آبپاشی کے میدان میں

ریاست جموں و کشمیر میں پہلے پنجسالہ منصوبہ کے دوران آبپاشی کے میدان میں جو ترقی ہوئی ہے ذیل میں اس کی تفصیل ملاحظہ ہو

منصوبہ میں مخصوص شدہ رقم ——— ۲۲۵٠۵۷ لاکھ روپے
متوقع اخراجات ——— ۱۷۰٠۴۸ لاکھ روپے
منصوبہ کے وقت میں مندرجہ ذیل کام مکمل ہوئے ہیں

نہروں کی تعمیر و توسیع

(۱) اونتی پورہ نہر (۲) مُمبل نہر (۳) زینہ پورہ نہر (۴) کوٹلی نہر (۵) بابل نہر (۶) پارمپورہ شالہ ٹینگ نہر (۷) رکھ لش نہر (۸) کھابجی کوہل (۹) ملتھو ترا کوہل (۱۰) پلہالن کوہل (سر بند) (۱۱) اومپور کوہل (ویر) (۱۲) چک گنڈی ارجن کوہل (۱۳) کھابجن کوہل — ہیڈ ورکس (۱۴) اون یاری کوہل (۱۵) لولاب میں پانی جمع کرنے کیلئے تالابوں کی تعمیر (۱۶) زینہ گیر نہر کی توسیع (۱۷) جموں شہر میں سیلاب کے تحفظ کا کام (۱۸) صوبۂ جموں میں حفاظتی بندوں کی تعمیر

لفٹ ایری گیشن

(۱۹) پدگام پورہ کوہل (۲۰) ڈوگری پورہ نہر (۲۱) بارسو نہر (۲۲) لِتہ پورہ نہر (۲۳) لدرُو نہر (۲۴) دِلنہ نہر (۲۵) آنکھل نہر

سیلابی نہریں

(۲۶) ببرو چند گنڈ نہر (۲۷) اودہمپور نہر (۲۸) کریرمیں کنواں

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان سکیموں کی تکمیل سے تقریباً ۵۰۴۷ لاکھ ایکڑ زمین زیر کاشت لائی گئی
تفصیل یہ ہے :-

سیلابی نہریں ۱۰۶۶۷۵ ایکڑ
لفٹ ایری گیشن ۴،۹۷۸ "
زمینداری کوہلوں اور آبپاشی کے دیگر ذرائع کی مرمت و توسیع ۳۱،۲۲۴ "
زمین جو زیر کاشت لائی گئی ۳۰۰ " میزان ۱۴،۲۲۷ ایکڑ زمین

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات حکومت جموں و کشمیر
دسمبر ۱۹۵۶ء
تعمیر

گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتیں

ریاست جموں وکشمیر میں پہلے پنج سالہ منصوبہ کے دوران گھریلو اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کو فروغ دینے کے سلسلے میں نمایاں کام انجام دیا گیا۔ تفصیل یوں ہے:

منصوبہ میں مخصوص شدہ رقم ——— ۳۰ء۹۳ لاکھ روپے
متوقع اخراجات ——— ۸۴ء۴۶ لاکھ روپے

صنعت وحرفت کو بڑھاوا دینے کیلئے جو کارروائی کی گئی۔ اس کے نتائج ذیل میں ملاحظہ کریں

کشمیر کی صنعتیں

(۱) انڈسٹریل ریسرچ لیبارٹری قایم کی گئی۔
(۲) سلک انڈسٹری کو بڑھاوا دینے کے لئے کئی اقدامات کیے گئے۔
(۳) کارخانہ تعمیرات کو وسعت دی گئی۔
(۴) چمڑے کا ایک کارخانہ قایم کیا گیا۔
(۵) قالین بافی کا ایک کارخانہ قایم کیا گیا۔
(۶) سرینگر میں نمدہ سازی کے ایک مرکز کا قیام عمل میں لایا گیا۔
(۷) سرینگر اور سوپور میں ہینڈ لوم ویونگ مراکز قایم کیے گئے۔
(۸) لیہہ میں بُنائی کا ایک مرکز قایم کیا گیا۔
(۹) اخروٹ کی لکڑی خشک کرنے کا ایک مرکز قایم کیا گیا۔

جموں کی صنعتیں

(۱) جموں کی سپورٹس فیکٹری کو وسعت دینے کے اقدامات کیے گئے۔
(۲) بسوہلی میں پشمینہ کا ایک سنٹر قایم کیا گیا۔
(۳) تھنہ میں لکڑی کے کام کا ایک مرکز قایم کیا گیا۔
(۴) رام نگر میں ایک وولن سنٹر کا قیام عمل میں لایا گیا۔
(۵) ہیرانگر میں کھادی کا ایک سنٹر قایم کیا گیا۔
(۶) کشتواڑ میں ایک وولن سنٹر کی داغ بیل ڈالی گئی۔
(۷) سانبہ میں سوت کا کپڑا تیار کرنے کے لئے ایک مرکز قایم کیا گیا۔
(۸) بسوہلی میں بانس کا سامان بنانے کے لئے ایک مرکز کا قیام عمل میں لایا گیا۔
(۹) میراں صاحب میں دستی کاغذ بنانے کا ایک مرکز بنایا گیا۔

دوسری اسکیمیں

متعدد طلبا کو مختلف پیشوں میں ضروری تربیت حاصل کرنے کیلئے ملک کے مختلف حصوں میں تربیت پانے کے لئے بھیجا گیا۔ طلبا کی ایک جماعت حسب ذیل صنعتوں میں تربیت حاصل کر کے ریاست میں واپس آگئی ہے

(۱) رنگ سازی اور چھپائی (۲) مٹی کے برتن بنانا (۳) چمڑے کا سامان بنانا
(۴) وُوڈ کارونگ (۵) ہوزری (۶) ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی
(۷) جراحی کے سامان کی تیاری (۸) ٹینگرافی (۹) مٹی کا روغنی سامان
(۱۰) لاکھ کی صنعت

شائع کردہ محکمہ اطلاعات۔ حکومت جموں وکشمیر
تعمیر
دسمبر ۱۹۵۶

تعمیر

سری نگر

جلد ۱ ——— شمارہ ۶

سالانہ چندہ ... ... ۶ روپے
فی پرچہ ... ... ۸ر آنے

دسمبر ۱۹۵۶ء

ترتیب

سرورق: - دینا ناتھ نادم جنہوں نے کشمیری شاعری کو ایک نیا آہنگ بخشا ہے۔ آپ نے کشمیری زبان میں پہلی بار اوپیرا OPERA کی ٹکنیک کو متعارف کیا۔ آپکے تین شاہکار غنائیے "بمبور یمبرزل" "ہیمال ناگرائے" اور "نیکی بدی" تاقدرانِ فن سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں ؛

مدیر: شمیم احمد شمیم۔ عبدالغنی وڈیرا پرنٹر پبلشر نے لالہ رُخ پبلیکیشنز سرینگر کی طرف سے شایع کیا

زاویے

نئے آئین کی تکمیل سے ریاست جموں وکشمیر کی تاریخ کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ مطلق العنان طرزِ حکومت کے خاتمے کے بعد نئے آئین میں جس اشتراکی سماج کا خاکہ پیش کیا گیا ہے وہ ہمارے صدیوں کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لئے سماجی انصاف اور برابری کے بُنیادی اصولوں پر یقین رکھنا بہت ضروری ہے اور یہ بات اطمینان کُن ہے کہ نئے آئین کا ڈھانچہ ان ہی بُنیادوں پر تعمیر کیا گیا ہے۔ عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ رکھ کر شہری حقوق کو جس طرح محفوظ کر لیا گیا ہے وہ اس بات کی ضمانت ہے کہ نئے آئین کے تحت باشندگانِ ریاست کو مکمل سیاسی، سماجی اور اقتصادی آزادی حاصل ہوگی۔ ریاست کی نمائندہ دستور ساز اسمبلی کے ممبران نے آئین پر اپنے دستخط ثبت کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شہنشاہیت کو دفن کر کے ایک ایسے جمہوری نظام کی داغ بیل ڈال دی ہے جس پر کشمیری عوام جس قدر فخر کریں، کم ہے۔ آئین پاس ہونے کے بعد مُلک بھر میں جس خوشی اور مسرّت کا اظہار کیا گیا اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مُلک کی غیر یقینی سیاسی صورتِ حال کے ختم ہونے سے کشمیری عوام نئے جموں وکشمیر کی تعمیر کے لئے کس قدر کوشاں ہیں۔ حال میں شمالی کشمیر کا دَورہ کرتے ہوئے وزیرِ اعظم جناب بخشی غلام محمد نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے یہ بات واضح کر دی ہے کہ "نئے آئین پر پُورے ضبط و نظم، دیانت اور خلوص سے عمل درآمد ہوگا اور ریاست کے ہر باشندے کو مکمل شہری اور سیاسی آزادی نصیب ہوگی ــــــ" وزیرِ اعظم کے ارشادات اُس جذبے اور خلوص کے آئینہ دار ہیں جو آئین کی تکمیل میں کار فرما رہے ہیں!

• • • • • • •

چین کے وزیرِ اعظم مسٹر چو-این لائی اور بودھ دُنیا کے دو عظیم رہنماؤں کی ہندوستان میں آمد ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ چین اور ہندوستان کی دوستی نہ صرف دو عظیم تہذیبوں کا ملاپ ہے بلکہ امنِ عالم کے قیام کی بھی بہت بڑی ضمانت ہے۔ باہمی تشکیک اور اعصابی جنگ کے اس مایوس کُن ماحول میں "پنچ شیل" کی تخلیق میں چینی وزیر اعظم کا جو حصّہ رہا ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس مرحلے پر جب کہ پنڈت جواہر لال نہرو امریکہ کے صدر مسٹر آئزن ہاور سے اہم بات چیت کرنے کے لئے امریکہ جا رہے ہیں، مسٹر چو-این لائی کی ہندوستان میں موجودگی قیامِ امن کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

• • •

دلائی لامہ اور پنچن لامہ کی آمد اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ وُہ پہلی بار تبت سے باہر آئے ہیں۔ اس وقت جب کہ دُنیا امن اور جنگ کے دوراہے پر کھڑی ہے، مہاتما بُدھ کا پیغام روشنی کی ایک ایسی کرن ہے جو اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہے۔

•

مصر میں جنگ بندی سے فوری جنگ کا خطرہ تو ٹل گیا، لیکن مصر کی سرزمین پر برطانیہ اور فرانس کی فوجوں کی موجودگی امنِ عالم کو ایک مُستقل خطرہ ہے۔ برطانیہ اور فرانس اپنی فوجوں کے قیام کے لئے جو عُذرِ لنگ تراش رہے ہیں اُس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی نیّت صاف نہیں۔ بین الاقوامی ہنگامی فورس کی موجودگی میں اب حملہ آور فوجوں کا وہاں رہنا انجمن اقوامِ متحدہ کو ایک کھُلا چیلنج ہے۔ دُنیا کی نظریں آج کل انجمن اقوامِ متحدہ پر لگی ہوئی ہیں کہ وہ اس چیلنج کا کیا جواب دیتی ہے!

• • • • • • • •

یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ برطانیہ اور فرانس کے وزرائے اعظم نے مصر سے بلا کسی تاخیر کے اپنی فوجوں کے اخراج کا اعلان کر دیا ہے۔ برطانیہ اور فرانس کا یہ اعلان جہاں ایک طرف اقوامِ متحدہ کی ایک عظیم فتح ہے، وہاں برطانیہ اور فرانس کے ان حاشیہ برداروں کے مُنہ پر ایک چپت بھی ہے۔ جو اب بھی مصر پر انکے جارحانہ [illegible] تاویلیں کر کے سامراج کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

• • • • • • •

وحید اختر

جنتِ ارض

جنتِ ارض کا شاداب چمن ہے کشمیر
نکہت و رنگ کے خوابوں کا وطن ہے کشمیر

اس کی شاداب بہاروں سے چرا کر خوشبو — نفسِ بادِ صبا مشک فشاں ہوتا ہے
اس کے گلمرگ و پہلگام کے نظاروں سے — دل میں احساسِ جمال اور جواں ہوتا ہے
آتشِ گل سے پگھلتی ہوئی چاندی بن کر — ہر رگِ سنگ میں برفاب رواں ہوتا ہے
آبشاروں کے خنک ساز سے پھوٹا ہوا راگ — دلِ دریا میں لہو بن کے تپاں ہوتا ہے
نغمہ و شعر کی اس رقص کناں وادی میں! — ذرّہ ذرّہ دلِ صاحب نظراں ہوتا ہے

جنتِ ارض کا شاداب چمن ہے کشمیر
نکہت و رنگ کے خوابوں کا وطن ہے کشمیر

اس کی جھیلوں میں اتر آتے ہیں مہتاب و نجوم — زعفران زار پگھلتے ہوئے سونے کی لکیر
اس کے کہساروں کے ماتھے سے ٹپکتی ہوئی برف — عرقِ چہرۂ خورشید وشاں کی تصویر
مہکا مہکا ہوا سرشار ہوا کا آنچل — خوابِ پہلوئے مسیحا نفساں کی تعبیر
دہکی دہکی ہوئی ہر سمت چناروں کی آگ — سینۂ آب پہ بجروں کی مسلسل تحریر
باغِ انگور کی ہر سانس مئے افشردہ — روحِ مستی نہیں میخانوں میں پابند و اسیر

جنتِ ارض کا شاداب چمن ہے کشمیر
نکہت و رنگ کے خوابوں کا وطن ہے کشمیر

جب ہوا دشت و گلستاں میں مہک جاتی ہے — دلِ غنچہ کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
حبہ خاتون کے نغمات سے برسی ہوئی مے — اب بھی پیمانۂ ہر گل سے چھلک جاتی ہے
روحِ اشعارِ غنی اب بھی نئے قالب میں — باغ و کوہ و دمن و دشت کو گرماتی ہے
وجد میں ماہیا گاتے ہوئے مانجھی کی صدا — عظمتِ محنتِ آدم کی قسم کھاتی ہے
دیکھ کر جوششِ نمو، فیضِ بہاراں اس جا — دستِ گل چیں کو بھی اپنے سے حیا آتی ہے

جنتِ ارض کا شاداب چمن ہے کشمیر
نکہت و رنگ کے خوابوں کا وطن ہے کشمیر

محمد یوسف ٹینگ

آزاد ــــــــــــ فکروفن

حیات کے عظیم اور بلیغ حیرت کدے کے عناصر ترکیبی کا تجزیہ کرنا کوئی ایسا کام نہیں ہے کہ اس پر کسی قیاس کو حرفِ آخر کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ مگر اس کہانی کا اختصار بیان کرنا مقصود ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ کشش حیات کا یہ متنوع سلسلہ جلال اور جمال کے دو بنیادی عناصر کی رنگا رنگیوں کا دلنواز سنگم ہے۔ یہ دو عناصر یوں تو ایک دوسرے کی ضد نظر آتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ زندگی کی اکائی کے ایسے اجزائے ترکیبی ہیں جن کے اتصال اور امتزاج کا نتیجہ یہ ساری کائنات ہے اور جو ایک دوسرے کی کمی پوری کر کے تسلسل اور ارتقاء کے لامتناہی عمل کے محرک ہیں۔ جمال کی خصوصیات مفعولیت۔ خودسپردگی۔ سبک سبک تصورات اور ملائم ملائم جذبات ہیں۔ اس کے زیرِ سایہ انسان ایک ایسی بے نام سی وادی میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں چاندنی، حسن، سرگوشیاں۔ زلف و رخسار اور مدھم مدھم نغمے ہوں۔ اس کے مقابلے میں زندگی کا متحرک اور فاعل پہلو ہے۔ جو عمل، محنت اور کھرے پن سے عبارت ہے۔ عزم، بغاوت اور پرواز جس کے زیور ہیں۔ جسے مصائب اور سختیوں کا سامنا کرنے میں ہی لذت حاصل ہوتی ہے۔ جسے کنواری زمینوں اور نادیدہ چوٹیوں کی تسخیر میں ہی سرور ملتا ہے۔ جسے سربستہ راز کی عقدہ کشائی کے لئے اپنے تمام قواء کو داؤ پر لگانے سے من کی مراد ملتی ہے۔

صنفِ شاعری پر قلبِ انسانی کے ان دو تاثرات کے نقوش صاف نظر آتے ہیں۔ یہاں گلستان کی جمیل بہاروں کا بھی ذکر ہے۔ اور کوہستانوں کے پُرشکوہ جلال کی نقاشی بھی۔ یہاں شیریں کے حسن کی طرحداریوں کا حال بھی ہے۔ اور فرہاد کے کوہ شکن تیشے کا بھی۔ ایک طرف آپ خیام کی ساقی مہوش، حافظ کے معشوق چہاردہ سالہ شیکسپیر کی ملکوتی حسن سے مالامال جولیٹ اور کالیداس کی شکنتلا کے جمال جہاں آرا کے جلوؤں میں گم ہو جائیں گے اور دوسری طرف گوئٹے کے حکیم فاؤسٹ، نطشے کے فوق البشر، فردوسی کے رستم اور پھر اقبال کے مردِ مومن کے حلیوں کو دیکھ کر آپ کے دل کی عمیق ترین گہرائیوں کے دریچے کھل جائیں گے۔ برنارڈ شاء نے اسی جلیل حسن پر توسے میجر باربرا اور مقدس جان کے نسوانی پیکروں کو دوامی پیرہن پہنا دیئے۔ ان ہی دو پہلوؤں کے دھوپ چھاؤں سے ادب و انشا کی قوس و قزح کی سحرکار آب و تاب قائم و دائم ہے۔

کشمیری شاعری کا جنم ہی حسن اور محبت کی آغوش میں ہوا ہے۔ قدرت کی اس صناعانہ خطۂ زمین کے ارض و سماء، چناروں کے سائے، آبشاروں کے رباب اور چمن زاروں کے سرسبز تختوں کے بیچ میں محبت اور رومان کے ترانوں کے سواء اور کونسے نغمے جنم لے سکتے تھے۔ جس کا ثبوت ہمارا شاداب لوک ادب ہے۔ دزرا مال لولری، ہی مال اور ناگرائے کے حسین اشعاروں اور غیر فانی داستانوں کے پس منظر میں اس نکتے کی بخوبی صراحت ہوتی ہے۔ ان ہی رجحانات نے اپنے پیرایۂ اظہار کے لئے نسوانی لہجے کی ملائمت گداز اور سوز کی تلاش کی۔ جو کشمیری شاعری کا لب و لہجہ بن گیا۔ للّ کے کلام میں پہلی بار تاریخ کی ابھرتی ہوئی پیچیدگیوں اور تسلسل کے فطری تضادات نے ایک لمحۂ فکریہ کا سامنا کیا تھا اور شاعری کے آئینہ پر پہلی بار تخیل کی پرچھائیاں منعکس ہوگئی تھیں۔ للّ کا کلام شیومت اور نوزائیدہ اسلامی تصوف کی آمیزش کا آئینہ دار ہے گو اس کا نکتہ نظر عینیت پسندانہ ہے۔ مگر اس نے فکر کی شراب کے لئے کشمیری شاعری کے نازک سے آبگینہ میں ظرف ڈھونڈ نکالا۔ اس کے یہاں ذہن کی کارفرمائی اور مختلف تصورات و خیالات کا بے باکانہ اظہار ملتا ہے۔ مگر

جب بعد میں کشمیر پر غلامی اور افلاس کا ایک پُر آشوب اور دراز زمانہ آپڑا تو یہ ذہن پھر ہلکے رومان کے بادلوں کی اوٹ میں چھپتا گیا۔ غلام اور بے چارہ قوم نے اپنی شکست کا سامنا یا تو تصوف اور عینیت کے فراری فلسفے کی شکل میں کر لیا جس کے بموجب دُنیا کے مصائب کا صلہ آخرت کی عاقبت گاہ میں ملے گا۔ یا ایک مجروح عورت کی زبان سے درمند گیت گا کر ان گیتوں میں اپنے ستم گر کے رُوٹھنے کا مرثیہ، اپنے "یاون" (شباب) کی محرومیوں کی فریاد اور آئندہ وصل کی اُمیدوں کے محل تعمیر کئے گئے۔ اور یہ محرومیاں رمز و کنایہ کے لطیف پیکر میں آسودگی کی پناہیں ڈھونڈتی ہیں۔ حبہ خاتون سے لیکر ارنہ مال تک کے سارے کلام میں اجنبی ہاتھوں کے بے نام گرانبار ستم کی صدائے بازگشت کو آپ بڑی آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں۔ اور اس کا ہمہ گیر اور جگر سوز فریادی لہجہ آپ کو اپنی آپ بیتی سُناتا جائے گا۔

مہجور ہماری جدید شاعری کا مُعلّم اول ہے۔ مگر اُس کے تمام تاریخی کارناموں کو پیش نظر رکھ کر بھی آپ کو یہ فیصلہ کرنے میں دقّت نہیں ہوگی کہ اُس کے بات کرنے کا انداز بھی نسوانی ہے۔ اُس کے یہاں بھی فریاد شکست اور زمین بوس ارادوں کا وہی سلسلہ ہے۔ وہ بھی قدیم اور جدید روایت اور تجربے کے اُس چوراہے پر کھڑا ہے جہاں تذبذب اور سراسیمگی کے جذبات کا جُھکاؤ غالب ہے۔

اس کارگہہ شیشہ گری میں خیرہ کُن چمک کے ساتھ ایک برق گرجی ساز کی لہروں پر تیرتا ہوا ایک آتشیں طوفان آیا جس نے اس سارے آہنگ کو زیر و زبر کر کے اس کا رُخ کسی اور ہی دھارے کی طرف موڑ لیا۔ یہ صدیوں کے دبے ہوئے غلاموں کے مردانہ اور باغیانہ جذبات کی قیامت خیز اُٹھان تھی۔ اس میں طلوع ہوتے ہوئے سُورج کی تابانی بیداری کے انگڑائیاں لیتے ہوئے بھونچال کا غلغلہ، ارادوں کا تلاطم اور بغاوت کے ازلی جذبات کی جھنکار موجود تھی۔ جس نے قرنوں کے ظلموں کی تلافی کا قصد کیا ہوا تھا، اور جس کے بعد کشمیری شاعری کا رُخ ہمیشہ کے لئے فکر، بغاوت اور شباب کی وادیوں کی سمت پھر گیا۔ یہ آواز عبدالاحد آزاد کی تھی۔ دیکھئے یہ تیور کشمیری شاعری میں کتنے نئے اور کتنے انقلابی ہیں اور ان کا آہنگ مدت دراز کی خواب آور راگنیوں کے مقابلے میں کتنا منفرد، پُرشکوہ اور پُرسطوت معلوم ہو رہا ہے۔

لُس دردہ نیتان مستانہ قدم ترائے
اہریزہ نیزہ خنجر زن پوشہ پھولے چھائے

(جو معرکہ حق و باطل میں سینہ تان کے کھڑا ہو جائے شمشیر، خنجر، نیزے اور گولیاں اس کے نزدیک پھولوں کی بارش ہوگی)

بیئہ نارہ نزٹن سند پائٹھ الرادہ کوہن بالن
صبحکہ ہواک پائٹھ پوشن دِل پھولرا دے

(وہ برق کی طرح گرے گا اور پہاڑوں کے سینوں کو چیرے گا اور نسیم صبح کی طرح پھولوں کو کھلنے کا سندیسہ دے گا)

یہ ازلک لولہ دیوانہ چھو آسان تیز طوفانہ
پکان محشر تُلان شہرن تہ گامن پرگنن اندر

(محبت کا یہ ازلی متوالا گرجتے ہوئے طوفان کی مانند ہوتا ہے۔ جو شہروں اور گاؤں میں قیامتیں بیدار کرتا چلا جاتا ہے)

ہمہ عقلہ سند زولانہ لوکتھ پائٹھ تُرٹتھ دراس
یا زانہ یہ میون پان نتہ زانہ مشر میون
تل میان پانن سارہ سمیک اور کلس پیٹھ
ملکن تہ فلکن لرزہ ستو ڈلیتھ یہ جگر میون

(خرد کے ہتھکنڈے سے میں کیسے آزاد ہوا۔ یہ یا تو میں جانتا ہوں یا میرا جنون)
(میں نے کشش حیات کے بوجھ کو کاندھوں پر اُٹھایا۔ فرشتوں اور آسمانی مخلوق نے میرا یہ دل گردہ دیکھ کر لرزہ طاری ہوگیا)

اور پھر اُس عظیم رزمیے کا گرجتا ہوا طوفان جس کے عنوان یہ دو مصرعے ہیں:۔

ژلان چھُوم شرچھا بن اضطرابن ولولن اندر
لیوان چھُوم زندگی ہیوند سوز سفرن منزلن اندر

درحقیقت آزاد کی آتش نوائی اور آسمان پیمائی کے ان عزائم کے پیچھے کشمیر کی اُس تحریک آزادی کا سیل بے پناہ ہے جو ظلم کے شکنجے سے نکل کر نکلی اور اس کے تیغ دسنان کے سائے میں

جوان ہوئی اور جس نے بعد میں ایک فیصلہ کن نعرے کے ساتھ جوابی یلغار کا آغاز کیا۔ آزاد اپنے اس دور کا سب سے نمائندہ اور سب سے بڑا شاعر تھا جس کے شعر کے قالبوں میں تاریخ کشمیر کے سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دور کا سیلاب موجزن ہے۔ آزاد کی اس چھا جانے والی کیفیت کو دیکھ کر مہجور نے جو آزاد سے پہلے آیا تھا اور آزاد کے بعد چلا گیا، کہا تھا ؎

مہجور کرہ ہی ناز برداری - دتیتھ تس چھی لاچارتی
دین چھی آزادس جان ذمہ واری - کاژہ زدن نوز میان زاری

(مہجور تیری ناز برداری کرتا مگر وہ مجبور رہے۔ اب آزاد کو تمہارے خاطر کی ذمہ واری ہے۔ اے پنیم کے چاند)

مہجور چند نئے تصورات اور نئے پیرایہ اظہار کا خالق ہو تو ہو مگر اس عظیم تاریخی شعور کی ہمنوائی اس کے بس کی بات نہ تھی جس کی رہنمائی آزاد نے سرانجام دی یہی اس کی مجبوری ہے۔ جہاں پر اس کے تصور کے پر جل جاتے ہیں، وہاں سے آزاد کی پرواز کی سرحدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ جہاں مہجور تھک کر ستانے لگتا ہے۔ وہاں پر آزاد کا سفر شروع ہوتا ہے مہجور کی فکر جس جنگل میں ہراسان ہو کر نکلنے لگتی ہے، آزاد کی نظر کے لئے وہ ایک سادہ سی راہگذر ہے۔ جہاں مہجور کے کلام میں تحریک آزادی کے ایجی ٹیشنل دور کی عکاسی حرف آخر ہے۔ وہاں آزاد کے کلام میں ابتدائی جوش کے بعد اقتصادی مسائل کی تاک جھانک، اصولوں اور انصاف کے ترازو اور تمام انسانیت کے مستقبل کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ مہجور نئی اور پرانی شاعری کے درمیان حدِ فاصل کی تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے مشن کی تکمیل اور ان کے ابتدائیے کا اختتامیہ آزاد کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ مہجور اپنی پرواز خیال میں رسول میر کے قریب ہو جاتے ہیں۔ مہجور کی شاعری کے پروں پر آپ ڈل کی کسی حسین شام میں کھو جائیں گے جس کے سکوت میں کسی دوشیزہ کی پرسوز نے کا زیر و بم نغمات کی ایک پیاری دنیا آباد کرتا جائیگا۔ حالانکہ آزاد کے شعر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اہربل کی سنگلاخ گھاٹیوں میں بیٹھ کر ایک پرہیبت آبشار کا وحشی حسن آپ کو مسحور کر رہا ہے۔ آزاد نے کشمیری شاعری کے مواد، طرز فکر اور ہیئت پر جو انقلابی اثرات ڈالے ہیں۔ وہ اس کی تاریخ کا ناقابلِ فراموش واقعہ ہے۔ یہ اسی فنکار کا دل گردہ تھا کہ ایک تنگ نائے کو اس نے بحر کی عظیم الشان وسعت بخش دی اور اس کا کینوس اتنا کشادہ کر لیا کہ اس میں قلبِ انسانی کی گہرائیاں، فکر فلک رس کی آسمان پیمائیاں، اقتصادی گھتیوں کا سلجھاو، خالق کی قدرت اور اشرف المخلوقات کی خامکاریوں پر طنز۔ غرض کہ بیسویں صدی کے کشمیری ذہن کو جن فکری اور جذباتی نشیب و فراز دیکھنے پڑے، ان سب کا پرسطوت رزمیہ آزاد کا کلام ہے، جسے اس نے سنگرمالہ (سلسلہ ہائے کوہ) کا نام دیا ہے۔ اور جن کی رفعت، وقار اور خروش ہمالہ کے عظیم کوہستان میں بکھر جاتی ہے۔

آزاد کی شاعری روایتی عشقیہ انداز سے شروع ہوئی، مگر اس کے کلام میں ابتداء سے تلخی کی کسک شامل رہی۔ وہ عشق اور حسن کا من موہنا کھیل کھیلنا چاہتا تھا۔ مگر اسے ہر وقت یہ احساس رہا کہ اس کے قلب و جگر اتنا چھلنی ہو چکے ہیں کہ ان کے گھاؤ اس کو کسی کروٹ چین کی نیند سونے نہیں دے سکتے۔ وہ ہر وقت اس احساس سے بے چین رہا کہ "برہ کیاہ چھوکہ لد دِلہ کین لھنری" (زخمی دل کے گھاؤ کیسے مندمل کرلو) جو معرکۂ زندگی کی ابھرتی ہوئی قوتوں اور مائل بہ انحطاط طاقتوں کے مابین ہو رہا تھا۔ اس میں بھی روز بروز شدت آتی گئی اور ایک دن آزاد اس فیصلہ کن اور انقلابی نعرے کے ساتھ اس میں کود گیا ؎

نمہ لولہ کھو تہ بہتر زد لانہ غلامی ہند
استادہ جوانمردس، یوس لول بتھر یاوئے

(اس عشق سے غلامی کی زنجیریں بہتر ہیں۔ جو مائل بہ بیکار نوجوان کے عزم و ارادے پر اوس ڈالے)

اس نے مرثیانہ طرزِ فکر اور غلامانہ ذہنیت کی ان بندشوں پر بڑی سختی سے حملہ کیا۔ جنہوں نے اس حسین اور توانا قوم کے قواءِ عمل کو شل کر دیا تھا۔ وہ ان بندشوں کے خلاف سخت قسم کا صدائے احتجاج بلند کرتا ہے ؎

دل سوان مہ کر غمگین تقدیر تھکن والے
افسانہ بران والے، دیوانہ کرن والے
نس دردہ غز لخوانس صد حیف ہزار افسوس
بیس خام خیالن پت آرام دِلوک راوے

(ہمارا دلوں کو تقدیر کی جھوٹی تسلیاں دے کر سراسیمہ نہ کر خیالی باتوں

پر متوالا کرنے والے اُس غزلخواں پر حیف ہے جو طفل تسلیوں پر اپنے من کی شانتی کو قربان کر دے)

وقت کی نداؤں اور تاریخ کے تقاضوں کو سمجھ کر وہ ایکدم چونک اُٹھتا ہے اور پکار پکار کر کہتا ہے کہ ؎

بزم تہ فریب چھے زلف خم ناز و ادا تہ مینزہ نم
زندگی مہ کر ستم رندہ ہنا تہ عار کر

(زلف و کاکل کے افسانے بے وقت کی راگنی ہیں۔ زندگی کا گلا نہ گھونٹ ذرا اپنے حال پر رحم تو کر)

وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں دلداروں سے خطاب کرتا ہے کہ "ساز اور سامان اور "رونہ داماں" اس وقت اب بساط سے اُٹھانے کی چیزیں ہیں اب "صداقت" کا شعلہ بن کر اور سوز کے پر لگا کر برق پاشیوں کی ضرورت ہے جن سے محبت کے کہسار جگمگا اُٹھیں۔ اُسے احساس ہے کہ اس کی قوم کی غلامی صرف جسمانی نہیں ہے۔ بلکہ حکمرانوں نے اُن کے قوائے ذہنی کو بھی مفلوج کر دیا ہے۔ اسی لئے وہ پرانے ترانوں کو بھی بے جوڑ، اور زنجیروں کو توڑنے کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ اور خود شناسی اور خود نگری کا درس دیتا ہے۔ کیونکہ اُس کی رائے میں صرف یہی ایک راستہ ہے جس سے قعرِ مذلت میں پڑی ہوئی یہ قوم پھر فلک پر جگمگا سکتی ہے۔

آزاد کی شاعری کا لب و لہجہ آفاقی ہے۔ اور اُس کی نظر نے دل و وجود کو چیر کے رکھ دیا۔ اپنا ذاتی یا دُنیا کا کوئی ایسا تعصب نہیں جس پر اُس نے وار نہ کیا ہو۔ وہ دیوانے کی طرح مکر و فریب اور کذب و افترا کے اس شیشہ خانے میں تخریب کا خوگر نظر آتا ہے۔ اس مرحلے پر اُس نے انسان کی غلط کاریوں کے ساتھ خود قدرت کی خامکاریوں پر صدا بلند کرنے کی جسارت کی ہے۔ ؎

دُو گنیار چھُو یلہ مطلب پُوزا یہ نمازن ہیوند
سوز س یو یہ بخشانیش یہ تو رُلدت ڈلے

(اگر نمازوں اور پوجا کا مطلب تفریق ہے۔ تو میں یہ سندیسہ قدرت کے حضور واپس روانہ کر دونگا)

بنیوگ دینک نہ دھرمک غم نہ دینک غم نہ دھرمک غم
کران انسانیت ماتم وچھیُت جہان کار اِنسانو

(تم دین اور دھرم کے ٹھیکیدار بنے۔ مگر درحقیقت تمہیں ان دونوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ انسانیت کی رُوح تمہارے کارناموں کو دیکھ دیکھ کر چیخ رہی ہے)

فند باز یار و بازگار و بازیٔن زیٔن
یادمن ژہ نفوہے کعبہ تہ بُت خانہ وینے کیاہ

(دھوکے بازوں نے تمہیں کعبے اور بت خانہ کے فسانوں میں گم کر دیا اور خود اپنی ہی موج اُڑاتے ہیں)

انسانیت کے حسن تعمیر اور اخلاق کی جس جنت کے تصور کا جہان اُس کے شعروں میں آیا ہے۔ وہ تمام تر توانا اور تند ہے کہ کشمیری شاعری کے پیمانے اس شراب کی شدت سے پگھل پگھل جاتے ہیں۔ اردو کے شعراء میں اُس کا اقبال کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ دونوں عمل، جلال اور فکر کے پیمبروں کی علمبرداری کرتے ہیں۔ دونوں نے اپنے مروجہ شعری پیمانوں کو توڑ پھوڑ کر اپنے نئے ظرف بنا کر آگے کے لئے شعر و ادب کی نئی راہیں دریافت کیں جس پر بعد میں راہی آتے گئے۔ اور محو ہوتے رہے۔ دونوں انسان کی عظمت کے لافانی ترانے گاتے ہیں۔ مجھے جسارت کرنے کی اجازت دیجئے تو میں کہونگا کہ آزاد کی عظمت کی اس سے بڑی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ حیات کی مدح نوازی کے اس مقابلے میں جن تعصبات کے آگے خود اقبال نے ہتھیار ڈال دئیے ہیں جن توہمات کے دھندلکوں میں خود اُس کی نظر اُلجھ کے رہ گئی۔ وہاں سے آزاد نکل کے آتا ہے اور رحمت کے عظیم الشان اُفق سے کائنات اور انسان کے حسین مستقبل کے گیت گاتا ہے۔ اُس کے دل کے نہاں خانوں سے تنزل اور انحطاط کی پرچھائیوں کو تلاش کر کے وہاں تخیل اور شعور کی کرنوں سے اجالا کرتا ہے اور اتنا کٹھن کام، اتنی فن کاری، نزاکت احساس اور دردمندی کے ساتھ کرتا ہے کہ اُس کے فن کا معیار کہیں زوال نظر نہیں آتا۔ اُس کی آواز جہاں بھر کو پکارتی ہے۔ مگر یہ چیخ میں تبدیل نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ یہ آپ کے نہاں خانۂ دل کی تاروں کو بے اختیار جھنجھا دیتی ہے۔

(باقی)

عبدالاحد آزاد

پروفیسر حسن شاہ
ایس۔ پی۔ کالج

بُدھ مت اور کشمیر

جس طرح قدرت نے کشمیر کو ایشیا کا دل بنایا ہے۔ اسی طرح یہ ایشیا کی عظیم الشان بودھی، ہندی اور اسلامی تہذیبوں کا سنگم بھی ہے۔ یہاں دست قدرت کی جابکدستیاں اور فکر انسانی کی سحر آفرینیاں دونوں تہذیب کی دلھن کے بناؤ سنگار میں برابر کی شریک ہیں۔ اس مقالے میں اسی دلفریب داستان کے ایک باب کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

کشمیر کی زمانہ قبل از تاریخ کی کیفیت ابھی آنکھوں سے اوجھل ہے۔ مقامی روایات اور دیومالا کے قصوں میں ہمیں کچھ دھندلے سے نقوش ملتے ہیں۔ لیکن ان میں زیب داستان اور حقیقت کچھ ایسی گنگا جمنی روپ سے خلط ملط ہیں کہ مورخ اُس معاشرے کے نقوش میں پُورا رنگ بھرنے سے قاصر ہے۔ تاہم اگر نیلہ مت پوران اور کلہن کی قدیم روایات کو شاعرانہ طرز بیان، سحر آمیزی اور مبالغے سے قطع نظر کرکے پرکھا جائے تو معلوم ہوتا کہ کشمیر کے اصلی باشندے غیر آریہ تھے جنہیں پشاچ اور ناگ کہا جاتا ہے یہ لوگ راکھشس یا سانپ نہ تھے۔ یہ تو صرف آریائی اظہار تنفّر و تحقیر ہے کہ آج ہم قدیم کشمیریوں کو ایک خوفناک بدخو اور خونخوار راکھشسی یا سانپوں کی قوم سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان قوموں نے آریہ نو آبادیاں قائم کرنے کی سخت مخالفت کی ہوگی، اور بالآخر اُنہیں ہار ماننی پڑی ہوگی۔ چنانچہ کشپ رشی ناگوں کا دیوتا مانا گیا اور آریہ لوگ خانہ بدوش بستیاں بنا کر چھ ماہ کے لئے یہاں آتے اور پھر لوٹ جاتے تھے ہوتے ہوتے آریہ اور ناگ لوگوں کا میل جول بڑھتا گیا اور آریہ لوگ چرواہوں کی زندگی کو خیر باد کہہ کر زراعت کی طرف مائل ہوئے۔ اور اس طرح کشپ مر یا کشمیر پوری طرح آریاؤں کے اقتدار میں آگیا۔ اور برہمنی ادب اور دیومالا میں یہاں کے اصلی باشندوں کا مافوق العادہ خلقت کی حیثیت سے ذکر ہوتا رہا۔

قدیم یونانی جغرافیوں اور بودھی ادب میں کشمیر کو گندھار کا ایک حصّہ کہا گیا ہے۔ گندھار کا علاقہ اننت ناگ سے شہباز گڑھی اور پشاور تک پھیلا ہوا تھا بودھ مت کے عروج سے پہلے اس علاقے کا تہذیبی اور فنی مرکز ٹیکسلا تھا جسے پانینی نے اپنی اشٹ ادھیائی میں تاک شلا یا، تاک شک شلا کے نام سے یاد کیا ہے۔ ادھر مہابھارت میں تاک شک کو ناگاؤں کا راجہ اور ربطل عظیم کہا گیا ہے۔ علماء کا قیاس ہے کہ یہ اشارہ ٹیکسلا کے ناگ راجہ کی طرف ہے۔ پرانی روایات میں ناگ اور سدھ کے الفاظ ساتھ ساتھ ملتے ہیں۔ سدھ عرف عام میں وُہ لوگ تھے جو یوگ دھیان کے ذریعے کوئی روحانی یا نفسیاتی طاقت حاصل کر لیتے تھے۔ یہ سدھی کہلاتی تھی۔ سدھ کو سائنسدان اور سدھی کو سائنٹفک دریافت کہنے میں علماء کو تامل نہیں۔ ناگاؤں میں اس قسم کے صاحبان علم و فن بکثرت ملتے ہیں۔ چنانچہ شریمد بھاگوت گیتا کی روائت کے مُطابق سب سے بڑا سدھ ہندو فلسفہ مادیت یعنی سانکھیہ درشن کا بانی کپل ہو گذرا ہے۔ وُہ نسلی اعتبار سے ناگ تھا۔ پرانوں میں اُسے ناگ لوک یا ناگاؤں کی دُنیا میں مصروف عبادت دکھایا گیا ہے۔ کپل کے بعد دوسرا مشہور عالم پاتنجلی گذرا ہے جو عام روایات کے مطابق شیش ناگ کا اوتار تھا، اور اس لحاظ سے اُس کا ناگ ہونا بھی یقینی ہے۔ پاتنجلی ایک متبحر عالم تھا۔ اُس نے پانینی کی گرامر اشٹ ادھیائی کی شہرۂ آفاق شرح مہابھاشیہ اور طب کی کتابیں اور

لوگ سوتر مرتب کئے۔ فلسفہ دینیات میں پرمارتھ سار اُس کی یادگار تصنیف ہے جس میں سانکھیہ درشن اور ویدانت کا نہایت دلکش امتزاج ہے بدھ مت کے عروج کے بعد مشہور سائنسدان ناگارجن اور بدھ فلسفی ناگ بودھی دونوں ناگ تھے اور آج تک انہیں بدھ دُنیا بڑے احترام اور تکریم کی نظر سے دیکھتی ہے۔ گندھارجو ناگاؤں کا مرکز تھا۔ علم وفن کی ترقی میں ہندوستان بھر میں پیش پیش تھا۔ چنانچہ یہاں کی دانش گاہ سارے مشرق میں علم وفنون کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ خود پانینی اس علاقے میں شالاتور یا لاہر کا باشندہ تھا۔ مسئلہ وحدت الوجود پر بے مثل سنسکرت کتاب چھند وگیہ اُپنشد جسے داراشکوہ نے فارسی جامہ پہنایا تھا۔ اسی علاقے میں تصنیف ہوئی تھی۔ سائنس کی ترقی کا یہاں یہ عالم تھا کہ بُدھ روایات کے مُطابق جیوک کمار حکیم مگدھ سے چل کر ٹیکسلا آیا تھا۔ تاکہ یہاں کے صاحبانِ فن سے کھوپڑی کھول کر دماغ کا اپریشن کرنے کا طریقہ سیکھ سکے۔ انہی ناگاؤں کے بھائی بند کشمیر میں آباد تھے۔ اب آپ خود فرمایئے کہ ہم انہیں آریائی روایات کے مطابق راکھشس یا سانپ کیسے مان لیں۔ اور پھر یہ قوم نجیب آج بھی آسام میں آباد ہے اور ناگ ہی کہلاتی ہے۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ کشمیری ناگ ایک مہذب قوم کے افراد تھے جو جھیلوں یا چشموں کے قریب رہنا پسند کرتے تھے اور غالباً شکار پر اور پالتو جانور پال کر گذارہ کرتے تھے اور بالآخر اُنہوں نے کھیتی باڑی اختیار کی۔ کشمیر میں نیلہ ناگ اُن کا مشہور قومی ہیرو گذرا ہے۔ پراگ یونیورسٹی کے مشہور سنسکرت دان پروفیسر ونٹرنتز کا بھی تقریباً یہی خیال ہے۔ اننت ناگ۔ کونسر ناگ۔ سکھ ناگ مہاپدم ناگ۔ شیش ناگ کے مقامات کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ ناگ لوگوں کے مرکز تھے۔ کلہن کی راج ترنگنی سے عیاں ہوتا ہے کہ بارہا ناگ لوگ آریائی اقتدار کے خلاف نبرد آزما ہوتے تھے اور کئی بار کامیاب بھی ہو جاتے تھے چنانچہ بیج بہارہ کے قریب واقع چکردھر سوامی کا تیرتھ جو آج ژکدر کہلاتا ہے۔ ایک ناگ نے ہی برباد کیا تھا۔ شاید یہ لوگ آریائی تفوق اور ذات پات کے تحقیر آمیز گورکھ دھندے سے نالاں تھے۔ چنانچہ بدھ روایت ہے کہ جب مجھنتک نامی بدھ مبلغ کشمیر میں دھرم پرچار کے لیے تشریف فرما ہوئے تو سب سے پہلے ناگ قبیلے ہی اس دعوت کو قبول کرنے کے لئے آگے آئے۔ اسی طرح گندھارا کے باقی علاقوں میں بھی مہذب ناگ قوم بُدھ کے اعلیٰ فلسفہ حیات کی حلقہ بگوش ہو گئی۔ چنانچہ آثارِ قدیمہ سے اس کی کئی نئی شہادتیں دستیاب ہوتی ہیں۔ جہاں ناگ لوگ بُدھ کی اُپاسنا میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ بُدھ دھرم کے عروج کے بعد کشمیر میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔

بدھ تہذیب

کشمیر میں بودھ مت کے پرچار کے متعلق سب سے پہلی روایت سیلون کے مشہور گرنتھ مہاومش میں ملتی ہے۔ جہاں ذکر آتا ہے کہ اشوک نے اپنے مذہبی مشیر موگلی پُتا تِسّہ کے کہنے پر مجھنتک کو گندھار میں بودھ مت کے پرچار کے لئے بھیجا۔ یہاں اس وقت ناگ راجہ اروالی راج کرتا تھا۔ اروالی نے ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا تھا اور لوگ اُس سے سخت نالاں تھے۔ اروالی نے مجھنیک کی سخت مزاحمت کی لیکن بالآخر جب لوگ جوق در جوق بودھ مت کے حلقہ بگوش ہونے لگے تو اروالی کو بھی اطاعت کے سوا چارہ نظر نہ آیا۔ چنانچہ اس طرح گندھارا اور کشمیر میں بُدھ مت کا پرچم لہرانے لگا۔ تبتی بودھ تاریخوں میں بھی یہی روایت قدرے اختلاف سے ملتی ہے۔ تبتی بودھ مورخ تارا ناتھ کی یہ روایت بڑی اہم ہے۔ کہ اُس زمانے میں کشمیر میں لوشٹر کی متعدد پہاڑی بستیاں ایک شاہی محل اور بارہ بڑے عبادت خانے تھے۔ مجھنتک نے ہی کشمیر میں زعفران کی کاشت کو رواج دیا۔ جس سے کشمیر کی تجارت کو بڑا فائدہ پہنچا۔ ہوتے ہوتے ناگ تہذیب، بدھ تہذیب میں گھل مل گئی۔ بقول کلہن "وید کے مخالف مرتدوں یعنی بودھوں نے ناگوں کو مباحثوں میں نیچا دکھایا اور نیلہ مت پران کی مقدس رسوم کا اس ملک میں خاتمہ ہو گیا۔" پہلی صدی عیسوی میں ترشک راجہ کنشک کے عہد میں بدھ مت نے ایک اور کروٹ لی اور کشمیر میں بُدھ مت کی چوتھی مجلس منعقد ہوئی۔ جس میں مہایان فرقہ کی داغ بیل ڈالی گئی۔ بُدھ مت کی اس نئی شاخ کے اُصولوں پر کشمیر کی وسعت قلبی۔ رواداری اور انسانیت کی بڑی گہری چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ اس نئے بودھی فلسفہ نے اپنے نور سے سارے ایشیا کو منور کر دیا اور کشمیر کے نامور بُدھ علماء نے ہندوستان کی عظمت کا سکہ ساری مہذب دُنیا کے دلوں پر بٹھا دیا۔

چنانچہ وبھاشا شاستر کی تدوین۔ سدرشن۔ اشوگھوش۔ پارشو۔ اور واسوبندھو جیسے علماء کا ظہور اور مہایان دھرم کا ایشیائی ممالک میں پرچار اس زمانے میں ہمارے تہذیبی کارناموں کی عظیم الشان یادگاریں ہیں۔ وبھاشا شاستر اب صرف چینی زبان میں ملتے ہیں۔ ان کا ترجمہ ابھی دوسری زبانوں میں میسّر نہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ بُدھ دھرم اور مذہبی روایات اور ہندو علم و فضل اور ویدوں کے علوم کا بہترین خزانہ ہیں۔ قیاس ہے کہ ان کے محققانہ مطالعہ سے کشمیر کی علمی و تمدنی تاریخ کا ایک نہایت شاندار باب مرتب ہو سکے گا اور یہ حقیقت اور واضح صورت میں ہمارے سامنے آسکے گی کہ کشمیر میں مذہبی رواداری کی بنیادیں نہایت ہی قدیم روایات پر قائم ہیں۔ کشمیر بودھی تہذیب کا ایک نہایت ہی اہم مرکز رہا ہے۔ چنانچہ سید سلیمان ندویؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ جب بلخ کے صنم کدہ نوبہار کے مذہبی پیشوا عربوں کے حملوں کی تاب نہ لا سکے تو بالآخر اُنہوں نے اپنے مربی کے بیٹے اور ماں کو کشمیر بھیج دیا تاکہ وُہ بچہ یہاں بُدھ مت کی اچھی تعلیم پا سکے۔ یہی بچہ بعد میں برمک کہلایا اور اسی کی اولاد میں جعفر برمکی تھا جو خلیفہ سُلطان ہارون الرشید کا وزیر اور ندیم خاص تھا۔

یہ نوبہار دراصل نووہار اور یہ برمک اس وہار کا پرمکھ یعنی صدر تھا۔ اسی طرح ۱۹۳۱ء میں گلگت میں بودھ دھرم سے متعلق مخطوطات ہیں اور بین الاقوامی اہمیت و شہرت کے حامل ہیں۔ ان سے بھی کشمیر میں بُدھ دھرم اور بودھ تہذیب کے ارتقا پر روشنی پڑتی ہے۔ تاریخ کے اس دَور میں بودھ اور ہندو دھرم ایک ندی کے دو دھاروں کی طرح مدتوں اس ملک کی تہذیب کے چمن کو سیراب کرتے رہے ہیں۔ اس تہذیبی عمل نے ایک نئے فلسفہ کا روپ بھرا جسے ہم ترکا یا کشمیر شیو درشن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

فلسفیانہ اور سماجی نکتہ نظر سے بودھ مت نے کشمیر کو ایک نیا شعور بخشا۔ چنانچہ بودھی نظریات جیسے۔ ماہیت حیات۔ نجات آخروی۔ اہنسا۔ مواخات۔ ترحم۔ ریاضت نفس۔ ترک لذات دُنیا اور فکر آخرت سب نے برہمنی فلسفہ اور دینیات پر بڑا گہرا اثر کیا حتیٰ کہ برہمنوں نے بُدھ کو بھی وِشنو بھگوان کا اوتار تسلیم کر لیا۔

چنانچہ سنسکرت کے مشہور کشمیری شاعر کھیمندر نے "دس اوتار" اور "بودھ اودان کلپ لتا" میں جس عقیدت اور نیازمندی سے بدھ کا ذکر کیا ہے۔ وُہ اسی ذہنی عمل کی بین شہادت ہے۔ حکمران اور رئیس شو اور بدھ کے مندر ساتھ ساتھ بنانے لگے اور لوگ ان دونوں کے سامنے سر نیاز خم کرنے لگے۔ ہندوستان میں بودھ تصورات سے متأثر ہو کر شنکراچاریہ نے اپنے فلسفہ وحدت الوجود کو رواج دیا۔ کشمیر شیو مت بودھ اور شنکر کے فلسفوں کے امتزاج کا رہین احسان ہے۔ اور بُدھ دھرم کے اصُول اخلاق اور فلسفہ حیات اور شیو دھرم کا جذبہ عبادت و ایقان دونوں ہماری تمدنی اور قومی زندگی پر موثر ہوئے ہیں۔

مہایان بُدھ مت نے مورتی پوجا کو جائز قرار دے کر فنِ تعمیر کی ترقی کی نئی راہیں کھولدیں۔ اس سے پہلے بھی اشوک اور کشمیری بودھوں نے جا بجا استوپ یعنی زیارت گاہیں اور وِہار یعنی خانقاہیں تعمیر کی تھیں جن کی شہادت چینی سفرناموں سے ملتی ہے۔ لیکن اس دَور کے بعد مجسمہ تراشی اور فنِ تعمیر کی بودھ گندھاری روایات کشمیر میں اپنے پُورے جوبن پر آئیں۔ افسوس ہے ہن راجہ مہر کل اور راجہ ہرش کی تباہ کاریوں سے صناعی کے کئی نادر نمونے صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ اور رہے سہے امتداد زمانہ کی نظر ہو گئے۔ چنانچہ راجہ میگواہن کی بودھ مہارانی امرت پربھا کا امرت بھون نامی وِہار۔ رانی کھادن کی خانقاہیں۔ راجہ درلبھ وردھن کی رانی کا آننگا بھون وِہار۔ پرورسین ثانی کے عہد کا جیندر وِہار جس میں بُدھ کا عظیم الجثہ پیکر برہنہ بُدھ نصب تھا۔ جیا پیڈ وِہار۔ نش پالک وہار راجہ جے سنگھ کے سپہ سالار اودے کی بیوی کی بنائی پنج منزلہ خانقاہ مندی وہار جہاں چینی سیاح او کونگ چار برس ٹھہرا تھا اور اس کے علاوہ تین سو چھوٹی بڑی بُدھ خانقاہیں اور مندر آج صرف تاریخ کے اوراق میں چھپے ہیں اور ظاہراً اُن کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا۔

۱۹۱۶ء میں رائے بہادر دیا رام ساہنی نے پرہاسپور۔ پاندریٹھن اور اونتی پورہ کے بودھ آثار قدیمہ دریافت کئے اور بعد میں ڈاکٹر ووجل نے ملنگ پورہ اور پنڈت آر۔ سی۔ کاک نے شمسدون یا ہارون کے بودھ آثار سے علمی دُنیا کو روشناس کرایا۔ ان سب میں پرہاسپور کے آثار قدیمہ اپنی عظمت و شکوہ (بقیہ صفحہ نمبر ۵۶)

خلیل الرحمن اعظمی

غزل

تیرے دیوانے کہیں اور تو کیا جاتے ہیں
روز آ کر تری زنجیر ہلا جاتے ہیں

تیرے ہوتے ہوئے راتیں یونہی ویران رہیں
لے ترے شہر سے اے ماہِ لقا جاتے ہیں

جب بھی میں نے کبھی مرنے کی دُعا مانگی ہے
میرے ارمان مجھے رہ رہ کے جگا جاتے ہیں

ہاں ذرا سوچ کے اے قافلۂ نکہت گل
خس و خاشاک بھی ہمراہ صبا جاتے ہیں

تیرے پہلو میں بھی جی بھر کے کہاں نیند آئی
چند جھونکے مجھے رہ رہ کے جگا جاتے ہیں

بد گماں تجھ سے نہیں رنج نہ کر جانِ جہاں
اپنے ہی آپ سے ہم ہو کے خفا جاتے ہیں

اس اندھیرے میں غنیمت ہیں یہ غم کے شعلے
زندگانی کے چراغوں کو جلا جاتے ہیں

آج کس شان سے نکلے ہیں ترے متوالے
رقص کرتے تہ امواج بلا جاتے ہیں

تم جو مِل جاتے تو پھر تم پہ ہی لاتے ایمان
تم نہیں ملتے تو پھر سوئے خُدا جاتے ہیں

دیکھ اے تشنہ لبی میں نہ کہیں جل جاؤں
لوگ میرا ہی لہو مجھ کو پلا جاتے ہیں

امین کامل

حبہ خاتون کی شاعری کا سماجی پس منظر

حبہ خاتون کشمیری زبان کی وہ شاعرہ ہے جس نے سولھویں صدی میں کشمیری شاعری کی تاریخ میں پہلی مرتبہ حسن وعشق کے معاملات کو اپنا موضوعِ سخن بنایا اور کشمیری موسیقی میں نئی جان ڈال کر اس میں بہت سی نئی راگ راگنیوں کا اضافہ کیا۔ اس سے پیشتر کشمیری موسیقی سے متعلق تو کچھ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا، البتہ کشمیری شاعری محض تصوّف اور مذہب ہی کے محور کے گرد گھومتی رہی تھی

حبہ خاتون نے جس زمانے میں اپنی آنکھیں کھولیں اُس وقت صدیوں کی کشمیری حکومت اپنی زوال کے آخری ایّام سے گذر رہی تھی۔ مرکزی حکومت کا اقتدار اور مُلک کی سالمیت عملی طور پر ختم ہو چکی تھی۔ بڑے بڑے جاگیرداروں نے اقتدار کی خوفناک خانہ جنگی سے سارے مُلک میں قیامت خیز اودھم مچا رکھی تھی۔ غرضیکہ ایک شدید سیاسی اور معاشی بحران کا زمانہ تھا جب حبہ خاتون جنم لیتی ہے۔

بدقسمتی سے اس شاعرہ کی زندگی کے حالات ابھی تک ٹھیک سے تحقیق نہیں ہوئے ہیں۔ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اُس کے اپنے اشعار کی روشنی میں بہت کم قابلِ وثوق رہتا ہے۔ اس کے اپنے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے خاندان کی چشم وچراغ تھی جو کہ اوسط درجے کے کسانوں اور اونچے پایے کے جاگیرداروں کی درمیان کی کڑی تھا۔ ایک ایسا آسودہ حال طبقہ جہاں حبہ خاتون کو زندگی کے آرام وآسائش اور راحت واطمینان کے تمام ذرائع اور سامان میسّر تھے۔

مالِ مالِ مٲجہِ رچھتھس تنہٕ وکتو رے ۔ ہتہ ہتہ ژونزہ آسم شلہ دان
سوٗتی پان لگمہٕ راہ مسافرے ۔ کانسہ ماراون شوٗرے پان

(ترجمہ:۔ میرے ماں باپ نے مجھے کتنی نازونعمت سے پالا تھا سینکڑوں مُغلانیاں مجھے پنگوڑے میں لوریاں دیتی تھیں۔ اب دہی میں ہوں کہ ہزاروں غم وآلام کا مسکن بن گئی ہوں۔ آہ کسی کا بچپن یوں گم نہ ہوجائے)

حبہ خاتون نے لڑکپن میں نہ صرف اُس وقت کی مُرّوجہ فارسی تعلیم کی قریب قریب تمام منزلیں طے کی تھیں بلکہ موسیقی کے فن میں بھی مہارت حاصل کی تھی بسنِ بلوغ میں قدم رکھتے ہی اُس کی شادی کسی ایسے شخص سے ہوئی جس سے اُس کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ ایسا جان پڑتا ہے کہ اپنے خاندان کی لاج رکھنے کی خاطر وہ اپنی ذاتی محبت تک کی قربانی دیتی ہے۔

دوہہ اکہ کم تام دوٗرہ وچھایس ۔ وتہ گٹ لاگتھ ہتہ ہتہ آم
گھرِ یام ژالیس بہیہ حتہ درایس ۔ باگن آسی کہندے تام
دوہہ اکہ مال ماجہ نگرہ سرتھایس ۔ شہرچ آسس وأرس گام
کیا کرہ پوشس تہٕ لا زِ نیاپس ۔ باگن آسی کہندے تام

(ترجمہ:۔ اے خوشا وہ دن کہ جب مجھے کسی نے دُور ہی سے دیکھ پایا تھا اور مسافر کے روپ میں میرا پیچھا کرنے لگا۔ میں گھر میں کیا داخل ہوئی بہانہ بنا کر پھر سے اُس کے دیکھنے کو واپس نکلی۔ اے سہیلی دیکھ میں کن لوگوں کے یہاں بیاہی گئی۔

شہر کی ہوکر میں دور کسی گاؤں میں بیاہی گئی۔ تقدیر کے لکھے ہوئے کے سامنے میری ایک بھی نہ چلی۔ اے سہیلی دیکھ میں کن لوگوں کے یہاں بیاہی گئی)

ان اشعار سے نہ صرف اُس کی ذاتی محبت کا ہی پتہ چلتا ہے۔ بلکہ

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہر (شاید سری نگر) کی رہنے والی تھی اور اُس کی شادی کسی گاؤں (چندہ ہار یا پانپور) میں ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی ذاتی محبت کی تکمیل کے لئے اپنی طرف سے کافی کوشش بھی کی تھی لیکن اُس میں کامیاب نہ ہوسکی۔

کشمیر کا ایک پرانا مؤرخ پنڈت بیربل کاچرو لکھتا ہے کہ حبہ خاتون نے اپنی طبیعت کے تقاضوں سے مجبور ہوکر کشمیری اشعار کہنے اور اُنہیں سُریلی آواز میں گانے کا سلسلہ اپنے سسرال میں بھی جاری رکھا اُس کے سسرال والے اس بات پر اپنے قبیلے کے طعن و تشنیع کا شکار ہونے کے باعث حبہ خاتون سے دِل برداشتہ ہوئے اور طرح طرح کے حیلے بہانوں سے اُس کی زندگی اجیرن کرنے لگے۔ یہاں تک کہ آخر معاملہ اُس کی طلاق پر منتہی ہوا۔

حبہ خاتون کی شاعری اور موسیقی کی جو شہرت پھیلنی شروع ہوئی تو بڑھتے بڑھتے شاہی محل تک بھی جا پہنچی۔ اُن ایام میں کشمیر پر چک خاندان کی حکومت تھی۔ یوسف شاہ چک شہزادگی کے عالم میں تھا۔ اور شب و روز عیش و عشرت اور رنگ رلیوں میں مست رہا کرتا تھا۔ اپنی موسیقی کی محفلوں کی رونق بڑھانے کی غرض سے اُس نے حبہ خاتون کے حصول میں کامیابی حاصل کی۔ لیکن جب اس کے لاثانی حسن و جمال اور علم و عقل سے سابقہ پڑا۔ تو اُسے اپنی شریکِ زندگی بنا لیا۔ یہاں سے حبہ خاتون کی زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے اور اُس کی شہرت مُلک کے طول و عرض میں پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

جیسا کہ اُوپر اشارہ ہو چکا، حبہ خاتون کے سامنے مُلک کی زوال آمادہ جاگیرشاہی اور اُس کی آپس کی خانہ جنگی تھی۔ مرکزی نظام کا شیرازہ درہم برہم ہو چکا تھا۔ مُلک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جاتے وہ بھی جاگیرشاہی بنیادوں ہی پر کھڑا ہوتے اور صبح و شام تغیر و تبدل کا شکار ہو جاتے۔ عوام معاشی لحاظ سے تباہ حال ہو رہے تھے اور جگہ جگہ بھوک اور کال کے گدھ منڈھلا رہے تھے۔ اس پر حبہ خاتون کی اپنی ذاتی زندگی انتہائی پریشان اور دُکھ درد میں گذر رہی تھی۔ ایسی صورت میں جو ادب اُس زمانے میں پیدا ہوتا اُس میں ناکامی، محرومی، غم اور ایک خوشگوار خیالی زندگی کی تمناؤں کے بغیر اور کیا ظاہر ہوسکتا تھا۔ چنانچہ

تعبیر

حبہ خاتون کے کلام میں پیا پیارے کے رُوٹھنے کا گِلہ شکوہ، سوکن کا حیلے بہانوں سے اُس کو اپنانے کا غم، تقدیر کے لکھے ہوئے کے سامنے انسان کی بے بسی کا اعتراف، ایک محبت بھری اور خوشگوار زندگی کے ارمان واضح صورت میں سامنے آتے ہیں۔

بالس زُون بِچھس درہ   ژِہ کتہِ ژُول گیمژ چھے
بروِنہ ژھس تہ پتو ڈلہ   لالو کلہ آلہ وَے
ہانژِہ کہ درانژہ سیت کتزم بدنو   ڈیتوس بال یلہ رادے یو
آسمان تہ زمین وآنکھ ادہ نو   مدنو لدیو دآن پوشس تہ ہی
یارِ کرزمنہ دوہے سٹری   نشہ پر دین ژُودم راتھ
کوہ لامینس سونہ داد ژھی   بال کرُمتس مژی بو
یتہِ چھے سار عاشق دیتہ اللہ کیاہ معنہ تے
ونتہ وُیس کُس نیاے لانیوان انز راُوِتھ زانہ تے
چھیو تہ ژندنی نووُم بدن   دِیوہ یارِ میلیم دمہ ہا ژھوہ
سارُن روزان عارہ روُمن مدن   وَدن وَدن لوُسِم نین

ترجمہ:-

میں وہ چاند ہوں جو کہ پچھم کے اُس پار پہنچنے کو ہے۔
تُو نہ جانے ابھی تک کہاں بدمست پڑا ہے
میں ایک آدھ گھڑی تک غروب ہونے کو ہوں
تیرے واری جاؤں اے پیا، آ بھی جا
اُس نے میرا دِل کون سے قصور پر چھلنی کر کے رکھ دیا
اُسے کہدو کہ جب میں ہمیشہ کے لیے آنکھیں موندھ لُونگی
پھر چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی مجھے نہ پاسکو گے
تجھے پھولوں کی مالا پہناؤں، اے پیا، آ بھی جا
وُہ تو مجھے یُوں ہی ظاہری طور پر دِلاسے دیتا رہا
اور راتیں غیروں کے یہاں بسر کرتا رہا
مجھے سوکن کا دُکھ درد عطا کر دیا
مجھ ایسی سُندر کو پگلی بنا کر رکھ دیا
یہاں عشق کا دعویٰ کرنے والے تو ہزاروں ہیں
لیکن اے سہیلی قسمت کے لکھے ہوئے کو کون بدل سکا ہے
دسمبر ۱۹۵۶ء

خوشبو اور صندل کے پانی سے میں نے بدن نہلایا
شاید وُہ آ جائے اور میرا نصیب جاگ اُٹھے
افسوس انسان کے ارمان، ارمان ہی رہا کرتے ہیں
روتے روتے میری آنکھیں چندھیا گئیں

شاہی محل اور یوسف شاہ سے رابطہ پیدا ہونے کے بعد حبہ خاتون کی شاعری میں اگرچہ اُن جذبات کا عکس بدستور ملتا ہے۔ لیکن فنی لحاظ سے اُس کے کلام میں تصنع پیدا ہو جاتا ہے جو کہ ہر درباری شاعری کا خاصہ رہا ہے۔ اس زمانے میں شاہی موسیقاروں کے ساتھ مل کر حبہ خاتون نے کشمیری موسیقی کو نئے نئے مقامات دئے، جن میں "راست کشمیری" بہت مشہور ہے۔

یوسف شاہ کے ساتھ جو کہ اب کشمیر کا بادشاہ بن چکا تھا، یہ رابطہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ ملک کا نظام پہلے ہی درہم برہم ہو گیا تھا۔ اُس پر یوسف شاہ کی عیاشی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی نتیجہ کے طور پر کشمیر کے چند ذی اثر لوگوں کے اصرار اور معاہدے پر مغل شہنشاہ اکبر اعظم نے ۱۵۷۶ء میں کشمیر پر چڑھائی کی اور حبہ خاتون کی آنکھوں کے سامنے ہی چک خاندان کی شاہی کا خاتمہ ہو گیا۔

مغلوں کی یہ یلغار ویسے تو کشمیر کی قومی خود مختاری اور آزادی کا پہلا تاریخی خاتمہ تھا لیکن پھر بھی اُس وقت کے معاشی اور سماجی حالات کے پیش نظر یہ ایک نئی اور شاداب زندگی کی بشارت بھی تھی۔ یوسف شاہ گرفتار ہو کر ہندوستان بھیج دیا گیا جہاں وُہ ایک عرصہ تک مغلوں کی حراست میں رہ کر بنگال کی سرزمین میں فوت ہو کر دفن ہوا۔

اُس کی گرفتاری کے بعد حبہ خاتون پر پھر سے مصیبتوں کا گراں بار پہاڑ آ گرا۔ کچھ دیر تک تو وُہ اُس کی راہ دیکھتی رہی کہ شاید کسی حیلے بہانے سے جان چھڑا کر واپس آ جائے، لیکن جب ایسی کوئی صورت بنتی نظر نہ آئی تو مایوس ہو کر تنہائی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئی۔ اُس کی زندگی پہلے ہی غم و آلام سے بھرپور تھی اب جو اُس پر ان نئے مصائب کا اضافہ ہوا تو لازمی طور پر اُس کی طبیعت تصوّف کی طرف مائل ہوئی جو کہ یاسیت اور دُنیا سے بیزاری کی آخری منزل کہی جا سکتی ہے۔ زندگی کا یہ موڑ حبہ خاتون کی شاعری کا آخری دَور تھا جبکہ اُس کی شاعری کی بنیاد بدل جاتی ہے۔ اب وُہ خالص مادّی عشقیہ جذبات کے بجائے تصوّف اور روحانی واردات کی عکاسی کرنے لگتی ہے، لیکن ہیئت شعری زبان و بیان اور تشبیہ و استعارات عشقیہ شاعری کے رنگ میں ہونے کے باعث اُس کے اس دَور کے اشعار میں نہ تو پھیکے پن کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی حلاوت و شیرینی میں کوئی زیادہ کمی آ جاتی ہے۔

حبہ خاتون نے شاعری کی جو نئی طرح ڈال دی، اُس نے بعد میں کشمیری شاعری کا رُخ ہی بدل دیا۔ اتنی صدیاں گذرنے کے باوجود اسکا رنگ آج بھی اُتنا ہی مقبول ہے جتنا کہ وُہ اُس کے اپنے وقت میں تھا۔ الفاظ بہت ہی رس بھرے اور سادہ ہیں تشبیہات و استعارے عام لوگوں کی سمجھ بوجھ کے مطابق ہیں اور جذبات جاندار اور بے پناہ ہیں۔

ٹنگہ دُتھ برتھا وسں بیڑی ۔ تنہ نیرُس کو تاہ کال
بتہ درالیس دوہ دئِن کٹرئی ۔ بال کرنفس مڑئی لو
دارہ کن وُچھو نمے ۔ کارہ دُوگن وُر دآن
تارہ دِل کور نمے ۔ چھُومے بالے تمنّا
بوُدی چیادنس مسں تے دتردُی ۔ کوہ تِلہ کتردُی گا جنس بوُ
نس تے میہ اوسں انرے لونوی ۔ پوشے تو نوی بھرہ سے
داہ چھُم گومُت کوتاہ دَنہ لو ۔ وُندہ مڑرادِتھ ہاوہ یو
بازنے بیہ ہم دَنہٗی ژلہ یو ۔ بلہ یو پننے مالہ نے

(اشعار کا ترجمہ مقصود نہیں بلکہ ان کے الفاظ، جذبات اور تشبیہات و استعارات میں جانے کی ضرورت ہے)

حبہ خاتون کے اشعار میں محبت کے بے پناہ جذبے کا جو اظہار ملتا ہے۔ اُس میں وُہ آفاقی خد و خال موجود ہیں جو کہ ادب اور حُسن کو مربوط کر کے ابدی رنگ روپ عطا کرتے ہیں جس کے حُسن و تاثیر میں زمانے کی تبدیلی اور حالات کے بدلنے پر بھی کہنگی کے آثار آنے نہیں پاتے۔ اس کے ان آفاقی رجحانات ہی سے ہم اس کے ذہنی میلانات کا اندازہ کر سکتے ہیں چنانچہ یہ بات واضح ہے کہ وُہ سراپا محبت کا پیکر تھی اور محبت ہی کی طلبگار۔ اس کے تصوّر میں محبت کا جو مفہوم تھا وُہ عادی ہونے کے باوجود بہت ہی بلند اور ارفع تھا۔

سیپارہ ترہ مرہ بریم اکہ آلو۔ پھیرہ نو کنہ گوم دیرہ زبرے

(بقیہ صفحہ نمبر ۵۶)

سی راجگوپال آچاری

گیت گاتے رہو

"اپنے لبوں پر چپ کے پہرے بٹھائے رہو
گیتوں کی لَے کو بجھا دو"
ایک برافروختہ شاعر جھنجلا کر گنگنایا
مگر میں اُس سے متفق نہیں ہوں

•

وُہ موت کے پرہول سناٹے ہوں،
یا غم کا اتھاہ ساگر
ہم کاہے کو خود کو سوگوار کریں
وُہ خوشی کے مدھر سپنے ہوں،
یا اندوہ کے دردناک نالے
ہمیں تو سب سے نباہ کرنا ہے

•

کام کتنا ہی کٹھن کیوں نہ ہو،
کتنا ہی آسان کیوں نہ ہو،
مگر تمہارے گیت کی لے نہ بجھنا چاہیئے
جب چاروں اور سے تمہیں سوچ نے جکڑ رکھا ہو،
تب بھی گیت کی دھن چھیڑنا نہ بھولو۔
ساز بجتے ہی تمہارے تخیل میں،
خوشی اور عزم کے پھول کھل اُٹھیں گے
تمہارے گیتوں کا رس —
تمہاری گفتگو کو شہد آگیں بنا دے گا
اور تمہاری آواز کی مٹھاس،
دُور دُور تک رس گھولنے لگے گی

•

کتنے ہی سالوں کی میتوں پہ بین ہوگا
اور کتنے ہی لمحے اپنی براتیں سجائے آتے رہیں گے
وُہ لازوال اور نا مختتم ہیں۔
دوست! تم جھجکتے کیوں ہو؟
فردا سے ڈرتے کیوں ہو؟
آگے بڑھو اور آسماں پر کمندیں پھینکو۔
تمہاری غلطیوں کی بدسلیقگی اپنی موت مر جائیگی!

•

حیات کا رقص جاوداں ہے
تمہارے بعد کتنی ہی پیڑھیاں آئیں گی
اور جب وُہ تمہاری محنت کا سونا پگھلتے دیکھیں گی
— تو اُن کی مسرت کی انتہا نہ رہے گی
اُن کے مشامِ جاں معطر ہو جائیں گے۔
اور فضا میں معصوم پرندوں کے مقدس پروں کی طرح

•

گیت لہرا اُٹھیں گے!
دوست! میں سدا تمہاری آنکھوں میں
مسکراہٹوں کا رقصِ مسلسل دیکھنے کا متمنی ہوں۔
سدا گیت گاتے رہو!
اندیشۂ فردا پر گریہ وزاری کیسی؟
جب بھی کوئی تعمیر تمہارے مضبوط ہاتھوں کی جکڑ میں آئے
تمہارے ہونٹوں پر گیتوں کا جادو جاگنا چاہیئے
وُہ خوشحال دُنیا ضرور عالمِ وجود میں آئے گی
جسے تم نے اپنے ذہن کے نہاں خانہ میں سجا رکھا ہے۔

ترجمہ: آفاق احمد

مسیح الزماں
لیکچرار الٰہ آباد یونیورسٹی

مومن

غالب اپنے کلام کی مقدار کم ہونے کے باوجود بڑی وسیع نظر رکھتے ہیں۔ فکر و خیال کی بہت سی منزلوں سے گزرتے ہوئے زندگی کی بہت سی حقیقتوں پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ مومن کی نگاہ محدود ہے اور ان کا تجربہ ایک تنگ دائرے میں گھومتا ہے۔ ایک پردہ نشین سے انہوں نے پیار کیا۔ لیکن اس محبت میں ان کا دل جہانِ بے خودی نہیں ہوا، اور نہ اس جذبے کی شدت نے روحانیت کی شکل اختیار کی۔ ایک متوازن آدمی کی طرح وہ محبت و شیفتگی کی منزلوں سے گزرتے کشش و اجتناب، التفات و گریز، بے رخی و تلطّف کی وادیوں میں لہراتے، اندیشوں اور وسوسوں کی جھاڑیوں سے الجھتے، وصال کے سبزہ زاروں اور جدائی کی گھاٹیوں میں زندگی کے دن بسر کرتے رہے۔ ان کی شاعری انہیں بیانات سے رنگین اور ان کے اشعار اسی سچائی سے موثر ہیں۔ لیکن پھر بھی ان میں وہ گہرائی یا بلندی نہیں ملتی جو میر یا غالب کا حصہ ہے۔ حالانکہ شیفتہ کو اگر ان کا شاگرد ہونے کی وجہ سے نظر انداز بھی کر دیا جائے تو نیاز فتح پوری اور چند دوسرے نقاد ایسے ہیں جو مومن کو اردو کے تمام غزل گویوں میں افضل ترین سمجھتے ہیں اور ان کی نازک خیالی اور تغزل کو بے مثال مانتے ہیں۔

فکر روزگار میں مومن کو کبھی پریشان نہیں ہونا پڑا۔ بندھا بندھایا وظیفہ ملتا تھا سلیقے، ذوق اور وضع داری سے خرچ کرتے تھے۔ شطرنج، موسیقی، طب، نجوم سے دلچسپی تھی۔ زیادہ روپے کی ہوس نہ تھی کہ درباروں کا چکر لگاتے۔ شاعری بھی ایک مشغلہ تھا۔ امۃ الفاطمہ صاحبہ سے لگاؤ بھی، اتفاق جو بڑھتے بڑھتے شیفتگی اور محبت تک پہنچ گیا اس کے علاوہ اٹھارویں صدی کے اول نصف کا زمانہ امرا، و شرفا کے عیش و طرب کی آج سے بالکل مختلف قدریں رکھتا تھا۔ مومن کو جذبات کی تسکین کے بہت سے راستے ملے پھر جب مذہبیت طاری ہوئی تو ان کو پرہیزگاری کا راستہ پسند آیا اور سید احمد رائے بریلوی کی بیعت کر کے کٹر مذہبی بن گئے۔ کہیں کہیں ان کی غزلوں میں اس مذہبیت کا اثر ملتا ہے۔ ان کی غزلوں کا بیشتر حصہ حدیث دلبران پر مشتمل ہے۔ اس کو بھی کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ایک حصہ وہ ہے جو عشق پردہ نشین کے بیان میں ہے۔ پردہ نشین کا لفظ مومن کی غزلوں میں بار بار اور جس جس طرح سے استعمال ہوا ہے۔ غالباً کسی اور غزل گو کے یہاں نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ یہ بھی صاف ہے کہ جس محبوب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ صنف لطیف سے تعلق رکھتا ہے۔ دہلی کے غزل گویوں میں داغ کے علاوہ مومن ہی ایسے ہیں جن کے تقریباً سارے کلام میں ایک عورت سے محبت کا اعلانیہ اظہار ہے اور یہ محبت مادّی ہے:—

دشمنی دیکھو کہ نا الفت نہ آ جائے کہیں ۔ لیا منہ پر دوپٹہ حال میرا دیکھ کر
ہو گئی گھر میں خبر ہے منع واں جانا ہمیں ۔ وہ بھی رسوا ہو خدا جس نے ہمیں رسوا کیا
اہل ماتم اپنے روئیں کس طرح منہ ڈھانک کے ۔ مرتے مرتے پاس اس پردہ نشیں کا تھا ہمیں
اضطراب شوق شاید غیر اس کے پاس ہے ۔ جانب چلمن نظا رہ دمبدم کیونکر کریں
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دمبدم ۔ گلۂ ملامتِ اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اس عشق کا اظہار مومن کے یہاں ان تمام منزلوں سے گزرتا ہے جن سے محبت کرنے والے کو واسطہ پڑتا ہے۔ مومن نے نفسیات انسانی کی باریکیاں اور جذبات کی لطافتیں مہارت اور کامیابی سے پیش کی ہیں۔ ان میں محبت بھرے دل کا احساس ہے عشق کا میٹھا میٹھا درد ہے مشاہدے اور

تجربے کی سچائی ہے:-

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو
رو یا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح ۔ اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح
نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں۔ کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح
اک نئی آرزو کا خون ہوا۔ ہم ہیں اور تازہ سوگواری آج
تا سے آنکھیں جھپک رہے تھے ۔ تھا بام پہ کون جلوہ گر رات
ٹکٹکی لگائی ہے اب تو اس توقع پر۔ تا وہ گر ادھر دیکھیں مجھ کو دیکھتا دیکھیں
پھر کچھ صدائے پا سے دل مردہ جی اُٹھا۔ پھر جلوہ ریز کون قیامت خرام ہے

مومن کی محبت صرف ہجراں نصیب کی محبت نہیں۔ ان کی قسمت کے پیالے میں کامرانی کی شراب بھی ہے۔ وعدۂ فردا کو اُنھوں نے امروز سے بدلتے دیکھا ہے اور طالع ناساز ان کے لئے سازگار بھی ہوئے ہیں۔ ان کی محبت بھی یک طرفہ نہیں رہی، بلکہ ان کی نگاہوں کو باریابی، ان کی توجہ کو التفات، ان کے نالے کو رسائی کا خلعت ملا ہے۔ اسی لئے ان کے عشق میں تڑپ یا غم میں سُلگنے والی کیفیت نہیں۔ اُنہوں نے ایک سے دل لگا کر اسی کے سہارے زندگی نہیں بلکہ بلبل کی طرح مختلف گلزاروں میں زمزمہ پردازی کی ہے:-

شوق کم ملنے سے اندوہ فزا ہوتا ہے۔ ہائے پرہیز سے یہ درد سوا ہوتا ہے
پھر کسی نے مسکرا کے مجھے بے وفا کہا۔ کیوں کہہ رہا ہوں بندہ تو صاحب غلام ہے
جاں لوٹتی ہے پھر کر وہی عیش ہو نصیب۔ ہم میں وہ مست ناز ہے اور دور جام ہے
یارب وصال یار میں کیونکر ہو زندگی۔ نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ
تھی وصل میں بھی فکر جدائی تمام شب ۔ وہ آئے بھی تو نیند نہ آئی تمام شب
ایک ایک ادا سو سو دیتی ہے جواب اسکے۔ کیونکر لب قاصد سے پیغام ادا ہوتا
کبھی بیٹھے شب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

حافظ نے کیا خوب کہا ہے: "ہزار نکتہ درین کار و بار دلداریست"
محبت میں روٹھنے اور منانے، بدگمانی اور خفگی، انتظار اور تڑپ، اُلجھن اور بے بسی، رشک اور جلن کے بہت سے موقع آتے ہیں۔ مومن کے یہاں اس کے بہت سے پہلوؤں کے ساتھ ایسے لمحات کی تصویریں بھی ہیں۔ جب وہ اپنے دل سے باتیں کرتے ہیں۔ کبھی اپنے جذبات کا جایزہ لیتے ہیں کبھی اپنی بے بسی کا بیان کرتے ہیں

کیجیئے دل شوخی فطرت پہ جو آجائے۔ یہ تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ رام نہ ہوگا
روز کا بگاڑ آخر جان پر بنائے گا ۔ ان کو شوق آرائش دل ہے بدگماں اپنا
گر نہ تھی اے دل اس کے نزع کی تاب۔ ناحق اُمیدوار ہونا تھا
صبر کر صبر ہو چکا جو کچھ ۔ اے دل بے قرار ہونا تھا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے۔ ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
ہر دم عرق عرق نگہ بے حجاب ہے۔ کس نے نگاہ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ

معاملہ بندی

اس حسن پہ خلوت میں جو جاں کیا کم تھا۔ کیا جانیے کیا کرتا گر تو مری جا ہوتا
نہ کیوں کر بس ہوا جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر
وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر
ہے چھیڑ اختلاط بھی غیروں کے سامنے۔ ہنسنے کے بدلے روئیں نہ کیوں گدگدی سے ہم

مسلسل غزلیں

داستان شوق کے بیان میں مومن کی مسلسل غزلیں قابل توجہ ہیں۔ ان سے جہاں ایک طرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ایک ہی جذبے کو سلسلے سے طرح طرح بیان کرنا مقصود ہو تب بھی غزل تنگ دامن نہیں [illegible] اس مُبتلائے محبت کے جذبات کی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔ جسے بیان درد یا شکوۂ مہجوری کو اختصار سے ایک شعر میں کہہ دینے سے تسلّی نہیں ہوتی۔ اس کے پاس تو شکایتوں اور بدگمانیوں کا دفتر ہوتا ہے۔

وصل کی بات کب بن آئی تھی۔ دل سے دفتر بنا سے لوگوں نے
بات اپنی وہاں نہ جمنے دی ۔ اپنے نقشے جما لے لوگوں نے
کیا تماشا ہے جو نہ دیکھے تھے۔ وہ تماشے دکھا سے لوگوں نے
کر دیا مومن اس صنم کو خفا ۔ کیا کیا ہائے ہائے لوگوں نے

تم بھی رہنے لگے خفا صاحب ۔ کہیں سایہ مرا پڑا صاحب
ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب ۔ غیر اور تم بھلے بھلا صاحب
کیوں اُلجھتے ہو جنبش لب سے ۔ خیر ہے میں نے کیا کہا صاحب
کیوں لگے دینے خطِ آزادی ۔ کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب
ستم آزار و ظلم و جور و جفا ۔ جو کیا سو بھلا کیا صاحب

تعبیر

دسمبر ۱۹۵۶

طنز

شکوے شکایتوں ہی میں طنز کا پہلو نکل آتا ہے۔ توقع کے خلاف جب کچھ باتیں ہوتی ہیں تو چوٹ کھائی ہوئی فطرت انسانی لڑائی کو بربریت و وحشت سمجھ کر طنز کے تیر چلا کر اپنے زخموں پر مرہم رکھتی ہے۔ اپنے ہی گریبان پر زور چلا کر در پردہ مقابل پر چوٹ کی جاتی ہے۔ محبت کی نفسیات کا یہ لطیف پہلو مومن کے یہاں فراوانی کے ساتھ موجود ہے۔ فقروں اور لفظوں میں وہ ایسی نشتریت بھر دیتے ہیں کہ سننے والا تلملا اٹھے:۔

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے ۔ میں نے ہی تم سے بے وفائی کی
ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے ۔ تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی
مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ ۔ بدنامیِ عشاق کا اعزاز تو دیکھو
غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ ۔ آرزو ہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

طنز ہی کا ایک گوشہ نوک جھونک کرنے اور جلی کٹی سنانا ہے جس کے لئے شعرا نے غزل کے بجائے واسوخت کی الگ صنف ہی بنائی تھی۔ مومن نے واسوخت تو لکھے ہی ہیں، لیکن ان کی بعض غزلوں میں بھی یہ کیفیت ملتی ہے:۔

اب اور سے لو لگائیں گے ہم ۔ جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
بگڑے تو کریں گے اور سے صلح ۔ تجھ پر بھی یوں بنائیں گے ہم
گر تیری طرف کو بے قراری ۔ کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

مکرِ شاعرانہ

جگہ جگہ مومن نے بیان کا ایسا طرز اختیار کیا ہے جس میں اپنے فائدے کی بات محبوب سے اس پیرائے میں کہتے ہیں۔ کہ معلوم یہ ہو کہ اس سے دوسرے کی خیر خواہی مقصود ہے۔ اپنا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کو نیاز فتح پوری نے مکرِ شاعرانہ کا نام دے دیا ہے۔ یہ انداز بعض دوسرے شاعروں نے بھی اختیار کیا ہے، لیکن مومن کے یہاں اس کی مثالیں زیادہ اور بہت دلچسپ ہیں۔ ان سے کلام میں ایک طرح کی شوخی اور تازگی نظر آتی ہے:۔

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا ۔ جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں
بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا ۔ مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں
درباں کو آنے دینے پہ مت کیجئے قتل ۔ ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا
خواہشِ مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ ۔ دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوں گے
منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں ۔ اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

ان خصوصیات سے قطع نظر مومن کو لفظوں کے انتخاب اور طبیعت کی شوخی سے مروّجہ مضامین کو اس طرح ادا کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ کہ ان میں ایک نیا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے اشعار میں کبھی کبھی ایسی عمومیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کی شاعری کا مطمحِ نظر وسیع معلوم ہونے لگتا ہے۔ ان میں ہمہ گیری اور اپیل بڑھ جاتی ہے۔ اگر مومن کے یہاں ایسے اشعار زیادہ ہوتے تو ان کا درجہ آج زیادہ بلند ہوتا۔

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی ۔ آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے ۔ صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں
چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی ۔ ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے
تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں ۔ اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے
صبر بعد آسائش اس قلق پہ مشکل تھا ۔ عیش جاوداں نکلا رنج جاوداں اپنا

مومن کے مقطعے

تخلص کی مناسبت سے اردو کے بہت سے شاعروں نے گاہ گاہ ایسے مضامین نظم کئے ہیں جن سے مقطعوں میں ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ مومن نے یہ رعایت بہت زیادہ ملحوظ رکھی ہے۔ ان کے بیشتر مقطعے اس لطف کا نمونہ ہیں۔ کیونکہ ان کا تخلص مومن، زہد و پرہیزگاری، پارسائی اور شرع کی پابندی کے ہم معنی ہے اور عشق بازی، شراب خوری، بت پرستی استعارے کے طور پر ہی سہی اس کی بالکل ضد ہے۔ ان دونوں کو اکٹھا کر کے مومن نے اپنے مقطعوں میں ایک خصوصیت پیدا کر لی ہے:۔

ہو گئے نامِ بتاں سنتے ہی مومن بیقرار ۔ ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں
سن اے مومن یہ ایماں ہے ہمارا ۔ نہ کہنا کفر پھر عشقِ بتاں کو
عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن ۔ آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

ابہام

مضمون میں نئی بات پیدا کرنے یا سوچ کر اس میں نئے پہلو نکالنے کی کوشش مومن بھی کرتے ہیں۔ اوپر کے اشعار میں اس کی بہت سی اچھی مثالیں مل بھی جا سکتی ہیں۔ لیکن ان کے اشعار میں یہ عیب بھی ہو جاتا ہے کہ ان کے الفاظ اور اشاروں سے پورا مفہوم واضح نہیں ہوتا اور جب تک کوئی فقرہ نہ بڑھایا جائے۔

نہ شعر کے معنی سامنے آتے ہیں نہ تاثر۔ مثال کے طور پر :۔

ان سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی ۔ مجھکو مری شرم نے رسوا کیا

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے راز محبت چھپائے رکھنے کے لئے سب کے سامنے محبوب کی طرف نہیں دیکھا کیونکہ اس کا اندیشہ تھا کہ اگر ہماری نگاہیں ملیں تو جو عالم ہوگا اس سے لوگ ہماری محبت تاڑ لیں گے۔ لیکن یہی احتیاط میری رسوائی کا سبب بن گئی۔ کیونکہ یہ بات غیر معمولی ہے کہ سامنے ان کا ساپری جمال ہو اور کوئی ادھر نہ دیکھے۔ لامحالہ اس سے یہی نتیجہ نکالا گیا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ ورنہ عام قاعدہ تو یہ ہے کہ جب سامنے کوئی اچھی صورت آتی ہے تو نگاہیں اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ یہ پورا مفہوم ان دو مصرعوں سے واضح نہیں ہوتا طوالت کے خوف سے اس کی چند مثالیں دی جاتی ہیں :۔

نقد جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف۔ خون فرہاد سر گردن فرہاد رہا

گر یہی ہے لوگوں کا تو آجا کہ فلق سے۔ ہے لاش کہیں اور کہیں مدفن ہے ہمارا

مومن کا مخصوص طرز ان کے انفرادی عشق کا اظہار ہے۔ محبت کے فطری جذبے کو انہوں نے ابتذال سے دور رہ کر اس کامیابی سے پیش کیا ہے کہ اگر ہمارے نقادوں نے نازک خیالی، ندرت اسلوب، حسن ادا جیسے رسمی عنوانات سے مومن پر تنقید نہ کی ہوتی تو اردو غزل کے غیر فطری عشق کے متعلق بہت سے لوگوں کی غلط فہمیاں نہ بڑھتیں۔ مومن کے جذبات کا توازن ان کے احساسات کا خاص جوہر ہے۔ انہوں نے عورت سے محبت کی ہے۔ اس کے حسن پر فریفتہ ہوئے ہیں، اس کے جسم کی کشش محسوس کی ہے۔ چاہت کے اس عالم میں نفسیات انسانی جن رنگا رنگ احساسات کا مرکز بنتا ہے۔ ان کی ترجمانی مومن نے چابکدستی اور مہارت سے کی ہے۔ تجربے کی سچائی اور فن پر عبور نے ان کے تیور میں ایک نیکھا پن پیدا کر دیا ہے اور اسی انداز نے اردو غزل میں ان کو بلند مقام دلا دیا ہے۔

بزمِ تعمیر

"بزم تعمیر" کے قیام کو ریاست اور بیرونِ ریاست کے ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے مقتدر ادیبوں نے "بزمِ تعمیر" سے مکمل تعاون کا وعدہ کیا ہے۔ ریاست کے دُور دراز علاقوں سے بھی ادیبوں اور شاعروں کے پیغامات موصول ہوئے ہیں جن میں "بزم تعمیر" کے قیام کو سراہا گیا ہے۔ آیندہ سال مئی میں "بزمِ تعمیر" کے زیر اہتمام سرینگر میں ریاست اور بیرونِ ریاست کے ادیبوں کی ایک عظیم الشان کانفرنس ہو رہی ہے جس کے لئے ابھی سے تیاریاں شروع کی گئی ہیں۔ ایڈیٹر "تعمیر" بہت جلد "بزم تعمیر" کی تنظیم کے سلسلے میں ریاست کا دَورہ کر رہے ہیں۔

"بزمِ تعمیر" کی فیس داخلہ کے لئے آخری تاریخ ۱۵ جنوری مقرر کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد رکنیت قبول نہ کی جائے گی۔ پہلی فرصت میں فیس داخلہ ایک روپے آٹھ آنے ذیل کے پتے پر روانہ کیجئے :۔

ایڈیٹر تعمیر گورنمنٹ پریس سری نگر کشمیر

کشوری کول

حسینہ

میں جب اسپتال کی دوسری منزل سے نیچے اتری تو میں نے بہت سے نئے مریضوں کو دیکھا۔ ہوا مریضوں کی مایوسیوں سے بھاری ہو گئی تھی۔ سچ پوچھئے تو حسینہ سے میری پہلی ملاقات مریضوں کے اسی غول میں ہوئی۔

میں نہ جانے کیوں اُداس ہو گئی۔ اتنی ساری مریض عورتیں ان میں سے کوئی کسی کی بہن ہو گی اور کوئی کسی کی ماں ہو گی۔ کوئی کسی کی بیٹی ہو گی اور کوئی کسی کی بیوی ہو گی۔ کوئی کسی کی محبوبہ بھی ہو سکتی ہے؟

ان سبھوں کو ٹی بی نے نہ جانے کہاں کہاں سے کھینچ بلایا تھا۔ کیا بنے گا آخر ان گھروں کا جو ان کے بغیر سنسان لگ رہے ہوں گے؟ نہ جانے کہاں کہاں ان کمھلائے ہوئے پھولوں اور ان اُداس کلیوں کا انتظار ہو رہا ہو گا۔

مگر وُہ سب کی سب میری اُداسی سے بے خبر تھیں۔ انہیں اپنی اداسیوں ہی سے فرصت نہیں تھی۔ پھر بھلا وُہ میری اُداسی پر کیا دھیان دیتیں۔ ان میں سے کوئی لیٹی ہوئی لکڑی کی سفید چھت کو اس طرح دیکھ رہی تھی، جیسے اس کا انتظار کر رہی ہو۔ کہ یہ چھت پھٹ جائے اور اس کے اپنے مکان کے اوپر والا آسمان نظر آنے لگے۔ اور کوئی چپ چاپ بیٹھی شاید ان دنوں کو یاد کر رہی تھی جب وُہ بیمار نہیں تھی۔ جب اس کے تھوک کا رنگ لال نہیں ہوا تھا۔ جب وُہ گاؤں کی دوسری عورتوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس سکتی تھی۔ جب وُہ گھر کے لئے چشمہ سے پانی لا سکتی تھی ـــ جب وُہ اپنے گھر میں تھی اور جب گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتیں اس کے ہر طرف بکھری ہوئی تھیں۔

وُہ تمام کی تمام کسی نہ کسی کو یاد کر رہی تھیں۔ کسی کو سامنے والی پہاڑی پر بکھرے ہوئے رنگ برنگے بادلوں میں اپنی یادوں کے رنگ کی تلاش تھی۔ اور کسی کو بادلوں میں چھپی ہوئی پہاڑیوں میں . . . . . .

وُہ بھی ایک طرف بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ وُہ شاید بہت دور جا چکی تھی اور شاید یہ بھول چکی تھی کہ وُہ سینی ٹوریم میں ہے۔ میں رُک گئی۔ وُہ بہت خوبصورت تھی۔ میں اس کمھلائی ہوئی شکل کے پردوں کے اِدھر دیکھ رہی تھی اور وہاں بہاریں خیمہ زن تھیں، کلیاں ایک دوسرے سے سرگوشی کر رہی تھیں۔ اور ہوا کلیوں کو چھو چھو کر بھاگتی پھر رہی تھی . . . مگر اس وقت تو وُہ بالکل اس میدان کی طرح ویران نظر آ رہی تھی جہاں سے قافلے نے اپنے خیمے اُٹھا لئے ہوں۔ چولھوں کی راکھ اور خیموں کے لنشا نات کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے ـــ ہاں وہاں کبھی کیف و مستی کا قیام رہا ہو گا۔ اور اس کے ان رخساروں میں گڑھے سے پڑے ہوئے تھے ـــ شراب گر چکی تھی اور پیالے خالی رہ گئے تھے!

میری آواز پا پر اس نے اپنی لمبی لمبی پلکوں کی چلمن اُٹھا دی۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں گہری اُداسی لہریں لے رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وُہ چونک پڑی۔

"آپ . . . ؟"

میں اس کی گھبراہٹ دیکھکر مسکرا دی۔

" مجھ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس ہونٹوں پر مسکراہٹ جیسی کوئی چیز آ گئی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" یہ سوال میں نے کیا۔ کیونکہ وُہ تو شاید

مسکرانے کی کوشش ہی کر کے تھک گئی تھی۔

"حسینہ"

اس ایک لفظ کے جواب میں ایک پوری کہانی تھی۔ میں اس کی آواز کے ننھی ننھی موجوں پر دور تک بہتی چلی گئی — حسینہ! اُس ایک لفظ میں وہ سارے لاڈ پیار چھپے ہوئے تھے۔ جنہوں نے اس کے بچپن میں اسے دھوپ سے بچایا ہوگا۔ اور پھر جب وہ جوان ہوئی ہوگی تو نہ جانے کتنے دل دھڑک اُٹھے ہونگے اور آرزوؤں کے نہ معلوم کتنے بیابانوں میں بہار آگئی ہوگی۔ . .

"آپ یہاں کیا کام کرتی ہیں"؟ میں اس سوال پر چونک پڑی۔ اس کے نام کے طلسم سے باہر آگئی۔

"کیا آپ ڈاکٹر ہیں"؟

میں اس کی معصومیت پر ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔

"نہیں بہن۔ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ میں بھی تمہاری ہی طرح ایک مریض ہوں"۔ میں نے کہا "میں اوپری منزل میں رہتی ہوں"۔

"آپ بیمار ہیں؟" اسے بڑا تعجب ہوا۔

"ہاں" میں مسکرائی۔ "تم بھی جلدی ہی اس برآمدے میں چکر لگا سکوگی"۔

"میں کیا چلوں پھروں گی"۔ اس نے گہرے اداس لہجہ میں کہا۔ "میں تو یہاں مرنے کے لئے آئی ہوں"۔

"اسپتال میں لوگ مرنے کے لئے نہیں آتے۔ اور پھر تم تو کوئی ایسی بیمار بھی نہیں ہو . . . . . "

میں نے اسے دو چار چھوٹی سچی کہانیاں سنا ڈالیں کہ کون کس حالت میں آیا تھا اور کیسا بھلا چنگا ہو کر گیا۔ " . . . . اس خیال کو دل سے نکال دو"

"ہو سکتا . . . "! کھانسی نے اس کی بات کاٹ دی۔ بہت سارا بلغم تھوک کر وہ نڈھال ہوگئی۔ میں گھبرا گئی۔

"کیا بات ہے"؟ میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں"۔ وہ چند لمحوں کے بعد بولی "پتہ نہیں اس بیماری سے کب نجات ملے گی۔ شاید کبھی نہیں ملے گی۔ دن کے بعد رات آتی ہے دھوپ چھاؤں میں بدل جاتی ہے اور — زندگی کے بعد موت ہی آتی ہے"۔

"ہاں۔ مگر دن کے بعد رات آتی ہے۔ زندگی کے بعد موت آتی ہے یہ کبھی نہ سوچو کہ ابھی تم زندہ ہو"۔ میں نے کہا۔ اس نے پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ اب مجھ سے وہاں رکا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ پھر ملنے کا وعدہ کرکے میں وہاں سے ٹل گئی۔

میں کیا جانتی تھی کہ مجھے اس زرد سی خوبصورت لڑکی کے بارے میں ایک دن لکھنے پر مجبور ہو جانا پڑے گا۔ اس کے بارے میں لکھنے کا خیال کوئی ایک دم سے نہیں آیا۔ رفتہ رفتہ آیا۔ جیسے کوئی چراغ جلائے تو اس کی لَو دھیرے دھیرے تیز ہوتی ہے اور پھر ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو جاتی ہے۔

اس روز میں حسینہ سے ملنے کے بعد اپنے کمرہ میں آگئی میں نے اپنے ادھورے کینوس کی طرف دیکھا — کیا زندگی سچ مچ اس ادھورے کینوس کی طرح ہے۔ یہ تصویر کیا سدا ادھوری ہی رہے گی؟ کیسے فنکاروں نے اسے ہاتھ لگایا۔ مگر تکمیل شاید زندگی کی ضد ہے . . .

میں نے پھر اپنے ادھورے کینوس کی طرف دیکھا اور نہ جانے کیوں مجھے ہنسی آگئی۔ شاید اس لئے ہنسی آئی ہو کہ مجھے اپنے اس کینوس کے لئے مشکل سے ایک ماڈل ملا تھا! کشمیری لڑکیوں کو ماڈل بنانا سخت دشوار کام ہے۔

اب اس سینی ٹوریم میں جب یہاں کی مریض عورتیں مجھے دیکھ لیتی ہیں تو آپس میں سرگوشیاں کرنے لگتی ہیں۔ میں ان سرگوشیوں کو خوب سمجھتی ہوں۔ مگر کیا کروں۔

ایک کہے گی "یہی ہے جو تصویریں بناتی ہے"؟ اور یہ کہہ کر وہ سر سے کمبل اوڑھ لے گی کہ کہیں جھٹ سے میں اس کی تصویر نہ بنا لوں!

دوسری بولے گی "مگر تو نے منہ کیوں چھپا لیا"؟

وہ منہ چھپائے چھپائے ہی کہے گی "اگر اس نے میری تصویر

بنالی۔ تو یہ اسے ہندوستان بھیج دے گی۔ اور تب سسرال والے مجھے نکال دیں گے۔ اور میرا خاوند مجھے طلاق دے دیگا۔"

یہ باتیں سُنکر میں ہنس ہی سکتی ہوں۔ ہنس دیتی ہوں اور اپنے کمرہ میں واپس چلی آتی ہوں۔ اور وہاں دیر تک یہ سوچا کرتی ہوں کہ کیا اپنے وطن میں فن کار ہونا بُرا ہے کہ لوگ اسے دیکھکر منہ چھپا لیتے ہیں . . . . .

ایک روز میں اپنے کمرہ کی کھڑکیوں سے رنگ برنگے بادلوں کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ وُہ شریر بچوں کی طرح ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے سامنے شنکر اچاریہ کی پہاڑی مسکرا رہی تھی۔ کہیں دھوپ تھی۔ کہیں سایہ تھا۔ کبھی بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا مندر کے کلس کو چھو کر بھاگ جاتا تھا . . . . . .

"بہن جی ـــــ"

میں چونک پڑی۔

"ارے تم؟" حسینہ کو دیکھکر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ وُہ اس وقت بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا کھویا ہوا رنگ لوٹنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ان دیکھا قطرہ قطرہ شراب گرانے لگا تھا۔ اور اس کے رخساروں کا سیال ختم ہو چکا تھا۔ اور شگوفے کھلنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ بہاروں کے قافلے چل چکے تھے۔ خوشبو مچلنے ہی والی تھی۔ اور اس کے گہرے سیاہ بالوں کی اوٹ سے ایک آفتاب نکلنے کی کوشش کر رہا تھا . . . . اور اس کے گلابی کپڑوں نے اسے کسی اور دُنیا کی مخلوق بنا دیا تھا ـــــ

وُہ میری تیز نگاہوں کی آنچ نہ برداشت کر سکی۔ شرما گئی۔

اس دن کے بعد میں اسے بالکل بھول گئی تھی۔ اور میں اپنے آپ سے خفا بھی ہوئی۔ حسینہ ایسی چیز نہیں تھی جسے کوئی مصور بھول جائے۔ وُہ بیٹھ گئی۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اس روز ہماری دوستی استوار ہوئی۔ میں اس سے روز ملنے لگی۔ وُہ روز میرے کمرہ میں آنے لگی۔

موسم بدلا۔ مریض سرینگر سے ٹنگمرگ بھیجے جانے لگے۔ میں بھی انہیں مریضوں میں سے ایک تھی۔ میرے کمرہ میں ایک ہنگامہ تھا۔ بہت سی عورتیں میرے کمرہ میں اکٹھا تھیں۔ ان کا ڈر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا! وُہ سب کی سب ایک حد تک اُداس تھیں۔

"اب میری اسکرین کی رپورٹ کون پڑھے گا؟" ایک نے کہا۔

"میں نے تو یاد کر دیا ہے"۔ دوسری بولی"۔ ایک لفظ لکھا ہو تو مطلب ہوتا ہے کہ وہی حال ہے۔ اور اگر بہت سارا لکھا ہو تو اس کے معنی ہیں کہ کچھ گڑبڑ ہے"

اس کی اس معصومیت پر میرے کمرہ میں ایک قہقہہ لگا۔ اس نے گھبرا کر بات بدلی۔

"اب ایک بار یہ بتائی جاؤ کہ میری کیوٹی کا کیا حال ہے؟ کیا میں یہاں سے جانے کے بعد شالی نہیں کوٹ سکوں گی؟ گھر کا کام کاج نہیں کر سکوں گی؟ اور لوگ یہ کیوں کہتے ہیں کہ ایسے بیمار کو الگ تھلگ رکھنا چاہیئے۔ میرے گھر میں دو ہی کمرے ہیں اور گیارہ آدمیوں کا کنبہ ہے۔ میں الگ تھلگ کیسے رہ سکتی ہوں؟"

میں نے کہا۔ "ایسا تو نہیں ہے۔ ہاں پھر بھی خیال رکھنا چاہیئے"۔

"خیال رکھکر بھی کیا کرونگی۔ گھر ہی چھوٹا ہے۔ اب ستر کمروں کا محل کہاں سے لاؤں"۔ وُہ بولی" پھر ہم مسلمان تو برتن باس بھی الگ نہیں رکھتے۔ ہم لوگ چھوت مانتے ہی نہیں۔ ہمارے پیغمبر صاحب تو کوڑھیوں کے برتن میں کھا لیا کرتے تھے۔ سب قسمت کا کھیل ہے۔ ہمارے حضرت نے کہا ہے کہ سب کو مل جل کر کھانا چاہیئے۔ اور وُہ خود کھایا کرتے تھے"۔

"مگر وُہ تو پیغمبر تھے۔ تم کوئی پیغمبر ہو؟" اس کے علاوہ میں کیا کہتی میں اسے دیر تک سمجھاتی رہی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

"خدا کارساز ہے بہن"۔ اس نے اس یقین سے کہا کہ میں اس کا مُنہ دیکھتی رہ گئی۔ میرے پاس اس کے اس یقین کا کوئی جواب نہیں تھا۔

پھر ایک ایک کرکے سب چلی گئیں۔ صرف وُہ رہ گئی۔ وُہ چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ اور میں سوچ رہی تھی کیا اسے مجھ سے کچھ نہیں کہنا ہے مگر میں بھی کچھ نہیں بولی۔ میں کمرے میں بکھری ہوئی تصویریں اکٹھا کرنے لگی۔ جب میں نے آخری تصویر بھی لکڑی کے بکس میں رکھ دی۔ اور بکس کا پٹ بند کرکے ہاتھ جھاڑنے لگی تو وُہ رو پڑی۔ بالکل بچوں کی طرح ـــ

"اب ہم کہاں ملیں گے"؟

"دُنیا بہت چھوٹی ہے پگلی ہے"۔ میں نے اپنے آنچل سے اس کے آنسو پونچھ کر کہا۔

"نہیں۔ نہیں ـــ" وُہ پھر رونے لگی "کہاں کشتواڑ اور کہاں سرینگر"

میں نے بھی ٹھیک ہی کہا تھا کہ دُنیا بہت چھوٹی ہے۔ مگر اس نے بھی ٹھیک ہی کہا کہ کہاں کشتواڑ اور کہاں سرینگر ـــ میں اُداس ہو گئی۔ میں نے پلکوں تک آجانے والے آنسوؤں کی خوشامد کی۔ واپس چلے جاؤ۔ خُدا کے لئے واپس چلے جاؤ . . . . میں جانتی تھی کہ اگر میں رو پڑی تو پھر حسینہ کے آنسو کون پونچھے گا!

میں شاید اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ رہی تھی۔ مجھے اس کا افسوس زیادہ تھا کہ آخر میں نے اس کی تصویر کیوں نہیں بنائی۔ ہاں کیوں نہیں بنائی۔ میں نے اسے اپنے رنگوں کے لباس کیوں نہیں پہنائے۔ میرے برش کی انگلیوں نے اس کے بال کیوں نہیں سنوارے . . . مگر اب تو میں جا رہی تھی۔ بہت دور نہیں۔ پھر بھی شاید بہت دور . . . . بہت بہت دور۔ شاید کئی افقوں کے پار۔

"اپنے خُدا پر بھروسہ رکھو"۔ میں اس سے صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

ایمبولنس کے ڈرائیور کو کیا معلوم تھا کہ مصوّر کو ایک شاہکار نے روک رکھا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں حسینہ سے رخصت ہو رہی ہوں۔ وُہ ہارن دینے لگا اور مجھے اس کی آواز سُن کر حسینہ سے رخصت ہو جانا پڑا۔ میں ایمبولنس میں بیٹھ گئی۔ میری پیاری تصویریں بھی میرے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ اور ایمبولنس کراہ کر ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال کی طرف چل پڑی۔

میں نے اپنی ساتھی بیمار عورتوں کو رخصتی سلام کیا۔ مگر حسینہ نے مجھے رخصتی سلام نہیں کیا۔ وُہ بس چُپ چاپ میری طرف دیکھتی رہی اور اُس کی لمبی سیاہ پلکوں پر نہ جانے کون سی چیز چمک چمک کر غائب ہوتی رہی۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ ایمبولنس کی گھڑگھڑاہٹ نے اسے پکارا۔ وُہ چونک پڑی۔ مگر اس نے چونک کر مجھے آخری سلام نہیں کیا۔ وُہ تیزی سے دوسری طرف مُڑ گئی، اور میں صرف اتنا دیکھ سکی کہ اس کے دونوں ہاتھ اُٹھے اور اس کی مخروطی انگلیوں نے اس کے چہرے کو چھپا لیا۔ اور اس کے کندھے ہلنے لگے تھے

. . . . . . شاید حسینہ نے ایمبولنس کے گذر جانے کے بعد اس راستہ کو دیر تک دیکھا ہو۔ جس پر پہیوں کے نشان تھے اور نہ گردِ کارواں

"گلمرگ میرے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھا۔ میں اس سینی ٹوریم میں پہلے بھی کئی بار آچکی تھی۔ میں ہر طرف گردنیں اُٹھائے ہوئے پہاڑوں اور ہرے بھرے چیڑ کے درختوں اور اس درنگ کی طرف جانے والے پُر پیچ راستوں اور سامنے سے نظر آنے والے گلمرگ اور بابل کینال کی رس بھری آواز کو اچھی طرح جانتی تھی۔ یہ مناظر مجھ سے سرگوشیاں کر چکے تھے اور میں بھی گہری راتوں کی خاموشی میں ان سے نہ جانے کتنی بار کتنی باتیں کر چکی تھی۔ میرے برش نے انہیں چھوُا تھا ـــ پھر بھی ایمبولنس نے جب مجھے اس خوبصورت طلسم کے قریب پہنچایا تو میں پھر کھو گئی۔ بالکل پہلی بار کی طرح کھو گئی۔ میں یہ بھول گئی کہ مجھے ٹی بی ہے۔ مجھے صرف یہ یاد رہ گیا کہ میں مصوّر ہوں کر . . . . کاش میں ان ننھے ننھے جھرنوں کی گنگناہٹ کو بھی اپنے کینوس کے قریب لا سکتی . . . .

سینی ٹوریم میں بھی دن گذر ہی جاتے ہیں۔ گذرنے لگے۔ سینی ٹوریم بھی ایک بڑا آئینہ ہوتا ہے کہ گذرنے والے دنوں کا احساس بھی نہیں تھا۔

ایک روز مجھے اچانک حسینہ کا خط ملا۔

اس نے لکھا تھا۔

. . . . . وُہ اسپتال سے بھاگ گئی جسے خُدا پر بڑا بھروسہ تھا۔ مگر کوئی تین مہینوں کے بعد وُہ پھر نظر آئی۔ اس کے ایک بچے کو بھی ٹی بی ہو چکی ہے۔ دوسرا بچہ گود میں تھا۔ وہی بچہ جسے ہم کھلایا کرتے تھے مجھے تو خُدا نہ کرے وُہ بھی بیمار ہی لگتا ہے . . . . .

. . . . ایک ہفتہ کے بعد وُہ پھر آئی۔ اس بار وُہ رہنے آئی تھی اس کا خاوند بھی داخل ہو گیا ہے۔ میں اس خط کو پڑھ کر نہ جانے کیوں رو پڑی۔ کاش ہمیں پیغمبروں اور دیوی دیوتاؤں کی باتوں کا لفظی ترجمہ یاد رکھنے کا اتنا شوق نہ ہوتا۔ کاش . . . . . .

پھر حسینہ مجھے برابر خط لکھنے لگی۔ وُہ میرے بہت قریب تو تھی

(بقیہ بر صفحہ ۳۱)

گلمرگ کا ایک حسین منظر

پہلگام ۔ جنت واعظ سے بھی بڑھکر کہیں حسین مقام

شہر کے ہنگاموں

ہمارے دیہات

چرواہ

دیہاتی وزیراعظم سے براہ راست اپنی

دھان کے کھیتوں میں خود رو گھاس پھوس اکھیڑنے کے عمل کو نیندہ کہتے ھیں

خوشہ چینی- جبہ ماوں کے رسیلے لعلوں اور ... کے پھولوں کی سر زمین پانپور

سکلات کا حال بیان کر رہے ھیں

دھان کو خوشوں سے الگ کرنیکا عمل— "چھمبن"

لداخ میں بودھوں کی عبادت گاہ گنپا

ــب اجتماع

ہی شاید سرینگر سے ٹنگمرگ کے معمولی فاصلہ نے مجھے بھی اس کے قریب پہنچا دیا تھا۔ مجھے یہ سُن کر بہت خوشی ہوئی تھی کہ وُہ بہت ہی تیزی سے اچھی ہو رہی ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ مہینے دو مہینے میں وُہ گھر بھی چلی جائے۔ یہ بتانا تو میں بھُول ہی گئی کہ اس کا بھی ایک چھوٹا سا گھر تھا ــــ اور پھر گھر تو ہوتا ہی ہے۔ یہ کون سی بتانے کی بات ہے۔

تو اب وُہ گھر چلی جائے گی۔ میں نے سوچا اور پہلی بار مجھے اس کا احساس ہوا کہ کشتواڑ سرینگر سے کتنی دُور ہے ــــ یا ایک گھر دوسرے گھر سے کتنی دُور ہے۔ وُہ تو ٹی بی نے اسے میرے قریب کر دیا تھا۔ ورنہ وُہ کشتواڑ میں مر جاتی اور میں سرینگر میں نہ اسے پتہ چلتا کہ سرینگر میں کوئی کشوری بھی رہتی ہے اور نہ مجھے پتہ چلتا کہ کشتواڑ میں کوئی حسینہ ہے . . . . . سچ مچ یہ زندگی بھی کتنی عجیب اور کتنی پُر پیچ ہوتی ہے۔ ایک سرا ہاتھ آتا ہے تو دوسرا سرا گم ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا سرا ہاتھ آتا ہے پہلے کا پتہ نہیں چلتا اور کبھی کبھی تو دونوں سرے غائب ہو جاتے ہیں اور آدمی اپنے آپکو معلق سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ آسمان بھی بہت دُور ہوتا ہے اور زمین بھی نزدیک نہیں ہوتی . . . . .

اس کے گھر جانے کی خبر سُن کر یہ زخم اور ہرا ہو گیا کہ میں اس کی تصویر نہ بنا سکی۔ کہہ کر تو دیکھنا تھا۔ کیا معلوم وُہ مان ہی جاتی مگر میں اپنے اس خیال پر خود ہی ہنس ہی پڑی۔ نہیں نہیں۔ کشمیر کی لڑکی ماڈل نہیں بن سکتی۔ اس کی باہیں اس کے ڈھیلے ڈھالے فیرنوں میں چھپی رہتی ہیں۔ بال کسابوں میں اور چہرہ پر ایک ازلی شک اور ایک ازلی مایوسی کا نقاب پڑا رہتا ہے۔ کیا پتہ یہ نقاب کب چاک ہوگا ــــ یہ ازلی نقاب چاک ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا ہے . . . . .

حسینہ کا ایک خط اور ملا۔ اس نے لکھا تھا۔

. . . . میں کل گھر جا رہی ہوں۔ میں بالکل اچھی ہو گئی ہوں۔ مگر میں نے تمہاری محبت دیکھ لی۔ تم نے تو میری ایک تصویر بھی نہیں بنائی۔ کہہ کر تو دیکھا ہوتا . . . . . .

میں پُورا خط پڑھ ہی نہ سکی۔ یہ کیا ہوا۔ میں کیسی آرٹسٹ ہوں کہ ایک آنے والے انقلاب کی چاپ بھی نہ سُن سکی؟ میں کیسی آرٹسٹ ہوں کہ . . . . . مگر سچ پوچھئے تو حسینہ کی یہ بغاوت قطعاً اچانک تھی۔ میں کیا کوئی بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کشمیر بدل رہا ہے . . . . . . اس کے معنی یہ ہیں کہ کشمیری عورتیں اپنا کفن چاک کر رہی ہیں۔ کینوس کہاں ہے لاؤ میں کفن چاک کرتی ہوئی اس کشمیری عورت کی تصویر بنانا چاہتی ہوں۔ تاکہ کل کے مورخ کو معلوم ہو سکے کہ یہ کفن کہاں سے چاک ہونا شروع ہوا تھا۔ اور کیسے چاک ہوا اور یہ ایک ابدی نیند میں سوئی ہوئی شہزادی کیسے جاگ پڑی . . . . .

میں اپنا سلف پورٹریٹ بنانا چاہتی ہوں۔

بقیہ بزمِ خواتین (شادیوں کی اہمیت)

اس وقت تک بیوی صاحبہ کی عُمر کافی آگے دوڑ جاتی تھی اور شوہر صاحب "مُنہ" دیکھتے ہی رہ جاتے تھے ــــ!

ینڈگو تہذیب میں شادیوں کا کوئی مذہبی پس منظر نہیں ہوتا تھا۔ شادی کے بعد عورتوں کو ہنسنے کی اجازت نہیں تھی۔ شوہر کے سامنے ان کا مُسکرانا بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ گھر میں ایک خاص قسم کی گہری سنجیدگی (High Seriousness) قائم رہتی تھی۔

کاردک تہذیب میں بھی ایک دلچسپ بات اس سلسلہ میں ملتی ہے۔ شادی کی اہمیت اس لئے تھی کہ اس سے خرید و فروخت کا ایک بازار لگتا تھا۔ قیمت ادا کر کے مرد کسی بھی لڑکی کو خرید لیتا تھا اور اس سے شادی کر سکتا تھا۔ اگر کسی مرد کو کوئی عورت پسند آگئی اور اس کے پاس پُوری قیمت نہیں ہوئی تو وہ نصف قیمت ادا کر کے عورت کو گھر لاتا تھا۔ اس طرح عورت "قسط" پر آتی تھی۔ جب تک مرد پُوری قیمت بازار میں ادا نہیں کرتا تھا۔ اس عورت کی غلامی کرتا تھا۔ جس روز پُوری قیمت ادا ہو جاتی تھی اس روز وہ اس عورت کا آقا بن جاتا تھا۔ گینیا میں ایک وقت ایسا بھی تھا کہ مرد ایک عورت سے شادی کے بعد کچھ اور عورتوں کو بھی بیوی کی طرح گھر میں رکھتا تھا جب اس مرد کا انتقال ہوتا تھا تو پہلی بیوی کے علاوہ ساری عورتیں قتل کردی جاتی تھیں۔ دُنیا کے قدیم سماج میں یہ زندگی کتنی عجیب تھی!

دینا ناتھ نادمؔ

غزل

(کشمیری)

صُبحدم یُژ چھُو پرِہ ژھیوُن گاشہِ تارک
مشتھ گومُت چھو شاید کاروانس
چھُولُو گمُت لاَرِکِنِ بے چارِہ دارُک
ینِن ژہارن دِوَن وُنِ آسمانس
گُلالن وُچھ تہ سینس گوس ترِٹھ داغ
تیھر شبنم بنِتھ وولُن در آغوشس
زمینن دُعا کرُوس "نوُہ نسَ کُنس باغ"
تھرُن دُکہ وِیرہ پیٔیے لوُرُن تھنۓ پوشس
نبس پیٔٹھ اوس کُنُ بوُن وُتھ سیٹھاہ گو
کھوُچیر تھزرُک ژولُس گلزارہ سیٔ منٛز
گُلن سیٔت گُل، تہ نوِہ سیٔت مُوختہ سپدیو
حیاتُک پےٚ لبُن مِلہ ژارہ سیٔ منٛز
یمس گومیُول لکُن سیٔت بڈنھ سوُی پوُک
بِدول لیُس رُود منٛزِل واتہ نےٚ تھوٗک

(ترجمہ)

صُبح صادق کے وقت ایک ستارہ اُفق پر تنہا ہے۔
شاید کاروان اسے بھول کر چلا گیا ہے۔
جیسے کوئی اجنبی پردیس میں ہو۔
اور کسی ھمدم کی تلاش میں سرگرداں
گُل لالہ کی نظر اس پر پڑ گئی اور اُس کا جگر داغدار ہو گیا۔
اُس نے بے چارے شبنم کی صورت میں اپنی آغوش میں سمو لیا۔
دھرتی نے دُعا دی "کہ اس اکیلے کا چمن سدا شاداب رہے"۔
کیا ریوں میں غنچوں کی گود پھولوں سے بھر گئی۔
ستارہ آسمان پر تنہا تھا نیچے آکر شناساؤں سے گھُل مِل گیا۔
گلستان میں آکر بلندی کے کھوکھلے وقار کی حقیقت کھُل گئی۔
پھُولوں کے ساتھ پھول بنا اور شبنم کے ساتھ مُوتی۔
اس نے زندگی کا سُراغ جذب باہم میں پا لیا۔
جس نے عوام کیساتھ تعلق قائم رکھا، اُس کے قدم عروج کی طرف اُٹھتے گئے۔
جو ان سے بے نیاز رہا۔ وہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی تھک ہار کر بیٹھ گیا۔

اکبر لداخی

لداخ کا لوک ادب

اپنے مخصوص جغرافیائی اور سماجی حالات کی وجہ سے ریاست کا یہ حصّہ ثقافتی طور پر اپنی انفرادیت لئے ہوئے ہے اور اُس کلچر کی پوری پوری عکاسی وہاں کا لوک ادب کرتا ہے — فنونِ لطیفہ زندگی اور اپنے گرد و پیش کے اُن ہی مادی حالات اور حقائق کا عکس یا اُن پر تنقید ہوتے ہیں جس سے انسانی ذہن متاثر ہوا ہو، کیونکہ انسان اپنے آپ کو اُس ماحول سے علیٰحدہ نہیں کر پاتا جس میں اُس کی نشو و نما ہوئی ہو — جب انسان نے اپنے کام کو ہلکا کرنے، محنت کے جذبے کو اُبھارنے اور جسمانی حرکات میں ایک توازن کی ضرورت محسوس کی، تو رقص، موسیقی، اور شاعری نے جنم لیا اگر ہم اس سائنٹفک نقطۂ نظر سے لداخ کے لوک ادب کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دُنیا کے باقی ملکوں کی طرح لداخ کے لوک ادب کا آغاز بھی اُنہی گیتوں سے ہوا، جو پیداوار سے تعلق رکھنے والے کام کو ہلکا اور آسان کرنے، محنت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور محنت کرنے والے جذبات کو زیادہ محنت کے لئے اُبھارتے ہیں۔ بوتے وقت، کٹائی کے موقعوں پر یا جب کبھی دو تین سے زیادہ مرد عورت ملکر کام کرتے ہیں۔ اُس وقت جو گیت گاتے ہیں یا شبد اُٹھاتے ہیں، اُن میں انہی جذبات خواہشات اور ضروریات کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ مثلاً جب بیج بوتے ہیں تو جانوروں کی تعریف اور اچھے فصل کی اُمیدوں سے بھرپور گیت گاتے ہیں اور جب کٹائی ہو تو

دیکھو نا بالیاں کیسے چمک رہا ہے
جیسے سونا دمک رہا ہو
اور میری نیم کھائی میں فولادی درانتی
اتنی تیز ہے جیسے جھرنے کا تیز دھارا

جہاں اپنے جوش اور فصل کی خوبصورتی کی تعریف کرتے ہیں، وہاں اُن بھوت پریتوں کو کاٹ ڈالنے کا عزم بھی رکھتے ہیں جو پرانے لوگوں کے قول کے مطابق بڑے کھیتوں پر قابض ہوتے ہیں۔ اسی طرح اُن جانوروں کی تعریف اور عمر درازی کے لئے دُعا کرتے ہیں جو بھوسہ اور اناج کو الگ کرنے کے لئے کام میں لگے ہوتے ہیں۔

ارے او کنارے والی تیز گام قدم تو بڑھا
میرے دیوتاؤں کے بانے تم سب کی عمر دراز ہو!

کام سے متعلق ان گیتوں میں ہمیں جہاں ضروریاتِ زندگی کے لئے کشمکش اور آگے بڑھنے کے عزم کا پتہ چلتا ہے وہاں شادی بیاہ کے موقعوں پر جو گیت گائے جاتے ہیں، اُن میں وہاں کے سماجی حالات کی سیدھی اور سیدھی سادی تصویر ملتی ہے۔

اس مختصر مضمون میں طویل اقتباسات پیش کرنا ممکن نہیں، اس لئے اپنے خیالات کی وضاحت کے لئے اِدھر اُدھر کے مختصر اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کرونگا جب براتی دلہن کے گھر کے سامنے پہنچتے ہیں، تو انہیں روک دیا جاتا ہے، اور گھراتی پارٹی میں سے ایک آدمی جسے ایسے موقعوں کے لئے ہزاروں اشعار زبانی یاد ہوتے ہیں گا کر پوچھتا ہے "ارے اتنے سارے بھٹے حال انسان، تھکے ماندے گھوڑوں پر سوار ہمارے گاؤں کیطرف کیوں آئے ہو؟ کیا بات ہے؟" تب براتی پارٹی کا لیڈر گا کر جواب دیتا ہے "ہم نیک خبر لے کے آئے ہیں۔ بڑے، بوڑھے، عزیز، رشتہ دار سب سن لیں ہم تو آپ کے گھر میں جو چاند روشن ہے اس کی روشنی کو دُور تک پھیلانے کے متمنی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے رشتے آپس میں مضبوط

ہوں؟- اسی طرح کے درجنوں سوالات کا جواب دینے کے بعد اور ضروری رسومات ادا کرنے پر جب اندر پہنچتے ہیں تو پھر اسی قسم کی سوالات کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔ مثلاً یہ قالین جس پر اژدہا کی تصویر ہے کس کے لئے ہے؟ شیروں کی تصویر والے قالین پر کون بیٹھے گا؟ پھولدار نمدہ کیوں بچھایا ہے؟ یہ چبوترا کس کے لئے ہے وغیرہ؟ اور جواب میں جو گیت گائے جاتے ہیں وہ اس نظام کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں جس میں لداخی آج سے کچھ سال پہلے تک زندگی بسر کرتے تھے۔ "اژدہا والا قالین لامہ کے لئے ہے شیروں سے منقش قالین پر راجہ بیٹھے گا۔ یہ پھولدار نمدہ خاندانی لوگوں کے واسطے بچھایا ہے اور چبوترے پر اپنا گڈریا بیٹھے گا" اسی طرح جب لڑکی کی جدائی کا وقت آتا ہے تو لڑکی اپنے عزیزوں سے گلے ملکر روتی ہے اور مختلف گیت گاتی ہے۔ مثلاً جب بھائی سے جدا ہوتی ہے۔ " بھائی تم میرے گلے کا ہار ہو، میں تمہاری بہن دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے جا رہی ہوں اور اگر قسمت نے یاوری نہ کی تو پھر تیرے سوا کس کا دروازہ میرے لئے وا ہوگا وغیرہ۔

لداخ کے لوک گیتوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لداخ کے لوک گیتوں میں محبت کا درد، جدائی کی کسک، حسن کے تذکرے کے ساتھ ساتھ انسان دوستی کے جذبات بھی موجزن ہیں۔ رنگ و نسل، مذہب و ملت، محبت کے پاک رشتے کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ لداخ میں اب بھی ایسے کتنے گیت گائے جاتے ہیں، جن میں عورت دوشیزگی کو جھگڑے دامن بچنے کے سانتی اصولوں پر بڑی حقارت سے لات مارتی ہے اور عورت کھلے بندوں اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے۔

آنا ہے تو آؤ ورنہ مجھے رخصت کرو اے ناراں کے پھول
تم جب کشمیر سے لوٹو تو میں کھڑ ول پل پر انتظار کرونگی
اے ناراں کے پھول
تمہیں کوئی چیز نشانی کے طور پر بھیجتی لیکن کوئی ایسی چیز نہیں جو تمہارے شایاں شاں ہو۔
اگر دل نکال کر تحفہ بھیجوں تو میری جوانی ختم ہو جائے گی اے ناراں کے پھول

یا

جب کبھی پر بھوت کا سایہ پڑے تو محلے کے ملا کو بلاتے ہیں۔
لیکن مجھ پر جس جن کا سایہ ہے اُسے تیرے سوا کوئی نہیں بھگا سکتا۔

ایک بودھ عورت کسی مسلمان سے محبت کرتی ہے اور وہ اُسے شادی کرنا چاہتی ہے اپنی خواہش کا اظہار یوں کرتی ہے:-

لوگ چاہتے ہیں کہ میں معمول کے کھانے پر گذارہ کروں
لیکن میں چاہتی ہوں کہ سفید چاول کھاؤں
پد مالنزس چاہتی ہے کہ سفید چاول کھائے
لوگ چاہتے ہیں کہ میں پیراک پہن کر رہوں
لیکن میں لٹھے کا ڈوپٹہ پہنا چاہتی ہوں
مالنزس چاہتی ہے کہ لٹھے کا ڈوپٹہ پہنے

یا

مانا کہ میں سندھ سے لایا ہوا مور کا پر
اور تم کشمیر سے لائے ہوئے زعفران ہو
یہ سچ ہے کہ جنم بھومی مختلف ہے
لیکن پھر بھی نمگل پونگپا میں تو ایک ساتھ مل جاتے ہیں۔

نمگل پونگپا اُس مقدس برتن کو کہتے ہیں جس میں زعفران گھول کر رکھتے ہیں اور مور کا پر اس میں زینت اور برار تھنا کے وقت چھڑکانے کے لئے ڈالتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ لداخ کے لوک گیتوں پر کوئی قطعی رائے قائم کریں اُن قطعات کا مطالعہ لازمی ہے جنہیں لداخی زبان میں چھک لو یعنی طنزیہ گیت کہتے ہیں۔ طنزیہ گیت لداخ کی لوک شاعری میں ایک الگ صنف سخن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چار مصرعوں کے یہ بند ایک مکمل خیال پیش کرتے ہیں۔ اکثر راتوں میں مرد عورت الگ الگ ٹولیوں میں بٹ کر یہ گیت بیت بازی کیطرح گاتے ہیں۔ ان گیتوں میں نہ صرف سماج کی اس ساخت کے خلاف بغاوت کی گئی ہے۔ اور اُن جبڑوں کو کاٹا گیا ہے جو معاشرت اور انسانیت کی ترقی کے راہ میں حائل ہیں بلکہ ان گیتوں میں سانس لیتی ہوئی زندگی احساس کو چونکا دینے والا طنز، زندگی پر تنقید اور شستہ ظرافت بھی موجود ہے۔ یہ گیت نہ صرف اپنے محبوب پر چوٹ کسنے کے لئے گائے جاتے ہیں بلکہ ایسے موقعوں پر بھی گائے جاتے ہیں جب کھلے بندوں بغاوت ناممکن یا خلاف مصلحت ہو۔

چند قطعات کے تراجم ملاحظہ فرمائیے :-

تم امیر لڑکی۔ قیمتی پیالی میں دودھ
میں غریب۔ مٹی کے کونے میں لسّی

یا

یہ سوچ کر کر درخت اُگ آئے گا
میں نے پودا لگایا تھا
کون جانتا تھا کہ
یہ تو کھوکھلا بانس نکل آئے گا

یا

تم درخت پہ چڑیا
کس قدر آزاد

میں دریا میں مچھلی
کس قدر قید و مجبور

پچھلے برس ایک ہی نگینے کی انگوٹھی پہن لی
امسال اگر نو نگینے والی انگوٹھی بھی دو تو نہیں پہنوں گی

لداخ کے لوک گیتوں میں بحروں کی پابندی نہیں۔ شاعری سوائے طنزیہ قطعات کے عموماً موسیقی کے ساتھ گائے جانے کے لئے جنم لیتی ہے۔ اس لئے ہر کوئی اپنے روزمرّہ کے واقعات سے متاثر ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کر لیتا ہے لاماؤں، گپنوں، راجاؤں اور بعض عورتوں کی تعریف توصیف میں کہے گئے۔ گیتوں کے علاوہ باقی تقریباً سبھی گیت نامعلوم شاعروں کے ہیں اور یہ لوگوں کی مجموعی تخلیق کا نتیجہ ہیں۔ کئی گیت جو اس وقت گائے جاتے ہیں اپنا اصلی رنگ کھو چکے ہیں۔ لوگ عموماً اپنی مرضی کے مطابق گیتوں میں موقع محل کے لحاظ سے ضروری ترامیم کرتے ہیں۔

انسان کہانی سُننے کا دلدادہ ہے، آج بھی لداخ میں اکثر لوگ سردیوں کی راتیں الاؤ کے گرد جمع ہو کر داستان سُننے میں گذارتے ہیں۔ اور جاڑوں کی طویل و بے کیف راتیں آنکھ جھپکنے میں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان داستانوں، کہانیوں اور دیومالاؤں میں کردار کے جذبات اور دلی کیفیات کی ترجمانی کے لئے اہم موقعوں پر گانوں سے جو کام لیا گیا ہے وُہ اپنی مثال آپ ہے۔ لنگ گیالم کیسر میں چوچو ڈُرگوما یا دوسرے اہم کردار جو گیت گاتے ہیں وُہ داستان سے کم مشہور نہیں۔ اسی داستان میں جب گیالم کیسر اس پتھر کی تعریف کرتا ہے۔ جو وُہ اپنے دشمن پر وار کرنے کے لئے گوپھن میں ڈالتا ہے تو لداخی زبان کے سرمایہ کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ داستان اور قصّے زماں و مکاں کے تصوّر سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں اور داستان کا ہیرو مافوق الفطرت طاقتوں کا حامل ہوتا ہے لیکن پھر بھی ان کہانی قصّوں میں مقامی رنگ، تخیّل کی پرواز حق و باطل کا تصادم، حسن و عشق کی آویزش، کردار نگاری کے نمونے انداز بیان کی خوبصورتی سب کچھ پایا جاتا ہے۔ ان کا سُننے والا خود کو ایک ایسی دُنیا میں پاتا ہے جہاں عجیب و غریب شخصیتیں اور اُن کے عجیب و غریب کارنامے حیرت میں ڈال دیتے ہیں، ان داستانوں کو سُنکر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اور کھو جاتا ہے — ان کہانی قصوں میں ہمیں انسانی خواہشات کی ایک جھلک ملتی ہے۔ مثلاً اس زمانے میں جب انسان اڑنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہانی قصوں کا ہیرو مہینوں کی مسافت لمحوں میں طے کرتا ہے وُہ ایک ڈنڈے کی مدد سے دریا پار کر لیتا ہے۔ ایک ٹوٹا پھوٹا برتن اس کے لئے ہر قسم کی مُرغن خوراک مہیّا کرتا ہے۔ جہاں تک ان باتوں کا تعلق ہے لداخ کی لوک کہانیوں اور دوسرے ملکوں کی لوک کہانیوں میں کوئی فرق نہیں لیکن جہاں تک مقامی رنگ کا سوال ہے لداخی کہانی قصوں میں لاموں کا تذکرہ جب بھی آتا ہے تو وُہ پاکیزگی، قابلیت اور قوت کا مظہر بن کر سامنے آتے ہیں۔ دیوتاؤں کا استقبال بالکل اسی طرح کیا جاتا ہے جیسے لداخ میں بودھ اپنے مذہبی پیشواؤں کا کرتے ہیں۔ اسی طرح کردار ایک لداخی کی طرح بات کرتے ہیں اسی طرح سوچتے سمجھتے سُنتے اور بولتے ہیں۔ بچوں کے لئے جو لوک کہانیاں ہیں، اُن میں سے اکثر شیخ چلی کی کہانیوں سے ملتی ہیں، دیومالاؤں میں ٹی بیت کندن کی لمبی داستان ایکڈ واقعات کے علاوہ منشی رام چندر جی کے بن باس کی داستان بنجاتی ہے۔ داستان کا ہیرو ایک اچھا بودھ جوان ہوتا ہے جو مذہبی رسومات کا پابند ہوتا ہے جس میں نیکی، قربانی اور انسا کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوتے ہیں۔ جن اور (بقیہ صفحہ نمبر ۵۶)

منظر شہاب

غزل

کم ظرفیٔ رِنداں نے آخر برباد کیا مے خانے کو
بدنام بھلا کیوں کرتے ہو سیماب نفس پیمانے کو

زنجیر و سلاسل زینتِ تن اور سختیٔ زِنداں راحتِ جاں
تسکیں کے بہانوں کیا کہنا! بہلا ہی دیا دیوانے کو

محروم رہا گر خرمنِ دل، اندازِ تغافل کے صدقے
محسوس ہوا یوں برق نظر آئی تھی یہیں گر جانے کو

یہ تشنہ لبی، یہ سوزِ جگر، یہ خندہ زنی، یہ دیدۂ تر
ساقی کی عنایت کے ہاتھوں کیا کچھ نہ ملا مستانے کو

عارف کی نظر میں ناموں کی بس اِتنی حقیقت ہوتی ہے
پروانہ کہے وہ شمع کو اور شمع کہے پروانے کو

کچھ وضع نرالی تھی اپنی، کچھ پاسِ محبت کی خاطر
ہنستا ہی رہا، گاتا ہی پھرا سینے میں لئے غم خانے کو

یہ رات کا افسوں زہر شکن، یہ دخترِ زر کی یاد شہاب
خوش کام رہو اے اہلِ سخن اب میں تو چلا میخانے کو

تعمیر سری نگر

راہی معصوم رضا

ایک سال ہو گیا!

آج سے ایک سال پہلے ۵ دسمبر کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے مجاز کو ہم سے چھین لیا۔ مجاز کو ہم سے جُدا ہوئے ایک سال ہو گیا لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کل تک ہمارے درمیان موجود تھے۔ ایک سال کا یہ عرصہ کتنی جلدی بیت گیا ——— ادارہ

تیز سرگوشی ہے پھر ذہن کے دروازوں میں
تیری یادوں کی بہت تیز ہوا آئی ہے
مرے کمرہ سے بہت دُور سحر ہوتی ہے
تیرے نغموں کی مہک لے کے صبا آئی ہے

آج پھر گونج رہی ہے ترے شعروں کی کھنک
کسی معشوق کے پازیب میں یہ بات نہیں
تیرے شعروں کے شگوفوں پہ بہار آج بھی ہے
موت کی مات ہوئی ہے یہ تری مات نہیں

کل جنہوں نے نہ کیا تیری وفا کو سجدہ
وہ بھی آہنگ کے اوراق اُلٹتے ہوں گی
ختم تجھ پر ہی ہوئی شامِ اودھ کی غربت
چند پھانسیں ہیں جو ہر دل میں کھٹکتی ہوں گی
میں نے لوگوں سے سُنا ہے کہ تیری موت کے بعد
تیرے احباب کے پیالوں میں نہ جانے کیا ہے
میں نے لوگوں سے سُنا ہے کہ ہر اک شام کے بعد
کیف مے تجھ کو بہت یاد کیا کرتا ہے!

دسمبر ۱۹۵۶ء

ایس۔ کے۔ رینہ
ڈائریکٹر ٹوریزم

سیاحت کا فروغ

زمانہ حال میں ٹوریزم کو ایک باقاعدہ انڈسٹری کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ ہر اس ملک کی حکومت جہاں سیاحوں کی دلچسپی کے لئے تھوڑا سا بھی سامان میسّر ہو، یہ کوشش کرتی ہے کہ سیاح زیادہ سے تعداد میں وہاں آئیں۔ کافی دیر وہاں قیام کریں، اور اپنے ذوق کی خاطر خواہ تسکین کے ساتھ ساتھ کافی روپیہ بھی خرچ کریں۔ تاکہ مقامی باشندوں کی خوشحالی میں اضافہ ہو جائے۔

کشمیر پُرانے زمانے ہی سے باہر کے لوگوں کے لئے باعث کشش رہا ہے، یہاں کا علم و فن، یہاں کا تمدن اور سب سے زیادہ قدرتی نظارے اور خدا داد حسن دُور دراز ملکوں کے سیاحوں کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بنے چلے آئے ہیں۔ قدرت نے اسے مختلف خوبیوں سے مالا مال کرنے کے لئے بڑی فیاضی سے کام لیا ہے، اور ہماری حکومت قدرت کی اس فیاضی کو ریاست کی معیشت (ECONOMY) مضبوط بنانے، قومی دولت میں اضافہ کرنے اور عوام کا معیار حیات بلند کرنے کا ذریعہ بنانے کی طرف خاص توجہ دے رہی ہے۔

یہ امر تو سب کو معلوم ہی ہے کہ کشمیر میں جتنا مال درآمد کیا جاتا ہے اتنا برآمد نہیں ہوتا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ریاست سے جس قدر روپیہ باہر جاتا ہے اُتنا باہر سے یہاں نہیں آتا۔ اس صورت حال کو ناموافق تجارتی توازن کہا جاتا ہے جس ملک کا تجارتی توازن ناموافق ہو اُسے ترقی یافتہ نہیں سمجھا جاتا۔ کشمیر کے ناموافق تجارتی توازن کی شدت کم کرنے میں ٹوریزم کو خاص حصّہ حاصل ہے۔ مثال کے طور پر اس سال ۶۵ ہزار کے قریب سیاح یہاں آئے، اگر ان میں سے سب نے یہاں اوسطاً صرف پانچ پانچ سو روپے خرچ کئے ہوں تو ریاست کو ان کی وجہ سے تین کروڑ روپے سے زائد کی آمدنی ہوئی اور اس حد تک ناموافق تجارتی توازن کی شدت کم ہو گئی۔

ریاست کی معیشت میں ٹوریزم کی اس قدر اہمیت کے پیش نظر آپ یقیناً یہ جاننا چاہیں گے کہ حکومت نے اس انڈسٹری کو فروغ دینے کے لئے کیا کیا اقدامات کئے ہیں، اور آئندہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ سب کچھ تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے لئے کافی وقت درکار ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ اس مختصر سے مضمون میں آپ کو اس بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کروں۔

ٹوریزم کو فروغ دینے کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ نقل و حمل کے وسائل کو وسعت دی جائے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ کیا گیا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ جموّں پٹھان کوٹ سڑک جو ریاست کی شاہراہ ہے کو اور کشادہ اور پختہ کیا گیا ہے۔ پٹھان کوٹ سے سری نگر تک آرام دہ اور نئے ماڈل کی بسوں، موٹر کاروں اور سٹیشن ویگنوں کا بندوبست کیا گیا ہے، دہلی، امرتسر اور پٹھان کوٹ سے سری نگر تک ہوائی سروسیں چالو ہیں۔ اور ہر سیاح اپنی مالی استطاعت کے مطابق گاڑی یا ہوائی جہاز کے ذریعے بڑی آسانی کے ساتھ کشمیر پہنچ سکتا ہے۔ راستے میں ڈاک بنگلوں کو وسعت دی گئی ہے۔ جہاں سیاحوں کی رہائش، آرام اور کھانے پینے کا معقول انتظام موجود ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کے اندرون میں بھی سڑکوں اور پُلوں کو وسعت دینے کی زبردست مہم جاری ہے۔ بہت سے دُور افتادہ مقام اب بہت ہی اچھی سڑکوں کے ذریعے سری نگر سے ملائے گئے ہیں، اور بہت جلد ریاست سڑکوں کے معاملہ میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گی۔ اب

اس سوال کے دوسرے پہلو کو آپ کے سامنے رکھتا ہوں، سالہا سال تک سیاح گلمرگ، پہلگام، سونہ مرگ اور مغل باغات کی سیر سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔ مگر عرصۂ دراز تک اُن کی دلچسپی اور تفریح کے دائرے کو وسیع کرنے کے لئے کوئی کاروائی نہیں کی گئی تھی۔ موجودہ حکومت نے اس کمی کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ اور اب ایسے ذرائع اختیار کئے جا رہے ہیں جن سے سیاحوں کی تفریح کا دائرہ وسیع ہو۔ گلمرگ، ٹنگمرگ اور پہلگام کی ترقی کے لئے ٹھوس اقدامات کئے گئے ہیں مثلاً گلمرگ میں تمام سرکاری مکانات کی ازسرِنو مرمت کی گئی ہے۔ گاف لنکس ٹھیک کیا گیا ہے کلب میں تفریح کے انتظامات کو توسیع دی گئی ہے، کھلن مرگ اور بابا رشی اِتھر جانے والی سڑکوں کو بہتر بنایا گیا ہے۔ پہلگام میں نئی سرکاری رہائش گاہیں (HUTS) بنائی گئی ہیں اور ایک یوتھ ہوٹل زیرِ تعمیر ہے جو بیک وقت سینکڑوں طلبہ کے لئے رہائش گاہ کا کام دیا کرے گا۔ ایک پارک بنگلہ زیرِ تعمیر ہے جس میں سینیٹری فٹنگ (Sanitary fiting) کا پورا پورا انتظام ہوگا۔ دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کے تحت پہلگام میں ہر سال بیس بیس رہائش گاہیں (HUTS) تعمیر کی جائیں گی۔ چندن واری تک ایک جیپ سڑک بنائی جا رہی ہے اور امرناتھ کی گپھا تک جو راستہ ہے اُسے ٹھیک کیا جا رہا ہے اور ہر پڑاؤ پر رہائش گاہیں بنائی جا رہی ہیں کولاہائی گلیشر کو جانے والی سڑک کی مرمت کی گئی ہے۔ آڑو اور لدروٹ میں جو رہائش گاہیں موجود ہیں اُن کی ازسرِنو مرمت کی گئی ہے۔ پہلگام کلب کو وسعت دی گئی ہے اور مردوں اور خواتین کے لئے تیرنے کے لئے الگ الگ تالابوں کا بندوبست کیا گیا ہے۔ سونہ مرگ میں اگلے سال سے رہائش گاہیں تعمیر کرنے کا کام شروع کیا جائے گا۔ اس وقت تک وہاں ایسا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے سیاحوں کو خیموں میں رہنا پڑتا تھا سونہ مرگ کے اردگرد کئی اور مقامات بھی ہیں جن کو سیاحوں کی دلچسپی کے مرکزوں میں تبدیل کرنے کے لئے سکیموں پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہے۔ سونہ مرگ جانے والی سڑک کو بھی کافی حد تک ٹھیک کیا گیا ہے۔

وادئ لولاب اور یوس میدان کو اس سال سیاحوں کیلئے کھلا چھوڑا گیا۔ دونوں مقامات پر رہائش گاہیں بنائی گئی ہیں۔ اور اُمید کی جاتی ہے کہ ہر سال زیادہ سے زیادہ سیاح ان خوبصورت جگہوں کو دیکھنے کے لئے آیا کریں گے۔

سرینگر میں سیاحوں کی آسائش کے لئے مکمل انتظامات کئے گئے ہیں۔ ابھی حال ہی میں . . . . ایک عظیم الشان استقبالیہ مرکز کی تعمیر مکمل ہوئی ہے، جس پر تقریباً بارہ لاکھ روپے خرچ آئے ہیں۔ یہ مرکز دُنیا بھر میں اس قِسم کا سب سے بڑا استقبالیہ مرکز ہے۔ کشمیر آنے والے سیاح پہلے یہاں آیا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی چوبیس کمرے ہیں جن میں سینیٹری فٹنگ کا بندوبست ہے۔ جن سیاحوں نے سری نگر میں قیام کے لئے پہلے سے کوئی انتظام نہ کیا ہو وہ چوبیس گھنٹوں کے لئے ان کمروں کو استعمال کر سکتے ہیں۔ یہاں پر ایک کیفے (COFEE - HOUSE) بھی ہوگا۔ مردوں اور خواتین کے لئے الگ الگ loungers کا انتظام ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہاں محکمہ ٹورزم، پرمٹ آفس، گیم وارڈن کا دفتر، محکمہ فشریز، انڈین ایئر لائینز کا دفتر سول ٹرانسپورٹ سروس اور اُن بنکوں کی شاخیں کھولی گئی ہیں، جن کا سیاحوں سے کاروبار ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سیاحوں کو کسی کام کے لئے بھی وقت ضائع نہ کرنا پڑے استقبالیہ مرکز، تھوڑا عرصہ ہوا پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ اور اس سیزن کے دوران اس نے سیاحوں کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں جس کا خود سیاحوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔

محکمہ ٹورزم نے سیاحوں کی سہولت کے لئے "رہنماؤں" (Guides) کو رجسٹر کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ معمولی فیس ادا کرنے کے عوض سیاح ان کی خدمات حاصل کر سکیں گے۔ ہاؤس بوٹوں کی درجہ بندی کا طریقہ بھی ہاتھ میں لیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سیاحوں کو ایک تو سہولیت بہم پہنچے اور دوسرے ان کو کرایہ وغیرہ کی ادائیگی سے متعلق کوئی شکایت کرنے کا موقع نہ ملے۔

حکومت اتنے پر ہی بس نہیں کرنا چاہتی، نہرو پارک اور شنکر آچاریہ کے درمیان اور گلمرگ اور کھلن مرگ کے درمیان رسی کے پُل (Rope Bridges) بنانے کی سکیموں کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ اور مغل باغات میں ایک شاندار ریسٹوران کھولے جانے کے ارادے کئے جا رہے ہیں۔ اس سال بانہال کی نئی ٹنل مکمل ہوگی اور سیاح سال بھر یہاں آ جا سکیں گے، اس لئے محکمہ ٹورزم ایسی سکیموں کو ہاتھ میں لے

رہا ہے۔ جن سے سیاحوں کو موسم سرما کے دوران مناسب اور موزوں تفریح کا سامان بہم پہنچے۔ صوبہ جموں میں بھی ٹورزم کو فروغ دینے کے لئے ضروری انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ کٹرہ میں بجلی کا انتظام کیا گیا ہے جہاں سے وشنو دیوی کی گپھا تک راستہ جاتا ہے۔ کدّ اور بٹوت کو سیاحوں کی دلچسپی کے مرکزوں میں تبدیل کرنے کے لئے انتظامات کئے جا رہے ہیں، اور جلد ہی ان دو جگہوں میں بجلی کا بندوبست کیا جائے گا۔ سناسر میں بھی ایسے ہی انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ سدھ مہادیو سے پتنی ٹاپ تک سڑک بنائی جا رہی ہے اور جھیل مانسر کو سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنانے کے لئے اسکیمیں ہاتھ میں لی جا رہی ہیں۔

ٹورزم کو فروغ دینے کے لئے حکومت جو کچھ کر رہی ہے۔ سرکردہ سیاحوں نے اسے سراہا ہے۔ مشہور امریکی سیاح مسٹر مڈّی نے ان اقدامات کے لئے کشمیر کی حکومت کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ انجمن اقوام متحدہ کے ایک نمائندہ نے بھی حکومت کو مبارک باد دی ہے۔ کہ اس نے سیاحوں کی سہولت کے لئے کافی انتظامات کر رکھے ہیں۔

پچھلے مہینوں میں ہمیں چند امتیازی حیثیت کے مہمانوں کو نوازنے کا فخر حاصل ہوا۔ جن میں یو۔پی کے سابق گورنر سر ایچ۔ پی۔ مودی، مغربی جرمنی کے سفیر متعینہ ہند ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر میئر، ہندوستانی فوج کے چیف آف سٹاف جنرل ایس ایم شری نگیش۔ ہندوستان کی مرکزی کابینہ کے وزراء شری ایس۔ کے ڈے۔ شری پٹاسکر، شری لوبلے ہز ہائی نس شاہ بہوّر اور کوٹھا کے مہاراج کمار بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ ہمیں ہندوستان کی مختلف صوبائی حکومتوں کے وزراء اور امریکہ کے سرکردہ وکلا، اور ڈاکٹروں کے خیر مقدم کا شرف بھی حاصل ہوا!

سال رواں (۱۹۵۶ء) اس لحاظ سے ملک کی سیر و سیاحت کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت سے یاد کیا جائیگا۔ کہ اس سال کشمیر آنے والے سیاحوں کے پچھلے تمام ریکارڈ مات ہو گئے ہیں۔ اکتوبر کے اخیر تک ۶۳۶۰۸ سیاح کشمیر آئے۔ جن میں ۵۶۹۳۹ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آتے تھے اور ۶۶۶۹ سیاح بیرون ہند سے آئے تھے۔ اس کے مقابلے میں پچھلے سال اسی تاریخ تک ۴۹۵۲۴ سیاح کشمیر آئے تھے۔ جن میں ۴۶۵۲۴ ہندوستانی تھے اور ۲۴۸۲ بیرون ہند کے باشندے تھے۔ اس سال یہاں کے پُر لطف خزاں کے مزے لوٹنے کے لئے بھی مزید سیاح وارد کشمیر ہو رہے ہیں۔ اور ان کی آسائش کے تمام پہلوؤں کا پوری توجہ کے ساتھ دھیان دیا جا رہا ہے۔

سیاحوں کی اتنی زبردست ریل پیل کے باوجود اس سال کے سیزن کا خوشگوار پہلو یہ ہے کہ شکایات کا موقع شاذ و نادر ہی آیا، اور تمام سیاح ہماری ریاست سے متعلق اچھا تاثر لیکر رخصت ہوئے اس کے باوجود ہمیں خود اس بات کا احساس ہے کہ ہم نے ابھی اس معاملہ میں وہ کمال حاصل نہیں کیا ہے، جس کا وجود ایک ٹورسٹ انڈسٹری کے لئے باعث فخر ہو سکتا ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ سیاحوں کو کم سے کم خرچ کے بدلے زیادہ سے زیادہ آرام اور آسائش بہم کی جا سکے۔ سیاحوں کو اس بات کا اطمینان رکھنا چاہیئے کہ مستقبل میں ہم انہیں ایسی خدمات پیش کر سکیں گے۔ جس کی وہ خود بھی تمنا کرتے رہے ہوں گے۔

آخر میں یہ بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس اہم کام میں اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ عوام کا پرُخلوص تعاون شامل حال نہ ہو۔ ٹورزم ہماری ریاست کی معیشت میں خوشگوار انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ عوام اس سلسلے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔ اگر ہم سیاح کو مہمان سمجھ کر اسے ہر ممکن سہولیت بہم پہنچائیں۔ تو سیاحوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جائیگا۔ اور ہماری خوشحالی کا تناسب بھی روبہ ترقی ہوتا جائے گا۔

مظفر عازم

غزل

یاوُن دوہے چھُ ژہاران لولُک مُدھر شرابا
ہاوَس یتھی چھِ بیکُل منزنین وُچھان چھِ خوابا
گُوٚرِن چھِ آسنہٕ چی کُل، فریاد بُلبلُن خوٗی ؛
حُسنس نہِ اِضطرابا، عشِقس نتہٕ اضطرابا
شبنم چھُ مُوٚنہِ پھلیتن سُند ہاوان بہار آخر
دامن چھُوٚلُم لُوٚتامت لولُک پھوٚلُم گُلابا !
نھُوٚد پردہ تس نگارس راتھی تُلُم تہٕ ڈُلیو ٹھُم
پژہ کالہ کیٚن سوالن آمُت چھُ رُت جوابا
کمہ آیہ باشہ کرٕ کرٕ آشن دِرُیر کرُن مہ
میتہ ہیوٚت سُرن حبابا، میتہ ہیوٚتُ سُرن شبابا
مِژہ تیرٕ کیٚن چھوٚکن ہُنُد احسان چھُ شاعرس پیٹھ
نتہ وَن چھُ کتھ شمارس مضرابہٕ رُوس ربابا
اکھ جام وصلکُوی چیتھ زِ یچھر مُوٚٹھس فراقک
عازم نتہ وُچھ مہ بدلئ یاوَن مُوٚنا بیٚتابا

(ترجمہ)

جوانی ہمیشہ شرابِ محبت کی طلبگار رہتی ہے۔
آرزوئیں اسقدر نادان ہیں کہ دن میں خواب دیکھتی ہیں۔
غنچوں کو تبسّم کی دھن لگی رہتی ہے اور نالہ و فغان بلبل کی فطرت ہے۔
حسن بھی بے قرار رہتاہے اور عشق بھی مضطرب
پتیلیوں کی شبنم آخر بہار دکھاتی ہے۔
میں اس شبنم سے دامن دھوتا رہا، یہاں تک کہ میرا گلاب کھل گیا۔
میں نے کل ہی محبوب کا پردہ سرکا کر دیکھا۔ مجھے یہ محسوس ہوا۔
کہ میرے پرانے سوالوں کا حسین سا جواب ملاہے۔
اس نے کچھ اس انداز سے میٹھی میٹھی باتیں کرکے میری امیدوں کو سہارا دیا۔
کہ میں نے بھی چاہت کے مزے لینا شروع کیا۔ اور میں بھی شباب کی لذت سے لطف اندوز ہونے لگا۔
شاعر تیر مژگان کے زخموں کا احسان مند ہے۔
ورنہ مضراب کے بغیر رباب کس شمار و قطار میں ہے؟
وصل کا ایک ہی جام پی کر فراق کے طول کو بھول گیا۔
میں نے عازم کو بیقرار اور مستِ شباب پایا۔

موہن کشن ولی

گاہے گاہے بازخواں.....

بڈشاہ ـــــ ایک مطالعہ

یہ جوان سال بادشاہ جس کی یاد لوگوں کو جمہوریت کے دَور میں بھی ستاتی ہے۔ اُنیس سال کی عمر میں ہی تخت پر بیٹھا۔ بچپن سے ہی بڑا ہونہار، ذہین اور معاملہ فہم تھا۔ اور اپنے گردِ نواح کو پوری طرح بھانپنے کا عادی تھا۔ تخت پر بیٹھنے سے پہلے بھی مُلک کے معاملات سے پوری طرح باخبر تھا۔ اور ہر مسئلہ کی نوعیت سے آگاہ تھا۔ اس لئے برسرِ اقتدار آنے کے فوراً بعد ہی اُس نے ہر دُکھ کا مداوا ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مخلصانہ کوشش تھی۔ اس لئے کامیاب اور کامران رہی۔ مرتے دم تک وُہ رعایا کا چارہ گر اور چارہ ساز بنا رہا۔ اور درد کی دوا بنتا گیا۔ وُہ اُن تمام صفتوں کا مالک تھا جو اُس وقت کے بادشاہ میں ہونی لازمی تھیں۔ کہنہ مشق، سیاست دان، مدبر، ارادے کا پکّا، دل کا غنی، علم و ادب کا پرستار اور داد گستر تھا۔ اپنے والد کی خامیوں سے بخوبی آگاہ اور فرقہ وارانہ رواداری کا دلدادہ تھا۔

تخت پر بیٹھتے ہی زین العابدین نے مختلف محکموں کی باگ ڈور قابل ترین اشخاص کے ہاتھوں میں دی۔ اور ان میں اعتماد، بھروسہ اور وفاداری کا جذبہ پیدا کیا۔ اُنہوں نے وزارت عظمیٰ کا قلمدان اپنے بھائی محمود خان کو سونپا اور اپنی فوجوں کے دو قابل کمانڈروں، ہلمت رینہ اور احمد رینہ کو محمود خان کے تحت رکھا۔ ملک مسعود کو وزیر داخلہ کے عہدے پر مامور کیا اور اسی طرح اُنہوں نے مرزا حسین کو خزانے کا افسر اعلیٰ مقرر کیا۔ زین العابدین تب تک چیف جسٹس کا کام خود کرتے رہے جب تک کہ اُنہیں قاضی جمال الدین کی ذات میں اس عہدے کیلئے ایک موزون اور مناسب شخص ملا۔ بڈشاہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ امیروں اور وزیروں کی سازشوں اور گروہ بندیوں سے ملک کمزور ہوتا ہے۔ اس لئے اُس نے اُن کا خاتمہ کیا اور ایسے عناصر کی پوری طرح سے سرکوبی کی جو ملک کی خوشگوار فضا کو مکدّر بنانے کا باعث بن سکتے تھے۔ بڈشاہ کے تخت پر بیٹھنے کے وقت پیدل فوج کی تعداد تقریباً ایک لاکھ اور گھوڑا سواروں کی تعداد تیس ہزار تھی۔ اُنہوں نے اپنی فوجوں کو اس طرح از سر نو منظم کیا کہ کسی بغاوت یا فساد کا امکان باقی نہ رہا۔ فوجی افسروں اور فوجیوں کے ساتھ اُس نے اتنا اچھا برتاؤ کیا کہ وُہ ہر طرح سے مطمئن ہو گئے چونکہ بڈشاہ فوجیوں کے دُکھ درد میں شریک تھا اس لئے وُہ بھی اُس کے اشارے پر سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہو گئے۔

بڈشاہ کو تعمیرات کا اس قدر شوق تھا کہ اُس کا مقابلہ ہند کے عظیم معمار بادشاہ شاہجہان سے کیا جا سکتا ہے۔ البتہ مقابلہ کرتے وقت ذرایع کی محدودی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اُنہوں نے نئی عمارتیں بنائیں اور نئی بستیاں بسائیں۔ زینہ لنک۔ زینہ کوٹ۔ زینہ کدل زینہ منڈ۔ زینہ پور۔ زینہ تلک۔ زینہ گیرا اور زینہ گام اُن کے نام سے اب بھی مشہور ہیں۔ اور بچے کھچے کھنڈرات زبان حال سے پکار رہے ہیں کہ عمارت عظیم تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ اُنہوں نے ہر پرگنہ اور ہر گاؤں میں آرام گاہیں اور سرائیں بنوائیں۔ جن کی وجہ سے لوگوں کو سفر کرتے وقت کوئی تکلیف نہ ہوتی تھی۔ بڈشاہ نے سرینگر کے نزدیک نوشہرہ میں ایک عظیم الشان محل بنوایا۔ اس محل کی بارہ منزلیں تھیں ہر منزل میں پچاس کمرے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ عمارت چکوں کے وقت میں نذرِ آتش ہو گئی۔ بڈشاہ نے طبی سائنس کی طرف بھی کافی توجہ دی اور عوام کی سہولیت کے لئے ہسپتال بنوائے۔ خواجہ اعظم نے لکھا ہے کہ بڈشاہ نے سمرقند سے نرسیں منگائیں اور زچہ بچہ کو سہولتیں مہیا کیں۔ بادشاہ نے

کسانوں کی بہتری اور بہبودی کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ اور بہت سے ایسے اقدامات کئے جن سے اُن کا معیارِ حیات بلند ہوگیا۔ وُہ بذاتِ خود اُن کی بہبودی کے کام کی نگرانی کرتے تھے، جہاں جہاں نئے پُل اور نئی نہریں بنائی جاتی تھیں، وہاں خود جاکر وُہ اس کام میں انتہائی دلچسپی لیتے۔ تفصیلات دریافت کرتے اور ہر کام کی عملی مشکلات کا جائزہ خود لے کر اُن کو دُور کرنے کی کوشش کرتے۔ بادشاہ کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ایسے علاقے سبز کھیتوں سے لہلہانے لگے جہاں آبپاشی تو درکنار پیاس بجھانے تک کیلئے پانی کو ترستے تھے۔

بڈشاہ صنعت و حرفت کو فروغ دینے کا متمنّی تھا۔ کیونکہ وُہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ لوگوں کی خوشحالی اور فارغ البالی میں ہی سلطنت کے استحکام کا راز مضمر ہے۔ اُنہوں نے ایران، توران، ترکستان اور ہندوستان سے کاریگروں کو یہاں آنے کی دعوت دی اور اُنہیں بڑی بڑی تنخواہیں اور رعائتیں دے کر کشمیر میں آباد ہونے پر آمادہ کیا۔ کشمیر کے لوگ فطرتاً ذہین ہیں جب اُنہیں زندگی کے مختلف شعبوں میں باکمال اُستادوں کی رہنمائی حاصل ہوئی تو وُہ چمک اُٹھے۔ اور اُستادوں سے بھی آگے بڑھے زین العابدین نے نہ صرف دوسرے ملکوں کے کاریگروں کو یہاں بُلایا، بلکہ کشمیر کے لوگوں کو بھی مختلف صنعتوں کی تربیت حاصل کرنے کے لئے دوسرے ملکوں کو بھیجا۔ بادشاہ کی سرپرستی اور رہنماؤں کی رہنمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیری کاریگروں نے گوناگوں نمونوں کے مطابق دستکاری کی چیزیں تیار کیں۔ اور کشمیر کے نام کو چار چاند لگادئے یہ زین العابدین کی کوششوں اور کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے کہ کشمیر کو آج بھی صنعت و حرفت کے لحاظ سے نام حاصل ہے، اور دُنیا یہاں کے صناعوں کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہے۔

بڈشاہ علم و ادب کا دلدادہ تھا اُس نے شاعروں، ادیبوں، مورخوں اور علمِ طب اور نجوم کے ماہروں کو انتہائی نوازشوں سے نوازا کر بڑے بڑے عالم و فاضل اُن کے دربار میں جمع ہوگئے مولانا کبیر دینیات اور دوسری الہی سائنسوں کے اُستاد تھے اور شیخ الاسلام کے علاوہ شاہی یونیورسٹی کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ اِس یونیورسٹی کے لئے ناگام پرگنہ کے کئی گاؤں کا مالیہ وقف تھا۔ مُلا احمد ایک بڑے عالم سرکردہ شاعر اور اعلیٰ پایہ کے مورخ تھے۔ اُنہوں نے مہابھارت کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ اس کے علاوہ بادشاہ کے کہنے پر اُنہوں نے کلہن کی مشہور و معروف تاریخ 'راج ترنگنی' کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا۔ ترجمے کا نام "بحر الاسرار" رکھا گیا۔ حافظ بغدادی اور ملا پارسا اُن کے دربار کے دو اور بڑے عالم تھے۔ جنہوں نے اپنی ساری عمر شاہی یونیورسٹی کی خدمت میں گذاری۔ اُتاسوما ایک کشمیری عالم تھے۔ جنہیں فارسی سنسکرت اور کشمیری زبان پر کافی عبور حاصل تھا، وُہ ترجمے کے ادارے میں ایک اعلیٰ عہدے پر مامور تھے۔ اور اُنہوں نے کشمیری زبان میں 'زین چرتر' یعنی زین العابدین کی سوانح حیات لکھی ہے۔ یادھو بٹ۔ جونراج۔ کیسر بھوار۔ تلک آچاریہ کرپورہ بٹ۔ دو بہ بٹ۔ سمھا اور رامانند کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ بڈشاہ خود سنسکرت کا شوقین تھا، اور اس نے ہندو فلسفے کا بغور مطالعہ کیا تھا۔

بڈشاہ ہندو اور مسلمان دونوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرتا تھا۔ دونوں فرقے اس کے وقت میں امن و آشتی سے مل جل کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس نے ہندوؤں کے خلاف وُہ تمام اقدامات منسوخ کردئے اور تمام پابندیاں ہٹادیں۔ جو سلطان سکندر کے وقت میں اُن پر عائد کی گئیں تھیں۔ بادشاہ نے تمام مذاہب کی آزادی کا اعلان کیا ہندوؤں کو نئے مندر بنانے کی اجازت دی گئی۔ ہندو لڑکوں کے لئے پاٹھ شالائیں کھولی گئیں۔ اور اُنہیں سنسکرت کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفے دئے گئے۔ سُلطان نے ہندوؤں پر عائد کئے گئے ٹیکس منسوخ کرئے اور اس نے سرکردہ ہندوؤں کی خدمات حاصل کیں۔

بڈشاہ نے اپنی رعایا کے لئے مجموعہ قانون مرتب کیا اور اس مجموعے کو عوامی جگہوں اور عدالتوں میں رکھوایا۔ وُہ خونریزی سے انتہائی نفرت کرتا تھا اور معمولی جُرم کے لئے دوسرے مطلق العنان بادشاہوں کی طرح پھانسی کی سزا نہیں دیتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وُہ کسی کو بھی جُرم کی سزا دینے سے ہچکچاتا نہ تھا۔

زین العابدین پچاس سال کشمیر پر حکومت کرنے کے بعد ۱۴۷۰ء بعد از مسیح میں اس جہانِ فانی سے رحلت کرگیا۔ اس نے پریشان کشمیر کو خوشحال کشمیر بنا کر چھوڑا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو اس غمگسار

(بقیہ صفحہ نمبر ۵۶)

جی ایم شیخ
لیکچرار امر سنگھ کالج

دوسرا پنجسالہ منصوبہ اور صنعتیں

ریاست جموں وکشمیر کا دوسرا پنج سالہ منصوبہ یکم اپریل ۱۹۵۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ ہمارا ترقی وتعمیر کا یہ دوسرا منصوبہ پہلے پنج سالہ منصوبے سے بہت زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ پہلے پنجسالہ منصوبے پر صرف تقریباً تیرہ کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ لیکن اندازہ ہے کہ دوسرے پنج سالہ منصوبے پر ۵۱ کروڑ ۲۷ لاکھ روپیہ کی لاگت آئے گی۔ اس کے دو حصّے ہوں گے۔ پہلے حصہ پر ۳۵ کروڑ روپیہ خرچ ہوں گے اور دوسرے حصّہ پر ۱۶ کروڑ ۲۷ لاکھ روپیہ۔ ان کی تفصیل یہ ہے:-

(الف) زراعت اور اجتماعی ترقی	-	۷۳۴،۱۴۷ لاکھ روپیہ
آبپاشی اور بجلی	-	۱۵۶،۵۷ لاکھ روپیہ
سڑکیں اور ٹرانسپورٹ	-	۶۰۰،۰۰ لاکھ روپیہ
دیہاتی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتیں	-	۳۰۲،۳۰ لاکھ روپیہ
تعلیم		۳۰۰،۰۰ لاکھ روپیہ
صحت		۳۰۰،۰۰ لاکھ روپیہ
مکانات		۱۰۰،۰۰ لاکھ روپیہ
دوسری سماجی خدمات مثلاً مزدوروں کا بہبود۔ پسماندہ طبقوں کا سدھار اور سماجی سدھار	—	۵۷،۰۰ لاکھ روپیہ
متفرقات مثلاً پسماندہ علاقوں کی ترقی۔ اشاعت منصوبہ سیاحت اعداد وشمار سے متعلق سکیمیں تحصیلاتی منصوبے لوکل باڈیز کے منصوبے	-	۲۵۰،۰۶ لاکھ روپیہ

میزان الف —— ۳۵ کروڑ روپیہ

(ب) کنڈی نہر	-	۱۲،۰۰ کروڑ روپیہ
سیلاب کی روک تھام	-	۳،۰۰ کروڑ روپیہ
بڑی اور درمیانی صنعتیں	-	۱،۲۷ کروڑ روپیہ

میزان ب ۱۶،۲۷ کروڑ روپیہ

ہمارا پہلا منصوبہ جن حالات میں وجود میں آیا۔ وہ کچھ زیادہ اُمید افزا نہیں تھے۔ ہمارا ملک صدیوں کے خواب گراں کے بعد نیا نیا ہی جاگا تھا۔ مدتوں کی غلامی اور اقتصادی بدحالی سے زندگی پر جو جمود طاری ہوگیا تھا اس کو توڑنا کچھ آسان نہیں تھا۔ نتیجہ کے طور پر پہلا منصوبہ زیادہ جامع نہیں بن سکا بلکہ یہ منصوبہ ترتیب دئے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک عدم توجہی کا شکار رہا۔ چنانچہ جو کام پانچ سال میں ہونا تھا۔ وہ منصوبہ کی مدت کے آخری دو تین سال میں پورا کیا گیا۔ پہلے پنج سالہ منصوبے کے تکمیل پذیر ہونے پر ریاست نے کتنی ترقی کی ہے۔ اس کا اندازہ اس طرح کیجئے کہ کسان جو ہمیشہ لوٹ کھسوٹ کا شکار رہا۔ آج اپنی زمین کا مالک ہے۔ دیہی قرضہ کے پیچیدہ سوال کو بہت حد تک سلجھایا گیا ہے۔ آبپاشی میں توسیع ہونے سے مزید ۱۸۶۷۱ ایکڑ زمین زیر کاشت آگئی ہے۔ جن دیہاتی علاقوں میں پینے کے پانی کا فقدان تھا۔ وہاں پانی فراہم ہے۔ مویشیوں کی دیکھ بھال اور افزائش نسل کے لئے بہت سارے اقدام کئے گئے۔ اعلیٰ قسم کے بیج اور کیمیاوی کھاد مہیا کرکے زمین کی پیداوار میں بڑھاوا دیا گیا۔ مختلف قسم کی گھریلو دستکاریاں چالو کی گئیں

صنعتی قرضے دئے گئے۔ نمائشیں منعقد ہوئیں اور ایمپوریم قائم کئے گئے اور اس طرح ملک کی ترقی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

دوسرے پنج سالہ پلان کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ ہمارا یہ پلان اسی طرز پر بنا ہے جس پر کہ کل ہند پلان بنا ہے۔ چنانچہ ہمارے سامنے بھی وہی مقاصد ہیں۔ جو کہ سارے ملک کے سامنے ہیں۔

جنگ بندی لائن کے اس پار ہماری ریاست کی موجودہ آبادی ۲۹۴۸۰۰۰ اشخاص پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ۸۰ فی صدی لوگ دیہات میں رہتے ہیں۔ اور یہ سب بالواسطہ یا بلا واسطہ زراعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے پاس کل رقبہ ۶۹۹۷۰۰۰ ایکڑ ہے۔ اس رقبے میں سے صرف ۱۵۳۱۰۰۰ ایکڑ زیر کاشت ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ زمین پر آبادی کا بہت زیادہ دباؤ ہے۔ اور دیہاتی آبادی کو ضرورت کے مطابق پورا کام نہیں ملتا۔ اس طرح اگر ایک طرف آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ جزوی طور پر بیکار ہے۔ تو دوسری طرف کافی انسانی قوت بھی ضایع ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے زراعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ ضروری بن جاتا ہے کہ دیہاتی آبادی کے ایک کافی حصہ کی توجہ زراعت سے ہٹا کر دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی طرف لگا دی جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے منصوبے میں جہاں زراعت اور اجتماعی ترقی پر ۷۳۴،۱۷ لاکھ روپے کا خرچہ مخصوص کیا گیا ہے۔ وہاں دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لئے ۳۰۲،۳۰ لاکھ روپے رکھا گیا ہے اس طرح اندازہ ہے کہ دوسرے پلان کی مدت میں بیکاری میں خاطر خواہ کمی ہوگی۔ اور تقریباً ۲۸۴۰۰ اشخاص کو کام مل جائے گا۔

ہماری ریاست مصنوعات کے لئے بہت مدت سے مشہور ہے۔ ہماری چیزیں دور دور تک جاتی رہی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں گھریلو صنعتوں کی تنظیم اس طرح رہی ہے کہ ہمارے کاریگر، ہماری صنعتی اشیاء کی پیداوار اور اس کی فروخت پر تاجر قابض ہے۔ اور ہمارے کاریگر کو اس کی محنت کا کوئی پھل نہیں ملتا۔ اگرچہ صناعی اشیاء بنانے کے پیشے موروثی ہیں۔ لیکن تاجر کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ ہماری ریاست کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ صنعتیں

تعمیر

خاطر خواہ ترقی کریں۔ چنانچہ دوسرے پلان میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات پر کافی زور دیا گیا ہے کہ کاریگر کو سارا سال کام ملتا ہے اور اس کی اجرت میں کافی اضافہ ہو جائے۔ گھریلو صنعتوں کو مضبوط بنانے کے لئے نمائشیں اور ایمپوریا بہت ضروری ہیں۔ دوسرے پلان کے تحت سمندر پار ملکوں میں ایمپوریا قائم ہوں گے۔ پروڈکشن سنٹروں میں توسیع کی جائے گی۔ سرینگر میں ایک ڈیزائن سنٹر قائم کیا جائے گا، اور وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مختلف حصوں میں نمائشیں منعقد کی جائیں گی۔

ہماری ریاست کے صنعتی نظام میں سریکلچر بہت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسی صنعت ہے جس پر شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں رہنے والے کافی لوگوں کی خوشحالی کا دارومدار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں کے حالات خام ریشم تیار کرنے کے کافی موافق ہیں۔ کشمیر کے موسمی حالات ریشم کے کیڑے پالنے کے لئے بہت موزوں ہیں۔ یہاں توت کے درخت کی بہتات ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ صنعت خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابریشم کے غنچے کافی مقدار میں مہیا نہیں کئے جاتے۔ ابریشم کے غنچے ہمارے کرم کش اپنے گھروں میں ریشم کے کیڑے پال کر فراہم کرتے ہیں۔ اور وہ بہت حد تک بے توجہی برتتے ہیں۔ ابریشم کے غنچوں کی کمی کی وجہ سے بسا اوقات یا تو سرینگر کی سلک فیکٹری کو بند کر دینا پڑتا ہے یا مزدوروں کی کافی تعداد کو الگ کیا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا علاج کیا جائے۔ چنانچہ پلان میں تجویز ہے کہ ایک اولین ابریشم کے بیج سے ۲۴ سیر غنچوں کی بجائے ۴۰ سیر غنچے پیدا کئے جائیں، اور اس طرح خام ریشم کی پیداوار ۱،۸۰ لاکھ سے بڑھا کر ۳،۰۰ لاکھ کر دی جائے۔ اس طرح جہاں دیہات میں رہنے والے کرم کشوں کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔ وہاں مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کو مستقل طور پر روزگار حاصل ہوگا۔

گاہ میری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں
اقبال

حدیثِ دیگراں!

لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ
۱۹ر نومبر ۱۹۵۶ء

عزیزمن! تسلیم

مجھے بے حد خوشی ہے کہ ماہنامہ "تعمیر" کا اجرا کیا جا رہا ہے۔ میری دِلی تمنا ہے کہ وہ محض اُردو کی نہیں، کشمیر کے عوام اور خواص کا، محبّت اور اتحاد کی قدروں کا، آزادی اور جمہوریت کے خوابوں کا اور بہترین انسانی خواہشوں اور تمنّاؤں کا ترجمان بن کر بہت دنوں تک قائم رہے۔ اُردو ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان ہے اور ہم سب اُردو کے پجاری ہیں۔ اس حیثیت سے یقیناً ہمارا رشتہ اُس سے دُہرا ہے۔ میں یقیناً "تعمیر" کی خدمت کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی ادارت میں یہ رسالہ وہ فرائض انجام دے گا جن سے ادب اور زندگی دونوں کا بول بالا ہوگا۔

"بزمِ تعمیر" کا قیام بھی مبارک باد کا مستحق ہے۔ میں اس کا رُکن بننے کو ایک اعزاز تصوّر کروں گا۔

اُمید ہے کہ آپ اور سب دوست اچھے ہوں گے!

مخلص
سیّد احتشام حسین

بسم اللہ محل۔ میرس روڈ۔ علی گڑھ
۱۵ر نومبر ۱۹۵۶ء

برادرِ عزیز۔ خوش رہیئے!

آپ کا خط مِلا۔ یہ خبر میرے لئے بڑی خوشی کی ہے کہ آپ "تعمیر" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اپنی صلاحیتوں سے اب کوئی کام لے سکیں گے۔ "تعمیر" سے تعلق آپ کو ہنگامی دلچسپیوں سے نکال کر تعمیری کاموں میں لگائے گا۔

"تعمیر" میں ہندوستانی ادب و کلچر سے متعلق معلوماتی مضامین اور کشمیری زبان و ادب سے متعلق مقالات شائع کیجئے۔ کشمیر کے نئے اُردو ادیبوں اور شاعروں کو آپ "تعمیر" کے ذریعہ متعارف کرا سکتے ہیں اور یہ بڑی خدمت ہوگی۔

میں سرِ دست فی الحال اپنی ایک غزل بھیج رہا ہوں۔ مضمون بھی جلد ہی لکھنے کی کوشش کروں گا۔

"بزمِ تعمیر" کا قیام بھی وہاں کی ادبی ترقی کے لئے مفید ہوگا اور اس کے ذریعہ کشمیر میں اُردو ادب کی آبیاری کا موقع مِلے گا۔ میں بہت خوشی سے اس کی رُکنیت قبول کرتا ہوں اور میرے احباب بھی۔

سہیل صاحب کو سلام کہئے۔ ان کو علیحدہ سے خط لکھوں گا۔

آپ کا خلیل الرحمٰن اعظمی

گورنمنٹ سینی ٹوریم۔ ٹنگمرگ
۱۶ر نومبر ۱۹۵۶ء

برادرم!

"تعمیر" مِلا۔

تعریف اس لئے نہیں کروں گا کہ تمہیں تو ایسا صاف ستھرا رسالہ نکالنا ہی چاہیئے تھا۔ اگر یہ اتنا اچھا نہ ہوتا تو تعجب ہوتا!

کتابت اور طباعت میں اور اچھا ہونے کی گنجائش ہے۔ میرے خیال میں دوسرا پرچہ طباعت اور کتابت کے اعتبار سے بہتر ہوگا۔ "تعمیر" رسالے کا نام ہے اس لئے تعمیرِ نَو ہونی ہی چاہیئے۔

"تیری قیمت تُو زلیخا کی زلیخائی ہے!" اور "قدیم مصر کا کلچر" کو

میری تعریف کی ضرورت نہیں ہے۔ میری تعریف کے بغیر بھی لوگ انہیں پسند کر چکے ہوں گے۔

"وادی کے پھول" مجھے پسند نہیں آئی۔

"بزمِ تعمیر" کا تیر مار کر البتہ تم نے کمال کیا۔ میرے خیال میں اس بزم کی تشکیل کے سلسلہ میں شاید تم اکیلے ہی مبارک باد کے مستحق ہو۔ ادبی اور تہذیبی الحاق سیاسی الحاق سے زیادہ اہم ہے۔ کشمیری کے ادیبوں کو ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادیبوں میں پہنچانا ہم سب کا فرض ہے۔ اور یہ ان کا حق ہے!

کشمیری ادب کے ترجموں کا ایک سلسلہ ضرور شروع کرو۔

تمہارے مضمون کی تعریف اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ پھر بعد میں اپنی غزل کی بھی تعریف کرنی پڑے گی۔

دوسرے پرچہ کا انتظار ہے!

تمہارا راہی معصوم رضا

ہلال منزل۔ ابراہیم پورہ بھوپال

۸ نومبر ۱۹۵۶ء

مدیر محترم، خلوص!

"تعمیر" کا تیسرا اور چوتھا شمارہ نظر سے گذرا۔ بڑا ستھرا پرچہ نکال رہے ہیں آپ —— اس کے لئے میں مبارک باد دیتا ہوں۔

ہندوستان کے بزرگ سیاست داں جناب سی۔ راجگوپال آچاریہ کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ کر کے "تعمیر" میں شائع کرنے کے لئے بھیج رہا ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت؟

ترجمہ کی رسید اور رائے اور دوسری تفصیلات سے مطلع کیجئے!

والسلام۔ خلوص کار آفاق احمد

ہندو ہائی سکول

بڈی یار۔ سری نگر کشمیر

۲۳ نومبر ۱۹۵۶ء

عزیزم!

"تعمیر" کا تازہ شمارہ ملا۔ بہت پسند آیا۔ مجھے تمہاری صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔ لیکن تمہاری شوخی اور انانیت سے بھی خائف ہوں۔ اگر تم اپنی شخصیت اور فرائض میں توازن قائم رکھ سکے تو "تعمیر" کا مستقبل بہت شاندار ہوگا۔

"تعمیر" کشمیری ادب کی ترویج و اشاعت میں اہم فریضہ ادا کر سکتا ہے۔ تمہیں زیادہ سے زیادہ کشمیری ادیبوں کا تعاون حاصل کرنا چاہیئے۔ "بزمِ تعمیر" کا قیام ایک مستحسن اقدام ہے۔ میں اپنی طرف سے مکمل تعاون کا وعدہ کرتا ہوں۔ "بزمِ تعمیر" کو ایک جمہوری ادارہ بنانے کی کوشش کرو۔

اشاعت کے لئے ایک کشمیری سانیٹ بھیج رہا ہوں۔

تمہارا دینا ناتھ نادم

انجینئرنگ کالج

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۷ نومبر ۱۹۵۶ء

عزیزم!

"تعمیر" ملا۔ بھئی تمہارا یہ رسالہ بہت پسند آیا۔ ایک پندرہ روزہ جریدہ اس سے اور زیادہ اچھا کیا ہو سکتا ہے۔ ذرا کتابت کی طرف توجہ کرو۔ رہا اچھے مضامین اور دوسرے نگارشات، تو وہ قیمت ادا کر کے یقیناً اچھے ملیں گے!

تمہارا وامق

بزمِ خواتین

بہنوں کی طرف سے "بزمِ خواتین" کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ ہمیں یہ جانکر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ ریاست میں بہت سی ایسی خواتین ہیں جن میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اگر بہنیں اعتماد سے لکھیں۔ تو ان کی تحریروں میں حسن اور تاثر پیدا ہو سکتا ہے۔ ہمارے پاس اشاعت کیلئے جو تخلیقات موصول ہوئی ہیں۔ ان سے اس بات کا شدید احساس ہو جاتا ہے کہ فنکار میں خود اعتمادی کی کمی ہے۔ "تعمیر" کے یہ چند صفحات آپکے لئے حاضر ہیں۔ آپ پورے اعتماد اور یقین کیساتھ اپنی نگارشات بھیجیے۔ (ادارہ)

عصمت شکیل

دُنیا کے قدیم سماج میں شادیوں کی اہمیت

مختلف ممالک کے قدیم کلچر میں جہاں اور بہت ساری دلچسپ باتیں ملتی ہیں وہاں شادیوں کے متعلق بھی نہایت ہی عجیب عناصر ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اب ہم کتنی دُور آگے نکل آئے ہیں۔ اس کے تجزیہ میں ہمیں سماجی، نفسیاتی، اور جنسی زندگی پر بھی نظر رکھنی ہوگی اس کے بغیر باتوں کو سمجھنے میں آسانی نہیں ہو سکتی۔

قدیم روس میں یہ بھی ایک قاعدہ رہا ہے کہ شادی کے روز لڑکی کا باپ ایک نہایت ہی خوبصورت چھڑی لاتا تھا اور اپنی لڑکی کو آہستہ آہستہ اس سے مارتا تھا، مارتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے تھے۔ اور وہ یہ کہتا تھا کہ تمہارا باپ تمہیں آخری بار کوئی سزا دے رہا ہے، ان لمحوں میں اپنے باپ کے دل کی حالت نہ پوچھو، اب تمہارے باپ کی چھڑی تمہارے شوہر کے ہاتھوں میں جا رہی ہے۔ اس لئے کہ اب وہی تمہارے جسم کا مالک ہے۔ قدیم روس میں شادیوں میں یہ رسم عرصہ تک جاری رہی۔ قدیم سماج میں شادیوں کی اہمیت کا احساس اس انوکھی رسم سے دلایا جاتا تھا۔

سماٹرا کے قدیم سماج میں شادیوں کی اہمیت بہت زیادہ تھی تین مختلف قسم کی شادیاں ہوتی تھیں۔ ایک شادی ایسی ہوتی تھی جس میں مرد عورت کو خرید لیتا تھا۔ اور پھر وہ عورت کا آقا عمر بھر رہتا تھا۔ دوسری شادی کا طریقہ یہ تھا کہ عورت مرد کو خرید لیتی تھی اور مرد عمر بھر عورت کی غلامی کرتا تھا، اور تیسری شادی میں مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کو خرید لیتے تھے۔ وہ زندگی بھر سماج میں دونوں کے حقوق مساوی ہوتے تھے، دونوں ایک دوسرے کے غلام تھے۔

مغربی افریقہ کی قدیم زندگی بھی بہت دلچسپ تھی، وہاں شادی کے بعد تین سال تک شوہر بیوی کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا، اگر اتفاق سے اس نے بیوی کو دیکھ لیا تو اسے پھر شادی کرنی پڑتی تھی اور وہ مزید تین برسوں تک بیوی کی صورت سے محروم ہو جاتا تھا۔ اس طرح شوہر کے لئے سب سے بڑا حادثہ یہی ہوتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کی شکل دیکھ لے ——!!

شمالی امریکہ میں شادیوں کی "اہمیت" کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے قدیم تمدن میں "پیار" اور "محبت" کی کوئی اہمیت نہیں تھی ان کے لئے پیار کوئی لفظ نہیں تھا۔ جس سوسائٹی میں "پیار" اور "محبت" کے لئے کوئی لفظ زبان میں نہ ہو اس سماج میں شادیوں کی جو "اہمیت" ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ آسٹریلیا، تسمانیا اور گینیا کے قدیم کلچر میں بھی یہی حال تھا۔

آسٹریلیا کے قدیم سماج میں بیوی کی حیثیت غلام کی تھی، شوہر بیوی سے محبت نہیں کر سکتا تھا۔ بیوی کی محنت دیکھکر جب شوہر کو رحم آتا تھا تو ہمدردی کے چند الفاظ کہہ دیتا تھا اور بیوی ان الفاظ کو سینے سے لگائے رہتی تھی ——!

جنوبی ہندوستان میں شادیوں میں اس بات کی اہمیت زیادہ تھی کہ شوہر بیوی سے عمر میں کتنا چھوٹا ہے۔ جتنا شوہر عمر میں چھوٹا ہوتا تھا۔ اتنی زیادہ خوشی منائی جاتی تھی۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ سترہ برس کی لڑکی کی شادی پانچ برس کے لڑکے کے ساتھ ہو۔ جب شوہر صاحب جوان ہوتے تھے

(بقیہ صفحہ نمبر ۳۱)

شاہدہ خانم

چند ترکیبیں

مجھے ہمیشہ نئے کھانے پکانے اور کھانے کا شوق رہا ہے۔ چنانچہ میں ہمیشہ اس سلسلے میں تجربے کرتی رہی ہوں۔ کتابوں اور رسالوں میں چھپی ہوئی ترکیبیں عام طور سے وہی ہوتی ہیں جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں۔ اس لئے آج میں آپ کو کوئی ایسی ترکیب نہیں بتاؤں گی جو کسی کتاب یا رسالہ میں بھی مل سکتی ہو۔ میں نے جو تجربے کئے ان کے نتائج کبھی حوصلہ افزا ہوئے تو کبھی حوصلہ شکن۔ کبھی کبھی تو ایسی چیز تیار ہوئی ہے کہ اسے دوسری بار چکھنے کی خود میری بھی ہمت نہیں ہوئی۔ لیکن میں مایوس نہیں ہوئی۔ ایک یا دو بار کی ترمیم کے بعد آخر میں کامیاب ہوئی۔ لیجئے جو ترکیبیں میں نے کئی تجربوں کے بعد حاصل کی ہیں، آپ پہلے تجربہ ہی سے ان سے فائدہ اُٹھا سکتی ہیں۔

آج کل اخروٹ اور بادام عام ملتے ہیں۔ یہ دونوں میوے قوت بخش ہیں ان کا حلوہ چاہے الگ الگ بنایئے یا ملا کر ایک ساتھ۔ ترکیب یہ ہے:-

شام کو ایک پاؤ گری پانی میں بھگو دیں۔ اگلے روز چھلکا اُتار کر بڑی کھرل میں کوٹ لیجئے۔ سیر بھر اچھا دُودھ چوڑے مُنہ کی پتیلی میں ابلنے کو رکھ دیجئے۔ اُبال آتے ہی پسے ہوئے مغز اس میں ڈال دیجئے اور برابر چلاتی رہیئے تاکہ گٹھلی نہ پڑنے پائے۔ جب دُودھ آدھا رہ جائے۔ تو پاؤ بھر شکر اور آدھ پاؤ پسی ہوئی کشمش ڈال دیجئے۔ برابر چلاتی رہیئے۔ شکر گھل جائے اور قوام گاڑھا ہونے لگے تو آدھی چھٹانک گھی ڈال دیجئے۔ پانچ منٹ بعد چینی کی بڑی اور گہری پلیٹ میں نکال لیجئے۔

اس سلسلے میں آپ خود کئی تجربے کر سکتی ہیں۔ صرف اخروٹ کا حلوہ بنایئے۔ پھر بادام کا حلوہ بنایئے۔ اس کے بعد اخروٹ اور بادام ملا کر حلوہ بنایئے۔ آپ چاہیں تو اگلی بار اس میں اور اضافہ کر سکتی ہیں۔ وہ یہ کہ ناریل کا چھلکا اُتار کر شام کو پانی میں بھگو دیجئے۔ صبح اسے کدو کش پر کس کے کھرل میں پیس لیجئے۔ اور اس کو بھی حلوہ میں ڈال دیجئے۔ اسی طرح پستے اور چرونجی کو بھی شامل کر سکتی ہیں۔

لیجئے۔ اب ایک اور مزیدار چیز بنایئے۔ دودھ میں پسے ہوئے یا ٹوٹے چاول اُبال کر کھیر یا فرنی تو آپ نے بارہا بنائی ہو گی۔ اس میں تبدیلی پیدا کر کے جو خوشی مجھے ہوئی۔ آپ کیوں اس سے محروم رہیں۔ ایک چھٹانک صاف کر کے رات کو پانی میں بھگو دیجئے۔ صبح اُٹھ کر ان کو کوٹ لیجئے۔ دو انڈے خوب اچھی طرح پھینٹ کر سیر بھر دُودھ میں ملا دیجئے۔ اور چوڑے منہ کی پتیلی میں آگ پر رکھ دیجئے۔ اُبلنے سے پہلے کٹے ہوئے بادام ڈال دیجئے اور برابر چلاتی رہیئے۔ اسی وقت پانی میں حل کی ہوئی زعفران رنگ اور خوشبو کے لئے ڈال دیجئے۔ دُودھ آدھا رہ جائے تو اپنی پسند کے موافق شکر ڈال دیجئے۔ اس وقت دو چمچے گھی ڈال دیجئے۔ ہلکی آنچ پر دس منٹ پکنے کے بعد پتیلی اُتار لیجئے اور پڈنگ گہری پلیٹ میں نکال لیجئے۔ آپ چاہیں تو پستے اور بادام کے ورق بھی اس پر چھڑک سکتی ہیں۔ میں آپکو یہ مشورہ دوں گی کہ ہر بار پڈنگ بناتے وقت ایک نئی بات پیدا کیجئے۔ مثلاً کشمش پیس کر ڈالیئے، کبھی چھلکا اُترے ہوئے بادام ڈالیئے۔ اور کبھی بھیگی ہوئی کشمش ملایئے۔

اچھا اب یہ سنیئے کہ یہ دونوں چیزیں کب استعمال کیجئے:-

یوں تو ہر وقت یہ چیزیں کھائی جا سکتی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں کھانا کھانے کے بعد SWEET DISH کے طور پر یہ سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ یا پھر ناشتہ میں انکا استعمال کیجئے۔ دو چار بار تجربے کے بعد آپ خود کسی نتیجے پہنچ سکیں گی۔

امورِ خانہ داری کے سلسلے میں اگر آپ کوئی بات مجھ سے پوچھنا چاہیں تو دفتر "تعمیر" کی معرفت مجھے خط لکھئے اور اپنا پتہ لکھا ہوا لفافہ ساتھ بھیجئے۔

سلیمہ اختر

تین رنگ اور عورت کی نفسیات

بہت سارے ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ عورتوں کی نفسیات پر رنگوں کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ ہر رنگ کا اثر جُدا ہے۔ اس اہم بات کی طرف ہمیں متوجہ ہونا چاہیئے —— رنگوں کے انتخاب سے عورتوں کی نفسیات، کردار اور ذہن کو اپنے اپنے گھروں میں سمجھا جا سکتا ہے۔ میں یہاں صرف تین اہم رنگوں کے متعلق لکھ رہی ہوں ——

سُرخ رنگ کو پسند کرنے والی عورتیں زندگی سے کچھ گھبرائی گھبرائی سی رہتی ہیں۔ زندگی کی ہر نئی کروٹ انہیں کچھ نہ کچھ پریشان کرتی ہے۔ اس رنگ کو پسند کرنے والی عورتیں اپنی حیات میں اُداسی اور غم کو ضرورت سے زیادہ شامل کر لیتی ہیں۔ مزاج کی خُشکی اور جھنجھلاہٹ اور ضِدّ تو ان کی فطرت میں شامل ہے۔ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ سُرخ رنگ سے دراصل ایسی عورتیں غیر شعوری طور پر اپنی پریشانیوں اور اُداسیوں کو دُور کرنا چاہتی ہیں۔ کچھ ماہرین یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے ایسی عورتوں میں زندگی کا مذاق اُڑانے اور زندگی کی تلخیوں پر طنز کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ جو عورتیں ادب سے دلچسپی رکھتی ہیں وہ اس رنگ کو خاص طور پر پسند کرتی ہیں اور اُن کے ادب میں طنز کا پہلو اچھی طرح نمایاں ہوتا ہے۔ مِس ڈان وان یونیورسٹی کی پروفیسر تھیں۔ اُنھوں نے بڑی محنت سے بعد اپنا مقالہ تیار کیا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے اُنہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری نہیں مِلی۔ اس کا اُنہیں سخت صدمہ ہُوا اور پریشان رہنے لگیں۔ اُنہوں نے ماہرین نفسیات سے مشورہ کیا۔ ماہر نے کہا کہ وُہ ایک ایسے کمرہ میں رہیں جہاں سُرخ قمقمے ہوں، سُرخ پردے اور صوفے ہوں اور سُرخ قالین ہو۔ مِس ڈان وان نے ایسا ہی کیا اور رفتہ رفتہ ان کا غم دُور ہو گیا۔ جب انہیں سُرخ رنگ سے محبّت ہو گئی تو مِزاج کی خُشکی بڑھ گئی۔ ضِدّ ان کی فطرت میں داخل ہو گئی اور بات بات پر جھنجھلانے لگیں۔

زرد رنگ کو پسند کرنے والی عورتیں اور لڑکیاں نڈر اور بے باک ہوتی ہیں۔ انہیں کسی کا خوف نہیں ہوتا۔ لیکن ایسی عورتیں اپنا جائزہ ہمیشہ لیتی رہتی ہیں۔ اپنی کمزوریوں کو سمجھتی ہیں۔ وُہ ہر وقت کام میں مشغول رہنا چاہتی ہیں۔ اگر انہیں کوئی کام نہیں ہوتا تو وُہ پریشان رہتی ہیں۔ موسیقی سے بھی ان کا لگاؤ ہوتا ہے۔ ایسی عورتیں نڈر اور بے باک ہونے کے باوجود گھناؤنی چیزوں سے بہت دُور رہتی ہیں۔ وہ اپنے عزیزوں سے محبّت بھی خُوب کرتی ہیں اور نفرت کرنے میں بھی دیر نہیں کرتیں۔ اس رنگ کو پسند کرنے والی عورتیں میک اَپ اور بناؤ سنگار کو اپنی غذا پر بھی فوقیت دے سکتی ہیں۔ وُہ ہر وقت یہ سمجھتی ہیں کہ وہ اپنے عزیزوں یا اپنے شوہر پر بوجھ ہیں۔ اسی فکر میں رہتی ہیں کہ کسی صورت سے اپنی محنت و مشقّت سے بوجھ کو ہلکا کیا جائے۔

نیلے رنگ کو جو عورتیں اور لڑکیاں زیادہ پسند کرتی ہیں وہ بہت نیک اور خوش مزاج ہوتی ہیں۔ غم میں بھی مُسکراتی رہتی ہیں۔ مشرقی عورتوں کی بہت ساری خصوصیات ان میں ہوتی ہیں۔ شرم، لحاظ، اخلاق، مروّت اور محبّت کی ایک دُنیا آباد رہتی ہے۔ اس رنگ کو پسند کرنے والی عورتیں سردیوں کے موسم میں زیادہ صحت مند اور خوش رہتی ہیں:

بچوں کا "تعمیر"

پیارے بچو! تعمیر اب پندرہ روزہ کی بجائے ماہنامہ ہو گیا ہے، اور اسی لئے ہم نے تمہارے لئے کچھ اور صفحوں کا اضافہ کیا ہے۔ بہت سے بچوں نے ہمیں نظمیں، کہانیاں اور لطیفے شایع کرنے کیلئے بھیجے ہیں۔ ان میں سے کچھ چیزیں منتخب کر کے ہم شایع کر رہے ہیں۔ کچھ بچوں نے مختلف رسالوں سے نظمیں، کہانیاں اور لطیفے چرا کر اپنے نام سے بھیجے ہیں یہ بہت بری بات ہے — تم خود کوشش کر کے لکھو۔ وہ جیسا بھی ہو، ہم اسے ٹھیک ٹھاک کر کے شایع کیا کریں گے۔

دودھ کی گڑیا

نسیم محمد جان

یہ اس گاؤں کی کہانی ہے جہاں درختوں سے پھل اور دودھ کے قطرے ٹپکتے تھے۔ دودھ کی نہریں تھیں، دودھ کے آبشار تھے، کھیتوں میں دھان کی بالیوں پر شہد ٹپکا یا جاتا تھا، گلاب کے پھولوں سے سارا گاؤں مست تھا، اس گاؤں میں ایک دیوی کو تمام لوگ دودھ کی گڑیا کہتے تھے۔ دودھ کی گڑیا کو آبشاروں، نہروں، پودوں، سبزیوں، گیہوں کے خوشوں اور چاول کے دانوں کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ جب وہ گاتی تھی تو دودھ کی روانی تیز ہو جاتی تھی، گڑیا ہمیشہ لوگوں سے یہ کہتی تھی کہ لوگ گاؤں میں امن قائم رکھیں اس لئے کہ بغیر اس کے وہ ایسے گیت نہیں گا سکتی ہے۔ وہ جنگ اور لڑائی سے گھبراتی تھی، وہ سمجھتی تھی کہ دودھ میں انسان کا لہو گرتا ہے گا تو دودھ کی ساری خوشبو اور سارا عطر ختم ہو جائے گا۔ زندگی مزے میں کٹ رہی تھی، لیکن ایک روز جنگ شروع ہو گئی۔ باہر کے دشمنوں نے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ معصوم لوگ گھبرا گئے، وہ دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکے۔

جیسے جیسے دودھ کی نہروں اور آبشاروں میں انسان کا لہو ملتا گیا۔ لوگوں کی ہمت لوٹتی۔ دودھ کی نہریں سرخ ہو گئیں۔ دودھ کے آبشاروں سے خون ابلنے لگا۔ دشمنوں نے دودھ کی گڑیا کو گرفتار کر لیا۔ اس طرح وہاں کے لوگ امن اور دودھ دونوں کو بھول گئے۔ رفتہ رفتہ یہاں کی زندگی بدل گئی۔ دودھ کی جگہ خون پینے کی رسم جاری ہو گئی۔ تمام لوگ اب گھبرا چکے تھے۔ دوسرے گاؤں کے لوگ بھی یہی چاہتے تھے کہ دودھ کی گڑیا کوئی گیت گائے۔

میری سہیلی

سید وجیہ احمد

جان سے پیاری میری سہیلی — کتنی سندر اور البیلی
نیلی نیلی آنکھیں اس کی — چھوٹی چھوٹی ٹانگیں اس کی
کیسا گورا سرخ بدن ہے — سندرتا کی کیسی پھبن ہے
کھانے سے یہ کتراتی ہے — ورنہ کس سے شرماتی ہے
پڑھ کر جب گھر آتی ہوں میں — سینے سے چمٹاتی ہوں میں
ساتھ اپنے نہلاتی ہوں میں — نیلا جمپر پہناتی ہوں میں

کون ہے میری پیاری سہیلی
بوجھو جلدی سے یہ پہیلی

کچھ ہی عرصہ کے بعد لوگ خون پیتے پیتے عاجز آ گئے اور دودھ کی جدوجہد شروع ہوگئی۔ دودھ کی گڑیا کی آزادی کے ترانے شروع ہوئے تو یہ ترانے گڑیا تک پہنچ گئے۔ دودھ کی دیوی کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے بھی گانا شروع کر دیا۔ لوگوں نے فوراً دیکھا خون کے دھاروں کی رنگت بدل گئی۔ دودھ کی گڑیا پھر اپنے گاؤں واپس آگئی اور جنگ کے خوفناک سائے دور ہوگئے۔

دہلی کی سیر

معراج الدین
ایم۔ پی۔ ہائی سکول

خوش قسمتی سے میں بھی ان تین لڑکوں میں شامل تھا۔ جنہیں ۱۴ نومبر کو چاچا نہرو کے جنم دن کے لئے یہاں سے دہلی بھیجا گیا۔ میں اس سے پہلے سرینگر شہر سے کبھی باہر نہیں گیا تھا۔ اس لئے جب مجھے معلوم ہوا کہ مجھے دہلی جانا ہے تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ۱۰ دسمبر کو ہم یہاں سے جموں کی طرف روانہ ہوئے رات کو جموں میں ٹھہرے صبح کو جموں سے پٹھانکوٹ کی طرف چل دئیے، اور اسی دن شام کو کشمیر میل میں دہلی کے لئے روانہ ہوگئے۔ ہم نے پہلی بار ریل دیکھی تھی۔ اس لئے اسے دیکھ کر ہمیں بہت خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ ہمارے ماسٹر صاحب نے ہمیں سمجھا دیا کہ ریل رات بھر سفر کرتی ہے اور یہ کہ ہندوستان میں لاکھوں لوگ روزانہ ریلوں سے سفر کرتے ہیں۔ ریل کی لمبائی دیکھ کر ہم بہت حیران ہوگئے۔ یہ ہماری لاریوں سے ڈیڑھ سو گنا لمبی ہوتی ہے۔ رات کو ہمیں نیند آئی اور ہم سو گئے۔ صبح جب ہماری آنکھ کھلی تو ہم دہلی کے ریلوے سٹیشن پر پہنچ چکے تھے۔ سٹیشن پر بہت سے لڑکے اور استاد ہمیں لینے کیلئے آئے تھے۔ ہم کو ایک بہت اچھے مدرسے میں رکھا گیا۔ نہا دھو کے اور کھانا کھا کے ہم دہلی دیکھنے کے لئے نکلے۔ ہمارا خیال تھا کہ سرینگر جتنا بڑا شہر اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر دہلی کو دیکھ کر ہمیں اس کے مقابلے میں سرینگر ایک چھوٹا سا محلہ دکھائی دیا۔ موٹروں، لاریوں، بسوں، تانگوں اور سائیکلوں کا وہ رش تھا کہ ہم نے کبھی اپنی زندگی میں نہ دیکھا تھا۔ ۱۴ نومبر کو ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے آئے ہوئے تمام بچے صبح ہی صبح نیشنل سٹیڈیم کے میدان میں جو بہت بڑا میدان ہے جمع ہو گئے۔ اس کے بعد پنڈت جواہر لعل جی نہرو جیپ میں سوار ہو کر آئے اور سارے میدان کے گرد چکر لگایا۔ وہ بڑے خوش دکھائی دے رہے تھے۔ اور ہم نے انہیں دیکھ دیکھ کر خوب تالیاں بجائیں اور نعرے لگائے۔ وہ بھی تالیاں بجا بجا کر ہماری تالیوں کا جواب دیتے، اس کے بعد دہلی اور باقی سکولوں کے بچوں نے کھیلیں دکھائیں، اس طرح ہم دن بھر پنڈت جی کے ارد گرد ان سے باتیں کرتے رہے۔

شام کو پنڈت جی نے ہمیں دعوت دی اور ہم نے ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس کے بعد دوسرے دن ہم نے دہلی کے مشہور تاریخی مقامات دیکھے، لال قلعہ، جامع مسجد، قطب مینار، پارلیمنٹ ہاؤس، فزیکل لیبارٹری۔ اور اسی طرح کی چیزیں دیکھتے دیکھتے شام ہوگئی۔ شام کو ہم نئی دہلی کے سب سے خوبصورت بازار کناٹ پلیس گئے۔ وہاں ہم نے اتنی اچھی اچھی چیزیں دیکھیں کہ سارا بازار خریدنے کو جی چاہتا تھا۔

دوسرے دن ہم واپس کشمیر کیلئے روانہ ہوگئے۔ اتنے دن دہلی میں رہ کر بھی ہم پوری طرح دہلی کو نہ دیکھ سکے اور نہ ہی ہماری تسلی ہو سکی۔ ہمارا دل تو کچھ دن اور ٹھہرنے کو چاہتا تھا مگر جب ماسٹر جی نے غراتے ہوئے کہا کہ نہیں اب ہمیں واپس جانا ہے۔ تو واپس آنا پڑا۔

کانگڑ

وچھ جان، کانگڑ میاں کیاہ جان
رنگا بہ رنگ کانہ شولہ مارال
ییر تھ تیز شیر تھ آینہ زانیاں
نیوکھ وزل اَبر زیتنہ ندتال
وندچ بہارین، جنگلچ کور
جرأت چھس لولہ کنہ دور
تھون ییس منز ینہ ینس ژور
ژارہ کانگڑ میانہ ومبر پور

کانگڑی

دیکھو جانی! میری کانگڑی کتنی سندر ہے۔
اسکی رنگ برنگ تیلیاں اپنا جوبن دکھا رہی ہیں۔
دلہن کی ڈھولی کی طرح یہ آراستہ پیراستہ ہے
نیلا اور سرخ ابرق اس پر تاروں کی طرح جگمگا رہا ہے
سرما کی دلہن اور جنگل کی شہزادی جس کے کانوں میں
محبت کے آویزے لٹک رہے ہیں۔
میں اسے چور کی نظروں سے بچانے کے لئے
اپنے گریبان میں چھپاؤں گا۔ جرار شریف کی بنی ہوئی
اس کانگڑی کی عمر دراز ہو۔

جہاں نما

مہینے بھر کی اہم خبروں کا خلاصہ

۷ نومبر ——————— ۳۰ نومبر

۷ نومبر — برطانیہ اور فرانس نے مصر میں جنگ بندی کا حکم جاری کر دیا۔ اینھونی ایڈن نے سویز میں ڈوبے جہازوں سے سویز کو صاف کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔

ہندوستان نے یو۔ این۔ او کی ہنگامی پولیس فورس میں شرکت قبول کر لی ہے۔

۸ نومبر — حکومت مصر نے مصر سے غیر ملکی فوجوں کے اخراج کا مطالبہ کیا ہے۔ صدر آئزن ہاور بھاری اکثریت سے دوبارہ امریکہ کے صدر منتخب ہو گئے۔

۹ نومبر — اقوام متحدہ نے ایشائی۔ افریقی ریزولیوشن پاس کر دیا۔ ریزولیوشن میں غیر ملکی فوجوں کے مصر سے اخراج کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

۱۰ نومبر — مصر سے برطانوی فوجوں کا اخراج شروع ہو گیا ہے۔ برطانیہ نے یو۔ این۔ پولیس فورس کے ساتھ تعاون کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

۱۱ نومبر — انجمن اقوام متحدہ نے ہنگری میں روس کے رویّے کی مذمت کی ہے۔ اور ہنگری سے فوراً روسی فوجوں کے اخراج کا مطالبہ کیا ہے۔ ہندوستان نے ہنگری میں انجمن اقوام متحدہ کے تحت رائے عامہ کرانے کے اصول کی مخالفت کی ہے۔

۱۲ نومبر — پنڈت نہرو نے کہا ہے کہ پنج شیل ہی دنیا کو بچا سکتا ہے۔ انہوں نے فوجی گٹھ جوڑوں کی مذمت کی ہے۔

۱۳ نومبر — مغربی ایشیا اور ہنگری کی صورت حال پر غور کرنے کے لئے کولمبو طاقتوں کی کانفرنس دہلی میں شروع ہو گئی۔ پاکستان کے کسی نمائندے نے شرکت نہیں کی۔

اقوام متحدہ کی ہنگامی فوج کا پہلا دستہ آج مصر پہونچ رہا ہے۔

۱۴ نومبر — کولمبو طاقتوں کے درمیان مصر اور ہنگری سے متعلق رویہ میں مفاہمت پیدا ہو گئی ہے۔

سوویٹ روس کے سرکردہ لیبڑر یوڈاسپٹ میں بات چیت کرنے کے لئے جمع ہو گئے ہیں۔

۱۵ نومبر — کولمبو طاقتوں کے تین وزراء اعظم نے مصر کے خلاف برطانیہ اور فرانس کے حملے کی مذمت کی ہے۔ وزراء اعظم نے مصر کی سرزمین سے غیر ملکی فوجوں کے اخراج کا مطالبہ کیا ہے۔ انہوں نے ہنگری میں روس کے رویّے کی بھی مذمت کی ہے۔

۱۶ نومبر — عرب ملکوں نے برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کو تنبیہ کی ہے کہ وہ فوراً مصر سے اپنی فوجیں نکالیں۔ انہوں نے حملہ آوروں کو دھمکی دی ہے کہ ان کے خلاف اقتصادی بائیکاٹ کیا جائے گا۔

ہندوستان نے سوویٹ روس سے ساٹھ کروڑ روپے کا امدادی قرضہ لینا قبول کر لیا ہے۔

۱۷ نومبر — پنڈت نہرو نے کہا ہے کہ دنیا کو تیسری جنگ عظیم کا خطرہ لاحق ہے۔ اور دنیا کو ہائیڈروجن بم یا پانچ شیل کا انتخاب کرنا ہوگا۔

پاکستانی لیڈر مصر سے اختلافات دور کرنے کے لئے مصر جانے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔

۱۸ نومبر — سوویٹ روس نے غیر مسلح ہونے کی ایک نئی تجویز پیش کی ہے۔ جس میں ہم بڑوں کی کانفرنس اور بم بنانے کے کارخانوں کی تباہی کی تجویز

پیش کی ہے۔ جس میں ہم بردوں کی کانفرنس اور بم بنانے کے کارخانوں کی تباہی کی تجویزیں بھی شامل ہیں

۱۹ نومبر - ہندوستان نے چار بردوں کی کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے رضامندی ظاہر کی ہے۔

ایک معاہدے کے مطابق روسی فوجیں پولینڈ میں بدستور موجود رہیں گی۔

۲۰ نومبر - پنڈت نہرو نے ہنگری میں روس کے طرز عمل کی شدید مذمت کی ہے۔ انہوں نے وہاں کی موجودہ گڑبڑ کو قومی بیداری سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے تجویز کی ہے کہ ہنگری میں اقوام متحدہ کے مبصروں کو داخل ہونے کی اجازت دی جائے۔ بخشی غلام محمد نے پاکستان کو مشورہ دیا ہے کہ وہ کشمیر کے خواب دیکھنا ترک کر دے۔ کشمیر کے نئے دستور پر ممبران اسمبلی نے دستخط ثبت کر دئے۔

۲۱ نومبر - ہندوستان نے امریکہ کی اس تجویز کی حمایت کی ہے کہ ہنگری کی صورت حال پر غور کرنے کے لئے وہاں اقوام متحدہ کے مبصر بھیجے جائیں۔

یو۔ این سیکرٹری جنرل ہمرشولڈ نے کہا ہے کہ نہر سویز کو صاف کرنے کے لئے مصر کی پیش کردہ شرائط قابل قبول ہیں۔

۲۲ نومبر - مسٹر ہمرشولڈ نے کہا ہے کہ برطانیہ، اسرائیل اور فرانس مصر سے اپنی فوجوں کے اخراج میں لیت و لعل سے کام لے رہے ہیں۔ کرنل ناصر نے کہا ہے کہ میں غیر جانبدارانہ پالیسی پر بدستور کاربند رہوں گا۔

۲۳ نومبر - اڑھائی ہزارویں بدھ جینتی کی تقریب پر صدر راجندر پرشاد نے ایک بار پھر امن عالم کے قیام کے لئے ہندوستان کے اہم رول کی وضاحت کی ہے۔ آپ نے کہا کہ ہندوستان ہمیشہ امن عالم کے لئے کوشاں رہے گا

۲۴ نومبر - مصر سے امریکی، برطانوی اور اسرائیلی فوجوں کا اخراج شروع ہو گیا۔ آغاز کے طور پر متعلقہ حکومتوں نے برطانیہ کی ۹۰۰ سپاہیوں اور ۵۰ آفیسروں پر مشتمل ایک بٹالین اور فرانسیسی فوجوں کا ایک تہائی حصہ ہٹانے کا اعلان کر دیا۔

برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ایڈن ناسازیٔ طبیعت کا بہانہ کر کے رخصت پر چلے گئے۔ حکومت برطانیہ کے کئے گئے اعلان کے مطابق ان کی غیر حاضری میں مسٹر بٹلر قائم مقام وزیر اعظم کی حیثیت سے کام کریں گے۔

۲۵ نومبر - اڑیسہ اور مدراس کے نزدیک ریل کے ایک حادثے میں ۱۴۷ اشخاص مر گئے۔ اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔

اکالی دل نے انڈیا کانگریس میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔

۲۶ نومبر - مسٹر اٹیلی سابق وزیر اعظم برطانیہ نے لنڈن کے اخبار ایوننگ سٹار میں اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ میرے خیال میں کشمیریوں نے ہندوستان کے ساتھ ہمیشہ رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ بخشی غلام محمد کی قیادت میں شاہراہ ترقی پر گامزن ہیں۔

مصر سے برطانیہ اور فرانس کی فوجوں کا اخراج شروع ہو گیا۔

۲۸ نومبر - چو این لائی وزیر اعظم چین، بارہ روزہ دورے پر ہندوستان تشریف لائے۔ دہلی کے پالم اڈے پر پنڈت نہرو، مرکزی کابینہ کے دوسرے وزراء اور ہزاروں لوگوں نے آپ کا خیر مقدم کیا۔ پنڈت جی اور مسٹر چو نے ہند چین دوستی پر خوشی اور فخر کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ دو ممالک امن عالم اور بقائے باہم کے اصولوں کے لئے مصروف جدوجہد ہیں۔

۲۹ نومبر - پنڈت جواہر لعل نہرو وزیر اعظم ہند اور مسٹر لائی وزیر اعظم چین نے ایک اور بار پنچ شیل کے اصولوں پر ثابت قدم رہنے کے لئے اپنے بھرپور عزم کا اظہار کیا ہے۔

۳۰ نومبر - برطانیہ اور فرانس نے مصر سے بلا کسی تاخیر کے اپنی فوجوں کے اخراج کا اعلان کر دیا۔ امریکہ نے برطانیہ اور فرانس کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا ہے کہ وہ مصر سے فوری طور اپنی فوجوں کو نکال لیں گے۔

ہنگری کی حکومت نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو ہنگری آنے کی اجازت دے دی ہے۔

سید جعفر احتشام رضوی۔ لکھنو

چائے کی کہانی

بچو! تم چائے ضرور ہی پیتے ہو گے۔ لیکن کبھی تم نے یہ بھی جاننے کی کوشش کی ہے کہ یہ دُنیا میں کہاں کہاں پیدا ہوتی ہے۔ تو آج میں تمکو یہ بتاتا ہوں کہ یہ کہاں اور کیسے پیدا ہوتی ہے

چائے زیادہ تر پہاڑوں کی ڈھلانوں پر کاشت کی جاتی ہے تاکہ پانی جمع ہو کر جڑوں کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ چائے کی کاشت کے لئے پانی کی بہت ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس میں نئے پتے نکلتے رہیں چین، ہندوستان لنکا، وغیرہ میں چائے کی کھیتی بہت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں چائے کی کھیتی ۸ لاکھ ایکڑ زمین پر ہوتی ہے جس سے ۱۳ لاکھ ٹن چائے پیدا کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں چائے کی بہت کھپت ہو رہی ہے۔

چائے نومبر کے شروع میں بوئی جاتی ہے اور قریب قریب چھ مہینے میں چائے کی جھاڑیاں اُگتی ہیں اور تین سال بعد جھاڑیاں چائے پیدا کرنے لگتی ہیں۔ چائے کی جھاڑیوں کو پانچ یا چھ فٹ سے زیادہ نہیں بڑھنے دیا جاتا۔ تاکہ چائے کی پتیاں چُننے میں آسانی رہے۔ یہ جھاڑیاں قریب ۴۰ سال تک چائے پیدا کرتی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں آسام دارجلنگ، دہرہ دون، اور کانگڑہ کی پہاڑیوں پر پیدا ہونے والی چائے کی پتی چھوٹی ہوتی ہے۔ جھاڑیوں سے پتیاں سال میں کئی بار توڑی جاتی ہیں۔ برسات میں توڑی ہوئی چائے کی پتیاں زیادہ خراب ہوتی ہیں انکا پتہ کالی اور ہری ہوتی ہے۔

چائے کی پتیاں جمع کر کے کارخانوں میں ڈالی جاتی ہیں۔ ان پتیوں کو بیس گھنٹے تک سکھایا جاتا ہے اور اگر ہوا میں نمی ہوتی ہے تو کمروں کو گرم کر کے سکھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد پتیوں کو مشینوں میں ڈالکر انکے اوپر بیلن چلایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان پتوں کو کڑھائی میں ڈال کر بھونا جاتا ہے۔ اور پھر ان کو ڈبوں میں بھر دیا جاتا ہے اس طرح کی چائے کو "ہری چائے" کہتے ہیں۔ ہندوستان سے چائے کا ۷۰ فی صدی حصّہ باہر بھیجا جاتا ہے۔

چائے سے ہم لوگوں کے بہت سے فائدے اور بہت سے نقصانات بھی ہیں۔ فائدے تو یہ ہیں کہ تھکن دوُر ہو جاتی ہے۔ اور جاڑوں میں گرم ہو جاتے ہیں۔

اور نقصان یہ ہے کہ چائے سے گرمیوں میں اور زیادہ گرمی لگنے لگتی ہے۔ اسی لئے لوگ گرمیوں میں کم چائے پیتے ہیں۔ اور جاڑوں میں زیادہ پیتے ہیں۔

تو ہاں تم لوگوں نے "چائے کی کہانی" سن لی اب تو جاڑا بھی آرہا ہے اس لئے خوب مزے لے لیکر چائے پیو۔

کُتا

مدن زتشی

کتنا اچھا اپنا کُتا
موٹا موٹا پیارا پیارا
سوکھی روکھی روٹی کھائے
ہڈی پائے خوب چبائے
اُچھلے کودے اُوپر نیچے
دوڑ لگائے جی بہلائے
پتھر کھڑکے چلّا اُٹھے
سایہ دیکھے غرّا اُٹھے
بھوں بھوں بھوں بھوں غوں غوں غوں غوں
ڈاکو آیا خطرہ لایا
دوڑ کے آؤ مار بھگاؤ

کشمیر

شاہراہ ترقی پر

ریاست جموں وکشمیر نے پہلے پنجسالہ منصوبہ کے دوران تعلیم کے میدان میں جو ترقی کی اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے

منصوبہ کے لئے مخصوص شدہ رقم - ۶۶۰۵۶ لاکھ روپے • متوقع اخراجات - ۴۶۰۷۵ لاکھ روپے

متعدد طبی اداروں کا درجہ بڑھانے کے علاوہ حسب ذیل نئے ادارے کھولے گئے

- کالج ۵
- تربیتی اسکول ۳
- ہائی اسکول ۲۹
- مڈل اسکول ۴۸
- مرکزی اسکول ۷۶
- پرائمری اسکول ۵۹۰
- مکتب اور پاٹھ شالائیں ۹۰
- لوئر ہائی اسکول ۱۳

شائع کردہ محکمہ اطلاعات حکومت جموں وکشمیر

باقیات

بقیہ:- بُدھ مت اور کشمیر

کے لحاظ سے سب سے ممتاز اور قابل ذکر ہیں۔ سری نگر بارہ مولہ کی شاہراہ کے چودھویں میل پر سڑک کے شمال میں کوئی میل بھر کے فاصلہ پر ایک کربوہ ہے۔ ہرہاس پور یہیں آباد تھا۔ یہاں ایک استوپ یعنی زیارت گاہ۔ ایک خانقاہ اور ایک عبادت خانے کے آثار نہایت بری حالت میں ملتے ہیں۔ اس استوپ کا بانی للتادتیہ کا وزیر جنکن تھا۔ اس کا قاعدہ ۱۲۸ فٹ ۲ انچ کا مربع ہے۔ یہاں کئی مجسموں کے ٹکڑے ملتے ہیں جن میں سے چیدہ چیدہ اب پرتاپ میوزیم کی زینت ہیں۔ اس کے جنوب میں راج وہار یا شاہی خانقاہ کے کھنڈر ہیں اور اس سے ملحق ایک عبادت خانہ ہے۔ ویسے تو ساری عمارتوں میں ہی بہت بڑے بڑے پتھر استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن اس عبادت خانے کی ایک طرف ایک ہی پتھر سے تراشیدہ تخت ہے جو شاید مورتیوں کے رکھنے کے کام آتا ہوگا۔ یہ تخت یا یوں کہئے کہ پتھر ۱۴ فٹ لمبا۔ بارہ فٹ چوڑا اور ۵ فٹ ۲ انچ موٹا ہے۔ اسے دیکھ کر مصری عمارتوں کے عظیم الجثہ پتھروں کی تفصیل یاد آتی ہے۔ کشمیر میں . . . . کیا ہندوستان بھر میں اس کی مثال مشکل سے ہی نظر آسکتی ہے۔ یہ آثار سڑک سے دور الگ تھلگ نہایت کس مپرسی کی حالت میں پڑے مٹتے چلے جارہے ہیں اور ہماری عظمت پارینہ کا یہ پرشکوہ نقش عوام اور علمی دنیا کی نظروں سے اوجھل ہے۔ کنشک کے بعد طوائف الملوکی پھیل گئی اور رفتہ رفتہ برہمنی تہذیب پھر پوری عوت سے چمک اٹھی۔ سنسکرت شعروادب۔ کشمیر شیو درشن اور زمانہ وسطی کے فن تعمیر کے شاہکار اس دور خوش بختی کے سب سے قیمتی تحفے ہیں۔

بقیہ:- لداخ کا لوک ادب

عموت کے مقابلے میں لڑائی کے وقت ایک معمولی سا منتر ہیرو کو کامیاب کردیتا ہے لامہ اکثر موقعوں پر ہیرو کی مدد کو پہنچ جاتا ہے۔ اسطرح لداخ کی کہانیاں قصے اور داستان وہاں کی زندگی کی صحیح عکاسی کرتی ہیں کیونکہ جیسے کہ پہلے عرض کیا ہے ادب زندگی کی تنقید یا عکاسی ہوتا ہے اور لوک ادب عموماً عوام کی مجموعی تخلیق کا نتیجہ ہوتا ہے، اسی لئے یہ عوام کے مجموعی احساسات، خواہشات، جذبات مشکلات اور اُنکے مسائل کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس مقالہ میں لوک ادب کے دوسرے اصناف مثلاً پہلیاں، لوریاں، کہاوتیں اور دوسرے گیت گانوں کا تذکرہ ضروری تھا لیکن ایک ہی مضمون میں تمام اصناف پر نظر ڈالنا مضمون کو طویل کردے گا۔

بقیہ:- حبہ خاتون کی شاعری کا سماجی پس منظر

عشقن خط کانِہ پرُنہ یکبار و ۔ ژہیہ کیھو واتھ میانہ مرُونے

ترجمہ:- ایک ہی نشست میں قرآن کے تیس سیپارے پڑھکر میں نے کہیں زیر یا زبر میں غلطی نہ کھائی۔ لیکن عشق کا صحیفہ کسی سے بھی آجتک مکمل نہ پڑھا جاسکا)

حبہ خاتون نے اپنی زندگی کے آخری چند سال ایک تارک الدنیا راہبہ کی طرح گذارے۔ اگرچہ اُس کے مزار کا تعین کیا جاچکا ہے۔ لیکن وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کہاں اور کب دفن ہوئی۔ بہرحال اُس کا دن ہر سال کشمیر میں بڑے شان اور احترام سے منایا جاتا ہے جو اس بات کی روشن دلیل ہے کہ کشمیری اپنے ادیبوں اور فنکاروں کو زندہ رکھنے اور اُن کی قدر کرنا جانتے ہیں۔

بقیہ:- بڈشاہ ——— ایک مطالعہ

کی موت پر جس نے اپنے حسن سلوک سے اُن کے دلوں کو مسخر کیا تھا۔ انتہائی رنج ہوا۔ کشمیر میں کوئی آنکھ نہ تھی جو پرنم اور آب دیدہ نہ ہوئی شعرا نے ماتم میں مرثیے لکھے۔ زین العابدین کو اپنے والد سلطان سکندر کے پاس ہی دفنایا گیا۔ اُن کا مقبرہ زینہ کدل سے ذرا نیچے واقع ہے۔ اس بادشاہ کی رعایا پروری کا ثبوت اس سے بڑھکر اور کیا ہوسکتا ہے کہ چھ سو سال گزرنے کے بعد بھی لوگ اُن کو بڑی عزت اور عقیدت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں دریائے جہلم پر جو آٹھواں پُل تعمیر کیا گیا اُسکا نام بڈشاہ پل رکھا گیا۔

نام نیک رفتگاں ضایع مکن۔ تا بماند نام نیکت برقرار

بخشی صاحب انڈونیشیا کے وزیر اعظم علی شاسترو موجوجو کے ساتھ

بہار ایڈیشن

پیرپنچال کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل
آبشاروں کی روانی سے یہ کہتا ہے کہ جاؤ
چشمۂ آب بنو، آب کا سنگیت بنو
ایک اک ذرۂ کشمیر کی تم پیاس بجھاؤ
اک نئے طرز سے تنظیمِ چمن ہونا ہے
باغ و صحرا میں بڑا فرق ہے یہ فرق مٹاؤ
دھان کے کھیت ہوں مخمل سے زیادہ شاداب
گیہوں کے کھیتوں میں پیمانۂ لالہ چھلکاؤ
جاؤ صحراؤں کی زلفوں کو سنوارو جاکر —
اور صحراؤں کو اس طرح سے پھولوں سے سجاؤ
کہ بہار آئے تو سمجھے مرا گھر ہے کشمیر
واقعی جنّتِ اربابِ نظر ہے کشمیر!

حضرت جگر مراد آبادی

ہر دستخط ثبت کر رہے ہیں
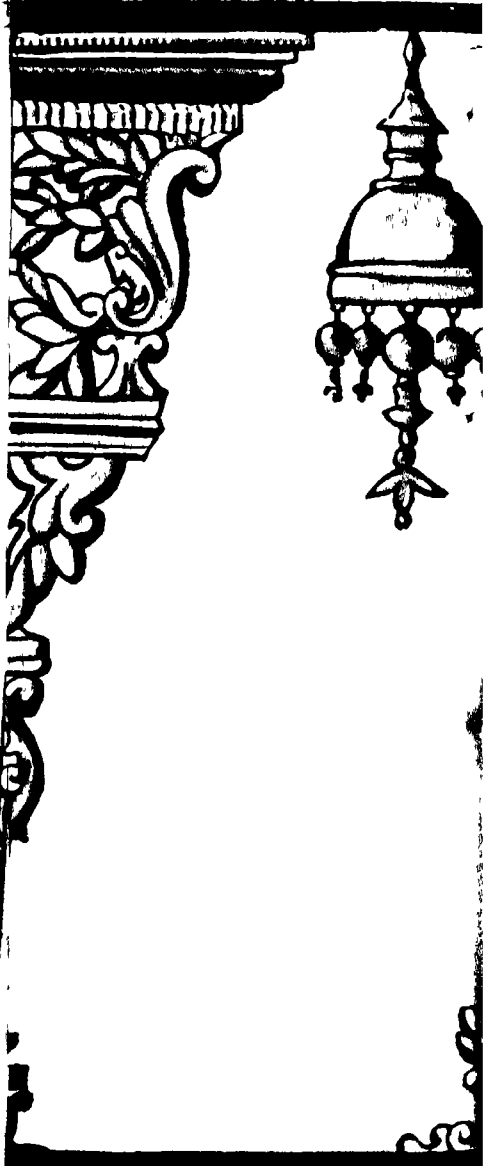
بخشی صاحب انڈونیشیا کے وزیر اعظم علی شاسترو موجوجو

۲۶ جنوری

چشمِ نرگس کا اشارہ تھا، بہار آ ہی گئی
اور سوسن نے پکارا تھا، بہار آ ہی گئی

پیر پنچال کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل
آبشاروں کی روانی سے یہ کہتا ہے کہ جاؤ
چشمۂ آب بنو، آب کا سنگیت بنو
ایک اک ذرہ کشمیر کی تم پیاس بجھاؤ
اک نئے طرز سے تنظیمِ چمن ہونا ہے
باغ و صحرا میں بڑا فرق ہے یہ فرق مٹاؤ
دھان کے کھیت ہوں مخمل سے زیادہ شاداب
گیہوں کے کھیتوں میں پیمانۂ لالہ چھلکاؤ
جاؤ صحراؤں کی زلفوں کو سنوارو جاکر —
اور صحراؤں کو اس طرح سے پھولوں سے سجاؤ
کہ بہار آئے تو سمجھے مرا گھر ہے کشمیر
واقعی جنّتِ اربابِ نظر ہے کشمیر!

جنوری سنہ ۱۹۵۶ء

تعمیر

سری نگر

ایڈیٹر

شمیم احمد شمیم

جلد ١ ـــــ شمارہ ٧

چندہ سالانہ ... ... ٦ روپے

فی پرچہ ... ... ٨ آنے

جنوری ١٩٥٧ء

ترتیب

عبدالغنی ڈار پرنٹر پبلشر نے لالہ رخ پبلی کیشنز سری نگر کی طرف سے شائع کیا

زاویے

۱۹۵۶ء کا سال اس لحاظ سے ہماری تاریخ کا ایک اہم دَور ہے کہ اس میں کچھ تاریخی اہمیت کے منصوبے تکمیل کو پہنچ گئے۔ آئین کی "تنسیخ" میں اور بانہال سُرنگ کا پہلا ٹیوب سالِ گذشتہ کا حاصل کہا جاسکتا ہے۔ یہ دو عظیم الشان کارنامے اپنی سیاسی، سماجی اور معاشرتی نوعیت کے لحاظ سے اتنی اہمیت کے حامل ہیں کہ ہم ہی نہیں بلکہ آیندہ آنے والی نسلیں بھی فخر اور غرور کے ساتھ ان کا ذکر کیا کریں گی۔ وزیرِ اعظم جناب بخشی غلام محمد نے بانہال سُرنگ کی افتتاحی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"ہمارے عزم اور ارادے کے سامنے پہاڑوں نے بھی اپنا سر جُھکا دیا۔
یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نیتوں میں خلوص ہو تو دُنیا کی کوئی طاقت
آپ کی مزاحم نہیں ہوسکتی۔ ہم نے پُورے شعور اور اعتماد کے ساتھ
اپنے عوام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ان کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لئے
اگر ہمیں پہاڑوں کا جگر چیر کر بھی راستہ بنانا پڑے ۔۔ تو ہم گُریز نہ کریں گے۔
بانہال کی سُرنگ ہمارے عزمِ صمیم اور ایفائے عہد کی پہلی منزل ہے۔"

جمہوریہ ہند کے نائب صدر ڈاکٹر رادھاکرشنن نے سُرنگ میں کام کرنے والے انجینئروں اور مزدُوروں کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے کہا کہ "بیرونی سیّاح ہندوستان آکر جب قدیم مندروں، مسجدوں اور اس نوع کے دیگر فنِ تعمیرات کو دیکھتے تو وہ ہم سے ایک معقول سوال یہ کرسکتے تھے کہ یہ سب تو تمہارے اسلاف کی دَین ہے، تُم نے خود کیا کیا ہے؟ اس معقول سوال کا اب ہمارے پاس ایک معقول جواب ہے اور وہ ہے بانہال کی سُرنگ ۔۔ اب ہم ان سے پُورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکیں گے کہ "بانہال کی سُرنگ ہماری تخلیق ہے۔"

بانہال سُرنگ کے اس عظیم کارنامے کی اس سے بہتر الفاظ میں تعریف نہیں ہوسکتی۔

✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣

۱۹۵۶ء کی الوداعی تقریب بانہال سُرنگ کا افتتاح تھا اور ۱۹۵۷ء کی استقبالیہ تقریب ۲۶ جنوری کو نئے آئین کے نفاذ سے ہوگی ۔۔۔ نئے آئین کا نفاذ ہماری نئی زندگی کی تمہید ہی نہیں، ہماری سال ہا سال کی جدوجہد کا ماحصل بھی ہے! یہ ایک خوشگوار اتفاق ہے کہ ہم اپنی نئی زندگی کا آغاز ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کے پُورے ایک سَو برس بعد کر رہے ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں پہلی بار ہندوستانیوں نے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی تھی جسے انگریز نے اپنی پُوری قوّت اور سیاسی ہتھکنڈوں سے ناکام بنا دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت بظاہر ناکام ہوکر ختم ہوگئی۔ مگر دراصل یہ اس جنگِ آزادی کی ابتدا تھا جس کا اختتامیہ ہند سے انگریز کا اخراج تھا۔ اس لئے تاریخی نقطۂ نظر سے ہندوستان کی جنگِ آزادی کا آغاز ۱۸۵۷ء میں ہی ہوتا ہے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۷ء کو ہماری ریاست میں نئے آئین کا نفاذ اِسی جنگِ آزادی کی تکمیل ہے جو ہندوستانیوں نے آج سے سَو سال پہلے حقِ خود ارادیت اور جمہوریت کے حصول کے لئے شروع کی تھی۔

✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣

ایشیائی ادیبوں کی چھ روزہ کانفرنس ختم ہوگئی ہے۔ کانفرنس کا آغاز جس ماحول میں ہوا تھا وہ کافی حوصلہ شکن تھا مگر رفتہ رفتہ کھچاؤ کم ہوتا گیا اور ڈیلی گیٹوں کو ادب اور ادیب سے متعلق کچھ اہم موضوعات پر تبادلۂ خیال کرنے کا موقع مِلا۔ نظریاتی تصادم تو ناگزیر تھا۔ لیکن یہ امر اطمینان بخش ہے کہ بنیادی مسائل پر قریب قریب تمام ایشیائی ادیبوں کے نظریے میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔ "ادیب کی آزادی" کا موضوع دو مکتبۂ فکر کے ادیبوں کے درمیان اختلاف کا موجب بنا رہا اور اس پر بحث کے دَوران خوب گرماگرمی رہی ۔۔۔ اس بات پر تو سبھی متفق تھے کہ ادیب کو سماجی بھلائی اور بہتری کے لئے ہی لکھنا چاہیئے۔ لیکن سماجی بھلائی اور بہتری کی قدریں خود ادیب معیّن کرے یا سماج، اس پر اتفاقِ رائے نہ ہوسکا۔

✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣

پریم ناتھ پردیسی ہماری ریاست کے واحد اُردو افسانہ نگار تھے جنہوں نے ہندوستان کے افسانہ نگاروں میں اپنا ایک مقام پیدا کر دیا تھا۔ پردیسی کی کہانیوں میں کشمیر کی رُوح ہے اور وہ غالباً اُردو کا واحد افسانہ نگار ہے جس نے کشمیری زندگی کی صحیح عکاسی کی ہے۔ ۱۱ جنوری ۱۹۵۵ء کو پردیسی کا انتقال ہوا۔ اسکی دوسری برسی پر "تعمیر" کا خاص نمبر نکالنا ممکن نہ ہوسکا۔ اس لئے اسکی ایک غیر مطبوعہ کہانی "سودائی" اسی شمارے میں شائع کی جا رہی ہے۔

راہی معصوم رضا

وادئ حیات

کشمیر اے خیال کی جنّت کے ہم نشیں　　اس کے بدن تو میری نظر کی طرح حسیں
حبّہ کی فکر ہے کہیں مہجور کی زمیں　　فصلِ خزاں پہ اُلٹی بہاروں نے آستیں
چشموں کے اضطراب میں حُسنِ بتاں کی بات
کہساروں میں ہے پستیٔ ہفت آسماں کی بات

مچلی ہے اس طرح سرِ کہسار ہر گھٹا　　جیسے بتانِ شوخ کو آئے کبھی حیا
جیسے بدن کے عطر میں ڈوبی ہوئی ہوا　　ڈالا قدم کہیں پہ تو جا کر کہیں پڑا
ہلکی سی چھاؤں میں سرِ کہسار ہر سحر
جیسے نظر جھکا لے کوئی دِل کی بات پر

کلیوں نے جھک کے کان میں اِک بات سی کہی　　جھرنوں نے میری بات سُنی پر کہاں سُنی
کہساروں میں بھٹک گئیں راہیں خیال کی　　خوابیدہ زخم جاگ اُٹھے جب ہوا چلی
سبزہ مہک کے لے گیا بیگانگی مری
سنکی ہوا تو جاگ اُٹھی دیوانگی مری

ہر لمحہ اِک پیالہ کہ اب چھلکا اب گری　　ہر غنچہ کے لبوں پہ ہے ہلکی سی اِک نمی
کافر ہے وہ جو کہدے یہاں پیاس بجھ گئی　　یاں تو یہ حال جتنی بھی پی تشنگی بڑھی
سبزہ میں، گُل میں، کالی گھٹا میں شراب ہے
زاہد یہاں کی ٹھنڈی ہوا میں شراب ہے

ہے مسکنِ بہارِ ارم یہ حسیں زمیں　　کس کو ہے فکرِ جیب، کسے فکرِ آستیں
آئے خزاں کا ذکر تو ہوتی ہے خشمگیں　　میرا مشاہدہ ہے یہ کوئی غلو نہیں
بچہ ہو یا جوان ہو، یہ حال ہو گیا
آئی خزاں چنار کا مُنہ لال ہو گیا

گو ہم یہاں سے جانے پہ تیار سے بھی ہیں! — یادِ وطن کی پی ہے تو ہوشیار سے بھی ہیں
لیکن یقین کر کہ گرفتار سے بھی ہیں! — اچھے بھی ہو رہے ہیں پہ بیمار سے بھی ہیں
جائیں گے ہم پہ یاد رہے گا کہاں رہے
سایہ ترے چنار کا یوں ہی جواں رہے

جس نے مجھے تراشا وہ آذر عزیز ہے — گنگا کی نرم لہروں کا بستر عزیز ہے
جس میں جواں ہوا ہوں میں وہ گھر عزیز ہے — مجھ کو بھی ایک پیار کا نشتر عزیز ہے
یہ تو نہیں کہ جانے سے انکار کر سکوں
نظموں میں کاش تجھ کو گرفتار کر سکوں

اپنے قلم کی لو سے جلائے ہیں جو دیے — میرے جنونِ شوق نے جیتے جو مرحلے
یہ میرے خواب ہیں وہ رہے میرے حوصلے — یہ بھی ہیں تیرے واسطے وہ بھی ترے لئے
میں پاس ہوں کہ دور مگر اعتبار کر
جو تجھ پہ جان دیں گے انہیں میں شمار کر

تو کارواں کے ساتھ ہے میں تیرا ہم سفر — خوابوں سے اپنے میں نے سجی تیری رہ گذر
رہزن کمین گاہ میں ہیں بھی تو کیا ہے ڈر — تیرے ہر ایک ذرّہ سے باندھا ہے میں نے سر
تو خود چمن بھی، جان بھی میرے چمن کی ہے
تو وہ کلاہِ کج مرے پیارے وطن کی ہے

سنتے تھے دیکھا جو صلۂ کیف و رنگ و بو — ہر ذرّہ میں چمکتا ہے خونِ رگِ گلو
حد یہ ہے ناچتا ہے رگِ سنگ میں لہو — تو اپنے ہی شہیدوں کے خوں سے ہے سرخرو
ہم جس سے روشنی لیں تو وہ آفتاب ہے
تاریخ میں وطن کی تو اپنا جواب ہے

جاگا ہے کس ادا سے ترا حسن بے حجاب — میدانِ گیر و دار میں کھلتے رہے گلاب
ہم بھی لڑے اندھیرے سے پر تیرا کیا جواب — جتنا بڑھا اندھیرا، چڑھا تیرا آفتاب
جس سمت اٹھے نگاہ اُدھر زندگی سی ہے
تاریکیوں میں دور تلک روشنی سی ہے

کس سوچ میں ہے کہہ دے تو اپنی بہار سے — ہر گل، ہر اک کلی، شجرِ سایہ دار سے
ہر زعفران زار سے، ہر لالہ زار سے — گردن جھکے نہ غیر کی وحشت کے بار سے
آئیں جو غیر مثلِ درِ یار بند رہ
اپنی پہاڑیوں کی طرح سر بلند رہ

ح ۔ ح

پردیسی ـــــــ ایک اجمالی جائزہ

پردیسی کے ذہنی اور فنی ارتقا کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان کی ذاتی زندگی کا مطالعہ کریں۔ آپ ایک نچلے متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ حوصلہ شکن مصائب اور تلخیوں کے گہوارے میں پروان چڑھے۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور گھر کی ذمّہ داریوں کا بوجھ ان کے نازک کندھوں آ پڑا۔ مجبور ہو کر تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا۔ اور ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ آپ آخری دم تک زندگی کی بے پناہ دشواریوں کا سامنا کرتے رہے۔ ذاتی زندگی کی تلخیوں نے آپ کو اتنا حسّاس بنایا کہ آپ نے کشمیر کے افلاس زدہ اور نہتے لوگوں کے دلوں کی دھڑکنوں کی آواز سن لی۔ آپ کو یہ دیکھ کر شدید صدمہ پہنچا کہ بہاروں میں پلنے والے انسان جہنم کی زندگی گذارتے ہیں۔ وہ صدیوں سے غلامی، جہالت، مذہبی تفرقات، توہمات، بیماریوں، اقتصادی اور ذہنی پستیوں اور نہ جانے کتنی ہی سماجی اور مذہبی بُرائیوں کے بوجھ تلے کراہ رہے ہیں۔

پردیسی کا شعور تلخ حقایق کی گود میں پروان چڑھا۔ وہ رومان کی نظرفریب وادیوں میں کیونکر بھٹکتے؟ آپ زندگی کی حقیقتوں کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی عظمت اور انفرادیت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کی حقیقی زندگی کی مختلف واردات کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو کشمیریوں کی اصلی زندگی سے خاصی دلچسپی ہے۔ خاص کر نچلے طبقوں کے مزدور پیشہ لوگوں کے ساتھ۔ "لباس تلے"۔ "کاریگر"۔ "سائڈ لائن"۔ "دیوتا کہاں ہیں؟"۔ "اُجالے اندھیرے"۔ "سنکرات"۔ "اَن کوٹ" خاص کر ان طبقوں کی مجبور زندگی کے مختصر خاکے ہیں۔ "کاریگر" میں مصنف نے ایک کشمیری دست کار مام دین کو پیش کیا ہے جو اپنے طبقہ کا نمایندہ کردار ہے۔ کشمیر کے دست کار اپنی تخلیقات کو خونِ جگر سے صیقل بخشتے ہیں۔ اور خود مُفلسی، تنگ دستی اور بیماری کے دم گھٹا دینے والے اندھیروں میں سانس لیتے ہیں۔ فنی نقطۂ نظر سے یہ افسانہ بہت کامیاب ہے، نقطۂ عروج پر واقعات کا رُخ نفسیاتی طور پر بدل جاتا ہے۔ مالکِ دُکان اور نفسیات کا معلّم دونوں کردار نگاری کے اچھے نمونے ہیں۔ "لباس تلے" سماج کی اُونچ نیچ پر ایک گہرا طنز ہے۔ وِشومبر کو مالک نے بڑے دن کی خوشی میں اپنا پُرانا اوورکوٹ دے دیا تھا اور وہ بلندیوں میں پرواز کر رہا تھا۔ لیکن جلد ہی ٹھوس حقایق سے دوچار ہونے پر اُسے محسوس ہوا کہ وہ اوورکوٹ کے قابل نہیں۔ اوورکوٹ صرف پیسے والے ہی پہن سکتے ہیں، ایک نوکر نہیں جس کی جیبیں خالی ہوں۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

پردیسی کی کہانیوں کی یہ بھی پہچان ہے کہ ان میں کشمیریوں سے متعلق بے پناہ ہمدردی اور خلوص جھلکتا ہے۔ لیکن یہ خیال کرنا غلط ہو گا کہ وہ کشمیریوں کی حالتِ زار دیکھ کر صرف آنسو بہانا ہی جانتے ہیں۔ وہ آنسو بہلنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ تلملا اُٹھتے ہیں۔ اور بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ "اُجالے اندھیرے" ایک ایسے حسّاس نوجوان کے احساساتی اُتار چڑھاؤ کا آئینہ ہے جو ظالم سماج کی بدعنوانیوں، ناانصافیوں اور جفاکاریوں اور مظلوم اور نہتے لوگوں کی بے چارگیوں کو دیکھ کر تڑپ اُٹھتا ہے۔ اس کے دل میں جذبۂ بغاوت جاگ اُٹھتا ہے ـــــــ "میں کسی کا قیدی نہیں ہوں، مجھے آزادی کا حق ہے۔ میں اپنی لذّات فنا کرنا نہیں چاہتا۔ میں زندگی کے اقتدار کو جانتا ہوں۔ زندگی کی حقیقی مسرّتوں کو سمجھتا ہوں ـــ"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

پردیسی نے اپنی کئی کہانیوں میں کشمیریوں کی سماجی زندگی کے کئی پہلوؤں کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ آپ نے ان کی تہذیب، ان کے عادات و اطوار، لباس اور رہن سہن کے طریقوں، گھریلو حالات اور سماجی رسوم پر بڑی کامیابی کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے۔ "اُجرت"۔ "چور"۔ "چتائیں"۔ "جھنجھنا"۔

"ٹیکہ ٹبنی" - "امام صاحب" اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔

پردیسی کو انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ تھا۔ انسانی نفسیات کا تجزیہ، جو اس کے فن کا ایک خاصہ ہے، اُس کی عظمت کی ایک روشن دلیل ہے۔ "دھول" ایک مفلس عورت کی جذباتی زندگی کی حسین عکاسی ہے۔ وہ اپنا سب کچھ خاوند کے قدموں تلے نچھاور کرنے کے باوجود ازدواجی زندگی کی لطافتوں کو حاصل نہیں کرسکتی۔ وہ زندگی میں ایک خلا محسوس کرتی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے ہاں بچہ نہیں۔ اور بچہ حاصل کرنے کے لئے اُس کے پاس پانچ روپے نہیں تاکہ وہ بچھواڑے کی نرس سے دوا خرید سکے۔ آخر جب خاوند کی تمام تر توجہ اور محبت حاصل کرنے کے لئے وہ ایک سیاح سے اپنی تصویر کھچوانے پر رضامند ہوتی ہے اور اسی طرح پانچ روپیہ حاصل کرتی ہے۔ لیکن غیر متوقع طور پر اس کا خاوند اس کے اس قدم کو اخلاقی گراوٹ سے منسوب کرتا ہے۔ یہی اس کی ذہنی اور جذباتی شکست ہے۔ افسانہ فنی خوبیوں کا آئینہ دار ہے ... ... "شام و سحر" میں پردیسی نے کئی کہانیوں مثلاً "راجو کی ڈولی" - "پارسل" - "ماں کا پیار" میں انسانی فطرت کے بنیادی جذبات اور احساسات کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

پردیسی کے شعور کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس کا فن بھی ارتقائی منزلیں طے کرتا گیا۔ اُس کو جدید افسانہ کی تکنیک پر پوری دسترس تھی۔ آپ زندگی کے کسی معمولی واقعہ یا بات کو افسانہ کا موضوع بنا سکتے تھے اور بڑے شگفتہ اور فن کارانہ انداز سے پڑھنے والے کے ذہن پر ایک دیرپا اور گہرا اثر پیدا کر دیتے۔ کہانی تخلیق کرتے ہوئے آپ کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ آپ فنی نزاکتوں اور اُلجھنوں میں پھنس کر نہ رہ جائیں بلکہ آپ اپنے تجربات، احساسات اور مشاہدات کو ایک نپے تلے اور متاثر انداز ... پیش کریں۔ سید احتشام حسین لکھتے ہیں — "پردیسی کے افسانوں میں نہ کھینچ تان ہے نہ واقعات توڑ مروڑ کر بیان کئے گئے ہیں۔ نہ نتیجے محض نتیجہ نکالنے کے لئے نکالے گئے ہیں۔" آگے چل کر وہ لکھتے ہیں — "فن کار کے لئے سچائی اور سادگی دو بڑے سہارے ہیں جن کی مدد سے وہ فن کی دشوار گذار وادیوں میں سفر کرتا ہے۔ پردیسی کے پاس یہ دونوں سہارے تھے۔ اس لئے ان کی افسانہ نگاری میں حسن اور کشش کے ساتھ تاب و تواں بھی ہے۔" "سنکرات" - "دھول" - "پھسلن" - "بجھتے چراغ" - "مہمان" خاص کر فنی خوبیوں کے آئینہ دار ہیں۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

پردیسی کی افسانہ نگاری کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان افسانوں کے آئینوں میں ہمیں مصنف کی قابلِ قدر اور متین شخصیت کے نقوش نظر آتے ہیں۔ تقریباً ہر کہانی میں آپ کے بے پناہ جذبۂ ہمدردی، خلوص، انسانیت اور سلجھے ہوئے تفکر کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

آپ کے فن کی یہ خصوصیت بھی نمایاں ہے کہ آپ اپنے قوتِ مشاہدہ اور تخیل کی گلکاریوں سے فطرت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے نثر میں شاعرانہ رنگینی پیدا کرتے ہیں۔ آپ نئی تشبیہیں اور استعارے تخلیق کرنے میں پوری قدرت رکھتے ہیں جس سے حسنِ عبارت میں دل کشی اور تنوع پیدا ہوتا ہے۔ "دھول" میں لکھتے ہیں — "بڑی کالی، مہیب صورت پہاڑیوں کے پیچھے صبح کا مسکراتا ہوا سورج دھیرے دھیرے اوپر آچکا تھا اور ابھی تک اُسے اپنے پپوٹوں میں آنسوؤں کی نمی کا احساس ہو رہا تھا۔"

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

انتخابِ میر

دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا — اور بھی وقت تھے بہانے کو

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ — نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جائے گا

کل نہ آنے میں ایک یاں تیرے — آج سو سو طرف گمان گیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا — آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد — ایسے پھر خانماں خراب کہاں

داغ فراق و حسرتِ وصل آرزوئے شوق — میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا

تعمیر

جنوری ۱۹۵۰ء

پریم ناتھ پردیسی

سودائی

اُسے خبط تھا نہ جنون ـــــ کوئی خاص بیماری بھی نہ تھی۔ پھر بھی لوگ اُسے سودائی کہتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ وہ رات کو بہت دیر تک دریا کی طرف کھلنے والی کھڑکی پر بیٹھا لہروں کا رقص، پانی کا بہاؤ، خاموشی اور تاریکی کی دُنیا دیکھتا رہتا تھا۔ یا کبھی کبھی سرود پر گت بجایا کرتا تھا جس کی لے سے، نیچے گھاٹ پر کشتی کے دالان میں پڑی ہوئی تپ دق کی مریضہ سو جاتی تھی۔

"گت انسانی زندگی کے لئے کس قدر مفید اور اہم ہے!" وہ کبھی کبھی سوچتا اور نوجوان مانجی کی حسین بیوی جسے ڈاکٹر کی دوائیں، انگوروں کا رس اور انڈے کی زردی نیند نہیں لا سکتیں۔ "اُف! انسانی زندگی کس قدر نامکمل اور ادھوری ہے۔" "طب، فلسفہ، ریاضی، قانون، سرود، سرسنگار کتنی ہی چیزیں ابھی زندگی کی ضروریات میں داخل ہونے والی ہیں ـــ اور پھر انسان بیمار نہ ہوگا۔ اُداس نہ ہوگا، شاکی نہ ہوگا۔ نئے نظام کے ساتھ ساتھ نئی چیزوں کی ایجاد، نئی روشنیوں کا پھیلاؤ لازمی اور لابدی ہے۔"

نیچے شکستہ گھاٹ کے ایک طرف حبیب اللہ کا کارخانہ تھا۔ دن بھر چھپر کے نیچے مزدوروں کا ایک ہنگامہ سا بپا رہتا تھا۔ نئی شہتیریاں آتی تھیں۔ پرانی شہتیریاں تختوں اور کڑیوں میں مبتدل ہوتی تھیں۔ بچی کھچی تراش لٹکتی ہوئی ترازو کے پاس جمع ہو جاتی تھی جسے شام کو ننگے بھوکے چیتھڑوں میں ملبوس عورتیں اور کھانستے ہوئے بیمار اور پیلے پیلے بوڑھے خرید کر لے جاتے تھے۔

دریا میں پڑی ہوئی شہتیریاں موٹی طنابوں سے بندھی رہتی تھیں۔ پانی کا بہاؤ اُن سے چھو کر اُنہیں گدگدا کر، اُن کی کروٹوں میں بھلے چھو کر اُداس اُداس سا نکل جاتا تھا۔ زندگی اپنے بہاؤ میں کسے ساتھ لینا نہیں چاہتی۔ لیکن یہ تنی ہوئی طنابیں، عزت، اخلاق، دولت اور سرمایہ کی موٹی طنابیں ـــــ اُسے حبیب اللہ سے محبت تھی کیونکہ وہ ستار کا شیدائی تھا اور ستار انسانی زندگی کے لئے کچھ کم اہم نہیں۔ جب مزدور لکڑی چیرتے چیرتے آرے چلاتے چلاتے گاتے ؎

چیرہ تو ـــــ کچھ دو
فلُیے ـــــ دو نہ دے
کچھ دو ـــــ دو نہ دے

تو حبیب اللہ چوکی پر بیٹھا ستار سنا کرتا۔ فرطِ شوق میں وہ کبھی کبھی آنکھیں بھی بھینچ لیتا۔ اور چیتھڑوں میں ملبوس گویّا کیلے فرش پر بیٹھا اپنی انگلیوں سے ستار کے تاروں میں زیادہ ارتعاش پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ آرہ چلانے والے مزدور بھی ستار کا نغمہ اور گویّے کا گیت سنتے۔ لیکن اُن کے تصوّر پر پھولوں کے کھیت چھائے ہوتے ـــــ وہ ستار کے نغمے کے ساتھ ساتھ گا اُٹھتے ـــــ

چیرہ تو ـــــ کچھ دو ـــــ فلُیے ـــــ دو نہ دے

وہ تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرنا چاہتے۔ لیکن نہیں ـــــ شام ہونے سے پیشتر اُنہیں شہتیری سے کڑیاں نکالنی تھیں۔ گویّا ستار بجا کر اپنی انگلیوں کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا۔ خفیف سے خراش، ہلکے ہلکے زخم جن سے لہو نہیں بہتا۔ صرف میٹھا میٹھا درد اُٹھتا ہے۔ چہرے پر مسکراہٹ پھیلا کر وہ حبیب اللہ کی طرف دیکھتا۔ جیسے کچھ پوچھتا ہو۔ حبیب اللہ اس کا مطلب تاڑ کر ایک مزدور سے کہتا۔ "اسے پانچ سیر بالن دے دو۔"

گویّا کپڑے کی میلی چادر میں بالن باندھ کر لے جاتا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ فرش پر پڑی ہوئی چھوٹی سی تراش بھی چپکے سے اُٹھا کر لے جاتا۔

"بدمعاش!" حبیب اللہ اُس کی یہ حرکت دیکھ کر حقارت بھرے لہجے میں اپنے آپ سے کہہ اُٹھتا۔ سودائی کھڑکی پر بیٹھا ہر روز یہ تماشا

دیکھتا۔ اُسے گوّیے کی زندگی پر ہنسی آتی۔ کمینہ "

کبھی کبھی اس کی توجہ چھپّر سے ہٹ کر کشتی کی طرف جاتی۔ نوجوان ہانجی دن بھر اپنا خسارہ لے کر کہیں چلا جاتا۔ اور اس کی حسین بیوی کشتی کے دلان پر کبھی میلے بستر پر لیٹتی۔ یا کبھی ٹوٹے ہوئے آئینے میں اپنا مُنہ دیکھتی۔ دواؤں کی کتنی ہی بوتلیں اُس کے دائیں بائیں تھیں۔ جن پر خوراک کی بڑی بڑی نشانیاں لگی ہوئی تھیں اور سنگترے کا اُترا ہُوا چھلکا جو شاید مریضہ نے دوپہر کو کھایا تھا وہیں پڑا رہتا۔ مریضہ اُسے اکثر کھڑکی پر بیٹھا دیکھتی۔ کبھی کبھی دونوں کی آنکھیں چار ہوتیں۔ "اُف! مریضہ کی آنکھوں میں شباب کی کتنی تند آگ ہے۔" وہ اپنے دل سے کہتا۔ لیکن مریضہ خاموش رہتی۔ صرف اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے جن کے گرد سیاہ دائرے پڑ چکے تھے۔ اُسے دیکھتی۔ شاید اس لئے کہ وہ بعض اوقات رات کے وقت گت بجایا کرتا تھا۔ اور مریضہ سو جاتی تھی۔

"تپ دِق اور حُسن" کتنا ظلم ہے!" وہ اپنے دل سے کہتا۔ لیکن میلی کچیلی زندگیاں یُوں ہی ختم ہو جاتی ہیں ـــــ اور یہ ہانجی کی حسین بیوی جو کشتی کے دالان پر پڑی ٹوٹے آئینے میں اپنا مُنہ دیکھتی ہے شاید اپنے حسین چہرے کے بگڑے ہوئے نقوش سے اپنی صحت کا اندازہ لگاتی ہے۔ لیکن یہ حُسن کیا جانے۔ ابھی اس کی تعریف نامکمل ہے۔ یہ تپ دق کی مریضہ ہے جو اس طرح آئینے میں مُنہ دیکھ دیکھ کر ایک دن مر جائے گی۔

اس نے طبّ کی ایک ضخیم کتاب میں پڑھا تھا۔ تپ دق پھیپھڑوں کی بیماری ہے۔ مرتے دم تک مریض کے ہوش وحواس بجا رکھتی ہے لیکن صحت یاب نہیں ہونے دیتی۔ انڈے، شوربہ، تازہ ہوا، صفائی، پھَل اور دُودھ اس کا علاج ہے۔

ایک دن دوپہر کو وہ کھڑکی کھول کر بیٹھا۔ آج وہ بے حد خوش تھا۔ رات کو سُرود بجاتے بجاتے اس کے شوق نے نئی گت ڈھونڈ نکالی تھی۔ ایک دل فریب گت جس پر کائنات کو نیند آ سکتی تھی۔ سرود طاقچے پر مخملی غلاف میں تھا۔ اور نئی گت اس کے ذہن میں پوشیدہ۔ آج شام وہ نئی گت پُوری قوت کے ساتھ بجائے گا، حتیٰ کہ مریضہ سارا دُکھ درد بھُول کر سو جائے گی۔

اُس نے دیکھا۔ مریضہ رضائی کے نیچے لیٹی پڑی ہے۔ اس کا جوان خاوند اُس کے پاس ہی حقہ پی رہا ہے۔ چھپّر کے نیچے سے آروں کے چلنے کی آواز آ رہی ہے اور گھاٹ پر موٹی طنابوں سے شہتیریاں باندھی ہوئی ہیں۔ دریا میں بُلبلوں کی طرح شکارے تیر رہے ہیں۔ خوش پوش سیّاح اور حسین فرنگی سپرنگ والی گدیوں پر لیٹے دریا کی سیر کر رہے ہیں۔ ہانجی پُوری قوت کے ساتھ شکارہ چلا رہے ہیں۔ اُن کے ماتھے پسینے سے شرابور ہیں اور بازوؤں کی مچھلیاں پھٹی پڑی ہیں۔ دریا کی لہروں میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن بہاؤ بدستور جاری ہے۔ تنکے، پتّے، پھٹی ہوئی چٹائیاں لاشے اور مینڈھے بہے جاتے ہیں۔ بہتا پانی ہر کمزور چیز کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ اس نے بے مطلب سا قہقہہ لگایا۔ بہتا پانی ـــ ایک دن سب کو اپنے ساتھ بہا لے جائے گا۔ ان شہتیریوں کو بھی، مریضہ کو بھی، کشتی کو بھی، گوّیے کو بھی۔ لیکن نہیں، فلسفہ ایسا نہیں کہتا۔ جو چیز طناب سے بندھی ہوئی ہے وہ بہہ نہیں سکتی۔ تنظیم اُسے بہنے نہیں دے گی۔ کارخانے کا مالک حبیب اللہ سپرنگ والی گدیوں پر بیٹھنے والے سیّاح اور فرنگی اس بہاؤ میں نہیں بہہ سکتے۔ صرف آرے چلانے والے مزدُور، گیلے فرش پر ستار بجانے والا گوّیا تپ دق کی حسین مریضہ۔ اور اُس کا خاوند بھی کچّی تراشش خریدنے والے نیم عُریاں بوڑھے اور عورتیں ـــــ ابھی زندگی نامکمل ہے ـــــ ابھی زندگی کا شیرازہ بکھرا پڑا ہے۔ اسے سنوارنے کے لئے کسی مضبوط اور آہنی ہاتھ کی ضرورت ہے جو اس کے گرد موٹی طناب باندھے۔ ابھی زندگی نامکمل ہے۔ ارزاں ہے ـــــ"

تھوڑی دیر کے بعد وہ چونک اُٹھا۔ نوجوان ہانجی اپنی بیمار بیوی سے لڑ رہا تھا ـــــ

"میرے پاس اب کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ مرنا ہے تو مر جاؤ۔ میں غریب ہوں۔" مریضہ کے چہرے سے رضائی سرک گئی۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح سُرخ ہو گیا تھا ـــــ

"حُسن ـــ شعلہ بار حُسن ـــ" سودائی نے مچل کر کہا۔ "کاش حُسن کی صحیح تعریف ہو سکتی ـــ"

مریضہ نے سیاہ پلکیں اُٹھا کر خاوند کی طرف رحم جُویانہ نظروں سے دیکھا اور خاوند کہنے لگا۔ "سات پیسے میں سنگترہ ملتا ہے اور دو آنے میں ایک انڈا اور پھر دوا۔ دُودھ۔ یا اللہ تم مر کیوں نہیں جاتیں! ایسی

بیماری کے لئے قارون کا خزانہ بھی کم ہے۔ اور میرے پاس اب کچھ بھی نہیں۔"

اسی وقت ایک خوبصورت شکارہ وہاں سے گذرا جس میں ایک فرنگی جوڑا تھا۔ میم کی گود میں ایک کُتا تھا۔ جسے وہ بسکٹ کھلا رہی تھی اور صاحب مُسکرا رہا تھا۔ شکارے کو پانچ ہانجی چلا رہے تھے اور کبھی کبھی بلند آواز میں کہہ اُٹھتے تھے۔ "بڈشاہ — پاتھ شاہ —"

مریضہ کے خاوند نے بڈشاہ کی آواز سُن کر دریا کی طرف دیکھا اور ایک لمبی آہ کھینچی۔ کُتا بڑے اطمینان سے بسکٹ کھا رہا تھا اور کبھی کبھی گھاٹ پر میلے کچیلے کشمیری کو دیکھ کر بھونکتا بھی تھا۔ اس وقت میم، صاحب اور پانچوں ہانجی کھلکھلا کر ہنس دیتے تھے۔

مریضہ کانپ رہی تھی۔ وہ آج دالان کی چوبی دیوار کے سہارے بیٹھ نہ سکتی تھی۔ بوتلوں کی دوائیں ختم ہوگئی تھیں اور دُودھ کی بوتل خالی تھی۔ اُس نے نہ جانے اپنے خاوند سے کیا کہا کہ وہ پھر تڑپ اُٹھا۔ "آگے ہی قرض سے دب گیا ہوں۔ اور کتنا دباؤ گی!"

مریضہ یہ سُن کر خاموش ہوگئی۔ اُس کی گول گول آنکھوں سے شبنم کے قطروں کی طرح آنسو پھوٹنے لگے۔ سودائی نے اپنے آپ سے مُسکرا کر کہا۔ "غصّہ زندگی کا دُشمن ہے اور آنسو حُسن کے دُشمن۔ البتہ ایسی زندگیوں کے لئے جو طنابوں سے بندھی نہیں غصّہ اور آنسو تابع داری کے لئے مُفید ہیں بلکہ ضروری —"

اور مریضہ کا خاوند زیادہ نادان نہیں۔ سودائی نے سوچا۔ "سات پیسے میں سنگترہ آتا ہے اور دو آنے میں ایک انڈا۔ ریاضی میں قیمتوں ہی پر زور دیا گیا ہے اور قیمتیں ہی زندگی میں شمار ہوتی ہیں۔ نغمے کی قیمت پانچ سیر بالن بہت کم ہے۔ لیکن گویا ریاضی سے واقف نہیں۔ وہ بیوقوف ہے اُس نے سنگترے اور انڈے کی طرح اپنی انگلیوں کی حرکتوں کی قیمت طلب نہیں کی۔ وہ بے وقوف ہے اور زندگی ابھی مجموعی طور پر نامکمل ہے ارزان ہے!"

سودائی نے مخملی غلاف سے سرود نکالا۔ اور نئی گت بجانے لگا۔ لیکن مریضہ کو نیند نہیں آئی۔ وہ کروٹ پر کروٹ بدلتی رہی۔ شاید اسے شدّت کا بخار تھا۔ چھپر کے نیچے آرے چل رہے تھے اور دریا کا پانی تنکے، پتّے اور چیتھڑے لئے بہہ رہا تھا۔

سودائی بار بار مریضہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسے حیرت تھی۔ نئی گت اور بیداری۔ اُسے مرنا ہوگا اور مرنے کے وقت کوئی بھی نغمہ سکون نہیں پہنچا سکتا۔ فلسفے میں ایسا ہی لکھا ہے اور موت بُری نہیں۔ یہ لڑکی حسین ہے اور حُسن نہیں مرتا۔ نُور کے ساتھ تحلیل ہو جاتا ہے۔

اُس نے سرود ایک طرف رکھ دیا۔ اور نئی گت کی ناکامی پر افسوس کرنے لگا۔ جب یُوں بھی اُس کی تشفی نہ ہوئی تو کھڑکی بند کر کے کمرے سے باہر نکلا۔

ایک جگہ بہت بڑا مجمع تھا۔ ایک گدھا اور اُس کا مالک پٹے جا رہے تھے

"سُور کا بچہ —"

"ڈاکو —"

"اسے پولیس میں بھیج دو —"

"ابھی قحط نہیں پڑا —"

"توبہ — توبہ —"

سودائی لوگوں کو دھکیل دھکیل کر گدھے کے برابر کھڑا ہوگیا۔ "کیا ہے۔ کیا ہے؟" اس نے لوگوں سے پوچھنا شروع کیا۔

"سُنو میاں۔ بیس سیر مٹی کی قیمت دو آنے طلب کرتا ہے۔ کہتا ہے لت پور سے لے آیا ہوں۔" ایک نے کہا۔

"بڑا پاجی ہے۔ گدھے کو بوجھ پر لگا دیا ہے اور آپ پیسے بٹورتا جاتا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔

تیسرے نے گدھے کو لات مارتے ہوئے اس کے مالک سے کہا: "بھاگ، یہاں سے حرامی — سات پیسے بہت ہیں — بھاگ — "

سودائی تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اُس نے اپنے دل میں اندازہ لگایا۔ "بیس سیر مٹی کی قیمت دو آنے — "

پھر جھک کر بولا۔ "دو آنے سچ مچ زیادہ ہیں۔ مٹی دُنیا میں بے شمار ہے اور سِکّے محدود۔ بس سات پیسے ٹھیک ہیں۔ ایک سنگترہ ! "

لوگوں میں اطمینان سا پھیل گیا۔ اور سودائی نے پھر کہا۔ "میں نے ریاضی کی کتابوں میں دیکھا ہے۔ پانچ سات پیسے مناسب ہیں۔ سات پور زیادہ دُور نہیں، صرف بارہ میل۔" پھر گدھے کے مالک سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جا بھاگ یہاں سے۔ خواہ مخواہ شور مچا رکھا ہے اور طبّی اصول کے مطابق شور زندگی کی راحت کا دشمن ہے۔ بھاگ یہاں سے۔ اور ہاں گدھے کو چارہ کھلا — پانی پلا — بھاگ — "

مجمع آہستہ آہستہ منتشر ہو گیا۔ سودائی خوش تھا کہ اس کی تعلیم نے گدھے اور اس کے مالک کو بچا لیا۔

وہ آگے چلتا گیا۔ شام کی تاریکی آہستہ آہستہ پھیلتی گئی۔ کھمبوں کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ اُس نے سوچا۔ گدھا اور انسان دونوں میں بہت کم فرق ہے۔ ایک چُپ رہتا ہے اور دوسرا بولتا ہے۔ دونوں لاتیں کھا سکتے ہیں۔ دونوں بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ طبّی اصول کے مطابق دونوں کی رُوح ایک جیسی ہے۔ دونوں کے محسوسات ایک جیسے ہیں۔ دونوں لت پور کے ہیں۔ جہاں سے پانی اپنے ساتھ تنکے، پتے، لاشے اور بوسیدہ چٹائیاں بہا کر لے آتا ہے اور پھر بیس سیر مٹی کی قیمت دو آنے — کیوں؟ سات پیسے کیوں نہیں؟ سنگترہ بھی تو سات ہی پیسے میں ملتا ہے۔ سنگترے دُنیا میں تھوڑے ہیں اور مٹی بے اندازہ !

وہ آگے چلتا گیا۔ شہر سے بہت دُور نکل کر ایک جگہ اُسے ٹھوکر لگی۔ وہ چونک اٹھا۔ کسی نے کراہتے ہوئے "ہائے" کی۔

"کون ہے؟"

کسی نے آہستہ سے کہا۔ "ایک انسان ! "

"انسان ! " سودائی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "نامکمل انسان۔ لیکن سڑک پر کیوں بیٹھے ہو۔ نہیں جانتے قانون کی رُو سے یہ جُرم ہے۔ "

"جانتا ہوں ! "

"جاؤ ایک طرف بیٹھو۔ پھر قانون سے بچ کر رہو گے۔ یہ شاہراہ عام ہے۔ "

"سلام دوست ! " کسی نے کھڑے ہو کر خوشی کے لہجے میں کہا۔

"کون دوست، میرا کوئی دوست نہیں — " سودائی نے اُسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے فلسفہ بہت پڑھا ہے، ریاضی بھی، قانون بھی اور طب بھی۔ ٹھیک ہے نا؟ "

سودائی نے سر اونچا کر کے فخریہ انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے اور مُرلی بھی بجاتا ہوں۔ کل میں نے نئی گت ایجاد کی۔ "

"شاباش۔ لیکن — تم نے گدھے اور اُس کے مالک کو اپنی واجبی اُجرت سے کیوں محروم کرا دیا — ؟ "

"محروم ! " سودائی نے حیرت میں کہا۔ "نہیں نہیں دو آنے زیادہ تھے۔ بس سات پیسے۔ سنگترہ بھی تو سات ہی پیسے میں ملتا ہے۔ "

"خاموش — دو آنے صرف کھُدائی کی اُجرت تھی۔ مٹی وہ مُفت میں دے رہا تھا۔ اور پھر گدھے کا بوجھ — اپنی اُجرت — پھر بھی پِٹا گیا۔"

"تم بھی وہاں تھے — ؟ " سودائی نے قریب آ کر پوچھا۔

اُس انسان نے اپنی مونچھوں کو مروڑتے ہوئے کہا۔ "اور وہ تپ دق کی مریضہ جسے دُودھ نہیں ملا۔ انڈا نہیں ملا۔ سنگترہ نہیں ملا۔ اُس کے خاوند کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن تم خاموش رہے۔ تمہارا دِل نہیں دھڑکا تمہارا سینہ نہیں پھٹا۔ تم روئے نہیں — "

سودائی نے جلد جلد کہا۔ "یہ غلط ہے۔ وہ لڑکی بے حد حسین ہے۔ لیکن تپ دق میں مبتلا۔ اور طب میں لکھا ہے۔ بیمار کافی عرصہ مبتلا رہتا ہے لیکن صحت یاب نہیں ہوتا۔ رُوح تحلیل ہوتی ہے۔ حُسن نور میں سما جاتا ہے۔ وہ مر جائے گی میرے دوست میری نئی گت سُن کر اُسے نیند نہیں آئی — "

"تف ہے تمہاری گتوں پر۔ بیمار گتوں سے ٹھیک نہیں ہوتے۔ اُنہیں ہمدردی، محبت، علاج، خدمت اور پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم نے

اس کے لئے کیا کیا۔ یہی سوچا کہ موت بُری نہیں۔"

سودائی کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ عجیب قسم کا انسان اُسے مِلا تھا۔ اُس نے اپنے دِل میں سوچا۔ انسان بھی خُدا کی عجیب تخلیق ہے۔ ایک دوسرے سے مختلف سب کا زاویۂ نگاہ جُدا ہوتا ہے اور فلسفہ میں ایسا ہی لکھا ہے۔

"تمہارے پاس انسان کی کیا تعریف ہے" سودائی۔ انسان ؟ ہاں ابھی نامکمل ہے۔ ابھی نہیں۔ چیزیں نہیں آئیں۔ گتیں ایجاد نہیں ہوئیں۔ نغمے کی قیمت مقرر نہیں ہوئی۔ ابھی انسان نامکمل ہے۔" سودائی نے کہا۔

کُتّے۔ فلسفی کہیں کے !"

سودائی تلملا اُٹھا۔ "خاموش ! قانون کی رُو سے یہ جائز نہیں ہے اور اس کی سزا مقرر ہے۔"

"سُنو ! ہم بھی ایک دِن تمہاری طرح تھے اور ہمارے سامنے انسانیت موت کی ہچکیاں لے رہی تھی۔ انسان اُجرتوں پر گدھوں کی طرح پیٹے جاتے ہیں۔ ہماری چھتوں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتے تھے اور ہم وائلن بجایا کرتے تھے۔ دُور سے تماشا دیکھتے تھے۔ ہنستے تھے۔ لیکن ہمیں محسوس ہُوا ہم بھی کسی دِن اسی طرح مرجائیں گے۔ بہتا پانی ہمیں بھی اپنے ساتھ لے کر بہے گا۔"

ہم اُٹھے اور کائنات کو جگا دیا۔ طنابوں سے بندھی ہوئی شہتیریاں بہا دیں۔ ستار اور وائلن پھینک دیئے۔ فلسفے اور طب کی کتابیں جلادیں۔ چھپر ڈھا دیئے۔ سپرنگ والی گدیاں پھاڑ دیں۔ کتوں کے بسکٹ انسانوں کو کھلائے۔ اوروں کے خون پر کسی کو ستار سُننے نہ دی۔ سب کے لئے ایک ہموار سطح بنادی۔ انسانیت کے چہرہ پر مُسکراہٹ پھیلا دی۔ سمجھ گئے۔ ہم نے انسانوں کو خُدا کا دِماغ سمجھا اور کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو —

فلسفہ دھوکا ہے۔ دھوکا۔ جاؤ سرود کو دریا میں پھینک دو۔ کتابوں میں آگ لگا دو۔ انسانیت کو اُبھار دو۔ انسانیت کو۔ سمجھے !

سودائی کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ حیرت کا مجسّمہ بن گیا۔ "تم کون ہو میرے دوست؟" سودائی نے آہستہ سے پُوچھا۔

"میں ؟ مجھے گوری کہتے ہیں۔ گوری۔"

دوسرے دن صُبح سودائی نے دیکھا کہ تپ دق کی مریضہ مرگئی ہے۔ شہتیریاں طنابوں سے بندھی ہوئی ہیں۔ چھپّر کے نیچے طنابوں کا گیت گونج رہا

سیّد امین اشرف

غزل

فصل گل آنے کو ہے شیشہ و پیمانے تک
آج وہ قصدِ سفر رکھتے ہیں میخانے تک

تیری آہستہ خرامی ہے کہ فیضانِ بہار
گل و گلزار ہوئے جاتے ہیں ویرانے تک

یں تو پروردۂ غم ہوں مگر اے موجِ بلا
تجھ پہ کیا گزری مرے سر سے گزر جانے تک

راہ پر آج بھی کافر ہے نہ مومن ورنہ
سلسلہ ایک ہے کعبے سے صنم خانے تک

جب کہیں بات چلی ہے غمِ الفت کی امین
داستاں آکے رکی ہے مرے افسانے تک

ہے— چرتو بو۔ گھُروو۔ دونز دَے۔ دونز دَے۔ دونز دَے۔ دونز دَے !
دریا آہستہ آہستہ بہہ رہا ہے۔ تنکے پتے، بوسیدہ چٹائیاں اور چیتھڑے بہے جا رہے ہیں ؛

مظفر عازم

گُلریز اور گُلِ بکاولی ـــــ تقابلی مطالعہ

کشمیری ادب کا سب سے بڑا اور اہم حصّہ مثنوی کے روپ میں ہے، زیادہ حصّہ رزمیہ مثنویوں کا ہے۔ اس کے بعد عشقیہ مثنویوں کا نمبر آتا ہے۔ عشقیہ مثنویوں میں گلریز اور گل بکاولی سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ مقبولیت کے لحاظ سے ایک اور مثنوی 'ممتاز بے نظیر' بھی قابلِ ذکر ہے۔ لیکن اس میں رزمیہ اور بزمیہ دونوں قسم کے مضامین کا امتزاج ہے۔ اور اس بنا پر یہ اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے۔ ہمیں دو عظیم بزمیہ مثنویوں ــ گلریز اور گل بکاولی ــ کا مطالعہ مطلوب ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے۔ کہ دونوں اصل میں ترجمے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ کے متعلق اس طرح فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح تخلیق کے متعلق خصوصاً جب ہم مترجم کی کامیاب ترجمہ کرنے کی صلاحیت کا نہیں بلکہ اُس کی تخلیقی قوت کا اندازہ لگانا چاہتے ہوں۔ بہرحال ایک مثنوی کا ترجمہ کرنے میں مترجم کی تخلیقی صلاحیت بھی معرضِ امتحان میں آتی ہے۔ اس دوران میں کتنے ہی ایسے مقام آتے ہیں جہاں مترجم کی اپنی شخصیت بھی اُبھر آتی ہے۔ اور وہ تالیف کی حدوں کو پھاند کر تخلیق کی سرحدوں میں قدم رکھتا ہے۔ اور ایسے ہی مقام ہیں جہاں ہم دونوں مثنویوں کے مترجموں کی صلاحیتوں، اور دونوں مثنویوں کے تاثر اور کامیابی کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ایک فن کار جب کسی فن پارے کو ترجمہ کے لئے منتخب کرتا ہے تو اس کے انتخاب سے بھی اس کی شخصیت کے چند پہلو نمایاں ہوتے ہیں جو اس کے ذوق اور شعور کی نمائندگی کرتے ہیں، اس طرح سے ہم اس کی انفرادی صلاحیت کا بھی تعیّن کر سکتے ہیں اور ہمیں اس کی قدرتِ فن کا اندازہ لگانے میں بھی مدد ملتی ہے۔

گلریز کا ترجمہ پیر مقبول شاہ کرالہ واری نے سنہ ۱۲۸٦ ہجری (۶۳-۱۸٦۲ء) میں کیا ہے۔ جیسا کہ وہ کتاب کی ابتدا میں لکھتے ہیں۔ یہ اصل میں ضیائی نخشبی نے فارسی میں لکھی تھی۔ گل بکاولی کا ترجمہ گلریز کے کوئی نصف صدی بعد اسلام آباد کے ایک شاعر لسہ خان نے اردو کے ایک شاعر لسہ خان نے اُردو کے ایک مشہور قصے سے کیا ہے۔ اُس نے اصل کتاب کا نام 'گلستانِ بقا' لکھا ہے۔ لیکن جہاں تک عبارت کا تعلق ہے۔ مجھے یہ 'مذہبِ عشق' کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔ دونوں کی عبارتوں میں اس قدر قرب ہے کہ 'گل بکاولی' کو آسانی سے 'مذہبِ عشق' کا منظوم کشمیری ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ "مذہبِ عشق" کا ترجمہ اردو میں نہال چند لاہوری نے اس وقت کیا تھا جب لارڈ ولزلی ہندوستان کا گورنر جنرل تھا۔ وہ اپنی کتاب کی ابتدا میں لکھتا ہے کہ یہ قصہ اصل میں شیخ عزت اللہ بنگالی نے بارہویں صدی ہجری کی ابتدا میں فارسی میں لکھا ہے۔

ان دونوں مثنویوں کا موضوع ایک جیسا ہے۔ ایک آدم زاد کا ایک پری سے عشق۔ اس دوران میں طرح طرح کی مشکلات کا سامنا اور پھر وصل۔ موضوع کے اعتبار سے ان مثنویوں کا کشمیری زبان کی اکثر عشقیہ مثنویوں سے اشتراک ہے، اور یہ اشتراک اس عہد کی عکاسی کرتا ہے۔ جس میں ان کی تخلیق یا ان کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ ایک مرد کا پہلی ہی نظر میں یا بعض اوقات ـــ جیسے کہ گلریز میں ہوتا ہے۔ چند دلفریب کلمات سن کر ہی کسی عورت کے لئے جان کی بازی لگانا اور پھر فطرت کی تمام ہیبت ناک قوتوں کا اُسکی دشمنی پر اتر آنا۔ ایک ایسا تصوّر ہے۔ جو صرف اس دَور میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جو انسان کے جذبہ محبت اور جنسی تعلقات پر بے پناہ قیود عائد کر کے ایک طرح

کے جذباتی ہیجان کو پروان چڑھا رہا ہو۔ جب ایک مرد کیلئے غیر عورت کی طرف دیکھنا ہی ناممکن ہو۔ تو عشق کی آگ سُنی سنائی باتوں ہی سے بھڑک اُٹھتی ہے۔ اور جب دوسرے کی طرف دیکھنا جُرم ہو تو عشق کا دعویٰ کرنا ہلاکت اور مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ بات اس دور کی ہر عشقیہ تخلیق سے ظاہر ہے۔ جس میں متذکرہ صدر کتابوں کی تخلیق اور اُن کے ترجمے ہوئے ہیں۔

دوسری اہم بات ان مثنویوں میں غیر فطری یا فوق الفطرت عناصر کا وجود ہے۔ مولانا حالی مقدمہ شعر و شاعری میں لکھتے ہیں۔ "جو قصہ مثنوی میں بیان کیا جائے اس کی بنیاد ناممکن اور فوق العادۃ باتوں پر نہ رکھی جائے۔ . . . جب تک انسان کا علم محدود تھا۔ ایسی باتوں کا اثر لوگوں کے دلوں پر نہایت قوت کے ساتھ ہوتا تھا۔ لیکن اب علم نے اُس طلسم کو توڑ دیا ہے"۔ یہ بات درست ہے یقیناً ایسی باتوں پر اب ہنسی آتی ہے اور اس قسم کے موضوعات کو اب قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے موجودہ دَور میں کسی ادبی کارنامے کی بنیاد ان باتوں پر نہیں رکھی جا سکتی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے کلاسیکی ادب میں ان باتوں کا وجود اس قدر غیر مستحسن بھی نہیں کہ انہیں باقیاتِ عہدِ کہن کہہ کر ہی ٹالا جا سکے۔ نیاز فتحپوری لکھتے ہیں کہ عہدِ قدیم کا وحشی انسان جب مظاہرِ فطرت کو دیکھتا تھا تو وہ حیران رہنے اور ڈرنے کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی لئے اس نے ان کیفیات کی تشریح کے لئے دیوی اور دیوتاؤں کا تصوّر قائم کیا۔ یہ بات صحیح ہے لیکن یہ تصوّرات جس صورت میں ہمیں ادب میں ملتے ہیں۔ اس میں خوف اور حیرت کے سوا اور بھی کچھ ہے۔ ظاہر ہے کہ وُہ تصور عہدِ قدیم کے وحشی کا تصوّر نہیں ہے۔ بلکہ اس انسان کا تصوّر ہے جو اپنی زندگی کو بہت حد تک سمجھ چکا تھا۔ اگر ہم صرف متذکرہ دو کتابوں میں اس عنصر کو زیرِ غور لائیں تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس میں ایک طرف اس دور کی تصویر ہے جس میں یہ پایۂ تکمیل کو پہنچی ہیں۔ اور دوسری طرف اس میں انسان کے بہتر مستقبل کی خواہش ترقی کی امنگ اور فطری سدِ راہ پر قابو حاصل کرنے کی چاہت بھی ہے۔ یہ تصوّرات عہدِ قدیم کے وحشی انسان کی بے علمی اور کم مائیگی ہی نہیں بلکہ انسان کے عزائم کا آئینہ اور اُس کی کبھی مغلوب نہ ہونے والی قوتوں کی غیر مبہم تصویریں بھی ہیں۔

ان دونوں داستانوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہیروئن پری ہے۔ لیکن اس کے جذبات، اُس کے احساسات اور اس کے تصورات سب ہمارے جذبات، احساسات اور تصوّرات ہیں۔ اصل میں وُہ پری صرف اس حد تک ہے کہ وُہ اپنے آپ کو پری کہتی ہے۔ اور کچھ مدت تک اس بہانے سے اپنے عاشق پر مشقِ ستم کرتی ہے۔ وُہ جب خود عشق کے دام میں پھنستی ہے۔ تو وُہ بھی بالکل ہماری ہی طرح بے بس ہوتی ہے البتہ وُہ ہمیشہ ایک ایسے گھرانے کی چشم و چراغ ہوتی ہے۔ جہاں عظمت، حشمت اور شوکت کے سہارے وُہ مدت تک کسی آدم زاد کی نگاہوں سے آلودہ نہیں ہونے پاتی۔ پری کا تصوّر بنیادی طور عہدِ قدیم کی پیداوار سہی۔ لیکن کتنی قریب ہے یہ پری اُس دور کی 'شریف زادی' کے جس دَور میں یہ ہمارے محمل ادب کی زینت بنی۔ 'شریف زادی' جس کو سالہا سال تک کسی آدم زاد کی آنکھ دیکھ نہیں پاتی تھی، اور جس کے نسلی تفوّق کا احساس اُسے عام انسانوں کی دُنیا سے جدا رکھتا تھا۔

پھر دیکھئے۔ 'گلریز' کی ایک حکایت میں ہارون الرشید کا ایک پرندے کی معرفت ایک طویل سفر دم زدن میں طے کرنا، 'گل بکاولی' میں تاج الملوک کا ایک درخت کا میوہ کھا کر اُڑنے کے قابل ہونا، یا درخت کی چھال کی ٹوپی پہن کر عام جانداروں کی نظروں سے اوجھل رہ سکنا۔ کیا اس میں بنیادی طور تو ہم پرستی کے ساتھ انسان کے بلند عزائم اور اس کی غالب اور ناقابلِ تسخیر قوتوں کا غیر شعوری اظہار نہیں ہے۔ خواب کی حالت میں پرواز کرنا یقیناً بے معنی ہے۔ اور اُس پرواز پر ناز کرنا حماقت، لیکن اڑنے کے خواب وہی دیکھتا ہے۔ جو بیداری کی حالت میں اُڑنے کی امنگ رکھتا ہو۔ مگر اُڑنے کی قوت نہ رکھتا ہو۔ اس وہم کی تہ میں ارادے کی مضبوطی، اور امید کی روشنی بے نقاب ہے۔ اس بنا پر میرا خیال ہے کہ یہ باقیاتِ کہن اگرچہ اب ترک ہونے چاہئیں۔ لیکن ہمارے کلاسیکی ادب میں ان کا وجود قابلِ تضحیک نہیں۔ بلکہ قابلِ غور ہے۔

فوق العادۃ باتوں کے علاوہ ایک اور بات میں بھی یہ مثنویاں اپنے دور کی اکثر مثنویوں کے ساتھ اشتراک رکھتی ہیں۔ وُہ ہے ان کا مقصد دونوں کتابوں سے یہ واضح ہے کہ ان کے مصنّف اور ان کے مترجم بھی۔ ایک عام سی عشقیہ داستان سُنا کر جسے وُہ عشقِ مجازی کہتے ہیں۔

ہمیں اصل میں اُس عشق کی بات سمجھانا چاہتے ہیں۔ جو آدمی خدا سے کرتا ہے اور جس کو عشق حقیقی کا نام دیا جاتا ہے۔ ہمیں تلقین کی جاتی ہے کہ یہ مجاز حقیقت کو سمجھنے کا ذریعہ ہے۔ اور ہمیں مجاز ہی کی بھول بھلیوں میں نہیں بھٹکنا چاہیئے۔ میں اس تصور کی تاریخ زیر بحث نہیں لانا چاہتا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کا تعلق اُس دور کی شدید مذہب پرستی سے ہے۔ جس دور کی یہ پیداوار ہے۔ ان مثنویوں میں انسانی جذبات اور کیفیات عشق کی جو بے باک مصوری کی گئی ہے۔ کسی پاکیزہ تصور کی آڑ لئے بغیر ناممکن ہو جاتی۔ بلکہ اس کا تو تذکرہ بھی حرام ہو جاتا۔ کسی تصور کی اس طرح آڑ لینا وقت کی اہم ضرورت تھی۔ اور اس کی ابتدا عموماً غیر شعوری طور ہوتی ہے۔ محبت انسان کا ایک ایسا شدید جذبہ ہے جو کسی بھی قیمت پر دبایا نہیں جا سکتا ہے۔ یہ کسی نہ کسی روپ میں زندگی کے اور شعبوں کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی غالب آتا ہے۔ ناسازگار ماحول میں یہ ایک عجیب سا تضاد پیدا کرتا ہے۔ جب یہ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود بھی ہو۔ اور اظہار کا بھی موقع نہ پائے۔ تو سماج میں ایک فکری تضاد پیدا ہوتا ہے۔ فنکار عام طور پر زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ان جذبات کی مصوری کرے اور ایسا کرنے کیلئے فن کی قوت کوئی نہ کوئی ذریعہ پا ہی لیتی ہے۔ مجاز اور حقیقت کا جھمیلا اسی کیفیت کی پیداوار ہے۔

دونوں مثنویوں کے موضوع کی یکسانیت کے سلسلے میں یہ چند باتیں کہنے کے بعد اب ہم ان کا تفصیلی تذکرہ کریں گے۔ مثنوی کے اسلوب میں فنی نزاکتوں کو استعمال کرنے کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ خصوصاً جب ایک قصہ بیان کیا جا رہا ہو۔ تو اس میں جذبات نگاری کا مقام اہم ہے۔ عشقیہ داستان لکھنے کا بالفعل مقصد ہی یہی ہوتا ہے۔ کہ پڑھنے والے کا جذبۂ محبت ابھارا جائے۔ اور ایسا کرنے کے لئے مختلف کرداروں کے جذبات کی مصوری سب سے بہتر حربہ ہے۔ یہی چیز ہے جو کامیاب منظر نگاری کے ساتھ مل کر "گلریز" کی بے پناہ مقبولیت کا سبب بنتی ہے۔ اس ضمن میں گل بکاولی کوئی اچھی مثال قائم نہیں کر سکی ہے تاج الملوک اور بکاولی جب مختصر سے وصال کے بعد جدا کر دیئے جاتے ہیں۔ تو اس مصیبت کے موقع پر تاج الملوک کی کیفیت بیان کرنے کے لئے صرف دو شعر لکھے گئے ہیں۔

سپن دیوانہ از گریہ تلن شور

زعشرت خانۂ خود کمؑ اُونس یورُ

ژُچھان سر سو دوال ونِ بالہ یارس

ہیوان پے دلبرس دِلہ کِس قرارس

(ترجمہ:- وُہ دیوانہ ہوا اور آہ وزاری کرنے لگا۔ کہ مجھے اپنے عشرت خانہ سے کون اُٹھا لایا۔ وُہ اپنے دوست کی تلاش میں ہر سُو نظریں دوڑانے لگا۔ اور اس قرار جان کی جستجو میں محو ہوا)

کِس قدر کم زور ہے یہ بیان۔ یہ واقعہ جب ہم "گلزار نسیم" میں بھی پڑھتے ہیں، تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ بکاولی کو تاج الملوک کی جدائی سے اتنا دُکھ نہیں ہوا ہے۔ جتنا کہ اُسے اپنے باغ کا پھول کھو جانے پر ہوا تھا۔ اس کے مقابلہ میں ایک ایسا ہی موقع گلریز میں بھی آتا ہے۔ وصال کے فوراً بعد عجب ملک کو نوش لب سے جدا کیا جاتا ہے۔ اسوقت نوش لب کے جذبات کا جو بیان "گلریز" میں ہے وُہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ چند شعر پڑھ لیجیئے ؎

گجس رکھُ کامہ دِلِ دیونہ آمہ نے لِیس

لگوم ورلادہ موے آدِہ سے لِیس

زٹِتھ کمُ شِتھرنی دتونم متھرے

لدِتھ طاسس پیم طوسس اُتھرے

یتھس جانانس رستوی لب لوُ

سہ تراوُتھ شربت شیرین چھ ومے

سہ تراوِتھ منگہ کیا یتھ پاٹ برنگس

سہ تراوُتھ مازہ کرہ نقش ورنگس

(ترجمہ:- میں محبوب کے تصور سے نڈھال ہو کر رہ گئی۔ میری نوخیز جوانی فراق کی کشمکش میں پائمال ہو کر رہ گئی کس دشمن نے میرے دوست کو مجھ سے جدا کر دیا۔ میرے محبت کے آشیاں پر اُس وقت بجلی گری جب یہ مکمل ہونے کو تھا۔ میں اپنے محبوب کے بغیر جینے کا تصور کیونکر کر سکتی ہوں۔ اُس کو چھوڑ کر میں بیگانوں کے ساتھ کیسے جیوں؟ اُس کے بغیر تو میری نیندیں حرام ہیں۔ اور اُس کے فراق میں لذیذ ترین نعمتیں میرے لئے زہر ہیں۔ اُس کے بنا، میرے لئے کسی بھی عشرت کا تصور ناممکن ہے اور دُنیا کی تمام راحتیں اجیرن)

اسی طرح نوش لب کو دلہن بنانے کا واقعہ اور عجب ملک اور نوش
لب کے شبِ وصال کا خاکہ اس قدر پر زور ہے کہ ہم شاعر کی قدرتِ
فن کے قائل ہو جاتے ہیں۔ وصل کی کیفیت کا نقشہ لسہ خان نے بھی
ایک جگہ کھینچا ہے جس کے دو شعر ہیں ؎

گاہے آسس ژتیر ناز ماراں
گاہے خود غمزہ تیرن سینہ داراں
گاہے از دیدہ آسس رُدی اوچھان
گاہے تس مار زُلفو سیٖت بوچھان

(ترجمہ:- کبھی وہ اُسے تیرِ ناز سے بسمل کرتی تھی اور کبھی خود اُس کے
تیرِ غمزہ کے سامنے اپنا سینہ پیش کرتی تھی۔ کبھی اُس کا منہ تکنے لگتی تھی
تو کبھی اپنے شہمار گیسو سے اُسے ڈس دیتی تھی)

ان اشعار میں بھی فنی نزاکت ہے۔ لیکن گلریز کے کوئی نصف صدی
بعد لکھے جانے کے باوجود ان کی خالص روایتی نوعیت عیاں ہے۔
جہاں تک منظر نگاری کا تعلق ہے۔ گل بکاولی میں اُس کی کچھ عمدہ
مثالیں ہیں۔ جس وقت تاج الملوک دلبر بیسوا سے رخصت ہوتا ہے تو وہ
دیوتاؤں کے ایک صحرا میں پہنچتا ہے، اُس کی تصویر گل بکاولی میں یوں
کھینچی گئی ہے ؎

زمین پر گومتن از اژدر و مار
سٹھا وحشت اثر بدخوی بدکار
درخت ژٹمت تموز آفتابن
سٹھا پوشیدہ تھوٚمت ردی آبن
کینن شورہ گٔت جانا درن سور
کوہن سُرمہ بنیومت مثلِ کافور

(ترجمہ:- زمین سانپوں اور اژدہوں سے بھر گئی تھی۔ وہ کتنے ہی وحشت
اثر، بدخو اور بدکار تھے۔ گرمی کی شدت سے درخت گویا جل بھن
گئے تھے۔ پانی نے نہ جانے کہاں منہ چھپایا تھا۔ پتھر شورہ کی مانند
ہو گئے تھے۔ پرندے جل گئے تھے اور پہاڑ سُرمہ کی طرح ہو گئے تھے
داتنے خشک کہ آسانی سے پیس سکیں)

یہ بیان قابلِ قدر ہے۔ اس مقام کا ایسا اچھا بیان دیا شنکر نسیم
سے بھی نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن پھر بھی ایسے متعدد مواقع آئے ہیں۔
جہاں گل بکاولی کے مصنف کی خاموشی کچھ اچھی نہیں لگتی۔ مثلاً بکاولی
کے باغ کے متعلق شاعر زیادہ کچھ نہیں کہہ سکا ہے۔ حالانکہ کشمیری
شاعری میں حسنِ فطرت کی نقاشی کے اتنے اچھے نمونے موجود ہیں۔ کہ ایک
عمدہ شاعر اس میدان میں اپنی شہسواری کا ثبوت بہت آسانی
سے دے سکتا ہے۔ گلریز میں ایک باغ کا ذکر آیا ہے۔ وہاں اُس کا
بیان اتنا حسین اور پُر زور ہے کہ اُس کا جواب نہ صرف یہ کہ ہماری
باقی مثنویوں میں نہیں ہے بلکہ خود گلریز کے مصنف سے کہیں اور نہیں
ہو سکا ہے۔ حالانکہ اُس نے ایسی کوششیں کی ضرور ہیں۔ اس بیان
کے چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہوں ؎

لگن یلہ آسہ پوشن واوہ گرایہ
سراں آس عطر باغس جایہ جایہ
اچھہ پوشن لچھن ہنز آس نہ گرند
کچھ کنہ نسترن اندر شکر خند
سر سنبل کھٹت از شرم دریائی
بتھن پوشن اندروٚن میانٔ چھنہ جائے
چھٹن گلبرگ چھٹ نہ سُرخ و زرد آس
چھکن زن سیم و زر لاجورد آس
بلا تشبیہ جنت اوس زنہ باغ
دمس کر با ارم نسبت گژھس داغ

(ترجمہ:- جب پھولوں کو ہوا کے جھونکے ہلاتے تھے۔ تو جیسے باغ میں جگہ
جگہ عطر کی بارش ہوتی تھی۔ اچھہ پوش (ایک پھول کا نام) لاکھوں کی
تعداد میں کھِل گئے تھے۔ معمولی سی گھاس کے بدلے بھی نسترن مسکراتی
ہے۔ سنبل احساس کمتری سے پاؤں میں سر ڈال کر کہہ رہا تھا کہ ایسے
پھولوں میں میرا مقام نہیں۔ پھولوں کی پتیاں سفید، سُرخ اور زرد
اس طرح سے گر رہی تھیں۔ جیسے لاجوردی فرش پر سیم و زر بکھیر دیا جائے۔
وہ باغ جنت جیسا تھا میں تو اُسے جنت کے ساتھ تشبیہ نہیں دے
سکتا۔ (وہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر حسین تھا)

اس باغ کا نقشہ 'گلریز' کا حسین ترین حصّہ ہے۔

مثنوی کے روپ میں جب کوئی قصہ بیان کیا جائے تو قصہ گوئی کے لوازمات بھی پیشِ نظر رکھنا پڑتے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ واقعات اس طرح بیان کئے جائیں کہ وہ ہمارے روزمرہ مشاہدہ کے عین مطابق ہوں۔ غیر فطری باتوں کا ذکر قصہ کی قدر گھٹا دیتا ہے گلریز کا ہیرو عجب ملک، نوش لب کی صرف تعریفیں سن کر اس کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے۔ یہ بات یوں تو عام تجربے کی نہیں لیکن ناممکن بھی نہیں۔ خصوصاً اس پس منظر میں جو شاعر نے اس کے لئے پیدا کیا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ عجب ملک کے مصاحب اس کی تعریف میں جوش و خروش سے رطب اللسان ہوتے ہیں۔ دورانِ گفتگو میں حسینوں کی بات چھڑ جاتی ہے۔ اور اسی اثنا میں ایک دانشمند بوڑھا کہتا ہے کہ میری نظر میں سوائے نوش لب کے کسی کا حسن مکمل نہیں ہے اور اس کے بعد اس کے حسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں نوجوان عجب ملک کا دامِ عشق میں پھنسنا متوقع ہے۔ اگرچہ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ نوش لب جو خود وصل سے کچھ مدت پہلے نازمست سے کہتی ہے کہ آج تک میرا نام بھی پردہ میں رہا ہے۔ تو بوڑھا اسے کیونکر جانتا تھا لیکن ہمیں اس شبہ کا جواب ملتا ہے جبکہ نازمست، نوش لب سے کہتی ہے کہ وہ بوڑھے سے داستان سن چکا ہے۔ اور نوش لب خاموش ہو جاتی ہے۔ اس کا بوڑھے کے متعلق کچھ نہ پوچھنا ظاہر کرتا ہے کہ بوڑھا اس کا کوئی واقف تھا۔ نوش لب پر عاشق ہونے کے بعد جب عجب ملک طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کر کے اس سے ملتا ہے تو وہ اس سے کہتی ہے کہ میں ایک پری ہوں میرے ساتھ تمہارا وصال ناممکن ہے ایک بحث چھڑ جاتی ہے یہ ایک طویل مکالمہ ہے۔ جس کے کچھ اشعار بہت ہی حسین ہیں ؎

نوش لب:-

> زہ میانوی وصل سپینی نہ میسّر
> ہیچا نہ نار زانحہ درہیزم تر
> زہ مہر من ژہ تل یکبارگی دل
> تراںشیستر گرئن چھنہ کارحاقل

> موںلج کتہ چچی یہ چپس کھوژان پامن
> مہ چمنہ زانحہ گمت آلودہ دامن

(ترجمہ:- میرے ساتھ تمہارا وصل ممکن نہیں۔ گیلی لکڑی جل نہیں سکتی ہے۔ تو میری محبت سے دست بردار ہو جا . . . . بات اصل میں یہ ہے کہ میں طعن و تشنیع سے ڈرتی ہوں۔ ابھی میرا دامن آلودہ نہیں ہوا ہے)

عجب ملک:-

> نبر عشقن زبر سروس مہ دِژ تھم
> غبر آہستہ مولن تام ہژ تھم
> کمانے چاتہ دِ تنم تیر سینس
> چھوکر لدژہرٹ دلوان چھپس پیٹھ زمینس
> بمن زخمن مہ للّٰہ مرہما دِم
> دِلہ رستس دلاسا اکھ دمادِم

(ترجمہ:- میں ایک سرو تھا۔ تو نے محبت کی حسین کلہاڑی کچھ اس طرح ماری کہ جڑوں تک پہنچ گئی۔ تیری کمان نے میرے سینے پر ایسے تیر چلائے کہ میں نیم بسمل ہو کر تڑپ رہا ہوں۔ خدا کے لئے میرے ان زخموں کی مرہم پٹی کر اور مجھ بے دل کے دل کو سہارا دے)

عجب ملک کا یہی درد آمیز انداز کلام ہے۔ جو نوش لب کا . . . . دل پگھلا دیتا ہے۔ یہ طرزِ عمل عام تجربات کی پیداوار ہے۔ اس کے مقابلہ میں گل بکاولی کا ہیرو تاج الملک بکاولی کو ایک بار دیکھتا ہے اور اس کا فدوی بن جاتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ صبح بکاولی جب دیکھتی ہے کہ اس کا پھول کھو گیا ہے۔ تو فوراً اندازہ کر لیتی ہے کہ یہ کسی آدم زاد کا کام ہے۔ اور اسی وقت اس کے عشق میں گرفتار ہوتی ہے۔ کتنی غیر متوقع بات ہے۔ یہ مشکل اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ یہاں پر بھی مترجم نے کتاب کے باقی حصّہ کی طرح اصل اردو کتاب کا لفظ بلفظ ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی واقعہ کو جب دیا شنکر نسیم گلزارِ نسیم میں بیان کرتے ہیں تو وہ لکھتے ہیں ؎

> جس نے مجھے ہاتھ سے لگایا

وُہ ہاتھ لگے کہیں خُدایا
عریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے
کھال اُس کی جو کھینچئے سزا ہے
یہ کہہ کر جنون میں غضبناک
خون رو دی لباس کو کیا چاک

ظاہر ہے کہ یہاں بکاول کے دل میں وہی جذبہ پیدا ہوا ہے جو فطرتاً پیدا ہونا چاہیئے۔ گلزار نسیم میں اس مشکل کو حسین طریقہ سے حل کیا گیا ہے۔ حمالہ کے ذریعہ تاج الملوک بکاول سے ملتا ہے۔ اُس کی جھڑکیاں برداشت کرتا ہے۔ پھر اُسے درد آمیز لہجہ میں سمجھاتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کے دل میں بھی محبت کا جذبہ اُبھر آتا ہے۔

"گلریز" میں غزلیں ضرورت سے زیادہ ہیں۔ مثنوی میں غزلوں کا استعمال صرف اس حد تک جائز ہے کہ داستان زیادہ دلچسپ بنجائے لیکن یہاں غزلوں کی کثرت سے مجموعی تاثر اگر گھٹتا نہیں تو بڑھتا بھی نہیں ہے۔ یہ خامی اتنی اچھی مثنوی میں ذرا کھٹکتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں "گل بکاولی" میں غزلیں کم اور سب برمحل ہیں۔ اگرچہ تغزل کے لحاظ گلریز کی غزلیں بہتر ہیں۔

"گل بکاولی" میں قصہ کے دوران میں بعض جگہوں پر مصنف خواہ مخواہ وعظ خوانی کرنے لگتا ہے۔ اس سے قصہ کا لطف کم ہوتا ہے واقعات کی وُہ صوفیانہ توجیح مثنوی نگار کے مقصد۔ عشق حقیقی کی تفہیم۔ کی رُو سے خواہ صحیح ہو، فنی لحاظ سے مستحسن معلوم نہیں ہوتی۔

تشبیہ و استعارہ، محاورہ اور روزمرہ، فصاحت اور حُسن کلام سے شعر میں جو لطف پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں "گلریز" میں "گل بکاولی" سے بہت زیادہ ہیں۔ "گلریز" پڑھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیری زبان پر تنگ دامانی کا الزام لگانا مبالغہ اور صریح ناانصافی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی زبان کا کشمیری پر جو غلبہ رہا ہے، اس کی وجہ سے متذکرہ ذکر دونوں مثنویوں میں متعدد الفاظ اور تراکیب فارسی کی استعمال ہوئی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ایسے اشعار کی کمی نہیں، جو ٹھیٹھ کشمیری میں ہیں ہمارے عوام کی زبان میں ہیں اور اتنے حسین اور لطیف ہیں کہ ہم داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اُوپر جذبات نگاری اور منظر نگاری کے سلسلہ میں جو مثالیں دی گئی ہیں۔ اُن سے میرا مقصد کسی حد تک واضح ہوتا ہے۔ مزید مثالوں سے مضمون طویل ہوگا۔ اس لئے ان تین اشعار پر اکتفا کروں گا ؎

ژ ی چھوُی نا کینہہ رہ چھُم مہ پانس
مہ پانے پران مِلوُم زعفرانس

(ترجمہ:۔ خطا تیری نہیں میری ہے۔ میں نے ہی زعفران میں پیاز مِلا لیا) (یعنی اپنے عیش کو منغص کرنے کا سامان مہیا کیا)

بپردہ ازدوہس تامت مہ چھم ناو
چھُنہ گُلمت مہ یاون لنجہ زانہ واو

(ترجمہ:۔ آج تک (میں ہی نہیں) میرا نام بھی پردے میں رہا۔ میری شاخِ شباب کو کبھی صبا کے جھونکے بھی نہیں چھوُ سکے)

ینبرزل تس بموُرنہ مابہ دِ جِلس
فرکہ وُن ژژ گرکہ وُنہ تاوہ تجنس

(ترجمہ:۔ میں نرگس اُس بھنورے کی محبت میں ایسی متوالی ہو رہی ہوں۔ جیسے کوئی ہانپتی چڑیا دہکتے ہوئے الاؤ میں تپ رہی ہو)

شمیم احمد شمیم

تاج محل

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم • من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

تاریخ کی ہر کروٹ کو انسان نے انقلاب کا نام دیا ہے اور ہر انقلاب ایک اور آنے والے انقلاب کا نقیب ہوتا ہے۔ انقلابات کا یہی مسلسل سلسلہ روز و شب بن کر نقش گرِ حادثات بن جاتا ہے اور تاریخ کے اسی پیچیدہ عمل سے انسانی زندگی عبارت ہے۔

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ ڈرامہ کے بعد خالق نے جب انسان کی سیمابی فطرت، اس کی بے چین روح اور فطرت کو تسخیر کرنے کی خواہش کو دیکھا ہوگا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھل گئی ہوگی۔ بالکل وہی مسکراہٹ جو ایک تجربہ کار باپ کے ہونٹوں پر اپنے ننھے بچے کی ڈینگیں سن کر نمودار ہوتی ہے جس میں بے پناہ خلوص اور محبت کے ساتھ ساتھ بچے کی نادانی پر ایک ہلکا سا طنز بھی ہوتا ہے۔ "خالق" کو مشکل سے ہی یقین آیا ہوگا کہ اس کی تخلیق کے اس معصوم سے پیکر میں اتنی تڑپ، اتنی بے قراری اور اتنے حوصلے سما سکتے ہیں جو فطرت کو تسخیر کرنے کے خواب دیکھ سکتے ہوں۔ نادان بچے کی شوخیوں سے دِل بہلانے کے لئے اس نے اسی ننھی سی جان کو کارزارِ حیات میں بھیجدیا۔

اس بے آب و رنگ خاکدے میں انسان نے اپنے حوصلوں اور ارادوں سے وہ وہ رنگ بھرے کہ یزداں بھی چیخ اُٹھا ہے

کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

مگر انسان کی منزل "مہ کامل" کی منزل سے بھی بہت بلند تھی۔ اس کے عزائم کے جلال نے عرشِ معلیٰ تک کو ہلادیا۔ اور اس کی لامحدود تخلیق کے جمال نے مہ کامل کے حُسن کو بھی ماند کردیا۔ آدمِ خاکی کے اس جذب و جنون، اس کی شوخیوں اور بے باکیوں کا ذکر حضورِ حق میں بھی ہونے لگا۔ اسرافیل نے اپنے خدشے کا یوں اظہار کیا:

من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

؎ یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ انسان کے جنون و شوق کی سرحدیں خود خالق کی حدِ نظر سے بھی دُور تھیں۔ وہ بے بسی کی حالت میں دیکھتا رہا کہ انسان پہاڑوں کا جگر چیر کر اپنا راستہ بنا رہا ہے۔ سمندروں کی چھاتی پر سے گذر کر اپنی فتح مندیوں کے جھنڈے گاڑ رہا ہے۔ دریاؤں کا رُخ موڑ کر ان کے سیلِ بے پناہ کو اپنی مرضی کے تابع کر رہا ہے۔ زمین کا جگر چاک کر کے اس کے پوشیدہ خزینوں کو لوٹ رہا ہے۔ چٹانوں سے ٹکرا کر انہیں پاش پاش کر رہا ہے۔ صحراؤں کو اپنے خون اور پسینے سے سینچ کر گلستان بنا رہا ہے۔ وہ فطرت کے ہر سربستہ راز کو بے نقاب کئے جا رہا ہے۔ زمین کی چھاتی پر اپنی عظمت اور اپنی قدرت کے بے انتہا نقوش ثبت کر کے اس کی نگاہیں فضا میں اُٹھنے لگیں۔ اس نے اپنے حوصلوں کی کمندیں فضا میں لگادیں اور آنِ واحد میں آسمانوں کا غرور پاش پاش ہو کر زمین کے قدموں پر گر پڑا۔ کون اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ وہی ننھی سی جان ہے جسے اس کے خالق نے اپنا دِل بہلانے کے لئے کارزارِ حیات میں بھیجدیا تھا، ننھی سی جان نے تو خالق کا دِل دہلا دیا تھا۔

تسخیرِ فطرت کے ساتھ ساتھ انسان کی فکر رسا اپنے تخلیقی عمل سے بے نیاز نہ رہی۔ وہی ہاتھ جو پہاڑوں کا غرور توڑتے رہے۔ اجنتا اور ایلورا کی چٹانوں سے لازوال حُسن کے مجسمے بھی تراشتے رہے۔ وہی ہاتھ جو پتھر کا جگر چیرتے رہے۔ تاج محل کی تخلیق بھی کرتے رہے۔ وہی ہاتھ جو دریاؤں کے بہاؤ بدلتے رہے، بنجروں کو گلزار بھی بناتے رہے۔ غرض انسانی ہاتھوں نے اپنی حُسن کاری سے نقاشِ ازل کے نقشِ اوّل کا اتنا خوبصورت نقشِ ثانی تیار کیا کہ خالق خود اپنی تخلیق پر رشک کرنے لگا۔ انسان نے جب

اعتماد اور وقار سے اپنے خالق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

یہ فطرت کے خلاف انسان کا فردِ جرم نہ تھا۔ انسان کی عظمت اور اس کی فتوحات کا ترانہ تھا جسے فطرت بڑے غور سے سنتی رہی۔ اس کے ہونٹوں پر ہنسی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ساری خدائی کھیل رہی ہے۔ انسان کے ہاتھوں فطرت نے شکست کھا کر اپنے گھٹنے ٹیک دیئے!

زمانہ بڑی سُرعت سے آگے بڑھتا رہا۔ زمانے کا معمار — انسان — بدستور فطرت کے رازوں کو بے نقاب کرتا گیا۔ اس کا ذوقِ تجسس اور اس کی بے قرار رُوح ہر دیوار کو پھاندتی ہوئی کسی نامعلوم منزل کی تلاش میں سرگرداں رہی۔ اس کی یہی تلاش اُسے سمندر کی تہ سے ماونٹ ایورسٹ کی چوٹیوں تک لے گئی۔ زمین کی گہرائیاں اور افلاک کی بلندیاں اس قدر قریب آگئیں کہ زمان و مکان کا تصور ہی مٹ گیا ہے۔ انسان کی تڑپ اور اس کا ذوقِ تجسس کہاں جاکر دم لیگا، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

مسلسل عملِ جراحی سے زمین کے چہرے کی ہیئت بدل رہی ہے اور اتنی سُرعت کے ساتھ بدل رہی ہے کہ آئندہ آنے والی نسلیں مشکل سے یقین کریں گی کہ دُنیا کبھی اس حالت میں تھی جس حالت میں یہ آج کل ہے۔ تسخیرِ فطرت کا یہ عمل دُنیا کے ایک کونے سے لے کر اس کے آخری سرے تک جاری ہے۔ کہیں اس کی رفتار مدھم ہے اور کہیں تیز۔ لیکن اسے کہیں سکون حاصل نہیں۔ بانہال کی تسخیر بھی اسی حکایت کا ایک خوشگوار باب ہے جس میں انسان کی اولوالعزمی، اس کی جرأتِ رندانہ، اس کے جذب و شوق اور اس کی جنون سامانیوں کا بیان ہے۔

بانہال کا یہ پہاڑ جو آج صدیوں سے کشمیر اور بیرون کشمیر کے درمیان حائل ہو کر انسانی حوصلوں پر طنز کر رہا تھا۔ جو ایک فصیل بن کر مدتوں انسانی غیرت کو للکارتا رہا۔ جو انسان کی بے کسی اور بے بسی پر سالہا سال سے ایک زہرناک ہنسی ہنس رہا تھا۔ جو اپنی رفعت اور وسعت پر نازاں ہو کر سینکڑوں معصوموں کے خون سے اپنی پیاس بجھاتا رہا تھا۔ ۲۲ر دسمبر کو اس کا سرِ پُرغرور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جھک گیا۔ انسان نے اس کے چیلنج کو قبول کر کے اس کا جگر چیر کر رکھ دیا۔ اس کی سنگلاخ چٹانوں کو بھسم کر کے اسے اپنی عظمت اور جوان مردی کا قائل کر دیا۔ آج جب بانہال کی فولادی چٹانیں انسان کی بے پناہ قوت سے مغلوب ہو کر پانی پانی ہو گئیں۔ تو ان سینکڑوں ماؤں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے ہوں گے جن کے لختِ جگر بانہال کی ہیبت اور نفرت و غضب کے شکار ہو گئے تھے۔ وہ بیوائیں جیسے ایک بار بیوہ ہو گئی ہوں جن کے شوہر بانہال کو عبور کرتے ہوئے پھر کبھی واپس نہ لوٹے تھے۔ وہ بہنیں بہت اداس ہوئی ہوں گی جن کے بھائی بند پنجاب آتے ہوئے بانہال کو کبھی عبور نہ کر سکے تھے۔

عید کے دن مرنے والوں کی بہت یاد آتی ہے۔ جبھی تسخیر بانہال کی اس پُرمسرت تقریب پر ان ماؤں، بہنوں اور بیویوں نے بہت رویا ہو گا، جن کے لختِ جگر، جن کے بھائی بند اور شوہر بانہال کی پُرپیچ گھاٹیوں سے کبھی باہر نہ آسکے۔ نئی سُرنگ کے کھلنے سے جیسے کسی نے دوشیزاؤں کے مانگوں میں سندور بھر لیا ہو۔ جیسے اُمیدوں کے مرجھائے ہوئے پھول کھل اُٹھے ہوں۔ اب کسی کے جموں یا پنجاب روانہ ہوتے وقت گھروں میں کہرام نہ مچا کرے گا۔ اب سال بھر کی محنت، مزدوری کے بعد گھر آنے والے مزدوروں کی مشقت کا حاصل بانہال کے دیو کی نذر نہ ہوا کرے گا۔ ہمارے ادب میں بانہال کی پُرہیبت اور ڈراؤنی شخصیت کا جو ذکر ملتا ہے اب وہ داستانِ عہدِ رفتہ ہو کر رہ جائے گا۔ اس کی جگہ اب انسان کی عظمت اور اس کی فولادی قوت کے ترانے لیں گے ؎

دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھ دی
جگر داروں نے بُنیادِ جہانِ جاوداں رکھ دی

۲۲ر دسمبر کو بانہال کی جگہ جگہ کی دیکھنے کے لئے ہزاروں لوگ وہاں جمع ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ انسان کی یورش کی تاب نہ لاکر بانہال نے اپنا گریبان چاک کر دیا ہو۔ آج اس کے چہرے سے ندامت اور انفعال ٹپک رہا تھا۔ اس کی عظمت اور ہیبت کا طلسم آج کسی فرہاد کے تیشے کی نذر ہو کر رہ گیا تھا۔ کشمیر کا بچہ بچہ بانہال کو للکار رہا تھا —

تعمیر

تیری قہرمانیوں کی انتہا ہو چکی تھی بانہال ! تیرے جسم پر سینکڑوں نوجوانوں کا خون بہہ کر تیری چٹانوں کی رگوں میں جذب ہو چکا ہے۔ انسان کا خون ہمیشہ اپنی قیمت طلب کرتا ہے اور آج اس خون نے اپنی قیمت وصول کر لی ہے۔ یہ پونے دو میل کی سُرنگ جو تمہارے سینے کا زخم ہے، ہمارے زخموں کا مرہم ہے اور یہ مرہم ہم آیندہ آنے والی نسلوں کے سپرد کر دیں گے کہ وہ ہمیشہ کے لئے تمہاری بہیمیت سے محفوظ رہیں۔" ہمارے ہاں آنے والے سیّاح جب نشاط باغ، شالیمار باغ، گلمرگ اور پہلگام کے نظارے دیکھ کر ہم سے کہتے کہ یہ سب تو تمہارے آبا و اجداد اور فطرت کی دین ہے۔ تم نے خود کیا کیا ہے ؟ تو ہمارے سر ندامت سے جُھک جاتے تھے۔ اب ہم بڑے فخر اور غرور کے ساتھ کہا کریں گے کہ ہم نے بانہال کا جگر چاک کیا ہے۔ اور یہ وہ عظیم کام ہے جس کا ہمارے پیشرو تصوّر بھی نہ کر سکتے تھے۔ بانہال کی یہ سُرنگ کشمیر کو سال بھر کے لئے بیرونی دُنیا سے ملائے رکھنے کا کام ہی نہ کرے گی بلکہ ہماری تہذیبی، ثقافتی، تمدّنی اور سماجی زندگی میں ایک اہم انقلاب کی نقیب بھی ہے۔ اس کے کھُلنے سے ۱۸ میل کی مسافت کی جو کمی واقع ہوئی ہے۔ اس کا اثر صرف سفر کرنے والوں پر ہی نہیں ہوگا بلکہ بالواسطہ طور کشمیر کے ہر فرد و بشر پر ہوگا۔ اب بانہال کا تعطّل ہماری انفرادی زندگیوں کا تعطّل نہ بن سکیگا ضروریات زندگی کی بہم رسانی میں بانہال کی برف پوش چوٹیوں کی مداخلت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی ہے۔ سات ہزار فٹ کی بلندی پر پہاڑ کا کلیجہ چیر کر انسان نے نہ صرف انسان اور انسان کو ملایا۔ بلکہ موسم کی جبرّیت کو ہمیشہ کے لئے مغلوب کر دیا۔ آج زمین نے ایک بار پھر آسمان کو شکست دی۔ اپنے ارادوں کو موسم کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے انسان نے فضاؤں سے اعتماد چھین کر اسے زمینوں کے سپرد کر دیا۔ یہ انسان کی ہی نہیں انسانیت کی بھی بہت بڑی فتح ہے۔ ایک طرف مصر میں انسان کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی دوسری طرف کشمیر میں خون پسینہ بن کر پہاڑوں کا جگر چیر رہا تھا کہ انسان فطرت کی فرعونیت کو شکست دے سکے۔ یہ بڑا خوشگوار اتفاق ہے کہ عین اس وقت جب وادیٔ نیل میں سامراجی فرعون شکست کھا رہا تھا، وادیٔ کشمیر میں بانہال کے فرعون کا غرور بھی پاش پاش ہو رہا تھا۔ — یہ بات انسانیت کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے کہ انسان کے ہاتھ آج بھی چہرۂ گیتی پر اپنی حسن کاری کے لازوال نقوش ثبت کر رہے ہیں۔ آج بھی کہیں تاج محل بنتا ہے اور کہیں اجنتا کی تصویریں۔ آج بھی کہیں جامع مسجد کا جلال اُبھرتا ہے اور کہیں لال قلعے کی عظمت۔ آج بھی کوئی فرہاد اپنی شیریں کے لئے پہاڑ چیر کر جوئے شیر لاتا ہے اور کوئی مانی اور بہزاد حُسنِ مجسّم تخلیق کرتا ہے۔ صرف زمانے نے قدریں بدل دی ہیں۔ تصوّر بدل دئے ہیں اور قالب بدل دئے ہیں۔ آج جب کوئی شاہ جہاں اپنی ممتاز محل سے محبت کا اظہار کرتا ہے تو وہ بھاکرا ننگل کی تخلیق کرتا ہے، آج جب کوئی فرہاد اپنی شیریں کے لئے جوئے شیر لانا چاہتا ہے تو وہ اپنا تیشہ بانہال کے جگر کے پار کر کے اس سے ایک سُرنگ نکالتا ہے جو ہزاروں فرہادوں کو ہزاروں شیرینوں سے ملا دیتی ہے۔ آج جب کوئی مانی اور بہزاد اپنے رنگوں سے حُسنِ مجسّم تراشنا چاہتا ہے تو وہ دریاؤں کا رُخ بدل کر بنجروں کو سیراب کر دیتا ہے۔ جب اجنتا کا خالق اپنے ذوقِ جمال کا اظہار کرنا چاہتا ہے تو وہ فضاؤں کو گرفتار کر کے انسان کو انسان سے قریب کر دیتا ہے۔ جب لال قلعے کے معمار لال قلعے کا نقشِ ثانی تیار کرنا چاہتے ہیں تو وہ پتھر کوٹ کوٹ کر کسی عظیم الشان شاہراہ کی تعمیر کرتے ہیں ـــــ غرض حُسن کی تخلیق آج بھی ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی ـــــ ہاں حُسن کے پرکھنے کے معیار بدل گئے ہیں۔ پہلے حُسن کی تخلیق میں فرد کی رُوح کارفرما ہوتی تھی - آج ہر فن پارے میں ہمارے دَور کی اجتماعی روح کارفرما رہتی ہے۔ پہلے ایک شاہ جہاں اپنی ممتاز محل کے لئے تاج محل بناتا تھا۔ آج ہزاروں شاہ جہاں اپنی ہزاروں ممتاز محلوں کے لئے مِل کر تاج محل بنا دیتے ہیں۔ آج سینکڑوں فرہاد مِل کر پہاڑوں سے نہریں نکالتے ہیں۔ یہ نئے انسان کی تدبیر ہے اور نئے دَور کی تقدیر !

بانہال کی سُرنگ ہمارے عزائم، ارادوں اور حوصلوں کی تصویر ہی نہیں ـــ یہ نئے دَور کا تاج محل بھی ہے جسے نئے دَور کے معمار نے نئی زندگی سے محبت کا اظہار کرنے کے لئے تعمیر کیا ہے ؎

دِل سے نکلا ہے یہ پیغام جگر داروں کا
عزم سرشار ہی خلّاق ہے شہکاروں کا

شاذ تمکنت

خرابہ

آہ کو پھر شبِ گُدازی کی خلش تڑپا گئی
آج لیکن کفِ حسرت ناشکیبا بھی نہیں
صبح تک آنکھوں کو جل بجھنے کا سودا بھی نہیں

چاندنی کی نیم خوابیدہ اُداسی کا فسوں
بام و در کے مضمحل شانوں پہ تھک کر سو گیا
اُڑتے اُڑتے یک بیک چاہت کا البیلا چکور
اندھے کہساروں کی ڈھلوانوں پہ تھک کر سو گیا
نوشگفتہ نیم رس ارماں کا اِک گُل بدن
مدتیں گذریں کہ ویرانوں پہ تھک کر سو گیا

جم گئی قصرِ طرب پر غم کی محرابوں کی گرد
زندگی کا راستہ دُھندلا گئی خوابوں کی گرد
خانۂ ویراں کا لے دے کے اثاثہ ہے یہی
ایک سوتے جاگتے بُت کا سکوتِ پُر سخن
جس کے چرنوں میں نجوم و کہکشاں کی سرد راکھ
چاند چمکا چُور، خوں میں تر بہ تر ہر ہر کرن
آس کی دیو داسیوں کے پاؤں چھلنی کر گئی
فرش پر بکھرے ہوئے سورج کے ٹکڑوں کی چبھن
شمعدانوں کی پگھلتی موم کی بے خوابیاں
تک رہی ہیں دیر سے آپ اپنے لُٹنے کا سماں
شہر سُونا ہو گیا پچھلے کی رُت سنولا گئی
گھر کا دروازہ کھلا کیوں ہے کہ وعدہ بھی نہیں
میہماں کی آہٹ کیسا، رہزن کا کھٹکا بھی نہیں

کنور اخلاق محمد خان

پریم رس

اب کِت اُور کو جاؤں پریتم تجھ سے بھی جب دِل نہ بہلے
تجھ سے مِل کر بھی تنہائی تجھ کو پا کر بھی ہیں اکیلے!

اور نہ کوئی آشا لے کر تیرے دوار پہ میں آیا ہوں
تیری پُوجا کرتا ہوں میں مجھ کو بس چرنوں میں لیلے

ہم تو تیرے ہو ہی چکے ہیں جیسے بھی ہو پیار نبھا لے
اس جیون کا کون ٹھکانا چار دِنوں کے ہیں یہ میلے

تُو چاہے جانے کہ نہ جانے ہم نے تجھ سے چھپ کر پریتم
کتنے کڑوے گھونٹ پیئے ہیں کس کس طور سے ہیں دُکھ جھیلے

ہاں اپنا ہی دِل نہ مانا یُوں تو لوگوں نے سمجھایا
چھوڑ دو بھی ایسوں کی محبت، چھوڑ دو یہ چاہت کے جھمیلے

محمد یوسف ٹینگ

آزاد ـــــ فکروفن

اقبال اور آزاد دونوں نے اپنے پہلے تیر سامراجیت اور شہنشاہی تسلط کے سینے کے پار کر دیئے اور دونوں نے اس دشمن کو نیچا دکھانے کے لئے ابتدائی طور وطن پرستی کی ڈھال میں پناہ لی۔ مگر اُن کی پُرسوز نگاہوں سے اس مجموں مرکب معاشرے کا وہ عجیب و غریب تضاد چھپ نہ سکا۔ جو اُسی کے رگ و ریشوں کی پیداوار تھا۔ اور جس نے اندر ہی اندر ایک دوسرے ہی میدان جنگ کا نظارہ پیش کیا تھا۔ اُن کی نگاہیں [illegible] عظیم معرکہ کی طرف [illegible] گئیں۔ جو بساط عالم پر ایک نئے انداز کی طرح ڈال رہا تھا۔ اور جس کے پیچ و تاب سے تمام انسانیت پر ایک ہمہ گیر اضطراب طاری تھا اور ان دونوں اصحابِ نظر پر وطن پرستی کے حصار کی محدودیت اور ناتوانی آشکار ہو گئی۔ اس طرح سے وہ خود تو محصور ہو جانے تھے مگر اُن کے گرد و پیش کی گتھیوں کی اُلجھنوں کا کوئی سُراغ نہیں ملتا تھا۔ اس مرحلے تک آزاد اور اقبال کی پرواز خیال ہم آہنگ ہے۔ مگر اس کے بعد اقبال ملت بیضا کے کاروانِ رفتہ کی خوش آئند مگر خیالی دُنیاؤں میں کھو جاتے ہیں۔ اُن کا تصور مستقبل کی سنگلاخ گھاٹیوں کی بجائے ماضی کے تصوراتی غبار اور دُھندلکوں کی جانب باگیں موڑ لیتا ہے۔ مگر آزاد جس منزل کو پالیتا ہے وہ ارتقاء اور انسانیت کی پُرشکوہ ظفریابی کی منزل ہے۔ اُس کے خیالات کا سیل بے پناہ اُس بحر بے پایاں سے ہم آغوش ہو جاتا ہے جس کی اُسے ہمیشہ سے تلاش تھی اور اس موڑ پر پہنچ کر اس کی شاعری کا حسن اور زور اتنا مکمل ہو جاتا ہے۔ کہ خود قاری کی ذہنی رسائیوں کو بھی تھک کر ستانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان شعروں کو دیکھئے تو آپ پر منکشف ہو جائے گا۔ کہ اگر اقبال اسلاف پرستی کی تکرار تمنا میں کھو نہ جاتے تو اُن کی خودی کیا روپ دھار لیتی۔ یہی وہ منزل ہے جب اقبال کے یہاں مومن کی علامت اُبھرتی ہے۔ اور آزاد کے یہاں 'انسان' کی۔ اقبال وطن پرستی کے بُت کو توڑ کر دینداری کا صنم تراشتے ہیں۔ مگر آزاد کا فکر ان تمام دھندلکوں سے نکل کر عالمگیر انسانیت کو اپنا مسجود بناتا ہے۔ طبقاتی نابرابری اور سماجی اونچ نیچ کو جڑ سے اُکھیڑنے کا یہ حشر انگیز زیر و بم دیکھتے جایئے۔

ستیئر دُگنیار بیٹھ تہ بیرہ ڈلیشت جبرہ چھیم لوان
کو نہ یکسان چھس ژہاران لاران لوت ماران پان
تو نہ چھس آب سیتھ وارہ تولہ وئین تنگلن اندر
لوان چھُم زندگی ہیوند سوزِ سفرن منزلن اندر

(ترجمہ:۔ نشیب و فراز اور پستی و بلندی کا یہ ناہموار منظر دیکھ کر میں تلملا اُٹھتا ہوں۔ میں مشابہت اور یکسانیت کی تلاش میں اپنا سر پھوڑتا رہتا ہوں۔ میں نے زندگی کا راز سفر مسلسل میں دریافت کیا)

غریبن ہیوند جگر تہ دل بزان یم کیا زہ سیخن پیٹھ
امیرن ہند خدائن تم تہ کرمیت ایس اگر پیدا

(ترجمہ:۔ امیروں کے کہنے کے مطابق اگر غریب بھی اُن کے ہی خدا کی مخلوق تھے۔ تو انکا دل و جگر کباب بن کے کھانا کس فتوے کے مطابق جائز ہے)

دِوان چھوک نیئی باغس ژہ مولن درد لوزن سگ
گرمس بنیہ نس ژہ پانے چھوک کران لورہ پاد انسالو

(ترجمہ:۔ تو اپنے ہی باغ کی تباہی کے سامان کرتا آیا ہے اور اسے تو نے فلاح کا نام دیا ہے۔ تو اپنے گھر کی بنیادیں خود ہی ڈھا رہا ہے)

ہمہ گیر انسانیت اور ابدی اور لافانی حیات کی ان بیکران پہنائیوں میں پہنچ کر اُس کے سامنے مذہب رنگ یا کسی قسم کی جغرافیائی حد بندی کی حدود نہیں رہ جاتیں اور اُس کا عظیم تفکر اس حسین وادی میں تمام مصنوعی رکاوٹوں سے بالاتر ہو کر اپنے پروں کو پھڑپھڑاتا ہے۔ اس وسیع اور رفیع اُفق سے وہ انسان پر نظر ڈالتا ہے۔ اُس کے کارناموں کی گمبھیرتا پر اُسے فخر بھی ہوتا ہے مگر ساتھ ہی وہ اس کی بھول بلیوں اور گمراہی پر بیک وقت خنداں اور گریاں بھی ہوتا ہے۔ وہ اس کے غلط کارناموں کی تفصیل کا ماتم اُٹھاتا ہے جن کی بدولت اُس نے آب و آتش خاک و باد کے دیوؤں پر تسلط تو جما لیا مگر اُس کے باوجود اپنے من کے صحرا کو بادِ سموم سے جھلساتا رہا۔ اپنے دِل کے گلزار کو جہنم زار میں تبدیل کرتا رہا۔ بعض لوگ اسے مزاج کا نام دیتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ زیرِ خند کی کیفیت ہے جو اسی وقت وجود میں آتی ہے جب کسی دکھیارے کے قلب و جگر رنج و غم کی انتہائی یلغار سے چھلنی ہو کر اس کے ہونٹوں کو متبسم کر رہے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی تھوڑی سی نالاں ہے کے بعد آپ آزاد کے لہجے میں اس غم نصیب ماں کی ماں ممتا کی پکار بھی سن پائیں گے جو اپنے لختِ جگر کی بربادی کا سامان ہوتے دیکھ رہی ہو اور آخری وقت پر اُنہیں متنبہ کرنے کی سعی کر رہی ہو۔ زیرِ خند کے اسی آتشیں طنز اور ممتا کی اسی نازک ترین حس نے آزاد کی پکار کو وہ حسن عطا کر دیا ہے جو کشمیری شاعری کے لئے بالکل منفرد چیز ہے۔ شاعر کو احساس ہے کہ یہ "مشتِ خاک" خود نگر ہو جائے تو ماہ و انجم اس کی کمند کے اسیر ہیں۔ بحر کی گہرائیاں اس کے تخیل کے عمق کی تھاہ نہیں پا سکتیں۔ اور اُس کے خیالوں کی مئے فطرت کے لئے وسیع پیمانوں میں بھی چھلک چھلک پڑتی ہے۔ وہ عاقبت یا اسی قسم کی دوسری خیالی دُنیا کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھتا۔ اُس کے خیال میں شش جہات کے اس خیال انگیز اور جنون خیز سلسلے میں انسانی فہم و ادراک کی تسلی کا کافی سامان موجود ہے۔ انسان کے جنت اور جہنم دونوں اسی متحرک سیارے پر موجود ہیں۔ اور وہ اپنے ارادوں کو ندا دے تو اُس کی نگاہ کے لئے کوئی حجاب حجاب نہیں رہ سکتا۔

بیس فول نہ دِل تہ جگر ییت لولہ نار کوی زر
سو بوزہ ر زہ محشر باغ ارم غنیمت

(ترجمہ:- جس کے دل اور جگر پر عشق کے زندگی نواز جھونکوں سے بہار نہیں آئی۔ اُسی کے لئے عاقبت میں خُلد بریں کا باغ قابلِ ترجیح ہوگا)

انسان کیتھ سیتھ نعمت گنھ پانہ کران قدرت
رو پہ کھاس اتھن کینہ ہیت انیدانید ہوتہ زہ دھا

(ترجمہ:- بنی نوعِ انسانی کی نازبرداری کیلئے خود فطرت اپنے ہاتھوں میں نعمتوں کا تھال لئے ہوئے رقصاں ہے)

اور ساتھ ہی میں اس کی ساری مادرانہ شفقت عود کر آتی ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ یہ طفلِ گمراہ کس طرح خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی خودکشی کے سامان کرتا ہے۔ علم اور حکمت کا یہ علمبردار تہ سلسلے ہتھیار بنا کر علم و حکمت کا ناش کر رہا ہے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے گلے کے لئے پھانسی کا پھندا بُن رہا ہے۔ زوال اور انحطاط کی ان پستیوں کو دیکھ کر آزاد کا درد مند دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ اور سالہ جہاں کا درد اپنے سینے میں سمیٹے ہوئے وہ اس نادان مخلوق کی اس لغزش کو تکتا ہے جو انجام کار اُسے موت کا ناچ ناچنے پر آمادہ کر رہی ہے۔ چونکہ یہ صدا براہِ راست شاعر کے دل سے نکلتی ہے۔ لہٰذا یہ تاثیر کی دُنیاؤں کی امین ہے اور ایٹمی دَور کا انسان بھی اسے سُن کر لمحۂ فکریہ میں کھو جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

تھولونے قدرتن پنہ نین خزانن ٹھان مژہ راوتھ
ژہ آسوی باگراونھ کھیون بیو کھ شہمار انسانو

(ترجمہ:- قدرت تیری دولت اپنے دفینوں کے دہانے کھول کر آئی تھی۔ تاکہ تو اُسے لے کر اپنی ذات جس کے ساتھ مل بیٹھ کر لطف اُٹھائے مگر وائے تو اس دفینے کا اژدہا بن بیٹھا)

ہا لولہ رستیو لو لکی افسانہ دَنے کیاہ
دیوانہ گیمتھ بوالہوس نادانہ فتنے کیاہ

(ترجمہ:- اے رازِ عشق سے نامحرم۔ تجھے جذبِ باہم کے کیا نغمے سناؤں۔ تو تو ہوس کی نادانیوں میں بھٹک کر دیوانہ بن گیا ہے)

نے دِل نہ سوزِ ہمت دراکھ دنیی عَلَم بتھ

اَمہ کھوتہ کیاہ قیامت آخر زمانہ وٲلے

(ترجمہ:۔ نہ تو تیرے سینے میں زندہ دل دھڑکتا ہے۔ نہ تو سوز کی دولت کا امین ہے۔ اور نہ تو ہمت اور حوصلے کا دھنی ہے مگر تو مذہب کا مقدس پرچم اٹھائے ہوئے ہے۔ اس سے بڑھکر اور کونسا دلگداز منظر تصور میں آسکتا ہے)

اس نوع کے اقتباسات کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ آزاد کے دیوان کے تقریباً ہر صفحے پر اس قسم کے اشعار موجود ہیں۔ اس قسم کی خاص نظموں میں نادان لوگت ...... کیا روزہ پردن ژہایہ .... اور ایسی ہی دوسری نظموں کا مطالعہ ضروری ہے۔

محوِ خواب آدم زاد کو جھنجھوڑنے کے اس عمل میں آزاد نے اُس کے متعفن معاشرے پر عمل جراحی بھی کیا ہے۔ اور ایک عظیم فنکار کی طرح صدیوں کے پیپ شدہ پھوڑوں کو بڑی بیدردی سے نوکِ نشتر کی زد میں لایا ہے۔ اس سلسلہ میں اُس نے انسان کا کونسا ایسا تعصب چھوڑا جس پر اپنا وار نہ آزمایا ہو، کونسا سماجی، اقتصادی، اخلاقی اور معاشرتی ناسور اُس کی نظر سے اوجھل ہو گیا ہے۔ جہاں پر اُس نے اپنا کام نہ کیا ہو۔ اس وقت تفصیل کا موقعہ تو نہیں ہے۔ مگر قانون کے مسئلے پر اُس کے خیالات کی چند جھلکیوں کو پیش کرنے کے لئے میں التزام سے موقعہ نکالنا چاہوں گا۔ مہذب، انسان نے اپنی دانست میں دُنیا کو رحم اور انصاف سے سجانے کے لئے قانون کو جنم دیا ہے۔ وُہ باقی سب چیزوں کے معاملے میں سرد گرم برداشت کرتا رہا۔ مگر قانون کے پیکر کو اُس نے تقدس اور عفت کا وُہ جامہ پہنایا کہ جس کسی نے اس کی طرف ترچھی نظر سے دیکھا۔ قابل گردن زدنی قرار پایا۔ اس نے اِسکے "متبرک" کے بڑے بڑے ترانے گائے اسے انسانی تہذیب و ترقی کا حاصل بتایا۔ مگر آزاد کی نگاہ کو یہ تقدس برما نہیں سکا۔ اُس نے صاف دیکھ لیا کہ یہ بھی "جادوئے محمود" کا ایک طلسم ہوشربا ہے۔ جس کا حلقہ بیچارے مظلوموں پر اس لئے ڈالا گیا ہے کہ کم از کم چھری کو حلق پر پھیرتے ہوئے چند خوش آہنگ الفاظ سے شکار کی روح کو تسکین تو پہونچے۔ اس مردم خوار قانون کی قدر کوئی اُن مجبوروں سے پوچھے جن کے لیل و نہار لیلئی انصاف کی ہلکی سی جھلک دیکھ پانے کی آرزو میں منزلِ آخرت کو پہنچ جاتے ہیں۔ آزاد نے خواجگی کے اس آلۂ قتل کو بے نقاب کرکے اس کے اصلی رنگ میں پیش کیا ہے۔

کمُ چوٗ نہ کِھ کرِ تیم ژٕ بے قانونکس قلائیس
رحمک مکانہ لورتِ عدلکہ دُکانہ وٲلے

(ترجمہ:۔ قانون کی فلک شگاف دیوار کو تو نے نقش ہائے رنگ رنگ سے سجایا۔ مگر اس کے اندر کا حال تجھے معلوم نہ ہو سکا۔ تونے رحم کی کسوٹیوں کو طاق نسیاں کی نذر کر دیا اور مصنوعی عدل کے نام پر زرگری کی دُکانیں سجائیں)

بجو ہوچھ میانہ ہوکھ قانون، خوجوزدل جاپہ کھوتہ نون
حبس گیرٕ ژھ گیشرہ نرِ میونوی خون کران گنتھ تتھ لوٗنے مبرو

(ترجمہ:۔ ججوں نے میرے لئے قانون سیکھا اور خواجوں نے نمک اور چائے کے بھاؤ آسمان سے بھی بلند کئے۔ جج کو جاکر بھی میرا ہی لہو اُس مقدس عمارت کے طواف کرتا رہا)

زندگی کے متعلق اور اس کے ہزار ہا شعبوں کے متعلق اس دقیقہ رس نگہ اور حقیقت پسندانہ گفتگو کے پس منظر میں وُہ قرب جلوہ گر ہے جو آزاد کو عوام کی روزمرہ زندگی اور مسائل سے تھا۔ آزاد کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت شاید یہی ہے۔ وُہ خود گاؤں کا ایک غریب اُستاد تھا اور اُس کی جوانا مرگ زندگی کے چالیس سال عوام کے اسی ہجوم میں بسر ہوئی۔ جن کے پسینے سے کشمیر کی سیرگاہوں کا حسن تو نکھر جاتا ہے۔ مگر جو ایک غلیظ کیڑے کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ صوفوں اور قالینوں پر بیٹھے ہوئے ادیب اس زندگی کا تصور تو کر سکتے ہیں۔ رومان اور مہم پسندی (Adventurism) کی ترنگ میں اس زندگی کو قابل رشک بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے متعلق ایک آدھ نظم بھی لکھ سکتے ہیں جس میں سخن گسترانہ بات کے طور پر دُختِ دہقان کی کڑیل جوانی اور بھڑکیلے شباب کا ذکر خاص طور سے ہو۔ مگر اُن روزمرہ کی بے اعتدالیوں، اُس لامتناہی سلسلۂ حادثات کا اُنہیں کیسے علم ہو سکتا ہے۔ جو تقدیر کے چکر کے نام سے عام طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ مگر جو ایک طویل عمل کا حصّہ ہوتے ہیں۔ جنہیں چند ظالموں چند البوالہوسوں کے ہاتھوں کی سجھائی تیار ہوتی ہے، جو صدیوں میں سینچے جاتے ہیں اور تب ایک معمول

کی حیثیت اختیار کرتے ہیں اور جیسے دستِ دولت آفرین قسمت کا نام دے دیتا ہے۔ ڈرائنگ روم کا شاعر اپنی حد سے بڑھی ہوئی ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے اس دہقان کی قسمت کو زلفِ معشوق سے بھی تشبیہ دے سکتا ہے مگر آزاد اسی موقعہ پر اظہار کی معراج پہ پہنچتا نظر آتا ہے۔ اُس نے محنت کش کے دُکھ کی آنچ خود اپنے دل میں محسوس کی ہے اور اُس نے کشمیری دہقانوں، اُن کی گڈریوں، کانگڑیوں اور پھر اُن کے طرح طرح کے تعصبات کا حال بیان ہے۔ جو خود روبیل کی طرح اُن کے لہو کی ایک ایک بوند پر تصرف جما لیتے ہیں۔ اُس نے ایک چابکدست فنکار کی طرح اُن تسمہ پاؤں کو آپ کی نظروں میں نمایاں کر دیا ہے۔ جن کے "غمزۂ پیری" سے یہ بیچارا تھرک رہا ہے۔ اُس نے اپنے گردو پیش کے تمام سماجی رشتوں کا بغور مطالعہ کر کے اُن کا سب کچا چھٹا دریافت کر لیا ہے۔ اُس کی نوا کی تندی اور تلخی نے کسی کو معاف نہیں کیا ہے۔ اور اُس نے اُس نوکر شاہی طرزِ حکومت پر بھی اپنے جملہ قواء سے ہلہ بول دیا ہے۔ جن کے پنجوں کی گرفت میں قدرت کی اس حسین ترین سرزمین کے باشندے نزع کے عالم میں ہیں وہ حکومتی نظام کے اُن چھوٹے چھوٹے پرزوں پر طنز، تعریض اور تنقید کے ہتھیاروں سے حملہ کر کے اُن کی قوت کو گھٹاتا ہے۔ جو اپنے بڑے استحصالی جنم داتاؤں اور اس کے منبع نظام کے وجود کی ضمانت ہیں۔ اور یہ سب کچھ اتنے فنکارانہ طریقے سے ہوا ہے کہ کہیں اُس کی ساز کی لے غلط آہنگ نہیں ہو جاتی۔ کہیں ناگواری نہیں آتی۔ ظالم اس آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر مُنہ پھیر لیتے ہیں اور مظلوموں میں جدوجہد کے ارمانوں کی آبیاری ہو جاتی ہے۔ عوامی زندگی کا یہ قرب۔ اُن کے مسائل کی یہ تفہیم اور اُس کے ردِ عمل میں یہ فنکارانہ خلوص اور کسی کشمیری شاعر کو نصیب نہیں ہو سکا ہے۔ اور اسی لئے آزاد کے شاہپارے آج بھی کشمیری ادب کے سب سے زیادہ ترقی پسند اور جاندار حصے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ آج بھی ترقی پسند کاروان کا متفقہ قافلہ سالار ہے۔ اور اُس کے اتنے صحت مند نظریات اور ایسی نازک فنکارانہ شخصیت کا راز اُس کے گہرے عوامی زندگی کے مطالعہ میں مُضمر ہے۔

نمازن کیوت تہ میونوی پان نیازن کیوت تہ میونوی پان
لیوان ییلہ اورہ ماہِ رمضان بہان میانے گرے بمبرو

(ترجمہ:۔ نمازوں کے لئے بھی میرا ہی وجود ہے اور باقی ایسے مخصوص کے لئے بھی میں ہی وقف ہوں۔ رمضان کا مہینہ بھی آکر میرے ہی گھر مہمان ہو جاتا ہے۔ میرے بالم)

حدس یوس آلہ مَٹہ اوسوم
ونوک تام سوی نکھن بیٹھ چھُوم
لوکیاہ ہا دے دِلاداری
لو لو زرہ عشقہ بیماری
سنڈس کرہ ہون، ہونس ہوَنڈ
کنڈس کرہ پوش، پوشس کنُڈ
کرُن چھُوم رأض پٹواری
لو لو زرہ عشقہ بیماری
لِگاہ چھُوم ہدیہ دِیون پیرس
تھوِیم کُن تو یہ تقصیرس
قیامژ دوہ کریم یاری
لو لو زرہ عشقہ بیماری

(ترجمہ:۔ میرے اجداد کے کاندھوں پر جو آلہ تھا۔ ابھی میں اُس کی رکھوالی پر مامور ہوں۔ میں تو اسی لئے پیدا ہوا ہوں۔ کیوں عشق کے جھگڑوں میں پھنس جاؤں۔ مجھے پٹواری کو راضی کرنا ہے۔ کیونکہ وہ بھیڑ کو کُتّا بنا سکتا ہے۔ اور کتے کو بھیڑ۔ میں عشق کے جھمیلوں میں کیوں پڑوں۔ مجھے پیر کو ہدیہ دینا ہے۔ کیونکہ وہ قیامت کے دن میری سہائتا کریگا۔ میں عشق کی بیماری کے لئے کہاں فرصت لاؤں)

طوالت کے خوف سے اقتباسات کی تفصیل ممکن نہیں۔ البتہ اوپر کے چند شعر پڑھکر ہی اُس روحانی کرب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو آزاد کو اپنے ہم نفسوں کی زندگی کے رنگ روپ دیکھ کر ہوتا تھا۔ آزاد اُن کے لئے کیا کر سکتا تھا۔ ایک مظلوم ملک کا مظلوم ماسٹر۔

اُس نے انہیں اُن کے ناسوروں سے آگاہ کیا۔ مگر اُس کے اُس جذبۂ درد نے ان "مضمحل یاروں" کے لئے اور بھی لبساطیں سجائیں اور بھی محفل آرائیاں کیں۔ دریا کی زبانی پیکرِ درد، ہمہ سوز، ہمہ ساز شاعر کی دل کی اُن گہرائیوں میں جھانکئے جہاں عظمتِ محنت آدم کے سوا اور کسی چیز کی حکمرانی نہیں۔ ان تصویروں میں کتنی قوتِ شفا دہے اور کتنی ماتا۔ ؎

بود تہران فرش مخمل بیٹھ کنارن بالہ یارن کیوت
مزورن تھکمیتن بیہ شوقہ والیئن دوستدارن کیوت
انان ترلینہ ہیتن آلو کریت چھوس سالہ چاوان ترشیں
چھولکسناہ دِل جگر شہلیک ژلکیھکہ پکنوک تہ تھکنوک ویہہ

(ترجمہ:۔ میں کنارے اپنے پیارے رفیقوں کے لئے مخمل کا فرش بچھاتا ہوں۔ اور وہ ہیں مزدور تھکے ماندے اور شوق سے لبریز پیاسوں کو دعوت دیکے پانی پلاتا ہوں تاکہ محنت اور تھکاوٹ کی پژمردگی دُور ہو جائے)

آزاد اگرچہ ہمیشہ کہتا رہا کہ اُس کے معشوق کو زلف اور خال کا غم ہے درآں حالیکہ اُسے غم روزگار چھلنی بنا رہا ہے۔ مگر پھر بھی اُس کے یہاں تغزل کی نازنین اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اور چونکہ اس عشق کے پیچھے توانا سماجی تفہیم بھی ہے۔ لہٰذا یہ عشق زندہ جواں اور پُر شباب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد کا کلام زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اُس کی غزلیں کشمیری نمائندہ غزلوں کے بہترین انتخاب میں جگہ پا سکتی ہیں۔ ان کی خصوصیات، اُن کا دھیما دھیما سوز، پُر جوش سپردگی اور والہانہ خلوص ہے۔ صرف دو نمونے ملاحظہ ہوں۔ ؎

دندے یمہ شوُر پالوک سنز
لو تھاؤ تھ یارہ دیدن منز
شو بیکھ ژی اتھ ڈلس پپوشش
دلو مونہ دِش لو ماری پان

(ترجمہ:۔ اس میں شباب جسم کی تمام لطافتیں تیری بھینٹ کروں۔ میں تجھے آنکھوں میں رکھوں۔ اس دل کا کنول صرف تم ہی ہو سکتے ہو میرے پیا)

لو کھ پارینہ نوی آیت تھاوس

چھو کر لد والنجہ ژلہ ہیم بار
مزماہ کرہ کیاہ یت چکہ چاوس
کتہ لوز وادس ونیو زار

(ترجمہ:۔ اپنی جوانی کا چمن اُس کے سپرد کرنے کی تمنائی ہوں، تاکہ میرے گھائل جگر کے داغ بھر جائیں۔ یہ شباب اور جوانی یونہی مرنے کی چیزیں تو نہیں ہیں۔ میں صبا سے اپنا دکھڑا کہہ رہی ہوں)

آزاد پر نظر تشنۂ تکمیل رہی گی۔ اگر خصوصی طور اُس کی نظم دریا کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ نظم اپنی نوعیت میں کشمیری شاعری کی منفرد نظم ہے۔ اور اسے پڑھکر کشمیری شاعری کے بے پایاں حسن، حیرت انگیز توانائی اور خیرہ کن شباب کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس نظم کو آسانی کے ساتھ دُنیا کی کسی عظیم نظم کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے اور اگر اس کے ولولوں، جوش، آسمان پیما ارادوں اور رواں دواں اندازِ بیاں کو کسی نظم کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ نذرالاسلام کی نظم باغی ہے۔ اس موضوع کو چھیڑنے سے میں اس لئے خائف ہوں کیونکہ مجھے اندازہ ہے کہ یہ نظم بجائے خود ایک طویل مضمون کی طالب ہے۔ جس کی اس وقت نہ تو گنجائش ہے اور نہ فرصت۔ ؎

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

آزاد اپنی آخری عمر میں اپنی تمناؤں کے شگوفوں پر بہار آتا دیکھ رہے تھے۔ اُن کے کلام میں اس نئی بہار کی نوید ملتی ہے۔ جس کی آرزو میں وہ عمر بھر لہو کے گھونٹ پیتے رہے۔ گو وہ موسم گل کا لطف لوٹنے کے لئے باقی نہیں رہے۔ مگر اُن کے مضطرب قلب جگر ایک حسین اور جمیل اُفق کے نظارے سے شاداب ہو رہے تھے۔ ؎

گٹہ ژیچ سنگرو بنہ گاش آؤ ماران نوزین چھویت
ژہین ژاؤ ظلم لوُن دراؤ انقلاب آہستہ آہستہ
جہانس تنبہ لاوان ہیون دلبر جلوہ ہاوان دراؤ
پھولان دل چُم ژلان جگرک حجاب آہستہ آہستہ

(ترجمہ:۔ اندھیارے کا دور گیا۔ پہاڑوں کے پیچھے صبح کی دلہن نور کے رتھ پر سوار آ گئی۔ ظلم تھر تھر کانپنے لگا۔ انقلاب کا نقارہ بجا۔ دل والوں کو فریفتہ کرتا ہوا میرا پیتم جلوے بکھیرنے لگا۔ میرے دل کی کلی کھلی جا رہی ہے، اور میرے خاطر کا غبار چھٹ رہا ہے، دھیرے دھیرے)

دو غزلیں

شہاب جعفری

ہم سا بھی عشق میں کوئی بے دست و پا نہ ہو
اے کاش اب وُہ دن ہوں کہ ہم سے وفا نہ ہو

پھر اس گمان پر تیری محفل میں آئے ہیں
شاید ہمارا وہم ہو، تو ہی خفا نہ ہو

شاید ہمیں ہیں درخورِ آشوبِ امتیاز
اچھا تو اب نہ آئیں گے، تم بدمزا نہ ہو

سب جانتے ہیں تم پہ ہمیں کتنا ناز ہے
تم یوں نہ سرگراں ہو کوئی دیکھتا نہ ہو

بیباکیوں سے حُسن کی ڈرتا ہوں میں کہ آہ
اہلِ وفا کو طعنۂ عُذرِ وفا نہ ہو

کیا جیتے ہیں جو نام ترا لے کے جیتے ہیں
وُہ بھی تو ہیں کہ جن کو ترا آسرا نہ ہو

موجِ بلا تو نام ہے سر سے گذرنے تک
یارو یہ دردِ عشق ہے، موجِ بلا نہ ہو

ذوقِ جمال چاہیے ہے نیرنگیٔ جمال
تم سے بھی ہے تعلقِ خاطر، خفا نہ ہو

دردِ حیات مانعِ بیگانگی نہیں!
حسن اسقدر بھی عشق کا درد آشنا نہ ہو

دُنیا ہے بے وفا کوئی روکو شہاب کو
شاعر ہے سادہ دل ہے، کہیں مُبتلا نہ ہو

حامدی کاشمیری

تا... اے غمِ دِل کے شرارو ... کو دُور تک جا کر پُکارو
مرے روشن اِرادوں کو اُبھارو غمِ دِل کے جنوں پرور سہارو
چمن میں ظُلمتیں رقصاں ہوں کب تک؟ دہک اُٹھو سُلگتے لالہ زارو
کب آئے ہائے وہ رُوحِ بہاراں مِرے احساس کی ویراں بہارو
تمہیں ہو ظُلمتِ شب میں فروزاں نہ ڈھلکو چشمِ غم سے ماہ پارو
تلاطم ہی ہمیں راس آگیا ہے سکوں تُم کو مُبارک اے کنارو
بڑی اُلجھن میں تقدیرِ جہاں ہے خُدارا زُلفِ پیچاں کو سنوارو
غمِ دل ہی نشاطِ دو جہاں ہے یہ سوچا ہے کبھی اے غم کے مارو
ہے پھر نغمہ سرا سازِ رگِ جاں خموش! اے زیست کے ہنگامہ زارو

دلِ شاعر پہ کیا گذرے سحر تک
نہ پُوچھو شامِ غم کے رازدارو

سہیل عظیم آبادی

غیرت

جب رمضانی کی نیند ٹوٹی اور وہ کمرے سے باہر آیا تو آنگن میں دھوپ پھیل گئی تھی۔ سچھولے چھتے اور بند گھر کے آنگن میں دھوپ پھیلنے کا مطلب تھا کہ دن کافی چڑھ چکا۔ لیکن رجیا اب تک پلنگ پر پڑی خراٹے لے رہی تھی اور چولھا ٹھنڈا پڑا تھا۔ رمضانی پلنگ سے اٹھنے کے بعد سب سے پہلے چائے پیا کرتا تھا۔ مگر چائے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اُسے بڑا غصہ آیا۔ اُس نے رجیا کو پکارا۔

" ارے او نواب جادی۔ دیکھ دن کہاں گیا۔ کب تک بھینس کی طرح پڑی رہے گی ؟ "

مگر رجیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رمضانی کو اور بھی غصہ آیا۔ اور اس نے چیخ کر کہا۔

"ارے لاٹ کی بچی ! اُٹھے گی یا نہیں ؟ "

پھر بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ تو وہ غصے میں کمرے میں گیا اور بولا۔

ارے رانی کی بچی اُٹھ اور چائے بنا۔۔۔ "

رجیا نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

ہوٹل جا کر پی لو۔ میرا جی اچھا نہیں لگتا۔"

رمضانی نے چڑ کر کہا

" اُٹھ چائے بنا۔ آئی بڑی مہارانی کہیں کی ۔۔ "

رجیا نے چڑ کر کہا۔

"جاؤ پی لو چائے بنا کر۔ آئے بڑے لاٹ صاحب . . . "

رمضانی کا خون کھول گیا۔ اُس نے رجیا کے سر کے بال پکڑے اور اُٹھا کر بٹھا دیا اور غصے میں بولا۔

اُٹھ حرمجادی۔ چائے بناتی ہے یا نہیں ؟ "

رجیا غصے سے لال ہو گئی۔ اُس نے اپنے سر کے بال درست کئے اور غصے میں بولی۔

" گلام کے بچے۔ میری کمائی کھاتا ہے اور اُلٹا آنکھ دکھاتا ہے۔ نمک حرام دوگلا "

اب رمضانی کو تاب نہیں رہی۔ رجیا کے منہ سے گالی نکلی اور اُس نے تین چار طمانچے رجیا کے گالوں پر لگائے۔ رجیا اور بھی گالی بکنے لگی تو رمضانی نے پلنگ سے کھینچ کر اُسے زمین پر ٹپک دیا اور اوپر سے دو تین لات لگا کر گالیاں بکتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ رجیا دیر تک گالیاں دیتی اور روتی رہی۔

ہر روز کا یہی قصہ تھا۔ محلے کے لوگ ان دونوں کی ہر روز کی لڑائی سے تنگ آ چکے تھے۔ جب دونوں میں جھگڑا ہوتا تو گلی میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ بہت سے لوگ جمع ہو جاتے۔ رمضانی جی کھول کر رجیا کو مارتا اور رجیا رمضانی کو ایسی ایسی گالیاں دیتی جو اس سے پہلے محلے والوں نے کبھی نہیں سنی تھیں۔ ایسی ایسی گالیاں جو تیر کی طرح کانوں میں اُتر جاتیں اور عورتیں اپنے گھروں کے اندر بھاگ جاتیں۔ مگر کوئی بھی ان دونوں کے جھگڑوں میں نہیں پڑتا تھا۔ اگر کوئی بیچ میں بولتا تو دونوں مل کر اُسی سے لڑنے لگتے۔ اسی لئے جب ان دونوں میں جھگڑا ہوتا تو کوئی بھی بیچ بچاؤ کرنے نہیں آتا۔ بلکہ رمضانی جب مار پیٹ کر چلا جاتا اور رجیا اُسے دیر تک گالیاں دیتی رہتی۔ تو جھگڑا آپ ہی ختم ہو جاتا۔ یوں رمضانی ہر بار عہد کر کے نکلتا کہ اب رجیا سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا اور رجیا بھی ہر بار سوچتی کہ رمضانی سے ناتا توڑ دے گی۔ جب تک دونوں کو غصہ رہتا دونوں الگ ہونے کی بات سوچتے رہتے۔ مگر دونوں کا غصہ ختم ہو جاتا۔ تو پھر میل ہو جاتا۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔

محلے کے لوگ دونوں سے تنگ آ چکے تھے۔ ان دونوں کی وجہ سے

محلے میں گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ محلہ بدنام ہو رہا تھا۔ نہ جانے یہ عورت کہاں سے آگئی تھی۔ اس سے پہلے کسی کی مجال نہ تھی کہ محلے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا۔ غریبی سے کیا ہوتا ہے۔ سارے محنت مزدوری کرنے والے مگر عزت والے تھے۔ سیدھی سادی زندگی گذارتے تھے۔ نہ کسی سے لینا ایک نہ دینا دو۔ مگر جب سے رمضانی رجیا کو لے آیا تھا، محلے کی حالت ہی بدل گئی تھی۔ محلے کی دوسری عورتوں نے گلی میں نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ رجیا کے جانے پہچانے مرد نہ جانے کہاں کہاں سے آتے رہتے تھے۔ لوگ دل سے چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ بلا دور ہو۔ مگر بلا تھی کہ دور ہوتی ہی نہ تھی۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ رمضانی سے لڑتا اور اسے محلہ چھوڑ دینے کو کہتا۔ وہ ذرا ذرا سی بات میں چھری نکال لیتا تھا اور مرنے مارنے پر تیار ہو جاتا تھا۔ کس کے کندھے پر دو سر تھے جو اس سے لڑائی مول لیتا۔ بےچارے چپ چاپ سب کچھ برداشت کرتے تھے۔

اس بار لڑائی تو زیادہ نہیں ہوئی۔ نہ رمضانی نے زیادہ مارا اور نہ رجیا نے زیادہ گالیاں دیں۔ لیکن غصہ دونوں کو بہت تھا۔ رمضانی نے دل میں ٹھان لیا تھا کہ رجیا کو گھر سے نکال دے گا اور رجیا نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب رمضانی کے ساتھ نہیں رہے گی اور رجیا نے ہی پہل کی۔ جب رمضانی مار پیٹ کر چائے پینے بازار چلا گیا۔ تو دیر تک وہ گالیاں بکتی رہی۔ پھر اس نے اپنا سارا سامان اکٹھا کیا۔ جا کر ایک رکشا لائی اور سامان اس پر رکھ کر نہ جانے کہاں چلی گئی۔ محلے کے جن لوگوں نے بھی رجیا کو جاتے دیکھا، اطمینان کا سانس لیا۔ چلو لعنت دور ہوئی۔ کسی نے دکھاوے کے لئے بھی نہیں کہا کہ نہ جائے۔ اس کی وجہ سے ساری گلی بدنام ہو گئی تھی۔ نہ جانے رمضانی اسے کہاں سے اٹھا لایا تھا۔ اس کو اپنی بیوی کہتا تھا۔ مگر یہ بات بالکل جھوٹی تھی۔ وہ ہر شام بن سنور کر کسی رکشے پر بیٹھ جاتی اور نہ جانے کہاں کہاں ماری پھرتی تھی۔ گیارہ بجے رات تک واپس آتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے جانے پہچانے مرد محلے میں بھی آجاتے تھے۔ دو چار بار محلے والوں اور باہر سے اس کی تلاش میں آنے والوں کے درمیان مار پیٹ تک نوبت پہنچ چکی تھی۔ رمضانی کا اپنا مکان تھا اور رجیا کو بیوی بتاتا تھا۔ کوئی کیا بول سکتا تھا۔ پہلے رمضانی رکشا کھینچتا تھا۔ مگر جب سے رجیا آئی تھی، اس نے کام کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ دن بھر ادھر ادھر گھومتے رہنا، کہیں بیٹھ کر گپیں کرنا یا جوا کھیلنا اس کا کام تھا۔ اور اگر کوئی اسے سمجھاتا تو اس سے لڑائی پر تیار ہو جاتا۔

دن ڈھلے رمضانی گھر واپس آیا تو اس کا غصہ ختم ہو چکا تھا۔ گھر پہنچ کر اسے بڑی حیرت ہوئی۔ باہر دروازے میں تالا بند تھا۔ محلے کی ایک عورت نے کنجی لا کر دی۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ رجیا کہہ کر گئی ہے کہ اب وہ واپس نہیں آئے گی۔ اس خبر سے رمضانی کو پہلے تو خوشی ہوئی۔ مگر پھر اس کو ذرا دھکا سا لگا۔ رجیا ہی چھوڑ کر چلی گئی۔ اس نے نہیں نکالا۔ تالا کھول کر اندر گیا۔ مکان کے اندر اس کے بستر اور چند کپڑوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ باہر سے کسی عورت کے بولنے کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ "اچھا ہوا کتیا چلی گئی۔ رمضانی پہلے کتنا سیدھا تھا۔ اسی نے برباد کیا۔ پگلے نے ایسی عورت پر اعتبار کر کے زندگی خراب کر لی۔" رمضانی کے دل کو جھٹکا سا لگا۔ عورت ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اسی عورت کے لئے اس نے اپنی زندگی خراب کی اور وہ بھی چھوڑ کر بھاگ گئی۔ مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بڑی بے پروائی کے ساتھ بڑبڑایا۔ "جانے دو حرامجادی کو۔ گھر پاک ہوا۔ سمجھتی ہے جیسے کوئی دوسری عورت ملے گی ہی نہیں۔" مگر فوراً ہی اسے خیال آیا۔ دوسری عورت کہاں سے ملے گی اور اگر ملے گی بھی تو کوئی اسی کی طرح ہوگی۔ اب کون اس سے اپنی بیٹی کا بیاہ کرے گا اور اب وہ کرے گا کیا؟ کھائے گا کہاں سے؟ یہ بات تو سچی تھی کہ کماتی تھی وہ اور یہ بیٹھ کر کھاتا تھا۔ اسی کی کمائی پر ٹھاٹ کرتا تھا۔ رمضانی کو یہ سوچ کر کوفت ہوئی کہ اب اسے مزدوری کرنی پڑے گی۔ اسے اپنے اوپر اعتبار نہیں تھا کہ وہ مزدوری کر بھی سکے گا۔ مگر اب چارہ بھی کیا تھا۔

رمضانی نے گھر کے دونوں کمروں کو اچھی طرح دیکھا۔ رجیا اپنی ساری چیزیں اٹھا کر لے گئی تھی۔ مگر رمضانی کی ساری چیزیں اپنی جگہ جیوں کی تیوں دھری تھیں۔ جیسے رجیا نے کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ رمضانی کی جیب میں چند آنے پیسے رہ گئے تھے اور گھر میں کوئی چیز نہیں تھی۔ دیر تک پلنگ پر سر جھکائے بیٹھا سوچتا رہا۔ اب کیا کیا جائے۔ سوچتے سوچتے ایک بات اس کے دماغ میں آئی۔ کسی طرح پھر کہیں سے کوئی جوان عورت لائے اور اس کی کمائی پر بے فکری کے ساتھ وقت گذارے۔ تین سال تک بیٹھ کر وقت کاٹنے کے بعد رکشا کھینچنا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔

مارتنڈ کے کھنڈرات
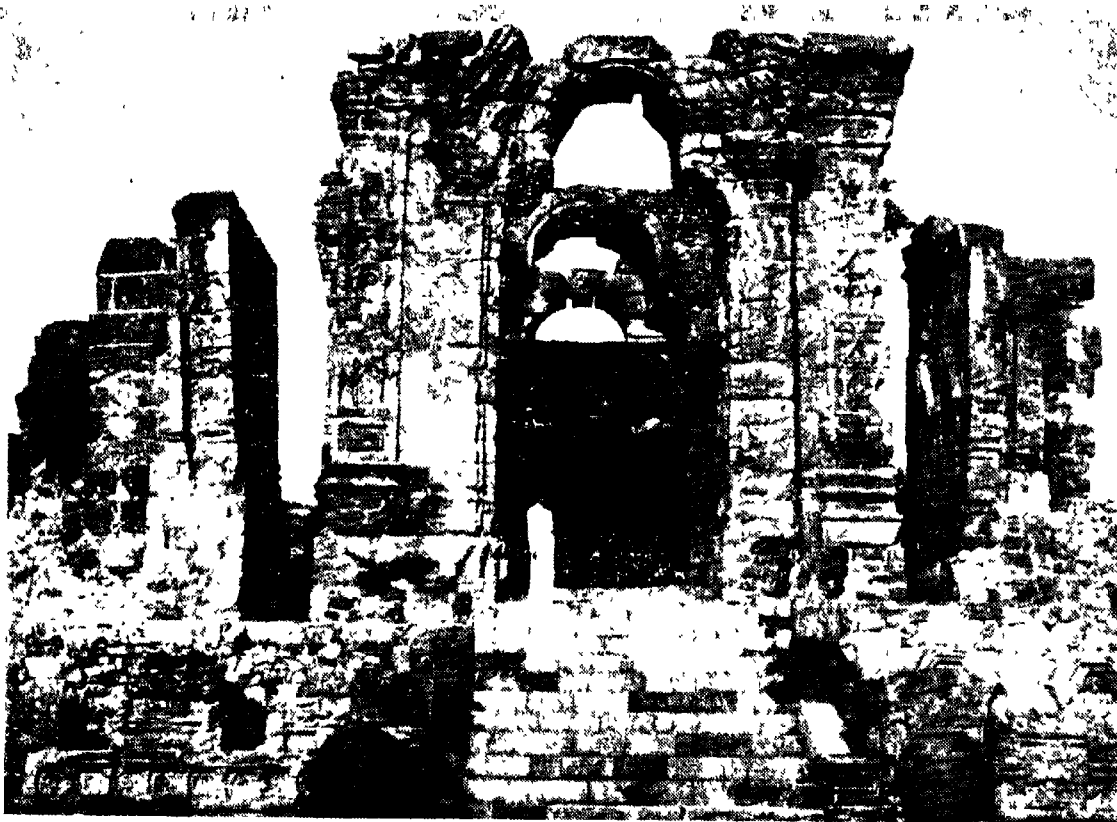
قدیم فن تعمیر کے چند نمونے

جامع مسجد

خانقاہ معلیٰ

معراج الدین
ممبر

تعمیر کے زیر اہتمام بچوں کے ایک کلب کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ یہ کلب بچوں کی ذہنی، جسمانی اور تہذیبی نشو و نما کیلئے مختلف سرگرمیوں کے مرکز کی حیثیت سے کام کرے گا۔

محمد سلیم
جو سال رواں کیلئے نونہال کلب کے صدر چنے گئے

دینا ناتھ نادم کے تحریر کردہ اوپیرا نیکی بدی کا ایک سین
نیکی بدی کے سب اداکار سات سے تیرہ سال کی عمر کے ہیں۔

[illegible] ممبر

عبدالمجید ڈار۔ ممبر

اُسے اپنی غلطی پر بڑا رنج ہوا۔ آخر وہ رجیا کے چکّر میں پڑا ہی کیوں؟ رجیا نے اُس کو کہیں کا بھی نہیں رکھا تھا۔ ایک دن وہ اس کے رکشے پر بیٹھی گھومتی پھر رہی تھی۔ وہ یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ رجیا آوارہ عورت ہے۔ پھر بھی اُس کی بات میں آ گیا۔ جب اُس نے ساتھ رہنے کو کہا تو انکار نہ کر سکا۔ اور اس کو اپنے گھر لے آیا۔ اس بدمعاش عورت نے اس کو کہیں کا نہ رکھا تھا۔ یہ تو سچ تھا کہ بیٹھے بیٹھے دونوں وقت روٹی مل جاتی تھی۔ تاڑی پینے اور جُوا کھیلنے کو پیسے بھی مل جاتے تھے۔ لیکن اس کا فائدہ کیا؟ وہ ہر ایک کی نظر سے گر گیا تھا۔ جو دوست کبھی اس کی محبّت کا دم بھرتے تھے۔ وہ بھی آنکھیں بچاتے تھے اور نیچی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک دن جب کلّو پان والے سے کسی بات پر اُس کا جھگڑا ہو گیا۔ تو اُس نے مُنہ پر دوٹک کہہ دیا تھا "چل سالے۔ عورت کی کمائی کھاتا ہے اور مقابلہ کرتا ہے۔ شرم بھی نہیں آتی۔" اور رجیا کے آنے سے پہلے یہی کلّو پان والا اُسے رمضانی بھائی کہا کرتا تھا۔

رمضانی کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ ذلّت کی گہری اور گندی نالی میں ڈوب گیا ہے اور اب اُبھرنے کی کوئی صورت نہیں۔ یہ سوچ کر اُسے رونا آ گیا۔ بڑے بوڑھوں نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ عورت مرد کی عقل کو مار دیتی ہے۔ رجیا نے اس کی عقل مار دی تھی۔ یہ جاننے کے بعد بھی کہ رجیا رنڈی ہے۔ اس کو اس لئے لے آیا تھا کہ وہ جوان تھی۔ اس کا بدن گدرایا ہوا تھا۔ اُس کی بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی۔ غضب کا تناؤ تھا اور بڑی کشش تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ رجیا اس کی بن کر رہے گی سدھر جائے گی۔ مگر رجیا رجیا ہی رہی اور یہ خود بدل گیا۔ اس کے نام پر اپنے آپ کو بیچتی رہی اور وہ تھوڑے سے آرام کی خاطر برداشت کرتا رہا۔ لوگ اُس کو دلال اور بھڑوا کہتے تھے۔ اب وہ اس کام کا بھی نہیں رہا تھا کہ کوئی محنت مزدوری کرے یا کسی بھلے مانس کے پاس جا کر کوئی نوکری ہی کرے۔ کوئی شریف آدمی اپنے گھر میں اس کو کیوں رکھنے لگا اور جب وہ بالکل برباد ہو چکا تھا تو وہ بھاگ گئی۔ رجیا پر اُسے بےحد غصّہ آیا اور اپنے آپ پر بھی۔ اگر وہ سامنے ہوتی تو رجیا کو چھری مار دیتا۔ اور اپنا کام بھی تمام کر لیتا کہ سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا۔

رجیا کی ایک ایک بات اُسے یاد آنے لگی۔ اُس کی پہلی مُلاقات جب وہ اس کے رکشے پر بیٹھی تھی اور وہ اُسے شریف عورت سمجھا تھا۔ مگر جب راستے میں اس کے رکشے سے اُتر کر وہ منگرو کے رکشے پر بیٹھ گئی۔ تو وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ عورت شریف نہیں ہو سکتی۔ منگرو کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا یہی پیشہ تھا۔ لیکن رجیا اس کی آنکھوں میں کھب گئی تھی اور اس نے دل ہی دل میں کہا تھا کہ یہ سالا مریل منگرو اور یہ سونے کی چڑیا۔ اس وقت وہ کچھ بھی نہ بولا تھا۔ مگر اس نے منگرو سے دوستی بڑھائی۔ آخر رجیا اس کے قبضے میں آ گئی۔ اس نے پہلے ضرور چاہا کہ رجیا بدل جائے۔ مگر وہ نہیں بدلی۔ اُس نے رمضانی کو بدل کر رکھ دیا۔ اُف کتنی عجیب عورت تھی۔ سامنے تو محبّت جتاتی تھی۔ مگر پیچھے میں دوسروں کے ساتھ گل چھرّے اُڑاتی تھی۔ رمضانی کو اپنے آپ پر غصّہ آ رہا تھا۔ اس کی عقل کیسی ماری گئی تھی۔ اب وہ دُنیا میں کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ جیسے جیسے ساری باتیں یاد آتی جاتی تھیں اس کا غصّہ تیز ہوتا جاتا تھا۔

رمضانی کو یہ بھی یاد آیا کہ رجیا کن کن لوگوں کے یہاں جاتی تھی۔ شہر کے کیسے کیسے لوگ اس کے قدرداں تھے۔ ہر روز وہ کتنے روپے لاتی تھی اُس کے پاس زیور کتنے ہو گئے تھے۔ یہ سب کچھ رجیا نے خود ہی اسے بتایا تھا۔ پھر بھی وہ اس پر بھروسہ کرتا رہا۔ زیور کے خیال نے رجیا کی زندگی کے دوسرے پہلو بھی اُسے یاد دلائے۔ اُسے یاد آ گیا کہ دو سال پہلے وہ سخت بیمار ہو گیا تھا اور نمونیہ ہو گیا تھا تو رجیا نے اس کی دیکھ بھال اور خدمت میں دن رات ایک کر دیا تھا۔ اپنے سارے زیور بیچ ڈالے تھے اور اس کا علاج کرایا تھا۔ رات رات بھر جاگ کر کاٹتی تھی۔ مگر اُس نے کبھی اپنے زیوروں کا ذکر کیا تھا۔ اور نہ تکلیفوں کا۔ رمضانی کو محسوس ہوا کہ اس کے مرنے کے بعد رجیا کے سوا اور کوئی دوسرا اُس سے محبّت کرنے والا نہیں تھا۔ یہ خیال آتے ہی رجیا کی طرف سے اس کا دل نرم ہو گیا۔ وہ آوارہ اور بدزبان سہی مگر محبّت ضرور کرتی تھی۔ لیکن بدنامی رسوائی اور اب یہ بے سروسامانی۔ اس کا جی چاہا کہ اُٹھ کر کہیں چلا جائے۔ مگر یہ بھی نہ کر سکا۔ بے سہارا بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ دیر تک روتا رہا۔ جب جی ہلکا ہوا بستر پر لیٹ گیا اور سو جانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نیند بھی نہیں آئی۔ طرح طرح کے خیالات دماغ میں آتے رہے۔ بارہا ایک ہی بات دماغ پر منڈلاتی رہی۔ اب پھر سے اچھا آدمی بن کر زندگی گذارنی چاہیئے۔ رجیا نے جو کچھ بھی کہا تھا سچ کہا تھا۔ ایک

بار اُس کی آنکھیں اس نے بند کر دی تھیں تو شور مچا کر جگا بھی دیا تھا۔ اب وہ پھر آنکھیں بند نہیں کرے گا۔ یہ کوئی زندگی نہیں ہے۔ اپنے بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ لوگ کتے سے بھی اتنی نفرت نہیں کرتے تھے جتنی اس سے کرتے تھے۔

جیسے جیسے رمضانی ساری باتیں سوچتا گیا۔ اس کو اپنے اوپر رحم آتا گیا۔ اور دل ہی دل میں اس گھڑی کو کوستا جب رجیا کو پہلی بار اُس نے دیکھا تھا۔ اگر وہ نہیں ملتی تو آج اس کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ کسی عورت سے بیاہ کر لیتا۔ غریبی کی مگر عزت کی زندگی گذارتا۔ لیکن اب ——— پھر وہ عزت کی زندگی گذار سکے گا۔ یہ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دوسرے دن سے پھر وہ کوئی کام ضرور کرے گا۔ کچھ نہیں تو رکشا ہی کھینچے گا۔ کچھ دن تکلیف تو ضرور ہوگی لیکن پھر عادت پڑ جائے گی۔

اسی طرح کی باتیں سوچتا سوچتا سو گیا۔ اُلجھن میں اُس نے گھر کا دروازہ بھی نہیں بند کیا تھا۔ کچھ کھڑبڑ ہوئی تو اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ مگر باہر روشنی جل رہی تھی۔ جلدی سے کمرے سے نکل کر باہر آیا۔ اُس نے دیکھ کر رجیا بیٹھی کھانا پکا رہی ہے۔ رجیا کو دیکھ کر اسے غصہ آیا اور وہ چیخ کر بولا ———

"حرامجادی کہاں گئی تھی اور چلی گئی تھی تو آئی کیوں؟"

رجیا نے جواب میں عادت کے مطابق گالیاں نہیں دیں بلکہ آہستہ سے بولی ——— "غصے میں چلی گئی تھی مگر جاتی کہاں؟ میرا اس دُنیا میں دوسرا کون بیٹھا ہے۔"

رمضانی کے غصے کی آگ پر جیسے پانی پڑ گیا۔ ٹھیک ہی کہتی ہے اس کا ہے بھی کون؟ آخر کہاں جاتی! رمضانی نرم پڑ گیا۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کرے۔ اس کو نکال دے یا گھر میں رہنے دے۔ اگر نکال دے تو پھر کہاں جائے گی۔ رہنے دے تو پھر اس کی زندگی گندگیوں میں پھنس جائے گی ——— مگر نکالے کیسے۔ نکالے گا تو پھر لوگ کہیں گے تین سال تک اس کی کمائی پر روٹیاں توڑتا رہا۔ بیمار پڑا تو اس نے اتنی خدمت کی۔ اس کو بھی بھول گیا۔ اب گھر سے نکال دیا تو اور بھی بُرا ہے۔ جو بدنامی ہونی تھی وہ تو ہو چکی ——— اس نے ذرا تیکھے انداز میں مگر سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہی کہتی ہے کہاں جائے گی۔ مگر ایک بات میری بھی سُن لے۔"

رجیا سر جھکائے بیٹھی رہی۔ کچھ نہ بولی۔ تو رمضانی بولا۔

"سُن لے۔ اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو شریف عورت بن کر رہنا ہوگا۔"

——— رجیا بولی

"جو تم کہوگے وہی کروں گی ———"

رمضانی سب کچھ بھول گیا۔ اس نے رجیا کے قریب آ کر کہا۔

"ہم کل سے پھر رکشا کھینچیں گے۔ تو گھر کی رانی بن کر رہے گی۔"

رجیا نے اس انداز سے سر جھکا دیا جیسے وہ بھی یہی چاہتی تھی ———

"تعمیر" کا اپریل کا شمارہ

مہجور نمبر ہوگا

مہجور کے فکر و فن، ذہنی ارتقا اور شخصیت پر اپنی نگارشات ارسال کیجئے۔

پندرہ مارچ ۱۹۵۷ء تک وصول ہونیوالی تخلیقات "مہجور نمبر" میں شامل کی جا سکیں گی۔

(مدیر)

سون آئین

ازمہ باسان لالہ آوسون، زُونہ ژوّل گردن
تارہ کو ہیوّت زُول زالون، زُونہ ژوّل گردن

بالہ ووتم ہنگہ وستاہ ڈالہ آئین   شیرہ لاگن بالاہس ہیٹھ ووت پائین
لولہ اتھوی شیوّرہم لون، زُونہ ژوّل گردن

ہُورہ ڈیکس نُور ملہ نیے آو آئین   شادہ سوکھس شُوبہ میانے زاو ضائین
شولہ وونی میون سونہ مالیوّن، زُونہ ژوّل گردن

کونگہ وارین رنگنے بیٹیہ تمناہ ڈراو   رنگہ ریوّناہ حیہ خوتو نہ یوسفاہ آو
اتھہ آلیس تہ رتھہ کھوّت کردن زُونہ ژوّل گردن

پتہ یورمادامنس سونہ چوُنہ ننم   زاگہ رُوزِتھ جگنہ ٹھس تھپ مہ دنم
سایہ سرکوی آم رچھہ ون، زُونہ ژوّل گردن

نامہ پرتوم کامہ دیو آم گرایہ یاران   شامہ ژھاین روی لیڈر یوو جای ژھاران
ہیوّتہ بیٹیہ ازنُور برِ زلون، زُونہ ژوّل گردن

باغس منز یام شیٹھ ستھ ووت شبنم   لُو رووی ہوّر پیالنی منز آبہ زمزم
پوشوی ہیوّت محتہ چھکرون، زُونہ ژوّل گردن

ہیندہ اندّسے ہمای بند میانی کیاہ چھ شانن   خندہ کرہ وو خندہ باندو وارہ کریشان
ہارہ ژوّلمت کارہ خم پرون، زُونہ ژوّل گردن

پردہ میانے ہین ژہ پاری ڈور گوشن   گاشہ میانے آش موجودرو زہ روشن
تقدیر میوّن ڈیکہ پھولون، زُونہ ژوّل گردن

تعمیر

ہمارا آئین

مجھے آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پریتم میرے گھر آگیا ہے اور چاند گہن سے نکل آیا ہے
ستاروں نے چراغاں کی محفل سجائی ہے اور چاند گہن سے نکل آیا ہے۔
مجھ البیلی کے ماتھے کا جھومر دآئین، کسی نے سوغات کے تھال میں سجا کر دیا ہے۔ اس کو میں اپنی مانگ پر کیوں نہ سجاؤں جبکہ میرے مقدر کا سورج نصف النہار پر پہنچ گیا ہے۔
کتنے ارمانوں سے میرے تقدیر کو سرسبز کیا گیا ہے جب ہی تو چاند گہن سے نکل آیا ہے۔
آئین تو مجھ سجیلی کے حسین ماتھے کو اور بھی پُر انوار بناتا آیا ہے۔ یہ میری مسرت اُمنگ اور آبرو کی ضمانت ہے۔
اب تو میرے پیارے میکے کا نصیبہ جاگ اُٹھے گا۔ چاند گہن سے نکل آیا ہے۔

زعفران کی کیاریوں پر نکھار لانے کیلئے ارمانوں کا قافلہ پھر آمادہ سفر ہے۔ اب پھر حبہ خاتون کے پاس اُسکا شوخ یوسف آن پہنچا ہے۔ اور اب میرا جیون سپھل ہو گیا ہے۔ چاند گہن سے نکل آیا ہے۔
اب میرے داماں کے بوقلمون نگینے کوئی چرا نہ سکیگا اور نہ ہی کوئی چوری چھپے میرے گلے کا ہار چھین سکے گا۔
اب میرے آبرو کا رکھوالا آن پہنچا ہے اور چاند گہن سے نکل آیا ہے۔
میری زلفوں کو سنوارو میرا ساجن اٹھکیلیاں کرتا ہوا آگیا ہے۔ رات کی ظلمتوں کا چہرہ بنا ہنگاہ مسرت آئینکی وجہ سے پیلا پڑ رہا ہے۔
آج پھر نور کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں اور چاند گہن سے نکل آیا ہے۔
گلشن میں جیسے ہی شبنم کا پیغام سنا گیا۔ اسی وقت غنچوں نے اپنے پیالے زمزم کے پانی سے لبریز کر دیئے۔
پھولوں نے موتیوں کی بارش شروع کی اور چاند گہن سے نکل آیا۔
ہندوستان میں میرے اپنے مسرتوں کے جھولے میں جھول رہے ہیں۔ کل تک جو میرا مضحکہ اڑاتے تھے۔ ان کے بھی منہ میں پانی بھر آیا ہے۔ اب پرانے بیداد کی کہانی ایک خیالی افسانہ بن چکی ہے۔
میرے نور کی کرنیں ظلمتوں کو نورانی بنا دیں گی۔ اور میری روشنی سے امید کا ستارہ چمکتا رہے گا۔
میری تقدیر کی جبیں مسکرا رہی ہے۔ اور چاند گہن سے نکل آیا ہے۔

پروفیسر بالی کرشن شرما

ڈوگری لوک شاعری

ادبی دنیا میں جو درجہ لوک شاعری کو حاصل ہے وہ شاید بلند تخیل کی اس کتابی شاعری کو نہیں جس سے لطف اندوز ہونیوالے افراد کی تعداد لوک شاعری کے شائقین کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ لوک شاعری کی اہمیت اس امر سے اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ یہ عوام کی روزمرہ زندگی، طرزِ معاشرت، رہن سہن، سماجی و اقتصادی حالت اور رسم و رواج کا ٹھیک ٹھیک نقشہ پیش کرتی ہے۔ یہ عوام کی ناز زبان پر رقص کرتی ہوئی اگر ایک طرف باعث مسرت بنتی ہے تو دوسری طرف بھولے بھٹکے موڑوں کی صحیح رہنمائی کر کے انہیں منزلِ مقصود کی طرف بھی لے جاتی ہے۔ اور پھر صدیوں کے تغیر و تبدل کے باوجود ایک ڈھرے پر رہنے والی یہ شاعری اہلِ زبان اور ماہرینِ لسانیات کے لئے بہت اہم بن جاتی ہے۔

ہر صوبہ اور علاقہ کی لوک شاعری کی طرح ڈوگری لوک شاعری بھی چند خاص خصوصیات کی حامل ہے۔ یہ اپنے علاقہ میں ہر دلعزیز اور مقبول ہے۔ ہندوستان کی کلاسیکل موسیقی میں بھی اسے ایک امتیازی شان حاصل ہے اور ان خصوصیات کی وجہ اس کی مٹھاس، گھلاوٹ سادگی، صفائی اور سلاست ہے۔ صوبہ جموں اور ہماچل پردیش کا علاقہ اپنی وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ لگ بھگ سارے کا سارا پہاڑی ہے۔ اور اس سارے علاقہ کی زبان ڈوگری ہے، گو علاقائی پھیلاؤ اور سرحدات کے دوسرے خطوں سے ملاپ کی وجہ سے ڈوگری لوک شاعری میں تھوڑا بہت اختلاف بھی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ڈوگری لوک شاعری جو نقشہ مجموعی طور پر پیش کرتی ہے اس میں فرق نمایاں نہیں۔ پیدائش سے موت تک کے دراز سفر میں شادی، غمی کے سر خوشنما

تعمیر

اور خطرناک موڑ پر آپ ڈوگری لوک شاعری کے بلبل کو سریلی اور مترنم آوازمیں چہکتا اور چہچہاتا پائیں گے۔

ڈوگری لوک شاعری بھی اردو و فارسی شاعری کی طرح مختلف اصنافِ سخن میں تقسیم ہے۔ اس میں بھی غزل، رباعی، قصیدہ، مثنوی قطعہ، بیت کی طرح گھوڑی، سہاگ، جاترہ، باراں، بسن پد، بھاکھ جھنجھوٹی، بسنتی، بھادتی ۔۔۔ ڈھولک کے گیت مشہور ہیں۔ لڑکے سے متعلق کسی بھی خوشی کے موقع پر گائے جانے والے گیت کو گھوڑی کہتے ہیں۔ اسی طرح لڑکی کی شادی پر گائے جانے والے گیتوں کو سہاگ کہا جاتا ہے۔ خدا کی یاد میں کہے گئے شعروں کا مجموعہ بسن پد کہلاتا ہے اور کسی دیوتا کی تعریف میں کہے گئے قصیدہ کا نام جاترہ ہے۔ پرانے بادشاہوں یا بہادروں کی شجاعت سے متعلق مثنویوں کو باراں کہتے ہیں۔ پہاڑی علاقہ کے اونچی اور لمبی آوازمیں کانوں پر ہاتھ رکھکر گائے جانیوالے گیت بھاکھ کہلاتے ہیں۔ جھنجھوٹی عشق و محبت میں کہی گئی غزل ہوتی ہے۔ یہ اقسام شعر بندی کے نام نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا تعلق شعر کے مضمون اور موقعت ہے۔

لڑکے کی پیدائش پر گھر خوشیوں کا مقام بن جاتا ہے۔ ایسے موقع پر لوک شاعر بھلا کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ ذیل کے اشعار سے اندازہ فرمایئے کہ وہ کس انداز میں نوزائیدہ کی پیدائش پر دلی مسرت کا اظہار کرتا ہے۔

ہر ہر مائے میری۔ ہر ہر ہے نو۔ ہر ہر میڑا ہر یا اے
جس دھیاڑے میرا ہیر ہر جمیا
اُس دے دھیاڑا بھاگیں بھریا اے

نا تا تے دھوتا ہریا پٹ پیٹیا !
گود دی ملیا دائی آں مائی آں آے
کے کشن دِ تا مائے دائی آں تے مائی آں
کے کشن دِتا سکّی ایں پَے نیں اَے

(ترجمہ) اے ماں اور بہنو ہری ہر کرشن کا نام لو۔ دیکھو۔ کرشن آج تمہارے گھر آیا ہے۔ اری اپنا صحن تو دیکھو۔ کیسا ہرا بھرا ہو گیا ہے جس دن کرشن ہمارے گھر پیدا ہوا وہی دن سب سے بڑا خوش قسمت ہے۔ اسی نوزائیدہ کی آمد کی خوشی پر دائیوں کو کیا خیرات دے گی۔ کرشن کو نہلایا، دُھلایا گیا اور پھر اُسے ریشم میں لپیٹ دیا گیا۔ دائیوں اور والدہ کی گود آج ہری بھری ہو گئی)

لڑکی کی شادی ہو رہی ہے۔ والدین اور رشتہ دار خوشیاں منا رہے ہیں۔ دعوتیں اُڑ رہی ہیں شہنایاں بج رہی ہیں۔ منڈپ میں دُولہا اور دُلہن رنگ برنگی ریشمی لباس میں ملبوس ہیں۔ پروہت منتر پڑھ پڑھ کر مقدس آگ میں آہوتی دے رہا ہے۔ عورتیں مل کر ایک آواز میں گا رہی ہیں

اس بیلے کُن کُن جاگے جی راجے دھرمے دا بیلا
اس بیلے بابُل جاگے جی راجے دھرمے دا بیلا
بابُل دان بی دِندا۔ داج بی دِندا
کنیا دا دان کراندا جی راجے دھرمے دا بیلا
اس بیلے ماما جاگے جی راجے دھرمے دا بیلا
ماما چوڑا جی دندا۔ بی ٹرا جی دِندا۔ بھنجی دا دان کراندا
اس بیلے بی راجا گے جی۔ راجے دھرمے دا بیلا
بی را دھوتی بی دِندا۔ کپلاں بی دِندا۔ بے نوں دا دان کراندا

(ترجمہ :۔ یہ دھرم کے راجہ کا وقت ہے۔ اس وقت کوئی دھرمی آدمی ہی جاگتا ہو گا۔ جبکہ ساری دُنیا میٹھی نیند کے مزے لے رہی ہے۔ اس وقت لڑکی کا باپ جاگ رہا ہے۔ جس نے دُختر کو دان میں دے دیا اور ساتھ بہت سا جہیز بھی دیا۔ یا اس وقت لڑکی کا ماموں جاگ رہا ہے جس نے بھانجی کو ہاتھوں میں پہننے کا چوڑا اور بیٹھنے کے لئے خوبصورت سنگار میز دیا۔ یا اس وقت لڑکی کا بہادر بھائی جاگ رہا ہے۔ جس نے بہن کو دھوتی اور دودھ پینے کے لئے دودھار گائے دی)

لڑکی کو ڈولی میں ڈال کر باجوں اور شہنائیوں کے ساتھ رخصت کیا جا رہا ہے۔ لڑکی رو رہی ہے۔ مگر اس کی آواز ڈھول اور باجوں کے شور میں مدغم ہو رہی ہے۔ لڑکی کے میکے والوں کی آنکھیں آنسوؤں سے پُرنم ہیں۔ ڈولی کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی عورتوں کی ٹولی درد بھرا گیت الاپ رہی ہے۔

لول میری لے باغیں دی اے کوئلے
باغ چھوڑی بن کی چلی ایں
بابُل میرے دھرم جے کی تا
دھرمیں دی بدّی آؤں چلی آں
اہنیں محلیں دے بِچ بِچ جی۔ بابُل ڈولڑے ایں لنگدا
اِک اِٹ پٹائی دینگے۔ دھی اے گھر جا آپنے
اہنیں باغیں دے بِچ بِچ جی۔ بابُل ڈولڑے ایں لنگدا
اِک انب پٹائی دینگے۔ دھی اے گھر جا آپنے
تیرے لمّے پیارے ن۔ بابُل کھینو کُن کھیڈسے
میریاں کھیڈن پوتریاں۔ دھی اے گھر جا آپنے

(ترجمہ :۔ ڈولی میں ڈالی گئی لڑکی کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے۔ اے میرے باغوں کی بلبل۔ تو باغ چھوڑ کر جنگل کی طرف کیوں جا رہی ہے اجی آپ کو معلوم نہیں میرے باپ نے دھرم کی شہادت میں میرے دان کا وعدہ کیا ہے۔ اسی وعدہ کی بندھی ہوئی میں جا رہی ہوں)

لڑکی اپنے باپ کو کہہ رہی ہے۔ اے میرے پیارے باپ تیرے محلوں میں سے میری ڈولی گذر نہیں سکتی۔ میں سسرال کیسے جاؤں۔ باپ بیٹی کو جواب دے رہا ہے۔ بیٹی تیری ڈولی کے صحیح سلامت گذر جانے کے لئے ہم اپنے محلوں کی اینٹیں اُکھڑوا دیں گے۔ تو اپنے گھر سسرال چلی جا۔ اے باپ اب یہ ڈولی تیرے باغ کے درختوں کی شاخوں میں اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ میں کیسے جاؤں۔ اے بیٹی ہم باغ کے دو چار آموں کے درخت کٹوا دیتے ہیں تو اپنے گھر چلی جا۔ بیٹی پھر بہانہ کرتی ہے۔ اے باپ تیرے گھر میں کھلے کھلے دالان ہیں۔ میرے چلے جانے کے بعد ان میں گیند کون کھیلا کرے گی۔ تب یہ بڑے سنسان لگیں گے۔ باپ جواب دیتا ہے بیٹی ان دالانوں میں میری پوتیاں گیند کھیلا کریں گی تم اپنے گھر چلی جاؤ)

مرد اپنی نئی نویلی دلہن کو اپنی ماں کے پاس چھوڑ کر نوکری پر حاضر ہونے کے لئے فوج میں چلا گیا ہے۔ دلہن اپنے شوہر کے لئے بیتاب ہے مگر لوک لاج کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔ وہ اپنی ساس سے سوال کرتی ہے۔

نوں سسو گی پچھنا کر دی
بار سپاہی کہاں رَوندے ں
پینگاں منجی پٹی سستھر باندے
شونک شٹی سے ای رَوندے ں

(ترجمہ:۔ بہو ساس سے پوچھ رہی ہے۔ آے اماں فوج کے سپاہی گھر سے باہر کس طرح زندگی گذارتے ہیں۔ ساس جواب دیتی ہے۔ بیٹی بھانگ وغیرہ کے سبز سبز پودے اکھاڑ اکھاڑ کر وہ اپنے بستر بچھاتے ہیں اور اُن پر آہیں بھرتے ہوئے سو رہتے ہیں)

دشمنوں نے قومی بہادر کو دھوکہ سے قتل کر دیا۔ اُس کی بہادر عورت جوہر کرنے کے بجائے دشمن سے بدلہ لینے کی تاک میں گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ بیٹوں نے سمجھا شاید اُن کی ماں مر گئی۔ مگر ایک لمبی مدت کے بعد وہ یکایک ایک اندھیری رات کو گھر واپس آ گئی۔ وہ اپنی بہو کو جگاتی ہے مگر بیٹا جاگ اُٹھتا ہے۔ ماں اُس سے دشمنوں کا حال پوچھتی ہے۔ اُس کا بدلہ لینے کا ارادہ ہے۔ لڑکا سمجھتا ہے۔ اُس کی والدہ شاید خدا کے گھر سے لوٹی ہے۔

سرگ لوکیں دا چلی اے ماتا بیر پرے نج آئی
ادّی راتیں پچھلے بیلے ستی دی نوں جگائی
اُٹھیاں شکر اے بالیاں دی آ بھری اے عالم مائی
باراں برے تگی بلگدے ہوئے ستی کی نے ایں ہوئی
جنیں بیری ایں تیر ابھرتا مار یا بڑے سکھے نج ہوئی
دن دن جاڑک جوڑے جیڑدے نند یا کرے لکائی
سپیّں دے پتر متر نی سنہدے چھنّے دُدّ پلائی
شیرین دے پتر متر نی سنہدے سنو باری نندی پائی

(ترجمہ:۔ آدھی رات کے سناٹے میں ماتا جنت سے چل کر بیر پور آ پہنچی۔ اُس نے گھر میں داخل ہو کر بہو کو جگانے کی کوشش کی۔ بیٹا جاگ

عتیر

اُٹھا۔ اور بہو کو پکار کر کہنے لگا۔ اے بھلی مانس اُٹھ۔ شکر ہے ہماری والدہ واپس آئی ہے۔ اے ماں! تیرا انتظار کرتے کرتے بارہ برس گذر گئے۔ بھلا تم نے جوہر کیوں نہیں کیا۔ جن دشمنوں نے تیرے بہادر شوہر کو قتل کیا تھا۔ وہ تو بڑے مزے میں ہیں۔ اُن کے ہاں اور نئی نئی شادیاں ہوتی ہیں۔ مگر لوگوں میں اُن کی بڑی غیبت ہوتی ہے۔ سچ ہے سانپوں کے بیٹے دوست نہیں بن سکتے۔ چاہے اُنہیں بڑے بڑے کٹورے بھر بھر کر دودھ کیوں نہ پلایا جائے۔ نہ ہی شیروں کے بیٹے سو بار قید کرنے سے دوست بن سکتے ہیں)

ڈوگرہ پہاڑی علاقہ اپنے میٹھے گیتوں اور مست ناچوں کے لئے مشہور ہے۔ پہاڑی ناچ کو کُڈ کہا جاتا ہے۔ کسی بھی تہوار یا خوشی کے موقع پر نوجوان مرد، عورتیں کسی میدان میں جمع ہو کر گول دائرہ کی شکل میں دوش بدوش کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مردوں کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں اور عورتوں کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے ریشمی رومال ہوتے ہیں۔ بنسری کی تان چھڑتی ہے۔ ڈھول پر تھاپ پڑتی ہے۔ نوجوانوں کے پاؤں گیت کی تال پر تھرکنے لگتے ہیں اور زمین و آسمان تھرکتے نظر آتے ہیں۔ عجیب سماں بندھ جاتا ہے۔

میری جو جاں سُندری اے۔ تیرے نین بلوری او
میری جو جاں سُندری اے۔ میرا من لیا چوری او

(ترجمہ:۔ اے میری خوبصورت محبوبہ جو جان تیری آنکھیں بلوری ہیں اے میری محبوبہ ان آنکھوں نے میرا دل چرا لیا ہے)

بڑی مدت کے بعد ساجن کا صحن میں سے گذر ہوا۔ شام کا وقت تھا محبوبہ ساجن سے رات بھر رہ جانے کے لئے اصرار کرنے لگی۔ ساجن کو دور جانا ہے۔ وہ جانے کیلئے ضد کر رہا ہے۔ محبوبہ اُسے لالچ دے رہی ہے۔

اجّے دی راتیں رَو میرے گدیا۔ رَو میرے گدیا
اجّے دی راتیں رَو
تھلوبی دنی آں بجرُو بی دِنی آں
ترٹکے گی دِنی آں گھیو
صابنی بی دِنی آں تیل بی دِنی آں
ساڑی لوی ببر نو

سارٹھی آ باڑی آمیرگ جو پو ندا
کلی آگی لگدا ای تھو

(ترجمہ: - اے میرے ساجن - رات بھر کے لئے میرے ہاں ٹھہر جاؤ۔ میں تمہیں میمنا اور بکری کا بچہ دیتی ہوں - کھانا پکانے کے لئے گھی بھی دونگی - نہانے کے لئے صابن اور تیل دیتی ہوں - تم ہمارے چشمہ پر نہالو - ہمارے پچھواڑے کے کھیت میں رات کو شیر حملہ کرتا ہے مجھ اکیلی کو ڈر لگتا ہے - اس لئے رات بھر کے لئے ٹھہر جاؤ - میں تمہیں آٹا اور چاول دیتی ہوں - تم صحن میں کھانا پکالو -)

میلہ لگا ہوا ہے - دوکانیں سجی ہوئی ہیں - رنگ برنگی کرتے پہنے بچے اُچھل کود رہے ہیں - دوکانوں پر گاہکوں کی بھیڑ ہے کہیں مداری کی ڈگڈگی بج رہی ہے - کہیں نوجوان مرد عورتیں ہنڈولوں پر چڑھے جھولنے کا لطف لے رہے ہیں - نوجوانوں کی ایک ٹولی پہاڑی گیت گانے کے لئے تیار ہو رہی ہے - یہ لو اُنہوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے - اور گیت شروع ہوا -

او پکھّی لوڑچدی کنّے جھو لچدی
کنّے ڈولچدی او
او پکھّی اے لگن سُنّے دیاں لڑیاں
اوندے سجّن کرشے عرضیاں
پکھّی لوڑچدی کنّے جھول چدی
کنّے ڈولچدی او

(ترجمہ: - اے محبوبہ! تیرے ہاتھ کی اس خوبصورت پنکھی کی ہمیں ضرورت ہے - یہ پنکھی خوب جھلی جاتی ہے - یہ بڑی خوبصورتی سے جھلائی جاتی ہے - اس پنکھی میں سونے کی جھالر لگی ہوئی ہے - اسی لئے ساجن لوگ اس کے لئے منتیں کر رہے ہیں)

رات کا وقت ہے - بچے دادی کے ارد گرد جمع ہیں - وہ اماں دادی کو کہانی سُنانے کے لئے مجبور کر رہے ہیں - دادی بچوں ... کے لئے اُنہیں پہیلی بوجھنے کے لئے کہتی ہے - بچے ہاں چاہتے ...

سری نگرا چور ڈھیا نین راجے تاڑیا
سفت رنگیں پکڑی آندا - نیل راجے ماریا

(ترجمہ: - بھئی بتاؤ تو بھلا سری نگر کے پہاڑوں سے ایک چور نیچے کی طرف آیا - نین راجہ نے اُسے پہچان لیا - سفت رنگ اُسے پکڑ کر لے آئے - اور نیل راجہ نے اُسے مار ڈالا)

بچے سوچ میں پڑ گئے - بہت سر ٹپکا - مگر پہیلی نہ بوجھی جا سکی آخر دادی اماں نے بتایا کہ سری نگر کا مطلب سر ہے اور نین راجہ آنکھ ہوئی - سفت رنگ سے مراد ہاتھ ہے اور نیل راجہ ناخن ہوئے - بچے جھٹ بول اُٹھے - دادی اماں ہم سمجھ گئے - یہ تو جوں ہوئی -

ڈوگرہ لوگوں کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں جس کی اچھائی، بُرائی کو لوک شاعروں نے موضوعِ سخن نہ بنایا ہو - چرواہے اور گڈریئے اپنے مویشیوں کو چراتے وقت اُن کی تعریف میں گیت گاتے ہیں - کسان ہل چلاتے یا فصل کاٹتے وقت فصلی گیت الاپتے ہیں - مسافر راستہ طے کرتے ہوئے اپنے گھروں کی یاد میں مگن گھریلو زندگی کے گیت پڑھتے ہیں - کبھی محبوبہ عاشق کو مناتی ہے تو کبھی عاشق محبوبہ کو چشمہ پر مل جانے کے لئے شعروں میں عرض کرتا ہے - کبھی کسی شعر میں پہاڑی زندگی کی تعریف سُنائی دیتی ہے تو کبھی اشعار میں ہی اُس کی برائیوں کا ذکر ہوتا ہے - یہاں تک کہ موت کے سے منحوس موقعہ پر بھی مرنے والے کی لاش پر لوا نیاں نام کے شعر پڑھے جاتے ہیں - اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف ڈوگرہ علاقہ کے پہاڑی منظر ہی قدرتی شاعری کا نمونہ پیش کرتے ہیں - بلکہ ڈوگرہ زندگی بھی بذاتِ خود ایک جیتی جاگتی شاعری ہے -

(بشکریہ ریڈیو کشمیر)

شوق بہرائچی

مزاحیہ غزلیں

○

یہ ڈر ہے نالۂ آتش فشاں سے
کہ ایٹم بم نہ برسیں آسماں سے

ہوئے محوِ سیاست یوں نمازی
اقامت کہہ گئے پہلے اذاں سے

چمن میں ہو نہ نقصِ امن یارب
مچلکہ لے لیا جائے [illegible] سے

تمہی نے رہبری واعظ کی چھوڑی
نہ سنبھلا اونٹ آخر ساربان سے

معاذ اللہ وفورِ شوقِ طاعت
چپک کر رہ گیا سر آستاں سے

پلے ہیں آپ ہی کے گھر میں دونوں
چنّوں کا بیاہ کر دیجئے چنّاں سے

نمازوں میں بھی دل سوئے صنم ہے
ارے یہ پالسی اللہ میاں سے

مبارک ہو یہ کرسیٔ صدارت
کہا یہ قیس نے لیلیٰ کی ماں سے

خموشی میں ہے جب اے شوق ہلچل
قیامت ہو گی برپا ہم جو کھانسے

تعمیر

○

کبھی خوئے بتاں مائل بہ احساں ہو نہیں سکتی
کوئی سوتیلی ماں ہرگز سگی ماں ہو نہیں سکتی

طبیعت کاغذی پھولوں سے شاداں ہو نہیں سکتی
دھتوروں سے تو تزئینِ گلستاں ہو نہیں سکتی

تمہارے وعظ کا واعظ اثر کچھ ہو نہیں سکتا
تمہاری طرح کُل مخلوق شیطاں ہو نہیں سکتی

تمہاری رہبری بیکار ہے صحنِ گلستاں میں
یہ کیپی ٹین کی شمعِ شبستاں ہو نہیں سکتی

زبانِ حال سے بدنیّتیٔ واعظ کی کہتی ہے
بلا چوری کئے تکمیلِ ایماں ہو نہیں سکتی

پرِ پرواز کو دے ہمّت پرواز ہی یارب
جو نیچی چند فٹ دیوارِ زنداں ہو نہیں سکتی

تمہاری کج ادائی فطرتی ہے جا نہیں سکتی
یہ دُم کُتّے کی ہے سیدھی مری جاں ہو نہیں سکتی

پروفیسر حسن شاہ

تاریخ کشمیر —— برہمنی تہذیب کا دور

مہاراجہ للتادتیہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی کشان مملکت میں گھر گھر راج ہوگیا۔ اس گیر و دار میں بودھی تہذیب کی بنیادیں ہل گئیں اور رہے سہے برہمنی تہذیب نے پھر سے بال و پر سنبھالنے شروع کئے۔ حتیٰ کہ نویں سے بارہویں صدی تک برہمنی تہذیب پوری حدت سے چمک اُٹھی۔ کشمیر کے اس دورِ خوش بختی کی انمٹ یادگاریں ہیں سنسکرت شعر و ادب۔ کشمیر شیو درشن اور برہمنی فنِ تعمیر کے شاہکاروں کے روپ میں ملتی ہیں۔ ان یادگار زمانہ کارناموں کی روپ ریکھا ان سطور میں پیش نظر ہے۔

کلہن کی راج ترنگنی کی روایات کے مطابق کشمیر میں سنسکرت شعر و ادب کے اولین علمبردار ناٹک نویس چندرک اور راج کوی ماتری گپت ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان دونوں ادیبوں کے شاہکار دستبردِ زمانہ کی نظر ہو چکے ہیں۔ البتہ شری پور کی سبھاشتا ولی میں نخوڑے بہت انتخاب دستیاب ہوتے ہیں جن سے چندرک اور ماتری گپت کی عظمت کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بعینہ کارکوٹا شاہی خاندان سے منسلک شعراء اور ادباء کے ادبی کارنامے بھی معدوم ہو چکے ہیں۔ کشمیر کی سب سے قدیم سنسکرت تصنیف جو اب بھی ملتی ہے۔ "ہر وجے" ہے۔ یہ کتاب نویں صدی میں لکھی گئی تھی۔ اس کا مصنف راجانک رتنا کر ہے۔ ہروجے چار ہزار بندوں کا ایک عظیم الشان رزمیہ ہے۔ یہ بھگوان شو کی اندھک نامی راکھشس پر فتح کا پُر شکوہ بیان ہے۔ ساری نظم صنائعِ شعری سے مرصع ہے۔ اس کے انداز و ادا میں بان کی طرز شاعری کا اثر جھلکتا ہے۔ ثقافتی نکتہ نظر سے شیو دیو مالا اور فلسفہ کے طلباء کے لئے یہ کتاب خاص دلچسپی کی حامل ہے۔ راجانک رتنا کر کے بعد دوسرا نامور کشمیری شاعر ابھی نندگوڑ گذرا ہے۔ جو بنگال کے پال شاہی خاندان کی سرپرستی حاصل تھی

اُس کی تصنیفات میں رام چریت اور کادمبری کتھا سار قابلِ ذکر ہیں۔

دسویں صدی میں شعر و ادب کی محفلیں سُونی پڑی رہیں البتہ گیارھویں صدی میں کشمیر کے دو مایہ ناز سپوت کھیمندر اور بلہن سنسکرت شعر و ادب کے آسمان پر آفتاب بن کے چمکے اور اُن کی تصنیفات آج بھی ہمارے علم و ادب کا گراں قدر سرمایہ مانی جاتی ہیں۔ ان میں سے پہلا عوامی اور دوسرا درباری شاعر تھا۔ ان کا مختصر سا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کھیمندر راجاؤں اور دیوتاؤں کی دُنیا سے نکل کر انسانوں کی دُنیا اور عوام کی زندگی کی کہانیوں کو موضوعِ سخن بناتا ہے۔ وُہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار نہیں چاہتا۔ بلکہ نوکِ قلم اور طنز و مضحکہ کے نشتر سے اُنہیں اور بھی اُجاگر کرتا ہے۔ اُس کی یہی خصوصیت اُسے اپنے معاصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ کھیمندر ابھینو گپت آچاریہ ابھی ناو گپت جیسے عالم بے بدل کا شاگرد اور کھیمراج جیسے شیو فلسفی کا ہمدرس تھا۔ وُہ بڑا پرگو شاعر اور کثیر التصنیف مصنف تھا۔ بودھ اودان کلپ لتا۔ کلا ولاس، سمے ماترکا، دیش اُپدیش، نرم مالا اور کوی کنٹھ بھارن اُس کی اہم تصنیفات ہیں۔ ان میں سے اول الذکر میں گوتم بدھ کی پہلی زندگیوں کی کہانیاں ہیں۔ یہ کتاب بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ [illegible] میں اس کا ترجمہ تبتی زبان میں ہوا تھا۔ اور تبتی مذہب و ادب میں اسے نہایت [illegible] مقام حاصل ہے۔ کوی کنٹھ بھارن صنائعِ شعری سے متعلق ہے۔ بنارس یونیورسٹی کے ڈاکٹر سوریہ کانت صاحب نے حال ہی میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ لیکن تاریخی اور ثقافتی اعتبار سے باقی چار تصانیف زیادہ اہم اور دلچسپ ہیں۔ [illegible]

سنسکرت ادب کے جوہر شناس کلا ولاس کو کھیمندر کا سب سے بڑا شاہکار سمجھتے ہیں۔ پوری نظم دس فصلوں پر مشتمل ہے۔ نظم کا آغاز ایک مشہور زمانہ عیار مولدیو کے تعارف سے ہوتا ہے۔ مولدیو اپنے چیلے چندر گپت کو تجارتی عیاریوں اور چالاکیوں کے درس دیتا ہے۔ اور ایک کامیاب دُنیادارانہ زندگی کی راہ دکھاتا ہے۔ چنانچہ شروع شروع میں گھمنڈ۔ لالچ اور بنیا پن کی صفات کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد طوائفوں کے مکروفریب کے ہاتھوں عشاق کی زبوں حالی کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ اس کے بعد نوکرشاہی اور کالستھوں یعنی کلرک پیشہ طبقے کی بد دیانتی اور بے راہ روی طنز و استہزا کے نشتر چبھو چبھو کر بے نقاب کی گئی ہے۔ اسی طرح شیخی خوری اور شراب نوشی کی مذمت ڈوم ڈھاریوں اور بھائیوں پر پھبتیاں کسی گئی ہیں۔ اس کے بعد سناروں کی چولستم قسم کی بے ایمانیوں کا بھانڈا پھوڑا گیا ہے۔ اور آخری دو فصلوں میں نوجوانوں کو بد اطواری سے بچنے کی نصیحتیں کی گئی ہیں۔ اسی سے اندازہ فرمایئے کہ ہمعصر معاشرے کا یہ نقشہ مورخ کے لئے کس قدر اہم ہے۔

سمے ماتریکا کلاوتی نامی ایک نوخیز طوائف کی داستان ہے جو اپنے مکروفن میں دستگاہ حاصل کرنے کے لئے سارے کشمیر میں گھومتی ہے۔ اس سیر کی کہانی میں جا بجا معاشرتی خاکے آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ جو جغرافیائی نکتہ نظر سے بھی بڑا اہم ہے چنانچہ سراورل سٹائن کو اپنے "قدیم جغرافیہ کشمیر" کی تدوین میں اس سے کافی مدد ملی ہے۔ اسی طرح قحبہ خانوں کی صبح و شام۔ عشاق کی اقسام۔ بے زر عشاق سے دامن چھڑانے کے ۲۲ طریقے اور بالآخر ایک نوجوان کو پھانسنے کی داستان بڑے دل چسپ طریقے سے بیان کی گئی ہے۔ گو یہ کتاب عریاں نگاری کی مُتہم ہے تاہم ژین پال سارترے کی "انٹی میسی" یا "فاراپور امیز" سے زیادہ بے باک نہیں۔ کھیمندر نے اس تصنیف میں ایک رِستے ہوئے ناسور کو ضرور بے نقاب کیا ہے۔ اور یہ بذاتِ خود اُس کے فن کا معراجِ کمال ہے۔

دیشن اپدیش معاشرتی نکتہ نظر سے اور بھی اہم تصنیف ہے۔ اس میں کھیمندر اپنے زمانے کے معاشرے کی زیادہ واضح تصویر پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں جا بجا ہمعصر رسم و رواج اور بد نام کرداروں

کا تذکرہ ملتا ہے۔ بخیلوں کی زندگی اور عادات پر اُس کا استہزا کشمیر کی ایک درس گاہ میں ایک بنگالی طالب علم کا مضحکہ خیز ذکر۔ ایک بڈھے کی شادی پر قہقہہ، شاعر، نیم حکیم اور نجومیوں پر چوٹیں قابل ذکر ہیں۔

نرم مالا میں سرتاپا نوکرشاہی اور کالستھوں پر تحقیر آمیز طنزیں کی گئی ہیں۔ ہمعصر راجہ اننت کی رسمی تعریف کے بعد اُس کے افسروں کی کرتوتیں خوب طشت ازبام کی گئی ہیں۔ ان لوگوں کے کردار کی کیفیت کھیمندر چٹکیاں لے لے کر بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ان لوگوں کا مقصد حیات محض سرکاری ملازمت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ان کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا ہے اور ہر وقت بد دیانتی اور رشوت ستانی کے نت نئے ڈھنگ سوچتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ اُن کی سرکاری اور نجی زندگی کی نہایت گھناؤنی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔

یہ سب کتابیں چھپ تو چکی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان کے ترجمہ کرنے کی طرف کسی کو توجہ نہیں ہوئی ورنہ کشمیری تاریخ کے طالب علموں کے لئے یہ مواد بڑی افادیت کا باعث ہوتا۔

افسوس ہے کہ کھیمندر کی تاریخ موسومہ نرپاولی عنقا ہو چکی ہے اور یہ دُنیائے علم کا ایک المناک سانحہ ہے۔

کھیمندر کا اسلوب بیان اچھوتا۔ زبان فصیح و بلیغ اور حسن مذاق اور طنز و استہزا اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ سماج کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ اور اڈیسن کی طرح ہجو و استہزاء سے معاشرے میں انقلاب کا متمنی نظر آتا ہے۔ اُس کا انداز حسین و نازک ہی نہیں دلدوز بھی ہے۔ یہی اُس کے فن کا اعجاز ہے۔ کھیمندر واقعی ہمارا پہلا عوامی شاعر کہلانے کا مستحق ہے۔

کھیمندر کے مقابلے میں بلہن ایک درباری شاعر ہے۔ اُس کی شہرہ آفاق تصنیف وکرمانک دیوچرت ہے۔ اسی میں اُس نے جا بجا اپنی آپ بیتی کی طرف اشارے کئے ہیں۔ بلہن کشمیر کے موضع کھن موہ کا رہنے والا تھا۔ جہاں کی برفانی چوٹیوں لہلہاتے کھیتوں رس بھرے انگوروں سے لدی بیلوں اور سنسکرت اور پراکرت بولنے والی حسن و رعنائی کی شاہکار عورتوں کا ذکر جھوم جھوم کر کرتا ہے۔ جس سے نہ صرف اُس کی [illegible] ہی بلکہ اُس کا جذبہ حب الوطنی بھی پھوٹ پھوٹ کر نکلتا ہے۔

بلہن مدتوں قنوج کاشی متھرا پریاگ اور انہلواڑہ میں گھومتا رہا، اور بالآخر کلیانی کے چالوکیہ حکمران وکرم آدتیہ ششم نے اُسے اپنا ملک الشعراء مقرر کیا اور چھتر و ہاتھی بخش کر عزت افزائی کی۔ وکرمانک دیو چیرت کی مرصع رزمیہ نظم اسی عنایت کا حسین و جمیل شکریہ ہے۔ سنسکرت ادب تاریخ سے تہی دامن ہے۔ یہ کتاب اس کمی کو کسی حد تک پورا کرنے میں اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ فصاحت، ندرت خیال اور بلندی کلام کے لحاظ سے بھی اسے کافی امتیاز حاصل ہے۔ بلہن اپنے فن پر بجا طور پہ نازاں تھا۔ لیکن اُس کا یہ فن شہنشاہی کی چوکھٹ پر کھڑا ہے اور عوام کی سوقیانہ مزاجی کی ترجمانی کا متحمل نہیں۔ بلہن ایک جگہ کہتا ہے:-

> "اے شاہان زمان شاعروں کے اظہار جذبات کی راہ
> میں حائل نہ ہونا، کیونکہ تمہاری نیک نامی کی راہ کی سلامتی
> انہیں کی مرہون منت ہے۔ رام کی عظمت و شوکت کی
> داستان میں انہیں کی شکر گذاری کی رنگینی ہے۔ اور
> ایک دُنیا کے فاتح راون کی ہنسی اُڑانے میں، انہیں کا
> جذبہ استحقار کارفرما ہے"۔

چورپنچاشکہ اُس کی ایک اور حسین یادگار ہے۔ اس نظم میں بلہن ایک راجکماری سے اپنے معاشقے کی داستان بیان کرتا ہے۔ اس نظم کی رنگینی اور دلکشی بھی قابل داد ہے۔

گیارہویں صدی کے اواخر میں سوم دیو کی تصنیف کتھا سرت ساگر قابل ذکر ہے۔ یہ کہانیوں کی ایک کتاب ہے اور برہتھ کتھا اور کتھا کوتک کی طرح ہماری کئی عوامی کہانیوں کا خزینہ ہے۔ اس صدی کے دوسرے نامور مصنف منکھ اور کلہن ہیں۔ منکھ سری کنٹھ چیرت کا مصنف ہے، یہ ایک طویل رزمیہ نظم ہے جس میں شوجی اور تری پورا راکھشس کی لڑائی کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ہمارے لئے اس کا پچیسواں باب بڑی دلچسپی کا حامل ہے۔ اور کشمیر کے سنسکرت ادب کی تاریخ میں بڑا اہم ہے۔ اسی باب میں مصنف بیان کرتا ہے کہ جب اُس کی کتاب مکمل ہوئی تو اُس نے اسے علماء و فضلاء کی ایک مجلس میں پیش کیا۔ یہ مجلس اُس کے بھائی النکار کے ہاں منعقد ہوئی تھی جو جے سنگھ راجہ جے سنگھ کا وزیر تھا۔ منکھ اس مجلس کا پورا خاکہ پیش کرتا ہے اور اراکین مجلس کی مکمل فہرست بھی درج کرتا ہے۔ اس مجلس میں تیس صاحب ذوق دوست جمع تھے جن میں دس شاعر، پانچ فلسفی و صوفی، ایک منطقی، ایک شیو آچاریہ، ایک استاد ادب، تین صرف و نحو اور علم بیان کے ماہر، چار طبیب، ایک سرکاری افسر، بیرونی ممالک کے تین سفیر اور منکھ کے گرو شامل تھے۔ اس تفصیل سے اُس زمانے کی علمی مجلسوں کے خد و خال، معیار ذوق اور تہذیبی فضا کی ایک جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرتی نظر آتی ہے۔

اس صدی کا سب سے بڑا شاہکار کلہن کی راج ترنگنی ہے۔ فردوسی کے شاہنامہ کی طرح ادب عالم میں اسے ایک نہایت بلند مقام اور ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ کشمیر کے تاریخوں کے سب مصنف اُسی کے خوشہ چین ہیں۔ اس کی ثقافتی و تاریخی اہمیت و افادیت ایک علیحدہ صحبت کی محتاج ہے۔

شعر و ادب کے اس ارتقا کے ساتھ ساتھ فلسفہ و روحانیت کے میدان میں بھی کشمیری علماء نے بے مثل شاہکار یادگار چھوڑے ہیں۔ جن کی چھاپ آج بھی ہماری تمدنی زندگی پر نہایت گہری نظر آتی ہے۔ اس دور میں کشمیر شیومت اور الیشور پرتی جیسے فلسفہ کا عروج و ارتقا قابل ذکر ہے۔ ہندوستان کے چھ فلسفوں کے مقابلہ میں یہ ایک ساتواں فلسفہ ہے جو خالص کشمیر کی دین ہے۔

شیومت کا بنیادی عقیدہ ہے کہ خدا، روح اور مادہ تین الگ الگ قائم بالذات حقائق ہیں، اور مذہب، ایمان اور عبادات کے ذریعے روح کو مادے کے جنجال سے چھڑا کر معبود حقیقی سے ملانا روحانیت کا معراج کمال ہے۔ "شو"، "انسان" اور "دنیا" کا یہ تثلیثی تصور مہایان بودھ مت کے تصور نروان سے بہت حد تک متاثر نظر آتا ہے۔ اسی طرح شو اور بھگوتی درگا یا شو اور شکتی کے تصورات پر مہایان بودھ مت کے رب الارض اوی لوکیتشور، اور "تارا" کا اثر بھی نمایاں ہے۔

کشمیر میں شیومت کا بانی واسوگپت مانا جاتا ہے۔ جس نے سب سے پہلے ایک رویائے صادقہ میں بھگوان شو سے بشارت پا کر "شو سوتر" دریافت کئے اور ان کی تبلیغ و اشاعت کی۔ یہ سوتر یا مختصر عبارات ہی اس سلسلہ مذہب کی بنیاد ہیں۔ اور الہامی مانی جاتی

پیدا ہوئے جنہوں نے فلسفہ یا ترکا کی ترویج و ترقی اور اس کے ادب کی تدوین کا فریضہ [illegible] شیو (تصوف) [illegible] مستحق ہے۔ اس فلسفہ کا ادب بھی تین شعبوں میں منقسم ہے:

(الف) آگم شاستر: جو مہا شیو اور شکتی کے مکالمات یا صرف شیو کے کلام کا مجموعہ ہیں اور الہامی مانے جاتے ہیں جیسے "مالنی وجیوتر تنترم" یا "شیو سوتر"

(ب) سپند شاستر: جو الہامی تو نہیں لیکن معرفت کائنات سے متعلق ہیں۔ اور

(ج) پرتی بھگیہ شاستر: جو معرفت اسرار اور خدا شناسی سے متعلق ہیں۔ موخر الذکر شیومت کا علم تصوف ہے اور اس لحاظ سے ہمارے لئے اہم ترین ہے۔ کیونکہ اس فلسفہ کی طرز فکر کا اثر ہماری تمدنی اور قومی زندگی پر سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اس فلسفہ کے تصور توحید اور اسلامی تصور توحید میں ایسی مماثلت تھی کہ مبلغین اسلام کو اسلام کی تبلیغ میں کوئی نظریاتی مشکل درپیش نہ آئی۔ اور انہوں نے کشمیر میں ایسی بین کامیابی حاصل کی جس کی مثال جنوبی اور وسطی ایشیا میں اسلامی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔

الیشور پرتی بھگیہ کی بنیاد کشمیری صوفی و عالم سومانند کی تصنیف "شیو درشٹی" ہے جس کا سن تصنیف لگ بھگ ۹۰۰ء ہے۔ سومانند کے مشہور شاگرد اتپل نے اس طرز فکر کو فلسفیانہ رنگ بخشا۔ "شرح سپند کاریکا" اور "الیشور پرتی بھگیہ سوتر" اس کی عظیم الشان یادگاریں ہیں۔
اس دور میں ایک اور عالم بھٹ نارائن بھی ہو گزرا ہے۔ جو لغت و مناقب کی مشہور کتاب "ستو چنتامنی" کا مصنف تھا۔ اتپل اور بھٹ نارائن دونوں کا شاگرد لکشمن گپت تھا جس کے تلامذہ رشید میں مشہور آچاریہ ابھی ناو گپت تھا۔ ابھی ناو گپت الیشور پرتی بھگیہ فلسفہ کا امام و شیخ اکبر تھا اور اپنے زمانے کا عالم اجل، بے بدل فلسفی و صوفی اور کثیر التصنیف مصنف ہو گزرا ہے۔ چنانچہ شیومت کا دائرۃ المعارف "تانترلوک" جو بارہ ضخیم جلدوں میں حکومت کشمیر کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے تبحر علمی اور دقت تحقیق کا زندہ جاوید کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ "مالنی وجے ورتی کم" اور "پرتی بھگیہ ومرشنی" بھی اس کی معرکۃ الآرا تصنیفات

تعمیر

ہیں۔ ابھی ناو گپت کا نام ہمارے تذکرہ نویسوں کے حلقوں میں اگرچہ ابوالفضل اور امیر خسرو کے نام کے ساتھ کئی داستانیں اور روایتیں کی کہانیاں مشہور ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ ابھی ناو گپت نے اپنے تبحر علمی اور معرفت اسرار کے بل بوتے پر ہندوستان کے شہرۂ آفاق عالم و فلسفی جگت گرو شنکر آچاریہ سے مقابلہ کی ٹھانی اور بالآخر علمی مباحثوں میں پے در پے شکستیں دے کر جگت گرو کو کشمیر سے ناکام لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ ابھی ناو گپت کے بعد اس کے مایہ ناز شاگرد کھیم راج نے اپنے استاد اور دیگر پیشرو شیو فلسفیوں کی تصنیفات پر قابل قدر حاشیے اور شرحیں لکھیں اور اس فلسفہ کو عام فہم اور مقبول بنانے میں بڑا کام کیا۔ اس فلسفہ کا آخری بڑا شارح اور مفسر جے رتھ تھا جو تیرھویں صدی میں ہو گزرا ہے۔

الیشور پرتی بھگیہ کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ شو یا معبود حقیقی کی معرفت حاصل کرنے کا بہترین طریقہ معرفت نفس یا خود شناسی ہے۔ چنانچہ صوفیائے اسلام کا عقیدہ بھی یہی ہے۔ اور خود فرمودۂ آقائے دو جہاں حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" کا منشا بھی یہی ہے۔ ارباب نظر خوب اندازہ فرما سکتے ہیں کہ حضرت شاعر مشرق علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کا فلسفہ خودی کس حد تک اس قدیم کشمیری تصور پرتی بھگیہ کا مرہون منت ہے۔ ہماری تہذیب کا یہ شاہکار ابھی تک سنسکرت کے حجاب میں مخفی ہے اور علمی دنیا اس سے اچھی طرح روشناس نہیں ہو پائی۔ گو ڈاکٹر کے سی پانڈے (لکھنؤ یونیورسٹی) اور ڈاکٹر لائیڈ کر (کیلیفورنیا یونیورسٹی) نے بالترتیب ابھی ناو گپت اور الیشور پرتی بھگیہ پر انگریزی زبان میں کتابیں لکھی ہیں تاہم مضمون ابھی تشنۂ توجہ ہے اور اس میدان میں مزید تحقیق کی بہت ضرورت ہے۔

سنسکرت شعر و ادب اور فلسفہ و روحانیت کی ترقی کے اس سنہری دور میں کشمیر نے فن تعمیر کے یادگار زمانہ شاہکار بھی پیدا کئے۔ چنانچہ بقول پروفیسر باشم (لنڈن یونیورسٹی) اس کی سب سے پرشکوہ مثال مارتنڈ کا شہرۂ آفاق مندر ہے۔ اس کے یونانی وضع کے ستون مرکزی صنم کدہ اور صحن کی تراش ہندوستان بھر میں اپنی مثال آپ ہیں۔ چونکہ بودھ مت دور میں کشمیر مدتوں گندھار کے علاقہ کے ساتھ منسلک رہا۔ اس لئے گندھار کی طرز مجسمہ سازی اور سنگتراشی بھی کشمیر میں ثبت (بقیہ صفحہ نمبر ۹۲)

ولی کاشمیری

غزل

(کشمیری)

کشمیری	اردو ترجمہ
ہیٗدٕٕن ییٚن انگ زخمن داغدارن	داغداروں کے زخم مندمل ہونے لگے۔
بہارن ترووٗ پرتو لالہ زارن	بہار نے لالہ زاروں پر اپنا پرتو ڈالا۔
اچھے پوشن زژوہیٖت ژانگ زالن	جونہی موتیوں کے ہار پر تمہارا پرتو پڑا
تیتھوی پیو چون پرتو موختہ ہارن	تو وہ اس طرح جگمگا اٹھے جیسے اچھ پوشوں (ایک پھول ہے) دیپ مالا کی ہو۔
کلے والن چھو بوٗرمت گلریٖزی مس	ساقی نے پیمانوں میں شراب بھر دی ہے۔
چھو چاوان دامہ دامے پرخمارن	اور وہ مستوں کو قطرہ قطرہ پلا رہا ہے۔
مے گُڈنم لولہ نارن تالہ کن ژہٹ	محبت کی آگ نے مجھے جلا کر بھسم کر دیا
بوزولس بالہ یارو انتظارن	اے میرے محبوب مجھے انتظار کے کرب نے جلا ڈالا۔
جگر گملتھ وزن چھوم خون چشمن	میرا جگر پگھل کر خون کی شکل میں آنکھوں سے ٹپک رہا ہے۔
تلن چھہوس ولیوٗر سوزک آبشارن	اور ان آبشاروں سے میں درد کی کسک کا حظ اٹھا رہا ہوں۔
مہ زخمن ہنز پھوٗلے فوجمژ دلس چھم	میرے دل میں زخموں کی پھلواری کھل اٹھی ہے۔
بو کیا مانہ نشاطن شالہ مارن	میرے لئے نشاط اور شالمار کے نظاروں میں کونسی کشش ہو سکتی ہے۔
اوارے چھہوس ولی آزردہ خاطر	میں آزردہ خاطر ولی آوارہ و سرگرداں ہوں
مے گنڈنم لولہ نارن رہبہ آمارن	مجھے محبت کی آگ جلائے جا رہی ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن

دوسرا پنجسالہ منصوبہ اور تعلیم

پس منظر

ریاست جموں وکشمیر کی ثقافتی ترقی کے منصوبہ کا ایک نہایت ہی اہم پہلو یہ ہے کہ ریاست کے عوام زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں۔ ریاست کے تمام شہریوں کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ گذشتہ دو سال کے درمیان تعلیم کا دائرہ جتنا وسیع ہوا ہے اس سے تعلیمی ترقی کے ارادوں کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔ تعلیم کو مفت اور عام کرنے کا اعلان جتنی مسرتیں نہیں لایا تھا۔ اتنی مسرت اور خوشی اعلان کے بعد عملی اقدام اور جہالت کو دور کرنے کی باضابطہ مہم کی وجہ سے آئی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اس ریاست میں صرف تین کالج تھے اب بارہ کالج ہیں۔ پرائمری اسکولوں کی تعداد ۸۴۷ء سے ۱۰۷۷ ہوگئی ہے۔ مڈل اسکول ۹۳ تھے اور اب ۲۱۹ ہیں اور ہائی سکولوں کی تعداد ۱۹ سے ایک سو اکیس ہوگئی ہے۔ ان کے علاوہ ریاست میں سات ٹیچرس ٹریننگ اسکول اور دو ٹریننگ کالج بھی ہیں۔ کچھ ہی عرصہ پہلے جب تعلیم مفت نہیں تھی لوگ تعلیم کے میدان سے دور تھے۔ فیس اتنی تھی کہ لوگ کان پر ہاتھ رکھتے تھے۔ اقتصادی اور معاشی الجھنوں میں تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کا بھی خیال نہیں تھا۔ زیادہ فیس ادا کرکے تعلیم حاصل کرنے کے ارادوں میں طاقت اور قوت نہیں تھی۔ ایم اے تک مفت تعلیم نے ریاست کے عوام کو بہت ساری الجھنوں اور پریشانیوں سے دور کردیا ہے۔ بہت سارے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے راستے صاف ہو گئے ہیں۔ ابھی ابھی وزیر تعلیم جناب غلام محمد صادق نے کہا ہے کہ آئندہ تین برسوں میں تعلیم پر دو کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مقاصد میں کتنی شاندار کامیابی حاصل کی جاسکے گی۔ ہندوستان کی تعلیمی ترقی کی تاریخ میں یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے اور اسے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا ہے۔ اس سے ریاست کے کم وبیش دو لاکھ طلباء اور طالبات کو فائدہ پہنچا ہے۔ جمہوریت جہاں قید بھی رہتی ہے۔ وہاں بھی اسے آزاد کیا جاتا ہے۔ اس کارنامہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جمہوریت نے آزاد فضا میں گہری سانس لی ہے۔ ثقافتی ترقی کے اس وسیع دائرہ میں ریاست جموں وکشمیر کے دور دراز اور پسماندہ علاقوں کو بھی جگہ ملی۔ بکروال اور گوجر جیسے خانہ بدوش لوگوں کی تعلیم کے لئے گشتی اسکول جاری کئے گئے۔ لداخ میں چالیس سے زیادہ تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ ایک لاکھ چھبیس ہزار چار سو چالیس روپے وظیفے کے لئے منظور کئے گئے جن سے ہزاروں طلباء اور طالبات کو فائدہ پہنچا۔ ان اقدام اور جہالت کو دور کرنے کی باضابطہ مہم نے عوام کے مستقبل کو اور روشن کردیا ہے۔

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے (غالب)

پیشِ منظر

اس پس منظر میں جو پیش منظر تیار ہوتا ہے اس سے ہماری بہت ساری تمنائیں وابستہ ہو جاتی ہیں۔ ریاست جموں وکشمیر کا پہلا منصوبہ جن حالات میں تیار کیا گیا تھا وہ حالات کچھ عجیب تھے۔ تاریخی قدروں کی کشمکش جاری تھی۔ اقتصادی اور سیاسی زندگی کی تاریکیاں آہستہ آہستہ دور ہو رہی تھیں۔ اس منصوبہ کے ابعاد کو اگر کمزور نہیں سمجھا گیا تو اس کو کوئی زیادہ اہمیت بھی نہیں دی گئی۔ اس کے رنگ و روپ

ںقش ونگار پر زیادہ دھیان نہیں دیا گیا۔ ان ساری باتوں کے
وجود پہلا منصوبہ جو کچھ کرسکا وہ حیرت انگیز ہے۔ حکومت کی سخت
ںنت اور عوام کے تعاون سے تعلیمی پالیسی نے کامیابی حاصل کی اور
ِ کچھ ہوسکا اس کی اپنی تاریخی اہمیت ہوگی۔

دوسرے پنجسالہ منصوبہ میں جو صحت مند تعلیمی پالیسی تیار کی گئی ہے
ں میں متعدد تعلیمی مسائل درپیش ہیں۔ حکومت اور ریاست کے تمام
گوں کی مشترکہ کوششوں سے یہ مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ ریاست کا
وسرا پنجسالہ منصوبہ کم و بیش اسی انداز کا ہے جس انداز پر ہندوستان کا دوسرا
منصوبہ تیار ہوا ہے۔ حالات کے مطابق دونوں منصوبوں میں بہت ساری
توں کا فرق ہے لیکن بنیادی اصول ایک ہیں۔ تعلیمی پالیسی یہاں کے
قتصادی اور سماجی حالات کے مطابق ہے۔ آئندہ دس برسوں میں سات
سال سے بارہ سال کے بچوں کی تعداد ۵ لاکھ ہو جائے گی۔ اس وقت اس
مر کے بچوں کی تعداد اسکولوں میں ۱،۵ لاکھ ہے۔ ان کے لئے ایک ہزار
پچسو اسکول موجود ہیں۔ حالانکہ آئندہ دس برسوں کے بچوں کے لئے
چھ ہزار سکولوں کی ضرورت ہے۔ تعلیمی ساخت کی بنیاد کو مضبوط کرنا ضروری
ہے۔ اس کے لئے حکومت کو بہت کچھ کرنا ہے، مختلف قسم کی سہولتیں اس
مقصد میں کامیابی دے سکیں گی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ دس برسوں میں بچوں
کی تعداد جتنی بڑھے گی ان کے مطابق اسکول قائم کئے جائیں۔ ظاہر ہے سارے
بچے اسکول میں داخل نہیں ہونگے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے پنجسالہ منصوبہ میں ایک
ہزار پانچ سو پرائمری اسکول قائم کئے جائیں گے۔ ان سے مقصد میں بہت حد
تک کامیابی حاصل ہوسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں ریاست کے لوگوں کی بھی یہ
کوشش ہونی چاہیئے۔ کہ اسکول جانے کی عمر رکھنے والے بچوں میں ابتدائی
تعلیم عام ہو، یہ ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے۔

دوسرے پنجسالہ پلان میں ایک نہایت ہی اہم بات یہ ہے کہ اس
میں ریاست کے جوانوں کے لئے ٹیکنیکل اسکول قائم کئے جائیں گے۔ ان
اسکولوں میں ریاست کی نئی نسل کو تعلیم کا ایک اور اہم مقصد بتایا جائیگا۔
یہاں کی ہدایتوں سے نوجوان طبقہ کو اس کا احساس اور زیادہ بڑھ جائیگا۔
ریاست کو ان کی سخت ضرورت ہے۔ ریاست کی ترقی کس طرح ہوسکتی
ہے؟ یہاں کے تاریک گوشوں میں روشنی کیسے آسکتی ہے؟ زندگی کے نئے
اصولوں کو کس طرح حاصل کیا جاسکے گا؟ ان ہدایتوں کے ساتھ ساتھ
ریاست کے ہونہار اور ذہین نوجوانوں کو مختلف کام بھی دئے جائیں
گے تاکہ وہ معاشی الجھنوں میں گرفتار نہ رہیں۔ اور ایک سچے مجاہد کی
طرح ریاست کی خدمت کرتے رہیں۔

جموں و کشمیر یونیورسٹی اس وقت محض ایک امتحان لینے اور مختلف
تعلیمی حالات پر نظر رکھنے والا ادارہ ہے۔ یہ یونیورسٹی ابتدائی حالتوں
میں ہے۔ انتہا یہ ہے کہ کالجوں میں ایم۔اے کی تعلیم ہے اور یونیورسٹی اب
تک ایم۔اے کی تعلیم براہ راست اپنے دائرہ میں لینے سے مجبور ہے! دوسرے
پنج سالہ منصوبہ میں اس یونیورسٹی کو ایک مکمل تدریسی اور اقامتی یونیورسٹی
بنا دیا جائے گا۔ یونیورسٹی کے لئے ایک بڑی عمارت تعمیر کی جائے گی۔ اور
کومرس، انجینیرنگ اور میڈیکل کے شعبوں کو یونیورسٹی سے وابستہ کیا جائے
گا۔ اب یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ریاست کی یہ یونیورسٹی تعلیمی، ثقافتی اور
اقتصادی ترقی میں اضافہ کرتی رہے گی۔

اندھوں کے لئے ایک سکول اور ایک سکول گونگوں اور بہروں کے
لئے کھولا جائے گا۔ ان اسکولوں میں طلبا اور طالبات کے رہنے
کا بھی انتظام ہوگا۔ وہ اس وقت تک رہ سکتے ہیں۔ جب تک کہ وہ کسی
کام کے لائق نہ ہو جائیں دوسرے پنجسالہ پلان میں ان لوگوں کے لئے بھی
سکول قائم کئے جائیں گے جن کا ذہن ایک خاص منزل پر آکر رک گیا
ہے، عمر کے ساتھ ذہن کا ارتقاء نہیں ہوسکا ہے۔ ذہنی توازن کو برقرار
رکھنے کے لئے اس سکول سے قوم کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

موجودہ ہائی سکولوں میں تعلیم دینے کے جو طریقے ہیں اور جو نصاب ہیں
ان میں بھی اچھی خاصی تبدیلی ہوگی۔ یونین سکنڈری تعلیمی کمیشن کی سفارشوں
پر آئندہ سائنس، ٹیکنیکل آرٹ، کامرس، زراعت اور گھریلو سائنس
کو بھی شامل کیا جائے گا۔ پرائمری سکولوں کے ساتھ جو تعلیم بڑھے گی اس
کے لئے کئی اور سکنڈری اسکولوں کی ضرورت ہوگی۔ دوسرے پنجسالہ منصوبہ
میں پچاس نئے سکول قائم کئے جائیں گے۔ تعلیمی کمیشن کی سفارشوں پر یہ
کام ابھی ممکن نہیں ہے کہ تمام ہائی سکولوں کو سکنڈری سکولوں میں تبدیل
کر دیا جائے۔ دوسرے منصوبہ میں صرف تیس ہائی سکول سکنڈری سکولوں
میں تبدیل کئے جائیں گے، اور ہر سکول کے نصاب میں حساب، بوٹانی

(بقیہ صفحہ نمبر ۴۴

کمال لداخی
ماسٹر ناچی

لدّاخی ناچ

ناچ کا لداخ کی سماجی اور تمدنی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ لداخی ہوکر ناچ نہ جاننا ایک انہونی سی بات ہے۔ ناچ کی ہمہ گیری کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ بڑوں کی دیکھا دیکھی یہاں کے ننھے مُنے بچے بھی کم سِنی میں ہی ناچ کی مشقوں میں مگن نظر آتے ہیں اور اگر آپ کسی بھی موقع پر کسی بھی لداخی بچے کو ناچ پیش کرنے کی فرمائش کریں تو وہ آپ کی توقعات کا خاطر خواہ طور پر جواب دے گا۔ یہاں ناچ سیکھنے میں مرد اور عورت کا کوئی لحاظ نہیں ہے اور نہ ہی اعلیٰ اور ادنےٰ طبقے کی کوئی تمیز ہے۔

ناچ یہاں کی سماجی زندگی کا ایک لازمی جزُو بن کر رہ گیا ہے۔ کوئی بھی تقریب یا محفل اُس وقت تک مکمل نہیں کہلا سکتی۔ جب تک کہ اُس میں ناچ کا اہتمام نہ ہو۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر تو خیر ناچ ایک لازم و ملزوم چیز ہے۔ لیکن اس ناچ کی نوعیت مختلف ممالک کے ناچ سے ذرا جُداگانہ ہے۔ کشمیر میں بھی شادی بیاہ کے موقعوں پر رقص و سرود کی محفلیں گرم رہتی ہیں۔ لیکن وہاں وہ فن کار رونقِ بزم ہوتے ہیں۔ جنہوں نے اس پیشے میں مہارت حاصل کی ہو، اس کے برعکس لداخ میں دولھا، دولہن خود ہی سروں پر مُبارک بادی کے مخصوص سفید رومال باندھ کر ناچتے ہیں اور اُن کے ساتھ ہی اُن کے عزیز و اقارب، کیا مرد اور کیا عورتیں، شریک ہوجاتے ہیں — اس موقعہ پر خاص قسم کا زرد ریشمی لباس زیبِ تن کیا جاتا ہے اور سر پہ کالی مخمل کی لمبی سی ٹوپی پہنی جاتی ہے۔

شادی بیاہ کے علاوہ بھی اور دوسری تقریبوں پر ناچ اور گانے کی مجلسیں گرم ہوا کرتی ہیں۔ جب کسی گھر میں بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کے ایک ہفتے کے بعد ایک خاص تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس تقریب میں بچے کے عزیز و اقارب کے علاوہ آس پاس کے پڑوسی اور دیگر احباب بھی اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ بزمِ رقص و سرود کے ساتھ ساتھ لداخی شراب (چھنگ) کے دَور بھی چلتے رہتے ہیں۔ اور وقفے وقفے کے بعد لداخی چائے (گُر گُر چائے) کی سوندھی سوندھی خوشبو محفل کو گرماتی رہتی ہے۔ چھنگ پی کر جب کسی کو سرور آجاتا ہے تو وہ بھی مستی کے عالم میں ناچنے لگتا ہے اور ساتھ ہی شرابی کا مخصوص ترانہ بھی دِل کش لَے میں گاتا جاتا ہے۔

یہاں یہ بات دِلچسپی اور ایک گونہ تعجب کا باعث ہے کہ ایک طرف تو لداخ کے سماج میں ناچ ایک لازمی عنصر قرار پایا ہے۔ مگر دوسری طرف اُن لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جنہوں نے ناچ اور موسیقی کے فن میں پیشہ ورانہ مہارت حاصل کی ہو۔ اس طبقے کو یہاں ایک حقیر سے نام "بیدا" سے موسوم کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ رشتہ یا اسی قسم کے دیگر تعلقات کو باعثِ ننگ خیال کیا جاتا ہے مگر ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ان پیشہ ور رقاصوں اور سازندوں کے بغیر یہاں کی کسی محفل میں جان نہیں آسکتی اور ان کے ڈھول کی تھاپ اور شہنائی کی لَے پر اعلیٰ طبقے کے مرد اور عورتیں ٹھمک ٹھمک کر ناچتی ہیں۔ ناچ کا آغاز ناچنے والوں کا گروہ سلامی سے کرتا ہے۔ نغمے کی تانوں کی ترتیب میں ان لوگوں کا جسم بھی حرکات و سکنات بدلتا رہتا ہے۔ ناچنے والوں کے انگ انگ کی حرکتیں بالکل مُشابہ ہوتی ہیں اور قدموں کے زیر و بم کا لحاظ بھی تان پر ہی رکھا جاتا ہے۔ ناچ دھیمی دھیمی لَے میں دھیرے دھیرے شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ ساز کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ نشیب و فراز کے مختلف مرحلوں سے گذرتا ہے۔ نقاروں اور شہنائیوں کی مدھر اور سُریلی تانوں پر ناچنے والوں کی حرکات کا رُخ بھی بدلتا جاتا ہے۔ ناچ جب نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے

تو اُس میں ایک خاص جان آجاتی ہے۔ تماشائی بھی وجد میں آکر رقاصوں کی حرکات کی ترتیب میں تالیاں بجاتے ہیں اور رقاص مستی کے عالم میں سازکی لہروں پر ایسی تیزی سے متحرک کر بنتیرے بدلتے رہتے ہیں کہ تماشائی کسی اور ہی عالمِ کیف و مستی میں پرواز کرنے لگتے ہیں۔ ناچ کا اختتام اچانک ہوتا ہے اور ناچنے والے اپنے سروں کی جنبش سے وداعی سلام کرکے ناچ کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔

یہ لداخ کا اپنا اور قدیمی لوک ناچ ہے جو بیرونی اثرات سے بہت حد تک پاک ہے اور پُشت ہا پُشت سے اسی صورت میں چلا آتا ہے۔

مذہبی ناچ

یہ ناچ یہاں کے مذہبی رہنما (لامے) ہی ناچ سکتے ہیں۔ مندر (گُنپے) میں ہر سال ایک ایسی تقریب کا انتظام کیا جاتا ہے جس میں لامے دو یا تین دِنوں کے لئے اپنے ناچ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ زرق برق ..... بیل بوٹے دار لباس، سروں پہ ڈراؤنی صورتوں (Masks) کے پہناوے اور ہاتھ میں فتح کا خنجر یا تلوار۔ اس ناچ کے لوازمات ہیں۔ (Masks) مختلف صورتوں اور شکلوں کی ہوتی ہیں۔ کسی کی صورت بارہ سنگھے سے مِلتی جُلتی ہے اور کسی کی گائے سے۔ کسی شکل کے جبڑے کُھلے ہوئے اور دانت باہر نکلے ہوئے ہوتے ہیں اور کسی کی گول گول ڈراؤنی آنکھیں ایک لمحے کے لئے تماشائی کو متوحش کر دیتی ہیں۔ ناچ کے دائرے کے سرے پر بڑے لاما کی نشست ہوتی ہے۔ اس کے سامنے موسیقی کے بہت سے ساز لے کر باقی لامے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ ساز مختلف قسموں کے ہوتے ہیں جن کی مختصر سی جھلک یہ ہے :-

ڈُنگ ڈُنگ

ایک قسم کا گول ڈھول جو اپنے دستے پر کھڑا ہوتا ہے۔ لاما ایک ہاتھ میں ڈُنگ ڈُنگ کو تھامے رکھتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی پکڑے رکھتا ہے جس کا سر درانتی کی شکل سے مِلتا جُلتا ہے اور اس کی نوک پر ایک چھوٹا سا کپڑا منڈھا ہُوا ہوتا ہے۔ اسی سے ڈُنگ ڈُنگ بجایا جاتا ہے۔

چھم چھم

یہ دو تھالیوں کی شکل کا ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ میں ایک اور دوسرے ہاتھ میں دوسری تھالی پکڑی جاتی ہے۔ ان دو تھالیوں کی ٹکر سے چھم چھم کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ اسی قسم کا ایک ساز کشمیر میں بھی رائج ہے جسے تھالُہور کہتے ہیں۔

نمواٸے

یہ شہنائی کی ایک قسم ہے جس کی لمبائی دو گز سے زیادہ ہی ہوتی ہے۔ جب دو لامے اس کو بجاتے ہیں تو ایک چھوٹا لامہ اس کے دونوں سروں کو اپنے ہاتھوں میں آگے کی طرف پکڑے رہتا ہے۔ اس کی آواز دُور دُور تک پہنچتی ہے اور اسے چلتے چلتے بھی بجایا جا سکتا ہے۔

گیاپنگ

یہ شہنائی کی چھوٹی قسم ہے۔ اس کی آواز بہت ہی رسیلی اور سُریلی ہوا کرتی ہے

سکالگ ینگ

یہ ساز بِگل سے مِلتا جُلتا ہے اور اس کی آواز بھی اُسی قسم کی ہوتی ہے۔ اس کا استعمال خاص خاص موقعوں پر ہی کیا جاتا ہے۔

ان سازوں کے علاوہ شنکھ، جرس اور اسی قسم کے دوسرے متعدد سازوں کا استعمال بھی عام ہے۔ ان تمام سازوں کی مِلی جُلی گونج فضا کو نغمہ اور ترنم کی دِلکش شیرینیوں سے مالامال کرکے رقص کے جادُو کو اور بھی زیادہ سحرکار بنا دیتی ہے۔

عوام کی طرح لامے بھی ناچ میں ابتدا سے ہی مہارت حاصل کرتے ہیں اور اس کے لئے اُن کے خاص آتالیق مقرر ہیں۔ یہ ناچ بودھوں کے اپنے مذہبی جشن پر ہوا کرتا ہے۔ اس ناچ کی مختلف نوعیتیں ہیں اور ہر نوعیت کا کوئی نہ کوئی تاریخی اور سماجی پس منظر ہوا کرتا ہے۔

(Masks) یا ڈراؤنی صورتوں کے پہناوے کے رواج سے متعلق ایک مذہبی روایت مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں تبت میں ایک مقدّس لاما رہا کرتا تھا۔ اُسے ایک خاص وقت یہ خبر مِلی کہ کسی گھر میں بچّہ پیدا ہوگیا ہے۔ یہ سُنتے ہی وہ چونک پڑا اور بول اُٹھا کہ اس وقت جو بچّہ جنم لے گا۔ وہ بچّہ نہیں بلکہ جن ہوگا۔ اس لئے اُس بچّے کو فوراً مار ڈالنا چاہیئے۔ (بقیہ صفحہ ۶۲ پر)

حدیثِ دیگراں

علی گڑھ۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۵۶ء

مکرمی تسلیم

آپ کے دو خط ملے۔ امید ہے کہ "تعمیر" آپ کی اور دوسرے ادو دوستوں کی کوشش سے برابر ترقی کرے گا۔ میں ادھر بہت مصروف رہا۔ اب ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لئے دہلی جا رہا ہوں۔ "تعمیر" کے لئے جلد کچھ بھیجوں گا۔ "ہماری زبان" ملتا ہے کہ؟

مخلص:-
آل احمد سرور

بسم اللہ محل میرس روڈ علی گڑھ

۲۰ دسمبر ۱۹۵۶ء

برادرم! دسمبر کا "تعمیر" ملا۔ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ طباعت، ترتیب اور مضامین ہر اعتبار سے یہ پچھلے پرچے کی نسبت بہتر ہے۔ جبہ خاتون اور عبدالاحد آزاد پر مضامین مفید معلومات کے حامل ہیں۔ اکبر لداخی نے "لداخ کا لوک ادب" بہت عمدہ مضمون لکھا ہے۔ یہ مضمون اس شمارے کی جان ہے۔

"جنتِ ارضی" کے عنوان سے وحید اختر کی نظم اچھی ہے۔ کاش اس نظم کا لہجہ قصیدہ نما ہونے کے بجائے قربت اور مانوسیت کا ہوتا۔ ہمارے شاعروں میں فطرت پر نظمیں لکھتے وقت نہ معلوم وہ محویت اور ہم آہنگی کیوں نہیں ملتی جو ورڈس ورتھ یا ٹیگور کی شاعری میں ملتی ہے۔ فراق نے اپنی دو نظموں "آدھی رات کو" اور "دھندلکا" میں یہ لہجہ اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اس روایت کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ وحید اختر پر یہ تنقید نہیں بلکہ ایک دوستانہ مشورہ ہے اور مجھے امید ہے آئندہ وہ اپنی نظموں میں اس امر کی طرف توجہ کریں گے۔ کیونکہ ان میں نظم لکھنے کی صلاحیت ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

جامعہ نگر نئی دہلی۔ ۲۹ دسمبر ۵۶ء

شمیم صاحب۔ تسلیم

جی نہیں میں آپکو بھولی نہیں۔ خوشی ہوئی کہ آپ "تعمیر" کے مدیر مقرر

ہوئے ہیں۔ آپ کی فرمائش ضرور پوری کروں گی۔ کہانی تو جب کبھی لکھی جائے گی ارسال کروں گی۔ لیکن کشمیر پر ایک مضمون موجود ہے۔ ذرا ڈھونڈنے کے قابل ہو جاؤں تو بھیجوں۔

کشمیر کا موسم تو آج کل خوب ہوگا! عابد صاحب اچھے ہیں۔ دعا کہتے ہیں۔

خاکسار:-
صالحہ عابد حسین

---

۶۸۷ معظم پورہ۔ حیدرآباد دکن

۱۵ دسمبر ۱۹۵۶ء

پیارے شمیم، محبت نامہ ملا۔ "تعمیر" نہیں ملا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم پچھلے شماروں کا سیٹ مرے نام بھیجدو۔ تم نے سلیمان اریب کو خط نہیں لکھا۔ "صبا" کے پتے پر لکھو ان کی غزل بطور خاص کہکر آئندہ شمارہ کیلئے بھجوا دوں گا۔

زینت ساجدہ کو "ویمین کالج شعبہ اردو حیدرآباد دکن" کے پتے پر لکھ سکتے ہو مگر کچھ نہ ہوگا۔ یہ مدتوں سے خاموش ہیں۔ یہی حال مخدوم کا بھی ہے مگر مخدوم دیر آشنا سہی فراموش کار نہیں۔

— کی نظم تمہیں پسند نہیں آئی۔ مگر یہ کیا ضروری ہے کہ چھپنے والی ہر چیز مدیر کو پسند بھی آئے۔ پسندیدگی کا معاملہ قطعی دوسرا ہے اور چھپنے چھپانے کی بات بالکل علیحدہ، میں بھی دو ایک پرچوں سے وابستہ رہا ہوں۔ مجھے بہت ساری ناپسندیدہ چیزیں بھی شائع کرنا پڑیں، ادیب جانیں اور ان کے قارئین — ہمیں اچھی چیزیں بہرحال تلاش کرنی چاہئیں۔ مجبوری کی صورت میں ایسا مواد پیش کرنے میں کوئی ہرج نہیں جس پر سخت حرف گیری نہ ہو سکے۔ یہ میرا اپنا ذاتی نقطہ نگاہ ہے تمہیں اختلاف کا پورا پورا حق ہے۔ تمہارے ارشاد کے مطابق نظم بھیج رہا ہوں۔ کبھی کبھی یاد کر لیا کرو۔

تمہارا:- شاد

۲، ریزیڈنسی کوارٹرز سرینگر ۲۴ دسمبر ۵۶ء

پیارے شمیم۔ "تعمیر" جس رفتار سے ترقی کر رہا ہے، اس سے میں بہت خوش ہوں۔ وہ دن دور نہیں جب اہل ذوق بیچینی سے اس کے ہر شمارہ کا انتظار کیا

کریں گے۔ کتابت کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

کمال احمد صدیقی

26، جونیئر ہوسٹل
میڈیکل کالج، گوالیار

پیارے شمیم!

تمہاری ادارت میں شائع شدہ دونوں شمارے ملے۔ دسمبر کا شمارہ ترتیب اور مواد دونوں کے لحاظ سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ یہاں میڈیکل کالج میں جہاں طالب علموں کو ادب سے کم ہی دلچسپی ہوتی ہے "تعمیر" کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

آزاد پر یوسف کا مضمون بہت سنجیدہ اور فکر انگیز ہے لیکن فاضل مضمون نگار نے استدلال سے زیادہ زبان کے رکھ رکھاؤ کا اہتمام کیا ہے۔ نادم کی تصویر چھاپ کر آپ نے "تعمیر" کا مزاج ہی بدل دیا ہے۔ نادم حال ہی کا نہیں، مستقبل کا بھی شاعر ہے۔ میں اس کی پر جلال شخصیت سے متاثر ہی نہیں، مرعوب بھی ہوں۔

مظفر عازم کی غزل اس کے شاندار مستقبل کی طرف ایک حسین سا اشارہ ہے۔ جنوری کے پرچے کا انتظار رہے گا۔

تمہارا:-
محی الدین

امر سنگھ کالج
سرینگر۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۵۶ء

مدیر محترم!

"تعمیر" ملا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ "تعمیر" اگر اسی رفتار سے ترقی کرتا رہا۔ تو بہت جلد اس کا شمار ہندوستان کے بہترین ادبی رسائل میں ہوگا۔ دسمبر کا شمارہ اپنی ظاہری و باطنی خوبیوں کے لحاظ سے تعریف سے مستغنی ہے۔ اثر صہبائی پر ایک تنقیدی مقالہ بھیج رہا ہوں۔ اسے جنوری کے شمارے میں شائع کیجیے۔

آپ کا مخلص:- پروفیسر اکبر حیدری

راج تلک روڈ
جموں۔ یکم دسمبر ۱۹۵۶ء

شمیم بھائی۔ آداب!

آپ کے "خلوص" سے میں کافی متاثر ہوا۔ ہم لوگ خلوص کے بھوکے ہوتے ہیں، جہاں بھی خلوص نظر آیا، بچھ گئے۔

میں "تعمیر" کے لئے ضرور لکھوں گا۔ اور بہت جلد، وعدہ رہا۔

جموں میں شاعر اچھے موجود ہیں۔ مثلاً منوہر لال دل، رسیکش کاشمیری شوق، زیڈ سیمی اور عرش صہبائی ـــ دوسرے لوگ بھی ہیں جو صرف ڈوگری میں لکھتے ہیں۔ دینو بھائی پنت، دیپ، وغیرہ ـــ

یوں بھی آپ تشریف لا رہے ہیں تو بہت ساری باتیں اکٹھے بیٹھ کر ہی ہوں گی ـــ "تعمیر" کا منتظر

کار لالکھر ۹ مخلص
مومن یاور

سریکلچر ڈیپارٹمنٹ
سرینگر

مدیر محترم۔ السلام علیکم

دسمبر کا "تعمیر" پڑھا۔ ترتیب قابل داد ہے۔ ٹائٹل حسین اور دیدہ زیب ہے۔ "مدھومت۔ کشمیر میں"۔ اور "مومن" اچھے مضامین ہیں۔ "آزاد ـ فکر و فن" بھی سلیقہ سے لکھا گیا ہے۔ "حبہ خاتون" کی شاعری کا سماجی پس منظر میں"۔ ظن و تخمین زیادہ اور تحقیق و تدقیق کم ہے۔ اس موضوع پر اور زیادہ غور سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ کہانی "حسینہ" کی زبان میں بعض جگہ غیر ضروری تصنع ہے جو کھٹکتا ہے۔

دوسرے پرچہ کے لئے اپنا مضمون "گلریز اور گل بکاولی" تقابلی مطالعہ" بھیج رہا ہوں۔ والسلام

آپ کا:-
مظفر عازم

"تعمیر" کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے اپنی قیمتی آراء سے نوازیئے!

بزمِ خواتین

حسنِ ترتیب

اپنے گھر کی چیزوں کو ترتیب سے آراستہ کرنا حسنِ ترتیب ہے جن بہنوں میں جمالیاتی ذوق زیادہ ہے وہ اپنے گھروں میں زیادہ سے زیادہ حسن پیدا کر لیتی ہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ گھر میں سجاوٹ کا سارا سامان موجود ہو تو پھر کوئی گھر سنور سکتا ہے۔ گھر میں جتنی بھی چیزیں ہوں ان کی ایک خاص ترتیب ہو سکتی ہے۔ اس زندگی میں ہر گھر کا تقاضا یہ ہے کہ وہاں حسنِ ترتیب ہو۔ بعض بہنوں میں جمالیاتی ذوق کی کمی ہوتی ہے تو وہ اچھے گھروں کو بھی تباہ کر دیتی ہیں۔ اپنے کمروں میں چیزوں کو جس طرح چاہتی ہیں رکھ دیتی ہیں۔ ریڈیو کے اوپر بچے کا دودھ رکھتی ہیں۔ ڈرائنگ روم میں اگر بخاری لگی ہوئی ہے تو اس کی پروا کئے بغیر کہ ڈرائنگ روم کی اپنی حیثیت اور اپنا حسن بھی ہے۔ بخاری کی لکڑیوں سے اس طور پر فائدہ اٹھاتی ہیں کہ ان سے کھانا تیار کرنے لگتی ہیں۔ اس طرح ڈرائنگ روم باورچی خانہ کا کام بھی دیتا ہے اور حسنِ ترتیب کے تصور کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔

بہنوں کی نگاہیں کمروں کے ہر گوشہ پر ہوں تاکہ جو چیز جہاں ضروری ہو وہاں رکھی جائے۔ جن بہنوں کو اس کی عادت نہیں ہے یا جن سے چیزوں کی ترتیب میں بار بار غلطی ہوتی ہو تو وہ اپنی غلطی کا جائزہ ہمیشہ لیتی رہیں۔ چند بار کی مشق سے بدصورت کمرے خوبصورت بن سکتے ہیں۔ بہنوں کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کے گھر میں [illegible] گی اور دنیا کی ایک نئی نسل پرورش پاتی ہے۔ گھر کے حالات بدانتظامی، غیر جمالیاتی حس اور بدحواسی کا اثر بچوں پر پڑتا ہے۔ ہم اپنی کمزوریوں سے ایک پوری نسل کو تباہ کرتی ہیں۔ حسنِ ترتیب سے وقت کی بہت بچت ہوتی ہے۔ ہر چیز نگاہوں کے سامنے ہوتی ہے۔ وقت پر بعض چیزیں نہیں ملتی ہیں اور ان سے گھر میں ہنگامے بھی ہوتے ہیں۔ جھگڑے بڑھ جاتے ہیں اور نہ جانے بہنوں پر کتنی قیامتیں ٹوٹتی ہیں۔ اگر میری بہنیں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں ان کا قصور زیادہ ہے۔ وہ گھر کی ترتیب کی زیادہ ذمہ دار ہیں۔ گھر میں خوشی اور مسرت کی آرزوئیں سبھوں کو ہوتی ہیں لیکن اس بات پر بہت کم دھیان دیا جاتا ہے کہ گھر کی مسرت کا تعلق حسنِ ترتیب سے گہرا ہے۔ حسنِ ترتیب سے حال میں حسن پیدا ہوتا ہے اور مستقبل سنور جاتا ہے۔

ہم زندگی کی حقیقی مسرت کا سراغ آسانی سے پا سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اپنے روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے معمولات میں ترتیب اور توازن کا حسن انگیز عنصر داخل کر لیں۔ یہ متوازن اور مرتب معمولات ایک ایسی فضا کو تشکیل دیں گے جس میں ہماری بہترین صلاحیتیں بارآور ہو کر ہمیں مسرت کے لازوال خزانوں سے دامن بھر دیں گی۔ ہماری زندگی کی بہت سی مصیبتوں اور ناخوشگوار واقعات کا تعلق ہماری معمولی قسم کی روزمرہ بے اعتدالیوں سے ہوتا ہے اور اگر ہم ان بے اعتدالیوں کو قابو کر سکیں تو ہمارے بہت سے

رگ وید میں عورت

رگ وید ہندوستان کی وہ قدیم ترین دستاویز ہے جس سے قدیم ہندوستان کی تاریخ سامنے آتی ہے۔ دیش کے اُس سماج میں عورتوں کی جو حیثیت تھی اس کے متعلق بہت کم باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ رگ وید کی دُعاؤں اور منتروں میں لڑکوں کی پیدائش کی آرزوئیں اور تمنائیں ہیں لیکن لڑکیوں کی پیدائش کے لئے تمنائیں نہیں ہیں! اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں نکلتا کہ اس سماج میں عورتوں کا مقام بلند نہیں تھا۔ یہ قطعی دوسری بات ہے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں میدانِ عمل میں نہ تھیں اور مرد اور عورت کا درجہ سماج میں یکساں نہیں تھا۔ "رگ وید" کے مطالعہ سے اس کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ہندوستان کے اس قدیم سماج میں عورتوں کی قدر و منزلت بہت تھی۔ عورتیں بہت سارے اہم مسئلوں پر مردوں کو مشورے دیتی تھیں۔ بہت سارے اہم کاموں کی تخلیق میں مردوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ رگ وید میں کئی جگہ یہ کہا گیا ہے کہ مرد اور عورت دونوں کا دماغ ایک ہونا چاہیئے۔ اس کے بغیر سوسائٹی کے رنگ و رُوپ میں حسن پیدا نہیں ہو سکتا۔

رگ وید میں گھریلو زندگی کی بہت ساری تصویریں ملتی ہیں۔ ان تصویروں میں عورتوں کے کردار، ان کی نفسیات اور فطرت کا رنگ و رُوپ موجود ہے۔ گھریلو زندگی کی پُر امن فضا عورتوں کی وجہ سے قائم رہتی ہے۔ "مقدس گھاس" کو توڑنے میں مردوں نے عورتوں کا سہارا ہمیشہ لیا ہے۔

ہندوستان کی قدیم سوسائٹی میں عورت کی عُمر کی ہر منزل کو جن نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اس کی عمدہ مثال رگ وید میں موجود ہے۔ "کنیا" کا لفظ رگ وید ہی سے حاصل کیا گیا ہے۔

"سمانا" ایک تہوار کا نام ہے۔ سمانا کی رات بہت پیاری ہوتی تھی ہر طبقہ کے لوگ مل جُل کر یہ تہوار مناتے تھے۔ رگ وید میں اس تہوار کا نہایت ہی دلچسپ بیان ملتا ہے۔ اس بیان سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس تہوار کا تعلق مذہبی جذبہ سے نہیں تھا۔ خالص تخلیقی جذبہ کام کرتا تھا۔ اس تہوار کے روز ہر فرد مختلف آرٹ کو اپنے خاص رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے ملنے کا یہ اہم موقع ہوتا تھا۔ عورتیں اور لڑکیاں اس تہوار کی زندگی ہوتی تھیں ان کے گیت، ان کے رقص، ان کی ہدایتیں تہوار میں جان ڈال دیتی تھیں۔

رگ وید میں دُلہن کے لباس کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ نئی دُلہن سے بار بار یہ کہا گیا ہے کہ وہ شوہر کی طرف کبھی غصہ میں نہ دیکھے۔ بیوہ عورت کو شوہر کے بھائی سے شادی کرنے کی اجازت تھی۔ شوہر کے مرنے کے بعد بیوی کو جل کر مرنے سے روکنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ رگ وید کے سماج میں عورت کی زندگی کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

مرزا غالب ایک پریس کانفرنس میں!

ایک صحافی۔ مرزا صاحب! آپ آئے بھی اور جا بھی رہے ہیں لیکن اتنی خاموشی کے ساتھ جیسے آپ کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ ہم آپ کی خاموشی کی وجہ دریافت کرسکتے ہیں؟

مرزا غالب۔ عزیزم! یہ دُنیا ایک بار اور دیکھ لی۔ کیا رہ گیا ہے میرے پاس جو کہوں۔

فرصتِ کاروبار شوق کسے؟
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں؟

دوسرا صحافی۔ آج کل تیسری جنگ کا چرچا ہر جگہ ہو رہا ہے۔ آپ نے خود بھی اس کا اندازہ کیا ہوگا۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ تیسری جنگ ہوگی؟

مرزا غالب۔ تیسری جنگ؟ میں نے فردوس میں پہلی اور دوسری جنگ کے متعلق کچھ سُنا تھا، برادرم! جنگ کی باتیں کرنے والوں کو کیا کہو گے!

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

میں تو انسان کی عظمت پر ہمیشہ فخر کرتا رہتا ہوں۔ فطرت نے جب بھی انسان کو ذلیل سمجھا میں نے فطرت کو آواز دی۔ شاید تمہیں میرا وہ شعر یاد ہو

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

لیکن اب تو انسان فطرت کو ذلیل کر رہا ہے۔ سچ کہتا ہوں اب یہی کہنا پڑتا ہے:۔

گُل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

تیسرا صحافی۔ آج کل جو مشاعرے ہوتے ہیں ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

مرزا غالب۔ کچھ نہ پُوچھو۔ دو ایک مشاعروں میں لوگ مُجھے لے گئے مجھے کیا معلوم تھا کہ اب کوئی شمع نہیں جلتی ہے۔ لوگ "اندھیرے" میں ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ کبھی میں مشاعروں میں شریک ہوتا تھا تو خوشی سے ہاتھ پاؤں پھُول جاتے تھے۔ لیکن ان مشاعروں میں شریک ہو کر اس کا اندازہ ہوا کہ میں نے دوبار حماقت کی ہے۔ بچوں کا تماشا معلوم ہوتا ہے۔ یہ شعر و شاعری کی محفل فتنہ ہے فتنہ۔ آپ صحافی ہیں آپ لوگوں سے کہیئے کہ اس سے شاعری کی نازک محفل لُٹ رہی ہے

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے اسکا دشمن آسماں کیوں ہو

چوتھا صحافی۔ آپ اس با۔ دُنیا میں کن باتوں پر زیادہ غور کرتے رہے؟

مرزا غالب۔ تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کے عادی تھے، اب بھی یہی حال ہے

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

پانچواں صحافی۔ فردوس سے پھر کب آنے کا ارادہ ہے آپ کا؟

مرزا غالب۔ مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

لیکن برادرم تمہاری مہربانی پر مجھے اُس وقت اعتبار آئے گا جب دُنیا کے نظام کے سارے موجودہ ہنگامے دُور ہو جائیں گے۔

چھٹا صحافی۔ ایک اور اہم سوال پُوچھنا چاہتا ہوں۔

مرزا غالب۔ ع غالب مُنہ بند ہو گیا ہے گویا

پھر آئیں گے تو باتیں ہوں گی۔ دوسری پریس کانفرنس کا مجھے بھی انتظار رہے گا۔

مضمون نگار حضرات سے التماس ہے کہ اپنی نگارشات صاف اور خوش خط لکھ کر ارسال کریں!

تعمیر

"سفید بالوں والی لڑکی" چین کی ایک سچی داستان ہے

بہت کم بہنوں کو اس کا علم ہوگا کہ چینی فن و ادب کا مشہور آپیرا "سفید بالوں والی لڑکی" کی کہانی حقیقی اور سچی ہے۔ اس کا تعلق فینٹیسی سے نہیں ہے۔ اس کہانی کا اپنا سماجی اور سیاسی پس منظر ہے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں چین کے ایک گاؤں میں ایک ہنگامہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس گاؤں میں سفید بالوں والی کوئی دیوی آئی ہوئی ہے۔ وہاں کے لوگ اوہام پرستی میں مُبتلا تھے۔ اس دیوی کی آمد کی خبر سے ہر طرف بے چینی پھیل گئی۔ لوگ گھبرا گئے پتہ نہیں دیوی نقصان پہنچائے گی یا لوگوں کو اس سے آرام اور سکون ملے گا۔ جن لوگوں نے دیوی کو دیکھا اُنہوں نے بتایا کہ اس کے بال سفید ہیں۔ اس کا لباس سفید ہے۔ عبادت گاہوں میں گاؤں کے لوگ دیوی کو خوش رکھنے کے لئے کھانے پینے کی چیزیں رکھنے لگے اور کھانے پینے کی ساری چیزیں راتوں میں دیوی لے جاتی تھی۔ پُورے چاند کی رات گاؤں کے تمام لوگ ایک جگہ جمع ہوتے تھے اور سفید بالوں والی دیوی کی عبادت کرتے تھے۔ شہر کی فوج کے ذمّہ دار لوگوں کو شُبہ ہُوا اور وہ اس گاؤں میں آئے وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ گاؤں کے لوگوں نے کسی سفید جانور کو دیوی سمجھ لیا ہے۔ جب وہ اس گاؤں میں آئے تو اُنہوں نے چھُپ کر اس دیوی کو دیکھ لیا۔ اس کے بال سفید تھے اور اس کے کپڑے بھی سفید تھے۔ فوجیوں کو شُبہ ہوا کہ شاید وُہ کوئی دُشمن ہے۔ اُنہوں نے دیوی کا تعاقب کیا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ وہ ایک غار میں جا رہی ہے۔ وہ بھی وہاں پہنچے۔ وہاں ایک ننھے بچے کے رونے کی آواز سُنائی دی۔ ان کی حیرت اور زیادہ بڑھ گئی۔

چاندنی کی دُودھ بھری روشنی میں اُنہوں نے ایک نہایت ہی پیارے بچے کو دیکھا۔ دیوی نے فوجیوں کی آہٹ پا کر بچے کو سینے سے لگا لیا۔ ایک فوجی نے پستول دکھاتے ہوئے پُوچھا — "تم کون ہو؟" "سفید بالوں والی لڑکی گھبرا گئی اور اس نے چیخ کر کہا۔" مجھے نہ مارو۔ یہ میرا بچہ ہے اسے دُودھ کون دے گا —" اور پھر سفید بالوں والی دیوی نے اپنی کہانی سُنائی اور یہ بتایا کہ دس برس پہلے اس کے گاؤں میں ایک نہایت ہی ظالم زمیندار تھا۔ اس کا باپ مال گذاری ادا نہیں کرسکا۔ زمیندار نے اس کے

باپ کو خودکشی کرنے پر مجبور کیا اور اسے اپنے گھر لے آیا۔ جب زمیندار کو
اس کی خبر ہوئی کہ وہ ماں بننے والی ہے تو اس نے اسے قتل کرنا چاہا۔
کسی صورت سے وہ وہاں سے بھاگ سکی۔ اس نے اس غار میں پناہ لی۔
یہاں اسے قدرت نے پھول سا بچّہ دیا۔ اس کی پرورش کے لئے وہ گاؤں
میں جاتی ہے۔ لوگ اسے دیوی سمجھتے ہیں۔ بچے کے دودھ کے لئے اسے کھانے
کو کچھ مل جاتا ہے۔ وہ کئی برسوں تک دن میں غار سے باہر نہیں نکلی۔ سورج
کی روشنی سے اس کا عرصہ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بھوکی رہی۔ ساری
مصیبتیں برداشت کرنے کی وجہ سے اس کے بال سفید ہوگئے۔ ..

فوجیوں نے اسے بتایا کہ ملک کا سماج بہت کچھ بدل چکا ہے۔ لہذا
اسے باہر آنا چاہیئے۔ جب وہ دیوی باہر آئی تو وہ سفید بالوں والی لڑکی ہو
گئی اور اس کی نئی زندگی شروع ہوئی۔ یہ کہانی مختلف رنگ میں چین میں کہی
گئی ہے۔ اس کہانی کے دکھ، درد، کسک اور بے چینی کو ایک اوپیرا کی شکل
دے کر چین کے فن کاروں نے ایک بہت بڑا کارنامہ پیش کیا ہے۔ اسے
بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس اوپیرا کی بنیاد ایک حقیقت پر ہے۔

حقیقت کو فنّی اداؤں سے سنوار کر زندگی کو ایک فن بنانا کوئی چینی
فن کاروں اور ادیبوں سے سیکھے۔ ہمارے ادب میں بھی ایسی حقیقتوں کو
پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں ایسے عناصر کی کمی نہیں ہے۔

فیشن کا تہذیبی پہلو — نفسیاتی نقطۂ نظر سے

اس حقیقت سے کسی بہن کو انکار نہیں ہوگا کہ موسم کی تبدیلیوں سے
زیادہ انسان کی فطرت کی تبدیلیوں سے فیشن میں نئے رنگ اور نئے زاویے
پیدا ہوتے رہتے ہیں — سماج کے حالات میں جیسے جیسے تبدیلیاں آتی
جاتی ہیں انسان کی فطرت میں بھی نئے شگوفے کھلتے رہتے ہیں اور ان کے
اثرات فیشن پر براہِ راست ہوتے ہیں۔ موسم کی تبدیلیوں کا سہارا ضرور لیا
جاتا ہے لیکن دراصل یہ تغیر پسند فطرت ہی کے سارے کارنامے ہوتے ہیں۔
فیشن کے مجسمہ کی تراش و خراش میں عورتوں کے بہت سارے جذبے کام
کرتے ہیں۔ بہت سارے جذبوں کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ بہت ساری
کمزوریوں کی پردہ پوشی ہوتی ہے۔ سماج کے حالات کو پیش نظر رکھ کر عورتیں
وقار حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ وقار حاصل کرنا، خودنمائی کی خواہش، ذہن کو
سکون دینا، احساسِ برتری کو ظاہر کرنا، احساسِ کمتری کو چھپانا، سماجی
زندگی سے علیحدہ اپنی انفرادی زندگی میں حسن پیدا کرنا اور اپنی انفرادیت
کو زندہ رکھنے کی خواہش دراصل یہی فیشن کے مقاصد ہوتے ہیں۔ نفسیاتی
نقطۂ نظر سے جب فیشن کے تہذیبی پہلو پر نگاہیں جاتی ہیں تو عورتوں سے
یہ شکایت ضرور پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ سماج کی نئی اداؤں سے فائدہ اس طرح
حاصل کر رہی ہیں کہ خود سماج کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ اپنے سماج کی تمام
عورتوں کو اس مسئلہ پر سوچنا پڑے گا کہ ان کی حرکتوں سے ہمارے نئے
سماج، نئی زندگی اور نئے تہذیبی دَور کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے۔ اپنی کمزوریوں
کو دور کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے — ماہرین نفسیات جب فیشن
کے تہذیبی پہلو پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ اتنی گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں،
جہاں ان کے بھی ہوش اڑ جاتے ہیں۔ تمام بہنیں جانتی ہیں کہ نفسیات
کے ماہرین ہر حقیقت کے تجزیہ میں جنسی زندگی کو دیکھتے ہیں۔ فیشن کے
تجزیہ میں جب وہ جنسی زندگی کی طرف جاتے ہیں تو اس حقیقت سے
انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ بہت ساری حقیقتوں کا پتہ لگاتے ہیں اور
بہت ساری ایسی باتوں سے آگاہ کرتے ہیں جنہیں جان کر ہم اپنی حیثیت
کو اور زیادہ جان لیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ جنسی زندگی کے ایسے واقعات
اور حالات سامنے لاتے ہیں جنہیں دیکھ کر ان کے ذہن پر ماتم کرنے کی خواہش
ہوتی ہے۔ وہ ایسی باتیں کرجاتے ہیں جو بظاہر دلچسپ ضرور ہوتی ہیں لیکن
حقیقت کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کی بنیاد غلط اور سطحی باتوں پر
ہوتی ہے۔

ماہرین کہتے ہیں کہ فیشن کا تعلق اخلاق سے نہیں ہے اس لئے کہ
اس کا تعلق انسانی جذبات سے ہے۔ میرے خیال میں یہ ماہرین انسانی
جذبات اور اخلاقیات کے تعلق کو بھول جاتے ہیں۔ ان دونوں کے تعلق پر
نظر ڈالنے سے فیشن اور اخلاق کے تعلق کی بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔
اخلاقی زندگی کے اثرات فیشن پر ہوتے ہیں اور فیشن کے اثرات اخلاقی
زندگی پر — یہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ ایک ملک کے فیشن کو دوسرے ملک
کے فیشن ایبل لوگ حاصل کرتے رہے ہیں۔ ایک ملک کے فیشن کی نقالی

دوسرے ملک میں ہوتی رہی ہے۔ بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ اخلاقی عناصر گھبرا جاتے ہیں، چونک جاتے ہیں۔ مشرقی تہذیب پر مغربی فیشن کے اثرات سے تو یہی ہوا ہے۔ فیشن کو حاصل کرتے وقت اس کا خیال ضروری ہے کہ اپنے ماحول میں اس کی گنجائش کہاں تک ہے؟ فیشن کے افادی پہلو پر نظر ضروری ہے۔ جس فیشن سے اخلاق تباہ ہو جائے، زندگی میں جد و جہد کی طاقت نہیں رہے۔ زندگی کی نزاکتیں ختم ہو جائیں اور اس کی جگہ فیشن کی نزاکتیں آجائیں تو اس فیشن کو قریب لاتے وقت بہنوں کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ سماجی زندگی کی اُن پر کتنی ذمہ داریاں ہیں اور انہیں حاصل کرتے وقت ان ذمہ داریوں کو کوئی صدمہ تو نہیں پہنچ رہا ہے؟

نفسیات کے دائرہ کو اور وسیع کرتا ہوگا۔ نفسیاتی زندگی صرف جنس پر منحصر نہیں ہوا کرتی۔ ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ عورتیں اپنے ہونٹوں کو رنگ کر اپنے لاشعور میں دبی ہوئی خواہشوں کو سکون دیتی ہیں۔ جو عورتیں اپنے ماحول میں اور بچپن میں اپنی خواہشوں کو پوری نہیں کرتی ہیں وہ اپنی آزادی اور سماج کی زنجیروں سے آزاد ہونے کا اعلان اس طور پر کرتی ہیں کہ وہ اپنے ہونٹ رنگتی ہیں۔ جو عورتیں احساسِ کمتری کی شکار ہوتی ہیں وہ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے ہونٹوں کو رنگتی ہیں، یہ دکھانے کے لئے کہ وہ آزاد ہیں وہ دوسری عورتوں سے بلند ہیں، نمائش اور ذہنی سکون کا یہ ایک ذریعہ ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ مشرقی تہذیب میں کم سے کم ہونٹوں کو رنگنے کی بات قدیم نہیں ہے۔ مغربی تہذیب کے اثرات نے ہماری عورتوں کو زیادہ متاثر کیا ہے۔ اس لئے یہ سوچنا پڑے گا کہ آخر ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ہم ہونٹوں کو کیوں رنگتے ہیں؟ کونسا وہ جذبہ ہے جو اس سے سکون پاتا ہے؟ اگر یہ بات یوں ہی ہے تو یقیناً خطرناک نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی بات ہے تو انفرادی اور سماجی زندگی کے لئے مُضر ضرور ہے۔ افادیت اور اخلاقیات کو سخت صدمہ پہنچ سکتا ہے۔ خود نمائی کی خواہش انفرادی اور سماجی زندگی کے لئے زہر ہے۔ ہماری بہنوں کو اس مسئلہ پر سوچنا چاہیئے۔ فیشن کا ہر انداز غلط نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ضرور ہوتا ہے کہ بعض عنصر سے شخصیت اور سماج کو سخت نقصان پہنچتا ہے اور عملی زندگی میں جد و جہد نہیں ہوتی۔

اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ آج کل ہماری زندگی میں فلمی دُنیا کے اثرات اور اشتہار بازی اور پروپیگنڈا سے بہت ہی گھناؤنے عناصر شامل ہو رہے ہیں۔ کاروبار کو ترقی دینے کے لئے وطن کے تاجر تہذیبی زندگی کے نقصان اور فائدہ کے متعلق کچھ نہیں سوچتے۔ یہی حال ہماری فلمی زندگی کا ہے مغربی زندگی اور امریکہ کے فیشن کو خواہ مخواہ اور بغیر کسی مقصد کے شامل کیا جا رہا ہے اور ہماری کم علمی اور محدود نقطۂ نظر سے غلط فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے۔ فیشن کا تہذیبی پہلو کافی اہم ہے۔ فیشن میں تبدیلیوں کے لئے ہمیں اپنی معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی زندگی کی تبدیلیوں کو دیکھنا ہوگا۔ اچھے عناصر کو حاصل کرنے سے کس نے روکا ہے؟

شفیقہ انجم

ویرانے کی شام!

دُھواں دُھواں سی یہ چپ چاپ بیکراں وسعت
تمام برگ و شجر خامشی کی نیند میں گم
سکوت جیسے کوئی چھیڑتا ہو پردۂ ساز

فضا کے دوش پہ بکھری ہیں سُرمئی زُلفیں
ہوا کی نرم روی نکہتوں سے بوجھل ہے
وہ دیکھو دُور دھندلکوں میں کھو گیا پربت

بغیر سایوں کے پردے سرکتے آتے ہیں
گھنے درختوں میں اب نیند کا بسیرا ہے
کوئی نہیں جو سُنے تیرگی کا یہ نغمہ

بچوں کا تعمیر

مُلک راج صراف ہماری ریاست کے بہت پُرانے اخبار نویس ہیں۔ بہت سال ہوئے یہ بچوں کے لئے ایک دلچسپ رسالہ "رتن" نکالتے تھے۔ حال ہی میں انہیں یُورپ کے بعض ممالک کا دَورہ کرنے کا موقع مِلا۔ یہ چین بھی گئے تھے۔ آج یہ آپ کو بھی چین کی سیر کراتے ہیں اور وہاں کے بچوں کے متعلق کچھ بتلاتے ہیں!

—————— (ادارہ)

چین کو اگر بچوں کا بہشت کہا جائے تو شاید غیر موزون نہ ہوگا۔

یُورپ اور ایشیا کے بعض ملکوں کے اپنے حالیہ دَورے کے سلسلے میں مجھے چین جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ اور وہاں تقریبًا ایک ماہ تک ٹھہرنے کا موقعہ مِلا۔ اس عرصے کے دَوران میں میں نے چین کی راجدھانی پیکنگ کے علاوہ چین کے بعض دوسرے مشہور شہر نانکنگ، شنگھائی، کینٹن، ہنکاؤ، مقدین اور کئی اہم تاریخی مقامات بھی دیکھے۔ ان سب میں جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وُہ چینی بچوں کی پرورش، اُن کی نگہداشت اور اُن کی تعلیم و تربیت کا انتظام تھا۔

چین کا ہر شخص خواہ وہ مرد ہے یا عورت حکومت کی مشینری کا پُرزہ ہے یا کسی پرائیویٹ اِدارے کا رُکن، بچوں کو اپنے مُلک کا سب سے قیمتی سرمایہ تصوّر کرتا ہے اور اُن کی مُناسب پرورش اور دیکھ بھال کو نہایت ضروری سمجھتا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کو چین کے بچوں میں چین کے شان دار مستقبل کی صورت صاف نظر آئے گی۔

چینی بچہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہی ہوتا ہے تو اُس کی نگہداشت کا معقول بندوبست شروع ہو جاتا ہے۔ حکومت کی جانب سے والدین کو ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ پیدائش کے موقعہ پر بہترین طبّی امداد مہیا کی جاتی ہے۔ یوم پیدائش سے اُس بچے کو بہترین شہری بنانے کا ہر ممکن جتن کیا جاتا ہے۔

چین کے کنڈر گارڈن سکول دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے علاوہ بچوں کے دِل بہلاؤ کے سب ضروری سامان موجود ہوتے ہیں جس سے بچّے ایسی چیزیں اور ہُنر سیکھتے ہیں جو آیندہ زندگی میں اُن کے بڑے کام آتے ہیں اور جس سے مُلک کی مجموعی ترقّی کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں۔

چین میں چھوٹے چھوٹے بچوں کی اپنی نِرالی، مفید درس گاہوں کے علاوہ بچوں کے باغ، بچوں کے محل، بچوں کے عجائب گھر، بچوں کے پارک، بچوں کے محل، بچوں کے تھیٹر اور سینما ہال وغیرہ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ بچوں والی عورتوں کے لئے ریلوے کے ڈبوں میں بھی خاص آرام دِہ انتظامات ہوتے ہیں۔ اُن عورتوں

کے۔ ل۔ احمد صدیقی

نیا سال

نیا سال آیا، نیا سال آیا
خوشی اور مسرت کا پیغام لایا
نئے سال کا اُٹھ کے سواگت کریں ہم
شرارت نہیں، آج دعوت کریں ہم
نیا سال آیا، نیا سال آیا
جو رُوٹھے ہوئے ہیں اُنہیں ہم منائیں
انہیں ہم منائیں، منا کر بلائیں
وہ آئیں تو سب مِل کے کھائیں مِٹھائی
یہ اخروٹ، بادام، کھیر اور مِلائی
نیا سال آیا، نیا سال آیا
اٹھو، اُٹھ کے جشنِ مسرت منائیں
نئے کھیل کھیلیں، نئے گیت گائیں
نیا سال آیا، نیا سال آیا
خوشی اور مسرت کا پیغام لایا

کے بچوں کے لئے جو کارخانوں وغیرہ میں کام کرتی ہیں کارخانوں کے ساتھ
ہی نرسریاں قائم ہیں۔ جہاں تعلیم یافتہ نرسیں ان بچوں کی نگرانی کے
لئے مقرر کی جاتی ہیں جو اپنے فرائض کی ادائیگی میں بڑی ماہر ہوتی ہیں جیسا
کہ ہمارے ذاتی مشاہدے میں آیا، یہ نرسیں ان چھوٹے چھوٹے دُودھ پیتے
بچوں کو اس طرح کھلاتی، پلاتی اور اُن کی ہر قسم کی نگہداشت کرتی ہیں جو اُن
کی مائیں بھی اپنے محدود ذرائع کے ساتھ مشکل سے کرنے کے قابل ہوتی ہیں۔
پی کنگ راجدھانی کے نزدیک ایک کارخانے کے ساتھ ہم نے ایک نرسری کو
دیکھا۔ جہاں ایک شاندار وسیع عمارت کے خوبصورت کمروں کے اندر تین
تین چار چار ماہ کے دُودھ پیتے، اُجلے لباس میں ملبوس بچے پنگوڑوں میں لٹائے
ہوئے تھے یا جھولنوں کے باہر کھیل رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں خوبصورت
کھلونے تھے۔ اُن کے دُودھ پلانے، سونے وغیرہ کے سب سامان موجود تھے۔
نوجوان نرسیں اپنے بچوں کی مانند اُن کی دل بہلائی میں مصروف تھیں۔ اُن
کی اپنی مائیں بھی تفریح کے اوقات میں وہاں آکر اپنے بچوں کو اس قدر
محفوظ اور مسرور پاکر اور بعض اپنی چھاتی سے دُودھ پلا کر خوشیوں سے پھولے
نہ سماتی تھیں۔ ننھی مُنّی دُنیا کا یہ بے نظیر اور رُوح پرور نظارہ ناقابلِ فراموش
ہے۔

بچوں کا محل

چین میں بڑے بچوں کے لئے سکول ٹائم کے باہر بھی کئی قسم کے مفید عام
ہُنر سکھلانے کے وسیع انتظامات دیکھنے میں آئے۔ شنگھائی میں مجھے اس
تعلق میں ایک نہایت شاندار ادارہ دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اس کو "چلڈرنز
پیلس" یعنی "بچوں کا محل" کہا جاتا ہے۔ یہ ادارہ "چائنا ویلفیئر انسٹی ٹیوٹ"
نام کی ایک سوسائٹی کا قائم کردہ ہے جس کی چیئرمین نئے چین کے بانی
مرحوم ڈاکٹر سن یات سین کی بیوہ میڈم سن یات سین ہیں۔ اس عالی شان
عمارت کو دیکھتے ہی دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ عمارت کے باغیچے میں کئی قسم کے
پھول لگے ہوئے ہیں۔ باغیچے کے درمیان محراب پر ایک نوجوان لڑکے اور ایک
نوجوان لڑکی کے مُجسّمے بنے ہوئے ہیں۔ بناوٹ اور کاریگری ایسی کہ ان دونوں
نوجوانوں کے چہروں سے بشاشت اور آنکھوں سے جلال ٹپکتا ہے اور اُن کے
ارادوں میں عالی حوصلگی پائی جاتی ہے۔ مانو وہ چینی نوجوانوں کی زندہ تصویریں
ہیں جو چین کے شاندار مستقبل کی ضامن ہیں۔ اس محل کے اندر بے شمار
کمرے ہیں۔ ہر ایک کمرے میں مختلف کاموں کے نمونوں کی نمائش کی گئی ہے
جو چینی بچوں کے اپنے تیار کردہ ہیں۔ کہیں کشتیاں ہیں تو کہیں ہوائی
جہاز۔ کہیں کھلونے ہیں تو کہیں تصویریں۔ کہیں فوٹوگرافی۔ اور کئی قسم کے
دوسرے آرٹ اور کاریگری کے نمونے دکھلائے گئے ہیں۔ محل کے اندر چند
ایسے کمرے بھی ہیں جن میں بچوں کے وہ تمام حسین تحفے رکھے گئے ہیں جو
دوست ملکوں نے چین کے موجودہ رہنماؤں کو بھیجے ہیں یا اُن کو ان ملکوں کے
دَورہ کرتے وقت ملے ہیں۔ ہندوستان کی ایک گُڑیا کی تصویر کو تو لوگ بار بار
دیکھتے تھے۔

اس محل میں ایسے چینی بچوں کو جن کی عمر نو سال سے لے کر پندرہ سال
ہو، سکول ٹائم کے باہر کام سیکھنے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ یعنی جب یہ بچے
اپنے اپنے سکولوں کے کام سے فارغ ہوتے ہیں تو وُہ صبح اور شام چند
گھنٹے اس محل کے اندر ہُنر سیکھنے اور پریکٹس کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ محل
کی وُسعت کا اندازہ لگائیے کہ اٹھارہ سَو بچے (لڑکے اور لڑکیاں) ایک ہی
وقت کے اندر ان کمروں میں داخل ہوکر یہ کام سیکھتے ہیں۔ تصویروں اور مختلف
کاریگری کے نمونوں کو دیکھ کر بچے خُود اپنے ہاتھ سے اسی قسم کے یا ان سے
بہتر نمونے تیار کرتے ہیں۔ اس طرح بڑے ہوکر یہ بچے اپنے کام کے خاص ماہر
بن جاتے ہیں۔ سینا پرونا، کھلونے بنانا، پینٹنگ، فوٹوگرافی، رنگ سازی،
جہازوں، کشتیوں اور کھیلوں کا سامان بنانا، سجاوٹ اور کئی قسم کے دوسرے
ہُنر غرضیکہ ہر قسم کی عملی تعلیم کے حصول کے موقعے اس محل کے اندر بچوں کو
مہیا کئے جاتے ہیں۔ اسی جگہ ان بچوں کو ناچ اور چھوٹی چھوٹی کھیلیں بھی
سکھلائی جاتی ہیں۔ محل کے اندر ایک وسیع ریڈنگ روم اور ایک لائبریری بھی
ہے۔ اس کے علاوہ جمنیزیم اور سٹیڈیم بھی قائم کئے گئے ہیں تاکہ بچے کھیل
کُود میں حصہ لے سکیں۔ اور تندرست رہ سکیں۔ غرضیکہ اس محل کے اندر بچوں
کے دِل و دماغ اور جسم دُرست رکھنے کے لئے اور اُن کو بہترین شہری بنانے
کے سب سامان مہیا کئے گئے ہیں اور سب سے بڑھ کر خوبی یہ کہ یہ کام اکٹھے مِل کر
کیا جاتا ہے جس سے اجتماعی ترقی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ باہمی اُلفت اور
یک جہتی فروغ پاتی ہے اور سب کا وقار بڑھتا ہے۔

ہمارے بچے بھی چین کے ان بچوں کی مثال سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور
اپنے مُلک میں نام پیدا کر سکتے ہیں۔

سوم ناتھ سادھو

خوب ہنسو

آدمی — کیوں منّے، تمہارے ابّا جان اندر ہی ہیں؟

منّا — نہیں۔ جی نہیں۔ وہ باہر چلے گئے ہیں!

آدمی — کب تک لوٹیں گے؟

منّا — (اندر جھانک کر) ابّا! اب کیا جواب دوں؟

* * * * * * * * * * *

مجسٹریٹ نے ملزم سے کہا۔ "افسوس ہے کہ میں تمہیں تیسری مرتبہ چوری کے الزام میں جیل بھیج رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آئندہ تمہیں ملزموں کے کٹہرے میں نہ دیکھوں گا۔"

ملزم (حیرت کے ساتھ) کیا جناب کا تبادلہ ہونے والا ہے؟

* * * * * * * * * * *

کرایہ دار۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اب آپ کے مکان میں نہیں رہ سکتا۔

مالکِ مکان۔ کیوں آپ کو کوئی نقصان ہوا ہے؟

کرایہ دار۔ اجی نہیں، کل تمام رات میرے سونے کے کمرے میں چوہے لڑتے رہے!

مالکِ مکان (بڑی بے پروائی سے) جناب پانچ روپے ماہوار کے کمرے میں اگر چوہے نہ لڑتے۔ تو کیا بھینسے لڑتے!

* * * * * * * * * * *

ماسٹر جی نے لڑکوں سے کہا تھا کہ کوئی بات کہنے سے پہلے اندر سے سو تک گنتی پڑھنی چاہیئے۔ چنانچہ ایک دن ماسٹر جی انگیٹھی کے پاس بیٹھے تھے تو سب لڑکوں کے ہونٹ ہلنے لگے۔ ماسٹر جی نے حیرت سے پوچھا۔ "ارے کیا ہوا ہے وقوفو!" لیکن کسی لڑکے نے کچھ نہ کہا اور اُن کے ہونٹ برابر ہلتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد سب لڑکوں نے یک زبان ہو کر کہا "ماسٹر جی! پیچھے سے آپ کا کوٹ جل رہا ہے۔"

* * * * * * * * * * *

الطاف ۔ین

دنیا کی وہ چھوٹی چیزیں جو اپنا ثانی نہیں رکھتی ہیں

(۱) سب سے چھوٹی کتاب ایک دھیلے کے نیچے چھپ سکتی ہے۔ یہ کتاب انچ کا ۱/۵ حصہ موٹی ہے۔ اس میں ایران کے مشہور شاعر عمر خیام کی رباعیات کے ۴۹ تصویر دار صفحے ہیں۔

(۲) سب سے چھوٹی تصویر ایک گندم کے دانے پر ہے جس پر ایک چکی کی تصویر ہے اور چکی والا اپنی کمر پر اناج کی بوری اُٹھائے سیڑھی پر چڑھ رہا ہے۔ اس کے قریب ہی چھکڑا کھڑا ہے۔ تصویر کی ہر چیز صاف نظر آتی ہے۔

(۳) سب سے چھوٹی عورت ہالینڈ میں ہے جس کا قد صرف بیس انچ ہے اور عمر تقریباً تیس سال ہے۔

(۴) سب سے چھوٹی حکومت جزیرہ سوڈ کی ہے جس کا رقبہ ۸۰ ایکڑ اور آبادی چار سو آدمیوں کی ہے۔

(۵) سب سے چھوٹی جنگ ۱۸۹۶ء میں برطانیہ اور زنجبار کے درمیان ہوئی جو صرف ۴۰ منٹ تک رہی۔

(۶) سب سے چھوٹا اخبار "میکسیکو" (امریکہ) سے نکلتا ہے جو صرف چار انچ مربع کاغذ پر چھپتا ہے۔

(۷) سب سے چھوٹا سکّہ جزیرہ نما ملایا کا ہے جو صرف ایک بندی کے برابر ہے۔

(۸) سب سے چھوٹا کتّا ساؤتھ کنگسٹن کے عجائب خانہ میں تھا جس کا وزن صرف ۲½ چھٹانک تھا۔

(۹) سب سے چھوٹا جزیرہ ایک چٹان پر واقع ہے جہاں جہازوں کے لئے روشنی کا مینار بنا ہوا ہے۔

جہاں نما

مہینے بھر کی اہم خبروں کا خلاصہ

اول دسمبر ——— ۱۳ر دسمبر

اول دسمبر:- نئی دہلی میں وزیراعظم ہند شری نہرو اور چینی وزیراعظم شری چو این لائی کی بات چیت اختتام کو آپہنچی ہے۔ وزیراعظم شری نہرو کے امریکہ کے دورے کے پیش منظر میں یہ بات چیت کافی اہمیت کی حامل قرار دی گئی ہے۔

۲ر دسمبر:- وزیراعظم چین شری چو این لائی نے اپنے ایک بیان میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ہندوستان سائنسی تحقیقات، صنعتوں اور باقی ٹیکنیکل شعبوں میں چین سے آگے ہے۔

۳ر دسمبر:- پاکستان کے وزیراعظم مسٹر سہروردی نے مصر میں اینگلو فرانسیسی حملے کا جواز پیش کر دیا ہے۔ امریکہ کی طرف سے مغربی یورپ کے ملکوں کو تیل مہیا کرنے کی پیش کش کی گئی ہے۔

۴ر دسمبر:- ہنگری کی حکومت نے اقوام متحدہ کے مبصروں کو ملک میں آنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ شری نہرو نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ سلامتی کونسل کو مسئلہ کشمیر پر غور کرتے وقت یہ بنیادی حقیقت مدنظر رکھنی ہوگی کہ پاکستان کشمیر میں حملہ آور کی حیثیت رکھتا ہے۔

۵ر دسمبر:- شری نہرو نے اقوام متحدہ کے مبصروں کے تئیں ہنگری کے رویہ کی نکتہ چینی کی ہے۔ اینگلو فرانسیسی کمان نے تین ہفتے کے اندر اپنی فوجوں کو مصر سے نکالنے کا اعلان کر دیا ہے۔

۶ر دسمبر:- اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ہنگری کے ہمسایہ ملکوں میں اپنے مبصروں کو بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو وہاں کی اندرونی صورت حال کے متعلق اطلاعات بہم کریں گے۔

۷ر دسمبر:- ہندوستان کے سابق وزیر قانون شری بی۔ آر امبیڈکر کا دہلی میں انتقال۔ پارلیمنٹ کے دونوں ہاؤس موصوف کی یاد میں ملتوی کئے گئے۔

۸ر دسمبر:- لوک سبھا میں قانونی امور کی وزارت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ ہندوستان بھر میں عام انتخابات مارچ کے پہلے پندرہ واڑے میں عمل میں لائے جائیں گے۔ شری جگ جیون رام ریلوے کے نئے وزیر مقرر ہوئے ہیں۔

۹ر دسمبر:- صدر آئزن ہاور کے خاص ایلچی مسٹر کوپر نے شری نہرو سے ملنے کے بعد اعلان کیا ہے کہ ہونیوالی نہرو آئزن ہاور ملاقات سے دُنیا کی بہتری کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

۱۰ر دسمبر:- سوویت روس اور آسٹریا نے اقوام متحدہ کے مبصروں کو اپنے ملکوں میں داخل ہونے کی اجازت دینے پر رضامندی ظاہر کی ہے تا کہ وُہ ہنگری کی صورت حال کا مطالعہ کر سکیں۔

۱۱ر دسمبر:- ریاست کے وزیراعظم بخشی غلام محمد نے اعلان کیا ہے کہ کشمیر میں بھی ہندوستان کے باقی حصوں کی طرح انتخابات کے انعقاد کے لئے تیاریاں جاری ہیں جس میں تمام سیاسی پارٹیوں کو حصّہ لینے کے لئے ضروری سہولیات مہیا کی جائیں گی۔

۱۲ر دسمبر:- صدر ناصر نے اپنے اس عزم کا ایک اور بار اعادہ کیا ہے کہ وہ کسی قسم کے دباؤ کے تحت کسی فوجی گٹھ جوڑ میں شامل ہونے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔

۱۳ر دسمبر:- سوویت یونین کی طرف سے جنرل اسمبلی کو استدعا کی گئی ہے کہ وُہ اپنے ایجنڈا میں امریکہ کی طرف سے" عوامی جمہوریتوں کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کے سوال کو بھی شامل کرے۔

۱۴ر دسمبر:- شری نہرو نے ہنگری کے حالیہ واقعات کو قومی جذبہ کے ابھار سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے انکشاف کیا ہے کہ وہاں بتیس ہزار سے زائد اشخاص

مارے جا چکے ہیں۔

۱۵ر دسمبر:- امریکہ کے تاریخی دورے پر روانہ ہونے سے قبل شری نہرو نے بمبئی میں اُمید ظاہر کی کہ صدر آئزن ہاور سے میری ملاقات ہند اور امریکہ کے تعلقات کے باب میں خوشگوار اضافہ کرے گی۔

۱۶ر دسمبر:- امریکہ جاتے ہوئے شری نہرو ۹ گھنٹوں کے لئے لندن میں ٹھہرے اس عرصے میں آپ نے برطانوی وزیر اعظم سر اینھتونی ایڈن سے پونے گھنٹے کے لئے ملاقات کی جو بالکل غیر متوقع خیال کی جاتی تھی۔

۱۷ر دسمبر:- وزیر اعظم شری نہرو کا واشنگٹن میں شاہانہ خیر مقدم۔ امریکی پریس کا اظہار خوشنودی۔

۱۸ر دسمبر:- گیٹس برگ میں شری نہرو اور صدر آئزن ہاور کی مخصوص ذاتی نوعیت کے تبادلۂ خیالات کا آغاز۔

۱۹ر دسمبر:- گیٹس برگ کی ملاقات کے بعد شری نہرو اور صدر آئزن ہاور واشنگٹن پہنچ گئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ امریکہ ہندوستان کو دی جانیوالی اقتصادی امداد میں کافی اضافہ کرنے کا اعلان کریگا۔

۲۰ر دسمبر:- شری نہرو نے کہا ہے کہ میرے امریکہ کے دورے کے بعد ہندوستان کی غیر جانبدارانہ پالیسی کو بہتر طور سمجھا جانے لگا ہے۔ اور خود مجھے بھی احساس ہوا ہے کہ امریکہ کی خارجی پالیسی اتنی بے لوچ نہیں ہے، جتنا خیال کیا جاتا تھا۔

۲۱ر دسمبر:- واشنگٹن میں شری نہرو اور صدر آئزن ہاور کی ملاقات کے نتیجے میں ایک مشترکہ بیان جاری کیا گیا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ دونوں لیڈروں کی ملاقات کے بعد امریکہ اور ہندوستان کی دوستی اور زیادہ اُستوار ہو گئی ہے۔

۲۲ر دسمبر:- اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے شری نہرو نے کہا ہے کہ فوجی گٹھ بندیوں اور طاقت کے بل بوتے پر عالمی امن کا قیام احمقانہ خیال ہے۔

۲۳ر دسمبر:- ہندوستان کے نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ایک عظیم اجتماع کی حاضری میں بانہال کی نئی سُرنگ کا افتتاح کیا ہے جس کے ذریعے سال بھر کشمیر کی آمد و رفت کھلی رہ سکے گی۔

۲۴ر دسمبر:- شری نہرو کینیڈا کے تین روزہ دورے پر اوٹاوا پہنچ گئے۔

وزیر اعظم چین مسٹر چو این لائی نے کہا ہے کہ وہ روسی لیڈروں سے اعلیٰ سطح کی بات چیت کے لئے ۷ر جنوری کو ماسکو پہنچ جائیں گے۔

۲۵ر دسمبر:- برطانوی وزیر اعظم کی دیہاتی رہائش گاہ چیکرس میں سر اینتھونی ایڈن اور شری نہرو کی بات چیت۔ دہلی کے گول ڈاک خانے پر ڈاکے کی لرزہ خیز واردات۔

۲۶ر دسمبر:- مصر نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے مطالبہ کیا ہے کہ برطانیہ فرانس اور اسرائیل کے حالیہ حملے کے سبب اُس کو جو بھاری نقصان اُٹھانا پڑا ہے حملہ آور ملکوں سے اس کا معاوضہ دلوانے کے لئے اقدامات کئے جائیں۔

۲۷ر دسمبر:- انڈونیشیا میں فوجیوں کی رخصتیں منسوخ کر دی گئی ہیں۔ صدر سوکارنو نے باغی فوجی کمانڈر کرنل کمبلون کو اُن کے عہدے سے برطرف کر دیا ہے۔

۲۸ر دسمبر:- شری نہرو لندن سے ہندوستان کے لئے روانہ ہو گئے ہیں۔ اقوام متحدہ کے زیر اہتمام نہر سویز کی صفائی کا کام شروع کیا گیا ہے۔

۲۹ر دسمبر:- شری نہرو اپنے امریکہ کے دورہ کے بعد واپس نئی دہلی پہنچ گئے ہیں۔ آپ نے دیگر امور کے علاوہ اسبات کا انکشاف بھی کیا ہے کہ اس امر کے روشن امکانات ہیں کہ صدر آئزن ہاور دوسرے سال ہندوستان کے دورہ پر تشریف لائیں گے۔

۳۰ر دسمبر:- کانگرس کی طرف سے عام انتخابات کے لئے انتخابی منشور شائع کیا گیا ہے۔ منشور میں سماج وادی نظام قائم کرنے کی ذمہ داری لی گئی ہے۔

۳۱ر دسمبر:- مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ شری روی شنکر شکلا دہلی میں انتقال کر گئے ہیں۔ صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کہا ہے کہ اُن کی موت کے نتیجے میں ہم جنگ آزادی کے ایک اولوالعزم مجاہد سے محروم ہو گئے ہیں۔

اول جنوری ۱۹۵۷ء:- کرنل ناصر نے کہا ہے کہ ۱۹۵۴ء میں برطانیہ کے ساتھ کیا گیا معاہدہ اب قابل عمل نہیں رہا۔

{باقیات}

(بقیہ لداخی ناچ)

تھوڑی دیر بعد یہ خبر بھی ملی کہ بچے کی ماں مرگئی۔ بڑے لاما نے ہدایت دی کہ اس بچے کو بھی ماں کی لاش کے ساتھ ہی دفنا دینا چاہیئے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ بچہ قبر میں ہی ماں کا گوشت چٹ کر گیا ہے اور زمین کھرچ کھرچ کر باقی قبروں کی لاشوں پر بھی ہاتھ صاف کر بیٹھا ہے۔

اور مردوں کی ہڈیوں کی مالائیں بنا کر اپنے گلے میں پہن رکھی ہیں۔ قبرستان [illegible] سے فارغ ہوکر [illegible] طفل نے جن [illegible] بستیوں پر [illegible] دیا۔ اور زندہ لوگوں [illegible] کو چیر پھاڑ کر کھانے لگا۔ گریہ وزاری کرتے ہوئے لوگ مقدس لاما کے پاس فریاد لے کر گئے۔ لاما ان کی فریاد سے بہت متاثر ہوا۔ اور اس نے اپنے روحانی کمال کو داؤ پر لگا کر اپنے [illegible] کے جسم میں داخل کیا اور [illegible] دماغ سے گھوڑے کی صورت میں [illegible] ہوکر ہنہنانے لگا۔ اس طرح سے جن کا کام تمام کر کے وہ پھر اپنے [illegible] روپ میں ظاہر ہو گیا۔ اس عظیم فتح کی خوشی میں کسی [illegible] صورت کا [illegible] بنالیا اور اسے پہن کر ناچنے لگا اور اس انداز سے [illegible] حرکتوں سے واضح طور پر [illegible] دل اور جنوں پر انسان [illegible] فتح [illegible] تھا۔

بڑے لاما کی وفات کے بعد اس کی تقلید شروع ہوگئی اور ہر سال اس واقعہ کا تیوہار منایا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ ناچنے والوں کی صفوں میں وسعت آتی گئی اور مختلف حیوانوں کی شکلیں پہن کر ناچنے کا رواج عام ہو گیا اور آج حال یہ ہے کہ تمام بودھ دنیا میں یہ ناچ بہت مقبول ہے۔

لداخ میں بیرونی ناچ

لداخ کی سرزمین قدیم زمانہ سے مختلف تہذیبوں کا گہوارہ رہی ہے۔ اور مختلف کناروں سے آئی ہوئی تہذیبی موجوں کا یہ سنگم رنگ رنگ کے تمدنی رجحانات کی آماجگاہ رہتا آیا ہے۔ اس باہمی تعلق اور امتزاج سے یہاں کے اپنے کلچر پر بھی بیرونی اثرات کی گہری چھاپ ثبت ہو چکی ہے۔ ناچ کے معاملہ میں بھی لداخیوں نے بیرونی رقص کے [illegible] ات کو قبول کر لیا اور کئی بیرونی ناچ اس وقت بھی معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ اپنے اصلی حلیے میں یہاں پر ناچے جاتے ہیں۔ مختلف تیوہاروں پر مقامی ناچوں کے علاوہ بیرونی ناچوں کے مظاہرے بھی کئے جاتے ہیں۔ ان میں کشمیری ناچ گلگتی ناچ اور تبتی ناچ وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرا پنجسالہ منصوبہ اور تعلیم

بقیہ:- زولاجی، کیمسٹری، تاریخ اور اقتصادیات کو شامل کیا جائے گا۔ صحت کیلئے بھی ایک سرکاری کالج قائم کیا جائیگا۔ جموں و کشمیر دونوں صوبوں میں نوجوانوں کے کیمپ کیلئے مناسب مقاموں کا انتخاب کیا جائیگا۔ اس سے نوجوانوں میں تمدنی سرگرمیاں بڑھتی جائیں گی اور سماجی تعلیم کو آگے بڑھانے میں مدد ملیگی۔ اساتذہ، ہیڈ ماسٹر اور انسپکٹر ہندوستان کے مختلف حلقوں اور کانفرنسوں میں شرکت کرینگے۔ دوسرے پانچسالہ منصوبہ میں ریاست کے باہر ہونے والی کانفرنسوں میں شرکت پر کافی زور دیا گیا ہے۔ طلبا اور طالبات کو بھی ریاست کے باہر تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مواقع فراہم کئے جائیں گے۔

محکمہ تعلیم نے ریاست کی آئندہ تعلیمی پالیسی کا ایک نہایت ہی پیارا خاکہ مرتب کیا ہے جو تمام اساتذہ، پروفیسروں اور تعلیمی آفیسروں کو بھیجا گیا ہے تاکہ وہ اس خاکہ پر اپنی رائے دے سکیں۔ اس خاکہ میں تعلیمی مسائل، ابتدائی تعلیم، عملی سکول، نصاب اور مدرسی کتب، ذریعہ تعلیم، اساتذہ کی تربیت، تربیتی کالج، صنعتی اسکول، ثانوی تعلیم، کالج کی تعلیم، ایم اے کی تعلیم، تعلیمی یونیورسٹی، بیرونی ممالک کے مطالعہ کیلئے وظائف، ثانوی تعلیمی بورڈ، درسی کتب کمیٹی، جسمانی تعلیم و تربیت، تمدنی سرگرمیاں اور طلبا کی صحت اور علاج کے متعلق باتیں کی گئی ہیں۔

بقیہ:- تاریخ کشمیر ـــــ برہمنی تہذیب کا دور

مقبول رہی۔ چنانچہ کشمیر کے آثار قدیمہ میں بودھ اور برہمنی دیو مالا کے قصے پتھروں میں اس طرز فن کے مطابق اس طرح منقش ملتے ہیں کہ عقل انسانی اس زمانے کے کاریگروں کی چابکدستی پر عش عش کر اٹھتی ہے۔ فن تعمیر اور سنگتراشی کے لحاظ سے مارتنڈ کے علاوہ اونتی پور کے مندر بھی کافی اہم ہیں۔ ان میں نہ صرف مذہبی بلکہ غیر مذہبی فن کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ ان میں بعض تو اس قدر عریاں ہیں کہ انہیں دیکھ کر یونانی روایات کی یاد آنے لگتی ہے۔ اس طرز فن کے نمونے کشمیر کے آس پاس بھی ملتے ہیں چنانچہ اکھنور (جموں) کے قریب [illegible] کشمیری طرز کے معلوم ہوتے ہیں اسی طرح بلاورا اور [illegible] (جموں) میں بھی جو البیرونی کے زمانے میں کشمیر کی تجارتی شاہراہ پر بڑی اہم بستیاں تھیں۔ اس آرٹ کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔

یوں تو کلہن کے زمانے سے کشمیر میں گھر گھر راج کا [illegible] دور ہو چکا تھا لیکن تیرہویں صدی کے آخر میں زبون حالی کی حد ہو چکی تھی۔ بالآخر رحمت باری جوش میں آئی اور چودھویں صدی میں کشمیر اسلام کی ضیا باریوں سے بقعہ نور بن گیا اور ہماری تہذیب میں نئے رنگ روپ سے ایک اور نکھار آ گیا جس کا ذکر ہم عہد سلاطین کے تہذیبی کارناموں کے بیان میں کرینگے۔

صدر دستوریہ مسودہ آئین پر دستخط کر رہے ہیں ۔

جوش و اخلاص سے کی کوشش پیہم ہم نے
کوہ غم ٹوٹ پڑے پر نہ کیا غم ہم نے

نظم کہسار کیا درہم و برہم ہم نے
کر دیا قوم کا اک خواب مجسم ہم نے

۲۲ دسمبر ۱۹۵۶ کو جمہوریہ ہند کے نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے جواہر ٹنل کی رسم افتتاح انجام دی ۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن، یوراج کرن سنگھ جی اور بخشی صاحب جب سرنگ سے باہر آئے ۔ تو ہزاروں لوگوں نے اُن کا پرتپاک خیر مقدم کیا ۔

نیشنل کانفرنس کے جنرل سکرٹری بخشی عبدالرشید لال چوک میں تقریر کر رہے ہیں۔

۲۶ جنوری کو جشن جمہوریت
ہند اور جشن آئین کی تقریب

لال چوک میں ایک عظیم اجتماع

ماہنامہ تعمیر

سری نگر

ایڈیٹر

شمیم احمد شمیم

جلد ۱ ——— شمارہ ۸

زرِ سالانہ ... ... ۶ روپے

فی پرچہ: ... ... ۸ آنے

سرورق:- ماسٹر زندہ کول کشمیر کے کہنہ مشق اور پیر لیثال شاعر! ماسٹر جی کے مجموعۂ کلام "سمرن" پر انہیں ہندوستان کی ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے پانچ ہزار روپے کا عطیہ پیش کیا گیا ہے جسے بڑھاپے میں علم ہو کہ عبث کی شراب جلا کر خاک کر دے گی۔ وہ نشے کے خوف سے شراب ترک کر دیتا مگر شراب کی طلب کہیں اُسکا پیچھا چھوڑ سکتی ہے؟

فروری سنہ ۱۹۵۷ء

عبدالغنی وڈیرا پرنٹر پبلشر نے لالہ رُخ پبلی کیشنز سری نگر کی طرف سے شائع

ترتیب

زاویے!

ریاست کے نئے آئین کی تکمیل اور اس کے اطلاق کی خبر جہاں ریاستی باشندوں اور ان کے بہی خواہوں کیلئے مژدۂ جانفزا کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہاں یہی بات پاکستان کے حکمرانوں اور اس کے سامراجی آقاؤں کے لئے سوہان روح ثابت ہوئی چنانچہ ایک جانے بوجھے منصوبے کے زیر اثر اسی موقعہ کو شور و غوغا کیلئے منتخب کیا گیا جب ریاستی عوام اپنی جدوجہد حریت کا آخری باب لکھ رہے تھے۔ پاکستانی حکمرانوں کا یہ اضطراب تو اس وجہ سے قابل فہم تھا کہ اس طرح سے پاکستان کے عوام کی توجہ ملک کے اصلی مسائل سے ہٹ سکتی تھی۔ اور ان کے دور اقتدار میں کچھ وقفے کا اضافہ ہو سکتا تھا۔ مگر سلامتی کونسل نے ۲۴ جنوری والی قرارداد جس طرح سے منظور کی۔ اس سے یہ حقیقت ایک اور بار نمایاں ہو کر سامنے آ گئی کہ یہ بین الاقوامی ادارہ دراصل امن اور انصاف پسند انسانیت کا صحیح ترجمان اور نگہبان نہیں ہے۔ بلکہ یہ مغرب کے استعماری طاقتوں کے ہاتھ کا کھلونا ہے، جسے وہ انصاف اور معقولیت سے قطع نظر اپنی جنگی، سیاسی اور اقتصادی مصلحتوں کے پیش نظر آئے دن مختلف سمتوں میں گھماتے رہتے ہیں۔
پاکستان کشمیر میں حملہ آور کی حیثیت سے داخل ہوا۔ کشمیری عوام نے ہندوستان کی مدد سے اس کی مزاحمت کی۔ اور ہندوستان نے سلامتی کونسل کے دروازے کھٹکھٹائے۔ سلامتی کونسل نے پاکستان کو حملہ آور قرار دیدیا۔ اور اسے صاف طور پر بتایا گیا کہ وہ اپنی فوجوں سے کشمیر کو خالی کرے۔ مگر اس کے باوجود اب تک پاکستان ڈھٹائی سے اپنی حملہ آورانہ حیثیت برقرار رکھے ہوئے ہے اور اس پر یہ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ سلامتی کونسل اپنی ہی قراردادوں کو فراموش کر کے اس کے حق میں قرارداد منظور کرتی ہے، اور وہ بھی نہایت پُراسرار اور ڈرامائی طریقے پر۔ اس سلسلہ میں ہندوستان نے جو رویہ اختیار کیا ہے۔ اس سے ان عناصر کا منہ بند ہو گیا ہے۔ جو زبردستی اور جبر کے ہتھیار آزما کر اس سے غلط باتیں منوانے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ چنانچہ اس امر کی صراحت شری نہرو، جناب بخشی غلام محمد اور شری کرشنا مینن کی ان تقاریر سے ہوتی ہے جو اس سلسلہ میں کی گئیں۔ شری کرشنا مینن نے جس طریقے سے ہندوستان کا کیس پیش کیا۔ اس نے دشمنوں تک کو

تعمیر

اس کی معقولیت اور منصفانہ نوعیت کا قائل کر دیا۔ شری نہرو نے صاف کہہ دیا کہ ہندوستان جاننا چاہتا ہے کہ بیرونی ممالک کی فوجیں کسی ملک میں تعینات کرنے کے معنی کیا ہوتے ہیں اور وہ نہ صرف کشمیر میں بین الاقوامی پولیس فورس کا وجود برداشت نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں بھی اس فوج کا داخلہ گوارا نہیں کر سکے گا۔ جو کہ ہندوستان کا ایک حصہ ہے۔ کشمیری عوام کے موقف کی وضاحت اس قرارداد سے ہو جاتی ہے، جو حال ہی میں آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کی مجلس عاملہ نے منظور کی ہے۔ اور جس میں بتایا گیا ہے کہ کشمیری عوام نے ہندوستان کے ساتھ جو الحاق کیا ہے۔ وہ تاریخ کی جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ جسے کوئی طاقت بدل نہیں سکتی۔ البتہ اب وقت آ گیا ہے۔ جب سلامتی کونسل کو ہندوستان کی اصل شکائیت پر غور کر کے ان اقدامات پر سوچ بچار کرنا چاہیئے جن کے تحت ریاست کے بعض حصوں سے پاکستانی حملہ آوروں کو نکال باہر کر دیا جائے۔ جنہوں نے ان پر غاصبانہ قبضہ جما رکھا ہے۔ اور وہاں کے لوگوں کو بدترین قسم کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سلامتی کونسل کشمیریوں کی ان نداؤں کا خاطر خواہ ردِ عمل کر کے اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کے لئے کیا ذرائع اختیار کرتی ہے۔

گذشتہ ماہ مجھے تعمیر سے متعلق مختلف امور کے سلسلہ میں جموں اور دہلی جانیکا موقعہ ملا۔ اور اس مختصر سے وقفہ میں مجھے بہت سے ادیبوں اور ادب نواز دوستوں سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ ریاست اور بیرون ریاست میں تعمیر کا خاطر خواہ خیر مقدم کیا گیا ہے۔ اور مختصر سے عرصے میں اس کے ساتھ بہت سی توقعات وابستہ کی گئیں ہیں۔ عام طور پر تعمیر کی موجودہ ترتیب کو پسند کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں بہت سے مفید اور کارآمد مشورے بھی حاصل ہوئے ہیں۔ ہم اپنے کرمفرماؤں کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ ترتیب کے وقت ان کی قیمتی آراء کو زیر نظر رکھا جائیگا۔ اور تعمیر کو ادب نواز حلقوں میں اور زیادہ مقبول بنانے کے لئے مختلف اقدامات کئے جائیں گے۔ اس کیلئے ایک سب سے بڑی خواہش یہ بھی ہے کہ ہمارے ادیب اور لکھنے والے ہمیں اپنے سرگرم تعاون سے نوازیں اور اپنی قلمی اعانت سے ہماری مشکلات کو آسان کر دیں۔ تاکہ تعمیر کشمیری اور اردو ادب کی خاطر خواہ خدمت سرانجام دے سکے۔

ماسٹر جی

حیات اور افکار پر ایک نظر

"حقائق نے میرے تصوف کا مذاق اُڑایا:

"یہ ایک خواب ہے۔"

میں نے اس کی پروا نہ کی اور کہا:

"یہ خواب (بیداری سے) بہتر ہے کہ اس نے بادشاہ کو قلندر بنایا۔

اس نے شاعر، مصور، سنگ تراش پیدا کئے۔

اس خواب ہی نے تو قیس و کوہ کن جیسے عاشقوں کو جنم دیا۔

شمع و پروانہ بھی تو اسی کی تخلیق کا کرشمہ ہیں!"

میں نے ماسٹر جی کی شاعری کی رُوح ان ہی شعروں میں پائی اور اس کے سوا کچھ اور ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ بہت کچھ ملا۔ لیکن اس سب کچھ کا سرچشمہ یہی کچھ پایا۔ انسان دوستی، امن اور محبت —— یہ تین چیزیں ہمارے شعری ادب کی شان دار روایات رہی ہیں اور اس وقت بھی ہمارے اکثر شاعروں کے کلام میں ایک مقدس ورثے کی شکل میں زندہ و تابندہ ہیں۔

لیکن یہ روایات کہیں تصوف کی پیچ در پیچ راہوں میں پڑ کر قارئین کے لئے بالکل بے معنی بن جاتی ہیں اور کہیں پر ان کا استعمال اس قدر گھٹیا انداز میں ہوتا ہے کہ شاعری بے ہودگی کا چولا اوڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ زندہ کول کا تصوف ان دونوں خطروں سے دامن بچاتا ہوا سیدھا سادہ ہے، عام فہم اور معنی خیز انداز میں اپنے مسائل پیش کرتا ہے اور اس وقت طلب اور مشکل موضوع سے بیزار آدمی بھی تھوڑی دیر کے لئے ایک کشش، ایک گہرائی اور تاثر کے جذبے کے تحت چونک سا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں زندہ کول کی یہی سادگی اُن کی پختہ کاری اور پختہ کاری کی دلیل بھی ہے۔

زندہ کول کی شاعری کا ایک جائزہ پیش کرنے کے لئے یہ بات نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اُن کی شخصیت، کردار اور افکار کا ایک مطالعہ بھی پیش کیا جائے۔ زندہ کول سری نگر میں ایک غریب ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے اور ابتدا ہی سے انہیں مالی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ پڑھنے کا شوق تو تھا۔ لیکن آٹھ جماعتیں پڑھنے کے بعد تلاش روزگار شروع ہوئی۔ کہتے ہیں ایک فوٹو گرافر کی دکان میں ملازمت مل گئی۔ لیکن ملازم ہونے پر بھی تعلیم کا شوق کم نہ ہوا۔ اور یہی شوق آپ کا رہنما بن گیا اور آپ نے بڑی مشکلات کے باوجود آج سے نصف صدی سے کچھ پہلے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد بی۔ اے کا امتحان دینے کی غرض سے لاہور گئے۔ اور ڈگری حاصل کر کے واپس لوٹے۔ پھر ریاست کے مختلف محکموں میں کام کرتے رہے۔ کہیں کلرکی کی۔ کہیں مترجم ہو گئے۔ پھر اُستاد بن گئے اور یہاں لوگوں میں اتنے مقبول ہوئے کہ چھوٹے بڑے سبھی ماسٹر جی کہنے لگے اور اس وقت بھی زندہ کول کی نسبت آپ "ماسٹر جی" کے نام سے زیادہ معروف ہیں۔

بچپن سے ہی شعر و شاعری سے دلچسپی تھی کہتے ہیں آٹھ سال کی عمر میں بھی آپ شعر کہتے رہے ہیں۔ اور پھر جب اسکول میں آپ نے اپنے اس شوق کا مظاہرہ کیا تو اُستاد حیران رہ گئے اور آپ کی قابلیت کا لوہا ماننے پر مجبور ہوئے۔ بعض سنکی مزاج لوگوں نے آپ کی اہلیت پر شبہ کیا۔ اور آپ کے اشعار کو "سرقہ" سمجھ کر مذاق اُڑاتے رہے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد آگے چل کر یہی لوگ آپ کے مداحوں میں پیش پیش رہے۔

زندہ کول نے ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔ فارسی، عربی، اُردو اور انگریزی پر آپ کو عبور حاصل ہے۔ شروع میں اُردو میں شاعری کرتے رہے لیکن پھر احساس ہوا کہ کشمیری کو ہی ذریعۂ اظہار بنایا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد اپنی مادری زبان میں ہی شعر کہنے لگے۔

ترلوکی ناتھ کندن نے ماسٹر جی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ

عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر آپ کو کافی عبور حاصل ہے۔ کشمیری مادری زبان ہونے کے طفیل آپ کے گھر کی لونڈی سمجھی جاتی ہے۔ کشمیری زبان کی مٹھاس، اس کے اختصار اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ جذبات کی ترجمانی کرنے کی اہلیت نے آپ پر جادو کیا اور آپ فارسی اور اردو میں شاعری کرتے کرتے یک لخت کشمیری کی طرف مائل ہوئے اور یہیں آپ کی شاعری کا جوہر چمکا۔"

یہ صحیح ہے کہ زندہ کول نے فارسی اور اردو میں بھی اشعار کہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کا نام اُن کشمیری اشعار کے طفیل ہی چل نکلا جو میرے خیال میں ان کے فارسی اور اردو کلام کے مقابلے میں کم ہیں۔ کلرکی کے زمانے میں اُنہوں نے کلرک کی زندگی سے متعلق جو مزاحیہ نظم لکھی ہے اُسے پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ زندہ کول نے اس پیشے کی گھٹن، محرومیوں اور ناکامیوں کا احساس دلانے کی کوشش تو کی ہے لیکن اُن کی نظم ان جذبات کو اچھی طرح سے پیش کرنے میں ناکام رہی ہے اور اسی موضوع کو جب وہ کشمیری میں پیش کرتے ہیں تو کلرک کی بزدلی، چاپلوسی اور آقا سے نسبت اُس کے غلامانہ جذبات کی پوری آئینہ داری ہوتی ہے۔

"راجے کی عمر دراز ہو
اُنہیں عقل ملے
اُنہیں عیال ملے
اور وُہ کاغذ کے مزدور کا خاص خیال رکھیں۔"

زندہ کول کے مجموعہ کلام "سمرن" کے دیباچہ نگار ابتدائی دور میں کشمیریوں کے کشمیری زبان سے دوری کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"... ... دل و دماغ پر سینکڑوں برس کی غلامی کے اثرات تھے۔ جن کی وجہ سے پڑھے لکھے لوگ کشمیری کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور بعض اسے زبان ماننے سے بھی انکار کرتے تھے۔ یہی اثر ماسٹر جی پر بھی تھا جس کی وجہ سے انہوں نے بہت دیر تک کشمیری کی طرف توجہ نہ کی۔ لیکن کشمیریوں میں جب اپنی قومیت، تہذیب، زبان اور ادب کا احساس جاگ اُٹھا تو پھر ہمارے یہ شاعر بھی اپنے اصلی رنگ و رُوپ میں آکر کشمیری میں شاعری کرنے لگے۔"

میرے خیال میں یہ دلیل ترمیم کی ناقد کنگدن کے جواز کی نسبت زیادہ معقول اور حقیقت پسندانہ ہے۔ اس کی معقولیت کا اندازہ ہمیں خود زندہ کول کے ایک شعر سے ہوتا ہے جو اُنہوں نے اس خوشی میں کہا تھا کہ بعض لوگ کشمیری میں لکھنے لکھانے کی تلقین کر رہے تھے۔

"کشمیریوں کو مبارک ہو!
اُنہیں کسی نیک رہبر نے کشمیری زبان میں لکھنے کی تلقین کی ہے۔"

ایک اور وجہ بھی ممکن ہو سکتی ہے جس کی موجودگی میں زندہ کول شروع میں کشمیری زبان میں شعر نہ کہہ سکے ہوں۔ وہ اپنی ایک نظم "اپنی بات" میں ایک ہندوستانی اور کشمیری کا مکالمہ پیش کرتے ہیں۔ ہندوستانی کشمیری کو بیداری کا درس دیتے ہوئے اُس کی خاموشی کی وجہ پوچھتا ہے تو وُہ جواب میں کہتا ہے:

"تم سے کیا کہیں ہم بے زبانوں پر کیا گزری ہے؟
ہم سے کہا جاتا ہے کہ بیرونی سازوں پر اپنے راگ گائیں
پر کیا کریں بیرونی زبان ہماری مادری زبان تو نہیں ہے۔"

ظاہر ہے شاعر کو اپنی بے بسی کا رنج ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس کی مادری زبان ایک ایسی زبان بن جائے جسے کاروبار اور بول چال کی زبان کے ساتھ ساتھ ایک مؤثر اور بہتر ادبی زبان کا درجہ بھی حاصل ہو اور جسے اپناتے ہوئے کسی ہم وطن کو عار نہ ہو۔

بہرحال وجہ کچھ بھی ہو، جذبہ کوئی بھی کارفرما ہو، زندہ کول کشمیری میں شاعری کرنے لگے۔ لیکن ان کا کلام ان ہی کی طرح پوشیدہ رہا۔ ان کی تنہا پسندی اُن کے کلام پر بھی اثر انداز ہوتی رہی اور لوگ اس سے متعارف نہ ہو سکے۔ پھر آج سے کچھ سال پہلے ان کا کشمیری کلام "سمرن" کے نام سے دو حصوں میں شائع ہوا۔ لیکن خط دیوناگری تھا اور اس طرح یہ کتابیں بھی گنے چنے لوگوں تک ہی پہنچ سکیں اور زندہ کول کی شاعری عام لوگوں کے لئے ایک راز سربستہ رہی۔ عام لوگوں کی بات رہی ایک طرف، پڑھے لکھے بھی ان کے کلام سے اب اب متعارف ہونے لگے ہیں۔ اس سلسلے میں لالہ رُخ مطبوعات کا یہ کام ایک کارنامے سے کم حیثیت نہیں رکھتا کہ اس ادارے نے اب سے ڈیڑھ دو سال پہلے زندہ کول کے سارے کشمیری کلام کو مقبولِ عام فارسی رسم الخط میں شائع کیا اور اس طرح زندہ کول کو گوشۂ "تنہائی" سے نکال کر بزمِ ادب میں لا بٹھانے کا فریضہ انجام دیا۔ اور اب ہم اس قابل ہیں کہ ان کے کلام کے حسن و قبح کا اندازہ لگا سکیں۔

کرختگی کی متحمل نہیں ہوسکتی ہے۔

باقی رباعیات میں جزو وکُل کی تفصیل، نارائن کی عظمت، قطرے اور سمندر کا ابدی تعلق اور دوسرے صوفیانہ خیالات اور اعتقادات نظم کئے گئے ہیں اور یہ سب اپنی جگہ پر خوب ہیں۔ ان کے حصے کا ناکمل بند بہت ہی اثر انگیز اور زوردار ہے۔ کہتے ہیں :-

وہ لالہ رُخ میری یادوں میں بس گیا
من کا اندھیرا بن سُلگ اُٹھا
میرا خرمنِ حیات جل کر راکھ ہوگیا
پھر دم زدن میں آگ لگی اور پھیل گئی
دِل میں لگی تو جگر تپا اور شور اُٹھا :
آگ ! آگ !! آگ !!!

اس بند میں الفاظ کا انتخاب، خوبصورت امیجری، تخئیل کی اثر آفرینی اور مضمون کی سادگی اور نزاکت اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ زندہ شاعروں میں غالباً رحمان راہی اور دینا ناتھ نادم کے سوا شاید ہی کسی نے اس پایہ کی چیز پیش کی ہو۔ اِدھر یہ کہنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ بعض ستم ظریفوں نے اس بند کو جب یہاں کے بعض اخباروں اور بعد میں ایک کتاب "گائے جا کشمیر" مطبوعہ نیشنل کلچرل فرنٹ میں شائع کروایا تو اس خالص عشقیہ بند کو انہوں نے ایک ایسے انقلابی جذبہ کے معنی پہنا دیئے جس میں طوفانوں کی گھن گرج بجلیوں کی کڑک، بگولوں کی تُندی اور بغاوت کے سیل رواں نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ زندہ کول کی شاعری سے زیادتی کے برابر تھی۔ اُن کی شاعری اس چیز کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اُنہیں اپنے گرد و پیش میں ناانصافی، دولت کی غیر مساوی تقسیم، امیر و غریب کی تمیز اور دوسری سماجی اور معاشی بے انصافیاں نظر آتی ہیں۔ وہ ان چیزوں کا درد بھرے لہجے میں ذکر بھی کرتے ہیں اور ایسے نظام کی خواہش کرتے ہیں :-

"جہاں وسیع و عریض زمین ہے
پانی اور کھیتوں کی بہتات ہے
پھل پھول، گھی، دودھ، شہد اور سب چیزیں میسر ہیں
خُدا کا دیا ہوا سب کچھ ہے
لوگ بانٹتے ہیں۔ چوروں کا نام و نشاں نہیں
سب برابر برابر حصّہ پاتے ہیں
اور ایک دوسرے سے خار نہیں کھاتے
جہاں سب کام میں مگن ہیں
اور فرصت کے لمحات میں ہنسی خوشی اور اپنے محبوب مشاغل
میں مست ہیں ! "

یہ تصوّر ایک سوشلسٹ نظام کا ہے۔ لیکن زندہ کول اس نظام کی تکمیل کے لئے انسان کی محنت، اُس کے عزم اور ارادے کو پسِ پُشت ڈال کر پھر خُدا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ زندہ کول کو اپنے سماج میں بھوکے ننگے نظر آتے ہیں۔ اُنہیں لڑکی کی بے بسی اور بے چارگی کا علم ہے۔ اُسے آسمان سے بم گرتے بھی نظر آتے ہیں اور انسان ایک ننگے وحشی کی طرح ناچتا ہُوا بھی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ان سب چیزوں کے لئے اُس کے پاس کوئی مثبت (POSITIVE) حل موجود نہیں۔ وہ ان تمام چیزوں کا مداوا صرف اُس ملّاح میں ڈھونڈتے ہیں جو کبھی

"ہماری ناؤ کو کنارے لگا دے گا !"

زندہ کول نے اپنی آٹھ سالہ شاعری کے دَوران میں (ان کی کشمیری شاعری کا زمانہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۰ء مقرّر کیا گیا ہے) کافی قابلِ قدر چیزیں لکھیں۔ لیکن اپنی نظموں میں انہوں نے جو زبان استعمال کی ہے وہ قابلِ فہم نہیں ہے۔ اُنہوں نے ہندو اساطیر کے زیرِ اثر بعض ایسی ترکیبیں استعمال کی ہیں جو خالص سنسکرت مزاج کی ہیں اور ان کو استعمال کرتے وقت بھی آپ نے الفاظ کے انتخاب میں بڑی لغزش کھائی ہے۔ اُنہوں نے بڑے کٹھن اور ثقیل سنسکرت اور ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کی بعض اچھی نظمیں بھی (جو صرف چند ہی ہیں) اپنا تاثر اور گہرائی کھو بیٹھتی ہیں۔ "سُمرن" کے ناشروں نے غالباً اس چیز کو محسوس کرکے مشکل الفاظ کے معانی حاشیوں میں دیئے ہیں۔ لیکن اس سے بھی بات نہیں بن سکی ہے اور اصل کے مقابلے میں جب ہم ان نظموں کا انگریزی ترجمہ، جو خود زندہ کول نے کیا ہے، پڑھتے ہیں تو اصل اور ترجمہ کے بیچ میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے جسے ناشروں کے حاشیے بھی پاٹنے میں ناکام رہے ہیں۔ ان کی "لوسن کُن !" (پیار سے) "زادہ" (راجہ) "مُرشدہ شُد تعظیم" (مُرشد کی تعظیم) "جوگی" - "بن کالاں" اور

دوسری نظمیں گو ایک مقصد کے تحت لکھی گئی ہیں لیکن ناموزوں الفاظ کا استعمال اس مقصد کو قاری تک مشکل سے پہنچا سکتا ہے۔ اب ان کی نسبتاً عام فہم نظموں "سِشیناہ وولُن" (برف باری ہوئی) "سونت" (آمدِ بہار) "کانہہ ماساترِہ ژھم" (کوئی دریا کے پار ہونا چاہتا ہے) "کرناوِہ تارکھنا!" (ہاتھی پار لے چل!) اور "مجبوُریاہ" (مجبوری) کو لیجئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں جن الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے وہ عام فہم ہیں، جن تراکیب کا سہارا لیا گیا ہے وہ مانوس ہیں اور اسی وجہ سے ان نظموں کا نیا انداز اپنے اندر ایک رچاؤ لئے ہوئے ہے جو ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔

زندہ کول کی دوسری نظمیں "گیارہ پھول مہجور کی قبر پر" "ایک تصویر" "شاعر کی عظمت" اور "آرزو" ہیں۔ ان کا مطالعہ نسبتاً دلچسپ ہے۔

زندہ کول نے اپنی بعض غزلوں اور نظموں میں نئی ہئیتیں برتی ہیں۔ لیکن اسے شاعر کی مشکل بندی یا محض تجربے کی ہوس کا نام دیا جا سکتا ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

میں اس مضمون کو شاعر کے کلام کے اپی لوگ (حرفِ آخر) پر ختم کرتا ہوں ؎

یار تھاوِن یا مہ تھاوِن کن بوُ چھس آلو دِوان
آلو دِ سِتّی منس کم کاسہ چھم سِتّا نتی اِوان
گرا کھ کا نہہ ما میلہِ نیس میانِس تہ ہکس لاگہِ کونگ
پانپرین نزدیک اِی آسِتا تھوُت کھولم یہ وان

ترجمہ:- وہ سُنے یا نہ سُنے، میں تو اُسے پکارے ہی جاؤں گا
کہ یہی پکار میرے دل کو تھوڑا سا سکون بخشتی ہے
میں نے اس اُمید میں سرزمین زعفران کے نزدیک (شاعری کی) دُکان کھولی ہے کہ شاید کوئی گاہک آئے اور میرے ساگ (شاعری) کو اس قابل سمجھے کہ اُس میں زعفران ڈال دے! (یعنی اس کی قدر کرے!)

گاندھی وچار

- میں ہندوستان کو عروج پذیر دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس سے ساری دُنیا کو فائدہ پہنچ سکے۔
- سب سے پہلے سچائی کی تلاش ضروری ہے۔ پھر خوبصورتی اور نیکی خود بخود حاصل ہو جائیں گی۔
- میں موسیقی اور دوسرے فنون کو عزیز رکھتا ہوں۔
- جمہوریت کے متعلق میرا تصوّرِ جمہوریت کے اس تصوّر کے ساتھ کوئی بھی مطابقت نہیں رکھتا جس میں جسمانی طاقت کے ذریعے لوگوں کو اطاعت کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔
- میں تقریری یا تحریری لفظ کی طاقت سے بڑھ کر قوتِ خیال میں یقین رکھتا ہوں۔

ماسٹر زندہ کول

غزل

کشمیری	اردو
اگر نے آسہے سُوی جانِ جانِ قلبُ رٲنس منز مُنش ہیکہے لبِتھ تس میرِ میوُ حسوی بہالنس منز	اگر وُہ جانِ جان تمام موجودات میں جلوہ گر نہ ہوتا تو کیا آدم اپنے بیرونی حواس سے اُس کا سُراغ پا سکتا تھا؟
یہ کینژھا دون جہانن منز تہٕ انسانس چھُو پانس منز	شش جہات میں جو کچھ بھی ہے۔ وُہ انسان کے اپنے من میں موجود ہے۔
گیُت دریا چھُو قطرن منز تہٕ خرِمن باچھہ دانس منز	دریا قطرے میں سمویا ہوا ہے اور خرمن دانے میں پوشیدہ ہیں۔
چھُو شانِ کبریائی عیب پوشی تے خطا بخشی	کبریائی کی شان عیب پوشی اور خطا بخشی ہے۔
نتہ کانہہ شیخ زاہد پوُرہ اُتر یا امتحانس منز؟	ورنہ کیا کوئی شیخ اور زاہد امتحان میں پورا اُتر سکتا ہے؟
اَچھن یم سُرمہ لاگن خاکِ پائے ولین تہٕ سدھن ہند	جو اپنی آنکھوں میں ولیوں اور بزرگوں کی خاکِ پاء کا سُرمہ لگائیں
تمے ڈیشت ہیکن اَدہ لامکان آمت مکانس منز	وہی لامکان کو مکان میں سموتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔
حقارت کرمہ ہرگز کانسہ یُس کنہٕ جایہ رد بہاسن	کسی کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھ کہ جو کسی جگہ حقیر دکھائی دیتا ہے۔
بیٚن جاین چھُو سُوی مقبول زٹھس کارخانس منز	دوسری جگہ پر وہی انسان محبوبیت کے درجے پر متمکن ہوتا ہے۔
کمالک شعر فہم آسِت کران تنگ بندین واہ واہ۔	اعلیٰ پائے کا شعر فہم ہو کر تنگ بندوں کا دل بھی نہیں توڑتا۔
یمے اطوار اقبالمند چھِ مہربانس منز	ایسے ہی نیک بخت اطوار ہمارے مہربان کے ہیں۔
غزل گو حُسن و عشقا۔ یُس گژھِ شباب پتہ پرانہ ممکن	غزل کے معنی عشق اور حُسن کے ہیں۔ جو شباب کے بعد قصّہ پارینہ ہو جاتے ہیں۔
پنُن نالائقی تو وکن کھٹم پیت عارفانس منز	اپنی نااہلی کو اسی لئے میں نے اس عارفانہ گفتگو میں چھپا دیا۔

نذرِ ساقی

کونین سے بیگانہ بنا دے ساقی ہر پھول کو پیمانہ بنا دے ساقی
میخانے سے باہر نہیں جانا ہے مجھے دُنیا ہی کو میخانہ بنا دے ساقی

جنت کی بہاروں کو چُرا لاتا ہوں حُوروں کی اداؤں کو چُرا لاتا ہوں
میخانے کو مےخانہ بنانے کے لئے دانستہ گناہوں کو چُرا لاتا ہوں

ہر گام پہ گرتا ہوں سنبھل جاتا ہوں ساقی جو نہ دے مے تو مچل جاتا ہوں
کہتا ہوں بس اِک جام، مِلا کر نظریں دے دے تو خرابات سے ٹل جاتا ہوں

غم اُس کی جُدائی کا ستاتا ہے مجھے ماضی کے دھندلکوں میں بُلاتا ہے مجھے
احساس نے بدلی نہ ہو کروٹ ساقی ہر جام کہ پھر ہوش سا آتا ہے مجھے

ہر مرحلۂ دہر کو آساں کر لوں مرنے کے لئے جینے کے ساماں کر لوں
چلتا ہوں مگر چلنے سے پہلے اے موت پیمانے کے ہر خط کو رگِ جاں کر لوں

پھر حافظ و غالب کو جوانی دے دوں خیام کو پھر قالب ثانی دے دوں
اِک پل کے لئے میں جو خدا ہو جاؤں دُنیا کو بس انگور کا پانی دے دوں

شکیل الرحمٰن

روشؔ صدیقی ـــــ محرابِ غزل کے آئینے میں!

غزل کی بات جب بھی آئی ہے میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے اور یہی محسوس کیا ہے کہ غزل کو ہمارے قومی مزاج سے اتنی ہم آہنگی ہے کہ ہم اپنے بہت سارے مسائل پر اس کی تیز روشنی ڈال سکتے ہیں اور مطمئن ہو سکتے ہیں۔ غزل ہماری شاعری کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اس میں اعلیٰ قسم کی شاعری ہوئی ہے اور پُرعظمت خیالات سموئے گئے ہیں۔ میں اس حقیقت کا بھی قائل ہوں کہ اجتماعی زندگی کے آہنگ اور اقدار کا اثر غزل پر ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ قومی زندگی کے بھرپور مطالعہ اور اس کے ارتقا پر گہری نظر سے جو سوز و گداز داخلی زندگی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سوز و گداز سے نشاط اور نکھار کو حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ غزل میں سوز و گداز کی بات جب بھی آتی ہے میں داخلیت کے اس پہلو پر بھی سوچنے لگتا ہوں جس پہلو میں نشاط کا رنگ و روپ ہوتا ہے۔ اپنے طور پر یہی سمجھتا ہوں کہ غزل، کیف اور ارفعیت کے لئے شاعر کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کا سوز و گداز حاصل کرنا چاہیئے۔ زندگی کو سمجھنے کی کوشش ہی زندگی کو بھرپور بنا سکتی ہے۔ حوصلہ شکن عناصر سے کوئی شاعر داخلیت نشاط اور سوز و گداز کو حاصل نہیں کر سکتا اور اس طرح غزل میں پُرعظمت خیالات اور انسانی جذبات و احساسات، کیفیات اور واردات کی رعنائیوں کو شامل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ موضوع کی دلربائی، چبھن، اس کا رسیلا پن اور اس کی کسک جس کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہوتا ہے، غزل میں سینکڑوں گلاب کھلا دیتی ہے۔ روشؔ صدیقی کی غزلوں میں جو سوز و گداز ملتا ہے اس میں سطحیت اور مبالغہ انگیزی نہیں ہے غم اور نشاط کا ایک نیا روپ ہے، ایک نئی منزل اور ایک نئی شکل ہے۔ روشؔ کے شدتِ احساس کو سمجھنے کے لئے ان کے لب و لہجہ کو اس طور پر بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ زندگی کے مشاہدے اور داخلی زندگی کے اُبال سے زندگی کا نقطۂ نظر سامنے آجائے۔ روشؔ صدیقی داخلی احساسات کے شاعر ہیں۔ لیکن انہیں داخلی احساسات کا شاعر سمجھتے ہوئے یہ بھی سوچنا ہے کہ ان کے یہاں داخلی محسوسات کی پختگی کا اعلان اس وقت تک نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ ان کے سوز و گداز میں صداقت اور تاثیر کے جادو کا تجزیہ نہ ہو اور مزاج اور طبیعت کی کیفیت کو بدلتی ہوئی سماجی اور اخلاقی قدروں کے تیور کے قریب اپنی نرمی، گھلاوٹ اور بے ساختگی کے ساتھ دیکھا نہ جائے۔ روشؔ صدیقی غزل کے متعلق سوچتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ حق گوئی کا ہوش غزل کی وجہ سے قائم ہے اور یہ بھی کہتے ہیں ؎

نکہتِ زلفِ پریشاں کا سہارا لے کر
نہ کہیں دوشِ تغافل پہ بکھر جائے غزل

حق گوئی اور صداقت کو وہ کیا سمجھتے ہیں اور غزل کی غنائی کیفیت کو کس طرح سنبھال کر رکھنا چاہتے ہیں اس کی تلاش ان کے کلام میں ضروری ہے۔ اسی سے ایک طرف حیات کی گوناگوں تصویروں اور فن کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش دیکھی جا سکتی ہے اور دوسری طرف، غزل کے کردار اور جمالیاتی حسن کا بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے یہاں بہت کم ایسے غزل گو شعرا ہیں جن کے یہاں دل، دل کی آگ میں گداز ہوا ہے اور مشاہدہ کے لئے ایک ماحول بن گیا ہے اچھے شاعروں کے یہاں بھی یہ ماحول نہیں بن پاتا۔ روشؔ صدیقی کے یہاں بھی یہ ماحول نہیں ہے۔ سانس لینے کی ایک فضا ضرور تخلیق ہوئی ہے وہ اپنی جذباتی صلاحیتوں سے خوب متاثر کرتے ہیں۔ اس لئے کہ حالات نے انہیں جذباتی طور پر بہت بیدار کر دیا ہے۔ ان کے خیالات کے ذرائع موجود ہیں۔ وہ ان سے اور بھی فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ غزل کی روایت سے مکمل واقفیت اور نئے تقاضوں سے ان کے یہاں ایک پیغمبر کی زبان بھی پیدا ہو سکتی تھی لیکن زندگی کبھی ایک بڑا سوال بن کر ان کے سامنے نہیں آئی اور انہوں نے حیات کو کسی مسئلہ کا حل نہیں سمجھا۔ جس شاعر کے پاس غزل کا اتنا سرمایہ

موجود ہو۔ اس سے اس کی بھی اُمید ہوتی ہے کہ وہ زندگی کو ایک اہم سوال سمجھ کر اس کا جواب تیار کرے۔ غزل کے سوز و گداز اور عشق کی نفسیات کا یہ ایک بہت بڑا تقاضا ہے۔ بہت پہلے روش نے اس کا اقرار کیا تھا ؎

غلط نہیں ہیں زمانے کے شکوہ ہائے دراز
وہاں سے دُور رہے ہم جہاں زمانہ تھا

لیکن کچھ عرصہ بعد انہوں نے زندگی کی اُداسیوں کو سمجھ کر اپنے اُٹھتے ہوئے قدم کو سنبھالا ؎

خزاں کے ساتھ بہت دُور مجھ کو جانا ہے
نہ انتظار کرے محفلِ بہار مرا

روش کے یہاں جو مخصوص فضا ہے اس میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے سامنے حُسن و جمال اور عشق و محبت کی ایک دُنیا آباد ہے۔ اور وہ اس دُنیا کا تجزیہ کرنے سے قبل اپنی رُوح کو ٹٹولنے کی کامیاب کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی غزلوں کا سارا جلال اور جمال یہاں موجود ہے:

- تجھ سے مل کر ایک مبہم سا خیال۔ رفتہ رفتہ جدا ہو گیا ہوتا [illegible]

- حُسنِ خود بیں کو ازل سے تھی کسی کی جستجو
زندگی نے کیوں مری جانب اشارہ کر دیا؟

- غنیمت ہیں مری بربادیاں بھی
سکھایا ہے تجھے دامن بچانا

- بہت وُسعت ہے دامانِ نظر میں
کسی کی کم نگاہی کا گلا کیا!

- کہاں خود فراموشیوں سے نجات
تجھے بھول جانا تو مشکل نہ تھا!

اپنے دل کی کیفیتوں کو جس طرح سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اس میں ان کی شوخی سادگی کا رُوپ لے لیتی ہے اور ان کے البیلے پن کی شان نظر آتی ہے:-

- اجنبی کرتے ہیں تیرا ذکر کس اخلاص سے
دیکھتا ہوں آج تیرا درد بیگانوں کے پاس

- جو میں کرم نہ سمجھتا ترے تغافل کو
تو بار بار یہ دِل مجھ سے بدگماں ہوتا

- وہیں تک زبوں حال تھی زندگی
جہاں تک ترا درد شامل نہ تھا

روش غم کو کوئی ایسی چیز نہیں سمجھتے جو ناقابلِ برداشت ہو۔ ان کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ وہ محبت کی دُنیا میں مبالغہ سے دُور رہتے ہیں۔ تازگیٔ دلِ شبنم لے کر غم کی جھلسی ہوئی راہوں سے گذر جانے کی بات اسی وجہ سے ان کے یہاں پیدا ہوئی ہے۔ جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والی تاثیر کی شدت کو جو خلوص ملا ہے اس کی بھی وجہ یہی ہے۔ ان کی طبیعت میں بجھی ہوئی کیفیت نہیں بلکہ وہ کیفیت ہے جو غم کے درد سے پیدا ہوئی ہے اور اپنے وجود کا بار بار احساس دلاتی ہے۔ غزل کی ہیئت کے وجود کا بھی تو احساس اسی سے بڑھتا ہے اور جمالیاتی ہیئت کے متعلق غور کرنے اور سوچنے کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ روش کے کلام سے اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ ان کا غم کبھی عیش کی صورت اختیار نہیں کرے گا۔ ان کے غم میں کائنات کے غم کی [illegible] بھرپور طریقہ سے نہیں تو کچھ نہ کچھ موجود ضرور ہے۔ غم کا سرور اور غم کا شعور دونوں ہے۔ وہ غم میں روتے نہیں اور نہ داستانِ غم سُننے کو تیار رہتے ہیں۔ ان کے لہجہ میں جو ادا سی پیدا ہو جاتی ہے اسی سے ان کے غم کا اندازہ ہو جاتا ہے اور یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ان کا عشق وہ کردار پیدا کر لے گا جس سے غم ایک انوکھے اور البیلے تجربہ کی صورت میں سامنے آئے گا۔ انفرادی غم کو جس آنچ اور شدت کی ضرورت ہے وہ ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ ؎

بہار آتے ہی مجھ کو اپنے ویرانے کی یاد آئی
خزاں جب تک رہی دل تھا نگہبانِ چمن میرا

زندگی صبحِ قیامت سے بھی کیا ہو اُمید
کس نے دیکھا ہے مآلِ غم شب ہائے فراق

غمِ جاناں ہی سے ہو گا غمِ جاناں کا علاج
درد ہی درد ہے اس دردِ فراواں کا علاج

تازگیٔ دلِ شبنم لے کر
غم کی جھلسی ہوئی راہوں سے گذر
کشمکشِ رنج و مسرت سے دُور
رہیئے ہر اِک محفل و خلوت سے دُور

• وہیں لٹ گیا، کاروانِ حیات
جہاں سے ترا غم جدا ہو گیا

محبت انہیں جینا سکھاتی ہے۔ زندگی اور زمانہ سے جب بھی نفرت ہوئی محبوب نے اپنی جھلک دکھادی اور تمام اداسی اس طور پہ سامنے آگئی کہ اسے دور کیا جائے۔ اس سے منہ پھیر کر فرار حاصل کرنے کی کوشش نہ ہو سکی

چلے تھے زمانے سے منہ پھیر کر
یکایک ترا سامنا ہو گیا

اور یہی وجہ ہوئی کہ انہیں زندگی پہ سایۂ گیسوئے دوست کا گمان ہونے لگا۔ ان کی پلکوں پہ آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ رہا اور افسردہ ستاروں کو دیکھ کر یہ سوچنے لگے کہ ان کا غم تو انہیں زندگی سے محبت سکھاتا ہے۔
اور پھر وہ یہ کہہ اٹھے کہ ؎

یہ بھی ہے شاید فریب آگہی
کون تجھ سے بے خبر ہونے لگا

اور :- وہیں تک زیاں حال تھی زندگی
جہاں تک ترا درد شامل نہ تھا

روش صدیقی محبوب کی جھلکیاں ضرور دیکھتے ہیں اور ان کا ان پر اثر بھی ہوتا ہے لیکن وہ اس سے بھی زیادہ کچھ اور چاہتے ہیں۔ "انجمن ہوش" میں محبوب کو اس لئے بلاتے ہیں کہ "قصۂ طور" کا عنوان بھی بدل جائے۔ اور ان کے محبوب کو کوئی تکلیف بھی نہ ہو۔ ان کے عشق کو محبوب کی تکلیف گوارا نہیں ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ محبوب کے احساس کو اس طرح کسی قسم کی تکلیف پہنچے۔ محبوب کی آن کو برقرار رکھتے ہوئے وہ اپنی دنیا اور اپنے راستے روشن کرنا چاہتے ہیں، کتنا گداز اور کتنا بانکپن ہے اس خیال میں کہ

ترے احساسِ تغافل کو خبر تک بھی نہ ہو
یوں بھی اک روز مری خلوتِ خاموش میں آ

اور جب محبوب کو ان کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تو وہ چونک پڑتے ہیں اور یوں پوچھنے لگتے ہیں ؎

تغافل میں بھی اس قدر احتیاط؟
تری بے نیازی کو کیا ہو گیا ہے؟

بعض وقت ذوقِ جستجو میں وہ کسی کے تغافل کی بھی پروا نہیں کرتے اور تنہا ہی بڑھنے لگتے ہیں۔ لیکن اس کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ انہیں اپنے راستے پر کسی کے سہارے کی ضرورت ہے۔ کہنے کو تو وہ یہ بھی کہہ دیتے ہیں ؎

چلا ہے لے کے مجھے ذوقِ جستجو میرا
اب انتظار کر اے جانِ آرزو میرا

لیکن اپنے محبوب کے دیئے ہوئے غم کا احترام بھی تمام عمر کرتے رہتے ہیں اور محبوب کے غم کو اپنا راز سمجھتے ہیں اور اس راز کو اپنے کلام میں کہیں بھی ظاہر نہیں کرتے۔ کچھ اس طرح چھپائے رہتے ہیں جیسے انہیں کسی کو شریکِ غم بنانا پسند نہ ہو۔ محبوب کی زلفوں کے گھنے سایے میں سانس لئے [illegible] "زندہ سود و زیاں ہوتا ہے" اور اس کی آنکھوں سے زندگی کا ایاغ [illegible] بھی ہنس کر اٹھالیا جاتا ہے۔ ان کے محبوب کے تصور میں جاں بخشی ہے۔ اس کا شدید احساس روشن صدیقی کو بھی ہے۔ انہیں اتنا اعتماد ہے کہ وہ غمِ دوراں غمِ جاناں سے گذر کر ہر غم کو شریکِ غمِ انسان کرنا چاہتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ یہ کام ان کے محبوب ہی سے ہو سکتا ہے۔ معشوق کے لب و لہجہ اور اس کی گفتگو سے روش کے سامنے حیات کی تہیں کھلتی جاتی ہیں۔ وہ اسرار و رموز سے آگاہ ہوتے جاتے ہیں۔ کسی شے کی جستجو میں محبوب کی آواز سے اور بھی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک گلاب کی تلاش یا ایک گلاب کی خواہش سینکڑوں گلاب کے دامن بھر لینے کے لئے اکسانے لگتی ہے۔ عاشق کو اپنے فکر و نظر پر فخر ہے لیکن جب وہ کوئی مسئلہ محبوب کے سامنے پیش کرتا ہے تو باتیں اور بڑھ جاتی ہیں اور فکر و نظر میں محبوب کے جواب سے اور بھی وسعتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ محبوب کے ایسے کردار پر اردو غزل کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ روش کے سوز و گداز میں اس کردار سے بڑی بات پیدا ہو جاتی ہے۔ عشق اور غم پہ یاس اور تشنگی کا رنگ نہیں ہے اور داخلی پسپائیوں کی کوئی تصویر نظر نہیں آتی ہے۔

روش صدیقی کے بہت سارے اشعار ایسے ہیں جن میں اپنے دور کی آواز اور گونج سنائی دیتی ہے۔ ایسے جذبات اور احساسات ہیں جنہیں ہم اپنے عہد کا رنگ و روپ کہہ سکتے ہیں۔ مثال کے لئے چند اشعار دیکھئے۔

• زندگی سر بہ گریباں غمِ تدبیر میں ہے
خوابِ آدم ابھی گہوارۂ تعبیر میں ہے

حال پوچھا ہے کسی نے تو یہ ہے رنگِ بیاں
جیسے صدیوں کی خموشی مری تقریر میں ہے (۱۹۴۶ء)

صاف کہنے پہ ہوں مجبور میں اے بادِ صبا
تیرے گلشن پہ ہے سایہ ابھی زندانوں کا (۱۹۴۸ء)

ابھی آزادیٔ انساں ہے فریبِ انساں
دلِ انساں ہے نشانہ ابھی انسانوں کا (۱۹۴۸ء)

ابھی خاکِ چمن کو ہے خود اپنا رازداں ہونا
خزاں کا سوزِ دل لیکر چمن کا پاسباں ہونا (۱۹۴۹ء)

ٹھہر اے جادہ پیما! رازِ منزل تجھ کو سمجھا دوں
غبارِ کارواں ہونا ہے خضرِ کارواں ہونا (۱۹۴۹ء)

یہ کیوں رقصِ صبا پر لالہ و گل چاک داماں ہیں
ذرا کچھ سوچ کر اہلِ جنوں سے بدگماں ہونا (۱۹۴۹ء)

آساں تو ہے جوئے شیر ــــ لیکن
کچھ اور ہی عزمِ کوہ کن ہے (۱۹۵۱ء)

ہے خاکِ پائے غریباں جنہیں فروزِ حیات
مہ و نجوم زمیں پر کمند ڈالیں گے (۱۹۵۱ء)

ستاروں پر مدارِ رہبری تھا ظلمتِ شب میں
قریبِ صبح خضرِ کارواں کی آزمائش ہے (۱۹۵۲ء)

کہاں کا سبزۂ بیگانہ کیسے لالہ و ریحاں
چمن والو! یہ سارے گلستاں کی آزمائش ہے (۱۹۵۲ء)

بہت ہی سرگراں ہیں شعلہ ہائے شمعِ آزادی
روشؔ اب دامنِ ہندوستاں کی آزمائش ہے (۱۹۵۲ء)

زندگی نام ہے طوفانِ حوادث کا روشؔ
ننگِ ساحل تھے وہ جس کو کوئی طوفاں نہ ملا (۱۹۵۳ء)

اجتماعی زندگی کے آہنگ اور للکار کا اثر یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ روشؔ صدیقی نے روایات اور قومی زندگی کے ارتقاء پر گہری نظر کا مطالعہ پیہم کرتے رہیں گے۔ آج بھی زندگی کو ایک سوال پیش کر شاعر کے سامنے آتا ہے تاکہ تغزل میں گہری تشنگی کے ساتھ حیات کا سوز و گداز بھی صحیح معنوں میں حاصل ہو جائے۔ روشؔ کے پاس غزل کی وہ زبان موجود ہے جس کے سہارے پُرعظمت خیالات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جو ارتقاء ہے اس سے یہی اُمید ہوتی ہے کہ ابھی اور سینکڑوں نکہتوں سے معطر منازل آئیں گے۔ انہوں نے اپنی محنت اور ریاضت سے وہ مقام حاصل کر لیا ہے جہاں سے بلندیوں پر جانے کے راستے نزدیک ہو جاتے ہیں۔ ان کی طبیعت اور مزاج کو بدلتی ہوئی سماجی اور اخلاقی قدروں کے بہت قریب آتا ہے۔ عوامی زندگی کا مطالعہ ہی مواد کی نئی صورتوں کو پیش کرتا ہے۔

روشؔ کی غزلوں میں طنز کی وجہ سے بھی ایک خاص قسم کی گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ شراب، مے خانہ، حرم، بُت خانہ، شیخ، زاہد اور واعظ سے انہوں نے نئی باتیں کی ہیں اور بھرپور طمانچے لگائے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار سے طنز کی گہرائی کا بھی احساس ہوتا ہے:-

شبِ بہشت کا دیکھا ہے خواب واعظ نے
شبِ بہشت کہاں زلفِ مشکبو کے سوا
گماں بادۂ عشرت مرے سبو پہ نہ کر
ہے اس میں زہر بھی شامل مرے لہو کے سوا
ہے میکدے سے یہ کیوں تجھ کو اجتناب روشؔ
یہاں کچھ اور بھی ہے بادہ و سبو کے سوا

•

حرم تک ایک خاموشی ہے طاری
یہ بت خانے میں کل مذکور کیا تھا

زاہد حدودِ ہوش و خرد میں رہا اسیر
ناداں نے زندگی ہی کو زنداں بنا دیا

حرم سے لاکے جلائی ہے شمع واعظ نے
بجھا بجھا سا چراغِ شراب خانہ تھا

تری خود داریوں پہ طنز بھی ہے
مرا اک اک قدم پر لڑکھڑانا

آدمیت سے فرشتوں سے بہت دور روشؔ
واعظِ شہر کو دشوار ہے انساں ہونا

•

سماجی اور معاشی قوتیں بہت کچھ کہنے پر مجبور کرتی ہیں (بقیہ صفحہ ۴۳ پر)

روشن صدیقی

غزل

کسی سے کام نہ رکھ ذوقِ جستجو کے سوا
کہیں قیام نہ کر شہرِ آرزو کے سوا

شبِ بہشت کا دیکھا ہے خواب واعظ نے
شبِ بہشت کہاں زلفِ مشکبو کے سوا

ملے گی کیا مرے ذوقِ نگاہ کو تسکین
بہار کیا ہے حجاباتِ رنگ و بو کے سوا

وہاں ہزار تغافل، شریکِ نازِ سکوت
ہزار شوق یہاں شوقِ گفتگو کے سوا

گمانِ بادۂ عشرت مرے سبو پہ نہ کر
ہے اس میں زہر بھی شامل مرے لہو کے سوا

خطا معاف، مری لغزشوں کا محرمِ راز
کوئی نہیں، ترے لطفِ بہانہ جو کے سوا

ہے میکدے سے یہ کیوں تجھ کو اجتناب روشؔ
یہاں کچھ اور بھی ہے بادہ و سبو کے سوا

احمد رضا

ادب میں ہوٹنگ کا مقام

ہو سکتا ہے کہ اس عنوان ہی کو دیکھ کر آپ میں سے بعض حضرات اور خواتین سوچیں کہ میں بڑا بے ادب ہوں۔ ادب کی محفل میں بے ادبی کی بات کر رہا ہوں۔ مگر ادب حکیم بو علی سینا کا لکھا ہوا کوئی نسخہ نہیں ہے کہ اس میں کوئی ترمیم ہی نہ ہو سکے۔

ابھی چند سال قبل کی بات ہے کہ نظم کو شاعری تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا تھا بعض نقادوں کی تنقید کی بنیاد پر کھڑی کی گئی تھی۔ وہ نظم کا حصہ [illegible] رہے ہے۔ مگر برف اور سورج کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ [illegible] تنقید نظم کے سورج کی حرارت کے سامنے چند [illegible] نظم صنفِ سخن قرار پائی اور اب تو [illegible] ہیں۔ اور ان پر شاید کے بھی نہیں!

عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اور زمانے کی ترقی کے ساتھ جہاں زندگی کے تمام شعبوں میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ کچھ چیزیں چھانٹ دی جاتی ہیں۔ کچھ شامل کر لی جاتی ہیں وہاں ادب میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اور ادب میں بھی چند چیزیں چھانٹ دی جاتی ہیں۔ اور چند چیزیں شامل کر لی جاتی ہیں۔

جب بادشاہ لوگ ہوا کرتے تھے تب ایک صنفِ سخن ایجاد ہوئی۔ جسے ہم آپ قصیدہ کہتے ہیں۔ قصیدہ کے توڑ پر کچھ سر پھروں نے ہجو ایجاد کی۔ اسی طرح غزل کی ضرورت پیش آئی کہ اس سے پہلے غالباً لوگوں کا خیال یہ تھا کہ عورتوں سے معمولی زبان میں بات چیت نہیں کی جا سکتی۔ اور پھر عورت بھی معمولی نہیں۔ خاصی کسرتی تھی کہ اسے "ترک بچہ" اور "جلاد" اور اسی قسم کے دوسرے لقب سے یاد کرنا پڑتا تھا۔ اور کبھی کبھی تو یہ عورت اتنی تندرست ہو جاتی تھی کہ شاعر کو شکایت کرنی پڑتی تھی۔

کیسے فتنے ہو کر اٹھتے نہیں گھر سے اپنے
کیا ستم ہے کہیں چلتے نہیں جلاد ہو کر

اور پھر یہ عورت ذرا جانب دار بھی تھی کہ عاشقانِ وفا پیشہ کو قدم قدم پر اس سے شکایت کرنی پڑتی تھی۔

غیر کیا ہم کیا ستمگر قتل کرنا چاہیئے
جب اٹھائی ہاتھ میں تلوار دونوں ایک ہیں

ادبی اس زمانہ میں شاعری کرنا بھی خاصا جان جوکھم کا کام تھا۔ معشوق ہمیشہ ہاتھ میں ننگی تلوار لئے گھوما کرتا تھا۔ اوروں سے کچھ نہیں بولتا تھا۔ بلکہ ان سے تو مسکرا کر ہاتھ بھی ملا لیتا تھا۔ معانقہ بھی کر لیتا تھا۔ مگر ادھر کوئی عاشق نظر آیا کہ تلوار چلی، قصہ ختم ہوا۔ اب عاشق کے دوست احباب آئیں اور لاش اٹھوائیں۔ کبھی کبھی بیچارے عاشق کی لاش کو اپنے دوستوں کو آواز بھی دینی پڑتی تھی!

اب ایسے میں بیچارے شعرا اگر زبانِ غزل ایجاد نہ کرتے تو کیا کرتے! معشوق کا دربان بھی جانب دار، بے وقوف اور ظالم ہوا کرتا تھا۔ اس نے غالب جیسے شاعر کا بھی خیال نہیں کیا۔ اور غالب کو کہنا پڑا۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

ان حالات میں غزل صنفِ سخن قرار پائی۔ پہلے صوفیوں اور اب ترقی پسند شاعروں نے اس غزل کی مٹی پلید کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مگر اس نے جب اس "تندرست عورت" کے وار سہہ لئے تو صوفیوں اور ترقی پسندوں کی کیا حیثیت ہے!

تعمیر
فروری ۱۹۵۷ء

اب بھی قریہ قریہ آپ کو "غزل گو اور غزل گا" شعراء کی اچھی خاصی تعداد مِل جائیگی۔

تو جب کل آپ نے غزل کو صنفِ سخن ہونے سے نہیں روکا۔ اور نظم کے لئے آپکو ادب کے شیش محل کا دروازہ کھولنا پڑا۔ تو اب وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم ہوٹنگ کو بھی ایک باقاعدہ صنفِ سخن کا درجہ دیں کہ یہ اس کا حق ہے!

اس میں شک نہیں کہ ہوٹنگ ابھی تجربہ کے دَور میں ہے۔ مختلف لوگ مختلف قسم کے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ ایک مشاعرہ میں میں خود موجود تھا۔ ایک ہوٹنگ کرنے والے کا انداز دیکھکر مکرر ارشاد کہنے کو جی چاہنے لگا۔

ہوا یہ کہ ایک صاحب جامہ دار کی خوبصورت شیروانی پہنے ایک نہایت بدصورت قسم کی غزل سنا رہے تھے۔ لوگ نہ معلوم کیوں انہیں برداشت کئے جا رہے تھے۔ آخر ایک دیوانے سے نہ رہا گیا۔ اس نے تعریف کی۔ ان شاعر صاحب نے زانوؤں کی تہ کھول کر کہا آداب بجا لاتا ہوں۔ اس نے بھی فوراً کہا - اخاہ آپ ہیں۔ کہئے مزاج اچھے ہیں؟ اس ایک جملہ نے تمام سامعین کو اس خوبصورت شیروانی والے شاعر کی پوری بدصورت غزل سننے سے بچا لیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وُہ شاعران پہلوانوں میں سے تھا جو دوغزلہ اور کبھی کبھی سہ غزلہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔

ہوٹنگ کے بھی کئی مدرسے ہیں۔ ایک مدرسۂ خیال علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہاں سے بہتر اجتماعی اور انفرادی ہوٹنگ دُنیا کے نقشہ کے کس حصّہ میں ہوتی ہے۔ مجھے خود چونکہ ہوٹنگ کا شوق ہے اس لئے میں اس بات کو غور سے دیکھتا ہوں۔ کہ کہاں کے لوگ کیسی ہوٹنگ کرتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ علی گڈھ والوں کی ہوٹنگ کا کوئی جواب نہیں ہے۔

وہاں بھی کئی قسم کی ہوٹنگ ہوتی ہے۔

ہوٹنگ کی ایک قسم کا نام ہے رشید احمد صدیقی! ان کے بارے میں تفصیل سے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ لوگ انہیں جانتے ہوں گے۔ لیکن ہوٹنگ کے اس خدا وند تعالےٰ کی خدائی اب زوال پر ہے کہ ان کے قلم کا نب گھس گیا ہے!

مدر یونین اگر ایک طرف یونی ورسٹی کی مختلف یونینوں کی ماں ہے تو مدر یونین کا ہال ہوٹنگ کی ماں ہے! میں نے ایک بار یونی ورسٹی کے ایک مشہور مقرر سے پوچھا کہ آخر اتنے ہنگامے میں اس نے اتنی اچھی تقریر کیسے کی۔ وُہ مسکرا دیا۔ کہنے لگا تقریر کس نے کی۔ اتنے شور میں نج حضرات سن کیا سکتے تھے۔ اسلئے میرے منہ میں جو آ رہا تھا میں کہتا جا رہا تھا۔ ہاتھ البتہ خوب ہلا رہا تھا۔ حد یہ ہے کہ انگریزی کی اس ڈبیٹ میں میں اُردو بول رہا تھا کہ اُردو بولنا میرے لئے انگریزی بولنے کے مقابلہ میں آسان ہے۔

اب بتایئے مجمع نے اسے ہوٹ کیا کہ اس نے مجمع کو، اسے کہتے ہیں کلاسیکل ہوٹنگ۔ اس ہوٹنگ سے انسان کے جوہر کھُلتے ہیں۔ اس کی حاضر دماغی کا پتہ چلتا ہے۔ اب اگر کوئی چیز انسان کا جوہر کھولنے میں مدد دے تو آپ اسے بے ادبی کیسے کہہ سکتے ہیں۔ نہیں کہہ سکتے جناب۔ ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

ھوٹنگ کرنے کا ایک اور طریقہ میں نے علی گڈھ میں دیکھا۔ آپ اگر بور کر رہے ہیں تو اسٹریچی ہال کے کسی گوشے سے کوئی ایک لڑکا آپ پر آواز کسے گا۔ اور پھر آدھا مجمع اس کی طرف منہ کر کے بور بور چلانے لگے گا۔ وُہ لڑکا بور ہو یا نہ ہو آپ ضرور بور ہو جانے سے بچ جائیں گے۔

یہ تو مشتے از خروارے ہے۔ میں مثال دیکر اس مضمون کی طوالت میں ناجائز اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ میرے ایک سرینگر کے دوست ہیں جنہیں ہوٹ کرنے میں یہ کمال حاصل ہے کہ کہ آدمی موجود ہو یا نہ ہو وُہ اسے ہوٹ کر دیتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں ڈاک کے ذریعہ ہوٹ کرنا۔ مگر ہوٹنگ کا یہ طریقہ بغیر مثال کے آپ کی سمجھ میں نہیں آئیگا۔

میں ایک رہنمان کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ وُہ اُردو کے ایک مشہور نقاد کے ایک مضمون کا مسوّدہ دیکھ رہے تھے۔ وہ مضمون اُردو کے ایک مشہور قدیم شاعر پر لکھا گیا تھا۔ فاضل ناقد نے اس شاعر کے کلام سے بہت سی مثالیں دے ڈالی تھیں۔ ان حضرت نے کیا کیا، کہ مضمون کو جوں کا توں رہنے دیا اور مثالیں کاٹ ڈالیں۔

فاضل مضمون نگار جب اپنا مضمون دیکھیں گے تو اپنی مثالوں کے غائب ہو جانے پر افسوس کرینگے۔ مگر آپ دیکھئے نا کہ مثالیں تو کوئی دیوان سے بھی نکال سکتا تھا۔ پڑھنے والے کو مثالوں کی ضرورت کم اور

مضمون کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے!

میرے ایک کشمیری دوست بھی ہوٹنگ کا ایک مدرسہ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد ادبی دُنیا ان کے اس جوہر سے واقف ہو اور یہی فاضل مضمون نگار ان پر ایک مضمون لکھیں جس میں وُہ خود اس واقعہ کو نقل کریں کہ مرحوم نے انہیں بذریعہ ڈاک کس طرح ہوٹ کیا تھا!

اسی طرح ہوٹنگ کے اور بہت سے سکول ہیں۔ میرے خیال میں جتنے مدرسہ ہائے خیال ادب کے ہیں، شاید اتنے ہی مدرسہ ہائے خیال ہوٹنگ کے بھی ہیں۔ اب میں ان کا ذکر کہاں تک کروں۔

میں ہوٹنگ کو ناپسندیدگی کے اظہار کا ایک صحت مند اور عوامی طریقہ سمجھتا ہوں۔ اگر آپکو یہ مضمون بُرا لگ رہا ہو تو آپ مجھے بھی ہوٹ کر سکتے ہیں۔ اور آپ مجھے اس طرح ہوٹ کر سکتے ہیں کہ اس مضمون کو یہیں سے پڑھنا بند کر دیں۔ اور اس رسالہ کے ایڈیٹر کو فوراً ایک خط لکھیں کہ وہ ایسے مخربِ اخلاق مضامین کیوں شایع کرتا ہے۔ میں خود بھی لوگوں کو ہوٹ کرتا ہوں۔ اور جب مجھے ہوٹ کیا جاتا ہے تو میں اس کا بُرا نہیں مانتا۔

ہوٹنگ اور شاعری کا رشتہ خاص طور پر بہت اہم ہے۔ بلکہ یہ رشتہ اٹوٹ بھی ہے۔ اور جو لوگ اس اٹوٹ رشتے کو توڑنا چاہتے ہیں وُہ شاعری اور شاعر اور شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے والوں کے دشمن ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ آپ میں سے کچھ حضرات اور بعض خواتین کو میری یہ بات عجیب معلوم ہو۔ اس لئے میں ذرا وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

شاعر کی انا کی شہرت تو آپ تمام لوگوں نے سُنی ہوگی۔ چند سطری گلی نظمیں لکھ کر وُہ اقبال سے آنکھیں ملانے لگتا ہے۔ چند لغو قسم کی غزلیں لکھ کر وُہ میر و غالب کو گردانتا ہے اور چند بازاری شعر لکھ کر وُہ اکبر سے بڑھ جانے کا دعویدار ہوتا ہے۔ اور پھر وُہ یہیں پر بس نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں اس کے علاوہ باقی تمام شعرا دوسروں سے شعر لکھواتے ہیں!

شاعروں کی انا ہی کی طرح ان کے پیٹ کا درد بھی کافی مشہور ہے۔ افسوس کہ میڈیکل سائنس کی ترقی کے اس عہد میں بھی اس درد کا علاج نہ مل سکا۔

شاعر کے پیٹ کا یہ درد بڑھ کر جب لوگوں کے سر کا درد بن جاتا ہے تو یہ درد ایک سماجی بیماری کی جگہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس لئے عام لوگوں کو اس کا حق ہے۔ بلکہ میں تو کہونگا کہ ہر ایماندار شہری کا یہ قومی فریضہ ہے کہ وُہ گربہ کشتن روز اول کا ورد کرنے لگے۔ آپ نے اس راجا کا قِصّہ تو سُنا ہی ہوگا جس کے سر پر دو سینگیں تھیں۔ پیٹ کے ہلکے پن نے بتّن حجام کو پھانسی کے تختہ پر پہنچا دیا۔

قِصّہ یہ ہے کہ ایک راجا کے سر پر دو سینگیں تھیں۔ بتّن حجام نے حجامت بناتے بناتے۔ راجا کے سر کے امریکہ کو دریافت کر لیا۔ راجا نے کہا کہ اگر یہ بات کسی کو معلوم ہوئی تو بتّن کی زندگی کی خیر نہیں ہے۔

چند دن تو بتّن نے صبر کیا۔ مگر جب پیٹ کا درد بہت بڑھا تو اس نے ایک درخت سے لپٹ کر کہہ دیا کہ راجا کے سر پر دو سینگیں ہیں۔ بات آئی گئی ہو گئی مگر بات آئی گئی کہاں ہوئی۔ وُہ درخت کٹا اور ساز دل کے بنانے میں استعمال کیا گیا۔

تمام راجاؤں کی طرح اس راجا کو بھی رنڈیوں کے گانے سننے اور ریاست کو تباہ کرنے کا بہت شوق تھا۔ ایک رنڈی کے ساتھ وُہ ساز بھی آئے جو اس درخت سے بنائے گئے تھے۔ سارنگی بولی۔ راجا کے سر پر دو سینگ۔ پھر نہ معلوم کس ساز نے کہا۔ کن نے کہا گن نے کہا طبلہ کی زبان درازی تو مشہور رہی ہے۔ بول پڑا بتّن حجام بولا —— چلئے بتّن حجام کی شامت آگئی۔

عرض کرنے کے مطلب یہ ہے کہ پیٹ کے جس ہلکے پن نے بتّن حجام کو پھانسی کے تختہ پر پہنچا دیا۔ وہی ہلکا پن ہمارے بے شمار شعرا کو ہوٹنگ کی صلیب تک پہنچا دیتا ہے۔

اسی لئے مجھے عرض کرنے دیجئے کہ ہوٹنگ کا تحفظ کرنا ہمارا قومی فریضہ ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنی قومی سرکار سے مطالبہ کرنا چاہیئے کہ وُہ اس صنفِ ادب کی حفاظت کے طریقوں پر غور کرنے کے لئے فوراً ایک سب کمیٹی بنا دے۔

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب کسی شاعر پر ہوٹنگ ہوتی ہے۔ تو وُہ یہ کیوں سمجھتا ہے کہ ہوٹنگ کرنے والے جاہل اور غیر مہذب اور وغیرہ وغیرہ ہیں۔ وُہ یہ کیوں نہیں سوچتا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ معدہ کی خرابی کی وجہ سے وُہ بھری محفل میں کھٹی ڈکاریں لے رہا ہے اور

لوگ اس کی اس غیر مہذب حرکت کا بُرا مناتے ہیں؟ وہ آخر یہ کیوں سوچتا ہے کہ قصور ہوٹنگ کرنے والوں کا ہے۔ وہ یہ کیوں نہیں کہ وہ فرشتہ نہیں ہے!

آپ کو آخر اس بات پر اتنا شدید اصرار کیوں ہے کہ شاعر اس دُنیا کی مخلوق نہیں ہوتا۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر وہ اس دُنیا کے لوگوں کو اپنا کلام سُنا کر بور کیوں کرتا ہے۔ وہ اپنی دُنیا میں جائے! اس کو سیدھے سادے محنت مزدوری کرنے والے ایماندار لوگوں کی محفل میں آنے اور ان کا وقت برباد کرنے کا کیا حق ہے؟

گورکی نے ادیبوں کو مخاطب کرکے ایک بار کہا تھا۔ اگر آپ کی طبیعت مالش کر رہی ہو۔ تو عام گذرگاہوں اور تفریح گاہوں سے پرہیز کیجئے کیونکہ وہاں بہت سے صحت مند لوگ ہوں گے اور آپ کا بگڑتا ہوا چہرہ دیکھکر ان کی صحت پر بُرا اثر پڑے گا۔

یہی بات میں ذرا کھرے لہجہ میں کہنا چاہتا ہوں۔ اگر آپکو متلی ہو رہی ہے تو سلفچی ڈھونڈیئے۔ بزمِ شعر کو آپ اگالدان کیوں سمجھ لیتے ہیں۔

ہوٹنگ کی خاطر خواہ ہمت افزائی نہ ہونے کی وجہ سے ہماری شاعری کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ فکر کے دیوالیہ پن کا یہ عالم ہے کہ بھولے بھٹکے کوئی اچھی بات نظر آجائے تو سمجھئے کہ کمال ہوا۔ ہمارے اچھے شاعر یا تو خاموش ہیں یا تیسرے اور چوتھے درجہ کی شاعری کر رہے ہیں۔ ہما شما کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ کوئی اچھی بات سننے کو کان ترس گئے ہیں وہی سڑے گلے مضامین، وہی سیلی ہوئی ترکیبیں، وہی گھسے پٹے استعارے اور وہی زنگ آلود تشبیہیں۔ عاشق ایسا سخت جان ہے کہ صدیوں سے بیمار ہے۔ روز کئی بار مرتا ہے۔ اور ابھی تک زندہ ہے۔ شوق اسی طرح سیون او کلاک کا بلیڈ خریدتا پھرتا ہے، اور پلٹ کر نہیں دیکھتا کہ عاشق صاحب کا کیا حال ہے۔ ایک بے وقوف معشوق اس سے بھی زیادہ بے وقوف عاشق اور ایک پرلے درجہ کے احمق رقیب کے مثلث میں گرفتار ہو کر اچھی شاعری نہیں پنپ سکتی۔

جی ہاں دار و زندان اور خزان و بہار اور صبح و شام وغیرہ کا جو نئے سرے سے سنگار کیا گیا تھا۔ وہ سنگار بھی بگڑ چکا ہے۔ ترقی پسند شعرا بھی بڑی حد تک روایتی شعرا کی دُنیا میں ہیں۔

تعمیر

ایک بار میں نے ایک بزرگ شاعر سے سوال کیا۔ جنابِ عشق کیا ہے؟ انہوں نے عربی میں لاحول پڑھ دی۔ ان سے تو میں نہیں کہہ سکا آپ سے ضرور کہونگا کہ اگر آپ نے عشق نہیں کیا ہے تو عشق کے پیچھے آپ اپنی شاعری کا ڈنڈا لئے کیوں گھوم رہے ہیں۔ یہ کیا حرکت ہے۔ ایں!

میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ تمام شعرا کو ہوٹنگ کی ضرورت ہے یہ کڑوی دوا پیئے بغیر ان کی صحت نہیں سنبھل سکتی۔

شاعری کی رگوں کو تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔ تازہ خیالات، تازہ زبان، تازہ امیجری ——— جب تک یہ سڑا ہوا میک اپ نہیں اُترے گا تب تک شاعری کو بچانا ناممکن ہے۔ جس طرح قبائے گل میں گل بوٹا نہیں ہوتا اس طرح شاعری کا حسن بھی عشق وغیرہ کے بھدے ٹھپوں کو برداشت نہیں کرسکتا۔ شاعر کو ایک بے مثال مصور ہونا چاہیئے۔ ایک ایسا معمولی رنگریز نہیں جو اپنے ٹھپوں کے آگے سوچ ہی نہ سکتا ہو۔

اب بھی دُنیا میں ایسے احمقوں کی کمی نہیں ہے جن کے خیال میں پترول کے جلنے سے ہوا چلتی ہے۔ اور اب بھی دُنیا میں ایسے وحشیوں کی تعداد اچھی خاصی ہے، جو آگ کا استعمال نہیں جانتے۔

اب اگر کسی ایسی محفل میں جس میں ہر شخص کی جیب میں ایک دیا سلائی ہو کوئی آئے اور پتھر کو رگڑ کر آگ نکالے اور پھر سب کی طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھے تو کیا اہلِ بزم تعریف کر اٹھیں گے؟ ہرگز نہیں۔ آپ چاہے تکلف میں اسے پاگل نہ کہیں۔ مگر آپ دل میں اسے پاگل ضرور سمجھیں گے۔

اس لئے اگر کوئی آپکو ہوٹ کر رہا ہو— تو ایک بار سوچئے کہ کہیں آپ دیا سلائی کے عہد میں چقماق سے آگ پیدا کرنے کی حماقت ——— یا غلطی تو نہیں کر رہے ہیں۔

اسی لئے میں بہت زوردار الفاظ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہوٹنگ کے ساتھ بہت ناانصافی ہو چکی۔ اب بزم ادب میں اسے اس کا جائز مقام ملنا چاہیئے۔ لیکن اگر آپ اب بھی اسے تسلیم نہیں کرتے تو میں یہ کہہ کر چپ ہو جاؤنگا کہ دُنیا کی ایک بڑی طاقت کے تسلیم نہ کرنے کے باوجود چین کی نئی جمہوریت موجود ہے۔ (بقیہ صفحہ نمبر)

دو غزلیں

خاموشؔ غازی پوری

گل پیرہن و غنچہ دہن کس نے بنایا
اے دوست تجھے جانِ چمن کس نے بنایا

توبہ کی حکایت تو مرے دل نے بنائی
آنکھوں کو تیری توبہ شکن کس نے بنایا

اے شمع کے ہمدرد پتنگو یہ بتاؤ
شعلوں کا یہ رنگین کفن کس نے بنایا

ہے میرے ہی آنسو کی طرح تیرا بھی آنسو
لیکن تیرے آنسو کو کرن کس نے بنایا

پابندِ مقامات نہیں ہے مری وحشت
یہ مرحلۂ دار و رسن کس نے بنایا

تاریخِ چمن دیکھ ذرا بھولنے والے
جلتی ہوئی شاخوں میں وطن کس نے بنایا

چپ رہ کے بھی آنکھوں سے ہوا کرتی ہیں باتیں
خاموشؔ یہ اندازِ سخن کس نے بنایا

نائلؔ جمشید پوری

ہے طلوعِ صبحِ عشرت مہ لقا جس کو کہیں
گیسوے برہم ہے وہ شامِ بلا جس کو کہیں

ایک اک ذرہ ہے مظہر جلوۂ خورشید کا
پرتوِ حسنِ نظر ہے آئینہ جس کو کہیں

کاہشِ پیہم سے ہے ہم مشربِ لطفِ حیات
انفعالِ ضبط ہے آہِ رسا جس کو کہیں

بزم میں توقیرِ بے ناسورِ دل ممکن نہیں
ہے وہ لطفِ خاص دردِ لا دوا جس کو کہیں

کہتے ہیں انسان مر کر بھی فنا ہوتا نہیں
ابتدائے عمرِ نو ہے انتہا جس کو کہیں

جرأتِ بے باک ہے مائل تقاضائے شباب
شوق کی انگڑائی ہے وہ حوصلہ جس کو کہیں

جیلانی بانو

آنسویا

"تم نے دیکھا بھگوتی! سنگیسر میں نئی کلیاں آ رہی ہیں۔" آنسویا نے یوں کہا جیسے اس تعجب خیز خبر کو سنتے ہی بھگونتم کے ساتھ ساتھ ساری دنیا خوشی سے جھوم اٹھے گی۔ جب کوئی بات اسے بڑی اچھی لگتی تھی تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ من بھر وزنی بوری اٹھائے اٹھائے پھر رہی ہو۔ کسی کو سنائے بغیر جی پر پتھر سا رکھا رہتا تھا۔

مگر اس خبر کا اثر حسب عادت بھگونتم پر کچھ نہ ہوا۔ آنسویا کا بھڑکتا ہوا چہرا چمکتی ہوئی آنکھیں اور خبر کی وہ ناقابل یقین نوعیت اس کے ایڈیٹر بیٹے کے لئے بھیگی آتش بازی بن گئی۔ اس کی بلا سے اس کی ماں اپنے آنگن میں کتنی ہی کلیاں کھلائے۔ دنیا کے آنگن کے دیپ تو بجھتے جا رہے تھے۔

آنسویا نے برا نہ مانا، وہ سمجھ گئی۔ دفتر سے تھکا ہارا آنے کے بعد اس کا بیٹا صرف بہو سے ہنسنا بولنا چاہتا ہے...... دوسرے کمرے میں جا کر مشین چلاتے میں تلگو کا ایک پرانا گیت گانے لگی۔ اس گیت میں ایک امید والی ماں آدھی رات کو اپنے آنگن میں چاند نکلا دیکھتی ہے اور سب کو جگاتی پھرتی ہے۔ تاکہ بیچارے لوگ چاندنی کے دیدار سے محروم نہ رہ جائیں۔ بیچ آنگن میں اس نے سنگیسر کا پیڑ بڑے چاؤ سے لگایا تھا۔ دنیا میں پھولوں کے ہزاروں پیڑ ہیں۔ مگر آندھرا کی عورتوں کو جانے کیوں اس سرخ پھولوں والے پیڑ سے محبت ہے۔ آندھرا میں یہ پیڑ ہر گھر کے آس پاس ضرور نظر آتا ہے۔ شہر آ کے بہت دنوں تک آنسویا اپنی سب امنگوں کے ساتھ سنگیسر کا پیڑ بھی اپنے دل میں رکھے بیٹھی رہی تھی۔ اور پھر ایک دن اس نے اس پودے کو دل سے نکال کر بیچ آنگن میں لگا دیا۔ شروع گرمیوں میں جب سنگیسر کی نازک نازک زمردی پتیوں میں سے سرخ کلیاں جھانکنے لگیں تو آنسویا کی ہنسی کسی طرح نہ تھمتی تھی۔ دنیا بھر کے بھولے بھٹکے گیت اس کی زبان پر آ جاتے تھے۔ اور جب شام کی خنک ہواؤں میں سرخ پھولوں کی آنگن میں بوچھار ہوتی تھی تو وہ اپنی بہو سد ھانتا کو زبردستی پیڑ کے نیچے بٹھا دیتی تھی۔ اس بھاگ دوڑ میں خود اس کے سفید بالوں میں بھی پنکھڑیاں اٹک جاتی تھیں جنہیں وہ یوں ہی لگا رہنے دیتی۔ بچوں کا ہنسی کے مارے برا حال ہو جاتا تھا۔ آنسویا کو یوں لگتا تھا جیسے آنگن میں چراغوں کی قطاریں جگمگا رہی ہیں اور سب کے چہروں پر روشنی کی یہ چھوٹ پڑتی۔

جس زمانے میں پھول کھلتے تھے تو آنسویا کا کام اور بڑھ جاتا۔ صبح اٹھ کر اسے سب سے پہلے نیچے گرے ہوئے پھول اٹھانا پڑتے، تاکہ کوئی پاؤں سے نہ روند ڈالے۔ اسے بڑا وہم تھا۔

ایک بار اس کی نانی نے ایک کہانی سنائی تھی کہ پھول تو اصل میں پریاں ہوتی ہیں۔ جو آنکھ مچولی کھیلتے وقت رنگ برنگے کپڑے پہن کر درختوں میں چھپ جاتی ہیں۔ جب کوئی ایک پھول توڑ کر مسلتا ہے تو ایک پری مر جاتی ہے ——— آنسویا نے یہ کہانی اپنے سب پوتوں پوتیوں کو سنائی تھی۔

"اور فاختہ کون ہوتی ہے پدما ——؟" شانتا پوچھتی۔

"فاختہ ——! فاختہ پہلے ایک عورت تھی۔ وہ اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتی تھی۔ پھر ایک بار بڑے زور کا کال پڑا اور اس کا میاں کام ڈھونڈنے کہیں جا رہا تھا۔ کہ راستے میں اسے موت مل گئی اور اپنے گھر کی اس نے بہت دنوں میاں کا انتظار کیا۔ وہ سمجھی مصیبتیں اٹھاتے اٹھاتے وہ گھبرا کے بھاگ گیا ہے۔ پھر اس نے فاختہ کا جوگ لیا اور اب آنگن میں آ کر اسے پکار پکار کر گاتی پھرتی ہے ——

ہائے آیا نہ تو اے دوست تو ـــ اے دوست تو ——

کہانی سنانے کے بعد بڑی دیر تک آنسویا اپنے آنسو پونچھے جاتی۔ بڑی دیر تک آہستہ آہستہ بڑبڑائے جاتی ـــــ ہائے آیا نہ تو اے دوست تو ـــــ اے دوست تو ـــــ

نہ معلوم یہ کہانیاں اس نے سچ مچ کسی سے سُنی تھیں یا بس یوں ہی دل سے جوڑی تھیں۔ بہرحال ان کہانیوں پر اور پرانی روایتوں پر اسے بڑا اعتقاد تھا ـــــ اگر صبح ہی صبح کوا منڈیر پر چلانے لگے تو اس دن سنجیوا کا خط ضرور آئے گا۔ اور اگر خط نہ آتا تو وہ رات بھر فکر کے مارے جاگا کرتی تھی۔ نہ جانے سنجی نے اسے کس ضروری بات کے لئے خط لکھا ہوگا۔ جو ڈاکیے نے راستے میں کھو دیا ہے۔ کسی کے جوتے پر جوتا سوار ہے تو وہ کسی کو رخصت کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے لگتی۔ اور شیشہ گر کے ٹوٹ جائے تو دل کو صدمہ پہنچتا ہے۔ پھول اُوپر گریں تو پریاں بچوں کی سلامتی چاہتی ہیں۔

آج بھی ایسے وقت جب دوسرے کمرے میں اس کی بہو اور بیٹا اپنے بچوں کے حُسن کی تعریف کر رہے تھے۔ آنسویا نے اپنے گیت کی لے بڑھا دی۔

"ہمارے بچوں کی یہ خوبصورتی تو اصل میں پدما سے آئی ہے ـــــ"

سدھا نتا نے بڑی انکساری سے کہا۔

"واہ ماں کونسی خوبصورت ہیں ـــــ؟ اپنا نام لیتے ہوئے شرم آ رہی ہے کیا ـــــ؟" بھگونتم نے بڑی رومانی نگاہوں سے بیوی کو دیکھا۔ مگر سدھانتا ذرا بھی نہ لجائی۔ دراصل اُس نے پتی کا آخری جملہ سُنا ہی نہ تھا۔

"آپکو پدما خوبصورت نہیں لگتیں! آپ انہیں کبھی غور سے کیوں نہیں دیکھتے! آپ کی بھی سب عادتیں اُن ہی پر گئی ہیں ـــــ"

وہ کھے گئی۔ اس وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ ساس کی تعریف کر رہی ہے۔ یا کوئی نئی کوِتیا لکھ رہی ہے۔

بھگونتم صحافی تھا اور سدھانتا شاعر۔ اس لئے جب کبھی ایک دوسرے کی تعریف کرنا چاہتے تو مُوڈ اُکھڑ جاتا تھا۔ بھگونتم کو کبھی موزوں الفاظ ہی نہ ملتے جو سدھانتا کو متاثر کر سکیں۔ ہار کے اُسے بیوی کی رنگین بیانی کو ماننا پڑتا۔ اس وقت بھی جب اپنی دانست میں وہ بڑی شاعری کر رہا تھا۔ سدھانتا کی کوِتیا نے اسے بجھا دیا اور مجبوراً اس نے شنٹی کو اُٹھا کے پیار کرنے پر اکتفا کر لیا۔ بھگونتم کو اپنی ماں رقیب معلوم ہونے لگی تھی۔ ایک خوش قسمت مرد ہیں جو بیوی سے ماں کی برائیاں سنتے سنتے خودکشی کی ترکیبیں سوچتے ہیں۔ ایک بھگونتم تھا جس کی بیوی اُس سے زیادہ ساس پر مرتی تھی۔

"پدما کہتی ہیں شنٹی آپ پر گیا ہے ـــــ" وہ اس کے قریب سرک آئی۔

"اُونہہ پدما تو بالکل پگلی ہیں"۔

ممکن تھا سدھانتا اس بات کی حسبِ معمول آج بھی بڑی زوردار تردید کرتی مگر عین اُسی وقت گھر میں ایک ہنگامہ مچا اور پدما اپنے پاگل پن کا ثبوت دینے کمرے سے باہر نکل آئی۔

باہر کی موری کے راستے ایک بلی کا بچہ اندر بھٹک آیا تھا۔ یوں جیسے کوئی شرنارتھی اپنے پیاروں سے بچھڑ گیا ہو۔ کیچڑ میں لتھڑا ہوا۔ فارش زدہ ـــــ ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا تو اُس کی پسلیاں تک اُبھر آتی تھیں۔ بچوں نے نرم کپڑے کی گیند سمجھ کر اس کے کان پکڑ کے اُچھالنا شروع کر دیا۔

مگر جس دن سے اس گھر میں دُکھ جھیلنے کا ٹھیکہ آنسویا نے لیا تھا وہ یہ حق کسی اور کو بالکل نہ دیتی تھی۔ اس لئے وہ بلی کے بچے کو بچوں کے بے رحم پنجوں سے نکال کر اپنے کمرے میں لے گئی۔

"دیکھا ـــــ! اب وہ طاعون زدہ پلّا پالا جائے گا ـــــ" بھگونتم نے شکایت آمیز نگاہوں سے بیوی کو دیکھا اور ساس کی اس حماقت کو بھلانے کے لئے اسے بھگونتم کے اور قریب سرکنا پڑا۔

پھر سچ مچ اسے پالنے کی تیاری ہونے لگی۔ آنسویا نے اسے گرم پانی سے نہلایا۔ اسے پیٹ بھر کے دودھ پلایا۔ اُس کا نام شنٹی کے جوڑ پر چنٹی رکھا اور اسے سمجھا دیا کہ آج سے وہ شنٹی کا دوست ہے۔

پھر تو وہ بلی کا بچہ سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گیا۔ کبھی دودھ کی دیگچی میں مُنہ ڈال رہا ہے۔ کبھی الماری میں سے لبکٹ لے بھاگا۔ صراحی کا پانی پی لیا۔ بچوں کے بستر گندے کر گیا۔ سارا گھر لعنت بھیج رہا ہے اور پدما الیں شرمندہ ہو رہی ہیں۔ جیسے سنجیوا کی نالائقیاں سُن رہی ہو۔ چاول صاف کرنے میں گھنٹوں اُسے پاس بٹھا کے عقل کی باتیں سمجھاتیں اور آئندہ فرمانبردار بننے کا وعدہ بھی لیتیں۔ تھوڑی دیر تو وہ آنکھیں بند کئے یوں مراقبے میں بیٹھتا رہتا جیسے آج سے دُنیا ترک کر کے بیراگ لے لیا ہو۔ لیکن ذرا دیر بعد دیکھئے تو پھر وہی اُول جلول حرکتیں۔

"بچے بچے سب ایک ـــــ چاہے وہ بلی کے ہوں یا آدمی کے"

وہ سدھانتا کا موڈ بگڑا ہوا دیکھ کر سمجھاتی۔

"بس تھوڑے دنوں کی بات ہے تم دیکھنا میں اسے کیسا سلیقہ مند بناتی ہوں"۔ اور پھر سچ مچ تھوڑے دن بعد اس کے جسم پر وہ صحت اور خوبصورتی آ گئی جو ماں کے شفقت بھرے ہاتھوں سے سنواری جاتی ہے۔

صبح جب کام کی زیادتی سے آنسو یا چکی کا کھونٹا بنی گھومتی پھرتی تھی تو چیٹی اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا تھا۔ اس کے پیروں کو چھو چھو کر بھاگ جاتا۔ ایک دن شاملا زبردستی پدما کو پردے کے پیچھے چھپا کر بیٹھ گئی اور چیٹی نتھنے پھیلا کے اس کی خوشبو کا سراغ لگاتا رہا۔ پھر جب گھبرا کے اس نے چیخنا شروع کیا تو آنسو یا پردے کے پیچھے سے نکل آئی۔ اس نے جلدی سے چیٹی کو اٹھا کر گلے لگا لیا۔ اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔۔۔ بچہ تو چاہے آدمی کا ہو یا بلی کا۔ ماں کے سینے سے لگے بغیر اسے چین کہاں ملے گا۔

بلی کے بچے پر بھی ساس کو اتنی مہربان دیکھ کر سدھانتا ہنس پڑتی۔ اسے اپنی ساس بہت پسند تھی۔ بیاہ سے پہلے اس کے رنگین سپنوں کو ساس کے تصور نے بڑا بھیانک بنا دیا تھا کیونکہ اس نے اپنا پتی خود چنا تھا۔ بھگونتم نے اسے اپنے گھر کا رتی رتی حال بنا دیا تھا کہ اس کی ماں کو صرف اس کے پتی نے نہیں ٹھکرایا بلکہ ساری دنیا روندھ چکی ہے۔ وہ صرف اپنے بچوں کے لئے زندہ ہے۔ یہ سن کر سدھانتا پر اور دہشت سوار ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جو عورت زیادہ ظلم سہتی ہے۔ وہ زیادہ ساس بنتی ہے۔ اور بیاہ سے پہلے اس نے اپنی کوتیاؤں کی کاپی کو آنسو پونچھ کر ہمیشہ کے لئے وداع کر دیا تھا۔ دوستوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ سر پر پلو ڈالنے اور دھیمی آواز میں ہنسنے کی مشق شروع کر دی۔ بلکہ اس نے تو چاول ابالنا اور "سوم" بنانا بھی سیکھ لیا تھا۔ بھگونتم جیسے ہیرے کو پلنے کے لئے وہ سر چٹان کو توڑ سکتی تھی مگر آنسو یا کے گھر آ کے یوں لگا جیسے وہ روئی میں دھنسی جا رہی ہے۔ پدما کے دل میں کتنی جگہ ہے۔ یہ بات وہ بارہ برس تک کے ساتھ میں بھی نہ جان پائی۔ سوتیلی ماں کے کڑوے سلوک نے اسے ماں کا بھی کوئی میٹھا تصور نہ دیا تھا۔ اسی لئے وہ مدافعت کے ہتھیار ڈھونڈنے کی بجائے صلح کی جھنڈی تھام کر آئی۔ کتنے ہی دنوں اس نے ساس کے اس بے معنی خلوص کو معنی پہنائے۔ اس طوفان کی منتظر رہی جو ایک دن اچانک پھٹ پڑے گا اور پدما اپنے معصوم چہرے میٹھی زبان اور بچوں کے سے قہقہے بھول کر اپنے اصلی روپ میں آ جائے گی۔ اس الجھے ہوئے دھاگے کی طرح وہ پدما کو سلجھاتی رہی جس کا سرا کھو گیا ہو۔ آخر اس نے

ہار مان لی۔ اور اپنے درمیان سے ساس بہو کا رشتہ نکال پھینکا۔ بڑھاپے نے اس کی ہمت اور شگفتگی ذرا بھی نہ چھینی تھی۔ نہ جانے کیسے وہ زندگی بھر دکھ اٹھاتی رہی اور مسکرانا بھی نہ بھولی ــــ!

اس گھر کی فضا عجیب تھی۔ اس کے پڑوسی چہ میگوئیاں کرتے تھے۔ محلے کی عورتیں جب ساس کے ظلموں کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں۔ تو لوگوں کو بالکل ترس نہیں آتا۔ یہ تو ہر عورت کا پیدائشی حق ہے۔ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ پھر یہ بہو بھی اپنے بیٹے کی دلہن لائے گی اور اسے یوں ہی رولایا کرے گی۔ زندگی بھر دوسروں کے احکام پر دوڑنے والی عورت صرف یہاں آ کر ہی تو ڈکٹیٹر بنتی ہے۔ لوگ اس سلسلے سے مطمئن تھے۔ مگر اب بوڑھی آنسو یا نے اس روایت کو توڑ دیا تھا۔ اس گھر میں ساس اور بہو بیک وقت مسکراتی تھیں۔ یہ کتنی آن ہوتی بات ہے ــــ! صرف یہی ایک بات کیا۔ اسے تو سینگ کٹائے بچھڑوں میں ملنے کا بڑا چاؤ تھا۔ ساٹھ برس کی عمر میں اسے میٹرک کا امتحان دینے کا شوق اٹھا۔ اپنی بڑی پوتی درالکشمی کے ساتھ وہ سنگیت سیکھتی تھی۔ بچوں کے ساتھ گڑیاں کھیلتی اور بہو کے ساتھ سہیلیوں کے سے مذاق چلتے۔

اس کی پڑوسنیں اپنے مہمانوں کو آنسو یا دکھانے ضرور لاتی تھیں۔ "زو" میں رکھے ہوئے نئے جانور کی طرح وہ سب کو بڑی دلچسپ لگتی تھی۔

"تم نے ہمارے چیٹی کو نہیں دیکھا ــــ؟" وہ مہمانوں سے بڑے اشتیاق بھرے لہجہ میں پوچھتی اور انہیں وہ پوری کہانی سنانا چاہتی تھی کہ وہ بچارہ کس طرح مصیبتیں جھیل رہا تھا۔ مگر لوگ بلی کے بچے کو چھوڑ کر اسے دیکھنا شروع کر دیتے تھے۔

جب کوئی اس کی تعجب خیز بات دلچسپی سے نہ سنتا تھا۔ تو آنسو یا کا دم گھٹنے لگتا۔ گھر والوں کو تو جیسے پکا یقین ہو گیا تھا کہ پدما کے پاس اب کبھی کوئی تعجب خیز بات سنانے کے لئے نہیں ہے۔ خصوصاً صبح کے وقت جو حیرت انگیز اور نئی نئی باتوں کا ڈھیر ہوتا ہے۔ کوئی اس کی بات پر کان نہ دھرتا۔ سدھانتا اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے اور خود آفس جانے کی تیاری میں لگ جاتی۔ درالکشمی کا ماسٹر آ جاتا۔ بھگونتم کو آفس کی فائلوں اور اخباروں سے فرصت نہ ملتی تھی۔ البتہ ہمیشہ بیمار رہنے والا شٹی پدما کی باتیں بڑے غور سے سنتا تھا بلکہ وہ تو چاہتا تھا کہ پدما دن بھر اس کے پاس بیٹھی ایسی ہی کہانیاں سنائے جائیں مگر آنسو یا کو چولہے سے کھانے کی میز تک بے شمار چکر کاٹنا پڑتے۔ سب کو

کھلا پلا کے دن بھر کے لئے سبکو رخصت کرنا اس کا بے حد ضروری کام تھا۔ ورنہ دن بھر افسوس رہتا کہ آج سدھانتا نے "پٹو" نہیں لگایا۔ بھگونتم نے ٹھنڈی چائے پی۔ درالکشمی کی کتاب نہیں ملی۔ اور وہ اسکول میں پٹی ہوگی۔

ایسے وقت کوئی گھر میں جھانک کر دیکھتا تو اسے رنگا رنگ آوازوں کی تال پر رقص کرتی ہوئی ایک سفید بالوں والی عورت دکھائی دیتی۔ اونچا پورا قد سفید بالوں کا جوڑا اس کے سر سے بھی بڑا تھا معمولی سے کپڑے کی ساری اس کے جسم پر یوں لپٹی رہتی تھی کہ چولی کا رنگ کبھی نظر نہ آتا تھا۔ کام کرتے وقت وہ نیچے کی چنٹیں اٹھا کر کمر میں اڑس لیتی تھی۔

یہ اس کا پچھلا حصہ تھا۔

اس کے بال پلو میں چھپے ہوئے ہوں تو سانولے چہرے پر چمکدار دانتوں کی جگمگاہٹ اور گٹھیلے جسم کی بناوٹ اسے پچیس تیس برس سے زیادہ کا نہ کہنے دیتی۔ پھر رات کو جب وہ اپنی پونیوں کے ساتھ تبلو سے سنگیت سیکھتی تھی یا ہو سکے پاس بیٹھی میٹرک کی اسٹڈی کرتی تو اس کے چہرے پر سترہ اٹھارہ برس والی لڑکیوں کا تجسس اور تازگی ہوتی۔ ہر نئی بات اس کے خون کی روانی تیز کر دیتی تھی۔ اور قہقہے کسی طرح نہ تھمتے۔

مہینوں اس کے پڑوس میں رہنے والے ہاسٹل کے لڑکوں نے اس کی لڑکیوں بھری کومل آواز سے اپنے جوڑ جوڑ میں درد محسوس کیا۔ اس کی آواز کی مٹھاس نے پکی دیواروں کو کھود کر پھینک دیا تھا تاکہ وہ اس کھنکتی ہوئی آواز والی حسینہ کی صورت دیکھکر اپنے سلسلۂ عشق کو طول دے سکیں۔ مگر آنسویا کے سفید بالوں کو دیکھکر انہیں ایسا دھکا لگا کہ دوسرے ہی دن وہ ہاسٹل چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بڑھاپے نے پہلا حملہ اس کے بالوں پر کیا۔ پھر اس کی آنکھوں پر۔ اور یہاں سے آگے بڑھنے کا اسے راستہ ہی نہ ملا۔ ایک جسم پر اتنی مختلف آب و ہوا کے خطے بڑے تعجب خیز لگتے تھے۔ عورت کے بر عظیم میں مسکراہٹ کی بارش تو صرف چند دنوں کے لئے ہوتی ہے۔ ورنہ جہاں دیکھئے تپتے ہوئے ویرانے اور جھلسے ہوئے صحرا پھیلے پڑے ہیں۔ ایسا جسم تو بھی عورتیں رکھ پاتی ہیں جو زندگی بھر آئینے کے آگے بیٹھی رہیں۔ مگر اسے دوسروں کی صورت دیکھنے سے کبھی فرصت نہ ملی کہ اپنا منہ بھی دیکھتی۔

آنسویا ملگنڈہ میں پیدا ہوئی۔ ریڈی قوم جتنی مہذب کہلاتی ہے اتنی ہی شدت سے اپنی روایتوں کی پھانسی کو گلے میں لٹکائے رکھتی ہے۔ اس کی ادھر چار بڑی بہنیں تھیں۔ ریڈیوں میں پانچ لڑکیوں کا باپ خودکشی کرلے تو گاؤں کا انسپکٹر بھی پوچھ گچھ میں سختی نہیں کرتا۔ کیونکہ زندہ رہنے کے لئے اسے ڈاکوں کی ٹولی میں شامل ہونا پڑتا ہے۔ برادری میں تو نکھٹے اور اپاہج لڑکے بھی دس بیس ہزار سے کم میں نہیں ملتے۔ دس ہزار میں بے عیب لڑکا مل جائے تو سمجھئے دن دہاڑے لوٹ لیا۔

آنسویا کا باپ سیندھی کے درختوں پر چڑھا سیندھی اتارا کرتا تھا۔ پانچ بیٹیوں کی خبر سن کر نیچے اتر آیا۔ مگر ڈوب مرنے کو کہیں جگہ نہ ملی جتنے تالاب تھے سرکار کی ملکیت۔ جتنے کنوئیں تھے جاگیردار کے۔ کوئی ڈوب مرتا تو اس کے وارثوں کو اپنے خرچ سے کنواں صاف کرانا پڑتا تھا۔ اسی لئے تلنگانے میں ڈاکوں کی اتنی کثرت ہے۔ اونچی نیچی پہاڑیوں میں سینکڑوں اچکے دبکے رہتے ہیں۔ جو زیادہ منجھ جاتے وہ چھپنے کی بجائے بیچ کھیت میں کھڑے ہو کر دوسروں کی کمائی چھین سکتے ہیں۔ آنسویا کے باپ کو بھی لوٹنے والی ٹولی میں ملنا پڑا۔ پہلے وہ کسانوں کے ڈھکے چھپے راز بتلا کے انعام پانے لگا۔ پھر اسے پٹے پر زمین ملی۔ پھر اس نے نیا چھپر ڈالا۔ پھر آنگن میں بھینس آئی اور وہ پکی اینٹوں کا احاطہ کھینچ کر اندر جا چھپا۔ اس عرصہ میں آنسویا کے باپ نے کوئی دکھ نہ سہا۔ صرف مسکرانا سیکھ لیا۔ کیا کرتا! پانچ بیٹیوں کے باپ کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح کسی لڑکی کے لئے اس نے پچاس ہزار میں میٹرک پاس دولہا خریدا۔ کسی کے لئے پچیس ہزار میں مڈل فیل گماشتہ اور اس طرح شٹم پشٹم چار بیٹیاں ٹھکانے لگا دیں۔

اس نے اپنی بیٹیوں کو اور کچھ نہ دیا۔ یہاں تک کہ داغ کے سے اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا۔ یہ لڑکیاں تو اس کے دل میں چھپی ہوئی برچھیاں تھیں۔ ان کی جدائی پر رونا کیا!

اب صرف آنسویا رہ گئی۔ جسے سینا پرونا آتا تھا۔ نہ کھانا پکانا۔ حد ہو گئی اسے مرچوں کا آچار ڈالنا بھی نہ آیا جس کے بغیر کوئی ریڈی کھانا نہیں کھاتا۔ مگر لڑکیوں کو گن والی بنانے کا فائدہ کیا تھا۔ جب سارے گن روپے میں چھپے ہیں۔ لیکن آنسویا اپنی بہنوں کے خلاف ہر کام میں ٹانگ اڑانے کو پہنچتی اور دھتکار دی جاتی۔ اپنی بہنوں کی طرح دن بھر بستروں پر اینٹھنے اور نخرے کرنے سے اسے بڑی وحشت ہوتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ چڑیوں کے ساتھ ساتھ اڑ کر آسمان میں چھپے ہوئے اسرار کا پتہ لگا آتی۔

پھر ایکدن جب اس نے بھگونتم کو آفس جاتے وقت اُداس دیکھ لیا تو قسم کھالی کہ کبھی اسے نوکری نہ کرنے دے گی۔ پھر بھگونتم اپنے اُصولوں کو جینے سے لگائے ایک اخبار میں منیجر بن گیا، اور اصولوں کو زندہ رکھنے کے لئے آنسویا رات کو بھی سلائی کرتی۔ پھر ایکدن بمبئی میں لکھنے والی ایک لڑکی اس کے ہاں آئی۔ بھگونتم اُسے بیوی بنا کر لایا تھا۔ بہو سمجھی شاید اس کی چار سو تنخواہ کی خبر نے ساس کو خوش کر دیا ہے۔ مگر آنسویا کے دل پر تو بھگونتم کے مسکراتے ہوئے چہرے کا عکس پڑ رہا تھا۔ وہ تو اپنے چھوٹے بیٹے سنجیوا ریڈی کو بھی ایسی ہی بہو لانے کا مشورہ دینے والی تھی، جو سدھانتا کی طرح اپنے یہاں کے کام بھی کرتی بلنے آفس کو جائے تپے پاپے اور ساس کو ٹنگ بر بیٹھ کر سناتے مگر سنجیوا بھائی اور بھابی سے دن رات بحث کرتے کرتے اپنے بھائی کے نقشِ قدم پہ دوڑنے لگا۔ ایک دن کالج سے خبر آئی کہ پولیس اسے پکڑ لے گئی۔ یہ سن کر آنسویا نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سنگیسر کے پھول وہیں چھوڑ دیئے اور بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اس دن سدھانتا گھبرا گئی جیسے آج پدما کی ہار دیکھنے کو آمادہ نہ ہو۔ آج اسے بھگونتم کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ اُسے پھر ایکبار خیال آیا کہ "ماں" عورت کا سب سے کمزور پہلو ہے۔

مگر جانے کیسے اس نے پھر اتنا صبر جمع کر لیا۔ جانے کیسے بھگوان اُس پر اتنے مہربان ہوگئے کہ وہ اس کھائی کو بھی پار کر گئی۔ اس نے سنجیوا کے سب خطرناک ارادے سُنے اور اسے نہ روک سکی۔ آخر اور بھی تو مائیں ہوں گی جن کے بیٹے سنجی کے ساتھ ہیں۔ کیا معلوم انہیں زبردستی روکنے سے اور تکلیف ہو۔۔۔ سنجیوا کی اس حرکت پر صرف خاندان اور برادری ہی ناراض نہ ہوئی۔ بلکہ حکومت نے بھی آنسویا کی جان کھائی۔ دنوں وہ عدالت میں گھسٹتی پھری تو اس کی سمجھ میں آگیا کہ وہ کیسی اذیت ہے جس کے لئے یہ مصیبیں اُٹھانا پڑتی ہیں ۔۔۔!

پھر وہ اپنے اُس بیٹے کو بھول گئی جو ماں کے ہاتھ سے کھائے بغیر کالج نہ جاتا تھا۔ اپنی پوتیوں کے ساتھ یوں کھیلنے لگی جیسے زندگی کی تلخی ابھی اس کے ہونٹوں کو نہیں لگی۔ اس کی پوتیاں برابر والیوں کی طرح اُس سے ضد کرتیں۔ وہ پڑھنے میں جو سب سے آگے تھی۔ ماسٹر صاحب کہتے

تو سبق فرفر یاد۔ تلگو میں سب سے آگے۔ حساب تو یانی زبانی ہوا ۔۔۔۔

"ذرا پدما کو تو دیکھو۔ کیسا سبق یاد کر لیتی ہے،" ماسٹر صاحب بچوں کو شرم دلاتے۔ درالکشمی حسد بھری نظروں سے دادی کو دیکھتی تھی یہ بھی بھگوان کی مہربانی تھی کہ پدما ان کے ساتھ اسکول نہیں جاتیں۔ ورنہ بس ہاریں ہی ہاریں قسمت میں لکھ جاتیں۔ مشکل یہ تھی کہ پدما کا دل کبھی پڑھنے سے اُچاٹ ہی نہ ہوتا تھا۔ جب ہوم ورک کے ساتھ گھر کے کام دھندے بھی نبٹ جاتے تو وہ اپنی بہو کے پاس آ بیٹھیں۔

"سدھانتا پی۔ ای۔ او میں کیا کام ہوتا ہے؟"

"سدھانتا ریڈیو میں سے آواز کیسے نکلتی ہے ۔۔۔؟"

"آج یہ پرنٹیڈ ساڑی پہن لوں سدھانتا ۔۔۔؟"

ایکدن تو شاملا نے اسے "پتھر پاشا" کھیلنے پر راضی بھی کر لیا تھا۔ مگر اسی وقت سنجی چاچا کا خط آگیا۔ اور جس دن سنجیوا کا خط آتا تھا۔ اس دن وہ کہیں نہ ملتی۔ جیسے عمر بھر کی پڑھائی پڑھی جا چکی ہے۔ جیسے ساری دُنیا کے کام ختم ہوگئے ہیں۔ بچے حیران ہو کر پدما کو دیکھا کرتے۔ سنجی چاچا جانے کس نوکری پر جاتے تھے۔ کبھی مہینوں میں گھر آتے تھے۔ تو آدھی رات کو دروازے کی بجائے دیوار پھاند کر اور صبح کو کیچڑ میں بھرے ہوئے کپڑے کاغذوں کے انبار، جھوٹے برتن اور پدما کا سُتا ہوا چہرا دیکھ کر اندازہ ہوتا کہ رات کون آیا تھا۔ جس دن سنجیوا کا خط آتا تھا۔ تو وہ کسی سے بات نہ کرتی۔ بیسیوں بار خط پڑھا جاتا۔ پھر باری باری سب سے پڑھوا کر سُنا جاتا۔ احساس کی شدت کا ایک لمحہ وہ بھی آتا ہے جب آدمی مبہوت ہو جاتا ہے۔ بالکل خالی الذہن دماغ کے ساتھ ساتھ جسم بھی دُھنکی ہوئی رُوئی کی طرح فضا میں اُڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کبھی چائے میں نمک ڈال رہی ہیں۔ کبھی "پیو چائے" میں املی ڈال رہی ہیں۔ شاملا کو پکار رہی ہیں۔ تب بھی سنجیوا کو بلا رہی ہیں اور کسی سے کچھ کہنا ہو تب بھی سنجیوا کا نام زبان پر چلا آ رہا ہے۔

دوسرے دن انہیں اچانک کوئی نیا شوق ہوتا۔ سدھانتا سے نٹنگ سیکھتیں یا پھر کوئی نیا جانور پالا جاتا۔

ادھ کھلی کلیوں کو یوں ہی کھلی ہوا میں رکھ دو تو گھنٹوں تازہ رہتی ہیں۔ اس نے بھی اپنی اُمنگوں کو یوں ہی سمیٹ کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ

ہر نئی چیز کو دیکھکر اُسے چھونے کی کوشش کرتی تھی۔

ایک دن یوں ہی سنجیوا کا خط ہاتھ میں تھامے وہ کھڑکی میں کھڑی زمین کی گہرائیاں ناپ رہی تھی۔ پھر نہ جانے کیسے اس کی نگاہ پڑوس میں چگتے ہوئے مرغی کے چوزوں پر گئی اور اُس کا جی مچل اُٹھا۔ ان ننھے پھولوں کی طرح خوبصورت چوزوں کو چھونے کے لئے دل بے قرار ہو گیا۔

اُس دن نہ تو ہوم ورک ہوا۔ نہ اُس نے چنی کو گود میں اُٹھا کے پیار کیا۔ شام کو وہ بازار سے لوٹی تو ساتھ میں ایک چیختی چلاتی مرغی، اور لوکری میں انڈے تھے۔

"لو اب یہ گندگی پھیلے گی ——" بھگونتم نے دبے لہجہ میں کہا

"کیوں فضول کام بڑھاتی ہو بیٹا ——؟" سدھانتا کو بھی ساس کا یہ نیا شوق پسند نہ آیا۔ مگر شاملا اور شٹی نے بڑی ماں کو رائے نہ بدلنے دی۔ اُنہیں بھی ننھے ریشمین چوزوں کو اپنے ہاتھ سے چھونے کا بڑا ارمان تھا۔

تینوں نے مِل کر لوگوں کی پروا کئے بغیر سنکیسر کی چھاؤں تلے مٹی جمع کرنا شروع کی۔ شٹی نے پانی لانے کا کام اپنے ذمے لیا۔ شاملا مٹی گوندھ گوندھ کر دیتی گئی۔ اور چند گھنٹوں میں مرغی کے لئے ایک شاندار بنگلہ تیار ہو گیا۔ اس میں روشندان بھی تھے اور جالی دار کھڑکیاں بھی تاکہ ننھے چوزوں کا دم نہ گھٹ جائے۔

"بڑی ماں میں تو اپنے چوزے کو بستے میں ڈال کر اسکول لے جایا کرونگی"۔ شاملا نے ابھی سے پلین بنا لیا۔

"ہائے کہیں ایسا مت کرنا ——" آنسویا گھبرا گئی۔ "وہ تو بہت نازک ہوتے ہیں۔"

"کتنے نازک ہوتے ہیں ——؟" شاملا چاہتی تھی موضوع بڑی ماں کبھی نہ بدلیں۔

"جیسے پھول ہوتے ہیں۔ اگر ایک چوزہ مر جائے تو سمجھو ایک پری مر گئی ——"

"اے ہے ——" شاملا اور شٹی یوں سہم گئے جیسے پری کا قتل ان کے ہاتھوں ہوا جا رہا تھا۔ اور پھر دونوں بہت اداس سے ہو گئے۔ صبح وہ تینوں چپکے چپکے اُٹھکر سنکیسر کے نیچے جمع ہو گئے۔ آنگن میں اپنی دُم سے کھیلتا ہوا چنی بھی بڑی ماں کے اس اہم کام کو بڑی سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔

اس وقت ان کے چہروں پر بڑی ذمہ داری کا احساس تھا۔ آنسویا نے اپنی عینک کو خوب اچھی طرح جما کے ناک پر رکھا تھا اور دونوں بچے ذمہ دار نرسوں کی طرح بڑی ماں کی مدد کر رہے تھے۔ جب انڈے گھاس پر رکھکر مرغی کو چھوڑا تو وہ ڈھونگ ہ جانے والی عورتوں کی طرح شور مچانے لگی۔ مگر انڈے دیکھکر اُسے بڑا کوگا ایسا دنیا یاد نہ رہا۔ پھولے ہوئے ملل پریوں قبضہ جما کر بیٹھ گئی جیسے انگوں ایک انڈا اس نے اپنی جان پر صدمے سہہ کر دیا ہو۔

آنسویا نے ڈربے کی دیوار پر انڈے بٹھانے کی تاریخ لکھ دی تھی۔ ہر روز شٹی اور شاملا کی یہ ضد ہوتی تھی کہ آج پہلے وہ لکیر کھینچیں۔ مگر دونوں لڑ پڑتے۔ اس طرح کبھی دن دو لکیریں بڑھ جاتیں۔ کبھی دن سب مٹا دی جاتیں۔ ہر اپنی غلطی پر وہ خود ہی پچھتاتے تھے۔ اگر بچے نکلنے کی تاریخ بھول گئے تو ——

لیکن وہ تاریخ آنسویا کے دل پر لکھی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی خوشیوں اور غموں کا ساتھی کبھی کسی کو نہ بنایا تھا۔ یہ بیج تو وہ خود ہی بوتی۔ خود ہی سینچتی اور خود ہی ان میں آگ لگا دیا کرتی تھی۔ لوگوں کو خبر تک نہ ہوتی تھی کہ اس کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ چنی کو سینے سے لگائے وہ گھنٹوں کھڑکی میں کھڑی رہتی۔ اس لاوارث بلی کے بچے کو سینے سے لگائے اسے اپنے بہت سے بچھڑے ہوئے یاد آ جاتے تھے۔ بڑی لڑکی سوبھالکشمی جو وجئے واڑہ میں اپنے شوہر کے گھر چلی گئی تھی۔ اور سنجیوا جو کسی اندھیری کوٹھری میں بیٹھا جوار کا "گھٹکا" کھا رہا ہوگا۔ اور کرشنا جو فلموں میں کام کرنے کے لئے ایک مسلمان لڑکے کے ساتھ مدراس بھاگ گئی تھی۔ اس کا پتی تو شاید اب بیوی بچوں کو بالکل ہی بھول چکا ہوگا ——؟

ہوا کے جھونکوں کی طرح یہ سب اس کے ہاتھوں سے نکل بھاگے تھے اگر وہ چاہتی تو کوئی دہلیز سے باہر قدم نہ رکھتا۔ مگر زندگی نے اسے زہر پلایا تھا۔ اور وہ دوسروں کو زہر پلانے کی ہمت نہ کر سکی۔

اب لوگ چاہتے تھے کہ کرشنا مسلمان کے ساتھ بھاگ گئی۔ تو آنسویا کیوں زندہ بیٹھی ہے۔ دن رات طعنوں کی گرم سلاخوں سے اس کے دل پر نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔

آخر لعنت ملامت کے ہتھیار کند ہو گئے۔ جب کوئی شرم ہی بیچ کھائے

تو کیا ہوگا۔

"سُنا ہے اس کی بہو کو پانسو تنخواہ ملتی ہے۔" محلے کی عورتیں ایک دوسرے سے کہتے وقت یوں سر پر پلو ڈالتی تھیں۔ جیسے بھگوت گیتا سُنا رہی ہوں۔ تھوڑے دن بعد اس کی لڑکیاں بھی شریف بن گئیں۔ ہر روز پولیس کی دوڑ دیکھ کر اُس کا گھر جو جوئے والوں کا اڈّا مشہور تھا۔ اب فریادیوں کا ٹھکانہ بن گیا۔ ہر ایک کی غرض بہو سے پوری ہوئی۔ چاہے بچوں کی فیس معاف کرانا ہو، نوکری ڈھونڈنا ہو۔ آپس کے جھگڑے طے کرنا ہوں یا قرض لینا ہوں ـــــ آنسو یا سب کے استقبال کو دوڑتی۔ گھر میں ملنے لوگ آئیں تو وہ بہت ہی تعجب خیز باتیں سُننے پر راضی ہو جاتے ہیں۔

لیکن جب ان کوئی نہ آتا تو وہ منّی کو گود میں بٹھا کے شٹّی سے زیادہ اپنے آپ کو سُناتی تھی کہ سب سے پہلے انڈا کیسے کھلے گا۔ اس وقت بچہ کتنا چھوٹا ہوگا! اُسے کیا کھلائیں گے؟

پھر ایک دن وہ پولٹری فارم سے کئی کتابیں خرید لائی۔ اس کے بستر پر ایک طرف شاملا لیٹی ایک طرف شٹّی، چیٹی اس کے پیٹ پر بیٹھا کتاب کے ہلتے ہوئے ورقوں سے کھیلتا رہا اور وہ سب کو کتابیں پڑھ کر سُنانے لگی۔ شاملا نے جوار کے دانے کوٹ کر رکھ دیئے تھے۔ کیونکہ ننھا چوزہ سارا دانا نہیں نگل سکے گا۔ شٹّی نے اپنے دودھ کی کٹوری ان کے پانی کے لئے دے دی تھی۔

"اب چیٹی بھی چوزوں کے ساتھ خوب کھیلا کرے گا۔ کیوں بدمعاش؟"

"ہاں بھئی۔ اب تم اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنا۔" اس نے بلّی کے بچے کو مشورہ دیا۔ "مگر ان سے لڑنا مت۔ وہ بیچارے معصوم تمہاری طرح لڑائی جھگڑے کیا جانیں ـــ! جب وہ چیٹی کے نرم بالوں پر ہاتھ پھیر کے اس سے کوئی بات کہتی تھی تو وہ آنکھیں موند کر اس کے مشورے کو قبول کر لیتا تھا۔

صبح ہونے سے پہلے وہ بڑی بے تابی سے اُٹھ بیٹھی۔ آج رات بھر اسے نیند کم آئی تھی۔ شام کو انڈا ذرا سا تڑخ گیا تھا اور اس نے اندازہ لگایا تھا کہ صبح ہونے تک بچہ نکل آئیگا۔ روزانہ کی طرح اس دن بھی اس نے کرشن جی کی بڑی سی تصویر پر پھولوں کی مالا ڈالی اور طانبورہ پر بھجن گایا۔ ابھی وہ دو ہی شبد پر بھی نہ آئی تھی کہ حسبِ معمول منّی نجار کی شدت سے گبھرا کے اُٹھ بیٹھا۔ اور وہ طانبورہ پھینک کر کرشن جی کو پرنام کئے بغیر بھاگی۔

پھر اس کے کام شروع ہو گئے۔ شٹّی کو دودھ گرم کر کے پلانا۔ چیٹی کو پیار کرنا۔ آنگن میں گوبر کا چھڑکاؤ کر کے چونے سے بیل بوٹے ڈالنا اس وقت سب پڑے سویا کرتے۔ صرف چیٹی جاگ رہا تھا۔ اپنی دُم کو پکڑنے کے لئے گول گول چکر کاٹنے میں وہ تھکا جا رہا تھا۔ جب آنسو یا ادھر ادھر ہوتی تو وہ زمین پر پنجے پھیلا کے جھک جاتا، سانس روک کر بدما کے پاؤں کا یوں نشانہ لگاتا تھا۔ جیسے وہ آنگن میں پھدکنے والی چڑیا ہوں اور پھر جھپٹ کے اس کے پیروں میں آ گرتا۔

آج وہ بہت جلدی جلدی اپنے کام نپٹانے کی فکر میں تھی۔ اس بدحواسی میں اچھے بھلے کام بگڑے جا رہے تھے۔ خصوصاً روتے ہوئے کو بہلانے کے سارے گر اس کے دماغ سے نکل بھاگے اور دودھ کی پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔

صبح ہی صبح بدشگونی ـــ وہ کانپ اُٹھی۔

اب تو اچھا خاصا دن نکل آیا۔ اس نے ساری کا پلو کمر سے لپیٹا اور ڈربے کے پاس جا بیٹھی۔ اندر بہت ہی واضح چوں چوں شروع ہو چکی تھی۔ اچھا تو بچہ نکل آیا ـــ! خوشی کے مارے وہ یہ خوشخبری سُنانے کے لئے تیزی سے دوڑی۔ پھر ایک ادھورا دائرہ بنا کے ڈربے کے پاس آ بیٹھی۔ چیٹی بھی اس کی ہر حرکت کی نقل کر رہا تھا۔

بڑی بے بسی سے اُس نے سوتی ہوئی شاملا اور شٹّی کو دیکھا اور جھک کے انہیں اُٹھانے لگی۔

"جلدی جلدی اُٹھو۔ بڑی بابو آ گئے۔ تم سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔"
جب دونوں بچے آنکھیں ملتے اندھا دھند ڈربے کی طرف بھاگے تو اُس نے روک دیا۔
"آہستہ آہستہ چلو۔ کہیں مرغی بیچاری نہ ڈر جائے۔ بچوں والی مرغی کو بہت ڈر لگتا ہے۔

پھر دھڑکتے دل سے مرغی کے شدید احتجاج کے باوجود اس نے چوزہ باہر نکالا۔

سفید گلاب کے پھول کی طرح ننھا سا چوزہ تیز روشنی میں آ کر سہما جا رہا تھا۔ شٹّی کی بے تاب ہتھیلی پر اسے رکھ کر وہ ہاتھ پھیر (بقیہ صفحہ نمبر ۴۲)

شاہد مہدی

نیا سال

جگ جگ بیتے، شیو شنکر جب ساگر منتھن کو نکلے تھے
منجدھاروں تک جاتے جاتے کتنے رتن انمول ملے تھے
اور آگے بڑھ کر جب شیو نے زہر کا ایک گرداب پیا تھا
کندن جیسے سکے پیالے میں امرت رس کا [illegible] پیا تھا
جس کا پہلا گھونٹ ہی پی کر نیلا لہو پھر چہک اٹھا تھا
یہ دنیا بھی جھوم اٹھی تھی، ذرّہ ذرّہ مہک اٹھا تھا[1]

ہم بھی تو اس بھو ساگر میں منجدھاروں تک آ پہنچے ہیں
لیکن اب تک سم ہی پیا ہے، جسم ہمارے زرد پڑے ہیں
کام و دہن سے قلب و جگر تک آگ لگی ہے، داغ کھلے ہیں
ابھر رہے ہیں ڈوب رہے ہیں، ہر جنبش پر ہانپ رہے ہیں
دور وہاں افقی لہروں پر خوشی کا امرت تیر رہا ہے
یہ بازو تو سوج گئے ہیں، اور ابھی کتنا بڑھنا ہے

چار طرف اک سناٹا ہے، وقت کی دھڑکن رک سی گئی ہے
اس دھرتی نے آج کی شب پھر اک گردش پوری کر لی ہے
اگلے پل اک نیا سفر ہے، یارو آؤ جام اٹھاؤ
پچھلے دنوں کی ساری تلخی آخری بوندوں تک پی جاؤ
کل شاید جب سورج نکلے، پیاس ہماری بھی بجھ جائے
اپنی رگوں میں بھی خوں چہکے، ہمیں بھی وہ امرت مل جائے
جس کی ہر ہر بوند کے اندر، زلفوں کی خوشبو بھیگی ہے
چاندنی راتوں کی ٹھنڈک ہے، سرخ لبوں کی شیرینی ہے

[1] یہاں ہندو دیومالا کے ایک قصّے کی طرف اشارہ ہے۔

انجم پرویز

ماحول

بہت سن چکے چاند تاروں، بہاروں کی رنگین کہانی
فسانۂ غمِ دل، غمِ آرزو کا، محبت یہ چنچل جوانی
کہ جیسے یہی دونوں شئے ہو ثمری حاصلِ زندگانی
یہ پھر راز کون و مکاں پھر دھڑکتا ہے کیوں آہ یہ سرگرانی

سناؤ کوئی اور قصّہ مجھے اس فسانے کا عنواں بدل دو
بدل دو ہر اک پیچ و خم کو زمانے کے، ہر نقشِ دوراں بدل دو
یہ دستِ جنوں، بزمِ رنداں، یہ صہبا، یہ ساقی
جو دم ہے تو بڑھ کر ہر اک جیب و دامن گریباں بدل دو

یہ افسردہ بخ بستہ لمحے، اگر ساتھ دیتے یہی سوچتا ہوں
تو بیگانہ وش پھر زمانے کا سیلِ فروزاں نہ جا سکے
محبت کی کتنی ہی آن دیکھی دنیا بہاریں، تبسم، شگوفے
لئے دامنِ زرفشاں ہیں، تمنا کے ساحل کو آتا سنبھلنے

مگر جیسے [illegible] مرگھٹ ہو کوئی [illegible] یہ دنیا
جہاں دفن ہوں آرزوئیں دلوں کی، نہ کوئی تبسم نہ کوئی ترنم
فقط ایک گھمبیرتا جیسے آوارہ روحیں فضاؤں میں رقصاں
مگر میں کوئی شب کی ملکہ نہیں یا قبائے سیہ رنگ ظلمت مجسم

کوئی تم میں ہے جو مشیت کی خلوت کا پردہ اٹھا دے؟
کوئی تم میں ہے جو بصیرت کی زرکار چلمن سے جھانک سکے!
سنو اے مری تیرہ بختی کے خالق! یہ افسردہ لمحے!
نہ تیرے نہ میرے فقط اس کا حصّہ [illegible] کو جو سمجھ سکا

"تعمیر" کا "مہجور نمبر"

اپریل میں شائع ہو رہا ہے

- مہجور صرف کشمیر کا ہی شاعر نہیں تھا۔ اُس کی شاعری جغرافیائی حدود میں مقید نہیں تھی۔ وہ اس زمین اور اس پہ بسنے والے انسانوں کی مسرتوں اور آلام کا شاعر تھا۔
- مہجور نمبر میں دلِ مہجور کے دھڑکنے کی صدا سُنی جاسکے گی۔
- مہجور کون تھا؟
- مہجور کی زندگی کن کیفیات میں گذری؟
- مہجور کے بارے میں اس زمین رنگ و نکہت نے کیا سوچا؟
- مہجور کے فکر و فن کے بارے میں ناقدین کی کیا رائے ہے؟
- مہجور نمبر کشمیر کے اِس عظیم شاعر کی زندگی اور فن پہ قائم ہونے والے ہر سوال کا جواب ہوگا۔ مہجور کو سمجھے بغیر آپ تاریخ کشمیر کے سب سے اہم دَور کی سیاسی اور سماجی کروٹوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ جنت ارضی کی ظاہری اور معنوی رعنائیوں سے آشنا نہیں ہو سکتے جن کی بدولت آج انسانیت اور اخوت کا پُر اُمید اُفق جگمگا رہا ہے۔

اس لئے اس ادبی دستاویز کا انتظار کیجئے

- مہجور کے فکر و فن پر کشمیر اور ہند کے معتدر اہلِ قلم حضرات کے درجنوں مقالات اور منظوم تخلیقات کے علاوہ مہجور کے منتخب کلام کا منظوم ترجمہ، شباب سے لیکر آخری سفر تک کی درجنوں تصاویر اور مہجور کی سہ رنگی قلمی تصویر بھی شریکِ اشاعت ہوگی۔
- ۱۵ مارچ تک موصول ہونے والی نگارشات پر غور کیا جا سکے گا۔

وزیر اعظم پنڈت جواہر لال
نہرو ریاست کے تمدنی وفد کے
ممبران کے ہمراہ

صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد
جشن جمہوریت میں حصہ لینے والے
فنکاروں کے ساتھ

جشن جمہوریت کے جلوس میں کشمیر
کی تمدنی جھانکی، جسمیں تسخیر
بانہال کی عکاسی کی گئی ہے
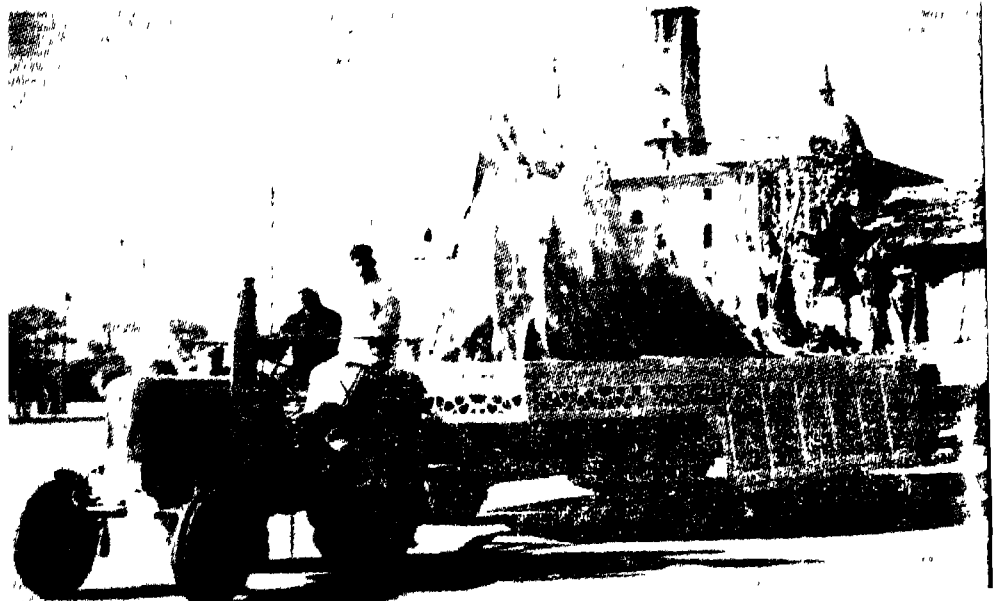
حسن بہاراں

میرے کشمیر یہ ایام بہاراں مبارک
یہ سکون اور یہ تسکین بہاراں مبارک
رنگ اور نور کا سیلاب امنڈ آیا ہے
یہ در و بام کی تزئین بہاراں مبارک

تیرے ماتھے پہ تیقن کی جلا دیکھی ہے
تیرے آیئں میں فردا کی ضیا دیکھی ہے
میرے کشمیر وہ آئین ہے تیرا حسین
ہم نے سرمستی ارباب وفا دیکھی ہے

تیری رعنائی کا اعجاز ہے آیئں تیرا
حسن کی جلوہ گہ ناز ہے آیئں تیرا
جنت ہند ترے ساتھ ہے میرے کشمیر
اک نئے عہد کا آغاز ہے آیئں تیرا

میرے کشمیر بہاروں کا وطن ہے ترا دل
پھول کملا نہ سکیں گے تری محفل میں کبھی
ہم کہ ہیں تیرے پر ستار نگہباں بھی ہیں
بو الہوس آ نہ سکیں گے تری محفل میں کبھی

ارماں لے کے حسن بہاراں میں آئے ہیں
اس شان سے ہم آج گلستاں میں آئے ہیں

کب سے لگائے آئے تھے خون دل و نظر
ہم آج اپنے جشن چراغاں میں آئے ہیں

ہر سمت اڑ رہی ہے یہ کیوں گرد آرزو
کچھ قافلے سے دل کے بیاباں میں آئے ہیں

جن کے لئے ترستی رہی ہے نگاہ شوق
وہ سارے خواب اب حد امکاں میں آئے ہیں

ہم ساحل مراد پہ آخر پہنچ گئے
غم کے سفینے موت کے طوفاں میں آئے ہیں

کیا فکر بال جو کاکل پیچاں میں آئے ہیں
ہم شانہ لے کے محفل خوباں میں آئے ہیں

آیئں کی خوشی میں چراغاں ہے ہر طرف
مہر و نجوم میرے گریباں میں آئے ہیں

وزیر اعظم بخشی غلام محمد دستوریہ کے آخری اجلاس سے خطاب کر رہے ہیں

جناب صادق صاحب دستوریہ کے آخری اجلاس میں تقریر کر رہے ہیں

کشمیری لوک گیت ـــ 'روف' کا ایک نظارہ

بھدرواہ کے لوک ناچ 'کُڈ' کا ایک منظر

رحمان راہی

کشمیر کے لوک گیت

لوک گیت عوامی ادب کا اہم جزو ہیں۔ ان گیتوں کو عوام سے کیا نسبت ہے' اس سوال کا کوئی سیدھا سادا جواب دینا ممکن نہیں۔ کیونکہ اس باب میں بڑی قیاس آرائیوں اور اختلافات سے سابقہ پڑتا ہے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اس موضوع سے متعلق ہماری معلومات ناکافی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عوامی فن سے فیض پانے والے زیادہ تر عام محنت کش لوگ ہی رہے ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرے مختلف فنون بھی عوام میں کافی جگہ پاتے رہے ہیں۔ چنانچہ عہدِ قدیم کا تمام تر فن اور دورِ سرمایہ کے پیدا کردہ ہر دلعزیز اور اجتماعی طور تخلیق کئے گئے فنون اسی قبیل میں شمار ہوتے ہیں۔ عوامی فن کو عہدِ قدیم کے فن سے الگ کرنے والی بنیادی خصوصیت سماجی نوعیت کی ہے قدیم سماج ایک ایسا غیر طبقاتی' متحد اور مربوط سماج تھا جس میں تقسیمِ کار کا کوئی اہم فرق نہیں تھا۔ عہدِ قدیم میں ہر فرد کی خواہش اور ضرورت' اس کے اپنے قبیلے کی جملہ خواہشات اور ضروریات سے منسلک رہتی تھی۔ دوسری روزمرہ سرگرمیوں کی طرح اس زمانے میں تخلیقِ فن کا مقصد بھی قبیلے کی بقا ہوتا تھا۔ وہ فن ایک اجتماعی فن تھا جس میں بہ حیثیت ایک کُل کے ساری جماعت یا قبیلے کی ضرورتوں اور ذوق و شوق کا اظہار ہوتا تھا۔ جب تک یہ سماج قائم رہا یعنی جب تک کہ قبیلے کے بعض افراد نے ذرائع پیداوار کو اپنی ذاتی ملکیت نہ بنا لیا۔ اس وقت تک معاشرے میں ایسا کوئی اختلاف سر نہیں اٹھا سکا۔ جس کی بنا پر سماج کے مختلف افراد کے ذہنی مذاق میں کوئی فرق اُبھر آتا۔ برعکس اس کے عوامی فن اُس دور کی پیداوار ہے جب انسانی معاشرہ ہزاروں سال کی تگ و دو کے بعد ترقی کی ایک اونچی منزل میں داخل ہو گیا۔ عوامی فن کا وجود اپنے دوش بدوش ایک ایسے ذوقی اور انفرادی فن کے وجود کا تقاضا کرتا ہے جسے حکمران طبقوں کے بیچ میں نکھارا گیا ہو۔ جوں ہی انسانی سماج طبقوں میں بٹ گیا عوامی فن کی تخلیق شروع ہو گئی۔ اور بعد میں اسی لوک کلا کے ذریعے سے محنت کش عوام کے جمالیاتی ذوق کا اظہار ہوتا رہا۔

سماج کی طبقاتی تقسیم کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مختلف طبقوں کے شعور' تعلیم و تربیت' تہذیب و تمدن اور مفادات کا فرق بڑھتا گیا اور بعد میں عوامی ادب عہدِ قدیم کے ادب سے اسی اونچ نیچ کی بنا پر ممتاز ہوتا گیا اور اسی اختلاف کی وجہ سے عوامی ادب کے مقابلے پر ایک اور ذوقی اور انفرادی ادب وجود میں آ گیا۔

سوچنے کی بات یہ رہتی ہے کہ لوک گیتوں کا خمیر اور ان کا جوہر کیا ہے ذوقی اور انفرادی ادب سے موازنہ کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ لوک گیتوں کے خالق' اُن کے پیش کار اور سامعین سبھی عام محنت کش لوگ ہوتے ہیں۔ جنہیں ہم عوام کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے برعکس انفرادی ادب کے شہپارے کسی خاص مصنف یا شاعر کی تخلیق ہوتے ہیں اور انہیں پڑھنے یا سننے والے بھی مقابلتاً تھوڑے ہوتے ہیں۔ آپ غالب یا مہجور کے اشعار کی مختلف تاویلیں تو کر سکتے ہیں لیکن کسی ایک مصرعے کی ساخت بدل دینا آپ کے اختیار میں نہیں۔ یہ انفرادی ادب ہے۔ اس میں تصرف نہیں ہو سکتا۔ لوک گیتوں کا خمیر اور ان کی تراش خراش اجتماعی کاوشوں کی دین ہوتی ہے۔ ان میں پے در پے تصرفات ہوتے رہتے ہیں۔ اور انہیں کسی بھی مخصوص شاعر سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے خالق عوام بحیثیت ایک کُل کے ہوتے ہیں۔ پن چکی کا یہ نغمہ سنیئے اور اس کے موضوع کی حیات آفرینی اور ہیئت کی مدھرتا اور سادگی کی داد دیجئے ؎

گرٹہ پھیرہ ژھلہ ژھلے — اوش نیرہ مالہ نلے
گرٹہ مَتیانہ دِنہ نِسے — یہ آبس ونہ دِمبو لیو
ہانزہ تلہ کولہ کلے — گاڈ بوزہ آبہ نلے
اڈسن کور ژلے — یہ زالس ونہ دِمبو لیو

جھٹہ یلہ وزہ نارسے　　　ٹگیس نو کتھہ تہ چارسے

آونیمہ یلہ پرارسے　　　بہ نارس وُن دِیمو یو

(دیگچی گم‌سم رہی ہے اور آٹا باہر آرہا ہے۔ میری محبوب چکی میں پانی کی قطار سے رہا ہوں۔ مانجھی جال پھینکنے کا ارادہ کرتا ہے اور مچھلی پانی کے نیچے ہی سمجھ جاتی ہے۔ مگر تقدیر سے کس کو فرار ہے، میں جال کا منہ تکتا ہوں)

لوک گیتوں کے اس اجتماعی کردار کو محسوس کرتے ہوئے اُن بہت سے نغموں کو نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیئے جو اپنی تخلیق کی اوّلین منزل میں تو انفرادی کاوشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن بعد میں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اُن پر اجتماعی ساخت، آہنگ اور مزاج غالب آجاتا ہے اور یُوں وہ انفرادیت کی حدود سے نکل کر لوک ادب کی فضا میں بکھرنے لگتے ہیں۔ ہماری زبان میں اس سلسلے کی کئی مثالیں لل دید، حبہ خاتون اور ارنہ مال وغیرہ کے کلام سے دی جاسکتی ہیں۔ چونکہ کچھ عرصے پہلے تک ہماری ریاست میں شعراً کا کلام طبع کرنے کی کوئی سہولت میسّر نہ تھی۔ اس لئے شعراً کا کلام زبانی زبانی ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچا کرتا تھا۔ تواتر کے اس عمل سے شعراً کی تخلیقات میں عوام کے ہاتھوں پے در پے تصرّفات کا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ شاعرات کی متعدد تخلیقات مختلف متن کی ملتی ہیں اور بعض فن پاروں کے بارے میں کوئی قطعی حکم صادر نہیں کیا جاسکتا کہ آیا ان کا اصلی مصنّف کون ہے!

اگلے وقتوں کے بعض عوامی شعراً کی زندگی اور مفادات معاشرے کے اکثر افراد کی زندگی اور مفادوں سے اس قدر مربوط رہتے تھے کہ دونوں میں بے نظیر ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ شاعر بڑی حد تک عوام کے جذبات و احساسات اور خیالات کا ترجمان ہوتا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کہتا اُس میں عوام کی حسرتوں، آرزوؤں اور ارادوں کی آواز سُنائی دیتی۔ ایک سچّے عوامی شاعر کی انفرادی فن کاری تخلیق کے ابتدائی مراحل میں ہی عوامی اور اجتماعی رنگ رُوپ میں ڈھل جاتی۔ اس مناسبت سے دیکھا جائے تو ہمیں للہ عارفہ، حبہ خاتون، ارنہ مال یہاں تک کہ محمود گامی کے بھی کئی ایک گیتوں کو عوامی گیتوں میں شمار کرنا ہوگا۔

کشمیری زبان میں بھی دوسری زبانوں کی طرح لوک گیتوں کی تخلیق ہوتی رہی ہے۔ کشمیری عوام نے بھی اپنے جمالیاتی ذوق کے اظہار کے لئے نت نئے نغموں کے پیکر تراشے ہیں۔ کشمیری لوک گیتوں میں بھی وہ تمام خصوصیات اور خوبیاں ہیں جو دوسری قوموں کے لوک گیتوں کا خاصہ ہیں۔ یہاں بھی ہمیں

تعمیر

عام محنت کش انسانوں کے دِلوں کی دھڑکنیں سُنائی دیتی ہیں۔ محنت کی سختی کو کم کرنے کے ارمان ملتے ہیں۔ خوش حال زندگی کے خواب جاگتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ زندگی کی مسرّتوں کو سمیٹ لینے کی اُمنگیں سر اُٹھاتی نظر آتی ہیں۔ کشمیری عوام نے بھی انسانی تقدیر کے مسائل پر سوچا ہے اور سماجی ظُلم و تفریق کے خلاف آواز اُٹھائی ہے۔ ہمارے یہاں بھی شادی و غم اور وصال و فراق کے تار و پود سے جذبات آفرین اور رقت انگیز گیت بُنے گئے ہیں۔ یہاں بھی زندگی کو نشیب و فراز سے سابقہ رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے لوک گیتوں میں بھی ہیئت و موضوع کا ہر آن بدلتا ہُوا نیرنگ ملتا ہے۔

لوک گیتوں کے موضوعات میں آپ کو بعض اوقات ایک ایسی گہرائی ملے گی جس پہ انتشار کا گُمان گذرتا ہے۔ لیکن ذرا غور کیجئے تو پتہ چلے کہ یہ انتشار اتنا ہی خوش آیند ہوتا ہے جتنا خوُد زندگی کا انتشار آپ نے دیکھا ہوگا کہ چکی کی گھمر گھمر میں کھو کر یہ آٹا پیسنے والی برہن کس طرح خود کو تخیل کے حوالے کرکے کبھی اپنی بدقسمتی کی شکایت کرتی ہے اور کبھی اپنے محبُوب سے جُدا ہونے کا الم‌ناک راگ الاپتی ہے۔

"یُہل کوُر" ایک اور مقبولِ عام لوک گیت ہے جس میں ایک چرواہن سے خطاب کرتے ہوئے اُس کے حُسن کی سراہنا کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی زندگی کی تلخ کامی کا احساس بھی اُبھارا گیا ہے ؎

یُہلِ کُوری ہا قزاق تیری　　　مالیوّن چون چھُی نیرسے تلنئے ہائے

بالن کھسان ڈوکے ڈکے　　　وتھرُن کرسے رنگہ چوکتے تائے ہائے

بالن کھسان بوچھہ لائے لاجی　　　ژوّچہ دُرج گندّسے یِزِہ نو پنچتائے ہائے

ہا ال جانو قران خانو　　　یہچہ پتہ گوکھا دیوانے تآئے ہائے

وتہ اُسّ پکان جوان جورا　　　اتھن کیتّھ رنگہ نورسے تمّئے ہائے

ہا یلائے ژھنتو یِمن رنگہ نورنّی　　　ماجن چیہ ماداں کورسے تآئے ہائے

ترجمہ :- چرواہے کی بیٹی، او سرو قد حسینہ۔ تمہارا میکہ پہاڑوں کی شاداب ڈھلوانیں ہیں۔ تم پہاڑوں پہ منزل بہ منزل چڑھتی ہو۔ میں تمہارے ستانے کے لئے رنگین پناہ گاہیں تراشوں گا۔ کوہ پیمائی کرتے کرتے تمہیں بھوک تو نہیں لگ جاتی، میں تیرے آنچل میں روٹیاں باندھ رکھوں گا۔ ارے زاہد! تو چرواہے کی لڑکی پہ دیوانہ کیوں ہوگیا ؟ دو نوجوان ساہ پہ جارہے تھے جن کے ہاتھوں میں رنگین کھلونے تھے۔ ارے ان رنگین کھلونوں پہ لعنت بھیجو۔ ماؤں کی لڑکیاں

کھو جاتی ہیں۔

یہ گیت بھی صورت و معنی کی ہم آہنگی کی ایک دل کش مثال ہے جس میں کشمیر کی چراگاہوں کی لہلہاہٹ اور ٹیلوں کے اُوپر ڈھلنے والی ٹھنڈی پُروائی کے پہلو بہ پہلو کشمیری عوام کی مُفلس زندگی کے واضح خط و خال جھلک آتے ہیں۔

کشمیری زبان کے جو لوک گیت زبان زد ہیں اُن میں سے کئی ایک عوام کے روزمرہ کام کاج سے سمبندھ رکھتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ حقیقت کھُل جاتی ہے کہ اکثر لوک گیت محنت مشقت کے دوران ہی میں تخلیق کئے جاتے ہیں۔ چرخہ کاتنا کشمیری عورتوں کا ایک قدیم ذریعہ معاش ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح ہمارے یہاں بھی چرخے کی تعریف میں گیت بُنے گئے ہیں جن میں کام کی سختی کو کم کرنے کی خواہش کے ساتھ ساتھ چرخہ کاتنے والی ماؤں بہنوں کے دِلوں کی حسرت انگیز گھُمکار بھی سُنائی دیتی ہے ؎

گیُس گیُس موکر ہایندرو کنٹریُن فلہِ لاہ ملاُمیو
ڈیِتِل کاُرتُل ہاسنبلو ینبرزل چالہِ ہیتھ پراراں چھس
ہی تھُر چھُسترُ دُبارہ پھوُلدیو کنٹریُن فلہِ لاہ ملاُمیو

یا یہ گیت ؎

گیُس گیُس موکر ہایندرو کہ دنہ دولکھو ہایندرو
پکھچِ چاُن نقشدار ہایندرو گیُس گیُس موکر ہایندرو
توسے کُتتے ہایندرو وسہ ناُو چھس بو ہایندرو
تاون درزی چھُہم ہایندرو گیُس گیُس موکر ہایندرو
رفاقتی زی چھُہم ہایندرو جفاکش چھُہو ہایندرو
گیُس گیُس موکر ہایندرو

(میرے چرخے شور نہ مچا۔ میں نے تجھے دُور جنگل سے لایا ہے۔ تجھ پر کیسی حسین گلکاری کی گئی ہے۔ میں نے تجھ پر پشمینے کے سُوت کاتے۔ تُو ہی میری اکتا دینے والی مشقت کا ساتھی ہے۔ تُو ہی میرا رفیق ہے اور میرا دست و بازو۔ شور نہ مچا چرخے!)

ترجمہ:۔ میرے چرخے شور نہ مچا۔ میں تجھے عطر میں نہاؤں گی۔ میرے بالم! میں نرگس کے پھُول کی طرح تیرے انتظار میں ہوں۔ تُو ذرا نظریں اُٹھا مجھ پہ دوبارہ نکھار آجائے گا)

ایک اور گیت دھان کُوٹنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کشمیر کے قریب قریب سارے دیہات میں دھان کُوٹتے وقت موسل اور اوکھلی سے ہی کام لیا جاتا ہے۔ یہ عمل چونکہ کافی محنت چاہتا ہے اس لئے اس عمل کے آزار کو کم کرنے کے لئے بھی متعدد گیت موزون ہوئے ہیں۔ آپ بھی ایک گیت کے چند مصرعے سُنیئے:۔

کُچھِ کڈی باسمت وُچھتے بیلہے پہے چھُم فلنے ہاُمس کیُو تہ
ڈوُگ دِی تُلس تملکس بیاُلس پہے چھُم فلنے ہاُمس کیُو تہ

(میں نے باسمت کے چاول اتنے چاؤ سے کُوٹے۔ کیونکہ میرے لاڈلے کے لئے ہیں۔ سکھی چاولوں کو اچھی طرح سنبھال کر کُوٹ۔ یہ میرے لاڈلے کے لئے ہیں)

کشمیری لوک گیتوں کی ایک اور خاص صنف رُوف ہے۔ رُوف کے نغمے تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور حُسن و خوبصورتی میں بھی بے نظیر۔ روف گیت ہمیشہ ایک طرح کے ناچ کورس میں پیش کئے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگلے وقتوں میں اس کورس میں مرد بھی شریک ہُوا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ عورتوں ہی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ رُوف کرنے والی لڑکیاں اور عورتیں باغوں، کھلیانوں یا صحنوں میں جمع ہو کر ایک دوسرے کے رُوبرو دو برابر برابر قطاروں میں اس طرح بٹ جاتی ہیں کہ ایک کی باہیں دوسرے کے کاندھے سے پیوست ہوتی ہیں۔ دونوں قطاریں گیت الاپتے وقت ایک قدم آگے اور ایک پیچھے اس ڈھنگ سے بڑھاتی ہٹاتی ہیں جیسے جھُولا جھُلایا جا رہا ہو۔ روف گیت بہار اور خزاں جیسے مختلف موسموں کی مناسبت سے اور شادی بیاہ، عید، بیساکھی جیسی سماجی تقریبات کے موقعے پہ گائے جاتے ہیں۔ ان میں کبھی شادی بیاہ سے تعلق رکھنے والی بعض رسموں اور سسرال والوں کے ظُلم و جبر کے خلاف آواز اُٹھائی جاتی ہے اور کبھی انسانی تقدیر کے سوالوں کو چھیڑا جاتا ہے۔ رُوف گیتوں میں جوانی کی پکار بھی ہوتی ہے اور زندگی کا سوز بھی۔

روختہِ ولا میانہِ دِلبرو پوشن بہار آو یُورِ دَلو
ٹنگ پھُلیا کیاہ چھِہ جان بوزے باغوان مایہ پان
روشہِ ولا میانہِ دِلبرو پوشن بہار آو یُورِ دَلو

(آؤ میرے محبوب! پھُول کھِل گئے ہیں۔ ناشپاتیوں کے شگوفے نکل آئے ہیں۔

صیاد آگر شتے تو کیڑے پھاڑ دے گا میرے دلبر بہار میں ادھر آ)

اور اب یہ گیت سُنیے۔ دیکھیے سوز و گداز کی دُنیا کیونکر آباد ہو جاتی ہے ؎

زُدان کُھر مُٹے یوہ پیے ہبرے
وأسی زُوُنی بے کستن غبرے

بیہ واجہ ہین بب چھ اِیوان خبرے — زُدن کُھر مُٹے یوہ پیے ہبرے
یس نہ کانہہ آسہ سُو چھ رودان نِثرے — واسی زُوُنی بے کستن خبرے

(چاند نکل آیا۔ مجھ ابیلی پر اُس کی شعاعیں نچھاور ہونے لگیں۔ آ چندا ہم بے کسوں کی خبر لے۔ جن بیٹوں کے باپ ہیں وہ ان کی خبر گیری کے لئے آتے ہیں جس کا کوئی نہ ہو وہ تکتی رہتی ہیں۔ آ چندا ہم بے کسوں کی خبر لے)

باغچ اُسس ہبرے تھامچ — تاوان زاُمچی نس
مال منزاُسس کورخانہ ناُمچ — واُرِو زاُمچی نس
کیاہ کرہ ازِس بب تے ناُمچ — تاوان زاُمچی نس

(میں باغ کی مسکراتی کلی تھی۔ ظالم زمانے نے مجھے برباد کیا۔ میں اپنے باپ کی چہیتی بیٹی تھی۔ مگر سُسرال نے مجھے لوٹ لیا۔ میرے ماں باپ ہیں اپنی تقدیر کو کیسے مناؤں۔ ظالم زمانے نے مجھے برباد کیا)

ہیے مہ گونڈ کیُر باغ نیرہ وُنئے — ہیے بُہ درایس بازر گنئے
تتِہے سمکھُم بب ینوُئے — نوُاں تہ ینس گھرہ ینوُئے
کھاراں تہ کھامِنس کُنڈ ینوُئے — رنگہ کُنڈ کوزنم پزگرہ تھرُنئے
بردن ٹھکہ نھو ونم قراں پرُنئے — دچھن کِن تھوونم طوطہ بولہ کُنئے
کھوور کِن تھوونم شمع دزہ وُنئے — لوت لوت ہیُوتس سیر باوُنئے
دِیُوٹھ دِیُوٹھ ہیُوتس اوش تراوُنئے — دوُ ینم کوُری گزِھ ژاسُنئے
ڈگراہ اوُننم تھاپہ توُ سنئے — ہاکھا اوُننم ہلِہ گنڈُنئے
دوُ ینم کوُری گزِھ ژاسُنئے — یارہ بلہ آبہ لوُٹ گزِھ کھائنئے
بشِہ تے ہیہرِس کھور چھانئے — مالہِ گھرہ نو گزِھ روزُنئے
ماُیہ و گھرہ گزِھ داوُ کرُنئے — ہیے مہ گونڈ کیُر باغ نیر وُنئے

(میں نے گھر سے نکل کر پھولوں کے گلدستے بنائے اور اُن کو ساتھ لے کر بازار چلی۔ راہ میں میرا اّبا جان سے سامنا ہو گیا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا اور پھر اپنے کمرہ میں، آراستہ و پیراستہ کمرے میں اُس نے میرے لئے پلنگ سجایا۔ میرے سامنے قرآن شریف رکھا۔ داہنے پہلو پر طوطا اور بائیں پہلو میں جلتی ہوئی شمع۔ ایسے میں میں نے دل کا ماجرا سُنانا شروع کر دیا۔ اور موٹے موٹے آنسو بہانے لگی۔ ابا جان نے کہا۔ بیٹی سب کچھ برداشت کر لینا۔ چاہے وہ چاولوں کے پیچ ہوں یا بدترین قسم کا ساگ۔ ہر حالت میں صبر شکر کر لینا چاہیئے۔ ندی سے پانی کا گھڑا لانا چاہیئے۔ ساس اور سُسر کے پاؤں دھونے چاہئیں اور میکے میں نہیں رہنا چاہیئے بلکہ سُسرال میں رہنے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ میں نے پھولوں کے ہار سجائے)

زوف کی طرح کشمیری لوک گیتوں کی ایک اور صنف "ونہ وُن" بھی عورتوں ہی تک محدود ہے۔ ان گیتوں میں بچے کی پیدائش سے لے کر شادی بیاہ تک کی تمام تقریبات سے سمبندھ رکھنے والے حالات و کیفیات کے نقوش ملتے ہیں۔ ان گیتوں میں خاص طور پر وہ گیت قابل ذکر ہیں جو دُلہن کے سُسرال روانہ ہوتے سمے گائے جاتے ہیں۔ قطع نظر اس بات کے کہ ان گیتوں میں عشق و محبت کی عظمت، انسانی پیار اور خلوص کی شدت اور الفاظ و معانی کا ایک اچھوتا طلسم بندھا ہوا ملتا ہے۔ یہ بات زیادہ غور طلب ہے کہ ان کے ایک ایک مصرعے سے غیرتِ نفس اور خودداری کے جذبات چھلک پڑتے ہیں۔ عورت کی قدر و قیمت کا احساس دلانا ان گیتوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ دُلہن کو میکے سے سُسرال روانہ کرنے کے لئے پالکی میں سوار کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور فضا میں یہ مدھر، بے تاب اور چنچل سُر ناچ اُٹھتے ہیں ؎

مدہ نی مدہ نس کوٹھ ہے لوس نُودہ نی — مدہ نی گھرہ کُن قدماہ تراوُ
مالنچہ کو نزہ کر دیدہ حاوالے — ادہ نیر واُرِو کہ ساوالے
گوبرے مالیو ژولیناہ ملالے — باغہ منزہ نیو تھو گلالے
بلہ کر کہارو تکُو زیپانے — اتہ اندر چھوی سہ کرپانے
ینہ سہ بوزو اسہ گیہ ژرسئے — یہ ہے آگرہ درسئے پچھے
دندن چھا اسے ژندن میشی — وارِ وہ نیشی واژی کھے
عمہ سیپارسے کُش ژارہ معنے — خُدایہ انتے اتہ چھا کانہہ

(رانی۔ دُولھا بیچارہ تو گھوڑے کھڑے تھک گیا ہے تو اپنے گھر کی طرف چل۔ میکے کی چابیاں اپنی نانی کے سپرد کر، اور سُسرال کے بلاوے پر روانہ ہو جا۔ لڑکے والے، اب تو تُو خوش ہو گیا نا؟ تو باغ میں سے گلِ لالہ کو توڑ کر لے گیا ہے۔ کہار! پالکی کو تیزی سے لے چل۔ اس میں ہماری

ہے۔ تمہارے دانتوں میں چندن کی چمک دیکھ تو سہی۔ ... دوارے آپہنچی۔ قرآن کے تیسویں پارے کا معنی کون سمجھائے۔ خدا کو معلوم وہاں کوئی ہے کہ نہیں؟)

کشمیری لوک گیتوں کی اور بھی کئی صنفیں ہیں جن میں ہوا ہو۔ نینده گیوان اور لڈی شاہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن آج کی اس مختصر صحبت میں ان تمام اصناف کا احاطہ کر لینا ناممکن ہے۔ آخر میں دو اہم باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ لوک گیت چونکہ عوام کی روزمرہ زندگی سے بڑے گہرے طور پر مربوط ہوتے ہیں۔ اس لئے عوام کی روزمرہ زندگی میں جب کوئی انقلاب آتا ہے تو لوک گیتوں کی موت و حیات کا بھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ دورِ غلامی کے گیت جاگیرداری دور میں فراموش ہونے لگتے ہیں اور اسی طرح صنعتی انقلاب کے بعد جاگیردارانہ زمانے سے متعلق بیشتر گیت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھلا دئے جاتے ہیں۔ اس واقعہ کا یورپ کی زبانوں کے لوک ادب میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے لوک ادب میں زوال و ارتقا کی رفتار اس لئے مدھم رہی ہے کہ ہماری سماجی زندگی میں کافی زمانے سے بہت کم ایسے تغیرات ہوئے ہیں جو بنیادی اور ہمہ گیر ہوں۔ ہاں پچھلے کچھ عرصے سے ایسی علامات ضرور اُبھرنے لگی ہیں جو اس عمل کو تیز تر کر رہی ہیں۔ کھڈیوں پر کام کرنے والے جُلاہے جب کپڑے بُننے کے کارخانوں میں کام کرنے لگتے ہیں تو جلاہوں کے گیت ذہن سے اترنے لگتے ہیں۔ باربرداری کے جدید ذرائع نے ان ہزاروں لوک گیتوں کا گلا دبوچا۔ جنہیں گا گا کر اگلے دنوں کے بوجھ ڈھونے والے اپنی محنت کا آزار کم کیا کرتے تھے۔ دھان کوٹنے کے گیت شہروں اور قصبوں میں اس لئے بھلائے جا رہے ہیں کہ اب موسل اور اوکھلی کی جگہ برقی زور سے چلنے والی مشینیں آگئی ہیں۔ شادی بیاہ کی تقریبا کا طور طریقہ بدل رہا ہے اور اس تبدیلی سے لوک گیتوں کا مستقبل بھی متاثر ہو رہا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں عوامی ادب سماج کی اس طبقاتی تقسیم کی پیداوار ہوتا ہے جس کی وجہ سے معاشرے کے مختلف طبقوں کے شعور تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن اور مفادات میں فرق بڑھنے لگتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آگے جا کر جونکہ دوسرے ممالک کی طرح ہمارا معاشرہ بھی ایک ایسی منزل کی جانب قدم بڑھا رہا ہے جو طبقاتی امتیازات سے بالا ہوگا اور جس میں معاشرے کے سبھی افراد کی تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن اور مفادات میں ہم آہنگی بڑھتی جائے گی تو منجھے ہوئے انفرادی ادب کے مقابلے میں لوک ادب کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمیں ان ممالک کے موجودہ ادب سے رجوع کرنا ہوگا جو طبقاتی سماج کی مختلف منزلوں سے گذر کر اب غیر طبقاتی سماج کی تعمیر و تحکیم میں مشغول ہیں۔ چین اور خاص طور سے روس میں پہلے کی نسبت لوک ادب کی تخلیق کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا ہے اور قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دن زیادہ دور نہیں جب وہاں کی زبانوں کا تمام تر ادب ایک منجھے ہوئے ادب کے خط و خال قبول کر لے گا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس نئے ادب میں عوامی ادب کی سادگی، موسیقی، جذبات و احساسات سے لبریز طرزِ بیان اور غیر مبہم انداز سے بات کہنے کا ڈھنگ اور دیگر دل نواز خصوصیات اپنا رنگ بھرتی رہیں گی —— آخر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ ہر نیا سماجی نظام اپنے پیشرو نظاموں کی خامیوں اور کوتاہیوں کو رد کرتے ہوئے ان کی حسن و خوبصورتی کو سمیٹ کر اپنی زندگی کو زیادہ توانا اور حسین بناتا ہے۔ میرے خیال میں ہمارے لوک ادب (جس کی ایک صنف لوک گیت بھی ہیں) کی بھی مستقبل میں یہی قسمت ہوگی آنے والے غیر طبقاتی سماج میں ہماری زبان کا ادب بھی ایک ایسا سنگم ہوگا جس میں لوک ادب کے چھلچھلاتے جھرنوں اور انفرادی ادب کے پُروقار دریاؤں کا نتیجہ خیز ملاپ ہوگا اور وہ ادب ہمارے موجودہ ادب سے کیفیاتی طور پر مختلف اور جامع تر ہوگا۔

صالحہ عابد حسین

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری!

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

یہ شعر جتنا کشمیر کی شان پر صادق آتا ہے۔ اتنا شاید ہی دُنیا کے کسی خطے پر پُورا اُترتا ہو۔ مانا کہ اس دُنیا میں بہت سے خوبصورت مقام ہیں لیکن یہ وسعت یہ شان' مناظر کی یہ رنگا رنگی جو کشمیر میں ہے اور جگہ کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ اور کہاں ہمالیہ جیسے برف پوش پہاڑ ہیں۔ جن کی سفید چوٹیاں ہمیشہ آسمان سے سرگوشیاں کرتی نظر آتی ہوں؟ سری نگر' لولاب' پہلگام اور سندھ کی سی فردوس بدوش وادیاں اور کہاں ملیں گی' جن کا نظارہ آنکھوں کو نُور اور دل کو سرور بخشتا ہے۔ ڈل جیسی جھیل اور کس ملک میں ہے جس کے پانی کی نیلاہٹ اور گہرائی سمندر کی شان دکھاتی ہے۔ اور پھر ڈل جیسی سُندر جھیل جس کی بدولت سری نگر کی وادی کے حُسن میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ اس کا موتی جیسا شفاف پانی جو کہیں زمردیں گہرا سبز اور کہیں ہلکا آسمانی نظر آتا ہے۔ اور اس کے سینے پر تیرتے ہوئے سفید و رنگین شکارے کشیدہ کاری کے حسین پردوں اور کشنوں سے آراستہ سیاحوں کو اپنی آغوش میں لئے تیرتے پھرتے ہیں۔ جس کے پہلو میں شالامار' نشاط اور چشمہ شاہی جیسے حُسن کے شاہکار براجمان ہیں۔ شام کے وقت جب سورج اپنی سنہری کرنیں ڈل کی سطح پر بکھیر دیتا ہے اور شفق کی سُرخی پانی میں آگ لگا دیتی ہے۔ تو رنگین بادلوں اور نارنجی سورج کا عکس عجب بہار دکھاتا ہے، اور شنکر آچاریہ کا سر بلند و بالانشین' مندر کا عکس جو پانی کی سطح پر ہمیشہ کانپتا نظر آتا ہے۔ شفق کی سُرخی سے اور بھی حسین اور شاندار معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور پھر جب شب ماہ میں سیمیں چاند ڈل کے آئینے میں اپنے حُسن کا جلوہ دیکھتا ہے تو ساری جھیل نقرئی سیال بن جاتی ہے۔ اس کی کرنیں جھلملاتے پانی سے اٹکھیلیاں کرتی ہیں۔ تو محوِ نظارہ کو دھوکا ہوتا ہے کہ وُہ اس آب و گل کی دُنیا سے کہیں اور کسی سپنوں کے سنسار یا پریوں کے دیس کی سیر کر رہا ہے۔

اور اسی کشمیر میں مانسبل کی جھیل بھی ہے۔ اُونچے اُونچے سرمئی پہاڑوں کی گود میں یہ بیضوی وضع کی چھوٹی سی جھیل حسن و دلکشی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کے چاروں طرف رنگین وسفید کنول کے پھولوں کی جھالر لگی ہے جن کے نیچے زمردیں پتوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ان تھالی نما گول گول مخملیں پتوں پر شبنم کے موتی اس طرح بکھرے رہتے ہیں۔ جیسے کاشانی مخمل پر سچے موتیوں کے بیل بوٹے کاڑھ دیئے گئے ہوں۔

اور کشمیر ہی کی گود میں جہلم' لدر' سندھ جیسے فیض رساں دریا پرورش پاتے ہیں۔ جن کا سرد' شیریں' صحت بخش پانی ہمیشہ پیاسوں کو سیراب کرنے کے لئے بیتاب نظر آتا ہے۔ اور پھر فلک بوس پہاڑوں کی گود میں کتنے ہی برف کے گلیشیر ہیں جن کی تہ در تہ جمی ہوئی برف کو چشم فلک نے بھی پگھل کر پانی بنتے نہیں دیکھا۔ اسی کشمیر میں دُنیا کی ایک نایاب وبے بہا چیز زعفران پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی خُدا کی قدرت ہے کہ یہ قیمتی خوشبودار پتے کشمیر کے چند میل کے علاقے میں جسے پام پور کہتے ہیں خود بخود اُگ آتی ہے۔ اور صرف یہی نہیں کہ دُنیا میں اور کہیں نہیں پیدا ہوتی بلکہ کشمیر کی وسیع وادی میں بھی کہیں دوسری جگہ نہیں پائی جاتی۔ اس کے پانچ پتی کے کاسنی پھول چاندنی رات میں ستاروں کی طرح چمکتے ہیں اور اس پھول کا زیرہ زعفران کے نام سے ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ اس کے کھیت کو دیکھ کر انسان کو جو فرحت ہوتی ہے وہ ضرب المثل بن

گئی ہے۔ کسی کو بہت خوش دیکھ کر ہم کہتے ہیں کیا بات ہے جو کشتِ زعفران بنے ہوئے ہو۔" یا "کیا زعفران کا کھیت دیکھ پایا جو اس قدر خوش ہو۔"

کشمیر میں ہزاروں نظارے سینکڑوں جلوے اور رنگا رنگیاں چھپی ہوئی ہیں۔ یہاں کے رس دار و شاداب پھل، یہاں کے رنگ برنگے سُندر پھول، لہلہاتا ہوا سبزہ، نادر روزگار و عظیم الشان چنار کے درخت، بلند و بالا سفیدے کی صف بستہ قطاریں، نازک اندام بید مجنوں کے جھنڈ، لالہ و گل کی بہار، دھان کے کھیتوں کی سبزی اور تراوٹ کس کس چیز کو گنایئے۔ کس کس چیز کا بیان کیجئے!!

میں ۱۹۴۳ء میں پہلے پہل کشمیر آئی تھی۔ ٹنل کو پار کرتے ہی بلندی سے سری نگر کی وادی کی جو جھلک نظر آئی اس نے کچھ دیر کے لئے دُنیا مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ سچ مچ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جنت کی جھلک آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ پہاڑوں کی بلندی، جہلم کا پیچ و خم، جھیلوں کی خوبصورتی، آبشاروں کا نغمہ، چنار اور سفیدے، لالہ و گل، سوسن و کنول کا نکھار، ہر چیز دل کو لبھاتی، نظر کو تراوٹ بخشتی محسوس ہوتی تھی، اور اقبال کے شعر ذہن میں گونج رہے تھے ؎

رفت کشا بہ کاشمر کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببین لالہ چمن چمن نگر

لب جو خود آرائی غنچہ دیدی ؎
چہ زیبا نگارے چہ آئینہ دارے
تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را
نہاد است در دامنِ کوہسارے

اور تب سے آج تک بارہا کشمیر آئی ہوں اور اس کے حسن نے ہر بار ایک نئے انداز سے مجھے لبھایا ہے۔ اس بار پٹھان کوٹ سے سری نگر تک ہوائی جہاز سے سفر کیا تو ایک نئی ہی شان نظر آئی۔ وہاں گرمی کی شدت، لو کی حدت اور دھول و خاک کی کثرت سے جان وبال معلوم ہو رہی تھی، لیکن جب بارہ ہزار فیٹ کی بلندی سے پیر پنجال کے برف پوش پہاڑوں کے سے پرواز کرتے ہوئے نیچے اترے تو ہوائی جہاز کی بلندی سے سری نگر کی وادی نے جو کسی ماہر فن کار کی شاہکار تصویر معلوم ہو رہی تھی۔ اپنی سُندر، سرد اور سرسبز آغوش ہمارے لئے دوا

کر دی اور ہم میدان کی گرمی اور تپش سب کچھ بھول گئے۔

میں آٹھ نو بار کشمیر آئی ہوں اور اس کی بہت سیر کی ہے پھر بھی شاید میں اس کا ایک آٹھواں حصّہ بھی نہیں دیکھ پائی ہوں گی۔ لیکن جتنا کچھ دیکھا ہے اس میں ہر بار ایک نئی آن اور شان پائی ہے۔

مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے جب بعض لوگوں کے منہ سے یہ سنتی ہوں کہ کشمیر میں ہے کیا؟

ایک بار پہل گام سے واپس آتے ہوئے دو حضرات کو باتیں کرتے سُنا، فرما رہے تھے "بھئی بڑا شہرہ سُنتے تھے کشمیر کا مگر ہمیں تو کچھ بھی نہیں، سوا ٹٹو اور پٹو کے یہاں اور ہے کیا؟" سچ ہے ؎

فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست

ایک اور صاحب نے ایک بار فرمایا کہ "پہل گام، پہل گام کیا رکھا ہے پہل گام میں؟ اس سے تو ہمارا حضرت گنج کہیں بہتر ہے۔" ایسے لوگوں ہی کے لئے موری کے کیڑے کی مثل بنائی گئی ہو گی۔

میں نے جب صرف کشمیر کا ذکر پڑھا اور اس کی تصویریں دیکھی تھیں جب بھی اس کی دلدادہ تھی اور پھر اس وقت بھی جب ہر سال یہاں آنے کا موقع ملتا تھا۔ اور اب بھی جب کئی سال بعد اس سندر دیس کے درشن ہوئے ہیں۔ میری اس سے دلچسپی اور محبت میں کمی نہیں آئی۔ یہاں کے صرف قدرتی مناظر ہی میرا دل نہیں کھینچتے بلکہ اور بھی بہت سی دلکشیاں ہیں۔ یہاں کی سندر دستکاریاں، پیپر ماشی، لکڑی، چاندی اور بید کے کام کی خوبصورت چیزیں، ریشم اور اون پر چابکدستی اور خوبصورتی سے کاڑھے ہوئے بیل بوٹے یہاں کے باشندوں کے ذوقِ حسن اور فن کارانہ صلاحیت پر دال ہیں۔ ان میلے کچیلے اور دُبلے پتلے لوگوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی انگلیوں میں حسن اور فن کی دنیائیں پوشیدہ ہیں اور پھر کشمیر کا معصوم حسن بھی کچھ کم پُرکشش نہیں۔ گلاب کے پھول جیسے شگفتہ چہرے والے بچے اور سیب کے سے سُرخ گالوں اور ہرنی کی سی سیاہ آنکھوں والی حسین دوشیزائیں دنیا میں اپنے حسن کے لئے مشہور ہیں۔

تین سال پہلے جب میں نے سوئٹزرلینڈ کو دیکھا تو مجھے بے اختیار کشمیر کی یاد آ گئی۔ ان دونوں دیسوں کو فطرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ

حسین و دل کش مناظر عطا کئے ہیں اور دونوں کے باشندوں میں دستکاری کی فن کارانہ صلاحیت ودیعت ہوئی ہے۔ دونوں جگہ کے لوگ حسن ظاہری سے مالا مال ہیں۔ آلپس کی چوٹیاں ہمالیہ کی یاد دلاتی ہیں۔ اور دریائے راین میں جہلم کی شان ہے۔ ایک سوئٹزرلینڈ کا حسن ڈل کی خوبصورتی سے لگا کھاتا ہے۔ اور لالہ و گل، سرو سمن، آبشاروں اور چشموں کا یہ دیس واقعی کشمیر کا چھوٹا بھائی معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی دونوں میں بہت فرق ہے۔ حسنِ فطرت کے ساتھ ساتھ انسانی ہاتھ کی صناعی نے وہاں کے حسن میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ وہاں صفائی ہے، سلیقہ ہے، دولت ہے، قابلیت ہے، یہاں صدیوں کی غلامی نے انسانوں کو پامال کر دیا ہے۔ جہالت، مفلسی، بیماری، گندگی اور بہت سے نفسی روگوں نے لوگوں کے ظاہری اور باطنی حسن کو گہنا دیا ہے۔ اسے دیکھ کر انسان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ یہاں کی حالت پر دل افسردہ ہو جاتا ہے۔

لیکن اب، جب کہ ہندوستان نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں اپنی آزادی کی دولت کو غاصبوں کے ہاتھ سے پھر سے واپس لے لیا ہے۔ کشمیر کو بھی صدیوں کی غلامی سے چھٹکارا مل گیا ہے۔ نیا کشمیر اب اپنی خامیوں، خرابیوں اور کمزوریوں کو دُور کرنے پر کمربستہ ہو رہا ہے۔ اب کشمیر سے بھی جہالت کی لعنت دُور ہو رہی ہے سفید قمیض اور بستے لیکر بیسیوں سینکڑوں پیارے پیارے بچے صبح کو اسکولوں کی طرف جاتے ہوئے نئے کشمیر کو تعلیم و ترقی کا پیام دیتے ہیں۔ ہر جگہ سینکڑوں کام گار اپنے اپنے کاموں میں تن من سے لگے ہوئے اس دیس کی نئی تعمیر کا سندیسہ دے رہے ہیں۔ کشمیری کسانوں کے بدن پر ثابت اور نئے کپڑے اور ان کے چہروں پر تندرستی کا ہلکا سا رنگ ان کی خوشحالی اور کشمیر کی خوش قسمتی کی نشانی ہے۔

یہ سچ ہے کہ کشمیر ابھی اپنی منزلِ مقصود سے دُور ہے جس طرح ہندوستان ابھی اپنی منزل سے دور ہے مگر دونوں اس منزل کی طرف گامزن ہیں۔ کشمیر عزم اور حوصلہ کے ساتھ اس منزل کی طرف قدم بڑھا رہا ہے جس میں ہر کشمیری علم کی دولت سے مالا مال ہوگا۔ خوشحالی اور صحت مندی، سلیقہ اور صفائی، سچائی اور تعمیر

ایمان داری، کارگزاری اور خود اعتمادی اس کی نمایاں خصوصیات ہوں گی۔ جب کشمیر کا ظاہری اور فطری حسن ہی نہیں اس کا باطنی حسن بھی دُنیا کو اپنی طرف کھینچے گا۔ جب وہ صرف نگاہوں ہی کے لئے نہیں دل اور دماغ کے لئے بھی فرحت و مسرت، کیف و سرور کا ایک دل کش نغمہ بن جائے گا ــــــ

بقیہ :- روش صدیقی ــــ محرابِ غزل ......

لیکن شاعر کو بھی سماجی اور معاشی قوتوں کا ہمیشہ جائزہ لینا پڑتا ہے۔ ہمیں اس مسئلہ پر بھی اچھی طرح غور کرنا ہے کہ آج غزل کس حد تک ہمارے ساتھ رہ سکتی ہے۔ غزل کے جدید مطالبوں پر گہری نظر ضروری ہے۔ آج غزل کو اسی ریاضت کی ضرورت ہے جو فراق نے کی ہے۔ میں اپنے طور پر جب یہ سوچتا ہوں کہ غزل وہاں سے آگے بڑھی ہے یا نہیں جہاں فراق نے اسے چھوڑا ہے تو میرا ذہن چکرا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان شاعروں کی طرف للچائی نگاہوں اور اُمید بھری نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ جن سے جدید غزل کو زیادہ سے زیادہ سوز و گداز اور سرمستی ملنے کی اُمید ہے ــــ روش صدیقی کے تجربوں کی طرف بھی شاید ہم اسی لئے للچائی نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں۔ غزل ایک نیا مزاج چاہتی ہے۔ اور اس کے لئے روش صدیقی جیسے شاعروں کے سوز و گداز کی بھی ضرورت ہے۔ غزل کی غنائی کیفیت کو اور بھی سچائی اور صداقت چاہیئے۔

بقیہ :- آنسو یا

والی تھی کہ چیل نے ایک جھپٹا مارا اور شیلا کی ہتھیلی خالی رہ گئی۔ صرف ننھی سی ایک آہ گونجی۔ سب اُٹھ بیٹھے۔ مگر آنسو یا سکیسر کے سوکھے ہوئے پھولوں جیسے بدن پڑی تھی بالکل کہانی والی پری کی طرح جس کا پھول کسی نے توڑ لیا ہو۔ اس کے چہرے پر وہ پشیمانی تھی جو گناہ عظیم کا اعتراف کرنے پر پھیل جاتی ہے۔ پڑوسیوں سے پرماکی موت کا حال بیان کرتے وقت سہمتا شرم سے گڑھی جا رہی تھی۔ کیسے کمزور دل کی نکلی اسکی ساس بھی جو ایک چھینے کی موت برداشت نہ کر سکی۔ جانے اس بات پر رونا چاہیئے یا نہیں ــــ؟

بقیہ :- ادب میں ہوشمندی کا مقام ...... آپ تسلیم کریں یا نہ کریں کسی چیز کے وجود پر کوئی اثر نہیں پڑتا ...... مجھے گلیلیو کا وہ ڈرامائی واقعہ یاد دلانے دیجئے کہ جب وہ عدالت کے سامنے ...... عدالت سے نکلا کہ زمین نہیں گھومتی تو فوراً ہی واپس آ گیا اور عدالت کو مخاطب کر کے کہنے لگا ــــ مگر زمین تو پھر ہے

دیس وچھوڑا

پدما شرما

(ڈوگری نظم)

ڈوگری زبان کی اس نظم میں شاعرہ نے اس پہاڑی لڑکی کے غمناک جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ جو رشتہ ازدواج میں منسلک ہو کر اپنے جانے پہچانے ماحول کو چھوڑنے پر مجبور ہے۔ اپنے بچپن کے پر بہار گھوارے سے جدا ہونے کا احساس ہی اس نظم کا محرک ہے۔ اور شاد صاحب کے ترجمہ میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ اصل نظم کا بنیادی میلان مجروح نہ ہونے پائے۔ (ادارہ)

نکرے بھنگرو اچی اڈان
جاننے تھمنا کیناں سمان
چانیاں گلے کیناں لانیاں

سونا لوں دے جوٹھے بیان
نندی منڈی کری منیں اوجان
جوٹھیاں رمجاں کہناں سنیاں

اپنے دیسا دا ماری ڈواریاں
بچھڑی آئیاں دھیاں کواریاں
ایتھیں نی تیرے تتے مدان
کسنے کھے بٹ مان بجھان
ٹھنڈیاں بالکاں کیناں لیناں
کتھیں گے میرے باگ تے بوٹے
عیاں پینگاں اچڑے چوٹے
بنہیں دی سوئی دا تیر کمان!
ڈونگیاں دھاراں تے کھلے مدان
بکھلیاں گیداں کیناں کھیناں

احساسِ مفارقت

نریش کمار شاد

پر ہی زخمی ہیں جب تخیل کے — کیا کریں اپنی سیر اڑان کو ہم
چاندنی سے لپٹ نہیں سکتیں — چھو نہیں سکتیں آسمان کو ہم

ساس اور نند کے کئی الزام — ہم کو مجبور ہو کے سہنے ہیں
سر جھکا کر حیات کے دکھڑے — خامشی کی زبان میں کہنے ہیں

کوہساروں کی نازنینوں کو — بارِ درد و الم اٹھانا ہے
بھولے بھٹکے سے پنچھیوں کی طرح — دور دلیسوں میں اڑ کے جانا ہے

چھوڑ کر سب سہیلیاں اپنی — اپنے ماں باپ کی پناہ سے دور
ہمکو رہنا ہے عمر بھر کے لئے — اپنی گلریز جلوہ گاہ سے دور
پھر کہاں یہ ہوائے سرد جہاں — اپنے بچپن کی شاخ پھولی پھلی
گرم و بے رنگ ریگ زاروں میں — کیا کھلے گی ہمارے دل کی کلی

ان حسین و جمیل باغوں کو — اُف ری تقدیر چھوڑنا ہے ہمیں
شہر کی اجنبی فضاؤں سے — رشتۂ زیست جوڑنا ہے ہمیں

محمود حسین پنجشی

وادیوں کی رانی

ایک اور دفعہ نیچے وادی سے ٹھک ٹھک کی آواز آئی اور اکبر خان سرہانے سے بندوق اُٹھا کر دروازے پر آگیا۔ وُہ نیچے وادی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہاں سب خاموش تھے۔ کچھ دیر کے بعد وادی سے رات کی تاریکی میں ایک چھوٹا سا سایہ اُبھرنے لگا۔ اکبر خان کی اُنگلیاں پھُرتی سے بندوق کی لبلبی پر پھرنے لگیں۔ سایہ اور اُبھرنے لگا۔ اکبر خان فائر کرنے ہی کو تھا کہ سایہ اچانک ایک جگہ رُک گیا۔ اور صرف ٹاوُں ٹاوُں کی آواز اکبر خان کے کانوں میں سما گئی۔ اس کی تجربہ کار اُنگلیاں بندوق کی لبلبی سے ہٹ گیئں۔ وُہ کئی راتیں اسی طرح گذار چکا تھا۔ چند گھنٹے سو کر چند گھنٹے جاگ کر یا ساری ہی رات جاگتے جاگتے!

گلمرگ کی اس پہاڑی پر صرف اکبر خان کی ہی ایک چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی تھی۔ کچی پکی اینٹوں سے بنی ہوئی ایک پرانی جھونپڑی۔ پہاڑی سے نیچے وادی تک ویسے بہت کم فاصلہ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں نے یہ فاصلہ بڑی حد تک بڑھا دیا تھا۔ وادی کے سب لوگ اس فرق کو محسوس کرتے تھے۔ بیشک ان کی نگاہوں میں یہ طویل اور پیچ دار راستہ تھا۔ لیکن اکبر خان کی بڑی بڑی اور گول گول آنکھوں میں نہ تو یہ راستوں کے پیچ ہی دکھائی دیتے تھے اور نہ ہی وُہ اسے ایک لمبی راہ تصوّر کرتا تھا۔ وُہ جس وقت پہاڑی سے نیچے وادی میں اُترتا تو ایک شان سے سینہ تانے ٹھپ۔ ٹھپ ٹھپ اُترا کرتا تھا۔ اور پہاڑی پر چڑھتے وقت بھی اسی شان سے قدم بڑھاتا یعنی سکت تھی اس کی ٹانگوں میں کتنی طاقت تھی۔ اس کے بازوؤں میں۔ رخساروں کی سُرخی میں پہاڑی پر چڑھتے اُترتے دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اس کے جوان جسم میں طاقت کا اُبلتا ہوا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا تھا۔

میں گلمرگ میں چار سال سے رہ رہا تھا۔ اور ان چار برس میں میں گلمرگ سے متعلق بہت سی کہانیاں مکمل کر چکا تھا۔ لیکن اکبر خان کی کہانی — یہ کہانی مجھے عجیب سی لگ رہی تھی۔ کبھی ادھوری اور کبھی مکمل۔ ان خاکوں میں کچھ رنگ شوخ تھے اور کچھ مدھم۔ اس کے متعلق سوچتا رہتا لیکن ذہن میں دھندلے دھندلے نقش آ کر پھر غائب ہو جاتے۔ اُن دنوں میں گلمرگ کے ڈاک بنگلے میں اکثر اوقات آدھی آدھی رات تک نہیں سویا ہوں۔ دن کو بھی میری نگاہیں اکبر خان کے تعاقب میں لگی رہتی تھیں۔ اور رات کو بھی ڈاک بنگلے کے اوپر والے کمرے کی کھڑکی سے میری نگاہیں اس کی پہاڑی پر کی جھونپڑی کو تاکا کرتی تھیں۔ جہاں کبھی دیئے کی روشنی ہوتی تھی اور کبھی گھپ اندھیرا کبھی گیارہ بجے سے پہلے ہی چراغ بجھا کرتا تھا اور کبھی آدھی آدھی رات تک جلتا رہتا۔

"یہ آدھی آدھی رات تک یہاں پہاڑی پر کے مکان میں روشنی کیوں رہتی ہے؟" میں نے ایک رات ڈاک کے ایک ہرکارے سے پوچھا جو میرے ہی کمرے میں سویا کرتا تھا۔ وُہ وادی کا ہی رہنے والا تھا اس سے پہلے میں نے اس سے پہاڑی سے متعلق بہت سے سوالات کئے تھے۔ لیکن اس کے ادھورے ادھورے جوابات سُن کر میری تشنگی بجھتی نہیں بلکہ اور بھی بڑھ رہی تھی میں نے کئی بار اپنے اس سوال کو دُہرایا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس وقت آدھی رات ہے۔ باہر سردی ہے اور بوڑھا ہرکارہ اپنا گھر چھوڑ کر سردی سے ٹھٹھر اسٹامیری چارپائی کے نیچے ایک میلی اور جگہ جگہ پیوند لگی ہوئی لحاف میں دبک کر نیند کی تلاش میں ہے۔ نیند اس کے پپوٹے بھاری ہو چکے ہیں۔ اور

اس کی آنکھیں جب میری آنکھوں سے حسرت سے ٹکراتی تھیں تو ان میں صرف ایک سوال ہوتا تھا: "بابو آپ مجھ بوڑھے کی آنکھوں سے نیند کیوں چراتے ہیں؟" اس بات کو سمجھتے ہوئے میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ اب بوڑھے کو نہ ستاؤں گا۔ لیکن پھر یہی سوال میری زبان اگل کر رہ جاتی اور میں بوڑھے سرکارے سے اس کے جواب کے لئے اصرار پر اصرار کئے جاتا تھا۔

"آپ کھڑکی بند کر دیجئے میں سب کچھ بتاؤں گا۔" وہ اٹھا اور کونے میں رکھا ہوا حقہ بستر کے نزدیک لے آیا۔ اور کانگڑی میں رکھی ہوئی آگ کو پھونک کر تیز کرنے لگا۔ میں نے کھڑکی بند کی اور بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا جو اب چلم میں تمباکو بھر رہا تھا۔

"بتاؤ بابا۔ اب تو کھڑکی بند ہے۔ سردی بالکل نہیں۔" میں بوڑھے کی زبان سے کچھ اگلوانا چاہتا تھا۔ "نہیں [illegible] میرا کمبل میرے پاس کافی بستر ہے، اور مجھے تو سردی میں ہی مزا آتا ہے۔"

"ہاں تو بابو یہ اکبر خان ہے نا وہاں۔" اس نے حقے کے دو چار کش لگائے۔

"ہاں ہاں وہ تو میں جانتا ہوں۔ لیکن یہ تو بتاؤ وہاں یہ آدھی ...."

"بابو وہ شرابی ہے۔ پکا شرابی ہے، اور نہ جانے وہ آدھی آدھی رات کو ہی کیوں پیتا ہے۔ لیکن بہکتا نہیں۔"

"لیکن صورت سے تو وہ شرابی نہیں لگتا۔"

"خوبصورت چھیلا ہے بابو۔ موٹا تگڑا۔ اس نے شرابی نہیں دکھائی دیتا۔ ورنہ بابو وہ شہر سے شراب منگواتا ہے۔" بوڑھا کھانستا جا رہا تھا۔ اور بلغم تھوکتا جا رہا تھا۔

"اچھا بابا اب یہ بتاؤ اکبر خان کا یہ پیسہ وغیرہ ....؟"

"ہاں بابو اکبر خان بہت پیسے والا آدمی ہے لیکن کام تو کچھ نہیں کرتا۔ پر ہے وسیلہ والا۔ نکڑ پر وہ نانبائی کی دکان ہے نا۔ وہ حبیب صوفی کی دکان۔"

"ہاں میں جانتا ہوں اسے۔" میں جلدی سے بولا۔

"تو حبیب صوفی ہی سے مجھے معلوم ہوا کہ اکبر خان کا بینک میں بہت پیسہ ہے۔ وہی نکال کے کھاتا ہے۔ اور پھر ایک اور دن حبیب صوفی ہی سے مجھے معلوم ہوا کہ اکبر خان کا کوئی بھائی پنجاب میں ہے جو پیسہ وغیرہ بھیج دیتا ہے۔ بس بابو اب مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ اٹھا اور حقہ وہیں کونے میں رکھ کر لحاف میں دبک گیا۔

اس رات کے بعد میں نے اکبر خان کے متعلق اور زیادہ سوچنا شروع کیا۔ میں اس سے خود ملنا چاہتا تھا۔ اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن میری یہ خواہش بہت عرصہ اندر ہی اندر دبی رہی۔ وادی کے تو سب لوگ اکبر خان سے ڈرتے تھے۔ کیونکہ اس کے پاس ایک عالی شان بندوق تھی۔ تگڑا جسم تھا۔ اس لئے مجھے بھی اس سے ڈر سا لگ رہا تھا۔ سب جانتے تھے کہ اکبر خان شرابی ہے۔ ان کے نزدیک وہ کچھ کام نہیں کر رہا تھا۔ اس لئے وہ اس سے ڈرتے تھے۔ اور جب کبھی کبھار کسی گاؤں میں اغوا کی واردات ہوتی تو سب اکبر خان پر ہی شک کرتے۔ اس لئے اس کے وادی میں داخل ہونے کے وقت کسی بھی لڑکی کو گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت ہی نہ تھی اور اگر کوئی لڑکی بھولے سے ایسا کر بھی لیتی۔ تو وادی کے سب لوگ اسے بے حیا تصور کرنے لگتے۔ اور بہو بیٹیوں کو اس سے دور رہنے کی شدید تلقین کرتے۔

ایک دن میں سویرے ہی ڈاک بنگلے کی طرف آ رہا تھا کہ دور سے پہاڑی کے نیچے میدان میں مجھے کچھ آدمی دکھائی دئے۔ میں نزدیک آیا۔ اکبر خان کے ارد گرد وادی کے پانچ چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ اکبر خان درمیان میں بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے ہاتھ میں سر کی پگڑی جس سے وہ بندوق کی صفائی کر رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی بچہ اپنے فرن کا دامن ہاتھ میں لئے بندوق کو صاف کرنے لگتا تھا تو اکبر خان ہنس کر بول اٹھتا تھا۔

"خو تم امارا بندوق خراب کرتا۔" اور محبت سے اپنا ہاتھ بچے کے سر پر پھیر لیتا تھا۔

میں اور نزدیک آ گیا۔ میں اکبر خان کو کئی زاویوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت وادی میں زور کی آندھی چلی۔ آس پاس کے بید کے درختوں کی ٹہنیاں زور زور سے ہلنے لگیں۔ گرد و غبار سے ننھے منھے بچوں اور خود اکبر خان کی آنکھیں دکھنے لگیں تھیں۔

"خو تم گھر جاؤ۔ ام بھی گھر جاتا ہے۔" بچوں سے یہ کہہ کر وہ نزدیک ہی بہتے ہوئے پانی کے ایک جھرنے کے کنارے کنارے جانے لگا۔ درختوں

کے زرد زرد پتے گر گر کر جھرنے میں آ بہتے تھے۔ اکبر خان یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جا رہا تھا۔ کہ اچانک اس نے اپنے ارد گرد دور تک اپنی نظریں دوڑائیں اور ایک بوڑھے چنار کے نیچے بیٹھ گیا۔ جھرنے کا صاف شفاف پانی اس بوڑھے چنار کے نیچے سے بہہ رہا تھا۔ اکبر خان نے چلو سے ہی دو چار گھونٹ پئے اور پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ بات میں سمجھ نہ سکا۔ لیکن اتنے میں جب وادی کی ایک خوبرو اور جوان لڑکی اس کے سامنے آ کر اونچی آواز میں بولنے لگی، تو مجھے کچھ شک گذرا۔

"تم ادھر کو" اکبر خان کا پہلا سوال تھا۔

"ایک بات تم سے"

"کیا۔ کیا بات۔ ام سنتا ہے بولو"

خاموشی

"فاطمہ تم کو ام۔ تم کو امارا قسم ہے بولو"

خاموشی۔ ایک طویل خاموشی اور اس خاموشی میں کوئی نہ بولا۔ صرف آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے فاطمہ کی آنکھوں سے گر کر اس کے رخساروں پر جم گئے۔ اکبر خان چونک گیا۔

"کیا بات ہے فاطمہ؟"

"کچھ نہیں ـــ"

"پھر بھی ـ ام کو بولو نا"

نہ جانے لڑکی کیوں نہ بول سکی وہ چپکے سے اٹھ کر وادی میں جانے لگی۔ دیر تک اکبر خان اسے دیکھتا رہا ـ۔ اور پھر وہ بھی اٹھ گیا۔ اکبر خان پہاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ لڑکی وادی کی طرف آ رہی تھی۔ اور آندھی بڑھ رہی تھی۔

اس واقعہ کے بعد میں دو بار سری نگر بھی ہو آیا۔ واپسی پر مجھے اکبر خان کے متعلق بوڑھے سرکاتے سے بہت کچھ معلوم ہو جایا کرتا تھا۔ دوسری بار سری نگر سے واپسی پر شام کو بوڑھے سرکاتے نے خود ہی بات چھیڑ دی۔

"بابو اب تو معاملہ بہت بڑھ گیا ہے۔" وہ گھٹنوں پر لحاف اوڑھے دیوار کا سہارا لئے ہوئے تھا۔

"یعنی؟" میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"یعنی فاطمہ کی شادی"

"لیکن فاطمہ تو ابھی چھوٹی ہے"۔

"بابو آپ نہیں جانتے یہ گاؤں ہے گاؤں۔ یہاں تو چھوٹی ہی عمر میں لڑکی کی شادی ہو جاتی ہے۔ اور پھر ـ ـ " یہاں آ کر بوڑھا رک گیا اور اپنے بائیں ہاتھ سے ماتھا رگڑنے لگا۔

"اور کیا؟ ـ بابا تم مجھ سے صاف صاف کیوں نہیں کہتے" میں اس کے نزدیک آیا۔ اور میرا دایاں بازو اس کے شانے کو چھونے لگا۔

"فاطمہ بدنام ہو چکی ہے نا۔ شریف ماں باپ کی ناک کٹ گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اکبر خان اس سے محبت کرتا ہے۔ اور وہ اسی کی ہو چکی ہے"۔ بوڑھا پھر موڈ میں آ رہا تھا۔

"کیا اکبر خان بھی فاطمہ سے محبت کرتا ہے" میں نے بات بنانے کو پوچھا۔

"بابو وہ خاک محبت کرے گا اس سے ـ۔ کسی وقت بھگا کے لے جائے گا۔ بابو وہ اس سے کیا محبت کرے گا۔ وہ تو اس سے کھیل رہا ہے"۔

"یہ محبت والا قصہ تمہیں کیسے معلوم ہوا"

"کیا کہتے ہیں آپ بابو۔ ساری وادی جانتی ہے اور آپ کہتے ہیں مجھے کیسے معلوم ہوا۔ وادی کے سب لوگوں نے انہیں ایک دوسرے سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ میں ہی کیا کہہ رہا ہوں ساری وادی کہہ رہی ہے اور ذیلدار صاحب بھی تو سن چکے ہیں۔ اب فاطمہ کے ماں باپ انہیں کے کہنے پر اپنی لڑکی کی شادی آفتاب خان سے کرنا چاہتے ہیں۔ تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آفتاب خان چاہ ہی رہا تھا اور اب موقع دیکھ کر جلدی ہی ہاں کر ڈالی ہے"۔

"یہ آفتاب خان کون ہے"

"وہ تو ذیلدار صاحب کا ایک خاص آدمی ہے۔ بچ ہے جو اب تک ہزاروں روپیہ جوئے میں ہار چکا ہے۔ لیکن باز نہیں آتا کمینے کا بچہ۔ اور ذیلدار صاحب کی بھی کبھی کبھی کچھ خدمت کرتا ہے۔ آپ سمجھ گئے نا بابو۔ فاطمہ ہماری اپنی لڑکی کے برابر ہے۔ ہماری وادی کی بیٹی ہے۔ گھر گھر کی بیٹی ہے بابو۔ لیکن تقدیر میں ہی آفتاب خان لکھا تھا اور اس پر ذیلدار صاحب کی سفارش ـ۔ اب ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟" بوڑھے کی پلکوں میں پانی کے

آنسو چھلک رہے تھے۔ اس کی زبان سے الفاظ کچھ اس انداز سے نکل رہے تھے جیسے اس کا دل بہت اداس ہو، اور جیسے وہ مجبوری کی حالت میں روتے روتے اپنی بیٹی کو کسی ذلیل کے ہاتھوں بیچ رہا ہو۔

اس رات بھی میں نہ سو سکا۔ رہ رہ کے عجیب عجیب خیالات ذہن کو ڈس رہے تھے۔ بوڑھا ہرکارہ بھی آج خلاف معمول بستر میں کروٹیں لے رہا تھا۔ جیسے آج اس کے بستر میں کسی نے کانٹے بچھا رکھے ہوں۔ اور یہ سب کچھ میں دیکھ رہا تھا۔ محسوس کر رہا تھا۔

پھر اکبر خان کچھ دنوں وادی سے غائب رہا۔ اس دوران میں نے کئی بار فاطمہ کو سر پہ مٹکا لئے آتے اور جاتے وقت پہاڑی کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے دیکھا۔ شاید وہ اکبر خان ہی کا انتظار کر رہی تھی اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ رخساروں کی سرخی اسی طرح قائم تھا۔ بھرے بھرے جسم میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی اور جھیل جیسی آنکھوں میں اور بھی دل کشی سمٹ آئی تھی۔

وادی میں چہمے گوئیاں ہو رہی تھیں۔ بعض لوگ کہہ رہے تھے کہ اکبر خان نے بدنامی کے ڈر سے وادی چھوڑ دی ہے۔ کچھ کہہ رہے تھے کہ وہ ایسا کرنے والا ہے لیکن ابھی اس نے مستقل طور پر وادی کو نہیں چھوڑا ہے کیونکہ ابھی اس کی بوڑھی ماں پہاڑی پر کے جھونپڑی میں ہی تھی۔ کوئی یہ بھی کہہ دیتا تھا کہ واپسی پر وہ فاطمہ کو بھگا لے جائے گا۔ اور پھر سارے اکبر خان کا انتظار کرنے لگے تھے۔ "وہ کب آئے گا اور کیا کرے گا" میں بھی سوچ رہا تھا۔

چند دن بیت گئے۔ میں ایک دن حبیب صوفی کی دکان پر بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔ اور کبھی کبھی اکبر خان بھی بات چھڑ جاتی تھی۔ کہ حبیب صوفی سرگوشی کے انداز میں بول اٹھا۔

"وہ دیکھو" اس نے ہاتھ سے بھی اشارہ کرنا چاہا لیکن نہ کر سکا۔ میں سڑک کی جانب دیکھنے لگا۔ اکبر خان جا رہا تھا۔ لیکن اس کے قدم ٹھیک سے زمین پر نہیں بیٹھ رہے تھے۔ شاید بہت پی رکھی تھی۔

"کب آیا ہے۔ اس نے تو وادی ہی چھوڑ دی تھی"۔

"دو دن ہوئے ہیں۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے"۔ حبیب صوفی نے پھرن سے لٹکتی ہوئی ناک صاف کی۔

"اچھا پھر ملیں گے۔ ایک کام یاد آیا ہے۔ ذرا جلدی ہے"۔ میں دکان سے نیچے تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا دور سے ہی اکبر خان کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میرے قدم بھی زمین پر آہستہ سے پڑ رہے تھے تاریکی کے سائے گلمرگ کو اپنی اوٹ میں لینے کے انتظار میں تھے۔ اور اکبر خان آکاش پر پھڑ پھڑاتے ہوئے کوّوں کی طرف دیکھ رہا تھا جن کی کائیں کائیں گلمرگ کی خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔ اور کبھی کبھی کوئی چڑیا پھر سے ایک ٹہنی پر آ بیٹھتی تھی۔ اب جھرنا پاس ہی آ گیا تھا۔ اکبر خان اسی بوڑھے چنار کے نیچے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اور جھرنے کے بہاؤ کو دیکھنے لگا۔ شام کے دھندلے دھندلے سایوں میں کوئی لڑکی اکبر خان کے جانب آ رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے اپنے دائیں بائیں اور کبھی کبھی پیچھے کی طرف دل پر ہاتھ رکھے ہوئے دیکھنے لگ جاتی تھی۔ جیسے کوئی باز فاختہ کا تعاقب کر رہا ہو۔ اور فاختہ سہمی سہمی بھاگ رہی ہو۔ وہ آئی اور اپنا ہاتھ اکبر خان کے ہاتھوں میں دے دیا۔ جو کہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"خو تم آ گیا" اکبر خان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہش۔ آہستہ" اس نے اپنا ہاتھ اکبر خان کے منہ پر رکھ دیا۔

"اب تمہارا شادی ہے" اکبر خان نے پھر کہا۔

"لیکن یہ میری موت ہے"۔ لڑکی آہستہ بولی۔

"خو تم شادی کو پسند نہیں کرتا"۔

"لیکن اس کے ساتھ نہیں" لڑکی کی نگاہیں یکدم سے اکبر خان کے چہرے سے اٹھ کر شپ شپ کرتے ہوئے جھرنے کے پانی پر جم گئیں۔

"پھر تم کس سے شا ۔ ۔ ۔"

خاموشی ــــ

"بولو تم کو امارا قسم ہے ــ؟"

خاموشی ــــ

"خو، فاطمہ ام تمارا بھائی ہے ــ تم امارہ بہن ہے۔ ام کو نہیں بولے گا۔ بولو کس سے"۔

"رحمان سے"

"خو، تم اس کو چاہتا ہے"۔ جھرنے کے شپ شپ کرتے پانی میں دلنواز قہقہے کی گونج بلند ہوئی۔

"تو تمارا شادی رحمان سے ہوگا۔ ام تمارا شادی رحمان سے بنائے گا۔"

"لیکن آفتاب" التجا کی نگاہیں اوپر اٹھیں۔

"تو تم گھر جاؤ۔ ام بھی گھر جاتا ہے۔" اور وہ جلدی جلدی فاطمہ سے علیحدہ ہوکر پہاڑی کی جانب بڑھنے لگا۔

اور اسی رات سے اس کی اکثر راتیں جاگتے جاگتے ہی گزرتی تھیں۔ اور آدھی آدھی رات تک چراغ جلتا رہتا تھا۔ وہ بیمار رہتا تھا جاگتا رہتا تھا۔

میں اور بوڑھا ہرکارہ بھی نیند کے حسین لمحات کھو بیٹھے تھے۔ اور انہیں لمحات میں ایک رات بوڑھا ہرکارہ ابھی ابھی سو پڑا تھا۔ کہ دیوار پر لگے ہوئے پرانے کلاک نے گیارہ بجائے۔ وادی سے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میرے کمرے کی کھڑکیوں پر لگے ہوئے شیشوں پر دھیمی دھیمی سی روشنی پڑی۔ میں نے ہولے سے کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا۔ دو آدمی پہاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے کے کندھے پر بندوق لٹک رہی تھی۔ میں نے پہاڑی کی طرف دیکھا وہاں چراغ بدستور جل رہا تھا۔ اور مدہم سی دھیمی دھیمی روشنی میں مجھے اکبر خان کا جسم حرکت کرتا دکھائی دیا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہاں چراغ بجھ گیا۔ شاید ان دو آدمیوں نے بھی یہ حرکت دیکھی تھی۔ وہ درختوں کی اوٹ سے پہاڑی کی جانب بڑھنے لگے۔ دونوں آدمی بمشکل نظر آتے تھے۔ اب وہ درخت بالکل پیچھے چھوڑ چکے تھے۔ اور دونوں آدمی پگڈنڈی پر آگئے۔ ایک نے دوسرے کے ہاتھ سے خاموشی کے ساتھ لالٹین لی اور لو کم کرنے لگا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کہ خاموشی کو چیرتی ہوئی گولی کی صدا پہاڑی سے بلند ہوئی۔ اس کے ہاتھ سے لالٹین چھوٹ گئی اور ساتھ ہی وہ بھی ایک خوفناک کراہ کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ دوسرا آدمی واپس وادی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اور اسی وقت پہاڑی کی جھونپڑی سے دو سائے نیچے وادی کی طرف آ رہے تھے۔

تب سے بہت دن بیت گئے۔ گلمرگ پر بہار آگئی۔ بوڑھے چنار کی ٹہنیوں پر نئی نئی کونپلیں پھوٹ پڑیں۔ جھرنے کے نیلے نیلے پانی میں نکھار سا آگیا۔ اور پورے تین مہینے کے بعد بوڑھے مکھیا کا جوان بیٹا دولہا بن کر فاطمہ کو لانے جا رہا تھا ــــ دھرتی کا بیٹا وادی کی رانی کو لانے جا رہا تھا ــــ

ــــ اور انہی تین مہینوں سے اکبر خان اور اس کی نحیف ماں وادی سے غائب ہوگئے تھے۔ مگر جانے سے پہلے اکبر خان نے اپنی وادی کی رانی کا کانٹا ہمیشہ کے لئے نوچ کر اپنے سینے میں پیوست کر دیا تھا ــــ

صدیق غلام احمد
بلاک ڈویلپمنٹ آفیسر

خاموش انقلاب

غیر ملکی حکمرانوں اور ریاستی راجواڑوں کے مطلق العنان اقتدار سے آزاد ہو کر اب ہمارے دیس کی تحریک آزادی کا دوسرا سفر شروع ہوتا ہے۔ اور اس سفر کی منزلیں اقتصادی ترقی اور سماجی بہبود کی اعلیٰ قدروں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ سیاسی آزادی کے لئے ہم نے کافی جدوجہد کی ہے اور بھاری قیمت ادا کی ہے۔ مگر اس کی تکمیل اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم مادی اور ذہنی طور آزاد نہیں ہو جاتے اور عہد غلامی کی باقیات سے چھٹکارا پا کر ایک آزاد اور زندہ قوم کے خصائص سے بہرہ ور نہیں ہوتے۔ یہ نکتہ ہندوستان کے مقتدر لیڈروں کی نگاہ سے کبھی اوجھل نہیں ہونے پایا۔ اور آزادی کے حصول کے بعد ہی اقتصادی آسودگی اور سماجی بہبود کی اعلیٰ قدروں کو پا لینے کی جدوجہد کا آغاز کیا گیا۔ ایک طرف بھاکرہ ننگل اور ہیراکڈ ڈیم جیسے عظیم منصوبوں کے ذریعے ملک کی کایا پلٹ ہونے لگی اور دوسری طرف کمیونٹی پروجیکٹ اور قومی توسیعی سروس کے تحت دیہاتوں کے پسماندہ عوام کو نئی زندگی کے تقاضوں سے نپٹنے کے لئے منظم کیا جانے لگا۔ تاکہ وُہ خود اپنی مدد کے لئے جاگ اُٹھیں۔ اور اپنی محنت سے غربت اور جہالت کے اُن پردوں کو نوچ ڈالیں۔ جن کی منحوس پرچھائیاں اُن کو طرح طرح کی مصیبتوں میں گھیرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جہاں منصوبہ بندی کے میدان میں قابل فخر کارنامے سرانجام دیئے گئے۔ وہاں سماجی بہبود اور دیہات سدھار کی سروس میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی گئی۔ جس کا شہرہ ہندوستان سے باہر بھی پھیل گیا۔ اس سلسلے میں انڈونیشیا، برما، پاکستان اور افغانستان کے وفد اس نئی اور حیرت انگیز تکنیک کا مطالعہ کرنے کے لئے ہند کا دَورہ کر چکے ہیں۔ اور ہندوستان میں کئے گئے کام کی پُرزور سراہنا کر چکے ہیں۔

ہندوستان کی باقی ریاستوں کی طرح کشمیر میں بھی دیہات سدھار کی تحریک پہلے ہی شروع کی گئی۔ مگر فی الحقیقت یہ تحریک اور کمیونٹی پروجیکٹ اور قومی توسیعی سروس کا اطلاق اور عمل درآمد موجودہ وزارت کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ہی ہوا۔ سابقہ وزارت کے دَور میں باقی اہم مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی طاقِ نسیاں کی زینت بنا رہا۔ مگر موجودہ حکومت نے عنانِ اقتدار سنبھالتے ہی اس طرف پوری توجہ کی، اور کوشش کی جانے لگی کہ گذشتہ غلطیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کی جائے۔ اس سلسلہ میں دیہات سدھار کے محکمے کو از سرِ نو منظم کرنے کا بیڑا اُٹھایا گیا۔ اور اُس کے دوش بدوش قومی توسیعی سروس اور کمیونٹی پروجیکٹ کے بلاک کھول کر ریاست کے مختلف حصوں میں ترقی کا ایک ہمہ گیر سلسلہ شروع کیا گیا۔ پہلے پہل یہ بلاک تحصیل کی سطح پر کھولے گئے، اور آج سے کچھ عرصہ پہلے ہی ہر تحصیل میں اس قسم کے متعدد بلاک قائم کئے گئے۔ تاکہ دیہات کی زندگی کو منقلب کرنے کا کام زیادہ سُرعت سے کیا جا سکے۔

اس وقت قومی توسیعی سروس اور دیہات سدھار کو ایک جامع سکیم کے تحت یک جا کر کے چلایا جا رہا ہے۔ پنچایت اس سلسلے کی بنیادی اکائی ہے۔ اس کے اراکین گاؤں کے لوگ منتخب کرتے ہیں۔ جس کا صدر سرپنچ کہلاتا ہے۔ پہلے اس کا کام صرف گاؤں کے معمولی قسم کے جھگڑوں کی شنوائی کرنا تھا۔ مگر اب یہ سدھار اور ترقی کا بنیادی بورڈ بن گیا ہے۔ اس کو حکومت کی طرف سے ہر سال تین ہزار روپے ملتے ہیں۔ جو پنچایت کے دائرہ کار میں ابتدائی قسم کے ترقیاتی کاموں پر خرچ کئے جاتے ہیں۔ اور پنچایت کے تحت عوامی نمائندوں ... کے ذریعے عام لوگوں کو متحرک کیا جاتا ہے کہ وُہ اپنے گاؤں اور حلقے

کو ترقی کی راہ چلانے کے لئے خود منظم ہو جائیں اور اپنی پُر خلوص اور رضاکارانہ محنت کے اضافے سے اس قسم کا صحیح مصرف کریں۔ قومی توسیعی سروس کے تحت حکومت کی طرف سے ٹیکنیکل اور باقی ماہر عملہ دہقانوں کی معاونت اور سہاینتا کے لئے موجود رہتا ہے اور اس طریقے سے ایک سمجھے بُوجھے طریقے سے گاؤں کے مسائل کے لئے اقدامات کئے جاتے ہیں۔

نئی سکیم کے تحت پنچایت کے صدر مقام کے لئے ایک خاص قسم کا پنچایت گھر تعمیر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک یک منزلہ عمارت ہوتی ہے جس میں ایک بڑے ہال کے علاوہ چند چھوٹے چھوٹے کمرے ہوتے ہیں۔ یہ عمارت نہ صرف پنچایت کے صدر مقام کا کام دیتی ہے۔ بلکہ عملی طور پر گاؤں میں نئی زندگی اور تہذیب کے منبع کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ایک سماجی مرکز، چھوٹی موٹی لائبریری، تفریح کے سستی آموز سامان اور کھیل کود کا سامان رکھا جاتا ہے۔ اور یہاں پر دن بھر کی مشقت سے پژمردہ کسان آکر اپنی اپنی پسند کے شغل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جو اُن کے قوائے ذہنی اور جسمانی کی تربیت اور تہذیب کا سبب بھی ہوتا ہے۔ ان پنچایت گھروں میں ایک سوشل ورکر تعینات ہوتا ہے۔ جو اس کے سارے نظم کے لئے ذمہ دار ہوتا ہے۔ پنچایت گھر کے ساتھ ہی ایک بڑی نرسری کھولنے کی سکیم بھی درج ہے۔ جس میں طرح طرح کے ثمردار درختوں کا ذخیرہ لگا ہوتا ہے۔ جو ہر سال گاؤں والوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ پنچایت گھر کے ساتھ ایک چھوٹا موٹا باغیچہ بھی ملحق ہوتا ہے۔ جس کو اچھے طریقے سے آراستہ پیراستہ کیا جاتا ہے۔

کشمیر میں اس سکیم کا پہلا دور۔ یعنی پنچایت گھروں کی تعمیر شاندار طریقے سے انجام پایا ہے۔ عام لوگوں نے پنچایت گھر کے لئے بڑی خوشی سے بڑے بڑے رقبہ جات اور نرسریوں کیلئے زمینیں دان دیدیں۔ اور اس کے بعد فراخدلی سے پنچایت گھر تعمیر کئے گئے۔ اسوقت یہ کیفیت ہے کہ عوام کی رضاکارانہ محنت سے ساڑھے چار سو پنچایت گھر تعمیر ہو چکے ہیں۔ ان کے ساتھ نرسریوں اور باغیچوں کے لئے وسیع خطۂ زمین بھی وقف کر دئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کامیابی اس سکیم کے لئے حوصلہ افزا ہے اور بجا طور پر توقع ہے کہ اس سال اس سکیم کا رنگ و روپ اور نکھر آئے گا۔

قومی توسیعی سروس کا طریقہ کار گو خاموشی کا حامل نظر آتا ہے۔ مگر درحقیقت یہ عملی مقاصد کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوا ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو اسباب کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ طریقۂ عمل کس طرح آہستگی مگر پختہ طور اور نرم روی مگر مستقل طور دیہات کی زندگی کا نقشہ بدل رہا ہے۔ اور گندگی کے ڈھیروں کے بدلے صحت مند، صاف اور ترقی پذیر گاؤں اُبھرتے جا رہے ہیں۔ اسوقت تک اس سکیم کے تحت دیہات میں ہزاروں بیت الخلاء اور ہزاروں غسل خانے بنائے گئے ہیں۔ جو گاؤں والوں کی صحت اور صفائی کے لئے لگن کا نتیجہ ہیں۔ اسی طرح کھاد کے ہزاروں گڑھے کھودے گئے ہیں جن کی بدولت ایک تو گاؤں کی گندگی کا ایک کثیر حصہ زمین دوز ہو گیا ہے اور دوسرے ملک کی زرعی دولت کیلئے کھاد کا ایک اچھا ذخیرہ مل گیا ہے اسی طرح گاؤں والوں نے مل کر اپنی اجتماعی محنت سے تالاب اور کنوئیں بنائے اور گاؤں گاؤں ہزاروں میل لمبی سڑکیں تیار کی گئیں۔ جس پر قومی خزانہ کا لاکھوں روپے خرچ ہو جاتا ــــ اس طرح لاکھوں ثمردار درخت لگائے گئے جو ملک کی خوشحالی کے مستقل خزینے بن سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس سروس کے تحت گاؤں کے طریقۂ کاشتکاری کو بھی جدید طریقوں سے قریب لانے کی کوشش جاری ہے۔ نو بہ نئے نئے طریقے اور سائنس کی جدید اختراعات سے خاطر خواہ طور استفادہ کیا جا رہا ہے۔ عام لوگوں نے اپنی محنت سے بہت سی نہریں نکالیں اور حکومت کی جانب سے آبپاشی کو وسعت دینے کے لئے بڑے بڑے منصوبے عمل میں لائے گئے۔ نئے قسم کے زرعی آلات متعارف کئے گئے اور اس کے ساتھ ساتھ کیمیائی کھاد کے استعمال کیلئے وسیع پیمانے کی مہم شروع کی گئی جس کی بدولت ریاست کی پیداوار میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے [illegible]

[illegible] گاؤں کی [illegible] کیلئے بھی اقدامات کئے جا رہے ہیں اور جس طریقے سے [illegible] ہو رہا ہے [illegible] واضح ہو جاتا ہے کہ اس سکیم کا مستقبل شاندار ہے۔

حدیثِ دیگراں

اننت ناگ
دکن۔ یکم جنوری ۱۹۵۷ء

عزیز دوست۔ آپ کا خط اور "تعمیر" کا پرچہ دونوں ملے۔ بہت بہت شکریہ! کشمیر کے حسنِ خداداد کے جلوؤں سے دل کی آنکھیں اب تک خیرہ اور خیال کا دم چڑھا ہوا ہے۔ اس لئے جذبات شعر کے قالب میں ڈھل نہ سکے۔ سرکاری کام کی جان لیوا مصروفیت بھی ایک حد تک اس خاموشی کی ذمہ دار ہے۔ بہرحال جو نئی نظم یا غزل ہوگی "تعمیر" کی نذر کروں گا۔

"تعمیر" کے مضامین کی طباعت اور کتابت کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر پرچے میں ایک کشمیری کہانی اور ایک کشمیری نظم (اردو ترجمے کے ساتھ) ضرور شائع کیا کیجئے۔ لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ ورنہ باہر کے لوگوں کو آپ کے پرچے سے زیادہ دلچسپی نہ ہوگی۔ "تعمیر" کو کشمیر ہی کا نہیں بلکہ ہندوستان کا بہترین رسالہ بنانے کی کوشش کیجئے۔ والسلام

مخلص:۔ سکندر علی وجد

انجمن ترقی اردو (ہند)
علی گڑھ ۳ر جنوری ۱۹۵۷ء

عزیزم! عرصہ ہوا تمہارا خط ملا تھا۔ مگر "تعمیر" کا دیدار اب جا کر ہوا۔ یہ چھٹا شمارہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ پانچ پرچے اور نکل چکے ہیں۔ مجھے اس پرچے کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ تم جانتے ہو کشمیر اور وہاں کے عوام سے مجھے کتنی محبت ہے اور انہیں خوش حال اور ذہنی اور مادی اعتبار سے آسودہ دیکھنے کی کتنی تمنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ "تعمیر" کشمیر کے اچھے لکھنے والوں کو ہماری ادبی دنیا سے روشناس کرے۔ کشمیر کے جمالیاتی اور تخلیقی احساس کو ہم تک پہنچائے اور اس طرح اردو کی دنیا میں اپنا مقام بنالے۔

اچھے پرچے کے لئے صرف مواد کافی نہیں۔ اس کی کچھ خصوصیات ہونی چاہئیں۔ "تعمیر" میں مقامی رنگ اور مقامی فضا اس کی سب سے اچھی خصوصیت ہوگی۔ ویسے ارتباط ذہنی کے لئے دوسرے صوبوں کے ادبی کارنامے بھی آنے چاہئیں۔ مگر اسے کشمیری زبان کے جواہر پاروں کو بھی رفتہ رفتہ اردو میں ضرور پیش کرنا چاہیئے۔

تصاویر اور چھپائی کا معیار اور بڑھانے کی ضرورت ہے۔ "بزمِ تعمیر" کا خیال بھی بہت اچھا ہے۔ میں اس میں مدد کرنے کو تیار ہوں۔

تمہارے لئے کچھ نہ کچھ جلد بھیجوں گا۔

مخلص:۔ آلِ احمد سرور
جنرل سیکرٹری

شہید گنج سرینگر
۱۸ر جنوری ۱۹۵۷ء

پیارے شمیم!

تازہ شمارہ ملا۔ شاذ تمکنت کی نظم "خرام" مجھے یہ لکھنے پر اکسا رہی ہے کہ "تعمیر" نے ترقی کر لی ہے۔ کتنی پیاری نظم ہے۔ آہ کو شب گزاری کی خلش تڑپا گئی اور مجھے یہ نظم۔ سچ کہتا ہوں بہت عرصے کے بعد ایک بہت ہی پیاری نظم پڑھنے کو ملی ہے۔ پروفیسر حسن شاہ کا مضمون پسند آیا۔ وہ یہ سلسلہ جاری رکھیں تو کتنا اچھا ہو۔ پردیسی پر مضمون سطحی ہے۔ مظفر عازم کے مضمون سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ ان سے کچھ اور مضامین لکھواؤ۔

اس طرف میں نے جگر، روش، احتشام حسین، وجد اور خلیل الرحمن اعظمی پر مقالے لکھے ہیں۔ ایک پر تمہارا حق ضرور ہے۔ بھیج دوں گا۔

مخلص
شکیل الرحمن

مجھے قوی امید ہے کہ آپ کی ادارت میں یہ پرچہ کافی ترقی کرے گا!

نیاز کیش: مبشر علی صدیقی

فن کار۔ دہلی
۹۳۰ چاندنی چوک

برادرم۔ آداب! "تعمیر" ملا۔ شکریہ۔ پرچہ بجا طور پر نئے کشمیر کا عکاس ہے اور آپ کی محنت اور سلیقے کی داد دینا پڑتی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ "تعمیر" کو بہت جلد اُردو رسائل کی صف میں ممتاز جگہ ملے گی۔ کار لائق؟

مخلص:۔ پرکاش پنڈت

امر سنگھ کالج روڈ۔ سرینگر
یکم جنوری ۱۹۵۷ء

پیارے شمیم! آداب! تعمیری تحفے کے لئے شکریہ اور شیریں شکوے کے لئے؟ جو چاہیں!

مجھے خوشی ہے کہ آپ کو ایک تعمیری کام مل گیا اور "تعمیر" کو ایک ایسا سرگرم معمار نصیب ہوا جو جوان سال بھی ہے اور بالغ نظر بھی۔

دسمبر کا شمارہ ایک شاندار مستقبل کی طرف اشارہ کر رہا ہے لیکن نئے کسی ایڈیٹوریل نوٹ میں اپنے لکھنے والوں سے درخواست کیجئے کہ اپنی ادبی اور کلچرل ذمہ داری کو نبھانے میں سہل انگاری نہ کریں۔ کیونکہ باہر والوں کے لئے "تعمیر" کا مواد یقیناً قابل اعتبار ہوگا۔

امید ہے آپ کی لگن کا سہارا پاکر "تعمیر" پنپتا ہی جائے گا۔

آپ کا:۔ کیٹپ

بہ توسط علامہ عبدالباری آسی مرحوم
احاطہ خام لکھنؤ

شمیم صاحب۔ السلام علیکم!

کچھ دن ہوئے آپ کا پرچہ دیکھنے کا موقعہ ملا۔ لکھنؤ کی ادبی خانقاہوں میں شب و روز چرچے ہیں۔ اور مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ مدت کے بعد ایک اور مستقر پرچے کا دیدار ہوا ہے۔

"تعمیر" کے لئے ایک تازہ غزل ارسال کر رہا ہوں۔

مخلص:۔ والی آسی

ریڈیو کشمیر سری نگر
۸ جنوری ۱۹۵۷ء

برادرم شمیم صاحب۔ تسلیمات

"تعمیر" کے گذشتہ دو شمارے زیر نظر ہیں۔ آپ کی کاوشوں کی داد دینا تو ایک رسمی سی بات ہوگی۔ البتہ یہ کہے بنا نہیں رہا جاسکتا کہ "تعمیر" کا آغاز نہایت ہی حوصلہ افزا ہے اور اگر اسی رفتار سے یہ ارتقاء پذیر ہوتا رہا تو مستقبل قریب میں ہی "تعمیر" کا شمار ملک کے مقتدر ادبی رسائل میں ہوگا۔

آپ کا: غلام نبی خیال

گورنمنٹ انٹر کالج۔ مرادآباد
۱۳ جنوری ۱۹۵۶ء

مکرمی تسلیم!

"تعمیر" کا جنوری کا شمارہ ملا۔ شکریہ قبول فرمائیے! پرچہ کی اٹھان اچھی ہے۔ مضامین سلیقہ سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ نظمیں بھی معیاری ہیں۔ کمال احمد صدیقی کی "۲۶ جنوری" اور راہی معصوم رضا کی "وادی حیات" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بچوں کے لئے آخر میں چھ یا آٹھ صفحات وقف کر دیجئے۔ لیکن اس کی کتابت ذرا مختلف ہوگی۔ "کشمیر کی منقبتیں" ان کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ "کشمیری لوک گیت" اس پر بھی تحقیق کی ضرورت ہے۔ کتابت طباعت اور اچھی ہونا چاہیئے۔

دریا گڈھ روڈ۔ جموں
۳۱ جنوری ۱۹۵۶ء

شمیم بھائی

جنوری کا "تعمیر" موصول ہوا۔ شکریہ!

کمال لداخی و ماسٹر ناجی صاحب کا مقالہ "لداخی تاریخ" بڑا معلوماتی اور جاندار مضمون ہے۔ ویسے پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر حسن شاہ، بلدیو کرشن شرما اور مظفر عازم کے مقالات بھی قابل مطالعہ ہیں۔

راہی معصوم رضا کی نظم "وادی حیات" بہت ہی خوبصورت ہے۔ کچھ مصرعے تو دماغ سے نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ اچھے بھی ہیں پیارے بھی ہیں اور سنے نظموں میں کاش تم کو گرفتار کر سکوں۔ اس نظم میں احساسات کی عکاسی میں شاعرانہ خلوص نے جان ڈال دی ہے۔

مخلص: وید راہی

بزمِ خواتین

میں کبھی نہیں بھولونگی

زندگی میں بہت سے ایسے واقعات ہوتے ہیں جنہیں ہم کبھی نہیں بھولتے۔ کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کے ساتھ رفیقوں اور دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ ہم انہیں ہٹانا بھی چاہیں تو ہٹا نہیں سکتے۔ بھولنا بھی چاہیں تو نہیں بھول سکتے۔ ذہن سے ایسے واقعات چمٹے رہتے ہیں۔ ہر بہن کی زندگی میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہو گی جسے وہ فراموش نہیں کر سکیں۔ بعض بہنوں کی زندگی کے بعض واقعات واقعی بہت دلچسپ ہوتے ہیں، اور بے اختیار سہیلوں کو سنانے کی خواہش ہوتی ہے۔ آج میں ایک ایسے ہی واقعہ کو پیش کر رہی ہوں۔ اس واقعہ کا تعلق میری زندگی سے گہرا ہو گیا ہے یہ وہ واقعہ ہے جسے میں کبھی نہیں بھولوں گی۔

تین برس قبل جنوری کی ایک رات کو جبکہ خوب برف گر رہی تھی میں اپنی ایک سہیلی کے یہاں کھانے پر جا رہی تھی۔ ۸ بجے کا عمل ہوگا۔ تاریکی تھی، سناٹا تھا، ہوا تیز نہیں تھی پھر بھی سردی سے میں کانپ رہی تھی۔ بہت سنبھل سنبھل کر آگے بڑھ رہی تھی۔ ہر لمحہ گر جانے کا اندیشہ تھا۔ میں اپنی سہیلی کو دل ہی دل میں کوس بھی رہی تھی، کہ ایسی شب میں کھانے پر کیوں بلایا۔ پھر خیال آیا کہ اس میں میری سہیلی کا کوئی قصور نہیں، ریڈیو کی خبر تھی کہ موسم خشک رہے گا اور بیچاری نے کھانے پر بلا لیا تھا۔ خدا خدا کر کے اس علاقہ میں پہنچ گئی، جہاں میری سہیلی کا کوارٹر تھا۔ ایک کوارٹر کے دروازہ پر دستک دی، دروازہ کھل گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ دریافت کرتی ملازمہ نے کہا۔ "آیئے، کافی دیر ہو گئی آپ کو"۔ اب کچھ پوچھنا فضول تھا، مجھے اطمینان ہوا کہ میں اپنی سہیلی کے کوارٹر میں آ گئی۔ میں پہلی بار آئی تھی، اس لئے میں ملازمہ کے لئے اور ملازمہ میرے لئے اجنبی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ میری سہیلی نے اسے سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس طرح پیش آئی۔ مجھے اس نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ ملازمہ نے کہا "ابھی ابھی آپ کا انتظار کر کے میم صاحب باہر گئی ہیں"۔ میں نے گھڑی دیکھی اور سوچا میں تو وقت پر آئی ہوں۔ وہ اس وقت کہاں چلی گئی۔ ایک گھنٹہ ہو گیا اور میری سہیلی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ میں نے ملازمہ سے کہا کہ اب جا رہی ہوں۔ بہت دیر ہو جائے گی، برف بھی خوب گر رہی ہے دور جانا ہے، ملازمہ نے جواب دیا کہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ میم صاحب نے کیوں دیر کی۔ پھر وہ مجھے کھانے کے کمرہ میں لے گئی۔ شاندار کھانا ٹیبل پر تھا۔ میں نے کہا کس طرح کھاؤں، تمہاری میم صاحبہ آ جائیں۔ ملازمہ نے کہا آپ کھا لیجئے، خواہ مخواہ تکلف کر رہی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ جب وہ آئیں کھانا کھلا دینا، سردی میں زیادہ دیر انہیں روکنا نہیں۔ میں بہت جھنجھلائی، بھوک بھی خوب لگ رہی تھی۔ اور جلد سے جلد

گھر جانا تھا اس لئے کھانے پر بیٹھ گئی۔ کھانے نہایت ہی لذیذ تھے۔ پڈنگ سوپ، انڈے، مرغ، پلاؤ، باقر خوانی، دہی، آچار، سلاد ـــــ میں سوچ رہی تھی۔ کہ اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی، پھر خیال آیا شاید پہلی بار آنے کی وجہ سے یہ اہتمام ہو۔ کھانے کے درمیان ملازمہ نے خبر دی کہ میم صاحبہ آگئی ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میری موجودگی میں میری سہیلی آگئی۔ اسے سنانے کے لئے بہت کچھ سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر میں میرے سامنے دو صاحبہ تھیں۔ جنہیں میں نہیں جانتی تھی۔ دونوں کو دیکھ کر وُہ حیران تھیں۔ میرے مُنہ میں انڈا تھا۔ مُنہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وُہ گھبرا گھبرا کر دیکھ رہی تھیں۔ معاملہ میری سمجھ میں آگیا۔ میں غلطی سے کسی دوسرے کے کوارٹر میں آگئی تھی اور وہاں بھی کسی کی دعوت کا اہتمام تھا۔ میم صاحبہ اور ان کی مہمان سامنے تھیں اور دعوت میں کھا رہی تھی۔ ان کے سامنے ایک بڑا تنتل ہوا تھا۔ ان کے چہرے پر نہ جانے کتنے رنگ آئے اور گئے۔ میں پسینہ سے بھیگ گئی تھی۔ میں جانتی ہوں میرے چہرے پر بھی کئی رنگ آئے ہوں گے۔ میں آہستہ سے اُٹھی، گھر کی مالکہ اپنی ملازمہ سے کچھ پوچھ رہی تھی کہ میں نے معذرت چاہی اور کسی نہ کسی صورت سے باہر نکلی۔ میری نگاہوں کے سامنے اس مہمان کی صورت تھی۔ جو کھانے آئی تھی اور مجھے کھاتے دیکھ کر پتھر کی طرح خاموش ہو گئی تھی۔ باہر نکل کر خیال آیا کہ میں نے ہاتھ مُنہ بھی نہیں دھویا تھا۔

دوسرے روز جب میری سہیلی نے نہ آنے کی شکایت کی تو میں نے صرف یہی کہا۔ "پھر کبھی آؤنگی، لیکن اپنے کوارٹر کا نمبر ضرور نوٹ کرادو۔"

کالی داس اور عورت ـــــ !

کالیداس ہندوستان کے وُہ عظیم شاعر اور فن کار ہیں جو آج بھی ترقی پسند دنیا میں عزت اور پیار بھری نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ انہوں نے انسانی جذبات کی سچی عکاسی کی اور سنسکرت ادب کو نئی ادائیں دیں۔ کالیداس نے عورت کا جو بھی کردار پیش کیا ہے، اس میں شہزادیوں کی شخصیت نہیں ہے۔ شاہی محلوں میں رہنے والی عورتوں کی زندگی کی تصویریں کالیداس کے حق میں نہیں ہیں۔ وُہ مصنوعی حسن، قیمتی کپڑوں اور زیوروں کو نہیں دیکھتے، بلکہ ان کی نگاہیں عورت کے کردار کے اصل حسن پر رہتی تھیں۔ ان کے یہاں عورت کسی مجسمہ کی طرح تراشی نہیں جاتی، بلکہ حقیقی زندگی میں جو عورت ہمارے ملک میں تھی وہی ان کے یہاں ہے وُہ تخیل کی پیداوار نہیں ہے اور نہ روایتی قانون اور اصول سے اس کا تعلق ہے۔

کالیداس جس عہد میں تھے اس عہد کا تقاضا یہی تھا کہ فن کار تخیل کی دُنیا میں رومان کی ایک نہایت ہی پیاری محفل لبائے، کالیداس نے اپنے عہد کے تقاضا کو پورا ضرور کیا۔ لیکن کچھ نئے ڈھنگ سے۔ رومان کی محفل میں زندگی کی حقیقت کو پیش کیا۔ اور شکنتلا، اروشی، پاروتی اور اس قسم کے کردار پیش کرکے بتایا کہ رومان کا تصور عورت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور عورت کی عظمت انسان کی عظمت ہے۔ محبت کی پاکیزگی اور صباحت ان کے یہاں عورتوں کے کردار میں موجود ہے عورت مختلف رنگ میں کالیداس کے یہاں آتی ہے۔ ایک محبوبہ بن کر جو محبت کا مطلب سمجھاتی ہے۔ جب لڑکی اپنے گھر سے سسرال جاتی ہے تو سماج اس کے کردار میں کتنی تبدیلی یک بیک چاہتا ہے اور لڑکی اپنی شرارتوں کو کس طرح یک بیک بھولنے پر مجبور ہوتی ہے۔ شکنتلا کے کردار میں اس کی تصویر مکمل دیکھی جا سکتی ہے۔

کالیداس کے فن میں عورت کا درجہ بہت ہی بلند ہے ـــ ہندوستانی عورتوں کی زندگی کو سمجھنے میں ان کے ایسے کرداروں کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

مادری زبان

پیدائش کے فوراً بعد ہی ماں اپنے ننھے لاڈلے کو جب بھینچ بھینچ کے پیار کرتی ہے۔ تو ممتا کے تیز و تند جذبات چھلک چھلک پڑتے ہیں۔ اس عالم میں وُہ یہ بھی فراموش کر دیتی ہے کہ اُس کا ننھا ابھی فہم ادراک کے عالم سے بہت دور ہے۔ اور اس کی طاقت گویائی ابھی اُس جہان کی سیر کر رہی ہے۔ جہاں الفاظ کے معنی نہیں ہوتے۔ جہاں خوشی اور بے ہوشی کی منزلیں واصل ہوتی ہیں۔ اور وُہ ننھے کو سینے سے لگا کر لوریاں گنگناتی ہے۔ اُس سے باتیں کرتی ہے۔ طویل اور خوشگوار

باتیں بچے کا دماغ اگرچہ اپنی ابتدائی حالت میں ہوتا ہے۔ مگر اس کے تحت الشعور میں ان خیالات اور الفاظ کا ایک مبہم نقش قائم ہو جاتا ہے۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بچہ چند آوازوں سے مختلف مفہوم کے اشارے کرتا ہے۔ اور یہاں سننے والے بعض الفاظ کا بھی صحیح ردّ عمل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس شعوری اور لاشعوری کشمکش میں اس کے نطق کے پٹ کھل جاتے ہیں اور دو تین سال کے عرصہ میں وہ اپنی ماں کی زبان کو اچھی طرح سے بول سمجھ سکتا ہے۔ اور اس وقت تک مادری زبان کے نقوش اس کے سادہ صفحۂ ذہن پر اس طرح سے منقش ہوئے ہوتے ہیں۔ کہ بعد میں عمر بھر مٹائے نہیں مٹ سکتے۔

اسی وجہ سے لسانیات کے ماہروں اور نفسیات کے عالموں کا کہنا ہے کہ ایک انسان جتنا ماہرانہ کمال اپنی مادری زبان میں حاصل کر سکتا ہے۔ ایسا کمال کتاب کے باوجود وہ دسترس اس کو کسی دوسری زبان پر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادری زبان کا مزاج اس کی روایات اور اس کا تدریجی ارتقاء اس کے خون میں رچ چکا ہوتا ہے۔ اور تھوڑی سی ہلاء سے یہ خفیہ قوتیں بیدار ہو کر نطق کے دامن کو گُل بار کر سکتی ہیں۔ برعکس اس کے کسی غیر زبان کو اکتسابی طور پر پڑھ کے بھی اس کے مزاج اور مخصوص لب و لہجے سے آسانی سے مانوسیت نہیں ہو سکتی۔ شاید اسی مسلّم اصول کے کرشمے ہیں کہ ہر زبان کا بہترین ادب وہ لوگ پیدا کرتے ہیں جنہوں نے اسے اپنے مادری ورثے کے طور پر پایا ہو۔ اور غیر زبانوں کے بڑے بڑے عالم بھی ان کی گرد کو نہیں پا سکتے۔ چاہے انہیں اس زبان کی صرف و نحو گرامر اور باقی کتابی چیزوں پر کتنی ہی دسترس کیوں نہ ہو۔

یہ بات جہاں اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ اول سے ہی بچے کو مادری زبان کی بہترین روایات سے ہم آہنگ کرنے کے لئے خاص توجہ کرنی چاہیئے۔ وہاں یہ بات بھی ضروری ہے۔ کہ بچے کے سامنے ہمیشہ شائستہ اور مہذب زبان استعمال کی جانی چاہیئے۔ کیونکہ جس بچے کو ہم ننھا نا سمجھ اور بے نیاز سمجھتے ہیں۔ اس کا دماغ کیمرے کی مانند ان تمام الفاظ اور آوازوں کا تاثر لیتا ہے۔ جو اس کی موجودگی میں پیدا ہوتی ہیں۔ جن کا انکشاف بعد میں بڑے ہو کر اس کے کارناموں میں ہوا کرتا ہے۔

تعمیر

ماؤں کو بچوں کی عمر کے ابتدائی سٹیج میں ان امور کی جانب خاص توجہ کرنی چاہیئے۔ جو بچہ ان امور سے واقف ماں کے سایۂ عاطفت میں پلے وہ شاید کسی دن ملک و قوم کے لئے سرمایۂ افتخار ثابت ہو سکے۔

گاندھی جی کی ایک بات!

۳۰ جنوری ہماری تاریخ میں غم کی ایک تاریخ ہے۔ ہندوستان نے جتنے آنسو اس تاریخ کو بہائے ہیں۔ شاید کبھی نہیں بہائے ہوں گے گاندھی جی نے اسی تاریخ کو اپنے کلیجہ پر گولیاں کھائی تھیں۔ گاندھی جی نے اَنگنت باتیں بتائی ہیں۔ ان کے اصولوں میں جتنا وزن ہے۔ اس کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے۔ کہ ہندوستان آزاد ہو گیا اور آج بھی امن کا پیام ساری دنیا کو دے رہا ہے۔

گاندھی جی کی ایک بات مجھے ہمیشہ یاد آتی ہے، انہوں نے کہا تھا۔ "میں نے عدم تشدّد کا سبق اپنی رفیقۂ حیات سے سیکھا تھا۔ اگرچہ یہ تعلیم میں نے حاصل نہ کی ہوتی تو شاید اپنے وطن کی خدمت مجھ سے نہیں ہوتی" انہوں نے اس کا اقرار کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب انہوں نے اپنی رفیقۂ حیات کو اپنے ارادے کا مطیع بنانا چاہا تو ایک پہلو پر ان کے ارادے کے مقابلہ میں ان کی رفیقۂ حیات کی عارفانہ مزاحمت اور دوسرے پہلو پر ان کی معصومیت سے پیدا ہونے والے دکھ کے آگے ان کی بیوی کی خاموش تفویض نے انہیں پشیمان ہونے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے سمجھا کہ وہ اپنی بیوی پر حکومت کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوئے ہیں۔

آج عالمگیر تشدّد کے خلاف ہندوستان کی آواز میں جو قوت ہے اس کا تجزیہ کتنا دلچسپ ہو سکتا ہے۔ عدم تشدّد کی بنیاد واقعی ہندوستان کی روایتوں کی گہرائیوں میں ہے لیکن اس قوت کو جس شخصیت نے صحیح معنوں میں آج کی دنیا میں استعمال کیا۔ اس شخصیت کے ساتھ صرف ہندوستان کی روایتوں کی پاکیزگی نہیں تھی بلکہ ایک عورت کی خاموشی پاکیزگی، معصومیت سے پیدا ہوا صبر اور نیکی تھی۔ ہندوستان کی ایک عورت نے یہ جادو جگایا تھا آج اس جادو کی قوت کا اندازہ ساری دنیا کو ہے۔ آج تو دنیا کی تاریکی کیا سے الجھی ہوئی ہے۔ ہندوستانی عورتوں سے یہ پوچھا جائے کہ جیت کس کی ہوگی تو جواب یہی ملیگا۔ کہ عدم تشدد کی۔ عدم تشدد ہی کا نام گاندھی ہے۔ ہندوستان نے آزادی [illegible]

ثریا جبین

ڈرائنگ روم

(فیچر)

افراد:۔ شوہر، بیوی، بیٹی رجّو
سکریٹری صاحب اور بُوا عبادن

(پہلا منظر)

شوہر:۔ بیٹی رجّو اپنی امّی کو تو ذرا بلانا۔ (بیوی آتی ہے)

بیوی:۔ کیا بات ہے؟

شوہر:۔ تم کیا چاہتی ہو، اپنا سر توڑ لوں، میں نے ہزار بار کہا کہ یہ کمرہ ڈرائنگ روم ہے۔ اس میں بیکار چیزیں نہ رکھی جائیں۔ کبھی بچوں کا بستر رہتا ہے، کبھی دیکھتا ہوں بُوا عبادن یہاں حقّہ پی رہی ہیں۔ آخر بات کیا ہے مجھے اس طرح چڑایا نہ کرو۔ میں اسے برداشت نہیں کرسکتا۔

بیوی:۔ میں نے بُوا عبادن کو منع کیا تھا، کر دں بھی کیا، دن بھر تو بچوں کو لے کر پریشان رہتی ہوں، اس کمرہ میں آنے کی نوبت ہی نہیں آتی ـــــ چلئے چائے پی لیجئے۔

شوہر:۔ میں چائے نہیں پیوں گا اور نہ کچھ کھاؤنگا۔ میں رات دن ڈرائنگ روم کو خوبصورت بنانے کا خواب دیکھتا ہوں۔ اور تم لوگ اسے تباہ کرتی ہو۔

بیوی:۔ کون تباہ کرتا ہے؟ آپ خواہ مخواہ ناراض ہوتے ہیں، آیئے چائے پی لیجئے۔ اُٹھئے نا۔

رجّو:۔ اُٹھئے نا پاپا۔

شوہر:۔ اس بار تمہاری بات مان لیتا ہوں، آئندہ سے تم نے ڈرائنگ روم کا خیال نہ کیا تو سچ کہتا ہوں۔ ٹھیک نہ ہوگا ـــــ (رجّو کو گود میں لے کر جاتا ہے)

... .

(دوسرا منظر)

شوہر:۔ (چائے پیتے ہوئے) کل شام کو میں نے آفس سکریٹری صاحب کو چائے پر بلایا ہے۔ ناشتے کا ذرا اچھا انتظام کرنا اور سنو بُوا عبادن سے کہنا خدا کے لئے مجھ پر رحم کریں اور اپنا حقّہ باورچی خانہ میں رکھیں۔ سکریٹری صاحب کو اپنا ڈرائنگ روم دکھانا چاہتا ہوں میری بڑی تصویر وہیں لگا دینا۔

بیوی:۔ بوا عبادن سے تو میں خود عاجز ہوں۔ دن بھر دماغ کھاتی ہیں، کام کچھ نہیں آپ کو دودھ کیا پلایا ہے۔ ہمیشہ کے لئے ہم ان کے غلام ہو گئے ہیں۔

شوہر:۔ اور سنو بیٹی رجّو، کل صبح بشیر میاں کے یہاں سے ڈبل روٹی لے آنا میں آفس جاتے وقت اس سے کہہ دونگا۔ دو روٹی سے کام چل جائیگا؟

بیوی:۔ (چائے کی پیالی رکھتے ہوئے) ہاں کافی ہے۔

شوہر:۔ ہاں تو بیٹی ضرور لے آنا ہوں!

رجّو:۔ جی، ضرور جاؤں گی۔

شوہر:۔ کہاں جاؤ گی؟

رجّو:۔ بشیر میاں کے یہاں۔

شوہر:۔ کیوں؟

رجّو:۔ دو ـــــ ڈبل ـــــ روٹی!

شوہر:۔ ہوں ـــــ شاباش...

اور سنو ڈرائنگ روم [illegible] (بیوی ہنستی ہے)

بیوی:- اچھا

(منظر بدلتا ہے)

شوہر:- رحّو، بیٹی رحّو، دیکھو ڈرائنگ روم کھول دو، سکریٹری صاحب آگئے ہیں۔

بوا عابدن:- (کانپتی آواز میں) آجاؤ، بیٹا، کھلا ہوا ہے۔

شوہر:- (بڑبڑاتے ہوئے) کھلا ہوا ہے؟؟ —— آجایئے سکریٹری صاحب
(دونوں ڈرائنگ روم میں آتے ہیں۔ کمرہ دھواں سے بھرا ہوا ہے)

شوہر:- ہیں یہ کیا —— یہ کیا حالت ڈرائنگ روم کی ہے؟

بوا عابدن:- آجاؤ بیٹا —— مجھے بخار آگیا ہے، ملیریا معلوم ہوتا ہے
تمہارے کمرہ میں آگئی۔ یہ کمرہ کچھ گرم رہتا ہے —— دیکھو نا
دھواں بھی کر دیا ہے، بہت مچھر ہو گئے ہیں۔
(حقہ پیتی ہیں اور ڈکاریں لیتی ہیں)

شوہر:- (غصّہ میں) کرسیاں کہاں ہیں؟

بوا عابدن:- کرسیاں میں نے باہر نکال دی ہیں، دھوپ میں

شوہر:- شام ہو گئی ہے دھوپ کہاں ہے، یہ کیا تماشہ ہے۔ ریڈیو
پر ایک ڈبل روٹی رکھی ہوئی ہے، کمرہ دھواں سے بھرا ہوا
ہے۔ بیگم کہاں ہیں؟

بوا عابدن:- بیٹے، بخار آگیا تھا، رحّو بیٹی دو ڈبل روٹی لائی تھیں۔ ایک
میں نے کھالی ہے۔ بیگم کی بات کرتے ہو بیٹا، وہ تو اس طرح
پیش آتی ہیں، جیسے میں نے تمہیں دودھ پلایا ہی نہیں ہے۔
میں کوئی غیر ہوں۔ وہ مجھ سے بگڑ کر میکے چلی گئی ہیں۔ تم
ہی بتاؤ بیٹے اگر میں نے تمہارے کمرہ میں آرام کر لیا تو کون
سی قیامت آگئی۔ (ڈکاریں لیتی ہے)

شوہر:- (سوچتے ہوئے) ڈرائنگ روم ——! میرا ڈرائنگ روم ——!
آیئے آیئے سکریٹری صاحب

سکریٹری صاحب:- اب کہاں!

شوہر:- آج سردی بھی بہت ہے، ہم لوگ بوا عابدن کے ڈرائنگ روم میں
چائے پی لیں۔ میرا مطلب باورچی خانہ سے ہے۔ کیوں۔

سکریٹری صاحب:- مگر آپ نے تو اپنے ڈرائنگ روم... ... خیر۔

شوہر:- سکریٹری صاحب۔ دودھ کی قیمت ادا کرنا چاہتا ہوں —— دودھ کی
قیمت —— ڈرائنگ روم ——! میرا خواب —— میرا اچھوتا خواب!
(دونوں باورچی خانہ کی طرف جاتے ہیں)

عورت —— ؟

○ "عورت کی تلاش زندگی کی تلاش ہے" ——
ڈوامس

○ "عورتوں کی سوسائٹی کے بغیر کلچر کا کوئی تصوّر پیدا نہیں ہو سکتا" ——
گیٹے

○ "مرد کے پاس تمنائیں ہوتی ہیں اور عورتوں کے پاس راستے" ——
ہومس

○ "عورت کا بڑا قصور یہ ہے کہ وہ مرد کی طرح رہنا چاہتی ہے" ——
ڈی سٹیرے

○ "یہ میرا یقین ہے کہ عورت اپنی آزادی نہیں کھو سکتی، جب تک کہ اس کے اپنے اندر کمزوری نہ موجود ہو" ——
مہاتما گاندھی

○ "زندگی کا ایک سب سے بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ خوبصورت مرد کو بدصورت بیوی کے مرنے کا غم نہیں ہوتا"۔
ژاں پے دان

○ عورت الوہیت کے ساز کا ایک بھٹکا ہوا نغمہ ہے۔
ہومر

○ عورت زندگی کی تفصیل کا اجمال ہے۔
(نامعلوم)

○ جب کوئی اچھا شعر یاد نہ آئے تو عورت کو یاد کرو کہ عورت خالق کا سب سے اچھا شعر ہے۔ (ابن حبیب)

○ حوا نے آدم کو بہکا کر دنیا پر احسان کیا۔
(دانتے)

مینڈک کو زکام ــــــ!

گنیش پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، وہاں ایک بہت ہی پرانا تالاب تھا۔ اس تالاب میں بے شمار مینڈک رہتے تھے۔ مینڈکوں کا ایک بادشاہ تھا ایک وزیر، کئی سپہ سالار اور کئی فوجی دستے۔ سمجھ لیجئے ایک حکومت تھی تالاب کے اندر۔ ان کے اپنے قانون تھے، اپنی سزا تھی، اپنے اصول تھے اپنی زندگی تھی۔ اسی تالاب میں ایک مینڈک کو زکام ہوگیا۔ اس نے اپنے پروفیسر ماموں سے راز دارانہ لہجہ میں کہا: "ماموں مجھے زکام ہوگیا ہے"۔

"زکام ہوگیا ہے؟" پروفیسر ماموں چیخ پڑے اور انہوں نے سوال شروع کر دیئے۔ زکام کب سے ہوا ہے، کیسے ہوا؟ کہاں کہاں گئے تھے، زکام میں دماغ کی کیفیت کیا ہوتی ہے اور اس قسم کی اور بے شمار باتیں۔ بیچارہ مینڈک جسے زکام ہوا تھا گھبرا گیا۔ اس نے کہا "پروفیسر ماموں آپ تو اس طرح سوال کرتے ہیں۔ جیسے آپ کو میرا امتحان مقصود ہے، حالت سننا چاہتے ہیں۔ تو سنئے" تالاب پر ایک آدمی غسل کرنے آیا تھا۔ وہ شاعر تھا، وہ اپنی شاعری سنا رہا تھا، نہ جانے کیسے۔ شاید خود کو سنا رہا ہو، میں پاس ہی بیٹھا تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے اس کی شاعری کا ایک ایک لفظ میرے حلق میں سمایا جا رہا ہے۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے محسوس کیا کہ میں بھی شاعر ہوگیا ہوں۔

"تم شاعر ہوگئے ہو؟" پروفیسر ماموں چیخ پڑے

"اور کیا یہی تو میرا زکام ہے۔ اس مرض سے کس طرح چھٹکارا حاصل کروں کوئی علاج بتایئے، سنئے شعر ہوا ہے . . . . !"

"رحم کرو رحم کرو، اپنی شاعری دور رکھو ورنہ مجھے بھی زکام ہو جائے گا، چلو میرے ساتھ حکیم صاحب کے پاس، شاید تمہارا علاج ہو جائے۔"

دونوں مینڈک حکیم مینڈک کے پاس گئے، حکیم مینڈک حضرت بیٹھے تھے۔ دور ہی سے اس مینڈک کو دیکھ کر بولے "عزیزم یہ مرض کہاں سے پیدا کر لیا، تمہیں تو شاعری کا زکام معلوم ہوتا ہے۔ ذرا نبض تو دیکھوں"، نبض دیکھ کر وہ بولے "میں نے کہا تھا کہ تمہیں زکام ہوگیا ہے"

"اس کا علاج ـــــ؟ ـــ کوئی معجون؟ ـــ" پروفیسر مینڈک نے کہا۔

"اس کا علاج خودکشی ہے"۔

"خودکشی!!!" بیمار مینڈک بول اٹھا۔

"اور کیا اس مرض سے تو ساری قوم تباہ ہو جائے گی، میرے علاج سے فائدہ تو ضرور ہو جائے گا، لیکن یہ خطرناک مرض اچھا نہیں ہوگا"۔

حکیم مینڈک نے معجون تیار کر کے دیا اور کہا صبح و شام دودھ کے ساتھ کھایا کرو۔

بیمار مینڈک جب گھر آیا تو معلوم ہوا کہ اس کا مرض اس کے بیٹے کو بھی ہو گیا ہے۔ اور وہ بھی شاعری کر رہا ہے۔ اس نے تھوڑا معجون اسے بھی کھلایا۔ دوسرے روز تالاب کے ایک سرکاری اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ پروفیسر مینڈک اور حکیم مینڈک سخت بیمار ہیں اور کہا جاتا ہے کہ انہیں بھی شاعری کا زکام ہو گیا ہے۔ یہ خبر اڈبر تک پھیلی۔ بیماری پھیلتی گئی۔ کافی لوگ اس مرض میں مبتلا ہو گئے۔ حکیم ڈاکٹر سب پریشان تھے۔ حکومت دوسری حکومت سے مدد لینے لگی۔ لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

ایک روز جب بادشاہ یہ حکم سنانے کے لئے کھڑے ہوئے کہ تمام ایسے مریضوں کو تالاب سے باہر نکال دیا جائے۔ تو شاہی حکیم نے ادب سے کہا حضور آپ شاعری کر رہے ہیں یعنی آپ کو بھی زکام ہو گیا ہے۔ پھر لوگوں نے دیکھا مینڈکوں کے بادشاہ بھی شاعری کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ساری قوم اس مرض میں مبتلا ہو گئی۔ اب تعمیری کام رک گئے اور ہر جگہ مشاعرہ ہونے لگا۔ مشاعرہ میں بادشاہ وزیر، سپہ سالار، حکیم، ڈاکٹر، پروفیسر ریڈیو آرٹسٹ اخبار اور رسالے کے ایڈیٹر سب شریک ہوتے تھے۔ دوسرے تالاب کے مینڈکوں نے اس تالاب کی یہ حالت دیکھی تو اپنے تمام ثقافتی، سفارتی اور سیاسی تعلقات اس تالاب سے ختم کر دیئے اور ان کو ان کے حال پہ چھوڑ دیا۔

ایک دوست ـــــ جو بیوقوف تھا!

کشمیر کے بچوں میں بھالو کی دوستی کی کہانی کافی مشہور ہے "ہاپت یارز" یعنی ایک بھالو کی دوستی کی بات جب بھی آتی ہے ایک احمق دوست کی حماقتیں نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ ایک بھالو نے ایک شخص سے اس وقت دوستی کی جب وہ شخص جنگل سے گزر رہا تھا۔ ایک روز راستے میں بھالو نے کچھ شہد کھایا اور اپنے دوست کے لئے بھی کچھ لے آیا۔ اس کے دوست نے بھی جی بھر کر کھایا اور کھاتے کھاتے سو گیا۔ اسی درمیان شہد کی ایک مکھی آئی اور شہد کی شیرینی کی وجہ سے اس کے منہ کے قریب اڑنے لگی۔ بھالو گھبرا گیا۔ اسے ڈر تھا کہیں مکھی اس کے دوست کو کاٹ نہ لے۔ وہ اٹھا اور ایک پتھر لے آیا اور مکھی پر دے مارا، مکھی تو اڑ گئی، لیکن اس کے دوست کا سر پھٹ گیا اور اس کا دوست شہد کی تلاش میں اس دنیا سے بہت دور چلا گیا۔

بھوشن کاتھیر

آج میں ایک ایسے ہی دوست کی کہانی سنا رہا ہوں۔ میرے چچا اپنے گاؤں سے شہر آنے والے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا ایک مکان شہر میں بھی ہو جائے۔ انہوں نے شہر میں مکان بھی پسند کر لیا تھا۔ جب وہ اپنے گاؤں سے روپے لیکر آ رہے تھے تو ان کے ساتھ ان کا ایک دوست بھی تھا۔ انہوں نے اسے ساتھ رکھ لیا تھا کہ دور کی بات ہے سفر میں تنہا اتنی رقم لیکر جانا مناسب نہیں تھا۔ رات کو دونوں ایک جگہ ٹھہر گئے۔ جگہ سنسان تھی، ایک بڑے درخت کے نیچے آرام کرنے کا خیال کیا، تھوڑی دیر دونوں بیٹھے تھے کہ کچھ لوگوں کے آنے کی آہٹ دور سے ملی۔ میرے چچا کو شک ہوا کہ چور ہیں اس لئے وہ درخت پر چڑھ گئے۔ ان کا دوست نیچے رہا۔ کچھ ہی دیر میں دو چار آدمی اس درخت کے قریب آ گئے۔ وہ واقعی چور تھے۔ ان لوگوں نے میرے چچا کے دوست کو اٹھایا اور پوچھا تمہارے پاس کیا ہے جو کچھ ہے ہمارے حوالے کر دو۔ چچا کے دوست کے پاس صرف ایک روپیہ تھا۔ چوروں نے روپیہ لے لیا اور کہا ملا بھی تو ایک روپیہ، پتہ نہیں روپیہ اچھا ہے یا خراب۔ چچا کے دوست نے کہا میرا روپیہ سو فی صدی اچھا ہے۔ اگر تمہیں یقین نہ آئے تو میرے دوست سے پوچھ لو، جو اوپر درخت پر ہے، پھر چوروں نے اوپر دیکھا۔ میرے چچا کا ہوش اڑ گیا۔ چوروں نے انہیں نیچے اتارا اور ان کا سارا روپیہ چھین لیا۔ جب وہ شہر پہنچے تو ان کے دماغ میں مکان خریدنے کی بات نہیں تھی۔ البتہ ان کے ساتھ ان کا وہ بے وقوف دوست ضرور تھا جو اپنے ایک روپیہ کی چوری پر ماتم کر رہا تھا۔

خوش اخلاقی

خوش اخلاقی سے کم و بیش ہر انسان کو زندگی کے ہر شعبے اور دور میں واسطہ پڑتا ہے۔ سوائے اس کے کہ آپ خود اس صلاحیت

سے محروم ہوں یا آپ کے حلقۂ احباب میں با اخلاق دوستوں کی کمی ہو۔

خوش اخلاقی کا فلسفہ گو بظاہر بہت ہی صاف اور سیدھا ہے۔ لیکن یقین جانئے کہ اگر اس پر صحیح طریقہ سے عمل کیا جائے، تو اپنی اصل روح کی ٹھنڈک سے مستفید کرنے سے پہلے ایک بہت صبر طلب مسئلہ بن جاتا ہے۔

کسی چیز کا اچھا مقصد اس وقت اچھا سمجھا جاسکتا ہے جس وقت اس کی ضرورت انسانی زندگی اور کردار میں کچھ اسی طرح محسوس ہو کہ اس کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہے۔ چونکہ انسانی زندگی میں وقت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر قدریں بگڑتی اور سنورتی ہیں۔ لہٰذا ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وقتاً فوقتاً ہم اپنے کردار کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کے ہم کس قدر نزدیک ہیں۔ خوش اخلاقی ہمارے قومی کردار کا جزو صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب ہم اس پر اپنی روزمرہ کی زندگی میں اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بات میں بطور عادت کاربند رہیں۔ مثلاً آپ بارش یا دھوپ میں کھڑے بس کا انتظار کر رہے ہیں۔ گھر پہنچنے کی عجلت ہے۔ اور ممکن ہے۔ پہلی بس میں جگہ نہ ملنے پر آپ کی طبیعت میں کچھ غصہ اور جھنجھلاہٹ آ گئی ہو اور ایسی حالت میں آپ بس میں سوار ہوں اور کنڈکٹر سے ٹکٹ طلب کریں۔ اور ساتھ ہی خوش اخلاق بھی رہیں۔ تو واقعی یہ معلوم ہو جائے گا کہ آپ میں یہ صلاحیت بڑی حد تک ہو گئی ہے۔ لیکن ابھی آپ کا امتحان پورا نہیں ہوا کیونکہ ممکن ہے کہ کنڈکٹر آپ کے ساتھ اس خوش اخلاقی کے ساتھ پیش نہ آئے۔ جس کی آپ کو توقع ہو۔ ایسے وقت میں بھی آپ صبر نہ کھو بیٹھیں تو یہ آپ کے خوش اخلاق ہونے کا ٹھوس ثبوت ہو گا۔

خوش اخلاقی کی توقع انسان کو صرف اسی وقت رکھنا چاہیئے جب وہ خود بھی دوسروں کے ساتھ اخلاق اور تہذیب سے پیش آئے۔ لعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کے خوش اخلاق ہونے کے باوجود دوسرا شخص آپ سے اخلاق کے ساتھ پیش نہ آئے جس کی آپ کو توقع تھی اور ایسے وقت پر یقیناً طبیعت میں جھنجھلاہٹ، الجھن اور جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے لیکن دراصل یہی موقعہ امتحان کا ہے۔ اور جو شخص ایسے وقت میں صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دے، وہی امتحان میں کامیاب کہلائے گا۔ پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ خوش اخلاقی وہ دولت ہے، جو لٹانے سے بڑھتی ہے اور بچانے سے گھٹتی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ آپ نہیں جانتے ...

کہ — مکانات رہنے کے لئے بنائے جاتے ہیں دیکھنے کے لئے نہیں۔

کہ — بے وقوف مکان بناتے ہیں۔ اور عقلمند مکان خریدتے ہیں۔

کہ — عادت پر اگر قابو نہ پایا جائے تو ہر عادت ایک ضرورت بن جاتی ہے۔

کہ — لیمب نے کہا تھا کہ انسان ایک کھلاڑی جانور ہے۔

کہ — قسمت اسے بے وقوف بناتی ہے جسے وہ پیار کرتی ہے۔

کہ — سماج کی تمنائیں بچوں کے کردار سے وابستہ ہوتی ہیں۔

کہ — ہیزلٹ نے کہا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ میری روٹی کے کس طرف مکھن لگا ہوا ہے۔

کہ — قانون جھوٹ بول سکتا ہے۔ کتابیں جھوٹ نہیں بولتیں۔

کہ — جنگ تباہی کی [illegible] ہے۔

کہ — ہر شخص ایک بڑی اہم کتاب ہے اگر کوئی [illegible] پڑھ سکے۔

کہ — انسان اور حیوان کے درمیان [illegible] ایک نازک سا پردہ حائل ہے [illegible] جائے تو انسان حیوان بن جاتا ہے۔

جہاں نُما

مہینے بھر کی اہم خبریں

یکم جنوری ۱۹۵۷ء :- مسٹر کروشیف نے کہا ہے کہ دُنیا میں امن کی طاقتیں اتنی مضبوط ہو چکی ہیں۔ کہ وہ دُنیا کو کسی جنگ میں جھونکنے کی کوششوں کو ناکام بنا سکتی ہیں۔

حکومت جموں و کشمیر نے صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے سٹیٹ فنانس کارپوریشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

۲ر جنوری :- ہوڑہ ایکسپریس کو حادثہ۔ نو اشخاص زخمی ہو گئے۔ ایکسپریس گاڑی کا انجن اور چھ ڈبے پٹڑی سے اُتر گئے۔

شام کے صدر نے بیان دیا ہے کہ کسی ملک پر فوجی مداخلت برداشت نہیں کی جائے گی۔

۳ر جنوری :- پاکستان کی ری پبلکن پارٹی میں زبردست پھوٹ پڑ گئی ہے۔

۴ر جنوری :- کانگرس ورکنگ کمیٹی نے مصر سے برطانیہ اور فرانس کی فوجوں کے تخلیہ کا خیر مقدم کیا۔ ہنگری سے بھی غیر ملکی فوجیں ہٹائے جانے کے متعلق قرارداد منظور ہو گئی۔

۵ر جنوری :- کانگرس سبجکٹس کمیٹی کے اجلاس میں شری نہرو نے اعلان کیا ہے۔ کہ ہند کا سوشلسٹ سماج اسی سرزمین کی پیداوار ہوگا۔

لندن کی ایک نمائش میں ۱۹ ویں صدی کے کشمیری شال رکھے گئے تھے۔ نمائش دیکھنے والوں نے کشمیری صناعوں کی تعریفیں کیں۔

۷ر جنوری :- نکشمی بائی نگر میں جناب بخشی صاحب نے شری نہرو کے ساتھ ملاقات کر کے کشمیر کے متعلق بعض نکات پر غور کیا۔

[illegible] کی انڈسٹریل [illegible] کو ہند کے ہم پلہ بنانے کی سکیم [illegible]

۸ر جنوری :- کانگرس کے کھلے اجلاس میں خالد کشمیر بخشی غلام محمد نے کہا ہے۔ کہ اگر پاکستان نے جنگ بندی سرحد کو پار کرنے کی کوشش کی۔ تو اُس کے دانت کھٹے کئے جائیں گے۔

امریکہ نے یقین دلایا ہے کہ وہ پاکستان کو فوجی سامان غلط طریقے سے استعمال کرنے نہ دے گا۔

۹ر جنوری :- تحصیل نیشنل کانفرنس سرینگر کی مجلس عاملہ نے حکومت ہند پر زور دیا ہے۔ کہ وہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کو آزاد کرنے کے لئے وسائل تلاش کرے۔

۱۰ر جنوری :- امریکہ کے وزیر خارجہ نے معاہدہ بغداد کو بیکار قرار دے دیا ہے۔

۱۱ر جنوری :- برطانیہ کے وزیر اعظم سر انتھونی ایڈن مستعفی ہو گئے جنوبی گوا کے پولیس سٹیشن پر حملہ کر کے دستی بم گرائے گئے۔ ایک پولیس افسر ہلاک۔

۱۳ر جنوری :- یمن پر برطانیہ کی فوج کشی اور بمباری سے سینکڑوں اشخاص ہلاک ہو گئے ہیں۔ شام نے کشمیر کے متعلق پاکستان کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

۱۶ر جنوری :- تخفیف اسلحہ کے لئے امریکہ کی پانچ نکاتی تجویز پولیٹکل کمیٹی میں تخفیف اسلحہ کے سوال پر بحث کی گئی۔

دہلی پولیس نے کشمیری میوزیم سے چوری کا سُراغ نکالا ہے۔ سات اشخاص گرفتار کئے گئے۔ پچیس ہزار روپیہ کا مال برآمد کیا گیا ہے۔

۱۷ر جنوری :- ووٹروں کی فہرستیں تیار کرنے پر ۵ ہزار روپے خرچ

ہوئے ہیں کئی سو اہل کاروں نے دن رات کام کیا۔

محکمہ زراعت نے ۸۰ ہزار من کھاد درآمد کرنے کا فیصلہ کیا ہے

۱۸ر جنوری :- وزیر اعظم شری نہرو نے اعلان کیا ہے۔ ہندوستان کشمیر کے معاملے میں ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے۔ ہندوستان کشمیر کو طشتری میں رکھ کر پاکستان کو پیش نہیں کر سکتا۔

۱۹ر جنوری :- شام کے صدر شکری القوتلی نے کہا ہے کہ ہندوستان اور شام ایک دوسرے سے اجنبی نہیں ہیں۔ آپ نے عالمی امن کے لئے ہندوستان کی خدمات کو خراج تحسین ادا کیا۔

۲۰ر جنوری :- شام کے صدر شکری القوتلی نے کہا ہے کہ شام ہمیشہ اپنے عظیم دوست ہندوستان کا ساتھ دے گا۔

سوویت روس کشمیر کی دستکاریاں درآمد کرے گا۔ کشمیری مصنوعات کے لئے بھاری مانگ۔ وہ تجارتی نمائندے امکانات کا جائزہ لے رہے ہیں۔

۲۱ر جنوری :- وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد نے کہا ہے کہ دُنیا کی کوئی طاقت ریاست میں نئے آئین کا نفاذ روک نہیں سکتی۔

صوبہ جموں میں سات لاکھ ووٹر انتخابات میں حصّہ لیں گے۔

۲۳ر جنوری :- زیر تربیت اساتذہ کا گرانی الاؤنس دوگنا کر دیا گیا۔

بغداد پیکٹ کے چار ملکوں نے نہر سویز پر انٹرنیشنل کنٹرول کی حمایت کی۔

۲۴ر جنوری :- اننت ناگ، اونتی پورہ اور بیج بہاڑہ کو تاریخ میں پہلی بار بجلی مہیا کی گئی۔ جناب بخشی غلام محمد نے اس سے ریاست کی تاریخ کا اہم واقعہ قرار دیا۔

سلامتی کونسل میں شیخ محمد عبداللہ کی تقریر کا ریکارڈ بجوایا گیا۔ جس میں اُنہوں نے پاکستان کو حملہ آور قرار دے دیا تھا۔

۲۵ر جنوری :- بادشاہ خان کو چودہ ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دی گئی ہے۔ صمد خان کو مجرم قرار دیا گیا ہے۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں ۳۰ر مارچ کو عدالت میں کاغذات پیش کئے جائیں گے۔

شری کرشنا مینن نے کہا ہے۔ کہ ہندوستان نے رائے شماری کے متعلق پاکستان یا اقوام متحدہ سے کوئی اقرار نہیں کیا ہے۔

۲۶ر جنوری :- ریاست میں نیا آئین لاگو ہو گیا ہے۔ ریاست بھر میں یوم مسرت۔

۲۷ر جنوری :- پاکستان نے مقبوضہ کشمیر کی پولیس کا چارج مقامی حکومت کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

۲۹ر جنوری :- نئے آئین کے تحت جموں میں مجلس قانون ساز کا اولین اجلاس شروع ہوا۔ ممبروں نے نئے آئین کی وفاداری کا حلف لیا۔

ریاست بھر میں نیا آئین نافذ ہونے کے سلسلے میں جشن شادیانے منائے گئے اور چراغاں کیا گیا۔

۳۰ر جنوری :- شری راج گوپال آچاریہ نے کہا ہے۔ کہ سلامتی کونسل کو کشمیر کے معاملات میں مداخلت کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

وزیر اعظم کو نئے آئین کے نفاذ پر نیک خواہشات کے پیغامات آئے ہیں۔ آپ نے اُن پیغامات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا ہے۔

ملک بھر میں مہاتما گاندھی کی شہادت کے دن کو یوم شہیداں کے طور پر منایا گیا۔

۳۱ر جنوری :- نئی دہلی کے جانکار حلقوں نے بیان کیا ہے۔ کہ ہند سرکار کشمیر کے معاملہ پر پاکستان کے ساتھ مزید کسی بات چیت میں نہیں اُلجھے گی۔

امریکی سینیٹ کے سرکردہ ممبروں نے مسٹر ڈلس کی خارجی پالیسی کی نکتہ چینی کی ہے۔

وزیر اعظم شری نہرو نے وزیر دفاع کا عہدہ خود سنبھال لیا۔

ڈاکٹر کاٹجو مستعفی ہو گئے۔ اور آپ مدھیہ پردیش کے چیف منسٹر کا عہدہ سنبھال رہے ہیں۔

چمن لال

اقبال

حبیب الہ

پال مکند

ننھے معمار

انہماک—

م قادر جیلانی

محمد انور

بی بی حوا

سبینہ

برف کے پھول

تعبیر

جلد 2

1957

صدر جمہوریہ ہند کشمیر کے نوجوان
آرٹسٹ غلام رسول سنتوش کو
سرٹیفکیٹ دے رہے ہیں
نیشنل اکادمی کی طرف سے سنتوش کو
اس کی تصویر ۔ اس پر ایکہزار روپے
کا انعام دیا گیا

بسوہلی فن مصوری کا ایک نمونہ

تعمیر

سرینگر

ماہنامہ

ایڈیٹر

شمیم احمد شمیم

جلد ۲ • شمارہ ۳

چندہ سالانہ۔ چھ روپے

فی پرچہ - آٹھ آنے

مارچ ۱۹۵۷ء

ترتیب

(عبدالغنی وڈیرا پرنٹر پبلشر نے 'لالہ رخ' پبلیکیشنز سرینگر کی طرف سے شائع کیا)

زاویے!

نئے آئین کے تحت ہونیوالے انتخابات کی تاریخ جوں جوں قریب آتی جارہی ہے مختلف جماعتوں کی انتخابی سرگرمیاں بڑھتی جارہی ہیں نیشنل کانفرنس کے علاوہ جو مختلف جماعتیں انتخابات میں حصہ لے رہی ہیں ان میں پرجا پریشد اور پرجا سوشلسٹ پارٹی قابل ذکر ہیں۔ ان دو بڑی پارٹیوں کے علاوہ بہت سے آزاد اُمیدوار بھی انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں۔ حکومت کی طرف سے تمام پارٹیوں اور آزاد اُمیدواروں کو انتخابات کے دوران میں ہر ممکن سہولت دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ سرکاری ملازموں کو انتخابی سرگرمیوں میں کسی قسم کا حصہ نہ لینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور پولنگ سٹیشنوں پر تعینات کئے جانے والے افسروں کو غیر جانبدار رہنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ غرضیکہ انتخابات لڑنے والے اُمیدواروں کو مطمئن کرنے کے لئے وہ سب کچھ کیا جارہا ہے جو حکومت کے بس میں ہے۔ وزیراعظم جناب بخشی غلام محمد نے بیرون ریاست کے اخباری نمائندوں کو بھی دعوت دی ہے کہ وہ خود آکر انتخابی عمل کا مشاہدہ کریں حکومت کے اس رویے سے مطمئن ہونے کا ہی نتیجہ ہے کہ پرجا پریشد اور پرجا سوشلسٹ پارٹی کے اُمیدواروں کے علاوہ بہت سے آزاد اُمیدوار بھی انتخابی میدان میں آگئے ہیں۔ اور انتخابات لڑنے کے لئے اُمیدواروں کی اتنی بڑی تعداد کا میدان میں آنا جمہوریت کی کامیابی اور ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کا آغاز ہے۔ ریاست کی تاریخ کے اس اہم اور تاریخی مرحلے پر جن جماعتوں نے انتخابات میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا ہے، انہوں نے عملاً اس بات کا اعتراف کرلیا ہے کہ جماعتی حیثیت سے اُن کا وقار صفر کے برابر ہے۔ انتخابات میں حصہ لئے بغیر انہوں نے موجودہ برسراقتدار پارٹی پر یہ الزامات لگانا شروع کردیے کہ ہونے والے انتخابات آزادانہ اور غیر جانبدارانہ طور پر عمل میں نہیں لائے جائیں گے۔ یہ اصل میں اپنی شکست کا اعتراف تھا۔ اور اپنی گرتی ہوئی ساکھ برقرار رکھنے کا ایک آخری سہارا! دراصل ان جماعتوں کے پاس کوئی ایسا ٹھوس پروگرام نہیں جسے وہ نیشنل کانفرنس کے پروگرام کے مقابلے میں پیش کرکے عوام کی ہمدردی اور ان کی حمایت حاصل کرسکیں نیشنل کانفرنس کو اسمبلی میں ابھی سے ٹھوس اکثریت حاصل ہوگئی ہے، اسلئے یہ امر یقینی ہے کہ آئندہ پانچ سال کے لئے بھی نیشنل کانفرنس ہی برسراقتدار رہے گی نیشنل کانفرنس کی یہ شاندار کامیابی اس کے ٹھوس اور تعمیری پروگرام کا نتیجہ ہے، اور اقتدار کا خواب دیکھنے والی ہر جماعت کو اس سے بہتر تعمیری پروگرام پیش کرکے ہی کامیابی کی اُمید رکھنا ہوگی۔

سلامتی کونسل کی تازہ قرارداد کے مطابق سویڈن کے نمائندے مسٹر یارنگ برصغیر ہند و پاکستان کا دورہ کرنے کے لئے مارچ کے وسط میں آرہے ہیں —— مسٹر یارنگ کے دورے کا کیا مقصد ہے اور وہ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوں گے، یہ سوال سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے جہاں تک مسٹر یارنگ کے دورے کے مقاصد کا تعلق ہے۔ ہندوستان نے اس سلسلے میں اپنی پوزیشن واضح کردی ہے۔ وزیراعظم پنڈت جواہرلال جی نہرو نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ مسٹر یارنگ سے دو بنیادی باتوں کو زیر نظر رکھکر ہی بات چیت کی جاسکتی ہے اور یہ حقیقتیں ہیں کشمیر کا ہند سے قانونی الحاق، اور پاکستان کی حملہ آورانہ حیثیت۔ اور ان دونوں باتوں کو سلامتی کونسل کی تازہ قرارداد میں نظرانداز کیا گیا ہے۔ اب اگر مسٹر یارنگ ہندوستان کی حکومت سے بات چیت کرنا چاہیں، تو ظاہر ہے، انہیں ان دو باتوں کو بنیاد بناکر ہی ایسا کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ان کی بات چیت کا مقصد کیا رہیگا۔ اس کے متعلق ابھی سے فیصلہ کرنا مشکل ہوگا۔ وہ جس قرارداد کی رو سے یہاں آرہے ہیں۔ اس میں نہ تو فوجی انخلاء کا ذکر ہے اور نہ ہی بین الاقوامی ہنگامی پولیس کا۔ اور ان ہی مقاصد کے حصول کے لئے پاکستان نے اب کے کشمیر کا مسئلہ اٹھایا تھا۔ مسٹر یارنگ کی آمد کا صرف ایک ہی مقصد ہوسکتا ہے کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو مسئلہ کشمیر کے حل پر باہمی گفت وشنید کیلئے راضی کردیں۔

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

میر غلام رسول نازکی

کشمیر

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلّی — اللہ کرے تجھ کو عطا دیدۂ بینا

ہے جلوۂ گُل جلوۂ انوارِ الٰہی — یہ وادیٔ کشمیر ہے یا وادیٔ سینا

یہ برف یہ کہسار یہ وادی یہ مناظر — چاندی کی انگوٹھی میں زمرُد کا نگینہ

ارژنگ کی گلرنگ بہاروں کا مرقع — یہ مانی و بہزاد کی صنعت کا خزینہ

یہ لالۂ گلفام ہے یا جامِ لبالب — یہ نرگسِ مخمور ہے یا ساغر و مینا

یہ برگ گل و لالہ پہ شبنم ہے کہ جس پر — حوروں کی جبیں پر ہے ندامت کا پسینہ

شاعر کے حسین خواب کی تعبیر ہے کشمیر — پُرکار مصوّر کے تخیّل کی حسینہ

اے نورِ نظر! دیکھ کہ منظورِ نظر ہے — ساون کا مہینہ ہو کہ پھاگن کا مہینہ

اے زاہد بد ذوق اسی خاک میں مر جا — اس خاک میں مرنا بھی ہے فردوس میں جینا

وہ گوہرِ نایاب ہیں اِس خاک میں جن سے — کم مایہ و ناچیز ہے کسریٰ کا دفینہ

خاموش پرستار ہوں میں حُسنِ ازل کا

اے جنبشِ لب! دل کا اُلٹتا ہے سفینہ

فدا محمد حسنین

شال بافی کی کہانی

بحیثیت پوشاک شال کا وجود صدیوں پرانا ہے۔ اور فن شالبافی کی تاریخ دلچسپی سے خالی نہیں۔ شال پشم سے تیار کی جاتی ہے اور قدیم عہد میں نیپال سے آتی تھی۔ نیپال کے بنے ہوئے شال۔ کمل نیپالی کہلاتے تھے۔ اگرچہ ایران اور وسط ایشیائی ممالک میں بھی شال بنے جاتے تھے مگر شال اب کشمیر میں اتنا مدغم ہو چکا ہے کہ آج کل شال کے لفظ کو کشمیر سے الگ نہیں سمجھا جاتا۔

ساتویں صدی عیسوی کے آخر میں کشمیر کے نامور حکمراں للتادتیہ مکتا پیڈ نے لداخ اور تبت کو تسخیر کیا اور ترکستان اور وسط ایشائی ریاستوں کو اپنے اثر و رسوخ میں لانے کی مہم شروع کی۔ تاریخی لحاظ سے بات قرین قیاس ہے کہ اس عہد میں شالبافی کا فن کشمیر میں وارد ہوا ہوگا۔ درد بحیثیت قوم کے گیارہویں صدی میں کشمیر میں وارد ہوئے وہ لوگ بھی اس فن سے واقف تھے۔ اس زمانے میں ہرش نے مسلمان فنکار۔ فوجی ماہر اور کاریگر کشمیر میں بسائے اور کپڑا بننے کے فن کو ترقی دی۔ اور نئی پوشاک نئے سنگار اور نئے فیشن کو جنم دیا۔ چودھویں صدی میں کشمیر کے سلطانوں نے بدخشاں۔ کاشغر۔ کابل اور یارقند کو تسخیر کر کے کشمیر کو تہذیب تمدن۔ علوم و فنون اور تحقیق و تفتیش کا مرکز بنایا۔ لیکن سلطان زین العابدین ہی پہلا سلطان تھا جس نے صحیح معنوں میں کاغذسازی۔ چوب سازی۔ کشیدہ کاری اور شالبافی کو سرکاری طور پر فروغ دیا۔ سلطان نے ترکستانی جلاہوں کو کشمیر میں لا بسایا۔ مسلمان حکمرانوں کے عہد میں پشم براہ لداخ کشمیر میں آنے لگی۔ پشم کی اعلیٰ قسم شاہ طوس کی شالیں سلطانوں کے عہد حکومت میں تیار کی جانے لگیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ پشمینہ کی سادہ چادریں بھی بنائی جانے لگیں۔

انیسویں صدی تک شال عام طور پر مردوں کا لباس تھا۔ جو رومال عمامہ اور چادر کے طور پر اسے استعمال کرتے تھے مگر آہستہ آہستہ انگریزی اثرات نے زور پکڑنا شروع کیا اور مردوں نے کوٹ پتلون وغیرہ کو اپنانا شروع کیا اور شال کو خواتین نے اپنایا اور آج کل شال صنف نازک کا پسندیدہ پہناوا ہے۔ شال پر مختلف بیل بوٹے بنانا اور کاڑھنے کا سہرا مغلوں کے سر ہے۔ لیکن مورکرافٹ سیاح کے بیان کے مطابق کشیدہ کاری کو افغان دور حکومت میں ترکی تاجر خواجہ یوسف اور کشمیری فنکار علی بابا نے مروج کیا۔ مرزا نقد بیگ نے کام والے شال کو رواج دیا۔ اور شہنشاہ اکبر کے زمانے میں شال طرح دار کشمیر تیار ہونے لگی۔ اکبر نے دوشالہ کو رائج کیا اور کشمیری شال کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہونے لگی۔ مؤرخ نے رنگ شال کو مغلوں سے منسوب کیا ہے۔ یہ شال شاہ طوس سے تیار کئے جاتے تھے جو کہ جنگلی بھیڑوں کی نہایت نرم و نازک پشم ہے جن کے بارے میں سنا گیا ہے کہ چٹانوں کے ساتھ رگڑ کی وجہ سے ان کی پشم نہایت ہی نازک اور ریشمی بن جاتی ہے۔

ستارھویں صدی میں کشمیر پر افغان حکومت تھی۔ انہوں نے شال کو عمامے کے طور پر استعمال کیا۔ اس عہد میں پشمینہ کی تجارت کو بڑا فروغ ملا۔ اور کابل و قندھار میں پشم کی منڈیاں قائم ہو گئیں اور سندھ کے تاجر شال کی خرید و فروخت میں دلچسپی لینے لگے۔ راجپوتانہ اور دکن کی ریاستوں میں شال دوگنے نفع پر بکنے لگے۔ اس دوران میں ایران کے تاجروں نے کشمیری شال کو درآمد کرنا شروع کیا اور اس طرح بحیرہ روم کے ممالک میں شال فیشن بن گیا۔ اور کشمیر میں شالبافی

کے کئی کارخانے قائم ہوگئے۔ اٹھارھویں صدی میں افغانی گورنر آزاد خان نے شال پر محصول قائم کردیا اور کشمیر میں بننے والے ہر شال پر مہر لگنے لگی جو داغ شال کے نام سے مشہور ہے۔ سری نگر میں جگہ جگہ شالبافی کے کارخانے قائم ہوئے۔ افغانی گورنر عطا محمد خان کے عہد حکومت میں پینتالیس ہزار شالباف فنکار کشمیر میں کام کرتے تھے اور کام کرنے کے اٹھارہ سو سنٹر قائم تھے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں شال پر ۲۶ فیصدی محصول قائم ہوا۔ اس وقت شالبافوں کی تعداد بارہ لاکھ تک پہنچ گئی اور شالبافی کے بائیس سو سنٹر قائم ہوگئے۔ مگر یہ دور شالبافوں کے لئے نحوست کی ابتدا بھی تھا۔ قحط عظیم کی وجہ سے کشمیر ویران ہوگیا۔ ہزاروں شالباف پنجاب کی طرف بھاگ گئے اور تقریباً چودہ سو شالباف بھوک سے مرگئے۔ بچے کھچے شالباف شملہ، امرتسر، لاہور، جلال پور، لدھیانہ، اور نورپور میں مقیم ہوگئے۔ اور سستے قسم کے شال تیار کرنے لگے۔ سکھ گورنر میاں سنگھ نے ان فنکاروں کی آبادکاری کی طرف توجہ دیکر شالبافوں کی ہمت افزائی کی۔ اس طرح شالبافوں کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی اور شیخ غلام محی الدین کے عہد میں چار ہزار تک پہنچ گئی۔ اس زمانے میں کشمیر کے شال یورپی ممالک خاص کر فرانس اور انگلینڈ میں جانے لگے۔ شیخ غلام محی الدین نے شالبافوں پر انفرادی ٹیکس عائد کرنے کی ابتدا کی جو کم سے کم پانچ روپیہ سالانہ ہوا کرتا تھا۔ بیمار، ضعیف النظر پر نصف ٹیکس عائد کیا جانے لگا، جو باج کے نام مشہور تھا۔ ایک شال کئی فنکاروں کی دماغ سوزی اور عرق ریزی کا کرشمہ ہوا کرتا تھا۔ تبت۔ لداخ، سنگ کیانگ اور ترکستان کے باشندے جنگلی بھیڑوں سے پشم حاصل کرتے تھے منڈی اور وسطی ایشیائی تاجر پشم لیکر کشمیر آتے تھے۔ اور ٹھیکہ داروں کو بیچ دیتے تھے۔ خواتین کا کام پشم کو صاف کرکے کاتنا تھا اور پھر دھاگے دو گنا کرکے بٹنا ہوتا تھا۔ ۲۵۰۰ گز دھاگے پر انہیں دو پیسے اجرت ملتی تھی۔ اس کے بعد رنگ کرنے والے جنہیں رنگر کہتے ہیں اس دھاگے کو رنگتے تھے۔ مورکرافٹ سیاح جو کہ ۱۸۱۹ء میں کشمیر وارد ہوا، لکھتا ہے مغل دور حکومت میں رنگسازوں کی تین سو بھٹیاں تھیں۔ کشمیر چونکہ رنگ رنگ کے پھولوں کا گلزار ہے اس لئے یہاں قدرتی طور پر بہترین رنگ دیئے جاتے تھے۔ شال بننے سے پیشتر نقاش جو کہ ڈیزائن، رنگ کی ہم آہنگی اور حسن کا خالق ہوا کرتا تھا۔ اپنا ایک نقشہ بناتا تھا جس کے مطابق شال تیار کیا جاتا تھا۔ ان حسن کاروں کی آمدن ۳ آنے سے ۸ آنے روزانہ تھی۔ ان کی مصوری کے نمونے، خاکے اور نقشے اور یہ خاندانی راز سمجھی جاتی تھیں۔ اس لئے چند خاندان ہی اس کام کے اجارہ دار تھے۔ نقاشی کے بنائے ہوئے نقشے کو استاد حرفوں میں مبدل کرتا تھا تاکہ بننے کے وقت مناسب ہدایات دے سکے۔ وہ ساتھ ساتھ بولتا جاتا تھا کہ یہ رنگ بھرو وہ رنگ بھرو اور اس آواز پر شاگردوں کی انگلیاں چلتی تھیں۔ شال بننے والے تمام مرد ہوا کرتے تھے۔ شالبافی کے کارخانے کا مالک کارخانہ دار ہوا کرتا تھا جو کاریگروں کو روزانہ چار پیسے مزدوری دیا کرتا تھا۔ ہر کارخانے میں سینکڑوں کاریگر ہوا کرتے تھے جو کہ کشمیر میں ہی بنائے چلتے تھے۔ ہر ایک کارخانہ دار کے تحت تیس سے لیکر تین سو تک شالباف ہوا کرتے تھے۔

کشمیر کو انگریزوں نے ۱۸۴۶ء میں راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں بیچ ڈالا اور تب سے یہ خطۂ ارض ڈوگرہ مہاراجوں کی عملداری میں آگیا۔ مہاراجہ نے اپنی آمدنی بڑھانے کی غرض سے شالباف طبقہ پر فی نفر ۴۳ روپیہ سالانہ ٹیکس عائد کردیا۔ اس کے علاوہ ہر شال پر بحساب قیمت ۲۵ فی صدی ٹیکس سرکار وصول کیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ ٹیکس وصول کرنے والوں کی نذر مزید ۲۵ فی صدی کی ادائیگی فرض بن گئی۔ اس طرح بیچارے شال بافوں کی محنت و مشقت کا ناجائز استعمال شروع ہوگیا۔ ان مظالم کو سہتے سہتے شالباف تنگ آگئے اور کشمیر سے باہر ہجرت کرنے لگے۔ پنجاب کے مختلف اضلاع کے علاوہ آگرہ۔ پٹنہ اور لکھنؤ میں بھی انہوں نے شالبافی کے کارخانے قائم کئے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے پنڈت راجہ کاک کو ۱۹۶۴ء میں ٹھیکدار شال مقرر کیا اور شالبافوں کے تعداد کا مالک بنادیا۔ اس نے اپنے لئے اور مہاراجہ کے لئے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ یہ محکمہ داغ شال کہلاتا تھا یہ محکمہ شال کے نمونے مقرر کرکے ان پر سرکاری مہر ثبت کرکے کارخانہ دار کو دیتا تھا جس کے لئے اسے ٹیکس دینا ہوتا تھا۔ شال تیار ہونے پر پھر محکمہ داغ شال میں پہنچایا جاتا جہاں جانچ پڑتال کے بعد اس کو

پاس کردیا جاتا۔ پاس کرانے کے سلسلے میں کارخانہ دار کو رشوت ادا کرنی پڑتی تھی۔ ورنہ محکمہ کے سرکاری ملازم کوئی نہ کوئی نقص نکال کر شال کو نامنظور کراتے تھے۔ راجہ کاک نے شالبافوں کی تعداد بڑھانے اور نئے کارخانے شروع کرنے پر توجہ دی۔ اس طرح شال بافوں کی تعداد ستائیس ہزار تک پہنچ گئی اور مُنبائی کے گیارہ ہزار سنٹر قائم ہوگئے۔

حکومت کشمیر نے بوساطت حکومت انگریزی یوربی ممالک میں شال کی کھپت کا انتظام کیا۔ فرانس، لندن اور قسطنطنیہ کے تاجر سری نگر پہنچے اور یہ شہر چینی، ترکستانی، ازبک، ترکی، تاتاری، ایرانی، کابلی، سندھی، فرانسیسی اور انگریزی تاجروں کا مرکز بن گیا۔ اس طرح انیسویں صدی میں کشمیر کا شال یورپ کا چہیتا تحفہ اور دل پسند فیشن بن گیا۔ اس طرح ایک تو حکومت کشمیر کو مالی فائدہ ہوا اور دوسرے شال بافوں کو روزگار مل گیا۔ بموجب بہار ۱۸۶۵ء میں شالباف ایجی ٹیشن کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ شالبافوں کو فی سال آٹھ خروار سے زیادہ شالی خریدنے کی اجازت نہ تھی، اس لئے ان کے اہل و عیال کو پیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہ تھا۔ دوسرے حکومت کی مقرر کردہ قیمت ان کی بساط سے باہر تھی۔ تیسرے راجہ کاک شال بافوں کو شالی ۱۸ آنے فی خروار فروخت کرتا تھا، حالانکہ مہاراجہ کے حکم کے مطابق ساڑھے سترہ آنے فی خروار بکتی تھی۔ دو پیسے فی خروار وہ خود خرد برد کرتا تھا۔ جب وزیر پنوں کی جگہ دیوان کرپا رام گورنر کشمیر بن کر سری نگر وارد ہوا۔ تو تقریباً پندرہ سو شالباف ظلم ستم کے خلاف احتجاج کرنے اس سے ملنے باہمال تنگ آئے۔ سری نگر میں ان کے وفد دو تین بار دیوان سے ملے۔ آخر جب ان سے انصاف نہ ہوا تو وہ کھٹہ کل (نہر) کے کنارے جمع ہوئے اور راجہ کاک دار دفعہ کا جنازہ نکالا اور جلوس کی صورت میں چل دیئے۔ دیوان کرپا رام نے تقریباً پانچ سو سپاہی اس جلوس کی سرکوبی کے لئے بھیجے۔ شالباف مسلح سپاہیوں کے آگے نہ ٹھہر سکے اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور ان میں سے پانچ یا چھ آدمی نہر میں ڈوب گئے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے شالبافوں کا یہ مطالبہ منظور کیا کہ انہیں زیادہ شالی خریدنے کی اجازت دی جائے۔ حکم ہوا کہ فی نفر سالانہ گیارہ خروار شالی خریدی جا سکتی ہے۔ قیمت میں چار آنے فی خروار کمی کی گئی۔

۱۸۷۰ء میں فرانس اور پروشیا کے درمیان جنگ چھڑ گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شال کی تجارت مدھم پڑ گئی اور شالباف بیکار ہونے لگے۔ مہاراجہ نے شال خرید کر ۳ آنے سے ۷ آنے تک خسارہ پر یورپ کی منڈیوں میں نیلام کرنا شروع کیا۔ اس طرح ہزاروں شالباف بے کار ہوگئے۔ اس مصیبت کے وقت دوسری آفت یہ آئی کہ ۱۸۷۷ء میں سخت قسم کا قحط پڑ گیا۔ اور وہ کیڑوں مکوڑوں کی طرح مرنے لگے۔ اور ان کے ساتھ ان کا فن موت کی آغوش میں جاتا ہوا دکھائی دیا۔ شال بافوں نے ہجرت کی اور فن کی وہ شمع جو وقت کے ظالم ہاتھوں یہاں گل ہو رہی تھی، ہند کے دوسرے شہروں میں روشن کردی۔ کہتے ہیں کہ شال باف مر گئے مگر یہ فن مرا نہیں۔ مٹا نہیں آج بھی زندہ ہے۔

فراق گورکھپوری

غزل

ایک انگشتِ شہادت بہ خدا ہوتی ہے
نظر اٹھتی ہے جدھر قبلہ نما ہوتی ہے

جز بقا کچھ بھی نہیں وہم فنا کچھ بھی نہیں
غور کر غور، فنا بھی تو بقا ہوتی ہے

خنکی و تیرگی و خوشبو و موج و گرداب
خم بہ خم زلف بھی کیا جانئے کیا ہوتی ہے

آخر اے بادِ صبا کس لئے ایک ایک کلی
چاکِ دل، چاکِ جگر، چاکِ قبا ہوتی ہے

کاش تجھ سے دلِ بیگانہ منش خوش ہو جائے
پُر اثر ایسے فقیروں کی دعا ہوتی ہے

آج پھر لرزہ بر اندام ہے نظمِ عالم
آج پھر وہ نگہِ لطف خفا ہوتی ہے

چھیڑ کر دیکھ لئے عشق نے بہت سازِ نشاط
ہر نوا ایک دُکھے دل کی صدا ہوتی ہے

آہ کیا درسِ فنا دے گئی بوئے گل بھی
کہ نکلتے ہی نکلتے یہ ہوا ہوتی ہے

کسی صیاد کے ہاتھوں میں نہیں ایسی کمند
میری خاموش نظر آہِ رسا ہوتی ہے

کسکو مجبور کہیں، کسکو بتائیں مختار
کہ مشیت بھی تو زنجیر بہ پا ہوتی ہے

یوں تو ہے شانِ چمن، جانِ چمن وہ نو گُل
اُس سے کچھ بات بھی اے بادِ صبا ہوتی ہے

ہیں ستارے کہ خیالات کے آنسو ہیں فراق
رات کہتے ہیں جسے، پوچھ نہ کیا ہوتی ہے

میر غلام رسول نازکی

کشمیر کا جامی ــــ عبدالاحد ناؔدم

سری نگر کے علاقہ رعناواری محلہ میشاہ میں حکیموں کا ایک خاندان رہتا تھا، عبدالاحد ناؔدم اصل میں اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں عبدالاحد ناؔدم سری نگر میں زیادہ دیر نہ رہ سکے۔ سری نگر سے ہجرت کا اصل سبب اگرچہ وثوق سے معلوم نہیں، مگر غالب قیاس یہی ہے کہ اُس زمانے میں سری نگر میں زندگی دُشوار تھی، اور شرفاء حالات کی نامساعدت سے تنگ آ کر دیہات میں پناہ لیتے تھے، عبدالاحد ناؔدم سری نگر سے سات میل دُور اومپورہ بڈگام کے قریب ایک گاؤں بٹہ ہار میں رہنے گئے، لیکن یہ اُنکی زندگی کے آخری بلکہ درمیانی حصے سے تعلق رکھتا ہے، اُن کا بچپن اصل میں بانڈی پورہ کے نزدیک ایک گاؤں گامرو میں گذرا۔ گامرو سے اُن کا تعلق کیا تھا اُس کے لئے کچھ اور تفصیلات جاننے کی ضرورت ہے۔

بانڈی پورہ کے نزدیک موضع گامرو میں ایک شریف خاندان کے آثار ابھی تک قائم ہیں۔ اس خاندان کے مورث اعلےٰ شیخ غازی ہیں جن کا اصلی نام پنڈت گنیش کول دنا تربہ تھا، اور جو حضرت شیخ حمزہ کشمیری رحمتہ اللہ علیہ کے دستِ حق پر بیعت کر کے مسلمان ہو چکے تھے۔ یہ شیخ غازی حضرت سلطان العارفین کی توجہ سے ایک نہایت اونچے رُوحانی مرتبہ پر فائز ہو گئے تھے، اُن کا مزار آج بھی موضع ماڈر بانڈی پورہ میں مرجع خلائق ہے شیخ غازی رح کی اولاد میں ایک اور بزرگ قابلِ ذکر ہیں، جن کا نام نامی شیخ فاضل زدیمری ہے۔ شیخ فاضل اپنے وقت کے بہت بڑے اہل اللہ تھے، زدیمر میں اُن کے مزار پر آج بھی عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے یہ خاندان انہی شیخ فاضل کی نسبت سے فاضلی خاندان کہلاتا ہے، اس گھرانے میں بہت سے لوگ بڑے اعلےٰ پایہ کے گذرے ہیں۔ ان میں غلام رسول شیوا ایک خدا رسیدہ بزرگ ہونے کے علاوہ فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے، غلام رسول شیوا، حسن شاہ مورخ اور غلام احمد جبید کے والد ہیں اور یہی غلام رسول شیوا عبدالاحد نادم کے نانا ہیں۔ اس اعتبار سے ناؔدم کا بچپن گامرو میں گذرا، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ خاندان علم دوست اور خدا پرست خاندان تھا، اس ماحول میں رہ کر ناؔدم کے جوہر ذاتی نے جلا پائی، اور وہ کشمیری ادب میں ایک ایسے قابلِ قدر باب کا اضافہ کرنے کا باعث بنے جس کا جواب آج تک نہ ملا۔

عبدالاحد ناؔدم کی تاریخ پیدائش یا سن ولادت کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ البتہ اُن کی تعلیم و تربیت کے متعلق یہ بات قطعی ہے کہ وہ غلام رسول شیوا، پیر حسن شاہ مورخ، غلام احمد جبید اور اُن کے ایک اور چھوٹے بھائی پیر محمد شاہ کی نگرانی میں ہوئی، اور بہت اعلےٰ پیمانے پر ہوئی شیوا کے تین بیٹوں میں سے اُن کے سب سے چھوٹے بیٹے پیر محمد شاہ بجید عابد، زاہد، مرتاض اور پارسا بزرگ تھے، نادم زیادہ تر انکی ہی کی نگرانی میں رہے ناؔدم کے متعلق بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر و شاعری کی لگن انہیں بچپن سے تھی، چنانچہ بچپن میں ہی جب ایک روز بھیڑوں کے ایک گلے کی نگہبانی اپنے چند اور ساتھیوں کے ساتھ کر رہے تھے، تو وہاں اکثر انہیں مچھر ستایا کرتے تھے، اُسی زمانے میں جب کہ اُن کی عمر دس بارہ سال سے زیادہ نہ تھی، انہوں نے فارسی میں ایک طویل مچھر نامہ لکھا، جو اب کہیں بھی موجود نہیں، بعض لوگوں کو ان کے اکثر اشعار یاد تھے، مجھ تک ایک شعر پہنچا ہے، جو پختگیٔ فن اور بداہت و بلاغت دونوں سے مالامال ہے، شعر یہ ہے

شرف شاہ از ہوا بگریختے گہے می‌نشستے گہے ایستے

ماحول نے انہیں ایک طرف سے تو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا، دوسری طرف سے اُن کے جذبات کو جلا بخشی، شعر کا مادہ ودیعت تھا ہی، وہ ایک

خاص رہگذر پر نکلا، اور نادم نے ایک مخصوص انداز میں نعت لکھنا شروع کی اور اس فن میں وُہ کمال حاصل کیا، جو آج تک کشمیری زبان میں کسی کو نصیب نہ ہوسکا، نعت ایک ایسا موضوع ہے جو عربی، فارسی، اردو میں یکساں طور محبوب ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ ان تینوں زبانوں کے ادب کو نعت نے ایک قابل قدر سرمایہ عطا کیا ہے، بعض نعتیں خاص کر عربی اور فارسی میں ادب کے اعلیٰ شاہکار ہیں، کہ نادم نے کشمیری میں جو نعتیں لکھی ہیں اُن سے نہ صرف یہ کہ اُن کے سوز و درون کا پتہ چلتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ کشمیری زبان کو وُہ لاجواب چیزیں ملی ہیں، جن پر اس زبان کا ادب رہتی دنیا تک فخر کرسکتا ہے، نادم کی نعتوں اور دیگر تصنیفات کا ذکر کرنے سے پہلے اُن کی زندگی کے چند واقعات کا ذکر کرنا ضروری ہے، تاکہ یہ تذکرہ اُس حد تک مکمل ہوجائے، جس حد تک ممکن ہو، نادم کے متعلق یہ بات معلوم ہے کہ وُہ اپنی ساری زندگی میں بے حد محتاط اور زاہد رہے، اس بات کا انہیں سخت خیال رہتا تھا کہ وُہ کسی کا حق نہ دبائیں، اور کوئی ایسی چیز نہ لیں جو اُن کی نہیں اس معاملے میں اُن کی احتیاط غلو کی حد تک پہنچی تھی، یہاں تک کہ وُہ کسی کے ہاں کھانا کھانے سے بھی پرہیز کرتے تھے، انہوں نے فن طب میں بڑا کمال حاصل کیا تھا، اور لوگ دُور دُور سے آکر اُن سے طبی مشورہ حاصل کرتے اور شفایاب ہو جاتے، اس سلسلے میں وُہ اکثر صبح کے وقت کچھ مریضوں کو دیکھنے جاتے، مگر اپنا کھانا ساتھ لے جاتے، اور جہاں بھوک لگتی کھاتے، زہد و ورع کے متعلق میرے والد مرحوم پیر غلام مصطفےٰ صاحب اُن کا ایک واقعہ اکثر بیان کرتے تھے، والد مرحوم کہتے تھے کہ ایک روز میں نے نادم کو ہار ساون کی دھوپ میں گامرو سے ماتری گام جاتے دیکھا، بہت ضعیف العمر تھے، اس کے باوجود پیدل جارہے تھے، مجھ سے ملے، اور میں نے اس حالت اور اس شدید دھوپ میں گامرو سے ماتری گام جانے کا سبب پوچھا، فرمایا نیچے بیٹھو، مجھ پر ایک بہت بڑی مصیبت آئی ہے، تم سے امداد چاہتا ہوں، ہم دونوں ایک درخت کے نیچے بیٹھے، نادم نے ذرا دم سنبھالا، اور فرمانے لگے، کل ماتری گام سے ایک آدمی آیا، اور مجھے بہ اصرار اپنی ماں کو دیکھنے لے گیا، جو کچھ عرصے سے بیمار تھی میں جب وہاں پہنچا، اور اُس کی حالت دیکھی، تو میں نے اُس آدمی سے کہا کہ موت و حیات اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ظاہری طور پر اس خاتون کا علاج ممکن نہیں۔ آتی دفعہ اس آدمی نے مجھے آٹھ آنے دئے، میں نے لینے سے

تعبیر

انکار کیا، وُہ بدستور اصرار کرتا رہا، اور انجام کار میری جیب میں آٹھ آنے ڈال دئے، اور میں چلا آیا، آج صبح معلوم ہوا کہ اُس کی بیمار ماں چل بسی ہے میں اب وہاں جارہا ہوں، تاکہ اُس کے دئے ہوئے آٹھ آنے لوٹادوں۔ تم سے پوچھنا یہ ہے کہ اس آدمی کے آٹھ آنے میرے پاس ایک رات کے لئے بلا استحقاق رہے، کیا اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس پر مواخذہ تو نہیں ہوگا' میرے والد جب بھی یہ واقعہ بیان کرتے تھے، تو اُن کی آنکھیں اشکبار ہوتی تھیں، اور وُہ کہتے تھے کہ میں نادم کی طرف دیر تک دیکھتا رہا، اور سوچتا رہا کہ یہ آدمی کس قدر پارسا اور محتاط ہے، اور ساتھ ہی اپنے نفس کا احتساب بھی کیا، دونوں میں جو فرق تھا، وُہ زمین اور آسمان کے فرق سے بھی زیادہ تھا اولاد کے معاملے میں نادم صاحب زیادہ خوش نصیب نہ تھے، اُن کا ایک لڑکا نجم الدین تھا، اور دو بیٹیاں، دونوں بیٹیاں بانڈی پور کے قصبے میں دو اچھے گھرانوں میں بیاہی گئی تھیں، جن کی اولاد اب بھی زندہ ہے بیٹے کے ساتھ اُن کے تعلقات اچھے نہ تھے، غالباً اس لئے کہ وُہ نادم کے معیار زہد و ریاضت پر پُورے نہ اُترتے تھے، بٹہ ہاراوم پورہ سے والد مرحوم کے نام ایک دفعہ خط لکھا، جو ہمارے ہاں موجود تھا، اس کا پہلا جُملہ مجھے اب بھی یاد ہے لکھا تھا "نورالابصار، سلک الغفار، پسر ناہنجار، خلف بدکردار، نجم دُم دار، دہر ذر بوقت نصف النہار وارد بٹہ ہار گردید" اس سے اُس تلخی کا پتہ چلتا ہے، جو اُن کے دل میں اپنے بیٹے کے خلاف موجود تھی، آخر عمر میں اُن پر مجذوبیت کا عالم طاری تھا، ۱۳۲۹ھ میں وفات پائی، اور موضع گامرو کے قبرستان میں آسودہ ہوئے، والد مرحوم نے تاریخ وفات لکھی،

اے دریغا سرو بُستانِ رشد جائے کردہ از قضا زیر لحد

۱۳۲۹ھ

اُن کی تصنیفات میں نعتوں کے علاوہ ایک شمایل نبوی اور ایک شہر آشوب نادرِ روزگار میں سے ہے، ان چیزوں کے علاوہ جو اب تک محفوظ ہیں نادم نے اور بھی بہت سی چیزیں لکھی ہیں، مگر وُہ یا تو ضائع ہوگئی ہیں یا ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں کہ جو ان کو باہر نکالنا پسند نہیں کرتے مگر واقعہ یہ ہے کہ نادم کا سب سے قیمتی سرمایہ اُن کی نعتیں ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نعتیں ایک خاص جذبے کے تحت لکھی گئی ہیں۔ اور مصنف کے دل میں عشق محمدی کا وُہ سمندر موجزن تھا، جس کی کہیں تھاہ نہیں، اس جذب صادق نے

ناؔدم کے قلم سے وہ سدا بہار پھول کھلائے ہیں جو ابد تک سرسبز اور معطر رہیں گے ان گلہائے رنگا رنگ میں جاکر آدمی کے لئے یہ دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سے پھول کو پہلے دیکھے اور کس کو بعد میں۔ نعتوں میں ناؔدم نے انداز "دبنہ دُن" کا رکھا ہے، شاید اس سے یہ مقصود تھا کہ یہ عورتوں میں عام ہو جائیں، چنانچہ ایسا ہوا بھی ہے، اور پھر زبان ان نعتوں کی اتنی پیاری، صاف اور منجھی ہوئی ہے کہ خود عورتوں کی زبان معلوم ہوتی ہے، ان نعتوں کے پڑھنے کے بعد ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جذبات کی ترجمانی کے لئے الفاظ اور زبان کا انتخاب کتنا ضروری ہے، کیونکہ جو کام ناؔدم کی نعت کا ایک بند کر جاتا ہے وہ غالباً واعظوں اور سیرت نگاروں کی فلسفیانہ موشگافیوں سے آج تک نہ ہو سکا،

میں یہاں ایک مسلسل نعت کے چند بند لکھتا ہوں، اُن کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ناؔدم کو اللہ تعالےٰ نے کتنی شاعرانہ صلاحیتیں عطا کی تھیں معلوم ہوتا ہے کہ اس جلیل القدر انسان نے محض قافیہ پیمائی نہیں کی ہے، بلکہ مضامین کی آمد نے خود قوافی اور مُناسب الفاظ کو دعوت دی ہے کہ وہ آ جائیں اور اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں۔ یہ بند حسبِ ذیل ہیں:-

سوزہ چانہ آدم اوس تابانہ سجدہ اوہ داونس باتکرار
کورنہ ابلیسن تہ گو ویرانہ شاہِ خوبانہ ہاوُ دیدار

(آپؐ کے سوز سے آدم علیہ السلام کی جبین تابناک تھی، اسی لئے خدا تعالےٰ کی مشیت نے آدمؑ کے سامنے فرشتوں کو سربسجود ہونے کا حکم دیا۔ ابلیس نے انکار کیا، اور برباد ہوا، اے محبوبوں کے بادشاہ! ہمیں اپنے دیدار سے سرفراز کر)

نوح اوس جو نوی کشتیبانہ پشتہ چانہِ لُب تم صدرس تار
بریٹھ لوگ وارہ کارہ تمہ طوفانہ شاہِ خوبانہ ہاوُ دیدار

(نوح علیہ السلام اُس کشتی کے ملاح تھے، جس کا رُخ آپ کی طرف تھا آپ کی حمایت سے وہ طوفانی سمندر سے پار اُترے، اور اس سیلاب سے نجات پا گئے، اے محبوبوں کے بادشاہ! ہمیں اپنے دیدار سے سرفراز کر)

ابراہیمس چانہ سوزانہ نارِ نمرودس گوس گلزار
فرزند کرونے ژی قربانہ شاہِ خوبانہ ہاوُ دیدار

(ابراہیمؑ کی پیشانی بھی آپ کے نور سے منور تھی، اسی لئے نمرود کی آگ اُن کے لئے گلزار بن گئی، ابراہیمؑ نے اپنے عزیز کو آپ ہی کے نام پر نثار کیا تھا، اے محبوبوں کے بادشاہ! ہمیں اپنے دیدار سے سرفراز کر)

شاہِ یوسف سوی ماہِ کنعانہ لیہس درشن اک سمار
خوبصنہ چانہِ منز اوس اک دانہ شاہِ خوبانہ ہاوُ دیدار

(حضرت یوسف علیہ السلام جو ماہِ کنعان کے نام سے مشہور ہیں، جن کی ایک زیارت کی قیمت ایک پوری دُنیا ہے، وہ بھی حضور کے خرمنِ حُسنؐ جمال میں ایک دانے سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے، اے محبوبوں کے بادشاہ! ہمیں اپنے دیدار سے سرفراز کر)

چوبدار چون اوس ابنِ عمرانہ عاصہ اوہ سپدُس خاصہ شہار
یدِ بیضا چھوس چون برہانہ شاہِ خوبانہ ہاوُ دیدار

(موسیٰ ابن عمرانؑ آپ کے ایک نقیب اور چوبدار تھے، اسی لئے عصائے موسیٰ میں یہ اہلیت تھی کہ وہ اژدہا بن سکتا تھا، موسےٰ کے پاس یدِ بیضا کا برہان بھی آپ ہی کا عطیہ ہے، اے محبوبوں کے بادشاہ! ہمیں اپنے دیدار سے سرفراز کر)

اس نعت میں جہاں یہ خوبی ہے کہ الفاظ کی بندش، مضامین کی چُستی اور طرزِ بیان کی برجستگی موجود ہے، وہاں یہ خوبی بھی موجود ہے کہ تمام انبیاؑ کرام کی ان خصوصیتوں کا ذکر بڑی چابک دستی سے کیا گیا ہے، جن کیلئے وہ مشہور ہیں، صنعت شعری میں تلمیح کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور یہ تلمیح ان اشعار میں اپنے پورے عروج پر موجود ہے، اس نعت میں حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کا سراپا لکھ چکنے کے بعد عرضداشتیں ہیں ان میں جو نیاز اور سوز و گداز ہے، وہ بدبخت سے بدبخت انسان کے دل میں سوز پیدا کرنے کے لئے کافی ہے، فرماتے ہیں:-

تخت آئے چانہِ پوژھ سانہِ سلطانؐ بخت سون ژیُ چھوک گژھ بیدار
رخت لاگ تنہ چھوی تخت پرارانؐ شاہِ خوبانہ ہاوُ دیدار

(اے ہمارے سلطانِ مدینہ! آپ کی جدائی ہم پر بہت شاق گذری ہے آپ ہمارا بخت ہیں، اب ذرا بیدار ہو جائیے۔ اپنے وجودِ پاک پر لباس زیبِ تن فرمائیے، تخت و تاج آپ کا منتظر ہے، اے محبوبوں کے بادشاہ! ہمیں اپنے دیدار سے سرفراز کر)

ناؔدم کی نعتوں میں ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، وہ یہ کہ عشق و محبت کے سوز نے اُس کے دل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

کے لیے ایک اپنائیت پیدا کی ہے جس کا کوئی جواب نہیں، نادم نے حضور کے لیے جو نئی نئی ترکیبیں بنائی ہیں، اُن سے اس اپنائیت کا پتہ چلتا ہے
"ایک ایسی ہی نعت کے دو بند ملاحظہ فرمائیے۔

ڈیکہ تس نورکہ طور رچ تیتھۓ ... گاہ یلہ ترووُتھمُ ماہ رخسارٕ
ساسہ بدٕ آفتابہ ددتھ تمُ پیتھۓ ... مدنی مارہ متتۓ مأرٕ

(آپ کی جبینِ مبارک نور کے طور کا ایک قمقمہ ہے، جب وہ ضیا پاشی کرتی ہے تو ہزاروں سورج ماند پڑ جاتے ہیں، مدنی محبوب نے ہمیں مار دیا ہے)

کمہ وتہ رو ترووُ سرو فا متتۓ ... گراین پتہ پتہ لگہ ہس پأرٕ
ژھاین تہ کرہ ہس نالہ متتۓ ... مدنی مارہ متتۓ مأرٕ

(اُس میرے سرو قامت محبوب کا گذر کہاں سے ہوا۔ معلوم ہوتا، تو ہم اُس کی چال پہ قربان ہو جاتے، اور اُس کے سائے سے گلے ملتے، مدنی محبوب نے ہمیں مار دیا ہے)

ان متفرق نعتوں کے علاوہ نعتیہ کلام میں نادم کے دو بہت بڑے شاہکار ہیں۔ ایک شمایل نبوی اور دوسرا جامی کی مشہور نعت زمہجوری برآمد جانِ عالم کی تضمین ہے۔ اگر شعورِ ادب نہ ہو تو میں یہاں تک بھی کہہ سکتا ہوں کہ حضرت جامی کی عظمت کے باوجود نادم کی نعت کا پلّہ بھاری ہے کہ ان صفحات میں گنجایش نہیں، اس لئے اس میں سے کچھ اشعار نمونہ کے طور پر نقل نہ کر سکنے کا افسوس ہے۔

خاتمۂ کلام میں نادم کے متعلق ایک بات کہنا بے حد ضروری ہے کہ نادم صرف اس قسم کے شاعر نہ تھے جنہوں نے ایک فرضی دنیا قایم کی ہوتی ہے، اور اسی دنیا میں اپنے خیال کے شب و روز بناتے اور فرضی زندگی بسر کرتے ہیں، وہ اسی کرۂ ارض کے باشندے تھے، اور ایک حساس دل اور دور رس نگاہ رکھتے تھے، چنانچہ اپنے زمانے کے حالات سے وہ بھی متاثر ہوئے، اور ان تاثرات کو ایک شہر آشوب میں قلم بند کیا ہے، نادم کا زمانہ وہ دور تھا جب جاگیر شاہی نظام نے استحصالی عناصر کی حوصلہ افزائی کی تھی، اور یہ استحصالی عناصر مثلاً، پیر، واعظ اور حاکم بن کر عوام کی گاڑھے پسینے کی کمائی پر چھاپہ مارتے تھے۔ نادم کا یہ شہر آشوب اپنے سماج کی برائیوں کے خلاف ایک للکار ہے، اور کہیں کہیں یہ چیخ اتنی تلخ ہوئی ہے

کہ اسلوب بیان پر قادر ہونے کے باوجود نادم کے قلم سے بعض ایسے الفاظ بھی نکلے ہیں جو اُن کی شان کے شایان نہ تھے، مگر اس کے باوجود بعض حقائق کو اس خوبصورتی سے نبھایا ہے کہ دل سے بے ساختہ واہ واہ نکلتی ہے
شروع کا بند ہے:-

یہ چھو کار از کن اسہ دینداران ... تزہ اوس تلہ کھارن مار
عام لگ چھینہ تہ خاص گیہ چھاکن

(آج کل کے ہم مذہبداروں کا یہ حال ہے کہ خدا کے منکروں کو بھی اس سے ننگ آتی ہے۔ ہم میں سے جو عوام تھے وہ کھائی میں گر پڑے اور خواص کھڈوں میں جا پڑے، عالم یہ ہے کہ خدا کے منکروں کو بھی اس سے ننگ آتی ہے۔

اپنے زمانے کے عالموں اور فاضلوں کی بددیانتی اور تفرقہ بازی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علم ایک ایسی چیز ہے، جو دوست بھی بن سکتی ہے اور دشمن بن کر زندگی کا خاتمہ بھی کر دیتی ہے۔

کینژن وتھ ہاوُ علمک بارن ... کینژن علم گو خرہ شند بار
کینہ کھچھ علمک کالہ شہارن ... تزہ اوس تلہ کھارن عار

(بعض لوگوں کو علم نے دوست بن کر سیدھی راہ دکھائی، بعض لوگوں کی پیٹھ پر علم اس طرح لادا گیا، جس طرح گدھے کی پیٹھ پر بوجھ لادا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کو علم نے اژدہا بن کر ڈس لیا۔)

کشمیر میں رہنے والے لوگوں کو معلوم ہے کہ ایک زمانے میں کشمیر کے واعظوں نے عوام کے اندر افتراق اور عداوت کا بیج بو یا تھا، بھائی کو بھائی سے اور شوہر کو بیوی سے الگ کر دیا تھا، باتیں معمولی تھیں، مگر اختلاف بڑا شدید تھا، کیونکہ اختلاف کو بڑھانے والے موجود تھے۔ اس بات کی طرف لطیف اشارہ کرتے ہوئے نادم اپنے شہر آشوب میں لکھتے ہیں۔

فتنہ چھ کتھہ ییلہ عامن تارن ... خارہ وتھ خلقن بارہ آکھ دیار
توُدہ گے فردن بیہ دستارن ... تزہ اوس تلہ کھارن عار

(یہ لوگ جب عوام کے دلوں میں فتنہ پردازی کی باتیں بٹھا دیتے ہیں تو لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں، انہیں کافی روپیہ ملتا ہے، دھسوں اور دستاروں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں)

نادم نے اس شہر آشوب کے آخری بند میں کہا ہے کہ میں کچھ اور بھی
(باقی صفحہ ۴۶ پر)

تعمیر
ماسک ۱۹۸۶ء

فاضل کاشمیری

غزل

خراماں خراماں سو جانِ بہار آو
گلن تازہ گی بلبلن لوکہ چار آو

آوے چھم مہ شادی آوے چھم دلس ستہ
مہربان رودم مرنش بار بار آو

سو ڈلیشت سولی شین گول۔ وندہ ژول وتن
پھلت آئے ون۔ پوشہ وارین بہار آو

وتھو شبنما تارہ کن ون وسیو وتن
چراغان کرو لالہ سوئے لالہ زار آو

بنیئے نالہ ساگر۔ بنیئے چشمہ قلزم
سمندر وچھت بے قرارن قرار آو

اکھا آسہ ہا یا لچھا آسہ ہن شوق
یمن بے حسابن شمار بے شمار آو

مے نن میون۔ گنون میون۔ اسن میون۔ دن میون
تہ بوزت اچھو منز وستہ آبشار آو

غزل میان غمگین دلن دِن ہا تسکین
امی آیہ لوکن یہ فاضل لکار آو

(ترجمہ)

وہ آیا میرا معشوق خراماں خراماں۔ لوگوں میں
تازگی آگئی اور بلبلوں میں بانکپن۔

میرا معشوق مجھ پر مہربان ہوا، اور میں اس کے لطفِ خاص کا
سزاوار قرار پایا۔ اس لئے خوشی میرے دل کو گدگدا رہی ہے۔

میرے معشوق کو دیکھتے ہی جاڑا بھاگ گیا۔ برف پگھل گئی جنگل
میں پھول کھلے اور چمن نکھر گئے۔

میرا معشوق لالہ زار کی طرف بڑھا۔ اے شبنم ذرا اُٹھ اور
ستاروں سے زمین پر اترنے کیلئے کہہ دے تاکہ ہم ملکر چراغاں کر سکیں۔

وہ دیکھتے ہی ندیاں ساگر بن گئیں۔ اور چشمے قلزم ہو گئے
.... ایک بحر بیکراں دیکھ کر بیقرار ندیوں اور چشموں کو قرار آیا۔

میرے دل میں کوئی ایک شوق ہوتا۔ یا کوئی لاکھ بھر
شوق ہوتے...... یہ تو اتنے ہیں کہ ان کا کوئی شمار ہی نہیں

میرا کلام۔ میرا سوز۔ میرا اُنسا اور میرا رونا سُن کر
سننے والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے آبشار گرنے لگے

میری غزلیں لوگوں کے دلوں کو تسکین و شانتی
پہنچائیں، اس طرح فاضل اُن کے کام آئے گا۔

قمر رئیس

مجازؔ کی شاعری میں داخلی عنصر

آہنگ کی پہلی غزل کا دوسرا شعر مجازؔ کی شخصیت اور شاعری کی مکمل تعبیر ہے۔ ع

ہجر میں کیف اضطراب نہ پوچھ
خونِ دل بھی شراب ہوتا تھا

ہجر، اضطراب، خونِ دل اور شراب، یہی مجازؔ کی زندگی اور اس کی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ یہی اس کی رسوائی کا باعث بنے اور یہی اس کی جنون زادگی کا۔ اس کی زندگی ہجر کی ایک طویل رات تھی لیکن وہ رات یقیناً برسات کی رات ہو گی۔ اس کی داخلی شخصیت اضطراب کا ایک پیکر تھی۔ لیکن اس اضطراب میں جوش و وحشت نہیں۔ تڑپ اور جستجو تھی۔ یہی تڑپ اس کے خونِ دل کی کشید کا سبب ہوئی اور خونِ دل کو اس کی تشنہ کام آرزوؤں نے شراب سمجھ کر ہونٹوں سے لگا لیا لیکن نشہ کے عالم میں بھی مجازؔ کو رات کی سیاہی کا شعور رہا۔ وہ رات کو دن نہ کہہ سکا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ رات اپنے دامن میں ظلمت ہی نہیں ستارے بھی سجائے تھی، اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ گھر سے سحر بن کر نکلا تو ماہ و انجم کا خریدار بن کر۔

مجازؔ کی شاعری میں رات کی ہولناک سیاہی کا پرتو صاف نظر آتا ہے لیکن اس کی شاعری کا محور وہ ستارے اور اُن کا وہ سنگیت ہے جسے اس نے اپنے دامن میں آ لیا تھا۔

مجازؔ کو انقلاب کا مطرب کہا گیا ہے لیکن اگر اس کے مجموعے سے چند نظموں کو نکال دیجئے تو وہ صرف مطرب رہ جاتا ہے گا۔ یہاں میرا مقصد مجازؔ کی شاعری یا اس کے فکر و شعور کے انقلابی آہنگ سے انکار نہیں بلکہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ بحیثیت شاعر اس کا مزاج انقلاب کی بہ نسبت رباب سے زیادہ قریب تھا۔ یہاں انقلاب سے میری مراد اجتماعی ناانصافی اور استحصال کا وہ خاص نقطۂ عروج ہے جب مظلوم متحد ہو کر طاقت اور تشدد کے زور سے ظالموں اور جابروں پر فتح حاصل کر لیتے ہیں۔ انقلاب کا یہ خارجی تصور مجازؔ کی شاعری میں جابجا اپنی جھلکیاں دکھاتا ہے لیکن مجموعی طور پر یہ کبھی بھی اس کی شاعری کا محرک یا جزوِ ایمان نہیں بنا۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مجازؔ کی شاعری میں عظیم شاعری کا رنگ و آہنگ نہیں ملتا۔ اور اس کا سبب صرف اس کی فکری کم مائگی اور تخیلی بے ربطی نہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس نے شاہدِ حیات کے جلوؤں کو کثرت میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی لیکن سچ پوچھئے تو اس کے مزاج کی اسی افتاد نے اس کی شاعری کو انفرادیت کا روپ بخشا ہے۔ مجازؔ نے زندگی کی پہنائیوں کو خود اپنی شخصیت کے آئینہ میں دیکھا ہے اس کے یہاں خارجی عوامل کے نقوش بھی ایک وجدانی وحدت اور ایک داخلی کیفیت بن کر آتے ہیں۔ اس کے تجربات محدود ہیں۔ ان میں آفاقیت کا وہ جوہر نہیں جو عظیم شاعری کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوصف اس کے تجربات میں جو تنوع جو لطافت اور جو اچھوتا پن ہے اور اس کے فن میں اظہار بیان کے رموز کا جو احترام ملتا ہے اس نے اس کی شاعری کو اعلیٰ شاعری کی سرحدوں تک پہنچا دیا ہے۔ مجازؔ کے فن میں خارجی حقائق کے صرف وہی پہلو ملتے ہیں جو غیر محسوس اور غیر شعوری طور پر اس کی شخصیت کا جز بن گئے۔ ماحول اور خارجی حالات کو شعوری طور پر اپنانا اور فن میں رچانا، ایک مصنوعی عمل ہوتا ہے جو یقیناً مزاجِ فن کے منافی ہے۔ مجازؔ اپنے فن کی دنیا کا آپ خالق ہے۔ اس کی شاعری

یہ [illegible] کی زائیدہ ہے جب وہ ماحول کی بے رنگیوں سے دُور ذہن و فکر کے ایسے ایوانوں میں جانکلتا ہے جہاں اسے اپنے جسم اور اپنی روح کی گرمی کا بھرپور احساس ہوتا ہے، اپنی معصوم آرزوؤں کے اس صنم خانے میں اسے ہر سمت اپنے ہی بُت اور اپنی ہی تصویریں رقص کرتی نظر آتی ہیں ماضی حال اور مستقبل کی یہ تصویریں مٹتی ہیں اور بنتی ہیں، بنتی ہیں اور پھر مٹ جاتی ہیں۔ اسے اپنے ظلمت کدے کے در و دیوار پر اپنے ہمدموں کے خد و خال اور اپنے دُکھوں اور مسرتوں کے نقوش لحظہ بہ لحظہ اُبھرتے اور دھندلے ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی یہ دنیا شہر نگاراں بھی ہے اور صحبت یاراں بھی۔ یہاں آوارگان عشق خود گم ہوکر کسی کو پا بھی لیتے ہیں اور اکثر کسی کو پاکر خود کو بھلا بھی بیٹھتے ہیں۔ اسی محفل کیف و مستی اور انجمن عرفانی میں شاعری کی شوخی اور بلانوشی بھی رنگ لاتی ہے ؎

سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

لیکن اس سے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ مجاز کی شاعرانہ شخصیت کی دنیا اس کے تجربات کی خارجی دنیا سے بے نیاز ہوکر اپنا کوئی علیحدہ وجود رکھتی تھی یا یہ کہ مجاز نے حقائق کے تند و تیز جھونکوں کی تاب نہ لاکر تخیل کے آئینہ خانے میں پناہ لی۔ مجاز کی داخلیت فرار نہیں، دروں بینی ہے اس کی خلوت نشینی زندگی سے گریز نہیں، زندگی کا عرفان ہے زندگی سے ہار کر بیٹھنا گریز نہیں، زندگی سے ہار مان کر بیٹھنا گریز ہے۔ مجاز نے زندگی سے ہار نہیں مانی۔ اس نے خزاں میں بہاروں کو اور شعلوں میں شبنم کو آواز دی ہے۔ اس نے شکستگی اور بے چارگی کے دَور میں حوصلوں اور اُمنگوں کے گیت گائے ہیں۔ اگر یہ زندگی سے فرار ہے تو میرا خیال ہے کہ دنیا کا ہر رجائی فراری ہے۔

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ مجاز کی زندگی محرومیوں، ناکامیوں اور نارسائیوں کی داستان ہے۔ اس نے دُنیا کی ہر حسین شے سے پیار کیا ہے۔ اس لیے کہ حسن اس کے احساس و حواس کی رگ رگ میں موجِ خون کی طرح رقصاں تھا۔ لیکن یہ حسن محض خیال یا کوئی ماورائی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اسی ارض اور مادی دنیا کی شیرینیوں اور دلفریبیوں سے عبارت ہے۔ مجاز نے حسن کو محسوس پیکروں میں دیکھا ہے، انہیں چاہا ہے ان سے عشق کیا ہے لیکن اس کی زندگی کا المیہ یہی ہے کہ وہ ان لطیف پیکروں کو محسوسات کی خارجی دنیا میں نہ پا سکا۔ اس نے حسن کے جلووں کو ان کی ساری کافر اداؤں کے ساتھ دیکھا ہے، ان سے نظر ملائی ہے لیکن جلووں کی گریز پائی نے اسے اس حد سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ خود اسکے الفاظ میں۔

وہی جلوے جو اک دن دامن دل سے گریزاں تھے
نظر میں رہ گئے گلہائے دامانِ نظر ہو کر

اس نے الفاظ کی سحر زائیوں سے حسن کے جو خوشرنگ پیکر تراشے ہیں وہ دراصل اسی نظر کی حسن اور آغوش کے کرشمے ہیں۔ وہ اس کی محرومیوں کا پرتو ہیں۔ وہ نغمے ساز کے نہیں شکست ساز کی آواز ہیں مادام نورا اور اس کی عیادت کو آنے والا "نگار نظر نواز" گلہائے دامانِ نظر کے سوا کچھ نہیں حسن بجائے خود اتنا دلفریب نہیں ہوتا، جتنا کہ اس کا تصور مجاز نے حُسن سے نہیں اس کے تصور سے عشق کیا ہے۔ اس لئے کہ حُسن ایک آہوئے رم خوردہ کی طرح اس کی دسترس سے باہر تھا، لیکن اس کے تصور کو وہ کسی وقت بھی اپنے تخیل کی شوخ باہوں میں اسیر کر سکتا تھا۔ مجاز کی شاعری میں اس تصور کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں۔

زلف کی چھاؤں میں عارض کی تب و تاب لئے
لب پہ افسوں لئے آنکھوں میں مئے ناب لئے
سحر و اعجاز لئے جنبشِ مژگانِ دراز
خندۂ شوخ جمالِ دُرِ خوش آب لئے
لب گلرنگ و حسیں، جسم گداز و سیمیں
شوخیٔ برق لئے لرزشِ سیماب لئے
نزہت و نور کا اک پیکر شاداب و حسین
نکہت و نور کا اُمڈا ہوا سیلاب لئے

رنگ و نور کے اس پیکر کا مسکن ظاہر ہے کہ یہ دنیا نہیں بلکہ مجاز کی روح کا شبستانِ نشاط ہے۔ اس نے اپنے ہی تراشے ہوئے کافر بتوں کی پرستش کی ہے، اپنے خلوت کدے میں ان کے گیسوؤں کو سنوارا ہے، اور صحن گلستان میں ان کے پہلو بہ پہلو ایسی وارفتگی سے قدم اٹھائے ہیں کہ فراز آسمان پر کہکشاں بھی مسرت سے تکتی رہ گئی۔

مجاز کی شاعری میں عشق کی سرکشی اور کج کلاہی اور حسن کی والہانہ

سپردگی اردو شاعری میں ایک نئی روایت اور ایک نیا باب ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہی واقعہ مجاز کی زندگی کا المیہ اور اس کی شاعری کا طرۂ بھی ہے مجھے اس واقعہ کے نفسیاتی پس منظر اور محرکات کی تلاش نہیں کرنا ہے بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس کی شاعری میں اس ارضی حسن کا کیا معیار ہے جو اس کے خوابوں پر شبخوں مار کر بھی اسے زندگی سے پیار کرنے کا حوصلہ دیتا رہا۔ مجاز کے فن میں داخلیت کا یہ پہلو بڑی صحت اور پاکیزگی کا آئینہ دار ہے جس طرح اس کا عشق اپنی محرومیوں اور تلخ کامیوں کے باوصف پراگندگی کا شکار نہیں ہوتا، اور اسے جنسی لذت پرستیوں کی راہ میں نہیں دکھاتا۔ اسی طرح اس کا محبوب بھی محبت لطافت اور پاکیزگی کا مجسمہ ہے، اسکی جبین پر قندیل رہبانی کا سایہ اور اس کی زبان پر عصمت و تقدیس کے نغمے ہیں، وہ اردو شاعری کے روایتی اور خارجی معشوق کی طرح بے وفائی اور جور و ستم کا آتشیں پیکر نہیں۔ اس کی وفا شعاریوں میں خلوص کی مہک اور اس کے لطف و محبت میں پاکیزگی اور گہرائی ہے۔ مجاز کے الفاظ میں۔

وفا خود کی ہے اور میری وفا کو آزمایا ہے
مجھے چاہا ہے مجھکو اپنی آنکھوں پر بٹھایا ہے
میرا ہر شعر تنہائی میں اسنے گنگنایا ہے
سنی ہیں میں نے اکثر چھپ کے نغمہ خوانیاں اسکی
میرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے میرے اندیشے مٹائے ہیں
میرے شانے پہ سر تک رکھ دیا ہے گیت گائے ہیں
مری دنیا بدل دیتی ہیں خوش الحانیاں اسکی

لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ مجاز کی شاعری میں، اس کا محبوب اپنی ارضیت کے باوجود اس دنیا کی مخلوق نہیں۔ اس نظم کے آخر میں مجاز نے خود اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

کوئی میرے سوا اس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا
کوئی اس بارگاہ ناز تک جا ہی نہیں سکتا
کوئی اس کے جنوں کا زمزمہ گا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اسکی

ظاہر ہے کہ رنگ و نور کے اس پیکر کا مسکن مجاز کی اپنی دنیا تھی یہاں اس نے حسن کو جس عشوہ و ادا میں چاہا ہے، دیکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ مجاز کی شاعری میں جن تجربات اور کیفیات کا بیان ملتا ہے، اس کی سطح ہماری عام زندگی کے عام تجربات اور کیفیات سے کسیقدر بلند ہے لیکن وہ ہمارے لئے بالکل اجنبی بھی نہیں۔ عام حالات میں عام انسان ان سے دوچار نہیں ہوتے لیکن ہم جانتے ہیں کہ خاص حالات میں کوئی بھی انسان ان کا حامل ہو سکتا ہے۔ مجاز نے نا مانوس کیفیات کو مانوس بنا کر پیش کیا ہے اور اس لئے ان میں ایک اچھوتا پن، تازگی اور لطافت ہے۔ مجاز کی داخلیت کا یہ پہلو اس کی غزلوں میں خاص طور پر نمایاں ہے، ان تجربات کی ندرت اور نزاکت کو دیکھئے۔

کمال عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں
یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں
بتانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل
ہزار بار جہاں سے گذر چکا ہوں میں

دل دھڑک اٹھتا ہے خود اپنی ہی ہر آہٹ سے
اب قدم منزل جاناں سے بہت دور نہیں

ابھی بزم طرب سے کیا اٹھوں میں
ابھی تو آنکھ بھی پرنم نہیں ہے

حسن ہے اب نہ حسن کے جلوے
اب نظر ہی نظر ہے کیا کہئے

مجاز کی ہر غزل میں ایسی وارداتوں کے نقوش مل سکتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ تخلیق فن کا عمل (شعوری یا غیر شعوری طور پر) فنکار کے ذہن و وجدان میں تکمیل پاتا ہے، اور فن پارے جنہیں ہم دیکھتے اور سنتے ہیں، در اصل ان فنی تخلیقات کی خارجی شکل ہیں، جو فنکار کے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ فنکار بعض الجھنوں یا اظہار و بیان کے وسائل پر عدم قدرت کی وجہ سے اپنے ذہن کی فنی تخلیقات کو خارجی شکل دینے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوتا۔ اس زاویہ نظر سے جب ہم مجاز کے فن پاروں کا جائزہ لیتے ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ وہ ان عظیم تخلیقات کا ایک پرتو ہیں، جو اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ تھے۔ تو اس کی عظمت پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ اگر غم روزگار کے ہنگامے اسے فرصت

(بقیہ بصفحہ ۶۲)

دو غزلیں

روش صدیقی

جب تیرا خیال آگیا ہے
تصویرِ ازل دکھا گیا ہے

گر گر کے ذرا سنبھل کے چلنا
کونین کو لڑکھڑا گیا ہے

تیری ہی طرف چلا ہوں اے دوست
جب بھی مجھے ہوش آگیا ہے

ہے ہجر ہی زندگی یہ کہہ کر
پردہ سا کوئی اُٹھا گیا ہے

فیضانِ جمالِ بام و مینا
واعظ کو بھی ہوش آگیا ہے

دامن کی جھپک ہے کوئی دل میں
لاکھوں شمعیں جلا گیا ہے

گل رنگ ہے پھر کنارِ مژگاں
پیغامِ بہار آگیا ہے

وہ دل ترے غم کا ناز بردار
کیا جانے کہاں چلا گیا ہے

دیکھا نہیں اس کو پھر کسی نے
جو تیرا نقاب اٹھا گیا ہے

بے ربط روش یہ گفتگو کیوں
شاید کوئی یاد آگیا ہے

غلام ربانی تاباں

کیا فغانِ شوق پھر صرفِ اثر ہونے لگی
پرسشِ حالات اب تو بیشتر ہونے لگی

دل کی جانب راز دارانہ نظر ہونے لگی
زندگی دشوار سے دشوار تر ہونے لگی

مل گیا شاید اسیروں کو بہاروں کا پیام
پھر قفس میں گفتگوئے بال و پر ہونے لگی

اب نگاہِ شوق کی گستاخیوں کا ذکر کیا
برملا عرضِ تمنا در گزر ہونے لگی

شیخ صاحب خلد میں کیا دینگے حوروں کو جواب
ایک کافر پر حریصانہ نظر ہونے لگی

عشق کیا خود حسن محوِ آرزو رہنے لگا
دلفریبیٔ تمنا کارگر ہونے لگی

کوچۂ ساقی میں پھر اپنا گذر ہونے لگا
پھر اسی انداز سے تاباں بسر ہونے لگی

پُشکر ناتھ

گوری

اُس کا نام ساجی تھا اور اُس کی ایک سہیلی تھی گوری۔

اگر گوری بھی ساجی کی طرح ایک میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹی ہوئی لڑکی ہوتی، ایک وحشی سی، سہمی سہمی سی لڑکی ہوتی۔ ایک حسّاس سی زود رنج سی، سر دم مسکرانے والی لڑکی ہوتی — تو یہ کہانی کبھی وجود میں نہ آتی۔ پر گوری ایک گائے تھی، ایک مٹیالے رنگ کی دبلی پتلی، مریل سی گائے جس کی پسلیاں ایک ایک کرکے گنی جاسکتی تھیں۔

کہانی کار جب پہلے پہل اس گاؤں میں آیا تو اس نے ساجی کے پاس والی کوٹھڑی آباد کی۔ اور اس کے عوض اُسے ساجی کے نحیف باپ کو ہر ماہ ڈیڑھ روپیہ دینا پڑتا تھا۔ یہ ڈیڑھ روپیہ دیتے وقت اُس کا ہاتھ کانپنے لگتا تھا — مگر پچاس روپیہ کے تنخواہ والے ملازم کا ہاتھ ہر جگہ اور ہر حالت میں ڈیڑھ روپیہ دیتے وقت لرزنے لگتا ہے، اس لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

جب بھی وُہ دن بھر کھیتوں کی خاک چھان کر، کیچڑ سے بھری ہوئی گلیوں کے چکر لگا کر، اور اپنے قلم سے پٹواری کے رجسٹر میں چند ٹیڑھی میڑھی لکیریں بنا کر اس کوٹھڑی میں آتا تھا تو اُس کی تھکان اس گائے کو دیکھ کر شدّت اختیار کرنے لگتی تھی۔ یہ گائے ایک اُداس اور تھکی تھکی نگاہ اُس کی طرف پھینک کر اپنی تھوتھنی سے اپنے ہی گھٹنے کو سہلانے لگ جاتی تھی۔ اور یہ چکر اسی طرح پچھلے دو مہینے سے جاری تھا۔ کہانی کار بھی شاید یہ محسوس کرچکا تھا کہ اس کوٹھڑی، اس گائے اور اُس کے رجسٹر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے، اس لئے وُہ اب اس معمولی سی بات پر اپنا دماغ صرف نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک دن جب وُہ اپنے معمول کے مطابق کھیتوں اور گلیوں کے چکر کاٹ کے، اور پٹواری کے رجسٹر میں کچھ اندراج کرکے اپنی کوٹھڑی میں داخل ہوا تو اُس نے شدّت سے محسوس کیا کہ آج اُسے ایک کہانی تخلیق کرنی ہے۔

اُس نے معمول کے مُطابق پہلے چائے بنائی، پھر اپنے لئے روٹی پکائی اور روٹی پکا کے اور چائے پی کے اُس نے حُقّے کی چلم میں تمباکو بھر کے اُس پر آگ رکھدی۔ اور حُقّے کی نَے مُنہ میں دبائے اور قلم ہاتھ میں لئے وُہ کہانی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کہانی کے بارے میں سوچتے سوچتے اُسے بہت سی چیزوں کا خیال آیا۔ اُسے گاؤں کے بیچوں بیچ بہتی ہوئی اُس ندی کا خیال آیا جس میں لوگ ٹراؤٹ مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ اُس چشمے کا خیال آیا جس سے یہ ندی نکلتی ہے۔ اُس بوڑھے چنار کا خیال آیا جو چشمے کے کنارے کھڑا ہے۔ اور جس کی ٹہنیاں چشمے کی سطح کو جھک جھک کر چھُو رہی ہیں۔ ساجی کے باپ کا خیال آیا جو دن بھر اپنے جھونپڑے میں بڑے بڑے تمباکو پیتا رہتا ہے۔ اور کھانستا رہتا ہے۔ ساجی کا خیال آیا جو سویرے اُٹھکر گاؤں کی باقی عورتوں کے ساتھ کھیتوں میں نلائی کرنے جاتی ہے اور سُورج ڈوبتے ڈوبتے وہاں سے لوٹ آتی ہے۔ اُس بُڑھیا کا خیال آیا۔ جسے ساجی کی ماں کے نام سے لوگ جانتے ہیں اور جو دن بھر گھراٹ میں لوگوں کے گندم اور جَو کو آٹے میں تبدیل کرتی رہتی ہے — مگر — اُس نے جھنجھلا کر سر کو انکار میں ہلا یا۔ ان چیزوں میں کسی پر ایک اچھوتی اور شاہکار کہانی نہیں لکھی جا سکتی ہے۔ اُس نے سوچا۔

پر اس کے باوجود کہانی اُسے لکھنے پر اُکسا رہی تھی۔ اور وُہ کہانی کہاں تھی؟ کن وادیوں میں ڈوب گئی تھی، کن برف کے گالوں کے تلے

دبک گئی تھی کن جیسموں کی تہہ میں چھپی بیٹھی تھی۔ اُسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

یہاں تک پہنچتے پہنچتے وُہ کہانی کے خیال کو بھول گیا اور اُسے اپنی بوڑھی ماں کا خیال ستانے لگا۔ اور دو کمسن بھائیوں کے خیال نے گھیر لیا۔ جو اُس سے پچاس ساٹھ میل کے فاصلے پر زندگی کی مستحنی شاہراہ پر رینگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وُہ دو مہینے سے گھر نہیں گیا تھا اور ان دو مہینوں میں آج پہلی بار اُسے اپنے گھر کی یاد ستانے لگی۔ مگر گھر بیٹھکر وُہ پٹواری کیسے بن سکتا تھا۔ وُہ کتنا احمق ہے جو ایسی باتیں سوچتا ہے۔ پٹواری کی زندگی ہی ایسی ہوتی ہے آج یہاں کل وہاں آج اِس کوٹھڑی میں کل اُس جھونپڑے میں ـــ مگر فن ـــ؟ فن تو کہیں بھی نہیں مرسکتا ـــ پھر وہ کیوں آج اپنی کہانی نہیں لکھ سکتا ـــ اور جھنجھلا کر اُس نے حقے کی نَے زور سے زمین پر پٹک دی۔ اسی وقت کوٹھڑی کے باہر اُسے کسی کے بولنے کی آواز سنائی دی۔

"گوری! گھاس کھا لی تم نے سب کی ـــ؟ شریر کہیں کی ـــ"

یہ تو ساجی کی آواز ہے۔ وُہ سوچنے لگا۔ پر یہ گوری کے ساتھ کیوں باتیں کرتی ہے۔؟ پگلی ہے بیچاری۔

"گوری! کل میں تیرے لیے گھاس کا بڑا سا ٹوکرا بھر کے لاؤنگی ـــ ہاں ـــ" آواز پھر سنائی دی۔ اُسے ہنسی آگئی۔ واقعی پگلی ہے بھلا کوئی گائے کے ساتھ بھی باتیں کرتا ہے۔؟ اور وُہ بھی اس مریل گائے کے ساتھ جس میں بات سمجھنے کی صلاحیت تو کجا دُودھ دینے یا گھاس چرنے کی صلاحیت بھی نہیں۔ اُس نے سوچا۔

"گوری! اب کے سردیوں میں تو کہاں رہے گی۔ کوٹھڑی تو پٹواری نے لے رکھی ہے ـــ"

ہُنہہ! جیسے مفت لے رکھی ہے یہ کوٹھڑی۔ جیسے اس کا باپ ڈیڑھ روپیہ نہیں لیتا ہے۔ مجھ سے مہینے کے مہینے۔ کہانی کار کو طیش آ گیا۔

"اچھا گوری! ایک بات بتاؤں وُہ جو رمضان کچھے کا لڑکا ہے، وُہ مرکبان۔ اُس نے آج مجھے ملائی کرتے دیکھ لیا اور جھانتی ہو کیا کہا؟ کہنے لگا۔ اری تم تو اب بڑا ہاتھ بٹانے لگی ہو اپنے باپ کا۔ مجھے تو شرم آگئی

تعمیر

گوری ـــ بھلا کام نہ کروں تو کھاؤں کیا ـــ؟ تو ہی بول؟"

کہانی کار سوچنے لگا ٹھیک ہے کام نہ کروں تو کھاؤں کیا ـــ زندگی کا اہم فلسفہ، میں تو اِسے پگلی سمجھ رہا تھا۔

"یہ بابا کی کھانسی کب رُکے گی؟ میں تو تنگ آگئی ہوں، رات بھر سونے نہیں دیتی اس کی یہ کھانسی دن بھر کی تھکی ہوئی آتی ہوں۔ مگر یہ کھانسی رات کو بھی چین نہیں لینے دیتی۔ بول گوری! ایسے میں آدمی تنگ نہ آئے تو کیا کرے ـــ؟"

اور کہانی کار کو اپنے باپ کی کھانسی یاد آگئی۔ بہت پُرانی بات تھی۔ اُن دنوں وُہ میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ رات رات بھر لالٹین جلائے پڑھتا رہتا تھا۔ اور پڑھتے پڑھتے جب اُس کی آنکھ لگ جاتی تو اُس کے باپ کی کھانسی اُس پر ہتھوڑوں کی بارش کرنے لگتی تھی۔ اور وُہ اس کھانسی سے تنگ آجاتا تھا۔ اتنا تنگ آجاتا تھا کہ اگر اُس کا بس چلتا تو وُہ ڈنڈے کی ایک ہی چوٹ سے اس کھانسی کا خاتمہ کر دیتا۔

اور اُس کھانسی کی یاد نے اُس کے ذہن کے گوشوں میں ایک اور یاد کو کریدا۔ اور وُہ اس کے باپ کی پیاری سی حسین سی یاد تھی وُہ اپنے باپ کو کھانسی کے باوجود بھی بہت چاہتا تھا۔ اور چاہتا اس لئے تھا کہ اُس کا باپ اُسے کالج میں مزید پڑھائی کے لئے سرینگر بھیج دینے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ مگر اُس کے خواب، خواب ہی رہے تھے۔ اور اُس کمبخت کھانسی نے اُسے موت کے دامن میں سُلا کر دم لیا تھا۔

"گوری! تمہارے سوا میری کوئی سہیلی نہیں، پر تم تو بولتی ہی نہیں۔ کیا تم بھی کریم چاچا کی لڑکی طرح گونگی ہو ـــ؟" کہانی کار کے خیالات کو جھٹکا لگا۔ اُسے پھر کہانی کا خیال آیا ـــ کتنا دابیات آدمی ہوں میں جو ان پاگل باتوں پر سُنتے سُنتے اپنی کہانی کا خیال ہی بھول گیا۔ اُس نے قلم کو پھر اُنگلیوں میں تھام لیا۔ اور کاغذ سامنے رکھکر سوچنے لگا۔

"اچھا گوری! اب میں چلتی ہوں۔ بڑی نیند آرہی ہے ـــ"

چلو چھُٹی ہوگئی۔ کہانی کار نے دل ہی دل میں کہا۔ مگر نیند کا

لفظ سنکر اُسے محسوس ہوا کہ اس کے پپوٹے بھاری ہونے لگے ہیں۔ اُسے ٹانگوں میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہونے لگا۔ اُس نے قلم اور کاغذ رکھ دیا اور سو جانے کی سوچنے لگا۔ کہانی تو کل بھی لکھی جا سکتی ہے۔ مگر اچانک اُسے خیال آیا کہ کل گاؤں میں تحصیلدار دورے پر آ رہے ہیں اور اس کے کاغذات نامکمل ہیں۔ اور یہ خیال آتے ہی اُسے اپنے آپ پر غصہ آ گیا۔ اُس نے بہت ہی مردہ چال سے کاغذات کھولے اور قلم ہاتھ میں لے کر لکھنے لگا۔

اگر کہانی کار صرف کہانی کار ہوتا جب بھی ممکن تھا کہ اس کہانی کا وجود کبھی نہ ہوتا —— مگر وُہ کہانی کار ہونے کے علاوہ پٹواری بھی تھا۔ اور پٹواری اس لئے تھا کہ اُسے اس کام کے عوض ہر مہینے سرکار سے پچاس روپئے ملتے تھے۔ کیونکہ روپیہ صرف کہانی لکھنے سے نہیں ملتا ہے اور صرف کہانیاں لکھنے سے اُس کے دو کمسن بھائیوں اور ایک بوڑھی ماں کا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا۔ اور اس کے بھائیوں کی پڑھائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور خود اُس کی کہانیاں زندہ نہیں رہ سکتی تھیں۔ کیونکہ کہانی کار کو ایک کہانی سب کچھ دے سکتی ہے مگر پیسہ نہیں دے سکتی۔

دوسرے دن جب کہانی کار شام کو اپنی کوٹھڑی میں واپس آیا تو باہر شفق اور اُفق گلے مل رہے تھے۔ اخروٹ کے درختوں پر چڑیوں نے اپنی پُرشور یلغار شروع کر دی تھی۔ اور دُور کھیتوں کی مینڈوں سے گزرتے ہوئے آدمیوں کے سائے بہت حسین دکھائی دیتے تھے۔ اُس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی محسوس کیا کہ آج وُہ بہت زیادہ تھکا ہوا ہے۔ کیونکہ دن بھر تحصیلدار کے ساتھ اُس نے بہت دوڑ دھوپ کی تھی۔ کاش! وُہ تھکا ماندا نہ ہوتا تو وُہ آج بھی اُس کہانی کے بارے میں ضرور سوچتا جسے لکھنے کی تڑپ اس کے دل میں ہیجان برپا کر رہی تھی۔ اُس نے حسبِ معمول اپنے لئے چائے بنائی اپنے لئے روٹی پکائی — اور پھر بیٹھ گیا۔ وُہ سوچنے لگا کہ یہ زندگی بھی کس طرح چلتی رہتی ہے۔ کبھی یہ مشین ایک لمحے کے لئے، صرف ایک لمحے کے لئے رک جائے تو مزہ آ جائے۔

"گوری! آج تو تم خوش ہو نا؟ آج جو میں نے تمہارے لئے اتنی ساری گھاس لائی ہے —"

وُہ چونک گیا — یہ کیا بات ہے کہ یہ لڑکی، جس میں کوئی دلکشی نہیں، سوائے اس کے کہ وُہ جوان ہے۔ ہر روز اپنی اس بوڑھی گائے کے ساتھ باتیں کرنے آتی ہے۔ اُس نے سوچا۔ مگر فوراً ہی اُسے خیال آیا کہ جب وُہ اس کوٹھڑی میں اکیلا ہوتا ہے۔ تو اُس کے جی میں بھی آتا ہے کہ وُہ کسی کے ساتھ بہت سی باتیں کرے، تاکہ اس کا دل ہلکا ہو جائے، اور اس کے دماغ میں سکون کی لہر دوڑ جائے، اور اُس کی آنکھوں میں ایک گمنام نشہ جھلکنے لگے۔ مگر ہر بار اُسے اپنی تنہائی کا اور اپنے اکیلے پن کا احساس دبوچ لیتا ہے۔ وُہ اُس وقت یہ چاہنے لگتا ہے کہ کاش ان کالی دیواروں کو زبان مل جائے اور وُہ رات بھر ان کے ساتھ باتیں کرتا رہے۔ اسلئے اگر یہ میلی سی لڑکی اپنی تنہائی مٹانے کے لئے اس گائے سے باتیں کرتی ہے تو اس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے۔

"گوری! اب کی بار تمہارا بچھڑا ہو جائے تو میں اس کے ساتھ دن بھر ہری ہری چراگاہوں میں گھوما کروں گی۔ ارے! تم تو اتنی پیاری ہو کہ آدمی ایک لمحے کے لئے ساری دُنیا بھول جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

"اچھا گوری! ایک واقعہ سناؤں۔ آج جب میں شام کو گھر لوٹ رہی تھی تو چشمے کے پاس مجھے گیتا ملی۔ اور اتنا گدگدانے لگی، اتنا گدگدانے لگی کہ میں چشمے میں گرتے گرتے بچی۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے گیتا؟ آج تم بڑی خوش نظر آ رہی ہو۔ تو کہنے لگی — ساجی! پرسوں میری منگنی ہے۔ ہاں گوری! اور یہ کہتے کہتے اُس کو ذرہ بھر لاج نہ آئی۔ میں نے کہا نگوڑی! تو بڑی بے شرم ہے۔ تو وُہ مسکرانے لگی کہنے لگی تو کیا جانو میرا گردھاری کتنا سجیلا ہے۔ اُوئی — میں نے تو اور کچھ بھی نہ سُنا۔ میں وہاں سے فوراً بھاگ آئی —

جاگ نہ آتی تو کیا کرتی گوری — ؟ لڑکیاں ایسی باتیں تھوڑا ہی کیا کرتی ہیں"

اندر کہانی کار سوچنے لگا کہ کاش اس نگوڑی گوری کی زبان ہوتی تو ان دو سہیلیوں کی گفتگو سن کر کتنا مزہ آتا۔ اور اچانک کہانی کار کو اپنی منگنی کی بات یاد آ گئی۔ اس کی ہونے والی بیوی بھی بڑی سجیلی تھی۔ اور وہ چند لمحوں کے لئے اس کے تصور میں کھو گیا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ اپنے گاؤں کے باہر ایک ٹیلے پر اس کا انتظار کیا کرتا تھا۔ دو سال پہلے کی بات تھی — تو چاندنی کتنی چپاک نظر آتی تھی، اور تھوڑی دور دھند میں لپٹا ہوا گاؤں کتنا حسین دکھائی دیتا تھا، جیسے حریر دل میں لپٹا ہوا کوئی سنہرا خواب یا جیسے مدھم چاندنی میں ڈوبا ہوا تاج محل۔

مگر ان دنوں اسے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ وہ کسی دن اپنی نوری کو ہمیشہ کے لئے اپنا سکے گا۔ کیونکہ نوری چاندنی کا بنا ہوا ایک مجسمہ تھی جس کے سراپا میں بہار رچ گئی تھی، جس کے قدموں میں گھنگروؤں کی آواز نچھاور ہوتی تھی، جس کے بالوں میں ابریل آبشار کی سی روانی تھی مگر منگنی ہونے کے بعد اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے نوری کو اپنا کر بہت غلطی کی تھی، کیونکہ نوری اطلس میں لپیٹ کر ایک سنہرے محل میں رکھنے کے قابل تھی۔ اور اس کے پاس صرف ایک جھونپڑی تھی اور ایک پٹواری کا رجسٹر تھا اور ایک میٹرک کی سند تھی۔

مگر اس خیال کے باوجود اس نے نوری کے خیال کو ایک لمحے کے لئے بھی اپنے سے جدا نہیں ہونے دیا تھا۔ اور اس اندھیری اور اندھی کوٹھڑی میں پڑے پڑے بھی اس نے اس سنہری مجسمے کو ذہن کے یخ بستہ گوشوں میں چھپائے رکھا تھا —

اور آج ساجی کی باتوں سے اس مجسمے کی گرد جھڑ گئی تھی۔ اور وہ پھر تابناکی سے اس کے ذہن کے گوشوں کو منور کرنے لگا تھا۔

بہت دیر تک کہانی کار اپنے ان خیالات میں گھرا رہا۔ بہت دیر تک اس کے ذہن کے گوشے ایک ابدی نور سے ضوفشاں ہوتے رہے۔ بہت دیر تک اس کے دل میں چاندنی کا مدھر سنگیت اور گھنگروؤں کی جھنک جھنک گونجتی رہی — اور پھر اس نے سوچا کہ وہ ساجی کی باتیں سنے۔ اس نے باہر آواز کی طرف کان لگائے مگر باہر کوئی آواز سنائی نہ دی۔ شاید ساجی اپنی سہیلی سے رخصت لیکر سونے چلی گئی تھی۔ کہانی کار نے بیٹھے بیٹھے انگڑائی لی اور پھر نیند نے اس کی پلکیں گرا دیں۔

اب کہانی کار کو دن میں بھی ساجی کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی گمنام زندگی میں ایک نحیف مصروفیت ایک کمزور ساتھی کا وجود عمل میں آ گیا ہے۔ وہ دن بھر انتظار کرتا رہتا کہ کب شام ہوتی ہے اور کب وہ اپنی کوٹھڑی میں جا پہنچتا ہے اور کب ساجی اور گوری چھوٹی چھوٹی معصوم باتیں کرنے لگتی ہیں۔

اس دن جب شام کو وہ اپنے معمولات سے فارغ ہو کر بیٹھا آواز کی طرف کان لگائے رہا، تو اس کی حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی کیونکہ شام ڈھل گئی تھی اور رات کے سایوں نے بھی گاؤں میں اپنے ڈیرے ڈال دئے تھے — مگر ساجی اپنی سہیلی سے ملنے نہ آئی تھی۔ وہ انتظار کرتا رہا۔ انتظار کرتے کرتے اسے خیال آیا کہ وہ آج اپنی کہانی مکمل کر دے۔ اس نے کاغذ اور قلم لیا اور کہانی کے بارے میں سوچنے لگا۔ مگر کہانی — ؟؟؟

اسے بے چینی سی محسوس ہونے لگی، کیونکہ کہانی کے بارے میں سوچنے کی بجائے اس کے کان باہر کسی آواز کی تلاش میں بھٹک رہے تھے۔ مگر باہر کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اس نے اکتا کر قلم پھینک دی اور چادر اوڑھ کر سو گیا۔

پر آج نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ اس نے ایک بار زور سے آنکھیں بند کیں، اور چند لمحوں تک انہیں بند ہی کئے رہا مگر نیند پھر بھی نہ آئی۔ دوسرے دن بھی وہ شام کو کوٹھڑی میں دیر تک بیٹھا رہا۔ مگر ساجی اپنی سہیلی سے ملنے نہ آئی۔ اور پھر اسی طرح بہت سے دن بیت گئے۔ کہانی کار نے آخر کار اکتا کر اس خیال کو ذہن کے گوشوں سے نوچ پھینکا، کتنا احمق ہوں میں بھی۔ ایک لڑکی ایک گائے کے ساتھ باتیں کرے یا نہ کرے۔ میں کیوں خواہ مخواہ ہلکان ہوتا ہوں۔ اس نے ایک دن سوچا۔ اور جب شام کو وہ چپ چاپ بیٹھا حقہ پی رہا تھا تو اس کے کانوں میں

وہی جانی پہچانی آواز پھر آئی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُسے کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔

"گوری! میری اچھی سہیلی۔ مجھے معاف کردو، آخر تمہارے پاس کیسے آتی، میں اتنے سارے دن بیمار تو تھی ——" اچھا تو یہ بات تھی میں بھی سوچ رہا تھا کہ اپنی پیاری سہیلی کو کیوں بھلا دیا گیا تھا۔" کہانی کار نے سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے سوچا۔

"تم بڑی دُبلی ہو گئی ہو اب تو ۔ آخر کیا ہوتا ہے۔ تمہیں روز کے روز۔ اِتنا گھاس بھی کھاتی ہو۔ اور دودھ بھی نہیں دیتی — پھر بھلا کیا بات ہے —؟"

بیچاری کو محبت ہو گئی ہے۔ کہانی کار نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا کل میں تجھے اُس پرے کے میدان میں چرانے لے جاؤنگی وہاں لمبی لمبی گھاس ہے۔ اور تم دن بھر گھوم پھر سکو گی۔ ہاں۔ سیر بھی ہو جائے گی۔ آتی بار ہم چشمے کی راہ سے آئیں گی، اور تم جی بھر کے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیو گی ——"

کہانی کار کو ہنسی آ گئی۔ پاگل ہے یہ لڑکی۔ ٹھنڈا پانی پئیں گے سیر کریں گے۔ سینما دیکھیں گے بکھنگم پیلس میں کھانا کھائیں گے آخر یہ گائے ہی ہے یا میڈم ٹن ٹن کوٹے والا کی بہن۔

مگر ایک دن کہانی کار ساجی کی باتیں سنکر بیحد اُداس ہو گیا اُس کے دماغ میں کسی گمنام فریاد نے ایک کربناک بےچینی پیدا کی۔ اُس کے جذبات اور احساسات کو مجروح کیا، اور اُسے اپنی زندگی سے بیزار کیا۔

اُس دن آسمان ابر آلودہ تھا۔ اور کالے بادلوں کے ٹکراؤ سے آسمانوں میں ایک مہیب گونج پیدا ہو رہی تھی۔ وُہ شام کو حسب معمول اپنی کوٹھڑی میں بیٹھا حُقہ پی رہا تھا۔ کہ ساجی کی آواز آئی تھی۔ اور ساجی کی آواز کے ساتھ ساتھ اسکی ہچکیاں بھی سُنائی دے رہی تھیں۔ کہانی کار چونک گیا تھا۔ کیونکہ اُس نے ہمیشہ ساجی کی پیاری پیاری اچھی اچھی باتیں سُنی تھیں۔ اُس کی ہچکیاں کبھی نہ سُنی تھیں۔

"گوری! نلائی" کا کام ختم ہو گیا ہے۔ اب میں کیا کروں؟"

"گوری! ہمارے پاس اپنے کھیت کیوں نہیں —؟"

"گوری! اب میرا بابا اور میں اور میری ماں کہاں سے کھانا لائیں گے۔ گھراٹ پر بھی لوگ روز تھوڑا ہی آٹا پسوانے آتے ہیں ——"

"گوری! اب تیرے لئے گھاس کہاں سے آئے گی۔ میری سہیلی۔ اب تم بھی بھوکی رہا کرو گی۔ اور تمہاری سہیلی بھی۔ اور ساری دُنیا بھی ——"

کہانی کار نے سوچا تھا کہ —— بہت، کچھ سوچا تھا۔ اور سوچتے سوچتے اُسے بے پناہ اُداسی نے گھیر رکھا تھا۔ اُسے ایک لمحے کے لئے بھی اپنا یا اپنی ماں کا یا اپنی لوری کا خیال نہ آیا تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ اب ساجی اور اُس کا باپ اور اُس کی ماں کیا کریں گے؟ کاش! ساجی کا ایک بھائی ہی ہوتا۔ کاش! ساجی کے پاس ایک چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا ہی ہوتا۔ جس پر وُہ دن رات کام کرتی۔ اور مسکراتی رہتی، چہکتی رہتی۔ جب آدمی کے دل میں کام کرنے کی تڑپ ہو، اس کے دل میں جینے کا ارمان ہو۔ اور اس کے دماغ میں ایک بے زبان سہیلی کا غم ہو۔ تو اُسے کام کیوں نہیں ملتا۔ تو اُسے بھوک سے دوچار کیوں ہونا پڑتا ہے۔ کہانی کار نے اس فلسفے کو سمجھنے کی بہت کوشش کی مگر اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

بہت دنوں تک کہانی کار رات رات بھر اپنے جھونپڑے میں نہیں آیا تھا۔ بلکہ ویرانوں میں بھٹک رہا تھا۔ چشموں کے کنارے سو گیا تھا۔ ندی کے پتھروں پر پھسل گیا تھا۔ چنار کی شاخوں سے لپٹ گیا تھا۔ کیونکہ کسی نے اس کے فنکار دل کو للکارا تھا۔ اس کے جذبات کو آواز دی تھی۔ کیونکہ وُہ فن کار تھا — اور آج وُہ سر شام سے ہی اپنی کوٹھڑی میں بیٹھا حُقہ پینے لگا تھا۔ وُہ جانتا تھا کہ اب کے ساجی اپنی سہیلی سے ملنے آئے گی تو زار زار روئے گی۔ تو اُس کے آنسوؤں سے یہ جھونپڑی، یہ کوٹھڑی اور یہ کانگڑی

جھاڑ سب بہہ جائے گی۔ مگر ـــ!

"گوری! میری اچھی گوری! تم آج مجھے اُداس لگتی ہو۔ سے کیوں گھور رہی ہو۔ کیا میں نہیں جانتی کہ تم کو دو دن سے گھاس نہیں ملی ہے ـــ؟

کہانی کار کے ہاتھ سے حقّہ کی نے چھوٹ گئی۔

"میں تو دو دن سے بالکل بھوکی پیاسی ہوں۔ پر میں تو اُداس نہیں ـــ"

کہانی کار تڑپ اُٹھا۔

"جب ہمارے پاس کھانے کے لئے روٹی ہوتی ہے۔ اور گھاس ہوتی ہے۔ تو ہم سب مزے میں کھاتے ہیں۔ اور بہت باتیں کیا کرتے ہیں دوسرا کوئی تھوڑے ہی کھا جاتا ہے ہمارا کھانا اُن دِنوں ـــ"

بالکل سچ کہہ رہی ہو ساجی! کہانی کار دل ہی دل میں کہنے لگا۔ کون کہتا ہے کہ تم صرف ساجی ہو۔ اُس کھانستے ہوئے بوڑھے کی گندی سی الہڑ سی لڑکی ـــ تم تو ایک بہت بڑی مفکّر ہو۔ اور تمہاری زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ایک ایک دیوان ہے، ایک ایک تاریخ ہے۔

"گوری! تم یوں اُداس نگاہیں میری طرف نہ پھینک۔ دو تھوڑا سا مسکراؤ۔ ایک کمزور سی ہنسی تو میرے ہونٹوں پر بھی رینگ رہی ہے کون جانے کل ہی کوئی آدمی گھراٹ پر آٹا پسوانے آ جائے اور ہم کو بھی روٹی اور گھاس مل جائے۔ ہے نا ـــ؟"

بس کرو ساجی! تم اگر آج کی رات خوب دھاڑیں مار مار کے روتی۔ اور اپنی ہچکیوں سے زمین اور آسمان کے درمیان آگ بھر دیتی اپنے آنسوؤں سے تمام خس و خاشاک کو بہا دیتی۔ تو مجھے کچھ بھی تعجب نہ ہوتا۔ مگر تم یوں پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے اور آنے والے کل کی اُمید ظاہر کرتے ہوئے مجھے ایک عجیب ذہنی کرب میں مبتلا کر دیتی ہو۔ میرے جگر کو چپکے چپکے نوچ دیتی ہو۔ کیونکہ تمہارے اس صبر اور اس اُمید نے میرے دل کے تمام گھاؤ کھول کے رکھ دئے ہیں۔ اس لئے بس کرو! اور اپنی سہیلی کے ماتھے پر ایک بوسہ ثبت کر کے بھو کے پیٹ سو جاؤ ـــ کہانی کار کے دل میں طوفان گرج اُٹھا۔

"اچھا گوری! میں چلی۔ کل تجھے پھر اُس میدان میں چرانے لے جاؤں گی۔ پر وہاں بھی اب گھاس نہیں رہی ہے۔ پھر بھی شاید شاید کہیں تھوڑی سی مِل جائے۔ کون جانے ـــ"

اور ساجی چلی گئی۔ جاتے جاتے شاید مسکرا رہی ہو۔ جب بھوکے پیٹ سے ہنسی اُبھر کر ہونٹوں پر چپک جاتی ہے تو فضا کتنی اُداس ہو جاتی ہے۔ تو ایسا کیوں لگتا ہے جیسے دُنیا بھر کے تمام بھوکے پیٹوں کی آہیں اکٹھی ہو کر آسمانوں سے ٹکرا ٹکرا کر مہیب گونج پیدا کرنے لگی ہیں۔

ساجی کے جاتے جاتے بادل ایک بار پھر زور سے گرج گئے۔ اور پھر خاموشی چھا گئی۔ موت کی سی خاموشی ـــ

دوسرے دن جب کہانی کار اپنی کوٹھڑی میں آ گیا تو اُس نے معمول کے مطابق چائے نہیں بنائی۔ اور نہ روٹی ہی پکائی اور نہ حقّے کو ہی گڑ گڑایا۔

آدمی جب اُداس ہو تو ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ اُس نے آج ساجی کے باپ کو دو مہینے کا کرایہ پیشگی ادا کیا تھا۔ اور وہ اب اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ کب ساجی آئے اور اپنی سہیلی سے کہے "گوری! آج میں نے روٹی کھائی ہے، اور تم نے بھی گھاس کھائی ہے۔ اس لئے آج ہم پہلے روز کی طرح باتیں کریں گے!"

مگر باہر کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کہانی کار انتظار کرتا گیا۔ اور انتظار کرتے کرتے آج اُس کے دل میں بے چینی پیدا ہونے لگی۔ آخر بات کیا ہے جو گوری سے ملنے اس کی سہیلی نہیں آئی ہے۔ اور اسی وقت اُسے باہر ہچکیوں کی آواز سُنائی دی۔ وہ چونک گیا۔ یہ شام گئے کون باہر کھڑا چپکے چپکے روتا ہے۔ اُس نے آواز کی طرف کان لگائے۔

"گوری! میری اچھی سہیلی ـــ"

ساجی روتے روتے ہی کہہ رہی تھی۔ کہانی کار کو تعجب ہوا، اُس کے دل میں آیا کہ وہ باہر نکل کر ساجی سے پوچھے کہ اُسے

البڑ اور شوخ لڑکی تو آج کیوں رو رہی ہے۔ تم تو اُس دن بھی نہ روئی تھی جب تم اور تمہاری یہ انوکھی سہیلی جھوکی تھیں۔ پھر آج ایسی کیا بات ہے؟

"گوری! ہائے میری سہیلی۔ آج بابا کہہ رہا تھا کہ وُہ کل صبح تم کو بیچ ڈالے گا۔ تمہارے جانے کے بعد میرا کیا بنے گا گوری؟ میرا کیا بنے گا!"

کہانی کار سوچ کے ساگر میں ڈوب گیا۔

"گوری! اگر تجھے بابا نے بیچ ڈالا۔ تو میں کیسے زندہ رہونگی۔ تمہارے ساتھ میں نے بہت سے دن بتائے ہیں۔ تمہاری آنکھوں میں، میں نے اُتر کر مدتوں راحت محسوس کی ہے۔ تمہارے بعد اس جھونپڑی کی ویرانی مجھے ڈس لیگی۔ اور بابا کی کھانسی مجھے ہلکان کر دے گی۔ میں کس کے ساتھ باتیں کرونگی——

میرا دم گھٹنے لگے گا۔ اور——"

کہانی کار نے مزید سُننے کی طاقت اپنے میں نہ پاکر کانوں میں انگلیاں ٹھونس دیں۔ وُہ کچھ نہ سُننا چاہتا تھا۔ وُہ کچھ نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وُہ کچھ نہ سوچنا چاہتا تھا۔ اور اسی کشمکش میں اُس نے محسوس کیا کہ ساجی تھکے تھکے اور مرے ہوئے قدموں سے واپس چلی گئی ہے اور گوری بیحد اُداس اور مغموم نگاہوں سے اُسے جاتے جاتے دیکھ کر رونے لگی ہے۔

دوسرے دن کہانی کار صبح سویرے اپنی کوٹھڑی سے باہر چلا گیا۔ دن بھر وُہ سوچتا رہا کہ وُہ اس مریل سی گائے کو خریدے گا اور اسکو اسی کھونٹے سے باندھے رکھے گا۔ مگر اُس کی جیب میں کچھ بھی نہ تھا۔ اور جب جیب خالی ہو تو ایک گائے کیسے خریدی جا سکتی ہے پھر اُسے خیال آیا کہ وُہ کسی نہ کسی طرح بوڑھے کو گائے بیچنے سے باز رکھے گا۔ اُسے سمجھائے گا کہ وُہ اس بیاری سی اچھی سی گائے کو نہ بیچے، اور اگر اُسے بیچ ہی دینا چاہتا ہے تو کچھ دن انتظار کرے تاکہ جب کہانی کار کو تنخواہ ملے گی تو وُہ اس گائے کو خرید لے۔ یہ خیال آتے ہی وُہ اپنی کوٹھڑی کی طرف واپس چل دیا۔

جب وُہ جھونپڑے کے نزدیک پہنچ گیا تو اس کے کانوں میں رونے اور بین کرنے کی آواز آئی۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اندر بہت سی آوازیں ایک ساتھ رو رہی تھیں اور باہر چند کسان سر جھکائے اُداس کھڑے تھے۔ اُس نے رُکتے رُکتے ایک آدمی سے پوچھا۔

"بھائی! کیا بات ہے یہاں——؟"

"بوڑھے کی چھوکری مر گئی ہے پٹواری جی۔" اُس نے اُداس لہجے میں جواب دیا۔

"کون ساجی مر گئی؟ کیسے؟؟"

"چشمے میں ڈوب گئی تھی——"

"کیوں——؟ کیسے——؟" کہانی کار لڑکھڑا گیا۔

"کون جانے——"

کہانی کار نے مزید کچھ نہ سُنا اور وُہ تیز تیز چلتا ہوا اپنی کوٹھڑی میں داخل ہونے لگا۔ مگر دروازے پر پہنچ کر وُہ ٹھٹک گیا۔ حسبِ معمول اُس کی نظر آج اُس مریل سی گائے پر نہ پڑی تھی۔ اُس نے غور سے دیکھا تو۔ گائے وہاں موجود نہ تھی۔ اُس نے گلوگیر آواز میں ایک کسان سے پوچھا۔

"ارے بھائی! یہ گائے کیا ہوئی——؟"

"پٹواری جی! بوڑھے نے اُسے صبح بیچ ڈالا ہے——"

کہانی کار کو یوں لگا جیسے اُس کے اردگرد اندھیرا چھا گیا اور دھڑام سے فرش پر گر سا گیا۔ اُس نے بستہ کھول کر کاغذ نکالا اور قلم ہاتھ میں سنبھال لی——

"پٹواری جی سلام! کل نائب صاحب گاؤں میں دورے پر آ رہے ہیں۔ کاغذات مکمل ہونے چاہیں۔" دروازے میں نمبردار کھڑا تھا۔ کہانی کار نے اُسکی طرف دیکھنا چاہا، مگر دُھند نے اُسے کچھ بھی دیکھنے نہ دیا۔

"نمبردار! اگر خود اللہ میاں بھی گاؤں میں آئیں گے تب بھی دنیا کی کوئی طاقت مجھے آج کہانی لکھنے سے نہیں روک سکیگی——سُنا تم نے؟——کوئی طاقت نہیں روک سکے گی——"

نمبردار ایک لمحے کے لئے حیران اور ششدر دروازے پر کھڑا ہی رہا۔ وُہ عجیب نظروں سے پٹواری جی کی طرف دیکھنے لگا۔ اور جب اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وُہ چُپ چاپ چلا گیا۔

کہانی کار کے آتش فشاں کا لاوا پھٹ پڑا۔ اُسے یوں لگا جیسے ایک بہت بڑا زلزلہ آ گیا ہو اور زمین اور آسمان کانپنے لگے ہوں۔

پھر کہانی کار نے قلم سنبھال کر لکھنا شروع کیا۔

اُس کا نام ساجی تھا اور اُس کی ایک سہیلی تھی گوری——

حکیم بنّے خان

کردار

(۱) حکیم بنّے خان
(۲) رحمان ... . مُلازم
(۳) حامد ... . مریض
(۴) ایک عورت
(۵) سیٹھ رگھبیر دیال

[پردہ حکیم بنّے خان کے دواخانہ پر اُٹھتا ہے جسے پلائی وڈ کے پارٹیشن سے دو حصوں میں بانٹا ہوا ہے۔ سامنے کے حصّے میں سڑک کی طرف ایک تخت بچھا ہے جس پر گاؤ تکیوں کے سہارے حکیم صاحب بیٹھے ایک موٹی سی کتاب کی ورق گردانی کر رہے ہیں۔ تخت کے دائیں اور بائیں طرف دیواروں سے لگی ہوئی شیشے کی الماریوں میں حکمت کی کتابیں سجی ہوئی ہیں۔ اندر کے حصے سے جہاں دوائیاں وغیرہ ہیں کچھ کھٹ پٹ کی آواز آتی ہے۔ حکیم صاحب چونک کر آواز دیتے ہیں]

حکیم :- اے میاں رحمان! رحمان میاں! یہ کیا ہو رہا ہے؟

رحمان :- (اندر سے ہکلاتی ہوئی آواز میں) جی دواخانہ ... بند ... کر رہا ہوں .... حکیم صاحب

حکیم :- دواخانہ بند کر رہا ہوں! کس مسخرے نے تم سے کہا ہے۔ کہ دواخانہ بند کر دو؟

رحمان :- (آکر) جی .... آٹھ .... بج گئے ہیں ... حکیم صاحب!

حکیم :- آٹھ بج گئے ہیں، کوئی اٹھارہ نہیں بج گئے۔ ڈھٹائی کی حد ہے۔ میں ابھی تخت پر بیٹھا ہوں اور تم دواخانہ بند کر رہے ہو۔

رحمان :- جی .... وہ .... تو

حکیم :- جی وی کچھ نہیں۔ میں تم سے پچاس مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ ہر کام کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیا کرو۔ بولو کہہ رکھا ہے یا نہیں؟

رحمان :- جی کہہ رکھا ہے۔

حکیم :- تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو بات میں کہوں گا تم ہمیشہ اس کے الٹ کرو گے۔

رحمان :- جی نہیں .... تو ....

حکیم :- نہیں تو پھر کیوں؟ میں پوچھتا ہوں تم نے دواخانہ بند کرنے کی کوشش کیوں کی؟

رحمان :- جب آٹھ بج چکے ہیں۔

حکیم :- پھر وہی آٹھ۔

رحمان :- جی آٹھ بجے آپ اکثر اُٹھ جاتے ہیں، اس لئے ....

حکیم :- اسی لئے آج اُٹھنے سے پہلے ہی تم نے دواخانہ بند کرنا شروع کردیا ۔۔۔ رحمان میاں!

رحمان :- جی ......

حکیم :- ایمان سے بتاؤ کیا تم دل میں یہ نہیں چاہتے کہ میں ہمیشہ کے لئے اُٹھ جاؤں؟

رحمان :- جی نہیں حکیم صاحب

حکیم :- تو پھر تم نے میرے اُٹھنے سے پہلے دواخانہ بند کرنے کی جرأت کیوں کی؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ابھی تک ستیارام کے یہاں سے کوئی اطلاع آئی ہے نہ کوئی دوا لینے آیا ہے۔

رحمان :- جی نہیں۔

حکیم :- اچھا تو حضور کو معلوم ہی نہیں کہ یہاں کون آتا ہے۔ کون جاتا ہے ۔۔۔ رحمان میاں!

رحمان :- جی ......

حکیم :- آٹھ بجنے کے بعد، میرا مطلب ہے دواخانہ بند کرنے کے بعد تم شطرنج کھیلتے ہو یا چوپڑ؟

رحمان :- جی کھانا کھاتا ہوں۔

حکیم :- چلو یونہی سہی، کھانے میں کیا کھاتے ہو؟

رحمان :- جی گوشت ترکاری ....

حکیم :- گھاس تو نہیں کھاتے؟

رحمان :- جی نہیں تو .....

حکیم :- ضرور کھاتے ہو ورنہ تمہیں خبر ہوتی کہ یہاں کون آتا ہے کون جاتا ہے۔ حکیم بقے خاں کے نائب ہو اور کام آتا تمہیں صرف دواخانہ بند کرنا ہے ۔۔۔ جاؤ جاکر اندر بیٹھو۔

رحمان :- (جاتے ہوئے) جی!

حکیم :- اور سنو۔ آئندہ اگر تم نے میری اجازت کے بغیر دواخانہ بند کیا تو میں تمہارا دانہ پانی بند کردوں گا۔ سمجھے!

رحمان :- جی!

[رحمان جاتا ہے۔ سڑک کی طرف سے مریض حامد داخل ہوتا ہے]

حامد :- السلام علیکم حکیم صاحب!

حکیم :- وعلیکم السلام! کہو حامد میاں، کیسی طبیعت ہے ۔۔۔ بیٹھو۔

حامد :- جی سر برابر چکرا رہا ہے۔ اختلاج قلب میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا اور نیند تو حکیم صاحب، بالکل نہیں آتی۔

حکیم :- جوشاندہ پیا تھا؟

حامد :- جی ہاں حکیم صاحب! جاتے ہی پی لیا تھا۔

حکیم :- تو پھر کیوں سر چکرا رہا ہے اور نیند تو ایسی آنی چاہیئے تھی کہ ..... خیر، نیند بھی آئے گی حامد میاں اور اختلاج قلب میں بھی افاقہ ہوگا اور سر کا چکرانا تو میں تمہارا ابھی بند کئے دیتا ہوں۔

(اونچی آواز سے) رحمان میاں!

رحمان :- (اندر سے) جی حکیم صاحب!

حکیم :- اماں ادھر آؤ، وہیں سے کیا جی جی کر رہے ہو۔

رحمان :- (آکر) جی ..... فرمائیے ..... حکیم صاحب!

حکیم :- تولہ بھر مروق گلقند میں سفوف نمبر چار اور سفوف نمبر چھتیس کے دو دو تنکے ملا لاؤ اور ایک آبخورے کو اچھی طرح دھوکر ہم وزن عرق گلاب اور عرق گاؤزبان

رحمان :- جی!

(جاتا ہے)

حکیم :- اور سناؤ حامد میاں! گھر میں تو سب خیریت ہے؟

حامد :- جی اللہ کا شکر ہے۔

حکیم :- صاحبزادے کے امتحان کا کیا ہوا؟

حامد :- جی کل نتیجہ نکل رہا ہے۔ حکیم صاحب! آپ کے قدموں کی خیرات سے پاس ہوگیا تو کہیں ملازمت کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔

حکیم :- کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ بڑا ہونہار لڑکا ہے ۔۔۔ پاس کیوں نہیں ہوگا۔

رحمان :- (آکر) جی یہ بھی گلقند اور یہ عرق

[تخت پر رکھ کر جاتا ہے]

حکیم :- لو حامد میاں! یہاں میرے سامنے گلقند جا لو۔ اور اوپر سے پیو یہ عرق کا پورا آبخورہ اور پھر میں دیکھتا ہوں کیس طرح تمہارا سر چکراتا ہے اور .....

حامد :- جی گھر جا کر پی لوں گا حکیم صاحب!

حکیم :- اجی نہیں میاں۔ گھر میں تمہیں اچھلتے کودتے بھی جانتا ہوں۔ پچاس کو پہنچ رہے ہو۔ لیکن عادتیں تمہاری وہی بچوں کی سی ہیں مجھے معلوم ہے گھر میں دوا تمہارے پیٹ میں جانے کے بجائے پچھواڑے کی گلی میں جاتی ہے۔

حامد :- جی نہیں حکیم صاحب، میں تو باقاعدہ دوا استعمال کر رہا ہوں۔

حکیم :- تو لو، کرو استعمال میرے سامنے ___ یوں چٹکیوں میں تمہارا سر چکرانا بند نہ ہوا اور دل کو راحت اور سکون نہ ملا اور رات تم گھوڑے بیچ کر نہ سوئے تو دواخانہ میں رحمان سے بند کروا کے پنواڑی کی دوکان کھول لوں گا۔

حامد :- وہ تو میں جانتا ہوں حکیم صاحب، آپ کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔

حکیم :- اب باتیں بعد میں بنانا پہلے جا لو یہ گلقند اور پیو عرق ...

[حامد منہ بگاڑ بگاڑ کر دوا کھاتا ہے]

اب جاؤ گھر اور جا کے آرام کرو اور صبح بتانا کہ ....

حامد :- کیا ہدیہ پیش کروں حکیم صاحب؟

حکیم :- ہدیہ وغیرہ سب کل دیکھا جائے گا۔ جب تم منہ لٹکانے کے بجائے سینہ تانے یہاں آؤ گے۔

حامد :- جی۔

[جاتا ہے]

حکیم :- رحمان ___ اے رحمان میاں!

رحمان :- (آ کر) جی!

حکیم :- کیا بجا ہے میاں؟

رحمان :- جی ساڑھے آٹھ بج گئے ہیں۔ کہیں تو دواخانہ .....

حکیم :- بند کر دوں، یہی نا۔ تم دواخانہ بند کرو اور میں تمہارا ناطقہ بند کرتا ہوں۔ ستیا رام کے یہاں سے نہ ابھی کوئی اطلاع آئی ہے نہ دوا گئی ہے اور تمہیں دواخانہ کاٹے کھا رہا ہے۔

رحمان :- شاید طبیعت ٹھیک ہو گئی ہو حکیم صاحب۔

حکیم :- کچھ بھی ہو۔ خبر آنی چاہیئے۔ دواخانہ اس وقت تک بند نہیں ہوگا جب تک ستیا رام کے یہاں سے کوئی خبر نہیں آتی۔ تم چاہو تو اندر بیٹھنے کے بجائے یہاں میرے پاس تخت پر بیٹھ سکتے ہو ___

رحمان :- جی میں تو

(ایک عورت داخل ہوتی ہے)

عورت :- آداب حکیم صاحب!

حکیم :- آؤ آؤ بیٹھو۔ کہو کیسی طبیعت ہے ننھے کی۔ دن میں کے دست آئے؟

عورت :- دست تو رک گئے ہیں حکیم صاحب لیکن سوتا اسی طرح ہے۔ دودھ بھی نہیں پیتا۔

حکیم :- تو اسے بھی ساتھ لے آئی نا بیٹا اور دیکھتا ہوں تمہارے ساتھ کوئی مرد وغیرہ بھی نہیں۔ ارشد میاں کیا ابھی کام سے نہیں لوٹے؟

عورت :- جی ان کے کسی افسر کا تبادلہ ہوا ہے۔ نئی دلی میں پارٹی تھی صبح کہہ گئے تھے کہ ذرا دیر سے لوٹوں گا۔

حکیم :- اچھا اچھا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ آدمی کا ایمان ساتھ ہونا چاہیئے۔ دیر سویر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم نے تو آج کوئی ثقیل چیز نہیں کھائی؟ کیا کھایا تھا آج؟

عورت :- جی صبح دلیا لیا تھا اور دو نیبو کا رس پیا تھا۔ شام کو دلیئے سے جی جل گیا تو تھوڑا سا شوربہ لے لیا تھا۔

حکیم :- کوئی حرج نہیں، کوئی حرج نہیں ___ دودھ پیا تھا؟

عورت :- جی دودھ کے لئے تو آپ نے منع کر دیا تھا۔

حکیم :- ہاں، دودھ بچے کے لئے مضر ہے۔ بس دو ایک دن کا پرہیز کرنا ہوگا ___ نسخہ لائی ہو؟

عورت:- جی ہاں (دیتی ہے)
حکیم:- رحمان میاں!
رحمان:- جی
حکیم:- لو یہ نسخہ تیار کرو اور چھ پڑیاں سفوف بزرسترہ کی الگ سے! بندھ دو اور جاؤ بی بی کو گھر تک چھوڑ آؤ۔
عورت:- جی میں خود چلی جاؤنگی حکیم صاحب۔
حکیم:- وہ تو میں جانتا ہوں بیٹا، خود آئی ہو تو خود جا بھی سکتی ہو لیکن ہمارے رحمان بہادر کو جو آٹھ بجتے ہی گھر کی یاد کے دورے پڑنے لگتے ہیں اور یہ جو نک جھونک کر دواخانہ میں تالہ ڈالنے اُٹھ بھاگتے ہیں تو میں انہیں اس کی سزا دینا چاہتا ہوں۔ تم جانو بیٹا، حکیم کی زندگی چوپڑ یا شطرنج کے لئے نہیں۔ مریضوں کے لئے ہوتی ہے۔ اب تو زمانہ ہی بدل چکا ہے۔ اک ذرا چھینک آئی نہیں کہ لوگ آپریشن سے ادھر بات نہیں کرتے۔ ہم نے وہ دن بھی دیکھے ہیں بیٹا کہ....
رحمان:- (آکر) جی نسخہ تیار ہو گیا۔
حکیم:- تو تم بھی جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔
رحمان:- جی اب تو نو بج چکے ہیں۔
حکیم:- ہاں ہاں، میری بینائی ابھی اتنی کمزور نہیں ہوئی کہ مجھے سامنے پڑی ہوئی گھڑی کی سوئیاں نظر نہ آئیں۔
رحمان:- جی!
عورت:- دوا کے پیسے حکیم صاحب!
حکیم:- آجائیں گے، آجائیں گے۔ تم جا کر بچے کو دیکھو اور دیکھو — صبح دفتر جاتے وقت ارشد میاں سے کہنا بچے کی حالت مجھے بتاتے جائیں۔ شائد دوا بدلنا پڑے۔
عورت:- جی بہتر۔
حکیم:- اور تم، رحمان میاں! ادھر ہی سے گھر کو مت سٹک جانا۔ بی بی کو گھر پہنچا کر لپک جھپک یہاں پہنچو۔ آکر دواخانہ بند کرنا ہے۔
رحمان:- (خوش ہو کر) جی بہت اچھا۔

عورت:- آداب حکیم صاحب!
حکیم:- آداب، آداب۔
[عورت اور رحمان جاتے ہیں، تھوڑی دیر بعد سیٹھ رگھبیر دیال داخل ہوتے ہیں]
سیٹھ:- کیوں جناب! حکیم بنّے خان کا دواخانہ یہی ہے کیا؟
حکیم:- جی ہاں، یہ سائن بورڈ لٹک رہا ہے۔
سیٹھ:- حکیم صاحب کب ملتے ہیں؟
حکیم:- کیا خاکسار کی شکل صورت حکیم نامی مخلوق سے نہیں ملتی؟
سیٹھ:- اوہ! تو آپ ہی حکیم بنّے خان ہیں۔
حکیم:- جی ہاں، بندے کو ہی اس نام سے پکارا جاتا ہے۔
سیٹھ:- میرا نام سیٹھ رگھبیر دیال ہے۔
حکیم:- بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟
سیٹھ:- آپ ذرا میرے ساتھ میرے گھر تشریف لے چلیے۔
حکیم:- وہ کس تقریب میں؟
سیٹھ:- سنا ہے آپ کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔
حکیم:- اجی شفا تو اللہ میاں کے ہاتھ میں ہے۔ بندے کے ہاتھ میں تو صرف دوا ہے۔
سیٹھ:- میری ساس کی ٹانگوں پر پچھلے دو سال سے فالج گرا ہوا ہے۔ سینکڑوں علاج ہو چکے کچھ فرق نہیں پڑا۔ کل ایک صاحب نے بتایا کہ آپ اس مرض کے مسیحا ہیں۔
حکیم:- تو کیا اس وقت یعنی رات کے ساڑھے نو بجے آپ سمجھتے ہیں میرے جانے سے ہی فالج کی مریضہ اُٹھ کر پھلانگنے لگے گی۔
سیٹھ:- جی — جی — یہ بات تو نہیں۔ اصل میں مجھے اسی وقت فرصت ہوتی ہے۔ اس کے لئے آپ کی جو بھی فیس ہو۔ میں پیشگی دینے کو تیار ہوں۔
حکیم:- خوب — بہت خوب۔ معلوم ہوتا ہے کافی مالدار آسامی

ہیں آپ یہ کہئے کتنے روپیہ ہے اسوقت آپ کی جیب میں؟

سیٹھ:- جی ساٹھ ایک ہوں گے۔

حکیم:- ہوں گے نہیں، ہیں کہئے۔

سیٹھ:- جی ہاں، ہیں

حکیم:- تو میری فیس جناب اکسٹھ روپے ہے۔ پورے ساٹھ بھی ہو سکتی تھی اگر آپ کی جیب میں اکسٹھ روپے ہوتے۔ آخر آپ کو واپس جانے کا کرایہ چاہیئے۔ ۔ اور صاحب یہ فیس صرف اس شرط پر ہے کہ فیس تو آپ اس وقت دے جائیے۔ اور مریضہ کو دیکھنے میں کل آؤں گا۔

سیٹھ:- لیکن مریضہ تو ... ...

حکیم:- فالج ہی کی مریضہ ہے نا؟

سیٹھ:- جی

حکیم:- تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جو مریضہ دو سال سے زندہ ہے، وہ ایک رات اور زندہ نہیں رہ سکتی؟

سیٹھ:- جی، میرا مطلب یہ تھا کہ ... ...

حکیم:- آپ کا جو بھی مطلب ہے وہ میں آپ سے کل پوچھوں گا۔ میرا مطلب اس وقت اکسٹھ روپوں سے ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اتنے شریف آپ ضرور ہوں گے کہ ایک شریف آدمی کی زبان پر اعتبار کر لیں۔ اکسٹھ روپے اور اپنے گھر کا پتہ چھوڑتے جائیے۔ بندہ صبح نو بجے خدمت میں حاضر ہو جائے گا۔

سیٹھ:- اگر آپ اس وقت چل سکتے تو ... .

حکیم:- چل سکتا تھا اگر مریضہ کو فالج کی بجائے ہیضہ ہوتا اور اس صورت میں شائد آپ کو اتنی فیس بھی نہ دینا پڑتی۔

سیٹھ:- تو آپ کل ضرور آئیے گا۔

حکیم:- عرض کیا نا کہ اکسٹھ روپے اور گھر کا پتہ چھوڑے جائیں۔

سیٹھ:- کہیں تو سواری بھیج دوں۔

حکیم:- سواری کی ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف اکسٹھ روپوں اور گھر کے پتے کی ہے۔ یوں بھی میں لمبے مرض کے مریضوں کے یہاں سواری پر نہیں جاتا۔

سیٹھ:- یہ اکسٹھ روپے اور پتہ حاضر ہے۔ صدر بازار میں آپ کسی سے بھی میرا پتہ پوچھ سکتے ہیں۔

حکیم:- بس ٹھیک ہے پوچھنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ میری عمر اسی برس کی ہے میاں! اور یہ اسی برس میں نے مراد آباد میں نہیں دلی میں گذارے ہیں۔ آپ کے گھر کے پاس لکڑی کا ٹال ہے نا؟

سیٹھ:- جی ہاں، بالکل

حکیم:- اور شبّو قصائی کی دوکان!

سیٹھ:- بالکل، بالکل!

حکیم:- تو اب آپ جا سکتے ہیں۔

سیٹھ:- آداب عرض۔

حکیم:- آداب عرض۔

(سیٹھ جاتا ہے۔ رحمان داخل ہوتا ہے)

رحمان:- جی ... ... پہنچا .... آیا ... ..

حکیم:- گھر پہنچا کر آئے ہو نا؟

رحمان:- جی ہاں گلی تک پہنچا آیا ہوں۔

حکیم:- گلی تک! گلی تک کیوں؟

رحمان:- جی انہوں نے کہا، ٹھیک ہے، اب چلی جاؤں گی۔

حکیم:- اور تم کاہے کو ساتھ گئے تھے؟

رحمان:- جی ... گھر .... پہنچانے۔

حکیم:- اور پہنچا کر آئے صرف گلی تک —— رحمان میاں!

رحمان:- جی!

حکیم:- تمہیں کب عقل آئے گی؟

رحمان:- جی؟

حکیم:- میں پوچھتا ہوں، تمہیں کبھی عقل بھی آئے گی یا نہیں؟

رحمان:- جی آئندہ ....

حکیم:- آئندہ میں جانتا ہوں، گلی کی بجائے تم محلے تک ہی پہنچا کر چلے آیا کرو گے۔ خیر دواخانہ بند کرو۔

رحمان:- (خوش ہوکر) جی ابھی بند کرتا ہوں۔

حکیم:- اور میرا دوائیوں کا بکس نکال لو۔

رحمان:- (تعجب سے) جی؟

حکیم:- ہاں میرا دوائیوں کا بکس نکال لو ستیارام کے یہاں سے ابھی تک کوئی نہیں آیا۔

رحمان:- جی ان کی طبیعت ٹھیک ہوگی۔

حکیم:- ان کی طبیعت ٹھیک ہے یا نہیں، یہ تو وہیں جاکر پتہ چلے گا، میری طبیعت البتہ اس وقت ٹھیک نہیں ہوگی۔ جبتک میں اپنی آنکھوں سے ستیارام کو نہیں دیکھ لیتا۔

رحمان:- جی اب تو دس بجنے والے ہیں۔

حکیم:- دس نہیں آج بارہ بجیں گے اور خدا نخواستہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو پوری رات وہیں گذرے گی۔ تم دواخانہ بند کرو۔

رحمان:- جی

حکیم:- اور سنو، یہ اٹھ روپے ہیں انہیں اپنے پاس رکھ لو۔

رحمان:- جی، وہ کس لئے؟

حکیم:- وہ اس لئے کہ میں تو تلسی رام سے باتیں کروں گا اور تم اس کی نظر بچا کر یہ روپے اس کے تکیے کے نیچے رکھو گے۔

رحمان:- جی!

حکیم:- اب دواخانہ بند کرو۔

رحمان:- جی

حکیم:- اور میرا دوائیوں کا بکس نکال لو۔

رحمان:- جی

حکیم:- اور چلو میرے ساتھ

رحمان:- جی!

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

انتخابِ فانی

فانی ہی وہ اک دیوانہ تھا۔ جو موت سے پہلے مرجائے
کیا ہوش کی کافر دنیا میں اس موت کے قابل کوئی نہیں

•

تذکرہ ہو رہا تھا محشر کا   بات پہنچی تیری جوانی تک

•

کچھ امید کرم میں گذری عمر   کچھ امید کرم میں گزریگی

•

کیا کروں نازک بہت ہے اُن کی مرضی کا سوال
ورنہ فانی اس بھلے جلنے سے کچھ حاصل نہیں

•

میکدہ

س۔ د۔ عشرت

...کب کی سحر ہو گئی!

جب سے برگشتہ انکی نظر ہو گئی — زندگی اور بھی مختصر ہو گئی

میں نے بنیاد جب آشیاں کی رکھی — بجلیوں کو اچانک خبر ہو گئی

خود بخود کھنچ کے آنے لگا میکدہ — تشنگی کس قدر معتبر ہو گئی

آپ منزل کی دھن میں پریشان ہیں — اور منزل مری ہمسفر ہو گئی

اب بھی تاریکیوں کا وہی حال ہے — یوں تو کہنے کو کب کی سحر ہو گئی

آپ ہی اپنا دامن بچا لیجیئے — مری دیوانگی معتبر ہو گئی

وہ کہاں زندگی ڈھونڈنے جائیں گے — موت جن کے لئے چارہ گر ہو گئی

جانِ عشرت تری بے رُخی کے سبب
زندگی مستقل دردِ سر ہو گئی

●

کیلاش ماہر ایم۔ اے

بخششِ عام

کچھ ہو ساقی یہ ترا جام عنایت تو نہیں — دل میں حسرت ہے مگر ہاتھ میں طاقت تو نہیں

شامِ ہجراں میں کبھی پہلے اُجالا نہ ہوا — شاملِ درد کوئی چشمِ عنایت تو نہیں

کم نگاہی بھی تری بزم پہ مائل نہ ہوئی — اہلِ غم سے میری نظروں کو عداوت تو نہیں

دردِ پنہاں بھی سہی چشمِ گریزاں بھی سہی — مرے ہونٹوں پہ مگر حرفِ شکایت تو نہیں

اہلِ دل جسکو ترا پیار سمجھ بیٹھے ہیں — وہ تبسم کوئی درپردہ شرارت تو نہیں

بخششِ عام سہی تیری نگاہوں میں مگر — اپنا دامن کبھی پھیلاؤں یہ عادت تو نہیں

کتنے ہی غم ہیں زمانے میں مگر اے ماہر
تجھکو بھی دل سے بھلا دیں یہ سعادت تو نہیں

ہمدم کاشمیری

اے نگاہِ معتبر!

ٹھوکریں کھانے سے ہر اک گام پر
اور بڑھتا ہے مرا ذوقِ سفر

کس کی دُنیا لُٹ چکی ہے عشق میں
کچھ تو بتلا اے نگاہِ معتبر

ہے جنوں اب کارفرما چار سو
باندھ لے تو اے خرد رختِ سفر

خانۂ دل سے اندھیرا چھٹ گیا
کام آئے ہیں مرے داغِ جگر

میری وحشت کا مداوا تم نہیں
دم بخود ناصح! پریشان چارہ گر!

●

ضیا آفریدی

گردش میں جام آئے...

رندوں کا شوق بادہ کشی بیقرار ہے — گردش میں جام آئے کہ ساقی بہار ہے

مونس فراق میں نہ کوئی غمگسار ہے — اپنا شریک صرف دلِ بیقرار ہے

کیا دردناک رخصتِ فصلِ بہار ہے — گلچیں ہے غمزدہ تو پریشاں ہزار ہے

دیکھے تو ایک ذرہ کو بھی غور سے کوئی — ہر ذرہ میری خاک کا آئینہ دار ہے

حاصل ہوا ہے مجھکو تصور میں یہ کمال — ہر وقت میرے سامنے تصویرِ یار ہے

اللہ رے یہ طرزِ تغافل تو دیکھئے — حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کسکا مزار ہے

مجموعۂ الم مری ہستی ہے اے ضیا
سو غم ہیں اور ایک دل بیقرار ہے

صاحبزادہ حسن شاہ

عہدِ سلاطین — تہذیبی کارنامے

زمانہ قدیم میں کشمیری تہذیب کے بناؤ سنگار میں بودھ اور برہمنی تمدنی فلسفیانہ اور ادبی تحریکوں نے جو شاندار حصہ لیا ہے۔ اس کا اجمالی بیان پچھلے دو شماروں میں نذرِ قارئین ہو چکا ہے۔ مقالہ زیرِ نظر میں عہدِ سلاطین کے تہذیبی کارناموں کی رُوپ ریکھا پیش خدمت ہے۔

چودھویں صدی عیسوی میں اسلام کے داعی کشمیر میں آنے شروع ہو چکے تھے۔ چنانچہ مارکو پولو کے سفرنامہ اور کشمیر کی متعدد تاریخوں سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن تہذیبی اور تمدنی نکتہ نگاہ سے کشمیر پر وسط ایشیا کے تمدنی و تہذیبی اثرات کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس تہذیبی نہضت کے سالار حضرت امیر کبیر سیّد علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ آپ روسی جمہوریہ تاجکستان کے قصبہ کولاب سے تشریف لائے اور وہیں آسودۂ خاک ہیں۔ کشمیر میں اسلام کی باقاعدہ اور پُرامن تبلیغ آپ کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر ایشیا اور اسلام دونوں بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ آپ سلطان شہاب الدین کے باعظمت اور پُرشکوہ عہد میں کشمیر میں تشریف لائے آپ کے تقدس علم و فضل اور مواعظِ حسنہ کی وجہ سے کشمیری جوق در جوق حلقہ بگوشِ اسلام ہونے شروع ہوئے۔ آپ نے کشمیری عادات لباس، عبادات و معاملات غرضیکہ ہر شعبۂ حیات میں اسلامی اور ایرانی روایات کو رواج دیا اور طریقۂ کبرویہ کی اشاعت میں سعی بلیغ فرمائی۔ یہ آپ کی ہی کوششوں کا صدقہ تھا کہ ہماری تہذیب میں اسلامی رنگ روپ سے ایک نیا نکھار آ گیا چنانچہ حضرت علامہ اقبال اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت امیر کبیر علیہ الرحمہ کے متعلق فرماتے ہیں:-

سیّد السادات سالارِ عجم
دستِ او معمارِ تقدیرِ اُمم
تا غزالی درسِ اللہ گرفت
ذکر و فکر از دودمانِ او گرفت
مرشدِ آں خطۂ مینو نظیر
میر و درویش و سلاطیں را مشیر
خطہ را آں شاہِ دریا آستیں
داد علم و صنعت و تہذیب و دیں
آفرید آں مردِ ایرانِ صغیر
با ہنرہائے غریب و دلپذیر

غرضیکہ حضرت امیر کبیر کا مشن ہماری تہذیبی اور تمدنی زندگی کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے فرزند پیرِ کشمیریاں حضرت سیّد محمد ہمدانیؒ نے اس کارِ خیر کو جاری رکھا۔ اور اسلامیانِ کشمیر کو پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگ دیا اور و صبغۃ اللہ احسن صبغۃ کی عملی تفسیر پیش کر دی۔ انہیں ایام میں حضرت سید حسین سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے دو طالب للہ عارفہ اور حضرت شیخ نور الدین ولی علمدارِ کشمیرؒ روحانیت کے افق پر جلوہ گر ہوئے اور انہوں نے تہذیبِ اخلاق اور معرفتِ الٰہی کے زمزموں سے سارے کشمیر کو سرشار کر دیا۔ شیومت اور ریشی طریقۂ تصوفِ اسلامیہ کے درمیان للہ عارفہ ایک سنہری کڑی ہیں۔ مقامی روایات کے مطابق آپ شیخ موصوف کی دودھ ماں بھی تھیں اور روحانی لحاظ سے بھی آپ کا حضرت شیخ کے خیالات پر بڑا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ گو للہ عارفہ کے کلام و تخیل پر شیو ریتی جھلکتی ہے اور حضرت شیخ پر اسلامی رنگ غالب ہے تاہم توحیدِ الٰہی، معرفتِ خداوندی، عشقِ حقیقی اور ریاضت و نفس کشی میں دونوں کی آواز ایک ہے۔ تمدنی نکتہ نظر سے یہ بات بڑی اہم ہے کہ للہ عارفہ اور حضرت شیخ کو ہندو مسلم دونوں عقیدت اور نیازمندی کی نظر سے دیکھتے ہیں

کشمیری ہندو آج بھی ان بزرگوں کو للہ الشوری اور نند ریشی کے ناموں سے یاد کرکے اُن کے سامنے سر نیاز خم کرتے ہیں۔

حضرت شیخ نورالدین ولی سلسلۂ کبرویہ میں منسلک تھے جس کے سرسلسلہ حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ لیکن آپ خود صاحب سلسلہ بزرگ تھے۔ آپ سلسلہ ریشیہ کے شیخ اول مانے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ اسلامی تصوّف میں خاص کشمیر کی دین ہے اور اس لحاظ سے دورِ زیرِ نظر کا نہایت ہی اہم تہذیبی کارنامہ ہے۔ یہ سلسلۂ تصوف بودھ، برہمنی اور اسلامی روایات کا ایک نہایت دلکش امتزاج ہے۔

کشمیر کے مشہور تذکرہ نگار حضرت داؤد مشکواۃ علیہ الرحمۃ اپنی کتاب "سرالابرار" میں فرماتے ہیں:۔

"در تاریخ ہفتصد و پنجاہ ہجری شیخ نورالدین قدس سرہٗ تولد یافتہ، و بعد از سی سال ریشی شد و توبہ کرد و بعد از توبہ بیشش سال نانِ غلہ از خود پرہیز کرد۔ و طریقۂ ریشیہ مجدّد گردانید و طریقۂ رہبانیہ و برہمنیہ واہی ساخت د اگرچہ پیش ازاں تازہ بود۔ چنانچہ طریقۂ ریشیہ قبل از جادۂ برہمنیہ لبیہ وسنیہ بود۔"

یہ عبارت تمدنی نکتۂ نظر سے بہت اہم ہے۔ خاص طور پر اس لئے کہ مصنف ایک متبحر عالم تھے اور انہوں نے یہ تاریخ صلحاء مرتب کرنے میں بقول خود نہ صرف مقامی روایات بلکہ مختلف فارسی تاریخوں کے علاوہ کشمیری زبان میں لکھی گئی کتابوں اور تاریخوں سے استفادہ کیا ہے۔ جو اب ناپید ہیں۔ اس عبارت میں جو اجمالی اشارات ہیں ظاہر ہے کہ ان کی تفصیل ضرور مصنف کی نگاہ میں ہوگی۔ عبارت مندرجہ بالا سے مترشح ہوتا ہے کہ:۔

(۱) حضرت شیخ نے طریقۂ ریشیہ کی تجدید کی یا بالفاظ دیگر یہ سلسلہ حضرت شیخ کے ظہور سے پہلے بھی موجود تھا۔

(۲) آپ نے طریقۂ رہبانیہ و برہمنیہ یعنی یوگ بیراگ سنیاس اور شیو مسلک جو زمانۂ قدیم سے کشمیر میں رائج تھے اور حضرت شیخ کے وقت تک مقبول تھے، متروک و منسوخ کر دیا۔

(۳) جادہ برہمنیہ سے قبل طریقۂ ریشیہ "لبیہ وسنیہ" تھا یعنی لوگ اس طریقہ کو اچھا سمجھ کر اس پر چلتے تھے۔ یا اگر ہم لبیہ وسنیہ کو "بدیہیہ وسمنیہ" پڑھیں جیسا کہ چند نسخوں میں لکھا ملتا ہے تو مطلب اور صاف اور تاریخی لحاظ سے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ طریقۂ ریشیہ برہمنی طریقہ سے پہلے بودھی اور سالکمنیہ تھا۔ "سمنیہ" سالکمنیہ کی بدلی ہوئی شکل ہے اور بودھ مت کے لئے عربی اور فارسی ادب و تاریخ میں عام مستعمل ہے۔ چنانچہ علامہ سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" میں اس کی توضیح و تشریح فرمائی ہے۔

اس آخری توجیہ سے اگر آپ اتفاق فرمائیں تو یہ ماننے میں تامل کی گنجائش نہ رہے گی کہ سلسلہ ریشیہ درحقیقت کشمیریوں کے مسلک روحانیت و طریقت یا تصوّف کی شیو اور بودھی روایات کی آخری اور اسلامی صورت ہے۔ یہ کشمیر کا ایک ایسا تہذیبی کارنامہ ہے جس کی مثال شاید اسلامی تاریخ میں کہیں اور نہ مل سکے گی۔ اس ادعا کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ طریقۂ ریشیہ کے اعمال و سلوک جن کی اجمالی توضیح حضرت داؤد مشکواۃ رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف "ریشی" سے ملتی ہے۔ اسلامی تصوّف کے چار سلسلوں سے کہیں زیادہ کشمیری شیو اور بودھی تصوف کی روایات سے زیادہ موثر نظر آتی ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد مشکواتی[2] فرماتے ہیں:۔

"اعلم ان الریشی ھو المرتاض من الزہادِ والعبادِ والمجرد من الازواج والاولادِ و المرغب عن النقود والعروض والعقار ولا یختار للسکونۃ الا فی الجبال من ناحیۃ الارض والاقطار۔ الخ" (سرالابرار)

یعنی ریشی ریاضت کش عابد و زاہد بیوی بچوں سے آزاد۔ مال و زر سامان و زمین سے متنفر اور بستی سے دور پہاڑوں کی غاروں میں رہنے والے ہوتے ہیں۔ اسی عبارت کے آخر میں ان کے مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں کہ ریشی نفل نمازیں پڑھتے ہیں۔ دنیا سے دور رہتے ہیں۔ چپ سادھے رکھتے ہیں۔ فاقے کرتے ہیں بڑے صابر اور ہر وقت خدا کے حضور میں حاضر رہتے ہیں۔ گوشت سے پرہیز کرتے ہیں اور "سندہ" اور "اُپل ساج" یعنی کشمیری ساگ سبزی "سندہ" اور "وپل ہاک"
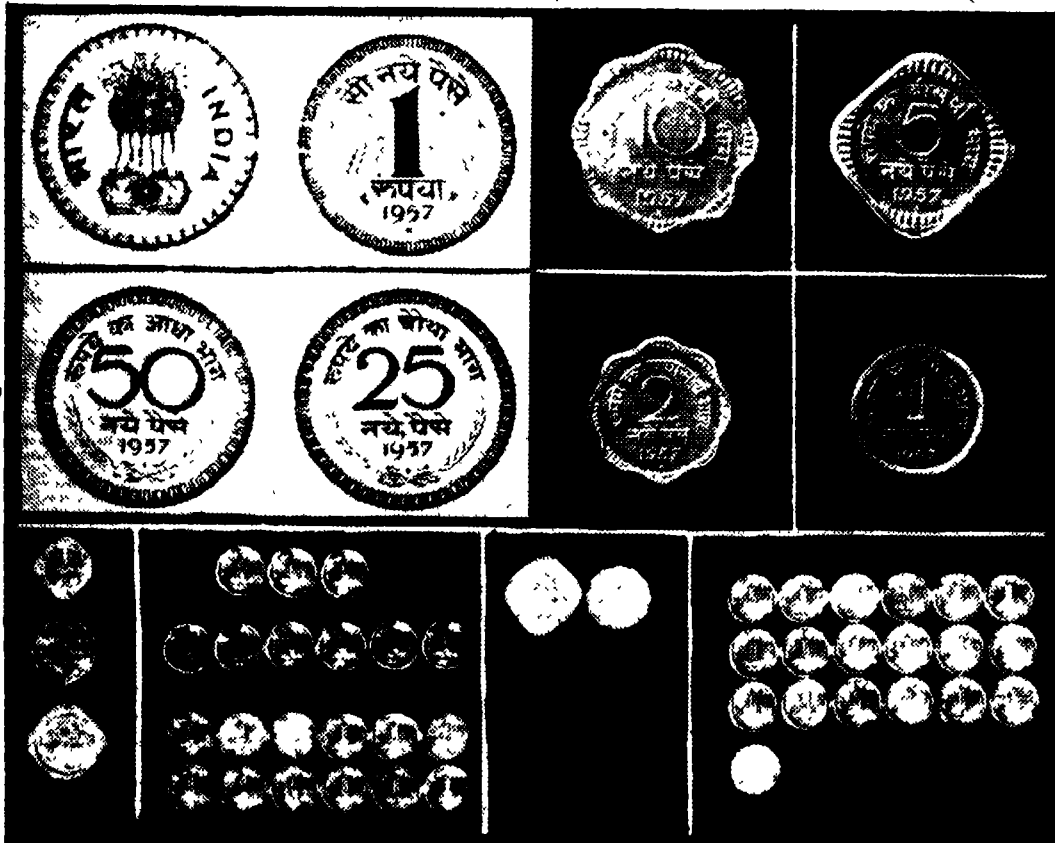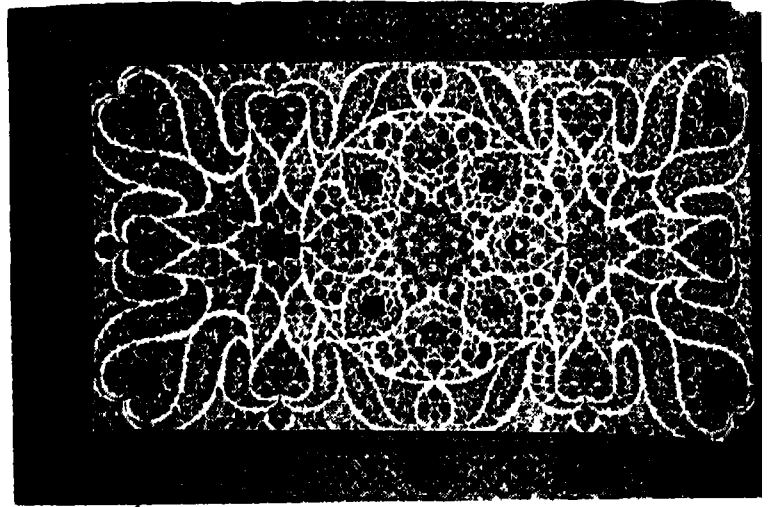
کشمیری شال کے دو نمونے

نئے اعشاری سکے

برف پوش گلمرگ

ہمارے ہم سفر نہ جانے کس طرف چلے گئے

سکھی تم کہاں چلیں؟

پر گذران کرتے ہیں۔

ارباب نظر اس توضیح کا موازنہ بودھی روایات سے کرسکتے ہیں۔ چنانچہ بودھ مت کے عباد و زہاد جو بودھ بھکشو کہلاتے تھے۔ اُن کے ہاں بھی ریاضت و نفس کشی۔ تجرد۔ دولت سے استغنا و تنفر۔ خیرات پر گذران کرنا، گوشت خوری سے پرہیز اور دُنیا کے لعو و لعب سے الگ تھلگ رہنا نجاتِ اخروی کا ذریعہ مانے جاتے تھے۔ بعینہٖ یہی روایات ہندو یوگیوں، بیراگیوں اور سنیاسیوں کے ہاں مقبول تھیں۔ غرضیکہ سلسلہ ریشیہ کشمیری تصوف کی دو ہزار سالہ پرانی روایات کی آخری اور اسلامی شکل ہے چونکہ یہ روایات یہاں کے لوگوں کے تمدنی اور روحانی رجحانات اور ماحول سے پوری طرح مؤثر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں قبولِ عوام کا خلعتِ دوام حاصل ہوا۔ اور اس سلسلہ کے بزرگوں کی سعی سے کشمیر دولتِ اسلام سے مالامال ہوا معائرت کے پردے اُٹھ گئے اور ان بزرگوں کی تعلیمات عوام میں جاری و ساری ہوگئیں۔ سلسلہ ریشیہ کے متعدد تذکرے کشمیر میں ملتے ہیں، لیکن ان میں خوش فہمیاں اور عقید تمندی کا جذبہ غالب ہے جس کی وجہ سے تنقیدی پہلو ابھی تک پردۂ اخفا میں ہیں۔ اس سلسلہ کے بزرگوں کے سلوک و اشغال کے متعلق تفصیلی معلومات دستیاب نہیں ہوتیں۔ اس سلسلہ میں حضرت داؤد مشکواتی کی کتاب "منہاج الریشی" اگر کہیں دستیاب ہوجائے تو اُمید ہے کہ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑ سکے گی۔ لیکن افسوس ہے کہ باوجودِ تجسس اس کتاب کا کوئی نسخہ ابھی تک ہاتھ نہیں آسکا۔ حضرت شیخ یعقوب متانی بچہ بلی رحؒ نے اپنے "ریشی نامہ" میں حضرت شیخ نورالدین رحؒ کے پانچ پیشرو ریشی بزرگوں کے نام لکھے ہیں۔ لیکن اُن کے ہاں بھی تفصیلات سے اغماض کیا گیا ہے حضرت شیخ نورالدین رحؒ نے اس سلسلہ کو حیاتِ نو عطا کی اور اُن کے بعد یہ سلسلہ برابر پھولتا پھلتا رہا۔ آپ کے بعد اس سلسلہ کے آفتاب قطبِ کشمیر حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فیض سے کشمیر کو سیراب کیا۔ آپ کے زمانے میں اشاعتِ دین اور تہذیب اخلاق میں بڑے کارہائے نمایاں انجام پائے۔ آپ کے مُرید خاص حضرت بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ عالم بے بدل تھے اور آج تک لوگ اُنہیں ابو حنیفہ ثانی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آپ کی "شرح ورد المریدین" کشمیری علم سلوک و تصوف میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے سلسلہ ریشیہ میں سلسلہ کبرویہ سہروردیہ کی روایات کو اور متداول کیا اور رواداری، صلۂ رحمی تزکیۂ نفس کے اُصولوں پر خاص زور دیا۔ افسوس ہے کہ ابھی تک سلسلہ ریشیہ پر پوری ناقدانہ تحقیق نہیں ہوئی ورنہ ہماری تمدنی تاریخ کا ایک شاندار باب مرتب ہوچکا ہوتا۔ کرنل ڈی جے۔ ایف۔ ینول پہلے مستشرق ہیں جنہوں نے اس سلسلہ کو علمی دُنیا سے روشناس کرنے کے لئے ایک تشنہ سی کوشش کی چنانچہ آپ کا ایک مختصر سا مضمون "ریشیز آرہرمٹس آف کشمیر" ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل میں ۱۸۷۰ء میں چھپا تھا جو اب بذاتِ خود نادرات سے ہے۔

سلسلہ عالیہ ریشیہ کی صوفی تحریک کی آزاد مشربی انسانیت نوازی، رواداری اور صفائے باطن کا اثر سلطان الاعظم سلطان زین العابدین کی حکمت عملی اور تہذیبی و تمدنی ترقی میں صاف نظر آتا ہے۔ خود سلطان حضرت شیخ نورالدین ولی رحمۃ اللہ علیہ کا ہمعصر اور معتقد تھا چنانچہ یہ روائت متعدد کشمیری تاریخوں میں نظر سے گذرتی ہے کہ حضرت شیخ کی نماز جنازہ کی امامت اعزاز و برکت خیال کرتا تھا۔ سلسلہ ریشیہ کی دنیوی برکات کا اندازہ کرنے کے لئے سلطان زین العابدین کے سُنہری زمانے کا تذکرہ یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

سلطان زین العابدین کا عہد زریں ہمارے شکوہ رفتہ کا سب سے شاندار باب ہے اور کشمیر کی تہذیب کی کہانی میں سب سے زیادہ ممتاز کڑی ہے۔

سلطان زین العابدین نے سلطان سکندر جیسے علم دوست متدین اور باشکوہ باپ کی گود میں آنکھیں کھولیں چنانچہ فرشتہ راوی ہے کہ:-

"سلطان سکندر بمرتبۂ سخاوت داشت کہ از شنیدن آوازہ آں دانشمندان عراق و خراسان و ما وراء النہر بملازمتش آمدند و علم و فضل و اسلام در مملکت کشمیر رواج تمام پیدا کردہ نمونۂ عراق و خراسان گردید"۔

سلطان زین العابدین نے بچپن علمی ماحول میں شروع کیا۔ حضرت میر سید محمد ہمدانی اور اُن کے عظیم المرتبت رفقا و معاصرین کی صحبتیں دیکھیں اور حضرت شیخ الاسلام ملا کبیر جیسے متبحر عالم کے سامنے زانوئے

ادب تہ کیا۔ چنانچہ یہ انہی بابرکت اثرات کا ثمر تھا جو سلطان کے عہد میں بہاری تمدنی نشاۃ ثانیہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔

سلطان خود عالم تھا اور عالموں کی قدر کرتا تھا۔ اس کی مجلسوں میں علمی چرچے رہتے تھے۔ جن کا ساری قومی زندگی پر اثر پڑتا تھا۔ اس زمانے کے علمی کارنامے اسی ذوق و شغف کی داستان ہیں

کہتے ہیں کہ سلطان کے عہد میں شاہی محلات کے پاس ہی ایک شاندار دارالعلوم تھا۔ اس کے صدر خود حضرت شیخ الاسلام ملا کبیر تھے۔ اور دیگر اساتذہ میں ملا احمد کشمیری، ملا حافظ بغدادی، ملا پارسا بخاری۔ میر علی بخاری۔ ملا یوسف رشیدی اور قاضی القضاۃ ملا جمال الدین خوارزمی جیسے یگانہ روزگار عالم تھے۔ دارالعلوم میں اسلامی روایات کے مطابق تعلیم، فراہمی کتب، طعام و قیام سب کا انتظام حکومت کی طرف سے مفت ہوتا تھا۔ ان اخراجات کی کفالت کے لئے مدد معاش میں کئی گاؤں وقف تھے۔ اس کے علاوہ شاہی عطیے دارالعلوم کو کبھی کسی کا دست نگر نہ ہونے دیتے تھے۔ کہتے ہیں ایک بار دارالعلوم کو کچھ خاص اخراجات آن پڑے جیسے ہی سلطان کی ملکہ تک یہ خبر پہنچی اس علم پرور خاتون نے فوراً اپنے گلے سے ایک گراں بہا ہار اتار کر دارالعلوم کی نذر کر دیا جو مصارف کی ضروریات سے کہیں زیادہ قیمتی تھا۔ اس کے علاوہ سلطان شہاب الدین کے زمانے سے ہی ملک میں جا بجا مدرسے قائم تھے جن کی سرپرستی میں سلطان اور اس کے امراء ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کوشاں رہتے تھے۔

دارالعلوم کے ساتھ ہی سلطان نے ایک بڑا کتاب خانہ قائم کر رکھا تھا۔ سلطان کو نادر کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ دور دراز ممالک سے کتابیں منگواتا اور اس کتاب خانے کی توسیع و ترقی میں کوشاں رہتا تھا۔ چنانچہ روایت ہے کہ سلطان نے علامہ جار اللہ زمخشری کی تفسیر کشاف کی مصدقہ نقل حاصل کرنے کے لئے ایک خاص قاصد مکہ مکرمہ بھیجا اور وہاں سے یہ نقل منگوائی۔ یہ نقل شاہان چک کے زوال تک کشمیر میں موجود تھی اور قومی متاع گراں سمجھی جاتی تھی۔ افسوس ہے کہ میر واحید دو غلات کاشغری کی یورش میں یہ انقلابات زمانہ کی نذر ہو گئی۔ اسی طرح سلطان نے بکمال تجسس یجروید کا ایک مصدقہ نسخہ دکن سے منگوایا۔ سلطان غیر ممالک کے بادشاہوں کو قیمتی تحائف بھیجتا رہتا تھا۔ اور ہمیشہ اُن سے اچھی اچھی اور نادر کتابوں کی فرمائش کرتا تھا۔ ان کوائف سے اس کے علمی ذوق کی شہادت ملتی ہے۔

سلطان کا یادگار زمانہ کارنامہ اس کا دارالتصنیف و ترجمہ تھا جس میں جونراج، شری ور، سوم دت، یودھا بھٹ، ملا احمد کشمیری، قاضی حمید الدین، ملا نادری اور بھٹ اوتار نے اپنی علمی کاوشوں سے دھوم مچا دی اور کشمیر کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ چنانچہ جونراج اور شری ور نے کلہن کی راج ترنگنی کے تتمے سنسکرت میں لکھے۔ بھٹ اوتار نے فرامین سلطانی کا مجموعہ موسومہ زینہ ولاس مرتب کیا۔ یودھا بھٹ نے موسیقی پر "زینہ" نامی کتاب تصنیف کی۔ بھٹ اوتار نے زینہ پرکاش نامی ناٹک کشمیری زبان میں تصنیف کر کے کشمیری ادبی نثر کا سنگ بنیاد رکھا۔ ملا نادری اور قاضی حمید الدین نے فارسی تاریخیں مرتب کیں۔ حاجی ادہم نے "مقامات" نامی کتاب میں سلوک و تصوف کے مسائل کی تشریح و توضیح کی۔ اور ملا احمد کشمیری نے رتنہ پوران کی بنیاد پر "واقعات کشمیر" نامی کتاب لکھی جس میں ان ۳۵ راجاؤں کا بھی ذکر تھا جن کے متعلق کلہن خاموش ہے۔ اس کے علاوہ اس علمی مجلس نے مہابھارت، وریت کتھا سار، ہاٹکیشور کتھا اور یوگ وشسٹ کے سنسکرت سے فارسی میں ترجمے کئے۔ طب میں "کفایہ منصوری" بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ افسانہ و حکایات میں غالباً شری ور نے "بان آسرودا" تصنیف کی جس کا ایک نسخہ ڈاکٹر بوہلر کو ملا تھا جس کا وہ اپنی رپورٹ اور فہرست مخطوطات میں ذکر کرتا ہے اسی دور میں علامہ احمد کشمیری نے "مراۃ الاولیاء" تصنیف کی جس میں حضرت شیخ نور الدین ولیؒ کے سوانح اور کلام کو جمع کر کے کلام کی فارسی شرح لکھی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ ان علمی جواہر ریزوں میں اب جونراج اور شری ور کی تصنیفات اور کفایہ منصوری کے سوا سب کچھ عنقا ہے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں بھی صرف اسی پر اکتفا کیا ہے کہ "سلطان دانش منش و خرد پژوہ بود و فراواں نامہ را از عربی و کشمیری و ہندی ترجمہ کرد۔"

سلطان کو شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی۔ چنانچہ ملک حیدر چاڈورہ صاحب تاریخ کشمیر جو جہانگیر کے امراء میں سے تھے روایت

کرتے ہیں کہ:-

"خود ہم سلطان سخنور بود و قطبی تخلص داشت چنانچہ این دو بیت رنگین نتیجۂ طبع وقاد سلطان است کہ ایراد می یابد۔

ے اے بگرد شمع روئت عالمے پروانہ
وز لب شیرین تو شورلیست در ہر خانہ
من بچندیں آشنائی می خورم خونِ جگر
آشنارا حال این است وائے بر بیگانہ"

کہتے ہیں کہ ایک دن ملک الشعراء ملا احمد کشمیری بھرے دربار میں کچھ اس طرح جھومتے جھامتے تشریف لائے کہ دستار کا شملہ جھک کر اُن کی پیشانی چوم رہا تھا۔ سلطان کی نگاہ جو پڑی تو سلطان کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

ے شاخ پیشانی ملا احمد کشمیر بہ بین
گر ندیدستی تو در آفاق انسان شاخدار

ملا احمد بھی غضب کے بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔ وہ بھلا اس چوٹ پر چپ کیوں رہتے جھٹ بول اُٹھے ے

شاخ پیشانی خدیوا کرگ واری داشتم
تا نیایم درمیانِ مادہ گاوان در شمار

سلطان اور اہل مجلس اس حاضر جوابی پر جھوم اُٹھے۔

ہمعصر مورخ شری ور اپنی سنسکرت تاریخ زینہ راج ترنگنی میں سلطان کی ساز و سرود اور رقص کی محفلوں کا ذکر کچھ اس طرح کرتا ہے کہ پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ خاص طور پر دستند کے تیوہار اور جشن بہار کے تذکرے مسحور کن ہیں۔ شری ور، ابو الفضل اور نظام الدین بخشی صاحب طبقات اکبری سب متفق ہیں۔ کہ سلطان موسیقی کا بڑا دلدادہ اور سرپرست تھا۔ چنانچہ اُس کے دربار میں ایرانی و تورانی سازندے اور مغنی بھی تھے اور ہندوستانی راگ کے ماہر بھی۔ یہ روایت اس لئے بھی زیادہ اہم ہے کہ کشمیری کلاسیکی موسیقی میں ایرانی، تورانی اور ہندوستانی موسیقی کی روایات آج بھی نمایاں ہیں۔ اس امتزاجی عمل کی تاریخ میں سلطان کے عہد میں موسیقی کی ترویج و ترقی کا حصہ خاصا نظر آتا ہے۔ سلطان کے زمانے میں ملا عود ملا جمیل اور یودھا بھٹ جگت اُستاد گذرے ہیں۔ شری ور کے بیان میں سب سے زیادہ دلچسپ روایت تھیٹر اور اداکاری سے متعلق ہے۔ چنانچہ زینہ راج ترنگنی کے چوتھے سرگ کے گیارہ سو اکتالیسویں اشلوک میں شری ور اس زمانے کے اسٹیج اور اداکاری کے کمالات کا تفصیلی ذکر کرتا ہے۔ اس اسٹیج کی صفات میں وہ "جیتر منکھم" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ جس سے ایک طرف نو بہار لوتا سے مناسبت پیدا کر کے تخلیقی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ اور دوسری طرف اس سے اسٹیج کا چورخہ ہونے کی شہادت بھی ملتی ہے۔ افسوس ہے کہ اس تمدنی کاوش کے دھندلے نقوش کے سوا آج ہمارے متاع قومی کا یہ گراں قدر حصہ بالکل مفقود ہے۔

اس زمانے میں صنعت و حرفت اور ہنر و فن بھی پھولے پھلے جن پر تھے اور سلطان بڑے ذوق و شوق سے ان کی سرپرستی کرتا تھا۔ خود سلطان کی طرف سے کئی سرکاری کارخانے قائم تھے ان کے علاوہ نجی کارخانے بھی تھے جنہیں سرکار کی اعانت اور سرپرستی حاصل تھی۔ دُور دور سے کاریگر آتے تھے اور ان کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ کار قلمدان یا پیپر ماشی۔ قالین بافی۔ ریشم سازی پشمینہ بافی اور کاغذ سازی کی کشمیری صنعتیں اسی دور کی یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ حکاکی سنگتراشی زرکوبی اور سکہ سازی کے ماہر بھی سلطان کے خوان کرم کے خوشہ چین تھے۔ میرزا حیدری کاشغری "تاریخ رشیدی" میں لکھتے ہیں کہ ان کے زمانہ تک ان صنعتوں کے کاریگروں کے خاندان کشمیر میں آباد تھے۔ چنانچہ آج بھی انہیں کشمیری ہنرمندوں کی اولاد اپنی چابکدستی اور ہنرمندی سے دُنیا کو انگشت بدنداں کر رہی ہے۔ اس صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ ملک میں زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے سلطان نے نہروں کا ایک جال بچھا رکھا تھا۔ سارا ملک سرسبز و شاداب تھا اور لوگ سکھ اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کا معیار زندگی بھی کافی بلند تھا۔ اس زمانے کی خوشحالی کے متعلق شری ور کا بیان ہے۔ کہ اس زمانے میں سب کشمیری ریشمی لباس میں ملبوس نظر آتے تھے اور ارزانی کا یہ عالم تھا کہ ایک ترک یا پانچ سیر انگور ڈیڑھ پیسے میں اور ایک خروار یا دو من تین سیر دھان ڈیڑھ آنے میں فروخت ہوتے تھے۔

ملک کی اس فارغ البالی اور دولتمندی کی وجہ سے فن تعمیر کے کئی اعلیٰ نمونے معرضِ وجود میں آئے۔ جن میں سب سے زیادہ رفیع الشان سلطان کا محل تھا۔ یہ بارہ منزلہ عمارت میرزا حیدر کاشغری کے وقت تک موجود تھی۔ اور اپنے زمانہ کی بہترین عمارتوں میں شمار ہوتی تھی۔ اس کے آگے ایک مصنوعی جھیل تھی۔ جس میں سفید راج ہنس تیرتے رہتے تھے۔ اس کا سنہری کلس کوسوں سے نظر آتا تھا۔ یہ محل نوشہرہ میں واقع تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ امتدادِ زمانہ نے اس کا کوئی نشان نہیں چھوڑا۔ اس کے علاوہ سلطان نے کئی مدرسے تعمیر کروائے۔ جھیل وولر میں ایک مصنوعی جزیرہ زین ڈب کے نام سے تعمیر کروایا۔ جس کا کتبہ حال ہی میں ریاست کے محکمہ سنٹرل ریکارڈ کے ہاتھ آیا ہے۔ اس جزیرہ پر بارہ دری اور مسجد کے کھنڈر آج بھی بزبانِ حال اس کی عظمت پارینہ کی شہادت دے رہے ہیں۔ لیکن اقبال مندی کا یہ دور سلطان کے دم کے ساتھ ہی رہا۔ ابھی سلطان نے آنکھیں بند بھی نہ کی تھیں کہ کشمیر میں بغاوت و خانہ جنگی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اور انہوں نے اس بھرے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سلطان کی وفات کے بعد کشمیری خاندان کا ستارہ اقبال ڈھلتا چلا گیا۔ امراء کی رنجشوں حسد و عداوت اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے بالآخر ۱۵۵۵ء میں عنانِ حکومت چک خاندان کے ہاتھ آگئی۔ اس خاندان نے اکیس برس کشمیر پر حکومت کی۔ لیکن اس دور میں علمی محفلیں سرد پڑ چکی تھیں اور دل بجھ کے رہ چکے تھے اسی لئے معاصر تاریخ میں ہماری دلچسپی کی باتیں بہت کم ہیں۔ شہنشاہ اکبر کے عہد میں مغل سامراج طوفان بن کر اٹھا اور چکوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا اور ہماری تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا جس کا بیان ایک الگ صحبت کا محتاج ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

قدیم مرادآبادی

فردوسِ خیال

میں نے دیکھی نہیں جنت تیری لیکن پھر بھی
اک تصور سا نگاہوں میں مگر پاتا ہوں
لطف لیتا ہوں تیرا ڈل کے کنارے بیٹھا
سبزہ زاروں میں ہو گلِ مرگ کے کھو جاتا ہوں

دن کا سورج ہے کہ پگھلے ہوئے سونے کی طرح
لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں بکھر جاتا ہے
شام ہوتے ہی چمن قوسِ قزح کی صورت
سحر کن نغموں کے عالم میں نکھر جاتا ہے

رہگزاروں کے تیرے ذرّے ہیں یا انجم فلک
چشمِ سیاح میں خورشید مبیّں ہوتے ہیں
تو کہ شہکار ہے فطرت کا کہاں تیرا جواب
پھول تو پھول ہیں کانٹے بھی حسیں ہوتے ہیں

فضا ابن فیضی

"پھر یاد تری آئی"

دل کے ظلمت کدہ میں رات ڈھلے — پھر تری یاد کے چراغ جلے
پھر تری یاد کی نسیم آئی — دل میں زخموں کے پھر دریچے کھلے
پھر چمکنے لگا جگر کا درد — آنسوؤں میں ستارے ڈھلنے لگے
ان ستاروں کی جوت ہائے نہ پوچھ — جگمگا اٹھے غم کے ویرانے
دھل گئی گرد روئے ماضی سے — دھندلی یادوں کے آئینے چمکے
گنگنا اٹھی دل کی برنائی — جگمگا اٹھے روح کے گوشے
رگ پھڑکنے لگی تمنا کی — دل دھڑکنے لگے امیدوں کے
آنکھ ملتا ہوا خیال اٹھا — خواب انگڑائی لے کے جاگ اٹھے
آگیا ہوش آرزوؤں کو — حسرتوں کے سمٹ گئے سائے
حافظے میں کلی چٹکنے لگی — ذہن میں پھول مسکرانے لگے
مجھ کو محسوس ایسا ہوتا ہے — آج بھی میں قریب ہوں تیرے
میرا زانو ہے اور سر تیرا — میری آنکھیں ہیں اور ترے جلوے
چھب وہی بانکپن وہی وہی ڈھب — وہی انداز اور وہی غمزے
وہی باتوں میں شہد کی سی مٹھاس — وہی لہجے میں پیار کے جھونکے

وہی ابرو وہی کٹیلے نین — وہی خم پتلے پتلے ہونٹوں کے
وہی شانوں کا نرم نرم گداز — وہی باہوں کے احمریں ہالے
وہی عارض کے تازہ تازہ گلاب — وہی گیسو کے دلکشا حلقے
ہر نظر میں وہی سلگتے خمار — ہر نفس میں وہی مہکتے نشے
وہی لطفِ نگاہ کی شبنم — وہی گرمیِ ناز کے شعلے
وہی فرصت شراب آلودہ — وہی فردوس آفریں لمحے
نغمہ و رنگ کی وہی محراب — وہی ماحول عشق و مستی کے
وہی جذبات کے نگارستاں — وہی تخئیل کے جلو خانے
وہی موسیقیِ تصورِ یار — وہی یادِ حسین کے ہنگامے
وہی آذر کے بتکدے کا جمال — حسن اور شوق کے وہی میلے
وہی عیشِ نگاہ کی تصویر — وہی کیفِ جمال کے خاکے
وہی سبزہ، وہی ہوا، وہی ابر — وہی ساقی وہی سبو وہی مے
وہی راتیں شکر چڑھائی ہوئی — وہی دن، انگبیں میں ڈوبے ہوئے
دل کے ظلمت کدہ میں رات ڈھلے — پھر تری یاد کے چراغ جلے

پھر تری یاد کی نسیم آئی — دل میں زخموں کے پھر دریچے کھلے

گھنشیام سیٹھی

برف پوش گلمرگ سے ایک خط

ارجمند!

اس موسم میں اور یہاں سے میرے جیسے آرام طلب اور سست آدمی کا خط پا کر تم حیران تو ہو ہی جاؤ گی۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ آرام کے اس مریض کا دل بڑا ہٹ کٹ ہے۔ اسی دل کی پکار کر لا کے کی سردی کے ان اندھیرے دِنوں میں بھی آٹھ ہزار فٹ کی بلندیوں پہ کھینچ لائی ہے۔ سیلانی کہتے ہیں جاڑوں کی برف کشمیر کا سنگھار ہے وادی کا زیور ہے۔ برف کشمیر کی دیوی ہے۔ قدرت کا دودھیا آنچل ہے کشمیر کے فلک بوس سلسلہ ہائے کوہ کے سر کا تاج ہے کشمیر کے لاکھوں ندی، نالوں کی ماں ہے ـــــ اور یہ برف سچ مچ دیکھنے کی چیز ہے، اور اس کی پوری بہار دیکھنے کے لئے میں سرینگر سے اٹھائیس میل دور اس سنسان جگہ پر آ گیا ہوں۔ لیکن میں بالکل اکیلا نہیں ہوں۔ ایک اُونچے 'بلیٹو' پر واقع اس ہوٹل کے باقی کمروں میں کچھ اور سیاح بھی ہیں۔ فوجی افسروں کی ایک پارٹی ہے اور کچھ یوروپین سیاح، لیکن سب کے سب خوش پوش جوڑے ہیں میری طرح غریب الوطن کوئی نہیں۔

باہر چاروں طرف برف ہی برف ہے اور فضا میں پھیلے ہوئے برف کے منجمد ذرّات، اس تیزی سے چمک رہے ہیں کہ آنکھیں کھولنا دشوار ہے۔ کمرے میں اندھیرا کرنے کے لئے میں نے کھڑکیوں پر لٹکتے ہوئے بھاری پردوں کو اچھی طرح پھیلا دیا ہے۔ آتش دان میں دیودار اور بلوط کی سوکھی لکڑیاں تڑاک تڑاک کر جل رہی ہیں۔ باہر دھوپ برف سے کھیل رہی ہے۔ اس قدر جھکا جھک اور چکاچوندھ ہے کہ دھوپ کا چشمہ لگا کر بھی نگاہ کہیں نہیں ٹکتی۔ شاید اسی لئے ہوٹل میں کچھ رونق ہے ورنہ لوگ تو سارا سارا دن کھلن مرگ کی ڈھلانوں پر SKITING کرتے ہیں، یہاں بیٹھنے کی فرصت کیسے ہوتی ہے! ملک کی تقسیم سے پہلے یہاں گوروں اور ٹامیوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اور ایسے ایسے چار ہوٹل یہاں ہمیشہ کھلے رہتے تھے لیکن اب صرف یہی ایک ہوٹل پندرہ، بیس دن کے لئے کھلتا ہے۔ کل یہ بند ہو جائے گا۔ میرا سامان بھی بندھ چکا ہے اور ایک گھنٹے میں، میں گلمرگ سے نیچے اُتر جاؤں گا، اور پھر ـــــ اور پھر وہی اُلجھنوں سے پُر، خشمگیں اور بکھری ہوئی زندگی سامنے ہوگی جس میں نزدیک ہو کر بھی تم کتنی دُور تھیں ـــــ اور اب جبکہ تم سچ مچ ہی دُور چلی گئی ہو تب ـــــ تب؟

یہاں سردی سرینگر کی نسبت بہت زیادہ ہے مگر تیلیوں کے علاوہ کسی اور شخص کو ٹھٹھرتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا۔ شاید اس لئے کہ یہاں ٹھٹھرنے کی فرصت ہی میسّر نہیں۔ سرینگر میں ان دِنوں جسے بھی دیکھئے، دانت بج رہے ہوں گے اور "کانگڑی"[1] ہاتھ میں تھامے چونک چونک کر گلا خشک کر رہا ہوگا۔ لوگ اپنی طرف سے ہر ایک پھٹا، پرانا کپڑا پہن کر بدن کو ڈھانپنے کا کوئی وسیلہ باقی نہیں چھوڑتے پھر بھی دانت بجتے ہی رہتے ہیں۔ . . . . . .

. . . . . . اصل میں کانگڑی ہی جاڑوں میں کشمیریوں کی زندگی کی محافظ ہے۔ چھوٹے، بڑے، امیر، غریب، پڑھے لکھے اور اَن پڑھ سبھی اس کے عاشق ہیں۔ تم تو اکتوبر میں ہی اس کا سہارا

[1] آگ رکھنے کیلئے مٹی کا ایک برتن جسے تیلیوں کے ایک ڈھانچے میں جڑ دیا جاتا ہے۔

لے لیتی ہو۔ یوں تمہارے لئے تو کانگڑی محض ایک شغل ہے، لیکن گھر کے اندر جال سے باہر نکل کر اگر تم دیکھو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ جھونپڑوں میں جو زندگانی پلتی ہے، اُس کی سانسیں، گرم راکھ سے بھرے) اسی 'کانگڑی' کی بدولت قائم ہیں ـــــ اور کئی بار تو یہ گرم راکھ ہی ایک بھیانک مسئلہ بن جاتی ہے۔ اسی لئے کشمیر میں یہ کہاوت عام ہے کہ "عیہ داری' جماداری' (انید حن گھر میں ہے تو سب کچھ گھر میں ہے)

کشمیر میں 'کانگڑیوں' کا موسم تبھی شروع ہو جاتا ہے جب آسمان دھندلا کر سمٹ جاتا ہے اور بادل جھک جھک آتے ہیں۔ لوگ پیروں میں اونچی اونچی کھڑاؤں پہن کر بازاروں اور گلیوں میں ٹھک ٹھک چلتے ہیں۔ اور کہیں بیٹھتے ہیں۔ تو سردی کے مارے مُرغیوں کی طرح سمٹے سمٹائے یا بھاری لوئیوں اور پھیرنوں کے بوجھ تلے دبے دبے سے کوشاں کہ بدن کے کسی حصّے کو ہوا چھُو نہ جائے۔ خزاں کے ظالم ہاتھوں سے بچے کھچے، ننگ دھڑنگ درخت' تیز اور ٹھنڈے جھونکوں سے سکڑتے جاتے ہیں۔ چناروں کی ٹھٹھری ہوئی ٹہنیوں پر چیلیں دُبک کر بیٹھی رہتی ہیں۔ دھرتی چناروں سے جھڑے ہوئے سنہری پتوں کی پرت کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے۔ کوہستانی سلسلوں کی چوٹیاں، برف کی روپہلی ٹوپیاں پہن کر دھوپ میں جگ مگ جگ مگ کرنے لگتی ہیں اور دُور کسی سفیدے کے اونچے درخت سے "شین پی پی" پکارتا ہے۔

"شینہ پیتو پیتو"

(او برف گر ہی جا، گر ہی جا)

پنچھی کی آواز سُن کر بچے کانگڑی کو پیٹ سے چپکائے یاس بھری نظروں سے اپنے ہاؤس بوٹوں اور ڈونگوں کی ادھ کھلی کھڑکیوں میں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ کب جاڑا ختم ہو گا کب نو بہار آئے گی، کب سیاحوں کے اُجلے اُجلے بچے ہاؤس بوٹوں میں چہلیں کرتے ہوئے شور مچائیں گے؟ ـــــ یہاں بھی، گلمرگ کے اس تنہا ہوٹل کی گیلری میں یوروپین سیاحوں کے اُجلے اُجلے بچے سردی کے مارے لال گلال ہو کر برف کے گولوں سے کھیل رہے ہیں۔ جیسے پھول کی پنکھڑیوں سے ہی تازہ، کمل کے پتے پر گری ہوئی شبنم کی بوند سے بھی چنچل بادل کے سفید ٹکڑے سے بھی کومل یہ بچے بڑے پیارے لگتے ہیں۔ تمہیں بھی تو ان پر پیار آتا ہے۔ تمہارا پیار ـــــ جو ابھی ایک بہن اور ایک دوشیزہ کا پیار ہے جب وقت پا کر یہ ماں کے جذبات کا لمس پائے گا تو اور بھی چمک اُٹھے گا۔ ان بچوں کے اُجلے اُجلے چہرے دیکھ کر . . . .

. . . . کر مجھے سری نگر کی ڈل جھیل میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں کے جھنڈ یاد آتے ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ یہ چہرے بجھے بجھے اور مرجھائے مرجھائے رہتے تھے۔ مگر اب تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ان کی آنکھوں میں صدیوں سے شوخی اور تنومندی کی جو دُنیائیں سوتی آئی ہیں۔ اب انگڑائی لینے کو ہیں جب کبھی ان بچوں کے کانوں میں شین پی پی کی آواز آتی ہے تو وہ کانگڑی کو پیٹ سے لپٹائے اس کی آواز میں آواز ملا کر ایک نیا مصرعہ جوڑ دیتے ہیں۔

ماسہ ایتو ایتو

(ماموں آ ہی جا۔ آ بھی جا)

اپنے اُس ماموں کو پُکارتے ہیں۔ جو اُن کی ننھیال سے اُن کیلئے سندر سندر اور اچھے اچھے تحفے لائیں گے۔ ماموں۔ جو اپنے ان لاڈلوں کے لئے شہر اور گاؤں کی ہر اچھی چیز جمع رکھتے ہیں۔ اور جب آتے ہیں تو ان کی گود کھلونوں، گڑیوں اور کھانوں سے بھر دیتے ہیں۔

کشمیر میں پت جھڑ جب قریب الختم ہوتا ہے تو برفانی ہوائیں بہنے لگتی ہیں سیب پک کر لال ہو جاتے ہیں اور ناشپاتیوں میں رس بھر جاتا ہے۔ درخت ننگ۔ دھڑنگ رہ جاتے ہیں۔ پتوں کی ہریالی رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایک بھوری چمک لے لیتی ہے۔ تب دسمبر کے شروع میں پنجال کی فلک بوس چوٹیوں پر موسم کی پہلی برف گرتی ہے۔ پہاڑی پرندے ڈاروں میں اُڑ اُڑ کر وادی میں آنے لگتے ہیں۔ اُن کی چہچہاہٹ اور پھڑپھڑاہٹ سے طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کی گمبھیرتا میں فرق آ جاتا ہے مانجی اور کوچوان ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتے ہیں۔ سیکریٹریٹ کا عملہ جموں جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ جموں: مندروں کا وہ چھوٹا سا شہر، جو جاڑوں میں کشمیر کی راجدھانی

ہے۔ جہاں شاید غریبوں کو سردی نہیں ستاتی۔

بادل ان دنوں دھوئیں کی طرح گھاٹی پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ سر فلک پہاڑ دنوں بلکہ ہفتوں تک بادلوں کی لپیٹ میں آ کر آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ عزازیلی ٹھنڈی یخ ہوائیں چلتی ہیں۔ اور جب کبھی کوئی برفانی ہوا کا تھپیڑا جسم کے کھلے اعضا پر وار کرتا ہے تو برموں کے چبھنے کا سا احساس ہوتا ہے۔ کہر آلود فضا میں دوکانوں اور بازاروں میں لوگ کم نکلتے ہیں اور ماحول پر ایک نامانوس سا گھٹا گھٹا سناٹا چھا جاتا ہے۔ سیکریٹریٹ سے لے کر اسکولوں دکنڈر گارٹن تک سونے ہو جاتے ہیں۔ موسم سرما کی یہی وہ خاموشی اور تنہائی ہے جو مصروفیت، ریل پیل، گہما گہمی اور شور و غل سے بھرپور گرمیوں کے بعد بڑی اچھی، پیاری اور soothing لگتی ہے جن کا نفس سیاحوں کی آمدن پر ہلتا ہے انہوں نے اتنا کما لیا ہوتا ہے کہ سرما کی بیکاری سے گزر سکیں۔ کشمیر کے غریب فنکار اور کاریگر کانگڑیوں کو چمٹائے (یا ان سے چمٹے) اندھیرے اور بند کمروں میں اپنی نئی تخلیقات کے لئے جٹ جاتے ہیں۔ لیکن آسمان ابر چھایا سا دھرتی کے اس ٹکڑے کو دیکھتا رہتا ہے جس پر بسنے والے لوگوں کے دلوں میں باقی دنیا سے کٹ جانے کا صدمہ چھایا رہتا ہے۔ جموں کے ہوائی اڈے پر ہوائی جہاز ڈاک اور اخباروں کا بوجھ لادے۔ کتنی چمکیلے دن کے انتظار میں پڑے رہتے ہیں ـــ اور جب جہاز آتا ہے تو ڈاک خانے میں خطوں رسائل اور اخبارات کا سیلاب آ جاتا ہے۔ مگر یہ الگا فائدہ مند بھی ہے۔ اسکالر اور طالب العلم اپنے کام میں زیادہ دھیان دے کر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔ کیونکہ کوئی پہاڑی جھرنا اور جھیل کوئی چلبلی ہلچل اور شفاف چشمہ ان تک اپنا پیغام نہیں پہنچا سکتا۔ ان دنوں تم بھی کتنی کتنی بُننگ اور کورس کی کتنی کتنی لو رنگ کتابوں کو نپٹا لیا کرتی ہو۔

اس موسم میں آنے والے سیلانیوں میں زیادہ تعداد یورپینوں کی ہوتی ہے۔ برف پر پھسلنا ان کا من پسند کھیل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ لوگ غریب کا وہ حوصلہ بھی دیکھتے ہیں جو جان لیوا حالات میں بھی اس کے جسم اور سانسوں کا تعلق برقرار رکھتا ہے۔ اس حوصلہ کو دیکھ کر یہ بات تو ان کے من میں بھی جاگتی ہو گی اور ممکن ہے کہ یہی انسان جب علم و سائنس کا ہاتھ پکڑے گا تب کشمیر میں بھی وہ سب کچھ ہوگا جو سوئٹزرلینڈ میں ہے ـــ تب کشمیر کے فنکار بھی بند کمروں کی گھٹی گھٹی و مکدر فضا سے دور ہوا دار، گرم اور روشن کمروں میں بیٹھ کر حسن و فن کو ساکار روپ دیں گے۔ تب جھکے جھکے بادلوں کو دیکھ کر ماں جیسوں، مزدوروں اور مفلسوں کو اپنے بھوکے بچوں کے پچکے ہوئے پیٹ یاد نہیں آئیں گے۔ تب سردی کو بھی باقی موسموں کی طرح قدرت کی ایک کروٹ اور حرارت کا ایک تغیر ہی سمجھا جائے گا۔ مگر آج ـــ آج تو سردیوں میں ساری زندگی ہی منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنار، سفیدے اور اخروٹ کے دیوہیکل درختوں کی اپاہج اور ٹھٹھری ہوئی ٹہنیاں فضا پر اور بھی نحوست طاری کر دیتی ہیں۔ سب کچھ شتھل سا ہو کر جیسے رینگنے سا لگتا ہے۔ زعفران کی خوشبوئیں کہرے کے نیچے دب کر رہ جاتی ہیں۔ اور دھرتی اپنے نئے پہناوے کے انتظار میں اونگھنے سی لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ ٹھنڈ کی بڑھتی جاتی ہے۔ دسمبر کے آخری دنوں میں شین پی پی کی آواز فضا میں گونجنے لگتی ہے۔ آسمان جھک جاتا ہے۔ تب سماوار کی نمکین چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کشمیری چہ میگوئیاں کرتے ہوئے کہتے ہیں "شین چھو ترا ن" (برف آ رہی ہے) برفباری سے قبل ہونے والے موسمی تغیر میں کشمیری کافی دلچسپی لیتے ہیں۔

اکثر رات کا ایک حسین ساکت اور خاموش لمحہ ہوتا ہے جب برف کی دیوی دبے پاؤں دھرتی پر اتر آتی ہے اور اپنے سفید آنچل سے اس کے نشیب و فراز کو ڈھانپ دیتی ہے۔ آکاش سے دھنکی ہوئی روئی کی طرح بڑے بڑے گالے گرنے لگتے ہیں۔ اوپر دیکھنے سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کروڑوں ٹڈیوں کا ایک لشکر سفید وردیاں پہن کر پیراشوٹ چھاتوں کی مدد سے دھرتی کی طرف اترتا چلا آ رہا ہو۔ کچھ ہی گھنٹوں میں زمین پر برف کی ایک دودھیا پرت بیٹھ جاتی ہے۔ سول لائنز امیرا کدل، لو لگرا ؤنڈ ہٹ سنکرآچاریہ ہاؤس بوٹوں اور بازاروں بلکہ لوگوں تک کا حلیہ بدل جاتا ہے۔

تعمیر

برف کی سفید چادر اوڑھ کر ہر ایک جینیز ناز سے اِٹھلا اُٹھتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے ہی ناچتے ہوئے برف کے بے گیرٹے مکوڑے رفتار پکڑ لیتے ہیں اور لپکتے ہوئے دھرتی کی طرف آنے لگتے ہیں ــــ جیسے متواتر جوہی کے پھولوں کی بارش ہوتی ہو۔ کچھ اُسی طرح گلی، کوچے، بازار اور مکانوں کی چھتیں برف سے اَٹنے لگتی ہیں ــــ تب یوں لگتا ہے برف اپنی پہلی پہلی سست رفتاری کی خِفت مٹانے پر اُدھار کھائے بیٹھی ہے۔ آندھیوں میں غریب رات بھر جاگ کر بسر کرتے ہیں تاکہ اپنی جھونپڑیوں پر پڑی گھاس کی چھتوں سے برف گراتے رہیں۔ جن کے سامنے یہ مسئلہ نہیں وُہ کانگڑی سے چمٹ کر گھاس کے بچھونوں پر پڑے رہتے ہیں اور امیروں کے یہاں گرم حماموں میں خوش گپیاں ہوتی ہیں، قہوے کے دَور چلتے ہیں 'بخاریوں' اور آتشدانوں میں سوکھی لکڑیاں جلتی ہیں، دروازوں پر کمبلوں کے پردے لٹکائے جاتے ہیں ــــ لیکن دن تو سبھی کے گذر جاتے ہیں' کانگڑی تاپنے والوں کے بھی اور گرم حمام والوں کے بھی۔

کشمیری حساب سے جاڑا دو مہینے اور دس دن رہتا ہے۔ بائیس دسمبر سے شروع ہونے والے چالیس دنوں کو "چلا کلاں" کہتے ہیں۔ یہ دن شدید جاڑے کے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کے بیس اور دس دنوں کو بالترتیب "چلاّ خورد" اور "چلہ بچہ" کہتے ہیں۔ ان دنوں سردی رفتہ رفتہ کم ہوتی جاتی ہے۔ 'چلاّ کلاں' میں تو آفتاب کے دیدار ہفتوں نہیں ہوتے۔ ہر طرف پھیلی ہوئی برف جم کر پتھر بن جاتی ہے برف کے بوجھ تلے دب کر بجلی کی تاریں ٹوٹ جاتی ہیں اور کئی کئی گھنٹے 'بلیک آوٹ' رہتا ہے۔ جھیلوں اور تالابوں کی سطح جم جاتی ہے اور زندہ دل لوگ اس پر پھسلتے ہیں۔ چھتوں سے گرتا ہوا پانی جم کر نوکیلی سلاخوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اب تو کہتے ہیں کہ جنگلات کٹ جانے کی وجہ سے اتنی سخت سردی اور اتنی شدت کے برفانی طوفان نہیں آتے، ورنہ تیس، چالیس برس پہلے تو جاڑوں میں یہ حالت ہوتی تھی کہ سانس کی نمی، ناک سے باہر نکلتے ہی موچھوں پر جم کر برف بن جاتی تھی!

چاندنی راتوں میں برفباری کا منظر دیکھتے ہی بنتا ہے۔ کل رات چاندنی میں گلمرگ کے سرکلر روڈ پر سے میں نے تین ہزار فٹ نیچے کی گھاٹی کا چاندنی میں بھیگا ہوا منظر دیکھا ــــ دیکھ تو من ہوا کہ اس نظارے کو پی لوں، اپنی یادداشت کے کسی سدابہار گوشے میں اس کا عکس محفوظ کر لوں۔ میں تمہیں یہ منظر دکھانا چاہتا ہوں۔ ارجمند! جس کی تخلیق میں قدرت کی دیوی نے اپنا تمام دودھیا رنگ ختم کر دیا، جس میں پورا چاند آسمان پر ٹھٹکا ہوا۔ حیران و ششدر ایک نئی زمین کو دیکھ رہا تھا۔ زمین کی ہر ایک ڈھلان اور اُٹھان کو برف نے اپنے سفید آنچل میں چھپا لیا تھا۔ دودھ دُھلی چاندنی اس سفید چادر کو چمکا چمکا کر روپہلا بنا رہی تھی۔ چاندنی کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ یوں دکھائی پڑتا تھا، جیسے دھرتی کی سپاٹ ڈھلانوں پر مخمل کا ایک وسیع اور کبھی نہ ختم ہونے والا تھان خود بخود ہی کھلتا چلا گیا ہو۔ سنتری نما پربتوں میں گھری ہوئی، سفید مخمل میں لپٹی کشمیر کی وادی وہاں سے ایک انسانی اور گدرائی ہوئی دوشیزہ ہی معلوم ہوئی ــــ لگا خواب دیکھ رہا ہوں ــــ معلوم نہیں کتنی رات گئے تک وہیں کھڑا اُس منظر میں کھویا رہا۔

آج میں طلوعِ آفتاب سے پہلے ہی اُٹھ بیٹھا۔ مگر آج کل گرم گرم لحاف چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ زندگی کی سست روی ایسے لمحوں میں جمود کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے ــــ اور زندگی بڑی محدود اور چھوٹی سی لگنے لگتی ہے۔ خیر! دہکتی ہوئی انگیٹھی یا آتشدان یا 'بخاری' کے پاس بیٹھ کر دل یہ چاہتا ہے کہ ارسطو سے لیکر شوپنہار تک سب کو گھونٹ کر پی لیا جائے۔ کھانا، پینا، پڑھنا اور سوچنا لے دے کر یہی کام یہاں کے لوگوں کے پاس رہ جاتے ہیں (اور شاید یہی شغل فرشتوں کے بھی ہیں)

آج صبح خوب SKIING کی۔ سوچا تھا پھسلتے پھسلتے پاؤں شل ہو جاتے ہوں گے۔ اور بڑی تکلیف ہوتی ہو گی۔ لیکن کھیل ہی کھیل میں اتنی گرمی آ گئی کہ صفر سے کم درجۂ حرارت میں بھی جیکٹ تک اُتار کر گائیڈ کے حوالے کر دینا پڑا .... باہر برآمدے میں قلیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ لگتا ہے اب خط بند کر دینا پڑے گا ــــ کیونکہ اب لوٹنا ہے۔ (بقیہ صفحہ نمبر ۶۴)

چمن لال چمن

غزل

چھ یمبرزل دِوان وَنِ مسوِلہ ترأوِتھ پریشان مَس
یہ پیٚچھ کیٚنِ کأنسہ پہ ارُن پرارُہ نادُن پوشہ کوت تامَت

نرگس متجسس ہے اور مَس عـ۱ ول بال کھولے بیٹھی ہے۔
بہ انتظار اس طرح کرنا اور انتظار کرانا کب تک ہوتا رہے گا۔

چھُو پنز پأٹھ قدتگ سرُہہ ییٚتھ زِہ مازَس سیت روزان نَم
کھیلُو روست مأہہک بہکے بہکَت میوشہ کوت نامَت

حساس فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ گوشت اور ناخن ساتھ ساتھ رہتا ہے۔
اے کنول اپنے پتوں کے بغیر نہ رہ سکو گے، رہو گے بھی تو کب تک رہا جائے گا۔

شُو بدلان وِہ چھ بدلأوِن بہ چھس ژِہ ساعت گنزرأنِ
ژہ وَنتس بأل رُدشُن پوزا ماپوز رِدشِہ کوت تامَت

وُہ اپنے انداز بدلتے ہیں تو بدلتے رہیں۔ میں لمحات گن رہا ہوں۔
سکھی اُن سے کہہ دو کہ روٹھنا ٹھیک سہی لیکن روٹھیں گے کب تک۔

گژھو یار باشومیانہ کتھہ رٹیتن وُہنیو وٚیراگ
ریٚتھس حالس اندر روز ییتھ تھوٚیُو توہ ہوشہ کوت تامَت

دوستو جاؤ! میری باتیں تمہیں پریشان کر دیں گی۔
ایسے حالات میں رہ کر تمہارے ہوش کب تک ٹھکانے رہیں گے۔

شُو یہٚنُن دولہ ٹھر تھوٚ تھوٚ بہ چھُس خوش پانسی سِتین
مَسہ ہے بانبراوِ وَنُن وُچھو بہٹہ گوشہ کوت تامَت

وُہ منہ پھیر کے اور گھونگھٹ کھینچ کے بھلے بیٹھ جائیں میں اپنے آپ سے خوش ہوں
تم مجھے مضطرب نہ کرو دیکھتے ہیں یہ بے رُخی کب تک رہے گی۔

مہ روزکھ مہربان موتو! خدا ژِہ تِہ مہربان روزی
بہ ماگُنہ ڈیٚجہ نہ ہے تتہ لَس تہ تس روست توشہ کوت تامَت

اے موت تم مجھ پر مہربان رہو تو خدا تم پر مہربان رہے گا۔
تمہارا قرب مجھے مطمئن نہیں کر سکتا اور اُن کے بغیر مجھ سے رہا نہ جائے گا۔

پزی لوکہ مَت چھُو مژہ راوان مہ وُچھتو شاپہ لدکو رہس
ییٚتھس جوشس دبان چھم رُزنہ ہے تمہ جوشہ کوت تامَت

سچ مچ یہ ہنگامہ پرست پاگل بنا دیتے ہیں۔ مجھے دیکھو آسیب زدہ کر دیا۔
میرے اس جنون کو دیکھ کر بھی کہتے ہیں کہ وُہ جنون نہ رہا۔

عـ۱ ایک پھول

تنیر

پہلا پانچسالہ منصوبہ ــ ایک اجمالی جائزہ

(تعمیر کے خاص نمائندہ سے)

پانچسالہ پلان کو اگر اقتصادی آزادی کی جامع اور ہمہ گیر تحریک کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، ریاست کشمیر میں پہلے پانچسالہ پلان کی بدولت عوام کا ایک بہت بڑا حصہ تندرستی، مسرت اور اپنے مستقبل پر بھرپور اعتماد کے احساسات کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ دیہات اور شہروں میں زندگی ایک نئی ڈگر پر دوڑتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ وہ سرد اور غمگین آنکھیں جو کبھی محرومی اور مفلسی کے آنسوؤں سے بوجھل رہا کرتی تھیں، آج خوشی سے چمکتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔

پہلے پانچسالہ پلان کا ہی نتیجہ تھا کہ ریاست کے بے شمار دیہات میں سوکھے کھیتوں کو پہلی بار مصنوعی نہروں سے پانی ملا۔ قصبوں میں پینے کے پانی کے لئے ترستے ہوئے لوگوں کو واٹر ورکس کے نلوں سے پانی میسر ہوا۔ ان گنت گھروں کے اندھیرے کمرے زندگی میں پہلی مرتبہ بجلی کی روشنی سے جگمگ جگمگ کر اٹھے، اور دور افتادہ دشوار گذار علاقوں میں بوڑھے بزرگوں کو اپنی آنکھوں سے اپنے نونہالوں کو سکول جاتے اور لکھتے پڑھتے دیکھنا نصیب ہوا۔ پانچسالہ پلان نے حقیقی معنوں میں عوام میں یہ احساس اجاگر کیا کہ یہ منصوبہ زندگی کو سبھی خوشیوں اور مسرتوں سے مالا مال کرنے کا منصوبہ ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں پہلے پانچسالہ پلان سے دوسرے پانچسالہ پلان تک فاصلہ پانچ سال کا نہیں صرف اڑھائی سال کا ہے، ملک کی دوسری ریاستوں کی طرح ہماری اپنی ریاست کے لئے بھی پانچسالہ پلان مرتب ہوا تھا۔ لیکن شروع کے اڑھائی سال تک اس پلان پر عملی طور پر کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ اس وقت سابق وزارت کی ڈھلمل یقین اور ڈانواڈول پالیسی کے نتیجہ میں قومی ترقیاتی کاموں میں زبردست جمود طاری تھا خوش قسمتی سے اگست ۱۹۵۳ء کے انقلاب کے بعد ریاست کے اندر سیاسی سماجی اور اقتصادی زندگی میں ایک نیا جوش وخروش ابھرا۔

پہلے پانچسالہ پلان پر بارہ کروڑ ستر لاکھ بتیس ہزار روپے کا خرچہ ہوا صحت عامہ کے وسائل میں اضافہ کیا گیا۔ مرکزی ہسپتالوں میں بستروں کی تعداد دو سے بڑھا کر ساڑھے چار سو تک پہنچائی گئی۔ تپ دق کا علاج کرنے والے سینی ٹوریمیں میں دو سو مریضوں کے ٹھہرنے کے انتظامات کئے گئے۔ ڈسٹرکٹ ہسپتالوں میں دو کا اضافہ کرکے تعداد آٹھ کردی گئی ۱۳ نئی ڈسپنسریاں کھولی گئیں، ادویات کا سٹاک بڑھایا گیا۔ ایک بی سی جی کلنک، دو سینی ٹوریم اور دو لیبارٹریاں قائم کی گئیں۔ دیہات میں بہت سی جگہوں پر زچوں اور بچوں کی بہبودی اور دیکھ ریکھ کے لئے دائیوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ سرینگر صدر ہسپتال میں سائنٹفک طریقہ پر کمروں کو سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد رکھنے کا بندوبست کیا گیا نرسوں اور دائیوں کو تربیت دلانے کے لئے ادارے قائم کئے گئے، اور بے شمار گشتی یونٹ چالو کئے گئے۔ جو متعدی امراض کی روک تھام کیلئے ریاست کے دور افتادہ علاقوں کے کونوں کونوں میں پھرتے ہیں۔

تعلیمی لحاظ سے ریاست میں ایک ایسا کارنامہ سرانجام پایا جس کی مثال نہیں ملتی۔ ایم اے تک مفت تعلیم کے انتظامات کرنے کے ساتھ ہی ساتھ نئے کالجوں اور سکولوں کا جال بچھایا گیا۔ پانچ نئے کالج تین ٹریننگ کالج - ۲۹ ہائی سکول - ۸۴ مڈل سکول ۲۲ سنٹرل سکول - پرائمری سکول اور کئی مکتب اور پاٹھشالائیں چالو کی گئیں۔ اساتذہ کو مراعات دی گئیں ان کی تنخواہوں کے گریڈ بدلے گئے۔ سکولوں کے لئے نئی عمارتیں تعمیر کی گئیں جن میں سے کئی ابھی زیر تعمیر ہیں۔ ٹرانسپورٹ کے وسائل کو جتنی وسعت اس پلان کے دوران ملی۔ اب تک نہیں ملی تھی۔ بس سروس کے اجراء۔ ٹرانسپورٹ

وجہ سے برا حال تھا کہ واجبی نرخوں پر خام پشمینے کی بہم رسانی ممکن نہ تھی۔ حکومت نے اس انڈسٹری کو چالو کرنے کے لئے ایک پشمینہ سنڈیکیٹ کو منظم کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ اور اس کو بلغیر سود کے پانچ لاکھ روپے کا قرضہ دیا حکومت نے اس کے علاوہ تقریباً ۱۵ لاکھ روپے کے قرضے تاجروں اور دستکاروں کو دیئے ہیں تاکہ وہ اپنی تجارت اور پیشے کو زیادہ مضبوط بنیادوں پر اُستوار کر سکیں۔

جوائنری مل

کشمیر کے صوبے میں پانپور کے مقام پر ایک جوائنری مل کو قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ یہ فیکٹری اپنی قسم کا واحد کارخانہ ہے کیونکہ اس قسم کے بہت کم کارخانے یورپ اور شمالی امریکہ کے ملکوں کے بغیر دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہ فیکٹری سالانہ تقریباً ۱۴ ہزار دروازوں اور ۳۶ ہزار کھڑکیوں کے چوکھٹ تیار کر سکتی ہے۔ جن کی واجبی قیمت د۲ لاکھ روپے ہو سکتی ہے۔

گورنمنٹ وولن ملز

اون کے کارخانوں میں اونی کپڑوں کی تیاری کے لئے جو خام مواد استعمال ہوتا ہے۔ آج سے کچھ ہی عرصہ پہلے اس کا ۸۰ فیصدی حصہ ریاست باہر سے منگوایا جاتا تھا۔ مگر اب ایسے اقدامات کئے جا رہے ہیں کہ یہ ضرورت ریاست کے اندر ہی پوری ہو سکے۔ چنانچہ گذشتہ سال لگ بھگ ۲۳ سو من اون جس کی قیمت ۳ لاکھ روپے ہے، ریاست ہی سے خریدا گیا۔ جبکہ کل ضرورت ۴۲ سو من کی ہے۔ بہت سے اقدامات کے علاوہ وولن ملز میں کام کرنے والے مزدوروں کو بہت سی سہولیات دی گئی ہیں۔ اور اُن میں ۹۱ ہزار روپے کا امدادی بونس تقسیم کیا گیا ہے۔

ریشم کی صنعت

ریشم خانے میں بننے والے ریشم کو بھی ترقی کی سطح پر لایا گیا ہے اور ایک نئی قسم "ایکسٹرا سپیشل" کی اختراع کی گئی ہے۔ صرف اس کی بدولت لگ بھگ ۷۷ ہزار روپے کی زائد آمدنی ہو گئی ہے۔ پرانی روایات کے مطابق مزدوروں سے زیادہ کام لینے اور اُنہیں کم اجرت دینے کی بجائے اب ایسے اقدامات کئے جا رہے ہیں جس سے اُن کی خوش حالی میں اضافہ ہو سکے اور وہ اچھی طرح سے کام سرانجام دے سکیں۔ اس سلسلہ میں نہ صرف اُن کی اُجرتوں میں اضافہ کیا گیا ہے، بلکہ اُنہیں رخصت کا حق اور ڈاکٹری امداد کا مستحق بھی ٹھہرایا گیا ہے۔ اُن کی تفریح کے لئے مختلف کھیلوں اور باقی چیزوں کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ مزدوروں اور کارخانے کے انتظامیہ کے درمیان تعاون کے رشتوں کو مضبوط بنانے کے لئے دس ممبروں پر مشتمل ایک بورڈ بنایا گیا ہے جس میں پانچ مزدوروں کے اور پانچ سٹاف کے نمائندے ہوتے ہیں۔ اس کا کام یہ ہے کہ فیکٹری کے مجموعی مفاد کے لئے مختلف تجاویز پر غور کرے اور اُنہیں عملی جامہ پہنائے

ڈرگ انڈسٹری

اس صنعت کو ترقی دینے کے لئے مختلف النوع اقدامات کئے گئے ہیں۔ حکومت نے دوائیوں اور جڑی بوٹیوں کی کاشت وسیع پیمانے پر شروع کر دی ہے کشمیر میں اس سلسلے میں ایک تجرباتی فارم ۱۰۰ ایکڑ زمین پر قائم کیا گیا ہے۔ بہتر قسم کے بیج منگوائے گئے ہیں اور انہیں مقبول عام بنانے کے لئے کام کیا جا رہا ہے۔ دوائیاں بنانے کی ایک لیبارٹری سرینگر میں قائم کی گئی ہے جہاں پر کشمیر کی جڑی بوٹیوں سے دوائیاں بنانے کا ابتدائی کام کیا جاتا ہے۔ یہ دوائیاں بعد میں جموں کی لیبارٹری میں مکمل ہو کر بازار میں آ جاتی ہیں۔

سیاحت

سیاحت ریاست کی عظیم ترین انڈسٹری ہے۔ کشمیر کو جو حسن خداداد عطا ہوا ہے، اس کے سبب اس کی ترقی کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد اس انڈسٹری کو کافی دھکا لگا تھا جس کی وجہ سے ریاست کے اُن طبقوں کی حالت خصوصی طور خراب ہو گئی تھی جن کا سیاحوں کی آمد سے خاص تعلق ہوتا ہے۔ ریاست میں غیر یقینی حالات کے خاتمے اور معمول کے حالات کے استحکام کی وجہ سے اب یہ انڈسٹری پھر عروج کی جانب جا رہی ہے اور ۱۹۵۶ء میں ۹۲ ہزار سیاح کشمیر آئے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔

سیاحوں کے لئے جو سہولیات فراہم کی گئی ہیں، اُن میں مندرجہ ذیل خصوصی طور قابل ذکر ہیں۔

(۱) ریل اور موٹر سے سفر کرنے کے کرایوں میں کمی۔

(۲) سیاحوں کی سہولیات کے لئے سری نگر، پہلگام، اور گلمرگ میں محکمہ سیاحت کے خاص یونٹوں کا قیام۔

(۳) ہوائی سروس میں مناسب اوقات کا تعارف اور پٹھانکوٹ سری نگر ہوائی سروس کا آغاز۔

(۴) سیاحوں کی سہولت اور اطلاعات کے لئے تمام ہندوستان میں وسیع پیمانہ پر سیاحوں کے متعلقہ صیغوں کا قیام۔

(۵) جموں، کُد، بٹوٹ اور بانہال کے ڈاک بنگلوں میں مناسب ترامیم اور وسعت کا کام۔

(۶) گلمرگ میں بنگلوں کی مناسب مرمت۔

(۷) مندرجہ ذیل مقامات پر ریسٹ ہاؤس بنائے گئے:۔

بارہ مولہ۔ سوپور۔ کپواڑہ۔ اننت ناگ۔ ویری ناگ۔ شوپیاں۔ سلدروٹھ وادجن۔ پنج ترنی۔ ڈورو۔ ڈلب۔

(۸) ریاست کے اندر رسل و رسائل کے ذرائع کی ترقی۔

اس کے علاوہ ایسے کئی اقدامات بھی حکومت کے زیر غور ہیں۔ جن سے سیاحت کو کافی عروج ملے گا۔ یہ تجاویز دوسرے پانچسالہ منصوبہ میں درج کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ کا آغاز سرینگر میں سیاحوں کا استقبالیہ مرکز تعمیر کرکے کیا گیا ہے جہاں پر سیاحوں کے لئے معلومات، آرام اور باقی سہولیات کا پورا بندوبست ہے۔ یہ تمام ایشیا میں اپنی قسم کا منفرد مرکز ہے۔

یہ ہے اُن چند پہلوؤں کا ایک اجمالی جائزہ جن کی طرف حکومت نے خصوصی طور توجہ دی ہے اور اس سلسلہ میں ٹھوس اقدامات کئے گئے ہیں مگر یہ اقدامات اپنی تمام اہمیت کے باوجود ترقی اور تعمیر کی اُس عظیم مہم کا پیش خیمہ ہے۔ جسکی طرف ریاست سُرعت سے آگے بڑھ رہی ہے۔ کشمیر عرصۂ دراز سے مطلق العنان جاگیر شاہی اور اسکی مصلحتوں کی آماجگاہ بنی رہی جسکی وجہ سے یہ اپنے حُسن خداداد اور معدنی دولت کے مالامال خزانے رکھتے ہوئے بھی مفلس رہا۔ اب جبکہ ریاست میں اشتراکی طرز کی ایک فلاحی ریاست بنانے کی طرف پہلو دار اقدامات کئے جارہے ہیں اور عوام کا معیار حیات بلند سے بلند تر ہوتا جارہا ہے۔ اس امر کے قوی امکانات ہیں کہ ہماری ریاست صنعتی سرگرمیوں کا ایک بہت بڑا مرکز بن جائے گی۔ اور اس بارے میں ہندوستان کے باقی صوبوں کی رہنمائی کرے گی۔

صلائے عام

شری وی، کے، کرشنا مینن نے کہا ہے کہ کشمیر کے معاملے میں ہندوستان کا ریکارڈ اتنا پاک و صاف ہے جتنا کہ انسانی تواریخ میں کسی دوسرے ملک کا ہوسکتا ہے۔ باہر کے ممالک میں اس بات کو ہندوستان کی کمزوری کی علامت تصور نہیں کیا جانا چاہیئے کہ ہندوستان کشمیر کے معاملہ کو صلح و صفائی سے حل کرنا چاہتا ہے اور اس نے یہ معاملہ اقوام متحدہ کے سامنے پیش کیا ہے۔

شری مینن نے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے ایک بھی سپاہی نے حملہ کرنے کی غرض سے کشمیر میں قدم نہیں دھرا ہے کشمیر کے عوام کی مرضی اور استدعا پر ہی کشمیری عوام کو حملہ آوروں کی غارت گری اور لوٹ مار سے بچانے کے لئے یونین فوج وہاں گئی ہے۔

شری مینن نے کہا کہ کشمیر کے متعلق یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ یہاں پولیس راج ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ کس قسم کا پولیس راج ہے۔ جو ستر ہزار سے زیادہ سیاحوں کو اپنے یہاں آنے کی اجازت دیتا ہے، جنمیں ہزاروں غیر ملکی سیاح بھی ہوتے ہیں۔ شری مینن نے کہا کہ میں یہ بات واضح کردینا چاہتا ہوں کہ ایک آزاد قوم کی حیثیت میں اور اقوام متحدہ کے ایک ممبر کے طور پر یہ ہندوستان کا مقدس فرض ہے کہ وہ اپنی قومی سرداری کو برقرار رکھے کشمیر ہندوستان کی قومی سرداری کی نمایاں علامت ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کشمیر کے متعلق ہند نے جو وعدے کئے ہیں، اُن میں سے اُس نے کسی وعدے سے انحراف نہیں کیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہندوستان نے تمام وعدے پورے کئے ہیں، لیکن ہندوستان سے اُن وعدوں کو منسوب کیا جارہا ہے جو اس نے کبھی نہیں کئے ہیں۔

شری کرشنا مینن نے آخر پر کہا کہ کشمیر کے متعلق ہندوستان کی پالیسی میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہیں ہوگی۔

●

فتح یا شکست

(سیاسی مبتصر کے قلم سے)

اندرونی خلفشار، بے اطمینانی اور انتشار کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کیلئے پاکستان کے ارباب اقتدار نے ایک بار پھر مسئلہ کشمیر کو اچھال کر مزید کچھ عرصے کے لئے اقتدار اعلیٰ سے چمٹے رہنے کا سامان کرایا ہے۔

جنوری کے مہینے میں پاکستان نے پاکستانی عوام کی توجہ اقتصادی بحران اور سیاسی بے اطمینانی سے ہٹانے کیلئے سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر بحث کرنے کی درخواست دی اور اس کے لئے وجہ یہ بتائی کہ کشمیر کی موجودہ صورت حال امن عالم کے قیام کے لئے ایک خطرہ ہے، یہ شکایت دراصل ہندوستان نے کرنا چاہیئے تھی کہ پاکستان کی فوجی تیاریاں اور اس کے ساتھ ہی اس کا اندرونی انتشار ہندوستان کے لئے ایک خطرہ ہے، مگر پاکستان نے اپنے ملک کی غیر یقینی صورت حال سے گھبرا کر سلامتی کونسل کے دروازے کھٹکھٹائے پاکستان کی درخواست کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کشمیر پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اس سے صورت حال خراب ہونے کا اندیشہ ہے، اسلئے پاکستان کو حملہ کرنے سے روکا جائے۔ یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب سی درخواست تھی مگر پاکستانی حکمرانوں کے حواس کہاں بجا تھے کہ وہ خود ایکبار اپنی شکایت پر غور و فکر کرتے "امن عالم کو خطرہ" کا نعرہ دیکر وہ غیر شعوری طور پر اس بات کا اعتراف کر رہے تھے کہ "ہماری نیت خراب ہے"! ہندوستان نے کبھی پاکستان پر حملے کا تصور ہی نہیں کیا بلکہ ہندوستانی لیڈر بار بار پاکستانی حکمرانوں کو یہ یقین دلاتے رہے کہ ہندوستان کے پاکستان کے خلاف کوئی جارحانہ عزائم نہیں ہیں۔ پاکستان کو فی الحال روس یا چین سے کوئی ایسا فوری خطرہ نہ تھا کہ وہ "امن عالم" کی آڑ میں سلامتی کونسل کی پناہ لیتا۔ افغانستان سے بھی اس کے تعلقات اب اتنے خراب نہیں کہ اس سے پاکستان کو حملے کا اندیشہ ہو۔ پھر امن عالم کو کیوں اور کہاں پر خطرہ ہے؟ اس کا جواب پاکستانی حکمرانوں نے یہ دیا ہے کہ اگر کشمیر کی موجودہ صورت حال برقرار رہی تو پاکستانی عوام "بے قابو" ہو کر کشمیر پر حملہ کر دیں گے، اور اس طرح "امن عالم" کو خطرہ لاحق ہوگا۔ یا بالفاظ دیگر پاکستان کشمیر پر حملہ کر دیگا۔ اس کے اس حملے کے خطرے کو روکنے کے لئے وہاں بین الاقوامی پولیس فورس بھیجدی جائے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک چور عدالت میں جاکر درخواست دیتا ہے کہ میں آج فلاں آدمی کے گھر چوری کرنے جارہا ہوں۔ اس لئے وہاں پر پولیس تعینات کی جائے۔ یہ دلیل جہاں مضحکہ خیز ہے وہاں شرانگیز بھی ہے عدالت کی ستم ظریفی بھی ملاحظہ کیجیئے کہ وہ درخواست دہندہ کی درخواست پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیتی ہے!

سلامتی کونسل نے پاکستان کی درخواست پر غور کرنا شروع کر دیا تو کچھ دلچسپ باتیں سامنے آگئیں معلوم ہوا کہ سے کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں! برطانیہ اور فرانس نے مصر میں اپنی مخالفت اور بے عزتی کا انتقام لینے کیلئے ہندوستان کو مشق ستم بنانے کی ناپاک سازش کی ہے۔ امریکہ نے ہندوستان کی غیر جانبداری سے جھلا کر اسے زبردستی اپنے ساتھ ملانے یا کمیونسٹ بلاک میں دھکیلنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور اس طرح امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے پاکستان کے کاندھے پر بندوق رکھکر ہندوستان کو نشانہ بنانا چاہا ہے! اپنی مقصد براری کے لئے اور پاکستان کو وقتی طور پر خوش کرنے کے لئے ایک ایسی قرارداد پیش کی گئی جس کا مقصد ریاست جموں و کشمیر میں نئے آئین کے نفاذ کو روکنا تھا۔ اور اسکے بعد ایک اور قرارداد میں ریاست سے فوجوں کے انخلاء اور ہنگامی پولیس فورس کے قیام کی سفارش کی گئی، جسے روس نے حق تنسیخ استعمال کر کے رد کر دیا۔

آخر میں ایک قرارداد منظور کر لی گئی جسمیں سویڈن کے نمائندے مسٹر یارنگ کو برصغیر ہند و پاکستان کا دورہ کرنے اور وہاں کی حکومتوں سے بات چیت کرنے کے بعد ۱۵ اپریل ۱۹۵۷ء تک اپنی رپورٹ پیش کرنے کو کہا گیا ہے جسمیں قضیہ کشمیر کو حل کرنے کے متعلق تجویزیں پیش کی جائیں!

اب اس سارے ہنگامے سے پاکستان کو کیا ملا؟ وزیر اعظم پاکستان سہروردی صاحب نے بار بار کہا ہے کہ برطانیہ، فرانس اور امریکہ نے کھلم کھلا پاکستان کی حمایت کی ہے، اور اس طرح پاکستان کی خارجی پالیسی کی بہت بڑی فتح ہو گئی۔ جہاں تک برطانیہ اور فرانس کی حمایت کا سوال ہے، یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، اسلئے کہ مصر میں ان دونوں مغربی طاقتوں نے جس طرح منہ کی کھائی ہے اور ہندوستان نے جس اخلاقی جرأت کا ثبوت دیکر انکی ہیبت کو بے نقاب کیا ہے اس کے پیش نظر اگر وہ ہندوستان سے انتقام لینے کیلئے پاکستان کی پیٹھ ٹھونکیں جس نے مصر پر مغربی سامراج کے حملے کی حمایت کردی، تو یہ غیر متوقع نہیں، اور پھر پاکستان نے اپنی آزادی کی قیمت دیکر ان کے ساتھ فوجی معاہدے بھی کئے ہیں۔ ان معاہدوں کی لاج رکھنے کے لئے اگر ان دو طاقتوں نے پاکستان کو سہارا دیا، تو پاکستانی وزیر اعظم کو اسے خارجی پالیسی کی کامیابی نہیں بلکہ اپنی آزادی اور اپنے وقار کی قیمت کہنا چاہیئے، جو کچھ وقت تک کیلئے انہیں ملتی ہی رہیگی۔ رہی امریکہ کی حمایت سو یہ کوئی بڑی فتح نہیں ہے۔ اپنے ملک کا چپہ چپہ امریکی توپوں اور بارود کے عوض رہن رکھکر بھی اگر امریکہ پاکستان کی حمایت نہ کرتا، تو وہ امریکہ کی بے مروتی ہوتی۔

تو پھر کشمیر کے مسئلے میں پاکستان نے کیا حاصل کیا؟ یارنگ مشن پاکستان کی فتح نہیں، اس کی بہت بڑی شکست ہے۔ کشمیر کا مسئلہ آج بھی وہیں ہے، جہاں جنگ بندی کے وقت تھا۔ مسٹر یارنگ نہ تو فوجوں کے انخلاء کے بارے میں بات چیت کر سکیں گے، اور نہ ہی بین الاقوامی ہنگامی فورس کے قیام کے متعلق، کیونکہ ان دونوں باتوں کا تازہ قرارداد میں کوئی ذکر نہیں، وہ مسئلہ کشمیر کا کوئی معقول اور مناسب حل ڈھونڈنے کیلئے دونوں حکومتوں سے مذاکرات کریں گے۔

ہندوستان کے وزیر اعظم نے دو بنیادی حقیقتوں کو تسلیم کئے جانے کے بعد ہی مسٹر یارنگ سے کسی مسئلے پر بات چیت کرنے کا اعلان کیا ہے اور وہ دو بنیادی حقیقتیں ہیں کہ کشمیر ہند کا ایک قانونی حصہ ہے، اور پاکستان کی حیثیت حملہ آور کی ہے، ان ہی دو بنیادی حقیقتوں کی طرف ہندوستانی وفد کے سربراہ شری کرشنا مینن نے بھی دنیا کی توجہ مبذول کرائی ہے، انہوں نے صاف اور واضح الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ ہندوستان کسی ایسی قرارداد پر عمل کرنے کیلئے تیار نہیں ہے، جو اس نے قبول نہیں کی ہیں۔

اب اگر پاکستانی حکمران اپنے عوام کو یہ مغالطہ دینا چاہیں کہ یارنگ مشن پاکستان کی بہت بڑی فتح ہے اور اس سے کشمیر کے پاکستان میں شامل کئے جانے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ پاکستان کی قانون ساز اسمبلی میں بہت سے لیڈروں نے اسے پاکستان کی شکست قرار دیا ہے اور پاکستانی عوام اب سمجھ گئے ہیں کہ حکمران ٹولی کا یہ سارا ہنگامہ "کھودا پہاڑ اور نکلا چوہیا" کے مترادف ایک ڈھونگ تھا — پاکستانی وزیر خارجہ نے گھر آکر اپنی خفت مٹانے کیلئے ایک بار پھر مغربی دوستوں کی دوستی کی تان چھیڑ دی ہے، مگر سوال یہ ہے کہ اس ساری دوستی سے پاکستان کا کیا بھلا ہوگا؟ اس سے پاکستان کی سیاسی بے اطمینانی اور اقتصادی زبوں حالی تو دور نہ ہو سکے گی، اور یہ ساری طاقتیں مل کر بھی کشمیر ان کے حوالے نہیں کر سکتیں، کیونکہ کشمیر کا چپہ چپہ یہاں کے عوام کا ہے، اور عوام کا متفقہ فیصلہ ہند سے اٹوٹ الحاق ہے! اور اس ماہ کے اخیر میں ہونے والے انتخابات دنیا کو ایکبار پھر دکھادیں گے کہ کشمیری عوام کا فیصلہ کیا ہے۔

دنیا اب جاننا چاہتی ہے کہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کا کیا فیصلہ ہے۔ کیونکہ ۹ سال سے انہیں آج تک کبھی اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کرنے کا موقع نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ جب کبھی انہوں نے یہ حق مانگا۔ تو انہیں یا تو ملک بدر کیا گیا یا جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے کر دیا گیا۔ مقبوضہ کشمیر میں بڑھتی ہوئی بے چینی ایک نئے انقلاب کی غماز ہے۔ اور وہ وقت دور نہیں۔ جب وہاں کے عوام متحد ہوکر پاکستانی حکمرانوں کے ایوانوں کو ہلادیں گے۔

●

ثریا جبین ناہید

جھوٹ

دنیا میں کون ہے جو جھوٹ نہیں بولتا۔ اگر کوئی کہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا، یا جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتا تو میں بلا تامل کہوں گی کہ یہ غلط ہے، آپ جھوٹ بولتے آئے ہیں اور بولتے جائیں گے اس لئے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کاروباری اور گھریلو زندگی گذاریں اور جھوٹ نہ بولیں یہ عین حقیقت ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان جھوٹا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ جو انسان جھوٹ بولے جتنا آٹے میں نمک تو دُنیا اُسے سچا کہہ دیگی۔ کیونکہ اُسکا جھوٹ دوسروں کے لئے نقصان دہ نہیں ہے لیکن جہاں انسان بے بنیاد باتیں کہے یا ایسی باتیں جن سے دوسروں کو نقصان ہو اور فائدہ صرف بولنے والے کو ہو تو دُنیا اُسے جھوٹا کہے گی۔

دُنیا میں جانداروں اور غیر جانداروں کی طرح جھوٹ کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔

ایک جھوٹ وہ ہے جسے بولنے والا اپنے آپ کو تسلی دینے اور اپنی امارت کا رعب جمانے کے لئے بولتا ہے جس کے بولنے سے سُننے والے کو ایک فیصدی نقصان کا بھی خدشہ نہیں رہتا۔ اس جھوٹ کو "سفید جھوٹ" کہتے ہیں۔ سفید جھوٹ کے پیچھے شیخی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے اور جب حقیقت سے آگاہی ہوتی ہے، تو بولنے والا بیمار جانوروں کی طرح منہ لٹکا لیتا ہے آجکل بہت سے لوگ سفید جھوٹ کے عادی ہیں۔ اور اکثر بڑھاپے تک اسمیں مبتلا رہتے ہیں۔ میری ملنے والی ایک خاتون ہیں جو اکثر کہا کرتی ہیں کہ اُن کا تعلق افغانستان کے شاہی خاندان سے ہے۔ اور تخت کے حقدار اصل میں اُن کے والد بزرگوار ہیں۔ مجھے جب اس بات کا علم ہوا، تو میں نے ہمدردی جتاتے ہوئے اُن سے پوچھ ہی لیا کہ آخر کون سی گردشِ افلاک نے اُنہیں اس دُور افتادہ مُلک میں لا پھینکا، اور ان کے والد تحصیلداری کرنے پر مجبور ہوئے۔ آنکھیں جھکا کر کہنے لگیں۔ بات اصل یہ ہے کہ میرے دادا کو تاج و تخت سے زیادہ زندگی کے دوسرے مشاغل سے دلچسپی تھی، اسی لئے وہ جلاوطن کر دیے گئے اور وہ مع اہل و عیال دلّی آگئے، جیسا کہ مغلیہ عہد میں دستور رہا ہے۔

یہ سُن کر میں نے اپنی ہنسی کو ضبط کیا۔ پھر تو آپ افغانستان کے شاہی خاندان کی شہزادی ہیں۔

وہ بڑی ادا سے بولیں۔ اسی لئے تو ہم گھر کا کام کاج اپنے ہاتھوں سے کرنا باعث شرم خیال کرتے ہیں۔

دوسرا جھوٹ وہ ہے جو انسان اپنی لیاقت اور قابلیت کی دھاک بٹھانے کے لئے بولتا ہے، اُس جھوٹ کو "صاف جھوٹ" کہتے ہیں۔ "صاف جھوٹ" بولنے والا بولتے ہی یا جملہ ختم کرتے ہی پکڑا جاتا ہے اور پھر محفل میں شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگتا ہے، نیز اپنی شرمندگی کو بے حیائی کی ہنسی میں چھپانے کی سعی کرتا ہے، ایسے جھوٹ کی بیماری عموماً اُن لوگوں میں پائی جاتی ہے، جو اپنے آپ کو لائق تصور کرتے ہیں اور دوسرے لوگ اُن کی لیاقت سے کافی حد تک واقف ہوتے ہیں یا دوسرے لوگ دوران گفتگو ہی میں اُن کی لیاقت پرکھ لیتے ہیں بار بار کی شرمندگی بھی اُن کی اس عادت کو نہیں بدل سکتی گویا ؎

چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی

زندگی میں "صاف جھوٹ" بولنے والوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے اسی طرح مجھے بھی واسطہ پڑا ہے "انھوں" نے بتایا کہ وہ ادیب فاضل پاس ہیں۔ میں نے اُن کی بہت عزت اس لئے کی کہ وہ اُردو کی ایک ڈگری رکھتی تھیں۔ میں نے یونہی ایک سوال کر دیا۔

آپ نے کس سال ادیب فاضل کیا ہے؟

اسی پچھلے سال یعنی ۵۵ء میں۔

آپ نے کون کون سی کتابیں پڑھیں ؟

یہ سُن کر وُہ چُپ ہوگئیں۔ میں نے پھر پوچھا تو بالکل مری ہوئی آواز میں بولیں۔

مجھے کہیں سے تمام پرچوں کے نوٹ ہاتھ آگئے تھے، میں نے اُنہی پر اکتفا کی۔

میں نے اس خیال کو پختہ کرنے کے لئے پھر سوال کیا، آپ کے پہلے پرچے میں کون کون سے سوالات تھے۔

محترمہ نے آنکھیں گھماتے ہوئے جواب ارشاد فرمایا۔ اس وقت یاد تو نہیں پڑتا، ویسے کُل پانچ پرچے ہوتے ہیں۔

پھر تو میں نے ہنس کر اُٹھتے ہوئے الماری سے فہرست کتب ادیب ادیب عالم وغیرہ ان کے سامنے ڈال دیئے۔ اور بولی محترمہ کل چھ پرچے ہوتے ہیں۔ میری بہن نے بھی اسی سال امتحان پاس کرلیا ہے اور یہ فہرست انہی کی ہے اب تو محترمہ لال پیلی ہوگئیں۔ میں نے کہا۔ کوئی بات نہیں، انسان خطاؤں کا پُتلا ہے۔

تیسرا جھوٹ وُہ ہے جس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا۔ بلکہ بولنے والے کو صرف اتنا نفع پہنچتا ہے جتنا آٹے میں نمک، ایسے جھوٹ بہت کم ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اگر ظاہر بھی ہوجائیں تو اتنے مکروہ اور بھونڈی صورت میں نہیں ہوتے۔ اس لئے اس کو "خفیہ جھوٹ" کہتے ہیں، اور دنیا ایسے جھوٹ بولنے کو سچا کہتی ہے، شاید اس لئے کہ اس جھوٹ کے بولنے سے نقصان اور شرمندگی کا خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ ایسے جھوٹ بولنے والوں کی تعداد بہت کم ہے اسلئے اس جھوٹ کا درجہ بھی دوسرے جھوٹوں کے مقابلے میں بلند ہے۔ دوکاندار لوگ اس سے بہت کتراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "خفیہ جھوٹ" بولنے والوں کی تعداد تقریباً پانچ فیصدی ہے، اس تعداد میں عموماً پرہیزگار اور ایماندار لوگ ہوتے ہیں، چونکہ اس کے بولنے والے کم ہیں اسلئے زندگی میں خفیہ جھوٹ بولنے والوں والوں سے واسطہ کم ہی پڑتا ہے۔ "خفیہ جھوٹ" بولنے والے شاذ و نادر اگر کہیں مل بھی جائیں تو میرا خیال ہے کہ اُن کا جواب بھی کچھ اس قسم کا ہوگا۔

"اللہ تعالٰے نے فرمایا ہے کہ جس سے کسی بے گناہ کا قصور معاف ہوجائے، جس سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ ہو، اور جس میں گھمنڈ اور شیخی کا شائبہ تک نہ ہو تو ایسے جھوٹ کے بولنے میں کوئی ہرج نہیں"

چوتھا جھوٹ وُہ ہے جسے انسان محض اپنے ذاتی اور مالی مفاد کیخاطر بولتا ہے، اسے "سیاہ جھوٹ" کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے درپردہ ریاکاری رقصاں ہوتی ہے۔ "سیاہ جھوٹ" بہت مکروہ صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ آجکل سیاہ جھوٹ بولنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور اسی سیاہ جھوٹ کی بدولت وکیلوں کی جیب گرم ہے اور کچہریوں میں چہل پہل ہے۔ اس جھوٹ کے ماہر اکثر بھلے مانسوں کو بھی چکر میں ڈال کر عدالت میں جج صاحب کے سامنے سچے بن جاتے ہیں۔ چونکہ سیاہ جھوٹ بولنے والوں کی تعداد نوے فیصدی ہے اسلئے آپ کو ایسے لوگوں سے مڈبھیڑ ہونے میں کافی مدت نہیں لگے گی۔ اور ان کے واقعات تو آپ آئے دن سُنتے رہتے ہوں گے۔ اگر نہیں تو لگے ہاتھوں ایک واقعہ عرض کئے دیتی ہوں۔

ایک بار میرے قصبے میں سیاہ جھوٹ کا حیرت انگیز واقعہ رونما ہوگیا ایک فلسفی قسم کے انسان تھے، ہروقت کھوئے کھوئے رہتے۔ جوش جنون کے دوران میں وُہ اپنے کسی دوست کے گھر پر گئے، انہیں پیاس لگی تھی۔ پانی مانگا دوست نے پانی کے عوض شربت پیش کیا۔ پھر کیا تھا۔ فلسفی صاحب نے اپنے دوست کو گلے لگالیا، اور اپنی ساری جائداد اُسی وقت جاکر اُن کے نام لکھ آئے اور جائداد لکھ کر جب گھر لوٹے تو اپنے فرزند سے بولے۔

بیٹا میں نے اپنی ساری جائداد اپنے ایک دوست کو لکھ دی ہے، تم ایک بڑے افسر ہو، تم خود حاصل کرلینا۔

یہ سُن کر بیٹے نے چند سوالات کئے۔ پھر تو فلسفی صاحب نے ساری بات بتادی۔ بیٹا جب باپ کے دوست کے پاس پہنچے تو دوست صاحب نے کہا، تمہارے باپ پر میرے ہزاروں روپے قرض کے نکلتے تھے جسکے عوض انہوں نے ساری جائداد میرے نام منتقل کردی ہے۔

بات عدالت تک پہنچی۔ اور کافی صرفے کے بعد حق بہ حقدار رسید تک معاملہ پہنچا۔ اور اُن کے دوست جھوٹے ثابت ہوئے، یہ تو سیاہ جھوٹ کا ایک معمولی سا کرشمہ تھا، ورنہ سیاہ جھوٹ کے واقعات تو ہزاروں ہوتے رہتے ہیں۔ جو ایک سے ایک بڑھکر دلچسپ اور حیرت انگیز ہوتے ہیں۔

پانچواں جھوٹ وُہ ہے جس کے سنتے ہی عوام میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے، فضا خوف وہراس کی آوازوں سے گونجنے لگتی ہے۔ اس جھوٹ کو "بھاگڑ جھوٹ" کہتے ہیں۔ بھاگڑ جھوٹ کے درپردہ بعض اوقات

سیاسی ہیجیدہ باتیں ہوتی ہیں جن کے بولتے ہی لوگوں کے چہرے فق ہو جاتے ہیں۔ ایسے جھوٹ زیادہ تر جنگ کے دنوں میں چلتے ہیں۔ اور سننے والے عوام کی بے چینی دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس جھوٹ کا اثر براہ راست اُن لوگوں پر پڑتا ہے جو جاہل اور گنوار ہوتے ہیں۔ اور حالات حاضرہ سے قطعی ناواقف ہوتے ہیں۔ "بھاگڑ جھوٹ" کے حادثات بعض اوقات کچھ اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ مدتوں تک اُن کی یاد سے ہنسی چھوٹتی رہتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس جھوٹ کے کرشمے آپ نے ضرور سُنے یا دیکھے ہوں گے، اگر نہیں تو لگے ہاتھوں اسے بھی سُن ہی لیجئے۔

ایک بار خوب زور کی بارش ہوئی، دریا بہاؤ پر آگیا اور بہت سے علاقے زیر آب آگئے۔ اُن علاقوں میں میرا قصبہ بھی تھا چند دنوں کے بعد جب پانی اُترا تو دیکھا گیا کہ جگہ جگہ سے زمین میں شگاف پڑ گئے تھے کسی منچلے نے "بھاگڑ جھوٹ" کی پھلجڑی چھوڑ دی۔ پھر تو سب لوگوں کی زبان پر تھا پرسوں جمعرات کے روز بارہ بجے زلزلہ آرہا ہے۔ ایک نجومی نے پیشین گوئی کی ہے کہ اگر شہر خالی نہیں کیا گیا تو نصف آبادی تباہ ہو جائے گی" نتیجہ یہ ہوا کہ "زلزلہ آرہا ہے" کی آوازیں اب ہر چہار طرف سے سنائی دینے لگیں کچھ لوگوں نے تو اپنا اپنا مال و اسباب لے کر کھلے میدانوں کی راہ لی۔ جو لوگ اس بات پر یقین نہیں کر سکے وہ آرام سے اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے رہے اُس رات اتفاق سے خوب بارش ہوئی، صبح کو لوگ اپنا اپنا بھیگا اور گیلا مال اسباب لے کر گالیاں بکتے ہوئے گھروں کو لوٹے اور "بھاگڑ جھوٹ" نے تقریباً اُن ہی لوگوں پر اپنا رنگ جمایا جو سادہ لوح اور ضعیف الاعتقاد تھے

چھٹا جھوٹ وہ ہے جس کا بولنا دوسروں کو آپس میں لڑا کر فائدہ حاصل کرنا ہے۔ اس لئے اس جھوٹ کو "فتنہ جھوٹ" کہہ سکتے ہیں۔

ایسے جھوٹ عموماً بڑے سیاست داں یا حکمران لوگ بولتے ہیں عموماً سیاسی رخنے اس جھوٹ کا موجب ہوا کرتے ہیں۔ انگریزوں نے "فتنہ جھوٹ" کے ذریعہ ہی اتنے دنوں تک ہندوستان پر حکومت کی۔ وہ لوگ جو فتنہ جھوٹ کے عادی ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ "ہمیں کتوں کی یہ عادت بہت پسند ہے کہ جہاں چار مل بیٹھے تو پھر کسی نے مصرع طرح چھیڑ دیا۔ پھر ہر کوئی باری باری سے وہ غزل سے غزل سنا کر چلتا بنتا ہے اور محفل برخاست ہو جاتی ہے۔"

اگر کسی خاندان میں دو تین بھی فتنہ جھوٹ والے پیدا ہو جائیں تو پھر سارے کنبہ کا ناک میں دم کرنے کے لئے کافی ہیں۔ یہ لوگ اتفاق کو پسند نہیں کرتے۔ اس جھوٹ کے واقعات بھی کئی ایک آپ کی نظروں سے گذر چکے ہوں گے، اس لئے کسی مثال کی ضرورت نہیں۔ اور چونکہ زمانہ رنگ میں بھنگ کا ہے اس لئے ایسے لوگوں کی کمی بھی نہیں آپ کو کہیں بھی مل جائیں گے

ساتواں جھوٹ وہ ہے جو انسان اپنی محبت اور اپنے محبوب کے بارے میں بولتا ہے، معشوق چاہے حور شمائل نہ ہو، لیکن شرط یہ ہے کہ عاشق کو بھا جائے۔ آخر قیس عامری نے بھی تو اپنا انتخاب کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا لیکن چندے آفتاب چندے ماہتاب نہ سہی، اب تو وہی حُسن و عشق کی ایک علامت بن گئی ہے۔ گو اب بھی لوگوں کا خیال ہے کہ اسے حُسن سے دُور کا لگاؤ بھی نہیں تھا۔ اس طرح کے جھوٹ کو "مخملی جھوٹ" کہتے ہیں۔ اس جھوٹ کو خفیہ جھوٹ کی بہن سمجھ لیجئے۔ کیونکہ مجنوں کی آنکھ کا سوال پیدا ہو جاتا ہے بعض اوقات جب عشق کا بھوت سر سے اُتر جاتا ہے (اگرچہ مجنوں کے سر سے نہیں اُترا) تو وہی مخملی جھوٹ بولنے والا بالکل اپنا برعکس ہو جاتا ہے۔

ایک صاحب نے بڑی کوششوں سے اپنی مرضی کی شادی کی۔ اپنی کوشش کی کامیابی پر جتنی بھی خوشی ہونی چاہیئے وہ کم تھی، بہت خوش تھے، بیوی کے بڑے ہی قصیدہ خواں، جہاں بھی بیٹھتے بیگم ہی کا راگ الاپتے انہی کے حُسن صورت اور حُسن سیرت، زُلف و رُخ اور لب و رخسار کی بات کرتے لیکن انہی حضرت کا آجکل حال یہ ہے کہ بیوی کو کالی کُتیا کہتے ہیں۔ اور اس کے ہاتھوں کو بندریا کے ہاتھوں سے تشبیہہ دیتے پھرتے ہیں۔ یک بیک اُن کا یہ جمالیاتی ذوق معلوم نہیں کس گُناہ کی پاداش ہے، ورنہ بیچارے کی زندگی تو بھلی چنگی تھی، کسی نہ کسی طرح کھیپ دیتے۔ لیکن بُرا ہو اس "مخملی بیگم" کا جو رقابت پر اُتر آئیں۔

میرا خیال ہے کہ مخملی جھوٹ کے قصے بہتر سے بہتر اس زمانے میں آپکو مل جائیں گے۔ آجکل مجنوں کی آنکھ ناپید ہے اور لیلیٰ کے لئے "آنکھ مچولی" کی کافی آسانیاں مہیا ہیں۔ کوئی بھی لڑکی آپ کو دھوکا دے سکتی ہے، مثلاً سینما ہال کے گیٹ پر آپ نے جس لڑکی کو دیکھا، جب فلم کے ختم ہونے تک وہ واپس ہو گی، تو بعض اوقات اس لڑکی کو پہچاننا بھی آپ کی آنکھ کے لئے امتحان ہو جائے گا، اس لئے کہ پاوڈر کریم کا سارا رس تو گرمی کی حدت نے کپڑوں کو پلا دیا ہوگا۔ پھر آپ کے لئے کیا بچا؟ زندہ باد جھوٹ۔ یہ زندگی ایک جھوٹ ہے حالانکہ یہ بھی ایک جھوٹ ہے۔ کاش آپکو یقین آجائے۔

ایس۔ کے۔ رینہ
ڈائریکٹر محکمہ سیاحت

سرمائی کھیلیں

کشمیر ہمیشہ سے ان سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے جو بہار، گرما اور خزاں میں اپنی تعطیلات منانے کے لئے کسی خوشگوار سیر گاہ کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مگر سرمائی کھیلوں کے شوقین حضرات کے لئے سرما میں بھی یہاں کچھ کم دلچسپیاں نہیں ہوتیں۔ گلمرگ، اپھروٹھ اور کھلن مرگ کی برف پوش ڈھلانیں ہر قسم کی سرمائی کھیلوں کے لئے دعوتِ شوق دیتی ہیں۔ گلمرگ پہلے ہی سرمائی کھیلوں کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے اور قبائلی حملے کی تباہ کاریوں سے پہلے یہاں دنیا کے کونے کونے سے سرمائی کھیلوں میں دلچسپی رکھنے والے سیاح آیا کرتے تھے۔ سطح سمندر سے ۹ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع بلند قامت چیڑ اور صنوبر کے درختوں سے آراستہ و پیراستہ گلمرگ میں سرمائی کھیلوں کے لئے ہر ممکن کشش موجود ہے یہاں کے علاوہ اپھروٹھ اور کھلن مرگ میں وہ سب کچھ موجود ہے جو فطرت اپنے پجاریوں کو پیش کر سکتی ہے۔ اپھروٹھ کی منجمد جھیل اپھروٹھ کی پہاڑیوں کے دامن میں اپنے سینے پر تیرتی ہوئی برف اور یخ کے ٹکڑے لئے ایک دلکش نظارہ پیش کرتی ہے۔ گھوڑسواری کے لئے گلمرگ سے ایک آرام دہ سڑک ہے جو اپھروٹھ اور گلمرگ کو ملا دیتی ہے۔

حکومت گذشتہ چند سالوں سے گلمرگ کو ایک بار پھر سرمائی کھیلوں کا مرکز بنانے کے لئے غیر معمولی توجہ صرف کر رہی ہے اور اس کے لئے کچھ سنجیدہ اقدامات بھی کئے گئے ہیں۔ مگر بانہال کا دشوار گذار راستہ ایسی ہر ممکن کوشش میں ایک سدِ راہ بنا رہا۔ ہوائی سفر اس لحاظ سے قابلِ اعتماد نہ تھا کہ بانہال کا فضائی راستہ بھی موسم کی خرابی کی وجہ سے ہمیشہ غیر یقینی رہا اور کوئی کھلاڑی اس قسم کی غیر یقینی صورت حال میں یہاں نہ آنا چاہتا تھا۔ جبھی ۲۲ دسمبر ۱۹۵۶ء کا دن سیاحت کی تاریخ میں ایک یادگار دن رہے گا۔ خاص طور پر سرمائی کھیلوں کے لئے! اس دن بانہال کی پست سطح کی سرنگ کو ہر قسم کی آمد و رفت کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا۔ اب بانہال کا یہ راستہ جو سال میں چار مہینوں کے لئے بند رہا کرتا تھا، بارہ مہینوں کے لئے کھلا رہا کرے گا۔ سرنگ کے کھلنے کے ساتھ ہی محکمۂ ٹورزم نے سرمائی کھیلوں کے احیاء کے لئے اپنی کاوشوں کا آغاز کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں محکمۂ سیاحت کو اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس ہے۔ سنہ ۱۹۵۷ء کے سرما کے دوران گلمرگ آنے والے سیاحوں کو رہائش اور خورد و نوش کی ہر ممکن سہولیات بہم پہنچانے کے لئے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ ٹنگمرگ کو رسیوں کے ذریعہ گلمرگ سے ملانے کے لئے آمد و رفت کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس سے فاصلہ کی کمی کے ساتھ ساتھ وقت کی بھی بچت ہوگی۔ سکیئنگ کے لئے جدید سامان کی فراہمی کے لئے باہر کی فرموں سے بات چیت کی جا رہی ہے اور ان تمام انتظامات کو مکمل کرنے کے لئے غیر معمولی سرعت سے کام جاری ہے۔

سالِ رواں میں آنے والے سیاحوں کے لئے بھی محکمہ ٹورزم حتی الامکان سہولتیں مہیا کرے گا۔ گلمرگ میں ٹورسٹ آفیسر مزدوروں، قلیوں، گھوڑوں اور خورد و نوش کے انتظامات کی دیکھ بھال کرے گا۔ سیاحوں کے لئے چھوٹی چھوٹی رہائش گاہیں ہر وقت مہیا رہیں گی۔ سرینگر اور ٹنگمرگ کے درمیان ایک باقاعدہ میل سروس جاری ہے۔ اس کے علاوہ سری نگر سے کسی بھی وقت ٹیکسی کاریں مل سکتی ہیں۔ گلمرگ میں قیام کے دوران جلانے کی لکڑی اور خوراک کا راشن ملتا رہے گا۔ سنہ ۱۹۵۷ء کے دوران کچھ معیاری ہوٹلوں اور ایک اچھے ڈاک بنگلہ کے سال بھر کھلا رکھنے کا اہتمام کیا جائے گا۔ اسی طرح گلمرگ میں محکمۂ ٹورزم کے دفاتر، پوسٹ آفس اور دیگر متعلقہ دفاتر بھی بارہ مہینے کے لئے کھلے رہیں گے۔ ہم گلمرگ کو اس کی شایانِ شان خوبصورتی سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں ہم سیاحوں، مقامی باشندوں اور حکومت کے باقی محکمہ جات سے سرگرم اور پُرجوش تعاون کے طلبگار ہیں۔

بخشش علی محمد

نئے سکّے ـــ تعارفی جائزہ

تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ اعشاریہ طرز کے سکّوں کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ ایشیا میں اس وقت تک ہندوستان اور پاکستان کے سوا سارے اہم ملکوں نے اعشاریہ سکّے جاری کئے ہیں۔ اور غور و خوض کے بعد اور خاص فوائد کے پیش نظر پلاننگ کمیشن، سٹیٹ حکومتوں، علمی اداروں، چیمبرس آف کامرس اور تجارتی اداروں سے مشورہ کر کے اب حکومت ہند نے بھی اپریل ۱۹۵۷ء سے اعشاریہ طریقہ کے سکّے جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سکّے کی اصلاح کافی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے ساتھ ہماری زندگی وابستہ ہے۔ لہٰذا ایسی اصلاح کے لئے اس مسئلہ کو سمجھنا اور اس پر غور و خوض کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نئے سکّے کو سمجھنے میں کافی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ اسی لئے حکومت نئے سکّے کے طریقہ کو کافی پبلسٹی دیگی اور مختلف طریقے اور ذرائع استعمال کر کے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی جائیگی۔ سکّے کے تبادلے کے لئے مبادلے کے پیمانے یا فہرست مشتہر کئے جائینگے

جہاں تک موجودہ سکّے کا تعلق ہے تین سے چار سال تک نئے سکّے کے ساتھ چلیگا۔ ایک روپے، اٹھنی، چونی کے سکوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئیگی صرف روپے کے ۶۴ پیسوں کے بجائے ۱۰۰ پیسے ہوں گے۔ اس نئے سکّے میں ۲، ۵، ۱۰، ۲۵، ۵۰ کے ذو اضعاف ہوں گے۔ اس عبوری دور میں یعنی تین سے چار سال تک جبکہ یہ دونوں سکّے مارکیٹ میں دستیاب ہونگے نئے سکّے کی سکیم کے تحت پیسے کو "نیا پیسا" کہا جائیگا، اور اس کے بعد جب پرانے سکّے رفتہ رفتہ واپس لئے جائیں گے تو نئے پیسے کو "پیسا" کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔

موجودہ سکّے کے مطابق ہم دولت یا دھن کا روپوں، آنوں اور پیسوں میں شمار کرتے ہیں۔ ہم روپے کے ۱۶ آنے یا ۶۴ پیسے یا ۱۹۲ پائی گنتے ہیں۔ اب ہمارے سکّے کو اور آسان، سادہ اور سبھوں کے موافق بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور نیا سکّہ جاری کرنے سے یہ مقصد پورا ہو جائیگا جیسا آپ جانتے ہوں گے کہ اعشاریہ طریقے کا مطلب ہے ۱۰ کے تعداد میں ایک ایک حصہ کو گننا۔ اس کے سوا بھی ہم ایک سے دس تک گنتی کرتے ہیں لیکن جب ہم لکھتے ہیں تو دس، سو اور ہزاروں میں ہی لکھتے ہیں۔

اعشاریہ سکّے کے مطابق اب ایک روپے کے سو حصے ہوں گے اس میں یہ نیا ایک عدد "نیا پیسا" کہلائے گا۔ موجودہ روپے ایک معیاری سکّے کی حیثیت سے رہیگا۔ اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ نہ ہی اس کی قدر و قیمت میں کوئی فرق آئیگا۔ لیکن جہاں اس کی قیمت ایک روپے کے برابر ہی رہے گی، وہاں اس نئے اعشاریہ سکّے کے قاعدے کے تحت اس روپے کے ۱۶ آنے یا ۶۴ پیسے یا ۱۹۲ پائیوں کے بجائے ۱۰۰ نئے پیسے ہوں گے نئے اعشاریہ سکّے کے مطابق جو نئے سکّے ہوں گے وہ یہ ہیں:۔ ۱ روپے جسکے ۱۰۰ پیسے آئیں گے۔ نصف روپے جو پچاس نئے پیسوں کے برابر ہوگی۔ ایک روپے کا چوتھائی حصہ جس میں ۲۵ پیسے ہوں گے۔ ان کے علاوہ وہ نئے سکّے بھی رائج کئے جائیں گے جو روپے کے چوتھائی حصے سے کم ہیں۔ روپے کا دسواں حصہ ۱۰ نئے پیسوں کے برابر ہوگا۔ روپے کا بیسواں حصہ ۵ نئے پیسوں کے برابر ہوگا۔ روپے کا پچاسواں حصہ ۲ نئے پیسوں کا ہوگا اور روپے کا سواں حصہ ۱ نئے پیسے کا ہوگا۔

جیسا کہ ظاہر ہے اس نئے سکّے کے مطابق ۵۰ پیسے موجودہ آٹھ آنے کے برابر ہوں گے، روپے کا ایک چوتھائی حصہ یعنی ۲۵ پیسے چونی کے برابر ہوں گے۔ اور موجودہ آنوں پیسوں کی جگہ نئے سکّے کے مطابق ۱، ۲، ۵، ۱۰ نئے پیسے روپے کے چوتھائی حصے سے کم ہوں گے۔ یہ نئے سکّے اپریل ۱۹۵۷ء

سے مارکیٹ میں دستیاب ہوں گے۔ لیکن ارادہ ہے کہ پہلے 'نیا پیسا' ۲، ۵، ۱۰ نئے پیسے کے سکّے چلائے جائیں گے۔ اور ۲۵، ۵۰ اور نئے پیسے کے سکّے کسی دوسری تاریخ پر جاری کئے جائیں گے۔ اُس وقت تک چونّی، اٹھنّی اور ایک روپے کے موجودہ سکّے بالترتیب ان نئے سکّوں کے برابر مانے جائینگے اور استعمال میں لائے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی موجودہ آنے پیسے کے سکّے بھی کم ازکم تین سال کے عرصے تک مروج رہیں گے۔ اس دوران میں دونوں سکّوں سے خرید و فروخت ہوگی اور تمام لین دین پرانے سکّوں یا نئے سکوں سے یا ان دونوں سکّوں سے ہوگا۔ اُمید ہے کہ تین سال کے عرصے کے اختتام پر یہ ممکن ہوگا کہ پرانے سکّے کو پوری طرح واپس لیا جائے

نئے سکّوں کی ساخت یا صورت

ایک روپیہ، نصف روپے روپے کا چوتھائی حصہ اور ایک پیسہ یعنی 'نیا پیسا' کے سکّے گول ہوں گے۔ ۲، ۱۰ پیسے کے سکّے کے کنارے پر قلعہ دار دائرے بنے ہوئے ہوں گے، اور نئے ۵ پیسے کا سکّہ مربع ہوگا۔ ایک سو پیسے، ۵۰ پیسے اور ۲۵ پیسے کے سکّے نکل (NICHEL) یعنی سفید دھات کے ہوں گے، اور ۲، ۵، ۱۰ پیسے کے سکّے تانبے اور نکل کے بنے ہوں گے۔ ان سکّوں میں تانبا ۷۵ فیصدی اور نکل ۲۵ فیصدی ہوگا، اور 'نیا پیسا' کانسے کا بنایا جائے گا۔

پرانے اور نئے سکّوں کا تبادلہ

جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ ایک روپے کے سو پیسے نصف روپے کے ۵۰ پیسے اور ایک چوتھائی حصے کے ۲۵ پیسے ہوں گے، اب اگر آپ روپے کے ایک چوتھائی حصے سے کم ریزگاری چاہیں۔ اس وقت آپکو پرانے سکوں کے عوض کیسے اور کس پیمانے پر نئے سکّے ملیں گے وہ مندرجہ ذیل فہرست یا پیمانے میں دیا گیا ہے۔

پرانے سکّے　　　نئے سکّے

۱ پیسہ سے ایک وقت پر مبادلہ ۲ نئے پیسوں سے ہوگا۔
۲ 〃 〃 〃 〃 〃 ۳ 〃 〃 〃 〃
۳ 〃 〃 〃 〃 〃 ۵ 〃 〃 〃 〃

۱ آنہ سے ایک وقت پر مبادلہ ۶ نئے پیسوں سے ہوگا۔
۱ آنہ ۱ پیسہ 〃 〃 〃 〃 ۸ 〃 〃 〃 〃
۱ آنہ ۲ پیسہ سے ایک وقت پر مبادلہ ۹ 〃 〃 〃 〃
۱ آنہ ۳ پیسہ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۱ 〃 〃 〃 〃
۲ آنے 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۲ 〃 〃 〃 〃
۲ آنے ۱ پیسہ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۴ 〃 〃 〃 〃
۲ آنے ۲ پیسہ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۶ 〃 〃 〃 〃
۲ آنے ۳ پیسہ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۷ 〃 〃 〃 〃
۳ آنے 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۹ 〃 〃 〃 〃
۳ آنے ۱ پیسہ 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۰ 〃 〃 〃 〃
۳ آنے ۲ پیسہ 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۲ 〃 〃 〃 〃
۳ آنے ۳ پیسہ 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۳ 〃 〃 〃 〃
۴ آنے 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۵ 〃 〃 〃 〃

ریزگاری میں شمار کرتے وقت ایک بات کا خیال رکھیں وہ یہ کہ پہلے روپے کا ایک چوتھائی حصہ لیجئے، یہ ظاہر ہے ۲۵ نئے پیسوں کے برابر ہوگا، اس کے بعد جو کچھ باقی بچے اس سے اوپر دئے ہوئے پیمانے کیطابق جانچ لیں، آپ پورا حساب لگاکر شاید یہ دیکھیں گے کہ آپ کو قدر سے کم یا زیادہ ریزگاری ملی، یہ اس لئے ہے کہ اس سکّے میں ایک پیسے سے کم کوئی بھی سکّہ نہیں ہے۔ اس مشکل کو دُور کرنے کے لئے ہم روپے کے چوتھائی حصے کی ریزگاری جو کہ ۲۵ نئے پیسوں پر مشتمل ہوگی سے مدد لے سکتے ہیں۔ اور ہم چھوٹے پیمانے پر لین دین کر سکتے ہیں۔

دراصل آپ کے روپے کی نہ تو قیمت کم ہو جائے گی اور نہ آپ کو اسے زیادہ کچھ ملے گا۔ صرف فرق یہ ہوگا کہ ۱۶ آنے ۶۴ پیسے یا ۱۹۲ پائیوں کے بجائے یہ روپے ۱۰۰ نئے پیسوں میں منقسم ہوگا۔ نیچے دئے ہوئے پیمانے میں دکھایا گیا ہے کہ اعشاریہ سکّوں کی برابر اور ٹھیک قیمت موجودہ ایک پیسے سے ۲ آنے تک کیا ہے۔

COINS	EXACT DECEMAL IN NAYA PAISA.	EXCHANGE VALUE IN NAYA PAISA WHEN LENDERED BY ITSELF IN A SINGLE TRANSACTION
I pice.	1.5626 Naya paisa.	2 Naya paisa.
½ Anna.	3.125 " " .	3 " " .

1 Anna.	6.25 naya paisa.	6 naya paisa.
2 Anna.	12.5 " " .	12 " " .

جب ایک سے زیادہ سکے آنوں یا پیسوں میں لین دین یا خرید و فروخت کرنے کے لئے ادا کرنے ہوں تو تبادلہ ایک ایک سکے سے نہیں بلکہ کل خرچہ لگا کر کرنا چاہیئے، اوپر دیا ہوا پیمانہ پیسے اور آنوں کو نئے پیسوں میں مبادلہ کرنے کے لئے مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

تبادلہ کرنے کی سہولیات

تبادلہ کرنے کے لئے ریزرو بنک آف انڈیا کے برانچ، بنک ایجنسیوں اور خزانوں سے سہولیات بہم پہنچائی جائینگی۔

ہمیں چاہیئے کہ تبادلہ کرنے کے پیمانے کو جو کہ حکومت مشتہر کریگی اپنے کسی وقت کے لئے موجود رکھیں۔ تاکہ ہم ان سے وقت ضرورت مدد لے سکیں اور دوسروں کے لئے بھی خود کو اور اس فہرست کو مددگار ثابت کر سکیں۔ خاصکر لکھے پڑھے لوگوں کو چاہیئے کہ وہ ناخواندہ لوگوں کی بھی امداد کریں اور ان کو اعشاریہ سکے سے متعلق اہم باتیں سمجھائیں۔

تبادلہ کے پیمانے کو کسطرح استعمال میں لایا جا سکتا ہے

آپ نیچے دئے ہوئے پیمانے کے عمود میں آنوں کو پہلے کالم میں دیکھیں، اس کے بعد جتنے پرانے پیسے یا پائی باقی رہتے ہیں ان کو متوازن طور پائیوں کے کالم دیکھیں اور اس کے سیدھ میں نئے پیسوں کے کالم میں عموداً دیکھ کر جہاں یہ دو کالم یعنی پائیوں کا کالم اور نئے پیسے کا کالم ملتے ہیں وہاں پر جس طرح دکھایا گیا ہے، وہی آپ کی رقم کا ٹھیک اور برابر نئے سکے میں تبادلہ ہو سکتا ہے۔

PIES پائی	۰	۳	۶	۹
ANNAS آنے	NAYA	PAISA		نیا پیسا
۰	۰	۲	۳	۵
۱	۶	۸	۹	۱۱
۲	۱۲	۱۴	۱۶	۱۷
۳	۱۹	۲۰	۲۲	۲۳
۴	۲۵	۲۷	۲۸	۳۰
۵	۳۱	۳۳	۳۴	۳۶
۶	۳۷	۳۹	۴۱	۴۲
۷	۴۴	۴۵	۴۷	۴۸
۸	۵۰	۵۲	۵۳	۵۵
۹	۵۶	۵۸	۵۹	۶۱
۱۰	۶۲	۶۴	۶۶	۶۷
۱۱	۶۹	۷۰	۷۲	۷۳
۱۲	۷۵	۷۷	۷۸	۸۰
۱۳	۸۱	۸۳	۸۴	۸۶
۱۴	۸۷	۸۹	۹۱	۹۲
۱۵	۹۴	۹۵	۹۷	۹۸
۱۶	۱۰۰			

اس تبادلے کے پیمانے کو اسی وقت استعمال کریں جبکہ آپ کو واقعی روپے ادا کرنے ہوں۔ موجودہ سکے کو نئے پیسوں میں مبادلہ کرنے میں اور لین دین چکانے کے لئے یہ فہرست اپنے سامنے رکھیں۔

اگر پرانے سکے نئے سکوں یا نئے سکوں کو پرانے سکے میں تبدیل کرنا ہو تو ایک روپے کو ۱۰۰ نئے پیسوں کے برابر ماننا چاہیئے یا آنوں یا پیسوں میں ان کا شمار کرنا چاہیئے۔ نصف نئے پیسے کو شمار میں نہیں لانا چاہیئے اور نصف سے زیادہ پیسے کو پورا پیسا قرار دینا چاہیئے۔ فرض کیا، آپ کو ایک درجن پنسل خریدنے ہیں اگر پنسل کی قیمت ڈیڑھ آنہ ہو، تو اس کے لئے ٹھیک طریقہ یہ ہوگا کہ ۱½ کو ۱۲ سے ضرب دیں، اس طرح یہ رقم ایک روپے دو آنے بن جائیگی اسکے بعد مبادلے کے پیمانے سے دو آنوں کے برابر نئے پیسے نکالئے، اس سے آپ کو پتہ چلیگا کہ ۲ آنے ۱۲ نئے پیسوں کے برابر ہیں، لہذا آپ ایک روپے اور ۱۲ نئے پیسے ادا کریں گے۔ پہلے ۱½ کے برابر نئے پیسے نکالنا اور اس کے بعد اسے ۱۲ سے ضرب دینا غلط طریقہ ہے۔ دیگر الفاظ میں برابر رقم کی ادائیگی آخری طبقے پر ہونی چاہیئے۔ اس طرح اگر آپ کوئی چیز آنوں یا پیسوں کے عوض خریدنا چاہیں تو پہلے کل خرچہ یا قیمت نرخ کے مطابق لگائیں، مثلاً اگر آپ کو ۸ روپے ۲۰ پیسے ادا کرنے ہیں تو پیمانہ سے پتہ چلیگا کہ ۱۹ نئے پیسے

تین آنوں کے برابر ہیں ۳ آنے ادا کریں اور باقی ایک نیا پیسہ یا تو نئے سکے میں دیا جائے گا یا پرانے پیسے سے ہی اس کا لین دین ہو سکتا ہے۔

اعشاریہ سکے کی سکیم ہمارے لئے کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے لاگو ہونے سے ہماری قوم کو کافی فائدہ ہوگا خاصکر آنے والی نسل اسے کافی مستفید ہو سکتی ہے۔ قومی تعمیر تمام چیزوں سے بالاتر ہے۔ ملک اور قوم کو تعمیر کرنے میں وقت اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم نے تھوڑے وقت میں اور کم مشقت سے زیادہ سے زیادہ کام عمل میں لانا ہے۔ نئے سکے کا لاگو کرنا ہمارے ملک و قوم کو بنانے کی طرف ایک اہم قدم ہے جس کو ہم نے تھوڑے سے وقت میں ہی کامیاب بنانا ہے۔ باقی ترقیاتی سکیموں کی طرح اس سکیم کے لئے بھی لوگوں کی امداد بہت ضروری ہے۔

ہند سے اِلحاق کیوں ؟

یہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ ریاست کشمیر جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، پاکستان کی بجائے ہند سے الحاق کو کیوں ترجیح دیتی ہے۔ حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد مجھے اس کا موزون ترین جواب یہ سوجھا ہے کہ پاکستان سے ہزاروں مسلم پناہ گزین چوری چھپے بھاگ کر کشمیر میں پناہ لینے آئے جیس مجھے کئی پناہ گزین کنبوں سے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ جنہوں نے میرے سامنے پاکستان کی خستہ حالی بیان کی، جبکہ پاکستان میں سرکار کی آمدنی کا سب سے زیادہ حصہ دفاعی اخراجات پر ضائع کیا جا رہا ہے۔

کشمیر آنے سے پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ کشمیر کا مسئلہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی نوعیت کا مسئلہ ہے لیکن اس کے برعکس مجھے یہاں وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ یگانگت اور مذہبی رواداری نظر آئی۔ سرینگر میں میں نے ایک ہی چھت کے نیچے ہندوؤں کے ایک مندر اور مسلمانوں کی ایک مسجد کو دیکھا ہے جو آج سے صدیوں پہلے تعمیر کئے گئے ہیں۔ وقت کی کمی کے باعث میں مذہبی رواداری کی ایک ہی مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ بازاروں، مسجدوں اور مندروں میں مختلف لوگوں سے بات چیت کرنے کا موقع ملا ہے۔ مجھ پر یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ ریاست کے تمام لوگ ہند کے ساتھ الحاق کو پسند کرتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کا سبب ہند میں آزادی اور مذہبی رواداری کی موجودگی ہے جب کہ پاکستان ایسے رجعت پسند ملک میں جہاں حکومت کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی ہے، آزادی اور مذہبی رواداری نہیں پائی جاتی۔

ریاست کے لوگوں کے نزدیک کشمیر نام کا کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں دیگر لفظوں میں وہ سیکولر اور جمہوری ہند کے شہریوں کے طور پر رہنا چاہتے ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ تو صرف غیر ملکی افراد کے لئے ہی ہے اور بعض غیر ایشیائی غیر ملکی طاقتیں اسے ایک حقیقی مسئلہ سمجھنے میں پاکستان سے بھی آگے ہیں ایشیائی طاقتیں اس امر کو بخوبی سمجھتی ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ کشمیر کے لوگوں کو ہی حل کرنا ہے۔ روس کی بھی یہی رائے ہے۔ مسٹر کروسچیف نے دسمبر ۱۹۵۵ء میں یہ اعلان کیا تھا کہ کشمیر کے لوگ ہند جمہوریہ کی ایک ریاست کی حیثیت سے کشمیر کے سوال کو پہلے ہی حل کر چکے ہیں۔

کشمیر کا مسئلہ مغربی سامراجی طاقتوں کے ذہن کی پیداوار ہے جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے پاکستان انگریزوں کا پیدا کردہ ہے جب انگریز ہندوستان سے نکلنے پر مجبور ہو گئے تو انہوں نے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا سامراجیوں کو ہندوستان کے جمہوریت پسند لیڈروں پر اعتماد نہیں تھا۔ اس کے برعکس انہیں پاکستان کے رجعت پسند مسلم لیگی لیڈروں پر بہت اعتماد تھا تقسیم کے وقت کشمیر کو بھی دوسری ریاستوں کی طرح اپنی مرضی سے ہند یا پاکستان سے الحاق کرنے کی اجازت تھی۔ کشمیر نے ہند کا انتخاب کیا، اور پاکستان نے کشمیر پر حملہ کیا۔ اس پر حکومت کشمیر نے ہند سے امداد مانگی اور یہاں لڑائی چھڑ گئی۔ کچھ دیر بعد لڑائی بند کر دی گئی۔ ہند نے اتحادی سبھا سے اپیل کی کہ پاکستانی فوجوں کو کشمیر کے علاقہ سے ہٹایا جائے۔

(اطالوی اخبار نویس مسٹر لانگون کے بیان کا اقتباس)

محمد یوسف ٹینگ

پانچسالہ منصوبہ — صنعتی پہلو

جموں وکشمیر کی ریاست معدنی دولت اور صنعتوں میں استعمال کئے جانے والے خام مواد کے معاملے میں کافی خوش قسمت ہے اور یہاں پر اس قسم کا مسالہ اتنی کثرت سے موجود ہے کہ اس کی بنیاد پر ایک شاندار صنعتی ڈھانچے کو ترتیب دی جاسکتی ہے، مگر یہ امر باعث تاسف ہے کہ ہندوستان میں بیرونی اقتدار کے طویل عرصہ میں جبکہ ریاست کے اندر ایک مطلق العنان راجواڑہ شاہی نظام قایم تھا۔ ان ذخیروں کو کام میں لانے اور ریاست کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنے سکے لئے کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں پایا۔

ریاست کی اقتصادیات میں دستکاریوں کا جز اہم مقام رہا ہے، وہ تاریخ کے کسی طالب علم کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کشمیر کو بجا طور اپنے صناعوں اور ان کے عظیم فن پر فخر حاصل ہے۔ بدقسمتی سے ماضی میں حکومت کی طرف سے دستکاریوں اور باقی صنعتوں کی مربوط سرپرستی کے کام پر توجہ نہیں دی گئی جس سے یہ فن کار عسرت اور غربت کی آغوش میں پلتے رہے، اور اُن کے فنون کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی رہی جس کی انتہا یہ ہے کہ یہ کاریگر دن بھر کی محنت کے بعد بھی دو وقت کی روٹی میسر نہ کر سکتے۔ لے دے کے موسم گرما کے چند مہینوں میں سیاح کچھ چیزیں لے جاتے تھے اور جاڑے کے باقی مہینوں میں دست کاروں کی یہ بہت بڑی تعداد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی موجودہ حکومت کو ان تمام امور کا احساس ہے، چنانچہ اس غرض کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت اُن اقدامات پر توجہ دی جارہی ہے جو ریاست کو صنعتی ترقی کی راہ پر لے سکیں۔ اس سلسلے کا ایک بڑا اقدام محصول کی معافی ہے جس کی بدولت ریاست کی تجارت اور صنعت کے لئے ترقی کے نئے دروازے کھُل گئے ہیں۔ تجارت اور صنعت کی ترقی کے لئے اس اقدام کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ یہ ریاست کا سب سے بڑا بالواسطہ ٹیکس تھا بہت سی اشیاء کے معاملے میں اشیاء کی قیمت کا پچاس فیصدی محصول کے طور پر وصول کیا جاتا تھا۔

چھوٹے پیمانہ کی صنعتیں

اون، ریشم، تارپین اور ڈرگ ریسرچ کی صنعتوں کو نئے سرے سے منظم کیا گیا، اور اُن کو پہلے کی نسبت بہت زیادہ وسیع پیمانے پر چالو کیا گیا۔ گھریلو دست کاریوں، جو پہلے نظر انداز کی گئی تھیں، کے احیائے نو کے لئے حکومت کی طرف سے خاص امدادی اقدامات کئے گئے۔ تمام ریاست میں ایسے دوسو سے زیادہ مرکز قایم کئے گئے ہیں۔ جہاں مختلف دستکاریوں کو منظم طریقے سے چلایا جاتا ہے اور اُن کی نمائش کی جاتی ہے۔ ان مرکزوں پر فنون کے معاملے میں جدید اور ترقی یافتہ اختراعات کو بھی متعارف کیا جارہا ہے۔ سری نگر کے قریب جدید طرز کا ایک چمڑے کا کارخانہ کھولا گیا ہے۔ یہ کارخانہ اُن کھالوں اور چمڑوں کو استعمال میں لائیگا۔ جو پہلے بھاری مقدار میں ریاست سے برآمد کی جاتی تھیں۔ حال ہی میں اس کارخانے میں بوٹ بنانے کا ایک یونٹ بھی کھولا گیا ہے، اس کے علاوہ جن چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی طرف توجہ دی جارہی ہے، اُن میں ہینڈ لوم بنانے کا مرکز (ہیرانگر) پشمینہ کے کام کا مرکز (بسوہلی) ہاتھ کا بنا ہوا کاغذ بنانے کا کارخانہ (میراں صاحب) اور اون کی اشیاء کے مراکز (کشتواڑ۔ رام نگر اور سانبہ) شامل ہیں۔ طالب علموں کو لڑیوہڈرم، شانتی نکیتن اور امرتسر بھیجا گیا ہے تاکہ وہ ان صنعتوں کی مختلف شاخوں میں کام کرنے کی تربیت حاصل کرسکیں۔

پشمینہ انڈسٹری

یہ ریاست کی مشہور صنعت ہے، مگر اس کا اِس

کے کرایوں میں کمی کرنے کے ساتھ ساتھ نئی سڑکوں کی تعمیر سے تجارت اور آمد و رفت کے وسیع امکانات پیدا ہوئے۔ اسی عرصہ میں ساڑھے چار سو میل لمبی سڑکیں تعمیر ہوئیں۔ پونے پانچسو میل لمبی سڑکوں کی مرمت کی گئی۔ اور چار ہزار پانچسو فٹ تک کی لمبائی کے نئے پل تعمیر ہوئے۔ میرا گڑھ، لوپچھہ، اودھم پور بانڈی پورہ، بیجبہاڑہ، اننت ناگ اور کئی دوسرے علاقوں کو بجلی مہیا کی گئی کشمیر میں دس قصبوں کو پینے کا پانی مہیا کیا گیا۔ جموں میں دس مقامات پر ٹیوب ویل کھدوائے گئے اور نہری پانی سے دیہات کے دیہات سیراب کئے گئے۔ لفٹ اریگیشن کی سکیموں سے ہزاروں ایکڑ غیر آباد زمین کو آباد کیا گیا۔ دیہات اور شہروں میں بجلی اور زیادہ پانی کی بہم رسانی کے کاموں پر لگ بھگ ساڑھے تین کروڑ روپے خرچ کئے گئے۔ جموں میں ویٹرنری لیبارٹری کھولی گئی۔ مویشیوں کے فارم بنائے گئے۔ شیپ بریڈنگ اور ریسرچ سنٹر جاری کئے گئے۔ مویشیوں کی دیکھ ریکھ کے لئے ۲۱ تحصیل ویٹرنری یونٹ اور ۲۴ سب یونٹ قائم کئے گئے۔ اس کے علاوہ گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے تحفظ اور نشوونما کے لئے لگ بھگ ۴۹ لاکھ روپے صرف کئے گئے۔

اسی طرح پہلے پانچسالہ پلان کی وساطت سے ریاست میں ایک نئے سماج کی تعمیر کے ڈھانچے کی بنیادیں استوار کر دی گئیں۔ اس پلان کی بدولت عوام الناس کی بہتری اور بہبودی کی تحریک جتنی وسیع ہوتی گئی۔ اتنا ہی عوام بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس پلان کے مقاصد کو پورا کرنے کے کاموں میں سرگرمی دکھاتے رہے۔ پہلے پانچسالہ پلان کی کامیابی کا نتیجہ ہے کہ آج دوسرے پلان کو مکمل کرنے کے لئے ریاست میں ہر گوشے اور ہر حلقے کے لوگ قومی ترقیاتی کاموں میں متواتر سرگرم عمل ہو رہے ہیں۔ اور اپنی معاشی اور تہذیبی ترقی کی تیز رفتار سے نشوونما کے تمام تقاضے پورے ہو رہے ہیں۔ پانچسالہ پلان کے تحت دیہات میں قومی توسیعی سروس اور کمیونٹی پروجیکٹ بلاکوں کے قیام سے دیہات سدھار اور سماجی بہبود کے کام کرنے والے کارکنوں کی ایک بڑی کھیپ پیدا ہوئی ہے جو پانچسالہ پلانوں کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے ذریعوں اور طریقوں کی مکمل سوجھ بوجھ اجاگر کرنے کے لئے عوام کو متحرک کر رہے ہیں۔

پہلے پانچسالہ منصوبے میں عوامی بہبودی کے جو کام ہو پائے ہیں، ریاستی سرکار ان پر ہی قانع نہیں۔ ریاست میں عوام کے ہر حلقے کی مانگوں کو افراط کے ساتھ پورا کرنے کے لئے اناج کی پیداوار بڑھانے کے لئے صحت عامہ اور علم و حرفت کے ارتقاء کے لئے اور ناخواندگی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرنے کے لئے تن دہی اور جوش و خروش کیساتھ تیسرے پانچسالہ پلان پر عمل در آمد شروع کیا جا رہا ہے۔

دوسرے پانچسالہ پلان میں اکاون کروڑ تاسی لاکھ روپے خرچ کرنے کا اندازہ ہے اسمیں ۳ کروڑ روپے صحت عامہ پر۔ ۴ کروڑ روپے تعلیم پر۔ ۷ کروڑ ۴۴ لاکھ روپے زراعتی کاموں پر۔ ۳ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے آبپاشی کے ذرائع کو وسعت دینے پر۔ چھ کروڑ روپے سڑکوں اور ٹرانسپورٹ پر بارہ کروڑ روپے جموں میں کنڈی علاقہ کے لئے نہر کی کھدائی پر۔ ۳ کروڑ روپے سیلاب کی روک تھام کی تدابیر پر۔ ۳ کروڑ روپے بجلی پیدا کرنے پر۔ ایک کروڑ روپے ٹورسٹ انڈسٹری پر۔ صنعتوں کی دیکھ ریکھ پر ایک کروڑ، ۴۴ لاکھ روپے سمال سکیل انڈسٹری کے پھلنے پھولنے کے امکانات بڑھانے کے کاموں پر ۳ کروڑ ۴ لاکھ روپے۔ ہوسنگ سکیم پر ایک کروڑ روپیہ۔ سڑکوں کی بہتری کے لئے ۵۰ لاکھ روپے۔ پسماندہ علاقوں کی بہتری کے لئے ۹۹ لاکھ ۲۷ ہزار روپے اور لوکل باڈیز کے ترقیاتی منصوبوں پر ایک کروڑ ۳۹ لاکھ روپے خرچ کئے جائیں گے۔

ریاستی عوام نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ دوسرے پلان کا خیر مقدم کیا ہے۔ اس پلان میں ایک ایسی کوشش ہے، جس نے ہر حلقہ کو ریاست میں معاشی زندگی کی نئی ترتیب اور تنظیم کے کاموں میں گہری دلچسپی کی طرف مائل کیا ہے۔

حدیثِ دیگراں

"راجستھان بھون"

دارالشفاء ۔ حیدرآباد، دکن ۔ ۴ فروری ۱۹۵۷ء

مکرمی تسلیم

"تعمیر" کا جنوری کا شمارہ ملا۔ اس سے قبل مجھے اس کا کوئی شمارہ نہیں ملا تھا۔ سب سے پہلے تو میں آپ کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ اُردو رسائل کے اس قحط کے زمانے میں آپ نے اتنا اچھا اور معیاری پرچہ نکالا توقع ہے کہ آپ اسے جاری رکھنے میں کامیاب ہوسکیں گے، اور زیادہ سے زیادہ ادیبوں کا اس کے لئے تعاون حاصل فرمائیں گے۔

آپ کے "مہجور نمبر" کے لئے مہجور پر ایک مضمون کا ارادہ رکھتا ہوں جو اب کافی طویل ہوگیا ہے۔ ان کی کئی عشقیہ اور سیاسی نظموں کے اقتباسات اسمیں شامل کر دئے ہیں۔

مخلص ۔ سری نیواس لاہوٹی

---

۱۰۰ / اسے معظم پورہ

حیدرآباد ۔ دکن ۔ ۴ فروری ۱۹۵۷ء

محترم تسلیم!

کافی انتظار کے بعد "تعمیر" کے دو شمارے ملے۔ شکریہ!

"تعمیر" کو آپ بڑی خوبصورتی اور سلیقے سے شائع کر رہے ہیں، یہ تو کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ تعمیر میں کشمیر کی مہک اور اس کا پس منظر نمایاں ہے۔ یہ چیز عام طور سے اردو رسالوں میں مفقود ہوتی ہے مثلاً حیدرآباد یا یو۔ پی سے شائع ہونے والے پرچے ادب کی نمائندگی تو کرتے ہیں۔ لیکن اپنے علاقے کی اُن پر کوئی چھاپ نہیں ہوتی۔ اس لحاظ

سے "تعمیر" بے حد پسند آیا۔ مبارکباد قبول فرمائیے۔

بچوں کے ساتھ ساتھ آپ نے خواتین کو جن دو صفحوں سے بہلانے کی کوشش کی ہے میں اُس سے بالکل متفق نہیں ہوں۔ آپ حضرات خواہ مخواہ لوک راج کے مارے خواتین کو دو صفحات کی خیرات دیکر اپنے فرائض سے عہدہ برا ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ "ہم بیچاری خواتین" پڈنگ کی ترکیبوں اور بال بڑھانے کے نسخوں کو ان صفحات پر دیکھ دیکھ کر اتنی بے حس ہوچکی ہیں کہ اب مزید "آسان نسخے" بھی ہمیں بالکل نہیں چونکاتے۔

کاش آجکل خواتین کی زندگی بھی صرف ان ہی موضوعات تک محدود ہوتی جو عموماً خواتین کے صفحات پر پیش کئے جاتے ہیں!

جیلانی بانو

ریزیڈنسی روڈ

جموں ۔ یکم مارچ ۱۹۵۷ء

عزیزم!

"تعمیر" کا فروری کا شمارہ ملا۔ ابھی اسے صرف ایک نظر دیکھا ہے اس پرچے کے متعلق تفصیلی رائے سری نگر آکر دوں گا۔

جنوری کے شمارے کی بہت بڑی خصوصیت اس کا توازن ہے۔ ۲۶ جنوری پہ کمال کی نظم نئے آئین ہی کو نہیں نئے کشمیر کو بھی خراجِ عقیدت ہے راہی کی نظم "وادیِ حیات" میں الفاظ کی شعبدہ گری زیادہ ہے اور تاثر کی شدت کم۔ سہیل کی کہانی "غیرت" بڑی خوبصورت کہانی ہے۔ مجھے یہ کہانی موضوع اور تکنیک کے لحاظ سے بہت پسند آئی۔ کتابت اور طباعت میں اور اچھا ہونے کی گنجائش موجود ہے۔

گو یہ پرچہ گذشتہ شماروں سے ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ ابھی تم مبارکباد کے مستحق ہو۔ تم سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔

تمہارا ۔ نصراللہ

دارالمصنفین اعظم گڈھ ۔ ۷ مارچ ۱۹۵۷ء

مکرمی ۔ السلام علیکم

تعمیر کے دو نمبر بھیجئے۔ کشمیر کا جنت نظیر خطہ ایک زمانہ میں علم و فن اور شعر و ادب کا بھی مرکز رہ چکا ہے، یہ دیکھکر مسرت ہوئی کہ آپنے ان روایات کو زندہ کرنیکی کوشش کی ہے تعمیر اگرچہ ظاہری و معنوی دونوں حیثیتوں سے اردو کے اچھے ادبی رسالوں سے کم نہیں ہے لیکن ابھی اس کو اور بھی مفید اور دلچسپ بنانیکی کوشش کیجئے کشمیر کی پرانی علمی و ادبی تاریخ اور اس کے آثار پر لکھنے کی بڑی گنجائش ہے۔ معارف تبادلہ میں جاری کر دیا گیا ہے۔

معین الدین احمد ندوی

کاشانۂ وفا

پورنیہ سیٹی ۔ بہار ۔ ۴ مارچ ۱۹۵۷ء

محترمی ۔ تسلیم

" مہذب اردو لائبریری" پورنیہ سیٹی کے سکریٹری کے نام تعمیر کا ایک شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ!

اس میں شک نہیں کہ آپ کا موقر جریدہ ہندوستان کے چند معیاری جرائد کی مختصر فہرست میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ لکھنے والے سب کے سب ادیب نہ سہی مگر جو اس شمارہ میں شامل ہیں، ان کی نگارشات قابل تحسین ہیں۔ نظم و غزل کا حصہ البتہ کچھ پھیکا پھیکا سا ہے۔ کچھ کتابت اور اس سے زیادہ طباعت کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں اعلیٰ معیاری جرائد کی طرف سے جو بے اعتنائی برتی جارہی ہے اور عوام کا ذوقِ مطالعہ جس قدر پست ہوگیا ہے مجھے اسکا بخوبی اندازہ ہوچکا ہے۔

تعمیر چونکہ حکومت کشمیر کے زیر سایہ نکل رہا ہے۔ اس لئے اُمید ہے کہ آپ مالی کش مکش سے بے پرواہ ہو کر زبان و ادب کے لئے استقلال و پابندی کے ساتھ تعمیری کام انجام دیتے رہیں گے۔

اُمید ہے مزاج

خاکسار ۔ وفا

لاجپت نگر ۔ نئی دہلی

۱۹ فروری ۱۹۵۷ء

محترم تسلیمات

پچھلے ہفتے سرکاری کام سے دورے پر علیگڈھ گیا ہوا تھا، اپنے دوست خلیل اعظمی کی میز پر آپ کا پرچہ "تعمیر" دیکھا۔ پرچہ دیکھنے کے بعد ہی بے اختیار دل چاہا کہ آپ کو اور آپ کے ادارے کو اتنے حسین اور باوقار رسالے کے اجراء پر مبارکباد دوں۔ لیکن وقت نے اب تک فرصت نہ دی اور یہ بات آئی گئی ہوگئی۔ آپ نے جو کشمیر کے شعراء اور ادیبوں کو ہندوستانی ادیبوں سے متعارف کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔

جواب کا منتظر ۔

نیازمند ۔ کیلاش ماہر

انجمن ترقی ادب بڈگام کشمیر

۱۳ جنوری ۱۹۵۷ء

مدیر محترم ۔ تسلیمات

'تعمیر' کو اتنے کم عرصے میں آپ نے جس معیار پر پہنچا دیا ہے۔ اسکے لئے آپ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں اور بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اُردو کے بہترین جرائد میں سے ایک جریدے کی اشاعت کا فخر اب کشمیر کو بھی حاصل ہے۔

'تعمیر' دیہاتی دنیا میں بھی مقبول ہو رہا ہے۔ اگر آپ کشمیری زبان کی تخلیقات کے لئے کئی اور صفحات کا اضافہ کریں تو کتنا اچھا ہو۔ ہماری انجمن آپ کو اپنا مکمل تعاون پیش کرنے پر تیار ہے۔

آپ کا

شاہد ۔ آرگنائیزر

بچوں کا تعمیر

محمد شفیع

گدھا ـــــ جو شاعر تھا !

ایک گاؤں میں بہت سے گدھے تھے۔ ان میں صرف پانچ عقلمند تھے۔ انہوں نے بیوقوف گدھوں سے الگ اپنی ایک انجمن بنائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ گدھوں کے درمیان بھی عقلمند اور بیوقوف ہوتے ہیں۔ سارے گدھے بیوقوف نہیں ہوتے۔ ان پانچوں کے درمیان کچھ دنوں کے بعد ایک اور گدھا آگیا، شروع میں اس کا پتہ نہیں چلا کہ وہ کیا گدھا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ بات پانچوں گدھوں کو معلوم ہوگئی کہ جو گدھا نیا آیا ہے وہ بالکل گدھا ہے یعنی اوّل درجہ کا بے وقوف ـــ ! اب انہیں اس کی فکر ہوئی کہ اسے کیسے پریشان کیا جائے اور اسے کس غلط فہمی میں مبتلا کیا جائے، وہ گدھے اس بے وقوف گدھے سے مذاق کرنا چاہتے تھے۔

ان گدھوں نے ایک جلسہ کیا جس کی خبر اس نئے گدھے کو نہیں ہوئی۔ ایک گدھے نے کہا کہ " اچھی بات یہ ہوگی کہ اس بے وقوف گدھے کو درمیان سے نکال ہی دیا جائے۔" دوسرے نے کہا: " یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی، اس طرح تو بات صاف صاف ہو جائے گی۔ اور ہم لوگوں کا مقصد پورا نہیں ہوسکیگا " تیسرے نے کہا " میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے، اگر اجازت ہو تو عرض کروں "۔ سب نے کہا ضرور فرمائیے اس گدھے نے کہا " میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اسے اس کا احساس دلایا جائے کہ وہ ایک بہت بڑا شاعر ہے اور اس کی شاعری سے گدھوں کی دنیا کو ایک نئی فضا مل جائے گی، اس غلط فہمی میں مبتلا ہوکر وہ بدحواس ہو جائے گا " اس بات سے تمام گدھوں نے اتفاق کیا اور بے وقوف گدھے کو بلایا گیا۔ جب وہ گدھا آیا تو ایک گدھے نے کہا۔ " بھائی تم تو بہت عقلمند ہو ایک راز ہم لوگوں نے تم سے چھپائے رکھا " نیا گدھا گھبرا گیا۔ اس نے پوچھا " کون سا راز ہے ؟ " اس عقلمند گدھے نے کہا " تم ایک بہت بڑے شاعر ہو اور تمہاری شاعری کی دھوم ہے " پھر کیا تھا، وہ نیا گدھا خوشی سے جھوم گیا۔ ایک دوسرے عقلمند گدھے نے کہا۔ " ہم لوگ تو ایک شاعر دوست کے انتظار میں تھے، اب ہم تم پر فخر کریں گے، ہم لوگوں کا خیال ہے کہ کل سے تم دوسرے تمام گدھوں کے پاس جاؤ اور تمام انسانوں کے پاس جاؤ اور اپنی شاعری سناؤ تمہاری شاعری سے گاؤں میں انقلاب آجائے گا "

اب وہ نیا گدھا شاعر تھا۔ اس نے تمام جاکر اپنی شاعری سنائی خوب چیخا اور چلایا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک روز وہ شاعر گدھا خوب اچھی طرح پٹ گیا۔ ایک بزرگ گدھے نے اس کی ہمت بڑھائی " میاں صاحبزادے گھبراؤ نہیں، ہماری قوم کو اسی قسم کی جدوجہد کی ضرورت ہے، قوم کے شاعر کی اس طرح توہین کرنے والوں کو ایک روز اسکی عظمت کا احساس ضرور ہوگا " ـــ اپنی شاعری کی وجہ سے اس شاعر گدھے کی اچھی حجامت بن گئی۔ ایک روز ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ گاؤں کا سرپنچ تقریر کر رہا تھا۔ شاعر گدھے نے وہیں اپنی شاعری شروع کر دی۔ وہ اپنی عظمت کا احساس دلا رہا تھا۔ جلسہ میں ایک ہنگامہ ہوگیا

لوگوں نے کہا گدھے کو باہر نکال دو۔ ایک شخص اطمینان سے اُٹھا اور گدھے
کے قریب آیا۔ شاعر گدھے سے سمجھا وہ نزدیک داد دینے کے لئے آرہا ہے
لیکن اس شخص نے قریب پہنچ کر گدھے کو پکڑ لیا، اور ایک تیز چاقو سے اسکی
ناک کاٹ لی اور باہر نکال دیا۔ لوگوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ باہر نکل کر گدھے
کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔

عبدالمجید

وادیٔ انڈس میں بچوں کے کھلونے

موہنجوداڑو اور ہڑپا کی تہذیب پر کافی تحقیق ہو رہی ہے یہ تو
معلوم ہی ہے کہ وادی انڈس میں آریوں سے قبل ایک ایسی تہذیب تھی
جو ترقی یافتہ تھی۔ سندھ اور پنجاب میں اس تہذیب کے جو آثار ملے
ہیں، ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ماہرین نے پتہ چلایا ہے
کہ اس وقت بہت بڑے بڑے شہر آباد تھے۔ کھیتی پر عوام کی زندگی زیادہ
منحصر کرتی تھی۔ ایک ایسے بڑے غسلخانے کا بھی پتہ چلا ہے جہاں سال
میں ایک دو بار تمام لوگ ایک ساتھ غسل کرتے تھے اور اس غسل کے بعد
ایک بڑا تہوار منایا جاتا تھا۔

اس تہذیب کے سائے میں جو بچے سانس لیتے تھے انکی زندگی
کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اس وقت بھی بچوں کو کھلونوں
سے شوق تھا۔ چھوٹے چھوٹے کھلونوں سے وہ زندگی کی بہت ساری
باتیں جان لیتے تھے۔ ایک ایسا ادارہ تھا جو بچوں کے لئے کھلونے تیار کرتا تھا
ان کھلونوں میں زندگی کی بہت سی باتیں شامل کی جاتی تھیں کھیل ہی
کھیل میں تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔

جس روز بڑے تہوار منائے جاتے تھے اس روز عام بچے اپنے
اچھے اور پسندیدہ کھلونوں کے ساتھ غسل کے لئے جاتے تھے۔ آج جو
حضرات بچوں کو کھلونوں سے دُور رکھنا چاہتے ہیں انہیں یہ سمجھنا چاہئے کہ
بچے کھلونوں سے ہمیشہ قریب رہے ہیں۔ تاریخ کے ابتدائی صفحوں سے یہ
روایت چلی آتی ہے۔ اس وقت بھی ذہین لوگ یہی سمجھتے تھے کہ کھلونوں
سے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کافی مدد لی جاسکتی ہے۔ مٹی کے کھلونوں
کا رواج عام تھا۔ مٹی کی ایسی گاڑیاں بھی بنائی جاتی تھیں جنکا رواج
اس وقت نہیں تھا صرف یہ بتانے کے لئے کہ ایسی گاڑیاں بھی بنائی
جاسکتی ہیں۔ اس سے بچوں کا ذہن نئی بات سوچنے کی کوشش کرتا تھا
موجودہ تحقیق سے اب تک جن کھلونوں کا پتہ لگا ہے اُن میں بھیڑ
مختلف قسم کے پرندے مرد، عورت، گاڑیاں، باجے، اور بتی شامل ہیں
کھلونوں میں کسی قسم کا ہتھیار یا جنگ کی کوئی بات شامل نہ تھی۔ اس
سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نئی نسل کو پُرامن زندگی گذارنے کا سبق
دیا جاتا تھا۔

بنسی لعل

دانت غائب!

میرے مدرسے کے قاضی صاحب نے نئے دانت یعنی مصنوعی
دانت لگوائے تھے۔ ان کے دانت عرصہ سے خراب تھے، کھانے میں بہت
تکلیف ہوتی تھی۔ انہیں اس کا بہت افسوس تھا کہ جب سے دانت خراب
ہوئے ہیں وہ نندرو نہیں کھا سکتے تھے۔ انہیں بچپن سے اس کا شوق تھا
کچا نندرو کھاتے ہوئے کسی کو دیکھ لیتے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے
تھے۔ انہیں اپنے بیتے ہوئے دن یاد آجاتے۔ مدرسہ میں لڑکوں سے
جہاں اور بہت ساری باتیں کرتے تھے وہاں یہ بھی کہتے تھے کہ ان کے
دانت فولاد کی طرح مضبوط تھے اور ان سے وہ پتھر بھی توڑ دیتے تھے۔

جب سے دانت خراب ہوئے اور ٹوٹ گئے تھے انہوں نے
ایک غم پیدا کر لیا تھا۔ وہ اس غم میں ہر وقت ڈوبے رہتے تھے۔ لوگوں
کو ان سے ہمدردی پیدا ہوگئی اور ایک روز ایک ڈاکٹر کے مشورہ سے
انہوں نے باقی تمام دانت نکلوا دئے۔ اب ان کے منہ میں مصنوعی دانت
تھے۔ جس دن نئے دانت لگے اس روز انہوں نے بہت خوشی منائی
اور دوستوں کو دعوت دی، محلہ میں ایک ہنگامہ رہا۔ اس روز انہوں نے
کچے نندرو خریدے۔ ان کا خیال تھا۔ اب وہ اچھی طرح یہ ساری
چیزیں کھا سکیں گے۔ رات کی دعوت ختم ہوئی۔ دوستوں نے نئے دانت
لگوانے پر قاضی جی کو مبارکباد پیش کی اور اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ ڈاکٹر
کی ہدایت تھی کہ ہر رات دانت نکال کر ایک گلاس پانی میں رکھ دئے جائیں
قاضی جی نے پہلے روز ایسا ہی کیا۔

صبح ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ گلاس ٹوٹ چکا ہے اور دانت غائب ہیں۔ ان کا ذہن چکرا گیا۔ اب تو وہ بالکل بغیر دانتوں کے تھے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ آواز نکلتے ہوئے پھسل رہی تھی۔ قاضی جی پریشان ہو گئے اور رونے لگے۔ تھوڑی دیر میں محلہ کے تمام لوگ قاضی جی کے گھر پر تھے معلوم ہوا کہ قاضی جی کے نئے دانت غائب ہو گئے ہیں۔ دانت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ہونٹ کی شکل عجیب ہو گئی تھی۔ پوپلے قاضی جی کو دیکھ کر محلہ کے لڑکے مسکرا رہے تھے۔ ان کے ہونٹ خواہ مخواہ لرز رہے تھے۔ دانت کی تلاش جاری تھی۔ کسی نے کہا۔ چور لے گیا ہوگا کسی نے کہا۔ اس کی رپورٹ پولیس میں کرانی چاہیئے۔ غرض ایک طوفان تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں ہو رہی تھیں۔ قاضی جی سے لوگ اپنی ہمدردی دکھا رہے تھے تشفی اور دلاسے دئیے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے قاضی صاحب کے کسی عزیز کا انتقال ہو گیا تھا۔ قاضی جی کے دوستوں کے ہونٹوں پر رات کی دعوت کا مزہ باقی تھا اور یہ حادثہ ہو گیا تھا۔ !

کافی تلاش کے بعد قاضی جی کے دانت چوہوں کے ایک بل کے قریب ملے۔ چوہوں نے اسے چبانے اور کاٹنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ قاضی جی بہت خوش ہوئے، انہوں نے تلاش کرنے والوں کا شکریہ بعد میں ادا کیا۔ پہلے دانت منہ میں ڈال لئے اور وہ تمام ندرو کھائے جو انہوں نے خریدے تھے۔ قاضی جی کی یہ حرکت دیکھ کر لوگوں نے قہقہے لگائے۔ سنا ہے۔ قاضی جی نے اپنے دانت کی حفاظت کے لئے ایک نہایت ہی مضبوط صندوق خرید لیا ہے اور چوہے دان سے چوہے پکڑتے رہتے ہیں۔ ایک روز وہ چوہوں سے کیا پریشان ہوئے کہ چوہوں کو ہر وقت ان سے پریشانی ہو گئی۔ وہ بھی کیا یاد کرتے ہونگے کسی کے دانت چرائے تھے ــــ !

چند پھول، چند کلیاں

○ "آنسوؤں کو بولتے اور الفاظ کو روتے ہوئے میں نے اکثر دیکھا ہے۔" کاؤلے

○ "جب میں بچہ تھا تو میں ایک بچے کی طرح بولتا تھا، ایک بچے کی طرح سوچتا تھا، ایک بچہ کی طرح سمجھتا تھا ــ لیکن جب میں جوان ہوا تو میں نے بچوں جیسی باتیں چھوڑ دیں۔"

کوری نتھینس

○ "دنیا ایک نہایت ہی مقدس اور خوبصورت کتاب ہے لیکن اس سے ان لوگوں کو کیا فائدہ ہوگا جو اسے پڑھ نہیں سکتے!"

گولڈونی

○ "حیرت کیا ہے؟ ایک بچے کی کہانی ــ ایک گھنٹے کی حیرت"

بائیرن

○ "تین روز سے زیادہ کوئی بات حیرت انگیز نہیں رہتی"

سائرس

○ "قاعدہ کے مطابق انسان بیوقوف ہے جب گرمی رہتی ہے تو وہ سردی چاہتا ہے، جب سردی رہتی ہے تو وہ گرمی چاہتا ہے۔ ہمیشہ وہ وہی چاہتا ہے جو نہیں ہے!"

میتھیو

○ تمام ندیاں سمندر کی طرف جاتی ہیں اس کے باوجود سمندر کا پیٹ نہیں بھرتا۔"

ابن صام

○ "سیاست کو سائینس سمجھنا کتنی بڑی حماقت ہے ــ!"

بسمارک

○ "آپ اپنی تعریف کیوں کر رہے ہیں؟ کیا اتنی دیر تک کسی حماقت کا احساس نہیں ہوا ہے؟"

سنٹ کلینٹ

○ "کسی کی روح کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کا خط پڑھئے"

ایس جونسن

○ "ہر ہیرو آخر میں دردِ سر بن جاتا ہے"

ایمرسن

○ "جو آدمی اس وقت بولتا ہے جس وقت اسے سننا چاہئے تو وہ آدمی یقیناً دردِ سر بن جاتا ہے۔" بابکرکس

وندہ

واہ ، شِشرُ کوتاہ زبر کوتاہ چھ جان
چھُٹیہ دوٚن ڈاین ریتن کیا خوش اِوان
آفتابن ھٹوٗو ابرس ژھایہِ پان
چھُنہ ہیکاں ہاوِتھ پنُن بُتھ آسمان

تیٚز کاڑا آسِتن ، راتھا چھ زِیٹھ
یِڈ بھرِتھ نیٚندرا چھ کیا خوشِن تہ میٹھ
میانہِ بدلے تیٚزُ لگہہے کاغذن
بیہ کتابن تِیہ پلو لاگن پیہن

اَتھ وندس خوش روزہ بُتھ توشہا
کاپُھرہا کیٚنژن دوہن بیہ پوشنا
گوژھ مگر امہِ شِینہ کِنہ مُدریر پیوٚن
بیہ شِشر کانٹن تہ گوژھ ناید بنُن

کھنڈ تہ نابد دوہ دوہس شُنبراوہا
ژالہا سردی تہ کانگرُ تراوھا

جاڑا

واہ واہ جاڑا بھی کتنا پیارا ہے
دو ڈھائی مہینوں کی چھٹیاں کتنی اچھی ہیں۔
سورج نے بادلوں کی اوٹ میں اپنے کو چھپایا
اور آسمان بھی سردی کے مارے اپنا مُنہ نہیں دکھاتا۔

چاہے کتنی ہی ٹھنڈ کیوں نہ ہو، رات تو لمبی ہے۔
جی بھر کے لمبی نیند میں مست ہونا کتنا سندر ہے۔
کاش میرے بجائے کاغذوں کو جاڑا ستاتا۔
اور کتابوں کو بھی پوشاکیں پہنانی پڑتیں۔

اور میں بھی جاڑوں بھر مسرور رہتا اور اُچھلتا کودتا۔
اور دِل ہی دِل میں جاڑے کے اور لمبا ہونے کی دُعائیں کرتا۔
مگر اس برف کی بجائے کاش کھانڈ کی بارش ہوتی۔
اور جمے ہوئے برف کا نبات بن جاتا۔

تاکہ میں دِن دن بھر چینی اور نبات اکٹھا کرتا۔
سردی کو برداشت کرتا اور کانگڑی کو چھوڑ دیتا۔

باقیات

برف پوش گلمرگ سے ایک خط

(صفحہ ۱۴ سے آگے :-)

تم بھی کہو گی اتنا طویل خط لکھ مارا ہے، کیا رکھا ہے برف کو اس قصے میں؟ مگر تم غور سے دیکھو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ اس قصے کا ہماری زندگی، ہمارے سماج، ہمارے فن و ادب اور ہمارے تمدن سے کتنا گہرا سمبندھ ہے — باہر میرے ہمسفر قلیوں سے باتیں کر رہے ہیں اب لوٹنا ہوگا، اُلجھنوں اور تفکرات سے بھری اُسی دُنیا میں، جہاں پناہ گاہوں کی کمی اکثر کھوٹتی رہی ہے — شاید اُس وقت تمہارا ہجر نہ اکھڑ ہے — یا شاید تب تم ہی ساتھ ہو — اِسی اُمید کے سہارے تو میری مسرت زندہ ہے — اُمیدیں — سہارے — ان کے دم سے تو دُنیا زندہ ہے — ہماری زمین بھی — اس کی اپنی اُمیدیں ہیں، اپنی آشائیں ہیں کہ رُت بدلے گی تو یہ بھی نیند سے جاگے گی — پیڑوں اور پودوں پر نئی کونپلیں ہونگیں۔ دھوپ کی تمازت کے سامنے "چِلّہ بچہ" ہتھیار پھینک دے گا۔ اور ایک دن آئے گا — (کیونکہ وہ دن ہر برس آتا آیا ہے) لوگ کانگڑی تاپنا بند کر دیں گے۔ ہر گھر میں اُس رات کانگڑیاں جلائی جائیں گی۔ زندگی میں یہ جمود نہیں رہیگا۔ موسم کی پہلی برف باری 'نوشین' کی تقریب کے بعد لوگ 'بادام واری' میں بادام کے چھلکے ہوئے شگوفوں کے جھرمٹوں میں 'نوبہار' منانے پہنچیں گے۔

تمہارا — انجم

مجاز کی شاعری میں داخلی عنصر

(صفحہ ۱۵ سے آگے :-)

دیتے، اگر جنون اس کی قوتوں کو مفلوج نہ کر دیتا۔ اور اگر موت اسے چند روز کی مہلت اور دے دیتی۔ تو یقین ہے کہ وہ ہمیں اپنے اُن فن پاروں سے بھی محروم نہ رکھتا جو اس کے ساتھ چلے گئے۔

زاویے!

(صفحہ ۲ سے آگے :-)

اس مقصد میں انہیں کہاں تک کامیابی حاصل ہوگی، اُسکا انحصار پاکستان کے رویے پر ہے۔ ہندوستان کے لئے پاکستان سے اب صرف ایک ہی مسئلے پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اور وہ ہے مقبوضہ کشمیر سے پاکستانی فوجوں کا اخراج! اور موجودہ حالات میں پاکستانی حکمرانوں سے اس قسم کی دانشمندی کی کوئی اُمید نہیں +

تعمیر کا اپریل کا شمارہ مہجور نمبر ہوگا۔ اس کی ترتیب و تدوین کا کام قریب قریب مکمل ہو چکا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ یہ نمبر اردو رسائل کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہوگا۔

یاد کی راہگزر جس پہ اسی صورت سے
مدتیں بیت گئی ہیں تمہیں چلتے چلتے
ختم ہو جائے جو دو چار قدم اور چلو
موڑ پڑتا ہے جہاں دستِ فراموشی کا
جس سے آگے نہ کوئی میں ہوں نہ کوئی تم ہو
سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم
تم پلٹ آؤ، گزر جاؤ، یا مڑ کر دیکھو

(فیض)

کشمیر کا حامی

(صفحہ ۱۱ سے آگے :-)

کہنا چاہتا تھا، مگر لوگوں سے ڈرتا ہوں۔ اس لئے اے میری زبان اب بند ہو جا، نہیں تو مار پڑے گی، اس سے بھی اُس زمانے کی اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ سچی بات کہنا کتنا مشکل تھا۔ اور شاید جہاد اکبر سے بھی زیادہ عظیم کام۔ مگر اس شدت کے باوجود وہ ساری سچی باتیں بتا گئے ہیں۔

تعمیر
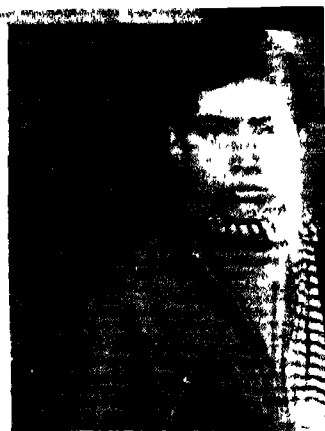
غلام رسول میر

جعفر احتشام رضوی

کشن لعل منشی

چپ رهو بهیا۔ ممی متھائی چھپا رهی هیں

ششی بھوشن

مسعود احمد

اشرف علی

شری کرشنا مینن

کہاں سرمایۂ محفل تھی میری گرم گفتاری
کہاں سب کو پریشاں کر گئی میری کم آمیزی
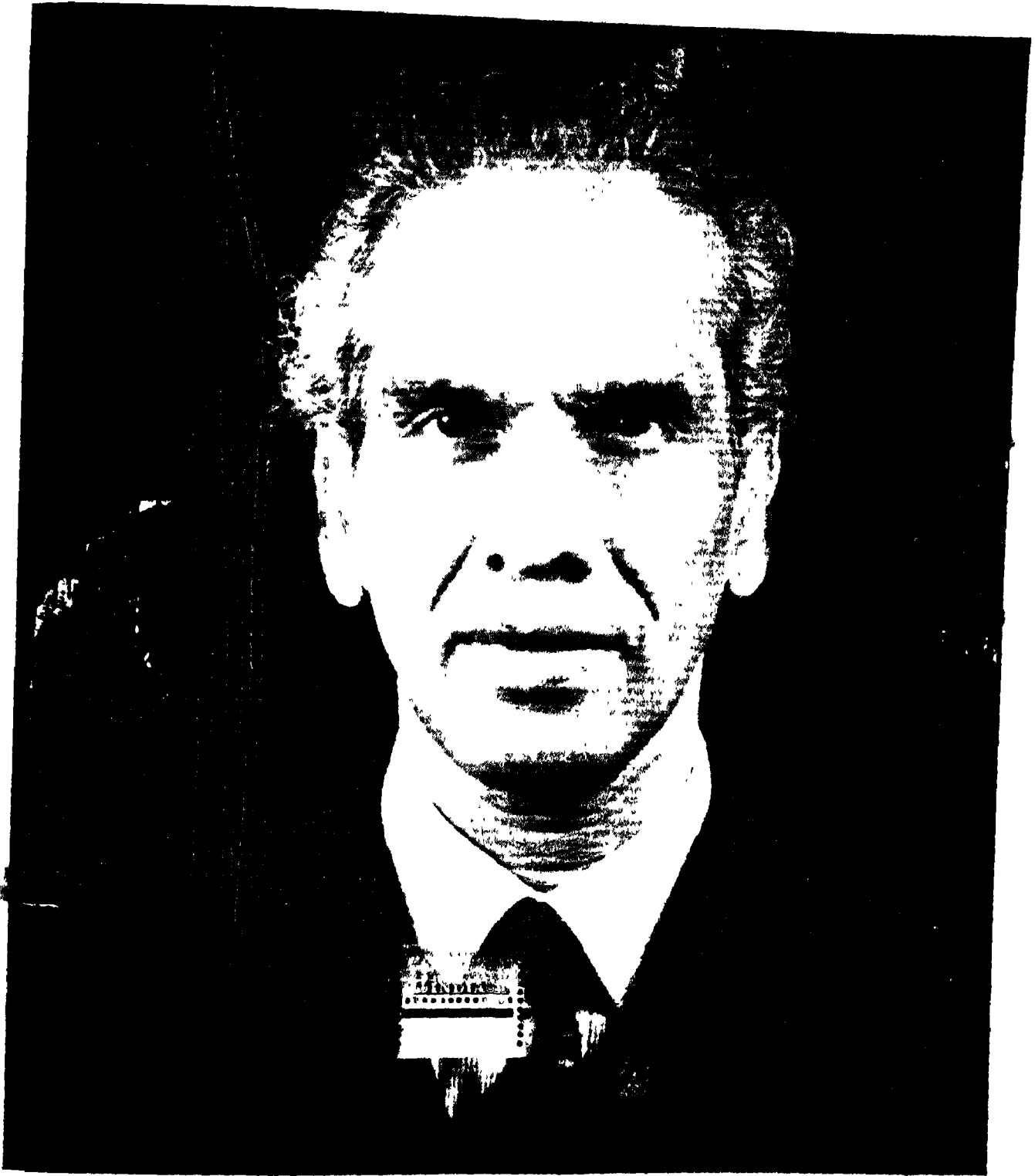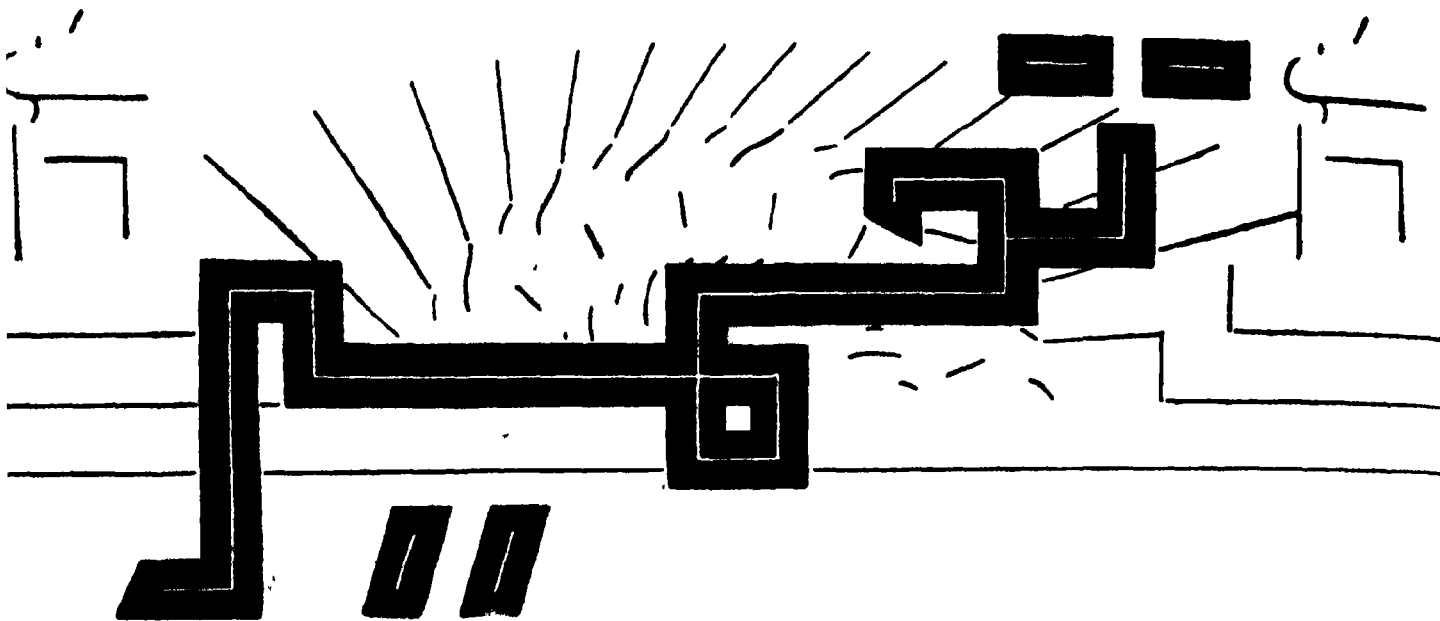
قراوٕ یلہ مہجور باغ جہاون
ادٕ ونیہ آرٕ ول مسولہ کن
راز دار ناز بردار کوتئی گوم
دل قرار توتہ مدنوار کوتئی گوم

دو عظیم فن کار—
مہجور اور پردیسی

حضرت مہجور کشمیر کے
شاعروں، ادیبوں اور
دانشوروں کے ساتھ

پیغام

سیاسی آزادی کے حصول کے بعد اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی تہذیبی روایات اور ادبی اقدار کے احیاء کے لئے سرگرم عمل ہوں ہمیں ماضی کے ورثے کو کھنگال کر اُسے دُنیا کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ کشمیری عوام جہاں اپنی عظیم الشان کلچرل روایات کو عزیز رکھتے ہیں وہاں ساتھ ہی ساتھ نئی زندگی کے تقاضوں سے بھی غافل نہیں ہیں!

مہجور کی شاعری ہماری عظیم ادبی میراث ہے۔ اس لئے مہجور کی یاد تازہ کرنا ایک اہم ادبی فریضہ ہے، مجھے خوشی ہے کہ 'تعمیر' مہجور کی یاد میں ایک خاص نمبر شائع کر رہا ہے۔ ریاست کے فن کاروں کو ریاست سے باہر متعارف کرانا بہت ضروری ہے، اس سلسلے میں 'تعمیر' کا مہجور نمبر ایک مُبارک قدم ہے!

(دستخط) جی۔ ایم بخشی

تعمیر سرینگر

مہجور نمبر

اپریل و مئی ۱۹۵۷ء

جلد ۲ • شمارہ ۴، ۵

ایڈیٹر

شمیم احمد شمیم

جوائنٹ ایڈیٹر

محمد یوسف ٹینگ

قیمت سالانہ

۶ روپے

فی پرچہ

۵۰ نئے پیسے

پرنٹر پبلشر عبدالغنی ولائیما نے مکتبہ لالہ رخ پبلیکیشنز کی طرف سے شائع کیا۔

زاویئے

۱۸۵۷ء کے انقلاب کو غدر کا نام دے کر سامراجی مورخین نے ہمیں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ یہ ایک فوجی شورش تھی، جو چند سر پھرے فوجیوں کی فوجی قوانین کی خلاف ورزی سے شروع ہوئی، بہت عرصہ تک ہم اس غلط فہمی کا شکار رہے اور جنگ آزادی کے اس پہلے سنگ میل کو غدر کے نام سے یاد کرتے رہے۔ اب جبکہ زبانوں پر سے پہرے اٹھائے گئے ہیں، تو فکر نے بھی انگڑائی لی ہے۔ اور ہم سن ستاون کے اس عظیم انقلاب کو اپنے تاریخی پس منظر میں دیکھ سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سن ستاون کے بہت پہلے ہی انگریزی تسلط کے خلاف عام بے چینی پھیلی ہوئی تھی، جس کا اثر خاص طور پر تین طبقوں میں محسوس ہو رہا تھا، ایک تو امراء و والیان ریاست، جن کا اقتدار ختم ہو رہا تھا، اور الحاق کی پالیسی سے مستقبل بالکل ہی تاریک نظر آنے لگا تھا، دوسرے علماء اور پیشوایان مذہب جنہیں عیسائی مشینریوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں اور ان کے ساتھ حکومت برطانیہ کی علانیہ وابستگی ایک مذہبی خطرہ نظر آ رہی تھی، تیسرے ہندوستانی سپاہی جن کے ساتھ انگریز سپاہیوں کے مقابلے میں نہایت ذلیل سلوک کیا جاتا تھا، اور جائز مطالبات پیش کرنے پر بھی ظالمانہ سزائیں دی جاتی تھیں، اس طرح غیر ملکی اقتدار کیخلاف نفرت کا یہ جذبہ صرف فوج میں پایا جاتا تھا، بلکہ مذہبی علماء اور والیان ریاست کے ہاں بھی یہ جذبہ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود تھا۔ ۹ مئی کو میرٹھ کے فوجی افسروں نے جب ۸۵ فوجی سپاہیوں کو چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کرنے پر سزا دی، تو بغاوت کا یہ لاوا پھوٹ پڑا۔ ۱۰ مئی کو انگریز کے خلاف باقاعدہ بغاوت کا اعلان کر دیا گیا۔ بغاوت کا اعلان ہوتے ہی بقول مولوی ذکاءاللہ سپاہیوں کے علاوہ اس میں بازاروں کے اور ہمسایہ کے دیہات کے آدمی بڑی خوشی سے شریک ہوئے، ہر طرف سے ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑے۔ علاوہ اس طرح فیروزہ کی برطانوی فوج کو شکست ہوئی، اور ہماری پہلی جنگ آزادی کے سپاہی مظفر و منصور آگے بڑھے۔ جنگ کے تفصیلی واقعات کے تذکرے کا یہ موقع نہیں، لیکن یہ کہنا ضروری ہے کہ بغاوت کی جنگ کے شعلے آناً فاناً دہلی، کانپور، بریلی، جھانسی، گورکھپور، الہ آباد، بنارس، اعظم گڑھ، نگینہ اور نجیب آباد تک پھیل گئے۔ اور انگریزوں کو اپنی پوری قوت صرف کرکے اس آگ کو بجھانا پڑا۔ بظاہر آزادی کی یہ جنگ ناکام ہو کر رہ گئی، لیکن مورخ یہیں سے اس نئے انقلاب کی بنیاد تلاش کرتا ہے، جس نے تقریباً سو سال بعد انگریز کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ یہیں سے بقول احتشام حسین نئے معاشی تعلقات، نئے ادبی رجحانات، نئے طریقۂ تعلیم، نئے طبقاتی روابط اور نئی اصلاحی تحریکات کے نئے طوفان اٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ غرضیکہ ہندوستان کی معاشی، سیاسی، اور تمدنی زندگی میں جتنی جدید تحریکات رونما ہوئیں، وہ ایک منطقی اور لازمی نتیجہ تھیں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی۔ اس طرح غدر واقعات کے لحاظ سے اتنا عظیم اور ہمہ گیر انقلاب نہیں ہے، جتنا نتائج اور اثرات کے لحاظ سے!

آج سو سال بعد ہم جب اپنی پہلی جنگ آزادی کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ ہمیں نئی نسلوں کے ذہن سے ۱۸۵۷ء کے متعلق شعوری طور پیدا کردہ ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنا ہوگی، جو بیرونی مورخین نے صرف اس لئے پیدا کر رکھی تھیں کہ ہم بھی اس انقلاب کو اسی زاویہ نگاہ سے دیکھیں جس سے برطانوی سامراج اسے دیکھتا رہا۔ تاریخ کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا، اور آج سو سال بعد ایک نئے تاریخی شعور کی ضرورت محسوس

ہورہی ہے ۔ جو تاریخ کا مطالعہ تعصبات سے بالاتر ہو کر کرسکے ۔

●

ریاست میں نئے آئین کے تحت عمل میں لائے جانے والے انتخابات قریب قریب ختم ہو چکے ہیں ۔ اب صرف ضلع ڈوڈہ اور لداخ کی سات نشستوں کا انتخاب باقی ہے ، ان کے لئے بھی انتخابات کی تاریخوں کا اعلان کردیا گیا ہے انتخابات کا کام جس اطمینان بخش اور حوصلہ افزا ماحول میں ہوا ہے ۔ اُس سے یہ اندازہ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ریاست میں جمہوری نظام کی تشکیل کا یہ تجربہ غیر معمولی طور کامیاب رہا ۔ ریاست کی تاریخ میں یہ پہلا انتخاب ہے ۔ جس میں یہاں کے عوام نے اتنی دلچسپی اور جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ۔ بعض جگہوں پر جہاں پرجا سوشلسٹ ، پرجا پریشد اور آزاد اُمیدواروں نے نیشنل کانفرنسی اُمیدواروں کا مقابلہ کیا ، مخالف اُمیدواروں کو وہ تمام سہولیات میسر تھیں جو نئے آئین میں ہر اُمیدوار کو عطا ہوئی ہیں ۔ جن میں اپنی تمام ہلڑبازی اور ہنگامہ آرائی کے بعد بھی پرجا پریشد پانچ سے زیادہ نشستیں نہ جیت سکی ، پرجا سوشلسٹ پارٹی اپنی ضمانتیں ضبط کرانے میں باقی سب پارٹیوں سے جیت گئی ، کشمیر میں صرف ایک آزاد اُمیدوار جیت گیا ، اور باقی تمام پر نیشنل کانفرنسی اُمیدواروں کا قبضہ ہو گیا ، نیشنل کانفرنس کی یہ عظیم الشان فتح ایک منطقی نتیجہ تھی ، اس ترقی ، تعمیر اور خوش حالی کی ، جو نیشنل کانفرنس کی حکومت میں ریاست کو نصیب ہوئی ہے ۔ اور جس کا اعتراف برطانیہ کے دو عظیم لیڈروں نے بھی کیا ہے ، مسٹر ایٹلی کے بعد مسٹر بیون نے کشمیر کی ترقی اور خوش حالی کے متعلق جن تاثرات کا اظہار کیا ہے ، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ ریاستی تعمیر و ترقی کا ڈھانچہ ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوا ہے ۔ اور مخالفین کو زبانی جمع و خرچ کی بجائے نیشنل کانفرنس کا مقابلہ کسی ایسے تعمیری پروگرام سے ہی کرنا ہوگا ، جو ملک کی اقتصادی آزادی کا ضامن ہو ، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک میں کسی ایسی جماعت کا وجود نہیں ہے جو اس قسم کا کوئی ٹھوس پروگرام رکھتی ہو ۔ پرجا پریشد کو حالیہ انتخابات کے نتائج سے اس بات کا احساس ہو جانا چاہیئے کہ کھوکھلے جذباتی نعرے بہت دیر تک عوام کو مغالطے میں نہیں رکھ سکتے ، مذہبی نعروں کے لئے پاکستان میں جگہ ہو تو ہو ، ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ۔ پرجا سوشلسٹ پارٹی انتخابات میں جس بُری طرح ہاری ہے ، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس جماعت کا ریاست میں عملاً کوئی وجود نہیں ، وہ چند افراد کی ایک فرضی تنظیم ہے ، جس کی سرگرمیاں اخباری بیانات تک ہی محدود ہیں ۔ ہمارا یہ شماری اور پولیٹکل کانفرنس کا وجود اور عدم وجود اس لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ ان دو جماعتوں کا ملکی سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں ہے ، نئے آئین کے نفاذ کے بعد قانوناً ان کا وجود ختم ہو چکا ہے ۔ اور یہ جماعتیں عملاً ابھی تک صرف اس قدر کام کر چکی ہیں کہ ریڈیو پاکستان کے بے بنیاد نشریوں کیلئے غذا مہیا کرتی رہیں ۔ غرضیکہ ملک بھر میں نیشنل کانفرنس ہی ایک ایسی تنظیم ہے ، جو صحیح معنوں میں اپنے سامنے ایک ترقی پسند ، تعمیری پروگرام رکھتی ہے ، اور جس نے گذشتہ دس سال سے اس پر عمل پیرا ہو کر اپنے وجود کو منوالیا ہے ۔

●

کشمیری زبان کا تمام تر سرمایہ اس کا شعری ادب ہے ۔ نثر اس میں تقریباً ناپید ہے اور زبان ابھی تک رسم الخط کی اُلجھنوں سے آزاد نہیں ہوئی ہے ۔ ان حالات میں اس زبان کے کسی شاعر کے فن اور اسکی شخصیت پر نقد و نظر کا کام کتنا مُشکل ہو سکتا ہے ۔ اس کا اندازہ مہجور کی یاد میں 'تعمیر' کے اس خاص نمبر کی تیاری کے دوران میں مجھے ہوا ہے فکر و فن کے وہ معیار جو تنقید کی بنیاد ہوتے ہیں ۔ ہمارے ہاں ناپید ہیں ۔ اسلئے مہجور کی شخصیت اور فن کے بارے میں جو مضامین اس خاص نمبر کی زینت ہیں ۔ ان کا مطالعہ اس حقیقت کی روشنی میں کرنا ہوگا کہ کشمیری زبان میں تنقید کی کوئی روایت نہیں ہے ۔ اور ان مضامین میں نقد کا جو معیار ہے وہ یا تو تاثراتی ہے یا اردو اور انگریزی سے مستعار ۔ یہ صحیح ہے کہ تنقید کی بیشتر قدریں آفاقی ہوتی ہیں ، لیکن ہر ادب کا چونکہ اپنا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے ، اس لئے تنقید کی ان آفاقی قدروں کا بھی اس مزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ضروری ہے ۔ اور یہ ہم آہنگی روایات اور تجربات کے ایک تسلسل سے ہی پیدا ہو سکتی ہے ۔ 'تعمیر' کا یہ خاص نمبر اپریل اور مئی کا مشترکہ شمارہ ہے ، اور ہم نے زیادہ سے زیادہ لکھنے والوں سے تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی ہے ، ہمیں اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ آپ کیجئے ۔

تعمیر کا یہ خاص نمبر ایک تجربہ ہے ، اور اگر یہ تجربہ کامیاب رہا ، تو یہ نمبر اس سے بہتر نمبروں کا ابتدائیہ ہوگا ۔ 'تعمیر' کے مہجور نمبر کے سلسلے میں ہمیں قارئین کی رائے کا انتظار رہے گا ۔

مہجورؔ کاشمیری

گُلشن وطن چھُہ سونٛوئی

بلبل ونان چھہ پوشن گُلشن وطن چھُہ سونٛوئی
اسہٕ وِن زمین چھہ پانبر گژھہ وُچھ ژہ کونگہ اوڈر

سونٛہی وطن چھُہ گُلشن
تتہٕ دِل بلی ژلی شر

گُلشن وطن چھُہ سونٛوئی
گُلشن وطن چھُہ سونٛوئی

اندِ اندِ سفید سنگر دیوارِ سنگِ مرمر
شوکہ ناگ تو سہ میدان تتہٕ وُچھ مہ پانہ بھگوان

منز باگ سبز گوہر
بگتن چھہ جلوہ ہاوان

گُلشن وطن چھُہ سونٛوئی
گُلشن وطن چھُہ سونٛوئی

ناگن کولن تہ آرن جوین تہ آب شارن
وُچھ لولرک ژہ میدان سرسبز کوہ بیابان

دِت سوز نو بہارن
مومت چھہ زندہ سیدان

گُلشن وطن چھُہ سونٛوئی
گُلشن وطن چھُہ سونٛوئی

وِرقم تہ ٹیکہ بیڑنے سُولہٕ آئے چائے ریڑنے
بُلبُل کران گُلن گتھ بُمبُر بنبرزِلن پتھ

لگِ ڈُرِ جامہ زنڑنے
کاشر چھہ مست مس چیتھ

گُلشن وطن چھُہ سونٛوئی
گُلشن وطن چھُہ سونٛوئی

کر سیر ڈل بر ہتھ یژھہ دریائے گُل وُچھان گژھہ
مہجورہ دیس سونٛوئی باغاہ چھہ شندہ بروٛئی

یم پوشن دِل رژھان گژھہ
اتھ لول گژھہ برونٛوئی

گُلشن وطن چھُہ سونٛوئی
گُلشن وطن چھُہ سونٛوئی

مہجور کا سیاسی شعور

(جناب بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر)

قوموں کے کردار کی تشکیل اور ان کی ذہنی نشو ونما میں شاعروں کا جو حصہ رہا ہے اس کی اہمیت کو روز بروز محسوس کیا جا رہا ہے۔ شاعر کا انداز ایک خطیب یا مصلح کا انداز نہیں ہوتا۔ وہ بالواسطہ طور پر ہمارے شعور کو متاثر اور متحرک کرتا رہتا ہے۔ تاثر کا یہ عمل پیچیدہ ہوتا ہے۔ شاعر اور قاری کے ذہنوں کے درمیان جب تک ہم آہنگی پیدا نہ ہو۔ تب تک اس کا کلام ہمارے احساس میں شدت پیدا نہیں کر سکتا۔ اور احساس کی اس شدت کے بغیر شاعر کے کلام سے محظوظ اور مستفید ہونا ممکن نہیں۔

کشمیر کی ادبی تاریخ میں مہجور کا جو مقام ہے اور اس نے جس طرح ہماری قومی تحریک کو متاثر کیا ہے۔ اس کے پیش نظر مہجور کی یاد کو تازہ رکھنا اور اس کے کلام کے محاسن کو اجاگر کرنا ایک اہم قومی فریضہ ہے۔ آج جب ہم آزادی، ترقی اور تعمیر کی اس منزل پر کھڑے ہیں جہاں سے ہماری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، مناسب ہے کہ قومی تحریک کی جد وجہد میں مہجور کے عظیم رول کا جائزہ لیا جائے۔

شخصی مطلق العنانی کے ظلم و تشدد کے خلاف جد وجہد میں مہجور کی آواز نے یہ ثابت کر دیا کہ آزادی کی جنگ میں طاؤس و رباب بھی تیغ و تلوار سے کم نہیں۔ مہجور نے اپنی کشمیری شاعری کا آغاز ایک روایتی انداز میں کیا اس کے ہاں غزل کی وہی مخصوص روایتیں، علامتیں اور مضمون ملتے ہیں جو اس سے پہلے کشمیری شاعری کا خاصہ رہی تھیں۔ مہجور کی ابتدائی غزلوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مہجور پر فارسیت کا کس قدر غلبہ تھا۔ لیکن مہجور نے رفتہ رفتہ اپنے ہاں کی قومی تحریک سے متاثر ہونا شروع کر دیا۔ اور اس طرح نئے اثرات کو قبول کر کے ان کے ذہن نے ایک بڑی اہم کروٹ لی۔ ان کے کلام سے فارسیت کا ملمع اُٹھنے لگا۔ اُن کی زبان زیادہ صاف اور شیریں ہوتی گئی۔ انہوں نے غزل کے مخصوص مضامین کی حد سے باہر قدم رکھ کر ان قوتوں کی آواز میں اپنی آواز ملا دی۔ جو اپنی آزادی کے لئے جد وجہد کر رہی تھیں۔ ایک وقت وہ آ گیا جب مہجور نے اشارات و کنایات کی بجائے واضح الفاظ میں شخصی مطلق العنانی کے خلاف بغاوت کر کے مجاہدین آزادی کا لہو گرمایا۔ برادران وطن کو یک جہتی، برابری اور برادری کا سبق دیا۔ اپنی شاندار ملکی اور قومی روایات کو ہمارے سامنے پیش کر کے آزادی کی خطرناک منزلوں پر ہماری ذہنی قیادت کی۔ اور یہ وہ کام تھا جو بڑے بڑے سیاسی لیڈر بھی اپنی دھواں دھار تقریروں سے نہ کر پائے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہر سیاسی جلسے میں مہجور کی نظمیں اس جوش و عزم اور ولولے کے ساتھ گائی جاتی تھیں کہ سامعین پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس طرح جب کبھی تحریک آزادی پر کوئی نازک مقام آیا، مہجور کی آواز نے مستقبل کے سہانے سپنے دِکھلا دِکھلا کر ہمارے حوصلوں کو بلند رکھا، انہوں نے ہمارے قومی جذبات کی عکاسی کی اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کافی حد تک محض اس غرض کیلئے وقف کر دیا کہ ماضی اور نئی اُبھرتی ہوئی زندگی کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو جائے، وہ جہاں ماضی کی روایات کا ترانہ گاتے رہے، وہاں نئے کشمیر کا راگ بھی الاپتے رہے۔ انہوں نے ہماری قوم کے ربابِ حیات کو اپنے غور و فکر کی مضراب سے چھیڑ کر اس کی تاروں سے ایک نئی لرزش، ایک نئی تھرتھراہٹ اور ایک نیا ساز پیدا کر لیا۔ ایک غلام قوم کو نئے سیاسی شعور اور نئی زندگی سے مانوس کرانے کے لئے سیاسی فلسفے اور تقریروں کے علاوہ کچھ ادبی اور تمدنی قدروں کی ضرورت ہوتی ہے کشمیر کی تحریک آزادی میں یہ فریضہ

مہجور نے انجام دیا۔ یہ صحیح ہے کہ مہجور کے علاوہ ان کے ہمعصروں نے بھی تحریک آزادی میں اپنا حصہ ادا کیا۔ مگر مہجور وہ واحد شاعر ہیں جو باقاعدہ ملک کی سب سے بڑی تنظیم سے وابستہ ہو کر جدوجہد آزادی میں شریک رہے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ انفرادی کاوشیں اجتماعی کوششوں کے ساتھ مل کر ہی خود ایک قوت بن جاتی ہیں۔ قطرے کی حقیقت مسلّم، لیکن سمندر میں شامل ہونے سے اس کی انفرادیت ختم نہیں ہوتی۔ اس کے وجود کو دوام حاصل ہو جاتا ہے۔ مہجور کو اس حقیقت کا شدید احساس تھا، اس لئے تحریک آزادی سے شعوری طور ان کی وابستگی ان کے بلند شعور اور بالغ نظری کی دلیل ہے!

مہجور کا سب سے بڑا کارنامہ اس نظریے کی تبلیغ اور اشاعت ہے جو ہماری قومی تحریک کا طرۂ امتیاز ہے اور یہ نظریہ ہے، مذہبی برابری، برادری اور رواداری کا — مہجور نے جن حالات میں پرورش پائی اور انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز جس پریشان کن ماحول میں کیا۔ اس کے پیش نظر ان سے یہ بھی توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ مذہبی تنگ نظری کا شکار ہو کر ایک غلط راہ پر پڑ جائیں مگر مہجور کو انسانیت کی بلند اور عظیم قدروں کا احساس بچپن سے ہی رہا تھا، وہ عمر بھر مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے لڑتے رہے اور اپنی تمام شاعری میں وہ اپنے ہم وطنوں سے یک جہتی اور رواداری کی تلقین کرتے رہے۔ شاعر کی آواز اپنا سحر کر گئی۔ ہمارے ذہنوں میں مذہبی رواداری کا وہ شدید احساس سرایت کر گیا کہ سنہ ۱۹۴۷ء کی خون آشامی بھی ہمیں اپنی منزل سے منحرف نہ کر سکی ہمارے اس قومی کردار کی کئی سیاسی توجیہیں کی گئی ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کردار کی تشکیل میں ہمارے قومی شاعروں کا بھی حصہ رہا ہے۔ اور ان میں مہجور کا نام خاص طور پر اس لئے قابل ذکر ہے کہ وہ خود قومی تحریک کے ایک جانباز سپاہی تھے۔

مہجور کے سیاسی رجحانات اور نظریات کا مطالعہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ وہ خود مطلق العنان نظام میں ایک پٹواری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، وہ اس نظام کی خامیوں، کمزوریوں اور کوتاہیوں پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے، اسی لئے ان کے جذبۂ بغاوت میں شدّت کے ساتھ ایک نئے نظام کا تعمیری تصوّر بھی ملتا ہے۔ اور نظام کہنہ کی تخریب کے ساتھ ایک نئے تعمیری نظام کا تصوّر وہی شاعر دے سکتا ہے۔ جو اپنے ذہن میں انقلاب کا صحیح تصوّر رکھتا ہو۔ مہجور کے ہاں یہ تصوّر قدم قدم پر ملے گا۔

تعیر

مہجور کی بے پناہ مقبولیت کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ سبھی اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ لیکن ان کے قبولِ عام کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ماحول کی ضروریات اور تقاضوں کو سمجھ کر ان رجحانات کا ساتھ دیا۔ جو ملک کو آزادی، ترقی اور تعمیر کی طرف لے جا رہے تھے، انہوں نے اپنے قومی مزاج کو سمجھ کر اپنی شاعری کو روایات کی نذر کر دینے کی بجائے ایک نئے انقلابی آہنگ کو اپنایا۔ جو نیا ہوتے ہوئے بھی مانوس نہ تھا، اس لئے کہ اس کی جڑیں ماضی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اور اس میں ماضی سے علیحدگی نہیں بلکہ ہم آہنگی کا تصوّر ملتا تھا۔ مہجور اس لحاظ سے کشمیری شعر و ادب کی نشاۃ الثانیہ کے علمبردار ہیں کہ ان کے ہاں خالص تغزل کے علاوہ نئے فکری رجحانات اور عصری میلانات کا امتزاج ملتا ہے۔ ان کی شاعری جہاں حال کی غماز ہے وہاں مستقبل کی بھی نقیب ہے اور عظیم شاعری کا یہی خاصہ ہوتا ہے۔

مہجور اس لحاظ سے بڑے خوش نصیب تھے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ لی۔ ملک آزاد ہو گیا، شخصی مطلق العنانی کا طلسم ٹوٹ کر اقتدارِ اعلیٰ عوام کے ہاتھوں میں آ گیا۔ اور ملک تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ اب اس منزل پر ہمیں ایک بار پھر مہجور کی شیریں نوائی کی ضرورت تھی کہ ہم ملک کی نئی تعمیر ایک نئے حوصلے اور عزم کے ساتھ کریں۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا، مہجور ہم سے چھن گئے، اور ہم بہت سے ان نغموں اور گیتوں سے محروم ہو گئے، جو مہجور اپنے ساتھ لے گئے وہ ابھی ہمیں کیا کچھ دینے والے تھے، اس کا افسوس کرنا بے سود ہے وہ ہمیں کیا دے گئے، اس کا احساس کرنا ضروری ہے، مہجور کی عظمت کو ابدی بنانے کی صرف ایک ہی صورت ہے، اور وہ ہے اس جذبے اور احساس کی نشوونما، جو اس کی شاعری کا جزو غالب ہے، یہ جذبہ ہے مہجور کی بے پناہ حب الوطنی اور مذہبی رواداری — مہجور نے جہاں کشمیر کے کہساروں اور لالہ زاروں کے گیت گاتے ہیں، وہاں اس نے قومی روایات کو بھی ابھارا ہے، جو ہمارے کلچر، تمدن اور تہذیب کا خاصہ رہی ہیں۔ مہجور کے تصوّرات ہماری اس رنگا رنگ تہذیب کے آئینہ دار ہیں۔ جو یہاں کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے اشتراک سے ظہور میں آئی۔ ان کے ہاں اس تہذیب کی کرشمہ کا تماشا بھی ہے اور وحدت کا نظارا بھی!

اپریل، مئی ۱۹۵۲ء

پیارے ہتاش

مہجورؔ ــــــ میری نظر میں

مہجورؔ آج ہماری نظروں سے اوجھل ہے مگر اُس کی شاعرانہ شخصیت ہمارے قومی تصور میں ہمیشہ جھلملاتی رہیگی اور کشمیری ادب کی تاریخ میں اُس کا نام زندہ جاوید رہیگا۔ شاعر کی پانچویں برسی کے موقع پر میری حسرتیں مچل اٹھی ہیں کہ "نیا کشمیر" کے اس ادیب شاعر کو ہم اپنے درمیان نہیں پاتے۔

مہجورؔ کی یاد آتے ہی میرا تصور بیس سال پیچھے کی طرف لوٹ جاتا ہے شِورارتری کے دن تھے۔ گاؤں کی فضاؤں میں شہنائی کے ترنم سے گونج رہی تھیں۔ بھانڈوں کی ٹولیاں سویرے سے ہی گھر گھر گھوم رہی تھیں۔ ایک ٹولی ہمارے صحن میں بھی آگئی۔ ڈھول پر چوٹ پڑی، شہنائی گونج اُٹھی۔ سُریلی دھن ہوا میں لہرانے لگی۔ رقاص سکھ پیر تھرک اُٹھے اور سُر اونچا ہوتا گیا۔

ویسئے شُریمون دلبر شیرین کلام ییہ کر
یس کُن وُچھتھ ژلان شر سُوی گل اندام ییہ کر

(سکھی، میرا وہ دلبر شیرین کلام کب آئے گا؟ جسے دیکھ کر دل کے ارمان نکلتے ہیں وہ گل اندام کب آئے گا؟)

گیت کے بول میں فارسیت کی بھرمار مجھے پسند نہیں آئی۔ کالج میں انگریزی 'رومانٹک' شاعری سے لطف اندوز ہوکر میں کشمیری شاعری کو بھی اُسی زاویے سے دیکھنے لگا تھا۔ غزل کے اس مطلعے پر غور کر ہی رہا تھا کہ مقطع سنائی دیا۔

مہجورؔ چان آو بوز سنگرو تہ بالو

چانیو فراقہ نالو گرِتھ ناشہ رام ییہ کر

(مہجورؔ تیری پکار پہاڑوں اور کوہساروں نے سُن لی۔ نالہ ہائے فراق سے وہ (محبوب) رام نہیں ہو جائے گا؟ وہ آئیگا کب؟)

مہجورؔ کا نام پہلے بھی سُن چکا تھا۔ اُس کی 'پوشہ متہ جانانو' اور 'سوز دل میون بوزِن ہا رُے' اُن دنوں بہت مقبول ہو چکی تھیں، لیکن مجھے ان میں کوئی خاص نئی بات نہیں سُنائی پڑی تھی، ہاں مقامی اخباروں میں شاعر کی جو چیزیں پڑھی تھیں، اُن میں سے دو ایک مجھے بہت اچھی لگی تھیں۔ 'شوقہ سان دِل کِس رِبابس تارہ لولچہ چارہ ہا' میں تو مجھے کشمیری شاعری کی ایک نرالی لے سُنائی دی تھی۔ خاص کر ان شعروں میں:-

یودوُشہ دلبر سرِشہ نرآوِتھ سیود مہ کُن کرِ ہے نظر
شرادنس زن ہی بو پھولہ ہا یادنس ژھوہ مارہ ہا
کامہ دیو کرِ سیر ڈل بوزم شبس گژھہ تیسل بل
درشنس آبس اندر پمپوشس لاگِتھ پارہ !
سوز بوزنہ پانہ ییہ ہے بوز ہے میانی وداکھ
شوقہ سان دِل کِس ربابس تارہ لولچہ چارہ ہا !

(کاش وہ دلبر کدورت چھوڑ کر میری طرف سیدھی آنکھ سے دیکھے۔ تو میں دن کی چمپیلی سی کھِل اٹھوں، میرا جوبن پھولا نہ سمائے۔)

(سُنا کہ کامہ دیو (محبوب) ڈل کی سیر کو جا رہا ہے۔ اور تیل بل میں رات کاٹیگا، اُسکے درشن کے لئے میں (ڈل کے) پانی میں کنول بن کر انتظار میں رہوں!)

اسی غزل نے مجھے مہجورؔ کی عظمت کا قائل کر دیا تھا۔ اسی لئے بھانڈوں سے اُس کا کلام سُن کر میرا جی للچایا کہ اور بھی سُن پاؤں۔ میرے اصرار پر انہوں نے جو غزلیں سُنائیں۔ اُن میں سے 'کیا سنا ییہ نا شو دلبر رو ئے زیبا ہاونا'، سوز دِل میون بوزی وِنہ ہا رُے'، اور 'کرو بلبلو دیدارِ گُل'، میں مجھے ایک تازگی کا احساس سا ہوا۔ 'کرو بلبلو دیدارِ گُل' کے کچھ اشعار تو آج بھی مجھے اچھے لگتے ہیں۔

"پوشن پچھ کم ژٹند انتظار کس کیوت چمن میدان تیار
ترہ پیٹھ چہ گیت تاہ گُل کرو بلبلو دیدارِ گُل"
مہجورؔ در شعر و سخن گگرن سپن گُل چین مہ بن

ادہ مُچھک ژٔہ دعوئ دارِ گُل   کرو بُلبُلو دیدارِ گُل "

(پھولوں کو کس کا انتظار ہے؟ کس کے لئے پَن سج رہا ہے ؟)

(ٹہنیوں پر پھول بے قرار ہو رہے ہیں ۔ بُلبُل دیدارِ گُل تو کر لو!)

(مہجور! شعر و سخن میں گلگشن بن، گل چین نہ بن، جبھی تو گُل کا دعویٰ دار گردانا جائیگا)

مہجور کے اس صحت مند اور حسین نظریئے نے میرا من موہ لیا تھا۔ میں اُسکے تازہ کلام کیلئے ہمہ تن گوش ہونے لگا۔ کالج کُھلنے پر سرینگر لوٹ آیا، تو معلوم ہوا کہ اُن دنوں شاعر ہندواڑے میں پٹواری تھا، اور اپنے گاؤں ترال کام جاتے وقت کبھی کبھار ہی وہ شہر میں قیام کرتا۔ اسی لئے اُس سال شاعر سے ملاقات کرنے کا میرا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ پھر بھی اُس کی غزلیات کے تین چھوٹے سے مجموعے پڑھنے کا شرف حاصل ہو ہی گیا۔ اُنہی دنوں (کالج کے) پرتاپ میگزین کا کشمیری حصہ ترتیب دینے کا کام میرے ہاتھوں میں آگیا اور شاعر کی اہمیت میرے لئے اور بھی بڑھ گئی۔

چند ہی ماہ بعد مہجور کی ایک نئی غزل شہر کے نیچے نیچے کی زبان پر سُنائی دی جس نے مجھ پر جادو سا کر دیا، اور میں کئی دن اکثر گنگناتا رہا۔

مُسلہ گژھو بیدار گُلِ بوستانٔے   بُلبُل سِندٕ افسانٔے بوز

گاش آو مُژراو چشم مستانٔے   بُلبُل سِندٕ افسانٔے بوز

(سویرے سویرے جاگ اُٹھ اے گُلِ بوستاں، بُلبُل کے افسانے سُن۔ پو پھٹی کھول دے مستانہ آنکھیں، بُلبُل کے افسانے سُن!)

مجھے ایسا لگا جیسے شاعر خود بُلبُل بن کر اپنے وطن کے گُلوں کو صدیوں کی نیند سے جگا رہا ہو۔

حُسن اور عشق کی حیات پرور رنگینیوں کا جو دلفزا اظہار مجھے مہجور کی غزلوں میں ملنے لگا تھا، اُس سے میں اُس کا اور بھی مداح ہوتا گیا۔ اور "گریس کور" (کسان کنیا) جیسا فن پارہ پڑھکر تو میں اُسے کشمیری زبان کے لئے ایک بیش بہا نعمت سمجھنے لگا۔ فطرت کی آزاد فضاؤں میں پروان چڑھنے والے غیر مصنوعی حُسن کی پتلی کس خندہ پیشانی سے مشقت کی سختیاں جھیلتی ہے، اس کا ایک دلکش بیان مجھے اس نظم میں ملا۔ اور شاعر کی مقدرس صلاحیتوں کا ایک روشن اشارہ بھی اسکا نیا شعور ان تصویروں میں سے جھانک رہا تھا۔

ژٔہ تہٕ خوجہ بایِن چھ برابر ئے   ژٕہ گُلن سیت دلبر ئے

خوجہ بایہ ترٕ پتھ دارِ تہٕ بَرٕ ئے   گرِیس کورٕ نازنین سوندر ئے

(تیری اور خوجہ مستورات کی برابری ہی کیا؟ تو گُلوں کی ہم جولی ہے خوجہ مستورات تو در و دریچے بند کر کے اندر ہی اندر بیٹھی رہتی ہیں۔ اے کسان کنیا، نازنین، سندری!)

دچھ پیٹھ وُچھم کھ تھٕ لَنٛدتھ نٔے   لوٕ کران لولرٔے

زٕہ مانو سے ژوٗرٕ کرٕ کرٔے   گرِیس کورٕ نازنین سوندرئے

(کھیت پہ تجھے دیکھا، آستین چڑھائے تھی، لولری تو ' ولو ' گنگنا رہی تھی گوڈی کرتے کرتے تیری باہیں تھک تو نہیں گئیں؟)

آستین چڑھائے گوڈی کرتی ہوئی کسان کنیا کا 'لولو' گنگنانا مجھے ورڈزورتھ (Wordsworth) کی سولٹری ریپر (Solitary Reaper) کی شیت سے کسی طرح بھی کم دلکش نہیں لگا۔ بلکہ کسان کنیا کے محنت کش حُسن کی یہ جھلکی مجھے بہت اچھوتی دکھائی دی۔

کٲتِک زُن چھہ کالہ ابرکِ ٹھٕرٔے

(مانو کاتک کے چاند کو کالے بادلوں نے گھیر رکھا ہو۔)

۱۹۳۱ء میں مطلق العنان حکومت کے ساتھ کشمیری عوام کی جو شدید ٹکر ہوئی، اُس نے مہجور کے انقلابی شعور کو اور بھی جِلا بخشی۔ ' ولو ہا باغوانو نو بہارُک شان پیدا کر ' میں اُس نے باغبان کو جو دعوتِ عمل دی، اُس میں کشمیری عوام کے لئے بیداری اور جد و جہد کا ایک نیا پیغام تھا۔

چمن ویران روان شبنم، ژٕٹتھ جامہ پریشان گُل

گُلن تہٕ بُلبُلن اندر دوبارہ جان پیدا کر

اگر چھُے ژٕہ نادٕ حن بستی گُلن منز تراو زیر و بم

بُنیول کر، واو کر، گگرایہ کر، طوفان پیدا کر

(چمن ویران ہے، شبنم آنسو بہا رہی ہے، گُل جامہ چاک کئے پریشان ہے، گلوں اور بُلبلوں کے اندر دوبارہ روح تو پھونک دے!)

(اگر تو گُلوں کی بستی کو جگانا چاہتا ہے تو زیر و بم کو تلاطم دے، بھونچال لا، آندھی اُٹھا، گرجتا جا اور طوفان مچا!)

مہجور کی یہ للکار کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی سرگرم عمل کشمیری عوام کا ڈھارس بندھاتی رہی مجھے اچھی طرح یاد ہے، اُن دنوں قومی تحریک کے سلسلے میں جتنے بھی جلسے ہوئے، اُن کی کارروائی اسی ترانے سے شروع کی جاتی اور اس طرح مہجور کی یہ غزل جلد ہی قومی ترانہ بن گئی۔

اب میرے سامنے شاعر کا ایک اور ہی تکیہ ابھرتا گیا۔ میں جیران تھا کہ حُسن

اپریل مئی ۱۹۸۸ء

وشن کے دل کو نظے والا اپنے والا ایک پکاری انقلاب کا اتنا پُر جوش ترانہ کیسے لکھ سکا تھا۔ شاعر سے ملنے کی میری تمنا اور بھی بے قرار ہو اُٹھی۔

انہی دنوں مجھے ایک مکالمہ جو دینا ناتھ ستیارتھی نے مہجور پر لکھا تھا، پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے ساتھ ان کی تصویر بھی شائع کرائی گئی تھی۔ مجھے "وشو بھارتی پتریکا" (کلکتہ) میں چھپا 'پوشہ متہ جانانو' کا (پنڈت آنند کول بامزئی کا) انگریزی ترجمہ بھی ملا، جسے ٹیگور نے بہت سراہا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد بلراج ساہنی کا ایک مضمون بھی پڑھنے کو ملا جس میں اُس نے مہجور کی شاعری کا جائزہ لیا تھا۔ شاعر کی یہ عزت افزائی دیکھ کر میں مسرت سے پھولا نہیں سمایا۔

مہجور ان دنوں سرینگر بہت کم آتا تھا۔ لیکن میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، جب جون ۱۹۴۱ء کو ایک دن میری دیرینہ خواہش پوری ہو ہی گئی۔ میں ہری سنگھ ہائی سٹریٹ سے جا رہا تھا کہ آگے سے شاعر آتا دکھائی دیا۔ "کلام مہجور" کے سر ورق پر میں نے اُس کی تصویر دیکھی تھی۔ بھاری بھر کم سفید دستار، جھریوں سے مزین چوڑی پیشانی، گھنی بھوؤں کے نیچے چمکتی ہوئی آنکھیں، سکھ رانگ کی گھنی مونچھیں، بولتے سے ہونٹ اور ہنس مکھ چہرہ ــــ سبھی کا اشارہ تھا یہی تو مہجور ہے!

میں بے صبری سے بول پڑا ــ "آداب عرض مہجور صاحب!" شاعر نے بڑی حلیمی سے جواب دیا ــ "آداب عرض، سُنائیے، اچھے ہیں؟"

مجھے ایسا لگا کہ میں اُسے برسوں سے جانتا تھا۔ ایک ہی سانس میں بولا ــ "آپ کی عنایت، سُنائیے کب تشریف لائے؟ آپ سے ملنے کی زبردست خواہش تھی۔ دیرینہ خواہش۔"

مہجور نے مسکرا کر پوچھا ــ "کہیے کیا حکم ہے؟"

"آپ کا کلام پڑھ کر آپ سے ملنے کو بیتاب تھا!"

اپنی کمر کو لاٹھی کے سرے کا سہارا دیتے ہوئے شاعر بڑی نرمی سے بولا "یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ کو میرا کلام پسند آیا۔ آپ کالج میں پڑھتے ہیں؟"

میں نے جھینپ کر جواب دیا ــــ "جی نہیں، ان دنوں کا نونٹ کالج میں پڑھاتا ہوں۔"

مہجور کی آنکھیں دمک اُٹھیں۔ بڑے تپاک سے کہنے لگے ــ "اوہ! معاف کیجئے۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

مہجور نے بائیں ہاتھ سے ٹھوڑی کو کھجلاتے ہوئے بڑے پیار سے کہا ــ "چلئے۔ کہیں ضروری کام تو نہیں جا رہے ہیں؟"

مسحور سا میں چپ چاپ اُس کے ساتھ ہولیا۔ تانگی کدل والے اُسکے مکان کی چھوٹی سی بیٹھک میں اُس دن پورے دو گھنٹے طرح طرح کی ادبی اور تہذیبی بات چیت ہوتی رہی۔

کچھ دیر تک کشمیری شاعرہ حبہ خاتون کا تذکرہ رہا۔ میرے سوال کا وہ بہت متانت اور سلیقے سے سلجھا ہوا جواب دیتا رہا۔ اُسی روز مجھے اُس کی ابتدائی زندگی میں جھانکنے کا بھی موقع ملا۔ یہ جانکر مجھے تعجب ہوا کہ پیرزادہ ہوتے ہوئے بھی وہ بچپن سے ہی مذہب زدگی اور توہم پرستی کے خلاف نبرد آزما رہا تھا، عربی فارسی کی روایتی تعلیم پاکر بھی اُس نے پیر بننے سے انکار کر دیا تھا اور گھر کے گھٹے گھٹے ماحول سے اُکتا کر وہ ۲۰ سال کی عمر میں اپنے گاؤں (متری گام) سے بھاگ نکلا تھا۔ لاہور میں جاکر اردو شعر کہنے لگا تھا، اور مہجور تخلص کیا تھا۔ امرتسر میں مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا ــ "یہ ہجر کس سے؟" مہجور نے جواب دیا تھا ــ "اپنے وطن سے!"

شبلی نے پھر سوال کیا: "اور وطن لوٹنے کے بعد؟" مہجور بولا ــ "آپ سے!"

اُس کی اس حاضر جوابی سے شبلی بہت متاثر ہوئے تھے۔ آخر ۱۹۰۸ء میں جب وہ کشمیر لوٹ آئے تو اُس نے محسوس کیا کہ کشمیری زبان کو اپنا کر ہی اُسکی شاعری اپنے معراج کو چھو پائیگی۔

مہجور نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بچپن میں مقبول شاہ کرالہ واری کی گلریز کے شاہزادہ عجب الملک اور نوش لب کی داستانِ عشق اُسے بہت پسند آئی تھی۔ بعد میں محمود گامی اور اس سے بھی زیادہ رسول میر کے تغزل نے اُسے متاثر کیا تھا۔ لیکن سب سے پہلے کشمیری میں شعر کہنے کی تحریک اُسے ۱۹۱۸ء میں حبہ خاتون کے ایک مقبول عام گیت سے ہوئی تھی۔ گاؤں کی کسان لڑکیاں میدان میں ساگ چُنتی ہوئی گا رہی تھیں۔

"گوشن منز با دھراوے   ولو بیانہ پوشہ مدنو"
(کنجوں میں تیرے لئے فرش کر دوں گی۔ آ جا میرے پھول پیارے مدن (محبوب))
اور اِسے سُن کر مہجور بھی گنگنانے لگا تھا ــ
"... ندلیما روشہ رو شے   پوشہ متہ جانانو"

اپریل ۔ ۱۹۸۶ء

اپنی ابتدائی غزلوں میں گُل و بُلبل کی اشاریت پر روشنی ڈالتے ہوئے شاعر نے کہا۔ "اُن دنوں میرے سامنے یہی سوال تھا کہ کشمیری زبان کی طرف پڑھے لکھے لوگوں کو کیسے رجوع کیا جائے۔ اسی لئے میں نے گُل و بلبل کی شاعری کو ہی نئے رنگ و روپ میں پیش کیا۔"

اس پر میں نے اُسی کا ایک مصرع سُنا دیا۔

"لولہ سازس تازہ لَے ہیتھ آیہ مہجورن غزل"

(محبت کے ساز پر تازہ لَے لیکر ہی مہجور کی غزلیں آگئیں !)

شاعر کے پُر جلال چہرے پر معصوم بچے کی سی بھولی مسکان کھل اُٹھی اور 'پیام مہجور' میں سے اُس نے ایک پیارا بند سُنایا۔

" وندہ ژلہ شین گلہ ہیۍ ییۍ بہار
مہجورہ لولک ساز تھو تیار
گُل پھولن پانئے ژہ ذرا بہانہ بن
جان بن جان بن جانانہ بن !"

(جاڑہ بیت ہی جائیگا، برف پگھل ہی جائے گی، بہار پھر سے آئیگی، مہجور! ساز محبت تیار تو رکھ۔ پھول کھلیں گے آپ ہی، ذرا بہانہ تو بن، پیارا بن پیارا بن، جاناں بن !)

اس پر مجھے انگریزی شاعر شیلی کے غیر فانی الفاظ یاد آگئے۔

"If winter comes
Can spring be far behind!"

(اگر جاڑہ آتا ہے تو بہار کو آتے دیر لگیگی کیا؟ ")

شاعر کو میں نے اس کا ترجمہ سُنایا، تو اظہار کی اس یگانگت سے بہت محظوظ ہوا۔ اس سے پہلے اُسے شیلی کے بارے میں سُننے کا کبھی بھی موقعہ ہی نہیں ملا تھا۔ اس لئے اثر پذیری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

خیر کشمیر کی سیاسی زندگی پر تو جاڑے اور بہار کی یہ اشاریت بہت ہی موزون تھی۔ اس لئے میں نے شاعر کی گُل اور غزلوں کی اشاریت کے بارے میں بھی اپنا ذہن صاف کرنے کی کوشش کی۔ ایک غزل میں شاعر نے کہا تھا۔

" وتہ جان دِچھہ ہا وارہ نظرن رأچھ چھم کم تام
بوزم ون گرتم رأچھ دلچ بہ مایہ کنے کیا "

(میں بھی بھر کر تیری راہ تکتا، مگر میری نظروں میں کسی کی کڑی نگرانی ہے۔ سُنتی ہوں کہ اب میرے دل کی راہ پر بھی پہرہ بٹھایا جائیگا !)

میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "اس مصرع میں آپ نے محض عاشقوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے یا کہ ملک کے سماجی، سیاسی ماحول کو بھی جھلکایا ہے؟"

اس پر وہ ہنس پڑا اور بولا۔ "یہ بتانا تو آپ جیسے نقادوں کا کام ہے مجھ جیسے شاعروں کا نہیں۔"

کس حُسنِ اخلاق سے شاعر نے نقاد سے پنڈ چھڑا لیا !

دو گھنٹے کی اس ادبی گفتگو کے بعد میں نے مہجور کا دلی شکریہ کیا۔ اور وداع مانگی تو بولا۔ "بس؟ تھک گئے؟ چائے پی کے جائیگا !"

میں نے بھی اُسی انداز سے جواب دیا۔ "جی، میں تو تھکنے کا نام نہ لوں ڈرتا ہوں کہیں آپ کو تھکا نہ دیا ہو !"

تو میرا ہاتھ پکڑ کر وہ پیار سے بولا۔ "بالکل نہیں، بالکل نہیں، بیٹھ جائیے دیکھتے ہیں کون پہلے تھکتا ہے !"

بیٹھک قہقہوں سے گونج اُٹھی، اور میں آداب عرض کرکے چلا آیا۔ جاتے جاتے میرے تصور میں رہ رہ کر اُس کمرے کے نقوش اُبھرتے رہے۔ چاروں طرف کتابیں، کھڑکی کے پاس گھسی ہوئی دری پر گاؤ تکیہ کا سہارا لئے ہمارا محبوب شاعر شیریں کلامی میں بھولی مسکراہٹیں گھول رہا ہے۔ آج بھی وہ تصویر میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوند جاتی ہے اور اُس کے بعد چلتی پھرتی تصویروں کا ایک چکر سا گھوم جاتا ہے جس میں بعد کی کئی ایک ملاقاتوں کے مرقع بھی کھل پڑتے ہیں ۱۹۴۶ء تک مہجور کی شاعری نئی ڈگر پر بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ 'کاشر زنانہ'، 'دنیائے نرأود مائے تھأود کأشرو'، 'آرہ ولن منز'، 'باغو نامہر لٲگ'، 'زون'، 'تازہ یادمن چھم'، 'نوکشیر'، 'سنگرمالن پیو پراگاش' اور 'یلے بوز لے تھو زنانس سیت' جیسی بڑھیا چیزیں ۱۹۴۲ء — ۱۹۴۷ء میں ہی لکھی گئی تھیں۔ ان میں نئے دَور کے نئے شعور کا جو پُر اُمید اور جوش بھرا پیغام پھوٹ پڑا وہ ہنگامی ہوتے ہوئے بھی دیرپا ہے۔ نئے کشمیر کی تعمیر کو اس سے تقویت پہنچی ہے اور پہنچتی ہی رہیگی۔ اُس نے ہم پہ احساس جگایا ہے کہ —

" وارہ وارہ دارلی گژھن نابود بُلبل تہ کستور واین سرود
باغ کرسو رگس یئت مان مان ...
یلہ کھسہ نوسماتک رَو گژھہ پییہ جانی ڈیہ پرتو
اد گژھہ روشن سوڈی جہاں

دِوارِلی، جیسے خونخوار شکاری پرندے۔ دھیرے دھیرے نابود ہو جائیں گے بلبلیں
اور گلستور شرمد بجائیں گے، ہمارا باغ سورگ سے ٹکر لے گا۔)
(جب نئے زمانے کا سورج چڑھیگا تو پہلے تیرا ہی دالان جگمگ جگمگ کر اٹھیگا
بعد میں سارا جہاں منوّر ہو اٹھیگا۔)

کیونکہ —

"ہرُدک طوفان پوشہ تھرہ ژالن   سونت بیہ دوبہ اکہ تلہ گژخاش
شوبی پھولتن لیُش دِیہ جنجالن   سگرمالن بیہ پراگاش"

(پھول کی ٹہنیاں خزاں کے طوفان کو برداشت کرلیں گی، تو ایک روز بہار لوٹ
آئیگی تو اُن کے بارے میں ضرور باز پُرس کریگی۔ وہی تو پھولیگا جو مصیبتوں سے
بھی نہیں گھبرائیگا۔ کیونکہ پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں (نئے دَور کی نئی روشنی سے)
جگمگ جگمگ کر اُٹھی ہیں!)

اور جس نئے کشمیر کیلئے مسلسل کوشاں رہنے کی تلقین مہجور نے کی ہے اُسکی
یہ جھلکیاں منصوبہ بندی کے موجودہ دَور میں ہمارے دِل و دماغ کو روشن کرتی ہی
رہیں گی۔

"شنیاہ چاپِن نہ سہ روزن شنیاہ شنیاہن اندر بسہ نَوی دُنیا
گلشن بنہ ویرانا ....
ازغلس پیوند دِن دِیوہ دارُک، ویرِ ہچہ آسہ دِن ژندن دارُک
سارِسی بنہ یکسانا!
ہتھیار کھولن مذہب دارن، یتہ بورِ بنہ تِم اکھ اکس مارن
مذہب روزِہ اکھ نشانا!

(تیرے ویرانے ویرانے نہیں رہیں گے، وہ گلشن بن جائیں گے، اور اُن کی جگہ ایک
نئی دنیا آباد ہو جائیگی .... (جہاں) کانٹے دار (زہریلے) پودوں کو دیودار کا
پیوند لگایا جائے گا۔ بید کی لکڑی کو چندن کی پائداری عطا ہوگی، اور سب کی
ایک سی قدر ہو گی!)

(مذہب داروں کے ہتھیار کھول لئے جائیں گے تاکہ آئندہ وہ ایک دوسرے کا کام
تمام نہ کر بیٹھیں، مذہب محض ایک نشانی رہ جائے گا!)

قبائلی حملے کے دنوں میں جموں میں تھا لیکن ۱۹۴۹ء کی گرمیوں میں میں
نے شاعر کو دیکھا تو اُداس پایا۔ پٹواری کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اُسے چار
پانچ سال ہو چکے تھے۔ پنشن ۱۵ روپے ماہوار سے کم ہی بنتی تھی، ایکطرف یہ اقتصادی

صورت حال اور دوسری طرف کس مپرسی کا ماحول! شہر میں اُس کا دل لگتا تو کیسے؟
۲۲ میل دُور اپنے گاؤں (متری گام) میں الگ تھلگ رہ کر وہ اپنے قریبی دوستوں
اور قومی زندگی سے بھی دُور دُور ہونے لگے۔ تھے۔ مجھے یہ دیکھکر بڑا دُکھ ہوا۔ کلچرل
کانفرنس کے کارکنوں سے اُس کا رابطہ بنائے رکھنا نہایت ضروری تھا۔ لہذا موقع
پاکر ایک روز نادم اور میں ان کو بھی مہجور کے گھر لیگیا۔ کھُل کر باتیں ہوئیں۔ 'یوم
مہجور' منانے کا فیصلہ ہو گیا۔ بڑی مشکل سے مہجور ۲۳ ستمبر ۱۹۵۰ء کو سرینگر آنے
پر راضی ہو گیا۔ 'یوم مہجور' بڑی دھوم سے منایا گیا۔ ریڈیو کشمیر سرینگر سے شاعر
نے اپنی ایک تازہ نظم 'ولو ہا پوشہ نولو' نشر کی۔ اُس کی شاعری پر ایک سنگیت
روپک پیش کیا گیا۔ اور محکمہ ریڈیو کی طرف سے اُسے ایک تھیلی بھی نذر کی گئی،
رات کو کلچرل کانفرنس کے دفتر (نمائش گاہ) پر ایک بھاری جلسہ ہوا جس میں شاعر
کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ اُس کی زندگی اور شاعری پر روشنی ڈالی گئی اور
غنائیے پیش کئے گئے۔ اُس تہذیبی تقریب کی صدارت کرنے کا جو خوشگوار شرف
مجھے ملا اُس پر مجھے ہمیشہ فخر رہیگا، کیونکہ اُس روز اپنے محبوب شاعر کی پینسٹھویں
سالگرہ پر ہم ایک ادبی جشن منا رہے تھے۔ اُس روز مہجور نے پہلی بار محسوس کیا
ہوگا کہ ان پڑھ عوام ہی نہیں، پڑھے لکھے کشمیری بھی اُسکی قدر و قیمت جاننے لگے
ہیں اور کشمیری زبان کی ادبی صلاحیتوں کے قائل ہو رہے ہیں۔

اپنے خطبے میں اُس نے اپنی شاعری کے اُتار چڑھاؤ پر روشنی ڈالتے ہوئے
کہا۔ "میں خوش ہوں کہ اب میرے شروع کئے ہوئے کام کو جاری رکھنے والے
نوجوان شعرا کی کمی نہیں رہی ہے!"

اُس وقت کسے معلوم تھا کہ ڈیڑھ سال کے اندر ہی وہ اپنے ادھورے
کام کو پورا کرنے کی ذمہ داری اپنے ساتھیوں پر ڈالکر ہمارے بیچ سے چل دیگا!
ابھی ہمیں اُس سے بہت کچھ حاصل کرنا تھا۔ نیا کشمیر کے بارے میں اس کا شعور
کتنا پختہ اور سلجھا ہوا تھا، یہ دیکھنا ہو تو 'ہا گُلِ لالو' 'آیہ آزادی' 'مادر مز
سانِ البانئے' اور 'پوشہ نولو ہو شہ سان روز' کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا۔ بعد میں
دور میں جو بے ضابطگیاں اور دھاندلیاں ہوتی رہیں اُن سے وہ برابر ٹکر لیتا
رہا جبھی تو اُس کی شاعری کا طنزیہ انداز نکھرتا گیا اور اُس کی اجتہادی آواز
گمبھیر ہوتی گئی۔ مجھے یاد ہے کہ کلچرل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں جب اُسکی
'لالو لالو ہا گُلِ لالو' پڑھکر سُنائی گئی تو چاروں طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ حاکم شاہی
کے علمبردار دم بخود ہو گئے تھے اور سچی جمہوریت کے حامی سر دھن رہے تھے

مہجور کے چند اشعار پر تضمین کا خمسہ

غلام نبی خیال

نذرِ مہجور

زندگی ہُند مس تمی چیو یُس بنیو وُمت نہ چون
پُچھ تماہ تس درا یے یس حاصل سپُد یارانہ چون
یان دُب دُب کرنہ لوگ دِل تان روٹ دامانہ چون
"ساقیا آباد روزِن تا ابد مے خانہ چون
آفتابک پاٹھ پرزلِن دم بدم پیمانہ چون

لول گوو زُو جان ہارُن لولہ بابارس اندر
نظرِ تل تھاوِن چمن تہٕ دِن دو وٹھاہ نارس اندر
زندگی ہند ژانگ زالُن موتکس غارس اندر
"تیل لبتھ نزدیک پوشن جایہ گلزارس اندر
ییلہ گرٹیلہ پوشہ لترو تل روٹ کنڈو دامانہ چون"

بُلبُلن مشہ نالہ زارِی کارِہ تھمہ ژلہ سُنبلن
رنگین ویران ونن منز شاد بانگ گُل پھولن
یلہ منزل نادلاین دُور ہیمتن قافلن
تیم زہ یُد باہم رلن ادہ کوہ الن سنگر ڈلن
دردِ مُحبت یم میان آ کو سازتے سامانہ چون"

مہجور

ترجمہ

زندگی کی شراب اُسی نے پی جو تمہارا مستانہ بن گیا۔
اُس کے ہزاروں ارمان پورے ہوئے جو تمہاری دوستی حاصل کر سکا
جب بھی دل دھڑکنے لگا تو رندوں نے تمہارا دامن تھام لیا۔
"میرے ساقی! تمہارا میخانہ ابد تک آباد اور سلامت رہے۔
میری تمنا ہے کہ تمہارا پیمانہ آفتاب کی طرح نُورافشاں ہو"
سودائے عشق میں جان کی متاع ہارنے کو ہی عشق کہتے ہیں۔
گُلستان کو پیشِ نظر رکھکر آتش میں کود پڑنا چاہیئے۔
موت کے تاریک غاروں میں زندگی کے چراغ روشن کرنے چاہیئں۔
"تُو نے اُسی صورت میں چمن میں گُلوں کے ساتھ جگہ پائی۔
جب پہلے خارزاروں نے تمہارے دامن کو تار تار کیا"۔
بُلبُلیں گریہ وزاری بھول جائیں گی اور سُنبل کی گردن میں خم نہ رہیگا
رنج وغم کے اُجاڑ بنوں میں مسرت کے پھول کھلیں گے۔
جو قافلے ابھی منزل سے دُور ہیں منزل اُنھیں خود پکاریگی
"ان دو کا جب بھی ملاپ ہوگا تو کوہستان ہل اُٹھیں گے۔
میری دردبھری پکار اور تمہارا ساز وسامان اے ساقی!"

دہلی، مئی [illegible]

چانہٕ رویک بُوزِتھ پیٚوٚ نوره پرٛتو سنگرن
یان وُچھ چانِ اسنہ لگ پلپوش ہی پھوٚل منز سرن
چون دامن یِم رٹن تِم مَس حیاتُک باگرن
زار چھنہٕ پننین تہٕ پرٛدین دیندارن کافرن
لوٚلہ والین سارِنی کیٛوٚت وَتھ چھو دسترخوان چون"
وُچھ خیال از بیٚیہ چھو وُزه ناوان تمُے مِیوٚٹھ سوز
بیت یمُے دِینز لیٚو گیوٚو وارلیٚو دِیوٚت نوز نوز
بُس پران اوس مالِکسی منز نوبہارُک نغمہٕ بوز
"تازه غزلاه آو ہیٚتھ مہجورِ کن دارِتھ ژه روز
نکتہ زاوٕل بوزه ناوان گاٹلین دیوانہٕ چون"

تمہارے رُخ کے بارے میں سُنتے ہی پہاڑوں کی چوٹیاں منور ہو گئیں
جب بھی تمہارے ہونٹوں پر تبسم آیا تو جھیلوں میں کنول کھل اُٹھے
تمہارا دامن جو تھام لیں گے دوسروں کو جام حیات پلائیں گے
"تو نے کبھی اپنوں بیگانوں یا دینداروں اور کافروں میں تمیز نہ کیا۔
تمہارا دسترخوان لئے ہوئے ساقی! سبھی کیلئے بچھا رہتا ہے۔"
دیکھ کہ آج خیال پھر اُسی کے شیریں ساز کو چھیڑ رہا ہے۔
جس کے گیت بلبلوں نے گائے اور زاغ و زغن ہراساں ہوئے
جو جاڑوں میں ہی بہار کے نغمے سُنتا تھا۔ تو بھی سُن۔
یہ مہجور تازہ غزل لیکے آیا ہے گوش بر آواز ہو!
"تمہارا دیوانہ زیرکوں کو باریک نکتے سُنا رہا ہے اے ساقی!"

●

آبشار اہربل

از مہجور کاشمیری

اہرہ بلچ نازنینِ ماه پیکری یاں ژادری
حوٗر سودٕرچ یا پرستانچ پری یاں ژادری
چانِ تن نوٗرک بدن ولہ ناوِ کم کاری گرن
ہیرہ بُرنہٕ پانس جواہر کم جری یاں ژادری

(ترجمہ:-)

اہربل کے حسین آبشار تُو ماہ پیکر ہے۔
یا جنت کی حور یا پریوں کے دیس کی شہزادی۔
تیرے جسم پر نور کا پیراہن کس فن کار نے سجایا۔
اور تیرے سراپا کو کس نے جواہرات سے مالا مال کر دیا۔

مہجور
جولائی ۱۹۳۳ء
بمقام اہربل۔ شوپیان

تحریر

اپریل مئی [illegible]

۱۵

[illegible] داس لاہوتی

کشمیری زبان کا عوامی شاعر ـــــــــ مہجورؔ

کشمیر کی خوبصورت وادیاں، دلکش مناظر، صحت بخش سبزہ زار اور روح پرور جھیلیں ہمیشہ سے جنت نگاہ رہی ہیں۔ شعرا نے اس پھولوں کی سرزمین کے راگ الاپے ہیں، افسانہ نگاروں اور فنکاروں نے اس بہاروں کی بستی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ سیاحوں نے اس حسن و جمال کی دنیا کے قصیدے پڑھے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس کشمیری عوام کی سماجی اور تہذیبی حالت انتہائی پست رہی ہے۔ اور اس کے کئی اسباب ہیں۔ یہ موقع نہیں ہے کہ اس پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جائے۔ البتہ مہجورؔ کے بارے میں کچھ لکھنے سے قبل پس منظر کے طور پر کشمیری زبان اور ادب کا مختصراً جائزہ لیا جائے۔ تو زیادہ مناسب ہوگا۔ تاکہ مہجورؔ کی شاعرانہ عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

کشمیری زبان کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ پندرہ سو سال قبل آریاؤں نے یہاں بسنے والی جنگلی قوموں پر اپنا اقتدار جمایا اور ان پر حکمرانی کرنے لگے۔ ان لوگوں نے سنسکرت زبان کو اپنی "راج بھاشا" بنایا اور وہ تقریباً ایک ہزار برس تک کشمیری زبان کو متاثر کرتے رہے۔ لیکن اس کی بناوٹ اور اصلیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور نہ اس کا اندرونی ڈھانچہ ٹوٹ سکا۔ کشمیری عوام نے سنسکرت زبان کی طاقت کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔ بلکہ اپنی مادری زبان کی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ کشمیری زبان کا تھوڑا سا قدیم ادب ہمیں "شاردا" رسم الخط میں بھی ملتا ہے۔ جو غالباً اس وقت لاہور کے میوزیم میں محفوظ ہے۔ آج کل تو اس رسم الخط کا کہیں بھی رواج نہیں ہے۔ آریاؤں اور برہمنوں کے دورِ حکمرانی کے بعد مسلمانوں نے کشمیر کو فتح کر کے فارسی زبان کو سنسکرت کی جگہ رائج کیا۔ جس کی بنا پر فارسی رسم الخط کا بھی رواج پڑا۔ لیکن اس رسم الخط کی سب سے بڑی خامی پائی گئی کہ صوتی اعتبار سے فارسی پورے طور پر کشمیری زبان کے تعبیر

لفظوں کو ادا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے اس کے یہ اثرات دیرپا ثابت نہیں ہوئے۔ لیکن پھر بھی یہ اثرات اتنے گہرے تھے کہ آج تو نئے لکھنے والوں کے سامنے رسم الخط کا بہت ہی پیچیدہ مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک فارسی کا زور رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج یہاں پر شہروں میں فارسی آمیز کشمیری زبان بولی جاتی ہے۔

برہمنوں کے دورِ حکمرانی میں کشمیری زبان کے عوامی ادب کا کیا حال تھا اس کا کوئی مستند حوالہ ابھی تک مجھے نہیں مل سکا ہے۔ کیونکہ چودھویں صدی سے قبل کی تخلیقات شاید محفوظ نہیں رہ سکیں۔ سلطان زین العابدین کے دورِ حکمرانی یعنی ۱۴۱۷ء سے ۱۴۶۷ء میں ایک مشہور شاعر کی لکھی ہوئی ایک نظم "یا ناسر کتھا" ملتی ہے جو شاید کشمیری زبان میں کہی جانے والی پہلی نظم ہے۔ صوفی شاعرہ "لل دید" کشمیری زبان کی پہلی شاعرہ گذری ہیں۔ جنہیں کبیر داس کی طرح ہندو اور مسلمان دونوں ہی مانتے ہیں۔ یہ چودھویں صدی عیسوی کی بات ہے۔ اسی زمانے میں شیخ نور الدین اور سوم پنڈت نے بھی کشمیری زبان میں نظمیں کہی ہیں۔ مگر اس دور کی جس شاعری کا مجھے پتہ چلا ہے اس میں خواتین کی تخلیقات زیادہ نمایاں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مرد تو درباری ہو گئے تھے۔ اور وہ فارسی ہی میں اپنے خیالات کو پیش کیا کرتے تھے۔ اکبر نے جب کشمیر کو فتح کیا تو وہاں کی مشہور شاعرہ "حبہ خاتون" تھیں جن کے شوہر کو اکبر کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس واقعہ کا شاعرہ پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ وہ جوگن بن کر گھر سے نکل گئی۔ اور پھر اس کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ اس کی بہت سی نظمیں آج بھی عوام کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں۔ اسی طرح سے انیسویں صدی عیسوی تک ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ طور پر کشمیری زبان اور ادب کو پروان چڑھایا۔

[illegible]

لیکن جس شخص نے آج سے سو سال پہلے جدید کشمیری ادب کی بنیاد رکھی اس کا نام "محمود گامی" ہے۔ اس نے کشمیری زبان میں ایرانی طرز پر "یوسف زلیخا" "لیلیٰ مجنون" وغیرہ کی تخلیق کی۔ لیکن ان کی یہ تخلیقات فارسی سے مبرا کشمیری بھاشا میں تھیں اس لئے اعلیٰ طبقہ میں ان تصنیفات کو کوئی جگہ نہیں مل سکی۔ مگر اس کے بعد سینکڑوں ادیبوں نے اسی کشمیری بھاشا میں لکھنا شروع کیا۔ اس زمانے میں فارسی کا اتنا زور تھا کہ ان ادیبوں کی تخلیقات کو حکومتی ایوانوں سے یہ کہکر پھینک دیا گیا کہ "یہ صرف جاہلوں کی بکواس ہے"۔ پھر بھی سیف الدین اور ستی پنڈت اس دور کے اچھے ادیب مانے گئے جن کی آج بھی قدر کی جاتی ہے۔ کشمیری زبان کی لوک کتھاؤں اور گیتوں کا سب سے اچھا اور نمائندہ مجموعہ ۱۸۹۳ء میں "جے ہنٹن نولے" نے مرتب کیا اسی طرح سے ۱۸۹۷ء میں پنڈت ایشور کول نے سنسکرت میں کشمیری لغت مرتب کی جو بعد میں گریرسن نے ۱۸۹۳ء میں اپنی زیر ادارت شائع کی۔ لیکن جب کشمیری عوام کا شعور بیدار ہونے لگا۔ تو انہوں نے کشمیری زبان اور ادب کی ایک مستند تاریخ مرتب کی اور آج بھی بہت سے لوگ اس زبان کے ادبی ذخیروں کی چھان بین کر رہے ہیں۔ اس مختصر سی تمہید اور پس منظر کے بعد اب ہم مہجور کی جانب رجوع ہوتے ہیں۔

موجودہ دور میں کشمیری زبان کے تین مشہور مانے گئے ہیں — مہجور، آزاد اور غلام حسن بیگ میں اپنے اس مضمون میں صرف مہجور کا ذکر کروں گا۔ کیونکہ کشمیری ادب میں ان کا بہت بلند مرتبہ اور مقام ہے۔ آزاد اور بیگ نے ان سے نہ صرف اکتساب کیا ہے بلکہ عوامی شاعر کے درجے تک پہنچنے کے لئے ان لوگوں نے مہجور کی رہنمایانہ سرپرستی بھی حاصل کی ہے۔

غلام احمد مہجور بہت ہی سنجیدہ شخصیت کے حامل انسان تھے۔ لمبا قد، گورا رنگ، آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ ایک نقاد کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ آپ (مہجور) اپنی شاعری میں فارسی الفاظ کا زیادہ استعمال کیوں نہیں کرتے؟ کہا کہ "اس سیلاب کو روکنے کے لئے قدرت نے مجھے پیدا کیا ہے"۔ ان کے اس بیان میں تعلی نہیں بلکہ حقیقت کی نمایاں جھلک پائی جاتی ہے۔

تعمیر

ان کے والد پیرزادے تھے۔ جن کی چھوٹی سی کھیتی باڑی بھی تھی ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی اس کے بعد یہ سری نگر میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ان کے استاد خود شاعر تھے جن کا عاشق تخلص تھا۔ جو فارسی اور کشمیری زبان میں شاعری کیا کرتے تھے۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں انہوں نے مہجور کے متعلق یہ پیشین گوئی کی کہ "یہ لڑکا مستقبل میں بڑا شاعر ہوگا"۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مہجور اپنے وطن واپس ہوئے۔ تو والدین نے پیری و مرشدی کی جانب انہیں متوجہ کیا لیکن مہجور کو اس سے نفرت تھی، وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا جائے۔ والدین کو بیٹے کی یہ بات پسند نہیں آئی اور مجبوراً کم عمری ہی میں مہجور کو گھر سے نکل جانا پڑا۔ اس وقت ان کی عمر (۱۷) سال کی تھی۔ ملازمت کی تلاش میں یہ آوارہ گردی کرتے ہوئے ۱۹۰۵ء میں لاہور پہنچے۔ یہاں سے امرتسر گئے اور خوشنویسی کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات اس عہد کے بڑے بڑے شاعروں سے ہوئی۔ اس وقت اتفاقاً علامہ شبلی امرتسر ہی میں مقیم تھے۔ مہجور بھی ان دنوں فارسی میں شعر کہا کرتے تھے اس لئے ایک دوست کے ساتھ علامہ شبلی سے ملنے گئے اور ان کو اپنا فارسی کلام سنایا۔ علامہ شبلی نے ان سے مسکراتے ہوئے کہا کہ "آپ کا یہ تخلص کس کے ہجر کا اظہار ہے"۔ تو انہوں نے جواب دیا "اپنے وطن کے"۔ پھر علامہ نے دریافت کیا کہ "آپ کس سے دور پڑے ہوئے ہیں؟" مہجور نے کہا "اپنے وطن سے"۔ شبلی نے ان کے اشعار پسند کئے اور اپنے نزدیک بیٹھے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا "یہ لڑکا ذہین ہے اور اپنے وقت کا اچھا شاعر ہوگا"۔

۱۹۰۷ء میں مہجور واپس سری نگر ہوئے۔ اس وقت چودھری خوشی محمد ناظر مہتمم بندوبست تھے۔ وہ خود بھی شاعر تھے۔ مہجور نوکری کی تلاش میں تھے۔ اس لئے انہوں نے ملازمت کی درخواست نظم کر کے چودھری صاحب کی خدمت میں پیش کی چودھری صاحب نوجوان شاعر کی اس قابلیت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور ان کو اپنے پاس رکھ لیا۔ جب وہ لداخ تشریف لے گئے تو مہجور کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے اور پٹواری گری کے عہدے پر مامور کر دیا۔ اس وقت انہیں آٹھ روپے ماہانہ تنخواہ ملا کرتی تھی۔ (۳۸) سال تک نوکری کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء [illegible]

جب ان کے وظیفے کے دن قریب آئے تو ان کی تنخواہ میں ڈھائی گنا اضافہ ہو گیا تھا یعنی انہیں بیس روپیہ ماہانہ تنخواہ ملنے لگی تھی۔ اپنی ملازمت کے آخری دور میں تنگدستی سے عاجز آ کر ملازمت کرنے کے بعد وظیفہ لے کر خدمت سے علیحدہ ہو گئے۔ اور عہد کیا کہ اب وہ اپنا سارا وقت کشمیری عوام اور ادب کی خدمت کرنے میں صرف کریں گے۔

مہجور نے اپنی شاعری کی ابتداء فارسی زبان سے کی۔ فارسی میں انہوں نے تقریباً (۲۰) نظمیں کہیں جو مجموعہ کی شکل میں ترتیب دی جا چکی ہیں۔ پتہ نہیں ان کے فارسی کلام کا یہ مجموعہ شائع بھی ہوا ہے یا نہیں؟ فارسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اردو میں بھی شاعری کی اور ۱۹۱۲ء تک وہ اردو ہی میں لکھتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے کشمیری زبان میں لکھنا شروع کیا۔ ان کی اس تبدیلی کا ایک خاص پس منظر ہے اور وہ یہ کہ پٹواری کی حیثیت سے دیہاتی عوام کے ساتھ ان کا روزمرہ کا تعلق رہتا تھا۔ لیکن ناخواندہ عوام ان کی شاعری کو سمجھ نہیں سکتے تھے روزانہ بحیثیت شاعر کے مہجور کی ان کے نزدیک کوئی قدر تھی۔ اس لئے مہجور مجبوراً اپنے شیش محل سے جنتا کے درمیان اتر آئے۔ اور جنتا ہی کی زبان میں شاعری کرنے لگے۔ جب ان سے کسی نے سوال کیا کہ "آپ اردو اور فارسی کو چھوڑ کر کشمیری زبان میں کیوں شاعری کرتے ہیں" تو انہوں نے بغیر کسی پس و پیش کے یہ جواب دیا:—

"جب قومی اور وطنی ذہنیت میرے اندر پختہ ہو گئی تو میں نے اپنی مادری زبان کو بے بسی کی حالت میں پایا۔ میرے ضمیر نے مجھ پر ملامت کی بوچھار کی کہ میں اپنی مادری زبان کو ترک کر کے دوسری زبان کی خدمت کر رہا ہوں۔ عہد ماضی کے تاریخی واقعات نے میری آنکھیں کھول دیں کہ آج کی پسماندہ کشمیری زبان نے صدیوں پہلے بڑے بڑے اہل کمال پیدا کئے تھے۔ مگر آج نہ صرف اس زبان سے غیروں کو بلکہ خود اہل کشمیر کو نفرت ہے۔ اور اسی کے بعد سے میں نے عہد کیا کہ اب میں اپنی مادری زبان کی خدمت کروں گا۔ اور پھر اسے دوبارہ زندۂ جاوید زبان بنا کر چھوڑوں گا۔ میں نے عہد رفتہ کے عوامی شاعر رسول میر اور حبہ خاتون کی طرز پر غزلیں لکھنی شروع کیں۔ اور میں نے دیکھا کہ تھوڑے ہی دنوں میں میری یہ غزلیں زبان زد عام ہو گئی ہیں۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مہجور اس دور کے کشمیری زبان کے سب سے بڑے عوامی شاعر تھے۔ دلیوندر ستیارتھی نے ۱۹۳۴ء میں "ماڈرن ریویو" میں سب سے پہلے مہجور پر مضمون لکھ کر ہمیں ان سے متعارف کرایا تھا۔ اس کے بعد بلراج ساہنی نے ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں "وشوا بھارتی" (انگریزی) میں ان پر دو مضمون لکھے جس میں انہوں نے مہجور کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:—

"اگر مہجور آج ایک گیت کہتے ہیں تو وہ ایک پکھواڑے کے اندر اندر عوام کی زبان پر چڑھ جاتا ہے۔ بچے اسکول جاتے ہوئے، لڑکیاں دھان کاٹتے ہوئے، مانجھی ناؤ کھیتے ہوئے اور مزدور کام کرتے ہوئے —— سب کے سب اس گیت کو گانے لگتے ہیں۔ ایک غیر تعلیم یافتہ ملک میں جہاں مشہور شعراء کے مجموعے دس پانچ کی تعداد سے زیادہ نہیں بکتے، مہجور کی اس مقبولیت کو کرشمہ ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔"

مہجور کی اس قدر مقبولیت ہوتے ہوئے بھی کشمیر کے اعلیٰ طبقے نے ان کی شاعری کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ لیکن جب کشمیری تاریخ کے عالم اور میونسپل بورڈ کے سابق چیئرمین پنڈت آنند نارائن کول نے مہجور کے ایک ابتدائی گیت "اے میرے پھول" کا انگریزی ترجمہ کر کے "وشوا بھارتی" میں شائع کروایا تو پڑھے لکھے طبقے میں ایک ہل چل مچ گئی۔ اس وقت شاعر اعظم ڈاکٹر ٹیگور زندہ تھے انہوں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے مہجور کو لکھا کہ "میں نے آپ کی نظم دیکھی، آپ کے میرے خیالات ملتے جلتے ہیں۔ اگر آپ بنگالی اور انگریزی سے واقف ہوتے۔ تو میں کہتا کہ یہ خیال آپ نے میری نظموں سے حاصل کیا ہے۔ میں آپ کی نظم سے بہت خوش ہوں"۔ اسی طرح سے جب ان کی دوسری نظم "کسان لڑکی" کا ترجمہ ٹیگور نے پڑھا تو انہوں نے دوبارہ مہجور کو لکھا کہ "تم کشمیر کے ورڈس ورتھ ہو"۔ اس وقت کشمیر کا اعلیٰ طبقہ اپنی نیند سے چونک پڑا اور سری نگر میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے میں پہلی بار مہجور کو مدعو کیا گیا۔ وہاں پر اپنی نظم سنانے سے پہلے مہجور نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:—

ٹیگور کی یہ انسان دوستی اور مردم شناسی ہے کہ

انہوں نے صرف ایک لفظ کہکر میرے وطن کے لوگوں کو
میری موجودگی کا احساس دلایا"۔

مہجور کی شاعری کے متعلق کسی قطعی رائے کا اظہار کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ اس لئے کہ ان کی نظموں کا اردو میں کوئی کامیاب ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ جب تک کامیاب ترجمہ نہ ہو یہ انتہائی مشکل ہے کہ ان کے متعلق کسی قطعی رائے کا اظہار کیا جائے۔ جہاں تک ان کی نظموں کے انگریزی تراجم کا تعلق ہے میں یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ ان میں نزاکت خیال اور باریکیٔ فن، تنوع اور طرز بیان کی ندرت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی شاعری محبت اور وطن پرستی کی شاعری ہے۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں انہوں نے سیاسی نظمیں بھی کہنی شروع کی تھیں لیکن وہ اسقدر مقبول نہیں ہو سکیں، جتنا کہ ان کی رومانی نظمیں مقبول ہوئی ہیں۔ میں ان کے اردو اور فارسی کلام کے چند نمونے پیش کر سکتا تھا۔ لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے مجھے منع کر دیا تھا۔ اس لئے کہ وہ عہد رفتہ کی اس شاعری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بہر حال ان کے ہاں آزادی اور محبت کے جذبے کا ایک شدید احساس پایا جاتا ہے جس کی سماجی نقطۂ نظر سے بہت بڑی اہمیت ہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ کسانوں کے درمیان گذرا ہے اور انہوں نے بہت ہی قریب سے ان کی غربت، افلاس اور مجبوری کا گہرا مشاہدہ کیا تھا اور ان کا یہ مشاہدہ حقیقت پسندانہ اہمیت کا حامل ہے اس لئے کہ خود شاعر نے غربت اور تنگدستی کا برسوں مقابلہ کیا تھا۔ وہ اپنی شاعری میں قدرت کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ وہ کوئی خیالی چیز معلوم نہیں پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ جدید اردو فارسی شاعری کے امتزاج سے خیالات کا ایک ایسا مقصدی محل تعمیر کرتے تھے کہ وہ عوام کی خوشحالی کا ضامن دکھائی دیتا ہے — وہ ہمیشہ نیا باغ لگانے کی بات کرتے تھے جس میں بلبل کو تاجداری حاصل ہو، جہاں ایک ہی مذہب کی پیروی ہو، جہاں لوگ گل لالہ پسند لگاتے ہوں، بھنورا اور نرگس کے پھول پر منڈلاتا ہو، جہاں کوئل کی مدھری کوک سنائی دیتی ہو۔ جہاں عندلیب اندلنوں نے گیندوں کو مات دے دیا ہو اور چیلیں گوشت کھانا چھوڑ کر پرہیزگار بن گئی ہوں۔ جہاں سورج کی کرنیں پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیوں کو منور کرتی ہوں — وہ آنے والے کل کے کشمیر کو ایسا گلشن بنانے کے
تعمیر

آرزومند تھے جہاں عوام بغیر کسی خوف و ہراس کے امن چین کی زندگی گزار سکے۔ "کسان لڑکی" میں شاعر اسے اس طرح مخاطب کرتا ہے:۔

"اے حسین کسان لڑکی! تو چشموں کے کنارے سبزہ زار پر لگائی ہوئی تلسی کی طرح ہے۔

تو اپنے بوسیدہ کپڑوں میں بھی ایسی حسین دکھائی دیتی ہے، جیسے بادل کے ٹکڑوں کے درمیان سے ماہتاب نظر آتا ہے۔

تو جب نغمہ چھیڑتی ہے تو تیری مسحور کن آواز سن کر پریاں بھی تعریف کرنے لگتی ہیں۔ تیرے حسن میں بناوٹ اور تصنع نہیں ہے۔

جب تو باغیچوں کے درمیان سے گذرتی ہے تو کہیں پھولوں نے تیرے کان تو نہیں بھر دئے ہیں۔

خواجہ زادیاں تیرا کیا مقابلہ کریں گی، تو، تو پھولوں کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہے۔

خواجہ زادیاں، در اور دریچے بند کرکے پڑی رہتی ہیں۔ تیری مدبھری آنکھیں شرم و حیا کے پانی سے لبریز ہیں۔

تجھ میں غیرت اور خودداری کی جلوہ آرائی ہے۔

پھر بھی پسینے سے نم تیری پلکیں، تلوار کی دھار کا کام دیتی ہیں، اور ہر دیکھنے والے کا دل موہ لیتی ہیں۔

مگر اے شراب ناز سے لبریز جام! دیکھ تیرے ہوش و حواس خراب نہ ہو جائیں۔ دوسروں کو دیکھ کر عیاشی اور کاہلی کی عادت پیدا نہ ہو جائے۔

اے حسین کسان لڑکی! میں نے تجھے کھیت کے ایک کونے میں کام کرتے دیکھا ہے۔

جہاں تو تھکن سے چور ساتھیوں کو اپنے مسحور کن نغمے سنا کر کام کی جانب مائل کر رہی تھی۔ کہیں تو تو نہیں تھک گئی ہے؟"

مہجور کی دوسری بہت ہی مقبول نظم "کشمیری عورت" ہے جس میں موجودہ کشمیری سماج اور خاص طور پر عورت کی گری ہوئی حالت کا ذکر کرکے اسکو ایک نئی دنیا کا پیام دیا گیا ہے۔ اس نظم میں عورتوں کو ایسی خود اعتمادی کا احساس دلایا گیا ہے کہ آج کشمیر میں تہواروں کے موقع پر عورتیں ایک مذہبی گیت کے طور پر اس نظم کو گاتی ہیں۔

مہجور کی شاعری میں نہ صرف ماضی کی عظمت پارینہ کا احساس ہوتا [illegible]

ہوتا ہے بلکہ اس میں وطن کی محبت کے شعلے بھی لپکتے ہوئے نظر آتے ہیں کشمیری زبان کے کلاسیکی شعراء کی طرح مہجور بھی اپنے اہلِ وطن کو بہادروں کے کارنامے سناتا ہے۔ شاہانِ سلف میں وہ للتا دتیہ کا نام لیتا ہے، مشہور سورماؤں میں تارزی بٹ اور رجے بھان کے گن گاتا ہے۔ مشہور شعراء میں محمد غنی کی مدح سرائی کرتا ہے۔ یہ تمام وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے مادرِ وطن کی جمال آرائی میں اپنا شاندار تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ وہ اپنے اہلِ وطن کو یگانگت اور اتحاد کے لئے للکارتا ہے۔ وہ ان کو انسانیت کا درس دیتا ہے۔ اور مذہبی اجارہ داروں کے خلاف اپنی آواز بلند کر کے ان کی ٹھیکیداری کے پرخچے اڑاتے ہوئے کہتا ہے:۔

"مہجور کو سنو! اس کے نغموں میں تمہیں سچائی کی
بلندیوں کے راز ملیں گے!
سچا علم، یا عقل کی پختگی مذہبی ٹھیکیداروں کی میراث
نہیں ہے!"

آگے چل کر وہ کہتا ہے:۔

"تمام اہلِ کشمیر ایک ہیں، اور یہی احساس یگانگت
انسانیت کی معراج ہے!
میں نے ہندو اور مسلمان دونوں کو ایک ہی وجود
کے آگے سر بسجود دیکھا ہے!
اے ارضِ محبت! میں اس سے بڑھ کر تجھے کون پیغام
دوں!"

وہ بار بار انسانی محبت اور مذہبی ہم آہنگی کا درس دیتا ہے:۔

"تمہارے وطن کا کون دشمن ہے اور کون دوست؟
تم اہلِ کشمیر ایک ہو، اور تم ایک ہی رہو!
دودھ اور شکر کو پھر ایک بار مل جانا چاہیئے!
اس کشتی کا لنگر ہندو ہے تو مسلم اس کا بادباں!
اور تم دونوں ہی اس کشتی کے کھیون ہار!"

مہجور کی شاعری میں مستقبل کا بھی ایک پیغام پنہاں ہے۔ اس کے اشعار میں صرف محبت اور رومانس کی باتیں ملتی ہوں۔ ایسا نہیں ہے، اور نہ ہی اس کا کلام مرغزاروں اور باغوں کا ایک تختہ ہے جو عشق و عاشقی میں مبتلا کر کے چھوڑ دے۔ اس کے اشعار بدلتے ہوئے سنسنی خیز گیتوں میں مناظرِ فطرت کو ذہن صرف احساسِ حسن ہی نہیں پیدا کرتے بلکہ احساسِ عمل کی بھی دعوت دیتے ہیں:۔

"او باغبان! اٹھ اور چمن میں پھر ایک بار بہار کو لے آ!
گلزاروں میں گلاب مہک اٹھے، اور بلبل پھر محبت کے
ترانے الاپنے لگے!
چمن کی فسردگی، شبنم کی اشک فشانی، اور گل کی چاک
دامانی کا دور ختم ہوا!
ایک بار پھر گلوں کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل جائے
اور بلبل کے لب نغموں سے چہکنے لگیں!
فریاد و فغاں کا کوئی حاصل نہیں، تجھے کون آزادی عطا
کرے گا!
تیری نجات کے ضامن تو خود تیرے بال و پر ہیں!
چمن میں ہزاروں پرند ہیں، پر ہر ایک اپنی دھن میں مست!
اے قدرت، ان کے گیتوں کو ہم آہنگ کر کے ایک تڑپا
دینے والے نغمے میں ڈھال دے!"

اسی طرح سے مہجور کی نظموں میں نئے کشمیر کی آزادی و نجات کی جد و جہد کی تڑپ ملتی ہے۔ وہ اپنے مبتلائے الم اہلِ وطن کو ایک درخشاں مستقبل کی طمانیت بخشتا ہے۔ جس میں اس کا وطن آزاد ہو گا اور تمام اہلِ وطن الم و افلاس سے نجات پائیں گے:۔

"میری بنجر اور ویران زمین اب عرصہ دراز تک
یوں ہی نہیں رہے گی!
ان پر ایک نئی دنیا جنم لینے والی ہے!
یہ صحرائی ریگ زار اب کشت و گل کا روپ دھار لیں گے!
ان زہریلے کانٹوں کی جگہ سرو و صنوبر کی قطاریں
کھڑی ہوں گی!
اس بید لرزاں کو صندل کی استقامت حاصل ہو گی!
ان پہاڑوں کے دامن لعل و گہر سے پُر ہو جائیں گے!

یہ کوہستان سونا اُگلنے لگیں گے ؛
غوطہ زن کے ہاتھ "ڈل" کی تہ سے زمرد نکالیں گے اور
نہر "دولر" اسکی جھولی موتیوں سے بھر دے گی!"
مہجور اپنے وطن کو یقین و اعتماد کی دولت سے بھی مالا مال کرتا ہے۔
"نئی دُنیا پر جب نئے آفتاب کی کومل کرنیں نور برسائیں گی!
تو تیری پیشانی سب سے پہلے منور ہوگی!
اس کے بعد یہی کرنیں پوری دُنیا کو اپنی آغوش میں سمیٹ
لیں گی!"

مہجور ملک کے نفع خور اور لٹیرے طبقے کو اس آنے والے وقت سے
آگاہ کرتا ہے جبکہ مجبور و محکوم انسان ظلم و استبداد کے خلاف صف آرا
ہوں گے اور اپنے آپ کو ڈھال لینے کی کوشش کریں۔

تو دو چار دن اور موج اُڑا لے!
جلد ہی تجھے سیلابوں سے دوچار ہونا ہے!
تیرے ڈرائنگ روم میں ایک دعوت عام ہوگی!
کان کھول کر اس حقیقت کو سُن، اور وقت کے ساز سے ہم آہنگ
ہونے کی کوشش کر!

اور جب مسرت کا آفتاب طلوع ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے :-

سیاہی شب ہجراں کا زور ٹوٹ گیا
افق سے جھانک رہی ہے نگار صبح وصال
قدم قدم پہ ہیں لالے کی مشعلیں روشن
نظر نظر سے عیاں ہے سکون و صبر و قرار
چمن کا دامن صد رنگ ہے بہار نظر

روش روش پہ کھلے ہیں کنول محبت کے
سُنا ہے سیر گل و لالہ کے بہانے سے
ہماری دید کو آئے گی وہ بہار خیال
مہک رہی ہے جو پیمانِ وفا سے وادیٔ دل

مٹا چکے ہیں دلوں سے غبار جور خزاں

فسانۂ شب ہجراں بھی لوگ بھول گئے۔
کچھ اس طرح سے ہوئی ہے طلوع صبح بہار

ان حوالوں کے بعد ہم مہجور کی زبان اور ان کے فن کے متعلق
مختصراً یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ بحیثیت مجموعی ایک ترقی پسند
شاعر تھے۔ کیونکہ جہاں انہوں نے اپنی قومی زبان اور اس کے ادب عالیہ کی
تمام اچھی روایات سے استفادہ کیا ہے وہیں انہوں نے اس کا بھی پورا
پورا خیال رکھا ہے کہ پرانی شاعری کے ان تمام اثرات سے اپنے کو محفوظ
رکھیں جو قوم کی بڑھتی ہوئی زندگی کے لئے رکاوٹ بن سکتے تھے۔ مواد
اور فن کے سلسلے میں جہاں وہ رسول میر اور حبہ خاتون وغیرہ کے گہرے
اثرات قبول کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ وہیں پر ان کی رومانیت اور تصوف
پرستی سے انحراف کا بھی مشورہ دیتے ہیں۔ کیونکہ رسول میر اور دوسرے
کلاسیکی شاعروں کی طرح وہ زندگی کو ایک سراب نہیں مانتے بلکہ فطرت کی
طرف سے سونپی ہوئی ایک زندہ اور متحرک حقیقت سمجھتے ہیں۔ اسی لئے وہ
زندگی اور دُنیا سے پیار کرتے ہیں۔ اور اسے سنوارنے اور نکھارنے کی
کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ زبان کے نقطہ نظر سے مہجور کی
نمایاں خصوصیات دو ہیں۔ صوتی تاثر یا مترنم ہم آہنگی اور سلاست و
سادگی۔ مہجور نے اور ورڈس ورتھ کے اس نظریہ کو اپنایا تھا
کہ شاعر کو وہی زبان استعمال کرنی چاہیئے۔ جسے زیادہ سے زیادہ
لوگ سمجھ سکیں یعنی نثر کی ٹکسالی زبان اور شعر کی مروجہ زبان بالکل ایک
نہیں ہو سکتیں۔ ان کی اسی اعتدال یا حقیقت پسندی نے انہیں کشمیر کا
مقبول ترین شاعر بنایا تھا۔

چند سالوں پہلے نئے کشمیر کی تعمیر کے لئے جو لائحہ عمل مرتب کیا گیا تھا
اس میں کشمیری زبان ہی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا ہے۔ جس کے خواب مہجور
تیس سال سے دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن ابھی تک اس خواب کے تکمیل
پانے میں کچھ مشکلات حائل ہیں۔ لیکن اب وہ دن دور نہیں ہے جبکہ
مہجور کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ جس کے پیچھے سینکڑوں سالوں کی
تاریخ، تہذیب اور روایات موجود ہیں۔ اور انہیں روایات کو زندہ
رکھنے کے لئے مہجور جیسے شاعروں نے انتھک کوششیں کی ہیں۔ اور جیسے
آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔

امین کامل

مہجور کی شاعری اور شخصیت

مہجور پر جو کچھ میں لکھ رہا ہوں۔ چند غیر مربوط خیالات کو تسلسل سے بیان کرنے کی ایک سعی ہے۔ لیکن ان خیالات کی تہ میں ایسی کئی چیزیں مل سکتی ہیں، جن سے ان کی شاعری اُن کے فن اور اُن کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

مہجور ہمارے پُرانے اور نئے ادب کی وہ درمیانی کڑی ہے کہ اگر اُسے علیٰحدہ کر دیا جائے تو ہم نہ صرف موجودہ ادبی دَور کا کوئی ہمہ گیر تجزیہ نہیں کر پائیں گے۔ اور اُس کا پس منظر سمجھنے میں ٹھوکر کھائیں گے بلکہ ان ادوار کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا ہوگی، جس کو کسی طرح پاٹا نہیں جا سکے گا۔ یہ بات اس امر کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے کہ مہجور کا ہماری شاعری میں کتنا اہم مقام ہے۔

مہجور نے اپنی شاعری کی ابتدا فارسی اشعار سے کی۔ لیکن فارسی اپنا صدیوں پرانا اقتدار کھو چکی تھی۔ اور اُس کی جگہ اُردو اور انگریزی لے رہی تھی۔ جس کا اظہار مہجور سے بہت پہلے فردوسیٔ کشیر وہاب پَرے کی زبان سے ہو چکا تھا۔

> اَدِ چھہ انگریزی تہ اُردو بیہ میّانُن بندوبست
> فارسی کلہ آلو تھوُدِین، یہ چھُو ازِ دِیُن نُو طریق
> فارسی خان وَدِ تاسُف کیاہ رِ راوُر لوکہ چار
> اوخواسہ بیٚیت بُلِ اَتھ، یہ چھُو ازِ دِیُن نو طریق

(نئے زمانے کی ستم ظریفی نے فارسی کا سر کچل کر اردو اور انگریزی کا جھنڈا بلند کیا۔ فارسی کے علماء کو افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اُنہوں نے مکتبوں میں ملاؤں کے پاس اپنی جوانی ضائع کر دی۔)

فارسی کی اس کس مپرسی والی حالت کے پیش نظر مہجور نے اُردو کی طرف اپنی طبیعت کی باگ موڑ لی۔ لیکن اُن کی اُردو کی استعداد اتنی نہ تھی کہ وہ اس میں لغزشوں کے بغیر زیادہ دُور تک چل سکتے اور اپنے وقت کے اُردو شعراء کی صف میں، جن میں سے اکثر غیر ریاستی تھے کوئی نمایاں جگہ پا سکتے۔ لازماً اُنہیں اُردو کو بھی خیر باد کہہ کے اپنی مادری زبان کشمیری کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ یہ ۱۹۲۹ء کے قریب کا واقعہ ہے کشمیری زبان کی یہ راہ اپنے لئے متعین کرتے وقت ظاہر ہے کہ مہجور کو کسی دِقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، زبان اپنی تھی۔ شاعری کا مادّہ فطری تھا۔ اور جس اُستاد (علی گنائی عاشق، مصنّف گلزار حسن و زہرا بہرام) سے ابتدائی تعلیم پائی تھی۔ وہ خود کشمیری زبان کا ماہر شاعر تھا، جس کے تلمذ میں اُنہیں کشمیری میں اکثر طبع آزمائی کے مواقع فراہم ہوئے تھے۔ پھر بھی ایک اہم سوال رہ جاتا تھا کہ وہ اپنے سے پہلے شعراء میں سے کس ایک کے رنگ کی تقلید کرے۔ وہ سوال جو ہر نئے شاعر کے لئے پہلے پہل دردِ سر بن جاتا ہے اور جس سے مفر کی کوئی راہ نہیں ہوتی۔ اپنی طبیعت کے اقتضاء اور فارسی تغزل سے واقفیت کے طفیل مہجور نے رسول میر، حبہ خاتون اور کسی حد تک وہاب پَرے کے رنگ کو اپنانے کا ارادہ کیا کیونکہ ان شعراء کی غزلیں مقبولیت کی وجہ سے ساری وادی میں گونج رہی تھیں۔ عوام نے انہیں اپنایا تھا۔ وہ ان غزلوں میں اپنے دل کی دھڑکنیں محسوس کرتے اور اپنے دُکھ درد کا تسکین پاتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ متصوفانہ شاعری کے برعکس اسے اپنی روزمرہ زندگی کے زیادہ قریب اور ہم آہنگ پاتے تھے چنانچہ مہجور نے اپنی چند ابتدائی عشقیہ غزلیں انہی شعراء کی تقلید میں کہیں۔ لیکن سب سے زیادہ اثر رسول میر نے قبول کیا۔

پتہ دردہ سوزس پردہ تلیتھ گو شور رسل میر
مہجور لاگتھ آدٔ بیہ دُوبارہ اتی روز !

(اس سازِ عشق کے پہلے سے رسول میر نے غلاف اٹھایا تھا، آج وہی مہجور کے روپ میں اس کو پھر سے چھیڑنے آیا ہے)

تقلید کی یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی اور ان کا اپنا ایک انفرادی رنگ اُبھرنے لگا جس کو ہم آج "مہجور کے رنگ" سے تعبیر کرتے ہیں جو ایک حسین امتزاج ہے۔ پرانی شعری روایات اور نئے شعری تقاضوں کا۔ اس میں لوچ بھی ہے رس بھی، خلوص بھی ہے، زندگی نوازی بھی، ادبی شان بھی اور عوام سے قربت کی چاشنی بھی۔ سب سے بڑی خوبی یہ کہ روایتی فارسی ترکیبات و تشبیہات سے گلو خلاصی اور اُتنے ہی گہرے خیالات جہاں تک ایک عام کشمیری کی پہنچ ہے۔ اس بات سے ان کے اشعار میں فکری پہلو کم ہے لیکن جذباتی اور محسوساتی کیفیت پورے جوبن پر ہے۔

مہجور نے صوفیوں کی زبان میں "مجازی" اور ہماری آپ کی زبان میں "عشقیہ شاعری" شروع کی اور عمر بھر اس کو ایسی فنکارانہ صفائی سے نبھاتے رہے کہ اس کی نظیر ہمارے سارے شعری سرمایہ میں رسول میر کے بغیر اور کہیں نظر نہیں آتی۔ لیکن ہماری شاعری پر تصوف کا جو صدیوں پرانا غلبہ چلا آرہا تھا۔ اس کے خلاف لڑنے کے باوجود مہجور ذہنی طور پر اس سے مرعوب بھی رہے۔ وہ تضاد جو ہمارے معاشرہ میں شدت کے ساتھ موجود تھا (اب بھی ہے) اس چیز کا اظہار مختلف صورتوں میں، اُنہی متصوفانہ شاعری کی مخصوص علامات، آہنگ اور روایات کے ساتھ دبے دبے الفاظ ہی میں سہی۔ ان کے یہاں آخری وقت تک ہوتا رہا۔

حبنہ تعریف شرمس نہ سازس ینہ مہجور لارک مجازس
ملہ رادی ینہ تُولہ سائے پایہ بڈہ میانہ یاؤن رائے

(اے مہجور تو ان کے حسن اور ان کے ناز و سنگار کی باتوں کو مجازی عشق سے تعبیر نہ کر۔ دیکھ تیری اپنی ہی سمجھ تیری ٹھوکر کا باعث نہ بن جائے)

یارِس ... جانے کیہی دتال ... نے بی ز
تعبیر

پاک روزتس لنشوانگ پانے بلبُل سنذ افسانے بوز

(اپنے دوست پر اپنی جان نچھاور کر۔ یہ وہ آواز ہے جو کہ پازیب کی جھنکار سے آتی ہے۔ اگر تو اپنے من کو پاک و صاف رکھے گا تو ضرور اس کے حضور باریابی پائے گا)

ہا منوشہ پوشہ چھکہ ژہ تو شان پیدہ کرین نئے بارچ دان

(اے مجور کو تو پھولوں کا دیوانہ کیا بنا بیٹھا ہے، ذرا اپنے من کے باغ کو پہچاننے کی کوشش کر)

یہ ساری نظم اسی رنگ میں ہے۔ اس ذہنی تضاد ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف مہجور طبقاتی سماج میں مذہب کے کردار کو "تنتر تیرچھا مسکین مرتد تہ بے دین، دین دار دُنیا دار" (دولتمند دیندار اور غریب بے دین مانے جاتے ہیں) کے رنگ میں دیکھتے تھے۔ تو دوسری جانب سے طبقاتی جدوجہد اور استحصال کی موجودگی کو مذہب سے دُور جا پڑنے کا نتیجہ ٹھہراتے تھے۔

دھرم تے مذہب ایمانداری یتھ کالہ اوس ینہ جاری یلے
تتھ بدل از چھہ ینہ زور زاوارئی کاژہ نذون بو زمیاکن زاری یلے

(گئے زمانے میں یہاں دھرم اور مذہب کا بول بالا تھا، اب اس کے بجائے باہمی آویزش اور بالا دستی زور وں پر ہے)

لیکن زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں نے ان کی اس "ذہنی مرعوبیت" کو کبھی نمایاں طور پر اُبھرنے کی اجازت نہ دی۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ مرحوم عبدالاحد آزاد کا انقلابی وجود مہجور کو اس طرف جھکنے میں ایک بہت بڑی روک ثابت ہوا۔ چنانچہ جب مہجور نے ازراہِ عقیدت "پچھر پورہ" کی زیارت شریف پر ایک نظم کہی تو آزاد نے اُسی ردیف و قوافی میں اُن پر طنز کی۔ جو کہ زبان زد عوام ہے۔

باوصف اس کے مہجور مذہب کے مخالف نہیں تھے۔ وہ روحانیت، تصوف، تقدیر، غرضیکہ ہر ایسی چیز کے قائل تھے جو کہ مذہبی فلسفے سے تعلق رکھتا ہے۔ البتہ کھوکھلی روحانیت، بے جان تصوف اور نام نہاد مذہب کی آمریت کے کٹر مخالف تھے اور اس کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔

کینہہ ... نام کرتھ ... ملوسیت

باذِت خُدا کنِہ سادہ دِل دِلوانہ بنائوم
ہجوُرِ سِنز بَکھ بَنِز لَبِکھ معرفتک پَئے
پنڈت گیان تہ عرفان ہجُوِنہ گوُرن تہ ملن منز

(کئی عقل کے اندھے ہیں نے تعویذ گنڈوں سے اپنے مطیع کرلئے اور کئی ضعیف الاعتقاد خدا کے نام پر بیوقوف بنا کر رکھ دیئے۔ ہجور کی باتوں میں تجھے حقیقی معرفت کا سُراغ ملے گا۔ مُلاؤں اور پنڈتوں کے یہاں نہ تو سچا عرفان ہے اور نہ سچا گیان)

ہندوستان میں برطانوی سامراج کے خلاف ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد قومی تحریک نہایت ہی شدومد سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کا لازمی اثر ہماری ریاست پر بھی پڑا، اور ۱۹۳۱ء میں یہاں بھی باقاعدہ شخصی حکومت کے خلاف جو کہ برطانوی سامراج کی پروردہ تھی، تحریک چلی۔ اس تحریک کا بلاواسطہ اثر ہجور کی عشقیہ شاعری پر بھی پڑا۔ بلاواسطہ اس لئے کہ ہجور نے اس تحریک کی ابتدائی منزلوں میں اس کی ترجمانی نو نہ کی (بلکہ قدرے تشویش وتشکیک سے دیکھتے رہے) لیکن ان کے عشقیہ خیالات میں بے لبی اور نسائیت کی بجائے رجائیت کے عناصر سرایت کرنے لگے۔ جوں جوں یہ تحریک شہروں سے دیہات کی طرف قدم بڑھانے لگی اور عوام اس سے منسلک ہوکر منظم ہونے لگے، ہماری شاعری بھی اس کی براہِ راست ہمنوائی کرنے پر مجبور ہوئی چنانچہ مرحوم آزاد اس میدان کے پہلے مجاہد تھے۔ اُن کی آواز تھی:-

کلہن، غنی تہ مرزی سیراب کریم آبن
سُوئی آب سانہ باپت زہرِ ہلال آسیا

(کلہن، غنی، اور مرزی جس پانی سے سیراب ہوتے رہے کیا وہ پانی ہمارے لئے زہرِ ہلال بنا دیا جائے گا، (کبھی نہیں)

گہری نظر سے دیکھا جائے تو آزاد کی شاعری سے اس دور کی شعوری اور بامقصد بنیاد پڑتی ہے۔ جس کو ہم "موجودہ ادبی دور" کا نام دیتے ہیں۔ آزاد اگرچہ ہجور کا شاگرد تھا لیکن شعوری سطح میں اُن سے بہت ہی بلند تھا۔ وہ طبقاتی سماج اور اس کے تضادات [illegible] سے بخوبی واقف تھا۔ وہ کشمیر کے مفلوک الحال عوام کو اس منزل کی طرف لے جانے کے لئے بے قرار تھا جو کہ انہیں لوٹ کھسوٹ سے آزاد کرکے اُن کے ہاتھوں میں اقتدار کی باگ تھمائے لیکن اُس کی ایک بڑی خامی یہ رہی کہ اس نے اپنے عوام کی شعوری سطح کا بغور مطالعہ نہیں کیا جس سے وہ پرانی قدروں کے صریح انکار پر اُتر آیا۔ وہ مذہب اور خدا سے شدید طور پر اُلجھ گیا جو کہ اُس کی انتہا پسندی تھی۔ اس کے باوجود اُس کا مقام بہت ہی بلند اور اس کی شاعری سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

قومی تحریک کے بڑھتے ہوئے تقاضوں اور آزاد کے نئے انقلابی خیالات نے ہجور کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ اور وہ بھی عوامی جدوجہد کا ساتھ دینے لگے۔ لیکن ان کی آواز میں آزاد کی انتہا پسندی نہ تھی البتہ ہماری قومی تحریک میں جو حد بندیاں تھیں وہ ان کی شاعری کا بھی احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ ہجور کے سامنے ایک پس ماندہ جاگیرداری سماج تھا اُس کا واسطہ دیہاتی ہونے کی وجہ سے اور اپنے پیشے (پٹواری) کے لحاظ سے بھی کسانوں سے رہا اور اُن ہی کے سلسلے میں طبقاتی سماج پر نظر ڈالی۔ اُنہوں نے اشتراکی فلسفے کا کوئی سنجیدہ مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اور نہ وہ اس کے قائل تھے وہ طبقات کے خاتمے سے حاصل ہونے والے فوائد پر صحیح طور پر نظر نہ ڈال سکے۔ اُن کی آواز انقلاب پر کم اور سمجھوتے پر زیادہ زور ڈالتی تھی۔ بالکل وہی چیز جو ہماری قومی تحریک کی حدبندی تھی یہ ایک بڑی وجہ ہے کہ ان کی سیاسی شاعری میں کسی واضح نصب العین کا سراغ نہیں ملتا۔ ہجور کی ان سیاسی نظموں کے اثر سے اُن کی غزل بھی جو کہ پہلے محض عشقیہ ہوا کرتی تھی، نہ بچ سکی اور اب وہ سیاسی اور عشقیہ خیالات کی آمیزش بن گئی۔ لیکن اس سے اُن کے عشقیہ اشعار کا حسن اور تاثر کم نہیں ہوا۔

پابندِ چمن گُل چھہ توَے کنڈ چھہ تمس لاؤ
آزاد بلبل باشہ کران پوشہ ڈالن منز
ویور لوشن کم تلان چھا وان چھ کم یا مُک ہاد
بے خبر آمہ رازہ [illegible] خور وشتر بیار چھم جی

(چمن کی غلامی کے باعث گلاب کے پودوں میں کانٹوں کی [illegible]
[illegible]

پڑگئی بیکت بُلبُل اپنی آزادی کو عزیز رکھنے کے باعث مرغزاروں میں، مزے اُڑاتی رہتی ہے۔ زندگی کون اُڑا کے لے جاتے ہیں؟ باغ کی بہاروں سے کون لُطف اندوز ہوتے ہیں؟ اس بھید کو سمجھنے کے بغیر تیرا سب جوش و خروش کس کام کا۔)

ان کی غزل کا یہ نیا رنگ موجودہ غزل کی دُنیا دبن گیا جس میں استعارات و رمز و کنایات تو یہی کچھ ہیں۔ لیکن خیالات زیادہ نازک اور فکری پہلو زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ اس بات کو موجودہ غزل کی عوام سے دُوری نہیں کہا جاسکتا، بلکہ زبان کی وُسعت وقت کے نئے ادبی تقاضوں، عوام کی بڑھتی ہوئی شعوری سطح اور خود شعراء کے عمیق مطالعہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

مہجور کی شاعری نے یہاں کی قومی بیداری میں جو حصہ لیا، اُس نے ایک طرف تو ہمارے عوام کو جذبات اور احساسات کے لحاظ سے اُس عمل کے لئے تیار کرنے میں مدد دی، جس کا سیاسی میدان سے اُن سے مطالبہ ہوتا تھا۔ دوسری جانب سے کشمیری زبان کو وُسعت ترقی اور جلا بخشی جس سے ہم پر ادب کے دروازے کھُل گئے جنہیں شخصی نظام نے ہم پر بند کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔

عوام کے احساسات و جذبات کو اُبھارنے کے سلسلے میں مہجور نے وقت وقت پر جو رول ادا کیا، وُہ تفصیل طلب ہے۔ البتہ ذیل کے چند اشعار اُن تمام نازک سیاسی مراحل کی یاد دلاتے ہیں۔ جن سے ہماری آزادی کے قافلے کو گذرنا پڑا۔ ان میں حبّ وطن کے ابتدائی جذبے "کشمیر چھوڑدو" کے تاریخی نعرے، ۱۹۴۷ء کے ایّام میں فرقہ وارانہ اتحاد برقرار رکھنے کے آدرش، کشمیر پر قبائلی حملے، اور ایک نئے کشمیر کے پُرامید خواب تک کے تمام مرحلے شامل ہیں۔

باغوانو باغِ نوبہارک شان پیدا کر
پھولن گل گتھ کرن بُلبُل تتھی سامان پیدا کر
[illegible] نوچہ پتہ [illegible] ہنز تراو زیر و بم
[illegible] گگرایہ کر طوفان پیدا کر

(اے باغبان اُٹھ اور ایک نئی بہار کی بُنیادیں استوار کر۔ ایسے تعمیر سامان بناکر پھول کھل اُٹھیں، اور بُلبُل گیت گائیں۔ اگر تجھے پھولوں کی بستی کو جگانا ہے تو طاؤس و رباب کو خیرباد کہہ کے طوفان، گونج گرج اور بھونچال کے مانند اُٹھ اور آگے بڑھ۔)

دوہہ تارہ ژھوہ مار ساز و سامانس
بُتھہ پتھ کانہہ طوفانس ییٔت
لگہ بُتن چیاٗ یس اَتھ دِوان خانس
پتے یوز لئے تھو زمانس سیٔت

(ابھی یہ رنگ رلیاں اور کچھ دن اور مَنا۔ جلدی ہی طوفان آنے والا ہے۔ تیرے ان بلند ایوانوں میں عوام اقتدار کا رقص کریں گے۔ میری بات سُن اور وقت کا ساتھ دے۔)

نیاٗے تراٗوِو ماٗے تھاوِو پانہ واٗن
پوز محبت باگراوِو پانہ واٗن
صاف تھاوِو سینہ شراٗوِو فساد
کینہ تراٗوِو، داغ باوِو پانہ واٗن
ہیٔند رٹن نَم، کھوٗروائن اہلِ دین
ناوِ یمہ مُلکیچ چلاوِو پانہ واٗن

(اپنے دل صاف کرکے تمام کدُورتیں دھو ڈالو، محبت کرو، ہاں ایک دوسرے سے سچی محبت کرو۔ آپس کے دُکھ درد میں شریک اور ہمدرد بن جاؤ۔ اس مُلک کی کشتی کو کنارے لگانے کیلئے مسلمان چپّو ہیں اور ہندو کشتی کا سِرا۔)

مُلکہ منزہ کڈ ژک یِم واہ گیراٗسہ کیو پتھ تِی چھ جان
اٗسی سنبھالو گھر پننی یِم نیرتن ساری نیبر
غیرس ساٗنِس کرِو توہہ کوٗت کالہ امتحان
اٗسِ مرو، غیرَس کھوٗرن تَل زنہہ تہٕ نمراوو نہ سَر

(ہم چاہتے ہیں کہ اس سرزمین سے یہ سارے باہر نکل جائیں، تاکہ ہم خود اپنا گھر سنبھالیں، ہماری غیرت کو یہ لوگ کب تک امتحان کرتے رہیں گے۔ ہم مرنا قبول کریں گے لیکن کسی کے سامنے اطاعت کی گردن جھکانے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔)

کشمیری زبان کو مہجور نے جو وُسعت بخشی اُن کے متعلق

میں سے پڑھکر اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ مُردہ زبان ہو کہ فارسی الفاظ و تراکیب کی بھرمار سے بعید از کار تشبیہات و استعارات اور متصوفانہ خیالات کے ابہام سے نہایت ہی پُر تکلف بن گئی تھی، ان کے فن کارانہ ہاتھوں سے فصاحت و سلاست کی اس معراج تک پہنچ گئی۔ (شعروں کا ترجمہ مقصود نہیں)

ژلہ لارہ دُ چمکٹ ہال فہے دارہ دُ چھپے ژدئے
گلہ زلو مہ گیم اوش وتھم دَد دایہ فَنے کیا
لہ مژتہ چھندیمژ میول دنان چھہ واوس
داماںہ میول یم چھول تس زانہ قرار آسیا
پختہ کاران مختہ بچھرے بیٹھہ دُ چھم آمت قرار
یے چیز امیہ غلامن اس ظالم زور ہ ٹل یہ یاواں
کٹاں تی بازرن اندر کرتھ ہولہ مایہ آزادی

ہر شاعر اور ادیب کا جسطرح اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی چیز پر نظر ڈالنے اور اسے بیان کرنے کا انداز بھی مخصوص ہوا کرتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جہاں وہ ایک خاص رنگ میں کھلتا ہے۔ دوسرے میں اتنے امتیازی شان کے ساتھ نہیں اُبھرتا۔ مہجور کو فطری طور پر تغزل کا رنگ عطا ہوا تھا اس لئے اُن کا وہ کلام جو تغزل محض ہے زیادہ سوز و گداز سے لبریز ہے بہ نسبت اُس کلام کے جس میں سیاسیات و معاشرہ سے متعلق پیغامات ہیں۔ ان کی سیاسی نظموں میں وہ تڑپ اور خون کو گرمانے والی انقلابی روح نہیں ملتی جو کہ آزاد کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی سیاسی نظمیں بھی وہی کامیاب ہیں جن کا اسلوب اور اندازِ بیان تغزل کا ہے یا رمزیہ انداز میں ہیں (مثال کے طور پر گُل لالہ سے خطاب یا تشکر مالائیں جگمگا اُٹھیں)۔

جہاں تک مہجور کی شخصیت کا تعلق ہے وہ اسقدر طاقتور تھی کہ آزاد جیسے انقلابی اور فکری شاعر کو اُن کے جیتے جی بلکہ ابھی تک اپنے پورے خدوخال کے ساتھ اُبھرنے کا موقعہ نہ ملا۔ مہجور کے ساتھ میرے تعلقات ۱۹۴۷ء کے بعد شاید سب سے زیادہ تھے اُن کے سامنے مجھ ایسا انسان ایسا لگتا گویا ایک بہت بڑے مردِ درویش کے سامنے ایک بے بضاعت آدمی شرفِ قدمبوسی حاصل کرنے آیا ہو۔ اب تو ایسی کوئی شخصیت باقی نہ رہی۔ صرف شاعر اور ادیب رہ گئے خواہ وہ آپ ہوں یا ہم۔

ایک دن مہجور میرے پاس آئے۔ میں نے اُن کا تعارف اپنے ایک سادہ لوح لیکن صوفی منش دیہاتی مہمان سے کرایا۔ میرے اس مہمان کو نہ جانے یہ وہم کیسے ہوا تھا کہ "مہجور" پہنچا ہوا مردِ درویش ہے۔ اُس نے مہجور سے کوئی تعویز عنایت کرنے کی استدعا کی۔ مہجور نے بڑی سنجیدگی سے قلم کاغذ مانگا۔ میں بھی خاموش کہ دیکھیں کیا لکھ دیتے ہیں۔ مہجور نے کاغذ پر دس خانوں میں اس شعر کے الفاظ بانٹ کر لکھدئے اور بالکل تعویز کی طرح تہ کر کے اُس کو "عنایت فرمایا"۔

تہ تہ چھا مہجور تنہا بہت دُور کو کرن چھکا مختہ ہار
(کیا وہاں بھی مہجور ایسا شاعر تنہا بیٹھ کر، اندھوں کو لبنت کی بہار سمجھا رہا ہے)

اپنی وفات سے چند دن پہلے مجھ سے ملنے آئے۔ کافی تلاش کے بعد جب مجھے ملے تو غمِ دوراں کی کچھ باتیں کر کے بےیار رونے لگے۔ میں حیران کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ کہنے لگے "بھئی ایسا کچھ محسوس ہو رہا ہے کہ اُدھر کا بلاوا ہو چکا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ خالی ہاتھ ہوں، کچھ اُدھر کا توشہ جمع نہیں کیا"۔ اس پر مسکرائے اور اپنے یہ شعر گنگنانے لگے۔

تیز پک پک کیا حاصل آم
منزلس واتنے سپدم شام
چکہ چاوُ سورم لوکہ چار کتوئی گوم
بالئے آدنگ یار کتوئی گوم
ترادہ یلہ مہجور بارغ چھاوَن
ادہ وَنہ آرہ دَل مسولہ گن
راز دار ناز بردار کتوئی گوم
بالئے آدنگ یار کتوئی گوم

(میری یہ ساری تیز گامی اکارت ہو کر رہ گئی، منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی شام ہو گئی

غلام محمد مشتاق

ندرِ مہجور

لالہ میون منز شالہ مارن سیت یارن آسہ ما	میرا محبوب کہیں "شالہ مارں" میں اپنے دوستوں کے ساتھ گلگشت تو نہیں۔
سنبہ لا وان بے شمارن بے قرارن آسہ ما	اور وہ کہیں اپنے لاتعداد بیقرار دل کو سنبھالا تو نہیں دے رہا۔
حُسنکی تمُ پادشاہن مسوٗلن دل کرُو بال	اُس بادشاہِ حسن نے دُنیا بھر کے محبوبوں کے دل موہ لئے ہیں۔
رُوشہ کران شانہ زُلفِ پیچ دارن آسہ ما	وہ کہیں چھُپا چوری اپنی زُلفوں میں شانہ تو نہیں کر رہا۔
ڈل دٔرس بیٹھ بالہ یارس وُچھنہ آمُت عالماہ	ڈل کے کنارے اُن کے درشنوں کو ایک کائنات جمع ہوئی ہے۔
تِکہ تارس تتہ گنڈان دِلہ کِن قرارن آسہ ما	کہیں وہ دل کے قراروں سے تکی کھیل تو نہیں رہا ہے۔
یاوُنک رنگ فیور رُخسارن دِلن ژٔلمُت ملال	اُدھر اُس کے رخساروں پر شباب کا رنگ اُبھر آیا ہے۔ اور ادھر دلوں سے گردِ ملال دُھل گیا
نوٗ فلئے لُجمُژ امارن لوکہ چارن آسہ ما	یہ کہیں یوں تو نہیں کہ ارمانوں کے بالے پن میں شگوفے پھوٹ رہے ہیں۔
بُوش کھتمت گپُت گنگائے تہ اِشبرنا گسی	گپت گنگا کے نالے اور الشبر چشمے میں آج رونق ہے۔
پُوشہ مٔت سُندروشہ درشن آب شارن آسہ ما	میرے محبوب کا درشن آج کہیں آبشاروں میں منعکس تو نہیں۔
از چھُو پرتھ مجلسہ اندر مہجور سُند یاوُن نشران	آج ہر محفل میں مہجور مرحوم کا جوشِ شباب موج زن ہے۔
از توٗے تسکین دِلن مشتاق یارن آسہ ما	مشتاق! شاید اسی لئے دوستوں کے دلوں کو ایک سکون سا حاصل ہے

اپریل ۱۹۵۶ء

محمد یوسف ٹینگ

کلامِ مہجور ـــ کشمیری ادب کے تاریخی پس منظر میں

مہجور کا ایک مقطع ہے سے مہجور شلہ کوہ آکھ زراہ زیر یزہ ہے لید
دلیہ زہ نہ یہنے کو نگہ پوشک پاکھ خریدار

(مہجور! تو سویرے ہی یہاں کیوں آگیا۔ ذرا دیر کے بعد آتے تو تجھے زعفران کے پھول کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا)

ایسی بہت سی شاعرانہ تعلیاں ہمارے ادب میں بے تکلفی سے رائج ہیں مگر مہجور کی تعلی کو سن کر اردو کے شہرہ آفاق شاعر مرزا غالب کے مصرعے " میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں" کی یاد آتی ہے۔ مگر ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جہاں غالب کے دعوی کو تاریخ نے حرف بحرف درست ثابت کر دیا ہے۔ مہجور کا کہنا بالکل خلاف واقعہ ہے۔ مرزا غالب کے سر پر بقائے دوام کا جو تاج زمانے نے رکھ دیا ہے۔ اُس سے قطع نظر بھی غالب کے اُس زمانے کے حالات سے آشکارا ہوتا ہے کہ جس ناقدری سے اُنکا پالا پڑا تھا، اُس کی صدائے بازگشت میں اُنکا یہ کہنا حق بجانب ہے۔ مگر حیرت کا مقام یہ ہے کہ جب مہجور اپنی مقبولیت اور شہرت کی معراج پر تھے۔ تو وہ یہ شعر کیسے کہہ سکے۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اُن معدودے چند خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں، جنہیں اپنا اصل مقام اور صحیح وقت میسر آیا ہے۔ اور جن کے اپنے زمانے کی سیاسی، معاشی اور مجلسی زندگی کے مختلف دھارے اُن کی شاعری سے متصادم ہونے کی بجائے اس کے حلیف ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح سے وہ مثالی مقبولیت وجود میں آتی ہے جو مہجور کی صف کے بہت کم شاعروں کو جیتے جی نصیب ہو سکی ہے۔ اس تعلی کا دوسرا دعوی زیادہ افسوسناک ہے۔ کیونکہ یہ امر باعث تاسف سہی مگر حقیقت ضرور ہے کہ مہجور کی یہ تفہیم کہ اپنے وقت کے بعد اُن کے کلام قدر و منزلت میں اضافہ ہو جائے گا۔ درست ثابت نہیں ہوئی ہے اور زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ جوں جوں ہمارا ادب بلندیوں کی طرف جا رہا ہے۔ اور عوام کا شعور ترقی پذیر ہو رہا ہے۔ مہجور کی مقبولیت اور محبوبیت کم ہوتی جا رہی ہے اور اُن کا کلام دل کے نہاں خانوں سے تاریخ کی الماریوں کا رُخ اختیار کر رہا ہے۔

مہجور کی غیر مقبولیت ایک شاعر کے ذاتی سانحے کی حیثیت سے ہمارے لئے بہت کم توجہ طلب ہو سکتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ چند ایسے بنیادی سوالات وابستہ ہیں۔ جو کشمیری ادب و انشا کے کسی بھی سنجیدہ طالب علم کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ اور اُن میں سے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ مہجور کی مقبولیت اور غیر مقبولیت کے اس ڈراما کے درمیان اُن کے کلام کا غیر متعصبانہ اور بے لاگ تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ اور اُن عناصر کا تعین کیا جائے جو مہجور کے قابل فخر ورثے کے طور ہمارے آئندہ ادب کی ترویج کے لئے قابل استعمال قرار دئے جا سکیں اور اُس کے ساتھ ہی اُن کی شاعری کے کمزور پہلوؤں کو الگ کر دیا جائے۔ اگر کسی معمولی شاعر کا سوال ہوتا تو یہ بات زیادہ اہم قرار نہیں دی جا سکتی تھی۔ مگر مہجور کی بات الگ ہے کیونکہ وجوہات خواہ کچھ بھی رہے ہوں۔ یہ ایک اٹل تاریخی حقیقت ہے کہ وہ ہماری تاریخ کے ایک عہد آفرین زمانے میں ایک چوتھائی صدی تک ہمارے شعر و ادب پر چھائے رہے اور اب جبکہ اُن کی مقبولیت کے آفتاب کی خیرہ کُن چکاچوند اس حد تک کم ہو گئی ہے۔ کہ ہم ٹھنڈے دل و دماغ سے اس بات پر فکر کریں کہ مہجور کی انفرادی شاعرانہ حیثیت کو الگ چھوڑ کر بھی اُن کے دیئے ہوئے

پہلوؤں کو اپنی صحت مند ادبی روایات کے ارتقاء کی کڑی قرار دینا چاہیئے۔ اور اس کے ساتھ اس کے کم غیر صحت مند عناصر کو جرأت کے ساتھ ترک کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ مہجور کے قامت (statements) کے شعراء کے بعد جب کہ اُن کی تقلید ایک متعدی مرض کی طرح پھیلتی ہے۔ زبان و بیان کا یہ مرحلہ بہت نازک بن جاتا ہے۔ کشمیری ادب کی صحت مند بنیادیں استوار کرنے کے لئے یہ سوال خاص اہمیت رکھتا ہے کہ ہم مہجور کے بہترین اجزاء کو اپنے ادب کی رگوں کا لہو بناتے ہوئے بھی اُن کے کمزور پہلوؤں کی آبیاری کے رُجحانات کی بیخ کنی کریں۔

مہجور کے مقابلتاً ضخیم دیوان کا مطالعہ کرنے کے بعد اُن کے یہاں تین مختلف رُجحانات کی ایک عجیب تثلیث کا احساس ہوتا ہے اُس میں تو دو رنگ اُن سے پہلے کی کشمیری شاعری کی روایات رہے ہیں۔ ایک رنگ وُہ ہے جب ہلکی پھلکی بحروں میں عام لوگوں کے وقتی جذبات کی جو شدید اور کبھی کبھی سطحی ہوتے ہیں، کی ترجمانی کی جائے دوسرا رنگ وُہ ہے جب عشق و حسن کے راگ ذرا بلند سطح پر فنی نزاکتوں اور جذبات کے زیادہ ٹھہراؤ کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں، اور تیسرا رنگ سیاسی شاعری کا ہے۔ جس کے تعارف کا تاریخی سہرا خود اُن کے سر ہے تیسرا رنگ چونکہ اُنہی سے شروع ہوا۔ لہٰذا اسکو صرف کیفیاتی طور پر کہا جا سکتا ہے۔ مگر پہلے دو رنگوں پر کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے کشمیری شاعری میں ان کے ارتقاء پر نظر ڈالنی ضروری ہے اور اگرچہ دونوں کا تعلق فراق و وصال اور عشق و محبت کی کیفیات سے ہے۔ مگر پھر بھی ان کا خط امتیاز جب تک نمایاں نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان کی تدریجی روایات کو ذہن میں نہ رکھا جائے۔

کشمیری ادب کی ابتداء لوک گیتوں سے ہوتی ہے۔ یہ لوک گیت عام طور دیہات کی کھلی فضاؤں میں پلنے والے محنت کش اور سادہ منش لوگوں کے پُر خلوص اور سادہ جذبات کو سیدھے سادے مگر دل کش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان بظاہر سادہ الفاظ میں اُن کے دل کی دھڑکنیں اس انداز سے سموئی ہوئی ہیں کہ ان کی تاثیر آج کے مشینی دور میں بھی چند لمحوں کے لئے ہمارے قلب و جگر کو تعمیہ

پگھلا کر رکھ دیتی ہے۔ ان ہی لوک گیتوں کے پس منظر میں للہ دید کا قدِ آدم سایہ اُبھرتا ہے۔ اُس نے پہلی دفعہ لوک گیتوں کی روایات سے جست لگا کر سماجی، تاریخی اور فلسفیانہ موضوعات کو ایک سنجیدہ اور گمبھیر آہنگ میں بیان کیا۔ اُس کے واکھ اگرچہ عام لوگوں کی زبان پر ہیں۔ اور صدیوں سے سینہ بسینہ چلے آتے ہیں۔ مگر پھر بھی اُن کی بو باس آسانی سے پہچانی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے وُہ کشمیری زبان کی پہلی صاحب طرز شاعرہ ہے۔ جس نے لوک گیتوں کے عام اور مقابلتاً سطحی پیرایہ اظہار کو الگ چھوڑ کر اسلوب کے نئے امکانات اور گفتگو کی ایک ارفع سطح کو متعارف کر کے ایک اہم کروٹ کی نشاندہی کی۔ اُس کے بعد اگرچہ کشمیری زبان میں بہت سی اچھی شاعرائیں اور شاعر پیدا ہوئے۔ مگر اُن میں نہ تو کسی کے یہاں زندگی محبت اور کائنات کا کوئی نیا تصور ہی ملتا ہے۔ اور نہ ہی بات کرنے کا کوئی مخصوص انداز اُبھرتا ہے یہی وجہ ہے کہ حبہ خاتون اور ارنہ مال کا اکثر کلام یا تو لوک گیتوں کے ساتھ خلط ملط ہو گیا ہے۔ یا ایک دوسرے سے ان شاعراؤں کی بہت کم ایسی چیزیں ہیں جنہیں وثوق سے کسی خاص نام کے ساتھ منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ان سارے شاعروں کا انداز لوک گیتوں کا ہی انداز ہے۔ وہی تصورات گفتگو کے وہی استعارے اور وہی ہیئت۔

ان گیتوں نے اگرچہ مقدار کے لحاظ سے شاعری کے ذخیرے میں کافی اضافہ کیا اور کبھی کبھی اعلیٰ پایہ شاعری کے بہت اچھے نمونے ملے مگر تصورات کی یک آہنگی جذبات کی ہمواری اور انداز بیان کے فرسودہ سانچے برقرار رہے جانے کی وجہ سے شاعری فنی عروج اور جذباتی پختگی کی کوئی فیصلہ کن منزل طے نہ کر سکی۔ جس کی تاریخی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بیرونی اقتدار کے سامنے کشمیری زبان ہمیشہ نچلے طبقے کی ہی زبان بنی رہی۔ اور اُن کے دُکھ درد کا ذریعۂ اظہار اس کے برعکس تعلیم یافتہ اور ذہین طبقہ ہمیشہ درباری زبان کو اپنا تا رہا گو کہ اُس زبان (یعنی فارسی) میں کشمیریوں نے غنی کے پایہ کا اُستاد اور بالغ نظر شاعر پیدا کر کے اپنی شعری صلاحیتوں کی دھاک بٹھا دی۔ مگر خود کشمیری شاعری کا حال بُرا رہا۔ اور اس میں وہی پامال

تصورات کا فرق ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے شاعر جو عام طور پر تعلیم سے نابلد ہوتے تھے اُن کے یہاں ایک ہی یکرنگ فضا ملتی ہے۔ اور اس دور کے کسی شاعر کا کلام پڑھکر کوئی مخصوص اثر پیدا نہیں ہوتا۔ محمود گامی کی شاعری بھی گو روایتی انداز کی حامل ہے۔ مگر اس لحاظ سے اہم ہے کہ اُسے مروجہ تصورات کو ایک نشاط آمیز رجائیت سے گلنار کر دیا۔ اُس کے یہاں انبساط اور سرور کی ایک ایسی صہبا کا خمار ملتا ہے جو روایتی پیمانوں میں ہوتے ہوئے بھی تاثیر کے لحاظ سے زیادہ پُرکیف ہے۔ اُس کے یہاں بحروں کے استعمال اور اُن کی پُرکاری میں ایک خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔ مگر اس کے باوجود وُہ کسی نئے رُجحان کا خالق نہیں قرار دیا جا سکتا

رسول میر کشمیری شاعری کا ایک اہم موڑ لیکر سامنے آتا ہے اور للہ دید کے بعد وُہ پہلا کشمیری شاعر ہے جس کے انداز بیان میں ندرت۔ جس کے تصور حسن و عشق میں انفرادیت اور جس کے اسلوب میں ایک نئی تازگی کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اُس کی شاعری گو روایتی انداز میں شروع ہوئی۔ مگر اُسکا فارسی ادب کا مطالعہ اور پھر عشق کی ذاتی واردات کا تجربہ بہت جلد پرانے سانچوں کے لئے اجنبی سا دکھائی دینے لگا۔ اور اس کے احساس حسن کی شدت اور جذبہ عشق کی توانائی نے پرانے خُم پگھلا کر ایک نئی شعری دُنیا تخلیق کی۔ وُہ عشق کی بالغ نظری اور حسن کی رمز شناسی کا شاعر ہے۔ اُس کے یہاں ہمیں عشق گلی کوچوں کی عام سطح سے اُٹھ کر ایک مرتفع اور بلند سطح پر متمکن نظر آتا ہے۔ اُس کے جذبات و احساسات کی حرارت نے اُس کے آہنگ پر بھی اثر ڈالا۔ اس لئے اس کے یہاں حسنِ بیان اور ندرتِ ادا کی وُہ بہار ملتی ہے جو اس سے پہلے کی شاعری میں عنقا ہے۔ اُس کے یہاں کشمیری شاعری (Folk Lore) کی منزلوں سے گذر کر تغزل کی نئی معراج تک پہنچ جاتی ہے اور وہ فارسی اور اُردو غزل کے مقابلے میں اپنی رعنائیوں کے ساتھ نکھر اُٹھتی ہے۔

اس پس منظر میں مہجور کی ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ مہجور نے ابتداء سے ہی دعویٰ کیا کہ وُہ رسول میر کی شراب نئے پیمانوں میں انڈیل رہا ہے اور اس نے اس رنگ میں مشق بھی کی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مہجور کے

تعمیر

پاس نہ تو داخلی واردات کا وُہ خلوص تھا جو رسول میر کا حصہ تھا۔ اور نہ ہی اُس کے احساس حسن میں اتنی توانائی تھی۔ نتیجے میں وُہ رسول میر کی علامات کے استعمال کو ہی اُس کی تقلید سمجھ بیٹھا۔ اور اس طرح سے "تیغ بازس رزم سازس ترکتازس عار چھا" والی غزلیں وجود میں آ گئیں۔ جو تاثیر کی گہرائیوں سے خالی اور لفظی اُلجھاؤں کا گورکھ دھندا ہیں۔

مہجور کا دوسرا رنگ وُہ ہے۔ جب وُہ پھر آسان اور ہلکی بحروں والے روایتی ادب کی جانب باگیں موڑ لیتا ہے۔ جس کے لئے مہجور کے بہت سے پیشرؤں نے زمین ہموار کر رکھی تھی۔ اس رنگ میں ہیئت کی شعبدہ گریاں دکھانے کیلئے کافی گنجائش ہوتی ہے۔ اور اگر مہجور کے کلام کے بہترین حصہ کی تلاش کرنا ہو۔ تو وُہ اس حصے میں ہی مل جائیگا۔ گو جب ان اشعار کا مقابلہ حبہ خاتون۔ ارنہ مال اور ایسے ہی دوسرے شاعروں سے کر دیا جائے تو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اُس نے اُن کی تخلیقات سے بہتر ادب کس نوعیت سے پیدا کیا ہے۔ کیونکہ اُس نے جو مضامین باندھے ہیں۔ ان پیشرو شاعروں کے کلام میں حسن۔ سادگی اور تاثیر کی آخری بلندیوں کو چھو لیتے ہیں۔ اس وقت موقع نہیں ہے کہ ایسے شعر اور مہجور کے اس رنگ کے شعروں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جائے۔ پھر یہاں پر بھی مہجور کے کلام کا اکثر حصہ مفہوم کے کسی گہرے دباؤ کی عدم موجودگی میں سطحیت اور عامیانہ پن کی اُس دُھند میں لپٹ جاتا ہے جس میں اعلیٰ ادب کی راہیں گم ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں مہجور کے ایسے رنگ میں سے

داؤ چھمک سُلہ اوس لاران
تنبہ لیومُت کس تام ژھاران
غندہ پوشو کرس جایہ جائے
پایہ مِژ مسیانہ یاوُن رائے

جیسے حسین بند مل جاتے ہیں۔ وہاں ایسے عام بند بھی ملتے ہیں جن میں رعایتِ لفظی کے سوا کچھ بھی نہیں ؎

دِل لیون تھوتون منز پھولداتن — یہ چھیلو پستانن منز
ام کرنیہ گی غنچہ دہانن — جائے تم بُنٹ پستانن منز

(یعنی دل کو پھولدان میں رکھو۔ یہ پستانوں میں پلا ہے اور غنچہ

بیان کیا جا سکتا ہے؟

مہجور کے دیوان میں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے اور اس بات پر دال ہے کہ جب کسی داخلی تحریک کے بغیر قافیہ پیمائی کی تلاش میں گھر چھوڑ دیئے جائیں۔ تو شاعری کا کیا حال ہو جاتا ہے۔ پھر بھی مہجور جیسے شعراء کے یہاں یہ بات نبھ جاتی ہے۔ مگر جب اس سے کمتر درجے کے شعراء اس میدان میں زور آزمائی کرتے ہیں۔ تو یہ مضحکہ خیز چیزیں پیدا کرتی ہے جس کی مثال ہمارے چند زندہ شعراء کے کلام میں مل سکتی ہے۔ جو ہفتہ بھر ایک ایک مجموعۂ کلام تیار کرنے کے متمنی ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک فکر طلب نکتہ یہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ مہجور کا یہ رنگ کشمیری شاعری کی ترقی کا غماز ہے اور کیا اس میں ہمارے موجودہ دور کے مسائل کے اظہار کا کوئی امکان ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لوک ادب اپنی نوعیت میں لاکھ دلفریب اور سحر کار سہی مگر پھر بھی ادب و شعر کی مقابلتاً ابتدائی شکل ہے۔ اور یہاں سے آگے بلاغت تخیل اور فصاحت بیان کی اُن راہوں کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ جو ہر تہذیب یافتہ قوم اور زبان کا سرمایہ افتخار رہتے ہیں۔ اور عظیم ادب کے عناصر ترکیبی بن جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مہجور کی یہ کروٹ فن کی پیچیدہ گھاٹیوں اور ریاضت طلب منزلوں سے فرار کا درجہ رکھتی تھی۔ حالانکہ اس کے پس منظر میں چند سماجی اور سیاسی حقایق کی کارفرمائی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں اُس کے کلام کا وُہ حصہ ناگوار بن جاتا ہے۔ جہاں اُس کی تصویر کشی عریانیت کی حدوں کو چھو لیتی ہے ؎

یارہ شند مارہ مت سارہ چھم نہ کھاوان
یارس لمہ پان ساوان چھیس
کامہ دیو بار چھنہ جامہ مژہ راوان

(محبوب کا ارمان مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ میں اُس کے پہلو میں سو جاتی ہوں۔ مگر وُہ کپڑے نہیں اُتارتا)

کشمیری شاعری میں ایسے مواقع اور ایسے جذبات کا اظہار کوئی نئی چیز نہیں۔ مگر رسول میر جیسے شعراء کے یہاں ان کے بیان میں فنی نزاکتوں کا پورا احترام ملتا ہے۔ اُس سے وُہ ہیجان خیزی کم ...

کے گناہ ذہن سے پہنچ جاتے ہیں۔ ؎

کھہس گوم ما نکلہ۔ دِرس گوم برے
ژَس گوم والنجہ یارہ ما آم
اورہ تم سینہ دورہ لورہ مے ترے
فتے دیئے یار کوت گوم

(کنڈی کھڑکی۔ دروازہ پر دستک ہوئی۔ مجھے واقعی وہم ہو گیا کہ میرا محبوب آگیا ہے۔ (اور اس عالم تصور میں) میں نے اپنی باہیں وا کر دیں اور اُس نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا لیکن میرا دوست کہاں چلا گیا؟)

مہجور کی یہ روایت آگے چل کر عارض کی اُن نظموں کا دروازہ کھولتی ہے۔ جب یہ پیرایۂ اظہار اور زیادہ نفرت انگیز شکل اختیار کر کے "تنہ مژہ راوتھ نالہ متہ سوودُم" جیسی نظموں کا قالب اختیار کر لیتا ہے۔

مہجور کے اس رنگ کا مطالعہ کرنے سے ایک اور دلچسپ بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اُس کی شاعری چند جنسی اُلجھنوں کے غبار سے بھی لپٹی ہوئی ہے۔ مہجور کے کلام میں کبھی یہ اُلجھنیں عریانیت اور ایسے جذبات کی کھلم کھلا تشہیر کی صورت میں اُبھر آتی ہیں اور کبھی ایک موہوم اور ان جانے مفہوم کی حیثیت میں۔ اور اس کے کلام کا مطالعہ کرنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ وُہ ہمیشہ بہت کچھ کہہ کے بھی اپنی تشکیک کی نوعیت کا مفہوم نہ سمجھ سکا۔

دِدپ کھم ژہ چھے آنزون کیاہ چھوی ژہ تمنا
خمارہ ہیتھ وارہ مے کُن کر نظر ونے
کرد چارہ دُل دُل مارہ میتہ میانہ جنونک
میتہ چھوی نہ پانس تان لوملوین نیر ونے

(تم نے آخری وقت پر مجھے پوچھا تو کیا چاہتا ہے۔ اے پیر خمار میری طرف غور سے دیکھ خود سمجھ جاؤ گے۔ یا تو تم میرے جنون کا کوئی علاج کرو۔ میں آپے میں نہیں ہوں۔ شاید کوئی ناگفتی بات کہہ دوں)

مہجور کے اس پہلو کا تفصیلی جائزہ بجائے خود ایک طویل بحث

ہے۔

مہجور کی شاعری کا تیسرا رنگ اُس کی سیاسی شاعری ہے۔ اس بات سے انکار کرنا حقیقت سے مُنہ موڑنا ہے۔ کہ مہجور کے سر ہمارے ادب میں کھُلم کھلا سیاسی رُجحانات اور سماجی حقائق کو متعارف کرانے کا سہرا باندھا جائیگا۔ مگر یہ امر پھر بھی صحیح رہتا ہے کہ اُن کے سیاسی رُجحانات کبھی مسبوط اور مکمل نہیں رہے۔ اور اُس کی شاعری کا کوئی جوہر اس میدان میں نہیں کھُلا۔ مہجور کے کلام کا فنی عجز اُن جگہوں پر عروج پر نظر آتا ہے۔ جہاں پر اُس نے چند اُن تصورات کی تبلیغ کی ہے۔ جو اُس کے لئے اَن سُنے منائے تھے۔ اور جن پر اُسے شعوری گرفت حاصل نہیں تھی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ ایک تو بھانت بھانت کی بولیوں میں ظاہر ہوا۔ اور دوسرے اُس کی شاعری اُس منزل تک پہنچ گئی۔ جہاں شاعری اور نثر کی سرحدیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ مگر چونکہ یہ وقت کا راگ تھا۔ اور بقول مہجور "دچھت مہجور رنو رس کون۔ نوی رنگاہ ہیوان ہاوُن"۔ لہٰذا مہجور کی یہ سیاسی نظمیں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ اور خود مہجور اس قدر دانی کی وجہ سے اپنے پہلے دو رنگوں سے نکل کر آخری دَور میں بالکل سیاسی نظمیں کہنے لگے۔

مہجور کی سیاسی شاعری کا درجہ متعین کرنا ہو تو اُس کے ہمعصر آزاد کے ایسے کلام کا مطالعہ ضروری ہے۔ آزاد کی ادبی زندگی مہجور کے سلسلے میں شروع ہوئی۔ مگر اُس کی شاعری بہت جلد نکھر اُٹھی۔ اور مہجور کے نسائیانہ لب و لہجے کو الگ چھوڑ کر اُس کے کلام میں تحریک آزادی کا وُہ سارا ولولہ، جوش، وقار اور خود اعتمادی ڈھل گئی۔ جو اس کا خاصہ رہی ہیں۔ اُمنگوں کے اُبال اور ارمانوں کے زیر و بم کے اس وقت میں بھی مہجور عاجزی کے ساتھ اپنے سر کو سنگ آستان پر جھکانے کی اجازت ملنے پر بھی نازاں نظر آتا ہے۔ مگر جب آزاد سر جھکاتا ہے تو اُس کی شان یہ ہوتی ہے ؎

فولاد ژ ایم نار ژ الم خون جگر چھوم
از تام ژہ روس کینہ بروٗنہہ کنہ بوزہ میہ سرلون

(میں نے فولاد چبا ڈالا۔ آگ کے لقمے لئے اور خونِ جگر کے جام

پئے۔ مگر میرے محبوب تیرے سوا میرا سر کہیں اور نہ جھک سکا)

آزاد کے یہاں ہمیں تحریک کی زندہ اور جیالی تصویریں ملتی ہیں اور وُہ نئے تصورات ملتے ہیں۔ جو ایک نئے خروش اور زلزلے کی پیداوار تھے۔ اُس کے یہاں حیات، کائنات، عشق، محبوب اور عاشق کے جاندار اور صحت مند تصورات کی آبیاری ہوتی ہے حالانکہ مہجور کی اس قسم کی کوئی خصوصیت اتنی دیر پا ثابت نہیں ہوئی۔ چنانچہ جوں جوں کشمیری ادب ارتقاء کی منزلوں کو جانے لگا۔ مہجور کو اپنی کوتاہیوں کا خود بھی احساس ہو گیا تھا۔ اور آخر پر وہ عوام کے جھگڑوں سے الگ رہ کر خلوت نشین ہو جانے کی تمنّا رکھتے تھے۔ اور "چھہ اکثر پاک سیرت ژ ہایہ روزان وورہ لوکو نش"، کہہ کر اس نئی کروٹ کا سامنا کر رہے تھے۔

مہجور ہماری ادبی بساط کی اہم ترین شخصیتوں میں سے ہیں۔ اور اُنہوں نے شعر و فن کی جو آبیاری کی ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر کشمیری ادب کے طالب علموں کو اُن کے کلام کی کوتاہیوں پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔ تاکہ غلط تقلید اور فن کو سہل نگاری سے نبھانے کے رُجحانات کی حوصلہ شکنی ہو۔ خاص کر جبکہ یہ آویزش اسوقت شروع ہو چکی ہے۔ ایک طرف شعراء کی وُہ صف ہے، جو ہیت کے سحر اور موضوع کی سطحیت کا سہارا لیکر پھر سے کشمیری ذہنوں کو سنجیدہ مسائل سے دُور رکھنا چاہتے ہیں۔ اور دوسری طرف بالغ نظر شعراء کی وہ صف ہے جو مہجور کے کلام کی بہترین روایات کو سمیٹ کر بھی ایک نئے لب و لہجے کو متعارف کر رہی ہے۔ ان شعراء کے یہاں رسول میر، آزاد اور مہجور کے رنگوں کی شوخ قوس قزاح ایک نئے روپ اور رعنائی سے جلوہ گر ہے۔ اور یہ ماضی کے ادب کی بہترین روایات کو سمیٹ کر اپنے خونِ جگر سے نئی وسعتیں عطا کر رہے ہیں۔ اس طرح ہماری شاعری کو رفعت کے نئے اُفق مل رہے ہیں۔

ڈاکٹر پریم ناتھ گنجو

مہجور کی شاعری کے چند فنی محاسن

کشمیری شاعری عرصۂ دراز سے معمہ گوئی تصوف اور عجیب قسم کے مابعدالطبیاتی خیالات کا مرکب بن چکی تھی۔ اور دور از کار تصورات نے اس سے اس کا لوچ اور رس چھین لیا تھا۔ جس کی آبیاری حبہ خاتون سے لیکر سوڈ میر تک بہت سے شعراء کرتے رہے مہجور کا یہ کارنامہ کیا کم ہے کہ انہوں نے کشمیری کو اس کا عوامی کردار از سر نو عطا کیا۔ اور ایک زندہ جاوید ادب کی بنیادیں استوار کیں۔

مہجور کشمیری ادب کا ایک بہت ہی اہم شاعر ہے اور اس کے لئے اُن کی چند خصوصیات ذمہ وار ہیں۔ مہجور کشمیر کی تاریخ کے حسن ہنگامہ خیز دور میں جیا۔ اس کے تمام نشیب فراز اُن کے کلام میں موجود ہیں۔ مگر قطع نظر اُن کے سیاسی کارناموں کے محض ادبی حیثیت سے انہوں نے کشمیری شاعری کو بہت سے محاسن بخشے۔ اولین بات یہ ہے کہ اس سے پہلے اس کے چند گنے چنے موضاعات تھے۔ مگر انہوں نے اس کو زندگی کے اند قریب لایا۔ کشمیری داستانیہ، مثنویوں کو چھوڑ کر جہاں مناظر فطرت کا ذکر محض ضمناً آیا ہے۔ مہجور نے اس شاداب خطۂ زمین کے حسن خداداد کو اپنی قلمی تصویروں میں بند کردیا۔ اہربل، آرہ بل، گنگہ ون۔ یوسمرس۔ سوکھ ناگ، نیلہ ناگ وغیرہ کے جیتے جاگتے مناظر کی نادر تصویریں مہجور کی شاعری میں محفوظ ہیں۔

مہجور کی شاعری میں گل و بلبل کا تذکرہ بہت ہے۔ مگر اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کی داد دینی پڑتی ہے۔ کہ انہوں نے ہر جگہ کس نئے پیرایے اور کس فنی حسن کے ساتھ اس کا نباہ کیا۔ چنانچہ جہاں ان چیزوں کا ذکر آیا ہے۔ وہاں ماحول اور روایت کے مطابق طوطہ، ون ہار، ٹیکہ بن اور ورکم کا استعمال پورے فنی التزام کے ساتھ ہوا ہے۔ مہجور کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کشمیری لوک دھنوں اور مقبول عام بحروں میں غزلیں کہیں۔ اور اس طرح سے کشمیری شاعری اور کشمیری موسیقی کے اُس فرق کو دور کردیا۔ جو صوفیانہ طرز کلام اور صوفیانہ موسیقی کے مروج تصور نے پیدا کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مہجور کا کلام کشمیری عوام کے لئے ایک خوشگوار جھونکے کی طرح حیات بخش ثابت ہوا۔ مدتوں کے رکے بند کھل پڑے اور کشمیر کی فضاء میں ہر جگہ مہجور کے ترانے دلکش دھنوں میں سنائی دینے لگے۔

مہجور کا کلام جہاں اپنے اندر بے شمار سیاسی اور سماجی تحریکوں کو سموئے ہوئے ہے۔ وہاں اس میں باریک فنی نزاکتوں کی بہار بھی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی بحروں اور سیدھے سادھے الفاظ کے استعمال سے ایسے پُر کار شعروں کا تانا بانا بنتے ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے۔ ذیل کے چند اشعار سے پتہ لگ سکتا ہے۔ کہ یہ فن کار اکے دُکے الفاظ سے کھیل کر کیا طلاطم بپا کر سکتا تھا۔

از روزو سانے دلبرہ میانے
لوزنہ بانے دلبرہ میانے
لولہ ہوت میون پان۔ یودگژھ پارا ان
لول ماپرانے دلبرہ میانے
شبنم مختہ ہار۔ ویرہ چانے کور تیار
کم شوژہ شانے۔ دلبرہ میانے

(آج ہمارے یہاں رہ محبوب، روشن میرے حسین دوست۔

آج میرے یہاں رہ۔ میرا محبت بھرا دل عمر کی کتنی منزلیں طے کرے مگر کہیں محبت پر خزاں آسکتی ہے؟ میرے پیار شبنم نے موتیوں کا ہار تیرے لئے کس پاکیزگی سے تیار کیا۔ میرے دلبر! میرے یہاں رہ)

آپ نے اشعار میں جدت طرازی اور باریکی سمو کر کشمیری غزل کو لطیف بنایا ہے۔ دیکھئے صبح کے وقت کلیوں کے چٹکنے کو کس ادا سے بیان کیا ہے ؎

واوٕ چھکٕ شُلہ اوس لالان
تنبہ لیمت کس تام ژھ ہاران
خندہ پوشو کرس جائے جائے
پائہ بلہ میانہ یاون رائے

(نسیم سحری صبح سویرے ہی دوڑتی بھاگتی جا رہی تھی۔ (کچھ تلملاتی سی کسی کی تلاش میں وہ) اتنی سہمی ہوئی تھی کہ ہر جگہ پھولوں نے خندہ زنی کی۔ میرے بلند مرتبہ بچپن کے دوست)

نسیم صبح کا گلستان میں شبنم سے پھولوں کو نہلانے سے "دامانہ چھلن" کا مضمون پیدا کیا ہے ؎

لوٗہ ہٕشر تہ چھنہ ریمبٕژ مسول ونان چھہ داوس
دامانہ میون یم چھوٗل اَتھ زاہ قرار آسیا

(شبنم کی تری سے لت پت اور کچھ گھبرائی ہوئی مسول (جنگلی گلاب) باد صبا سے یوں کہتی تھی کہ میرا دامان جس نے دھو ڈالا۔ وہ بھی ہمیشہ بیقرار ہوگا۔ دامان دھونا کشمیری میں غیبت کرنے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شبنم پھولوں کی پتیوں پر جم کر ان کو نہلاتی ہے۔ سورج چڑھنے کے ساتھ ہی شبنم بے قرار ہو کر اڑ جاتی ہے)

کسی کی یاد میں آنکھوں سے آنسو کا جاری ہونا یوں بیان کیا ہے ؎

خون گوم جاری اوٗش ہار ہاری
قلہ قلہ گوم مختہ ہار مد نو

(میں اتنا رویا کہ آنسو کے بجائے آنکھوں سے خون جاری ہوا۔ جو آنسو بہے وہ تو موتیوں کے دانے تھے جن سے کوئی ہار
تعمیر

بنا تھا)

توارد:۔

مہجور نے خیال کی باریکیوں کو اپنے کلام میں ایسے سمایا ہے کہ دیگر زبانوں کے اساتذہ کے کلام کے ہمدوش کیا ہے۔ ذیل میں چند نمونے درج ہیں جن سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

خان خاناں:۔ بہ جرم عشق توام مے کشند غوغائے ست
تو نیز بر لب بام آ چہ خوش تماشائے ست

مہجور:۔ خستہ دل میون لستہ گومت لوکس زالس اندر
کیا تماشا وچھنہ نیرنہ ہے اکہ دماہ راو نہ ہے

(میرا خستہ دل محبت کے جال میں پھنس کر تڑپ رہا ہے۔ ایک نادر تماشا ہے۔ محبوب ذرا سی فرصت نکال کر دیکھنے تو آؤ۔

عرفی:۔ اگر ز گریۂ میسر شدے وصال
صد سال مے تواں بہ تمنا گریستن

مہجور:۔ وَدنہ سیتن ییہ اثر گژھہ ہالتس سنگین دلس
رات تہ دوہ دوشوی اچھن کیٛن خون باران ہا ہا

(اس سنگدل معشوق کے دل پر اگر میرے رونے سے کوئی اثر ہوتا تو میں رات اور دن برابر دونوں آنکھوں سے آنسو کی بجائے خون کی بارش بہاتا)

ظاہر ہے کہ مہجور نے چند سال کی قید ہٹا کر "رات تہ دوہ" یعنی ہمیشہ کہہ کر اور آنسوؤں کی بجائے خون باران آنکھوں سے بہا کر استاد کے شعر کے معنی اور خوبی میں کتنا اضافہ کیا ہے)

ذوق:۔ گل پریشان ہوا ہنس کر چمن میں آخر
دیکھ اے غنچہ یہاں خندہ زنی خوب نہیں

مہجور:۔ پوشہ لوٗر خاموش پورہ سامانے
ژھوپہ چھے رویہ سنزٕ پانے لوز
کتھ سیٛت بوٗے گُل گو پریشانے
بلبلہ سند افسانے لوز

(اپنے انداز میں کلیاں بھید (راز عشق) چھپائے ہوئے خاموش ہیں۔ اُن سے ذرا سی غفلت ہوتی ہے کر چٹک کر پھول بنتی ہیں اور

پھولوں سے خوشبو ہر سمت پھیل کر زائل ہوتی ہے۔ راز کی بات کہنا
بھلی۔ خاموشی دنیا جہان سے۔ الغرض خموشی معنے دارہ کہ در گفتن
نہ آید۔)

یہ برسوں کی بات ہے جب راقم نے یہ ہم معنی اشعار ہجور کو
سنائے وہ اچھل پڑے اور بہت محظوظ ہوئے۔

غالب :- کرنے گئے تھے اُن سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نظر کہ بس خاک ہو گئے

ہجور :- ژلہ لارہ ورچھک حال ونہے وارہ وچھو ہے ردئے
گلہ ژ لوئیم ادش وتھم دده رائے ضائے کیاہ

(تم کہیں جلدی میں جا رہے تھے جب میں نے تمہیں دیکھا۔ میری
آرزو تھی کہ جی کھول کے دیدار کروں اور تمہیں اپنا سب حال دل
سناؤں۔ لیکن تمہیں دیکھ کر میں کچھ بول نہ سکی صرف آنکھوں
سے آنسو رواں دواں بہنے لگے)

اور دیکھئے جب ہجور کا شعر کانوں میں پڑتا ہے کہ ؎
لگمت تس چھوپ پرس کیاہ تام میون ووڈن ہس
نتہ ونتہ بے سبب تس چشمن خمار آسیا

(معلوم ہوتا ہے کہ رقیبوں نے اسے میرا بُرا بھلا کہہ کر اُس
کو اپنی بزم میکشی کی جوڑ ڈالی ہے۔ نہیں تو کیا وجہ ہے اُس کی آنکھوں
میں شبینہ خمار جھلکتا ہے)

تو مناسبت سے استاد کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎
تو شبینہ مے نمائی بہ بر کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

شیلی :- O wind! if Winter comes, can spring be far behind.

ہجور :- بود سورہ شراون وادہ ہر دنہ پوش ترادن کرو
ہر دس نتہ چھنہ بتہ پائداری دارہ ژ لس تھاؤ

(اگر ساون کی برساتی بہار بھی ختم ہوا اور موسم خزاں آ بھی جائے
اسی وجہ سے پھولوں کی بہار یکسر ختم بھی ہو جائے۔ لیکن یاد
رکھو کہ موسم خزاں میں ملت نمو تا یا نگار اور رعنائی ہے۔ خزاں کے
تعبیر

بعد بہار یقینی ہے)

غنی :- حسن سبزے بہ خط سبز مرا کردہ اسیر
دام ہم رنگ زمین بود گرفتار شدم

ہجور :- والہ داشن چھانہ بایت والہ بر زائل کوکھ
پوشہ تھرہ آند آند ہیتوی ما زال تے سبزار چھوی

(بالوں کے حلقہ کو تیرے لئے اور بھی چھوٹا بنایا گیا ہے۔ تاکہ
نظر تم اسکیں بے خبر دیکھ تو سمجھی کہ گلوں کے ساتھ جال اور سبزہ زار
ہم رنگ بنا ہوا ہے۔ کہیں بے خبری سے جال میں الجھ نہ جانا۔

غالب :- ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا ہے مرے آگے

ہجور :- روئے مصحف زلف کافر روبرو
ونتہ دسے کورکن لاگون تول

(معشوق کا روئے زیبا (مشابہ مصحف مجید) اور زلف سیاہ
(کافر) دو تو غضب ڈھاتے ہیں۔ سبھی یہ دو تو ایک سے بڑھ کر دوسرا
حسین ہیں۔ بھلا ہم اپنے دل کو ان دو میں کس ایک پر فدا کریں)

جہاں اقبال یہ کہہ کر ؎
د داغ غنچہ میں ہے راز آفرینش گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے

جینے اور مرنے کے راز کو ایک طرح خاص سے ادا کرتے ہیں۔ وہاں
ہجور کے لئے یہی گل اسی حیات و ممات کا راز یوں منکشف کرتا
ہے ؎
گل سر دہ ہران سونتہ بیٹھ دوبارہ کران ددر
مرُ مرُ چھ پھیرلن زندگی وسواس مرنک تراؤ

(پت جھڑ کے موسم میں پھول جھڑ جاتے ہیں۔ بہار آنے پر پھر
حاضر ہوتے ہیں۔ یہاں تو مر مر کے پھر سے زندگی ملتی ہے۔ مرنے کا ڈر
چھوڑ دے۔

یہ آخری شعر اُن کی سنگ تربت پر کندہ ہے۔
ہجور کے ذکر کے سلسلے میں یہ کہہ دینا بھی مناسب ہوگا کہ انہو
نے قصیدہ نگاری اور مرثیہ نگاری پر کبھی توجہ نہ کی۔ [illegible]

وتی ؤتی کٔس اکہ افسانہ لولک ۔ کری پیاؤ نعمہ کٔس ..، لولک
شمع لولک ژعیتہ گو منز کشیرے ۔ وتعمہ کتہ ژھارون اَس پروانہ لولک
کری باپار یہ کٔس لولہ کرئی وون ۔ بیہ مزہ راوہ کٔس ووکانہ لولک
بنی کٔس لولہ مجنون عالمس منز ۔ بنت کٔس نیرہ بیہ دیوانہ لولک
گلن تہ بلبلن کٔس لول بھرہ وونِ ۔ وتعمہ کٔس بیہ شیرہ گلشن پانہ لولک
چھ تہ باقی مگر ساقی ژدٔرئ کوت ۔ دپان تم سیتِ نیو پیمانہ لولک

ہیرونی گریہ میخانہ کشیرے
بنی کتہ چھ سخندانہ کشیرے

چھ بڈ افسوس اما ہجور کوت گو ۔ اسے نشہ اوس نزدیک دور کوت گو
میدان اوس داد سوزس نہ سازس ۔ پران اوس نغمۂ منصور کوت گو
کشیرے منز سو شمع شاعری اوس ۔ اما تمہ شمعکوئ سوئ نور کوت گو
ادب کشیر گوئ گرزیورے روس ۔ چھ افسوس ادبکوئ کنہ دور کوت گو
سپد بے سر یہ ملکِ شاعری ہے ۔ سخندانی ہندی فغفور کوت گو
ستارہ شاعری رود ژھایہ ابرس ۔ کورن ژدرے بہن منظور کوت گو

چھ کرمت دوٗرِ رن ہجور زنگیر
کران ماتم چھ ہے ہے ملک کشیر

کران پرتھ ساتہ از گریانہ کشیر	۔	بنیو از ماتمک سامانہ کشیر
مجنی زنجیر ہیرہ بنہ گیہ کشیرے	۔	چھ نالِ ہیتھ ماتمک زولانہ کشیر
دلس داغ جدائی پرتھ اکس چھوئی	۔	چھ لہروانی غمک طوفانہ کشیر
کران پیر و جوان از نوحہ خوانی	۔	بنیومت چھوئی تہ غمخانہ کشیر
جہانس نالہ زاری چھے ژوپاری	۔	چھ اوش ہاران چشمو پانہ کشیر
زمانن روہ ترد و رود رستن غمن ہیند	۔	پران از چھوئی تمے افسانہ کشیر

ودان کشیر چھوئی از نغمہ خوانس
تمس ہجور سئ شیرین بیانس

[illegible]

مظفر عازم

مہجورؔ کا تصورِ محبوب

مہجورؔ کی سادگی اور پُرکاری عشق و محبت ہی تک محدود نہیں ہے۔ اُس کی نظمیں اور غزلیں ہماری تحریکِ حُریت میں ایک نمایاں رول ادا کرتی رہیں لیکن پھولوں کی وادی کے اس زمزمہ خواں کے جوہر حُسن و عشق ہی کے میدان میں کھلے۔ اُس کے ہاں جلال کم اور جمال زیادہ ہے، جوش و خروش پر سوز و گداز کا پلّہ بھاری ہے۔ شعلہ و شرر کی بات کم، خنکیٔ شبنم کا ذکر زیادہ ہے بجلی کوندتی ہے تو اس کو ایک نازک بدن، سُرخ پوش کا تصور آتا ہے، جو پریم رس بانٹ رہا ہو۔ اُس کا لب و لہجہ واعظانہ نہیں۔ وہ ہمارے جذبات کے نازک تار چھیڑ کر ہمیں اپنے جذبات کے آہنگ کے قریب لے جاتا ہے اُس کے کلام کی یہی لطافت اور نزاکت ہے۔ جو ہمارے دل کی گہرائیوں میں اُس کے لئے ایک مقام پیدا کرتی ہے۔ اُس کے ساز کے تار جب حرکت میں آتے ہیں۔ تو ہمارے جذبات میں ایک ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ جو ہمیں مست و بے خود ہی نہیں کرتا — بلکہ ہماری نظر کو شوخی اور بے باکی بھی بخشتا ہے۔

محبت زندگی کی ایک عظیم حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری باقی شاعری کی طرح کلامِ مہجورؔ کا بھی بیشتر حصہ کیفیاتِ محبت سے متعلق ہے لیکن یہ بات ہمیں اُس کی تنگ دامانی کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ اُسکی عشقیہ شاعری میں اس قدر تڑپ، گہرائی اور گیرائی ہے کہ اُس کے تجزیہ سے ہم مہجورؔ اور اس کے عہد کے متعلق بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک محبوب کے گیت گاتا رہا، اُس کے فراق سے دُکھ اور وصال سے لطف اُٹھاتا رہا۔ اور نغمہ ریزی کی دُھن میں اپنے جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ اُس کے خد و خال کی بھی تصویریں اُبھارتا رہا۔ کشمیری شاعری کی روایت کے مطابق وہ خطاب کبھی مرد کی زبان سے کرتا ہے اور کبھی عورت کی زبان سے

تمیز

لیکن محبوب کا تصور ہمیشہ ایک رہا ہے۔ اس قدر غیر مبہم اور واضح کہ ہمیں اُس کے پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔ یہ بات ضرور ہے کہ وہ اپنے عہد کی کیفیات کا مکمل شعور نہیں رکھتا تھا۔ جس کی وجہ سے بعض جگہ ایک تضاد کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

مہجورؔ نے اُس وقت آنکھیں کھولیں، جبکہ صدیوں کی غلامی اور بندگی سے جُھلسے ہوئے ویرانے کے خستہ حال مکین، بہار کا ایک مبہم سا خواب دیکھنے لگے تھے کشمیر کی مظلومیت، بغاوت اور انقلاب کے مفہوم سے آشنا ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور ملک کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے میں تخریب و تعمیر کا عمل تیز تر ہونے لگا تھا۔ بہار آنے لگتی ہے تو زندگی کا ادراک اور جوانی کا احساس بھی اُبھرنے لگتا ہے۔ مہجورؔ کے محبوب کی سب سے بڑی خصوصیت کسی حد تک اس عمل کی بھی پیداوار ہے۔ اور وہ خصوصیت ہے اُس کا انسان ہونا۔ وہ ہمارے اکثر شعراء کی طرح کسی غیر مرئی محبوب کی بات نہیں کرتا۔ جو "نہ کہیں اوپر ہے نہ کہیں نیچے، جس تک ہمارا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا"۔ وہ ہمارے شمس فقیر کی ہمنوائی میں اس اُلجھن کا بھی شکار نہیں ہوتا کہ "وہ خود ہی عاشق ہے۔ خود ہی معشوق ہے، اور خود ہی سب کچھ ہے"۔ اُس نے رسول میر کی طرح ہمیشہ ایک چلتے پھرتے انسان کا ذکر کیا۔ وہ اپنے محبوب کو نشاط اور شالیمار کے باغوں میں ڈھونڈتا ہے۔ وہ میلے دیکھنے جاتا ہے کہ شاید وہاں دیدارِ یار نصیب ہو۔ وہ جب سنتا ہے کہ اُس کا دوست ڈل کی سیر کرنے جا رہا ہے، تو خود پانی میں کنول بن کر اُس کے درشن کا منتظر رہنے کی خواہش کرتا ہے۔ عشق و محبت کا یہ حیات آمیز تصور مہجورؔ کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کرتا ہے کہ "ساد و سادہ حسنِ قابلِ تعریف

نہیں۔ اے مہجور تو مجاز سے فریب نہ کھا"۔ لیکن شعور کی یہ خامی اُس کے سارے کلام میں صرف کہیں کہیں نمایاں ہے۔

مہجور کا یہ زندہ محبوب اس قدر سنگ دل واقع ہوا ہے کہ وُہ ایک بار جب جلوہ دکھا کر اپنے چاہنے والے کو نیم بسمل کرتا ہے، تو پھر آرام کے ساتھ بے نیازی کی زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے عاشق کو عالم فراق میں طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ عاشق موت و حیات کی کشمکش میں پڑ کر نڈھال ہو جاتا ہے۔ اور تلملا کر اپنے محبوب کو ظالم اور بے وفا کہکر یاد کرتا ہے۔ محبوب کی یہ سنگدلی انتہائی مبالغہ کے ساتھ پیش کی گئی ہے خصوصاً مہجور کے ابتدائی کلام میں۔

بیدردہ جفا کارو، بے عار ستمگارو
پتھرہ پھیرو دل آزارو، مو کرزہ دل آزاری

(اے بیدرد، جفاجو، بے رحم، ستمگر اور دل آزار، ذرا لوٹ کے آ اور دل آزاری نہ کر) محبوب کے جفا پیشہ اور سنگدل ہونے کا بار بار ذکر آیا ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک بار وُہ اپنے چاہنے والے کو تیر مژگاں سے چھلنی کر کے خود بھاگ جاتا ہے، تو عاشق دیوانہ وار اُس کا تعاقب کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کے پاؤں تھک کر چُور ہو جاتے ہیں اور وُہ پسینہ سے شرابور ہوتا ہے۔

شمہ بالہ لوسم، گمہ گیم جاری یارس پتہ لار لاری یے
رودہ ناساتھا بوزہ میانِ زاری، گگہ یو بال پار یاری یے

(میرے پاؤں تھک کر چُور ہو گئے، اور میں پسینہ سے شرابور ہو گئی، اپنے دوست کا پیچھا کرتے کرتے۔ کاش دم بھر ٹھہر کر میری فریاد تو سُن لیتے، تیرے قربان جاؤں میرے دوست!)

اس شعر میں خطاب عورت کی زبان سے ہے اور وہی اپنے محبوب کا پیچھا کرنے میں یہ ستم سہ لیتی ہے۔ محبوب کی سنگدلی کا یہ تصوّر فراق کی طوالت درد کی شدّت اور شعور کی خامی سے پیدا ہوا ہے۔ فراق کی شدّت اور اُس کے نتیجہ کے طور پر ایک جذباتی ہیجان کا وجود اس سماج کا طرۂ امتیاز تھا جس میں مہجور نے سانس لیا۔ اور شعور کی خامی بھی نتیجہ ہے، اُس درد کا جس میں ہمارا ویرانہ ابھی بہار کا ایک مبہم سا خواب دیکھ رہا تھا۔ کلام مہجور میں عاشق (چاہے وُہ مرد ہو یا عورت) اپنی کیفیات محبت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے آپ کو انتہائی بےبس اور مجبور ظاہر کرتا ہے۔ ہمارا سماج کچھ ایسی ہی نوعیت کا ہے کہ ہماری ساری روحانی

تعمیر

شاعری میں عاشق بے چارگی اور مجبوری کا ایک پیکر بن کے رہ گیا ہے۔ مہجور نے بھی اس کی تصویر کشی کی ہے، کمی صرف اسی چیز کی رہ گئی کہ عاشق اپنے محبوب کی بےکسی اور بےبسی کا احساس نہیں رکھتا اور اپنے محبوب کو سنگدل قرار دیتا ہے۔ عاشق کی یہ مجبوریاں وہاں زیادہ واضح ہیں جہاں خطاب عورت کی زبان سے ہو رہا ہے۔

دورِ یارہ گُند چھم ودہ ناوان — بکہ بکہ آب زن تراوان چھیس
گہ یامہ بدنس زدہ کرناوان — پوشن مالہ کرہ ناوان چھیس

تہ یارن بیت ژھوہ ماران بہ تنہا خُون دل ہاران
دوہس مانیرہ چھس لھاراں بہ ژھارت راتلے بمبرو
کوت نیرہ سییہ سرہ چھس، بے پے بے رہبر چھیس
اندری ہتیتھ لولہ شرچھیس، لولچہ چھیم بیماری
وُچھمک مہ دورہ دورہ سے، سنہ گوم سوزِ گچھ خورہ سے
چھیس ودان ژورہ ژور سے، پوشہ منہ جانانو۔

(دوست کی جدائی مجھے رُلا رہی ہے۔ میں آنکھوں سے پانی کے دریا بہا رہی ہوں غیروں کے طعنے میرا جسم چھلنی کر رہے ہیں، میں تمہارے لئے پھولوں کے ہار گوندھ رہی ہوں۔)

(تم دوستوں کی محفلوں میں مزے لوٹ رہے ہو، اور میں اکیلی خُون کے آنسو بہا رہی ہوں۔ دن کو نکلتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔ اے میرے بھونرے میں تجھے رات کے وقت ڈھونڈوں گی)

(میں کہاں نکلوں گی میں تو رہ و رسم محبت سے ناآشنا ایک عورت ہوں میں دل ہی دل میں درد محبت پال رہی ہوں۔ مجھے محبت کا روگ لگا ہے۔)

(میں نے تجھے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اور میں جنت کی حد نیم بسمل ہو گئی۔ اب میں چھپ چھپ کے رو رہی ہوں۔ اے پھولوں کے متوالے میرے ساجن!)

ان اشعار میں بےبسی کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ ہمیں سماجی اسباب کا شعور ہوتا ہے جن کی وجہ سے یہ قیامت بپا ہے۔ جہاں عاشق مرد ہے وہاں بےبسی کا ذکر تو ہے۔ مگر اس میں ماحول کا جو حصہ ہے اُسے واضح نہیں کیا گیا ہے۔ مجبوری کا بیان کچھ اس طرح سے ہوا ہے جیسے وُہ محبوب کی سنگدلی ہی سے پیدا ہوئی ہو۔ اگر دونوں صورتوں میں محبوب کی سنگدلی کی بجائے عاشق کی بےبسی کا ذکر عاشق کی زبان سے ہوتا، تو فراق کو پیدا کرنے والے سماجی اسباب

سکے خلاف بغاوت کا جذبہ جاندار ہوتا۔

محبوب کا تصور زندگی کی جدوجہد میں عاشق کی رگوں میں لہو کی گردش تیز کرتا ہے، اُس کے جذبۂ عشق کو اُبھارتا ہے، زندگی کی تلخیوں کا احساس گھٹاتا ہے، قوت اور ہمت میں اضافہ کرتا ہے اور اس طرح یاس اور فراق کے بدلے جدوجہد پہ آمادہ کرتا ہے۔ مہجور اس حقیقت سے آگاہ ہے۔

بیپارہ بو سرہ تارہ گنڑ واو وچھت ناو
طوفانہ منزہ اتھ ناوہ اپور تارہ محبت

(میری کشتی باد طوفان دیکھ کر دریا کے اس پار ہی ایک اُلجھن میں پڑ گئی، محبت ہی اس طوفان میں اس کو پار کر سکتا ہے)

وہ جانتا ہے کہ اگر محبوب کا وصال ہو تو عشق سے معجزوں کی نمود ہوتی ہے۔

یم زہ یود باہم رلن ادہ کوہ الن سنگر ڈلن
دردہ ہٹت میانن آلو، سازہ تہ سامانہ پحرن

(اگر عشق کی آہ و فغاں اور حسن کا ساز و سامان مل جائیں تو پہاڑ ہلائے جا سکتے ہیں۔)

محبوب کا یہ تصور مہجور سے پہلے کے شعرا میں اس صورت میں ناپید ہے، سوز و سازِ حیات کا یہ نغمہ خواں ان رموز کی چہرہ کشائی جس سادگی اور شان سے کرتا ہے، وہ اُسی کا حصہ ہے، یہ اُس کے صحت مند تصور کا معجزہ ہے کہ اُس نے جمالِ جاناں اور جلالِ عاشق کی ہمنوائی کو ایک انقلابی قوت اور ایک طوفانی طاقت کی حیثیت سے پہچان لیا، اور اس کا ذکر اُس رجائی اور اُمید افزا انداز سے کیا جو دلکش اور دل افروز ہے۔ اس کے کلام کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ تصور عمر کی رفتار اور تجربات کی وسعت کے ساتھ گہرا ہوتا گیا۔ وہ محبوب کی سنگدلی کی شکایت بھی کرتا ہے اور عاشق کی مجبوریوں کا ذکر بھی۔ کارزارِ محبت میں کئی بار اپنی جان بھی خطرہ میں پاتا ہے لیکن اس آزمائش دار و رسن میں اُس کے قدم ڈگمگاتے نہیں بلکہ وہ اسے زندگی کی قوتوں کو بروئے کار لانے کا سامان سمجھتا ہے۔

لولناد پانس گنڈم میزہ ونہ   امہ تارہ سر تلہ سپنم سون
میلیہ کیا زہ آسہ ولیہ ڈلن   نارہ تہ ستواروہ تہ لاگہ میہ وین

(میرا سارا جسم آتشِ محبت میں جھلس گیا اور اس آگ میں میری کاٹھی سونا بن گئی

تعمیر

میری سہیلیاں مجھے کیوں ڈراتی تھیں۔ میرے محبوب میری زندگی بھڑکانے لگا)

کلامِ مہجور میں عاشق جب مرد ہوتا ہے تو وہ اپنے محبوب کے گرد شہیدانِ ناز کا جمگھٹ دیکھ کر گھبراتا نہیں، وہ اس کو حسنِ محبوب کا ثبوت سمجھتا ہے اور اس لئے اسکا ذکر فخر سے کرتا ہے۔ رقیب کا خیال اُس کے دائرہ فکر سے باہر ہے، وہ محبوب کی جُدائی کے لئے اسکی بے نیازی، عشوہ کاری اور ناز و ادا کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ برعکس اس کے عاشق جب عورت ہوتی ہے تو اپنی غم نصیبی میں اپنے محبوب کی سنگدلی کے ساتھ ساتھ رقیب روسیاہ کی کارفرمائیاں بھی تاڑ لیتی ہے، یہ بات اسلئے پیدا ہوئی ہے کہ جاگیردارانہ سماج میں عورت مرد کے مقابلہ میں زیادہ تشنۂ محبت اور زیادہ مظلوم و مجبور ہوتی ہے اس کے غم خانہ میں ایک کرن کا بھی گزر ہو، تو وہ ساری کائنات کو اپنا رقیب سمجھ لیتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ شاید فطرت کی ساری قوتیں اس کی یہ متاعِ حیات چھین لینے کی کوشش میں ہیں۔ مرد کی مظلومیت اتنی نمایاں نہیں ہوتی اسی لئے وہ بار بار اپنے محبوب سے سوال کرتی ہے کہ یہ مجھ سے حسین کون ہے جو تمہیں مجھ سے جُدا کر گیا۔

زِہ کس ہتی گئے سازِش دہ ئم چھا یا کھ کانہ مہ ہش
ژہ میانے رشکہ پانو نش دِ لگھ کمہ مسولئے ٹمبرہ

(تمہیں کس کے حسن نے مجھ سے چھین لیا۔ کیا کوئی اور بھی مجھ جیسی ہے اسے میرے بھونرے! تمہیں کس گلبدن نے میرے رشک سے اپنے پاس ٹھہرا لیا)

لگمُت تس چھِہ برمس کیاہ تام میون وُنہ ہس
نتہ ونتہ یئے سبب تس چشمن خمار آسیا

(وہ پرائی شراب سے مست ہو گیا۔ میرے متعلق اُسے نہ جانے کیا کیا کہا گیا ہے ورنہ آخر یہ وجہ اُس کی آنکھیں مخمور کیوں ہوتیں۔)

منجملہ ان چند باتوں کے جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ مہجور کے کلام میں خطاب مرد کی طرف سے ہو یا عورت کی طرف سے، تصورِ محبوب میں بہت حد تک یکسانیت ہے۔ دونوں صورتوں میں جب محبوب کے حسن کی تعریف ہوتی ہے تو جسم کے خد و خال ایک جیسے بیان ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے کمند گیسو، خال سیاہ، محراب ابرو، تیر مژگاں، نرگسی آنکھوں اور تلوار جیسی ناک کی تعریف کرتے ہیں۔ اس طرح کہ صرف حسن کی تعریف سن کر محبوب کے مرد یا عورت ہونے کے متعلق رائے قائم کرنی مشکل ہوتی ہے۔

جس کائنات سے ہماری دلچسپی تصور محبوب کے تابع رہتی ہے ہمارے حواس پر محبوب کا حسن کچھ ایسا جادو کرتا ہے کہ وہ ہمیں ساری کائنات سے زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ زندگی کی یہ ساری تگ ودو وجود یار کی منت کش ہے۔ گلاب کی پنکھڑی دیکھتے ہیں تو اُن کے لب نازک کی یاد آتی ہے شفق کی لالی سے رُخسار کی سُرخی کا تصور آتا ہے۔ کالی گھٹاؤں سے زُلف یار کا خیال آتا ہے۔ گلزار حسن خوباں کے ہر پھول سے خوشبوئے یار آتی ہے صبا کے جھونکوں کی سرسراہٹ اور پھولوں کی پتیوں کی لرزش میں ان کا اشارہ ملتا ہے۔ خورشید کی مشعل چمکتی ہے، تو اُن کی پیشانی جھلکتی معلوم ہوتی ہے۔ ان جذبات کا اظہار مہجور کے الفاظ میں سُنئے۔

وارہ ہند پوش، بنبر زل، گل تہ سنبل، مسول
وارہ یتھ وارہ لگان، چھ تہ باری باری
برم چھ کینژن تہ چھ کینہ مست گٔت کینہ ہُشیار
فتنہ کرِ پیدا آمی چشم خماری ساری

(پھلواڑی کے پھول، نرگس، گلاب، سُنبل اور یاسمن سب باری باری تیری بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔ کچھ لوگ برباد ہو گئے ہیں۔ کچھ مست ہیں اور کچھ بیدار ہیں۔ یہ سارے فتنے تیرے خمار چشم کے پیدا کئے ہوئے ہیں)

عاشق کی بے بسی اور معشوق کی سنگ دلی کے باوجود مہجور کا نظریۂ عشق معصومیت، سادگی، دلکشی، حیات آفرینی، اثر انگیزی اور رجائیت سے لبریز ہے۔ اور اس کا فیصلہ ہے۔

لانہ ون ژھایہ تھاون زاہ نہ کرتاون یہ لول
پوشہ کھوتہ چھم زیادہ آول، جانہ کھوتہ بیش ملول

(میں اس محبت کی پرورش کروں گا، اس کو پاس رکھوں گا، اور کبھی اپنے سے جُدا نہیں کرونگا۔ یہ پھول سے زیادہ نازک اور جان سے زیادہ گراں قیمت ہے)

مہجور نمبر میں بچوں کے صفحات کے لیے گنجائش نہ نکل سکی۔ بچوں کے لئے ایک الگ رسالے کے اجرا کی تجویز زیر غور ہے ●

تعمیر

انتباہ

شری مینن نے دہلی کے روٹری کلب میں ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا "کشمیر کے متعلق ہندوستان کے رویہ کو غلط سمجھنا بین الاقوامی اخلاق کے لئے ایک چیلنج ہے۔ ہندوستان ایک صلح جو ملک ہے، طاقت سے بات منوانے کا یہ قائل نہیں۔ لیکن اس کی اس خواہش کا ہرگز یہ مطلب نہیں لینا چاہیئے کہ ہندوستان کمزور ہے یا جابرانہ قوتوں کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دئے ہیں۔

اس جلسہ میں سرکردہ سیاستدانوں کے علاوہ دہلی میں غیر ملکی سفارتی نمائندے بھی موجود تھے۔ اس میں شری مینن نے بین الاقوامی حالات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، جس میں زیادہ تر کشمیر کا ذکر تھا۔ آپ نے کہا کہ بعض لوگوں نے حق خود ارادیت کے معنی بھی نہیں سمجھے ہیں۔ اگر اس لفظ کا غلط استعمال کیا جائے تو اس سے ہندوستان خوف زدہ نہیں ہوسکتا۔ حق خود ارادیت قوموں کو حاصل ہوتا ہے، وہ اُن کی سرداری اور اختیار اعلیٰ کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر آج ہندوستان کے ہر ایک حصے کو حق خود ارادیت دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے ملک کا بلقان کی ریاستوں کی طرح شیرازہ بکھر جائے گا۔ لیکن ہم ایسا کوئی بھی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں جس سے ہماری قومی یکجہتی اور سالمیت کے حصے بخرے ہوجائیں۔

شری مینن نے کہا کہ اقوام متحدہ میں کشمیر کے متعلق ہمارا موقف یہ تھا کہ کسی بھی ملک کو جابرانہ کارروائی کے لئے پھل پانے کا حق نہیں ملنا چاہیئے۔ چہ جائیکہ یہ جابرانہ کارروائی سویز نہر کے سوال پر ہوئی ہو یا گلگت کے سوال پر جابرانہ حملہ کے سامنے جھکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک بار اگر جابر کے سامنے ہتھیار ڈال دئے جائیں تو پھر نہیں کہا جاسکتا کہ جارحانہ کارروائی کا یہ طوفان کہاں جاکر ختم ہو جائے۔ شری مینن نے کہا کہ سلامتی کونسل میں بھی ہم نے یہ بات واضح کردی کہ کشمیر ہندوستان کا حصہ ہے۔ اس پر ہندوستان کے ایک حصہ کے طور پر حملہ ہوا ہے۔ اب اگر پاکستانی فوجوں نے خود یا کسی دوسرے کی شہ پر جنگ بندی سرحد پر حملہ کرنے کی کوشش کی، تو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے سارا ہندوستان اُٹھ کھڑا ہوگا۔ اور ایک ایک ہندوستانی کشمیر کا بچاؤ کریگا۔ آپ نے کہا کہ جب کشمیر پہ جابرانہ حملہ ہوا تو اسوقت کشمیری عوام ہی مزاحمت کرنے اُٹھے۔

حبیب اللہ حامدی

مہجور کی شاعری میں حب الوطنی

عشق اور تصوّف — یہ ہیں دو مخصوص اور نمایاں موضوعات، جن پر بیسویں صدی کے ابتدائی اور وسطی دور تک کا کشمیری شعر و ادب مشتمل ہے۔ یہی دو موضوعات ہیں، جن پر حبہ خاتون سے لے کر محمود گامی تک ہر شاعر نے خامہ فرسائی کی۔ اور اپنے دائرہ فکر و نظر کو ان ہی روایتی حدود تک محدود رکھا یہ ٹھیک ہے کہ ہر بڑے قادر الکلام شاعر نے اپنے داخلی تجربات اور احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے ان پرانے موضوعات میں تنوع، وسعت اور جدت پیدا کی۔ رسول میر نے عاشقانہ شاعری میں سوز و ساز، رعنائی، تازگی اور موسیقی کے حسین امتزاج سے ایسے پرکیف نغموں کی تخلیق کی، جو ہمارے دل کی وادیوں میں ڈگمگ و نور کی جھلملاہٹیں بکھیر دیتے ہیں۔ صوفی شعراء میں شمس فقیر اور احمد بٹواری نے رنگا رنگ فکری اور روحانی تجربات کو دلکش اور شیریں لے میں پیش کر کے دل کے خاموش تاروں کو مرتعش کر دیا۔ اور اسی طرح شاعری کے دامن فکر و تخیل پر رنگا رنگ نقوش ابھرتے رہے لیکن اس کے باوجود شاعری ابھی اس دوران میں پروان چڑھ رہی تھی جب شاعر محض حسین خواب زاروں کے طلسم کو حقیقت سمجھ بیٹھے تھے۔ اور انہیں اس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ حقائق زمانہ کی ٹھوس چٹانوں کی حدّت کے سامنے خوابوں کے شیش محل پگھل کر رہ جاتے ہیں۔ وہ دن رات انہیں خوابوں کے حسین جال بنتے رہتے اور انہیں فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ حیات و کائنات کی گوناگوں [illegible] کی طرف نگاہ اٹھا لیتے، ان کی عقدہ کشائی کرتے، زندگی اور سماج کے گھناؤنے پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے۔ اپنی وادی کی فردوس بداماں بہاروں کا نظارہ کرتے — یہ ایک ایسا دور تھا جب زندگی پر جمود، مردنی اور بے حسی مسلط تھی ایک ایسا دور جب فکری صلاحیتوں کے آئینے زنگ آلود ہو جاتے ہیں، صدیوں کی غلامی، جہالت اور مفلسی نے ذہن انسانی کو خواب اجل سے ہمکنار کیا تھا اور شاعر بھلا اس خواب اور کیفیت سے کہاں بچ کر جاتے؟ وہ کبھی عشق اور کبھی تصوّف کی حسین اور سکون پرور وادیوں میں پناہ ڈھونڈتے رہے

بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں دنیا نے ایک نئی کروٹ بدلی۔ دنیا کی خوابیدہ قوموں میں بیداری، حرکت اور عزم و عمل کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ اس آفاقی تغیر نے اہل کشمیر کے لہو میں بھی گرمی اور حرکت پیدا کر دی۔ ان کے دلوں میں سوز یقین کے چراغ جل اٹھے، اور غلامی کی کہنہ زنجیریں توڑنے کے لئے اُن میں اپنی بکھری ہوئی قوتوں کو مجتمع کرنے کا شعور جاگنے لگا۔ یہی وہ وقت ہے جب کہ کشمیریوں کا محبوب شاعر مہجور ایک حقیقی محبِ وطن کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے اور بڑی خوش اسلوبی، تن دہی اور کامیابی کے ساتھ اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ آپ نے اپنے دامانِ فکر میں رسول میر کے عاشقانہ جذبات کے قوس قزح کو بھی ابھارا۔ اور ساتھ ہی اپنے ماحول اور گرد و پیش کے حالات اور وقت کے اہم تقاضوں کا ساتھ دیا۔

مہجور نے جب زندگی کا مشاہدہ کیا۔ اس کی نگاہ شوق کو زندگی کی واردات، اس کے بانکپن اور رعنائی نے اتنا مسحور کر لیا کہ اسے خیالی معشوقہ کے حسن نظر فریب کے کھوکھلے پن کا شدید احساس ہوا۔ آپ نے اپنے دل کو روایتی محبوبہ کی زلف پیچاں سے خلاصی دلانے کی ضرورت شدت سے محسوس کی۔

نیرانہ گٹہ نشہ نیبر آگرزہ حنک مہ ور کر
کرت کالاہ بند رونکھ زلف پیچانس اندر

(ظلمتوں سے باہر نکل آ، اور حُسن کے منبع کو دیکھ لے۔ کتنی دیر تو زلف پیچاں میں مقید رہے گا۔)

اپنے لئے ایک خاص راستہ متعین کرنے کے بعد آپ کے سامنے

ایک اہم فریضہ یہ تھا کہ آپ اپنے ہم وطنوں کو صدیوں کے خوابِ غفلت سے بیدار کریں۔

ہجور ژہ تہ بن سونتک واو   روشہ روشہ باغس کُن قدم تراو
ژہ تہ گژھ سند روٗت وزہ ناوان   ماڈھتہ وارہ ونہ لاگ میون پان

(مہجور تو بھی نسیم بہار بن کر دھیرے دھیرے چمن کی سمت قدم اٹھالے اور سوئے ہوؤں کو جگالے)

مہجور ایک حقیقی محبِ وطن تھا۔ اُس کی روح جذبۂ حُب الوطنی سے سرشار تھی۔ اُسے اپنے مقدس وطن کے ذرّے ذرّے سے پیار تھا۔ ان کے شعور کو وطن کے والہانہ پیار نے نکھار بخشا تھا — پیار کا ایک بے پناہ جذبہ جو چھپائے سے چھپ نہیں سکتا۔

پوشیدہ تھاوٗ تھاوٗ دراوٗ بیٚٹھنہ میون حال
یتھہ پاٹھہ پوشس سینہ ژٹِت مُشک نیرِ دراوٗ

(پوشیدہ رکھنے کی پیہم کوشش کے باوجود بھی میرا حالِ دل آشکارا ہو گیا، جس طرح پھول کا سینہ چاک کر کے خوشبو باہر نکلتی ہے)

مہجور کا اپنا دل حبُّ الوطنی کے بادہ سہ آتشہ سے سرمست تھا، آپ کی دلی خواہش تھی کہ عام لوگ بھی اسی مقدس جذبہ سے سرشار ہوں

بوزم چھہ ساقی باگراوان پلنہ وطنک مس
تمہ شوقہ نوی کھاس نوی بانہ بناوم

(میں نے سُنا کہ ساقی حُب الوطنی کی شراب تقسیم کر رہا ہے۔ میں نے اس کے لئے نئے برتن اور نئے جام بنا دیے۔)

چھہ مہجور مس بھران کھاسن یہ لولک مس چھو سارن چُن
دپان ینِن تہ پیٚہ پردن یہ مس باگراون چھُم

(مہجور جام میں شراب ڈال رہا ہے اور محبت کی یہ شراب سبوں کو پینی ہے یہ شراب اپنے اور پرائے سب لوگوں میں مساوی طور پر تقسیم کرنی ہے)

کشیری شعر و ادب میں مہجور پہلا عظیم فنکار ہے جس نے خیالوں کی طلسمی دنیا میں بھٹکنا خود فریبی کے مترادف سمجھا۔ آپ نے نگاہ شوق وا کی۔ آپ کی نگاہیں وادی کی بے پناہ رنگینیوں اور رعنائیوں میں کھو گئیں آپ کو قدم قدم پر فطرت کی بوقلمونی اور بہاروں کے بدلتے ہوئے حسین اور شوخ رنگوں کی فراوانی نظر آئی۔ نقرئی آبشاروں کے سوز و ساز نے اور لہراتی ہوئی جوئباروں کی موسیقی نے آپ کے سازِ دل کے تاروں میں آگ بھر دی۔ آپ کا احساسِ جمال کروٹیں لینے لگا۔ اور نغمات مسرت شعروں میں ڈھل کر بکھرنے لگیں گے۔ "بہار" میں آمدِ بہار کی تصویر ملاحظہ ہو۔

دلِ ژٹنہ لاوان جلوہ ہاوان آکھا بہارو   یتھہ راوٗمژ کتھہ یاد پاوان آکھا بہارو
بخشتھ ژہ سون آبشارن سونک ساز۔ افسانہ لولک ونہ ناوان آکھا بہارو
گل چاک جامن داوہ ناوتھ بادہ ناوتھ حال۔ دل بلبلن ہند ژٹنہ لاوان آکھا بہارو

(اے بہار تو نے اپنے جلوے دکھا کر ہمارے دلوں کو بے قابو کر دیا، تو کیا آئی بھولی بسری باتیں یاد آگئیں۔)

(تو نے جوئباروں اور آبشاروں کو سوز و درد کا ساز عطا کیا۔ تیری آمد پر محبت کے افسانے بیان کئے جا رہے ہیں۔)

(پھولوں نے اپنے لباس کو تار تار کر دیا۔ اور اس طرح اپنا حال ظاہر کیا۔ تو نے بلبلوں کے دلوں کو بے قرار کر دیا۔)

مہجور حسن فطرت کا شیدائی تھا۔ اس والہانہ جذبہ نے آپ کو وادی کے حسین مقامات اور پوشیدہ گوشوں میں دیوانہ وار پھرایا۔ جہاں بھی آپ پہنچ گئے، آپ کا دل 'جا اینجاست' کہتا رہا۔ ایک غزل میں وہ اپنی محبوبہ کو وادی کے دلکش مقاموں کو دیکھنے کی پوری دعوت دیتا ہے۔

سیلہ منہ سی ڈونگہ برادس   میلہ دچھنے نمن اچھہ ول
یوس مرگہ ہند سبزار ہاوس   ند تہ راوس فرشِ مخمل
نیلہ ناگچہ گلہ بلہ ناوس   سر تراوس پاون تل

(اپنے سیلانی دوست کے لئے میں ایک ڈونگہ سجاؤنگا۔ اور اس کو اچھہ بل کے میلہ پر لے جاؤنگا)

(میں اس کو یوس مرگ کا سبزہ زار دکھاؤنگا۔ اس کے قدموں میں فرش مخمل بچھاؤنگا۔ میں اس کو نیلہ ناگ کے پرندوں کے گانے سناؤں گا۔)

اور اسی طرح سنگردن، ناگرل، سندھ بیٹھ، مانسبل، زوڈر، تیل بل نشاط و شالیمار کے حسن نظر نواز کی عکاسی اشاروں اشاروں ہی میں کرتے ہیں

مہجور کا شعور وادی کی رنگین بہاروں اور شاداب مرغزاروں میں نکھار حاصل کر چکا تھا۔ اس لئے آپ کو وادی کے چپے چپے سے پیار تھا۔ پیار کا یہ مقدس جذبہ آپ کی نظموں اور غزلوں کے پیمانوں سے چھلکتا ہے۔ آپ کی نظمیں پڑھ کر ہمیں بھی حبُّ الوطنی کے لطیف احساس کی سرمستی کا احساس

چھنے لگتا ہے۔ ہمارا دل وادی کی بہاروں کے لئے ایک اکلنے احساس تپش کے تحت دھڑکنے لگتے ہیں۔ کیا یہ محبوب کے جذبۂ حب الوطنی کا ایک روشن ثبوت نہیں ؟

مہجور کو منظر نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔ آپ سے پہلے کشمیری شاعری میں منظر نگاری کا پہلو تقریباً مفقود تھا۔ "گریز" میں مقبول شاہ کرالہ واری نے کہیں کہیں منظر کشی کے چند مختصر نمونے پیش کر دئے ہیں۔ لیکن مہجور کی منظر نگاری میں ہمیں ایک جمالیاتی شعور کی دھڑکنیں محسوس ہوتی ہیں۔ جو ہمیں بالکل ایک نئے احساساتی تجربہ سے روشناس کراتی ہیں۔ ہماری نگاہوں میں موسیقی رنگ اور نور کا ایک سماں بندھ جاتا ہے۔

اند اند سفید سنگر   دیوار سنگ مرمر
منز باگ سبز گوہر   گلشن وطن چھُ سونوی

(اردگرد پہاڑوں کی سفید چوٹیاں ہیں جیسے سنگ مرمر کی ایک دیوار ہے۔ بیچ میں گوہرنما سبزہ زار ہے۔ ہمارا وطن جنت ہے)

آپ کسی حسین منظر کے نقوش ابھارنے کیلئے نئی تشبیہیں اور استعارے تخلیق کرنے پر بھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ مہجور کو واقعی شاعرانہ زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ ایک شعر ہے۔

سونٹھ یلہ آو باغ پھول ول جام حُسنک گلشنو
نوبہار چھ سازگرہ پیراوُ مہربنہ شوقہ سان

(جب بہار آ گئی، چمن کھل اُٹھا۔ چمن زاروں نے حسین لباس پہن لئے۔ بہار نو نے بڑے ذوق و شوق سے پھولوں کی دلہنوں کو سجایا۔)

حسن فطرت کی رعنائیوں کا نظارہ کرتے وقت جب آپ کی نگاہِ حقیقت کش اہل گلشن کے درون سے پردے سرکا دیتی ہے تو آپ کو مظلوم دلوں کی زخمکاری نظر آتی ہے۔ آپ کی نگاہیں غلامی، جہالت اور مفلسی کے پُر ہول اندھیروں میں بھٹک جاتی ہیں۔ آپ کا دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ طبقاتی اونچ نیچ دیکھکر آپ کی روح ماتم کناں پر لوٹتی ہے اور آپ کی مجروح پکاریں بلند ہوتی ہے۔

تس ہام پیمژ آوہ پیمژ بہ آموزتن   زینہ سانہ پیٹھ ازتام رودئی ثُہ خدمتگار

(اس کے زخم متعفن ہو چکے ہیں۔ اس کا جسم سڑا ہوا ہے، وہی جو پیدائش سے لیکر آج تک تیری خدمت کرتا رہا۔)

پننین چھولہ بات غیرتے بیگانہ چھاوان باغ

من خوش چھ قصاوان تن چھ نالہ وان ستہ طالن مُنز

(اپنوں کو حسرت ہے۔ اغیار اور بیگانے گلشن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ دلوں کو مسرور رکھتے ہیں۔ اور بہتے ہوئے دریاؤں سے نہاتے ہیں۔)

"نالۂ کشمیر" میں روح کشمیر فریاد کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

تنبلاوان پوشہ نول گلزار مین   عنبلاوان مادمت ول آبشار سبزار مین
عالمک بیمار گھر میون آی واپس گئے بلتھ   ترشہ ہت چھیت کتن پیٹھ مرُد دوان بیمار مین

(میرے دل پوشہ نول اور بلبلوں کے دل بیقرار کرتے ہیں۔ میرے آبشار اور سبزہ زار بیقرار دلوں کو قرار بخشتے ہیں۔ دنیا بھر کے مریض میرے گھر آ گئے اور صحت مند ہو کر چلے گئے، لیکن میرے بیمار تشنگی کی حالت میں سڑکوں پر جان دیتے ہیں)

لیکن مہجور اہل وطن کی یہ دلدوز حالت دیکھکر صرف آہیں بھرنے پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ ایک حقیقی محب وطن کی طرح انہیں سمجھاتے ہیں کہ وہ غلام ہیں۔ وہ ان کے مردہ دلوں میں عزم و یقین کے شعلے بھڑکانا چاہتے ہیں۔ انکی قومی خودی کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ انقلاب چاہتا ہے۔ انقلاب — ایسا انقلاب جو محض کھوکھلی نعرہ بازی کا حاصل نہیں، ایسا انقلاب جو اسکی قوم کی تقدیر بدل دے۔ انقلاب کی اس آواز میں عالمگیریت ہے، بغاوت ہے، اعتماد ہے اور سوزِ یقین ہے ؎

ولو ہا باغوانو نوبہارک شان پیدا کر   پھلن گل گتھ کرن بلبل تتھی سامان پیدا کر
اگر وزہ نادِ من لستی گلن ہند تراو زیر و بم   زُلزل کر، واو کر، گگرایہ کر، طوفان پیدا کر

(اے مالی اُٹھ اور نئی بہار کی شان پیدا کر۔ تو ایسے سامان پیدا کر جن سے پھول کھل اُٹھیں اور بلبل جھوم اُٹھیں، اگر تو اپنے پھولوں کے وطن کو جگانا چاہتا ہے تو زیر و بم چھوڑ دے۔ تو زلزلے، بجلیاں اور آندھی اور طوفان پیدا کر)

ایک دوسری نظم میں فرماتے ہیں۔

ولولہ جوش حباب اضطراب ہمناہ   پیدہ گژھن یامت دلن اندر تہ سی گو انقلاب

(ولولہ، جوش، حباب، اضطراب اور ہمت۔ جب یہ چیزیں دلوں میں پیدا ہو جائیں تو انقلاب جنم لیتا ہے)

مہجور حد درجہ رجائی واقع ہوا ہے۔ چھائے ہوئے گھپ اندھیروں میں آپ نے افقِ حیات پر نئے نویلے اجالوں کی ایک دوشیزہ انگڑائی دیکھ لی تھی۔ آپ کو یقین کامل ہے کہ ظلم و ستم کا شیرازہ عنقریب پریشان ہو جائیگا اور آرزوؤں کے چمن زار میں بہار مسکرائے گی۔

وقت نظر کرکھ نن آو گرت انقلابک آفتاب
یلن گو مت دغ پیٹھ پیغام ہتھ آؤ نو بہار

(آنکھ دیکھنے لے سحر ہوگئی، انقلاب کا آفتاب نمودار ہوگیا۔ بہار یہ پیغام لے کر آگئی کہ تیرا جلا ہوا باغ اب کھل اٹھے گا۔)

مہجور کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ فاقہ مست عوام کے بغاوت پر آمادہ ہونے پر ظلم و ستم کی زبردست آندھیاں چلیں گی۔ لیکن آپ کے دل میں امید و یقین کی شمعیں برابر جلتی رہیں۔

پھولک طوفان پؠشہ تھرہ ژالن　　سونتھ ییہ دوہہ اکہ تو لہ پرخاش
سوی پھولہ تن یس دیہ جنجالن　　سنگرمالن پیہ پرکاش

(پھولوں کی ٹہنیاں خزاں کی آندھیاں برداشت کریں گی بہار ایک دن آئیگی اور تحقیقات کریگی۔ وہی کھل جائے گا جو مصائب کو سہارے۔ پہاڑ کی چوٹیوں پر نئی سحر کے اجالے مسکرائے۔)

آپ کو معلوم ہے کہ اپنے مشترکہ مقصد کے حصول کے لئے اتحاد، برادری اور یکجہتی کی کتنی ضرورت ہے، اس کا درس اپنے ہموطنوں کو یوں دیتے ہیں۔

نیاے ترا ود مای تھاوِو یانہ وان　　یہ محبت باگراوِو یانہ وان
غیر نقصان کرنہ نہند میں غرض　　یتھ نہ زانہ عزت ہرا وِو پانہ وان
ملہ ژارک دِت یہ مہجورن سبق　　یاد تھاوِو بوزہ ناوِو پانہ وان

آخر وہ دن بھی آ ہی گیا، جبکہ ظلم و ستم اور مطلق العنانیت کی خلعتوں کا سینہ چاک ہوا۔ اور آفتاب آزادی جلوہ بار ہوا۔ شاعر کہتا ہے۔

نیہ گنہ ڈ گرس بیدار کنن کتھ بولن گوم
زونہ مے وندہ سوریہ پرتو تراو سونت کالن

(میں گویا بیدار ہوگیا۔ اور میرے کانوں میں کوئل کی آواز آگئی میرے جان لیا کہ زمستان گذر گیا۔ اور فصل بہار کا پرتو چھا گیا ہے۔)

آزادی میں لکھتے ہیں۔

بلبلا آزاد گژھنس جاؤ بر　　پوشن کراو کر چھاؤ گلزار
پنجرس کر سلام نیرا مہ نشہ نبر　　پوشن کراو کر چھاؤ گلزار

(اے بلبل! آزاد ہونے پر ناز کر، پھولوں سے کھیل لے اور گلشن سے لطف اندوز ہو جا، دام کو اب سلام کر، اور اس سے باہر نکل آ)

مہجور کے جذبہ حب الوطنی کا اس بات سے اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے اپنی قومی زبان کشمیری کو فروغ دینے کی حتی الامکان کوشش کی۔ آپ نے نئے اور اچھے خیالات، نئے نئے موضوعات اور ساتھ ہی نئی تشبیہیں اور استعارے پیش کر کے کشمیری زبان کو وسعت اور بالیدگی عطا کی۔ مہجور کی زبان بڑی شستہ، شیریں اور عام فہم ہے۔ مہجور عوام کا شاعر ہے آپ کی آواز میں لاکھوں کے دھڑکتے ہوئے دلوں کی آواز ہے۔ آپ کی غزلیں کھیتوں میں کام کرنے والے کسان، ملوں میں کام کرتے ہوئے مزدور، اور محنت کش اور حسین دوشیزائیں وجدانی کیفیت میں گاتی ہیں۔ گاتی ہیں اور جھومتی ہیں۔

خراجِ عقیدت

سرینگر میں ۱۱ اپریل ۱۹۵۲ء کو حضرت مہجور کاشمیری کے جنازہ کا شاندار جلوس نکالا گیا۔ جس میں شہر اور مضافات سے آئے ہوئے بہت سے عقیدت مندوں نے شرکت کی۔ پولیس، ملیشیا، ہوم گارڈ اور پیس بریگیڈ کے جوان بھی اس جلوس میں شامل تھے۔ مہجور صاحب کا جنازہ صبح کو متری گام (پلوامہ) میں پھولوں سے سجائی گئی ایک گاڑی میں سرینگر لا کر خانقاہ معلی میں پہنچایا گیا۔ عوام کا ایک جم غفیر یہاں پہلے ہی موجود تھا۔ تین بجے بعد دوپہر نماز جنازہ ادا کرنے کی رسم انجام دی گئی جس میں جناب بخشی غلام محمد، کابینہ کے دیگر وزرا و آئین ساز اسمبلی کے ممبران اور آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کے ممتاز ممبروں نے حصہ لیا۔ ماتمی جلوس تین بجے خانقاہ معلی سے روانہ ہوا۔ اس کے آگے ایک گاڑی میں مہجور کا جنازہ رکھا گیا تھا۔ گاڑی میں مرحوم کے صاحبزادہ مسٹر محمد امین اور ان کے کچھ رشتہ دار بیٹھے تھے۔ ماتمی جلوس خانقاہ معلی سے نکل کر فتح کدل، حبہ کدل، گنپت یار، گاؤ کدل، امیرا کدل سے ہوتا ہوا لال چوک میں پہنچا۔ راستے میں ہزاروں لوگوں نے دو رویہ کھڑے ہو کر شاعر اعظم کو خاموشی سے خراج عقیدت پیش کیا۔ لال چوک میں نیشنل ملیشیا کے ایک دستہ نے جنازہ کو سلامی دی۔ تھوڑے وقفہ کے بعد لال چوک سے ماتمی جلوس امیرا کدل کی طرف روانہ ہوا۔ جلوس کے آگے آگے مہجور کا جنازہ اور بعد میں ہجوم کی سینکڑوں گاڑیوں میں عام لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

(خدمت سرینگر۔ ۱۲ اپریل [illegible])

حضرت غلام احمد مہجور

حضرت مہجور کے نام علامہ اقبال کے دو خط

کل ہم آئینے میں رخ کی جھریاں دیکھا کئے
کاروان عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کئے
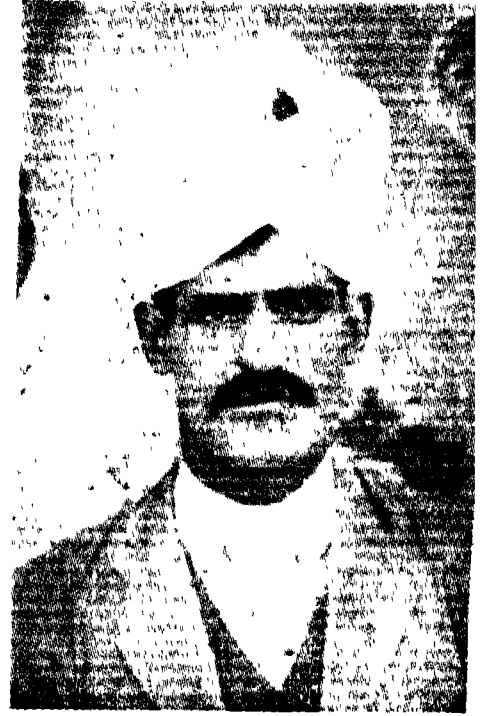
۳۰ سال کی عمر میں

۴۰ سال کی عمر میں

طویل بیماری سے روبہ صحت ہونیکے بعد

۴۵ سال کی عمر میں

۶۵ سال کی عمر میں

میکدہ

مہجور کی شاعری!

تیمر قلندر

نغموں میں تاروں کی چمک
کلیوں کی دوشیزہ چٹک
کرنوں کی نورانی اُمنگ
سرنوں کی ہے دلکش ترنگ
جھرنوں کی گاتی چاندنی
شمعِ وطن کی روشنی

کیفیت صہبائے غم
اور دیدۂ شبنم کا نم
ہے انجم شب کا خیال
مہر منور کا جلال
غم ہائے دوراں کی خلش
اور جانِ جاناں کی کشش

وہ دردِ و سوزِ آدمی
اور جہد پیہم، زندگی
رقصاں ہواؤں کا سرور
بہتے ہوئے نغمے زود زود

مہجور کی یہ شاعری
معجز نمیت اے تیمریؔ

تیمر

آہ مہجور!

کشن سمیلپوری

آہ اے مہجور۔ کشمیری ادب کے تاجدار
بلبلِ شیریں نوا۔ اے شاعرِ عالی وقار
اے نئے کشمیر کے گلزار کی فصلِ بہار
یک بیک کیوں ہو گئی یہ طبعِ نازک بیقرار
جنتِ کشمیر کے پھولوں سے یوں مُنہ موڑ کر
چل دیئے سوئے عدم کیوں ہمکو روتا چھوڑ کر

گلشنِ کشمیر کے گلہائے تر مُرجھا گئے
سُن کے تیری موت کلیوں کو پسینے آ گئے
شور و شیون کی صدا سے قلب بھی تھرا گئے
مطلعِ کشمیر پر پھر غم کے بادل چھا گئے

تیرے ماتم میں ہے ہر پیر و جواں ماتم کناں
آج بلبل کی زباں پر غم کے نوحے ہیں رواں

آہ اے مہجور۔ اے انسانیت کے شاہکار
پھول کے گفتو کی بے کاری کے سحر آگیں خمار
سُن وہ کیا کہتے ہیں تیرے باغ کے سرو و چنار
مانگتا کوئی تو کرتے جان و دل تجھ پر نثار
ہم تھے حاضر مگر آئی قضا تیرے لئے
ایک محشر سا ہے عالم میں بپا تیرے لئے

مہجور کی یاد میں

اکبر جے پوری

اے وطن کی آبرو! اے شاعرِ جنت نشین
تیرے نغموں سے خجل نغماتِ فردوسِ بریں
تیرے سازِ لب پہ نغمے حافظِ شیراز کے
تیری غزلوں میں نئے تیور نیاز و ناز کے
تیرے نغموں سے عیاں تھا سوز و سازِ زندگی
تو حقیقت کا پیامی، تو مجازِ زندگی
جذبۂ دل تو نقابِ شعر میں مستور تھا
قلبِ مضطر جلوۂ دیدار سے پُر نور تھا
زہرہ و ناہید کے نغمے سراسر تھے عیاں
اے کہ تیرے ہر نفس میں کیف نغماتِ جناں
تیرے نغموں کا ترنم اک سہارا ہو گئی
زندگی کی تلخ کامی بھی گوارا ہو گئی
شورشِ محفل کی رونق تیری تنہائی میں تھی
غم کی دھیمی آنچ تیری نغمہ پیرائی میں تھی
تیری آہِ نیم شب سے ماہ و انجم بے قرار
شاخساروں جوئباروں (?) کا ترنم بے قرار
محفلِ شبنم میں گھر بے اشک فشانی تری
گاہ ساز شب (?) کی زمزمہ خوانی تری

[illegible]

پروفیسر محمد یوسف

مہجور کی شاعری کے ابدی عناصر

کیا مہجور کی غزلوں میں ایسے عناصر بھی ہیں جو اُن کو ابدی بنا سکیں
ہمیں ہوا ہی میں اس ابدیت کی تلاش نہیں کرنی چاہیئے۔ اس سلسلے میں بڑی احتیاط
کی ضرورت ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ابدی عناصر کی عدم موجودگی کے باوجود مہجور
کے کلام میں یہ عناصر پیدا کرنے کی سعی کی جائے۔ اس کے علاوہ اس بات میں بھی
احتیاط لازمی ہے کہ اپنے ہی تصورات لیکر مہجور کے کلام کی چھان بین نہ کیجائے
اور اُن ذاتی تصورات کا جواب نہ ملنے پر شاعر کے کلام کو یک لخت رد کیا جائے
اور جس کسی میں وہ تصورات ملیں، اُسی کو شہرۂ آفاق شاعر قرار دیں۔ یہ بھی
ضروری نہیں کہ مہجور کسی دوسرے شاعر یا کسی اپنے ہم عصر کے جیسا کیوں نہیں۔ اس
تعلق میں اپنی ذاتی خواہشات کو الگ رکھکر اور اپنے تصورات کو اُس کے تصورات
سے جُدا کرکے اس کی شخصیت اس کے تجربات اور تخلیقی محرکات کا مطالعہ کرنا
ہے جب ہی حقیقت کا پتہ چل جائے تو چل جائے۔

مہجور ایک خاص ماحول میں رہتا تھا جس کا اسے شعور بھی تھا۔ اس
ماحول سے اثر پذیر ہوکر اُس نے زندگی کے تقاضوں کو پُورا کرنے کی کوشش
بھی کی۔ جیسا کہ ایک اچھے فن کار کے لئے لازم ہے۔ مگر اُس کی شاعری کا
تجزیہ کرتے وقت اس بات کو لمحہ بھر کے لئے بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ
وہ ایک غزل گو ہے۔ غزل ہی اُس کا خاص میدان ہے۔ مہجور نے اسی صنف
کو اپنے اظہار کے لئے موزوں سمجھا۔ اس میں اس کے خارجی اور داخلی
دونوں قسم کے تجربوں کا بیان ممکن ہوا۔ غزل ہی میں زندگی کی تلخ حقیقتیں
بیان کیں۔ اسی میں سماجی خامیوں اور سیاسی کش مکش کی طرف اشارے
کرکے عمل کی تلقین کی۔ اُس نے اس صنف کو اس قدر لچکدار بنایا کہ گریس کود'
'وکہ چار' 'زنان' 'بہار' وغیرہ جو اُس کی بیانیہ نظمیں ہیں۔ ان کو بھی غزل
کے ہی رنگ میں رنگ لیا۔ ان تمام خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی شعرا دیر

تعمیر

پائی کے لئے کسی اور ہی چیز کا محتاج ہے۔ شاعر کی فنی صلاحیتیں ہی شعر کی ابدیت
کے لئے کام آسکتی ہیں۔ فن سے میرا مطلب ہیئت طرز بیان اور دوسری خارجی
نزاکتیں ہی نہیں۔ بلکہ عظیم فن جب ہی پیدا ہوتا ہے جب موضوع اور بیان ہم آہنگ
ہو جائے، دل کی گہرائیوں میں اُتر جانے والا نغمہ اُسی حالت میں پیدا ہوگا جب
نغمہ اور ساز میں پوری طرح ہم آہنگی پیدا ہو جائے، جب شعر کی خون جگر سے
آبیاری کی گئی ہو۔ اور لفظوں میں آکر اُس خون کی وہ حرارت اور رنگ و بو
قایم رہے جو اُسے شاعر کے جگر کی تہوں میں حاصل تھی۔ اس کے لئے خلوص
چاہیئے۔ شاعرانہ خلوص ہی حرارت تڑپ اور شدت پیدا کرسکتا ہے۔ اسی لئے
شاعر اپنے خون جگر کو زبان عطا کرسکتا ہے اور اسے یہ مقام حاصل ہو تو پیغامبر
کے منصب سے بالاتر ہو جائے۔

مہجور نے غزل ہی میں شاعری کی۔ غزل کا خمیر عشق کے داخلی جذبات اور
قلبی واردات ہیں۔ مہجور کی غزلوں میں ہم اُس کے ذاتی جذبات اور اُس کی قلبی
واردات کا ہی اظہار پاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور خیال کو تلاش کرنا مہجور سے
ناانصافی ہوگی۔ اُس کی شاعری میں کوئی فکر انگیز خیال تلاش کرنا تضیع اوقات کے
برابر ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مہجور کا اپنے ہم عصروں مثلاً آزاد سے مقابلہ کیا جاتا
ہے۔ تقابلی تنقید فایدہ مند ضرور ہے لیکن اس صورت میں جب دو شاعر ہم مزاج
ہوں۔ مہجور اور آزاد کے مزاج بالکل مختلف تھے۔ اس لئے ایک کے خیالات دوسرے
میں تلاش کرنا اُن کی روح شاعری کے ساتھ ظلم ہے۔ حقیقت پسندی سے انحراف
ہے۔ لیکن اس بات سے شاید ہی کوئی انکار کرسکتا ہے کہ کسی شاعر کا تجزیہ کرنے
کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اُس کے دوست کون تھے، اُس کی زندگی کے تقاضے
کیا تھے، سماجی اقدار اور نفسیاتی عوامل کا پتہ لگانا بھی ضروری ہے، کیونکہ یہ
باتیں شاعر کی تخلیق پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ لیکن یہ سب حالات ہی تو ہیں۔ اسباب

نہیں۔ اسباب اور محرکات کئی ہو سکتے ہیں اور وہ بھی مختلف۔ ایک محرک بنیادی محرک ہوتی ہے جس سے فنی تخلیق وجود میں آتی ہے۔ وہ شاعر کی اندرونی کرید ہے۔ مہجور کا ایسا اور وہ محرک جو اس کی شاعری میں رواں دواں ہے تلاشِ حسن ہے۔ یہی تلاش حسن مہجور کی نئی تخلیق کے لئے ذمہ دار ہے۔ ہم اُس کی شاعری میں کوئی فلسفہ یا کوئی فکر انگیز خیال نہیں پاتے لیکن اس میں زندگی ہے اور زندگی کی رعنائیاں ہیں مہجور کی شاعری فطری خواہشات محبت اور تلاشِ حسن کی شاعری ہے۔

پیامِ مہجور میں چند انقلابی گیت ملتے ہیں وہ بھی غزل ہی کے قالب میں ڈھالے گئے ہیں۔ حسن کی اُمنگ ہر وقت اُس کے لاشعور میں رہتی تھی۔ ہاں جہاں کہیں اس کا دامن چھوٹ گیا ہے، کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

رٹکھ یم تیرِ مژگان قتلہ نِشہ پتھ
چھ یم ہاوان غریبن پہلوانی

(اپنے مژگاں کے تیروں کو قتل عام سے روکو۔ یہ غریبوں کو پہلوانی کا گُر سکھا رہے ہیں)

مقابلہ اکھ اکس ٹھہرِن تہ کیت تام
یہ طاقت چون تہٕ میانِ ناتوانی

(یہ دو چیزیں ایک دوسرے کے مقابلے میں کتنی مدت رہ سکتی ہیں۔ تمہاری طاقت اور میری ناتوانی)

چند غیر شاعرانہ الفاظ محض بحر کو قائم رکھنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں جو کانوں کو کرخت لگتے ہیں۔ جذبات مردہ اور تغزل معدوم ہے۔ اشعار ثقیل ہیں اور ایک بھاری بھر کم چھکڑے کی طرح حرکت کرتے ہیں۔ مجموعی اثر بالکل پھیکا ہے

مہجور کا شاہکار غزل ہی ہے۔ اس میں اُس کی شاعری کا نکھار اور اُبھار پایا جاتا ہے۔ اُس کے نغمے انسان کے حسین جذبات اُبھارتے رہیں گے۔ یہ نغمے انسان کے پاکیزہ اور بلند ترین جذبۂ محبت کا نتیجہ ہیں۔ مہجور محبت کا متوالا ہے اس کو محبت پہ پورا بھروسہ ہے۔ انسان جو آجکل خطرات میں گھرا ہوا ہے اور اندھیرے میں ایک بچے کی طرح چیختا چلاتا ہے، محبت ہی کے سہارے اپنی دشواریوں کو دور کرسکتا ہے۔ محبت ہی اس اضطراب اور عدم اطمینان میں دل آسائی کرتی ہے یہی جذبہ مہجور کے دل کی گہرائیوں میں اتر آیا ہے۔ اس کی نس نس میں سرایت کرگیا ہے۔ اسکا پُر خلوص اظہار اس کی شاعری کو ابدیت بخشتا ہے۔ اور یہی اس کی حقیقت پسندی کی دلیل ہے۔

نہ نہ تھو تم نہ کو تاہ نہ سنت گو

کوہ زانہ تو اکھ نقش دِلس کرمہ سنت گو

(اس نے مجھے درد بخشا۔ میں کتنا دردمند ہوں مجھے اس نے مار ڈالا۔ کون جانے محبت کا نقش میرے دل پر کندہ ہوگیا۔)

پوشہ ٹور مشکہ بر تھک۔ رسہ پانٹہ گنڈ خرتکھ
اسہ دن دیانہ کر تھک آوارہ وارہ وارے

(تم نے غنچوں کو خوشبو سے بھر دیا۔ تو نے متبسم ہونٹوں کو آہستہ آہستہ پریشان کردیا۔)

مہجور چھٕئی دوا بس دِلہ کس غمس عذابس
الفہ لولہ کس ربابس گنڈ تارہ وارہ وارے

(مہجور تیرے دل کے درد کا دوا صرف یہی ہے تو محبت کے ستاروں کی تاریں اُستوار کر)

اُلفتک سودا کُرم غم مولِ ہیوتُم
الفہ طریقس پیٹھ چلیوٚ بایار میون

(میں نے محبت کا سودا کیا اور غم مول لیا۔ اس طریقے پر میری تجارت چلتی رہی)

کوئی بھی ذی شعور مخلوق محبت کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ وقتی یا ہنگامی جذبہ یا خواہش نہیں۔ محبت انسان اپنے ساتھ لایا ہے۔ محبت اور حسن کی پرستاری انسان کو لہو و لعب سے پاک کرکے سنبلستان کی طرح شگفتہ کردیتی ہے۔ زندگی کو نکھار بخشتی ہے۔ محبت ہی غنچوں کو خوشبو سے بھر دیتی ہے اور وہ مسکرانے ہیں۔ اس آڑے وقت میں جب انسان سوچ سوچ کر تھک گیا ہے محبت ہی اس کے کام آئے تو آئے۔ مہجور کی شاعری محبت کی تشنہ انسانی روح کی تلاشِ حسن ہے۔ مہجور کی روح اُس کی آنکھیں ہر وقت حسن کی ٹوہ میں لگی رہتی ہیں۔ مہجور اپنے محبوب کے رخساروں میں پرتوِ آفتاب کا متلاشی ہے وہ زلفِ جاناں کو سنوارنے کی دھن میں لگا ہوا ہے۔ وہ اس کوشش میں ہے کہ محبوب کا حسن زیادہ سے زیادہ نکھار پائے۔ وہ اپنے محبوب کو رنج و الم سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی دل جوئی کے لئے اس کائنات کو ہر قسم کی گندگی اور غلاظت سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ اور اس کی دل بہلائی کے لئے اُسے حسین تر بنانا چاہتا ہے۔ اس کا دل کسی قسم کا ظلم یا زبردستی دیکھ کر زخمی ہوجاتا ہے۔ وہ آفاق میں تمام تر اقتصادی اور سیاسی جھگڑوں کا فوری حل چاہتا ہے۔ وہ اپنے سماج کی طبقاتی تفریق مٹا دینے کا آرزومند ہے اور اگر

تعمیر

[illegible]

سماج میں کی محبت کی راہ میں کوئی رکاوٹ ڈالے تو اس کو بدل دینا چاہتا ہے

تیلہ پانکھ نو کیت پوشن جائے گلزار سس اندر

نہ گژھ یلہ پوشہ عقرو تل سوٗنہ کنڈ یعامانہ چون

(محبت میں قربانیاں بھی درکار ہیں۔ وادیٔ عشق بڑی دشوار گزار ہے جدوجہد کے بغیر غنچے بھی نہیں کھلتے ۔جب تیرا دامن کانٹوں سے اُلجھ جائے جبھی تجھے پھلواڑی میں پھولوں کا قرب حاصل ہو سکتا ہے ۔)

مذکورہ بالا اشعار میں موضوع بلند ہے جس کو ایک حسین پیرایہ میں ادا کیا گیا ۔ جذبات کی شدت نے ہر شعر کو تغزل سے مالامال کر دیا ہے ۔

لیکن یہ محض انفعالی تاثر ہی تو نہیں ۔شاعر نے محبت کے سہارے جو حسین دنیا تخلیق کی ہے کہیں وہ ہماری اس دنیا سے الگ تھلگ ایک خیالی دنیا تو نہیں ۔ان سوالات کے جوابات کے لئے مندرجہ ذیل شعروں پر نظر رکھنا ضروری ہے ۔

دنتہ ہے دلیس بے وفائی شیوہ دلدار چھا

نازنین مہ جبین قتل وغارت کار چھا

(سکھی مجھے بتا بے وفائی کیا معشوقوں کا شیوہ ہے اور کیا ماہ جبین صرف قتل وغارت کا کام کرتے ہیں ۔)

لالہ ییہ سالہ چھس پیالہ برہ ناوان ۔ پوشن مالہ کرہ ناوان چھس

شالہ مار گوشن چھس دنھراوان ۔ پوشن مالہ کرہ ناوان چھس

(محبوب میرے ہاں آئیگا ۔ میں جام سجا رہی ہوں اور پھولوں کی مالائیں بنا رہی ہوں ۔شالہ مار کا نکھار اُتار رہی ہوں ۔ اور گلدستے بنا رہی ہوں ۔)

واو سونٹک پوشہ دتھرن باغہ کین چھکران ژدیور

کامہ دیوییہ شامہ پت سلہ باگراد کھ اشتہار

(بہار کی نسیم پھولوں کے پتوں کو چاروں طرف بکھیر دیتی ہے ۔محبوب شام کو آئیگا مگر اشتہار سویرے تقسیم کئے گئے ۔)

کشمیری شاعری میں محبت اور حُسن کا یہ تصوّر بالکل نیا ہے ۔"دنتہ ہے دلیس بے وفائی شیوہ دلدار چھا" کلام مہجور میں پہلی غزل کا پہلا شعر ہے ۔مہجور قدما کا تصوّرِ عشق دیکھکر کچھ ہراساں سششدر ہو جاتا ہے ۔جب وہ سنتا ہے کہ محبوب بے اعتنا اور جفا کار ہوتے ہیں ۔اس کو کچھ حیرانی سی ہوتی ہے ۔اُس کا ادراک حقیقت یقین ہی نہیں کر سکتا کہ حسن عشق سے احتراز کرے عشق نے یہ راز شاعر پر منکشف کیا ہے کہ حسینوں کا شیوہ جفا ہے نہ معافی نہیں حسن زندگی کو نکھارتا ہے ۔حسین قتل وغارت کے لئے نہیں آئے ہیں ۔محبت کی کرشمہ سازی مس خام کو کندن بنا سکتی ہے ۔لیکن حسن کو دیکھنے والی آنکھ مکمل طور حقیقت شناس بھی تو ہو ۔محبت کا یہ تصور حقیقت سے دُور نہیں ۔محبت میں خوشی اور غم دونوں ہیں ۔ دو میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرنا حقیقت سے تجاوز اور خود فریبی ہے ۔لیکن مہجور کا غم روائیتی غم نہیں کہ انسان کو افسردہ کر کے زندگی ہی سے بیزار کر دے ۔محبت دنیا کو خلد بریں بنا سکتی ہے ۔حوریں شاعر کے بناؤ سنگار پر رشک کرتی ہیں ۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عاشق کو غم کا تلخابہ بھی پلایا جاتا ہے ۔اور وہ نیم بسمل سا ہو جاتا ہے ۔محبت اور حسن اُس کو پھر بحال کر دیتے ہیں ۔غم پر خوشی کی فتح ہوتی ہے ۔مہجور کا محبوب اُس کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر نہیں گیا ہے ۔اُسے پورا یقین ہے کہ وہ واپس آئیگا ۔وہ محبوب کے خیر مقدم کی خوب تیاریاں کرتا ہے ۔اُس نے باغ کو سجا رکھا ہے ۔وہ محبوب کو ہار پہنانے کے لئے پھول چُن رہا ہے ۔محبوب کی آمد کی خبر کوئی نئی نہیں ۔یہ بہت پہلے مشتہر ہوا ہے کہ وہ آئیگا اور پھولوں کی نازک نازک پنکھڑیاں شاخوں سے گرتے ہوئے محبوب کی آمد کا اشتہار دے رہی ہیں ۔محبت کی یہ کامرانیاں ہیں وقتی غم جو پائندہ خوشی کے لئے ہے ، یہ انتظار جو ملاپ کے لئے ہے اور یہ بے پناہ عقیدتیں جو محبوب سے وابستہ ہیں ، انسان کو افسردگی سے بچا لیتی ہیں اور عمل کی تلقین کرتی ہیں ۔

یم نہ یود باہم رلن ادہ کوہ الن سنگر ڈلن

دردہ ہیت ہیہ مین آلوٗ سازتےٚ سامانہ چون

(اگر ان دو چیزوں کا اجتماع ہو جائے تو پہاڑ ہل جائیں ، یعنی میرے درد بھرے بلاوے اور تمہارا ساز و سامان ۔)

مہجور موتس کیاہ چھو کھوژن موت چھہ معراج

لوٗ آفتابس لارہ شبنم تس کھارہ محبت

(مہجور موت سے ڈرنا کیا ۔ یہ تو آدم خاکی کی معراج ہے شبنم جب سورج سے مٹ جاتی ہے تو بلندیوں کو چھو لیتی ہے ۔)

نہ گژھ گوس بیدار کنن کتیہ بولن گوم

زونم مہ دندہ سور پوٗر تو تہ مہ سنت کلن

(جب ظلمت میں بیدار ہوا ، اور پرندوں کی صدائیں سُنیں میں نے جان لیا کہ جاڑا

گیا اور بہار آ گئی۔)

سخت گیر نقاد اس بات سے انکار نہ کر سکے گا کہ ہجور نے شاعری اور موسیقی کی قرابتِ طرفین کو استوار کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی عیاں ہے کہ اُس نے وہ رشتہ بھی جو شاعری اور موسیقی میں مستحکم کیا ہے یہ رشتہ ہجور کی شاعری میں جس قدر قریب تر ملتا ہے۔ وہ دنیا کے چند ہی عظیم شعراء کے حصے میں نظر آتا ہے۔ ہجور ایک مصورِ شاعر ہے۔ جو کام مصور رنگ اور موقلم سے لیتا ہے وہ کام ہجور الفاظ کے ذریعے سرانجام دیتا ہے۔ کلام ہجور ایک تصویر خانہ ہے جس میں رنگ رنگ کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ ہجور بے جان کو جان اور غیر مرئی کو جسم دیکر اپنے شعروں میں دکھلاتا ہے۔ اُس نے ان تصویروں کو گوشت پوست عطا کر کے ان میں گہرے رنگ بھر دئے ہیں۔

شلہ گرایہ ماران ژڑھا یہ پاڅه دوت واو لوشن نشں
لولسں یہ چچہ ژگہ رائے جانی ہ ہٓ بُے۔ مدلو

(صبح ہی صبح اٹکھیلیاں کرتی ہوئی نسیم پھولوں کے قریب آئی۔ شاید یہ محبت کو تمہارا بلاوا ہے میرے ساجن!)

واؤ ځبکک شلہ اوسں لاران تنبہ لیوځت کس تمام ژڑھاران
خندہ پوشو کرسں جائے جائے پایہ بڑھد مانہ یادن رائجے

(نسیم سویرے ہی تڑپتی ہوئی اور کسی کی تلاش میں جا رہی تھی۔ پھولوں نے اُس پر ہنسا۔ میرے پیار!)

صبا کی چند تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ ہوا چلنے لگتی ہے اور پھول کھل اُٹھتے ہیں۔ ہوا ایک عاشق ہے جو نظریں بچا بچا کر اپنے محبوب پھول سے ہم دامن ہوتی ہے۔ محبت بیدار ہوتی ہے۔ ہوا جو ویسے تو دکھائی نہیں دیتی لیکن جب پھول کھلتے ہیں گویا ہم اِسے دیکھ ہی لیتے ہیں۔ دوسری تصویر میں ہم نسیم صبح کو ایک مضطرب عاشق کی طرح دوست کی تلاش میں سرگرداں دیکھتے ہیں۔ پھول جگہ جگہ اس سراسیمہ عاشق کی ہنسی اُڑا رہے ہیں۔

ہجور کے کلام میں عکاسی اور مصوری کے عناصر کا تجزیہ کرتے وقت اُس کی بیانیہ نظموں میں سے بہار، زمن اور وژمل کا ذکر لازمی ہے یہی تین نظمیں ہجور کو شعراء کی صفِ اولین میں جگہ دینے کے لئے کافی ہیں بہار، زمن اور وژمل میں مظاہرِ فطرت کو انسانی جذبات دینے کا کس قدر شوق ہے۔ بہار، چاند اور بجلی کو انسان کے اوصاف انسان کے حسن اور اُس کے جذبات دئے گئے ہیں۔ یکے بعد دیگرے تصویریں آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔ انسان کی طرح بہار پھر حسب معمول جگانے آئی ہے وہ سوتوں کو جگاتی ہے اور دردمندوں کو سنوارتی ہے۔ چاند پوری طرح ہماری زمین کی ایک انسان ذات بن گئی ہے اور نام ہی کی افلاکی شے ہے۔ پتہ نہیں اس دوشیزہ (چاند) کا سسرال اور میکا کہاں ہیں۔ اور اس کا رفیق حیات کون ہے۔ ایک داغدار عاشق کی طرح دوست کی تلاش میں سرگرداں ہے بجلی ہماری ہی زمین کی ہے لیکن کچھ تنگ سی آکر وطن کو چھوڑ چلی ہے۔ لیکن حُبِ وطن سے مجبور مڑ مڑ کر دیکھ رہی ہے۔ یا وہ بات نہیں۔ شاید کوئی ٹوٹا دیا لیکر محبوب کی تلاش میں نکلی ہے۔ یا کبھی ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معصوم بچہ آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔

مظاہرِ فطرت کی عکاسی کرتے ہوئے ہجور ان مظاہر کو انسان سے الگ کر کے نہیں دیکھتا ہے۔ وہ انسان اور فطرت میں ایک عجیب سا رشتہ پاتا ہے۔ اگر کبھی انسان کو فطرت کے ساتھ متصادم بھی پاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی فطرت کو انسان کا رازدار اور مددگار بھی محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بہار، چاند اور بجلی کے سپرد کر دیتا ہے اور اُن کو اپنے دُکھ درد بتاتا ہے۔

لیکن لوک شاعری کا یہ رتبہ اور دوسری طرف رومان اور کلاسکل کا تال میل اور نئی نزاکتیں کہاں تک ہجور کی عظمت کی حامل ہو سکتی ہیں۔ یہ ہنگامی قبول عام کہاں تک ابدیت اور آفاقیت اختیار کر سکتا ہے۔ اسکا جواب ابھی کچھ عرصہ کے زیادہ یقین کے ساتھ دیا جا سکے گا۔ کیونکہ ہجور ہمارے لئے ابھی بالکل ایک آندھی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم خود اُن نظریات تعصبات اور اندازِ فکر کے اسیر ہیں۔ جن میں ہجور نے اپنی زندگی گزاری اور اس طور ہمارے فیصلے مستند قرار نہیں دئے جا سکتے۔ کیونکہ ہم ان رجحانات پر کوئی رائے صادر کرتے وقت اپنے ذاتی تعصبات میں اُلجھ کر بھٹک سکتے ہیں۔ آنے والا نقاد ان تعصبات سے بالاتر ہو کر جب کوئی رائے قائم کریگا۔ تو ظاہر ہے کہ وہ اس کے آفاقی پہلوؤں کو بھی اُجاگر پائے گا۔

فرصت کشمکش مدہ ایں دل بیقرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

مہجور سے ایک ملاقات

اکتوبر، نومبر ۱۹۵۱ء کے وہ دن —— خلوص اور سادگی کے پیکر مہجور تب بیمار تھے۔ بہت بیمار —— اور علاج کے لئے سری نگر لائے گئے تھے۔ لیکن سانس کے دباؤ کی سختی کے علاوہ اُن کے چہرے پر بیماری کی نہ کوئی علامت تھی اور نہ ہی کوئی اثر تھا۔ جھریوں سے بھرے چہرے کے ایک ایک خط میں ایک جلال اور لااُبالی پن سا جھلکتا تھا — جیسے پہاڑ کی اُترائی میں ڈھلتے دن کی دھوپ چمکتی ہے، کچھ ویسی ہی چمک ان کے چہرے پر تھی۔ ان کے کردار میں ایک عجیب سا خود اعتمادی کا عنصر تھا جو ملنے والے سے اچانک ایک ناطہ جوڑ لیتا تھا۔

ستیہ وتی جی اور واتسائن سے لے کر شیودان سنگھ چوہان تک کے الگ الگ نظریوں اور اعتقادات رکھنے والے لوگوں سے مہجور کے تذکرے سنتے تھے۔ بلراج ساہنی اور دیوندر ستیارتھی کے مضمون بھی ان پر پڑھے تھے۔ لیکن انکی شخصیت کے ساتھ نہ تو ستیارتھی کے تذکرے ہی انصاف کر پاتے تھے اور نہ بلراج ساہنی کا وہ اسکیچ جو اُنہوں نے شانتی نکیتن کے 'وشوابھارتی' میں لکھا تھا۔ وہ ان بیانات سے بہت بلند تھے۔ لمبا قد، گورا رنگ، چہرے پہ چھوٹی لیکن پُرنور آنکھیں جن میں کالی کالی پتلیاں بڑی بےچینی سے اِدھر اُدھر بھٹکتی تھیں۔ کٹی چھوٹی مونچھیں اور پکے بال، ہنسوڑ چہرہ۔ اس سیدھے سادے آدمی کی صلاحیتوں کا اندازہ انکی شکل و صورت سے نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ وہ اپنی شاعری کے محل کے بوجھ اپنے سر پہ لاد کر کبھی آپے سے باہر نہیں ہوئے۔ اُنکے چہرے کی تبسم آمیز چمک اور آنکھوں کی کوروں سے پھوٹتی ہوئی جھریاں پکار پکار کر کہتی ہیں کہ وہ وقت اور زمانے کی حرکت کی اپج نہیں — بلکہ ایک عمیق اور گہرے انسانی مطالعے سے پائے ہوئے تجربے اور احساس کی عمر تھیں — ایسے تجربے احساس اور علم کی — جو محبت کے جذبے سے بھرپور تھا۔

بہار پھر سے آئیگی۔
مہجور تو محبت کا سنگیت تیار رکھ۔
پھول تو خود ہی کھلیں گے، تو صرف ایک بہانہ بن۔

میں اور واتسائن جب اُن سے ملنے گئے تو چند لمحوں میں ہی وہ ہم سے گھل مل گئے۔ مزاج میں تکلف نام کو نہیں اور خود اس قدر مخلص اور اخلاق نواز کہ کشمیری طبیعت سے ناواقف واتسائن اُن کی ہر بات پر بچھ بچھ جاتا۔ انہوں نے بتلایا کہ ایسے لوگوں سے ملکر اُنہیں خوشی ہوتی ہے جو ظاہرداری اور ریاکاری کے چکر سے بری ہوں۔ غالباً یہی وجہ ہے سماجی ڈھانچے میں غیر معمولی طور پر اہم ہونے کے باوجود کئی ایسے لوگوں سے وہ کتراتے تھے — اور ان کے متعلق اپنے خیالات و جذبات کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے تھے یہ حقیقت ہے کہ اُنہوں نے کبھی اپنی خودداری اور اصول پرستی کے سودے نہیں کئے۔ لیکن عمر بھر وہ ان چیزوں پر قائم رہے اور سادگی کو اپنا لیا

ایک بار شیودان سنگھ کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "محمود گامی کے بعد کشمیری شاعری میں فارسی الفاظ کے سیلاب کو روکنے کے لئے قدرت نے مجھ کو پیدا کیا۔" اُن کی آواز میں غرور نہیں اعتماد تھا، بلکہ منہ پر حلیمی اور انکساری اور بھی عیاں ہوگئی تھی۔ انکے جواب میں خودپرستی نہ تھی بلکہ صاف گوئی، نہ اُنکے لہجے میں طنز کی تلخی تھی، حالانکہ کشمیر کے En-Lightened طبقے نے ایک لمبے عرصے تک ان کی ناقدری کی۔ ہمارے سماج کا یہ المیہ ہے کہ جب تک باہر والے آکر ہمارے فن کو نہ پرکھیں، فتوے نہ دیں، فنکار اور اُس کا فن دونوں گمنامی کی دھول میں اٹے رہتے ہیں۔

شاید ۱۹۳۲ء میں دیوندر ستیارتھی نے سب سے پہلے مہجور کے بارے

میں ' ماڈرن ریویو ' میں لکھا تھا ۔ اُس کے بعد برج ساہنی نے شانتی نکیتن کی نوکری کے دوران میں ان پر ایک سکیچ لکھا تھا ۔ جس کی بدولت رابندر ناتھ ٹیگور تک مہجور کا کلام اور نام پہنچا ۔ شانتی نکیتن کے مجلہ " وشوا بھارتی " میں یوں رقمطراز ہیں :۔

" اگر مہجور آج ایک گیت لکھتے ہیں تو وہ [illegible] میں دن میں ہی عوام کی زبان پر ہوتا ہے ۔ اسکول جاتے ہوئے بچے ، دھان کوٹتی اور پھلکتی ہوئی کشمیری دوشیزائیں ، ڈونگے کھیتے ہوئے مانجھی ، ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے مزدور ۔۔۔ سب کے سب اس گیت کے دیوانے ہو جاتے ہیں ۔ ایک ناخواندہ ملک میں ، جہاں ایسی چیزوں کو شائع کیا جائے تو شاید دس کاپیاں بھی ضرورت نہ ہوں ۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم کسی معجزے سے کم نہیں ۔ "

لیکن اس سب کے باوجود بھی سرینگر کے En-lightened طبقے نے مہجور کو کوئی اہمیت نہیں دی ۔ ایک طرح سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جیسے کشمیر کی سرحدوں پر رہنے والا ہر چرواہا اور وادی کا ہر دہقان جانتا تھا ، انگریزی فارسی ، سنسکرت اور اردو دان طبقہ اس سے ناواقف تھا ۔ یا جان بوجھ کر ناواقف بنا رہنا چاہتا تھا ۔

شاید اسی زمانے میں پنڈت آنند کول بامزئی نے ان کی دو نظموں کا ترجمہ " وشو بھارتی " میں شائع کرایا ۔۔ " پوشی مت جانانو " اور " گریس کور " ۔۔ ان نظموں کو پڑھ کر رابندر ناتھ ٹیگور بہت مرعوب ہوئے ، اور انہوں نے خود مہجور کو لکھا ۔ " میرے اور آپ کے وچار آپس میں بہت ملتے ہیں ۔ اگر آپ انگریزی یا بنگلہ زبان سے واقف ہوتے تو میں یہ شک کرتا کہ آپ نے میرے خیالات کو اپنی زبان میں ڈھالا ہے ۔۔ مجھے آپ کی تخلیقات پر ناز ہے ۔ آپ بجا طور پر کشمیر کے ورڈز ورتھ ہیں ۔ "

شاید انہیں خطوط اور مضامین کی بھنک جب مندرجہ بالا فارسی ، سنسکرت اور انگریزی دان طبقے کے کرم فرماؤں کے کانوں میں پڑی ، تب انہیں ہوش آیا اور اسی بیرونی توجہ کا اثر تھا کہ مہجور کو پہلی بار کسی مشاعرے میں مدعو کیا گیا ۔۔ اور سادگی کا یہ مجسمہ نیستان شعر میں چمک اٹھا ۔ احترام سے عالموں اور نقادوں کے سر جھک گئے جس وقت مہجور اپنی پُر سحر آرائیاں بیان کر رہے تھے ۔ اُس وقت اس پیرانہ سالی اور بیماری کے عالم میں بھی ان کے چہرے پر ایک تازگی اور شگفتگی سی عود آئی تھی ۔ ان کی آواز بلند ہو گئی تھی ۔ ان میں ایک عجیب جوش پیدا ہو گیا

تھا ۔ وہ مسکرائے بھی ، اور اس مسکراہٹ میں یہ اعتماد بھی تھا کہ فتح ان کے فن کی تھی ۔ اور اس کے بعد وہ ہمیشہ فاتح رہا ۔

لیکن شہر کی گہما گہمی اور شور و غل سے انہیں نفرت تھی ۔ شاید یہ ان کی اس نوکری کے ماحول کا رد عمل تھا ، جس کے سلسلے میں وہ ہمیشہ دیہاتوں ہی میں رہے ۔ انہوں نے بتلایا کہ آبادیوں میں رہنے سے انہیں اتنی مسرت نہیں ہوتی جتنی دور دور تک پھیلے ہوئے پہاڑوں کے دامنوں میں گنگناتی ہوئی ندیوں ، آبشاروں اور جھرنوں کی خاموش موسیقیوں میں بیٹھ کر ہوتی ہے ۔ شہروں کی زندگی انہیں راس نہیں آتی تھی ۔

انہیں دنوں جیسا کہ مہجور کے بارے میں لکھتے ہوئے میں نے " نئی چیتنا " میں کہا تھا کہ " مہجور کشمیر کے " جن کوی " (عوامی شاعر) ہیں لیکن جنوادی (اشتراکی) کوی نہیں ہیں ' یہ فرق ان کی شاعری میں نمایاں طور پر واضح ہے ۔ حالانکہ مہجور کی شاعری سے متعارف کئی ہندی نقاد میری اس بات کو تسلیم کرنے سے ہچکچاتے ہیں ۔ میں آج بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں ، بلکہ میرے خیال میں ان کی ساری شخصیت کا نچوڑ اسی ایک بات میں ہے ، وہ عام قسم کے ایک انسان تھے ۔ شعراء کی بناوٹ اور تکلفات انہیں چھو تک نہیں گئے تھے ، انہوں نے فن کی بلندیوں پر پرواز کی ہے ، اور وہ ان ادیبوں سے بالکل مختلف تھے ، جن کا قلم ، فن کی بلندیوں تک تو پہنچتا ہے ، لیکن زندگی اور زندہ رہنے کے فن سے بے بہرہ ہوتا ہے ۔ وہ ایک حقیقت پسند دنیا میں رہتے ہوئے عینیت کی تلاش میں سرگرداں رہے ، اور اُسے پا گئے ، یہی اُن کا کمال تھا ۔ اُن کا دردمند دل انسانیت کا جوہر تھا ۔ میں نے کسی شاعر کے چہرے کی جھریوں کے ہر خط میں سے ٹپکتی ہوئی وہ شفقت ، وہ معصومیت ، وہ اُمید اور وہ جلال نہیں دیکھا ، جو مہجور کے کردار اور فلسفۂ حیات کے عوامی پہلو تھے ۔ یہی وہ صفات ہیں جن میں ان کی " شاعر شخصیت " کی تاریخ دفن ہے ۔

غلام محی الدین مجید

مہجور کا آخری سفر

۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء کی صبح تھی۔ ایسی ہی صبح جیسی روز ہوا کرتی ہے، مگر پھر بھی یہ صبح کتنی مختلف تھی۔ یہ صبح اپنے دوش پر کشمیر کے حسن آزادی اور سربلندی کے نغمہ خواں مہجور کی موت کی خبر لائی تھی۔ میں صبح ہی کالج کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں جب ایک سماعتی مرکز پر مہجور کی موت کی خبر کانوں میں پڑی، تو میرا دل جیسے ایک لمحے کے لئے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ جس نے کشمیریوں کے مفلوج نطق کو پھر گل بار کر دیا تھا جس نے کشمیر کی ویران وادیوں کو اپنی آتش ذاتی سے پھر دہکا دیا تھا جس نے غنی۔ للہ دید۔ حبہ خاتون اور رسول میر کی شراب کہنہ کو پھر سے نئے جام و مینا میں چھلکا کر کشمیریوں کو ایک ایسی صہبا سے مخمور کر دیا تھا کہ ان کو صدیوں کے ظلم و ستم بھول گئے تھے۔ وہ ایک آنے والی بہار کے انتظار میں دور رفتہ کی تمام کلفتوں کو فراموش کر گئے تھے، اور جب بہار آ گئی۔ تو اس کا مدح خواں۔ کشمیر کے بوستاں کا چہکتا ہزار داستاں خاموش ہو گیا تھا۔ شاید وہ اس عالم کی تلاش میں گیا تھا "جہاں کی بہار پا بہ رکاب نہیں ہوتی۔"

کالج میں یہ خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ گھنٹہ بجتے ہی تمام کالج احاطے میں اُمڈ آیا۔ وہاں پر چند پروفیسروں اور طلباء نے اس دولت کا سرسری طور ذکر کیا، جس سے آج کشمیری محروم ہو گئے تھے۔ اُن کے بشرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اُن خیالات کی پوری ترجمانی نہیں کر سکتے، جو اُن کے دل کے نہاں خانوں میں پرورش پا رہے ہیں۔ شاید ایسے ہی مواقع کیلئے اقبال کا یہ شعر کہا گیا تھا ؎

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

اس مختصر سی تقریب کے بعد کالج میں چھٹی کر دی گئی میرا کدل پہنچ گیا۔ وہاں کچھ بسیں مہجور کے گاؤں متری گام جانے والی تھیں، ایک جیپ جس پر عارف صاحب اور ناظم صاحب بیٹھے ہوئے تھے، مجھے بھی جگہ ملی، اور یہ قافلہ کوئی بارہ بجے پلوامہ پہنچ گیا۔ جہاں سے شاعر کا گاؤں چند میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ جہاں صرف پیدل ہی جانا پڑتا تھا۔ چنانچہ یہ سارا قافلہ جس میں مہجور کے نغموں کے شیدائی تھے، بھوک اور تکان سے بے نیاز چل پڑا۔ مجھے یاد ہے کہ سرسوں کے کھیت اپنی پوری بہار پر تھے، اور ہمیں راستے میں ایک چرواہا مہجور کا ایک درد آمیز بند گنگناتے ہوئے ملا تھا، جسے سن کر ہماری جماعت کے اکثر آدمی آنسو ضبط نہ کر سکے تھے۔

دو بجے کے قریب جب ہم متری گام پہنچے ہی تھے، جناب بخشی غلام محمد (جو اُس وقت نائب وزیر اعظم تھے) اپنے چند اور رفیقوں کے ساتھ متری گام پہنچ گئے۔ پوچھ گچھ پر معلوم ہوا کہ مہجور ۸ اپریل کی صبح کو اپنی پنشن لینے کیلئے پلوامہ گئے تھے، اور وہاں سے رات گئے جب لوٹنے لگے تو طبیعت خراب ہو گئی اور اُن سے گھوڑے پر چڑھا نہ جا سکا۔ چنانچہ چند دوستوں نے آپ کو سہارا دیکر متری گام پہنچایا۔ آپ کو جب گھر میں اُتارا گیا، تو آپ کی زبان لکنت آمیز ہو گئی تھی، اسی عالم میں کچھ باتیں کر کے آپ نے حقہ طلب کی اور صبح صادق کے وقت جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔ ۹ اپریل کو یہ خبر بہت دیر کے بعد سرینگر پہنچی۔ چنانچہ مہجور کے اقارب نے یہ سمجھ کر کہ وہاں سے کوئی نہیں آیا ہے، آپ کو مقامی قبرستان میں دفن کر دیا۔ یہ خبر ہماری جماعت کے تمام افراد کے لئے سوہانِ روح ثابت ہوئی۔ کیونکہ ہم سب لوگ اُن کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے لئے آئے تھے۔

جناب بخشی غلام محمد کی آمد پر مہجور کے چناروں کے چھاؤں تلے ایک چھوٹی سی محفل منعقد ہوئی۔ اس محفل کا وہ منظر مجھے اچھی طرح یاد ہے جب شاعر کے ایک ان پڑھ کسان دوست نے اُن کی نظم " [illegible] آؤ نوک یار کرت گرم " نہایت جگر سوز لہجے میں سنائی تھی۔ اور جناب بخشی صاحب سے لیکر باقی ہر شریک محفل کی آنکھیں ساون بھادوں بنی ہوئی تھیں۔

جناب بخشی صاحب نے وہیں پہ تجویز کی کہ حضرت مہجور کا جنازہ سرینگر پہنچایا جائے۔ جہاں اُن کے ہزاروں شیدائی اُنہیں شایان شان خراج عقیدت پیش کر سکیں۔ اور اُس کے بعد اُنہیں حبہ خاتون کے مزار واقع اتھہ واجن میں دفن کر دیا جائے۔ تاکہ آنے والی نسلیں اپنے اس محبوب شاعر کے مزار سے زندگی کا سُراغ پاتی رہیں اور اس خطۂ زمین کو " مزار شعراء " کے نام سے موسوم کر دیا جائے۔ دیہاتیوں نے پہلے تو اس تجویز کی مزاحمت کی کیونکہ وہ اپنے محبوب شاعر سے، جس نے اُن کے دُکھ درد کو اپنی نغمہ سرائیوں سے گھٹا دیا تھا، مفارقت نہیں چاہتے تھے مگر جناب بخشی صاحب نے انہیں سمجھایا کہ اُن کا فیض اتنا عام ہے کہ اسے محدود کر دینا ظلم ہے۔ تو وہ مان گئے اور فیصلہ ہوا کہ راتوں رات اسے سرینگر پہنچا دیا جائے۔

۱۱ اپریل کی صبح کے دس بجے شاعر کا جنازہ خانقاہ معلیٰ کے احاطے میں رکھا گیا تھا۔ اور صبح سے ہی ہزاروں لوگ، مرد۔ عورتیں اور بچے جوق در جوق آکر اپنے محبوب مغنی کا آخری دیدار کر رہے تھے۔ مہجور کا جنازہ ایک سجے سجائے تابوت میں رکھا گیا تھا۔ جس پر اُن کا یہ شعر لکھا گیا تھا کہ

مہجور مو تس کیاہ چھو کھوژُن، موت چھُوی معراج
مرُمرُ چھی چیران زندگی۔ وسواس مرنکُ ترادُ

(ترجمہ :- مہجور موت سے خائف ہونا کیا۔ موت تو آدم خاکی کے ارتقاء کی ایک منزل ہے۔ مرمر کے آخر زندگی کی ہی فتح ہوتی ہے۔ تو موت سے ڈرنا کیا۔)

دو بجے کے قریب ہزاروں لوگوں نے خانقاہ معلیٰ کے تاریخی احاطے میں اُن کی نماز جنازہ ادا کی۔ اور اُس کے بعد اُن کے جنازہ کو جلوس کی صورت میں امیرا کدل پہنچایا گیا۔ جلوس کے آگے آگے ملیشیا اور پولیس کے دستے تھے اُس کے بعد قومی کلچرل کانگریس کے ارکان سیاہ ماتمی علامت لگائے جا رہے تھے اور اُس کے بعد عام لوگوں کا انبوہ کثیر گریاں گریاں جا رہا تھا۔ امیرا کدل سے جنازہ ایک پھولوں سے آراستہ گاڑی میں رکھ دیا گیا۔ اور اُس کے عقب میں تھیں عام لوگ لاریوں سے اور پیدل جا رہے تھے۔ کوئی تین بجے کے قریب جنازہ اتھہ واجن پہنچا دیا گیا۔ اور یہاں سے جناب بخشی غلام محمد۔ دینا ناتھ نادم۔ مرزا عارف اور باقی ادب نواز شخصیتوں نے تابوت کو کندھا دیکر قبر تک پہنچایا اور اُس کے بعد انیس توپوں کی سلامی کے پس منظر میں جناب بخشی غلام محمد نے شاعر کے جسد خاکی کو تربت میں اُتارا۔ اور اُس کے بعد عوام کے سیل بے پناہ کو تحریک سی مل گئی۔ اور ہر ایک ہاتھ آگے بڑھنے لگا۔ تاکہ شاعر کی تربت کو ڈھانپنے کی سعادت سے محروم نہ رہ جائے۔ اور چند منٹ کے بعد ع

جس کی آوازوں سے لذت گیر اب تک گوش ہے
وہ جرس بس اب ہمیشہ کیلئے خاموش ہے

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد جناب بخشی صاحب محو گریہ عوام سے مخاطب ہوئے :-

" ہموطنو! آپ کا غم میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔ کیونکہ میرا دل بھی اس درد کی آنچ سے تپ رہا ہے۔ مگر کیا یہ بھی حقیقت نہیں ہے کہ مہجور مرا نہیں ہے، زندہ ہے، کیونکہ اُس نے جن نغموں کی تخلیق کی۔ اور جن گیتوں کا دیپک راگ گایا۔ وہ اُس وقت تک زندہ رہینگے جب تک انسانی دل میں حسن زندگی اور ارتقاء سے محبت کا جذبہ زندہ ہے۔ آئیے ہم سب عہد کریں کہ مہجور کے دیئے ہوئے پیغام کی مطابقت میں اپنے وطن عزیز کو پھر سے ترقی کی معراج تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔"

اس خطاب کے تھوڑی دیر بعد مہجور کی تربت کے اوپر ایک بزم قوالی منعقد ہوئی اور مہجور کے نغمے ساز کی لہروں پر تھرکنے لگے۔ محفل کبھی روتی تھی اور کبھی مسکراتی تھی ۔ ہاں مہجور ہمارے آلام اور مسرتوں ۔ دونوں کا رابطہ نواز تھا ۔ اور پھر جب آسمان پر چاندنی چھٹکی تو یہ بزم موسیقی ختم ہوگئی۔ اور کشمیر کے لوگ اپنے محبوب نغمات کے خالق کو تاریخ کی رفعتوں کے سپرد کر آئے تھے

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اُس گھر کی نگہبانی کرے

نریش کمار شاد

نیا کشمیر

دیکھ وہ تیرے سرِ افق سے
لال گلابی کرنیں پھوٹیں
دیکھ وہ تیرے جسم سے آخر
صدیوں کی زنجیریں ٹوٹیں
دیکھ وہ تیرے بدخواہوں کی
سانسیں اکھڑیں، نبضیں چھوٹیں
دیکھ وہ تیرے بچھڑے بچے چوم رہے ہیں تیرے گام
اے کشمیر کی سندر دھرتی تجھ کو شاعر کا پرنام

قدم قدم پر نگر نگر میں
خوشیوں کے پرچم لہراتے
آشاؤں کے اندھیارے میں
خون سے لاکھوں دیپ جلاتے
جاگ اٹھے ہیں تیرے بچے
جاگ اٹھے ہیں نیند کے ماتے
جاگ اٹھے ہیں سب نر ناری جاگ اٹھے مزدور تمام
اے کشمیر کی سندر دھرتی تجھ کو شاعر کا پرنام

دیکھ وہ اپنے راج دلارے
بھوکے ننگے اور سوالی
آنکھوں میں مستی کی لہریں
چہروں پر خوشیوں کی لالی
تعمیر

ڈگ مگ ڈولے راج سنگھاسن
تھر تھر کانپے راج کا والی
ڈگر ڈگر پر جشن بپا ہے راج محل میں ہے کہرام
اے کشمیر کی سندر دھرتی تجھ کو شاعر کا پرنام

سرمائے کا مرتا ڈھانچہ
کون سنبھالے، کون بچائے
کون یہ سرخ انگارے پکڑے
کون یہ پھیلی آگ بجھائے
کون امنڈتے طوفان کو روکے
کون چٹانوں سے ٹکرائے
اپنا بل پہچان چکے ہیں اب تیرے مظلوم عوام
اے کشمیر کی سندر دھرتی تجھ کو شاعر کا پرنام

پھوٹ کے تیرے ساز سے پھیلیں
آزادی کے گیت کی تانیں
پورب۔ پچھم۔ اتر۔ دکھن،
بول اٹھیں خاموش زبانیں
کھول رہی ہیں لاوا بن کر
دنیا بھر کی کچلی جانیں
ہر سینے میں تیری دھڑکن ہر لب پر تیرا پیغام
اے کشمیر کی سندر دھرتی تجھ کو شاعر کا پرنام

جنتوں توں

پھاگن کا مہینہ تھا شوراتری کے دن تھے اور تلا اشٹمی کا تیوہار تھا۔ وِتستا کے دونوں کناروں پر اَن گنت دیئے جھلملا رہے تھے۔ اور اکے دُکے وِتستا کے پانیوں پر بھی تیل کے چراغ بہتے نظر آ رہے تھے۔ نوبیاہتا دُلہنیں اور شوخ سیانی لڑکیاں اپنی ساسوں اور ماؤں کے ساتھ خوش خوش شرماتی سی لجاتی سی ہاتھوں میں تھالیاں اور تھالیوں میں وٹک راج کی مورتیاں پھول پھل لئے، ٹھمک ٹھمک کر اندھیری گلیوں اور تنگ بازاروں میں سے ہو کر وِتستا کی طرف جا رہی تھیں۔

نوبیلوں کے درمیان وِتستا کے کناروں پر لگ بھگ سب ہی گھاٹ جگمگا رہے تھے۔ ہر گھاٹ پر میلے کا سا شور، وہی رنگ اور وہی دمک تھی۔ عورتوں کا گھاٹ اُترنا اور گھاٹ چڑھنا فضا میں ایک انجانی سی سرسراہٹ پیدا کر رہا تھا، مندروں سے شنکھ اور گھنٹیوں کی صدائیں فضا میں انوکھا سا سنگیت بھر رہی تھیں۔ اور بچوں کا آگ لہرانے والا جیتوں توں کا کھیل سرد سرد سی فضا کو گرما رہا تھا۔

گنپت یار کے گھاٹ پر چہل پہل کسی بھی صورت کم نہ تھی یا ساسیں اور مائیں، دُلہنیں اور دیورانیاں شردھا سے بھرپور ایک نامعلوم سے سُر تال میں گھاٹ کی سیڑھیاں اُترتیں اور جا کے اُس جگہ رُک جاتیں جہاں وِتستا کا پانی اُن کے پاؤں چھو جاتا۔ اُدھر وہ جھک جاتیں اور تھوڑے سے پوجا پاٹ کے بعد وٹک راج کو شوراتری کے اتنے دن بعد وداع کرتیں۔ گوری گنپت یار کے ایک طرف کھڑے چار منزلہ مکان کی کھڑکی کی سِل پر سر رکھ کر یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اور دل ہی دل میں کڑھتی جا رہی تھی۔ دلہنیں اور دیورانیاں گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے اپنے گھروں کو جا رہی تھیں سہیلیاں مل رہی تھیں۔ اور گلے مل رہی تھیں۔ کبھی چنچل سی مسکانیں گھاٹ کے آر پار ہو جاتیں اور کبھی حسین سے قہقہے گھاٹ کی فضا کو گدگداتے .... اور یہ دیکھ کر گوری اپنے اندر ایک ٹیس سی محسوس کرنے لگتی لیکن آہ ہونٹوں پر نہ آنے دیتی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ تلا اشٹمی کے تیوہار کو اسی شوخی اور چنچل پنے سے منانے کی حقدار ہونے پر بھی وہ ایسا نہ کر سکی۔ اگر وہ قسمت کی پھوٹی نہ ہوتی تو شادی کے بعد پہلی شوراتری ہی ٹھاٹھ سے اپنے سسرال میں مناتی، مگر شاید گوری اسی لئے پیدا ہوئی تھی کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے اس کی اُمنگیں تڑپ تڑپ کر جان دیں اور اس کی زندگی بھاری بن کر اس کی کمزور روح پر بوجھ بنی رہے۔

گوری نے سُنا تھا کہ تلا اشٹمی کا تیوہار اُس زمانے کی یاد دلاتا ہے جب برسوں کی تپسیا کے بعد پاروتی نے شنکر کو پا لیا تھا۔ اور شوراتری کے دن اُن کا بیاہ ہوا تھا۔ اور آج کے دن پاروتی اپنے شنکر کے ساتھ کیلاش پربت کی طرف چل دی تھی تو ہمالیہ کے باسیوں نے شنکھ بجائے تھے۔ دیپ مالا رچائی تھی ...... اور آٹھ مہینے پہلے گوری بھی تو دُلہن بن کر گنپت یار کے گھاٹ کی ان ہی سیڑھیوں سے اُتر کر ناؤ میں بیٹھ کر شنکر کے گھر گئی تھی۔ اُس کے پیاروں نے بھی تو اُس دن اُسے وداع کرتے وقت خوشی کے آنسو بہائے تھے اور گھی کے چراغ جلائے تھے ...... مگر گوری اپنے بیاہ کی بات یاد کر کے ذرا بھی نہ کسمائی بلکہ اُسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کی شادی زمانہ ہوئے ہو گئی ہو اور اُسے یوں محسوس ہو

تھا کہ جیسے اُس کی زندگی اب اُس منزل پر پہنچ چکی ہے۔ جہاں سے دن گِنے جاتے ہیں۔

گوری لیشکر کے گھر تو دلہن بن کر گئی مگر شادی کے تیسرے ہی مہینے بعد ہمیشہ کے لئے میکے لوٹ آئی۔ اس میں قصور گوری کا نہیں تھا اور نہ لیشکر کا۔ وہ دِلی کا شہر ہی ایسا تھا جہاں کی ہوا لگتے ہی لیشکر کی آنکھوں کا پانی ڈھل گیا تھا۔ گوری کو ماں باپ کے سہارے چھوڑ کر لیشکر شادی کے ڈیڑھ ہی مہینہ بعد دِلی گیا تھا دِلی میں کسی دھنی سیٹھ سے ملاقات ہوئی تھی جس نے اُس کو اپنی فرم میں ایک بہت ہی اچھا عہدہ دلوایا۔ لیشکر جو ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے گندی سی چال میں سویا تو صبح اپنے آپ کو بزنس ایگزیکیٹو کی پوزیشن میں پایا تو دماغ پھر گیا۔ اب لیشکر کی زندگی ایک نئے ہی سانچے میں ڈھلنے لگی تھی اور اُس کا تصوّر اس بات سے مطمئن ہی نہ ہو رہا تھا کہ اَن پڑھ گوری اُس نئے ماحول میں کبھی رس سکتی ہے بس سکتی ہے۔ لیشکر اپنی نئی زندگی میں ایک خلا محسوس کرنے لگا۔ اور اسے پُر کرنے کی غرض سے اُس نے دلی میں ہی ایک نئی شادی رچائی اور اَن پڑھ گوری سے ناطہ توڑ دیا۔ اس پر گوری کے ماں باپ نے مقدمہ دائر کیا۔ اور بڑی ہائے ہے ہوئی۔ آخر کو یہی فیصلہ ہوا کہ لیشکر گوری کو ماہوار بیس روپیہ بھیجا کرے۔ اور گوری کے ماں باپ نے تقدیر کے سامنے شکست کھا کر اس بات کو مان لیا اور اپنی بیٹی کو ہمیشہ کے لئے میکے بُلا لیا۔

گوری کے دل پر جو گھاؤ پڑ گیا وہ بھلا بیس روپوں سے کیا بھر جاتا، وہ اندر ہی اندر گھلتی جاتی تھی، مرتی جاتی تھی۔ خیر خواہوں نے مشورہ دیا کہ گوری کو اب تعلیم حاصل کرنا چاہیئے۔ تاکہ اپنی ٹانگوں پر کھڑی ہو جانے کے قابل ہو سکے اور ماں باپ پر بوجھ نہ بنی رہے اس طرح اور بھی مشورے ہمدردوں سے ملے۔ لیکن گوری کو چاہیئے تھا اپنے شوہر کا پیار دُلار جس کے انتظار میں اُس نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال بتائے تھے۔ پیار ملا تو وہ بھی ایسا جیسے گھنے بادلوں کی اوٹ سے بجلی کا کوندا جس سے ایک لمحہ کے لئے روشنی تو مل گئی مگر ساتھ ہی آشیاں بھی جل گیا۔ گوری دوشن سے

تقسیم

تو کِس کو دے۔ لیشکر کو وہ اب بھی اپنا شوہر مانتی تھی۔ اس کی نئی بیوی کتنی پڑھی لکھی سہی آخر عورت ہی تو تھی۔ بُرا ہو صرف اُس کو عہدہ ملنے کا جس کے کارن اُس کا دماغ پھر گیا۔ گوری دل ہی دل میں اپنی خوشیوں کے سوتے سوکھ جانے پر اسی طرح کی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی رہتی۔ لوگ اُسے کہتے تھے کہ لیشکر اب تمہارا کبھی نہیں ہو سکتا، اس لئے اُس کا خیال دل سے نکال ڈالو۔ مگر گوری ایسا کر بھی لے پھر ——— اٹھارہ برس کی جوان عورت اس بے درد دنیا میں کیا کرے۔ کہاں جائے، جو اُسے دیکھیگا یہی کہے گا، دیکھو اسے شوہر نے چھوڑ دیا ہے۔ کلنک جو لگ گیا سو لگ ہی گیا۔ اب کِس کو پڑی ہے جو اس بات کی جانچ کرتا پھرے۔ کہ اس معاملے میں گنہگار کون ہے۔ مگر گوری کو دیکھتے ہی لوگوں کو جو پہلی بات یاد آئے گی وہ یہی ہوگی کہ اسے شوہر نے چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ میکے سے باہر ایک قدم نہیں رکھ سکتی۔ کچھ لوگ بے چاری سمجھ کر ہمدردی کی آڑ میں اس کی جوانی کو گھورنے لگیں گے۔ اور پھر اس کے ہر قدم پر اُنگلیاں اُٹھنے لگیں گی اور . . . .

کھڑکی کی سِل پر سر رکھ کر گوری کا دماغ یہ سب سوچتے سوچتے تھک سا گیا تھا۔ آنکھوں میں نمی سی آ چکی تھی اور رات نکل رہی تھی۔ نیچے گنپت یار کے گھاٹ پر عورتوں کا آنا جانا اب بالکل ہی تھم گیا تھا۔ شور بھی مدھم پڑ گیا تھا۔ گھاٹ پر صرف بچے تھے جو ابھی بھی اپنے جتوں توں کے کھیل میں مگن نظر آ رہے تھے۔ بہت سارے بچے تو اپنی کانگڑیوں کے خول میں پھوس بھر رہے تھے، رسیاں باندھ رہے تھے آگ لگا رہے تھے۔ ننھے ننھے بچوں کو پھرتی سے آگ لہراتے دیکھ کر گوری کا کلیجہ سہم جاتا اور اس کی نظریں جتوں توں کھیلتے ہوئے بچوں کے گرد بنتے ہوئے آگ کے دائروں کا برابر تعاقب کرتیں اور پلک تک نہ جھپاتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کبھی نونہال کے بدن کو چنگارا لگ جائے! گھاٹ سے اِتنے فاصلے پر بیٹھنے کے باوجود بھی گوری جیسے اِن بچوں کے پاس ہی بیٹھی، ان کی حفاظت کر رہی تھی۔ کبھی کوئی منچلا سا بچہ کانگڑی کے جلتے ہوئے خول کو زور زور سے گھماتا تو وہ ایسا محسوس کرتی کہ آگ کے چھپاکے میں آس پاس

کھڑے بچوں کو مس کرے گی ہی، نہیں تو کانگڑی کے خول سے رسی ٹوٹ ہی جائیگی اور جلتا ہوا خول ساتھ والے کسی مکان کی چھت پر آ ہی گرے گا اور محلے میں آگ لگ ہی جائیگی!

رات بیتی جارہی تھی۔ وِتستا کے چراغ بجھ بجھ کے سو رہے تھے۔ فضا میں سردی کی وجہ سے سکرٹان سی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر گوری ابھی تک سوچ ہی رہی تھی کہ نو بیاہتا دُلھنیں اپنے سسرالوں میں اس وقت کیا کر رہی ہو نگی! وُہ تھا وقت اپنے شوہروں کی گودیوں میں سر رکھ کر آنے والی خوشیوں کے سپنے دیکھنے کا مگر ایک گوری تھی جس کے حصّے میں یہ سب کچھ نہیں آیا۔ اُسے اپنی زندگی پر بڑا افسوس ہو رہا تھا۔ آخر اُس کی زندگی کا کیا ہوگا، اُس کی جوانی کا کیا ہو گا۔ یہ سوال بار بار اُس کے ذہن میں آجاتے اور ان کے آگے وُہ کچھ سوچ ہی نہ سکتی۔ جب پاروتی کو شنکر کا پیار حاصل نہیں تو وُہ ہمالیہ کے برفیلے تودوں میں اپنی قبر کھود کر ہمیشہ کے لئے یخ بستہ کیوں نہیں ہو جاتی! شنکر کے بغیر پاروتی کا نام جیسے زبان پر چڑھتا ہی نہیں۔ اسی طرح اگر گوری کو شنکر کا آسرا نہیں ملتا تب کیا جینا کیا مرنا۔ اس طرح وُہ سوچتی جارہی تھی کہ نیچے گھاٹ سے ننھے رتن کی آواز آئی۔ 'دیدی، دیدی، دیکھو نا یہ لوگ مجھے جنتوں توں کھیلنے نہیں دیتے۔ کہتے ہیں اپنی کانگڑی کا خول ہمیں دے دو، ہم لہرائیں گے'۔ گوری چونک گئی۔ دیکھا تو گھاٹ کی پتھریلی سطح پر بچوں نے جھگڑا شروع کیا تھا۔ رتن سے کوئی دوسرا بچہ اس کی کانگڑی کا خول چھینے جا رہا تھا۔ گوری نے کھڑکی سے ہی للکارتے ہوئے کہا 'خبردار! جو میرے ننھے بھیا سے کانگڑی کا خول چھین لیا۔ یہ اپنے ہی ہاتھوں سے خول لہرائے گا'!

اور یہ کہہ کر گوری جلدی جلدی گھاٹ پر اُتر آئی اور گھاٹ پر آتے ہی ننھے رتن کو دلاسہ دے کر اس کی کانگڑی کے خول میں اچھی طرح سے پھوس بھر دی، کس کے رسی باندھ لی اور پھوس کو آگ دکھا کر رسی رتن کے ہاتھ تھما دی۔ لیکن جونہی آگ بھڑک گئی رتن اسے لہرانے سے ڈر گیا۔ اور اُس نے گوری کی طرف رسی بڑھا کر کہا:

"دیدی تم ہی میرے بدلے جنتوں توں کھیلو، میں دیکھونگا تم کیسے لہراؤ گی۔"

گوری نے رسی تھام لی۔ اور دوسری سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے رتن کو اُدھر ہی بیٹھ کر تماشا دیکھنے کے لئے کہا اور خود دائیں ہاتھ سے ایک لمبی سی رسی پکڑ کر جلتی ہوئی آگ لہرانے لگی۔

گوری اپنے ارد گرد آگ گھمانے لگی اور گھماتے گھماتے اس گھماٹ کے ساتھ ساتھ اندھے سے سُر میں جنتوں توں کے بول بھی گانے لگی۔ رتن گوری کو آگ لہراتے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا، مچل رہا تھا۔ گوری یہ سب دیکھ کر بھی نہ دیکھ رہی تھی۔ اور کچھ سوچ رہی تھی کہ اک دم سے پلٹ گئی اور وِتستا کی طرف مُنہ کر کے اندھا دُھند شعلے لہرانے لگی۔ آگ گھمانے لگی۔ وِتستا کے پانیوں میں لہراتے ہوئے آگ کے تھرتھراتے ہوئے عکس اُبھرنے لگے۔ گوری نے گھومتی ہوئی آگ کی رسی چھوٹی کر دی۔ اب شعلے اس کے قریب رقص کرنے لگے۔ رتن سیڑھیوں پر کھڑا ہو کر گوری کی اس عجیب حرکت سے گھبرا اُٹھا۔ اُس نے پُکار کر کہا۔

"دیدی، رسی لمبی چھوڑ دو، تمہارے کپڑوں کو چنگاریاں لگ رہی ہیں"۔

گوری نے اس کا جواب کچھ نہ دیا اور رسی کو اور قریب سے پکڑا اور بے تحاشا آگ لہرانے لگی۔ سب بچے سہم گئے اور رتن نے پھر آواز دی۔

"دیدی تم کو کیا ہو گیا ہے۔ چھوڑ دو رسی کو، چھوڑ دو۔ اب میں نے دیکھ لیا۔ تم کیسے لہراتی ہو۔ بس کرو دیدی میں ڈر رہا ہوں"۔

"تم ڈرو نہیں بھیا، دیکھتے جاؤ۔ دیکھ رہے ہو نا میں جنتوں توں کیسے کھیل رہی ہوں دیکھتے جاؤ"۔ گوری کی آواز وِتستا کے دونوں کناروں سے ٹکرا کر گونج اُٹھی۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے دائیں بازو کی کلائی اور بھی تیزی سے گھومنے لگی، گھومنے لگی اور خود گوری بھی گھومنے لگی ـــــ گوری شنکر کا تانڈو ناچ ناچ رہی تھی۔ اس کی کائنات کے زمین و آسمان ہل رہے تھے، اس کی زندگی کا گھنیرا پن رات کی سیاہیوں میں تیزی سے ہل (بقیہ صفحہ نمبر ۸۳)

انتخاب

کسی شعری تخلیق کو دوسری زبان میں اپنی مخصوص فضا اور اصلی روح کے ساتھ منتقل کر دینا تقریباً ناممکن ہے۔ ہر زبان کی شاعری کا ایک خاص ماحول، مزاج اور آہنگ ہوتا ہے۔ اور دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت خیال کو تو اس زبان میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ مگر اس ماحول، مزاج اور آہنگ کو بعینہٖ منتقل کر دینے کی کوشش کرنا سعیٔ لاحاصل ہے۔

مہجور کی چند نمائندہ تخلیقات کو اردو ترجمے کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ ترجمہ بھی ایک فن ہے۔ اور مترجمین اس فن میں ماہر نہیں، اس لئے وہ صرف بنیادی خیال کو اردو کے قالب میں ڈھال سکے ہیں۔ اس کیفیت کو منتقل نہیں کر سکے ہیں جو خیال کو شعر بنا دیتی ہے۔

ہزار نکتہ دریں کاروبارِ دلداریست

سنگر مالن.....

گنۂ ژلہِ گاش پیہ گاہ ترود لالن   سنگر مالن پیوِ پراگاش
سنگر مالن کوہن تہ بالن
سنگر مالن پیوِ پراگاش

باغکِ رینزل وارلین گالن   بلبلہ غم تراد کڈ ہکھن داش
پتہ یِد چونُی مذہب پالن
سنگر مالن پیوِ پراگاش

ہردِک طوفان پوشہ تھرِ ژالن   سنتھ پیہ دومہ اَگرِ تگہ پُرخاش
شُپئ پھولِہ تن لیُس دِیہ جھبالن
سنگر مالن پیوِ پراگاش

گاگلہ لولچہ مشالہ زالن   تمہ نورہ روشن گھرِہ آکاش
مس ول شبنمکِ مس بھرِ پیالن
سنگر مالن پیوِ پراگاش

گِل آفتابن مُہرِ لزہ تھالن   لولکِہ اسمانہ ہیتھ آوراش
اسبند زولُس ام گگُلن
سنگر مالن پیوِ پراگاش

مانہ ژار مہجورہ سنزن مِثالن   نہ زِ تھ ونہ ہے ہرگز فاش
دانا یوزن تہ نادان نالن
سنگر مالن پیوِ پراگاش

نعیم

ترجمہ

ظلمت کے بادل چھٹ جائیں گے۔ نور کی سواری آئے گی۔ گل لالہ کی مشعل فروزاں ہوگئی ہے۔ اور کوہسار اس کے نور سے جگمگا اُٹھے ہیں۔

چمن کے محافظ شکاری پرندوں کو ہلاک کردیں گے۔ بلبل! سُکھ کا سانس لے کر محوِ پرواز ہو۔ اب سے تو وہی قانون چلے گا جو تیری پسند کا ہو۔ کوہسار نور سے جگمگا اُٹھے ہیں۔

خزاں کی مسموم ہوائیں کیاریوں کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی۔ ایک دن بہار آکر ان پر نکھار لائیگی۔ اُس وقت وہی مُسکرا اُٹھیں گے۔ جو آگ میں پڑ کر کندن ہوگئے ہوں۔ کوہسار نئی روشنی سے منوّر ہوگئے ہیں۔

صحرا کے پھول محبت کی قندیلیں روشن کریں گے۔ اور اُس نور سے آسمان تابندہ ہو اُٹھے گا۔ اور نرگس شبنم کی شراب سے پیمانے لبریز کر رکھے گی۔ کوہسار طلوع ہونے والی روشنی سے جگمگا اُٹھے ہیں۔

گل آفتاب (ایک پھول) نے اشرفیوں کے تھال سجا رکھے ہیں یہ سوغات پومپنگر سے آئی ہے۔ لالہ نے عود عنبر جلا کر اس کی پیشوائی کی ہے۔ کوہسار طلوع ہونے والی روشنی سے جگمگا اُٹھے ہیں۔

مہجور کے استعارے معنی طلب ہیں۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا، تو راز راز نہ رہے گا۔ عقلمند سمجھ جائیں گے۔ اور نادان سمجھنے کی کوشش تک نہ کریں گے۔ کوہسار نئی روشنی سے جگمگا اُٹھے ہیں۔

ژولہا روشہ روشے

ترجمہ:-

ژولہا روشہ روشے
پو شے متہ جانانو

اتی اتی روز تو یارو کتوُ ژکھُ جادوگارو
گوڈہ کر مینونی چارو
پو شے متہ جانانو

بال بیٹھ بال چھس پراران اشہ کنہ خون چھس ہاران
یارس مار متہ کھاران
پو شے متہ جانانو

بکنا حالِ دل باوے دود مُت سینہ ہاوے
تیلہ پکھا یلہ بو راوے
پو شے متہ جانانو

وتہ بیٹھ ژولہم تراوِتھ جگرس آمہ ناوُ تھاوِتھ
یم داغ کسو ہیکہ ہاوِتھ
پو شے متہ جانانو

شرہو ژلہ ہم پانس پھتو ڈیپہ ڈالانس
نگہ یو سورہ سانس
پو شے متہ جانانو

تم ڈھیرے ڈھیرے بھاگ کر کہاں چلے
پھولوں کے متوالے ساجن۔

محبوب۔ وہیں ٹھہر جا۔ مجھے چھوڑ کر کہاں جاؤگے۔
پہلے میرا انجام تو سوچ لے۔
پھولوں کے متوالے میرے ساجن۔

میں کہاں تک بیٹھی محوِ انتظار رہوں۔ اور اشکوں کے بجائے خون برسا رہی ہوں۔
میرا خون تیری گردن پر ہوگا۔
پھولوں کے متوالے میرے ساجن۔

آجا! تمہیں دل کا حال سناؤں۔ اور جلے ہوئے دل کے پھپھولے دکھاؤں۔
تب آنے کا کیا فائدہ جب میں کھو جاؤں۔
پھولوں کے متوالے میرے ساجن۔

تو مجھے زندگی کے چوراہے پر چھوڑ کر چلا گیا۔ اس حال میں کہ قلب و جگر اس بیوفائی سے کباب ہوگئے تھے۔
یہ زخم میں کس کو دکھلا سکوں گی۔
پھولوں کے متوالے میرے ساجن۔

میرے دل کے ارمان نکل جاتے۔ کاش تم بارہ دری پر جلوہ گر ہوجاتے
میں تیری اداؤں پر واری ہو جاؤں۔
پھولوں کے متوالے میرے پیارے!

نیر

بالہ پیٹھ لائیے نادو پتہ پھیرو ہاشاہزادو
موژل گوٹلہ پال وعدو
پوشے متہ جانانو

میں بلندیوں پر سے تجھے پکاروں گی کہ اے میرے دل کے مالک لوٹ کے آ۔
جب تک وعدہ پورا نہ کر لو۔ مجھے چھوڑ کے نہ جانا۔
پھولوں کے متوالے میرے ساجن۔

ریکھ لیکھ گراوہ ہا سوزیئے ہا بو نو ییم بہانہ بوزیو
دعوے گیسہ ہا روزیئے
پوشے متہ جانانو

میں شکووں کے دفتر لکھ لکھ کے بھیجوں گی۔ کوئی بہانہ مجھے بہلا نہیں سکتا۔
تیرا دامن تو مجھ سے کبھی نہیں چھوٹ سکتا۔
پھولوں کے متوالے میرے ساجن۔

ودلئے ولیس گژھ وئے کامے یاڑ ہیے کرنس نقامے
گاجہ نس تہ لاجہ نس پامے
پوشے متہ جانانو

آ سکھی! اب کوئی کام تو کرنا ہی ہوگا۔ محبت نے تو مجھے سحر زدہ کر دیا
اُس نے مجھے مار ڈالا ہے اور دُنیا مجھے طعنے دے رہی ہے۔
میرے پھولوں کے متوالے ساجن۔

ودلئے ولیس گژھ وئے ون تہٗ تس کمی برہ نم کن تہٗ
کرسنا بیہ ڈلیشن تہٗ
پوشے متہ جانانو

آ سکھی! جنگل میں اُسے تلاش کریں وہ مجھ سے بدگماں کیوں ہو گیا ہے۔
کیا اب میں اُسے پھر دیکھ سکوں گی۔
پھولوں کے متوالے ساجن کو۔

عشقن کرسہ بدنامو کریکھ گیہ شہرہ تہ گامو
پتر ہینہ چھم دیوان پامو
پوشے متہ جانانو

عشق نے مجھے بدنام کر دیا ہے۔ شہر اور گاؤں میں میرا ہی چرچا ہے
اور سوکنیں مجھ پر طنز کے وار آزما رہی ہیں۔
پھولوں کے متوالے میرے ساجن!

ہیجور ون دیوان یارس بے وفا بازی گارس
دیتہ سس کوت کال پرارس
پوشے متہ جانانو

(ہیجور محبوبہ کی راہیں دیکھ رہا ہے۔ اُس بے وفا شعبدہ گر کی۔
اُسے کہو، کب تک انتظار کراؤ گے۔ میرے پھولوں کے متوالے ساجن
کو!)*

تمنا چا نہ دیدار کی.....

تمنا چا نہ دیدار کی مہ چم بمبر زلے بمبرو
و بعض یامت لجس و پچے نے لجس چا نے کلے بمبرو

یہ قد چون زن چھ پوشے گل خوے برجستہ پچش بادگل
و چھت سنبل تہ رنگین گل یہ دِل ماتہ بلنے بمبرو

وچھک دورے مہ مستورے دِلک سرہ مہ قوم ژوبرے
ژہ لو پچہ تیر زن حورے یہ چھو کھ زاہ زبلے بمبرو

کھِت رومک دمن وارہ بدن مہ زولہ ھم نارہ
ودن چھس چا نہ امارہ یہ دِل کر شہلے بمبرو

ژہ یارن سیت زوم ماران بو تنہا خون دِل ماران
دومس کوت نیرہ چھس تھاران دِلسا ژھا نہ ظلم راتلے بمبرو

ژہ کس سیتی گی رسا ہش دویم چھا بیاکھ کانھہ مہ ہش
ژہ میانے ژنگ پاکس نش رنگ کمہ مولے بمبرو

یہ ہنا حالِ دل بامئے گچھہ کوٹھہ تو سرو قرادئے
پشن زو پیشکش تھاوئے مہ پانس شرز لے بمبرو

یہ پرس یارہ کمہ جوک ژہ غیرن سیت ملہ ژوک
کیہ تعویذہ بہم روزک کیہ آرہ ولے بمبرو

کران چھو چھس گمہ ونان یا دس پترا کھ کمہ
یہ دِل دیوانہ گو ژے یتہ بشس سیت نو رلے بمبرو

تمیر

ترجمہ:-

بھنورے ! نرگس کو تمہاری دید کا ارمان ہے۔

جونہی میں کھلی، میری نگاہیں تیری راہیں تکنے لگیں۔ اور تیرے ہی تصور میں نڈھال ہوتی رہی۔

تیرا پیکر ایک رواں دواں پھلواری ہے جو اپنی بہار پر آچکی ہو۔

گلوں کا یہ رنگین اجتماع دیکھ کر کہیں یہ دل مچل اُٹھے۔ تو کیا ہو!

نقاب کے اندر رہی میں نے تمہیں دُور سے پہچان لیا۔ مگر اس دل کا حال تمہیں نہ سُنا سکی۔

تم نے مجھے جو زخم بخشے ہیں وہ کبھی مندمل بھی ہو سکتے ہیں میرے بھنورے آ

حسینوں کو بھانے والے ! تیرے فراق میں میں ہجر کی آگ میں جلتی رہی۔

تمہارے لئے میری آنکھیں ساون بھادوں بنی رہیں۔ کاش میرے دل کا الاؤ بھی بجھ پائے

تم دوستوں کے جھرمٹ میں نغمہ سرا ہو۔ اور میں تنہا بیٹھی خون کے آنسو رو رہی ہوں۔

میں تجھے دن ڈھالے ڈھونڈتی مگر آہ ! مجھ پر خوف سے لرزہ طاری ہوتا ہے اب میں رات کے اندھیاروں میں تجھے تلاش کروں گی۔

کس نے تیرا من موہ لیا۔ کیا آکاش کے نیچے میرا کہیں جواب ہے ؟

یا کہیں میرے رشک میں کسی نرگس نے ہی کہیں تجھے اپنی باہوں میں تو نہ لے لیا ؟

آبھی جا ! میرے من کی میتی من لے۔ میرے لئے میں گھر کے سب سے اچھے کمرے میں پشم کا بستر سجا رکھوں گی اور اپنی جان تیرے سپرد کر کے دل کا غبار نکال ڈالوں گی۔

نہ معلوم کس کے یہاں تو نے شراب پی لی اور اُسی کے ہو رہے۔

نہ جانے کس نازنین نے جادو گنڈے کے زور سے تجھے بہکا دیا۔

ہیجر شمعِ حسن کے گرد پروانہ وار محوِ طواف ہے۔ اور کہہ جاتا ہے یہ دل جو تمہارا دیوانہ ہے۔ کسی دوسری طرف آنکھ نہیں اُٹھا سکتا۔

وُزمل

نازہ تنہ پیم وودل جامہ کم دلہ لیے نُورہ وُزہ ملِیے سارہ ھاو پان
نُورہ وُزہ ملِیے پُورہ نازلہ لیے
نُورہ وُزہ ملِیے پُورہ ہاوٗ پان

جلوا ہودُ بتھ پیٹھ اہرہ بلہ یے شہرتے گامہ گو شور یکسان
پریمہ رس باگران وژہ کھےٗ کھنہ بلہ یے
نُورہ وُزہ ملِیے پورہ ہاوٗ پان

شام ژھایہ ابرہ دار جامہ دل ولیے وارُو بتھ چھک پھیر بتھ گرژھان
بیہ چھک مالین گرژھان ثل ولیے
نُورہ وُزہ ملِیے پُورہ ہاوٗ پان

ورشٹ ہودت پردٗے تلہ یے نظرہ اکہ وچھہ تھن سورُوئی جہان
پان ژھایہ تھوُتھ بیڈل ولیے
نُورہ وُزہ ملِیے پُورہ ہاوٗ پان

زنہ گنگ سیرُونی کمی گاٹلہ یے سادہ نیٹ گژت چھنہ یہ سمسار جان
تی وُ چھت بتھ سیو تھہ یمبرزلیے
نُورہ وُزہ ملِیے پُورہ ہاوٗ پان

جان نےٗ یہ عالم زنتھ رنگہ ولیے پھیر پھیر کیازہ چمکت نُور کن چھان
تدسہ کس تبہ چھُوی کران مس ولیے
نُورہ وُزہ ملِیے پُورہ ہاوٗ پان

تمیم

ترجمہ:-

تیرے نازک پیکر کو یہ سُرخ پہناوا کس نے پہنایا۔
اے نُور کے کوندے۔ پوری طرح تو سامنے آ۔

تم نے اہرہ بل کی بلندیوں پہ جلوہ دکھایا۔ شہر اور گاؤں یکساں طور گونج اُٹھے۔
تو کھنہ بل کی طرف سے محبت کی شراب برساتی آئی۔ اے نُور کی دیوی

تم شام کے دھندلکے میں بادل کے جامے اوڑھے پیا ملن کو نکلتی ہو۔
اور پیا کے گھر سے بھاگ بھاگ آتی ہو۔ اُس کے بعد پھر میکے کی راہ لیتی ہو۔ اے نور کی دیوی۔

پردے کے پیچھے سے دیدار دکھاتی ہو۔ اور ایک ہی نظر سے تمام دنیا کا نظارہ کرلیتی ہو۔ اور اُس کے فوراً بعد پھر خلوت کی پہنائیوں میں کو د جاتی ہو۔ نور کی دیوی۔

زمانے کا یہ راز کسی عقلمند نے فاش کیا ہے کہ پری پیکروں کے لئے اِس عالم جہاں کی آب وہوا ٹھیک نہیں۔ اے نور کی دیوی۔ شاید اِسی لئے تم نے وجود کا پیکر پسند نہیں کیا۔

ہاں اگر تجھے یہ دُنیا نہیں بھائی۔ تو پھر آنکھ مچولی کا کھیل کیوں کھیلتی ہو۔
کون سا ارمان تیرے دِل کے تاروں کو رہ رہ کر مرتعش کر رہا ہے دیوی!

ملالہ تراوِتھ ....

ملالہ تراوِتھ ژہ سالہ پکھنا بو پیالہ مسہ کی برے ہا لالو

خیالہ چاسے مہ دِل چھُ توشن بو مالہ پوشن کرے ہا لالو

نسیمہ بُوزُمم ژہ بالہ دامن کمنہ سیتھ چھک شکار ژھاران

بو شوقہ چانے شکارہ اندر پنُن یہ سر ہیتھ ترے ہا لالو

چھ جل تہ کستوُر سوزہ میانے فراقہ چانکہ یہ سازہ دایان

یہ زیرہ بم کُس ژہ بوزہ ناوی بو بال یدوے مرے ہا لالو

بو شراوِنج ہی فرحہ وَنَن منزُ وچھان رُونس بونیبہ چانے

وُچھت نہ ہا رُک بہار میونوی ون واوہ ہرد نہ ہرے ہا لالو

ژہ ژھایہ روُدک بو ضایعہ کر تھس رُٹھتھ ملالہ و نوی ژہ کم کیا

بو نیرو ژے پتھ کران گدائی بو نو جدائی زرے ہا لالو

مہ چوُنہ سنبراوِہ خونِ دِلہ چے رچھان روزس بو رات راتس

تھویم سنبھالِتھ نشانہ یابت تمے ژہ نالس ہرے ہا لالو

بو نیرہ نِن یاڈِ باوہ لوُگن کُسنہ امارن مہ زاجِ ہن ہن

نہ کھو ژہ پامن کھتھن اولامن نہ کینسہ شترس ڈرے ہا لالو

گمژ ہیرزِل فراق چھا وِتھ دوبارہ آیکھ بو لولہ چانے

وندے اچھن ہند بو گاش یادن دوبارہ لولاہ برے ہا لالو

ونان چھُ ہجور ژہ روشہ پکھنا دماہ بیہکنا تھقاہ کر کھنا

بو پانہ شاہانہ ساز وایمے ترانہ نو نو برے ہا لالو

تمیر ..

ترجمہ:-

آ! بے رخی چھوڑ دے میرے بلاوے پر آ میں تیرے لئے شراب کے پیالے سجا رکھونگی

میرے محبوب تیرے تصور سے ہی میرا ویران دل شاداب ہو اُٹھتا ہے میں پھولوں کے ہار گوندھ رکھونگی

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف

بہ اُمید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

جل اور کستور (پرندے) میرے سوزِ فراق کی شدّت سے نغمہ سرا ہیں۔

یہ سوز و ساز تم کیسے سُن سکوگے۔ اگر میں کھو گئی میرے محبوب۔

میں یاسمین کے پھول کی طرح جنگلوں میں کھلی اور تیرے انتظار میں راہیں تکتی رہی

تم میرے شباب کی بہار نہ دیکھ سکے۔ اب تو میں بادِ خزاں سے مرجھائی جا رہی ہوں

تم مجھ سے چھپے رہے میں کھلا گئی، تم کیوں روٹھ گئے؟ تمہاری بدگمانی کس لئے ہے!

میں تیرے لئے صحراؤں کی خاک چھانوں گی یہ جدائی تو مجھ سے سہی نہ جائیگی اے دوست!

میں نے خونِ جگر کے نگینے چُن رکھے ہیں جنہیں راتوں کو سنبھالتی آئی ہوں۔

میں نے انہیں (اپنی بے قراری کی) نشانی کے طور سنبھال رکھا ہے تم آؤ تو تمہارے گریبان میں سجا دوں۔

میں تو اب برسرِعام کہہ دونگی کہ کس کی آرزو نے میرے جسم کو گھلا دیا ہے۔

میں نہ تو طعن و تشنیع سے ہی ڈروں گی اور نہ ہی کسی ایرے غیرے سے ہی خائف ہو جاؤنگی

مجھ مرجھائی ہوئی نرگس پر تمہارے شوق دید نے دوبارہ نکھار لایا ہے۔

میری آنکھوں کا نور تیرے پاؤں کے صدقے۔ آ ایک بار تجھے پیار تو کر لوں۔

مجور کی تم سے یہی استدعا ہے کہ آدم بھر بیٹھ کے کچھ میری سُن۔ اپنی سُنا۔

میں تیرے لئے بہشت کے ساز بجاؤں گا اور نئے نئے ترانے گاؤں گا۔

ہیرہ بونہ لاگیتھ جامہ وورٗلیے   اَتھ کیا چھُ معانے یکیوک نشان
ناحق خون مادر ایتھ مل ملیے
نُورہ وُزہ ملہ یے پُورہ ہاو پان

تُو نے اوپر سے نیچے تک سرخ پہناوا کیوں زیب تن کیا ہے۔ کہیں تو خون ناحق کا رنگ مل کر اٹھکیلیاں تو نہیں کر رہی ؟

اَنہ گٹہِ ہیم مُسافر وَتہ ڈلہِ یے   مَنزٕ منزٕ چھک تمن تِہ وتھ ہاوان
چانہِ مشالہِ ہُند گاش چھُنہ مولیے
نُورہ وُزہ ملہ یے پُورہ ہاو پان

ظلمتوں میں جو مسافر بھٹک جاتے ہیں اُنہیں تو راہ پر لگا دیتی ہے تمہاری مشعل کی روشنی خریدی نہیں جاتی۔ نورُ کے کوندے۔

تھُو مُرے پیٹھ چھِی نارہِ مشعلیے   گاش ہیتھ کس ژھُنڈان چھکھ زیرہ ژھاران
ژھنپہِ ژھایہِ ہا چھک گنڈان ہا ژلیے
نارہ وُزہ ملہ یے پُورہ ہاو پان

بلندیوں کی آتش پرکالہ۔ تو ہاتھ پر قندیل تھامے کس کی تلاش میں ہے کہیں تو اس بہانے دیپک ناچ تو نہیں ناچ رہی۔ دیوی !

زُلفک ہاٖ یِتھ چھی تہ پیچ ہاِ ملہِ یے   کاریت شوبان مار پیچان
سونہ ہارہ مستہ وانکہ دِل ڈلیے
نُورہ وُزہ ملہ یے پُورہ ہاو پان

زُلفِ جاناں کی طرح تیرے کاکل میں بھی خم پڑے ہوئے ہیں اور یہ لہراتے ہوئے سانپ انوکھی بہار دکھاتے ہیں تمہارے سنہری بال سلیقے سے گوندھے گئے ہیں۔ نورُ کی دیوی پوری طرح سامنے آ۔

بازِ مہجورس کرئی از لہِ یے   سیٔت ہاٖج حصہ تس آئے عِزران
سُورہ پھُل گزرٕ رکھ تنہِ دورٕ پھلیے
نُورہ وُزہ ملہ یے پُورہ ہاو پان

مہجور کی باری کب آئے گی۔ اُس کے ہمدم اُس کا رُتبہ نہیں پہچانتے انہوں نے اُس کے موتیوں کو خاشاک کی قدر دیدی۔ اسے نورُ کی دیوی پورا درشن تو دے۔

●

حُسن دمہ دمہ رنگ بدلاوان   دِل پتھ رنگہ تس پرزہ ناوان
پوش آسے نو نوتہ بلبُل چھُ پرون
بر نو زرہ مدنو دُور یہ چھون

حُسن کے پیکر تو گھڑی گھڑی کے بعد بدلتے رہتے ہیں۔ مگر محبت کی نظریں اُسے ہر حال میں تاڑ لیتی ہیں۔
پھول تو آئے دن شکل بدلتے رہتے ہیں۔ مگر بلبل وہی ہے میرے بالم میں تیری جدائی نہیں سہ سکتی۔

●

تمیر

بہار

دل تمبر لاوان جلوہ ماوان آکھا بہارو
مشہرا ومژہ کتھ یاد پاوان آکھا بہارو
بیہ نندرہ ہتین وزہ ناوان آکھ پرِیک پائیتھ
بیہ زندگی ہند راز باوان آکھا بہارو
بیہ مارِ مندن یاد پاوان چھکتھ مو بتیچ چال
بیہ رُوشِس متین منہ ناوان آکھا بہارو
بیہ مُود متین زندگی ہند جامہ ولان آکھ
بیہ داد لدن سنبہ لاوان آکھا بہارو
بخشت تہ آرن آبشارن دردہ سوزک ساز
افسانہ لولک ونہ ناوان آکھا بہارو
بیمار لگ مُژ گردہ کھیا مژ آس یمبرزل
مس کھائس تس کت باگہ راوان آکھا بہارو
دُن کیُن چھہ چونی راج تہ کُن کُل چھہ تاران راج
قانون ینہ ئی مانہ راوان آکھا بہارو
چھۓ ینگہ گتین آیہ زبان جانہ ورشنہ ہیت
لُرین تہ دلن پھولہ راوان آکھا بہارو
چھُئی رنگ پانس ہیت نارہ پانہ چھکہ بے رنگ
رنگہ رنگہ چمن رنگہ ناوان آکھا بہارو
غارن شسیدن مندرن ینزو تہ ہیہ تہ چھلن
شیخن تہ سادن خمہ ناوان آکھا بہارو

تعبیر

ترجمہ:-
دل کو بھاتے اور جلوے بکھیرتے ہوئے بہار آگئی ہے۔
بیتی ہوئی باتیں پھر سے یاد آنے لگی ہیں۔
پچھلے سال کی مانند اب کے بھی نیند کے ماتوں کو بیدار کرتی آئی ہے۔
اور پھر سے زندگی کے راز افشا کرتی ہوئی بہار آگئی ہے۔
تم نازنینوں کو پھر خرام کے انداز سکھا رہی ہو۔
اور روٹھے ہوئے دلوں کو منا رہی ہو۔
تم پھر نیم جانوں کے تن پر زندگی کے لباس سجا رہی ہو۔
اور دُکھی دلوں کو پھر سے سنبھالا دے رہی ہو۔
تم نے ندیوں اور آبشاروں کو پھر سے زندگی کا نغمہ سنج بنا دیا ہے۔
اور پھر سے ان کی زبانی پریم نگر کے فسانے بیان کرنے لگے۔
نرگس تو پژمردہ ہو کر خاک آلودہ ہو گئی تھی۔
اُس کے لئے تو امرت کے خم لنڈھاتی ہوئی آئی۔
اب تو تمہارا ہی راج ہے اور گلشنوں میں تیرے ہی نام کا سکہ رواں ہے۔
سارے جگت میں تمہارا ہی تمہارا قانون جاری ہے۔
بے زبان تمہاری آمد کی وجہ سے دولت نطق سے مالا مال ہوگئے۔
غنچوں اور دل کے شگوفوں کو چٹکاتی بہار آگئی۔
تمہارے ساتھ نکہت و نور کے طوفان ہیں۔ مگر خود کسی رنگ میں رنگی نہیں ہو۔
اور پھر بھی تو طرح طرح کے چمن زاروں کو طرح طرح کے رنگوں سے سجا رہی ہے
غاروں، مسجدوں اور مندروں میں بھی تمہاری تابانی کی شعاعیں پہنچ ہی گئیں
اور اب تو زاہد اور پارسا بھی دیوانگی کے نشے سے چور ہو رہے ہیں۔

لوکہ چار

بازکہ تھئی ژول کھا بازی گا روہو
نوبہارو میانہ لوکچارو ہو

میون یاوُن کھسےؤن ہارشراوُن   جلوہ ہاوُن تہ عالم تنبہ لاوُن
بوش پوشن ژود دوہ نارو ہو
نوبہارو میانہ لوکچارو ہو

میون لوکہ چار خواباہ اوس مزہ دار   کھیوم افسوس یامت گوس بیدار
تی بو وچھہ ہا بیہ دوبارو ہو
نوبہارو میانہ لوکچارو ہو

میون لوکہ چار باغک جانا دار   پوشہ لنجہ بیٹھ بولان خوش گفتار
تیر مولائے میرشے کارو ہو
نوبہارو میانہ لوکچارو ہو

میون لوکچار شولہ ؤن اوس گلزار   شلہ فلمت آس نتھہ گل انار
واوہ ہردنہ گوس لورہ یارو ہو
نوبہارو میانہ لوکچارو ہو

میون لوکچار ژلہ ؤن آب زبار   گو نیرتھ پھیرتھ ین چھہ دُشوار
کولہ رادن دود یہ سبزارو ہو
نوبہارو میانہ لوکچارو ہو

ہجور س یاد پیو آدنک یار   مُت یاوُن رُدُس ژھٹھ لوکچار
متو ژلتم آدنمہ یارو ہو
نوبہارو میانہ لوکچارو ہو

تیر

ترجمہ:-

تو مداری کی طرح تماشا دکھا کر رخصت ہو گیا۔
اے میری بہارِ رفتہ - میرے بچپنے !

میرا شباب اوائل بہار کے جوبن کی طرح تھا - جس میں جلوہ گری بھی تھی اور جہاں کو لبھانے کی ادا بھی۔
پھولوں کی یہ بہار چار دن کی چاندنی تھی۔
اب تو میرا بچپنہ قصۂ پارینہ ہے۔

میرا بچپن ایک خوش آئند خواب تھا - جب میں اس خواب سے بیدار ہوا، تو میں نے افسوس سے ہاتھ ملے۔
کاش میں ایک اور بار اس خواب کا لطف لے سکتا۔
میری بہارِ رفتہ - میرے بچپنے !

میرا بچپنا ایک چہکتا ہوا پرند تھا - جو شاخِ گل پر نغمہ ساماں تھا۔
تقدیر کے شکاری - کاش تو ناوکِ ستم نہ آزماتا۔
آہ میری نوجوانی - میری بہارِ رفتہ۔

میرا بچپنا آتشِ گل سے دہکتا تھا - اس باغ میں انار کے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔
بادِ خزاں نے اس کے حُسن کو تہس نہس کر ڈالا۔
آہ میری نوجوانی - میری بہارِ رفتہ۔

میرا بچپنا طوفانی ندی کا اُبال تھا - آ کر کہیں چلا گیا - اب واپس نہیں آ سکتا
ساحل کا یہ سبزہ دھوپ سے جھلس گیا۔
میری بہارِ رفتہ - میرا بچپنا۔

مہجور اپنے بچپنے کے دوست کو یاد کر رہا ہے - اس کا جوش شباب - آہ اس کا بچپن کہاں گیا۔
نہ جا - نہ جا - میرے محبوب
میری بہار - میرے شباب۔

غیر مطبوعہ تخلیقات

اس عنوان کے تحت مہجور کی وہ تخلیقات پیش
کی جا رہی ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے ان کی زندگی میں شائع ہونے سے
رہ گئیں۔ ان میں وہ تخلیقات بھی شامل ہیں، جو مہجور کے
دورِ مشق کی یادگار ہیں۔ اور جنہیں انہوں نے ارادتاً شائع نہیں
کرایا۔ اور وہ بھی جو بغیر کسی ارادے کے شائع ہونے سے رہ گئیں۔
مہجور کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے کے لئے ان ابتدائی کاوشوں
کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(ادارہ)

نالۂ مہجور

اے صبا رفتارِ پیکِ خوش خرام ـہ اے امینِ لعلِ دُرِّ ہائے کلام
اے بقائے مایۂ صبر و قرار ـہ اے تحمل بخشِ مرغِ دلفگار
اے امانت دارِ یارِ مے فروش ـہ اے خریدارِ دلِ گُم کردہ ہوش
اے شفائے دردِ جان و رنجِ تن ـہ اے قوئ ہمرازِ من دمسازِ من
اے انیسِ خلوتِ دلدادہ گاں ـہ دستگیر و مونسِ افتادہ گاں
اے نگاہت مرہمِ زخمِ جگر ـہ در لبانت نوش دارد سر بسر
اے پیامت رخنہ سازِ عقل و ہوش ـہ عقلِ ظاہر بین و ہوشِ حق فروش
زندگی بخشِ سقیم جاں بلب ـہ وے علاجِ نالہ ہائے نیم شب
رہ نوردِ منزلِ جانانِ من ـہ اے فدائے گردِ راہت جانِ من
غم ربائے عاشقِ شوریدہ سر ـہ اے سبک رفتار از بادِ سحر
محرمِ کوئے نگارِ دلنواز ـہ اے سبق آموزِ دیوانِ نیاز
آشنائے لذتِ دردِ فراق ـہ اے قوئ غواصِ بحرِ اشتیاق
عندلیب و ہُدہُد و شہبازِ من ـہ طوطئ شکر زبانِ جادو شکن
ماہرِ اسرارِ شانِ سروری ـہ رازدانِ شوکتِ پیغمبری
صد ہزاراں گُل زگلشن چیدۂ ـہ زیرِ جامہ باغ ہا پوشیدۂ
سنگر افگن شوکتِ بحرِ عشق ـہ شور شے پیدا کُن اندر شہرِ عشق
یادِ گُل دِہ بُلبُلِ دیوانہ را ـہ لذتِ سوزشِ دلِ پروانہ را
اہلِ کشمیر را قوتِ پرواز دِہ ـہ طاقت از دست رفتہ باز دِہ
اے خوشا روزیکہ آئی سوئے من ـہ ہمچو بادِ نوبہار اندر چمن
سر کنم گر داستانِ ہجرِ یار ـہ ختم نتواں گشت تا روزِ شمار
از وصالش ماندہ ام مہجور و دُور ـہ کے رسد جانم بداں دارا السرور
گرچہ مہجورم ز مہجوری چہ غم ـہ بُلبُلِ از بوستانِ شاہدم
عاشقاں را دین و ایماں یادِ دوست ـہ بہتر از ذکر و عبادت نامِ اوست

ہاں بیا اے طائرِ عرشِ آشیاں
دہ بمن پیغامِ یارِ دلستاں

گلِ ویرانہ

چوش سوے سیرِ صحرا شد خیالم راہبر
مثلِ مجنون رہ نوردِ دشت گشتم بے خطر

درمیانِ کوہ و صحرا بر سبیل آمد مرا
رشکِ گلزارِ ارم یک بوستانے در نظر

ہر طرف رنگین بہار و سبزہ زار و جوئبار
نغمہ خوان بر شاخ گلبن عندلیبِ خوش مقر

در چمن گلہائے گوناگون بصف آراستہ
وز پئے انجامِ خدمت باغبانان بستہ کمر

گر گلے پژمردہ گردد از تموزِ آفتاب
باغبان اورا کند سیراب از خونِ جگر

گرد آلودہ شود گر چہرۂ گل ناگہان
میکند سرشوئے او از آبِ دیدہ زود تر

الغرض از لطف و مہرش ہر گل خورد و کلان
پر ز آب و تاب بر فرشِ گلستان جلوہ گر

از سمومِ حادثاتِ دہر و ز بادِ خزان
ایمن و بے باک و بے غم ماندہ ہر گل ہر شجر

چون شدم فارغ ز سیرِ گلشنِ جنت نما
جانبِ ویرانہ رفتم شاد و خورم بیشتر

تا بحدے کز نظر غائب شدہ آن باغِ ارم
چون رسیدم دامنِ کہسار بے خوف و خطر

نے درخت و سنبلے نے خار در وے نہ گلے
نے دگر چیزے بغیر از سبزہ و خاک و حجر

لیک از خوشبو معطر شد دماغم ناگہان
خیرتم شد از وقوعِ ماجرائے طرفہ تر

در تگ و دو جستجو کردم یمین و ہم یسار
یکطرف در گوشۂ دیدم گلے مثلِ قمر

چاک دامن خاک بر تن روے زرد و سر نگون
چہرۂ نازک گرفتہ صورت و شکلِ دگر

از شمیم عطر بارش خاکِ ویرانہ شدہ
تازگی بخشِ دماغ مانندِ صحرائے تتر

ذرّ تحیر او فتادہ پایِ رفتارم نماند ؎ ایستادم پیشِ گل با آہِ سرد و چشمِ تر
گفتمش ای شاہدِ رعنای گلزارِ ارم ؎ وے ز گلہائے جہاں از رنگ و بو والا گہر
اندریں وادی است باغے رشکِ فردوسِ بریں ؎ ہر گل او ایمن و بے خوف و محفوظ از ضرر
صد ہزاراں گل درد بے وصف تمکیں یافتہ ؎ با چنیں خوش رنگ و نکہت تو دریں حال بتر
چوں بگوشِ گل رسید ایں نالۂ ہمدرد خویش ؎ پارہ پارہ گشت و بیرون آمدش لختِ جگر
از زبانِ حال با من پند داد و دُر فشاند ؎ با بحکمت مخزنِ اوراک را بکشاد در
گفت اے مہجور از نیرنگئ چرخِ کہن ؎ نیستی آگاہ؟ ندانی؟ حیلۂ ایں حیلہ گر
خار و خس در صحنِ گلشن لالہ اندر کوہسار ؎ سینۂ او داغ دار از کس مپرسی خم کمر
سگ درون قصرِ شاہی مست بر فرشِ حریر ؎ شیرِ نر در غارِ کہنہ بر زمین افکندہ سر
شکوۂ جورِ فلک پامال مضمونِ قدیم ؎ ترک کُن بیں سوی خود ای صاحبِ علم و ہنر
حضرت انساں کو لافِ انا الحق میزند ؎ مے شمارد ذاتِ خود را از ملک پاکیزہ تر
لیک در تنظیم انساں ایں تماشا دیدہ ام ؎ عاقلے محتاجِ لطفِ ابلہ شوریدہ سر
در تمیزِ خویش و بیگانہ دریں دیر و کہن ؎ گُل شمارد خار را خر مہرہ پندارد گہر

چوں ندانی قدرِ جنسِ خویش اے بسیار گو
تو چہ دانی قدرِ گل روداستاں کُن مختصر

ماسٹر جی

●

پوشہِ مُتِ پرواز فرماؤ وقتِ کار
پوشُ اُنمس نذر پرتھ شعرس اندر
پوشہِ مؤت مہجورؔ گو واصِل بہ حق

پوشس ژٔ ہیتھ یام وُدنِ آیوُو بہار
از کرن گُل پوشس مہجورنس مزار
"ہائے کشیرِ مک سُخنداں"! (کر شمار)
تاریخ وفات ۱۳۷۱ھ

(مرثیہ کے چند شعر)

میں کون ہوں؟

مخمس اردو

گلزارِ کاشمیر کا سروِ خمیدہ ہوں   صحنِ چمن کا سبزۂ دامن کشیدہ ہوں
خاموش مثلِ غنچۂ خاطر کبیدہ ہوں   نے بلبلِ چمن نہ گلِ نو دمیدہ ہوں
میں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں

ہر روز رنج و سوز سے رہتا ہے دل فگار   ہر شب میں شمع کی طرح روتا ہوں زار زار
ہر آں میری جان ہے مصائب کے زیر بار   ہر شام مثلِ شام میں ہوں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

آتے ہیں دور دور سے رندانِ خوش خرام   ہو مستِ بادہ اور میں رہتا ہوں تشنہ کام
اپنی کمی و غیر کی بیشی پہ صبح شام   گریاں بشکلِ شیشہ ہوں خنداں بطرزِ جام
اس میکدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں

ناواقفِ حیات و ممات اور گرم و سرد   نا آشنائے فرقِ سفید و سیاہ و زرد
پوچھو رسن، یہ نکتہ اقبالِ نیک مرد   میں کیا ہوں اور کون ہوں سودا بقولِ درد
جو کچھ بھی ہوں میں سو عرض آفت رسیدہ ہوں

علاقہ چھراٹ

مُلکِ کشیرس اندر بھود شان کیا تھاوان چھراٹ
دُنیاہس اندر چھُ جنّت یاد اَسہ پاوان چھراٹ

خوش یِئومن آب و ہوا مُردن چھُ بخشان زندگی
زندگی ہیند راز باوان نیندرِ وُزہ ناوان چھراٹ

خلق خوش مہمان نوازی، خوش تمیزی خوش دِلی
رُت پکُن انسانیت لُکن چھُ ہیچھہ ناوان چھراٹ

یِم صِفت سارِی شُبان اَسس مگر اکھ عیب چھُس
علمہ کِس دربارس اندر ناومندہ چھاوان چھراٹ

عِلمہ کِس باغس چھِہ وقتس پیٹھ پھولان گُل بے شمار
اڈہ پھولہٕنئ پوشہِ لُٹرین برہ کرہ ناوان چھراٹ

دُورِہ جایہ از پوان استاد چھی ہاوان ژہ وَتھ
ازکہ برونہہ اوس دُورِہ کن یژکال وتھ ہاوان چھراٹ

یِم پیتھر کمرِ ور آس تِم علمہ سیٖت کھٕت آسمان
غفلتچہِ بجہ لیغرِ تل پننین پکن ساوان چھراٹ

(ناتمام)

۱ے تحصیل پلوامہ کا وسطی علاقہ

گرلز سکول

آو صُبحک واو توشان خوش خبر ہیتھ بلبلن — علمہ کِس باغس بہار آو پوشہِ کھترہ سارے پھولن

پوشہ وارِین پھیرہ سبزی نیرہ سورگوی آمہ ناوُ — ہوشہ ڈلِمت سنبلن بیمار گامُت دِل بلن

درس گاہ علمک یہ گھرہ خوش یوُن باغاہ چھُہ جان — کھترِین یتہ پوشہ ڈرین گاش ییہ یمبرزلن

ہیہ پوشکِ پاٹھہ کنڈ یوس باغ چھاون رُت دوُ — گاٹہ جارک سُرمہ لاگن شرمہ ہیند پوڈر ملن

داو صُبحک ۔ مدرسک اُستاد دوبہ وسے کاٗرِ گرہ — داوُ پھولہ ناوان گُلن ۔ استاد پھولہ ناوان دِلن

سانہِ مُلکُک کورہِ مدرسہ زن پوستانک سکول — شوقہ سان ونہ وان زن یمہ ورِگنہ منز آرہ ملن

آسمانس زوُنہ نکھہ تل کرِژہ مُلہ تراوان گاہ — مدرسس منز کورہ بولان مارہ زن ہیپٹہ رالین

کر دُعا مہجورہ پتہ وتھہ پھولوُن روزِن یہ باغ
باغوان رُوزِن سلامت تازہ گی پوشن گُلن

عا ثریا

قطعاتِ تاریخِ وفات

کشمیر کے مشہور و معروف و مقبول عام مُغنی اور خود مہجور کے بہت محبوب موسیقار غلام محمد بٹ المعروف محمود شہری کی جواں مرگی پر :-

کاشُر کوستوُر محمود شہری	کاشرہ گیونک پُرہ اوستاد
ارمان آسہ نقوشِ نمُ تِرہ دہری	گُل دوپہر اوس شُلہِ آس ناد
کاشُر سازن وون ظہر بہری	کاشُر باظہِ آسہ بوُز تاریخ
ژالہِ مہجورُن محمود شہری	بس یہی سنہ تھاو ہجری یاد

۱۳۵۶ھ (۱۹۳۷ء)

•

انقلابی شاعر اور اپنے معاصر عبدالاحد آزاد کی جواں سال اور بے وقت موت سے متاثر ہو کر :-

کاشرین ہندہ زِلمہ اد بگ باغ از برباد گو

باغ وُچھنے حسرتاہ ہینتھ باغوول شنداد گو

سرفدا کور باغوانن دراو اوہ سالِ وفات

بولہ دِن زن بُلبُلا تراوتھ چمن آزاد گو

۱۳۶۵
+۲
۱۳۶۷ھ (۱۹۴۸ء)

دیگر فارسی میں

آہ آزاد از جہاں روپوش شد	یا کہ از جام بقا مدہوش شد
گفت مہجور از پئے سالِ وفات	بُلبُلِ شیریں بیاں خاموش شد

۱۹۴۸ء

تعمیر

علامہ اقبال رح کی وفات حسرت آیات کی خبر سُن کر بے اختیار زبان سے نکلا اور اسی سے سالِ وفات بھی بر آمد ہوا :-

آہ اقبال آفتاب آسمان شاعری

۱۳۵۷ھ

•

ایک شعر

شاہ بادہ میر اوس یاد کران قندہ ہارُیح زُون سے

تس کو نہ ژیتس اُس پیوان ژندہ ہارُیح زُون سے

نوٹ :- یعنی رسول میر شاہ آبادی اپنے شعروں میں "ماہِ نخشب" (جس کو کشمیری میں قندہ ہارُیح زُون کہا جاتا ہے) اکثر استعمال کرتا تھا۔ اُس کو موضع ژندہ ہار کی زُون (جو کہ حبہ خاتون کا اصلی نام تھا) یاد کیوں نہ آتی تھی ؟

رام لال کھوریہ
چیف کنزرویٹر آف فارسٹس

(ترقی کے منصوبے)

زمین کا کٹاؤ اور اس کے بچاؤ کے طریقے

سطح زمین جو اس قدر ناہموار معلوم ہوتی ہے۔ پانی کے بہاؤ سے اور ریگستان میں زور کی ہوا سے بھی بہت حد تک بدلتی رہتی ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ بارش گرنے یا برف پگھلنے پر جب پانی بہتا ہے تو اپنے ساتھ باریک مٹی کی تہہ اور زمین میں پائے جانے والے کیمیائی اجزاء کو جو پانی میں جلدی حل ہو جاتے ہیں بہا کر لے جاتا ہے۔ اسی وجہ سے تو پانی کا رنگ بھی مٹیالا ہو جاتا ہے۔ جس جگہ زمین کی ڈھلوان زیادہ ہو وہاں لازماً پانی تیزی سے بہتا ہے۔ اور اپنے ہمراہ نہ صرف زیادہ مقدار میں مٹی کو گھسیٹتا ہے بلکہ ریت، کنکر اور پتھر کے چھوٹے موٹے ٹکڑوں کو بھی بہا لے جاتا ہے۔ ناہموار کھیتوں میں جن کی اوپری سطح ہل چلانے کی وجہ سے نرم اور ڈھیلی پڑ گئی ہوتی ہے مٹی اور بھی زیادہ مقدار میں بہہ جاتی ہے۔ اُن کی ڈھلوانوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر چھوٹی چھوٹی دراڑیں (یعنی نالیاں) سی بن جاتی ہیں۔ انہی نالیوں میں سے گدلے یعنی مٹی آمیز پانی سے نالے اور بعد میں دریا بنتے ہیں۔ بڑی نالیوں اور نالوں میں بارش کے دوران بہت زیادہ مٹی۔ کھاد۔ ریت۔ کنکر اور پتھر بہتے ہیں۔ جو سیلاب کی صورت اختیار کر کے نشیبی علاقوں میں بہت زیادہ نقصان کا موجب بن جاتے ہیں۔

اس کے برعکس عقلمند انسان سمجھ سکتے ہیں کہ جن علاقوں میں زمین ہموار ہے۔ جیسے کہ میدانی علاقے یا ایسی ڈھلوان زمین جو جھاڑیوں اور گھاس پھوس سے ڈھکی ہوئی ہو جیسے کہ جنگلات یا ایسی زیر کاشت زمین جس کی مناسب طریق Terracing یعنی بٹ بندی کی گئی ہو بالعموم بارش کے دوران محفوظ رہتی ہے کیونکہ ایسی زمینوں میں پانی زیادہ تر جذب ہو جاتا ہے۔ اور بہت کم پانی زمین کی سطح پر بہنے لگتا ہے۔ کیوں کہ جڑوں اور پتوں کی بدولت یا بٹ بندی کی وجہ سے پانی آہستہ آہستہ بہتا ہے اور تیز بہاؤ کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ زمین کی زرخیزی کا مادہ بہنے نہیں پاتا۔ اور اس کا مکمل بچاؤ رہتا ہے۔ ندی نالوں تک بھی پانی دھیرے دھیرے پہنچتا ہے۔ اور سیلاب شدت نہیں پکڑتا جس سے میدانی علاقوں میں نقصان نہیں ہونے پاتا۔ اس کے علاوہ زمین اچھی طرح رچ جانے کی وجہ سے زیادہ عرصہ تک نمدار رہتی ہے۔ جو گھاس پھوس اور فصلوں کے لئے نہایت مفید صورت ہوتی ہے۔ ندی نالوں میں پانی کا ذخیرہ مناسب رہتا ہے۔ اور سال بھر بہتا رہتا ہے۔ اس طرح ندی نالے خشک بھی نہیں ہونے پاتے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاں زمین کے کٹاؤ کو روکا نہ جائے تو حالات دن بدن خراب ہو جاتے ہیں۔ جنگلوں یا فصلوں کی پیداوار روز بروز کم ہو جاتی ہے۔ اور ندی نالے زیادہ تر خشک رہتے ہیں۔ بارش کے دوران میں سیلاب شدت اختیار کرتے ہیں۔ اور زراعت اور مال مویشی کے نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ پانی کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ آب ہوا شدید صورت اختیار کرتی ہے۔ یعنی گرمیوں میں بہت گرم اور سردیوں میں بہت سرد ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ مدتوں کے بعد زمین ریگستان کی صورت اختیار کرتی ہے۔ جہاں انسان کی رہائش مشکل بن جاتی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ دنیا کے ریگستان فطرت سے زیادہ انسان کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ مہذب انسان کو آئندہ کے لئے احتیاط کرنی

چاہیئے۔

عوام اس بات سے واقف نہیں کہ زمین کی سب سے اوپر کی سطح جس کو سائل (Soil) کہتے ہیں ایک ایسی اہم چیز ہے کہ فصل یا ہر قسم کی نباتاتی پیداوار کا دارو مدار اسی پر ہے۔ اس کی چند انچ موٹائی کو پیداوار کے لئے موافق بننے میں صدیاں لگتی ہیں۔ مگر انسان کی لاپروائی اور عاقبت ناشناسی سے زمین کی طاقت پیداوار زائل ہو جاتی ہے۔ اور ہر قسم کے فصل کی پیداوار کمزور پڑ جاتی ہے۔ سائنسدانوں کا تجربہ ہے کہ زمین کے کٹاؤ ایک ایکڑ زمین میں سے سالانہ کئی ہزار من مٹی اور کھاد ضائع ہو جاتی ہے۔

غیر مہذب یا کم ترقی یافتہ ملکوں میں زمین کا کٹاؤ صدیوں سے جاری ہے۔ ان کی اقتصادی حالت روز بروز خراب ہو رہی ہے۔ اس کے برعکس ترقی یافتہ ممالک میں زمین کے کٹاؤ کو قطعیً روک لیا گیا ہے۔ چنانچہ وہاں زمین سے پیداوار پوسٹ طور پر حاصل کی جا رہی ہے۔ ان ملکوں میں سوچ سمجھ کر زمینوں کو اناج اگانے یا گھاس چارہ حاصل کرنے کے لئے الگ الگ مخصوص کیا جاتا ہے۔ مثلاً جو زمین ہموار یا ۵ درجہ تک ڈھلوان ہو وہاں کھیتی باڑی کرنے کی اجازت ہے۔ ۵ درجہ سے ۲۵ درجہ ڈھلوان والی زمین میں اگر کھیتی باڑی مطلوب ہو۔ تو اس پر لازماً Terracing یعنی مرٹ بندی کی جاتی ہے۔ تاکہ زمین کا کٹاؤ ہو جانے یا کھاد ضائع ہونے کا امکان نہ ہے۔ ۲۵ درجہ سے زیادہ ڈھلوان زمین پر کاشت کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اور جو زمین قابل زراعت نہ ہو اس میں سے موزون رقبوں میں گھاس چارہ پیدا کیا جاتا ہے اور باقی ماندہ پر جنگل اگائے جاتے ہیں۔ اس طرح ذرہ بھر زمین بیکار رہنے نہیں دی جاتی اور نہ ہی ملک کی زمین کو کسی طرح سے کمزور ہونے دیا جاتا۔

سائنسدانوں نے تجربہ سے یہ بھی ثابت کر دیا ہے۔ کہ مسلسل چرائی سے زمین کی گھاس یا درخت پیدا کرنے کی قوت ضائع ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جس زمین میں چرائی بند کرائی جائے۔ وہاں زمین کی حالت سدھر جاتی ہے۔ اور گھاس چارہ اس افراط سے پیدا ہوتا ہے کہ مویشیوں کے لئے پہلے سے کئی گنا زیادہ چارہ مہیا ہو جاتا ہے بعض حالات میں کچھ زمین مال مویشی کے چرنے کے لئے کھلی رہتی ہے اور باقی بند مناسب یہ ہے کہ زمین کے مختلف قطعات کو بدل بدل کر زمین کی زرخیزی کو قائم رکھا جائے۔

ہمارے اپنے ملک میں بھی کوئی پچاس سال سے زمین کو کٹاؤ سے بچانے کی تدابیر کی گئی ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر میں تقریباً ۱۵-۲۰ سال سے اس طرف قدم اٹھایا گیا ہے۔ خاص توجہ پہلے پانچ سالہ منصوبہ کے تحت دی گئی ہے۔ جبکہ تقریباً چالیس ہزار ایکڑ رقبہ کو ہاتھ میں لایا گیا تھا۔ اور تقریباً ۱۰ لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔ اور اب دوسرے پنجسالہ کے تحت بہت بڑے پیمانے پر کام شروع کیا جا رہا ہے۔ اس کام کے لئے تقریباً ۳۶ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔ اور بہت زیادہ نئے رقبوں کو زیر کار لایا گیا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل علاقوں کو پہلے زیر کار لایا جا رہا ہے۔

(۱) صوبہ جموں میں علاقہ کنڈی کے تمام رقبوں کو جو دریائے راوی سے دریائے چناب اور دریائے مناور توی تک واقع ہیں۔ اس میں سے تقریباً ۲۵ فیصدی رقبہ کو کٹاؤ سے بچانے کی صورت پیدا کی گئی ہے۔ تاکہ اس علاقے کے ندی نالوں سے جموں پٹھانکوٹ کی سڑک راوی و اوجھ کی نہر اور نیچے کی زرخیز زراعتی زمینوں کو نقصان سے بچایا جا سکے، اور وہاں کے کنوؤں اور نالوں میں پانی بآسانی اور سال بھر دستیاب ہو سکے۔ گذشتہ دس پندرہ سال کے تجربے سے پایا گیا ہے۔ کہ جہاں جہاں جنگلوں کی روک تھام کی گئی ہے۔ اور بکری کے چرنے پر پابندی لگائی گئی۔ نتیجے خوشگوار اور کامیاب رہے ہیں۔ گھاس چارہ بکثرت مہیا ہو رہا ہے۔ اور کنوؤں، نالوں میں پانی بڑھ گیا ہے۔

(۲) جموں سے سری نگر شاہراہ کی حفاظت کے لئے بھی اودھم پور سے بانہال تک سڑک کے دونوں طرف ٹرنچیں Trench یا Ditches یا پلیاں گرتی ہیں۔ وہاں پودے لگا لگا کر اور کہیں کہیں پتھر کی دیواروں سے گرتی ہوئی پہاڑیوں کی روک تھام

کی گئی ہے۔ تاکہ آمد و رفت کے لئے سڑک محفوظ رہے۔

(۳) کشمیر کی وادی میں چرار شریف کے مقدس مقام کے ارد گرد کی زمین میں کٹاؤ کی حالت نہایت تشویشناک تھی۔ گذشتہ بارہ پندرہ سال سے یہاں لاکھوں پودے لگا کر سینکڑوں ایکڑ زمین کو بڑھتے ہوئے کٹاؤ سے بچا لیا گیا ہے۔ اور گہرے نالوں میں مصنوعی بند ڈال کر خطرے کو بہت حد تک کم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سری ٹنگ اننت ناگ۔ مٹن۔ عشں مقام۔ شنکر آچاریہ پہاڑی۔ قلعہ ہاری پربت۔ ملہار۔ گاندربل۔ بانڈی پورہ۔ بابا شکردین کی ڈھیری۔ ڈٹلب۔ وارپورہ۔ لولاب ہونڈ تحصیل بارہ مولہ میں بھی ننگی پہاڑیوں پر درخت اُگائے جا رہے ہیں۔ اور دریائے پہرو کی وادی میں زمین کے کٹاؤ کو روکنے کے لئے خاص اقدام زیرِ عمل ہیں۔ نالہ رمبہ آرہ شوپیان اور نالہ برنگی میں بھی ایسی تدابیر زیرِ غور ہیں۔ تاکہ دریائے جہلم میں آئے دن جو سیلاب آتے ہیں اور شہر سرینگر کے لئے خطرناک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی روک تھام ہو سکے۔

(۴) ضلع لداخ میں کرگل کے نزدیک دریائے سورو سے اور رلہ کے نزدیک دریائے سندھ سے زراعتی زمینوں کو نقصان پہنچا ہے۔ اس کی روک تھام کے لئے باضابطہ تار اور پتھر کے کریٹ یعنی بندھ باندھے گئے ہیں۔

(۵) اس کے علاوہ تحصیل بسوہلی، رام نگر، ریاسی۔ راجوری اور ضلع ڈوڈہ میں جگہ جگہ زمین کے کٹاؤ کی روک تھام کی تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ غرضیکہ تمام ریاست بھر میں یہ کام زوروں پر ہے۔ اور جہاں نمایاں کامیابی ہو رہی ہے۔ لوگوں میں خود بھی اس طرف شوق پیدا ہوتا جاتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ زمیندار لوگ خاص کر کشمیر ویلی اور ڈوڈہ ضلع کے یہ محسوس کریں کہ زیادہ ڈھلوان پر جو کاشت کی جاتی ہے وہ قومی خودکشی کے برابر ہے۔ بہت زیادہ ڈھلوان پر یعنی ۲۵ درجہ سے زائد پر کاشتکاری ہونی ہی نہیں چاہیئے۔ یہاں موزون قسم کے درخت خواہ پھلدار ہوں یا دوسری قسم کے اُگانے چاہیں، یا گھاس چارہ پیدا کیا جانا چاہیئے اور متوسط درجہ کی ڈھلوان پر باقاعدہ بٹ بندی ہونی ضروری ہے۔ اس غرض سے لوگوں کو ہر تحصیل میں ایک ایک بھی قائم کیا گیا ہے۔ تاکہ اس کی نقل کر سکیں۔ اگر لوگ پھر بھی اس طرف توجہ نہ دیں تو قانونی طور پر یعنی L. P. Act کے تحت کاروائی کرکے روک تھام کرنی لازمی ہوگی۔ اُمید ہے لوگ اپنے اور ملک کے مفاد کو مدنظر رکھکر پورا تعاون کریں گے۔ تاکہ بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ساتھ زمین کی پیداوار کی تدابیر کو بھی عملی جامہ پہنایا جا سکے، اور ہمارا ملک ترقی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔

(بشکریہ ریڈیو کشمیر سری نگر)

آہ مہجور

مرزا عارف (مرثیہ کھچینہ شعر)

روشہ کوٹ ژول پوشہ موٹ دلدار میون
ہوشہ ڈولن پوشہ ہوٹ گلزار میون

مرگھا موتو صبر کرہک اگر
مجلیہ چھل ہیٹ واتہی دلدار میون

محبنہ والنس لولہ کھاشین مس بھرت
بُستر لب مہجورِ خوش گفتار میون

عارفو مہجور کُن ما ڈُودہ گو
زالہِ موتک پردہ درد ک نار میون

انتخابات — ایک نظر میں

(تعمیر کے نمائندہ خصوصی کے قلم سے)

نئے آئین کے تحت مجلس قانون ساز کیلئے گذشتہ ماہ مارچ میں جو انتخابات عمل میں لائے گئے، ان میں نیشنل کانفرنس کو ٹھوس اکثریت حاصل ہو گئی ہے۔ ابھی تک ضلع لداخ کی دو نشستوں اور ضلع ڈوڈہ کی پانچ نشستوں کے لئے انتخابات عمل میں نہیں لائے گئے ہیں۔ بہت جلد ان اضلاع میں بھی انتخابات عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ اس وقت تک پارٹی پوزیشن یہ ہے۔

نیشنل کانفرنس — ٦١
پرجا پریشد — ٥
ہریجن منڈل — ١
آزاد اُمیدوار — ١

نئے منتخب شدہ ممبران کے اسمائے گرامی اور حلقہ ہائے انتخاب ذیل میں دئے جاتے ہیں۔

نام اُمیدوار	حلقہ انتخاب صوبہ کشمیر	جماعت
جناب بخشی غلام محمد	صفاکدل	نیشنل کانفرنس
خواجہ غلام محمد صادق	گنکی پورہ	〃 〃
پنڈت شیام لال صراف	امیراکدل	〃 〃
شری ڈی۔پی۔ دھر	حبہ کدل	〃 〃
میر واعظ غلام نبی ہمدانی	رعناواری	〃 〃
پیر یحییٰ شاہ	حضرت بل	〃 〃
عبدالرحمان بٹ	خانیار	آزاد اُمیدوار
بخشی عبدالرشید صاحب	چرار شریف	نیشنل کانفرنس
میر غلام محمد میر سجن	دریگام	〃 〃
عبدالرحمان راحت	خانصاحب	〃 〃
سید علی شاہ صفوی	بڈگام	نیشنل کانفرنس
سید عبدالقدوس آزاد	بیروہ	〃 〃
میاں نظام الدین	کنگن	〃 〃
صوفی غلام احمد	گاندربل	〃 〃
سید میر قاسم صاحب	ڈورو شاہ آباد	〃 〃
میر سید حسین	برنگ نوبگ	〃 〃
شری منوہر ناتھ کول	کوکرناگ	〃 〃
مسٹر شمس الدین	اننت ناگ	〃 〃
مسٹر نورالدین ڈار	کھاور پارہ	〃 〃
مسٹر غلام احمد میر سلر	دچھن پارہ	〃 〃
مسٹر غلام محمد بٹ	کیموہ	〃 〃
مسٹر عبدالکبیر وانی	کولگام	〃 〃
مسٹر عبدالعزیز زرگر	ڈاڈہ سر	〃 〃
مسٹر غلام حسن خان	نارہ واو	〃 〃
مسٹر عبدالمجید بانڈے	شوپیاں	〃 〃
مسٹر عبدالغنی ترالی	ترال	〃 〃
میر غلام محمد راجپوری	راجپورہ	〃 〃
ماسٹر ثناء اللہ	پلوامہ	〃 〃
پیرزادہ غلام جیلانی	پانپور	〃 〃
مسٹر غلام نبی سوگامی	لولاب	〃 〃
خواجہ غلام قادر مصالہ	ہندوارہ	〃 〃
مسٹر محمد سلطان تانترے	درگہ مولہ	〃 〃

مسٹر غلام محمد وانی	راہمال	نیشنل کانفرنس
مسٹر محمد یونس	کرناہ	〃 〃
ملک عبدالغنی	سوپور	〃 〃
مسٹر غلام رسول کار	حمل	〃 〃
مسٹر عبدالخالق بٹ	سنی وارہ	〃 〃
مسٹر عبدالکبیر خان جیل بابا	بانڈی پورہ	〃 〃
سردار ہربنس سنگھ آزاد	بارہمولہ	〃 〃
مسٹر غلام محمد جالب	پٹن	〃 〃
مسٹر غلام محمد کاٹھامہ	ماگام	〃 〃
مسٹر محمد اکبر	تنگمرگ	〃 〃
راجہ محمد افضل خان	اوڑی	〃 〃

صوبہ جموں کے انتخابات

پنڈت گردھاری لال ڈوگرہ	ہیرانگر	نیشنل کانفرنس
میجر پیار سنگھ	کٹھوعہ	〃 〃
مسٹر مہیش چند	بسوہلی	پرجا پریشد
مسٹر رام چند کھجوریہ	بلاور	نیشنل کانفرنس
کنور ساگر سنگھ	سانبہ	〃 〃
مسٹر رام پیارا صراف	بشناہ سانبہ جنرل	〃 〃
مہاشہ ناہر سنگھ	بشناہ سانبہ ریزرو	〃 〃
سردار کلبیر سنگھ	رنبیر سنگھ پورہ جنرل	〃 〃
بھگت چھجو رام	رنبیر سنگھ پورہ ریزرو	〃 〃
مسٹر تارا چند	جموں تحصیل جنرل	پرجا پریشد
مسٹر ملکھی رام	جموں تحصیل ریزرو	ہریجن منڈل
مسٹر سمبھدیو سنگھ	اکھنور چھمب جنرل	پرجا پریشد
مسٹر ست دیو	اکھنور چھمب ریزرو	〃 〃
مسٹر ہیمراج جھنڈیال	رامنگر	نیشنل کانفرنس
پنڈت امرناتھ ایڈوکیٹ	ادھمپور	〃 〃
پنڈت موتی رام بیگڑہ	امنڈیکی	〃 〃

مسٹر رشی کیش	ریاسی	نیشنل کانفرنس
مسٹر محمد ایوب خان	ارناس	〃 〃
ماسٹر غلام احمد	حویلی پونچھ	〃 〃
پیر جماعت علی شاہ	مینڈھر پونچھ	〃 〃
مسٹر عبدالعزیز شال	راجوری	〃 〃
مسٹر محمد اقبال	درہال	〃 〃
شری کرشن دیو سیٹھی	نوشہرہ	〃 〃
رام چند مہاجن	جموں شہر جنوبی	〃 〃
پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ	جموں شہر شمالی	پرجا پریشد

واضح رہے کہ ضلع لداخ کی دو نشستوں کا ابھی انتخاب ہونے والا ہے ضلع ڈوڈہ کی پانچ نشستوں کے لئے نیشنل کانفرنس نے اپنے امیدواروں کے ناموں کا اعلان کیا ہے۔ مسٹر اسداللہ میر۔ رام بن انتخابی حلقہ کے لئے مسٹر عبدالغنی گونی بھلیس بھنجوا۔ میر بادشاہ کشتواڑ۔ کرتال چونی لال بھدرواہ اور مسٹر غلام احمد دیو ڈوڈہ انتخابی حلقہ کے لئے نامزد کئے گئے ہیں۔

جنوں توں

(صفحہ ۵۹ سے آگے)

رہا تھا۔ گوری وحشی سی ہو گئی تھی۔ اور جیسے یکایک کانگڑی کے خول کی دم توڑتی ہوئی آگ لپک کر گوری کی ساڑی میں چھپ گئی، اور پھر اس کے بالوں میں جھٹ سے آ چھلانگی ..... اور یہ دیکھ کر گھاٹ پر بچوں نے شور مچایا۔ لیکن جب تک لوگ گوری کو بچانے کے لئے گھاٹ کی پتھریلی سطح پر پہنچے، گوری نے آگ کا ناچ بند کر دیا تھا، اُس کے قدم اُلٹ چکے تھے، اور اس کے جواں گداز بدن سے کانگڑی کے ادھ جلے خول کی طرح دھواں اُٹھ رہا تھا۔

شوراتری کے بعد تیلا اشٹمی کے دن گوری پشکر کے سنگ کیلاش پربت کی طرف چل رہی تھی۔ ہمالیہ کے باسیوں نے اُس دن شگن منائے تھے، دیپ مالا رچائی تھی!

ملک غلام مصطفیٰ
ڈائرکٹر فشریز

مچھلی پالنے کی صنعت

مچھلیوں کی تجارت سے جہاں ایک طرف لاکھوں باشندے اپنا پیٹ پالتے ہیں، وہاں دوسری طرف مچھلیوں کی پیداوار میں اضافہ کرنے سے غذائی قلت بہت حد تک دُور ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں مچھلیوں کی غذائی اہمیت طبی اور ڈاکٹری اصولوں کے تحت مسلّمہ طور پر تسلیم کی گئی ہے۔ کیونکہ تمام غذائیات میں مچھلی بطور خوراک انسان کو تندرست و توانا اور صحت یاب رکھنے کے لئے ضروری سمجھی گئی ہو کشمیر جیسے چاول کھانے والے علاقوں میں خوراک کے ساتھ مچھلی کا استعمال اور بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ اس کے استعمال سے چاولوں کی خوراک ایک مکمل اور متوازن غذا بن جاتی ہے جس کے استعمال سے انسان اپنے آپ کو کئی ایک بیماریوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دُور دُور سے سیاح مچھلی کے شکار کے لئے آتے رہتے ہیں جو اس غرض کے لئے زرِ کثیر خرچ کر کے یہاں کی تجارت اور اقتصادیات کو ترقی دیتے ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر حکومت نے مچھلیوں کی حفاظت اور پرورش کے لئے ہر ممکن ذریعہ سے پانچ سالہ منصوبہ کے تحت مچھلیوں کی پیداوار میں اضافہ کرنے اور ماہی گاہوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے ایک لاکھ کا عمل منظور کیا ہے جس پر سالِ رواں کے وسط سے عمل شروع کر دیا گیا ہے۔

ٹروٹ مچھلی کی پیداوار بڑھانے کے لئے اچھہ بل، ہارون اور اہربل ہیچریوں کو وُسعت دی جا رہی ہے۔ پرانے حوض ہا کو موجودہ طریقے پر تشکیل دینے کے علاوہ ان مقامات پر بڑی ٹروٹ کے لئے بچے اور چھوٹی ٹروٹ کے لئے تیرہ حوض ہا تعمیر کروائے گئے ہیں۔ گذشتہ دو سال میں ٹروٹ کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے بعد امسال جولائی کے مہینے سے ٹروٹ مچھلی کی فروخت براہ راست ہیچریوں سے بغیر پرمٹ عام کر دی گئی ہے۔ اس سے قبل بہت کم اور مخصوص اشخاص کو قلیل مقدار میں یہ مچھلی مہیا ہوتی تھی۔ گذشتہ ستمبر سے قیمت فروخت میں براؤن ٹروٹ کے لئے ۳۳ فیصدی اور Rainbow کے لئے ۴ فیصدی کمی کر دی گئی ہے۔ سیاحوں کی سہولت کے پیش نظر ایک نئی ہیچری پہلگام جانے والی سڑک پر بمقام ٹرکنڈ قائم کر دی گئی ہے۔ اور مزید ایک ہیچری پہلگام خاص میں زیر تعمیر ہے ان ہر دو مقامات پر آئندہ اپریل کے ہر مہینے سے ٹروٹ فروخت کر دی جائے گی۔ اچھہ بل اور ہارون کے ہیچریوں میں میلا پانی آنے کی وجہ سے بیضہ ہائے ٹراؤٹ اور ان سے پیدا شدہ بچوں کو نقصان سے بچانے کے لئے مقطر پانی سیمنٹ بکسوں کے ذریعے بہم پہنچانے کا خاصہ انتظام کیا جا رہا ہے۔ تاکہ ہیچریوں کی پیداوار سے بہتر نتائج پیدا ہو سکیں۔ ان تمام کوششوں کی بدولت ہیچریوں سے دس ہزار پونڈ سے زائد مچھلی فروخت کی جا سکیگی۔ غیر آباد ٹروٹ نالوں کو از سر نو آباد کر کے شکار کے قابل بنایا جا رہا ہے۔ صوبہ جموں کے سرد علاقہ جات یعنی بسوہلی کا بھنی علاقہ، بھدرواہ، کشتواڑ میں بھی ٹراوٹ داخل کر کے سیاحوں کی تفریح کے لئے ٹراؤٹ شکار کی سہولت مہیا کی جا رہی ہے۔ صاحبانِ شکار ماہی کی رہائش کے لئے ایک آرام گاہ علاقہ برنگی میں امسال تیار ہو رہی ہے۔ اسی طرح آئندہ سال ایک آرام گاہ علاقہ لدر اور ایک آرام گاہ علاقہ سندھ میں تعمیر کی جائیگی تاکہ ان سہولتوں کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ سیاح کشمیر میں بغرض شکار ماہی آ سکیں۔

ٹروٹ مچھلی کو فروغ دینے کے علاوہ عام لوگوں کے لئے نئے اقسام کی مچھلیاں نیلگری سے لائی جا رہی ہیں منصوبہ کے تحت ہر سال Mirror Carp کے تین چار ہزار بچے پانپور جھیل - اہن سر - منی بگ - سوپور تالاب ترگام سر - ہوکر سر وغیرہ مخصوص قطعات آب میں پرورش کے لئے ڈالے جائینگے ان جھیلوں میں مچھلیوں کی افزائشِ نسل کے کافی مواقع موجود ہیں - اور دیگر جھیلوں کے مقابلے میں ماہی گیری سے آزاد ہیں۔ اس غرض کے لئے ایک نرسری گڈ تر پورہ ایک آبخار اور ایک اچھہ بل میں تعمیر کی جا رہی ہے۔

صوبہ جموں کے گرم آب وہوا کے علاقہ جات یعنی رنبیر سنگھ پورہ، کٹھوعہ

اور جموں میں بڑی کارپ کے اقسام خصوصاً رہو، کتلا اور سرگل مچھلی وہاں کے تالابوں میں پیدا کی جائے گی۔ ان اقسام کی مچھلی کا بیج دہلی، بنگال یا بہار سے لایا جائے گا۔ تجربہ کے طور پر واضح ہو گیا ہے کہ جموں کے تالاب تِلو جیسے تالابوں میں کتلا مچھلی پالنے سے اس قسم کی مچھلی اچھی طرح نشوونما پا سکتی ہے۔ مچھلی ڈالنے سے پہلے اس تالاب کی مرمت کر کے اس کو قابل استعمال بنایا گیا تھا۔ جموں اور رنبیر سنگھ پورہ کے دوسرے تالابوں کو امسال اور آئندہ سال مرمت کر کے ہر ممکن طریقے سے مچھلی پیدا کرنے کے قابل بنایا جائیگا۔ اس سکیم کے تحت صوبہ جموں کے مخصوص مقامات پر کارپ مچھلی عوام کو تین چار سال کے اندر سستے داموں فروخت ہو گی۔ اسی طرح صوبہ جموں کے سرد پہاڑی علاقوں خصوصاً کشتواڑ، بھدرواہ، رام نگر اور بسوہلی میں مرر کارپ پیدا کرنے کی تجاویز پر عمل کیا جائے گا۔

ریاست میں مچھلی کی پیداوار کا سب سے بڑا مرکز جھیل ولر ہے۔ جہاں سیزن کے دوران روزانہ ڈیڑھ سے دو سو من تک مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں اس مقدار کا بیشتر حصہ سرینگر لایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہی اس کی کھپت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اگرچہ سردیوں کے دنوں میں مچھلیاں تازہ حالت میں تیس چالیس میل دُور مقامات سے سرینگر بخوبی پہنچ سکتی ہیں۔ مگر گرمیوں کے ایام میں یہ چند گھنٹوں کے اندر اندر سڑ کر ضائع ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اس کے لانے میں بارہ گھنٹے سے زیادہ وقت عام چپہ والی کشتی کے پہنچانے میں صرف ہوتا ہے۔ اس مشکل کو دُور کرنے کے لئے محکمہ ہٰذا نے ایک گاڑی اور ایک انجن والی کشتی مہیا کرنے کا انتظام مکمل کر لیا ہے تاکہ مچھلیوں کی زیادہ سے زیادہ مقدار سرینگر اور دیگر اہم کھپت والے مرکزوں پر آسانی سے کم سے کم وقت میں پہنچائی جا سکے۔

ہر ملک میں مچھلیوں کی صنعت کا دارومدار ماہی گیروں کی سماجی اور اقتصادی حالت پر مبنی ہوتا ہے۔ کشمیر میں دیگر ریاستوں کی طرح ماہی گیروں کی حالت نہایت ابتر ہے۔ وہ حد درجے کے غریب، لاچار اور ان پڑھ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سالہا سال کی مفلسی اور قرضداری کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کا معیار بلند کرنے سے قاصر رہے۔ اُن کی کمائی کا بیشتر حصہ استحصالی عناصر کے فائدے کے لئے وقف تھا۔ مگر موجودہ حکومت نے ان کو استحصالی عناصر سے نجات دلانے ان کا معیار زندگی بلند کرنے اور اُن کی سماجی اور اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے ان کو انجمن امداد باہمی کے ذریعے منظم کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں تجربہ کے طور پر جھیل ولر کے مشہور گھاٹ وٹلب پر ایک سو ماہی گیروں کی ایک انجمن امداد باہمی قایم کر دی گئی ہے۔ جس کو آئندہ پانچ سال میں مناسب وسعت دی جائیگی تاکہ تمام علاقہ کے ماہی گیر اس تحریک سے مستفید ہو سکیں جھیل ولر کے ماہی گیروں کو طبی امداد بہم پہنچانے اور ان کے بچوں کو تعلیم دلانے کے لئے متعلقہ محکمہ جات نے محکمہ ہٰذا کی توجہ دلانے پر چند ایک اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مخصوص مقامات پر ماہی گیروں کو بہترین طریقوں کے متعلق باضابطہ ٹریننگ دی جائے گی۔ اس طرح سے وہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں مچھلیاں پکڑ سکیں گے۔ مزید برآں ان کو مچھلیاں زیادہ دیر تک تازہ رکھنے اور اُن کو حفظان صحت کے اصولوں کے تحت بہترین طریقوں سے مچھلیاں خشک کرنے کی ترکیبوں کے متعلق بھی آگاہ کیا جائے گا۔ تاکہ وہ اپنی اس پیداوار کو زیادہ دیر تک اچھی حالت میں رکھکر زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔ اس کے علاوہ اُن کو سستے داموں پر اوزار ماہی گیری مہیا کرنے کا سوال بھی زیر غور ہے۔ غرضیکہ ریاستی حکومت نے ماہی گیروں کی حالت ہر لحاظ سے بہتر بنانے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔

مندرجہ بالا امور کے علاوہ طلبا کی تفریح کے لئے صوبہ جموں میں مچھلیوں کا ایک فارم اور صوبہ کشمیر میں ایک فارم قایم کر دیا جائے گا۔ تاکہ طلبا ماہی گیری کے مختلف طریقوں سے مستفید ہو سکیں۔ اسی طرح مقامی لوگوں اور سیاحوں کی تفریح کے لئے زندہ مچھلیوں کا ایک شیشہ گھر تعمیر کیا جائے گا، جہاں پر مختلف قسم کی مچھلیاں زندہ حالت میں رکھی جائیں گی۔

مہجور کا یوم وفات

اس سال بھی ۹ اپریل کو ریاست کے علمی اور ادبی حلقوں میں حضرت مہجور کا یوم وفات منایا گیا۔ ریڈیو کشمیر سری نگر سے یوم مہجور پر ایک خاص طرحی کشیری مشاعرہ نشر ہوا جس میں کشمیر کے شاعروں نے حصہ لیا۔ ان میں دینا ناتھ نادم، امین کامل، مظفر عاظم، غلام نبی خیال، چمن لال چمن، فاضل کشمیری، غضنفر سغری، بیکس کشمیری، میر غلام رسول نازکی، برق کشمیری اور غلام نبی فراق قابل ذکر ہیں نوجوان کلب علارڈ میں بھی یوم مہجور منایا گیا۔

سیاسی مبصر کے قلم سے

ورق ورق

انتخابات ۔ مسٹر بیون کا دورہ ۔ مقبوضہ کشمیر کے لیل و نہار

غلط نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ ریاست جموں و کشمیر میں جمہوریت کا جو تجربہ ہو رہا ہے۔ اس کی اساس مضبوط بنیادوں پر قائم کی جا رہی ہے۔ جمہوریت کے اس تجربہ کا ایک اور اہم قدم نئے آئین کے تحت پہلے عام انتخابات کا انجام پذیر ہونا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کے پہلے جمہوری چناؤ تھے۔ نئے آئین کے تحت ریاست کی مجلس قانون ساز کے لئے ایک سو ممبران مقرر ہوئے ہیں۔ ان میں سے پچیس ممبران کے لئے مخصوص نشستیں بھی ہیں جو جنگ بندی سرحد کے اُس پار کے ریاستی عوام کے لئے رکھی گئی ہیں۔ جو اس وقت پاکستان کی غلامی برداشت کر رہے ہیں۔ جنگ بندی سرحد کے اِس پار کی ۷۵ نشستوں میں سے اس مرحلہ پر ۶۸ نشستوں کے انتخابات مکمل کر لئے گئے ہیں۔ سات نشستوں کے انتخابات اس لئے روک رکھے گئے ہیں۔ کیونکہ یہ انتخابی حلقے ریاست کے اُن دُور افتادہ اور دشوار گذار علاقوں میں ہیں۔ جو ابھی تک برف سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ ان سات نشستوں میں سے دو اپریل کے آخر میں ان پہاڑی علاقوں کی برف پگھلنی شروع ہو گی اور مئی میں موسم خوشگوار ہوتے ہی وہاں چناؤ عمل میں لائے جائیں گے۔

بے لاگ مبصر اس بات پر متفق ہیں کہ ریاست میں عام انتخابات عمل میں لانے کا کام پوری دیانت داری اور غیر جانبداری سے ہوا۔ سیاسی پارٹیوں کو انتخابات میں حصہ لینے کی پوری آزادی اور سہولتیں دی گئیں۔ اور ووٹروں میں بھی یہ احساس پیدا کیا گیا۔ کہ ایک جمہوری سٹیٹ میں ووٹ کی قدر و قیمت کیا ہے۔ بلاشبہ جمہوریت وہ ہے جس میں ہر ایک شہری کو رائے دینے کا انسانی حق حاصل ہو۔ اور ہر ایک مکتب خیال کے ووٹر کو اپنی مرضی اور ارادہ ظاہر کرنے کی آزادی ہو۔ غیر ملکی نمائندوں نے بھی نئے آئین کے تحت ریاستی عوام کو پہلی بار اپنے اس حق کا استعمال کرتے ہوئے دیکھا۔ سمندر پار ملکوں کے کئی نمائندے ریاست میں انتخابات کا جائزہ لینے کے لئے مختلف انتخابی حلقوں میں گھومے پھرے اور انہوں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا اظہار کیا کہ ووٹر بڑی گرمجوشی اور آزادی کے ساتھ اپنے ووٹ استعمال کر رہے ہیں۔

صوبہ جموں میں ووٹروں نے نہایت ہی خوشگوار موسم میں ۲۵ مارچ کی صبح سے شام چھ بجے تک اپنے ووٹ کا استعمال کیا۔ دُور دُور دیہات سے نوجوانوں سے لیکر نحیف و نزار بوڑھے تک ووٹ ڈالنے کے لئے پولنگ سٹیشنوں پر آئے۔ جس تعداد میں عورتوں نے اپنے ووٹ کا استعمال کیا وہ حوصلہ افزا تھی۔

صوبہ کشمیر میں ووٹ ڈالنے کا کام ۳۰ مارچ کو ہوا۔ بدقسمتی سے اس دن شدید بارش ہو رہی تھی اور بہت سے ووٹر اپنے ووٹ کا استعمال نہ کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود لگ بھگ پچاس فیصدی ووٹروں نے ووٹ کا استعمال کیا۔ جنہوں نے ووٹروں کو بارش کے پانی میں تر بتر ہوتے ہوئے پولنگ سٹیشنوں پر جمع دیکھا وہی اُن کی گرمجوشی کا اندازہ لگا سکے ہوں گے۔

انتخابات کے نتائج کا اعلان ہو جانے سے نیشنل کانفرنس نے مجلس قانون ساز کے ایوان میں قطعی اکثریت حاصل کی ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ ریاستی عوام کی اکثریت نے نیشنل کانفرنس پر اپنے بھرپور اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اور اسی کو ریاست کا انتظام

سنبھالنے کے اہل قرار دیا ہے۔ انتخابات میں دوسری پارٹیوں نے جو
پوزیشن حاصل کی ہے وہ یہ ہے:۔

پرجا پریشد ۵ - ہریجن منڈل ۱ - آزاد ایک۔

انتخابات میں جو اُمیدوار پرجا سوشلسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر
کھڑا ہوئے تھے۔ وہ کسی حلقے میں اپنی ضمانت کھو بیٹھے۔ اور کسی حلقے
میں دونوں کے معمولی فرق سے رہ گئے۔

مجموعی اعتبار سے یہ تمام انتخابات ریاست جموں وکشمیر میں
جمہوریت کے تخلیقی ارتقا میں سیاسی سماجی اور تہذیبی زندگی کے ہر شعبہ
میں انتھک پیش قدمی اور عوام کے مفادات کے لئے حکومت کی عملی سرگرمیوں
کے لئے نئی راہیں ہموار کر چکے ہیں۔ انتخابات کے ان نتائج کا بین الاقوامی حالات
پر اثر پڑنا بھی لازمی ہے۔ اس لئے کہ کشمیر بین الاقوامی بحث و مباحثہ کا مرکز
اور موضوع بنا ہوا ہے۔ اس موضوع پر جو لوگ یہ نظریہ پیش کرتے ہیں
کہ کشمیر کی تمام قوتیں امن اور جمہوریت کی خاطر ہندوستان کی دوسری
ریاستوں کے ساتھ اشتراک عمل پر ہی بھروسہ رکھتی ہیں۔ ان لوگوں
کی پوزیشن ریاست میں عام انتخابات کے نتائج سے اور بھی
مضبوط ہو گئی ہے۔

بہرحال حق یہ ہے کہ انتخابات کے نتائج کا ریاست کے اندر اور
باہر اگر پُرجوش خیر مقدم ہوا ہے، تو دوسری طرف ریاست کے
دشمنوں میں اس سے خوف اور ہراس بھی پیدا ہوا ہے۔ ان انتخابات
میں ریاستی عوام نے ایک بار پھر ریاست کے نئے آئین کی توثیق کر دی ہے
اور ان بنیادی اصولوں کے ساتھ اپنے جذباتی میلان کا ثبوت دیا جن کی
اساس پر اس آئین کو مرتب کیا گیا ہے۔ اس آئین کو نہ صرف ریاستی
عوام کی بلکہ ملک کی دوسری ریاستوں کے عوام کی تائید اور حمایت بھی
حاصل ہے۔ اتنا ہی نہیں برطانیہ کی لیبر پارٹی کے ایک ذمہ دار
لیڈر مسٹر بیوان نے بھی ریاست کشمیر کے نئے آئین پر پسندیدگی
کا اظہار کیا ہے۔ آپ اپریل کے پہلے ہفتہ میں تین دن کے دورے
پر کشمیر آئے تھے۔

مسٹر بیوان نے کشمیر میں ہر خیال کے لوگوں سے ملاقات کی
باغات کی سیر کی۔ قومی توسیعی سروس سکیم کے دائرہ میں لائے گئے دیہات
تیر

کو دیکھا۔ کارخانوں میں گھومے پھرے۔ عبادت گاہوں کو دیکھا۔ کاریگروں
کو اپنے مرکزوں میں کام کرتے ہوئے پایا۔ اور تعمیر نو کے لئے عوام کی
گرمجوشی اور لگن دیکھ کر مسرت بخش تاثرات کا اظہار کیا۔ سری نگر کے
شہریوں کی طرف سے آپ کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد
ہوئی جس میں چیدہ چیدہ شہریوں، سرکاری افسروں، ریاستی وزراء کے
علاوہ مرکزی سرکار کے وزیر شری وی، کے، کرشنا مینن بھی شامل ہوئے۔
مسٹر بیوان نے اس تقریب میں کئی اہم باتیں کہیں۔ انہوں نے اس بات کا
اعتراف کیا کہ سمندر پار کے ملکوں میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو
کشمیر کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوئے بھی اپنی رائے ظاہر کرتے
ہیں۔ جو محض اُن کی لاعلمی اور کم مائگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

یہ کہہ کے مسٹر بیوان نے اصل میں مغربی ممالک کے اُن سیاستدانوں
پر چوٹ کی جو محض سنی سنائی باتوں اور ذہنی افسانوں پر اپنا رویہ متعین
کرتے ہیں۔ اور کشمیر کی صحیح صورت حال کا ذرا بھی علم نہیں رکھتے۔ اس
کے ساتھ ہی مسٹر بیوان نے انجمن اقوام متحدہ کی مصلحت اندیشی پر بھی نکتہ
چینی کی۔ آپ نے کہا۔ " یوں محسوس ہوتا ہے کہ انجمن اقوام متحدہ
غیر شعوری طور پر کشمیر کے مسئلے کو نپٹانے میں مشکلات پیدا کر
رہی ہے"

فی الواقع اگر انجمن اقوام متحدہ میں سیاسی سودا بازی کے لئے
نجی مصلحتوں سے کام نہ لیا جاتا، تو ایسے ضروری حالات پیدا ہو سکتے تھے
جن میں اس سوال کو نپٹانا مشکل نہ ہوتا۔ لیکن انجمن کی بعض طاقتوں کو یہ
گوارا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لیبر لیڈر مسٹر بیوان نے جھگڑے کی اصل
جڑ کو سمجھ کر کشمیر کے معاملے پر اپنی قطعی رائے ظاہر کرتے
ہوئے کہا۔

" ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو کشمیر کا
معاملہ باہمی گفت و شنید سے حل کرنا چاہیئے۔ اور کسی بھی بیرونی مداخلت
کو بیچ میں نہ آنے دینا چاہیئے۔ چہ جائیکہ یہ بیرونی طاقتیں کتنی ہی نیک نیتی
سے مداخلت کیوں نہ کر رہی ہوں" گویا مسٹر بیوان نے ریاستی عوام
کی اُمنگوں اور خواہشات کی پوری ترجمانی کی ہے۔ بلاشبہ یہ وہی
راستہ ہے جو کشمیر کی سیاسی پارٹیوں اور سیاسی لیڈروں کی

رائے ہے اور مرکزی سرکار کی رائے ہے۔ ہندوستان میں جس کا کشمیر
ایک حصّہ ہے سب اس بات پر متفق ہیں کہ کشمیر کے معاملے میں کسی بیرونی
طاقت کی مداخلت ہرگز برداشت نہیں کی جائے گی۔ اور برطانوی لیبر
پارٹی کے لیڈر نے بھی ہمارے جذبات کے ساتھ اپنے جذبات کو ہم آہنگ
کر دیا ہے۔

کشمیر میں قومی ترقی کے کاموں کا جائزہ لیکر ملکی اور غیر ملکی شخصیتوں
کی طرف سے جن حوصلہ افزا تاثرات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس سے اُن
لوگوں کے جذبات میں زیادہ ہلچل پیدا ہوئی ہے۔ جو جنگ بندی سرحد
کے اُس پار پاکستانی مقبوضہ علاقے میں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ
جنگ بندی سرحد کے اس پار کے لوگوں کو جب بھی موقع ملتا ہے۔ وُہ
جان پر کھیل کر سرحد پار کر کے ادھر آجاتے ہیں۔ مارچ کے دوسرے
ہفتہ میں پندرہ مہاجروں کا ایک جتھہ جان جوکھم میں ڈال کر ادھر
آیا۔ ان مہاجروں کی جسمانی حالت ہی پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے
عوام کی زبوں حالی اور فاقہ کشی کی درد آمیز تصویر پیش کرتی ہے۔
مہاجروں کا پاکستانی مقبوضہ کشمیر سے بھاگ کر ادھر آنا کوئی انوکھی
بات نہیں ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک خلاف توقع واقعہ ہوا ہے
وُہ یہ کہ مظفر آباد کے تین سیاسی ورکر جنگ بندی سرحد سے زبردستی
ادھر دھکیل دئے گئے ہیں۔ ان میں مظفر آباد کے ہفتہ وار "کشمیر"
کا ایڈیٹر خواجہ ثناء اللہ بھی شامل ہے۔ خواجہ ثناء اللہ اور اُن کے
ساتھیوں نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں مقبوضہ کشمیر کی جو نقشہ
پیش کی ہے وُہ رونگٹے کھڑا کرنے والی ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے نام نہاد
آزاد کشمیر کی حکومت کے تمام اعلیٰ عہدے پاکستانی آفیسروں کے پاس
ہیں۔ یہ اعلیٰ آفیسر شیر محمد فنانس سکریٹری۔ فیروز حسین چیف جسٹس
اللہ نواز کریم خان انسپکٹر جنرل پولیس۔ مرزا محمد مظفر اسسٹنٹ انسپکٹر
جنرل پولیس ایس۔ ایچ محمد ڈیولپمنٹ کمشنر اے۔ جی۔ صوفی ڈائریکٹر
محکمہ اطلاعات اور دوسرے متعدد اصحاب ہیں۔

انہوں نے کہا ہے۔ مقامی لوگوں پر بھروسہ نہیں کیا جاتا ہے
اس لئے ان اور دوسرے افسروں کے عملے حتیٰ کہ چپراسیوں کو بھی پاکستان
سے ہی درآمد کیا جاتا ہے۔ اور کچھ وقت پہلے کی بات ہے۔ کہ
"آزاد گورنمنٹ" کے سکریٹری جنرل نے حکومت پاکستان کو یہ لکھا
کہ چونکہ اس علاقہ میں جہاں دشمن لوگ بستے ہیں سرکاری راز
پوشیدہ رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس لئے مقامی سرکاری ملازمین کی
جگہ مرکز یا پاکستان کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کو متعین کرنا
ضروری ہے۔

خواجہ ثناء اللہ نے کہا کہ حکومت پاکستان نے مظفر آباد میں
جو اعلیٰ افسر تعینات کئے ہیں۔ وُہ سمجھتے ہیں کہ وُہ نام نہاد "آزاد
کشمیر" میں رائج قوانین اور دوسرے قواعد و ضوابط کے پابند نہیں
ہیں۔ چونکہ یہ آفیسر "آزاد کشمیر" کی عدالتوں کے سامنے جواب دہ
نہیں ہیں۔ اس لئے وُہ کھلے بندوں ہر قسم کی بے ضابطگیوں کے مرتکب
ہوتے ہیں۔ فی الواقع حکومت کے سکریٹری جنرل اور انسپکٹر جنرل
پولیس اس علاقے کے قضا و قدر کے مالک ہیں۔ سرکاری ملازموں
کی سنیارٹی وغیرہ کا تعین "آزاد کشمیر حکومت" نہیں۔ بلکہ وزارت
امور کشمیر کیا کرتی ہے۔ محکموں کے افسران اعلیٰ کے خلاف
اپیلوں اور درخواستوں کی سماعت بھی یہی "مختار کل" وزارت
کیا کرتی ہے۔ حکومت کے لئے کوئی ضابطہ کار مقرر نہیں ہے۔ احکام
کسی خاص منظوری کے بغیر ہی صادر کئے جاتے ہیں۔ آپ نے
ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا۔ جس سے پاکستانی سیاست
اور صحافت کے اخلاق پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ آپ نے کہا قیدیوں
کے فرار کے افسانے گھڑ کر اصل میں اُنہیں قتل کیا جاتا ہے۔
خواجہ ثناء اللہ کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں جب کہ
اُنہوں نے پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی دُرگت کا حال بیان
کیا۔

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میر
کہ اب جو دیکھوں اُسے میں بہت نہ پیار آئے

(میر)

پروفیسر جی۔ اے۔ شیخ

زراعتی ترقّی اور پانچسالہ منصوبے

کشمیر بنیادی طور پر ایک زراعتی ریاست ہے اور ریاست میں بسنے والے ۸۰ فیصد سے زائد لوگ کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔ اس طور پر یقیناً زراعت ریاست کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اور ریاست کی مجموعی خوش حالی کا بہت کچھ انحصار اس کے زراعت کی نہج اور نوعیت پر ہے۔ ظاہر ہے کہ زراعت کے ڈھانچے کا ہماری جیالو معیشت کے ڈھانچے سے بہت ہی قریبی تعلق ہے اور جتنی ہماری زراعت ترقی یافتہ ہوگی۔ اُسی قدر ملک کی ترقی میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔

ہماری ریاست میں غذائی مسئلہ ہمیشہ پریشان کن رہا ہے۔ چنانچہ ریاست کی تاریخ کے اوراق اُلٹنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مطلق العنان بادشاہوں اور راجاؤں کے دور میں اکثر کشمیر میں غذائی حالات نامساعد رہے جس کی وجہ کچھ تو حکمرانوں کی غلط روش اور کچھ تو کشمیر کے موسم کی عام نہج تھی۔ ایسے بادشاہ جن کے عہد میں کشمیر غذائی طور خود کفیل اور مطمئن رہا، کشمیر میں بہت عزت سے یاد کئے جاتے ہیں۔

کشمیریوں نے جب اپنی قومی جدوجہد کا آغاز کر کے ایک درخشاں مستقبل کو سنوارنے کی کاوش شروع کر دی، تو ہر وقت غذائی مسئلہ اُن کے سامنے بہت ہی اہم حیثیت کا مالک رہا۔ چنانچہ جدوجہد کے عرصہ کے دوران بھی جب اہلِ وطن کے سامنے غذائی مسئلہ نے نازک صورت اختیار کی تو قومی تحریک کے تحت ایجی ٹیشن اور تحریکیں شروع کی گئیں اور حکومت کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ راشن بندی کے معقول طریقے کو ترویج دے۔ اس کے علاوہ قومی تحریک نے مستقبل کے لئے غذائی مسئلہ کو حل کرنے کی جو راہ سوچی۔ اُس کا اندازہ نیا کشمیر میں مندرج اس اقتباس سے ہوتا ہے۔

"اہلِ ریاست کی غذائی بہتری کو مقدم رکھنا یعنی ملک میں بسنے والے لوگوں کو دو وقت کی روٹی مہیا کرنا۔ ہماری قومی تحریک کے سامنے ایک اہم فریضہ رہا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کی خاطر اس پروگرام میں چند تجاویز بھی رکھی گئی ہیں۔ چنانچہ زرعی منصوبے کا مقصد ضروری اشیا خوراک اور اناج کے معاملے میں ریاست کو قومی کفالتی سے بہرہ مند کرنا ہے۔"

چنانچہ جوں ہی نیشنل کانفرنس برسر اقتدار آئی اور ملک میں پہلی عوامی حکومت قائم ہوئی تو تمام ریاست میں جاگیرشاہی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ مگر اتنے بڑے ترقی پسند قدم کے بعد بھی ہماری ریاست زرعی بحران کے طوفان میں ہچکولے کھاتی رہی۔ اور اس کی ذمہ دار سابق وزارت کی وہ ناعاقبت اندیشانہ پالیسی تھی جو چند خاص اغراض کے تحت روا رکھی گئی تھی۔ اس دور میں ایک طرف تو تمام ملک غذائی قلت کے خطرناک عواقب سے دوچار رہا۔ اور دوسری طرف سے کسانوں کے طبقے پر اتنے ظلم ڈھائے گئے جس کی نظیر تمام تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے، یہ تھی کہ ملک میں ایسے حالات کو جنم دیا جائے جس سے افراتفری، غیر یقینیت اور سراسیمگی انتہا کو پہنچ جائے اور چند لیڈروں کے اغراضِ خصوصی پورے ہو جائیں۔

مایوسی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ۹ اگست سنہ ۱۹۵۳ء کی وہ یادگار شام کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔ جب ریڈیو کشمیر کے سری نگر سٹیشن سے جناب بخشی غلام محمد نے اپنی پالیسی تقریر میں اعلان کیا تھا۔ "مجوزہ کا ظالمانہ سسٹم ختم کر دیا جائے گا۔ سرینگر کے شہر میں شالی کی قیمت دو روپے فی خروار کم کر دی جائیگی راشن کی مقدار بڑھا دی جائے گی اور گاؤں کے دیہاتی علاقوں میں راشن مہیا کرنے کے مسئلے کی طرف توجہ دی جائے گی۔"

چنانچہ بخشی حکومت نے اپنے قیام کے دن سے ہی جس مسئلے کو اولین اہمیت دی تھی، وہ غذا کا مسئلہ تھا۔ اور بہت جلد عوام نے محسوس کیا کہ انکی

مشکلات کے دن بیت چکے ہیں۔ چنانچہ اب وہ آرام سے دو وقت کی روٹی کھانے لگے اور وہ زخم مندمل ہونے لگے جو کئی سالوں سے اُن کو گھائل کئے ہوئے تھے۔

موجودہ حکومت نے کسان طبقے کی فارغ البالی پر سب سے پہلے توجہ کی تاکہ وہ پوری مستعدی سے زراعت کے پیشے پر اپنی تمام تر توجہ اور مشقت مرکوز کر سکیں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے کوآپریٹو قرضہ جات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اس طریقے سے کسان کو اوائل بہار میں اُس کی مختلف ضروریات کے لئے دس روپیہ فی خروار کے حساب سے قرضہ دیا جاتا ہے تاکہ وہ مہاجن اور وڈ دار کے چنگل میں نہ پھنسے جو بدستور کمائی کا ناجائز استحصال کرتے آئے تھے چنانچہ کسان یہ قرضہ لیتے ہیں اور [illegible] سے اپنی ضروریات پورا کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد خزاں میں غلے کی ادائیگی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیہاتیوں کو بیلوں کے لئے بھی قرضے دئے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ اچھے اور توانا بیل خرید سکیں جو اُن کی زمین کو اچھی طرح جوت سکیں۔ اور اس طرح پیداوار میں اضافہ ہو جائے۔

اس کے علاوہ موجودہ حکومت کی زبردست کوششیں اس امر پر مرکوز ہیں کہ ریاست کو غذائی پیداوار کے سلسلے میں خود کفیل بنایا جا سکے۔ اس بات کو مدِ نظر رکھکر دوسرے پانچ سالہ منصوبہ میں اس پہلو کو ترقی دینے کے لئے کافی توجہ دی گئی ہے۔ خوراک کی پیداوار کے لئے مندرجہ ذیل ذرائع کو استعمال کیا جا رہا ہے۔

(۱) ایسے بیجوں کو متعارف کیا جا رہا ہے جو کافی اور بہتر نوعیت کی فصلیں پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

(۲) خوراکی اشیاء کے زیادہ اُگاؤ کے لئے کیمیائی کھاد استعمال کئے جا رہے ہیں۔

(۳) زراعتی طریقوں میں سُدھار

(۴) زراعتی بیماریوں کے خلاف جہاد۔

(۵) بہتر قسم کے ذرائع آبپاشی کا تعارف۔

(۶) نئی اور بنجر زمینوں کو سیراب کرنے کا سلسلہ۔

چنانچہ اس وقت تک ان تمام نکات کے سلسلے میں مناسب اقدامات کئے گئے ہیں۔ اس وقت تک بیج کی بہتر اقسام تقسیم کی گئی ہیں۔ اور ان کے نتیجہ میں پیداوار میں کافی اضافہ ہو رہا ہے۔ کیمیائی کھاد کے سلسلے میں سلفیٹ آف ایمونیا کے ہزاروں من تقسیم کئے گئے ہیں۔ یہ کھاد ریاست کی شالی کے

تعمیر

زیادہ اُگاؤ کی مہم میں کافی کارآمد ثابت ہوئی ہے اور اس لئے روز بروز مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ اُس کے نتیجہ میں ریاست کی غذائی پیداوار میں قابلِ رشک اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ زراعتی بیماریوں کے خلاف جہاد کے سلسلہ میں بہت سی دوائیاں استعمال کی جا رہی ہیں، جن سے فصلوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس ضمن میں ٹڈیوں اور باقی نقصان دہ کیڑے مکوڑوں کو مارنے کا کام بھی کیا جا رہا ہے۔

آبپاشی کے ذرائع کو حیرت انگیز طور پر وسعت دی گئی ہے۔ چنانچہ بہت بڑی نہریں نکالی گئی ہیں۔ جن سے بڑے بڑے رقبہ جات سیراب ہو رہے ہیں اور اس طرح سے ملک کو غذائی طور خود کفیل ہونے میں ممد ثابت ہو رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں بدگام پورہ کا لفٹ اری گیشن سنٹر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ سنٹر لاکھوں روپے کی لاگت سے تیار ہوا ہے۔ اور اس کی بدولت واٹر پمپوں کے ذریعے ہزاروں ایکڑ بیکار اراضی کو قابلِ کاشت بنایا گیا۔ اور اس سے اب سینکڑوں من غلہ اور باقی اجناس حاصل کئے جا رہے ہیں۔

دوسرے پانچ سالہ منصوبہ میں زراعتی امور سے متعلق کاموں پر کروڑوں روپے خرچ کئے جا رہے ہیں۔ اس پہلو کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے اُس کا اندازہ اس بات سے لگ جاتا ہے کہ جموں کے کنڈی علاقہ میں ساڑھے بارہ کروڑ روپے کی لاگت سے ایک نہر نکالی جائے گی۔ جس سے ہزاروں ایکڑ زمین سیراب ہو سکے گی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ریاست کی زرعی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ہو گا۔

دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے اختتام پر ہماری ریاست زرعی پہلو میں کافی ترقی یافتہ ہو چکی ہوگی۔ اور ہماری کفالت کی منزلیں نزدیک تر آ جائیں گی۔

حدیث دیگراں

جوہو۔ بمبئی
۹-۳-۵۷

مکرمی شمیم صاحب

یاد آوری کے لئے بیحد مشکور ہوں۔ یہ واقعی سچ ہے کہ مہجور میرے بہت ہی پیارے دوست اور بزرگ تھے۔ میری اُن سے پہلی ملاقات ۱۹۳۷ میں ہوئی تھی۔ میں نے اُن کے کلام کے بارے میں ۱۹۳۸ میں شانتی نکیتن کے سہ ماہی رسالے VISHWA BHARATI QUARTERLY میں مضمون لکھا۔ جس کو ٹیگور نے پڑھا اور بہت متاثر ہوئے چنانچہ مہجور کو پہلی بار کشمیر سے باہر متعارف کرنے کا شرف اس ناچیز بندے کو ہی حاصل ہے۔

افسوس میرے پاس وقت نہیں ہے کہ میں اُن کی عظیم شخصیت کے بارے میں کچھ لکھ سکوں۔ بیحد مصروف ہوں۔ ورنہ لکھنے کیلئے بہت ہے۔ مہجور کے ساتھ جو لمحے میں نے گزارے ہیں وہ واقعی میری زندگی کی ایک بیش قیمت یادگار ہیں۔ میں اُن کے بارے میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں۔ مگر افسوس، مجبور ہوں۔

بطور ایکٹر میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہ ہے کہ ایک دن مہجور کی زندگی کو فلما سکوں اور فلم میں خود مہجور کا پارٹ ادا کر سکوں۔ کون کہہ سکتا ہے شاید یہ خواب کبھی پورا ہو ہی جائے
آپ کے رسالے کے لئے اپنی دلی شبھ کامنائیں بھیجتے ہوئے۔

آپ کا داس
بلراج ساہنی

۷/۴ بینک روڈ
الہ آباد

محترمی

رسالہ تعمیر مجھے بہت ہونہار رسالہ معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرتا ہوا یہ رسالہ آگے بڑھیگا۔

خیر اندیش
فراق گورکھپوری

سینٹ جونس کالج آگرہ
ڈیپارٹمنٹ آف اردو اینڈ پرشین

مکرم بندہ۔ تسلیم

علی گڑھ میں علوی صاحب کے پاس تعمیر کا ایک شمارہ دیکھا بے حد پسند آیا۔ آپ کے حسن ترتیب اور محنت کی داد دیتا ہوں۔
تعمیر کے آئندہ شمارہ کے لئے اپنی تازہ ترین فکر غزل کی شکل میں روانہ کرتا ہوں۔ امید ہے کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوگا۔ والسلام

آپ کا
مغیث الدین فریدی

---

۲ مارچ ۵۷ء
شونالٹ بھون

مکرمی! خلوص ونیاز، "تعمیر" کے دو شمارے بابت جنوری و فروری نظر نواز ہوئے۔ شکریہ
پروفیسر شکیل الرحمٰن کا مضمون "روشن صدیقی محراب غزل کے آئینے میں"

بڑا دل آویز ہوگیا ہے۔ بیشک رو‌ش صدیقی کے یہاں خیالات کا اچھوتا
انتقا، اسلوب کا تیکھا پن، ماحول پر ایک گہری بصیرت، داخلی محسوسات
کی رنگا رنگ پختگی اور سوز وگداز کی نکھری ہوئی تاثیر اپنی پوری شدت
کے ساتھ ملتی ہے جو شاید اس دلربایانہ نکھار کیساتھ دوسرے شعراء کے
یہاں کم مل سکے گی۔ آگے چل کر فاضل مضمون نگار نے ایک بڑی پیاری
بات کہی ہے کہ "روش نے اپنی محنت اور ریاضت سے وہ مقام
حاصل کر لیا ہے جہاں سے بلندیوں پر جانے کے راستے نزدیک ہو
جاتے ہیں"۔

ماسٹر زندہ کول کی غزل سے اردو ترجمہ کی وساطت سے
لطف اندوز ہوا ہوں۔ یہ ترجمے کشمیری ادب کو دوسرے علاقوں سے متعارف
کرانے کے لئے موثر ترین ذرائع ثابت ہوں گے۔ لیکن اس "کیف گل فروش"
کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے گل ہائے رنگا رنگ کی نکہتیں بھی اس
چمن شوق کے لئے ضروری ہیں تاکہ عام اہل ذوق کی شامہ نوازی بھی ہو
سکے۔ اور "میکدۂ تعمیر" سے بلا نوشان سخن کو خمار تشنہ لبی کا گلہ
نہ رہے۔

بہر کیف یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ "تعمیر" آپ کی محنت اور
حسن سلیقہ کے سائے میں آگے بڑھ رہا ہے۔

آپ کا
فضا ابن فیضی

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید تو دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحائی کرد
السلام علیکم! مبارک! سلامت! شمیم عطر آگین گلشن کشمیر نے
دھوم مچا رکھی ہے۔ لالہ و گل سے خیابان خیابان تعمیر ہو رہی ہے۔
یہ آپ جیسے عالی حوصلہ نوجوانوں کا کام ہے۔ واقعی ایسی خوبصورتی
سے رسالہ کی ترتیب کی ہے اور اس انداز سے سجایا ہے کہ لوگ
"آج کل" کو بھول گئے ہیں۔ چاندیں کہیں دبتے پائے جاتے ہیں۔
میں چاہتا ہوں یہ بھی نہ رہیں۔ سب اپنا اپنا دامن سمیٹے گزرگاہوں
سے نکلتے ہیں۔ میں اپنے دامن خیال کو یہاں سے لالہ زار کشمیر تک
وسعت دے رہا ہوں۔ ذرا فرصت ہوئی آپ کے لئے غزل اور
نظم بھیجوں! اس خط کے ذریعہ میں آپکو اور آپ کے سرپرستوں اور
مددگاروں سب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

دعا گو
نشور واحدی۔ ناظر باغ۔ کانپور

تعمیر

ادبی دنیا
ڈگی روڈ۔ علی گڑھ

محترم شمیم صاحب! امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔
"تعمیر" علی گڑھ میں ایس ایس ہال کومن روم میں برابر آتا
ہے۔ میں ہر ماہ اُسے ضرور دیکھتا ہوں۔ اب اس کے حسن اور نکھار
میں خاص شگفتگی آگئی ہے۔ اور یہ جان کر مسرت ہوئی کہ یہ سب آپ
کا فیضان ہے۔

آپ کا
سید مرتضیٰ حسین بلگرامی
ادبی دنیا۔ ڈگی روڈ۔ علی گڑھ

اردو ڈیپارٹمنٹ۔ کواپریٹو کالج
جمشید پور (بہار)

پیارے بھائی شمیم
چند روز ہوئے "تعمیر" موصول ہوا۔ دیکھ کر آپ کے ذوق
اور کمال محنت کا قائل ہونا پڑا۔ سرورق کا فن انتہائی جاذب
نظر ہے۔

مواد کا انتخاب بھی کافی ستھرا ہے۔ البتہ چھپائی عمدہ
نہیں۔ جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند آئی۔ وہ کشمیری ادب
کی جانب آپ کی خاطر خواہ توجہ ہے۔ اتنے اچھے پرچہ کی اشاعت
پر میری مبارکباد قبول کیجئے۔

آپ کا
منتظر شباب
اپریل ۱۹۵۷ء

کے آخری سفر کی کہانی
تصویروں کی زبانی

مضمون صفحہ ۵۴ پر ملاحظہ ہو

خرد نے مجھکو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھکو حدیث رندانہ

ماہنامہ تعمیر سری نگر

اگست و ستمبر ۱۹۵۷ء

جلد (۲) شمارہ (۸)

ایڈیٹر

شمیم احمد شمیم

جوائنٹ ایڈیٹر

محمد یوسف ٹینگ

قیمت سالانہ

چھ روپے

فی پرچہ

۵۰ نئے پیسے

عبدالغنی وڈیرا پرنٹر پبلشر نے گورنمنٹ پریس سرینگر میں چھپوا کر لالہ رُخ پبلی کیشنز کی طرف سے شایع کیا۔

زاویے

ریاست کی نئی کابینہ کی تشکیل کے بعد نئے آئین کے تحت نئے کشمیر کی تعمیر کا کام اب باقاعدہ طور شروع ہو گیا ہے۔ مجلس قانون ساز کے حالیہ اجلاس اگر نئے وزراء کی قابلیت، اہلیت اور صلاحیتوں کا معیار ہیں تو پورے اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ نئے وزراء اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ بجٹ سیشن کے دوران وزراء نے جس تدبر اور توازن کا ثبوت دیا ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ گو یہ لوگ مسند وزارت کے لئے نئے ہیں مگر سیاسی شعور، انتظامی قابلیت اور پارلیمانی آداب کی شاندار روایات میں پرانے تجربہ کاروں سے کچھ کم نہیں۔ سالِ رواں کے بجٹ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے تحت ریاست میں تعمیر و ترقی کا جو عظیم کام ہو رہا ہے۔ وہ نہ صرف اپنی وسعت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے لاثانی ہے بلکہ ریاست کی تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اس عظیم منصوبے کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب یہاں کے عوام حکومت کے ساتھ مکمل تعاون کر کے وقت کے اہم تقاضوں کو پورا کرنے کی سعی کریں اور یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے یہاں کے عوام منصوبے کی تکمیل میں اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں۔ اور اگر جوش و خروش کا یہی عالم رہا تو آیندہ پانچ سال کے بعد ہماری ریاست میں خوش حالی اور فارغ البالی کا دَور دَورہ ہوگا۔

ریاست میں تمدنی اور تہذیبی سرگرمیوں کو منظم کرنے کے لئے ایک کلچرل فورم کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ فورم کی رسم افتتاح گذشتہ دنوں یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب آصف اصغر علی فیضی نے انجام دی۔ اپنی افتتاحی تقریر میں انہوں نے تہذیبی قدروں کے احیاء اور تحفظ کی اہمیت پر زور دیا۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ کلچرل فورم نئے آئین کے تحت قایم ہونے والی کلچرل اکاڈمی کی ابتدائی شکل ہوگی۔ وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد نے حکومت کی طرف سے ہر ممکن امداد کا وعدہ دیتے ہوئے کہا کہ ہماری ریاست شاندار تہذیبی ورثے کی مالک ہے اور سیاسی اور سماجی ترقی کے ساتھ ساتھ اگر ہم اپنی تہذیبی قدروں سے بیگانہ رہے تو یہ ترقی نامکمل رہے گی۔ آپ نے فن کاروں کو مشورہ دیا کہ وہ سیاسی دھڑے بندیوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنے فن کی نشو و نما کریں۔

کلچرل فورم کی طرف سے جو اعلان شائع ہوا ہے اُس میں کہا گیا ہے کہ فورم ریاست کی علاقائی زبانوں کی ترویج و اشاعت کے علاوہ ہندی اور اُردو کی ترقی کے وسائل کو بھی بڑھاوا دے گا اور مقامی ادیبوں کو بیرون ریاست کے ادیبوں سے قریب کرنے کے لئے بھی کوشاں رہے گا۔ فورم نے باقاعدہ طور پر اپنا کام شروع کر لیا ہے اور معلوم ہوا ہے کہ بہت جلد ایک جامع پروگرام پر عمل درآمد شروع ہوگا۔ کلچرل فورم کا قیام ریاست کی تہذیبی زندگی کا ایک اہم موڑ ہے اور یہاں کے ادیبوں نے اس سے کافی توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ فورم کے سامنے کافی اہم کام ہے اور وہ ہے ریاست کے فن کاروں کو ریاست سے باہر روشناس کرنا اور یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے جب کشمیری ادیبوں کی تخلیقات کا ترجمہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں کیا جائے ؞

؞ ✦ ✦ ؞ ✦ ؞

حالیہ سیلابوں سے ریاست کو جو نقصان ہوا ہے ابھی اس کا مکمل اندازہ نہیں ہوا ہے لیکن قیاس یہ ہے کہ ریاست کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی اتنا خوفناک سیلاب نہیں آیا تھا۔ صرف دو دن کی متواتر بارشوں نے جہلم کو اس قدر خونخوار بنا دیا کہ ہزاروں ایکڑ زمین سینکڑوں مکانات

اور درجنوں جانیں اس کی نذر ہوگئیں۔ ابھی تک بدستور کچھ علاقے زیر آب ہیں۔ سیلاب کی ناگہانی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے موجودہ حکومت نے جس تندہی اور جانفشانی سے کام کیا ہے۔ وہ بے مثال ہے۔ وزیر اعظم تین دن اور تین رات مسلسل سیلاب زدہ علاقوں کا دورہ کرتے رہے ریاستی حکام اپنی زندگیاں خطرے میں ڈال کر سیلاب زدہ لوگوں کو امداد پہنچاتے رہے اور فوجی حکام نے اپنی جانوں پر کھیل کر ریاست کو قیامت خیز تباہی سے بچا لیا۔ فوجی جوانوں کی جرأت۔ ہمّت اور حوصلے کی داستان سننا ہو تو کسی سیلاب زدہ علاقے کے بدنصیبوں سے پوچھئے۔

سیلاب زدگان کو امداد بہم پہنچانے کا کام بڑی سرعت سے جاری ہے۔ وزیر اعظم نے جو امدادی اپیل شائع کی۔ اُس کا خاطر خواہ اثر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف انجمنوں کی طرف سے امدادی فنڈ جمع کرنے کے لئے سرگرمیاں جاری ہیں اور خیال ہے کہ موسم سرما کے شروع ہونے سے پہلے ہی مصیبت زدوں کی بحالی کا کام مکمل ہو جائے گا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

جمہوریہ ہند کے وزیر اعظم شری جواہر لعل نہرو گیارہ ستمبر کو ریاست کے دو روزہ دورے پر تشریف لائے۔ جموں اور سرینگر میں اُن کا جو تاریخی استقبال ہوا اور جس طرح ریاستی عوام نے اُن کی راہوں میں آنکھیں بچھائیں وہ اُس عقیدت کا غماز ہے کہ اُن کے دل میں اپنے اُس محبوب نیتا کے لئے عقیدت کے کتنے دریا موجزن ہیں جس نے جدوجہد آزادی سے لے کر آج تک ہر مشکل مرحلے پر اُن کے لئے اپنے رات دن ایک کر دئے ہیں۔ شری نہرو نے ریاست کے سیلاب زدہ علاقوں پر اُڑان کی۔ اور مختلف تقریبوں پر عالمی اور ملکی مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ ریاست نے گذشتہ چار برسوں میں ترقی کے جتنے منازل طے کئے ہیں۔ شری نہرو نے بجا طور پر اُن کو سراہا ہے۔ اور خالد کشمیر کی دانشمندانہ اور بہادرانہ قیادت کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ شری نہرو نے بدلتی ہوئی دنیا کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھ کر محنت اور ریاض کا جو سبق دُہرایا ہے۔ کشمیری عوام اپنی تعمیری مہم میں اُس سے ایک روشن مشعل کی حیثیت سے اکتساب فیض کریں گے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

مہجور نمبر کی اشاعت کے وقت ہم نے اعلان کیا تھا اگر یہ نمبر پسند کیا گیا تو آیندہ کے بہتر نمبروں کا ابتدائیہ ثابت ہوگا۔ خوش قسمتی سے مہجور نمبر کے پُر جوش استقبال نے ہماری ہمت بندھائی ہے۔ اور ہم مسرت سے اعلان کرتے ہیں کہ "تعمیر" کا اپریل کا شمارہ کشمیر کے انقلابی شاعر عبد الاحد آزاد کی یادگار میں آزاد نمبر کی حیثیت سے شائع ہو رہا ہے۔ مہجور نمبر کے سلسلہ میں پیش آنے والی دقتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم اپنے کرمفرماؤں سے ملتمس ہیں کہ آج سے ہی آزاد کے فکر و فن اور حیات پر اپنی نگارشات کو مرتب کر کے ہمارے پاس بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیں امید ہے کہ آزاد نمبر کا بھی اسی سرگرمی سے خیر مقدم کیا جائے گا جیسا مہجور نمبر کے حصہ میں آیا تھا۔ ہمیں اس نمبر کو کامیاب بنانے میں آپ کے مشوروں اور تعاون کا انتظار رہے گا۔

"تعمیر" کا یہ شمارہ اگست اور ستمبر کا مشترکہ شمارہ ہے چند ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے اگست کا شمارہ وقت پر نہ نکل سکا۔ اس لئے صفحات بڑھا کر اس کمی کی تلافی کرنے کی کوشش کی گئی ہے ❖

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

انتخاب فیض

اداے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہل ہوس
مدح زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں

عروج عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

بنی بساط غزل جب ڈبوئے دل نے
تمہارے سایۂ رخسار و لب میں ساغر و جام

باوا کرشن گوپال مغموم بی اے

ہے میسر دائمی دوشیزگی کشمیر کو
فوقیت ہر نقش پر حاصل ہے اس تصویر کو
مل رہی ہے اس سے دعوت دستِ دامنگیر کو
رنگ دیتا ہوں نیا جذبات کی تفسیر کو
عشوۂ خود بیں ہے اس میں غمزۂ غماز ہے
جو بھی ہے پتھر کا ٹکڑا۔ اک نگارِ ناز ہے

حلقۂ کہسار میں ہے یہ دیارِ بے نظیر
دب کے پنجے میں جیسے قید ہو "بدرِ منیر"
ابر ہے با بزمِ رنگ و بو میں قدرت کا سفیر
طائروں کے گیت۔ جھرنوں کی وہ خواب آور نفیر
بن گئی ہیں سازِ شاخیں نغمۂ بیدار کا
رہزنِ دل ہے نکھر کر رنگ برگ و بار کا

پتے پتے کی رگ و پے میں ہے خونِ زندگی
غنچے غنچے پر ہے طاری عالمِ وارفتگی
سبز پیڑوں سے چراغوں کی ہے پیدا روشنی
دیدۂ نظارہ جو پر چھا رہی ہے خیرگی
ہو گئی ہے خیمہ زن آکر یہیں روحِ بہار
یہ فضائے مشک ریز و یہ ہوائے خوشگوار

وادیوں میں بدلیوں کا اُف رے یہ حسنِ خرام
رقص میں جیسے مغنی۔ دور میں جس طرح جام
ان کی ہر جنبش حیاتِ نو کا اک دلکش پیام
ان کے سائے میں گل و لالہ کا رنگین اہتمام
چیر دیتی ہیں کلیجا کوئلیں باغات کا
جنت نظارہ ہے موسم یہاں برسات کا

اس کی جھیلوں میں کنول کے سرخ پھولوں کی بہار
نیلگوں موجوں کے گہوارے میں لرزیدہ شرار
دامنِ دل کھینچتے ہیں زعفراں کے کشت زار
برلبِ آبِ رواں سر سبز سروؤں کی قطار
ڈل کے آئینے میں برفانی کہستاں چار سو
کیف پرور سایۂ ابرِ خراماں چار سو

کیا طلوعِ صبح کا منظر کنارِ آب ہے
قرمزی کرنوں سے رنگیں دامنِ گرداب ہے
شبنمی چادر کے نیچے سبزۂ شاداب ہے
جو نگاہِ سیر بیں ہے۔ دیدۂ بے تاب ہے
برف آلودہ پہاڑوں کی شفق گوں چوٹیاں
سرخ مخمل میں مزین جس طرح شہزادیاں

رفتہ رفتہ آمدِ شامِ دلآرا۔ واہ! وا!
وہ غروبِ مہر کا رنگیں نظارا۔ واہ! وا!
چاند کا وہ آڑ میں چھپ کر اشارا! واہ! وا!
اور افق پر جھلملاتا سا ستارا۔ واہ! وا!

ہانجیوں کے گیت وہ آبِ رواں کے ساز پر
ڈوبنے لگتا ہے دل سینے میں اِس آواز پر

ڈل کے سینے پر شکاروں کی سُبک رفتاریاں ، ... اور برقی قمقموں سے اُن میں وہ ضو باریاں
دیدنی مُرغابیوں کی شوخیاں ۔ طرّاریاں ... بیٹھ کر پانی پہ ۔ پھر اُڑنے کی وہ تیاریاں
تھرتھراتا سادہ پانی میں سفینہ ماہ کا
خاطرِ مہجور سے اُٹھنا وہ شعلہ آہ کا

چاندنی کی سیم پیراہن بہاروں کا سماں ... مرغزاروں ۔ سبزہ زاروں ۔ لالہ زاروں کا سماں
کوہساروں سے اُچھلتے آبشاروں کا سماں ... ندّی نالوں کا سماں ۔ وہ جوئباروں کا سماں
آسماں سے پتّی پتّی پر وہ شبنم کا نزُول
نیند کے آغوش میں وہ غنچہ غنچہ ۔ پھول پھول

شوق کی آتش کو بھڑکاتے درختانِ چنار ... کوہ کے دامن میں چیلیں وہ قطار اندر قطار
راستہ دیتے نہیں مُرغِ نظر کو دیودار ... اُونچے اُونچے وہ سفیدے کے درختوں کی بہار
جانفزا اشفاق چشموں میں سُنہری مچھلیاں
سیم پارے تیرتے ہیں یا رو پہلی مچھلیاں

ہے کہیں پایابیٔ دریا میں بگلوں کی قطار ... ریت کے بستر پہ ہیں سارس کے جوڑے ہمکنار
اور سنّاٹے کے عالم میں وہ جھینگر کی پکار ... نیل سَر کے جھُنڈ سے کچھ دُور وہ چڑیوں کی ڈار
کبک کی کہسار سے اُڑ کر فلک پیمائیاں
اور ہر پرواز میں رنگینیاں ۔ رعنائیاں

ہر روش پر جلوہ آرا مہوشانِ نغز پوش ! ... محوِ گلگشتِ چمن کم سِن حسیں باصد خروش
حُسن کی پُرکاریاں غارت گرِ تسکین و ہوش ! ... ہر نظر نشتر زنِ دل ۔ ہر ادا محشر بدوش
حُسن کی گردن میں باہیں ہیں حمائل عشق کی
ابتدا سے یہ حسیں دنیا ہے قائل عشق کی

آب سادہ سے جِلا پاتا ہے رخسارِ حسیں ... اس کی عکاسی سے ہیں زہرہ جبیں زُہرہ جبیں
اس کی شیرینی پہ غش جنّت کی نہرِ انگبیں ... پانی پانی اس کے اِک قطرے کے آگے [illegible]
اس کے تشنہ وہ ہیں جو آبِ بقا سے سیر ہیں
اس کے اِک جرعے سے دنیا بھر کے پیاسے سیر ہیں

اس چمن کو روندنے پائے نہ صیّادِ خزاں ... طائروں کے آشیانوں پر نہ ٹوٹیں بجلیاں
خُلد کے باغوں کو بھی شرمائیں اس کے گلستاں ... اس کے پھولوں کو ستاروں کا شرف دے آسماں
پھول جائیں دو جہاں کو ایک اس کی سیر میں
پھول یہ کھٹکے نہ کانٹا بن کے چشمِ غیر میں

علی جواد زیدی

ع نگہ بلند، سخن دلنواز، دل پُرسوز

ریاستوں کی سیاست میں سکون و طوفان کے جوار بھاٹے آتے ہی رہے ہیں لیکن اسی سیاست نے کچھ ایسی شخصیتیں بھی ابھاریں جو زندگی بھر طوفانوں ہی سے کھیلتی رہیں۔ جتنی ہی ہوا مخالف اور فضا ناسازگار ہوتی اتنی ہی ان کی صلاحیتیں ابھریں اور ان کی قربانیوں کا جذبہ قوی تر ہوا۔ انہیں میں وہ پچاس سالہ نوجوان بھی ہے جسے اس کے ہم وطن 'خالدِ کشمیر' کہتے ہیں۔ مگر جو خود اپنے کو صرف 'خادمِ کشمیر' سمجھتا ہے۔

سیاسی دُور اندیشی، عملی خلوص اور تعمیری صلاحیتیں کم یک جا ہوتی ہیں مگر بخشی غلام محمد میں ان سب کا بڑا حسین امتزاج ہے۔ ان کا فکری توازن مخالفتوں میں اور بھی نکھرتا ہے لیکن ان کا مضبوط ارادہ کبھی شدت پسندی کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ ان کی سیاسی طاقت کا سرچشمہ ان کی یہی چند خصوصیات ہیں لیکن ان سے بھی بڑھ کر عوام ہیں یہی سبب ہے کہ وہ اپنی وزارت کے پچھلے دس برس میں ہمیشہ ہمالیہ کی طرح اٹل رہے۔ وہ مخالف دھاروں کا مُنہ موڑتے اور شورش پسند دریاؤں کا راستہ بدلتے رہے اور پھر بھی ان کی ہردلعزیزی بڑھتی ہی رہی۔ کیونکہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا، عوام کی بھلائی کے لئے کیا خلوص سے کیا اور ضمیر کے حکم سے کیا۔

ہمالیہ کی حسین ترین ریاست کشمیر ماضی قریب میں طوفانوں کا گہوارہ بنی رہی ہے اور ہر طوفان کا مقابلہ بخشی صاحب کو ہی بڑھ بڑھ کر کرنا پڑا ہے۔ لیکن کبھی نہ تو ان کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی ہے اور نہ ان کے چہرے پر فکر و پریشانی کی شکنیں دکھائی دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا راستہ آج تک کوئی نہیں روک سکا۔ وہ رکاوٹوں کے باوجود بڑھتے رہے اور بڑھتے ہی جائیں گے۔

جمہوریتوں میں بھی اکثر اہم عوامی لیڈروں کے اردگرد حفاظتی پولیس، سرکاری متوسلین، حکام اور موقع پرستوں کا ایک جم غفیر ہر وقت گردش کرتا رہتا ہے اور دُور سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پُرانے جاگیردارانہ رجحانات کلیتہً ختم نہیں ہوئے ہیں۔ بالخصوص ہمارے ذہن میں جب وزیر اعظم کا تصور آتا ہے تو اکثر ہم سمجھتے ہیں کہ وہاں کوئی سجا سجایا دربار ہوگا جہاں حاجب اور پہرہ دار عوام ہی کا نہیں خواص کا بھی راستہ روک دیتے ہوں گے۔ جہاں درباریوں کی ریشہ دوانیاں ہونگیں اور خوشامدیں پھل پھول رہی ہونگی۔ عنایات اور مراعات بٹ رہی ہونگیں اور ایمانداری اور خلوص ابھی "کیو" میں کھڑے ہوئے اپنی باری کا انتظار ہی کر رہے ہوں گے۔ لیکن بخشی صاحب کے پاس پہنچتے ہی خوابوں کا یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ تو ہمیں آپ جیسے ہیں۔ قانون نے انہیں پولیس محافظ، پہرہ دار سبھی دیئے ہیں لیکن کوئی محافظ، کوئی افسر غریب سے غریب فریادی کا بھی راستہ نہیں روک سکتا۔ وہ اپنے "بخشی صاحب" کے پاس اپنے 'خالدِ کشمیر' کے پاس بے دھڑک، بے روک ٹوک چلا جاتا ہے۔ ان سے فریاد کرتا ہے۔ ان سے بے خوف و خطر باتیں کرتا ہے۔ بحث کرتا ہے۔ مطالبہ کرتا ہے اور مطمئن ہو کر واپس جاتا ہے۔ ایسے ملنے والے سینکڑوں کی تعداد میں روزانہ ان کی جائے قیام پر پہنچتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو پُورا گاؤں، یا کسانوں اور مزدوروں کا کوئی بڑا وفد "خالدِ کشمیر زندہ باد" کے نعرے لگاتا ہوا حاضری اور سماعت کا حق طلب کرتا ہے۔ ہفتے میں سنیچر کے دن تو ہر آنے والے سے بخشی صاحب ضرور ملتے ہیں۔ فرداً فرداً

بھی اور گروہوں میں بھی۔

بخشی صاحب کی فطرت ایسے ہی مواقع پر اپنی تمام خوبیاں اور بزرگیاں لے کر سامنے آجاتی ہے وہ سینکڑوں افراد کے ان مجمعوں میں مسکراتے ہوئے پہنچ جاتے ہیں۔ اور اپنی مسکراہٹ کا جادو ساری فضا پر پہلی ہی نظر میں بکھیر دیتے ہیں۔ وہ ایک ایک شخص کو صورت سے اور نام سے اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ برسوں کی سیاسی زندگی انہوں نے عوام ہی کے درمیان تو گزاری ہے۔ افسر اور عہدہ دار زمیندار اور تجار تو آج ان کے گرد نظر آتے ہیں ورنہ وہ تو خود ہی ایک غریب متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ساری زندگی غریبوں میں ہی گزاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملاقاتیوں۔ غرض مندوں اور فریادیوں سے وزیر اعظم کی طرح نہیں۔ بلکہ بڑے بھائیوں کی طرح اور بزرگوں کے سامنے وفادار اور فرض شناس بیٹوں کی طرح ہنستے بولتے ہیں۔ رونے والوں کے آنسو خشک کرتے ہیں اور مخالفوں کو بھی موم کی طرح پگھلا دیتے ہیں۔ کیونکہ ان میں قوی عزم و ارادہ کے ساتھ ساتھ عوام کی دوستی اور راست کاری کا شدید جذبہ موجود ہے۔

عوام سے گہری دلچسپی سیاسی مقتضیات کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ بلکہ بخشی صاحب کے لئے بالکل فطری ہے۔ وہ جولائی ۱۹۰۷ء میں ایک غریب کشمیری خاندان میں پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنے بچپن اور جوانی کا زمانہ انہیں اقتصادی تلخیوں اور سماجی مایوسیوں میں گزارا۔ جن سے کشمیر کی بہت بڑی آبادی دو چار رہی ہے۔ گھر کے حالات سے ہی مجبور ہو کر انہیں سلسلۂ تعلیم ترک کرنا پڑا اور دشوار گزار راستوں کو طے کر کے دور دراز اور مفلوک الحال لداخ میں ایک ابتدائی مدرس بننا پڑا کیونکہ زندگی بہت سخت گیر ہے اور حقیقت اور خواب کے مابین بہت بڑی خلیج واقع ہے۔

بخشی صاحب کے لئے لداخ جانا "تلاش معاش کی منزل" آخر اور تلاش آزادی و خوش حالی کی منزل اول ثابت ہوئی۔ غربت سرینگر میں بھی تھی لیکن وہاں خوش حالی کے آثار تو تھے اور یہ لداخ تو گویا غربت کا آبائی مسکن تھا۔ درد مند دل اس انتہائی غریبی کو دیکھ کر بے چین ہو اُٹھا۔ ان کے سامنے ایک دوہرا الم تھا۔ صرف اپنی معاش کا بندوبست یا تمام ریاست کے اقتصادی اور معاشرتی حالات کو بہتر بنانے کا بندوبست اتفاق سے یہی زمانہ میں سارا ہندوستان ایک اہم سیاسی تحریک سے تہ و بالا ہو رہا تھا۔ ترک موالات اور مقاطع کی آوازیں گوشے گوشے سے اُٹھ رہی تھیں۔ تحریک خلافت شباب پر تھی۔ کشمیر کے سماجی اور اقتصادی اندھیرے میں بخشی صاحب کو امید کی ایک رینگتی ہوئی کرن نظر آئی اور انہوں نے تن تنہا یہ نعرہ بلند کیا کہ ہر غیر ملکی مال کا بائیکاٹ کیا جائے" اس وقت تک کوئی اور کشمیری کارکن یا رہنما عملی سیاست میں نہیں آیا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں حکومت کشمیر نے بخشی صاحب کو گرفتار کر لیا۔

یہ بخشی صاحب کی پہلی اور آخری گرفتاری نہیں تھی۔ چند ہی سال بعد ریاست کشمیر کی مطلق العنانی کے خلاف ایک عوامی تحریک کا آغاز ہوا جو مسلم کانفرنس نامی جماعت کے زیر پرچم چلائی گئی تھی۔ بخشی صاحب بھی اس تحریک کے بانیوں میں تھے۔ اس عوامی بغاوت کے جرم میں ان پر طرح طرح کے مظالم کئے گئے اور وہ مہاراجہ کے قید خانے میں ڈال دئے گئے۔ لیکن قید سے چھوٹتے ہی وہ پھر تحریک میں کود پڑے۔ کشمیری تحریک کے اور قائدین تو خالص سیاسی سطح پر ہنگامہ آرائیوں کی تدبیریں کرتے رہتے تھے لیکن بخشی صاحب نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اقتصادی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہو گی اور اقتصادی آزادی کے لئے طبقاتی بیداری ضروری ہے۔ اسی لئے انہوں نے کشمیر میں ٹریڈ یونین تحریک کی بنیاد ڈالی۔ سیاسی اور اقتصادی تحریکوں کو جذباتی سہارا دینے کے لئے انہوں نے طلباء کی تحریک بھی چلائی۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اور کشمیری قائدین کے مقابلے میں ان کی نظر سیاسی طور پر زیادہ ہمہ گیر تھی اور ہندوستان کے سیاسی اداروں سے ان کی وابستگی گہری تھی۔

چنانچہ جب ۱۹۴۶ء میں "کشمیر چھوڑ دو" تحریک چلی تو انہوں نے سب سے پہلے اس کو ہندوستان کی عام سیاسی تحریک سے وابستہ کرنا چاہا۔ مہاراجہ کی پولیس ان کی تاک میں تھی لیکن وہ اس "حلقۂ صد کام نہنگ" سے

رِیچ ہی نکلے۔انہوں نے سارے ہندوستان کا طوفانی دَورہ کیا۔کشمیر کی عوامی تحریک کے بارے میں رجعت پسندوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دُور کیا اور ترقی پسند اور وطن پرور حلقوں کی ہمدردیاں حاصل کیں۔ پندرہ مہینوں تک اس طرح ریاست بدر رہنے کے بعد جب وہ ۱۹۴۷ء میں کشمیر واپس آئے تو ان کا فاتحانہ استقبال کیا گیا۔

اس تمام عرصے میں ریاست کے فرقہ پرست اور رجعت پسند عناصر فرقہ پرستی کی آگ بھڑکانے میں مشغول رہے۔ وہ کشمیریوں میں تفرقہ ڈال کر تحریک آزادی کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ بخشی صاحب نے ریاست میں واپس آکر ان عناصر کی مخالفت شروع کی۔ چند ہی مہینوں بعد ریاست کی پاک سرزمین پر بیرونی حملہ آوروں نے قدم رکھے۔ اس وقت بخشی غلام محمد ہی کی تنظیمی صلاحتیں کام آئیں۔ انہوں نے حملہ آوروں کے خلاف ایک زبردست مورچہ بنایا۔ اس زمانے میں جبکہ کشمیریوں کی آزادی ہی نہیں بلکہ عزّت و ناموس بھی خطرے میں تھی۔ بخشی صاحب نے دن رات کام کیا اور خطرناک سے خطرناک محاذوں کا دَورہ کیا۔ اور دشمنوں کے دفاع کے تمام انتظام مکمل کئے۔

ریاست میں جب پہلی عوامی وزارت بنی تو آپ کو نائب وزیر اعظم کا عہدہ دیا گیا اور بہت سے اہم محکمے آپ کے سُپرد کئے گئے اور آپ نے ان محکموں کے تمام کام بڑی تندہی سے کئے۔ پھر جب کشمیری قیادت پر ۱۹۵۳ء کا بحران طاری ہوا تو بخشی غلام محمد ہی نے کشمیری عوام کی رہنمائی کی اور وہ اس خطرے سے ریاست کو صاف بچا لائے۔

۹ اگست ۱۹۵۳ء سے وہ ریاست کے وزیر اعظم ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سیاسی اعتبار سے آج کوئی بھی ان کا ہم پلہ نہیں ہے۔ لیکن اس اقتدار نے اِن میں کوئی نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے۔ وہ اب بھی اسی طرح ہر ایک سے ملتے ہیں اور عام مجمعوں میں بھی غریب ترین ساتھیوں کی گردن میں اس طرح باہیں ڈال دیتے ہیں کہ وہ عام شہری کے علاوہ کچھ اور معلوم ہی نہیں ہوتے وہ اپنے پرانے ساتھیوں، دوستوں اور عزیزوں کو نہیں بھولے وہ انہیں بھول ہی نہیں سکتے۔

بخشی صاحب کشمیر کے آہنی انسان ہیں۔ ان کا ارادہ اٹل ہے۔ لیکن وہ ضدی نہیں ہیں۔ وہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے ساتھیوں سے پورا مشورہ کرتے ہیں۔ اور ان کی مُناسب رائے کی قدر بھی کرتے ہیں وہ رائے عامہ کے سامنے جھکنا بھی جانتے ہیں اور گمراہوں کو اپنے راستے پر چلانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

بخشی صاحب فرشتہ نہیں ہیں بلکہ ہماری اور آپ کی طرح خطا و نسیان سے مرکب انسان ہیں۔ لیکن عوام سے شدید محبت اور عمل کا شدید جذبہ اُن کو اُن کی تمام کمزوریوں سے بچا بھی لیتا ہے۔ جن کا بہت سے سیاست دان شکار ہو جایا کرتے ہیں۔ مثلاً وہ لال فیتے کی جکڑ بندیوں کے زیادہ قائل نہیں ہیں۔ کیوں کہ ان کا مقولہ ہے کہ کام ہونا چاہیئے اور جلد سے جلد ہونا چاہیئے۔ اسی طرح وہ غریب اور حاجت مند کی امداد کے لئے ہر قانون میں ترقی پسندانہ لچک پیدا کر لیتے ہیں۔ ارباب نظر جانتے ہیں کہ اس جرأت کار کے بغیر ترقی ممکن ہی نہیں ہے۔

وہ فی الحقیقت بے حد سیماب فطرت ہیں۔ ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں، ہر شئے پر نظر رکھتے ہیں اور ہر خامی کو ناپسند کرتے ہیں۔ حکام اسی لئے اِن سے گبھراتے ہیں۔ کیونکہ وہ لال فیتے کے زیادہ قایل نہیں ہیں۔ جو لوگ کام سے گریز کرتے ہیں۔ انہیں وہ خوب پہچانتے ہیں وہ ان سے بھی ناواقف نہیں ہیں جن کی "زبان کچھ اور کہتی ہے۔ اور عمل کچھ اور کہتا ہے۔" جو لوگ ان کے گرد خوشامدوں سے جھولیاں بھرے، تملق کے پھول نچھاور کرتے ہیں انہیں بھی ان کی دُور رس نگاہ اچھی طرح جانتی ہے۔ مردم شناسی، فطری ذہانت، جذبہ عمل اور صاف گوئی ان کی خاص صفتیں ہیں۔

وہ اچھے دوست اور اچھے عزیز ہی نہیں بلکہ اچھے مخالف۔ یعنی ان لوگوں میں ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ ؎

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

اس معاملے میں وہ کچھ رفیع احمد قدوائی سے ملتے جلتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے دشمن بھی ان کی صلاحیتوں کا لوہا مانتے ہیں۔ اور اس بات کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اختلاف کی خلیج دُور ہو

فراقؔ گورکھپوری

غزل

مشیت برطرف کیوں حالتِ انساں بتر ہوتی — نہ خود یہ زندگی ہی زندگی دشمن اگر ہوتی

یہ کیا سنتا ہوں جنسِ حسن ملتی نقدِ جاں دیکر — ارے اتنا تو ہم بھی دے نکلتے جو خبر ہوتی

سیہ زلفوں کا سایہ ڈوبتے دن پر جو پڑ جاتا — ابد کی شام سے لمبی یہ شام مختصر ہوتی

دھمک سی ہونے لگتی ہے ہوائے گل کی آہٹ پر — قفس میں بوئے مستانہ بھی وجہِ دردِ سر ہوتی

کہاں تک راز کے صیغہ میں رہتی نیتِ رنداں — نگاہِ مستِ ساقی بھی کہاں تک بے خبر ہوتی

تسلی اس نگاہِ حیلہ جو کی پھر تسلی ہے — نہ ہوتی اس سے تسکین دل غمگیں مگر ہوتی

حقیقت خورد بیں یادوربیں سے کب نظر آئی — کبھی تو سامنے کی چیز پر اپنی نظر ہوتی

سفر میں زندگی کے خیر بھی بڑھتے ہی رہتے ہیں — ٹھہر جاتے جہاں یہ پاؤں منزل پُرخطر ہوتی

یہ مانا انقلاب زندگی میں لاکھ خطرے ہیں — تمنّا پھر بھی ہے یہ زندگی زیر و زبر ہوتی

زہے تہذیب تو ہوتا ہی کیوں تہذیب کا رونا — یہ تہذیب دماغ و دل اگر انسان گر ہوتی

کبھی اے کاش مرجھائے ہوئے دن اپنے کھل اٹھتے — کبھی تو روئے رنگیں کی گلابی دوپہر ہوتی

بشر بالفرض ہر دولت سے مالا مال ہو جاتا — محبت گر نہیں ہوتی تو مشکل سے بسر ہوتی

اسیرانِ قفس کی بے نیازی جائے عبرت ہے — نہ ہوتے بال و پر، خیر آرزوئے بال و پر ہوتی

فراریت کے ہم قائل نہیں لیکن تمنّا تھی — کہ اپنی کوئی دنیا آسمانوں سے ادھر ہوتی

کبھی تو نقشِ پا کے پھول کھلتے اس خیاباں میں — کبھی تو سرزمینِ دل بھی تیری رہگذر ہوتی

جسے ہم شامِ غم کہتے ہیں اک پردہ ہے غفلت کا
فراقؔ اس شامِ غم کی آنکھ کھلتے ہی سحر ہوتی

پروفیسر محمد حبیب

۱۸۵۷ء کی اہمیت

ہو سکتا ہے کہ ایک صدی میں کوئی خاص بات نہ ہو لیکن تین پشتوں کے تجربوں میں کچھ اہمیت ضرور ہے۔ یہ ٹھیک ہے لیکن جب ہم ہندوستان کی پچھلی چار سو سال کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو چار صدیاں الگ الگ نظر آتی ہیں۔ ۱۵۵۵ ۔ پانی پت کی دوسری لڑائی اور مغلیہ حکومت کا قیام۔ ۱۶۵۸ ۔ وراثت کی جنگ میں اورنگ زیب کی فتح، جس سے سلطنتِ مغلیہ کی ترقی معکوس شروع ہوئی اور جس کا منطقی نتیجہ ۱۷۵۷ میں ظاہر ہوا۔ ۱۷۵۷ ۔ پلاسی کی لڑائی اور برٹش راج کا قیام۔ ۱۸۵۷ ۔ برٹش راج کے خلاف پہلی، لیکن ناکام جدوجہد۔ ۱۹۴۷ :- آزادی۔

۱۸۵۷ء کے ہندوستان کے بارے میں بنیادی بات ہے اس وقت کے یورپ کے مقابلے میں اس کی پسماندگی یورپ بہت ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکا تھا۔ رینا سانس یعنی نشاۃ ثانیہ۔ پھر ریفارمیشن یعنی اصلاح' سولھویں صدی میں سرمایہ داری کی ترقی، انگلینڈ کا پیورٹن انقلاب' ۱۷۸۹ کا انقلابِ فرانس، نپولین۔ نئی ریاستوں کی تنظیم ـ جمہوری یورپ کا اصول۔ انگلینڈ کی روز افزوں صنعتی ترقی۔ اور ایک ایسے مضبوط بحری بیڑے کی تعمیر جس سے انگریزوں کو سمندر پر اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ یہ اور ایسی ہی دوسری قوتیں یورپ کی ترقی کا پس منظر تھیں۔ دوسری طرف ہندوستان کی یہ حالت تھی کہ ہم نہ صرف اپنے پچھلے معیار سے گر گئے تھے بلکہ باہر کی دنیا سے افسوسناک حد تک ناواقف تھے۔ ان حالات میں ہم نے جدوجہد شروع کی۔ لیکن نہ ہمیں موقع کی نزاکت کا احساس تھا اور نہ ان عناصر کا شعور تھا جو اس وقت کام کر رہے تھے۔ ہم نے ایک ایسی طاقت سے ٹکر لی تھی جس کا سمندروں پر قبضہ تھا جس کا پیداواری نظام یورپ کی دوسری ریاستوں سے بہتر تھا۔ جس کے پارلیمنٹری ادارے بہت ترقی یافتہ تھے۔ اور جیسے نو آبادیاتی راج کے گر آتے تھے۔ ہم اپنی بغاوت میں سارے ہندوستان کو شامل نہ کر سکے' اور اگرچہ ہمارا انقلاب قومی تھا اور اسے عوام کی حمایت حاصل تھی لیکن وہ منظم نہیں تھا۔ اس میں انتشار تھا۔

انقلاب کے ایک عرصے بعد تک ہندوستانیوں کو اس کے بارے میں لکھنے کی آزادی نہیں تھی۔ لیکن غیر ملکی حکمرانوں کی طاقت ہندوستانیوں کو اس کے بارے میں باتیں کرنے سے نہ روک سکی۔ میری عمر کے لوگ، جن کے عہد طالب علمی کے سیاسی شعور کا زمانہ اس صدی کی پہلی دہائی ہے انہوں نے بزرگوں سے ۵۸ - ۱۸۵۷ میں انگریزوں کی بربریت کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیاں سنی ہیں۔ ان کے بیان کا یہ موقعہ نہیں ہے لیکن جو شہادتیں موجود ہیں۔ ان سے یہ بات بلا شک و شبہ ثابت ہوتی ہے کہ انقلاب کو دبانے کے لئے دہشت اور بربریت کا سہارا لیا گیا تھا، تاکہ ہندوستانیوں کے ذہنوں میں انگریز کی غلامی سے آزاد ہونے کی تمنا نہ پنپنے' اور یہ بات واضح ہو جائے کہ ہندوستانی چاہیں یا نہ چاہیں، انگریز حکومت کریں گے اور ان کی حکمرانی اٹل ہے۔ اس لئے دو اصول وضع کئے گئے۔ دونوں اصول انگریزوں کے سیاسی مقاصد پورے کرتے تھے۔ اگرچہ دونوں اصول بالکل غلط تھے۔

(۱) حکمران انگریزوں کی پہلی جبلت INSTINCT یہ تھی کہ تحریک کو "قومی بغاوت" گردانا جائے، تاکہ اس جرم میں سزائیں دی جا سکیں۔ انگریز کی بنیادی جبلت صحیح تھی۔ ۱۸۵۷ کی تحریک کا صرف ایک مقصد تھا اور وہ تھا برٹش راج کا خاتمہ۔ لیکن بعد میں جب "غدر" کے انگریز مورخوں نے "سازشوں" کے نعرے لگانا شروع کئے (ہندوستانی رہنماؤں کی آپس کی "سازشیں"، راجاؤں کی "سازشیں"۔ غیر ملکی طاقت سے "سازشیں" وغیرہ۔ وغیرہ) تو ان مورخوں کو کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملے۔

جو "ثبوت" انہیں ملے وہ بازار کی گپوں سے زیادہ نہیں۔

(ب) لیکن اس تھیوری میں ایک بہت بڑا نقص تھا۔ اس سے برٹش راج کے تئیں ہندوستانیوں کی بددلی ثابت ہوتی تھی اور یہ بات بھی ثابت ہوتی تھی کہ برٹش راج کی اساس زور اور زبردستی ہے۔ انقلاب کے بعد ملکی اور بین الاقوامی مقاصد کے لئے برٹش پالیسی کا تقاضا کچھ اور تھا۔ وہ تقاضا یہ ثابت کرنا تھا کہ ہندوستانی عوام نے برٹش راج خوشی خوشی قبول کیا ہے اس لئے وہ تھیوری جسے سب سے زیادہ سر سید احمد خاں نے رائج کرنے کی کوشش کی، اسی کو سرکاری طور سے قبول کر لیا گیا۔ اس "خوشگوار" تھیوری کے مطابق ۱۸۵۷ء کی تحریک خالصتہً سپاہیوں کی شرارت تھی اور یہ شرارت انہیں تک محدود تھی۔ عوام اس سے بالکل لاتعلق تھے۔ یہ حکومت اور ملازموں کا معاملہ تھا۔ ملازموں کو سزائیں دی جا چکی تھیں۔ اب کچھ اور کرنے یا کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ معاملہ ختم ہو گیا تھا۔ حکمرانوں کے لئے یہ تھیوری بہت سودمند تھی، لیکن صرف ایک معین عرصے تک لیکن یہ سرے سے غلط تھی اور اس کے مُصنّف کو بھی معلوم تھا کہ یہ غلط ہے۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب ایک اُبال تھا اور غیر منظّم تھا۔ اس انقلاب کی پشت پر عوام تھے۔ بُرے سلوک، استحصال اور ناامیدی نے انہیں انقلاب پر مجبور کر دیا تھا۔ اس میں ہر اس بات کا فقدان تھا جو ایک مؤثر اور کامیاب انقلاب کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ پہلے سے کسی عمل کے حسن و قبح پر سوچ بچار نہیں کیا گیا تھا۔ آئندہ کی ضرورتوں پر نہ سوچا گیا تھا اور ان کو فراہم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ عین وقت تین فرسودہ سیاسی اداروں کو سنبھالنے کی کوشش کی گئی۔ دہلی میں مغلیہ سلطنت، لکھنؤ میں اودھ کی بادشاہت اور کانپور میں پیشوا کا اقتدار ۱۸۵۷ء کے انقلابی ان دو باتوں میں بھی ناکام ہوئے جن کا لحاظ دانش مند انقلابیوں نے ہمیشہ رکھا ہے۔ وہ دو باتیں یہ ہیں:- قانون اور نظم و نسق کے قیام کی کڑی نگرانی اور انقلاب میں کام کرنے والوں کو تنخواہ دینے کے لئے محصولوں کی باقاعدہ اور پُرامن وصولی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ ہتھیار بنانے کا بھی باقاعدہ انتظام نہیں تھا۔

میں نے بچپن میں سُنا تھا کہ لکھنؤ کے شہدوں نے بھی انقلاب میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا کسی صورت سے انہیں ایک توپ مل گئی۔ لیکن اس کے لئے ان کے پاس بارود اور گولے نہیں تھے۔ انہوں نے آتش بازی کی بارود سے اینٹیں داغیں۔ عہدِ وسطیٰ میں نظم و نسق کی صلاحیتیں ہندوستانیوں میں عروج پر تھیں۔ اس فن میں صرف چینی ان سے بہتر تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے بعد کی نسلوں سے یہ روایت مفقود ہو گئیں۔ کوئی درمیانہ طبقہ نہیں تھا جو رائے عامہ بناتا اور قایم رکھتا۔ پرانے تعلیمی ادارے فرسودہ، زوال پذیر تھے، اور جو کچھ انہیں پڑھایا جاتا تھا وہ ۱۸۵۷ء میں بے مصرف تھا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے علم کس منزل میں تھا اس کی ایک مثال یہ ہے کہ سر سید احمد خاں تک نے ایک تصنیف میں زمین کے چپٹے ہونے کی دلیلیں دیں۔ رائے عامہ کی غیر موجودگی میں عوام کی بے شعوری سے بدلتے ہوئے ردِّ عمل اور ان میں دُور اندیشی کے فقدان نے تحریک کا خون کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ انقلاب نے کسی عظیم رہنما کو نہیں اُبھارا۔ مروّجہ سیاسی آداب کے تحت راجاؤں اور نوابوں کے علاوہ کسی اور کی رہنمائی قبول کرنے کے لئے عوام تیار نہیں تھے اور جاگیرداری میں گھُن لگ چکا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ (SUBSI DIARY SYSTEM) باجگذاری کا سسٹم تھا۔ اور مسلسل اطاعت کی شرط پر اس کو زندہ رہنے دیا گیا تھا۔ انقلابیوں کو ان کی پریشانیوں نے تخیل میں پناہ لینے پر مجبور کیا اور انہوں نے سوچا کہ ہندوستان کے بڑے راجہ ان کی مدد کریں گے لیکن کسی بڑے راجہ نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ شرف صرف دوسرے درجے کے راجاؤں کو حاصل تھا کہ انہوں نے انقلابیوں کا ساتھ دیا۔ رانی جھانسی، نانا صاحب اور آرہ کے کنور سنگھ نے قومی تحریک میں شرکت کی۔ جو دستاویزیں ہمارے پاس ہیں اُن سے تین باتیں یقینی طور سے ثابت ہوتی ہیں۔ انگریز افسروں سے ان کے ذاتی تعلقات اچھے تھے۔ انہوں نے اپنا ہاتھ کسی جُرم میں نہیں ڈالا اور ان کے دامن پر کوئی دھبّہ نہیں ہے۔ انہوں نے ذاتی مفاد کے لئے انقلاب میں شرکت نہیں کی بلکہ حق و صداقت کے کاز کے لئے انہوں نے اپنی جانوں کو عزیز نہیں رکھا۔ اس کے باوجود کہ بعض مؤرخوں نے ان کے ساتھ ناانصافی کی اور ان کو غلط رنگ میں پیش کیا۔ ہندوستان کے لوگ ان کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیں گے۔ انقلاب کے وہ رہنما جن کا تعلق رجواڑوں اور نوابی

سے نہیں تھا۔۔۔ مولانا احمد اللہ، تانتیا ٹوپی، عظیم اللہ اور برکت احمد (لکھنؤ کے سپاہیوں کا لیڈر) صبری اور اولوالعزم تھے۔ کسی وقت انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی۔ وہ صحیح معنوں میں قومی ہیرو تھے۔ انہوں نے نسبتاً دوسرے درجے کا رول ادا کرنے پر قناعت کی۔ کیونکہ رائے عامہ نے انہیں اسی کی اجازت دی۔ دہلی اور لکھنؤ کے شاہی محلوں کو سعادت کی کوئی سند نہیں دی جاسکتی۔ حالات ایسے تھے کہ چندر گپت اکبر یا شیواجی بھی ہوتے تو ان کی ساری صلاحیتیں صرف ہوجاتیں۔ ایسے حالات میں ہندوستانی عوام صرف اس کل ہند لیڈر کو قبول کرنے کو تیار تھے جو زوال پذیر رجواڑے سے ہو۔

پھر بھی اپنی تمام خامیوں کے باوجود ۱۸۵۷ء کی تحریک کو کسی بھی صورت میں سپاہیوں کا غدر نہیں کہا جاسکتا۔ ایک محدود خطے میں (اترپردیش، دلی اور اس کے گرد و نواح میں) یہ سارے عوام کا انقلاب تھا۔ اگر برطانوی حکومت کو صرف سپاہیوں کے غدر کا سامنا ہوتا تو اسے کچلنے میں انہیں کوئی خاص دقت نہ ہوتی۔ دقت اس وقت پیش آئی جب عوام نے سپاہیوں کا ساتھ دینا شروع کیا اور اس کے بعد انگریزی حکومت دھڑ دھڑا کر گر پڑی۔

"سپاہیوں کے غدر" کے سرکاری مفروضے سے پہلے ۱۸۵۸ء میں ایک کتاب (Topics for Indian Statesmen) شائع ہوئی تھی۔ اس کے مصنف John Bruce Norton نے لکھا تھا "In Oudh the whole population was up in arms; every village was fortified and every man's hand was against us .... So far as Oudh at least is concerned, we have to deal with a thoroughly National Rebellion." لکھنؤ میں ریزیڈنسی کے محاصرے کے لئے جو اسّی ہزار آدمی جمع ہوئے تھے۔ ان میں تقریباً آدھے کسان تھے جو فصل بونے کے زمانے میں شہر سے واپس چلے گئے۔

۱۸۵۸ء میں یہ حقیقت ہر مرد عورت اور بچے کو معلوم تھی کہ برطانوی نظم و نسق بالکل ختم ہوگیا تھا یہ بات دوسری ہے کہ یہ خاتمہ مستقل نہیں تھا۔ یہاں تک کہ سر سید احمد خاں کو بھی "اسباب بغاوت ہند" میں اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ بجنور میں انگریزوں کی حکومت بالکل ختم ہوگئی تھی اور حکومت کے کچھ افسروں نے بھی انقلابیوں کا ساتھ دیا تھا اور سوائے ان چند افسروں کے، جن کو اپنے عہدے عزیز تھے اور جنہیں اس کی توقع تھی کہ ان کے عہدے انہیں واپس ملیں گے، ضلع بجنور کی آبادی کا کوئی اور حصہ انگریزوں کا وفادار نہیں رہ گیا تھا لیکن بعد میں ایک مفروضہ وضع کیا گیا۔ اور تحریک کو چند مرکزوں تک محدود بتایا گیا اور سارا "الزام" بپھرے ہوئے سپاہیوں اور چند رہنماؤں کے سر تھوپ دیا گیا۔ یہ "بنائی ہوئی" تاریخ ہے اور حقیقت سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ انگریزوں نے جن لوگوں سے زمینیں چھین لی تھیں، اس عرصے میں ان میں سے کوئی آدھے لوگوں کو دیہی علاقوں میں اپنی زمینوں پر پھر قبضہ مل گیا۔

سپاہیوں کی اصل اہمیت کیا ہے؟ ۱۸۵۷ء سے قبل ایک صدی تک سپاہیوں نے نمک خواری کا ثبوت دیا اور غیر ملکی آقاؤں کا حق نمک ادا کیا۔ ہندوستان کے ہر راجہ کو ان سپاہیوں کی وجہ سے انگریزوں کی اطاعت قبول کرنا پڑی لیکن ۱۸۵۷ء میں اودھ کو پُرامن طریقے سے تاراج کر لینے کے بعد انگریز حکمرانوں نے محسوس کیا کہ سپاہیوں سے جو کام لیا جانا تھا وہ لیا جاچکا، اور اب ان کو اپنے صحیح مقام کا احساس دلایا جائے۔ کسی وقت بھی سپاہیوں نے کوئی سازش نہیں کی۔ اور نہ سازش کا امکان تھا۔ ان پر انگریز افسروں کی کڑی نظریں تھیں، اگر واقعی کوئی سازش ہوتی تو انگریز افسروں کو شروع ہی سے اس کا پتہ چل جاتا۔ سر جان لارنس نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے:۔

"If there was a conspiracy in the Country, and the conspiracy extended to the army, how can it be reasonably explained that none of those who adhered to our cause were acquainted with the circumstances? However

Small may be the number of our adherents when compared with those that took part against us, the actual number of the former is considerable. Many of these remained true under all trials, others died fighting on our side. None of these people can speak of conspiracy in the first instance, none again of the 'conspirations' who expiated their guilt by the forfeit of their lives, ever made any such confession, though such confession doubtless would have saved their lives. None of the documents or papers that I have seen lead to such an impression"

سپاہیوں نے کوئی سازش نہیں کی تھی۔ انہیں اُکسایا گیا تھا۔ اشتعال دلایا گیا تھا۔ انگریز افسروں کو معلوم تھا سپاہی ان کے قابو میں نہیں ہیں۔ اور وہ چربی لگے ہوئے کارتوسوں کو امتحان بنا کر سارے ملک کے سپاہیوں کو سبق پڑھانا چاہتے تھے۔ سرکاری دستاویزوں سے اب اس بات کی شہادت مل گئی ہے کہ نئے کارتوسوں پر سؤر اور گائے کی چربی تھی۔ صرف ایسے ہی رویے سے اس بات کی وضاحت ہو سکتی ہے کہ میرٹھ کے ۸۵ سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کیا۔ تو ان کو دس سال قید کی سخت سزا دی گئی۔ اور پھر کس طریقے سے اس پر عمل کیا گیا۔ یہ اندھا دھند قدم اٹھانے سے پہلے انگریز یہ بات بھول گئے کہ سپاہیوں کی بھی ایک "برادری" بن گئی تھی اور وہ جذباتی طور سے ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔

جو کچھ ہوا۔ وہ قدرتی اور لازمی تھا۔ انقلاب کی صحیح رہنمائی کے لئے ضروری ہے کہ وہ شہریوں سے شروع ہو اور انہیں کی نگرانی میں سپاہیوں تک پہنچے۔ انقلاب کا دوسرا راستہ بدقسمتی ہے۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو جب سپاہیوں نے دلی کی طرف کوچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ تو بلاشبہ انہیں دو باتوں کا احساس تھا۔ پہلی بات یہ کہ انقلاب کی نمایندگی کرنے والا سول سمبل ہونا چاہیئے۔ دُوسری بات یہ کہ روزگار اور ماہ بماہ تنخواہ کی ضمانت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی تھی۔ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھے ان میں سے زیادہ تر اچھے گھرانوں سے تھے، پھر بھی ان کا تعلق محنت کشوں کے اوپری طبقے سے تھا۔ بہتر عناصر ان گھرانوں سے آئے تھے۔ جن کو مشکل سے پڑھا لکھا جا سکتا ہے۔ ان میں ایک بھی تربیت یافتہ افسر نہیں تھا۔ انگریز افسروں نے جو ضبط و نظم سختی سے اُن پر حاوی کیا تھا، وہ دھوئیں کی طرح اُڑ گیا۔ اگر کوئی سول اتھارٹی ہوتی جو ان کے اور ان کے کنبے کے گذارے کے لئے اُن کی نصف تنخواہوں کا بندوبست کر سکتی تو وہ اسکے وفادار رہتے لیکن ایسی کوئی اتھارٹی نہیں تھی اس لئے معاملات انہیں خود اپنے ہاتھ میں لینا پڑے۔ پہلے انہوں نے سرکاری خزانوں کو لوٹا۔ اس کے بعد انہوں نے امیروں کو لوٹا، اور جس پر ان کا ہاتھ پڑ گیا۔ اس کو لوٹا۔ ان کی فوجی کاروائیاں مضحکہ خیز تھیں۔ جسے کمانداری کہتے ہیں۔ وہ سرے سے تھی ہی نہیں لیکن تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ وقت آنے پر وہ بہادروں کی طرح لڑے اور اپنی جانیں دیں۔ ان میں سے بہتوں کو توپ کے دھانے سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ باقیوں کو اذیتیں دے کر مارا گیا۔ وُہ ثابت قدم رہے۔ ان کی آنکھیں نم نہیں ہوئیں جس مقصد کے لئے وہ لڑے تھے، اس مقصد کے لئے مرنے کے آداب انہیں معلوم تھے۔ وہ مقصد تھا۔ ہندوستان کی آزادی۔

عام لوگوں کے کیا ردِّ عمل تھے۔ یہ ابھی دیکھنا باقی ہے۔ اس وقت کی ظالم حقیقت یہ ہے کہ لوگ بھوک کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے "چپاتیوں کی تقسیم" کی اصل اہمیت یہی ہے۔ ہر گاؤں اپنے ہمسایہ گاؤں کو چپاتیوں کا "تحفہ" بھیجتا تھا۔ شرط یہ تھی کہ وہ اس سے زیادہ تحفہ اپنے ہمسایہ گاؤں کو بھیجے۔ چپاتیوں کا اور کوئی راز سوائے اس کے نہ تھا کہ وہ کھائی جاتی ہیں۔ آزادی کی خواہش تو تھی ہی لیکن بھوک نے عوام اور سپاہیوں کو مشترک مقصد کے لئے

متحد کر دیا۔ انتہائی مشکل حالات میں بھی جب شکست یقینی نظر آرہی تھی۔ "تانتیا ٹوپی کو اپنے سپاہیوں پر مکمل اعتماد ہو سکتا تھا۔ شرط تھی۔ تنخواہ کی پیشگی ادائیگی۔ سواروں کو ۳۰ روپے ماہانہ اور پیادوں کو ۱۲ روپے۔ مقبول سر سید احمد خان کے، بجنور میں روہیلا سردار محمود خان نے اپنے سپاہیوں کو باقاعدہ تنخواہیں دیں۔ لیکن اس کے لئے اسے ہندو چودھریوں کو لوٹنا پڑا۔ چودھریوں نے اپنی طرف سے لڑنے کے لئے جو آدمی جمع کئے ان کی اُجرت ۵ پیسے یومیہ تھی۔ جب وہ اس قلیل اُجرت کا بھی انتظام نہ کر سکے تو نقد کے بجائے اُجرت کھانے کی صورت میں دی جانے لگی۔ سر سید احمد خان نے یہ بھی لکھا ہے کہ انقلابیوں کے پوسٹروں کے مطالعہ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ دو عام وعدے کئے گئے تھے۔ امیروں کے لئے معافی (وہ زمینیں جن کی مالگذاری مُعاف ہے اور جو انگریزوں نے ضبط کر لی تھیں) اور غریبوں کے لئے خوش حالی۔ انقلاب عام میں مقبول اور ہر دلعزیز تھا۔ BRUCE NORTON نے تربہت سے لکھے گئے ایک خط کا حوالہ دیا ہے۔

"تلنگوں سے ملک میں ہر جگہ لوگوں کو گہری ہمدردی ہے۔ تلنگوں کی ہر فتح اور ہر بغاوت پر لوگ اطمینان کی سانس لیتے تھے۔

دہلی اور اُتر پردیش کے بڑے شہروں میں سپاہیوں کو معاف سمجھا گیا۔ ایسی حکومت جو نظم و نسق برقرار رکھ سکتی ہے اور رفاہِ عامہ اور عوام کی اقتصادی حالت سدھارنے کا کام انگریزوں سے بہتر کر سکتی وہ واقعی قومی حکومت ہوتی اور وہ کیا کچھ نہ کر سکتی لیکن اس کے بارے میں قیاس آرائی کرنا فضول ہے۔ زندگی کے کے عمل (یہاں تک کہ کام کاج اور سکّہ سے خرید و فروخت تک) انقلاب کے انقلاب ناممکن ہو گئے۔ عوام کی خوش فہمیاں دُور ہوئیں تو وہ انگریزوں کے دورِ حکومت کے دوبارہ قائم ہونے کی خواہش کرنے لگے۔ اور جب انگریزوں کی حکومت دوبارہ واپس آئی تو ان کو ایسی سزائیں دی گئیں کہ سپاہیوں کا عہد ہمیشہ کے لئے خوشگوار یاد بن گیا۔

اگر ۱۸۵۷ء کا انقلاب نظریاتی طور پر صحیح ہوتا تو اس کی کامیابی کے امکانات اتنے تاریک نہ ہوتے۔ ہمارے زمانے چیئرمین ماؤزے تنگ کے وسائل اس سے بھی کم تھے۔ لیکن وہ کامیاب ہوئے لیکن ۱۸۵۷ء کے ہندوستان میں "ماؤازم" کا ترقی پسند اور تعمیری نظریہ ممکن نہیں تھا ۱۸۵۷ء کے نظریوں اور اس کے رجعت پرست مقاصد کے ساتھ اگر کامیابی ہوتی بھی تو اس کا نتیجہ تباہی ہوتا۔ اس لئے ہندوستان کی آزادی ۹۰ سال تک معرضِ التوا میں رہی۔ اور ان ۹۰ سالوں میں، برطانوی حکومت کی وجہ سے نہیں بلکہ برطانوی حکومت کے باوجود ایک نئے ہندوستان نے جنم لیا۔ یہ مہاتما جی کا ہندوستان تھا۔

"پچھلی تین پشتوں میں ہم نے انگریزوں سے بہت کچھ سیکھا اور اس کے لئے ہم ان کے احسان مند ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے بنیادی تصورات برطانوی نہیں ہیں۔ چاہے وہ مہاتما جی کی "اہنسا" ہو یا وزیر اعظم نہرو کی بیرونی پالیسی، یا پھر پنج سالہ منصوبے ہوں۔ اور ہم اپنے عظیم رہنما کے احسان مند ہیں، کہ انہوں نے ہمیں زندگی کے ایسے فلسفے کا درس دیا۔ جس کی بدولت انگریزوں اور دوسری قوموں کے ہمارے مستحکم تعلقات انسانیت کی بنیاد پر استوار ہوئے اور جس کی وجہ سے دونوں فریق پچھلے جرائم پر خاک ڈال سکیں۔

مہاتما جی کے ایک ناچیز چیلے کے لئے ۱۸۵۷ء کی تحریک قومی انقلاب ہے۔ یہ ایک بھیانک خواب ہے۔ ہمیشہ کے لئے ایک تنبیہ ہے کہ انقلاب میں کیا کیا نہیں ہونا چاہیئے۔ پھر بھی (TAIPING) اور (BOXER) چینی انقلابوں کی طرح ۱۸۵۷ء کا انقلاب تاریخی منطق سے شاید ضروری بھی تھا۔ افراد کی طرح قوموں کو بھی آزمائش اور غلطی کے عمل سے بہت کچھ سیکھنا ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی انقلاب کی جتنی بھی خوبیاں ہیں انہیں یاد رکھنا چاہیئے اور ان کا احترام کرنا چاہیئے

(ترجمہ:- کمال احمد صدیقی)

قصد فریاد نہیں دل ناشاد نہیں

اُن کی بے داد کسی غیر کی بے داد نہیں

سُننے والے غمِ دل کے مِری آنکھوں کو بھی دیکھ

ان میں پوشیدہ ہے وہ جو کچھ کہ مجھے یاد نہیں

(خمار)

اسلم پرویز

۱۸۵۷ء کے شہیدوں کے نام

پی کے سرشارئ ایثار کا جام آئے تھے
بن کے تم صبحِ درخشاں کا پیام آئے تھے
شمعِ انوارِ عمل تم نے جلائی ہر سُو !
لے کے جب غیر یہاں ظلمتِ شام آئے تھے

جرأت و حوصلہ و عزم و عمل لے کے بڑھے
تم دغا بازوں کا سامانِ اجل لے کے بڑھے
شدتِ ظلم پہ بھی، سر کو جھکانا کیسا؟
"تیر ارجن کے" "ہنومان کا بل" لے کے بڑھے

دشمنِ خطۂ زرخیز نہ رہنے پائیں
یہی کوشش تھی یہ چنگیز نہ رہنے پائیں
تم کو ہم کیوں نہ کہیں "زندہ و پائندہ باد !
جن کا نعرہ تھا کہ انگریز نہ رہنے پائیں

سُرخئ خوں سے چمن اپنا سجایا تم نے
درحقیقت اسے فردوس بنایا تم نے
ہے یہ آزادئ جمہور بھی اس کا ثمرہ
اس میں جو نخل "بغاوت" کا لگایا تم نے

غیرت و حوصلہ و فکر و نظر زندہ باد!
رانی جھانسی و شہنشاہ ظفر زندہ باد!
جنگِ آزادی کو کرتے ہیں "غدر" سے منسوب
نام اس کا ہی غدر ہے تو "غدر" زندہ باد[1]

رقصِ دوشیزۂ جمہور ہے اور اہلِ وطن
کوئی جابر ہے لٹیرا ہے نہ کوئی راون
جتنی لنکائیں ہیں سب خاک ہوئی جاتی ہیں
اور ہونے کو ہیں تعمیر نئے بندرابن

---

[1] "غدر" بدیں نظر غلط العام ہے لہٰذا فصیح !

سنگِ میل

وزیرِ اعظم جناب بخشی غلام محمد کی وہ تقریر جو انہوں نے ۲۶ جولائی ۱۹۵۷ء کو ساڑھے آٹھ بجے شام ریڈیو کشمیر کے سرینگر سٹیشن سے نشر کی۔

جمہوریت اور ایک خوش حال مستقبل کی جانب پیشقدمی کرتے ہوئے ہماری ریاست ایک نئی منزل پر آگئی ہے۔ نئی وزارت کا قیام عمل میں آیا ہے اور ایک مرتبہ پھر مجھے اس کی قیادت کا اعزاز بخشا گیا ہے۔ اس سلسلے میں قوم نے مجھ پر از سرِ نو جس اعتماد اور بھروسہ کا اظہار کیا ہے۔ اس کے لئے میں اپنے دل کی عمیق گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور عجز و انکسار کے جذبہ کے ساتھ اس عہدے کی عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالتا ہوں۔

تقریباً چار سال کا عرصہ ہوا مجھے صبر آزما اور حوصلہ شکن حالات میں حکومت کی سربراہی کے گراں بار فرائض سونپے گئے۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ غیر یقینی سیاسی صورت حال اور بدنظمی کے باعث ہماری ریاست کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی ڈھانچہ کی بنیادیں تک ہل گئی تھیں۔ اس صورت حال کو معمول پر لانے اور اس میں استحکام پیدا کرنے کے سلسلے میں ہم معجزوں کا دعویٰ تو نہیں کر سکتے، لیکن ہم نے اپنی طرف سے حتی الوسع کوشش کی اور عوام کی حمایت اور تعاون سے کچھ کامیابیاں ضرور حاصل کیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ریاست کی سیاسی اور اقتصادی حالت بہتر بنانے کیلئے ہم نے ایک جرأت مندانہ لائحہ عمل کے مطابق کام کیا اور سیاسی استحکام بحال کرنے کے مقصد سے ایسے آئینی اقدامات کئے۔ جن سے انڈین یونین کے ساتھ ریاست کے الحاق میں اور زیادہ سیاسی مضبوطی پیدا ہوئی۔ اس سے کچھ غیر ملکوں کے عزائم مندرجہ میں قیل و قال کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور ایسے مسائل کی نسبت متخاصم طاقتی گروہوں کی باہمی کھینچا تانی ہماری سرحدوں پر پہنچ گئی۔ جن کا ہماری ریاست کے مسئلہ سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ مختلف طاقتوں کے تعلقات کی بدلتی ہوئی نوعیت سے ہماری ہمسائیگی میں واقع علاقہ اعصابی جنگ اور فوجی معاہدوں کے دائرہ اثر میں آگیا۔ ان واقعات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ انڈین یونین کے ساتھ ریاست جموں و کشمیر کی دائمی وابستگی ہی ریاست میں امن، سلامتی اور جمہوریت برقرار رہنے کی واحد ضمانت ہے اور اسی سے یہ ریاست بڑی طاقتوں کی اعصابی جنگ کے دائرے سے باہر رہ سکتی ہے۔

انڈین یونین کے ساتھ الحاق کی بدولت ہم اس ریاست کے لئے ایک جمہوری اور ترقی پسندانہ آئین بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ آئین سیاسی اور اقتصادی آزادی اور سماجی ترقی کے لئے عوام کی آرزوؤں اور امیدوں کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ جموں و کشمیر میں رہنے والے باشندوں کے حقوق اور مراعات کا چارٹر ہے۔ اور ان کو ترقی اور خوشحالی کے بیشمار مواقع فراہم کرتا ہے تاکہ وہ ہندیونین کی دوسری سٹیٹوں کے عوام کے شانہ بشانہ مساوی طور پر پُرامن لیکن تاریخی انقلاب کا پھل حاصل کر سکیں جس کے نتیجہ میں کروڑوں لوگوں کی قسمت بنائی جا رہی ہے۔ تاکہ ان کی زندگی کا معیار اونچا ہو۔

آئینی ترقی کے علاوہ، جو پچھلے چار سال کے دوران ہم نے کی ہے اقتصادی میدان میں بھی بھاری تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ہم نے

عنانِ اقتدار ہاتھ میں لیتے ہی اُن سخت گیر اور ظالمانہ قوانین اور طریقوں کو منسوخ کرنے کا وعدہ کیا۔ جو عوام کی اقتصادی ترقی کے راستے میں سدِ راہ بنے ہوئے تھے، چنانچہ مجوزہ سسٹم ختم کیا گیا جو کافی ظلم و ستم بدعنوانی اور ابتری کا باعث بنا ہوا تھا . . . . (۲۱)

سسٹم کے خاتمہ کے متعلق ہماری پالیسی سے دیہات میں رہنے والے لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا، اسی طرح ہم نے کچھ ضروریاتِ زندگی کی فروخت اور قیمتوں پر عائدشدہ کنٹرول منسوخ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کو یہ چیزیں افراط سے دستیاب ہونے لگیں۔ تجارت، کاروبار اور ٹورزم کو فروغ دیا گیا اور ریاست کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کے لئے روزگار کی شاہراہیں کھُل گئیں۔ قرض داری کی مصیبت جو صدیوں سے دیہاتی آبادی کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھی، مکمل طور سے ختم کی گئی اور کسانوں کو ریاست کی معیشت کے بنانے میں تعمیری کردار ادا کرنے کے لئے کھُلا چھوڑا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کشمیر میں سیاحوں کے از سرِ نو زیادہ سے زیادہ تعداد میں آنے سے یہاں کے کافی لوگوں کو بہت فائدہ ہوا۔

یہ شاندار اقتصادی سُدھار ممکن نہ ہوا ہوتا۔ اگر ہم پہلے پانچ سالہ منصوبہ کے تحت ترقی کے پروگرام کو روبہ عمل لانے کے لئے اپنی تمام ترقوتوں کو مجتمع نہ کرتے۔ اس منصوبہ کے تحت مختلف سکیموں پر عملدرآمد کرنے میں گو دیر ہوئی، لیکن اس کے باوجود اس ریاست میں جو ترقی کی گئی وہ اس ترقی کے برابر ہے جو ہندوستان کی دوسری سٹیٹوں میں کی گئی ہے۔ بجلی پیدا کرنے، رسل و رسائل کے ذرائع کو ترقی دینے، آبپاشی کو وسعت دینے، پینے کے پانی کی بہم رسانی اور اسی نوعیت کے دیگر لاتعداد مفید منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے سے بڑے ٹھوس نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر لاتعداد مفید خدمات بھی سرانجام دی گئیں۔

پہلے پانچسالہ منصوبہ کی تکمیل پر دوسرا پانچسالہ منصوبہ ہاتھ میں لیا گیا ہے۔ اس میں جو نشانے مقرر کئے گئے ہیں اور ان نشانوں کو پورا کرنے کے لئے سرمایہ کا جو تخمینہ کیا گیا ہے۔ وہ پہلے پانچسالہ منصوبہ کے نشانوں اور سرمایہ سے بہت زیادہ ہے۔ بلاشبہ ہماری کچھ سکیمیں بہت عظیم ہیں۔ لیکن اگر ان کو کامیابی سے روبہ عمل لایا گیا تو ریاست کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کو بے شمار فائدے پہنچیں گے۔

ہماری ریاست میں ایک خاص منصوبہ کے تحت ترقی کا جو کام ہاتھ میں لیا گیا ہے وہ اس منصوبہ کا ایک حصہ ہے، جو سارے ہندوستان کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہماری ریاست کے ذرائع محدود ہیں اور ہمارے لئے بڑی بڑی ترقیاتی سکیمیں ہاتھ میں لینا ممکن نہ تھا اگر مرکزی حکومت ان سکیموں کو روبہ عمل لانے کے لئے فیاضی سے سرمایہ فراہم نہ کرتی۔ ہندیونین کے ایک حصہ کے طور پر جموں و کشمیر کو جو ٹیکنیکل اور مالی امداد مہیا کی گئی وہ اس ریاست میں جمہوری نظام کی تعمیر اور اقتصادی ترقی حاصل کرنے کے بارے میں ہماری کوششوں کے تئیں ہمارے ہم وطنوں کی خیر اندیشی اور ہمدردی کا بدیہی ثبوت ہے۔

اقتصادی سدھار کی سرگرم کوششوں کے نتیجہ میں یہاں کے لوگوں کا معیارِ زندگی عام طور سے بلند ہوا ہے۔ پسماندگی، غربت اور بھوک کی مصیبتیں جو صدیوں سے یہاں کے لوگوں کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھیں، رفتہ رفتہ ہمارے درمیان سے نیست و نابود ہوتی جا رہی ہیں۔ اور خوشحالی اور مسرت کی منزلیں قریب آنے سے اُن کی زندگیوں میں کچھ رنگینی پیدا ہوئی ہے۔ نتیجہ یہ کہ اُن کے طرزِ زندگی پر بھی اس کا کچھ سماجی اثر پڑا ہے اور تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ چنانچہ آپ کے ذہن میں اُس ثقافتی اُبھار کی یاد بالکل تازہ ہوگی جو پہلے سال "جشنِ کشمیر" کے دوران ریاست کے تمام حصوں میں دکھائی دیا۔

پچھلے چار سال کے اندر جو کام انجام دئے گئے۔ اُن میں سے وہ کارنامہ ریاست کی تواریخ میں ایک نمایاں جگہ حاصل کریگا جو تعلیمی اصلاح سے تعلق رکھتا ہے۔ اس شعبے میں ہم نے کافی ترقی کی ہے اور ریاست کے پسماندہ طبقوں میں بھی ناخواندگی اور تحصیلِ علم کی خواہش پیدا ہوئی

ہے۔ ماضی میں ہم بے علمی اور ناخواندگی کے لئے بدنام تھے۔ لیکن اب وُہ دن دُور نہیں جب ہم تعلیمی میدان میں اولین صف میں جگہ حاصل کر سکیں گے۔

میں نے ان چند سالہ سرگرمیوں کا خاکہ قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے، جن دوران میں وزارت عظمیٰ کی ذمہ داریاں میرے کندھوں پر تھیں۔ ایسا میں نے اس غرض سے کیا ہے تاکہ میں اپنی جماعت اور خود اپنی طرف سے اس عقیدے کا اعادہ کروں کہ ہم عوام کا مادی اور ثقافتی معیار بلند کرنے کے لئے ترقی پسندانہ اقتصادی اور سماجی پالیسیوں پر مسلسل عمل پیرا رہیں گے۔ حکومت کی سربراہی کا جو شرف مجھے بخشا گیا ہے اس کی عظیم ذمہ داریوں کا مجھے اچھی طرح احساس ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کاموں کی تکمیل کے لئے جن سے ہماری ریاست دوچار ہے، مجھے مختلف طبقوں اور مختلف خیالات کے لوگوں کی مسلسل رہنمائی، مشورہ اور تعاون کی ضرورت ہوگی۔ کچھ اہم مسائل ہماری فوری توجہ کے محتاج ہیں۔ مثلاً خوراک کے مسئلہ کو لیجیئے، گو اس وقت تک اسے کامیابی سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن اسے مستقلاً حل کرنا باقی ہے۔ اور اس شعبے میں خود کفیل ہونے کے لئے ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ حکومت کے مختلف اقدامات کے باعث کسانوں کو کئی فائدے ہوئے ہیں، انہیں نہ صرف استحصال بالجبر ہی سے نجات مل گئی ہے، بلکہ ضروریات زندگی کی مختلف چیزیں بھی انہیں کافی مقدار میں سستے داموں مہیا ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں انہیں اپنی پیداوار کے لئے اچھے دام مل رہے ہیں۔ اب ہم متوقع ہیں کہ کسان ریاست میں خوراک کی پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں سرگرم پارٹ ادا کریں گے۔

اسی طرح ریاست کے ذرائع کو بڑھا دینا ہے تاکہ حکومت کو ترقیاتی سکیمیں روبہ عمل لانے کیلئے سرمایہ کی قلت محسوس نہ ہو، میرا خیال ہے کہ ریاست کی آمدن کو بڑھانے کیلئے یہ ضروری ہے کہ عوام بھی اس سلسلے میں اپنا حصہ ادا کریں، بیشک ہم اس بات کا خیال رکھیں گے کہ آمدنی کے نئے ذرائع پیدا کرتے ہوئے آبادی کے غریب طبقوں کو

غیر

غیر ضروری طور پر مشکلوں سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ یہاں کے عوام بڑی تندہی اور دلچسپی سے دیہات سُدھار کو آپریٹو، زمینی تحفظ وغیرہ مختلف تعمیری منصوبوں کی تکمیل میں سرگرم حصہ لے رہے ہیں۔ وُہ یقیناً اس موقع پر بھی ہمت اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے قومی ترقی کی گاڑی کو آگے لیجانے میں مدد دیں گے، تاکہ تمام طبقوں کے لوگ ریاست کی مجموعی ترقی سے مساوی طور پر فیضیاب ہوں۔

اب ہم نے زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی کرنے کیلئے شدت سے کام شروع کرنیکا فیصلہ کیا ہے، میرے خیال میں یہ بتانا ضروری نہیں کہ میری حکومت اس سلسلے میں کون سے خاص اقدامات کریگی۔ میں چاہتا ہوں کہ عوام نتائج کا اندازہ ان وعدوں کی بناء پر نہ کریں جو ہم اس وقت کریں، بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ وُہ ہماری کارکردگی کو دیکھکر ہمارے متعلق اپنا فیصلہ دیں، بہرحال سرسری طور پر میں یہ کہوں گا کہ حکومت ذرائع نقل و حمل کو وسعت دینے، آب پاشی کو فروغ دینے اور بجلی کی قوت بڑھانے کیلئے پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتار سے کام کرے گی، اسی طرح مکانات بنانے اور فلاح عامہ کے دیگر کام انجام دینے کی طرف بھی خاص دھیان دیا جائے گا۔ سب سے بڑھکر یہ کہ ہماری تمام تر کوششیں ریاست میں اقتصادی استحکام پیدا کرنے کے کام پر مرکوز رہیں گی۔ یہ مقصد پورا کرنے کیلئے میرے خیال میں اولین ضرورت اسبات کی ہے کہ دیہاتی علاقوں میں دیہات سُدھار کی سکیموں کے ذریعہ سے جن شکتی کے وسیع ذرائع کو بروئے کار لایا جائے، اجتماعی ترقی کی تحریک جسے شروع کئے گئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا، اور زیادہ تیزی سے چلائی جائے گی تاکہ ہر اجتماعی مرکز تعمیری سرگرمی اور باشعور بڑھنے کی علامت بن جائے۔ میں اس تحریک کو اہم سمجھتا ہوں کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس تحریک کی کامیابی ہمارے دیہات میں سماجی انقلاب کی ضامن ہوگی۔

جموں و کشمیر نے جو اقتصادی ترقی کی ہے وُہ ایک نئے دور کے آغاز کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ ترقی ہمارے کچھ سوائیتی بھائیوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وُہ ترقی کی طرف ہماری پیش قدمی کو

الٹ پھیر

روکنے کے لئے ہماری توجہ تعمیری سرگرمیوں سے ہٹانا چاہتے
ہیں، بار بار ہمیں دھمکیاں دی جاتی ہیں اور ہمیں خوفزدہ کرنے
کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اور اب حال ہی میں وہ توڑ پھوڑ
کی مذموم کوششوں پر بھی اُتر آئے، تاکہ یہاں ابتری پھیلے
اور فرقہ وارانہ جھگڑے بپا ہوں۔ میں اس موقع پر تمام محبانِ وطن
کی توجہ دشمن کے ایجنٹوں کی شر انگیزیوں کی طرف دلانا چاہتا
ہوں۔ حکومت ریاست میں بلاشبہ امن وامان برقرار رکھنے
کے لئے مضبوط پالیسی پر عمل کرے گی، لیکن ساتھ ہی ساتھ
یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنی صفوں کو ٹھیک کریں اور متحد ہو کر
آزادی، امن اور ترقی کے نصب العین کی حفاظت کریں۔ ہمارا
اندرونی اتحاد ان مسائل کو حل کرنے کے لئے بھی ضروری ہے جو
ہماری کامیاب کوششوں کے منتظر ہیں اور جن پر جموں وکشمیر
میں رہنے والے تمام لوگوں کی فلاح وبہبود کا
دارومدار ہے۔

خداتعالیٰ ہمیں ریاست کو ایک پُرمسرت اور خوشحالی
مستقبل کی طرف لے جانے کے لئے وسعت نظر، تدبر اور قوت
وہمت بخشے! آمین۔

زندہ باد نیا کشمیر! پائندہ باد جمہوریہ ہند!!

میر غلام رسول نازکی

قطعات

(۱)

گلاسن وَن یہ زاویل نکتہ داغن،
بوکروس خو ہم نازک دماغن
کرہ ہیا زِ ٹن چھم گنگر بیہ ذومت چھم
نہ کنڈ پوشن نہ روزان پوش باغن

(ترجمہ)

نالے سے اس کے داغ نے یہ لطیف نکتہ بیان کیا،
کہ مجھے اپنی طبع روشن نے کہیں کا نہیں رکھا۔
جب سے میں نے جانا ہے کہ باغوں میں نہ کانٹا رہتا ہے نہ پھول کو
دوام ہے، تب سے میرا رنگ کوئلے کی طرح کالا ہو گیا ہے۔

(۲)

تمس پیٹھ کاکُل ہیچانہ جوراہ
یہت زن یوسفس زولانہ جوراہ
مہ اچھ بے نور زن ویرانہ جوراہ
اچھن منہ تس لبت میخانہ جوراہ

محبوب کے چہرے پر کاکل پیچاں کی جوڑی پھنکار رہی ہے،
ایسا لگتا ہے جیسے یوسف دو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔
میری دو آنکھیں اس طرح بے نور ہیں، گویا دو ویرانے ہیں۔
محبوب کی دو آنکھیں دو چلتے پھرتے میخانے ہیں۔

(۳)

دیا غاہ نفود، دِلاہ شاہانہ دتوتھم
پنن ے چود تھس سوی پانہ دتوتھم
گرت کراوت یہ سوروی راہ ورودتھ
اتھس اندر بنہ پچھن بانہ دتوتھم

تو نے مجھے دماغ عالی اور دل شاہانہ عطا کیا
اپنے ہاتھ سے پلا کے مجھے اپنی مے سے سرشار کیا۔
یہ سب کچھ کر کرا کے تو نے اکارت کیا۔
کہ میرے ہاتھ میں کشکول تھما دیا۔

(۴)

جدائی زن چھ ہرُدن واو آسان
دپاں عشقس چھ ییرہ وَن ناو آسان
کریم دوہ پنیثہ حسنس مالہ پوشن
گیم نفرت دچھوم تت تاو آسان

جدائی جیسے پت جھڑ کی ہوا ہے۔
عشق ایک ایسی ناؤ ہے جس کا کوئی کھویا نہیں،
چند روز میں نے حسن کے حضور میں پھول چڑھائے۔
وہاں بھی نفرت ہوئی حسن میں بہت نخوت ہوتی ہے

(۵)

گڑھماں چھوس کرہ اگر لاگاں چھو سیرتب
پواں تا پھاہ وتھماں گردواہ غبارہ
دو ہے دوس ددے کر تھس ثنایاہ
دِلاہ چھوم حسرتن ثھند مرگزا راہ
تعمیر

پانی سے سینچتا ہوں، تو پانی راستے میں ہی گم ہو جاتا ہے۔
دھوپ پڑتی ہے، تو گرد و غبار اٹھ جاتا ہے
میرا دل اور تعمیر ستانا ایک جیسے ہیں
دونوں میں اور نہ کچھ نہ کچھ بویا جاتا ہے، اور روز اسکی ویرانی میں اضافہ ہوتا ہے

م-پ

فدا محمد حسنین

کشمیر کے کتبے —— تاریخی پس منظر

کشمیر تہذیب و تمدن کی ابتدائی دانش گاہ ہے اور صدیوں سے یہ جنت نظیر ساری دنیا میں مشہور ہے۔ اس خطۂ زمین نے نامور شعراء ادیب اور فنکار ممتاز مورخ، حکیم اور فلسفی اور اعلیٰ پایہ کے عالم، کمانڈر اور پیشوا پیدا کئے ہیں۔ یہاں اگر سیاح کو لہلہاتے ہوئے کھیت، مہکتے ہوئے گلزار اور صاف شفاف چشمے، آبشاریں اور جھیلیں ملتی ہیں تو مورخ کو بدھی زمانے کی مورتیاں، دھرم چکر، ہندو وہار کے لنگ اور مسلم تہذیب کے آثار اور زیارتیں ملیں گی اور ان کے ساتھ ساتھ قلعوں، مسجدوں، باغوں، چشموں اور عمارات پر نصب کئے گئے صدیوں پرانے کتبے دکھائی دیں گے۔ یہ کتبے اس سرزمین کی تہذیب و تمدن یہاں کے علوم و فنون اور فکر و عمل کے آئینہ دار اور شاہد ہیں۔ ان سینکڑوں کتبوں میں سے چند ایک کی کہانی یوں ہے۔

کہتے ہیں کہ کشمیر کے ایک لداخی حکمران رنچن نے ایک مرد مومن کے ہاتھوں اسلام اختیار کر کے پہلی بار کشمیر کو نئی تہذیب، نئی روایات اور نئے فکر و عمل سے روشناس کرایا۔ اس مرد مومن کا نام بلبل شاہ تھا اور آپ کا مرقد مبارک بلبل لنکر میں شکستہ حالت میں موجود ہے۔ خواجہ محمد اعظم نے آپ کی وفات کے سلسلہ میں یہ مادۂ تاریخ لکھا۔

سال تاریخ وصل بلبل شاہ
بلبل قدس گفت خاص الہ

خاص الہ سے تاریخ ۷۲۷ ہجری یعنی ۱۳۲۷ عیسوی حاصل ہوتی ہے۔

رنچن شاہ نے سلطان صدر الدین کا لقب اختیار کیا اور ۱۳۲۰ء سے ۱۳۲۳ء تک حکومت کی۔ سلطان نے جامع مسجد کو پہلی بار تعمیر کرایا۔ کئی بار یہ مسجد نذر آتش ہو گئی مگر ہمت مرداں مدد خدا کے مصداق پھر آباد کی گئی۔ شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں جب اسے آگ سے نقصان پہونچا تو یہ افواہ اڑی کہ اسے رئیس الملک ملک حیدر چغتائی جو کہ پادشاہ یوسف شاہ چک کا نامور معتمد ہو گذرا ہے، نے آگ لگوائی ہے کیونکہ وہ اسلامی نقطۂ حیات کے شیعہ اسکول سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اس الزام کی شدید تردید کرتے ہوئے جامع مسجد کو اپنے اخراجات سے دوبارہ تعمیر کرایا۔ مادۂ تاریخ اس کتبے سے ظاہر ہے۔

بتاریخ ہزار و بست و نہ از ہجرت سید
بروز عید روزہ سوختہ در نوبت ثانی
ملک حیدر رئیس الملک در عہد جہانگیری
نہاد از نو بنائش بار روز عید قربانی
چو تاریخ بنائش جست گفتا ہاتف غیبی
نہاد از نو اساسش بارگاہ عید قربانی

—— ۱۰۲۹ھ ——

جامع مسجد کی مرمت مسٹر ٹی۔ اوس ای ایک امریکن انجینئر کی زیر نگرانی ۱۹۱۴ء —— ۱۹۱۸ء تک ہوتی رہی۔ اس کے جنوبی گیٹ پر یہ کتبہ کندہ ہے۔

نخست این مسجد جامع ز شاہ اسکندر ثانی
عمارت یافت وانگہ سوخت از تقدیر ربانی
دگر بارہ حسن شاہ آنکہ بود از نسل پاک او
بشد بانیٔ این مسجد ہم از توفیق ربانی
ولیکن از دو جانب نہ ستون راست بشکستش
شاہ ابراہیم احمد ماگرے شد راست تا دانی
ز ہجرت نہ صد و نہ بود تا دور محمد شاہ
کہ این جنت سرا شد زینت دین مسلمانی

بتاریخ بنائیش . . . . . بگفتا ہاتف غیبی
نہاد از نوابسا کش بارگاہ عید قربانی
بتاریخ ہجرت ۸۹ ہشت و نہ ہجرت سنہ
بروز عید روز سوخت در نوبت ثانی

حس سلطان ملک نامی نمودہ بنائی مسجد کشمیر
رسید از اہتمام او و ملک حیدر رئیس الملک کشمیر
بروئی تاریخش خود گفتہ بعہد شاہ نورالدین جہانگیر

پہلے کتبے اور دوسرے کتبے کا جو بعد میں لگایا گیا موازنہ کرنے کے بعد یہ عیاں ہو رہا ہے کہ پہلا کتبہ زیادہ موزوں اور تاریخی لحاظ سے زیادہ صحیح ہے۔ مغربی دیوار پہ ایک پتھر کندہ کیا گیا ہے جس پر صرف ایک تحریر ہے۔

سال ہفتاد و ہشتم صاحب ملک موسٰے

یہ کتبہ نامکمل نظر آ رہا ہے اور سال ۹۸ ہجری بھی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ملک موسٰے جس کا تذکرہ اس کتبے میں کیا گیا ہے غالباً موسٰے رینہ ہے، جو سلطان فتح شاہ (۱۴۸۶ء — ۱۴۹۳ء) کے عہد میں ایک نامور سپہ سالار ہو گزرا ہے۔ جامع مسجد کی جنوبی دیوار پر مغل بادشاہ شاہ جہاں کے ایک تاریخی فرمان کا کتبہ نصب کیا گیا ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اعتقاد خان گورنر کشمیر کو معزول کرنے کی وجہ یہ تھی کہ عوام کے حقوق کی نگہداشت کرنے کی بجائے ان پر ناروا مظالم روا رکھتا تھا۔ اس کتبے کا گو جامع مسجد کی تعمیر سے کوئی تعلق نہیں مگر یہ یہاں اس لئے نصب کیا گیا تھا تاکہ حاکم اور عوام دونوں اس امر سے آگاہ رہیں کہ شاہ جہاں کا انصاف ہند کے کونے کونے میں زندہ اور جاوید ہے۔

جناب سید محمد مدنی ایک بڑے عالم و فاضل تھے جو امیر تیمور کے سفیر کی حیثیت سے سلطان سکندر شاہ کے پاس تشریف لائے اور ساری زندگی علم، روحانیت اور اسلام کی ترقی و ترویج میں صرف کر دی۔ آپ کی وفات ۱۴۴۴ عیسوی میں ہوئی اور نوشہرہ کے نزدیک محلہ عدالت مسجد میں دفن ہوئے۔ سلطان زین العابدین نے آپ کا مقبرہ تعمیر

تعمیر

کیا اور ایک مسجد بھی بنوائی۔ آج کل یہ جگہ مدین صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ مسجد پہ نصب کئے گئے پتھر کے کتبے شکستہ ہیں اور ان پر کندہ کی ہوئی عبارت یوں ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم لا الٰہ الا اللہ
محمد رسول اللہ علی ولی اللہ
بنی ہذا المسجد الفقیر
ظل اللہ فی ارضین
سلطان زین العابدین خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

بنا ہذا المسجد الفقیر محمد المدنی فی ساکن کشمیر

فی التاریخ سنہ ثمان و اربعین و ثمانمائۃ

آخری کتبے سے تاریخ بنیاد ۸۴۸ ہجری مطابق ۱۴۴۴ عیسوی بنتی ہے۔

ہری پربت کی فصیل کے پاس ہی مزار بہاءالدین صاحب واقع ہے۔ جہاں کشمیر کا ایک مشہور اور انوکھا کتبہ ایک جگہ نصب ہے جو سنسکرت اور فارسی دونوں زبانوں میں کندہ ہے۔
کتبے کا عکس یہ ہے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

فارسی کتبے کو یوں پڑھا جاتا ہے

عاقبت بخیر باد
۸۸۹
بسال ہشت صد و ہشتاد و نہ شہادت یافت
بہ تخت گاہ سلیمان سعید خان شہید۔۔۔۔۔

فی یوم الجمعہ

سعید خان اس جنگ میں جو سلطان محمد شاہ کے عہد حکومت (۱۴۸۴-۱۴۸۶) میں ہوئی مارا گیا۔ یہ بات قرین از قیاس نہیں کہ سعید خان جونپور کے حکمران ابراہیم شاہ شرقی کا بیٹا تھا اور سلطان بہلول لودی کے قبضۂ جونپور کے بعد کشمیر بھاگ آیا ہو۔ اسی مزار میں دو اور کتبے ہیں ایک جنابہ بی بی حافظ مریم صاحبہ کا ہے۔ جو شہزادی زیب النسا کی خاص سکتر تھیں اور دوسرا ملکہ مخدومہ خاتون کا ہے۔ جو سلطان زین العابدین (۱۴۲۰ — ۱۴۷۰ عیسوی) کی بڑی ملکہ تھیں۔ دوسری ملکہ دوگیرہ شہزادی تھی۔ یہ دونوں کتبے اب ٹوٹ گئے ہیں۔ ایک کتبہ کی عبارت یہ ہے۔

از جہان رفت مریم دوران
برد با خویش حیلہ ایمان

بست و ششم ربیع الثانی بود	سفر از دار بے مدار نمود
دفن بعد از نماز جمعہ شد است	ہر کہ دمہ بہ تعزیہ بنشست
عقل بہر وفات نیک سرشت	گفت تاریخ شدہ توی بہشت

"شدہ توی سے مادہ تاریخ ۱۰۸۹ ہجری مطابق ۱۶۹۵ عیسوی نکلتا ہے

دوسرے کتبے کی نقل یوں ہے

وفات حضرت مخدومہ خاتون
کہ سال ہشت صد و ہفتاد بگذشت
. . . . زہفتم ماہ شوال
بست و ہفتم اعداد بگذشت

جنابہ مخدومہ خاتون کا اصلی نام تاج خاتون بہقی بیگم تھا۔

حضرت شاہ ہمدان صاحب کی زیارت شریف کے دروازے پر یہ کتبہ منقش کیا گیا ہے

فیضی کہ در سابقہ مصر دو جہل نست
در پیروی حضرت شاہ ہمدانست
شاہ ہمدان بلکہ شہنشاہ جہانست
این خاک بران دیں کہ دو بب کمالست

حضرت شاہ ہمدان صاحب کا اصلی نام سید علی ہمدانی تھا۔ آپ ایران میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش رحمۃ اللہ۔ ۷۱۴ ہجری مطابق ۱۳۱۴ عیسوی ہے آپ نے ۳ بار دنیا کا سفر کیا اور تیموری یلغار کی وجہ سے وہ ۷۰۰ ساتھیوں کے ہمراہ ۱۳۷۲ء پہلی بار کشمیر تشریف لائے۔ اور وادی کشمیر کو شمع اسلام کی روشنی سے منور کر دیا۔ آپ ۱۳۸۴ عیسوی میں وفات پاگئے اور تاجکستان اشترا کی جمہوریہ کے ایک شہر کولاب میں دفن ہوئے۔ جہاں آپ کا مزار نہایت ہی شکستہ حالت میں اب بھی موجود ہے۔

مسجد پیر حاجی محمد صاحب میں ۳ مقبرے ہیں جن کے کتبے اب شکستہ ہو گئے ہیں عربی حروف میں لکھی گئی تحریروں سے سنہ ہجری ۸۴۶ مطابق ۱۴۴۲ عیسوی معلوم ہوا ہے۔

خوش است قصر حیات و نگار خانۂ عمر
ولے چہ سود کہ مرگش خراب خواہد کرد

. . . .

الحرم المحترم سلطان قطب الدین

یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مقبرہ سلطان قطب الدین پادشاہ کشمیر کی ملکہ کا ہے سلطان نے ۱۳۷۳ سے ۱۳۸۹ عیسوی تک حکومت کی اور قطب الدین پور کو بسایا۔ دوسرا مقبرہ شاید سلطان قطب الدین کا ہی ہے۔ تیسرے مقبرے پہ یہ آیت لکھی ہوئی ہے۔

الاہم انتج لہا الواب
رحمتک وحسنا تک خالعتہا الراحمٰن

شاید یہ سلطان کی دوسری ملکہ کا مقبرہ ہے۔ کہتے ہیں کہ سلطان کی دونوں ملکہ آپس میں بہنیں تھیں۔ ایک بے اولاد تھی اور دوسری کے بطن سے سلطان سکندر پیدا ہوا۔

بڈشاہ کشمیر کا سب سے نامور پادشاہ ہو گذرا ہے کیوں کہ اس نے ساری عمر اپنی رعایا کی اخلاقی مذہبی اور مادی زندگی بہتر کرنے کی کامیاب کوششیں جاری رکھیں۔ زراعت کی ترقی کے لئے لاتعداد نہریں کھدوائیں علوم و فنون کی ترقی کے لئے بیرونی ممالک سے ہنرمند، مقصود فن کار بلا بیگر منگوا کر کشمیر میں آباد کئے۔ کئی عمارات تعمیر کرائیں اور بے شمار باغ لگوائے

لاتعداد درس خانے اور دانش گاہوں کی بنیاد ڈالی۔

کہتے ہیں وُلر کسی زمانے میں شہر تھا۔ مگر جب لوگ شراب اور گناہ میں سرشار ہوگئے اور یہ شہر جھیل بن گیا۔ بڈشاہ نے اس جھیل کے وسط میں ایک جزیرہ بنوایا جس کا نام زیب دیب رکھا اور جسے آج کل زین لنک کہتے ہیں۔ وہاں شاہ نے ایک عظیم الشان محل تیار کرایا جو آج کل نہایت ہی شکستہ حالت میں ہے۔ اس پر جو کتبہ نصب کرایا گیا وہ یہ ہے۔

این مقعد چو بنیاد ملک محکم باد

مشہور بزین دیب در عالم باد

شاز ین عباد تا دو جشن کند

پیوستہ چو تاریخ خود ش خرم باد

حال ہی میں محکمہ محفوظات کشمیر (جنرل ریکارڈس ڈیپارٹمنٹ) نے اس نامور کتبے کو بصد کھوج حاصل کیا ہے۔ ۱۸۸۰ عیسوی میں یہ کتبہ موجود تھا۔ مگر بعد میں نہ جانے کس طرح جموں پہنچا اور ۱۹۵۵ عیسوی میں دستیاب ہوا۔ یہ کتبہ فنِ سنگ تراشی کا ممتاز نمونہ ہے اور سیلاح اس کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اس پر کندہ کئے ہوئے حروف کی غلط تاویلیں کرتے ہیں۔ اور آج بھی اس کی دوسری لائین کا دوسرا اور تیسرا حروف تاریخی موضوع بنا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صوفی نے ـــ تزین زیب لکھا اور ذوق نے ذین ڈب لکھا۔ دیب قدیم زبان میں جزیرہ کو کہتے ہیں۔ شاید اس کا نام زین دیب یعنی زین العابدین کا جزیرہ ہو۔ دیب شاید آج کل کی کشمیری میں ڈب بن گیا ہے۔ اس کتبے کی تاریخ لفظ خرم سے نکلتی ہے (خرم۔ ۸۲۷ ہجری مطابق ۱۴۲۳ عیسوی)

آج بڈشاہ مزار سلاطین میں دفن ہیں لیکن آپ کی قبر مبارک پر وہ آئینہ نما پتھر کا کتبہ موجود نہیں جو شاید یہ تھا۔

سلطان زین العابدین زد خیمہ در خلد بریں

بے نور شد تاج و نگین بے ہود شد ارض و سما

از بہر تاریخش عیاں بے سر شدہ اندر جہاں

عدل و کرم علم حکم ضبط و حشم صلح و صفا

آخری مصرع کے و حذف کرنے کے بعد ابجد کے لحاظ سے کل الفاظ کا مجموعہ ۸۷۴ ہجری مطابق ۱۴۷۰ عیسوی بنتا ہے جو شاہ کا تاریخ وفات ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ کتبہ سکھ دورانِ حکومت میں جب ۱۸۱۹ عیسوی میں وہ کشمیر پر قابض ہوئے اُن کے ایما پر اُٹھوایا گیا تھا۔

مزار سلاطین میں صاف و شفاف پتھر پر کندہ ایک کتبہ جناب محمد صالح کے بارے میں ہے، جو کشمیر کے مشہور آزاد بادشاہ یوسف شاہ چک کے عہد حکومت (۱۵۷۹ــ۱۵۸۶ عیسوی) میں ایک نامور سپہ سالار ہو گذرے ہیں۔

چوں محمد صالح آں شیر یلہ پشت زد بر پشت بیداد داد

در شبخونی کہ خصم او بر بخت نیم یا دیار خود استبزاد داد

خانہ گنج جسپ از کید یگیے افتاد او تن براد انتار داد

داد مردی داد رفت و ہاتف گفت سال تاریخ ز شبخونی یاد داد

۹۸۷

جناب ملک احمد کی قبر کا یہ کتبہ کتنا دلسوز ہے

زین جہاں رفتیم و دل بر داشتیم

با جہانداران جہاں بگذاشتیم

ایمنی جستیم از دست اجل

اے دریغا سا غلط پنداشتیم

سلطان حسن شاہ نے ۱۴۷۲ عیسوی سے ۱۴۸۴ تک کشمیر پر حکومت کی جناب ملک احمد وزیر اعظم تھے۔ گردش افلاک اور شومئی قسمت نے انہیں شہنشاہ ظفر کی طرح آخری عمر میں مقید کرایا۔ آپ نے زندان میں ہی موت پائی ـــــ

ولیم مورکرافٹ نے ۱۸۲۴ عیسوی میں مرزا حیدر دوگلت کے مقبرہ پر ایک کتبہ نصب کرایا۔ جو ان کے متمد خاص سید عزت اللہ نے لکھا تھا۔ وہ کتبہ یہ ہے۔

" مرزا حیدر گورگان ابن مرزا محمد حسین نواسہ یونس خان و

خانہ زاد بابر بادشاہ و سر لشکر ابو سعید خان پادشاہ یارکند

و مغولستان ابن سلطان احمد خان ابن یونس خان مرکوز

از اولاد تغلق تیمور خان از نسل چغتائی ابن چنگیز خان

مولد مرزا "وقت محمود" سال نہصدو پنج بعد تصارف زمان
بالکہ ابوسعید خان از یارکند برآمدہ پس از تسخیر تبت
در ہماں سال با چہار ہزار سوار بتاریخ روز چہارم از ماہ شعبان
۹۳۵ فتح کشمیر کردہ درراہ مرض تفرقہ کلی بہ مرزا رو دادہ
واپس بدخشاں رفت - باز بہ ہند بہ نزد ہمایوں پادشاہ
رسید در حینے کہ بادشاہ منہدم بہ ایران مے رفت میرزا با
چہار صدو پنجاہ سوار از لاہور برآمدہ بتاریخ بست د
دوئم رجب ۹۴۷ دوبارہ کشمیر را گرفتہ تا دہ سال حکمراں
بود از "قضائی الٰہی" در ۹۵۷ ہجری بہ غلط از دست ہا د
انسان شہادت یافت ۔مرزا بلاد توران د مغلوستان
د ہند دیدہ بخدمت بزرگان رسیدہ با اکثر ہندو شعور
جوان و دلیر صاحب تدبیر بود ۔تاریخ رشیدی تالیف اوست
بموجب فرمان "ولیم مورکرافٹ" صاحب بہادر میرآخور باشی
دولت انگلیشہ بہ اہتمام رسید عزت اللہ خان صورت احوال
ہا در سنہ ۱۲۳۸ ہجری بتاریخ یازدہم جمادی الثانی دیباچہ
اثبات شد"۔ سنگ مرمر کی سفید مگر موسم خوردہ تختی پر جس کے
کنارے زمانے نے توڑ دیئے ہیں کلمہ شریف اور آیات کے حاشیہ میں یہ
زیر کندہ کرائی گئی ہے

شہ گورگان میرزا حیدر آخر
بملک شہادت زدہ کوس شاہی
قضائی الٰہی چنین بود تاریخ
شدہ بہرہ صلش قضائی الٰہی

قضائی الٰہی مادہ تاریخ ہے ۔

یہ واقعہ تحریر کرتے ہوئے ذہن پر یہ بات آبھرائی ہے ۔کہ کاش
آج جبکہ ہم ماضی کی شاندار روایات اور بزرگان سلف کے ممتاز کارناموں
کی یاد کو دوبارہ تازہ کر رہے ہیں ،ضرورت اس امر کی ہے کہ آنے
والی نسلوں کے لئے ورثہ کے طور پہ کشمیر کے تمام نامور عالموں، فاضلوں،
شاعروں، سپہ سالاروں، حکیموں، فلسفیوں، مورخوں، فنکاروں اور
حاکموں کے آثاروں پہ مناسب کتبے نصب کرائے جائیں جن میں
اُن کی زندگی اور کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہو۔

تاریخی لحاظ سے کشمیر پہلی بار شہنشاہ اکبر کے زمانے میں غلام بن گیا
گو مغلوں نے کشمیر کی گوناگوں ترقی کی طرف توجہ دی مگر ساتھ ہی ساتھ
انہوں نے یہاں کے عوام کی ہمت کو پست کرنے کے لئے نوآبادیاتی طریقے اختیار کر کے
وادی کشمیر کو خوفزدہ اور ہراساں کرنے کی غرض سے اکبر نے کوہ ماران (ہری پربت)
کا قلعہ بنوایا ۔اور جذبۂ آزادی کو کچلا ۔اس قلعہ کا کتبہ یوں ہے ۔

بنائے قلعہ ناگرنگر کوٹ
بحکم پادشاہ دادگستر
بعہد شہنشاہان عالم شاہ اکبر
تعالیٰ شانہ اکبر

شہنشاہی کہ در عالم مثالش
نبود است و نخواہد بود دیگر
کرور و دہ لکھ از مخزن فرستاد
دو صد استاد ہندی جملہ چاکر
نہ کردہ ہیچ کس بیگار انجا
تمامی یافتند از مخزنش زر
چہل چار از ظہور پادشاہی
ہزار و شش ز تاریخ پیمبر

آخری شعر سے تاریخ یوں ظاہر ہوتی ہے ۱۰۰۶ ہجری مطابق ۱۵۹۷ عیسوی ۔
دوسرا کتبہ جو اس قلعے سے منسوب کیا جاتا ہے وہ یہ ہے ۔

بنائی قلعہ ناگر نگر بعون اللہ
بحکم شاہ جہاں ظل اللہ اکبر بادشاہ
بہ سایہ میر محمد حسین گشت تمام
حقیر بندہ از بندہ ہائی اکبر شاہ
دوام دولت ان شاہ تا ابد بادا
بہ حق شاہدان لا الہ الا اللہ

چشمہ شاہی کو پہلی بار آراستہ و پیراستہ کرنے کا سہرا شہنشاہ شاہ جہاں

کے سر ہے۔ سنکیڑوں سال گزر گئے مگر اس کی رعنائیاں آج بھی جوان ہیں۔ اس باغ کو علی مردان خان نے ۱۶۳۲ عیسوی میں بنایا تھا۔ مندرجہ ذیل کتبہ اس چشمے سے منسوب ہے۔

دوش دیدم نشستہ بر کوثر
شاہ مردان علی جم جاہی
گفتمش السلام گفت علیک
گفت برگو دگر چہ میخواہی
گفتمش بہر چشمہ تاریخے
گفت برگو کہ کوثر شاہی

۱۰۴۲ھ ——— ۱۶۳۲ع

چشمہ ویری ناگ دریائے جہلم کی جان ہے جس کو پہلی بار جہانگیر نے ۱۶۱۲ عیسوی میں دریافت کرکے اس کے اردگرد پتھر کی باڑ لگوا دی۔ اس کے ارد گرد ایک باغ لگوایا۔ اس چشمے پر دو کتبے نصب کئے گئے ہیں۔ جو شہنشاہ جہانگیر کے ہیں۔

پہلا کتبہ یوں پڑھا جاتا ہے۔

پادشاہ ہفت کشور شہنشاہ عدالت گستر ابو المظفر نورالدین جہانگیر پادشاہ ابن اکبر پادشاہ غازی بتاریخ سنہ جلوس در این سرچشمہ فیض این نزول جلال فرمودند۔ این عمارت بحکم آں حضرت صورت اتمام یافت۔"

از جہانگیر شاہ اکبر شاہ
این بنا سر کشید بر افلاک
بانئی عقل یافت تاریخش
قصر آباد چشمہ ویرناگ

دوسرا کتبہ یہ ہے

حیدر بحکم شاہ جہاں پادشاہ دہر
شکر خدا کہ ساخت چنین آبشار جوئے
این جوئے دادہ است ز جوئے بہشت بار
زین آبشار یافتہ کشمیر آبرو
تاریخ جوئے گفت بگوشم سروش غیب
از چشمہ بیروں آمد است جوئے

پہلے کتبے کی تاریخ ۱۰۲۹ ہجری مطابق ۱۶۱۹ عیسوی ہے اور دوسرے کتبے کی تاریخ مطابق ۱۶۲۶ عیسوی ہے۔

دو غزلیں

روش صدیقی

○

زرد چہرۂ گیتی، چشمِ آسمان پُرنم
ہائے ابنِ آدم ہو، دشمنِ بنی آدم

سیم و زر کے پیمانے، آبروئے میخانہ
قیمتِ دلِ مفلس، سنگ و خشت سے بھی کم

حسن و عشق کی باتیں، حسن و عشق ہی نہیں
سست وعدۂ فردا، رشتۂ یقیں محکم

تھا عجیب افسانہ تیرے دردمندوں کا
داستاں سرا خاموش، چشمِ انجمن پُرنم

گردشِ زمانہ کو لڑکھڑا دیا ہم نے !!
آج چشمِ ساقی کا تذکرہ رہا پیہم

کس نے اس کو دیکھا ہے کون دیکھ سکتا ہے
ہے مگر وہی اب تک شوقِ دید کا عالم

یہ مری تباہی بھی کھیل تو نہیں ناصح
تجھ کو زندگی کا غم، زندگی کو میرا غم

عرضِ شوق کے آداب اے روش! ہیں ملحوظ
شعلۂ تغزل کی لَے ہے ذرا مدھم

شہاب جعفری

○

مرے سوا نہیں کوئی مرے سجن کی طرح
ملے نین کی طرح کھل اٹھے چمن کی طرح

وہ آن بان وہ سج دھج کہاں سے لائیں گے
حسیں بنے تو ہیں بانکے مرے سجن کی طرح

میاں اک آن بھی غافل رہے تو تم جانو
بدلتی رہتی ہے دنیا دلِ لگن کی طرح

اب اہلِ غم کو بھی لازم ہے سر اٹھا کے چلیں
کلاہِ عشق ہو کج اس کے بانکپن کی طرح

سدا کی گود بھری ہے سدا سہاگن ہے
نئی نویلی یہ دنیا کسی دلہن کی طرح

نگاہِ شوق نے کل شب یہ معجزہ دیکھا
کہ کائنات حسیں تھی ترے بدن کی طرح

سنا ہے شہر تھا کوئی ۔ اکیلے جا نہ سکے
وہ دل کہ آج ہے تم بن اجاڑ بن کی طرح

دبی ہے آگ، یاد آ، برس نہ جائیں کہیں
بھری بھری یہ گھٹائیں ترے نین کی طرح

ہٹ، نہ رو کے مری آرتی اتارو تم
اب آنسوؤں سے نہ ڈالو کوئی لگن کی طرح

شہاب پاپ لگے گا کٹھور دل نہ بنو!
برہ کی آگ نے پھونکا گھر اس کا بن کی طرح

کس آسمان سے لایا تو یہ زمین شہاب
زبان نظیر کی سی فن ولی کے فن کی طرح

پروفیسر حسن شاہ

کشمیر کی فوجی روایات

قوموں کے عروج وزوال کی داستانوں میں اخلاق حسنہ صفات عالیہ اور روایات قومی کا حصّہ نہایت اہم ہوتا ہے۔ چنانچہ شجاعت ومردانگی کے جوہر کی اقوام عالم کی تاریخ میں جو اہمیت ہے اُس سے اغماض نہیں ہوسکتا۔ غلامی اور قومی انبلا میں یہ جوہر قومیں عموماً کھو بیٹھتی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد اُتر پردیش اور بہار کی جنگجو قومیں گھاس کھود کھود کر گذر اوقات کرنے پر مجبور کر دی گئی تھیں۔ اسی طرح استعمار مغلیہ نے کشمیر میں قدم جماتے ہی کشمیریوں کو نہتا کرنے کی تجاویز طے کرلیں اور ہوتے ہوتے شجاعت ومردانگی کشمیریوں کے لئے نامانوس اور بے معنی الفاظ ہو کر رہ گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ کشمیر میں فن سپہ گری اور جوانمردی کی موت مغل سامراج کے ماتھے پر ہمیشہ کلنک کا ٹیکہ رہے گی۔

اگر ہم کشمیر کی تاریخ کی ورق گردانی کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قوم نجیب کشمیر کے متعلق حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کے اس فرمودہ کی حقیقت کیا تھی کہ ؎

درزمانے صف شکن ہم بودہ است
چیرہ وجانباز و پُر دم بودہ است

زمانہ قدیم میں للتادتیا مکتا پیڈ نہایت نامور فاتح گذرا ہے اُس کی تلوار کی کاٹ ایک طرف تبت اور وسط ایشیا کے قلب تک کو چیرتی چلی گئی تو دوسری طرف سندھ و وسط ہند تک فتح ونصرت نے اُس کے قدم چومے۔ اُس کی صولت وسطوت عرب فاتحین سندھ کے لئے سدِ سکندری بن گئی، اور یہ طوفان شمالی ہند کو اپنی لپیٹ میں نہ لے سکا۔ فوجی روایات کا یہ شاندار باب پڑھکر آج کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ سپہ گری اور شجاعت میں کشمیری کسی وقت سب سے آگے تھے اسی طرح مختلف کشمیری شاہی خاندانوں کے عروج وزوال کے معرکوں کا جو بیان کلہن نے سپرد قلم کیا ہے، اُس سے بھی کشمیری روایات شجاعت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ان شواہد سے کہیں زیادہ دلچسپ اور اہم روائت ہمیں فردوسی کے شاہنامہ میں ملتی ہے۔ جہاں وہ کیخسرو کے ایک فوجی معائنے کی کیفیت کا بیان کرتے ہوئے کابل وسیستان کے بہادروں کے ساتھ ساتھ کشمیری شجاعوں کا ذکر کرتا ہے، اور لکھتا ہے ؎

پس او ہنبردہ فرامرز بود
کہ با مغفر و بازرہ و با ارزبود
ابا کوس وپیل وسپاہ گراں
ہمہ جنگجو یانِ کند آوراں
زکشمیر واز کابل و نیمروز
ہمہ سرفرازانِ گیتی فروز

زمانہ وسطیٰ میں ظہور اسلام کے بعد شوق جہاد اور شجاعت کی روایات اور بھی زیادہ مقبول ہوئیں۔ چنانچہ سلطان شہاب الدین کے عہد میں للتادتیا کی سطوت وصولت پھر سے ایک زندہ حقیقت بن کے نظر آنے لگی چنانچہ "تاریخ کشمیر" ملک حیدر اور "بہارستان شاہی" کے اوراق اس دور کی کچھ جھلک آج بھی دکھاتے ہیں۔ ان کشمیری تاریخوں میں سلطان شہاب الدین شمالی پنجاب سندھ اور مشرقی پنجاب کا شہنشاہ اور فاتح بیان ہوتا ہے اور بالآخر سلطان فیروز شاہ تغلق بھی سلطان کی عظمت کا پاس کرتے ہوئے اپنی سلطنت کی حدود میں تغیر وتبدل پر

راضی ہوتا ہے۔ اور سلطان شہاب الدین کی خود مختاری اور استقلال کو تسلیم کرتا ہے۔ اس عظیم فاتح کے متعلق حضرت علامہ اقبال کس حسرت سے فرماتے ہیں ؎

عمرہا گل رخت بربست و کشاد
خاک ما دیگر شہاب الدین نزاد

یہ اور بات ہے کہ آج ہماری قومی بے حسی کی وجہ سے کشمیر کا یہ مایہ ناز سپوت مہاراج گنج کے پرانے ڈاکخانہ کے فرش کے نیچے آسودہ خاک ہے۔

سلطان سکندر اور سلطان الاعظم سلطان زین العابدین کے با برکت اور پرشکوہ عہدوں میں بھی سپہ گری اور شجاعت کی یہ روایات تازہ رہیں۔ لیکن سلطان زین العابدین کی آنکھیں بند ہوتے ہی بساط سلطنت اُلٹ گئی۔ نکبت و ادبار اور بغاوت و شقاوت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا گئے اور حسد و رقابت اور خانہ جنگی کے شعلوں نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بالآخر تاج شاہی خاندان شہمیری کے سر سے اُتر کر چکوں کے قدموں میں آ گرا، لیکن شکوہ کشمیر کی گرتی عمارت سنبھل نہ سکی۔ حتیٰ کہ نازک شاہ کے عہد حکومت میں میرزا حیدر دوغلات وارد کشمیر ہوا اور سیاہ سفید کا مالک بن بیٹھا۔ اس گیارہ سالہ دور تغلب میں کشمیریوں پر بڑے زہرہ گداز مظالم ہوتے رہے۔ بالآخر کشمیری اُٹھ کھڑے ہوئے اور مرنے مارنے کے لئے سربکف میدان میں نکل آئے۔ ان معرکوں کے چشم دید حالات ہمیں تاریخ کشمیر مصنفہ سید علی میں ملتے ہیں اور کشمیریوں کی بے جگری، بہادری اور شجاعت کا مرقع آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے چنانچہ کشمیریوں کی یلغار سے مغلوں کے قدم اکھڑ گئے اور بالآخر میرزا حیدر دوغلات خود ان ہنگاموں میں کام آیا۔ لیکن پھر بھی چک حکمران نہ سنبھلے اور بالآخر جلال الدین محمد اکبر کے عہد میں مغل استعمارات کا طوفان کشمیر پر اُمڈ آیا اور کشمیر کا آخری خود مختار تاجدار سلطان یوسف شاہ چک اس طوفان کی تاب نہ لا سکا۔

کشمیریوں کے اس آخری جنگ نے فاع وطن کی کہانی کشمیری شجاعت و مردانگی کی روایات کا باب آخرین ہے۔ دیوان سکھ جیون کے درباری شاعر ملا توفیق کشمیری نے یوسف شاہ چک، یعقوب شاہ چک اور مغلوں کی آویزش کے واقعات پر طویل نظم لکھی ہے۔ یہ دراصل شاہنامہ کشمیر کا ایک باب ہے۔ جو دیوان سکھ جیون مرتب کروا رہا تھا۔ لیکن اس مربی کی قبل از وقت موت کی وجہ سے شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا۔ اس نظم میں کشمیریوں کی شجاعت اور نبرد آزمائی کے ایسے دل کش نقشے ملتے ہیں جن کی مثال کہیں اور نظر سے نہیں گذرتی۔

کشمیری لشکر ساز و سامان سے لیس ہو کر کشمیری بہادروں کی کمان میں میدان کارزار کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ملا توفیق اسے یوں بیان فرماتے ہیں ؎

سر قدر صف یمیں بر فلک
رساند از درفش ملک شمس چک
ابو طالب شیر دل بر یسار کشید از صف توپ رویں حصار
ملو سر چک از زدی رائے نکو
سپرد اہتمام صف پیشرو

بڑھتے بڑھتے یہ لشکر بالکل مغلوں کے آمنے سامنے آ جاتا ہے اور ان کی مڈبھیڑ کا بیان کرتے ہوئے ملا توفیق کیا خوب فرماتے ہیں ؎

کہ گفتی ز شورہ دو طوفان باد
دو دریائے آتش بہم در فتاد

اسی کیفیت کو دوسری طرح بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

دو لشکر چو مژگاں صف آراستند
ہماں دم کہ از خواب برخاستند
خروش دہل باز درکار شد
دگر فتنہ از خواب بیدار شد

کشمیری مغلیہ صفوں کو چیرتے ہوئے اور نکل جاتے ہیں اور بڑھ کر اس زور سے حملہ کرتے ہیں کہ مغلوں کا منہ پھر جاتا ہے۔ چنانچہ شمس چک کے حملہ کا بیان ملاحظہ ہو ؎

دگر شمس چک تاخت بر ہندیاں
چو بر گلۂ میش شیر ژیاں

چناں گرم کرد آتشِ کار زار
کہ شد تیرہ از دودِ آں روزگار

دوسری طرف سے مغلیہ فوجیں راجہ بھگوانداس کی ایالت میں آگے بڑھتی ہیں ؎

ازاں سوی بھگوان بفرِ دستکوہ
بجنبید و جنبید صحرا و کوہ

کشمیری لشکر اس طوفان کے سامنے ڈٹ گیا۔ چنانچہ یوسف شاہ چک نے بنفس نفیس لوسر چک اور ابو طالب کی معیت میں ایک نہایت ہی زناٹے کا حملہ کیا۔ جس سے مغل لوکھلا اُٹھے۔ ملا توفیق فرماتے ہیں ؎

چناں یک رکابی بدشمن زدند
کہ گرزی بآتش بخرمن زدند
نمودند سعی بجنگ و ستیز
کہ کردند از سندیاں در گریز
چو دید آں چناں راجہ بھگوانداس
ملرزید برخود ز خوف و ہراس

اس بے جگری، جوانمردی اور شدت مقاومت نے مغلوں کو کئی مورچوں پہ مار بھگایا، گو بالآخر میدان مغلوں کے ہاتھ رہا عام روائت ہے کہ اسی فوجی سیرت اور جنگجوئی کی وجہ تھی کہ مغل لرزہ براندام رہے اور بالآخر مغل ناظم میر بحر قاسم خان نے کشمیریوں کو چن چن کر فوج سے نکال دیا۔ اور سب اہل کشمیر کو من حیث قوم کھپرن اور کانگڑی کے چکر میں ڈال کر بے دست و پا کر دیا۔ یہ ایک ایسا ظلم تھا جس کی عفونت زمانہ حاضرہ کے اوائل تک محسوس ہوتی رہی ہے۔

مغلوں کے زوال کے بعد افغان، سکھ اور ڈوگرہ استبداد کے دور میں کشمیریوں کی شجاعت و جنگجوئی کی رہی سہی روایات بھی ختم کر دی گئیں۔ اور یہ صف شکن، جیرہ دھانباز قوم جوہر شجاعت کھو کر ابدی غلامی کی لعنت میں گرفتار کر لی گئی۔ اس دورِ غلامی کی یہ سب سے قبیح یادگار تھی۔ آزادی و استخلاص وطن کی تحریک شروع ہوتے ہی اس جوہر کی نمو پھر شروع ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں ڈودگروں کی گولیاں کشمیریوں نے کھلے سینوں پر کھائیں اور ایک تن واحد نے بھی میدان میں پیٹھ نہ دکھائی۔

ہماری تاریخ کا یہ باب ہمیشہ ہم سے او جھل رکھا گیا۔ کیونکہ مصلحت مملکت اسی میں مضمر تھی۔ اس کی ایک جھلک دیکھ کر آپ نے اندازہ فرما لیا ہوگا۔ کہ ہماری قومی روایات میں شجاعت و جنگجوئی کو کیا مقام حاصل رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس مضمون پر کوئی صاحب ذوق پوری تحقیق کر کے اس حقیقت کو اُجاگر کریں ؛

خلیل الرحمٰن اعظمی

آپ بیتی

(حصۂ دوم)

○

"آپ بیتی" دراصل میری ایک طویل نظم ہے جو ناتمام ہے اور ہمیشہ ناتمام رہے گی۔ اس کا پہلا حصّہ ۱۹۵۱ء میں لکھا گیا تھا اور اسی زمانے میں "ادب لطیف" کے سالنامے میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا حصّہ مئی ۱۹۵۷ء کی تصنیف ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے سے وقفے کے بعد اپنی زندگی کے بعض ایسے تجربات کو فن کے دائرے میں لانے کی کوشش کروں جو ایک طرف میرے لئے اہم ہیں دوسری طرف ایک عمومی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طور پر یہ داستان نئی نسل کے فنکار کی نمائندگی کرسکے گی۔

(مصنف)

میں کہ خود اپنی ہی آواز کے شعلوں کا اسیر
میں کہ خود اپنی ہی زنجیر کا زندانی ہوں
کون سمجھے گا جہاں میں مرے زخموں کا حساب
کس کو خوش آئے گا اس دہر میں خوں کا عذاب
کون آ کر مرے مٹنے کا تماشا دیکھے
کس کو فرصت کہ اجڑتی ہوئی دنیا دیکھے
کون بھڑکی ہوئی اس آگ کو اپنائے گا
جو بھی آئے گا مرے ساتھ ہی جل جائے گا

●

وہ گھڑی کون تھی جب مجھ کو ملا تھا بن باس
ایک جھونکا بھی ہوا کا نہ وطن سے آیا
لے کے کوئی نکہت گل اور نہ کوئی موج نسیم
پھر کوئی ڈھونڈنے مجھ کو نہ چمن سے آیا
میں وہ اک لعل ہوں جو بک گیا بازاروں میں
جس کو پھر پوچھنے کوئی نہ یمن سے آیا

●

یاد کرتے ہوئے اک یوسف گم گشتہ کو
کچھ دنوں روئی تو ہوگی مرے گھر کی دیوار

اگست، ستمبر ۱۹۵۷ء

کچھ دنوں گاؤں کی گلیوں میں اداسی ہوگی
کچھ دنوں کھل نہ سکے ہوں گے مرے ہار سنگھار
کچھ دنوں کے لئے سنسان سا لگتا ہوگا
آم کے باغ میں بے چین پھری ہوگی بہار

•

میں نے اک پیڑ پہ جو نام لکھا تھا اپنا
کچھ دنوں زخم کے مانند وہ تازہ ہوگا
میرے سب دوست اسے دیکھ کے کہتے ہوں گے
جانے کس دیس میں بے چارہ بھٹکتا ہوگا
عمر بھر کون کسے یاد کیا کرتا ہے
ایک اک کرکے مجھے سب نے بھلایا ہوگا

•

ہائے ان کو بھی خبر کیا کہ وہ اک زخم نصیب
زندگی کے لئے نکلا تھا جو راہی بن کر
آج تک پا نہ سکا چشمۂ آب حیوان
اس کو سورج بھی ملے ہیں تو سیاہی بن کر
گھر سے لایا تھا جو کچھ طبع رواں، ذہن رسا
ساتھ اس کے ہے اسباب تباہی بن کر

•

میرا یہ جرم کہ میں صاحب ادراک و شعور
میرا یہ عیب کہ اک شاعر و فنکار ہوں میں
مجھکو یہ ضد ہے کہ میں سر نہ جھکاؤں گا کبھی
مجھکو اصرار کہ جینے کا سزاوار ہوں میں
مجھکو یہ فخر کہ میں حق و صداقت کا امیں
مجھکو یہ زعم خود آگاہ ہوں، خوددار ہوں میں

•

ایک اک موڑ پہ آلام و مصائب کے پہاڑ
ایک اک گام پہ آفات سے ٹکرایا ہوں
ایک اک زہر کو ہنس ہنس کے پیا ہے میں نے
ایک اک زخم کو چن چن کے اٹھا لایا ہوں
ایک اک لمحے کی زنجیر سے میں الجھا ہوں
ایک اک سانس پہ خود آپ سے شرمایا ہوں

•

اہل زر، اہل ہوس کا مجھے شکوہ کیا ہے
کاش اپنوں میں کسی نے مجھے سمجھا ہوتا
چھلنی چھلنی ہے یہ سینہ مرے ارمانوں کا
رکھ کے اس دل پہ کبھی ہاتھ تو دیکھا ہوتا
کوئی اک بار تو جی کھول کے ڈھارس دیتا
اس بھری بزم میں کوئی بھی تو اپنا ہوتا

•

یوں تو کہنے کی نہیں بات مگر کہتا ہوں
پیار کا نام کتابوں میں لکھا دیکھا ہے
جب کبھی ہاتھ بڑھایا ہے کسی کی جانب
فاصلہ اور بھی کچھ بڑھتا ہوا دیکھا ہے
بوند بھر دے نہ سکا کوئی محبت کی شراب
یوں تو میخانے کا میخانہ لٹا دیکھا ہے

مبشر علی صدیقی
ایم اے

جگر ـــــ بیس سال قبل اور آج

ایک مشہور ناقد کا قول ہے کہ جگر اپنی بیس سال قبل کی غزلوں کی بدولت جگر ہوئے۔ ان کی آجکل کی غزلیں محض ان کے نام کی وجہ سے زندہ رہینگی۔ کلیتًا تو نہیں، لیکن ایک حد تک اس مقولہ سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ جگر کی غزلیات کی خصوصیت ایک والہانہ سرمستی ایک کیف، ایک نغمگی ہے جو ہمارے دل کے تاروں کو آہستہ سے چھوتی ہے اور ہم تھوڑی دیر کے لئے کچھ کھو سے جاتے ہیں۔ اُن کی یہ انفرادیت ہی ان کو معاصرین میں ایک نمایاں جگہ دلا دیتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب سے ۲۰ سال پہلے اُن کے کلام میں گہرائی اور گیرائی موجود نہیں تھی۔ اور "شعلۂ طور" کا شاعر صرف نوجوانوں کا شاعر تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی حدود کے اندر اس دور میں بھی جگر کا کلام بہت دل کش تھا۔ اور اپنے زمانہ کا ایک شاہکار جس نے آنے والے شعرا کو کافی متاثر کیا۔ کالج اور یونیورسٹی کے طلبا جگر کے خاص سامعین ہوتے تھے۔ اور اُن کے پڑھنے کا انداز اور لب و لہجہ ہمارے نوجوان شعراء کے لئے نمونہ کا کام کرتا تھا۔ بعض اشعار نفسیاتی تجزئے کے معیار سے بہت بلند ہیں۔

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

شاعر ایک میخوار کی حیثیت سے پہلے خوشامدانہ لہجہ میں محتسب سے التجا کرتا ہے کہ شراب نہ پھینکی جائے کیونکہ یہ پھینک دینے کی چیز نہیں ہے، لیکن محتسب نہیں مانتا اور اس کے ہاتھ سے پیالہ چھین لیتا ہے۔ نفسیات کا تقاضہ ہے کہ اب میخوار کو غصہ آ جانا چاہیئے کیونکہ وہ کافی منت و تعیر سماجت کر چکا ہے اور بالآخر یہی ہوتا ہے، اس کو غصہ آ جاتا ہے اور وہ محتسب کو ظالم کہنے لگتا ہے، اور اس کو شراب کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔ "ظالم شراب ہے۔ ارے ظالم شراب ہے۔"

غالبؔ کا ایک شعر ہے ؎

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی؟
بجا کہتے ہو! سچ کہتے ہو! پھر کہیو کہ "ہاں! کیوں ہو؟"

ایک نقاد کا خیال ہے کہ اس شعر میں روزمرہ کی صفائی حسن ادا اور بندش کی چستی سحر کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ جگر کے اس شعر کے متعلق کیا خیال ہے ؎

ترا جذبۂ شوق ہے بے حقیقت
ذرا پھر تو ارشاد فرمائیے گا

حضرت ناصح کے متعلق غالبؔ کا خیال ہے ؎

حضرت ناصح گر آئیں، دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو، کہ سمجھائینگے کیا؟

جگر نے بھی اس نوعیت کا ایک شعر کہا ہے ؎

نہیں کھیل ناصح! جنوں کی حقیقت
سمجھ لیجئے گا تو سمجھائیے گا

طرز بیان کی ندرت اس شعر میں بھی کم نہیں!

جگر محبت میں مغلوبانہ ذہنیت (DEFEATIST MENTALITY) کا قائل نہیں۔ محبت میں اس کا مسلک سب سے مختلف اور ساتھ ہی ساتھ مستحسن ہے ؎

محبت ہی اپنا بھی مذہب ہے لیکن
طریقِ محبت جدا چاہتا ہوں

عاشق کے نیست و نابود ہو جانے سے بظاہر اطمینان نصیب ہو جاتا ہے لیکن اس کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔ جگر کا کہنا ہے

مٹا کر ہمیں آپ پچھتائیے گا۔ کمی کوئی محسوس فرمائیے گا
ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا
نہ ہوگا ہمارا ہی آغوش خالی۔ کچھ اپنا بھی پہلو تہی پائیے گا

جگر اس کے لئے تیار نہیں کہ ایسا وصل ہو جس سے میرے آرام جاں کے سکون میں خلل پڑے۔

کسی کی خاطرِ نازک کا آگیا ہے خیال
دعائیں مانگ رہا ہوں دعا قبول نہ ہو

شاعر کا برق کو دیکھ کر ساغر اٹھانا اور واعظ کا کتاب اٹھانا نفسیاتی تجزیے کی ایک اچھی مثال ہے۔

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھ اے واعظ
میں اپنا ساغر اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

محبوب کا آمنا سامنا ہوتے ہی نہ اشکوں کی آرزوئیں رہیں گی اور نہ آنکھوں کی التجائیں۔

سب ان پہ ہیں تصدق وہ سامنے تو آئیں
اشکوں کی آرزوئیں آنکھوں کی التجائیں

اور ہو سکتا ہے کہ زبان بھی گنگ ہو جائے اور منہ سے کچھ نہ نکلے۔

گئے تھے ہم بھی جگر جلوہ گاہِ جاناں تک
وہ پوچھتے ہی رہے ہم سے بات بھی نہ ہوئی

تخیل کی کارفرمائیاں ملاحظہ فرمائیے۔ کیمرے سے نہیں بلکہ الفاظ سے فوٹو لیا جا رہا ہے۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں
وہی قیامت ہے قدِ بالا، وہی ہے صورت وہی سراپا
لبوں کو جنبش، نگہ کو لرزش، کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

اور یہ تصور کا فریب شاعر کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ محبوب واقعی آگیا ہے۔

ہائے یہ حسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

جگر محبوب کا احترام بھی کافی کرتے ہیں۔

ہنسی بھی اڑنے لگی عشق کے فسانے کی
نقاب اٹھاؤ بدل دو فضا زمانے کی

اگر آپ "آنسو" پر اردو کے شعرا کے شعر تلاش کریں تو جگر کا یہ شعر نظر انداز نہیں کر سکتے۔

انہیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم
پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

غم کوشی اور ایذا پسندی جگر کی خاص صفت ہے وہ محبت میں جملہ مصائب برداشت کرنے کے لئے تیار ہے۔

یارب غمِ محبت سب بخش دے مجھی کو
میرے سوا کسی کو اب مبتلا نہ کرنا

جگر خود کو ایک متلذذ کے رنگ میں بھی پیش کرتا ہے۔ خمریات کے سلسلے میں اس کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ان مست انکھڑیوں کی قسم کھا کے پی گیا
جب لہر آگئی، کوئی لہرا کے پی گیا
بے کیفیوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا
توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرا کے پی گیا
زاہد یہ میری شوخیِ رندانہ دیکھنا
رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا
آزردگیِ خاطرِ زاہد کو دیکھ کر —
مجھ کو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا
اے رحمتِ تمام میری ہر خطا معاف
میں حسنِ اتفاق سے گھبرا کے پی گیا

اور ذرا مے نوشی کا یہ انداز ملاحظہ کیجئے۔

پینا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال — در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

نشہ مست و بادہ مست و عشق مست و حسن مست
آج پینے کا مزا پی کر بہک جانے میں ہے

کسی شاعر کے کلام کے متعلق آخری فیصلہ کرتے وقت ہمیں اکثر اس کے یہاں معاملات کے اچھے نمونے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ جگر کے یہاں بھی اس قسم کے اشعار ملتے ہیں ؎

دھڑکنے لگا دل، نظر جھک گئی!
کبھی اُن سے جب سامنا ہو گیا

لکھے خط اُن کا کیا ضبط بہت کچھ لیکن
تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا

آنکھوں میں نمی سی ہے، چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

زباں خموش، نظر بے قرار، چہرہ فق
تجھے بھی کیا تیری کافر ادا نے لوٹ لیا؟

قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی
جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں

جگر کے کلام میں میر تقی میر کی طرح درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ فانی بھی اس سلسلہ میں نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ جگر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے
رونے کو نہیں کوئی، ہنسنے کو زمانہ ہے

وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج
دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے

کوئی بڑھے نہ بڑھے ہم تو جان دیتے ہیں
پھر ان کی چشم توجہ ہوئی ہوئی نہ ہوئی

نگاہ ناز کے پیہم اشارہ ہائے لطیف
شکستِ شیشۂ دل بار بار کیا کہنا

جگر کے کلام سے کھینچ تان کر کے فلسفۂ عالم اخذ کرنا مناسب نہیں اس کا میدان خالص تغزل کا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ موجودہ غزلیات میں عصری میلانات بھی پائے جاتے ہیں۔

جگر کی استادی اور عظمت کے اعتراف کے بعد اب ان کی خامیاں بھی دیکھ لینا چاہیں۔ اور ایک غیر جانبدار نقاد کے لئے تصویر کے دونوں رُخ دکھانا نہایت ضروری ہے۔ جگر ایک جگہ لکھتے ہیں "اکثر غلطیوں کا مجھے احساس ہے۔ بعض غلطیاں ایسی ہیں جنہیں میں نے دانستہ اختیار کیا ہے۔ بعض ایسی بھی ہیں کہ وہ خود اپنی جگہ محاسن ہیں" لیکن بقول محمد یوسف رضا مرحوم کے غلطیاں بہر حال غلطیاں ہیں۔ پہلی قسم کی غلطیوں کو ہم مہملات اور حشو و زوائد کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ذیل کے اشعار پر غور کیجئے ؎

حال بھی ماورائے حال بھی ہے عشق ممکن بھی ہے محال بھی ہے
وہ بھی ہوتا ہے ایک وقت کہ جب ماسوا ماسوا نہیں ہوتا

عشق کا بیک وقت ممکن ہونا اور محال ہونا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ "ماسوا ماسوا نہیں ہوتا" کا فلسفہ بھی قابل غور ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ کیجئے ؎

کُن کہتے ہی جلوؤں کی یہ کثرت نظر آئی
اللہ کو اللہ کی صورت نظر آئی

دوسرا مصرعہ قطعی ناقابل فہم ہے۔ اللہ کو اللہ کی صورت کیسے نظر آئی؟ ایک شعر اور ملاحظہ کریں:۔

آج اس نظر نے دل سے کیا یوں معانقہ
سمجھا ہیں کہ درد کو درماں بنا دیا

اس شعر کے متعلق ایک ناقد لکھتے ہیں: "معانقہ بمعنی گلے ملنا بھلا نظر نے دل سے کیونکر معانقہ کیا؟ اگر اختراعات کا یہی عالم رہا تو چشم و ابرو دل سے معانقہ کیا کریں گی۔ زلفوں سے (اگر جدید فیشن کی ہوئیں تو) "شیک ہینڈ" کی نوبت آ جائے گی"۔

دوسری قسم کی غلطیاں بعض ایسے الفاظ کا استعمال ہے جو مذاق سلیم پر بار گذرتے ہیں یا پھر اردو کے روزمرہ کے خلاف ہیں۔ بعض جگہ "ارے توبہ"۔ "معاذ اللہ"۔ "ہے ہے" اس طرح استعمال کئے گئے ہیں کہ مذاق سلیم پر گراں گذرتا ہے۔

شباب اور مکمل شباب ارے توبہ۔ بہار اور مجسم بہار کیا کہنا

کرم نما ستم ناز حسن ایسے تو یہ ستم نما کرم عف من یار کیا کہنا
گزرش دل تم آخر من معاذاللہ۔ نگارش غم محبت شکار کیا کہنا
تمام نگہ شوق ہے معاذاللہ۔ تبسم نگہ فتنہ کار کیا کہنا
آئینہ کی نزاکتیں ہے ہے۔ دست آئینہ ساز کیا جانے

آفتاب طلوع ہوتا ہے، نکلتا ہے
مگر جگر کہتے ہیں "آفتاب اُٹھا"
عدھر سے حسن کا ایک گوشۂ نقاب اُٹھا
تمام ذرّے پکار اُٹھے آفتاب اُٹھا

بعض اشعار میں حد درجہ ابتذال پایا جاتا ہے ؎
ایک بوسہ اس لب جاں بخش کا ۔ عمر بھر کے واسطے انعام ہے

لیکن باوجود ان اغلاط کے جگر کا درجہ اُردو غزل میں متعین ہے۔ ان کا انفرادی رنگ تغزل کے میدان میں بے حد کامیاب ہے، اب ذرا جگر کا موجودہ رنگ ملاحظہ ہو۔ بیس سال کے بعد —— کلام میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ لیکن افسوس وہ والہانہ سرمستی اور رنگینی نہیں جو پہلے تھی۔ عصری میلانات نے اس کی جگہ لے لی ہے اور یہ ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اب وہ بنی نوع انسان کی تباہی و بربادی دیکھ کر شراب کا پیالہ نہیں اُٹھاتے، بلکہ اس کو برداشت کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ تخریب کے پردہ میں تعمیر کے آثار دیکھتے ہیں۔

یہ لالہ و گل یہ صحن و روش، ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریب جنوں کے پردے میں تعمیر گلستاں ہوتے ہیں
بیدار عزائم ہوتے ہیں، اسرار نمایاں ہوتے ہیں
جتنے وہ ستم فرماتے ہیں سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں
آسودہ ساحل تو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اُٹھتی ہیں خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

اور یہ بات نہیں کہ اب جگر کے یہاں تغزل نہ رہا ہو۔ تغزل ہے مگر "نابالغ نیم رس" کا نہیں بلکہ ایک پختہ فن کار کا ہے۔ ایک تازہ ترین غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پھر بھی کتنی دل نشیں ہے پھر بھی کتنی جاں فزا
حسن کی اک اک ادا ظالم سہی، قاتل سہی
جو بھی مل جائے محبت میں وہی انعام ہے
لطف محرومی سہی، کیفِ شکست دل سہی
عشق ہی کی فطرت سرکش کا لیکن کیا علاج!
ہر نفس رہبر سہی، جادہ سہی، منزل سہی
پھر بھی آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اک سراپا ناز کو۔ زندگی میں ہر تجلی حسن کی شامل سہی
کس کو ملتی ہے جگر یہ دولت بیدار بھی۔ لاکھ جام جم کے بدلے ایک ٹوٹا دل سہی

اور آگے چلکر یہ رنگ کتنا نکھرتا ہے۔ اسکا فیصلہ مستقبل کرے گا۔

نگارشات ارسال کرتے وقت ذیل میں دیا ہوا خاکہ پُر کرنا نہ بھولیئے گا۔
خاکہ پُر کئے بغیر اشاعت ممکن نہ ہوسکے گی

میں تصدیق کرتا ہوں کہ میرا/میری غزل۔ نظم/مقالہ/کہانی ... ...

پہلی بار "تعمیر" میں شائع ہوا/ہوئی ہے۔ یہ اس سے پہلے نہ کہیں شائع ہوا/ہوئی ہے، اور نہ کسی ریڈیو سٹیشن سے نشر ہوا/ہوئی ہے۔

فقط تاریخ ... ... سنہ ۱۹ء

دستخط:-

رسا چادوانی

غزل

مَتو کر تم جوانی ضایع بے پروائے مو لا گم
ژہ کر کھنیہ میانہ زونک پایہ بے پروائے مولا گم
اگر بر سر میہ پر تو تراوہ شہپر چانہِ اُمیدک
کرم بالِ ھُما زن سایہ بے پروائے مو لا گم
قدم پِنہ چأن عشقن تھاوہ بیتھ دلکس نہاں خانس
لجم بستی میہ ویران شایہ بے پروائے مو لا گم
مہ بن بے گانہ روشن خانہ کر تم ماہ تابا نو
لو دُتھرے چشمہ قدمچہ چایہ بے پروائے مو لا گم
رسا دُلتھن ژہ پنئے مایہ بُرتھس کُول سینس منز
حیاتک بخشتھس سرمایہ بے پروائے مو لا گم
تمیر

(ترجمہ)

میرے شباب کو اکارت نہ جانے دے۔ اتنے بے پرواہ نہ بن۔
تم میرے جیتے رہنے کا کوئی سامان کرلو۔ تنے بے پرواہ نہ بن
اگر تیری اُمید کی پرچھائیاں میرے وجود پر گذریں۔
تو جیسے میں بال ہما کے زیر سایہ آجاؤں۔
جب دل کے اس نہاں خانے میں تیرے عشق کے قدم پڑے
اُس وقت سے گویا یہ ویران بستی آباد ہوگئی۔
تیرے دم سے تو میرے گھر کی رونق باقی ہے۔ اب مجھ سے بیگانہ نہ بن میرے چاند
میں تیرے پاؤں پر اپنی آنکھیں قربان کروں گی۔
تو نے رسا کو کمند گیسو کا شکار بنالیا اور اسکے سینے کو آتش عشق سے فروزاں کر دیا
اور اُسے زندگی کی متاع عزیز عطا کی۔ اب بیگانہ بننا اچھا نہیں۔
اگست ستمبر ۱۹۸۰ء

رضیہ سجاد ظہیر

بندھن

چھوٹے چھوٹے کوارٹروں کی اس بستی میں نعیمہ نے قدم کیا رکھا گویا ٹھہری ہوئی جھیل میں کسی نے پتھر پھینک دیا۔ ابھی سامان تانگے سے اُترا بھی نہیں تھا کہ چاروں طرف کے پھاٹکوں سے طرح طرح کی شکلوں کے بچے نکل نکل کر تانگے کے آس پاس اکٹھے ہو گئے۔ اور منہ کھولے تکنے لگے، کتے بھونکنے لگے، کھڑکیوں سے قسم قسم کی عورتیں جھانکنے لگیں، اور فیروزی بوا نے اپنے کوٹھے پر سے لکھن سنگھ کی بہو کو زور سے آواز دے کر اطلاع دی کہ "محمد شریف بابوجی — ارے وہی بڑے کوارٹر والے — اپنی بیوی کو لے کر آگئے ہیں! ادھر سے جواب ملا کہ سنبریا ایک نازک موڑ پر آگئی ہے، ہو جائے تو آؤں — پر کیسی ہیں؟"

"اچھی ہیں" — بوا فیروزی کی بجائے منشی جی کی بیوی نے جواب دیا۔ "پر لیوں ہی اُتری ہیں، چادر گھونگھٹ نہیں ہے۔ تم نے تو سنا ہی ہوگا کہ کالج پاس ہیں — اونہہ — چھوڑ تو انگلی —"

پھر وہ اپنے نواسے سے مخاطب ہو گئیں!

نعیمہ نے اسی سال بی اے پاس کیا تھا، شادی کے وقت صرف انٹرمیڈیٹ تک پڑھا تھا، اچھے خاصے کھاتے پیتے گھر کی لڑکی تھی لیکن چھ بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ اس لئے باپ نے ڈگری کالج کا پرنسپل ہوتے ہوئے بھی ڈھائی سو روپے کے کلرک سے شادی کر دینے میں مضائقہ نہیں سمجھا۔ آگے ترقی کے کافی امکانات تھے اور بھئی پھر لڑکی کی قسمت سب سے بڑی چیز ہوتی ہے۔ عورت تقدیر والی ہوتی ہے تو مرد راجہ ہو جاتا ہے! خوبصورت اور سمجھ دار نعیمہ جب تک باپ کے گھر رہ کر بی اے کرتی رہی، برابر اپنے شوہر کو یقین دلاتی رہی کہ اگر وہ اپنے گھر کا اکیلا تھا تو کیا ہوا۔ وہ جب اپنا

نعیمہ

گھر بسائیں گے تو نعیمہ پاس پڑوسیوں تک کو اپنا بنا لے گی! اور ان کے چھوٹے سے گھر کے آس پاس خوشیوں اور میل ملاپ کی سنہری کرنیں ہمیشہ بکھری رہا کریں گی — لیکن مکان کے سامنے اُترتے ہی جو اس نے منشی جی کی بیوی کی آواز سنی تو گھونگھٹ اور چادر کا ذکر سن کر کچھ ایسی گھبرائی کہ سیدھی اندر گھس گئی — نظر اُٹھا کر کسی کو دیکھا تک نہیں!

پھر رفتہ رفتہ اسے محسوس ہونے لگا کہ یا تو آس پاس کے کوارٹروں میں رہنے والی بیویاں ایسی عجیب و غریب تھیں کہ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتی تھیں یا وہ خود اتنی عجیب و غریب تھی کہ ان کو سمجھ نہیں سکتی تھی! اپنی طرف سے وہ بہتری ہی کوشش کرتی تھی لیکن جیسے کوئی چیز ان لوگوں کے بھاؤ میں ہی نہیں آتی تھی! مثلاً نعیمہ نے اپنے گھر میں جب پردے لگائے — اپنے جہیز کے خوبصورت جالی والے پردے — اور پھر کئی عدد پڑوسیوں کو چائے پینے کے لئے بلا کر پردوں کی خوبصورتی اور ان کو نہایت ماڈرن طریقے پر ٹانگنے کے لئے داد طلب کی تو کسی نے کوئی خاص جوش کا اظہار نہیں کیا۔ منشی جی کی بیوی بولیں "باہر سے تو دکھے ہے اس میں سے۔ باریک بہت ہے گا یہ پردہ!"

لکھن سنگھ کی بیوی تو اپنے بچے کو پکوڑے کھلانے میں اتنی مصروف تھی کہ اس نے پردے کی طرف دیکھا تک نہیں — اور فیروزی بوا کو پاندان کی کمی اتنی محسوس ہو رہی تھی کہ وہ دس بیس چھالیاں لینے کے بعد سب کو واپس چلنے پر آمادہ کرنے لگیں!

اکثر جب نعیمہ کھانے کی چھوٹی سی میز پر سفید چادر بچھا کر اس پر اپنے جہیز کی چمکتی ہوئی پلیٹیں لگاتی ہوتی یا اپنے جہیز کے بجلی

کر چولھے پر کبھی کبھار چائے بناتی ہوئی یا اخبار پڑھتی ہوئی تو اسے نیچی کھڑکی میں سے کسی پڑوسن کا چہرہ نظر آتا ـــــ اور اس چہرے پر دوری اور غیریت کی اتنی واضح چھاپ ہوتی کہ گھبرا کر نعیمہ کا دل بیٹھنے لگتا۔

اب یہی لیجیے کہ اس نے تو محض خیر خواہی میں رام لال کی بیوی کو رائے دی تھی کہ چھوٹے بچے کو ہر وقت دودھ پلانے سے اس کا پیٹ خراب ہو جاتا ہے اور رام لال کی بیوی نے دفتر سے آتے وقت رستے میں شریف کی ٹانگ لینی شروع کی، "بھیا ـــــ سمجھا رکھو اپنی بیوی کو ـــــ چار دن کی لڑکی اور ہم لوگوں کو نصیحت کرتی ہے۔ ہم سب کے بچے ملا کر آٹھ بچے پیدا کر چکے ہیں۔ کوئی آج کی بات نہیں ہے ـــــ کوئی نوسکھئے اناڑی نہیں ہیں ہم"۔

نعیمہ نے کان پکڑے کہ اب آئندہ کسی کو کوئی رائے نہیں دے گی! رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ شریف شام کو لوٹ کر گھر آتا تو اکثر نعیمہ کو چپکے چپکے روتے پاتا۔ وہ شوہر کے خیال سے جھٹ آنسو پونچھ کر بات بنانے لگتی لیکن حقیقت کو کہاں تک چھپا سکتی تھی ـــــ

اور اس دن شریف، نعیمہ کے ساتھ سینما جانے کے لئے تیار ہو کر گھر کی ڈیوڑھی میں کھڑا سگریٹ سلگا رہا تھا کہ بڑے مستری جی اور فخرو بابو کی بیوی ادھر سے گذریں۔ دونوں کے ہاتھوں میں سودے اور سبزی کے تھیلے تھے۔ انگلی پکڑے ہوئے بچے تیز تیز چلتی ہوئی نانی اور ماں کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ ان دونوں نے شریف کو نہیں دیکھا لیکن شریف نے ان کی گفتگو سنی ـــــ

"وہ ٹھہریں بڑی آدمی ـــــ اُن کے نوکرانی کھانا پکاتی ہے، سودا سلف لاتی ہے۔ اُن کو گھر میں پردے لگانے اور میز سجانے سوا کام بھی کیا ہے"۔

"اور تم نے کچھ سُنا ـــــ اس دن پندرہ پندرہ روپیلے کی ساریاں لائی تھیں۔ اور کہنے لگیں کہ گھر میں پہننے کو اچھی ہیں۔ میں نے تو کہہ دیا کہ بیوی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ نہیں تو . . . . ."

"بُرا مانا ہوگا؟"

"نا نہیں! ـــــ ایک روٹی زیادہ کھائیں ـــــ اب تو ہم لوگوں سے ملتی جلتی بھی نہیں ہیں ـــــ پہلے تو کبھی کبھار چھا نک بھی لیتی تھیں"۔

"بس میاں کے ساتھ نکلتی ہیں ٹھاٹ بدل کے"۔

"شادی کے کتنے دن ہوئے بھلا؟"

"دو سال سے کہیں زیادہ ہو گیا۔ میری چھوٹی منی پیدا ہی ہوئی تھی، ـــــ میں چھلہ بھی نہیں نہائی تھی جب ہی شریف بابو نے چھٹی لی تھی ـــــ اتنے دن میکے میں رہیں۔ شریف بابو آتے جاتے تھے"۔

"تو تو ڈھائی برس سے اوپر ہوا، اور بال بچہ بھی تو نہیں ہوا کوئی"۔

باقی باتیں جاتے ہوئے قدموں کی آہٹ میں کھو گئیں ـــــ

شریف کے مُنہ سے سگریٹ کا اور دل سے غصے کا دھواں اُٹھ رہا تھا ـــــ بیوقوف، حاسد عورتیں! ـــــ گھر کی مصیبت تھی کہ ملتے ہی نہیں تھے ورنہ اُسی دم وہ اپنی پیاری بیوی کو لے کر ان جاہل عورتوں کے اس دقیانوسی محلے سے اُٹھ جاتا! ـــــ جھنجھناتا ہوا وہ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا! ـــ کہ اتنے میں نعیمہ بھی تیار ہو کر ہاتھ میں بیگ جھلاتی باہر نکل آئی ـــــ بیوی کو بنا سنورا دیکھ کر وہ اپنی ساری کوفت بھول گیا اور دونوں سینما کی طرف روانہ ہو گئے!

واپسی پر کھانا کھاتے وقت اور بڑی رات گئے دونوں اس صورت حال پر بحث کرتے رہے! شریف کا خیال تھا کہ اس محلے کی عورتیں دراصل نعیمہ سے جلتی ہیں، اس کی صورت، لباس اور جہیز کی خوبصورت چیزوں سے حسد کرتی ہیں! نعیمہ زیادہ تر خاموشی سے سُنتی رہی! اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دراصل معاملہ کیا ہے اور کیسے حالات اتنے بگڑ گئے۔ شروع میں تو تقریباً سبھی عورتیں اس سے گھُل مل گئی تھیں، ـــــ لیکن ایسا لگتا تھا کہ ان کے اور اس کے درمیان کوئی ایسا بندھن نہ تھا جو اس رشتہ کو برابر قائم رکھتا اور اس کو مضبوطی بخش سکتا! لہٰذا تعلقات کھنچتے ہی گئے اور اب تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کھنچتے کھنچتے بالکل ٹوٹ جاتا بس اب کوئی دن کی بات ہے! ـــــ ایک بڑی کھائی درمیان میں حائل ہو گئی تھی جس کا پٹ جانا اب بالکل ناممکن نظر آتا تھا ـــــ وہ چپ چاپ سوچتی ہوئی کبھی کبھی شوہر کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی ـــــ اور یوں ہی

باتیں کرتے کرتے دونوں سو گئے!

صبح کو نعیمہ جیسے ہی ناشتے کے برتن لگا کر باورچی خانے سے تلا انڈا لینے گئی تھی کہ اس کا جی بڑی شدت سے متلایا — گھبرا کر وہ باہر والے برآمدے میں نکل گئی اور سیڑھی پر بیٹھ کر سر پکڑ لیا۔

شریف بیوی کی یہ حالت دیکھ کر چائے کی پیالی چھوڑ، پانی کا گلاس لے کر دوڑا — اتنے میں سامنے والے کوارٹر سے بڑے مستری جی کی بیوی، نواسے کو گود میں ٹانگے، کسی بات پر مہترانی پر بگڑتی چیختی برآمد ہوئیں — میاں بیوی کو اس حالت میں دیکھ کر گھبرا کر آگے بڑھیں، پھر یکایک ان کے چہرے پر ہمدردی یا افسوس کے بجائے خوشی کا ایک عجیب سا رنگ آیا — ایک منٹ تو کھڑی پوپلے منہ کو چبلاتی رہیں، پھر اور آگے بڑھ کر شریف سے بولیں "اے ہے بھیا — کیوں اس کو ڈگاڈگ پانی پلائے جا رہے ہو — اور جی متلائے گا نگوڑی کا! — اونہہ — جاؤ الائچی ہو تو اندر سے لاؤ"۔

شریف الائچی لینے اندر گیا تو بڑے مستری جی کی بیوی کا پوپلا منہ اور جھری دار چہرہ نعیمہ کی حسین اور بھولی بھالی صورت سے بالکل نزدیک آ گیا۔ کٹھ پتلی کی طرح سر ہلا کر ہلا کر انہوں نے نعیمہ سے دو چار سوالات بُدبُد بُدبُد کر کے پوچھے — شریف سے بولیں "رہنے دو الائچی — میں ابھی گھر سے املی بھیجوں ہوں، وہ ذرا چاٹے گی تو طبیعت اپنے آپ ٹھہر جائے گی — تم ناشتہ کرو نہ — منہ کیا تک رہے ہو — تو اندر چل کے لیٹ بیٹیا"۔ پھر وہ بڑے پُراسرار طریقے سے مسکراتی، نواسے کو کمر پر لادتی سڑ پڑ کرتی کانکھتی کونکھتی، اپنے گھر کی طرف چل دیں۔ شریف حیران کھڑا دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہی تو وہ بڑے مستری جی کی بیوی تھیں جن کی باتیں اس نے کل شام ہی کو سنی تھیں اور اب یکایک ان کو کیا ہو گیا تھا۔ یہ سب قصہ کیا تھا!

نعیمہ اندر آ کے لیٹی ہی تھی کہ دروازہ چوں چاں کر کے ذرا سا کھلا اور منشی جی کی بیوی کی ناک دکھائی دی۔ شریف اوٹ میں ہو گیا اور وہ بہت سے پھڑ پھڑاتی اندر آ گئیں، ان کے پیچھے رام لال کی بہو، کشن کی ماتا جی اور لکھن سنگھ کی بیوی بھی تھیں — سب کے آخر میں بڑے مستری جی کی بیوی تھیں جو گویا سب سے پہلے خبر حاصل کرنے کے فخر سے تنی ہوئی تھیں! اور شریف کو طرح طرح کی رائیں، نصیحتیں وغیرہ سنائی دینے لگیں۔

"واہ ہم لوگوں میں سے کسی سے کچھ کہا بھی نہیں — کیا ہم لوگ غیر تھے بہنا؟"

"اور بیٹیا — ذرا اونچ نیچ کا خیال رکھنا۔ بس پہلی بار سب خیریت رہے تو پھر تو چاہے بھگوان دس بیس دے"، کشن کی ماتا جی کہہ رہی تھیں۔

"آلو بخارا ذرا نمک لگا کے چاٹتی رہو"، منشی کی بیوی نے رائے دی۔

پھر آہستہ آہستہ یہ بحث ہونے لگی کہ کون سی ڈاکٹرنی اچھی ہے، کون سی نک چڑھی ہے، کس اسپتال کی نرسیں نیک ہیں اور کہاں کی طرار ہیں، کون نائن سب سے اچھی مالش کرتی ہے اور کون ٹالتی ہے! شریف خاموشی سے ناشتہ کرتا رہا!

جب بھیڑ چھٹ گئی تو وہ دفتر جاتے وقت نعیمہ سے خدا حافظ کہنے گیا۔ اور بیوی کے پلنگ پر بیٹھتا ہوا بولا "بھئی آج تو کمال ہو گیا — یعنی کہ ان سب عورتوں کو کیا ہو گیا تھا۔ یہ کایا پلٹ کیسی؟ پہلی ایسی معلوم ہی نہیں ہوتیں — حیرت ہے!"

نعیمہ پہلے ہنسی، پھر ذرا سا شرمائی، پھر سنجیدہ ہو کر بولی "پہلے میرے اور ان لوگوں کے درمیان کوئی بندھن نہیں تھا — اسی لئے رشتے جڑا اور پھر ٹوٹ گئے — لیکن اب ایک بہت مضبوط بندھن تیار ہو رہا ہے — ماتا کا بندھن — جو ... ..." اور اس نے پھر شرما کر سر جھکا لیا۔

جناب بخشی غلام محمد

وزیر اعظم

شری دینا ناتھ مہاجن

وزیر مال و قانون

شری شیام لعل صراف

وزیر صحت و تعلیم

نئی کابینہ

جناب شمس الدین

وزیر بلدیات

جناب غلام محمد راجپوری

وزیر صنعت و تجارت

شری چونی لال کوتوال

وزیر ترقیات

شری کوشک بکولا

سردار ہربنس سنگھ آزاد

جناب عبدالغنی ترالی

وزراء مملکت

پنڈت جیون رام

شری امرناتھ شرما

جناب غلام نبی سوگامی

امین کامل

غزل

جانانہ مہربانہ نظر تراو، بہار آو
از وعدہ پنُن یاد میتو پاو، بہار آو
پے لب کلیو بیہ زندگی ہُند درایہ بامَن ہُنیتھ
بیہ لگ ومیدن آشہ نئی تلہ تراو، بہار آو
بیہ سونتہ کالک واو، ژران آو ہیتھ بلغار
ودتھ لوش وندس، نارہ تتین تاو، بہار آو
بیہ ژایہ گھرن راومتِ، بیہ آیہ کلین زیو
بیہ ودرِ متے کستورنئی کھت چاو، بہار آو
بیہ نوش لبو زونہ ڈین پردہ تلن ہیت
کھوت ساگہ لرن، تالہ رزن بھاو، بہار آو
بیہ ناگرا لیو ژورہ ہیت دِل ناگہ راون وُن
بیہ پاٹِ ڈوبین ہنگہ ہجر ژاو، بہار آو
بیہ کور نشاطن، شالہ مارن سال شکارین
بیہ آو یادم وارِہ لوس چھاو، بہار آو
باغن بیُن بالن اندر کور ندل گلاً لو
ژہ تہ نار دِلک شولہ ون وزہ ناو، بہار آو
کامل ژہ وچھ از لولہ میتو یار ژھارن ہیوت
ژہ تہ نیر تس سیت تے وتھ پراو، بہار آو

تعبیر
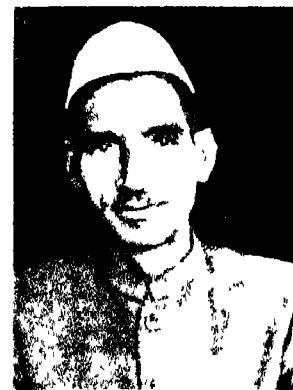
ترجمہ

اے میرے مہربان دوست، ذرا اپنی نظر تو اُٹھا کہ بہار آ پہنچی
آج اے میرے من موہن اپنے وعدے یاد کر کہ بہار آ پہنچی
درختوں میں ایک نئی زندگی کی پھر سے کونپلیں پھوٹ پڑیں
امیدوں اور آشاؤں کی بیقراری بڑھنے لگی کہ بہار آ پہنچی
بسنت کی ٹھنڈی ہوا دل جلوں کو پنکھا کرتی ہوئی آ گئی
جاڑے کے زہریلی پھولوں کا غرور لوٹ چکا کہ بہار آ پہنچی
کھوئے ہوئے پھر سے گھر آ پہنچے، گونگوں کو پھر سے قوت گویائی ملی
بلبلیں اور قمریاں خوشی سے ناچنے گانے لگیں کہ بہار آ پہنچی
نوش لب ایسی حسین عورتوں نے حرم سراؤں کی کھڑکیوں کے پردے پھاڑ دئے
آج تو بناؤ سنگار کی چیزوں کی قیمت بڑھ گئی کہ بہار آ پہنچی
پھر سے ناگرائے ایسے عاشق اپنے محبوب کی تلاش میں چل پڑے
پھر سے سروں پر کلاہیں کج ہونے لگیں کہ بہار آ پہنچی
نشاط اور شالیمار کے باغوں کی اور کشتیاں چل پڑیں
"یادام واری" میں محبت کی پینگیں بڑھنے لگیں کہ بہار آ پہنچی
مرغزاروں چمن زاروں اور بنوں میں لالے کے پھولوں نے چراغاں کر دیا
تو بھی اپنے دل کی قندیل روشن کر کہ بہار آ پہنچی
کامل دیکھ کہ آج عاشق اپنے معشوق کی تلاش میں چل پڑے
تو بھی ان کے ساتھ رہ پیما ہو، کہ بہار آ پہنچی

پروفیسر شمس الدین احمد

کشمیر کا ایک فارسی شاعر — مشتاق

محمد رضا مشتاق ناجی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور [illegible] کے رہنے والے تھے۔ آپ کا سن پیدائش معلوم نہیں۔ اکثر خطوط نویسی اور کتابت سے شغف رکھتے تھے، اور عہد جوانی میں شعر و شاعری کی طرف توجہ کی اور طبع آزمائی کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اپنی قابلیت اور استعداد سخن کی وجہ سے شاعر کا درجہ حاصل کیا اور اپنے ہم عصر شاعروں پر بھی سبقت حاصل کی۔ مثنوی مولانا روم کی نقلیں لکھ کر بیچتے اور اس طرح اپنا ذریعہ معاش بہتر کر لیتے، حکام و امرا کی کبھی مدح سرائی نہ کی جو کہ اس زمانے میں شاعروں کی خاصیت رہی تھی اور تا آخر عمر تک آزادگی اور قلندری میں بسر کی۔

چنانچہ ملا محمد توفیق نے جو بڑے پایہ کے شاعر تھے اُن کی شاگردی اختیار کر کے بعد میں ملک الشعرا کا درجہ حاصل کیا۔

۱۱۵۱ھ میں وفات پائی۔ تاریخ وفات اس شعر سے نکلتی ہے:

شاہ مشتاق از سرِ دنیا گذشت

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ملک کی آب و ہوا کا اثر لوگوں کے خیالات اور ان کے علوم و فنون پر پڑتا ہے۔ کشمیر کی خاک شادابی میں ایک واحد نمونہ ہے جس کی بدولت یہ "جنت کا نمونہ" کے لقب سے مشہور ہے۔ کشمیر کے قدرتی مناظر نے یہاں کے شاعر کو سخن دانی پر اُبھارا اور اُس نے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار آسانی کے ساتھ فارسی زبان میں کرنا مناسب سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاعر کی زبان سے جو شعر نکلا وہ حقیقت سے لبریز اور سادہ تھا۔ کشمیر کے اکثر فارسی شعرا وطن کے مناظر سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن ان سب میں محمد رضا مشتاق ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کا کلام چمنستان اور بہارستان ہے۔ سارے کلام میں رنگینی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ کسی چیز کی خوبی یا کمال کو بیان کرتے وقت رنگ و بو سے کام لیتے ہیں۔ رنگینی کا خیال اُن کی طبیعت پر اس قدر چھایا تھا کہ جو بات زبان سے نکلتی ہے رنگین ہو کر نکلتی ہے۔ درد و غم کے خیالات عام طور پر عاشقانہ رنگ میں بیان کئے جاتے ہیں لیکن مشتاق یہاں بھی اپنا مخصوص انداز رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

بلبل در دیم و خون صیاد داز منقار ما
الحذر ای شاخِ گل از نالہ ہائے زار ما

رشیۂ نخلِ زبان آب از دل ما می خورد
راستی شمعی بود در محفل گفتار ما

چاندنی رات کی تنہائیاں ایک فطری شاعر کے لئے زندگی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ عمر خیام کا جام و سبو فارسی شاعری میں بہت مشہور ہے۔ حافظ شیرازی کا دیوان نقل دمی سے بھرا ہے اور شراب معرفت کے یہ دونوں متوالے شراب کے جام لنڈھاتے وقت اپنی خداداد قابلیت سے کوئی لطیف نکتہ پیدا نہ کر سکے۔ لیکن مشتاق نے شب ماہتاب میں بادہ گلگوں کی نوشا نوشی کا وہ نقشہ پیش کیا ہے، کہ گویا تصویر کھینچ کے رکھ دی ہے:

زموج بادۂ گلگون شب مہتاب در گلشن
پری در سایۂ حیاتی مے مستانہ می رقصد
بذوق نغمۂ مطرب بشوق عشوۂ ساقی
زیک سو شیشہ از سوی دیگر پیمانہ می رقصد

مشتاقؔ رنگ و بو کے اس قدر قائل تھے۔ کہ اُن کی ہر غزل لالہ زار معلوم ہوتی ہے اور اُن کی تشبیہات اس قدر برجستہ ہیں کہ فطرت کی ہو بہو تصویر کھینچ کے رکھ دیتے ہیں اور اگر اس قسم کے اشعار الگ جمع کر دیئے جائیں تو نیچرل شاعری کا ایک عمدہ مجموعہ تیار ہو جائے گا۔

کشمیر کی تعریف کرنا فارسی شاعروں کا بھی خاصہ رہا ہے۔ عرفیؔ۔ طالبؔ کلیمؔ وغیرہ شاعروں نے سیاحوں کی آنکھ سے کشمیر کو دیکھ کر اس کی دلفریبیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مشتاقؔ کشمیر کو دوہری حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ بحیثیت ایک فرزند کے اور بحیثیت ایک مداح شاعر کے کشمیر کی شادابی یہاں کے سبزہ زاروں، آبشاروں، چشموں، سرسبز درختوں، چہکتے ہوئے پرندوں اور لالہ زاروں کی تعریف میں لکھتے ہیں ؎

شوخ از بس بہار کشمیر است
مژہ خور، حسار کشمیر است
چشم لیلےٰ کہ دل ز مجنوں برد
داغی از لالہ زار کشمیر است
نخلِ طوبیٰ باآں سر فرازی
زیر دست چنار کشمیر است
قامت ناز پرور لیلےٰ
سروی از جوئبار کشمیر است
آبروئی جہاں دہر چہ درست
خاکِ پاک دیار کشمیر است
چتر شاہنشہ بہار طرب
ابر گوہر نثار کشمیر است

حافظؔ شیرازی کو آب رکنا باد اور گلگشت مصلّیٰ پر بہت ناز تھا۔ انہوں نے کہا ہے ؎

بدہ ساقی مئی باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنارِ آب رکنا باد و گلگشت مصلّےٰ را

حافظؔ اگر رکنا باد کے کنارے پر شراب پینے کی دعوت دیتے ہیں اور اس طرح سے وہ اس جگہ کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن مشتاقؔ کشمیر کے دریائی بہت (جس کو ویتھ کہتے ہیں) کے کنارے پر بیٹھ کر صاف و شفاف پانی کا منظر دیکھ کر شراب کو بھی بھلائے جانے کا یقین دلاتے ہیں فرماتے ہیں ؎

بیا کہ حاجت می نیست در کنار بہت
شراب ناب بود آب خوشگوار بہت
بہشت نقد ازیں خوب تر نمی شود
نگار و سایۂ بید و می و کنار بہت
بگو بہ تشنہ لب میر لالہ زار بہشت
شب برات تماشا کند کنار بہت

مشتاقؔ ایک سچے عاشق کا دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے عاشقانہ خیالات میں انتہائی پاکیزگی اور روانی ہے، عاشقانہ کلام کی بڑی خصوصیت برجستگی اور شستگی ہے، یہ جوہر اُن کے کلام کا خاصہ ہے اور مختلف باتیں جمع ہونے سے اُن کی غزلیات زیادہ شیریں اور دلاویز ہو گئی ہیں مثلاً اُن کی یہ غزل ملاحظہ ہو ؎

کردیم سیر گلشن تا ما و یار ہر دو
گشتند بلبل و گل بے اعتبار ہر دو
چشم سیاہ مستش لعل قدح بدستش
از عاشقان ربودہ صبر و قرار ہر دو
زلفین تابدارش بر لالہ عذارش
خوش حلقہ حلقہ کردہ مانند مار ہر دو

مشتاقؔ کے کلام کی نمایاں خصوصیت اُن کی قادر الکلامی

ہے اور اس میدان میں وہ اپنے ہمعصر شعرا میں سب سے آگے تھے۔ زبان کی قدرت سے کلام میں زور پیدا ہو جاتا ہے اور یہ چیز ایک وجدانی چیز ہے اور اس کے ضروری عناصر تخیل کی بلندی، مضامین کا تنوع، الفاظ کا شکوہ اور بندش کی چستی ہے۔ مشتاق کی اکثر غزلیات میں یہ صفتیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی یہ غزل ملاحظہ ہو ؎

کند محراب طاعت ماہ نو نعل سمندش را
نہد نخچیر گردن حلقۂ زلف کمندش را
در و دیوار بزمش شوخی دارد کہ می بخشد
فریب چشم آہو حلقۂ دود سپندش را
نویدی لیلیش نخلی بتاراج خزاں رفتہ
اگر می دید مجنوں جلوۂ سرو بلندش را
کباب آتش رشک جگر گویم کہ می بخشد
نمک پاشش تبسم ہائی لعل نوش خندش را

مشتاق نے بھی زاہد کی خشک مزاجی کا مسئلہ چھیڑا ہے اس مسئلہ کو سب سے پہلے عمر خیام نے چھیڑا تھا اور بعد میں حافظ نے اس پردہ کو تو بالکل ہی چاک کر ڈالا اور شعرائے متاخرین بھی واعظوں کی ریاکاری کے مسئلے کو بیان کرتے رہے۔ مشتاق کی آنکھیں جنہوں نے جلوۂ انوار کا مشاہدہ کیا تھا بھلا زاہد کی خشک مزاجی کو کہاں تک برداشت کرتیں۔ زاہد کو چوٹ دیتے ہیں لیکن سادگی اور برجستگی کے ساتھ ملاحظہ ہو:—

زاہد خشک کجا ساغر سرشار کجا
چشم خفاش کجا جلوۂ انوار کجا
ہر تجرد منشاں دست علائق نرسد
دامن برق سبک سیر کجا خار کجا
ساقیا پنبۂ سبک از سر مینا برگیر
سر پر شور کجا و سر دستار کجا

مشتاق کی خصوصیات میں ایک خصوصیت تشبیہ کی صنعت ہے۔ جہاں کسی منظر کو بیان کرتا ہے تو کوئی لطیف تشبیہیں پیدا کرتا جاتا ہے اور اس کثرت سے کہ ان میں جدت پیدا ہوتی ہے ملاحظہ ہو:—

در باغ صبح خندۂ نسرین دمیدہ است
ہاں میکشاں کہ وقت صبوحی رسیدہ است
بوئے گل ز غنچۂ خنداں بار برد
رنگ شگفتگی ز رخ گل پریدہ است
از بوی سنبل نو زلفش ریز شد
چوں غنچہ نافہ پردۂ مغزش دریدہ است

زبان کی صفائی، سلاست اور روانی کسی شاعر کے کلام کی مقبولیت کا راز ہوتی ہیں۔ مشتاق کے کلام کا عام جوہر یہی چیزیں ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں جبکہ شاعروں کا عام خاصہ حکام و امرا کی مدح سرائی تھی مشتاق نے زبان کو کس قدر صاف و شفاف کر دیا۔ ایران کے شاعر قاآنی کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت روانی اور سلاست ہے قاآنی کا اگر مشتاق سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مشتاق میں بھی الگ جھلک دینے والی چیز ہے ملاحظہ ہو:—

دادن دل بخلق حاصل ماست
معتبر ہر پوست دانۂ دل ماست
رہ نوردان وادی درد یم
دل مجنوں ورائی محمل ماست
سبزشں از آب دیدہ می سازیم
دانۂ ہر غمیکہ در گل ماست
دل طپیدن براہ کعبۂ شوق
جرس آسا دلیل منزل ماست

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

بدستانامیکہ مارا یاد کردی
دلت خوش باد دل را شاد کردی

دلم محتاج آہی در جگر بود
عجب ویرانۂ آباد کرد می
نوید قتل دادی عاشقاں را
الٰہی زندہ باشی شاد کردی
ندیدی رقص شادی بسلم را
ستمگر سنگدل بیداد کردی
عفاک اللہ ز غمہائے پیا پے
دل مشتاق مارا شاد کردی

مشتاق کے کلام میں تجرد و آزادی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ جیسا پہلے بیان ہوا۔ وہ قلندر منش تھے اور آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ کنج تنہائی میں انہوں نے روحانیت کی طرف بھی توجہ کی اور صوفیوں کے زمرہ میں آگئے۔ حافظ کی طرح وہ بھی میکدے کا پرستار رہا اور رحمت الٰہی کی یاد میں کیا کرتا ایک صوفی ہونے کے باوجود بھی اپنے آپ کو حقیر و گنہ گار تصور کیا اور رحمت الٰہی سے مستفید ہونے کی اُمیدیں وابستہ رکھتا رہا۔ اُس سے اُن کی طبیعت میں عاجزی اور انکساری پیدا ہوئی تھی۔ ایک غزل کے دو شعر سنئے ؎

اگر از بیم گناہ گریہ نکردم غم نیست
گلشن عفو تو محتاج این شبنم نیست
از غم توبہ شکستن شدم خون شد دل
جنبش گفت و لے گریہ شکستی غم نیست

غرض مشتاق کا کلام ان تمام صفتوں سے مالا مال ہے جو ایک فطری شاعر کا خاصہ ہوتی ہیں۔ مشتاق صوفی تھے اور درویش بھی۔ قلندر بھی تھے۔ اور رنگین مزاج شاعر بھی لیکن افسوس یہ ہے کہ کشمیر کے اکثر فارسی شعرا کے مقابلے میں اُن کے حالات تذکرہ نویسوں نے نہایت اختصار سے لکھے ہیں۔

بقیہ ورق ورق

کشمیر میں کئے گئے حالات کا مشاہدہ کرنے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر میں کہیں بھی غیر یقینی صورت حال نہیں دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تعمیر و ترقی کا کام سرعت سے جاری ہے۔ عوام سرگرمی سے تعمیری کاموں میں حصہ لے رہے ہیں۔ اگر کہیں شکایتیں کی جا رہی ہیں۔ اور اگر لوگ مطالبات پیش کرنے لگتے ہیں۔ تو یہ اُن کی زندگی کی علامت ہے۔ صدیوں کے بعد ان کی غلامانہ ذہنیت دُور ہو گئی ہے اور وہ اپنے حقوق منوانے کے لئے لڑتے ہیں۔ اس کے برعکس پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے عوام کی حالت ابتر ہے۔ پاکستان نے انہیں سیاسی اور اقتصادی حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔

شری مینن نے نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کے ایک بھاری جلسے میں بھی تقریر کی۔ آپ نے کہا۔ پاکستان کی دھمکیوں کے باوجود بھی ہم امن کے اصولوں کو بالائے طاق نہیں رکھیں گے۔ آپ نے کہا کشمیر کا مسئلہ کوئی علاقائی مسئلہ نہیں۔ حملہ آور کے خلاف محض ایک شکایت ہے۔

ریاست میں آزادی کی دسویں سالگرہ اور جنگ آزادی کی سو سالہ سالگرہ کی تقریبات زبردست جوش و خروش کے ساتھ منائی گئیں جا بجا قومی جھنڈے لہرائے گئے جسمانی کھیل کود کے مظاہرے ہوئے اور جنگ آزادی کے جانبازوں اور مجاہدوں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ رات کو سرکاری اور غیر سرکاری طور پر بلوں۔ پارکوں۔ دریائی گھاٹوں۔ سرکاری عمارتوں۔ بڑے بڑے بازاروں۔ چوکوں اور دفاتر پر چراغاں کیا گیا۔ پولو گراونڈ میں شاندار پریڈ ہوئی۔ صدر ریاست نے مارچ پاسٹ میں سلامی لی۔ پولو گراونڈ میں ملیشیا۔ پولیس۔ فائر برگیڈ۔ سپیشل پولیس۔ نیشنل کیڈٹ کور اور سکولوں اور کالجوں کے طلباء نے حصہ لیا۔ اس موقعہ پر وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد۔ کابینہ کے دُوسرے ارکان اور وزراء مملکت۔ اعلیٰ سول اور فوجی افسر اور ہزاروں شہری موجود تھے۔ صدر ریاست نے اپنی تقریر میں جنگ آزادی کے جانبازوں کو خراج عقیدت پیش کیا۔ آپ نے کہا۔ ریاست کشمیر کی آزادی پر آنچ تک نہیں آسکتی۔ دشمنوں کے تمام منصوبے ناکام ہو جائیں گے۔

وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد نے قوم کے نام ریڈیو کشمیر سے ایک پیغام نشر کیا جس میں انہوں نے یوم آزادی کی اہمیت پر بصیرت

میکدہ

ست پرکاش شوق

شبستانِ ضیاء

خیر میری ہی خطا ہے مجھے معلوم نہ تھا — بات ناصح کی بجا ہے مجھے معلوم نہ تھا
وہ رہِ کردۂ مجھے یاد کیا کرتے ہیں — عشق گنبد کی صدا ہے مجھے معلوم نہ تھا
زندگی سے میں رہا دور تو بدظن اے دوست — زندگی تیری ادا ہے مجھے معلوم نہ تھا
مرے احساس کی رگ رگ میں ہے کر شور نہیں — تیرا نغمہ سرا ہے مجھے معلوم نہ تھا
تیری پائل کی سمجھتا تھا میں آواز جسے — میرے ہی دل کی صدا ہے مجھے معلوم نہ تھا
مہ و انجم میں چمک تیز ہوئی جاتی ہے — آپ نے یاد کیا ہے مجھے معلوم نہ تھا
میں شفق سے جسے تعبیر کیا کرتا ہوں — تیری رنگین قبا ہے مجھے معلوم نہ تھا
حسن نے لوٹ کے دل کر دیا آگاہِ مآل — راہزن راہنما ہے مجھے معلوم نہ تھا
تیرے بکھرے ہوئے گیسو کے پسِ پشت اے دوست — اک شبستانِ ضیا ہے مجھے معلوم نہ تھا

●

عالی آسی

اعترافِ شکست

سجود و عجز کے ساتھ اک نگاہِ بادہ پرست
قبول کر مری جانب سے اعترافِ شکست

تری ادائے مسلسل نے کر دیا پامال
کہ میں اسیرِ خرد تھا ترا تخیل مست

وہ آفرینشِ احساسِ آرزو توبہ!
کہ جیسے خون میں اک زہر ہو گیا پیوست

تو جان دینے سے انکار کیوں کرے کوئی
بلند عشق کا فرماں نہ دل کی ہمت پست

دراز دستیٔ قاتل کی داستان والی!
کہیں گے حشر میں جا کر خموش ہیں سر دست

بلراج حیرت

حسنِ نظر!

اپنی اپنی روش اپنا اپنا چلن — عشق لیکن ترا اپنا نہیں جانِ من
نغمۂ جاں فزا نالۂ دل شکن — اک تری انجمن اک مری انجمن
اللہ اللہ تیرا یہ بیگانہ پن — رقصِ برق و شرر موجِ گنگ و جمن
کون آیا یہ رشکِ گل و یاسمن — مسکراتا لہو گنگناتا بدن
مرے حسنِ نظر کے تماشے ہیں سب — کیا تری سادگی کیا ترا بانکپن
یوں دکھاتا ہے رستہ ہمیں باغباں — جیسے دیکھا نہیں ہم نے اپنا چمن
حسن اک خوابِ رنگین کی تصویر ہے — عشق اس خوابِ رنگیں کا آوارہ پن
چارہ گر کی ذرا سادگی دیکھنا — جیسے مٹ ہی گئی میرے دل کی جلن
آنسوؤں کے یہ لبریز آنکھیں تری — جیسے تاروں سے سرگرم ہو بام گگن

اف یہ کیا مقام آ گیا عشق میں
کوئی رہبر نہ حیرت کوئی راہزن

●

مظہر عارف

کہاں تیری یاد لے آئی!

قدم قدم پہ یہ ہنگامہ ہائے تنہائی — نہ جانے مجھ کو کہاں تیری یاد لے آئی
کسی کا نام زمانے میں ہو گیا مشہور — دلِ تباہ مبارک یہ شانِ رسوائی
شکستہ ساغرِ گل بزمِ رنگ و بو ویراں — اداس یہ شور بپا ہے کہ فصلِ گل آئی
وفا کی خیر نہیں ساز کر گئے دونوں — کسی کا ذوقِ جفا میری ناشکیبائی
نہ جام و مے نہ گل و گلستاں نہ نغمہ و ساز — فنا ہو گیا وہ ذوقِ بزم آرائی
حقیقتوں کا جہنم جلائے دیتا ہے — وہ میری خواب کی دنیا وہ خلد رعنائی

شریکِ حال ہے عارف جو رہبروں کا کرم
تو راہرو ہی رہیں گے نہ جادہ پیمائی

کمال احمد صدیقی

ہوائی قلعے

لوگ صرف اپنی خوبیاں جانتے ہیں، اور میں صرف اپنی خامیاں جانتا ہوں۔ اگر مجھ میں کوئی خوبی ہوتی تو مجھے ضرور نظر آتی۔ بہرحال میں مایوس نہیں ہوں۔ تلاش جاری ہے۔ جب بھی کوئی خوبی پائی جائے گی، میں آپ کو اطلاع دوں گا۔ اگر آپ بھی میری بیوی کی طرح میری خامیوں کو خوبیاں گردانیں تو قصور میرا نہیں، لیکن آپ سے اس حوصلہ افزائی کی توقع ذرا کم ہی ہے۔ کیونکہ پہلی ہی نظر میں آپ کو میری آنکھوں کے تنکے نظر آجائیں گے (اگر آپ کے پاس اس کے لئے وقت ہو، کیونکہ آپ اپنی خوبیوں کے دریافت کرنے میں منہمک ہوں گے جو ابھی منظرِ عام پر نہیں آئی ہیں، یا آئی ہیں، تو ان پر کسی نے سنجیدگی سے توجہ نہیں دی، کیونکہ دوسرے بھی آپ کی طرح اپنی شخصیت کے خفیہ خزانوں کو کھنگال رہے ہیں)

ہوائی قلعے بنانا انسان کا پیدائشی حق ہے سب ہی اپنے اس حق کا موقع بے موقع استعمال کرتے ہیں۔ انسان کو ہوائی قلعے بنانے کی لت نہ ہوتی تو آج ہوائی جہاز اور راکٹ کا وجود کہاں ہوتا، جس کا علم جتنا وسیع ہوتا ہے، اتنے ہی اس کے ہوائی قلعے بلند ہوتے ہیں۔ آج کے ہوائی قلعے کل کی ایجادیں ہوں گے پہلے ہم کہانیوں میں دوسرے سیاروں میں جاتے تھے۔ اب حضرت انسان کائنات میں اپنے بنائے ہوئے سیارے کا اضافہ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ یہ بھی تو ایک ہوائی قلعہ ہی ہے۔ جو جلد ہی اوپر پہنچے گا۔ ہر انسان اپنی بساط کے مطابق ہوائی قلعے بناتا ہے۔ سچ پوچھئے تو تمناؤں اور مسرتوں کی جتنی صحیح تصویر ہوائی قلعوں میں نظر آتی ہے اس کا جواب نہیں۔ لوگ ہوائی قلعے بناتے ہیں اور اس کو تخیل کا شاہکار سمجھتے ہیں۔ میں آم کو املی نہیں کہتا، یہ میری سب سے بڑی خامی ہے۔ میں اپنے ہوائی قلعوں کو کسی اور نام سے نہیں پکارتا

تعمیر

اس لئے ان میں رہنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بس یونہی تفننِ طبع کے لئے بنا تا ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ میری بیوی صاحبہ ان میں رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ منجملہ دوسری خوبیوں کے مجھ میں منصوبہ بندی کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں، چنانچہ میرے ہوائی قلعے منصوبے کی حیثیت سے قبول کر لئے جاتے ہیں۔

پرسوں نرسوں کی بات ہے۔ میں دن میں کھانا کھانے گھر آیا تو بیوی صاحبہ کا موڈ خراب تھا۔ چار ماہ کی بچی کو بڑی سنجیدگی سے نصیحتیں کی جارہی تھیں اور یہ دھمکیاں بھی دی جارہی تھیں کہ اگر اس نے ان نصیحتوں پر عمل نہ کیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ میں نے کہہ دیا کہ یوں بھی کوئی آپ سے زیادہ بُرا کیا ہوسکتا ہے۔ میرا جملہ قیامت ہوگیا۔ انہوں نے اپنی تقریر شروع کردی۔ خدا سوچئے کہ ایک بجے کی دھوپ اور وہ بھی تین فرلانگ تک کھانے کے بعد ذہن اس قابل کب ہوتا ہے کہ بیوی کی آتش فشانی کی داد دے سکے یا ان کی مدلل تقریر کو کما حقہ سمجھ سکے۔ ان کی فصاحت اور بلاغت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ البتہ انہوں نے جن تاریخی واقعات کا حوالہ اپنی تقریر میں دیا تھا۔ ان سے مجھے کسی حد تک اختلاف تھا۔ لیکن وقت کی نزاکت کے پیشِ نظر میں نے اختلافات کا اظہار نہیں کیا۔ ورنہ انہیں اپنی تقریر کو اور زیادہ سخت الفاظ کا جامہ پہنا کر دہرانے کی زحمت کرنا پڑتی۔ کچھ اور تاریخی واقعات کا حوالہ ملتا اور بات اُلجھ جاتی۔ اس وقت یہ قرینِ مصلحت نہیں تھا کیونکہ "لنچ آور" صرف آدھے گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اور میرے قریبی دوست جانتے ہیں کہ میں کھانے کو نعمت سمجھتا ہوں، اور خدا کے نیک بندوں کی

طرح نہ صرف کفرانِ نعمت نہیں کرتا، بلکہ خُدا کے برگزیدہ بندوں کی طرح کھانے سے پورا پورا انصاف کرتا ہوں۔ اور ہمیشہ اس فکر میں رہتا ہوں کہ انصاف کرنے کے موقعے ہر وقت ملتے رہیں۔ چنانچہ میں نے بیوی کی تقریر بڑے سکون سے سُنی۔ جب وُہ تقریر کر چکیں تو میں نے کہا۔ مجھے آپ کی ہر بات سے سولہ آنے یعنی سو نئے پیسے اتفاق ہے۔ انہوں نے اس اتفاق کو آگ لگا دینے کا مشورہ دیا۔ میں نے اس مشورہ پر عمل نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ اب وُہ ڈائننگ روم کی طرف میری رہنمائی کرینگی۔ لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔ آخر بے غیرتی لاد کر میں نے کہا کہ اگر کوئی حرج نہ ہو تو کھانا تناول فرمایئے۔ بس وُہ برس پڑیں۔

نگوڑا اُجاڑو بیٹھا مکان ہے۔ میرا تو ناک میں دم ہو گیا ہے۔ برے رُلائی نہیں آتی کیسی ادبی انجمن کا جلسہ تو تھا نہیں کہ میں بیچ میں اول پڑتا۔ ایڈیٹر) نے خود کو ایک اور تقریر سُننے کے لئے تیار کر لیا۔ بیوی نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ میں ہی ایسی ہوں جو ایسے ایسے مکانوں میں آپ کے ساتھ نباہ رہی ہوں، دوسری ہوتی تو دس مرتبہ میکے کے چکر لگوا چکتی پھر بھی میکے ہی میں بیٹھی ہوتی۔ ایک وُہ اُجاڑو بیٹھا مکان تھا کہ نیچے کے کمروں میں سیلن اور اوپر کے کمرے تو سبحان اللہ۔ چھتیں تھیں کہ چھلنی۔ پانی گھنٹہ بھر برسے تو چھت دو گھنٹے ٹپکے (غالب نے بھی یہی بات کہی تھی، لیکن میں نے بیوی کو نہیں ٹوکا کیونکہ پہلے وُہ ٹوکنے پر برہم ہوتیں۔ پھر خود کو غالب کے ہم پلہ سمجھنے لگتیں) ہزار بار کہا، لاکھ بار کہا کہ صاحب کوئی ڈھنگ کا مکان لیجئے، جس کی چھتیں بارش میں نہ ٹپکیں۔ بارہ مہینے تو برف اور بارش کا موسم ہوتا ہے، لیکن آپ کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی (جملہ زبان تک آ کے رہ گیا کہ سر میں جوئیں بھی تو ہوں، کان پہ کیا خاک رینگیں گے، لیکن میں نے جملے کا گلا گھونٹ دیا) بھلا ہو بیچارے متھرو بھائی کا، اُنہوں نے ترس کھا کے یہ فلیٹ دلوا دیا۔ نئی عمارت تھی۔ انکو کیا معلوم کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہیں۔ قبر کا حال کچھ مردہ ہی جانتا ہے۔ کیا ہے صاحب: برآمدے میں بجلی کا سوئچ نمونے کیلئے لگا ہے۔ کمروں کے سوئچ کام تو کرتے ہیں، لیکن اس نخرے سے کہ جی جل جائے۔ کبھی کرنٹ ملا دیں گے۔ کبھی دس مرتبہ جلاؤ، لیکن وہاں اسٹرائک ہو رہی ہے۔ ترکِ موالات کی تحریک چل رہی ہے اور اگر جل گئے تو جب تک آدمی بے غیرت نہ بنے، بجھیں گے نہیں۔ کیا ہے صاحب، غسلخانے میں نل بھی ہے اور شاور بھی۔ لیکن پانی نہیں۔ اب پوچھیئے کہ تیسری منزل پر تو آپ رہتے ہیں۔ نیچے سے کہاں تک پانی آئے۔ دو نوکر بھاگ کھڑے ہوئے۔ چلیئے بہشتی لگا لیا۔ لیکن اب یہ مصیبت ہے کہ غسلخانے کے فرش پر پانی نہ پڑے کیونکہ سیمنٹ کا فرش چھلنی کا کام کرتا ہے اور دوسری منزل کے کرایہ دار شور کرتے ہیں۔ اور سنئے اس فلیٹ میں آتے ہی صاحب بہادر کی آنکھوں میں سرسوں پھولی۔ لکڑی جلانے پر پابندی لگ گئی۔ ہیٹر آ گیا۔ ٹھیک ہے کہ لکڑی کی تلاش میں آپکو گھر سے گھاٹ تک پریشان ہونا پڑتا تھا، لیکن یہ بھی سوچا تھا کہ اس فلیٹ میں پانی اور بجلی کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ پانی حاضر تو غائب۔ بجلی ہے تو پانی نہیں۔ آج اسٹوو کی صفائی کرتے کرتے عزیز نے اس کے واشر کا صفایا کر دیا۔ وُہ تو کہو دال سالن صبح ہی پکا لیا تھا۔ آٹا گوندھ کر رکھا تو بجلی غائب۔ اب بتایئے میں کیا کروں۔ آپکو کیا کھانے کو دوں۔ میری بوٹیاں کھایئے۔ میرا سر کھایئے۔

مسئلہ بہت نازک تھا۔ میں خاموشی سے اُٹھ کر باہر گیا۔ ڈبل روٹی لایا۔ خود بھی کھانا کھایا اور اپنے سر کی قسمیں دے دے کر ان کو بھی کھلایا۔

شام کو دفتر سے واپس آیا تو ناشتے کے بجائے بھی بیوی کا لکچر ملا۔ میں ان کو لیکر نہرو پارک چلا گیا۔ وہیں ناشتہ کیا۔ گھر واپس آئے تو خیر بجلی آ چکی تھی۔ نہرو پارک کی ٹھنڈی ہوا نے انکی آتش مزاجی پر خاطر خواہ کام کیا۔ اب وُہ برہم نہیں تھیں، بلکہ بہت حد تک ان کا مزاج شگفتہ ہو گیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد میں حسبِ معمول ریڈیو سننے بیٹھا تو بولیں ایک بات بتایئے۔ میں نے کہا پوچھیئے۔ انہوں نے پوچھا، یہ ریڈیو

کس کا ہے؟ میں نے کہا: آپ کا ہے۔ کہنے لگیں: پھر اس کے کان نہ اینٹھیے۔ اس کو بند کر دیجیے۔ میں نے ریڈیو بند کر دیا۔ ڈلی کا تُرا لیکر وُہ پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ بولیں: انسان کو گھر بار کی فکر لازم ہے۔ میں نے کہا: ضرور لازم ہے۔ کہنے لگیں: آپ ایمانداری سے سوچئے کیا یہ گھر رہنے کے لائق ہے۔ معلوم ہوتا ہے جو پرائے پر بیٹھے ہیں۔ چار بجے صبح سے دو بجے رات تک کاروں، لبوں اور تانگوں کا شور، اور پھر گھر اتنا معقول کہ بجلی . . . . . پانی . . . . اور دیکھئے۔ نئی عمارت ہے لیکن دیواروں میں دراڑیں پڑی ہوئی ہیں۔ خدا نخواستہ کسی روز گر پڑے۔ اب مجھے بھی سنجیدگی سے سوچنا پڑا۔ میں نے سوچ کر کہا، مکان تو اس سے اچھا کہیں ملے گا نہیں۔ اور اگر ملے گا تو اس کا کرایہ میری تنخواہ سے زیادہ ہوگا۔ ہم کیوں نہ ایک مکان بنوا ڈالیں۔ یہ مژدہ سُنکر وُہ اُچھل پڑیں۔ کہنے لگیں۔ اب آپ نے عقل کی بات کی۔ جی میں آیا کہ جھک کر آداب کروں، لیکن انہوں نے تقریر شروع کر دی تھی: صبح کا بھولا شام کو آ جائے تو اُسے بھُولا نہ کہنا چاہیئے (جی میں آیا کہ غالب کا شعر سنا دوں لیکن ان کو دماغ ہو جاتا) اپنا مکان نہ ہو تو آدمی اُٹھائی گیرا معلوم ہوتا ہے۔ بھلا سوچئے۔ چھ سال میں یہاں جتنا روپیہ آپ نے کرائے میں دیا ہے، اتنے میں تو مکان بن جاتا (چھ سال میں جو شعر میں نے نہیں کہے، اگر کہے ہوتے تو ایک دیوان ہو جاتا) مگر یہ بتائیے کہ مکان بنوائیے گا کہاں؟ میں نے کہا کہ اس کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں۔ لکھنؤ میں بنوا لیں گے۔ انہوں نے اعتراض کیا: رہنا کشمیر میں ہے، لکھنؤ میں مکان سے فائدہ میں نے ان سے اتفاق کیا: یہ بھی آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ خیر یہیں بنوا لیا جائے گا (پاپلین کی قمیض سلوائی جائے گی) اب اُنھوں نے جرح کرنا شروع کی، آپ یہاں کے باشندے تو ہیں نہیں۔ پھر زمین کیسے خریدیئے گا؟ اس کا گڑھا گڑھایا جواب میرے پاس موجود تھا: کسی دوست کے نام پہلے لی

جائے گی۔ اس سے وُہ مطمئن ہو گئیں۔ لیکن ایک لعد سوال انہیں سوجھا: اگر کہیں اور تبادلہ ہو گیا۔ میں نے کہا: اول تو تبادلہ ہوگا نہیں، اگر ہوا بھی تو کیا۔ کوئی اور نوکری ڈھونڈھی جائے گی کہنے لگیں: ڈھنگ کا مکان تک آپکو ملا نہیں، نوکری کیا خاک ملے گی نوکریاں گھر پر نہیں آتیں۔ گھر پر آتی ہوتیں تو ضرور آپکو بھی کوئی مل جاتی۔ اگر سیبوں کی طرح درختوں پر نوکریاں لگتیں تو بھی آپکو نہیں ملتی کیونکہ آپ کبھی درخت تک جاتے ہی نہیں۔ لیکن خیر یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ تبادلہ کا انتظار نہ کیجئے۔ ابھی سے کوئی نوکری ڈھونڈ ھیئے۔ لیکن ایسی نہ ہو جیسی یہ ہے۔ دس بجے دن سے دس بجے رات تک کی نوکری نہ ہو۔ میں نے یقین دلایا کہ ان کی رائے پر عمل کروں گا۔ اب وُہ مکان کی طرف متوجہ ہوئیں دیکھئے میں کہے دیتی ہوں۔ باتھ روم اٹیچڈ ہوگا۔ یہ کیا کہ کمرے سے گلی میں جاؤ، گلی سے برآمدے میں اور وہاں سے باتھ روم۔ اور باورچی خانہ رہنے کے کمروں سے دُور ہوگا۔ یہ نہیں کہ گھر میں کوئی داخل ہوا تو کھانوں کی مہک اس کے نتھنوں میں پہنچنے لگی۔ ایسے گھر میں مہمان تکلف نہیں کرتے اور دیوالہ پٹتا ہے ہمارا میں نے سمجھایا کہ یہ فلیٹ ہے۔ گھر گھر ہوگا۔ چاروں طرف باغ ہوگا۔ بیچ میں مکان، کہنے لگیں: آپ اپنے دو کمرے الگ رکھئے گا۔ ایک تو آپ کا لکھنے پڑھنے کا کمرہ اور دوسرا آپ کا ڈرائنگ روم میرا ڈرائنگ روم الگ ہوگا۔ وجہ پوچھی تو اُنہوں نے بتایا: آپ کے دوست ایش ٹرے کے استعمال سے ناواقف ہیں۔ میں چپ ہو گیا، لیکن جھنجھلاہٹ ضرور ہوئی، اور جب انھوں نے یہ کہا کہ آنگن بڑا ہوگا۔ اور اس میں انار اور آڑو اور سیب اور چیری کے درخت ہوں گے تو پھر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے کہا: کیا بے وقوفی کی بات کرتی ہیں۔ آنگن سے برف کون اُٹھائے گا۔ اور پھر باغیچہ کاہے کے لئے ہے۔ گھر کے اندر آنگن نہیں ہوگا۔ انہوں نے اپنی بات پر ضد کی۔ میں اپنی بات پر اڑا رہا۔ بات بڑھ گئی اور اتنی بڑھی کہ انہوں نے ڈلی کا [illegible] (بقیہ صفحہ [illegible])

میر غلام محمد راجپوری
وزیر صنعت و تجارت حکومت جموں و کشمیر

صنعتیں — روزگار کے نئے وسیلے

ہماری معیشت زرعی ہے۔ معیشت کی یہ نوعیت ہماری ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ موجودہ سماج کو اشتراکی نظام میں بدل دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم صنعتوں کو بھرپور طریقے پر ترقی دیں۔
پہلے پنجسالہ منصوبے کے تحت ہم نے صنعت و حرفت کے میدان میں ترقی کی۔ دوسرے پانسالہ منصوبے میں ترقی کی رفتار اور تیز کر دی جائے گی۔
اس مضمون میں آنریبل وزیر تجارت و صنعت نے صنعتی ترقی کے پس منظر اسکیموں کی تفصیل اور انکی افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:—

ریاست جموں و کشمیر میں صدیوں تک جاگیر شاہی کا دور دورہ رہا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں ایک خاص ڈھنگ کی معیشت پروان چڑھی جس کے تحت یہاں نہ ہی صنعتوں کو کوئی خاص فروغ ملا اور نہ ہی کاروبار آگے بڑھ سکا۔ ماضی بعید میں ہماری معیشت جاگیردارانہ نوعیت کی تو تھی ہی لیکن اس میں اسوقت بھی کوئی خاص تبدیلی نہ آئی۔ جب سارے ہندوستان میں نئی نئی صنعتیں قایم ہوئیں۔ اور دُنیا میں صنعتی ترقی کا دور شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی ہماری اسّی فیصدی آبادی زراعت پر انحصار رکھتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۰-۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق صوبہ کشمیر میں سے ۱۶ لاکھ ۹۷ ہزار اشخاص سے ۱۳ لاکھ ۴۸ ہزار افراد اور صوبہ جموں میں ۱۱ لاکھ ۹۸ ہزار اشخاص میں سے ۱۰ لاکھ ۹۷ ہزار افراد کسی نہ کسی شکل میں زراعت سے وابستہ ہیں۔
ہماری زراعت پیشہ آبادی کے پاس کھیتی باڑی کے لئے بہت کم زمین ہے اور وہ کاروبار کے دوسرے ذرائع سے محروم رہے ہیں۔ اس لئے وہ مشکل سے قوت لایموت حاصل کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ریاست کی تجارت غیر متوازن رہی اور لوگوں کا معیار حیات بلند ہونے سے رہ گیا۔
اس سلسلے میں ۴۸-۱۹۳۹ء کی تجارت درآمد و برآمد کا حسب ذیل نقشہ قابل ملاحظہ ہے:—

	درآمد	برآمد
کل =	۲،۴۶،۳۵،۱۴ روپے	۱۶۷،۹۳،۷۸۵
سوتی اشیاء =	۶۸۱۸۵۳۶ "	
چائے =	۳۰۴۶۷۲۱ "	
اونی چیزیں =	۹۶۰۴۴۳ "	
تیل =	۱۷،۱۴،۶۴۰ "	
میوے اور سبزیاں =	۱۳،۴۱،۶۲۴ "	

یہ غیر متوازن تجارت اسبات کا تقاضا کرتی تھی کہ ریاست میں نئی صنعتیں قائم کی جائیں تاکہ ایک تو نئے کام وجود میں آنے سے زمین پر دباؤ کم ہوجاتا اور دوسرے یہ کہ لوگوں کو روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسّر ہوسکتے۔ لیکن شخصی حکومت نے اس سلسلے میں کوئی خاص قدم نہ اُٹھایا۔ اس میں شک نہیں کہ آزادی سے پہلے یہاں چند ایک صنعتیں قائم ہوئیں۔ مگر وسیع آبادی اور ملکی ضرورتوں کے پیش نظر یہ صنعتیں قوم کی مجموعی دولت میں کوئی خاص اضافہ نہ کرسکیں۔
مہاراجہ کے عہد حکومت میں ریاست کی دو کروڑ ۷۵ لاکھ روپے کی سالانہ آمدن میں سے صرف ۱۶ لاکھ روپے رفاہ عامہ کے کاموں پر

خرچ کئے جاتے ہے اور صنعتوں پر بہت ہی کم توجہ دی جاتی رہی چنانچہ اس کا اعتراف گلینسی کمیشن نے ۱۹۳۲ء میں اپنی رپورٹ میں کیا تھا جس میں لکھا گیا:۔

"..... ریاستی حکومت کو اپنی اولین فرصت میں ریاست کے اندر صنعتیں قائم کرنی چاہیئں..... موجودہ وقت میں صنعتوں کو فروغ دینا ضروری ہے تاکہ ریاستی عوام کی بیروزگاری اور بیکاری کو ختم کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔"

یہ بات عیاں ہے کہ ریاست میں پوشیدہ معدنی اور صنعتی ذخائر کو ڈھونڈ نکال کر ریاست کو شاہراہ ترقی پر ڈالا جا سکتا تھا۔ لیکن ماضی میں عیاں وجوہ کی بناء پر اس بارے میں کوئی پہل نہ ہوسکی اور ہماری شہرۂ آفاق دستکاریوں مثلاً وڈ کارونگ، پیپر ماشی، شال بافی نقرئی برتن سازی کو خاص سہارا نہ ملا پھر بھی ہماری یہ صنعتیں ہمارے کاریگروں کی عظیم فنکاری اور جان توڑ محنت کی بدولت فنا ہونے سے بچ گیئں۔

عوامی حکومت کے قیام کے بعد جب ریاست کی معاشی ترقی کی طرف دھیان دیا جانے لگا۔ تو نئی صنعتیں قائم کرنے اور پرانی صنعتوں کو بحال کرنے کے لئے اقدامات کئے جانے لگے۔ لیکن عوامی حکومت کے ابتدائی دور میں اس سلسلے میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست بدستور معاشی پسماندگی سے دوچار رہی۔ ۱۹۵۳ء میں بخشی وزارت نے جب اقتدار سنبھالا تو اس نے رفاہ عامہ کے دوسرے اقدامات عمل میں لانے کے ساتھ ساتھ ریاست کے پنجسالہ منصوبہ کو اس طرح مرتب دیا کہ اس میں صنعتی ترقی اور گھریلو دستکاریوں کو فروغ دینے کے امور پر خاص زور دیا گیا۔ پلان پر اس ڈھنگ سے عمل ہونا شروع ہوا کہ ایک دو برس میں ہی پرانی صنعتیں اپنے پاؤں میں کھڑا ہونے لگیں۔ اور جگہ جگہ دستکاریوں کے نئے نئے پیداواری مراکز اور کئی چھوٹے بڑے کارخانے قائم کئے گئے۔ مختصر یہ ہے کہ پہلے صنعتوں کی توسیع فروغ پر پہلے پنجسالہ منصوبہ کے دوران ۴۳۰،۰۷ لاکھ روپے خرچ کرکے کئی کامیابیاں حاصل کی گیئں۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ہم گذشتہ کئی سال سے صنعتی میدان میں آگے کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ لیکن ریاست میں آمدورفت کی مناسب و موزون سہولیات کی عدم موجودگی اور ریل کا کوئی انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ہم تسلی بخش طور پر آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔ اس لئے جہاں ہم ذرائع رسل و رسائل کو وسیع پیمانے پر بڑھاوا دینے میں منہمک ہیں وہاں ہم نے عوامی مذاق اور روایت کے مطابق گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو ترقی دینے کی طرف بھی توجہ دی۔ ان اسکیموں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا ہے اور بہت سارے لوگوں کو روزگار مہیا ہوا ہے۔

۱۹۵۳ء کے بعد ریاست کی صنعتوں اور تجارت کو فروغ دینے کے لئے سب سے پہلے جو کام کیا گیا، وہ کسٹم ڈیوٹی کی منسوخی تھی۔ یہ قدم اٹھانے سے تجارت اور صنعتوں کی ترقی کے پہلے سے بہتر مواقع پیدا ہوئے۔ اس اقدام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا کہ ہر ریاستی باشندہ کو اس ٹیکس کے تحت سالانہ پانچ روپے ادا کرنے پڑتے تھے۔ اور اکثر صورتوں میں باہر سے درآمد شدہ مال پر ۵۰ فیصدی سے زیادہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال کے پیش نظر یہاں کے تاجروں اور صنعت کاروں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور صنعتیں اور تجارت معقول حد تک ترقی کرنے سے رہ گئی تھی۔ لیکن یہ ٹیکس ختم کرنے سے تجارت اور صنعتوں کی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ دور ہو گئی۔

حکومت نے گذشتہ چار سال کے دوران گھریلو دستکاریوں کو منظم کرنے کے سلسلے میں قابل تعریف کام انجام دیا۔ چنانچہ دو سو سے زائد پیداواری مراکز قائم کئے گئے۔ دستکاریوں کے تحفظ اور کاریگروں کے فن میں زمانہ کے تقاضوں کے مطابق جدت پیدا کرنے کی خاطر کئی اقدامات کئے گئے۔ دستکاروں کی بنائی ہوئی چیزوں کے لئے وسیع منڈیاں تلاش کرنے کے لئے ایمپوریم کو نئی تشکیل دی گئی۔ ہندوستان کے کئی بڑے شہروں میں ایمپوریم کی شاخیں قائم کی گیئں۔ غیر ممالک میں ہندوستان کے سفارت خانوں میں کشمیری مصنوعات فروخت کرنے کیلئے انتظامات کئے گئے۔ چنانچہ ایمپوریم کے ذریعہ گذشتہ سال کے دوران ۴۰ لاکھ روپے کا سامان فروخت کیا گیا۔

اس کے علاوہ سرینگر میں سنٹرل مارکیٹ قائم کر کے مارکیٹنگ کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ چنانچہ اس مارکیٹ کی اوسط سالانہ بکری ۱،۰۰،۰۰۰ روپے ہوتی ہے۔ مقامی مصنوعات کی بکری کو فروغ دینے کے لئے نمائشیں بھی منعقد کی گئیں اور دستکاریوں کے لئے خام مواد فراہم کرنے کے لئے ٹھوس کاروائی کی گئی اور اب ان انتظامات کو دھیرے دھیرے وسعت دی جا رہی ہے۔

دستکاریوں کو توسیع دینے کے ساتھ ہی ریاست میں کچھ نئے کارخانے بھی وجود میں لائے گئے۔ چنانچہ جموں میں رنگ سازی اور معدنیات کی ایک فیکٹری قائم کی گئی۔ اس کارخانے میں چینی مٹی، کھاری مٹی اور صابون سازی کا مصالحہ تیار کیا جاتا ہے۔ روزن اور ٹرپنٹائن فیکٹری کی پیداوار میں بھی خاصا اضافہ ہوا اور سرینگر کے نزدیک ہی شالہ ٹینگ میں جدید طرز کا چمڑے کا کارخانہ قائم کیا گیا۔ اس کارخانے میں وہ تمام کھالیں کام میں لائی جائیں گی جو پہلے بھاری مقدار میں یہاں سے برآمد کی جاتی تھیں۔ حال ہی میں اس کارخانے میں جوتے بنانے کا ایک شعبہ بھی کھولا گیا۔

ریاست میں چھوٹے پیمانے کی کئی نئی صنعتیں منظم کی گئیں۔ جن میں ہیرانگر کا ہینڈ لوم پروڈکشن سنٹر، بسوہلی کا پشمینہ سنٹر، میران صاحب کا دستی کاغذ بنانے کا مرکز اور کشتواڑ، رام بن اور سانبہ میں اُون کے پیداواری مراکز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان مراکز کو چلانے کے لئے ماہرین کا بندوبست کر دیا گیا۔ کئی طلباء کو ڈیزائننگ، برتن سازی، شال سازی، جلد سازی اور بنائی اور دوسری صنعتوں میں تربیت دلانے کے لئے ٹراونکور، کوچین، شانتی نکیتن اور امرتسر بھیج دیا گیا۔

ماضی میں ریاست کی پشمینہ بافی کی اہم اور مشہور صنعت مناسب قیمتوں پر خام اون مہیا نہ ہونے کی وجہ سے تنزل کی طرف جا رہی تھی۔ لیکن حکومت نے ۵۰،۰۰۰ روپے کی لاگت سے ایک پشمینہ سنڈیکیٹ قائم کر کے اس مشکل کو دُور کر دیا۔ ہینڈ لوم سلک انڈسٹری کو بھی فروغ دیا گیا۔ جولاہوں میں رعایتی قیمتوں پر تقریباً ۷۰۰ کھڈیاں تقسیم کی گئیں جن پر حکومت کو ۴۰،۰۰۰ روپے کا خرچہ برداشت کرنا پڑا۔

حکومت نے چھوٹے چھوٹے تاجروں اور دستکاروں کو اپنے پیشوں اور تجارت میں بحال کرنے کے لئے ۱۵ لاکھ روپے کے قرضے تقسیم کئے اور چھوٹے پیمانے کی صنعتیں چلانے کے لئے بھی قرضے دئے گئے۔

ایک کارخانہ تعمیرات بھی قائم کیا گیا، جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے سارے ایشیا میں عظیم ہے کیونکہ ایشیا کے قطع نظر یورپ اور شمالی امریکہ میں بھی اس قسم کے کارخانے شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ اس کارخانے میں سالانہ ۳۶ لاکھ دروازے اور اتنی ہی کھڑکیاں تیار کی جا سکیں گی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ کارخانہ سالانہ ۲۵ لاکھ روپے کی مالیت کا سامان تیار کر سکے گا۔

اس کے باوجود کہ ریاست کے کئی حصوں میں اُون ملتا ہے، گورنمنٹ وُولن ملز کی ضروریات کے لئے، ۸۰ فی صدی اُون اور خام مواد باہر سے درآمد کیا جاتا تھا۔ لیکن اب مقامی خام مواد کو استعمال میں لانے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ چنانچہ کہ سال ۵۶-۱۹۵۵ کے دوران مِل کی کل ۴۱،۲۰ من اُون کی ضرورت میں سے ۲،۲۵۰ من اُون مقامی طور پر حاصل کیا گیا ہے اس کے علاوہ کارخانے کو توسیع دینے کیلئے حسب ذیل اقدامات بھی کئے گئے:-

(الف) قالین بافی، نمدہ سازی، ایمبرائڈری، ٹیپسٹری اور رفل شال بنانے میں مقامی اون سے تیار کئے ہوئے دھاگے کو استعمال میں لانے کے لئے ضروری اسکیمیں تیار کی گئیں۔

(ب) کارخانہ میں تیار شدہ مال کی بکری بڑھانے کے لئے دو علاقائی ایجنسیاں قائم کی گئیں جن کی بدولت ۵۶-۱۹۵۵ء کے دوران کارخانہ میں ۷۶،۰۰۰ روپے کی مالیت کا مال فروخت ہوا۔

(ج) کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں اور عملے کو کئی سہولیات دی گئیں چنانچہ ان لوگوں میں ۲۹،۵۹۵ روپے بطور بونس تقسیم کئے گئے اور انہیں طبی امداد بھی مفت دی جا رہی ہے۔

سِلک ویونگ فیکٹری کی پیداوار کا معیار بھی بڑھ گیا اور خام ریشم کی ایک نئی قسم "ایکسٹرا اسپیشل" دریافت کی گئی ہے جس کی بدولت کارخانہ کی آمدن میں ۷۷،۰۰۰ روپے کا اضافہ ہوا ہے۔ غنچہ ہائے ابریشم

کی وجہ دوئم قسم کی منجہ بندی اور ذخیرہ کرنے سے بھی کارخانہ کی
آمدنی میں ۵۵۰۰۰ روپے کا اور اضافہ ہوا۔

مزدوروں سے زیادہ کام لینے اور ان کی اجرتیں کم کرنے کی پرانی
پالیسی کو بدل کر مزدوروں کی صلاحیتوں کو ابھارنے کیلئے سازگار حالات
پیدا کئے گئے اور ان کی اجرتوں میں معقول اضافہ کیا گیا۔ ان اقدامات
کی بدولت مزدوروں پر کوئی دباؤ ڈالے بغیر ہی جموں اور سرینگر کے
ریشم خانوں کی پیداوار بڑھ گئی ہے۔

کارخانوں کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی اجرتیں
بڑھا دی گئیں۔ جو تارکش پہلے ایک روپیہ بارہ آنے فی یوم اجرت پاتا
تھا وہ اب دو روپے بارہ آنہ کماتا ہے۔ اور اسے بونس حاصل کرنے کا حق
بھی ہے۔ مزدور کو پندرہ دن کی با تنخواہ رخصت اور طبی سہولیات بھی
حاصل کر سکتے ہیں۔ اور انہیں تفریح طبع کھیل وکود کی دوسری سہولیات
بھی مہیا ہیں۔

مزدوروں اور مینجمنٹ کے درمیان اشتراک عمل پیدا کرنے کے لئے
مشاورتی بورڈ قائم کئے گئے جن میں مزدوروں اور عملے کے مساوی نمائندے
شامل ہوتے ہیں۔ بورڈ کارخانے کو ترقی دینے کے لئے منصوبے تیار کرتے
ہیں۔

ریاست میں ادویہ سازی کی صنعت کو اور فروغ دینے کے لئے
کئی تدابیر اختیار کی گئیں۔ حکومت نے وسیع پیمانے پر ادویات کاشت
کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کشمیر میں تجربہ کرنے کے لئے جو فارم قائم کیا
گیا تھا، اس کو اب ۱۰۰ ایکڑ سے ۳۰۰ ایکڑ زمین پھیلایا گیا، اور باہر
سے بڑھیا قسم کے بیج درآمد کر کے انہیں کاشت کیا جا رہا ہے۔ سرینگر
میں ادویات سازی کی ایک فیکٹری بھی قائم کی گئی جس میں ریاست
کی جڑی بوٹیوں کی شستہ وصاف شکل میں تبدیل کر کے جموں بھیجا جاتا
ہے، جہاں ان دواؤں کو آخری شکل دے کر فروخت کرنے کے لائق بنا
دیا جاتا ہے۔

سیاحت جو کہ ریاست کی اہم صنعت ہے، کو تقسیم ملک سے
کافی دھچکا لگا تھا اور اس صنعت پر انحصار رکھنے والے لوگوں کو سخت
تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن ریاست میں جب حالات اعتدال
پر آئے تو یہ صنعت پھر سے بحال ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء میں یہاں
۶۲،۰۰۰ سے زیادہ سیاح آئے۔

سیاحوں کو جو سہولیات مہیا کی گئیں ان میں حسب ذیل قابل
ذکر ہیں:۔

(۱) سیاحوں کے لئے سرینگر میں ایک عظیم الشان استقبالیہ مرکز
قائم کرنا۔
(۲) ریل کرایہ میں رعائت
(۳) بسوں کے کرایہ میں کمی
(۴) سیاحوں کو ضروری سہولیات بہم پہنچانے کے لئے پہلگام گلمرگ
اور سرینگر میں ٹورسٹ ہوٹلوں کا قیام۔
(۵) ایئر سروس کیلئے مناسب اوقات مقرر کرنا اور پٹھانکوٹ سے
سرینگر تک بس سروس کا اجراء۔
(۶) ہندوستان اور بیرونی ممالک میں لوگوں کو کشمیر کی سیاحت
پر ابھارنے کی مہم کا آغاز۔
(۷) جابجا ڈاک بنگلوں اور ریسٹ ہاؤسوں قائم کرنا۔
(۸) صحت افزا مقامات تک پہنچنے کے لئے سڑکیں تعمیر کرنا۔
(۹) سیر گاہوں کو بہتر بنانا۔

پرانی صنعتوں کو بحال کرنے اور نئی صنعتوں کو رواج دینے کے سلسلے
میں گذشتہ چار سال کے دوران جو ترقی ہوئی ہے وہ قابل قدر ہے،
ان اقدامات کی بدولت ریاست کی صنعتی پیداوار میں معتدبہ اضافہ ہوا۔
زمین پر بتدریج دباؤ کم ہو رہا ہے۔ اور لوگوں کے لئے روزگار کے نئے نئے
مواقع کھل رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم صنعتی ترقی کے ایک نئے دور میں
داخل ہو گئے ہیں۔ لیکن ابھی ہم اس دور کے ابتدائی مرحلے میں ہیں ترقی
کے مراحل طے کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان تمام ذرائع کو بروئے
کار لائیں، جو ابھی بیکار پڑے ہیں۔ چنانچہ دوسرے پنجسالہ منصوبہ میں
ان ذرائع کو کام میں لانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

منصوبے کی میعاد میں ریاست کی گھریلو صنعتوں کو مستحکم بنیادوں

پر ترقی دی جائے گی تاکہ کار حیات کے مزید ذرائع پیدا ہو سکیں اور دیگر دیہی آمدن میں اضافہ ہو سکے۔ اس کے علاوہ کم شرحوں پر خام مال کی فراہمی اور گھریلو صنعتوں کی پیداوار کو فروخت کرنے کے لئے زیادہ بہتر سہولیات مہیا کرنے کی اسکیمیں بھی مرتب کی گئی ہیں۔ برقی قوت دوگنی ہو جانے کی بھی توقع ہے اور یہ تجویز کیا گیا ہے کہ صوبہ جموں میں بسوہلی، رام نگر اور بھمبر راجوری، بھدرواہ اور صوبہ کشمیر میں اننت ناگ کو بھی فراہم کی جائے، تاکہ قصبوں میں بھی چھوٹے پیمانے کی صنعتیں قائم ہو جائیں۔

آئندہ زیادہ سے زیادہ سیاحوں کو یہاں لانے کے لئے بہتر انتظامات کئے جائیں گے۔ پرانے سیرگاہوں کو وسعت دی جائے گی اور نئے صحت افزا مقامات کی نشاندہی کی جائے گی، اور سیاحوں کے آنے جانے، کھانے پینے اور رہنے سہنے اور ان کی رہنمائی کے انتظامات کو فروغ دیا جائے گا۔

وسیع پیمانے کی صنعتوں سریکلچر اور جنگلات کا جہاں تک تعلق ہے ان کو وسعت دینے کے ہر ممکن ذرائع کو بروئے کار لائے جائیں گے۔ سرکاری کارخانے جو اب بہت پرانے ہو چکے ہیں ضروری ساز و سامان سے لیس کئے جائیں گے اور ان کی از سر نو تنظیم کی جائے گی۔

ریاست کو صنعتی میدان میں آگے لیجانے کے لئے ذرائع رسل و رسائل کو ترقی دی جائے گی، کیونکہ اسوقت ریاست کے دور دراز علاقوں مثلاً کشتواڑ اور لیہ میں سامان لیجانا اور وہاں سے چیزیں لانا کافی دشوار معاملہ ہے۔ اور ریاست میں ریلوے لائن نہیں ہے، اسلئے اندرون ریاست کے رسل و رسائل اور ریاست کو باہر سے ملا دینے والی سڑکوں اور شاہراہوں کی جدید تعمیر کی جائے گی۔ چونکہ صوبہ جموں کا بیشتر حصہ پہاڑی ہے اور اس کے قصبہ جات بھی دور افتادہ ہیں، اس لئے سڑکوں کی تعمیر کا منصوبہ خاص طریقے پر مرتب کیا گیا ہے، تاکہ وہ علاقے آباد ہو جائیں جہاں معدنی دولت پائی جاتی ہے اور اندرونی علاقوں کو تجارتی مراکز کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے۔

الغرض آئندہ پنجسالہ منصوبہ کی میعاد میں صنعتوں کو ہر لحاظ سے ترقی دی جائے گی۔ منصوبے میں متعدد چھوٹی بڑی سکیمیں شامل ہیں اجمالاً تفصیل یوں ہے:—

تعمیر

نمبر شمار	اسکیم	رقم (لاکھوں میں)
۱۔	سریکلچر	۶۰٫۰۰ روپے
۲۔	امپوریم اور نمائشیں	۴۰٫۰۰ ″
۳۔	جنگلاتی صنعتیں	۳۲٫۲۰ ″
۴۔	صنعتوں کے لئے قرضے	۲۰٫۰۰ ″
۵۔	ادویات کے متعلق تحقیق	۱۰٫۰۰ ″
۶۔	صنعتی کواپریٹو	۵٫۰۰ ″
۷۔	اسکیمیں جو کل ہند بورڈ کے دائرے میں آتی ہیں	۱۲۰٫۰۰ ″
	کل	۳۰۲٫۲۰ روپے

اس کے علاوہ بجلی، سڑکوں و ٹرانسپورٹ اور سیاحت کی صنعت پر علی الترتیب ۳۱۰٫۰۰، ۹۰۰٫۰۰، ۱۰۰٫۰۰ لاکھ روپے خرچ کئے جائیں گے۔

ان اسکیموں کا بغور جائزہ لینے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگلے پانچسالہ منصوبے کی میعاد میں ہماری صنعتوں میں ایک زبردست انقلاب آ جائیگا۔ اب تک جو ذرائع اور انسانی قوت ضائع ہو جاتی تھی، انہیں کام میں لاکر دھیرے دھیرے بیکاری کو ختم کرنے کا اہتمام کیا جائیگا۔ گھریلو دستکاریوں کو فروغ دینے سے ہماری آبادی کے ایک بڑے حصے کو کاروبار ملیگا۔ ایک محدود اندازے کے مطابق گھریلو دستکاریوں سے دوسرے پلان کی مدت میں لگ بھگ ۲۸۴۰۰ اشخاص کو روزگار مہیا ہو گا۔ گھریلو دستکاریوں میں روپیہ لگانے سے روزگار کے جو مواقع فراہم ہوں گے اگرچہ اس موقع پر ان کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے تاہم اتنا تو واضح ہے کہ گھریلو صنعتوں سے آبادی کے ایک حصے کو دائمی طور پر کاروبار مہیا ہوتا رہے گا۔

منصوبے کے وقت میں ۷۰۰۰ سے زائد کلوواٹ بجلی پیدا کی جائے گی جو ان صنعتوں کی ترقی کے لئے استعمال کی جائے گی، جو پلان میں شامل ہیں۔ مختلف ضرورتوں کے لئے بجلی کی تقسیم کا ایک مجموعی نقشہ یوں ہے:—

سلک فیکٹری ۳۱۱۲ کلوواٹ

اگست ستمبر ۱۹۵۷ء

(تعمیر کے خاص نمایندے سے)

ورق ورق

نئی کابینہ - صدر ریاست کا خطبہ - بچت کی مہم - پاکستانی حکمرانوں کے لئے دردِ سر - شری کرشنا مینن کی آمد ☆

پچھلا مہینہ اِس سال کے شروع میں اب تک کے تمام مہینوں میں سب سے زیادہ گہما گہمی اور دلچسپی کا مہینہ تھا - ایک تو وزارت سازی کا کام مکمل ہوا - دوسرا قانون ساز اسمبلی اور قانون ساز کونسل کا پہلا اجلاس منعقد ہوا ان واقعات سے سماجی اور سیاسی زندگی میں اس مہینہ میں کافی گرمی اور حرکت محسوس کی گئی -

نئی وزارت سات منسٹروں پر مشتمل ہے جن میں ایک منسٹر کے نام کا اعلان ابھی نہیں ہوا - وزیر اعظم کے علاوہ جو دوسرے وزیر لئے گئے - ان کے نام یہ ہیں :- شری شیام لال صراف وزیر صحت و تعلیم کوتوال چونی لال وزیر ترقیات - شری دینا ناتھ مہاجن وزیر مال - مسٹر شمس الدین وزیر دیہات سدھار و بلدیات اور مسٹر غلام محمد میر راجپوری وزیر صنعت و تجارت - اس کے ساتھ ہی وزرائے مملکت کا اعلان کیا گیا - اس میں بھی چھ سٹیٹ منسٹر لئے گئے - جن کے نام یہ ہیں :- شری کرشن بکولا وزیر مملکت لداخی امور - سردار ہربنس سنگھ آزاد وزیر مملکت جنگلات - بھگت چھجو رام - مسٹر عبدالغنی ترالی - اور مسٹر غلام نبی وانی سوگامی -

خالد کشمیر جناب بخشی غلام محمد کی قیادت میں نئی وزارت کا جس گرمجوشی اور نیک خواہشات کے ساتھ سواگت کیا گیا - اس سے یہ اُمید بندھتی ہے کہ نئی وزارت جن ولولوں اور اُمنگوں کو لے کر معرض وجود میں آئی ہے - اُسے اُن اُمنگوں کو پورا کرنے اور اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح نبھانے کے کاموں میں عوام کے ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں کا تعاون حاصل رہے گا - ریاست کے ہر بہی خواہ کی آج یہی خواہش ہے - کہ نئی وزارت اس ریاست کو سچے معنوں میں عوامی بہبودی کی سٹیٹ بنانے میں عہدہ برآ ہو -

وزارت سازی میں ہر صوبہ اور علاقے کا لحاظ رکھا گیا - اور جمہوری روایات کے عین مطابق ہر صوبے اور علاقے کو نمایندگی حاصل ہوئی - وزارت عظمیٰ کا چارج سنبھالنے کے بعد جناب بخشی غلام محمد نے ایک نشری تقریر کی جس میں انہوں نے نئی وزارت کی پالیسی کا ایک خاکہ پیش کیا - آپ نے کہا - حکومت ذرائع نقل و حمل کو وسعت دینے - آبپاشی کو فروغ دینے اور بجلی کی پیداوار بڑھانے کے لئے پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے کام کرے گی - اسی طرح مکانات بنانے اور فلاح عامہ کے دیگر کام انجام دینے کی طرف بھی خاص دھیان دیا جائے گا - آپ نے کہا کہ سب سے بڑھ کر ہماری تمام تر کوششیں ریاست میں اقتصادی استحکام پیدا کرنے کے کام پر مرکوز رہیں گی - یہ مقصد پورا کرنے کے لئے اولین ضرورت اس بات کی ہے کہ دیہاتی علاقوں میں دیہات سدھار کی سکیموں کے ذریعہ سے جن شکتی کے وسیع ذرائع کو بروئے کار لایا جائے اجتماعی ترقی کی تحریک جسے شروع کئے گئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور زیادہ تیزی سے چلائی جائے گی - آپ نے عوام کو دشمنوں کی چالوں سے خبردار کیا اور عوام سے اپیل کی کہ وہ نئی وزارت کی اور رفاقت اور تعاون کا ہاتھ بڑھائیں -

صدر ریاست شری کرن سنگھ جی نے بھی قانون ساز اسمبلی اور قانون ساز کونسل کے مشترکہ اجلاس میں اپنا خطبہ پیش کیا جس میں انہوں نے کہا - مجھے انتہائی مسرت ہو رہی ہے کہ ہماری ریاست کے آئین کی بدولت جو عوام کے نمایندوں نے مرتب کیا ہے - ہمارے ارادوں کو وسعتیں مل رہی ہیں - اور ہمارے لئے سماجی اور اقتصادی ترقی کے نئے

راستے کھل گئے ہیں۔ آپ نے کہا۔ یہ بات رنجدہ ہے کہ ریاست کا ایک بڑا علاقہ ابھی تک ایک غیر ملک کے غیر قانونی قبضہ میں پڑا ہوا ہے۔ جس نے اس پر جبر اور تشدد کے بل پر تسلط کر رکھا ہے۔ اس لئے یہ علاقہ مجلس قانون ساز میں نمایندگی نہیں پا سکا ہے۔ حالانکہ ہمارے آئین نے اس علاقے کے لوگوں کو حملہ آوروں کے جابرانہ قبضہ سے آزاد کرنے پر اس ایوان میں نمایندگی حاصل کرنے کا حق عطا کیا ہے۔

صدر ریاست کا کہنا بجا ہے۔ اس مسلسل جابرانہ کاروائی اور ناجایز قبضہ نے ہماری ریاست کو نہ صرف مصنوعی طور پر تقسیم کر رکھا ہے بلکہ اُس نے لوگوں کی ایک بھاری تعداد کو جو پاکستانی مقبوضہ علاقے میں عوامی اور جمہوری الحقوق کے استعمال سے محروم کر رکھا ہے۔ بہرحال میں پورے خلوص کے ساتھ اُمید کرتا ہوں کہ دنیا کی بیدار ہوتی ہوئی رائے عامہ جابر طاقت کو کشمیر میں جنگ کا مجرم تسلیم کرنے اور ہماری سرزمین کو خالی کرنے پر مجبور کرے گی۔

آخر میں آپ نے پُرانے کاموں کا جائزہ لے کر اور نئے کاموں کی تفصیل بیان کر کے عوام سے اپیل کی کہ وہ تندہی اور جانفشانی سے ملک کی تعمیر نو میں حصّہ لیں۔

تعمیر نو کی ترقی میں اہم پارٹ ادا کرنے کے لئے اگرچہ سب اپنی صفوں کو یکجا کر رہے ہیں۔ تو اس کے ساتھ ہی اخراجات میں بچت کی طرف بھی خاص توجہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں صدر ریاست اور ریاست کے وزیروں نے اپنی تنخواہوں میں رضاکارانہ کمی کرنے کا اعلان کر دیا۔ صدر ریاست نے ماہانہ الاونس میں دس فیصدی کٹوتی کر دی۔ اسی طرح کابینہ کے وزیروں نے اپنی تنخواہوں میں دو سو روپے کی کمی کر دی۔ اب وزراء کو ماہوار ایک ہزار روپے کے بجائے آٹھ سو روپے تنخواہ ملے گی۔ اس کے ساتھ کار الاونس میں بھی کمی کر دی گئی ہے۔ دو سو روپے کے بجائے ایک سو روپے کار الاؤنس مقرر کر دیا گیا ہے۔

نئی وزارت کے قیام ہونے کے بعد وزیر اعظم نے تمام سرکاری محکموں کے سیکریٹریوں اور اعلیٰ افسروں کو نئے وزیروں سے تعارف کرایا۔ آپ نے کہا۔ تعمیر و ترقی کے اس عظیم کام میں ریاست کے ہر ایک محکمہ کو برابر کا حصّہ ادا کرنا ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایڈمنسٹریشن کو جمہوری اور صحت مند لائنوں پر چلانے کے لئے تمام محکموں کے افسر اور اہل کار ایک دوسرے سے تال میل قایم کریں اور ایک دوسرے کے قریب آئیں۔

وزیر اعظم نے کہا۔ آج ریاست میں جو خاموش اور تاریخی انقلاب رونما ہوا ہے اُس میں ریاستی ایڈمنسٹریشن کے کام کرنے کے ڈھنگ اور لائحہ عمل کو بھاری اہمیت حاصل ہے۔ نظم و نسق کا معیار جتنا اونچا ہوگا۔ عوامی جمہوری اور قومی ترقی کے کاموں کو پورا کرنے میں اتنی ہی پھرتی اور مستعدی پیدا ہوگی۔ آپ نے کہا۔ میں آپ کی ذات سے اُمید کرتا ہوں کہ آپ اس نئی فضا کو محسوس کریں گے جو آئین کے نفاذ کے بعد محسوس کی جا رہی ہے اور نئے سماجی اور عوامی تقاضوں کو پُورا کرنے کے لئے کابینہ کے ہاتھ بٹائیں گے۔ اور اس ریاست کو سچے معنوں میں ہر طبقہ کے لئے ایک فلاحی سٹیٹ بنانے میں تعاون کریں گے۔ آپ نے کہا مجھے سرکاری افسروں کے کام کرنے کی صلاحیتوں پر پُورا اطمینان ہے کیونکہ ان کا اب تک کا کام تسلی بخش ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ریاست میں ترقی کی شاہرائیں جو کھل گئی ہیں۔ اُس کی خاص وجہ یہ ہے۔ کہ اس ریاست کا الحاق ایک جمہور نواز ملک ہندوستان کے ساتھ ہوا۔ ریاستی عوام کو بھی اپنی ریاست میں جمہوری حکومت قایم کرنے کا موقع ملا۔ ہندوستان نے ریاست کے آگے بڑھانے کے لئے جو کچھ مالی امداد دی اُس کا نتیجہ عیاں ہے۔ اس کے مقابلے میں جب مقبوضہ کشمیر کے حالات کو دیکھا جا رہا ہے۔ وہاں کے لوگوں کو آزادی طلب کرنے پر گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ آج بیرونی ملکوں میں خاص کر جن میں اسلامی ملک بھی شامل ہیں۔ ہندوستان کی تعریفیں کی جا رہی ہیں اور ہندوستان کو جس میں کشمیر بھی شامل ہے۔ ایسی ترقی کرنے پر عزّت سے دیکھا جا رہا ہے۔

دیکھنا یہ ہے۔ کہ پاکستان بھی اُس وقت آزاد ہوا۔ جب کہ ہندوستان کو آزادی حاصل ہوئی۔ لیکن ہندوستان نے اپنی

آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے ہر پہلو سے حفاظت کی مگر پاکستان سامراجیوں کا غلام بنا اور وہ اپنی آزادی کھو بیٹھا۔ پاکستان کو ہماری ترقی ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وہ ترقی کی طرف پیش قدمی کو روکنے کے لئے ہماری توجہ سرگرمیوں سے ہٹانا چاہتا ہے۔ بار بار ہمیں دھمکیاں دی جاتی ہیں اور ہمیں خوف زدہ کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اب حال ہی میں وہ توڑ پھوڑ کی مذموم کوششوں پر بھی اتر آئے ہیں تاکہ یہاں ابتری پھیلے اور فرقہ دارانہ جھگڑے بپا ہوں۔ اکبر خان ایسے افراد سامنے آکر کشمیر میں گڑبڑ پیدا کرنے کی باتیں کھلم کھلا کرنے لگے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جس کا نوٹس لئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

ہند کے وزیر اعظم شری جواہر لال جی نہرو بدیشی ملکوں کا دورہ کرنے کے بعد واپس آئے ہیں۔ ان کا دورہ کامیاب رہا ہے۔ انہوں نے بدیشی ملکوں کے لوگوں اور وہاں حکومتوں کی رائے سے یہ مشاہدہ کیا کہ پاکستان نے فوجی معاہدہ کرکے ملک کو برباد کیا ہے۔ پاکستان میں جو سیاسی جماعتیں ہیں۔ وہ بھی پاکستان کی تباہی دیکھ کر نالاں ہیں۔ وہ کشمیر کو خوش قسمت تصور کرتے ہیں کہ اُن کا الحاق اس جمہوری ملک کے ساتھ ہوا ہے۔ جو روز بروز ترقی کی طرف گامزن ہو رہا ہے۔ پاکستان کی سیاسی پارٹیاں وہاں کی حکومت کے خلاف ہیں۔ پاکستان میں وطن پرست لوگ اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ایسے روشن خیال لوگوں کی ایک نمایندہ کانفرنس پچھلے دنوں ڈھاکہ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کی صدارت کے فرائض مولینا بھاشانی نے انجام دیئے۔ کانفرنس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے وطن پرست لیڈروں اور نمایندوں نے شرکت کی۔ اور انہوں نے ایک فیصلے سے نیشنل عوامی پارٹی کو معرض وجود میں لایا۔

یہ پہلا موقع ہے جبکہ پاکستان کے سامراج دشمن اور وطن پرست لیڈر خان عبدالغفار خان۔ خان صمد خان اور بہت سے قوم پرست نمایندے ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ یہ کانفرنس منعقد کرنے سے پاکستان کے حکمران طبقہ کو بے حد پریشانی لاحق ہوئی انہوں نے وزیر اعظم مسٹر سہروردی کو جو کہ امریکہ کا دورہ کر رہے تھے۔ اس کانفرنس کی نسبت پیغام بھیجا۔ اور انہیں فوری طور اپنے ملک میں واپس آنے کے لئے کہا گیا چنانچہ مسٹر سہروردی نے دورے کا پروگرام ملتوی کر دیا اور فوری طور پر واپس آگئے۔ اس طرح کہا جاتا ہے۔ کہ پاکستان میں ایک زبردست بحران پیدا ہوا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ مسٹر سہروردی کی وزارت جو کہ بھنور میں پھنسی ہوئی ہے اور کچھ دقت رہ سکتی ہے یا نہیں۔

پاکستان کے چند سامراج نواز اخباروں میں آج کل یہ پروپیگنڈا ہو رہا ہے۔ کہ پاکستان اور ہندوستان کے باہمی اختلافات محض کشمیر کی بنا پر ہیں۔ اگر یہ مسئلہ طے ہو گا تو سارے باہمی اختلافات دور ہوں گے لیکن یہ سب کچھ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ امر واقع یہ ہے کہ یہ سوال خود پاکستان کے حکمرانوں کی ہوس اور ملک گیری کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔ وہ ریاست پر حملہ نہ کرتے۔ تو مسئلہ کشمیر کا کوئی وجود ہی نہ ہوتا۔ کشمیر کی لیڈر شپ کی طرف سے واضح کیا گیا تھا۔ کہ ریاست کے الحاق کا مسئلہ عوام کی مرضی سے طے کیا جائے گا۔ اُس وقت کی حکومت نے بھی اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہ لیا تھا۔ اچانک پاکستان نے ملک پر حملہ کیا۔ حملے کے بعد کیا ہوا۔ وہ تواریخ ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا ضروری ہے۔ کہ ہندوستان نے بار بار کوشش کی کہ کشمیر کے متعلق کوئی تصفیہ ہو جائے۔ لیکن پاکستان کے حکمرانوں کی ہٹ دھرمی اس سلسلے میں سد راہ ہوئی۔ لہذا یہ بات کہ محض کشمیر کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان میں اختلافات پیدا ہوئے ہیں۔ درست معلوم نہیں ہوتا۔

نہری پانی کی تقسیم کا معاملہ لیجئے۔ شری نہرو نے بالکل واضح طور فرمایا کہ یہ محض ٹیکنیکل مسئلہ ہے۔ لیکن پاکستان کے حکمرانوں نے اسے بھی سیاسی مسئلہ بنایا ہے۔ حالانکہ پاکستان کو بدستور پانی مل رہا ہے۔ اب جو کچھ وہاں پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ وہ محض اس لئے ہے۔ کہ پاکستان کو جو آبیانہ ہندوستان کی طرف ادا کرنا تھا۔ وہ کافی عرصہ سے واجب الادا ہے۔ اب پاکستانی حکمرانوں کا یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ یہ بتانا مشکل ہے۔ سب کچھ عوام کے بیدار ہونے پر منحصر ہے۔ اگر وہ بیدار ہو کر حقیقت حال کو سمجھنے لگیں تو پاکستانی حکمرانوں کے لئے انہیں دھوکہ دینا ناممکن ہو جائے گا۔

اگست کا مہینہ شروع سے ہی سرگرمیوں کا مہینہ رہا۔ اس مہینے میں ہند کے وزیر دفاع شری کرشنا مینن یہاں آئے۔ آپ ۱۱ اگست کو ہوائی فوج کے اعلیٰ کمانڈر ایئر مارشل مکرجی اور فوج کے قائم مقام اعلیٰ کمانڈر لفٹننٹ جنرل کلونت سنگھ کی معیت میں یہاں پہنچے۔ ہوائی اڈے پر وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد اور کابینہ کے دیگر وزراء اور وزرائے مملکت نے اُن کا استقبال کیا۔ اس موقع پر اعلیٰ سرکاری افسران نیشنل کانفرنس کے سربرآوردہ کارکنان اور معززین شہر بھی موجود تھے آپ کو ملیشیا کے ایک دستے نے گارڈ آف آنر دیا۔ آپ یہاں دو دن قیام کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔

شری کرشنا مینن نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ میں آج کسی خاص وجہ سے یہاں نہیں آیا ہوں بلکہ ایک وزیر کی حیثیت سے مجھے جس طرح یونین کے دوسرے حصوں میں جانا ہوتا ہے۔ اسی طرح میں یہاں آیا ہوں۔ شری مینن سے پوچھا گیا کہ آیا وہ اس رائے سے متفق ہیں۔ کہ موجودہ حالات میں یہاں اتحاد کی فضا قائم رہنی چاہیئے آپ نے کہا۔ عام حالات میں بھی ایک شہری سے یہ توقع رکھی جاتی ہے۔ کہ وہ ایسے معاملوں کو اولیت کا درجہ دے۔ جو اولیت کا درجہ دئے جانے کے مستحق ہوں لیکن جب جنگ کا خطرہ لاحق ہو یا اقتصادی اور دوسری بڑی مشکلیں درپیش ہوں تو اتحاد کو ہر چیز پر سبقت دی جانی چاہیئے۔

شری مینن نے کہا۔ کہ "وزیر دفاع کی حیثیت میں مجھے پہلی بار یہاں کی کچھ فوجی چوکیوں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اپنے مشاہدات میں جو بات مجھے سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر دکھائی دیتی ہے۔ وہ ہے سپاہیوں اور مقامی لوگوں کے مابین بہتر تعلقات کی موجودگی۔ جوان موقع ملنے پر عوام کی خدمت کرتے ہیں جس کے لئے عوام کافی ممنون ہیں"

شری مینن نے کہا۔ ہم امن پسندی کی پالیسی پر کاربند ہیں ہم نہیں چاہتے کہ اس خطے میں یا کہیں اور جھگڑا پیدا ہو۔ جو بڑی جنگ کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے لیکن ہم ملک کے ہر حصے کو بیرونی حملے سے محفوظ رکھنے کا تہیہ کر چکے ہیں اور اگر ملک کے کسی بھی حصے پر حملہ کیا گیا۔ تو ہم اُس کا اپنے تمام ذرائع سے مقابلہ کریں گے۔ آپ نے کہا کہ پاکستان کے تئیں ہمارے ارادے دوستانہ نوعیت کے ہیں اور ہم اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہمیشہ کے لئے برقرار رکھیں گے۔ بشرطیکہ پاکستان بھی ایسا چاہتا ہو۔

شری مینن نے کہا کہ کشمیر کے مسئلے کو صحیح طریقے سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب ریاست جموں وکشمیر پر حملہ ہوا۔ تو ہندوستان کی فوج فوراً ہی یہاں داخل نہیں ہوئی۔ بلکہ مقامی لوگ کئی دنوں اپنے طور سے پاکستانی حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے۔ آج جو جموں وکشمیر ملیشیا کے باوردی جوان اور اُن کے بینڈ وغیرہ دکھائی دے رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ان کی پوزیشن کچھ اور تھی تب انہی جوانوں نے لاٹھیوں سے پاکستانی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ ہندوستانی فوج لیہہ میں آئی جب کشمیری عوام نے پاکستانی حملہ آوروں کے خلاف امداد کی ضرورت محسوس کی۔

شری مینن سے پوچھا گیا۔ کہ ان کے خیال میں کشمیر کا سوال کب تک سلامتی کونسل میں دوبارہ زیر غور لایا جائے گا۔ جواب میں آپ نے کہا۔ "یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ شاید ستمبر میں ایسا ہو۔ بہرحال وہاں کوئی خاص بات نہیں ہونے والی ہے۔ پاکستان کی طرف سے اس بارے میں جو شور وشر بپا کیا جا رہا ہے۔ وہ محض پروپیگنڈا ہے۔ اور اس کا مقصد بحرانی فضا پیدا کرنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔"

آپ نے کہا۔ کشمیر کا معاملہ کسی متنازعہ علاقے کے قبضہ کا سوال نہیں۔ امر واقع یہ ہے کہ ہندوستان نے سلامتی کونسل سے صرف اتنا کہا ہے۔ کہ وہ جموں وکشمیر کے بعض علاقوں سے پاکستانی فوجیں پُر امن طریقہ سے نکلوانے میں مدد دے۔ ہندوستان اگر اپنے طور سے یہ کام اپنے ہاتھ میں لے تو اس کے نتیجے میں اسے پاکستانی علاقوں میں اپنی فوجیں بھیجنا پڑیں گی اور اس طرح سے ان دونوں میں جنگ شروع ہو سکتی ہے لیکن ہندوستان ایسا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ جنگ سے مسئلے حل نہیں ہوتے بلکہ مزید الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ باقی رہا سوال اس بارے میں پاکستان کی چالوں کا وہ مدعی کو مدعا علیہ بنانے کی تگ و دو کر رہا ہے۔ آپ نے کہا۔ ہماری کوشش یہ رہے گی۔ یہ مسئلہ پُر امن طریقے سے حل ہو۔ آپ نے

آفتاب احمد

حسرت موہانی کی شاعری ـــــ تہذیبی پس منظر

حسرت کی عشقیہ غزلوں میں جو انفرادیت پائی جاتی ہے ایسی انفرادیت بہت ہی کم شعراء کے یہاں ہے اور ان کی غزلوں سے ملتی جلتی انفرادیت ہے بھی تو وہاں بالکل اسی شکل وصورت میں موجود نہیں جو حسرت موہانی کے یہاں موجود ہے۔ حسرت نے اپنے دل کی باتوں کو جس طرح صاف صاف بیان کر دیا ہے اور اپنے ذہن کے ابلتے ہوئے خیالات کو جس طرح بالکل ان کی اپنی حالت میں پیش کر دیا ہے اس کی مثال بہت مشکل سے ملے گی۔ انہوں نے اپنی عشقیہ غزلوں میں اپنے غم جاناں کی ساری جیتی لہروں کو ظاہر کر دیا اور اس طرح ان کے جذبے کے گھاؤ ان کی غزلوں میں اچھی طرح نمایاں ہو گئے ہیں۔ حسرت کے یہاں پرانی بوتل میں نئی شراب نظر آتی ہے۔ روایاتی عناصر میں نئی لہریں پیدا کر کے انہوں نے انفرادی مصلحت پیدا کی ہے۔ ان کی بہت زیادہ غزلیں ایسی ہیں جن کا ہر شعر اپنے دارئرے کے دوسرے شعر سے گہرا رشتہ پیدا کرتا ہے۔ غزل میں ایک مرکزی تصور ہے جس کی طرف غزل کا ہر شعر بے اختیار دوڑتا نظر آتا ہے۔

ان کی طبیعت بڑی حساس تھی، ان کے غم میں ان کی انفرادی زندگی اور ان کی شخصیت کی تصویر صاف جھلکتی ہے۔ ان کی غزلوں میں "سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو" کی لہریں جتنی تیز ہیں، اتنی "جہان رنگ و بو" کی ہیں، پھر بھی یہ کہہ دینا مناسب نہیں کہ ان کے یہاں زندگی اور دنیا کی طرف دیکھنے کا کوئی انداز موجود نہیں۔ وہ غم جاناں کے دباؤ سے جہانِ رنگ و بو کو نہیں بھولتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا غم یا ان کی تمنائیں۔ زندگی سے الگ نہیں۔

حسرت کی محبت پر اس وقت شبہ کیا جا سکتا تھا جب وہ انفرادی محبت میں اچھی طرح گرفتار ہو کر دنیا کے متعلق کچھ بھی سوچنے سے مجبور ہو جاتے۔ ان کی محبت اور اس محبت کے پیدا کردہ غم ان کی اپنی دنیا ہی کی محبت اور غم ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ وہ مادی زندگی اور انسانی نفسیات کی باریکیوں سے کہیں بھی اپنا رشتہ نہیں توڑتے، ان کے عشق کی سرحد زندگی کی سرحد سے بہت ہی قریب ہے، ان کے یہاں زندگی عشق کو چمک اور روشنی دیتی ہے اور عشق دنیا اور زندگی سے محبت کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ وہ حقیقت کو بیان کرنے میں کہیں بھی جھجکتے نہیں، اور اس بیان میں غم کو بھی لبوں پر مسکراہٹ کا کنول کہتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا شدید غم مادی زندگی سے دور نہیں اور غم کے بار سے دبے ہوئے نہیں ہے ان کی نگاہیں زندگی کے نشیب و فراز کو اچھی طرح دیکھ رہی ہیں۔ غم کے بے شمار پردوں کو بڑے استقلال سے ہٹاتے چلے جاتے ہیں، مسکراتے ہیں، اس لئے کہ زندگی میں غم کے دوسرے پردے بھی موجود ہیں، اگر ابھی پلکیں بھیگ گئیں تو ان پردوں کو ہٹانے میں وہ زندگی سے رشتہ توڑنے سے مجبور ہو جائیں گے۔

حسرت کا نظریۂ جنس صحت مند ہے۔ وہ مریض جذبات سے اپنا دامن بچائے رکھتے ہیں۔ ان کا محبوب اردو شاعری میں پہلی بار صحیح معنوں میں اس مادی دنیا کی سانس لینے والی عورت بن کر سامنے آتا ہے۔ اردو غزل میں اسے ایک بغاوت کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی بعض غزلوں میں رومانی کہانیاں بند کی ہیں۔ وہ رومانی کہانیاں نہیں جو عریاں ہیں اور لاشعور کی غلیظ باتوں سے ترتیب پاتی ہیں۔ بلکہ وہ کہانیاں جن میں خلوص اور صداقت ہے، جن میں شوخی ہے لیکن حریفانہ ہوس نہیں۔ نفسیات کی باریکیاں ہیں اور واقفیت سے

تعبیر

مبہم الفاظ میں یا اشاروں سے دبی ہوئی جنسی خواہش کو ابھارنے کی کوشش نہیں ہے۔ جنسی جذبات کی ایسی صحت مندی حسرت سے قبل اُردو شاعری میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔ ایسی غزلوں میں صرف شاعر کی محبت نظر نہیں آتی بلکہ یہ محبت شاعر کے سماجی ماحول میں سانس لینے والوں کی محبت ہو جاتی ہے۔

بڑھ گیئں تم سے مل کر اور بھی بے تابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا

صد شکر غم سرد جہاں سے ہے وُہ فارغ
جو دل ہے ترے تیر محبت کا نشانہ

ہنسی عبرت، بہت، جب رنگ گل کی بے ثباتی نے
چمن میں عندلیب سادہ دل کو شادماں پایا

جب وُہ غم زندگی کی چکراتی ہوئی راہوں کا ذکر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حسرت کو عشق کا بہت بڑا سہارا مل گیا ہے۔ داخلیت کا بہاؤ حسرت کی انفرادیت کی بنیاد کمزور نہیں کر سکتا اس لئے کہ عشق کی چمک سے اس بنیاد کو نئی زندگی ملتی رہتی ہے۔ ان کے جمالیاتی احساس کی گہرائی میں ان کے سماجی ماحول کی تہذیب انگڑائیاں لے رہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے جمالیاتی احساس کے گہوارہ میں نئے تمدن کی پرچھائیاں زیادہ نہیں ہیں جو ان کی سماجی زندگی کے تقاضوں کی وجہ سے کسی نہ کسی شکل میں رہ سکتی تھیں۔ محبت کی دُنیا میں حسرت ایک نارمل انسان رہتے ہیں، ان کا خلوص ہر جگہ قائم رہتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ حسرت بھی اُردو کے بعض شعراء کی طرح زندگی کی ان راہوں سے ہو کر آئے ہیں جہاں غم اور مایوسی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ حسرت نے کہا تھا ؎

میں خود شیدائے غم ہوں، رفتۂ درد محبت ہوں

تغیر

یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں غم جاناں کا احساس نہایت شدید ہے۔ اور معاشی اور معاشرتی کشمکش کی تصویروں کی کمی ہے۔ پھر بھی غزل کے محدود دائرہ میں ان کی آواز بڑی غنیمت ہے۔ ۱۹۰۸ء میں علی گڑھ ڈسٹرکٹ جیل میں اُنہوں نے کہا تھا ؎

مایۂ عشرت بے حد ہے غم قید دن
ہیں شناسا بھی نہیں رنج گرفتاری کا
جو رہیں نہ کرے شان توجہ پیدا
دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا
ہیں جو ائے عشق تری بیخبری کے بندے
بس ہو ان کا تو نہ لیں نام بھی ہشیاری کا

اسی وقت کی ایک اور غزل کے اشعار ہیں ؎

اُٹھے ہیں جفا پیشگان مہذب
ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر
تقاضہ غیرت یہی ہے عزیزو
کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر

۱۹۰۹ء میں جب وُہ نینی سنٹرل جیل میں لائے گئے تو اُنہوں نے کچھ غزلیں کہیں، جن میں بعض ایسی ہیں جہاں حسرت کے غم دوراں کا احساس شدت کے ساتھ موجود ہے ؎

یورپ میں جیسے پھیل گئی ہے وبائے حرص
چلنے لگے نہ سارے جہاں میں ہوائے حرص
اے تلک اے افتخار جذبۂ حب وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن
تجھ سے قائم ہے بنا آزادیٔ بے باک کی
تجھ سے روشن اہل اخلاص و صفا کی انجمن

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

۱۹۰۹ء میں حسرت کی نگاہیں CONSTITUTIONAL REFORMS پر بھی گہری تھیں۔ ان کی حساس طبیعت نے حقیقت کو
اگست ۱۹۱۹ء

جان لیا تھا۔ ایسے وقت میں بھی حسرت ناکامیوں کو کامرانیاں سمجھتے تھے۔

طاعت گزار ہوں دل حسرت پسند کا

ناکامیاں ہیں میرے لئے کامرانیاں

حسرت موہانی نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں جو خونِ جگر پیش کیا ہے اسے سب جانتے ہیں ان غزلوں میں بعض جگہ چند ایسے اشارے مل جاتے ہیں جن سے تشفی تو نہیں ہوتی مگر ان اشاروں میں زندگی کی حقیقتیں صاف نظر آجاتی ہیں۔ دیوان حسرت کے صفحہ ۱۷ پر ایک غزل ہے، جس کے چند اشعار دیکھئے ؎

اے کہ نجات ہند کی دل سے ہے تجھکو آرزو

ہمت سربلند سے یاس کا انسداد کر

قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان

روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

حق سے بعذر مصلحت وقت پر جو کرے گریز

اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پر نہ اعتماد کر

خدمتِ اہل جور کو کر نہ قبول زینہار

فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ

کوششِ ذات خاص پر ناز کر اعتماد کر

حسرت موہانی نے ۱۹۲۳ء کے آخر میں یروڈا جیل پونا میں جو غزلیں کہی ہیں، ان میں بعض بہت اہم ہیں، اس لئے کہ ان کی غزلوں میں حقیقت ہے اور ساتھ ساتھ ترقی کی طرف اٹھا ہوا قدم بھی۔

ہمیں کیا بھلا تھکائی رہِ شوق کی درازی

کہ تمہیں اگر نہ ملتے سفر دوام کرتے

ہندوستان کی بڑھتی ہوئی تاریکیوں میں عوام کو سلایا جا رہا تھا۔ اور حسرت اس حرکت پر غور کر رہے تھے۔

اچھا ہے اہل جور کئے جائیں سختیاں

پھیلے گی یونہی شورش حب وطن تمام

سمجھے ہیں اہل شرق کو شاید قریب مرگ

مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام

اور ؎

تابکجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب

ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھئے کب تک رہے

حسرت ایک مخلص شاعر تھے، جوشیلے زیادہ تھے اور مفکر کم، آزادی اور انقلاب چاہتے تھے، لیکن آزادی اور انقلاب کی راہیں متعین نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی شاعری کچھ غم جاناں اور کچھ غم دوراں کی اردو ادب میں بہت اچھی مثال ہے۔

آنند ورما

موت کی راہ پر

۱۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کی یادگار شام کو میرا اردلی میرے نام کی ایک چٹ لایا۔ جس پر پنسل سے لکھا ہوا تھا "کامریڈ پامدیلو"۔ کامریڈ پامدیلو اور اس کی شخصیت کے بارے میں میں بہت کچھ سن چکا تھا لیکن اس کی ملاقات کا شرف ابھی تک مجھے حاصل نہیں ہوا تھا۔ میں اپنے اردلی کو اس کے بارے میں چند ضروری ہدایات دیکر دوسرے خیمے میں چلا گیا اور جب میں کپڑے بدل کر واپس لوٹا تو میں نے دیکھا کہ چھوٹی سی جسامت کا ایک گٹھا ہوا پینتیس ۳۵ سالہ جوان جس کے چہرے سے مسرت اور بے چینی کے ملے جلے آثار نمایاں تھے، میرا منتظر ہے۔ میں نے اسے مخصوص فوجی انداز میں آداب کہا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے نکمے اردلی پر بیحد غصہ آیا کہ میری فہمائش کے باوجود اس نے کامریڈ پامدیلو کو ایک اچھی کرسی پیش کرنے کی بجائے لوہے کی بنی ہوئی جنگی فولڈنگ چیئر پر بٹھا دیا تھا۔ کامریڈ نے آگے بڑھ کر نہایت ہی گرمجوشی کے ساتھ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہنے لگا۔

"کیپٹن سین! مجھے آپ سے مل کر بیحد خوشی ہوئی۔ اور یہ جانکر کہ آپ میرے ہم عمر ہیں، اس عارضی مسرت کو دائمی دوستی میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگے گی۔"

"یقیناً.... یقیناً" میں نے مخصوص فوجی انداز میں سر ہلایا۔

"ہاں تو کیپٹن سین!" اس کا چہرہ وفورِ جذبات سے تمتما رہا تھا۔ "میں یہاں کی جنتا کا ایک ادنیٰ سیوک ہوں اور جنتا کی طرف سے آپکا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں کہ آپ کی بروقت امداد نے کل ہمیں تباہی و بربادی سے بچا لیا۔"

مجھے اپنی تعریف سن کر مسرت بھی ہوئی اور شرم بھی۔ میں نے ان ملے جلے تاثرات کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا "کامریڈ! ہم نے جو کچھ بھی کیا۔ وہ آپ لوگوں پر کوئی احسان نہیں تھا۔ یہ فرض تو اپنی ایڈمنسٹریشن کی طرف سے ہم پر عائد ہوتا تھا۔ صحیح معنوں میں تو قصبہ

مبارک باد کے مستحق آپ جیسے روشن خیال، آدرش وادی اور عام مفاد کے لئے کام کرنے والے انسان ہیں جنہوں نے اس کڑے وقت میں جبکہ پونچھ کو چاروں اطراف سے دشمنوں نے گھیر رکھا تھا۔ عوام کی بے لوث خدمت کی اور انہیں بھوک جیسی لعنت اور متعدی بیماریوں کے چنگل میں پھنسنے سے بچا لیا۔"

"ہم کچھ بھی نہ کر سکے کپتان"۔ چھپانے کی کوشش کے باوجود بھی فخر اُن کے لہجہ سے جھلک رہا تھا۔ "بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بلندری، راولاکوٹ اور باغ کے مہاجرین اپنا گھریلو سامان اکٹھا کر کے گھر گھر گھوم رہے ہیں، تاکہ اس سامان کے بدلے میں کہیں سے انہیں خوراک مل جائے۔ بے پناہ جانی اور مالی نقصان نے ان لوگوں کو ایک قلیل سی مدت میں بالکل وحشی بنا دیا ہے۔ انسانیت کی ایک رمق بھی اُن میں نظر نہیں آتی۔ چند ناکارہ چیزوں کے لئے بھائی بھائی کا خون کر دیتا ہے۔ بیٹا باپ کی گردن کاٹ دیتا ہے۔ جب تک نواحی دیہات سے دشمن کو ہٹایا نہیں جاتا اور وہاں سے غلے کے نکاس کی کوئی عملی صورت اختیار نہیں کی جاتی، تب تک ایسے افسوسناک حادثوں کا ظہور پذیر ہونا عین قدرتی بات ہے۔ روٹی کے چند باسی ٹکڑوں کے عوض کنواریاں اپنے تقدس کی پرواہ نہیں کرتیں۔ لوگوں نے درختوں کے پتے کھانے شروع کر دیئے ہیں۔ جب پتے ختم ہو جائیں گے تب لید اور گوبر کھانے کی باری آئے گی۔ اور ان تمام چیزوں کے عنقا ہوتے ہی لوگ کتوں، چوہوں، گدھوں اور گھوڑوں کو ہضم کرنا شروع کر دیں گے اور اس کے بعد وہ دن دور نہیں جب آپکو سارے شہر میں ایک بھی ایسا انسان نظر نہیں آئے گا جسے آپ صحیح معنوں میں ایک زندہ اور ذی ہوش انسان کہہ سکیں۔"

"میرے خیال میں آپ غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔" میں نے صورتِ حالات [illegible]

کا اچھی طرح جائزہ لیتے ہوئے کہا: "لیکن پھر بھی ایسے لوگوں کو سمجھانے بجھانے کا کام آپ کو جاری رکھنا چاہیئے۔ حکومت جلد ہی یہاں سے لوگوں کو نکال لینا چاہتی ہے۔"

"جی ہاں ـــ! میں نے کل ہی یہ خبر سنی ہے اور بھگوان نہ کرے یہ سچ ہو۔" کامریڈ نے ایک طویل سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"یہاں کے پناہ گزین دوسرے شہروں کو بھی جہاں ابھی تک مکمل امن و امان ہے۔ جہنم بنا دیں گے۔ اور پھر جرائم، چوری، ڈاکہ، قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ میں بھاری اضافہ تو ایک یقینی چیز ہے۔ لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں یہاں کے لوگ آخری دم تک یہیں ڈٹے رہیں گے، وہ حکومت کی سختیوں کے باوجود بھی یہاں سے نکلنے کا نام نہیں لیں گے، وہ در در کی ٹھوکریں کھانے کی بجائے یہاڑوں کی اسی چار دیواری کے اندر بھوکے رہ کر اور فاقوں سے ہلکان ہو کر جانیں دیدیں گے۔"

"کافی اچھا خیال ہے۔" میں نے کہا، اور اس سے آگے کیا کہوں، مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ ابھی میں اسی شش و پنج میں مبتلا تھا۔ کہ میرا اردلی چائے لیکر آگیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں چائے پی رہے تھے اور ہر لمحہ سر پر منڈلاتی رہنے والی موت کا خطرہ ہمارے دلوں سے نکل چکا تھا۔

سردیوں کا آغاز تھا۔ سویلین لوگوں کی اموات کی شرح میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا تھا۔ لوگ سردی سے ٹھٹھر کر اور بھوک اور بیماری سے تڑپ تڑپ کر مر رہے تھے۔ شہر میں لکڑی کا ذخیرہ ختم ہو جانے کی وجہ سے لاشوں کو دریائے سُرن میں بہا دیا جاتا تھا۔ دشمن کی گولہ باری روز بروز تیز اور خوفناک ہوتی جا رہی تھی۔ اگرچہ وہ متوقع تباہی سے زیادہ تباہی خیز نہیں تھی۔ ہر جگہ جنون آمیز افواہیں جنگل کی آگ کیطرح پھیل رہی تھیں۔ لوگ کہہ رہے تھے۔ سرینگر پر قبائلیوں کا مکمل قبضہ ہو چکا ہے۔ مہاراجہ ہری سنگھ انگریزوں کے ساتھ مل کر لندن بھاگ گیا۔ شہر کا نظم و نسق ناقابل یقین حد تک افسوسناک ہو جانے کی وجہ سے شہر ملٹری کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ رات کو انتہائی خفیہ طور پر توپوں کی آواز ہو جاتی جو صبح ہونے تک جاری رہتی۔ شہر میں کرفیو آرڈر ہونے کے باوجود بھی لوگ اپنے اپنے گھروں کو تالے لگا کر سڑکوں، گلیوں اور میدانوں میں اکٹھے ہونے شروع ہو جاتے۔

اس دوران میں بامدیو مجھ سے متعدد بار ملنے آیا۔ وہ جب بھی آتا تھا میرے لئے رنج و الم کی ہولناک داستانیں، مایوسی و بزدلی کے بے ترتیب قصے اور جہل و نا آگہی کی خوفناک کہانیاں ہی لیکر آتا تھا۔ جب وہ کسی بہت بڑی ٹریجڈی کا ذکر کر رہا ہوتا۔ اُس وقت اُس کی فطری متانت اور میری مصنوعی مسکراہٹ دیکھنے کے قابل ہوتی۔ اُس کے طویل قصے سُن کر بعض اوقات میرا خلوص متزلزل ہو جاتا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے ہر بڑے آدمی کی صحبت کیطرح کامریڈ بامدیو کی صحبت بھی ایک اُکتا دینے والی ناقابل برداشت آفت ہے۔ یہ بات نہیں کہ میں غریب لوگوں کی اموات کے قصے سُنکر خوش ہوا کرتا تھا۔ اُن کی بے بسی اور اُن کی غریبی کے تذکروں سے محفوظ ہوا کرتا تھا۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ درحقیقت میں ایسی داستانیں سُنکر پریشان ہو اُٹھتا تھا اور میرا جی یہی چاہتا تھا کہ کسی دور افتادہ مقام پر جا کر اتنے آنسو بہاؤں کہ دُنیا کے تمام بدنصیب انسان میرے آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب کر رہ جائیں۔

کامریڈ بامدیو کو میں اپنے دل کی گہرائیوں سے پیار کرنے لگا تھا۔ دیکھنے میں وہ جتنا خوبصورت لگتا تھا۔ عملی طور پر وہ اُتنا ہی نیک اور ایماندار بھی تھا اور حق بات تو وہ مُنہ پر کہہ دیتا تھا۔ اور جبکہ حُکام بالا نے اُسے رفیوجی کیمپ کا انچارج بنا دیا تھا۔ اُسے اپنی موجودہ پوزیشن پر کوئی غرور نہیں تھا۔ سیاسی اور غیر سیاسی پبلک جلسوں میں وہ کھل کر اپنی رائے دینے سے اب بھی گریز نہیں کرتا تھا۔

ایک خنک شام کو کامریڈ بامدیو مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ آج وہ بیحد خوش نظر آ رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ہماری فوجیں نہایت سُرعت کے ساتھ دشمنوں کی چوکیوں پر قابض ہوتی جا رہی تھیں۔ متعدد اضلاع پر قبضہ ہو جانے کی وجہ سے، نواحی دیہات سے لائے گئے غلے کی مقدار کم از کم دس ہزار انسانوں کو تین ماہ تک کے لئے کافی تھی اور ان تین مہینوں میں بہت کچھ کیا جا سکتا تھا۔ غلے کے سب سے بڑے مرکز تیتری نوٹ، تراڑ کھل اور منڈی ابھی تک دشمنوں کے قبضے میں تھے۔ لیکن میرد ڈروم مکمل ہو جانے سے ہمیں پختہ یقین ہو چکا تھا کہ غلے کی ان بڑی منڈیوں پر بھی قابض ہونے کیلئے ایک نہایت ہی قلیل مدت درکار ہے۔

کامریڈ بامدیو نے مجھے بتایا کہ ہماری ابتدائی فتوحات کے سلسلے میں

کوئی ایسا منظر دیکھا ہے جس میں شرکت کے لئے وہ خود مجھے لینے آیا ہے۔
اور نہ جانے کی خواہش ہوتے ہوئے بھی میں ٹال مٹول نہ کرسکا۔ خود پر جانے ہونے والی سختیوں اور پابندیوں کو نظر انداز کرکے میں نے کامریڈ کی دعوت قبول کرلی۔ میں نے کرنل صاحب کے نام ایک مختصر سا خط لکھ کر اپنے اردلی کو دے دیا جو تھوڑی دیر بعد ہی میرے لئے کیمپ سے باہر جانے کی تحریری اجازت لیکر آگیا۔ دن ڈھل رہا تھا اور ہم دونوں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر سے گذر رہے تھے جس پر ترناری کے پھولوں کی لاتعداد پنکھڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ چند نظر تک پھیلی ہوئی ترناری کی بیلوں کو دیکھکر کامریڈ بولا۔
"ان بیلوں کو دیکھئے کپتان! ہمارے غم میں برابر کی شریک نظر آتی ہیں۔ اس موسم میں تو انہیں عروسِ نو کی طرح سجے رہنا چاہیئے"۔
"جی ہاں!" میں نے اپنے ہونٹوں پر مصنوعی تبسم لاتے ہوئے کہا۔ "میں انہیں تقریباً ہر روز دیکھتا ہوں۔ ہر شام ان بیلوں پر ہزار ہا پھول آتے ہیں لیکن بموں اور گولوں کے زوردار دھماکوں سے صبح تک برابر منتشر ہوتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ سورج کی پہلی کرن نمودار ہونے پر ان میں چند ایک ایسی پنکھڑیاں بھی باقی نہیں رہتیں جنہیں آپ صحیح معنوں میں ایک مکمل ترناری کا پھول کہہ سکیں"۔

کامریڈ خاموش تھا لیکن اس کے جذبات اس کے چہرے کے اترتے چڑھتے رنگ سے صاف ظاہر ہو رہے تھے۔ درحقیقت وہ خاموش نہیں تھا۔ وہ اپنے خیالات سے جنگ کر رہا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا آج کے انسان کے مقدر کی بات۔ جیسے ہر شام کو اس آخری صبح کا انتظار رہتا جس آخری صبح کو اسے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے فنا ہونا تھا ــــ!

تاریکی گہری ہو رہی تھی جب ہم ایک کافی کشادہ ہال میں داخل ہوئے ہال میں لگی ہوئی بتیاں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ چیتھڑوں میں ملبوس بھوکے لوگوں اور یتیم بچوں سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آفیسروں اور کیمپ کے سوشل ورکروں کیلئے اسٹیج پر جواہر لال اور سردار پٹیل کی تصویروں اور ترنگے جھنڈوں کے نیچے ایک چھوٹے سے پلیٹ فارم پر بٹھادیا گیا تھا۔ ہال کے اندر داخل ہوتے ہی ایک عجیب قسم کی بو نے میرا استقبال کیا تھا جس کی وجہ سے میرا دماغ بیٹھا جارہا تھا۔ لیکن شہر کے تمام بڑے بڑے آفیسروں کی موجودگی نے مجھے مجبور کردیا اور میں وہاں سے بھاگ جانے کی خواہش ہوتے ہوئے بھی

تعمیر

بھاگ نہ سکا۔
جلسے کی کارروائی کا آغاز ہماری آمد سے پہلے ہی ہو چکا تھا جس میں ہماری خدمات کو سراہے جانے کی بجائے اپنی تکلیفوں کو منظرِ عام پر لایا جا رہا تھا۔ کامریڈ بامدیو بھی ایک مختصر سی تقریر کے بعد اپنے سر سے گویا ایک بوجھ سا اتار کر چلے آئے تھے۔ اور اب وہ اس حسین لڑکی کو بری طرح گھور رہے تھے جو ہماری سامنے والی صف میں بیٹھی بیحد سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ وہ بار بار کامریڈ کی طرف دیکھتی تھی۔ اور ایک سرد آہ کھینچنے کے بعد اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتی تھی۔
وہ کچھ زیادہ خوبصورت نہیں تھی لیکن قدرت کے نقش و نگار کی جاذبیت نے اسے بلاشبہ حسین بنا دیا تھا۔ اپنے بھرے جسم پر ایک بہترین پوشاک پہنے وہ بڑی بے چینی سے جلسے کی کارروائی کے ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا اضطراب اس کے سینے کے زیر و بم اور اس کے چہرے کی ہر لحظہ بدلنے والی رنگت سے ظاہر تھا۔ شاید وہ کامریڈ سے ملنا چاہتی تھی۔ غالباً اسے کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن اندازہ کوئی یقینی چیز تو ہے نہیں۔ اس میں صحت اور غلطی دونوں کا امکان ہے۔ بلکہ زیادہ تر امکان تو غلطی کا ہی ہے!

جلسہ ختم ہو جانے کے بعد جب میں اور کامریڈ ایک تاریک سی گلی میں پہنچے۔ میں نے کامریڈ سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ میرا خیال تھا وہ کچھ چھپانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن میری توقع کے خلاف قدرے پریشانی کے ساتھ وہ کہنے لگا۔ "وہ میری محبوبہ ہے کپتان! ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں"۔
"خیال برا نہیں"۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ شاید آپ سے کچھ کہنا چاہتی تھی"۔
"ہاں۔۔ ہاں۔ وہ مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ درحقیقت ان دنوں ہمیں ایک نہایت ہی اہم مسئلہ درپیش ہے"۔
"اور وہ اہم مسئلہ" میں نے پھر ہنستے ہوئے کہا۔ "شادی کے سوائے اور کیا ہو سکتا ہے"۔
"ہاں یہی بات ہے"۔ انہوں نے تاریکی میں ٹھوکر کھا کر میرے بازو کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ "اس لڑکی کے والدین بہت بڑے سرمایہ دار ہیں۔

وُہ ہوائی سروس شروع ہوتے ہی یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان کا یہ اقدام ہم دو محبت کرنے والے والوں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جُدا کر دیگا۔"

"ضرور کر دے گا۔" میں نے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر کہا۔ "کیا آپ لوگوں کی محبت ابھی تک "انڈر گراونڈ" ہی رہی ہے؟"

"نہیں میرا خیال ہے۔ اب وُہ پردۂ راز میں نہیں رہی۔"

"تب آپ لڑکی کے والدین سے مِل کر بات چیت طے کر لیجئے اور خیال رکھئے کہ اس نیک کام میں تاخیر نہ ہو۔"

"تب تو کامیابی یقینی ہے۔"

میں نے کہا اور اُسی وقت توپ کا ایک گولہ سنسناتا ہوا ہمارے اُوپر سے گذر گیا۔ اور اُس کے پھٹتے ہی لوگ راستوں اور پگڈنڈیوں پر دوڑنے لگے۔ گہری نیند سو جانے والے بچے اور عورتیں بھی شاید جاگ اُٹھی تھیں۔ اور اُن کی دل خراش چیخیں ہماری بے پناہ گھبراہٹ اور خوف و ہراس میں بھاری اضافہ کر رہی تھیں۔

لگاتار تین دن سے گولہ باری ہو رہی تھی۔ لیکن غنیم تھا کہ کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اور دُور تک پھیلی ہوئی پہاڑیوں کے عقب سے ہر پانچ منٹ کے بعد ایک زلزلہ آ رہا تھا۔ شہر میں راشن کا ذخیرہ بالکل ختم ہو چکا تھا۔ لوگ بھوکے مر رہے تھے۔ وُہ درختوں کے پتے لینے جاتے اور دشمن کی توپوں کی زد میں آ جاتے۔ مردہ بھینسوں، گھوڑوں اور زندہ کتوں کی تلاش میں نکلتے اور ڈھیر ہو جاتے۔ چاروں طرف تباہی اور بربادی کا راج تھا۔ ہر طرف موت ہی موت نظر آ رہی تھی۔ دوکانیں بند پڑی تھیں۔ اُنہیں اشیائے خورد و نوش کا کوئی سامان نہیں تھا۔ دیہاتی عورتیں اپنے ادھ موئے بچوں کو اپنی لٹکی ہوئی زرد چھاتیوں سے چپٹائے ہر وقت ہمارے کیمپوں کے سامنے موجود رہتی تھیں۔ خوف اور بدامنی اپنی انتہا پر پہنچ گئی تھی۔

ایک ایسی ہی ہولناک شام کو کامریڈ پھر مجھ سے ملنے کیلئے آیا۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور وُہ بیحد پریشان نظر آ رہا تھا۔

"کیوں کامریڈ؟" میں اُسے دیکھتے ہی چلایا۔ اُس کے اندر کا غم اُس کے چہرے سے پھوٹ رہا تھا۔ "کیا ہوا ــــ؟" میں نے اُسے سہارا دے کر بڑی مشکل سے ایک کرسی پر بٹھایا۔

"ہونا کیا تھا۔ وُہ لوگ ان ہنگامی حالات میں لڑکی کی شادی کرنا نہیں چاہتے۔"

"کیا کہتے ہیں وہ ــــ؟"

"وُہ آج رات کو لینڈ ہونے والے ڈکوٹہ سے مجھے بھی اپنے ساتھ جموں لیجانا چاہتے ہیں۔"

"تب تم چلے جاؤ!" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"نہیں کپتان! میں چالیس ہزار مصیبت زدہ لوگوں کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ میں اپنی زندگی میں اب بے شک ایک خوفناک خلاء محسوس کر رہا ہوں۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ میری کوئی نہایت ہی قیمتی چیز کھو گئی ہے۔ یہ غمناک ویرانی جو آج تم میرے چہرے پر دیکھ رہے ہو۔ اب میری زندگی پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسلط رہے گی۔ لیکن میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ محض ایک حسین لڑکی کے عوض میں اپنے مُلک اپنی قوم کے ساتھ غداری نہیں کر سکوں گا۔ میں خود غرض اور تخریب کار نہیں ہوں۔"

"شاید تم ہوش میں نہیں ہو کامریڈ!" میں نے اُسے جھنجوڑتے ہوئے کہا ــــ

"میرے خیال میں تم اب بھی مُلک اور قوم کیلئے کوئی مفید کام نہیں کر رہے ہو۔ مجھے بتاؤ کیا تمہاری کھوکھلی اور بے بنیاد تقریریں بھوکے عوام کا پیٹ بھر سکتی ہیں۔ یہ نقلی جوش و خروش کیا اُنہیں روٹی کپڑے ایندھن اور ادویات فراہم کر سکتا ہے۔ اُنہیں بھوک، سردی اور موت سے بچا سکتا ہے۔ ان غیر یقینی حالات میں جب کہ موت کے سوائے اور کوئی چیز یقینی نظر نہیں آتی۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم یہاں سے نکل جاؤ۔ اور اس اذیت ناک زندگی کو محبت کی لامحدود خوشیوں سے مالا مال کر دو۔ کیا تم میری ناچیز رائے پر عمل کرنا پسند کرو گے؟"

"میں سوچوں گا۔" کامریڈ نے بڑی سرد مہری سے کہا۔

"سوچو گے نہیں۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم آج رات کو اُن لوگوں کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ گے۔"

"اچھا!" کامریڈ کی آواز میں پریشانی اور اُداسی کوٹ کوٹ کر

بھری ہوئی تھی۔ "لیکن تم اپنا فرض بھولنا مت ۔۔۔!"

"کیا مطلب ۔۔۔؟"

"یقینی جو تمہارا فرض ہے۔"

"وہ تو ہے ۔ اور تم ۔۔۔؟"

"میں نے اپنے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے۔"

"یعنی تم آج رات کو یہاں سے جا رہے ہو؟"

"ہاں!"

اُس نے کہا اور میں نے فرطِ مسرت سے پاگل ہو کر کاریڈ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

ملت بھید تا ہیک اور ڈیڑھ ادنی تھی۔ آج رات کو اُترنے والا ڈکوٹا جس میں ہیڈ کوارٹر سے ہماری دو بڑی توپیں آ رہی تھیں۔ لینڈ نہ ہو سکا تھا۔ پانچ پانچ زلزلے ایک ساتھ آ رہے تھے۔ اور غنیم تھا کہ کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ ہماری توپیں لگاتار چھ گھنٹے کی گولہ باری کے باوجود بھی دشمن کا جوش و خروش کم نہ کر سکی تھیں۔ ہم اپنے ڈیفنس کے لئے ایک نئی تجویز پر عمل کرنے ہی والے تھے کہ دشمن کی مقبوضہ پہاڑیوں میں سے ایک پہاڑی کی چوٹی پر دفعتاً آگ کا ایک شعلہ لپکا ۔ اور دوسرے ہی لمحے یہ شعلہ ہماری ٹولیوں کی زد میں تھا ہم اپنی تمام قوت کے ساتھ اُس شعلے اور نواحی پہاڑیوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ دشمن کی توپیں اب بھی چیخ رہی تھیں لیکن ان میں پہلے جیسا جوش و خروش اور برق رفتاری باقی نہیں رہی تھی پہاڑیوں کے عقب سے زوردار دھماکوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ غنیم شاید بھاگ رہا تھا ۔ اور بھاگ جانے سے پہلے اُس نے اپنے اسلحہ کے ذخیروں میں آگ لگا دی تھی ۔۔۔

صبح ہونے سے پیشتر ہی ہماری فوجیں فتح کے جھنڈے لہراتی ہوئی اُن پہاڑیوں پر چڑھ رہی تھیں۔ جب ہم خاردار جھاڑیوں کے ایک گھنے جنگل میں سے گذر رہے تھے تو دفعتاً میرا پاؤں کسی نرم نرم چیز سے ٹکرایا اور میں دھڑام سے ایک سرد لاش پر گر پڑا۔ سنبھل کر اُٹھنے کی سعی کے دوران میں جونہی میری نظریں اُس لاش کے چہرے پر پڑیں۔ میرے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی ۔ یہ لاش ۔۔۔ میرے دوست کامریڈ بابدیو کی لاش تھی۔ لاش کے تھوڑے فاصلے پر راکھ کا بہت بڑا ڈھیر جمع تھا۔ اور راکھ کے اس بڑے ڈھیر کے آگے حدِ نظر تک، لاشیں ہی لاشیں نظر آ رہی تھیں ۔۔۔

ہری کول ہری ـــــ تعارف

کشمیر عرصہ دراز سے ایک شاندار تہذیب کا مرکز رہتا آیا ہے گو ماضی قریب تک بُرے وقتوں اور مطلق العنانہ اقتدار نے اس تہذیب کا شیرازہ بکھرا دیا اور سرزمین کشمیر ایک وسیع شہر خموشاں میں تبدیل ہوتی نظر آئی۔ مگر آزادی کی منزل سے ہمکنار ہونے کے بعد جب باقی میدانوں کی طرح شعر و ادب کے میدان میں بھی کھوج شروع ہوئی۔ تو ہمیں اندازہ ہوا کہ استبداد اور جبر کے پنجوں میں رہنے کے باوجود ہمارے نطق کو مہر بہ لب نہ کیا جا سکا اور اس اندھیرے میں بھی اس جنت نشان وادی نے اپنی شاندار روایات کو زندہ رکھتے ہوئے عظیم شاعر اور ادیب پیدا کئے۔ آج کی صحبت میں ایک ایسے ہی فراموش کئے ہوئے اہل قلم کا تعارف مقصود ہے۔

پنڈت ہری کول صاحب المعروف ہری ۱۹۱۴ سمہ بکرمی میں شہر سرینگر میں پیدا ہوئے فارسی کی ابتدائی تعلیم آپنے والد بزرگوار سے ہی حاصل کی جو خود فارسی کے عالم متبحر تھے۔ بعد میں کچھ وقت کے لئے پنڈت ٹھاکر بھان کی معروف فارسی درسگاہ میں بھی زیر تعلیم رہے۔ ابتدا سے ہی طبیعت شاعرانہ پائی تھی۔ اور معرفت کا رجحان غالب تھا۔ لہٰذا چودہ سال کی عمر میں ہی گھر چھوڑ کر کارہامہ کے گاؤں چلے گئے اور وہاں لگ بھگ دو سال شہر کے ہنگاموں سے دور تنہائی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اس تنہائی میں آپ کی خدا داد شاعرانہ استعداد کے جوہر کھلنے لگے۔ اور آپ عالم کیف و مستی میں شعر کہتے رہے۔ اس عرصہ میں اشعار کا ایک دفتر تیار ہو گیا جس کو بعد میں آپ نے ایک باقاعدہ دیوان کی صورت میں ترتیب دیا۔

تین سال کے بعد آپ سری نگر واپس لوٹے اور یہاں پہ فارسی کی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد آپ محکمۂ مال میں کچھ وقت تک بطور محرر کام کرتے رہے۔ مگر اُن کی طبیعت کو پابند سلاسل ہونا گوارا نہیں تھا۔ لہٰذا اس سے بھی دست بردار ہو گئے۔ اس کے بعد ساری عمر کوئے معرفت کی جادہ پیمائی میں صرف کی۔ اہل دل اور عارفین کے ساتھ انہیں عقیدت تھی اور خود بھی علم روحانیت میں پہنچے ہوئے بزرگ تسلیم کئے جاتے تھے۔

آپ کے ذخائر شعر میں اسوقت بھی اسی ہزار شعروں کا بحر ذخار موجود ہے۔ اور دیوان ہری گلشن عشق المعروف تحفۂ گل، نکادلی منظوم فارسی بھاگوت (دو جلدوں میں تقریباً چالیس ہزار اشعار پر مشتمل) کاشٹھ نرائن رسالے اور چند قصائد کی صورت میں بطور یادگار موجود ہیں۔ آپ کے شعروں کا مطالعہ کرنے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ فارسی شعر و ادب پر غائر نظر رکھتے تھے۔ اور اس کے علاوہ آپ گداز قلب کی اُس کیفیت سے ساری عمر دوچار رہے۔ جو الفاظ کو شعر کا جامہ پہنا کر زندۂ جاوید بنا دیتی ہے۔ مثنوی میں آپ نظامی اور قصائد میں قاآنی کا تتبع کرتے ہیں۔ اور دونوں حالتوں میں اُستادوں کا رنگ جھلکتا ہے۔ پرگو ہونے کے ساتھ ساتھ اگرچہ کلام تکلف اور تصنع سے خالی نہیں۔ مگر اس کے باوجود ان اشعار میں کہنہ مشقی اور پختہ کلامی کے نادر نمونے [illegible]

اس امر کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ فارسی میں [illegible] رکھنے کے علاوہ آپ عربی اور سنسکرت [illegible] رکھتے تھے۔ سنسکرت میں آپ نے شیوا فلاسفی کے [illegible]

[illegible]

تعمیر

کئے ہیں۔ ان میں آپ نے علم روحانیت اور لوگ سادھناکے بارے میں کافی واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ علاوہ ازیں آپ علم نجوم اور قیافہ شناسی میں بھی مکمل دسترس رکھتے تھے۔

آپ کے طویل کارناموں کا تنقیدی جائزہ کافی ریاضت اور فرصت کا طالب ہے۔ البتہ سرسری طور ان کے غیر مطبوعہ کلام کے چند خاص رنگوں کی جھلکیاں پیش کرنا خالی از لطف نہیں ہے۔ ان مختصر سے اقتباسات سے اندازہ ہو سکے گا کہ آپ کی شاعرانہ صلاحیتوں نے مختلف اور متنوع میدانوں میں کیا گل کھلائے ہیں۔

حمد و ثنا کے باب میں آپ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

اے ہمہ تحت تو توئی مافوق ۔ حسن و عشق تو عاشق و معشوق
اے بہ عشقت نیاز و حسن تو ناز ۔ صفتِ ذاتِ تست ناز و نیاز
اے بذاتِ ترا صفاتِ ازل ۔ درجہاں جو ہست علم و عمل
اے کہ لاہوت عین ذات ترا ۔ نور لاہوت شد صفات ترا
اے صفات کبود تو جبروت ۔ جلوہ آرا شدہ از و ملکوت
اے عیاں آمد از نہاں ملکوت ۔ رونقِ افروز عالم ناسوت
اے چنیں رنگ ہا ز بے رنگی ۔ سرزدی در فراخی و تنگی
اے ازیں بر سر صفت معروف ۔ ملک و خلق و جن شدہ موصوف

اے توئی بے کنار دریائے ۔ پُر ز موج و حباب و از مائے
بحر را آب و آب را گرداب ۔ خاصیت ہست و نیز موج و حباب
پس حباب و موج و ہم گرداب ۔ مختلف کے تواں شمرد ز آب
زیں دلالت ز تو جہاں در تو ۔ ہست در ظاہر و نہاں در تو

معرفت میں ڈوبے ہوئے ایک لمحہ کی آواز سنئے ۔ ان اشعار میں ویدانت کا فلسفہ کس فصاحت سے نظم ہوا ہے :-

خود توئی کوزہ ساز و کوزہ توئی ۔ خود خریدار و جام و کوزہ توئی
اے کہ در واحدی نہ گنجیدی ۔ دوئی اندر یکے پسندیدی
کے تواں گفت بے دوئی واحد ۔ واحدی را دوئی بود شاہد
چو دوئی و چو احدیت بظہور ۔ ہمچو انوار بہ مہر و مہر بہ نور

اے توئی در وجود ہا موجود ۔ بے وجودی و با وجود شہود
اے ہمہ ظاہر و نہاں در تو ۔ بے نشانی و ہر نشاں در تو
اے توئی معدنِ علوم و عمل ۔ مخزنِ راز آخر و اول
اے توئی مہرِ مہر و ماہِ ماہ ۔ نبع و مجمع سپیدہ و شباہ
اے توئی خود بسوز و جہاں پیکر ۔ جاں دہ و جاں ہبی و جاں پرور
اے بامرِ تو آب پویاں است ۔ آتش تفتہ شعلہ خیزاں است
قادرا قدرتِ تو بیچوں است ۔ از دل و عقل و وہم بیروں است
چہ اتصور کنم بذاتِ ترا ۔ چہ مصور سوم صفاتِ ترا
اول اولی و دیگر ہیچ ۔ آخر آخری و دیگر ہیچ
ہر چہ ہستی توئی دروں و بروں ۔ بے تو ناگفتی است ہر مضموں
نقش و نقاش ہر چہ ہست توئی ۔ آنچہ والا و بلند و پست توئی
اے ہرؔی دمبدم بہ مسازی ۔ چوں بہ تیسال بحق بہ پردازی
حق شناسی و حق سرا باشی ۔ حق شوی کے ز حق جدا باشی

عشق مجازی اور عشق حقیقی فارسی شعراء کی قدیم جولاں گاہ ہے۔ اس جولاں گاہ میں ہرؔی کی نغمہ سامانیاں سنئے :-

اے نسیم صبا شمیم عشق ۔ رہنما ساز و حریم عشق
عشق مہرِ لیست کز ظہور او ۔ مہر و ماہ ذرہ ہائے نور او
عشق مشکے است کز نسیم او ۔ عالمے مست از شمیم او
عشق چوں آفتاب تابندہ ۔ مور تا ماہ ہمہ از و زندہ
عشق نار لیست کز فلک تا خاک ۔ تف گرفتہ از و سمک بہ سماک

جذبۂ عشق چوں کمال گرفت ۔ بدر از و پیکر ہلال گرفت
جذبۂ عشق در دلِ مجنوں ۔ لیلی آورد از علام بیروں
جذبۂ عشق یافت چوں فرہاد ۔ جان شیریں بنام شیریں داد
جذبۂ عشق یافت چوں صبا ۔ صبح تا شام رفت چوں شیدا
جذبۂ عشق یافت چوں عذرا ۔ سرزد از جانِ وامق شیدا
جذبۂ عشق چوں رود بہ آب ۔ کہ بہ دریا ز کوہ شد بہ شتاب
جذبۂ عشق چوں بہ نار آمد ۔ کہ بہر سوئے شعلہ باز آمد

جذبۂ عشق چوں ہوا بگرفت ۔ کز سمک جملہ تا سما بگرفت
جذبۂ عشق اگر نمے بودے ۔ کس بہ کس در جہاں نیاسودے
چرخ بے عشق کے رواں گردد ۔ باد بے عشق کے رواں گردد
آتش از عشق ہم شرر خیز است ۔ آب از عشق موج انگیز است
خاک مسکوں ز عشق بے پروا ۔ اختر از عشق عشوہ گر بہ سما
عشق معشوق را عیاں کردہ ۔ عالم پیر را جواں کردہ
عشق سوزے است گو بہ نالۂ و آہ ۔ عاشقاں راست روئے سپید و سیاہ
عشق جاں بخش و دلفروش آمد ۔ شیوۂ عشق نیش و نوش آمد
عشق را خو ہمہ نیاز و نیاز ۔ قوت او دل و دوائے و سوز گداز
عشق دردے است لا علاج و دوا ۔ عشق نغمے است و سماع و نوا
عشق از نے کند حکایت ہا ۔ وز جدائی لبے شکایت ہا
عشق معشوق را کمال افزود ۔ عشق عشاق را زوال افزود
عشق آباد کرد ویرانہ ۔ عشق بر شمع تاخت پروانہ

عشق در سجدہ بر قرار آورد ۔ عشق در مرد و زن گزار آورد
عشق آوازۂ الست در سر گوش ۔ کہ از دل و جاں و جاں راہوش
شیر از عشق ہم اسیر شود ۔ روبہ از عشق شیر گیر شود
اے سری عشق جاں جاناں است ۔ ہر کرا عشق نیست بے جان است
سوز عشق اگر نہ گردد کم ۔ شاد باشی بہ جاں جاں ہر دم

باغ و بہار کے بیان کا یہ منظر بھی ملاحظہ کیجئے:۔

شبے اندر چو آہوئے سیمین ۔ رم گرفتہ بباغ خضر از چین
روشناں سپہر خضرائی ۔ عشوہ گر شد بجلوہ آرائی
نافہ از ناف آہوئے شب تار ۔ منتشر کردہ بد نسیم بہار
شبے الحق ز پرتو ناہید ۔ چہرہ گشتہ بہ چہرۂ خورشید
بہ عطاری نافۂ نگہا ۔ کارواں کش صبا بہ منزلہا
مہ بخورشید از شکوہ ضیا ۔ علم افراشتہ بہ ارض و سما
صبح صادق خجل از اں شب بود ۔ مہر از مہر ماہ پر تب بود
روز از عود آں شب فیروز ۔ مجمر مہر کردہ نور اندوز

سطح گردوں بہ اختر پروین ! ۔ گوہر آمود بود و نور آگین
پشتہ و دشت چوں گلستاں بود ۔ راغہا ہمچو باغ و بستاں بود
عکس مہ آب سیم داد بہ کشت ۔ زر فشاں ہر چمن برنگ بہشت
کرد سقائی کہکشاں سما ۔ آب پاشی بہ سبزۂ فبرا
دہ چہ شبنم بروئے سبزۂ تر ۔ ہمچو اختر بہ چرخ اخضر
سیم اصابع یاسمین سفید ۔ بزر احمر گل خورشید
عبہر از نشۂ مے ہستی ۔ چشم وا کردہ بد بہ سرمستی
لالہ ز اندوہ نیستی یکسر ۔ چاک کردہ سجادۂ احمر
روزہ کش سوسن مسیح زباں ۔ دست موسیٰ بہ صبح دادہ نشاں

ز آتش رنگ ارغوان چمن ۔ شعلۂ طور بد عیاں بہ دمن
از شقایق عیاں بہ فیض نسیم ۔ بود گلنار نار ابراہیم !
در خلاص گونہ جعفر ۔ کرد سیماب نسترن در بر
ساقی گل بہ ساغر لالہ ۔ ریختہ بود بادۂ آلہ

کردہ واصل نسیم بستانی ۔ بام نسریں بہ شام ریحانی
بہ سمائے بنفشہ کرخسم ۔ بود درخشندہ روشنان نم

ظہور صبح کا بیان دیکھئے:۔

بامداداں کہ چوں شہنشہ چین ۔ ریخت از جام لعل مے بزمین
صد ہزاراں عروس سیم اندام ۔ رخ نہفتہ بہ تتق نیلی فام
بانوئے شام در حجاب آمد ۔ خسرو روم در شتاب آمد
صبح چوں شد جہاں فروز از نور ۔ رنگ تاریکی از جہاں شد دور
صبح دم کز افق سپیدہ دمید ۔ شد زر رخت سیاہ شب نومید
مرغ زرّیں چین پرید از چین ۔ زاغ مشکیں شد آشیانہ نشین

بامداداں چوں خازن افلاک ۔ گنج زر ریختہ بدامن خاک
نازنینان چرخ سنجابی ۔ پردہ بر رخ کشیدہ عنابی

چون سپیدہ دمان سپیدۂ روز — شد ز بیضا ضیا جہاں افروز

اب دیکھئے آمدِ شام کو کس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں۔

چون نگار کسوتِ فلک بہ پردہ دری — شد برون از افق بہ جلوہ گری
نازنینانِ چرخِ عباسی — ہمہ شد عشوہ گر بہ رقاصی
رومی بر حبش شد منصور — رُدم قاہر شدہ حبش مقہور
چینی تاخت زد بہ ہندوستان — کرد تاراج ہند و زنگستان

چون بہ او رنگ چرخ نیلی رنگ — محفل آراستہ شہنشہِ رنگ
شد بہ پرواز زاغ مشکین پر — بر طوطی نہفتہ بیضۂ زر

ایک جگہ آئینہ معشوق کی صفت میں غزل ایک ہی قافیہ میں پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

اے مقدر ز نورِ رخسارت ! — مردم خلق و چشم آئینہ
چوں در آئینہ روئے خود دیدی — لشکر فزودی آب و تابِ آئینہ
چہرۂ با چہرۂ تو چہرہ چو کرد — پُر عرق گشت روئے آئینہ
طرفہ بین رو برو جہاں دزدد — گنج حسنِ تو دزدِ آئینہ

تابِ مہر تو اے ہلال ابرو — مہ بر سر زد عکس آئینہ
ای سرتی دل بہ صیقل رحیب — کن معقلانِ آئینہ

قصیدہ گوئی میں بھی آپ کامل دسترس رکھتے ہیں۔ ایک نمونہ چند اشعار کا دیکھئے۔

چوں صبح خوں تیرہ شب از تیغ بیضا ریختہ
گردوں گرداں بر سرش عقدِ ثریا ریختہ
شب بود گفتی چوں حبش دندان کشیدہ آتشش
در استخواں سوز تبش بیمار آسا ریختہ
مہ بود یا نوشیش مگر گرفتہ بر ناقوش سر
در گر بہ از چشمان تر لولوئے لالہ ریختہ
من مست و ساقی در قدح صہبا ز مینا ریختہ
کاندر ہلال یکشنبہ رخشندہ بیضا ریختہ
سنجرف در سیماب بین آتش میان آب بین
اندر بلورِ ناب بین یاقوت احمر ریختہ

در مدحِ شاہ جہاں از گنج خود شد زر فشاں
کاندر سخاوت بر کساں گنج مواسا ریختہ
در بزم کیخسرو سیر در رزم اسکندر حشر
در فر و جاہ و زور و زر نخلت بہ دارا ریختہ
کاؤس طیفر چاکرا فغفور قیصر بیکرا
کز دانشش و داد و سخا نخوت بہ کسریٰ ریختہ
از صولتش لرزاں فلک و ز سطوتش ترساں ملک
بہ مال از سہمش شد سمک سماک از جا ریختہ
اعدا و خصم چو شرر بد خواہ و بد خو بد ترت
بے تن ستوش از نخوت در غار و خس ہا ریختہ

مندرجہ بالا اشعار میں حمد و ثنا عشق مجاز و حقیقت بیان صبح صادق اور بیان بزغ و لبستان و دوران شب میں کلام کی پختگی دیکھئے۔ استعارات اور تشبیہات میں کیا نزاکت موجود ہے۔ منبعوں کی ویدانت فلاسفی کو کس فصاحت کے ساتھ "حمد و ثنا" میں بیان کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

اے کہ در واحدی نہ گنجیدی — دوئی اندر یکی پسندیدی

یہ ویدانت کے فلسفے کی کیا جیتی جاگتی تصویر ہے۔
ساتھ ہی بیان کرتے ہیں ؎

چہ دوئی وچہ احدیت ظہور — ہمہ انوار مہر و مہر بہ نور

یعنی اس پرماتما کے نور سے دنیا کی کوئی بھی چیز خالی نہیں۔ جہاں تک احدیت اور دوئی کا تعلق ہے صرف دیکھنے کی چیز ہے۔ دراصل سب کچھ اسی خالق ہنر کا ہی ظہور ہے۔

ناجی منور

گوُنگل[1]

(ترجمہ)

گوُنگل کرنے چھہ درامِت گریست گامک	بہار کے ناز آج یوں ہی نہیں ہیں اس کا سبب تو یہ ہے کہ گاؤں کے
پُزی از لوُشس کھتمِت نوبہارس	سبھی کسان پہلی بار کھیتوں میں ہل چلانے نکلے ہیں۔
شُرین، ماجن، بینئن سُنند مشوٗر لوٗزتھ	آج کھیتوں نے بھی ماؤں، بچوں، اور بہنوں کا شور و غل سنکر اپنے
کھہو دیُت جوش ہنہ نس لولہ نارس	سوز دروں کو غارئش دی ہے۔
توے بیرن پھوُلت آمُژ چھہ دِرکین	اسی وجہ سے مینڈ وجو ل (ورکین) بہار کا ایک پھول کھلا ہے اور اسی لئے
توے کھُژ چاُل حُسنچ شالمارس	آج شالیمار ناز حسن سے پھولے نہیں سماتا۔
کھس منز ہاُ، تردُی قراٹھ گوڈنیوک	کسان نے اپنے کھیت پر آج پہلی دراڑ اسطرح لگائی کہ جیسے کوئی
لیکھان زن چیٹھ چھُ مجلون دِ دسلارس	عاشق (مجنون) اپنے محبوب (لیلیٰ) کو خط لکھ رہا ہو۔
نہ زن شاعراہ کانہہ کاغذس پیٹھ	یا جیسے کوئی شاعر کاغذ کے ایک اس کے شعر کی
کران ژیٹھ واٹھ امنس ہیٹھ چھُ شارس	کانٹ چھانٹ کر رہا ہو۔
لیکھن ہیوت گریست از تقدیر پننہ نوی	آج کسان نے اپنی تقدیر خود ہی لکھنا شروع کی اسی لئے
چھُ سونتس وندہ آمُت زارہ پارس	سرما آج بہار کی عجز و زاری کرنے آیا ہے۔
چھہ آمُژ زندگی پھوُل پھوُل ڈلن منز	میدانوں میں آج زندگی کھل اٹھی ہے۔ اور آج ہی ظالموں کے
یتھم دوُہہ محلنی منز ظلمگارس	محلوں میں بہنے کا آخری دن آ پہنچا ہے۔
گوُنگل سونتک تہٕ کھہنی داند داین	بہار میں پہلی دفعہ کھیتوں میں ہل چلانا اور "گوُنگل" کرنا ہی
شکس جنگچ تہٕ امنچ جیت چھے مُنٔ	جنگ کی شکست ہے۔

[1] گوُنگل اُس موقع کو کہتے ہیں جب کشمیر میں کسان پہلی دفعہ کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں۔ وہ کھیت پر شلوبا نے کے طور مٹھائیاں اخروٹ اور خشک چیز تقسیم

شاہد بڈگامی

تعمیر و ترقی

{ بڈگام میں اجتماعی ترقی اسکیم کی کارکردگی کا ایک جائزہ }

تحصیل بڈگام کا بیشتر حصہ پہاڑی ہے۔ اسی وجہ سے یہ علاقہ نسبتاً پسماندہ تھا۔ اس علاقہ میں سڑکیں نام کو بھی نہ تھیں۔ تعلیمی حالت نہایت ہی مایوس کن تھی اور زراعت کے صدیوں پرانے طریقے رائج تھے۔ شخصی حکومت میں ان دور و دراز دیہاتوں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ اور اس خطہ کی حالت ہر لحاظ سے بہت ہی خراب تھی۔ عوامی حکومت کے بننے کے بعد جب پنج سالہ منصوبہ پر عمل درآمد شروع ہوا تو اس علاقے کی پسماندگی کو مدنظر رکھ کر یہاں کشمیر بھر میں پہلا کمیونٹی پروجیکٹ مرکز قائم کیا گیا۔ اور ۱۹۵۳ء سے اس میں کام شروع کیا گیا۔ اگرچہ آج ریاست جموں و کشمیر میں اجتماعی ترقی اسکیموں اور قومی توسیعی سروس بلاکوں کا جال بچھایا گیا ہے، مگر پہلے پہل اسی علاقے کے ۲۰۹ دیہات میں اس سکیم کو لاگو کیا گیا۔ اور آج پچھلے کئی سال کی کارکردگی کو سامنے رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ یہ تجربہ حوصلہ افزا حد تک کامیاب ہوا اور ان گاؤں کی زندگی میں ایک بڑا انقلاب پیدا کرنے میں سپھل ثابت ہوا۔ مارچ ۱۹۵۷ء کے اختتام تک جو کام اجتماعی ترقی اسکیم (کمیونٹی پروجیکٹ بڈگام) کے تحت کیا گیا۔ اس کی مختصر سی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:۔

زراعت

زراعت کی ترقی کے لئے دو زراعتی فارم بیروہ اور چکہ شراہ میں تعمیر کئے گئے ہیں۔ تقریباً تیس ہزار میوہ دار بوٹے اس علاقے میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ بیس ہزار من کیمیائی کھاد استعمال کرائی گئی ہے۔ اعلیٰ قسم کے سبزیوں کے بیج اور اعلیٰ فصلوں کے بیج کسانوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ کسانوں کو نئے زراعتی تجربات سے روشناس کیا گیا ہے۔ زراعتی تجرباتی مظاہروں کے سلسلے میں آٹھ سو من مفت کیمیائی کھاد استعمال کی جاچکی ہے۔ فصلوں اور درختوں پر دوائی چھڑکانے کے طریقے رائج کئے گئے ہیں۔

حیوانات

بڈگام میں ایک عالیشان ویٹرنری ہسپتال کھولا گیا ہے جس کو جدید قسم کے آلات و ادویات سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس کے لئے ایک شاندار عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ ہسپتال میں ایک اعلیٰ نسل کا گھوڑا باہر سے منگایا گیا ہے۔ ایک درجن مرنو (Merino) نسل کے آسٹریلین بھیڑ نسل کشی کے لئے رکھے گئے ہیں۔ اور ایک سندھی (Sindhi) نسل کا مضبوط بیل بھی رکھا گیا ہے۔

حیوانات کی یہ اعلیٰ نسل کشی کارآمد ثابت ہوئی ہے اور اُن سے کامیاب نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔ ہسپتال میں مصنوعی نسل کشی Artificial incimination کا جدید طریقہ بھی عمل میں لایا گیا ہے اور اس طرح سے لوگوں کو بہت فائدہ ہوا ہے۔ بیروہ میں ایک ویٹرنری ڈسپنسری کھولی گئی ہے۔ جس میں جدید قسم کے آلات وادویات رکھے گئے ہیں۔ اس کے لئے بھی ایک شاندار عمارت تعمیر کی گئی ہے، وہاں بھی ایک سندھی بیل اور آدھ درجن آسٹریلین مرنو بھیڑ رکھے گئے ہیں۔ اس ڈسپنسری میں بھی مصنوعی نسل کشی کا طریقہ عمل میں لایا جارہا ہے۔

راولپورہ۔ ریار اور کھاگ میں نسل کشی کے مراکز قائم کئے گئے ہیں۔ ان مراکز کے لئے جدید طرز کے مکانات تعمیر کئے گئے ہیں۔ اور ان میں جدید ادویات و آلات رکھے گئے ہیں۔ ان مراکز

پر ۲۶ میرنو آسٹریلین بھیڑ اور تین سندھی نسل کے بیل رکھے گئے ہیں۔ اور یہ مراکز اس علاقہ میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

گرمیوں میں گوجر اور چوپان لوگ اپنے ریوڑ توسہ میدان لے جاتے ہیں۔ جہاں انہیں چارہ ملتا ہے۔ ان کے علاج ومعالجہ کے لئے ایک گشتی یونٹ بھیجا جاتا ہے۔ اس یونٹ میں ایک درجن میرنو بھیڑ اور دو سندھی بیل ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ادویات بھی ہوتے ہیں۔ حیوانات کی افزائش کے سلسلے میں اس علاقے میں جتنا کام ہو چکا ہے، اُس کی وجہ سے وہاں حیوانات کی مقدار اور معیار میں حیرت انگیز انقلاب آچکا ہے۔

بڈگام میں ایک پولٹری فارم قائم کیا گیا ہے۔ جس کی عمارت پر تقریباً تین لاکھ روپے خرچ آئے ہیں۔ اس فارم میں سُرخ مرغوں کو رکھا گیا ہے۔ گو یہ حال حال ہی میں قائم کیا گیا ہے مگر اتنے قلیل عرصہ میں اس کے ذریعہ سے ہزاروں انڈے تقسیم ہوئے ہیں، اور سُرخ مرغوں کے سینکڑوں جوڑے پیدا ہوئے ہیں۔

صحت

بڈگام کے ہسپتال کے لئے ایک شاندار عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ جس میں ایک درجن بستروں کا انتظام کیا گیا ہے۔ اور بیک وقت ۱۲ بیماروں کے اِنڈور رہنے کا انتظام ہوا ہے۔ اسے جدید طرز کے آلات وادویات سے آراستہ کیا گیا ہے۔

بیروہ اور سرد ینچوہ میں دو سول ڈسپنسریاں قائم کی گئیں ہیں۔ ان کے لئے بھی دو شاندار عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔ گاؤں کی صفائی اور چھوت والی بیماریوں کے انسداد کے لئے وقتاً فوقتاً اقدام کئے جاتے ہیں۔

جنگلات

جوالا پورہ۔ بیروہ اور پارنیوہ میں جنگلی بوٹوں کی تین نرسریاں قائم کی گئی ہیں۔ جن میں لاکھوں کی تعداد میں بوٹے اُگائے جاتے ہیں۔ ان نرسریوں سے بوٹے حاصل کرکے چھوٹے چھوٹے دیہی فارسٹس Village Forests بنائے گئے ہیں۔ اور زمین کو کٹاؤ سے بچایا گیا ہے۔ مختلف اقسام کے تقریباً ۸ لاکھ

تعمیر

جنگلی بوٹے لگائے گئے ہیں۔

تعلیم

بڈگام میں مڈل سکول کو ہائی سکول کا درجہ دیا گیا ہے۔ سکول کی نئی عمارت تعمیر کرنے کے لئے کمیونٹی پروجیکٹ نے ۱۲ ہزار روپے کی رقم دی ہے۔ مجموعی رقوم کے صرفہ سے سکول کی ایک عالیشان عمارت زیر تعمیر ہے۔

اس علاقہ میں اجتماعی ترقی سکیم کے تحت چار نئے مڈل سکول خانصاحب، شوگہ پورہ، وترہیل اور سرد ینچوہ میں کھولے گئے ہیں۔ لڑکوں کے لئے دس نئے پرائمری سکول اور لڑکیوں کے لئے پانچ نئے پرائمری سکول کھولے گئے ہیں۔

سماجی تعلیم

کے سلسلے میں اس علاقے میں موسیقاروں کی ایک جماعت تعینات کی گئی ہے یہ موسیقی کے تربیتی مرکزوں پر کام کرتے ہیں۔ بڈگام خاص میں ایک انفارمیشن سنٹر اور لائبریری شروع کی گئی ہے اور یہاں پر بہت سی سماجی اور ثقافتی نوعیت کی تقاریب منعقد کی گئی ہیں۔ علاقہ میں ایک سوشل ایجوکیشن آرگنائیزر اور ایک لیڈی سوشل ایجوکیشن آرگنائیزر اس سکیم کو چلانے کے لئے تعینات کئے گئے ہیں۔ پانچ جگہوں پر بنائی اور چھوٹی دستکاریوں کے مراکز بھی قائم کئے گئے ہیں۔

اَپی کلچر

شہد کی مکھیوں کو جدید طرز پر پالنے کے سلسلے میں علاقہ ہٰذا میں ۱۱ مراکز قائم کئے گئے ہیں۔ جن پر جدید طرز کے چھتے رکھے گئے ہیں۔ یہ چھتے کسانوں میں مفت تقسیم کئے گئے ہیں۔

دستکاری

رازول میں کشمیری پٹو بننے کا ایک بڑا کارخانہ قائم کیا گیا ہے یہاں پر کسانوں کو جدید طریقے پر پٹو بننے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ اس کارخانہ کی وجہ سے اس علاقے میں چہل پہل کا آغاز ہو گیا ہے۔

کواپریٹو

پچیس کواپریٹو سوسائٹیوں کو منظم کیا گیا ہے۔ اور ایک یونین قائم کی گئی ہے۔ کواپریٹو کے ذریعہ میوہ جات کی خرید و فروخت کا طریقہ

رائج کیا گیا ہے۔ اور اس طرح سے کسانوں کو کافی فائدہ پہنچا ہے۔ ان سوسائٹیوں سے وقتاً فوقتاً قرضہ جات کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

آبپاشی

علاقہ کی دو بڑی کوہلوں۔ کوہل اہچی اور کوہل لانی کی مرمت کی گئی ہے۔ ان دو نوں کوہلوں سے تحصیل بڈگام کا بیشتر حصہ سیراب ہو جاتا ہے۔ بڈگام میں نلکوں کی مرمت کی گئی ہے اور پینے کے پانی میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ خانصاحب میں پینے کے پانی کی دیرینہ دقت کو دُور کیا گیا ہے۔ اور نلکے جاری کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد مقامات پر نادہ نادہ اور چشمہ و لرکی مرمت بھی کی گئی ہے جس سے اس علاقہ میں آبپاشی اور پینے کے پانی کی مشکلات دُور ہو گئی ہیں۔

سڑکیں (ROADS)

(۱) قصبہ بیروہ سے آری زال تک ۹ میل لمبی سڑک تعمیر کی گئی ہے۔ جس پر عوام نے رعایتی اجرت پر کام کیا ہے۔ اس سڑک کے ذریعہ سے ایک وسیع اور پسماندہ علاقہ سرینگر کے ساتھ مل گیا ہے۔ یہ سڑک پتھر پہاڑ پھاڑ کر نکالی گئی ہے۔ اس سڑک کے ذریعے سے توسہ میدان اور سوکھ ناگ جیسے دلفریب اور خوبصورت مقامات تک رسائی آسان ہو گئی ہے۔ یہ دونوں سیاحوں کے دیکھنے کے لئے بہت ہی پسندیدہ مقامات ہیں۔

(۲) بڈگام سے خانصاحب تک پانچ میل لمبی سڑک تعمیر کی گئی ہے۔ اس سڑک پر لوگوں نے رضاکارانہ امداد دی ہے۔ یہ سڑک بھی پہاڑ کے دامن میں نکالی گئی ہے۔ اور ایک وسیع علاقے کو سرینگر کے ساتھ ملاتی ہے۔

(۳) آری پانتھن سے کھاگ تک چھ میل لمبی سڑک تعمیر کی گئی ہے ان کی تعمیر میں عوام نے رضاکارانہ امداد دی ہے۔ اس سڑک نے کھاگ جیسی مشہور اور دلفریب جگہ کو سرینگر کے ساتھ ملایا ہے۔ کھاگ کشمیر کے دلفزا جگہوں میں سے ایک ہے۔ اور پرانے وقتوں سے سیاحوں کا مرکز رہی ہے۔ مگر یہاں گھوڑوں پر جاتے تھے لیکن اب یہاں جدید ترین اور آرام دہ ٹرانسپورٹ میں جانا ممکن ہو گیا ہے۔

(۴) بیروہ سے چوئیٹارہ تک دو میل لمبی سڑک رضاکارانہ محنت سے تعمیر کی گئی ہے جو کہ پہاڑی کاٹ کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ اس پر تعمیر چھ ہزار افراد نے جوش و خروش سے کام کیا ہے۔ اور بلا معاوضہ اسے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ سڑک ایک وسیع علاقے کو بیروہ اور سرینگر کیساتھ ملاتی ہے۔

(۵) کھاگ سے جوگو کھارین تک پگڈنڈی کو ایک کشادہ سڑک کی شکل دی گئی ہے اور آٹھ میل لمبی سڑک تعمیر کی گئی ہے۔ اس سڑک پر عوام نے اپنا ملکیتی رقبہ بلا معاوضہ پیش کیا ہے۔ اور آٹھ ہزار افراد نے ایک عزم کے ساتھ یہ کام مکمل کیا ہے۔ یہ سڑک ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔

(۶) ریکاٹی سے خانصاحب تک چار میل لمبی سڑک تعمیر کی گئی ہے۔ اس سڑک پر آس پاس کے علاقہ کے لوگوں نے رضاکارانہ طور پر کام کیا ہے یہ سڑک پتھر پہاڑ پھاڑ کر نکالی گئی ہے۔ ابھی اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سڑک کی خاص اہمیت یہ ہے کہ یہ ایک دائرے کی صورت میں سرینگر سے ہوتے ہوئے براستہ بڈگام، خانصاحب، ریٹار، آری زال، بیروہ اور ماگام پھر سرینگر میں ختم ہوتی ہے۔ یہ سڑک دو علاقوں کے درمیان ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس پر تقریباً ۵ ہزار افراد نے بلا معاوضہ کام کیا ہے۔

(۸) ان بڑی بڑی سڑکوں کے علاوہ تمام علاقہ میں پگڈنڈیاں تعمیر کی گئی ہیں اور چھوٹی چھوٹی سڑکوں کے ذریعہ ایک گاؤں کو دوسرے گاؤں کے ساتھ ملایا گیا ہے۔

دیگر تعمیرات

(۱) اس علاقہ میں تمام پنچائت حلقوں میں چھوٹی چھوٹی پلیاں اور پل، غسلخانے اور ٹٹیاں رضاکارانہ تعاون سے تعمیر کئے گئے ہیں۔

(۲) سوکھ ناگ کے مقام پر ایک شاندار آرام گاہ Rest house تعمیر کیا گیا ہے۔

(۳) بڈگام میں محکمہ ہذا کیلئے ایک شاندار دفتری عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

(۴) سنگرام پورہ میں ایک نرسری ہاؤس تعمیر کیا گیا ہے۔

پنچائت

عوام کا زیادہ سے زیادہ تعاون کرنے کیلئے ۲۵ پنچائتوں کو از سر نو منظم کیا گیا ہے، اور ایک جامع پروگرام کے تحت ان پنچائتوں کے چناؤ عمل میں لائے گئے ہیں۔ ان ۲۵ پنچائت حلقوں میں دیہات سدھار کے تحت (بقیہ صفحہ نمبر...)

جی۔اے۔مختار
ڈائریکٹر ایجوکیشن

تعلیم ——— نئی منزلیں

(۲)

پرائمری تعلیم ریاست کے پرائمری سکولوں کو ایک پانچسالہ نصاب تعلیم میں ہدایت ملی۔ جو بہت کم عرصہ پہلے خالصتاً نظریاتی اور طلباء کی عملی ضرورت سے غیر متعلق تھا۔ پرائمری سکولوں کا نصاب تعلیم اب عملی ضروریات کے مطابق تبدیل کر لیا گیا ہے اسکول بھی بیسک سکولوں کا جال ریاست کے طول و عرض میں بچھا دیا گیا ہے۔ اسبات کا اندیشہ تھا کہ پرائمری تعلیم کے بعد ناخواندگی بدستور قائم رہے گی۔ کیونکہ پرائمری تعلیم بجائے خود بنیادی تعلیم کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی تھی۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے پرائمری سکولوں کے دائرہ کار کو وسیع کر دیا گیا ہے اور سینئر بیسک سکولوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا ہے۔

پچھلے چار سال میں پرائمری سکولوں کی تعداد میں تدریج اضافہ ہوتا آیا ہے۔ اور اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے، کہ سنہ ۱۹۵۳-۵۴ء میں پرائمری سکولوں کی کل تعداد ۱۰۶۴ تھی حالانکہ سنہ ۱۹۵۶-۵۷ء میں ان کی تعداد ۱۵۰۴ ہو گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تعداد میں ۴۲ فی صدی اضافہ ہوا ہے۔ تعلیم نسواں بھی ترقی کے مراحل تیزی سے طے کر رہی ہے۔ اور اس سلسلے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ لڑکیوں کو پڑھانے کے اداروں کی تعداد میں ۷۱ فیصدی اضافہ ہو چکا ہے۔ سنہ ۱۹۵۳-۵۴ء میں لڑکیوں کے پرائمری سکولوں کی تعداد صرف ۱۷۵ تھی۔ حالانکہ سنہ ۱۹۵۶-۵۷ء میں یہ تعداد ۲۹۹ تک پہنچ گئی ہے۔ اس مدت میں ان پرائمری سکولوں میں پڑھنے والی طالبات کی تعداد ۴۶۱۹ سے بڑھ کر ۱۳۷۰۰ تک پہنچ گئی ہے جس کا مطلب ۱۹۲ فیصدی اضافہ ہے۔ مندرجہ ذیل نقشے سے پرائمری اداروں اور طلباء کی تعداد میں ترقی کا اندازہ ہو سکے گا۔

نعیم

نقشہ (ا)

سال	لڑکوں کے پرائمری سکول	سنہ ۱۹۵۳-۵۴ء کی تعداد میں فیصد اضافہ	لڑکیوں کے پرائمری سکول	سنہ ۱۹۵۳-۵۴ء کی تعداد میں فیصد اضافہ
سنہ ۱۹۵۳-۵۴ء	۱۰۶۴	—	۱۷۵	—
سنہ ۱۹۵۴-۵۵ء	۱۲۸۱	۲۰ فی صدی	۲۰۹	۱۹ فیصدی
سنہ ۱۹۵۵-۵۶ء	۱۲۹۴	۲۱ " "	۲۴۷	۴۱ " "
سنہ ۱۹۵۶-۵۷ء	۱۵۰۴	۴۲ " "	۲۹۹	۷۱ " "

نقشہ (ب) پرائمری سکولوں میں طلباء کی تعداد کا نقشہ:-

سال	پرائمری سکولوں میں درج شدہ طلباء	سنہ ۱۹۵۳-۵۴ء کی تعداد میں اضافہ	پرائمری سکولوں میں درج شدہ طالبات	سنہ ۱۹۵۳-۵۴ء کی تعداد میں ترقی
سنہ ۱۹۵۳-۵۴ء	۵۶۳۷۲	—	۴۶۱۹	—
سنہ ۱۹۵۴-۵۵ء	۶۵۴۵۴	۱۶ فی صدی	۸۲۰۰	۷۵ فی صدی
سنہ ۱۹۵۵-۵۶ء	۶۹۱۴۶	۲۲ " "	۱۰۸۳۶	۱۳۱ " "
سنہ ۱۹۵۶-۵۷ء	۷۵۶۱۸	۳۴ " "	۱۳۷۰۰	۱۹۲ " "

مندرجہ بالا نقشہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ حکومت پرائمری سطح پر تعلیم کو عام کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ جہاں تک تعلیم نسواں کا تعلق ہے پرائمری سکولوں میں طالبات کی تعداد سنہ ۱۹۵۳-۵۴ء کے مقابلے میں لگ بھگ دوگنی ہو گئی ہے۔

دیہاتیوں کی تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر حکومت دیہاتیوں میں تعلیم کو مقبول کرنے کے لئے انہیں سہولیات پہنچانے کے لئے خاص اقدامات کر رہی ہے۔ اس غرض کے لئے کھولے جانیوالے سکولوں میں سے ۸۰ فی صدی پرائمری سکول دیہاتی علاقوں میں کھولے گئے ہیں۔

اگست۔ستمبر ۱۹۵۷ء

ایک ہی اُستاد والے سکولوں کا مسئلہ باقی دُنیا کی طرح ہندوستان میں بھی بدستور جوں کا توں ہے۔ مگر یہاں محکمہ تعلیم نے دیہاتی سکولوں کو امدادی عملہ مہیا کرنے کے لئے خاص اقدامات کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ ایسے اُستادوں کی تعداد ۲۴۴ ہو گئی ہے پچھلے چند ماہ میں اس غرض کے لئے متعدد ریفریشر کورس منعقد کئے جا چکے ہیں۔ تاکہ اساتذہ کو ایک ہی اُستاد والے سکولوں میں کام کرنے کے جدید ترین طریقوں سے باخبر کیا جا سکے۔

ماضی میں پرائمری سکولوں کو عموماً اور دُور دراز علاقوں میں واقع سکولوں کو خصوصاً لازمی سامان مہیا کرنے اور ان کی نگہداشت کرنے کے دوسرے لوازمات نظر انداز کئے جاتے تھے۔ مگر پچھلے چند برسوں میں پرائمری سکولوں کو ضروری ساز و سامان سے آراستہ کرنے، ان کی عمارات کو بہتر بنانے کے لئے خاص امدادی رقوم منظور اور خرچ ہوئی ہیں۔ معائنہ اور نگہداشت کرنے کا شعبہ بھی مضبوط بنا دیا گیا ہے۔ اور اس امر کے لئے متعدد کوششیں کی گئی ہیں کہ ہر تحصیل کے پرائمری سکول ایک ہی معائنہ کرنے والے آفیسر کے انتظامی کنٹرول اور اُس کی کڑی نگرانی میں رہیں۔

مندرجہ ذیل نقشے سے پچھلے چار سال میں اُستاد اور شاگردوں کے تناسب کا اندازہ ہو جائے گا۔

سال	پرائمری سکولوں میں اساتذہ کی کل تعداد	پرائمری سکولوں طلباء کی کل تعداد	اساتذہ اور طلباء کا تناسب
۱۹۵۳-۵۴ء	۱۰۵۳	۶۵۰۵۷	۱ : ۶۵
۱۹۵۴-۵۵ء	۱۳۲۸	۷۳۶۵۴	۱ : ۵۶
۱۹۵۵-۵۶ء	۱۸۷۹	۷۹۹۸۲	۱ : ۴۴
۱۹۵۶-۵۷ء	۲۰۸۶	۸۹۵۱۶	۱ : ۴۳

مندرجہ بالا نقشے سے اس امر کی بخوبی صراحت ہوتی ہے کہ ۱۹۵۳ء میں پرائمری سکول کے اُساتذہ پر کام کا دباؤ کافی سے زیادہ تھا۔ اوسطاً ایک اُستاد کو ۶۵ طلباء کی جماعت کو سنبھالنا پڑتا تھا۔ یہ حالت اب بدل گئی ہے اور اساتذہ کا بوجھ کافی حد تک ہلکا ہو گیا ہے۔ اور کسی جگہ جہاں ضرورت تھی، وہاں امدادی اُستاد تعینات کئے گئے تاکہ سکولوں کی صلاحیت میں اضافہ ہو جائے۔

تعمیر

اخراجات۔ مندرجہ ذیل نقشے سے پرائمری سکولوں کے اخراجات کی تفصیل کا پتہ چلے گا۔

سال	پرائمری سکولوں کا خرچ لاکھوں میں	طلباء کی تعداد	۱۹۵۳-۵۴ء کی نسبت ترقی	فی کس طالب العلم پر خرچ
۱۹۵۳-۵۴ء	۱۳ لاکھ روپے	۵۶۳۷۲	—	۱۷٫۲
۱۹۵۴-۵۵ء	۲۰ لاکھ روپے	۶۵۴۵۴	۷٫۰۰	۳۰٫۵
۱۹۵۵-۵۶ء	۲۲ لاکھ روپے	۶۹۱۴۶	۹٫۰۰	۳۱٫۸
۱۹۵۶-۵۷ء	۲۵ لاکھ روپے	۷۵۶۹۸	۱۲٫۰۰	۳۲٫۹
(ب) طالبات				
۱۹۵۳-۵۴ء	دو لاکھ روپے	۴۶۷۹	—	۴۲٫۷
۱۹۵۴-۵۵ء	۲ لاکھ ۵۰ ہزار روپے	۸۲۰۰	٫۵۰	۳۰٫۵
۱۹۵۵-۵۶ء	۲ لاکھ ۹۰ ہزار روپے	۱۰۸۳۶	٫۹۰	۲۶٫۷
۱۹۵۶-۵۷ء	۳ لاکھ روپے	۱۳۷۰۰	۱۰۰۰	۲۷٫۷

مندرجہ بالا دو نقشوں سے طلباء اور طالبات کی پرائمری تعلیم کے خرچ کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ حکومت کی ترقی پرور تعلیمی پالیسی میں پرائمری تعلیم کی وسعت کو کس قدر ترجیح دی جا رہی ہے۔ طلبا اور طالبات دونوں کی تعداد میں سال بسال اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے منظور شدہ خرچ بھی مناسب سطح پر آ رہا ہے۔ ایک طالب العلم کے لئے فی کس خرچے میں مجموعی طور اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہ خوش قسمتی کا مقام ہے کیونکہ اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ اساتذہ اور ساز و سامان کی صلاحیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

سکولوں کے لئے بہتر عمارتوں کی سہولیات میسر کرنے کے لئے عام لوگوں کی طرف سے سرگرمی اور پُر خلوص تعاون کے مظاہرے دیکھنے میں آئے ہیں۔ کرائے کے بغیر مکانوں کی پیشکش کی گئی ہے۔ اور لوگوں نے سکولوں کی عمارات بنانے کے لئے مفت زمین اور باقی عمارتی مصالحہ بھی پیش کیا ہے۔

علی جواد زیدی

جائزے

ادھر چند ہفتوں سے "ہماری زبان" اور کچھ دوسرے جرائد میں 'لغتِ اردو' کے بارے میں مختلف سوالات پر مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مستند اور جامع لغات کے بغیر کوئی زبان ترقی یافتہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اردو میں لغات کی کمی نہیں ہے۔ مختصر پاکٹ لغتوں سے لے کر پنج جلدی لغات تک موجود ہیں۔ تذکیر و تانیث "تلفظ" محاورات' وغیرہ کے بارے میں کافی معلومات ان لغات میں یکجا ہیں۔ ان تمام لغات میں جو مشترک خامی ہے وہ یہ کہ یہ شخص واحد کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ کسی لغت کی ترتیب میں ایک سے زیادہ اشخاص نے حصّہ نہیں لیا اور اگر ایک سے زیادہ اشخاص کے سپرد کام ہوا بھی تو نام تو بہتوں کے لئے گئے لیکن کام در اصل ایک ہی شخص نے کیا نتیجہ یہ ہوا کہ لغات کی اشاعت کے بعد اُن پر تنقیدوں کے جو سلسلے شروع ہوئے اُن میں مختلف غلطیوں کو منظرِ عام پر لانا پڑا۔ اس نوعیت کا سب سے اہم سلسلہ اودھ پنچ میں 'نور اللغات' کے سلسلے میں مرحوم ممتاز حسین عثمانی نے شروع کیا تھا۔ بعض اوقات تو وہ عیب جوئی ہی خاطر قلم فرسائی کرتے تھے لیکن زیادہ تر اُن کے اعتراضات پر وزن ہوتے تھے۔ زمانہ حاضرہ میں جعفر علی خان اثر نے اغلاطِ لغات کی طرف توجہ کی اور اس میں شک نہیں کہ کافی مواد جمع کر لیا ہے۔ زبان کی نوک پلک کے جاننے والے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اگر اثر صاحب سے ارباب ذوق اس طرف توجہ کریں تو یہ زبان کے لئے فالِ نیک ہی ہے۔

اس وقت اگر کوئی جماعت ترتیب و تصحیح لغات کا کام اپنے ہاتھوں میں لے سکتی ہے تو وہ یقیناً انجمن ترقی اردو ہے۔ اس کے لئے کوئی باقاعدہ بورڈ ہونا چاہیے۔ جو صرف نمائش کے لئے نہ ہو۔ بلکہ ٹھوس کام انجام دینے کے لئے اُس کے پاس وقت بھی ہو اور صلاحیت بھی۔ ایسے بورڈ کی صدارت اثر صاحب کر سکتے ہیں۔ اور اختر علی جیسے لوگ بے حد مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیکن انجمن ترقی اردو اس امر کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کر رہی ہے۔ شاید اپنے اس احساس کار کے پیش نظر انجمن نے رشید حسن خان کے نام سے لغات اردو کے موضوع پر ایک سلسلہ مضامین شروع کر دیا ہے۔ اس کا جواب بھی چند اخبارات میں دیکھنے میں آیا ہے۔ گویا ایک ادبی اختلاف آراء شروع ہو گیا ہے۔ اختلاف آرا نہیں ہے۔ لیکن ضرورت اس کی بھی مختلف گروہ مل کر بیٹھیں اور متحدہ کوشش سے نئے خطروں کا مقابلہ کریں اور کوئی تعمیری قدم اٹھائیں۔

اس طرح جو کام ہوگا وہ منظم طریقے پر ہوگا اور اجتماعی اعتبار سے بے حد اہم ہوگا۔ یہ کام ضمنی نہیں ہے کہ ایسے دوسرے کاموں کے ساتھ کیا جا سکے۔ اس میں تن من دھن سے لگنا ہوگا اور اس کے لئے ہمیں روایتی طریق کار کو کلیتہً ختم کر دینا ہوگا۔ بڑی بڑی چند شخصیتوں پر مشتمل بورڈ کا قیام ہی کافی نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسے لوگ اکٹھا ہوں جن میں تحقیق و تدقیق کا جذبہ ہو۔ کام کرنے کی فرصت ہو اور نظر اور مطالعہ میں وسعت ہو۔ اس طرح جو لغت مرتب ہو اُس کو ہمارے ارباب علم کا ایک ممتاز بورڈ دیکھے۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ بعض لغات اردو و ہندی کی ترتیب کے لئے بڑے بڑے بورڈ بنائے گئے لیکن کام کسی ایک شخص ہی کو کرنا پڑے کیونکہ بورڈ ایسے افراد پر مشتمل تھے جنھیں دوسرے مشاغل سے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔
سُنا ہے کہ انجمن ترقی اردو بھی لغات کی تدوین کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے۔ اگر یہ خبر صحیح ہے۔ تو بڑی خوشی کی بات ہے لیکن اس سلسلے

میں "لغت اور استعمال عام" کے عنوان سے جو مضامین "ہماری زبان" میں سلسلہ وار شائع ہو رہے ہیں اُن کو دیکھ کر چند شکوک پیدا ہوتے ہیں یہ شبیر حسن خان صاحب کے ذاتی خیالات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے لیکن اس طرح کے خیالات کا اس کے پہلے بھی دوسرے حلقوں سے اعادہ کیا جا چکا ہے اور یہ خیال گذرتا ہے کہ کہیں یہ رجحانات کی شکل اختیار نہ کرلیں اس لئے آج کی گفتگو میں صرف ایک عام رجحان کی طرف اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

یہ مسئلہ الفاظ کی اصل، اُن کی مہند شکل اور استعمال عام سے تعلق رکھتا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ کوئی زبان لغتوں سے مرتب نہیں ہوتی بلکہ لغت زبان کے مروّج اور متروک الفاظ و تراکیب، محاورات و امثال کا ہی ایک مجموعہ ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی زبان جامد نہیں ہوتی بلکہ ہر آن زبانوں میں بھی زندگی کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ الفاظ کے معانی اور محل استعمال بدلتے رہتے ہیں۔ اُن میں نئی اشاریت پیدا ہوتی ہے اور بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ نئی معنویت ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ اُردو میں فارسی اور عربی ترکیبوں کا دَور ختم ہو رہا ہے۔ ادھر مدتوں سے انگریزی جملوں اور ترکیبوں کی ساخت اور تراش خراش ہماری زبان کا طرّۂ امتیاز بنے ہوئے ہیں۔ اخبارات کے مترجم اور حیدر آباد کے دار الترجمہ کی تخلیقات نے اس تحریک کو کافی آگے بڑھایا اور آج بھی ہند اور بیرون ہند یہ تحریک زوروں پر چل رہی ہے۔ عربی اور فارسی کی ہیئت بھی بدلتی جا رہی ہے اور وہاں بھی مغربی زبانوں کے اثرات نمایاں ہوتے جا رہے ہیں انہیں بھی نئے الفاظ اور نئی ترکیبیں تراشنا پڑتی ہیں اور وہ اپنی نہج پر یہ کام کر رہے ہیں۔ اُردو میں بھی نئی اصطلاحیں زیادہ تر عربی اور فارسی ہی سے لی جا رہی ہیں۔ لیکن چونکہ اُردو کا موجودہ عربی اور فارسی سے زندہ رابطہ نہیں رہ گیا ہے۔ اس لئے پرانے الفاظ کی مدد سے نئی اصطلاحیں وجود میں آ رہی ہیں۔ الفاظ عربی اور فارسی لغات سے لئے جاتے ہیں لیکن وہ عربی اور فارسی کی اصطلاحات جدید سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایسے الفاظ ایک دو نہیں سینکڑوں کی تعداد میں ہماری زبان میں آ گئے ہیں۔ اور آتے جا رہے ہیں۔ ان سب کی تدوین کرنا ہے۔ یہ کام اُن لوگوں کے بس کا نہیں ہے۔ جن کی نظر قاموس، صراح اور غیاث کے آگے نہیں جاتی۔

دُنیائے اُردو میں عظیم الشان انقلابات آ چکے ہیں لیکن ہمارے لغت ساز اور لغت نواز ان تبدیلیوں سے نا آشنا ہیں۔ وُہ ابھی "سمجھدار" اور "لب سڑک" کی تراکیب کی صحت پر بحث کرتے ہیں۔ لغات کے سلسلے میں یہ بحث فضول ہی سی ہے۔ لغت میں، ایک جامع لغت میں، ہر مروّج لفظ کو آ جانا چاہیئے۔ جو لفظ زبان میں رائج ہے۔ اُس کے لئے صفحاتِ لغات کو کھلا ہونا چاہیئے۔ ہاں اس کا اظہار ضروری ہے۔ کہ وُہ لفظ صرف بول چال میں رائج ہے۔ ادب میں بھی جگہ پا چکا ہے اور ادب میں بھی شاعری کے لئے مخصوص تو نہیں ہے۔

مجھے رشید حسن خان کے سلسلہ مضامین کو دیکھ کر یہ بھی شک ہوا کہ کہیں ناسخ کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش تو نہیں کی جا رہی ہے۔ "متروکات" کی تحریک سے اُردو کو اُس وقت کافی نقصان پہنچ چکا ہے۔ فصاحت اور بلاغت کے مفروضہ معیاروں پر لغات کی تشکیل کرنا نامناسب ہے پھر اُردو میں معیارِ فصاحت ایک خاص حلقے کی زبان کو قرار دیا گیا تھا۔ اُردو اب لکھنو اور دلی تک محدود نہیں ہے۔ وُہ ہندوستان کی ہر ریاست میں بولی جا رہی ہے اور ہر ریاست کے لب و لہجہ کے اعتبار سے اس کے الفاظ کے تلفظ میں فرق بھی ظاہر ہوتا ہے۔ لب و لہجہ اور تلفظ کا یہ فرق ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ یہ علاقائی شکلیں اپنی اپنی جگہ پر سبھی درست ہیں۔ اور لغات کے لئے قابلِ قبول۔ لیکن ہر زبان میں ایک معیاری تلفظ بھی ہوتا ہے۔ حتی الوسع اس معیاری تلفظ کو باقی رکھنا چاہیئے۔ اُس تلفظ میں اگر حرکات و سکنات کا فرق ہو تو اُسے بھی واضح کر دینا بہتر ہو گا۔ سوال مہند حرکات کا بھی آتا ہے لیکن کسی شکل کو مہند قرار دینے کے پہلے یہ بھی دیکھ لینا ضروری ہو گا کہ مختلف علاقوں میں کوئی لفظ کن معنوں میں اور کس شکل میں مستعمل ہے۔ اگر تحقیق کا رُخ اس طرف موڑا جائے گا تو معلوم ہو گا کہ جو مسئلہ اتنے زور و شور سے زیر بحث رہا ہے وہ درحقیقت بالکل ہی فروعی ہے۔ مثلاً رشید حسن خان نے "احمد" اور "محل" کے استعمال میں تغیر حرکات پر یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ ان الفاظ کا بر اُردو والا تلفظ ہی درست ہے۔ جو لوگ قاریانہ انداز سے عربی والا تلفظ ادا کرنے کی کوشش

کرتے ہیں وہ نہایت غلط کرتے ہیں اور اپنی جہالت اور کم نظری کا ثبوت دیتے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ عربی والے تلفظ ادا کرنے والوں پر الزام "جہالت" تو کسی طرح لگایا نہیں جا سکتا لیکن کم نظری کا شبہ ضرور ہو سکتا ہے۔ لیکن یہی شبہ اُن لوگوں پر بھی ہوتا ہے جو لفظ کے اصلی تلفظ کو غلط قرار دیتے ہیں۔ مثلاً یہ سچ ہے کہ لفظ "محل" کے ادا کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ بولنے والا "ح" کو کسرہ کے ساتھ ادا کر رہا ہے۔ لیکن میں نے ایسے سینکڑوں بولنے والے دیکھے جو میری طرح قاری نہیں ہیں لیکن "ح" کو فتحہ کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ بالخصوص جب لفظ "محل" باضافت استعمال ہوتا ہے۔ تو کسی شکل میں بھی مکسور نہیں ہوتا۔ مثلاً "محلِ وقوع" کو کوئی بھی "محل د قورع" نہیں کہتا۔ یہی حال لفظ "احمد" کا بھی ہے۔ اس میں تنگ نظری یا کم نظری یہ نہیں ہے کہ اصلی تلفظ اختیار کیا جائے بلکہ کم نظری یہ ہوگی کہ آمرانہ انداز سے کسی بھی مروّجہ یا مسلمہ شکل کو متروک قرار دیا جائے۔

رشید حسن خان صاحب نے استعمالِ عام کا بھی تذکرہ کیا ہے یہاں استعمالِ عام کی بھی تشریح ضروری ہے۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ بہت سے الفاظ امثال، تراکیب، محاورات صرف علاقائی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی حال تلفظ کا بھی ہے۔ "استعمالِ عام" اُس کو تو کہیں گے جو طول و عرض ملک میں رائج ہو لیکن جو صرف علاقائی حیثیت رکھتا ہو اُسے استعمالِ عام نہیں کہہ سکتے۔

یہاں ایک اور نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہمارے عوام کی بہت بڑی اکثریت ابھی تک درست علم سے بے بہرہ ہے۔ وہ حروف کا صحیح تلفظ ادا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ بالخصوص حروف ذ۔ ز۔ ض۔ ظ۔ غ۔ ف۔ ش۔ ق وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ لغت کے لئے ان حروف کا وہ تلفظ صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا جس پر استعمالِ عام کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو تلفظ و استعمال کے معاملے میں پڑھے لکھے طبقے ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ یا کم از کم اُس علاقے اور آبادی کو پیش نظر رکھنا ہوگا جہاں سبھی حروف کو صحیح طریقے پر ادا کرنے کی صلاحیت ہو۔ اس لئے استعمالِ عام کا فیصلہ صادر کرنے سے پہلے اپنے ذہن کو صاف کر لینا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے جو غلطی ناسخ نے کی تھی۔ اُس غلطی کا اعادہ کسی حال میں بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ ناسخ نے ایک مخصوص طبقے کے رواج کو شرفِ قبول بخشا اور جو الفاظ شرفائے دربار میں رائج تھے۔ اُن کے علاوہ تمام الفاظ کو زبان کے دائرے سے خارج کر دیا ایسی ہی غلطی کہیں تلفظ اور ہجا کے بارے میں نہ کی جائے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

ادبی تقلید کی گرم بازاری کے خلاف سب سے پہلے ماہنامہ "شاہراہ" دلّی نے آواز اٹھائی ہے۔ اور ایک نئے نقطۂ نظر کو اپنانے کے لئے اور مُروّجہ ادبی اقدار کی از سرِ نو چھان بین اور پرکھ کے لئے اس رسالہ نے فرسٹ سیکرٹری خروشیف کا یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ "گذشتہ پندرہ برسوں میں ہمارے یہاں جو ادب پیش کیا گیا ہے اُس کو دیکھ کر ہمارا سر ندامت سے جھک جاتا ہے"۔ پندرہ برس کا مطلب یہ ہوا کہ آغاز جنگ عظیم کے بعد جو ادب پیش ہوا ہے وہ سارے کا سارا خروشیف کے پیش نظر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی مقولہ سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد کے اُردو ادب کے تقلیدی سرمایہ پر بھی حرف بحرف صحیح ثابت ہوتا ہے۔ یہ سرمایہ اگرچہ دفترِ بے معنی نہیں ہے لیکن بڑی حد تک بے روح، بے جان، تقلیدی صحافتی اور خطیبانہ ضرور ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اس دور کے ادب پر ہمارے بعض گم کردہ راہ ناقدین ایسے تہ در تہ نظریاتی غلاف چڑھا رکھے ہیں کہ خواب ہی کثرتِ تعبیر میں گُم ہو گیا ہے۔

لیکن یہ خوشی کا مقام ہے۔ کہ کم از کم ترقی پسند حلقوں میں ماضی پر نظرِ ثانی کا کام شروع ہو گیا ہے اور مشہور ترقی پسند شاعر فراق گورکھپوری اس نئی تحریک کے ہراول بن کر سامنے آئے ہیں۔ چنانچہ "شاہراہ" کے اسی شمارے میں "باتیں" کے عنوان سے فراق گورکھپوری نے "آج کل کے صحیفہ نگار ادیبوں" سے فریاد کی ہے کہ "ساتھیو اللہ ادب میں اپنی ٹانگ نہ اڑاؤ، اور زور دار الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے کہ "انسانیت، کلچر اور تہذیب اور فنونِ لطیفہ کی اجارہ داری کسی گروہ کو نہیں دی جا سکتی" انہوں نے آگے چل کر اس بات کو ایک بار اور ان الفاظ میں دہرایا ہے "میں اس عقیدے کا کٹر مخالف ہوں کہ ادب اور فنونِ لطیفہ پر کسی سیاسی پارٹی کا ڈکٹیٹر شپ قائم ہو"۔

ادبی سطح پر فراق کے اس عقیدے کا مطلب انہیں کے الفاظ میں یہ ہوتا ہے کہ "زندگی سیاست سے اور سیاسی عقائد بلکہ اجتماعی عمل سے بھی زیادہ وسیع، زیادہ گہری، زیادہ بلند، زیادہ وزنی، زیادہ رنگا رنگ اور زیادہ بڑی حقیقت ہے۔ مقاصد زندگی کے لئے ہوتے ہیں، زندگی مقاصد کے لئے نہیں ہوتی۔ پھر زندگی مقاصد سے بڑی چیز ہے . . . . گلاب کی خوشبو،

فکر و فن

(تبصرے کیلئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

خرام — (مجموعہ کلام) مہیش چندر نقش

پبلیشرز:- مکتبہ قصر اردو۔ دہلی

قیمت:- دو روپے آٹھ آنے

صفحات:- ۱۶۰

"خرام" مہیش چندر نقش کے کلام کا مجموعہ ہے۔ ابتدائیہ میں فراق گورکھپوری نے نقش کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے "یہ شاعری تاثرات کی شاعری ہے۔" "جناب نقش دلی اور لکھنو کی روایتی شاعری کے شکار نہیں ہیں۔ دور حاضر کے بھی بڑے شعرا یا کسی مرتبہ کے شعرا کی نقالی اُن کے کلام میں نہیں ملتی۔" ان کے کلام میں جس نرم غنائیت کی طرف فراق نے اشارہ کیا ہے اس کا اپنا کردار پیدا ہو سکتا ہے۔ غنائی کردار پیدا کر لینا بہت مشکل اور کٹھن کام ہے۔ یہ کام وسیع مطالعہ، ریاضت اور پُر خلوص محنت چاہتا ہے۔

احسان دانش نے خرام کا دیباچہ لکھا ہے جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں، وہ کہتے ہیں کہ شاعر کو "احساس کے شیش محل میں ایک اخلاقی انسان" کی طرح رہنا چاہیئے، احسان دانش نے نقش کے کلام کو اپنے خاص انداز سے پرکھ کر دیکھا ہے نقش کے کلام میں زبان کی نرمی اور صفائی کے ساتھ ایک خاص قسم کا ترنم موجود ہے۔ مثال کے لئے یہ اشعار دیکھئے:۔

آج پھر زخم دل مہک اُٹھے

آج پھر تیری یاد آئی ہے

جب بھی کلیوں کے چٹکنے کی صدا سنتا ہوں

مجھ کو مجروح بہاروں کا خیال آتا ہے

تیری آنکھوں کا اولین افسوں

میرے خوابوں میں رقص کرتا ہے

لوگ کہتے ہیں تیرگی جس کو

روشنی کی تکان ہوتی ہے

آنہ جائے کہیں نظر کو قرار

زلف برہم سنور نہ جائے کہیں

اور اس قسم کے سارے اشعار "خرام" کی زینت ہیں۔ ٹائیٹل، کتابت اور طباعت کے لحاظ سے یہ کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے۔ اردو میں ایسی خوبصورت کتابیں کم چھپتی ہیں۔ مکتبہ قصر اردو مبارکباد کا مستحق ہے۔ اُمید ہے مہیش چندر نقش کا یہ مجموعہ کلام کافی مقبول ہوگا۔

نغمۂ آزادی — مرتبہ علی جواد زیدی

پبلیکیشن بورڈ۔ محکمہ اطلاعات۔ یو۔پی

قیمت:- ۲۵ نئے پیسے

صفحات:- ۵۳

پہلی جنگ آزادی کے صد سالہ جشن کے موقعے پر پبلیکیشن بورڈ محکمہ اطلاعات یو۔پی نے اسے شایع کیا ہے۔ اس میں بہادر شاہ ظفر، غالب، آزاد، میر، حالی، اسمٰعیل میرٹھی، شبلی، سرور، اکبر، چکبست، حسرت، اقبال، ظفر علی خان، جوش، فراق، جمیل مظہری، ساغر، مجاز، مخدوم، احمق، ملّا، وجد، روش، جذبی، سردار جعفری، شمیم کرہانی اقبال احمد سہیل اور علی جواد زیدی کی نظمیں شریک ہیں۔

علی جواد زیدی کے پیش لفظ سے کتاب کی نوعیت پر زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ اردو میں جنگ آزادی سے متعلق نظموں کو یکجا کر کے زیدی نے

تعمیر

ایک اہم اضافہ کیا ہے موجودہ کتابچے میں صرف چند نظمیں شامل ہیں، یہ
اصل مجموعہ کی ایک جھلک ہے۔ اس سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ مختلف ادوار
میں اردو شاعروں نے جنگ آزادی کے سلسلہ میں کیا کچھ کیا ہے۔

اس کتابچے میں محمد حسین آزاد کی وہ نظم بھی شامل ہے جو مئی ۱۸۵۷ء میں
لکھی گئی تھی اور اسی وقت دہلی اخبار میں شائع ہوئی تھی۔

کتابت اور طباعت اعلیٰ ہے۔ ٹائیٹل پر دہلی اردو اخبار اور طلسم
لکھنؤ کے بلاک سے کتابچہ کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے، امید ہے
نغمۂ آزادی کو مقبولیت حاصل ہو گی۔ پبلی کیشن بیورو محکمہ اطلاعات
یو۔پی کا یہ کارنامہ اہم ہے۔

گنج معانی۔ دوسرا ایڈیشن (مجموعہ کلام)

مصنف:۔ تلوک چند محروم
پبلشر:۔ دہلی کتاب گھر، نیا محلہ پل بنگش دہلی
قیمت:۔ سات روپے آٹھ آنہ

گنج معانی تلوک چند محروم کے کلام کا مجموعہ ہے جو دوسری بار
شائع ہوا ہے۔ اس میں حمد و معرفت، جذبات فطرت، مناظر قدرت، پند و
نصائح، سیر گلستان، یاد رفتگان، طوفان غم، تضمینات، عاشقانہ
کلام جیسے عنوانات قائم ہیں اور ان کے تحت بہت ساری نظمیں شامل
ہیں، نظموں کے علاوہ غزلیں اور قطعات بھی ہیں۔

اردو شاعری میں تلوک چند محروم کا اپنا ایک خاص مقام ہے
وہ ایسے دور کے شاعر ہیں جس دور میں شعرا ایک دوسرے سے متاثر ہوتے
تھے اور اس طرح بعض شاعرانہ عناصر ایک دوسرے سے مل جل جاتے تھے، ایسے
وقت میں اپنی انفرادیت کو سنبھالنا اور اسے چمکانا آسان کام نہیں تھا،
اس وقت جن شاعروں نے اپنی شاعری میں انفرادیت کو ابھارا ان میں
تلوک چند محروم کا نام بھی اہم ہے۔ جدید ترشاعروں کو ایسے شعرا سے بہت
کچھ حاصل کرنا ہے۔ تلوک چند محروم کی شاعری میں جو محنت اور ریاضت
نظر آتی ہے اسے دیکھ کر مسرت ہوتی ہے۔ شاعری دراصل یہی ریاضت
چاہتی ہے، اسی کو کوئی لطف سخن کہتا ہے اور کوئی خون جگر۔

محروم کے کلام میں خیالات کی پاکیزگی، الفاظ کی برجستگی اور
کیفیت غم کے علاوہ جو ڈرامائی کیفیتیں ملتی ہیں ان سے نئی شاعری کو
روشنی ملنے کی توقع ہے۔ ضرورت ہے ان کی پیش کردہ ڈرامائی کیفیتوں
کو اور ابھارا جائے اور زیادہ سے زیادہ نکھار پیدا کیا جائے۔ "ٹائن
کے سین" کے تحت جو نظمیں ہیں اور پھر دوسری بعض نظموں میں جو رنگ
ہے اس میں ڈرامائی انداز موجود ہے۔

اس مجموعہ میں غم سے بھری ہوئی کیفیتیں بھی ہر جگہ ہیں، ان میں
محروم کی انفرادی زندگی کے اتار چڑھاؤ دیکھے جا سکتے ہیں، ان کی ایسی
نظموں میں کتنا غم اور کتنا دکھ ہے، شیخ سر عبدالقادر کا یہ خیال بہت حد
تک درست ہے کہ بہار ہو یا خزاں، قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر ان کے دل
کا کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو جاتا ہے۔

گنج معانی کا مطالعہ ہر صاحب ذوق کے لئے ضروری ہے۔
کتابت اور طباعت عمدہ ہے۔ گرد پوش جاذب نظر ہے۔ سر عبدالقادر مرحوم
کا دیباچہ تلوک چند محروم کی شاعری کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ امید
ہے محروم صاحب کا یہ مجموعہ کافی مقبول ہو گا۔

(شکیل الرحمان)

حدیث دیگراں

لشکری باغ۔ ناگپور ۲۰
۱۸ر جولائی ۱۹۵۷ء

محترمی!

"تعمیر" کا اپریل و مئی والا خاص تعمیری شمارہ مجھے نہیں ملا۔ جون والے شمارے میں جو غنی کشمیری کے متعلق مضمون شائع ہوا ہے وہ بیحد قابل قدر ہے۔ "درون پنبہ دانہ را" والا شعر صائب کے نام سے مشہور ہے اب نظر آیا کہ یہ غنی کا ہے تو اس کے متعلق مہربانی کر کے کچھ مزید تشریح کرا دیجیے۔ میں چاہتا ہوں کہ غنی کشمیری کے مزید کلام اور ان کے حالات زندگی اور کمالات کے متعلق آپ "تعمیر" کا ایک شمارہ بھی نکالیں کہ یہ سرینگر اور کشمیر ہی نہیں برصغیر ہند کی ایک مایہ ناز ہستی آپ کے وہاں پیدا ہوئی تھی جسے ہم اکابر ایران کے مقابلہ میں خسرو کے ساتھ بڑے فخر و ناز کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔

بندۂ دُعاگو
ناطق گلاؤٹھوری

راجندر نگر۔ نئی دہلی - 5
۲۲ر جون ۱۹۵۷ء

شمیم صاحب۔ آداب

"تعمیر" کا مہجور نمبر نظر سے گزرا۔ دیکھ کر دل کا سرور آنکھوں کا نور بڑھ گیا۔ یہ نمبر پیش کر کے آپ نے جو معیار قائم کیا ہے۔ اُمید ہے آپ اُسے برقرار رکھیں گے۔ کشمیر میں اُردو کے ایک ایسے جریدے کی واقعی ضرورت تھی اور اگر آپ نے اسی لگن سے کام جاری رکھا تو اس سے کشمیر میں اُردو کی بڑی ترقی ہوگی۔ حال ہی میں ریڈیو دہلی سے "رفتار ادب" کے عنوان سے میں نے جو تقریر کی ہے۔ اس میں "تعمیر" کے تعمیری کام کا ذکر بھی تھا

خاک نشین
ن ۔ ن

غازی پور
۱۵ر اگست ۱۹۵۷ء

محبّی۔ سلام و نیاز

"تعمیر" کا "مہجور نمبر" خاصہ کامیاب رہا۔ میں مہجور کی شاعری سے پہلی مرتبہ اس نمبر کے ذریعہ واقف ہوا۔ آپ نے مہجور کی شاعری کے متعلق جملہ معلومات اس میں فراہم کر دی ہیں۔ نیز مہجور کی متعدد تصاویر نے اس کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ کشمیر کے اور دوسرے مستند شعرا کو بھی اس طرح منظر عام پر لائیے۔

خیر طلب۔ راہی معصوم رضا

گورنمنٹ انٹر کالج ۔ مُرادآباد
یکم اگست ۱۹۵۷ء

مکرّمی۔ تسلیم

جولائی کے شمارہ کا ٹائیٹل دیدہ زیب ہے اور کتابت و طباعت بہتر۔ مضامین اور نظموں کا انتخاب معیاری ہے۔ آپ بڑی کاوش سے "تعمیر" کو مرتب کر رہے ہیں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ آپ کی نگرانی میں یہ پرچہ کشمیر کا مقبول عوامی رسالہ ثابت ہوگا۔ سائز کچھ اور کم کر دیجیے "آج کل" کے برابر کیجیے۔ جولائی کے شمارے میں جناب علی جواد زیدی کے "جائزے" میں بعض حقائق بے نقاب کر دیئے گئے ہیں۔ اُن سے کہیئے کہ وہ "تعمیر" میں ہر ماہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہا کریں۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن بھی سرینگر میں موجود

ہیں۔ وہ بھی اس سلسلہ میں آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ "بچوں کا تعمیر" بھی بھجوائیے۔

خیر طلب۔ مبشر علی صدیقی

جامع مسجد۔ گورکھ پور

مکرمی! تسلیم

"تعمیر" نظر نواز ہوا۔ اس کی دل فریبی اور دیدہ زیبی دیکھ کر از حد مسرت ہوئی۔ اس تھوڑے عرصہ میں اس نے اپنے مداحوں کا جتنا وسیع حلقہ پیدا کر لیا ہے وہ آپ کی محنت اور ریاضت پر دال ہے۔ اُمید ہے کہ بہت جلد یہ پرچہ دنیائے اردو کے اُفق کے درخشندہ ستاروں میں ممتاز جگہ حاصل کرے گا۔

خلوص کار،

سید لطف اللہ گورکھپوری

برناب کالج سرینگر

محترم

وحید اختر کی نظم "پذیرائی" اور اختر محی الدین کی کہانی "سُرخ شلوار" نے اس سال اردو ادب میں دو اضافے کئے ہیں۔ "پذیرائی" میں رابرٹ لائیڈ کی Passionate Sorrow کی یاد آتی ہے۔ اس کے پس پردہ شاعر کے پاس آرزوں اور تمناؤں کی جو کسک ہے وہ غضب کی چیز ہے ہمارے بعض اچھے شاعروں کی جو حالت ہے اس کے پیش نظر کچھ نئے شاعروں سے جتنی بھی امیدیں وابستہ کر لی جائیں وہ کم ہیں)

"سرخ شلوار" میں اختر محی الدین نے لاشعور میں پوشیدہ ایک ایسے عنصر کو پکڑا ہے کہ اس میں عجیب تلملاہٹ آگئی ہے۔ تم سوچ نہیں سکتے کہ کہانی ختم کرتے وقت مجھ پر کیا گذری۔ اختر کو مبارکباد دو۔ اور ان کی کچھ اور چیزیں شائع کرو۔ "ہم نے کیا بھول کی ہے؟ انہیں اپنے اپنے گھر لے جائیں" پیارے کون بھول سکتا ہے نسرت سالہ کے ایسے کردار کو۔

عجیب اتفاق ہے کہ جب میں "نگار" کی ایک پرانی فائل میں علی جواد زیدی کا ایک مضمون "ترقی پسندی کا بکھرتا ہوا شیرازہ" دیکھ رہا تھا تو تعمیر میں "جائزے" پڑھنے کو ملا۔ جائزے میں ذاتیات اور تنقید پر انہوں نے بیباکی

تعمیر

سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ زیدی صاحب کی باتوں کو خواہ مخواہ کسی اور رنگ میں نہ لیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ بہت ساری باتوں سے ہمیں اتفاق ہوگا اور ہم کچھ سوچ سکیں گے۔ زیدی صاحب سے میں وہاں اتفاق نہیں کرونگا جہاں وہ یہ لکھتے ہیں کہ جس طرح سید احتشام حسین اور آل احمد سرور نے غالب اور اختر شیرانی وغیرہ کے متعلق لکھا ہے خلیل الرحمٰن اعظمی کا دامن کے متعلق بھی وہی انداز ہے میں نے خلیل اعظمی کا وہ مضمون دیکھا ہے۔ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ اس واقعہ کی نقل کی ضرورت کیا تھی؟ میرا اپنا خیال ہے کہ اس واقعہ کی نقل کے بغیر بھی مضمون مکمل ہوتا۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ سوچ لیا جائے کہ سید احتشام حسین اور آل احمد سرور نے غالب اور اختر شیرانی کے متعلق جو اس قسم کی باتیں کی ہیں وہ قابل اعتراض ہیں، تو پھر یہ بات نئے نقادوں کے سہارے آگے کیوں بڑھے؟ زیدی صاحب نے گروپ کی بات کی ہے اور پھر خلیل الرحمٰن اعظمی کو ان لوگوں سے الگ رکھا ہے جن کے ساتھ مگر خلیل الرحمٰن اعظمی نے ادبی جد وجہد میں حصہ لیا ہے خلیل الرحمٰن ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں اور انہیں جن لوگوں نے کچھ کہا ہے۔ وہ بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں۔ زیدی صاحب کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ زیدی صاحب میرے بزرگ ہیں۔ میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے۔ لیکن ان سے کہو کہ ان کا ایک معتقد ان کی تحریر کے لہجہ کا شاکی ہے ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے ؎

> "احتشام حسین صاحب اختر شیرانی پر "تنقید اور عملی تنقید" میں یہ لکھیں گے کہ انہوں نے خاتمہ جنگ پر جو نظم لکھی ہے اس میں بھی سیاسی سوجھ بوجھ کا پتہ نہیں چلتا تو کوئی بھی احتشام صاحب کو ازالہ حیثیت عرفی کا مجرم نہ قرار دے گا۔ لیکن خلیل الرحمٰن کی آہ بھی قتل کے مترادف سمجھی جائے گی"۔

ظاہر ہے سید احتشام حسین نے "خاتمہ جنگ" کے متعلق بالکل درست فرمایا ہے۔ خلیل صاحب کی آہ کی بات بھی سمجھ میں نہ آئی۔ کیا میں ادب سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ سید احتشام حسین کا جو لہجہ ہے اور جس حقیقت کی طرف ان کا اشارہ ہے وہی لہجہ اور اسی قسم کا کوئی اشارہ خلیل صاحب نے بھی دامن کی طرف کیا تھا؟ طالسٹل میں غضب کا بانکپن ہے

تمہارا شکیل الرحمٰن

صنعتیں ــــ روزگار کے نئے وسیلے
(صفحہ ۵۰ سے آگے)

جائنری مل	۵۰۰ کلو واٹ
چھوٹی صنعتیں	۲۰۰۰ "
لکڑی چیرنے کا کارخانہ	۵۰۰ "
بڑی صنعتیں	۲۰۰۰ "

قدرتی دولت جیسے جنگلات اور معدنی ذخائر مثلاً لگنائیٹ اور کوئلہ کے ذخیروں کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے خاص اقدامات کئے جائیں گے سیاحوں کے لئے کشش رکھنے والے مقامات تک آمد و رفت کو بڑھاوا دیا جائے گا۔ چنانچہ منصوبہ کی مدت میں صرف وادیٔ کشمیر میں صحت افزا مقامات تک پہنچنے کیلئے ۵۵ میل لمبی نئی سڑکیں تعمیر کی جائیں گی۔

ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری زمین پر ایک تو دباؤ کم ہو جائے گا اور دوسرے یہ کہ صنعتی پیداوار بھی بڑھ جائے گی۔ اسے جہاں بیکاری میں فرق آئے گا، وہاں ریاست کی مجموعی دولت میں بھاری اضافہ ہوگا۔ اور ہماری زرعی اور صنعتی پسماندگی کے ناکارہ اثرات کم ہو جائیں گے۔ صنعتوں کو ترقی دینے کے علاوہ دوسرے پنجسالہ منصوبے میں قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں انقلاب لانے کے لئے متعدد سکیموں کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ جب یہ ساری اسکیمیں پایۂ تکمیل تک پہنچ جائیں گی تو ہماری پسماندہ ریاست کے عوام کی دنیا ہی بدل جائے گی، اور وہ اس مقام پر پہنچ جائیں گے، جہاں سے خوشحالی، فارغ البالی اور اطمینان کی راہیں کھلتی ہیں۔

تعمیر و ترقی
(صفحہ ۴۷ سے آگے)

۲۵ کمیونٹی سنٹر (پنچائیت گھر) تعمیر کئے گئے ہیں۔ ان پنچائیت گھروں کو عوامی تعاون سے ایک قلیل عرصہ میں مکمل کیا گیا ہے اور ہر حلقہ میں ایک ایک پنچائیت پارک و نرسری تعمیر کی گئی ہے۔ ان پنچائیت گھروں کو ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا ہے۔

اس علاقہ میں ۲۵ پنچائیت یونٹوں نے معمولی دیہات سدھار

تعمیر

رقومات پر ایک عظیم کام سرانجام دیا ہے اور اب اس علاقہ میں زندگی کا نیا آغاز ہوا ہے۔ جہاں بھی جائیں ایک خوشنما کمیونٹی سنٹر دکھائی دے گا۔ ہنستے ہوئے چہرے دکھائی دیں گے اور زندگی کی نئی امنگیں دکھائی دیں گے۔

ان تمام اسکیموں نے اس پسماندہ اور مردہ جان علاقے کو بیدار کیا ہے اور نئی روح پھونک دی ہے۔ پہلے پنجسالہ پلان کی یہ ایک کرن اس تاریکی کو منور کر کے ہی رہ گئی۔

ہوائی قلعے
(صفحہ ۴۹ سے آگے)

میز پر رکھدیا اور دوائی کھلوائی لیکر پڑ گئیں۔ وہ تو خیریت ہوئی۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ عزیز سے کیمسٹ کا بل لاکر دیا، جو غلطی سے پڑوسی کے یہاں پہنچ گیا تھا۔ ناراض ہونے کے باوجود انہوں نے کہا۔ پچھلے مہینے پچپن روپے کی دوائیں آئی تھیں۔ اب بتلایئے یہ بل کیسے ادا ہوگا۔ چھ سو روپے مکان کے کرایہ کے چڑھے ہیں۔ ریڈیو اور ہیٹر کے ساڑھے تین سو روپے ہوئے ہیں۔ پونے دو سو روپے بزاز کے ہیں۔ ابھی بجلی کا دو مہینے کا بل باقی ہے۔ تنخواہ سے زیادہ خرچ آخر یہ قرضہ کیسے ادا ہوگا؟

ابھی ابھی میں مکان کے منصوبے کا حشر دیکھ چکا تھا۔ قرضہ ادا کرنے کا منصوبہ میں نے پیش نہیں کیا۔

جائزے:- (صفحہ ۷۹ سے آگے)

عاشق و معشوق کے جذبات، انسانی ہمدردی، دوستی، باہمی انسانی تعلقات فطرت و کائنات سے ہم آہنگی و محبت، گھریلو زندگی اور زندگی کے بہت سے پہلو نہ تو مارکسی ہوتے ہیں نہ غیر مارکسی، بلکہ محض زندگی ہوتے ہیں۔"

فراق ان لوگوں میں نہیں ہیں جن پر یہ الزام لگایا جا سکے کہ وہ مارکسزم اور زندگی میں کوئی تضاد پاتے ہیں لیکن وہ ہمارے گذشتہ دس پندرہ برس کے ترقی پسندانہ ادبی سرمائے کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زندگی کے عقیدہ کو مارکسزم کا تابع مہمل سمجھ لینا اور کسی سیاسی یا اقتصادی عقیدے کو زندگی سے عظیم تر گرداننے لگنا۔ ناقابل تلافی غلطی ہے جس سے زندگی کا

تعمیر دسمبر ۱۹۵۹ء
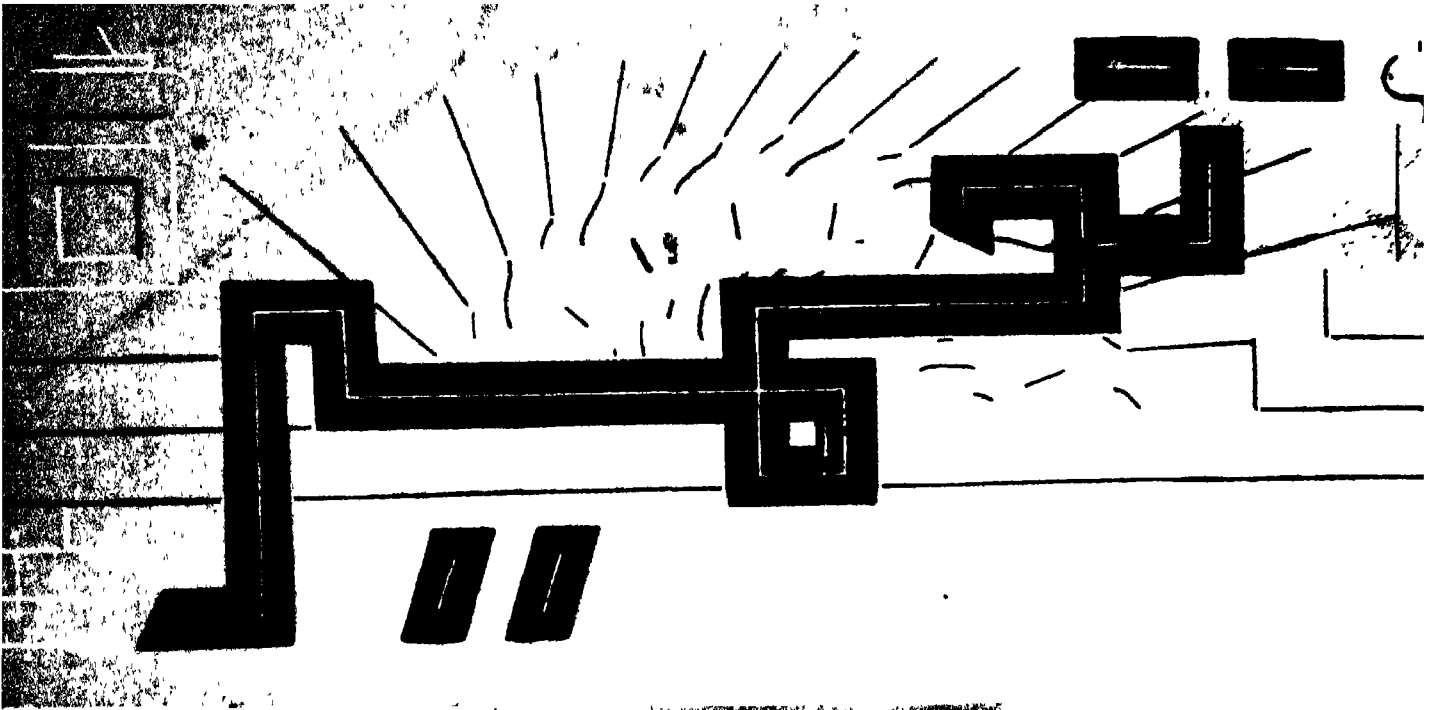
ماہنامہ

تعمیر

سرینگر

اگست ستمبر ۱۹۵۸ء

جلد ۳ ——————— شمارہ ۱۴

ایڈیٹر

شمیم احمد شمیم

جوائنٹ ایڈیٹر

محمد یوسف ٹینگ

قیمت سالانہ چھ روپے ——————— فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے

عبدالغنی [illegible] پرنٹر پبلشر نے گورنمنٹ پریس میں چھپوا کر [illegible] سرینگر کی طرف سے شائع کیا

ترتیب

زاویے

گذشتہ گیارہ برس کے دوران پاکستان کی ناؤ جس سیاسی اور اقتصادی بحران کے تلاطم میں ہچکولے کھا رہی تھی اُس کو دیکھ کر کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ یہ بدقسمت ملک ایک بہت بڑے انقلاب کے دہانے پر کھڑا ہے۔ مگر اس اندازے کے ساتھ یہ اُمید بھی لگی رہتی تھی کہ جو انقلاب آرہا ہے وہ حریت، تعمیر اور ترقی کی طاقتوں کا مظہر ہوگا اور وہاں نوجوانوں کا ایک ایسا کاروان سامنے آجائے گا جو زمانے کے آہنگ کو پہچان کر اس ملک کی مصیبتوں کی تہہ میں جائے گا اور اُن کا تجزیہ کرکے استحکام، آزادی اور تعمیر کی نئی قدروں کو اُجاگر کرے گا۔ یہی کچھ مصر میں ہوا تھا اور پاکستان کی تازہ سیاسی قلابازی سے کچھ ہی عرصہ پہلے عراق میں بھی یہی کچھ پیش آیا تھا۔ مگر پاکستان کے ساتھ حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کر وہاں بھی ایک بہت بڑا انقلاب آیا۔ مگر یہ انقلاب آزادی، اخوت اور تعمیر کی قوتوں کا بابِ نصرت نہ تھا بلکہ یہ رجعت پسندی، استعمار نوازی اور عوام دشمنی کے زیادہ بھیانک اور خونخوار قوتوں کی کامرانی کی منحوس رات کا طلوع تھا جس کی تیرگیوں میں فی الحال روشنی کی ساری کرنیں گم ہوگئی ہیں۔

اس بارے میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ پاکستان کے حالات ابتری کی اُس منزل پہنچ گئے تھے جہاں سے بربادی اور انتشار کا خوفناک غار بہت قریب رہ جاتا ہے اور اس بات میں بھی دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ پاکستان کے سیاست دانوں کا گروہ اخلاقی اور سیاسی لحاظ سے اس قدر دیوالیہ ہوگیا تھا کہ کوئی بھی قوم اپنی رہنمائی کے لئے ایسے بددیانت اشخاص پر اعتماد نہیں کرسکتی تھی۔ مگر پاکستان کی اس بربادی کے عقب میں اس سے زیادہ گہری وجوہات بھی کارفرما ہیں۔ اُن میں ایک تو یہ ہے کہ پاکستان کسی قدرتی اور منطقی قومیت کا گہوارہ ہے ہی نہیں۔ اور اس کا وجود خالصتاً ایک منفی اور تخریبی اندازِ فکر پر عمل میں آیا تھا۔ یہ تخریبی اندازِ فکر ہندوستان کی عظیم تحریک آزادی کو نقصان پہنچانے میں کامیاب تو ہوسکتا تھا مگر اس کی بنیاد پر ایک صالح اور ٹھوس ملک کی بنیاد رکھنا ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے وجود کے ساتھ ہی اس کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوگیا اور وہ مسلم لیگ جو شور و غوغا اور ہنگامہ آرائی کے بل بوتے پر ملک کو تقسیم کرانے کا منحوس کارنامہ انجام دے چکی تھی، نئے دور کے تعمیری تقاضوں میں پنپ نہ سکی۔ اور پاکستان کے ناامید اور شکست خوردہ عوام نے اس پر عدم اعتماد کرکے نظریۂ پاکستان کی جڑوں کو ہلا دیا۔ اسی لئے پاکستان کے سیاست دانوں (جنہیں جنرل ایوب مرحوم قرار دے چکے ہیں) کی منطق میں یہ بات کہنا پڑتی ہے کہ پاکستان کی مصیبتوں کے عواقب اور منبعے اُن کی اپنی رسائی سے بھی باہر تھے اور اسی لئے وہ کسی تعمیری نصب العین کی جانب نشان دہی کرنے کی بجائے ہمیشہ منفی نعروں پر تکیہ کرتے رہے اور ہندوستان کے خلاف نفرت اور کشمیر کے لئے جہاد کے مصنوعی ہنگامے تیار کرکے اپنی متاعِ زیست حاصل کرتے رہے۔

دوسری بات (جو دراصل پہلی ہی کا ایک منطقی نتیجہ ہے) یہ ہے کہ پاکستان کے سیاست دانوں نے اپنے ملک کو اپنی پیداواری صلاحیتوں اور ریاضت و مشقت کی ٹھوس بنیادوں پر کھڑا کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ کیونکہ یہ پاپڑ تو قومی حریت کا پرچم بلند رکھنے کے لئے بیلنے پڑتے ہیں اور پاکستانی حکمرانوں کو لفظ "حریت" کے مفہوم کبھی سمجھ نہ آسکے۔ اسی لئے اُنہوں نے مغربی استعمار کی ٹوٹی ہوئی زنجیریں پھر سے زیب گلو کرلیں اور پاکستان کی لرزہ براندام عمارت مغرب کے سامراجوں کا بازیچہ بن گئی۔

جنرل ایوب خان دونوں وجوہات کے طلسم میں اسیر ہیں۔ وہ مغربی استعماریت کے آلۂ کار بھی ہیں اور خالقانِ پاکستان کی منفی سیاست کا گہرا غلاف بھی اُن کی آنکھوں پر چڑھا ہوا ہے۔ اسی لئے وہ بھی اپنے آپ کو پاکستانی سمندر کی جولانیوں کے سامنے بے بس پاتے ہیں اور لاچار ہوکر وہ بھی اپنے پیشروؤں کی شرمناک میراث یعنی استعمار نوازی اور ہند دشمنی کے کھوکھلے میناروں کی گلوکاری میں مصروف ہوگئے ہیں تاکہ پاکستانی عوام کو ان کی "پوشیدہ قوت" کا قائل کرکے اپنے پیشروؤں کے خوفناک انجام تک پہنچ سکیں۔ پاکستان کو افراد کی تبدیلی کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ذہنیت اور اندازِ فکر کے انقلاب کی۔ وہاں جس مصنوعی انقلاب کا سوانگ رچایا گیا ہے وہ دراصل اُبھرتی ہوئی عوامی اُمنگوں کی تجہیز و تکفین کا مکروہ ڈرامہ ہے — مگر کون جانے کہ کبھی عوامی سمندر کا جوار بھاٹا اس سارے سوانگ کو غارت کرکے تاریخ کے ساتھ مذاق کرنے والوں کو خود ہدفِ مذاق بنا دے!

ہم کشمیر کے رکھوالے کشمیر ہمارا رکھوالا

ہم اپنا مستقبل بھی ہیں ہم اپنی تقدیر بھی ہیں
راگ بھی ہیں ہم آگ بھی ہیں ہم ساز بھی ہیں شمشیر بھی ہیں
پہچانو اے دُنیا والو اپنے وطن کی آن ہیں ہم
سارے جہاں کو ناز ہے ہم پہ سارے جہاں کی جان ہیں ہم
ہم پھولوں کے حُسن کی خاطر انگاروں سے کھیلے ہیں
برسوں رنج سہے ہیں ہم نے صدیوں صدمے جھیلے ہیں
طوفانوں نے داد دی ہم کو اور حوادث نے پالا
ہم کشمیر کے رکھوالے کشمیر ہمارا رکھوالا

خود ہی محکومی کی بوجھل زنجیروں کو توڑا تھا
خود ہی ہندوستان سے آزادی کا رشتہ جوڑا تھا
ہم ہیں ہندوستان کے ساتھی ہندوستان ہمارا ہے
جنگ نہ ہونے دیں گے ہرگز امن ہمارا نعرہ ہے
آزادی کی خاطر ہم نے خوشحالی کے گیت بُنے
صحراؤں سے موتی رولے انگاروں سے پھول چُنے
امن کی دیوی کو پہنائی چاند ستاروں کی مالا
ہم کشمیر کے رکھوالے کشمیر ہمارا رکھوالا

ہم ہیں امن کے حامی لیکن خونریزی کا خوف نہیں
اہلِ حق تلواروں کی جھنکاروں سے ڈرتے ہیں کہیں
ظلم و ستم نے للکارا تو غیرت جوش میں آئے گی
کانپ اُٹھیں گے قہر بھی ہم سے موت بھی گھبرا جائے گی
نوچ لئے سب بوجھل پردے راز کی باتیں جان گئے
کون ہے دشمن کون ہے ساتھی ہم سب کو پہچان گئے
کیسے چھپے گا دُشمن ہم سے دُشمن ہے دیکھا بھالا
ہم کشمیر کے رکھوالے، کشمیر ہمارا رکھوالا

ایک بار پہلے بھی ہم کو دشمن نے للکارا تھا
پہلے بھی ہم جیت گئے تھے پہلے بھی وہ ہارا تھا
ہم فولادی دیواروں سے ٹکرائے تھے پہلے بھی
ہم نے آزادی کے جھنڈے لہرائے تھے پہلے بھی
یاد ہے سب کو ہم نے کُل دُنیا میں دُھوم مچائی تھی
ایک بار پہلے بھی طوفانوں میں آگ لگائی تھی
پہلے بھی تھا ہم نے قطروں کو طوفانوں میں ڈھالا
ہم کشمیر کے رکھوالے کشمیر ہمارا رکھوالا

(بقیہ بر صفحہ ۱۸)

آنریبل میر اسد اللہ
سپیکر جموں و کشمیر لیجسلیٹو اسمبلی

شاعر اور سماج

کسی ملک کی مجموعی ترقی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اُس ملک نے ثقافتی طور پر کتنی ترقی کی ہے۔ ہم اُسی ملک کو مہذب اور متمدن کہتے ہیں جس کے رہنے والوں کی کلچرل سطح بہت بلند ہو۔ یہ کلچرل سطح محض اقتصادی لحاظ سے ترقی یافتہ ہونے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے فنونِ لطیفہ کو بھی بڑھاوا دینے کی بے حد ضرورت ہوتی ہے کیونکہ فنونِ لطیفہ انسان کی جمالیاتی قوتوں کو اُبھارتے ہیں اور اُس کے ذہن کو ارتقا پذیر کرتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ میں مصوری، موسیقی، شاعری، ڈرامہ، ناچ وغیرہ شمار کئے جاتے ہیں۔ ان سب کو مقبولِ عام بنانے کے مختلف ذرائع ہیں۔ مثلاً مصوری کے لئے نمائشیں منعقد کرنا، ڈرامہ، ناچ اور موسیقی کو دیکھنے اور سُننے کے لئے سامعین کو یکجا کرنا، شاعری کے لئے مشاعروں کی محفلیں منعقد کرنا، غرض کہ ان سبھی فنون کی کامیابی کے لئے اور ان سے مستفید ہونے کی خاطر فن کار اور عوام کی باہمی رضامندی اور اشتراک لازمی ہے۔ ہم چونکہ اس وقت صرف شاعروں کی بات کر رہے ہیں اس لئے ہم ان فنونِ لطیفہ میں سے صرف شاعری کو لیں گے اور پھر یہ دیکھیں گے کہ شاعروں کی ہمارے نئے سماج میں کیا اہمیت ہے۔

فنونِ لطیفہ میں شاعری کا درجہ بہت ہی بلند ہے۔ "شاعری جزویست پیغمبری" کا مقولہ آج کے حالات پر بھی صادق آتا ہے۔ شاعر آج بھی ملک اور قوم کی اُسی طرح رہبری کر سکتا ہے، جیسا کہ اگلے وقتوں میں اُس نے کی ہے۔ وہ اپنے پڑھنے اور سُننے والوں کے دِلوں پر سحر کا اثر طاری کر سکتا ہے اور اُنہیں اپنی قوتِ گویائی سے متاثر کر کے کسی بھی فعل کے لئے متحرک کر سکتا ہے۔ شعر میں ایسی تاثیر ہوتی ہے کہ سامعین میں اس سے خوشی، غم، جوش، سرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ایک مقرر اپنی بیسیوں تقریروں سے بھی انسانی دِل و دِماغ پر وہ اثر نہیں ڈال سکتا، جو ایک شاعر اپنے ایک ہی شعر سے پیدا کر سکتا ہے، کیونکہ شاعر ایک نباض ہوتا ہے اور انسان کی دِلی کیفیتوں سے واقف۔ مقرر کے مقابلہ میں انسانی دِل و دماغ پر اُس کی گرفت بہت مضبوط ہوتی ہے کیونکہ وہ انسان کے دِل کو ٹٹولتا ہے اور اُس کے جذبات اور احساسات کو اُبھارتا ہے۔

ہمیں تاریخ سے ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں شاعر کے تخئیل نے وہ کام کیا ہے جو ایک رہنما سے بھی نہیں ہو سکا۔ ہم یہاں دو ایک مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ سماج میں شاعر کی حیثیت زیادہ اچھی طرح سے واضح ہو سکے :-

لارڈ بائرن کی ایک نظم ہے۔ "Child heralds pilgrimage" یہ نظم بہت ہی مشہور ہے۔ یونان ترکوں کی اطاعت میں تھا اور شاعر نے اس نظم میں فرانس، انگلستان اور روس کو غیرت دِلائی تھی کہ وہ یونان کو ترکوں سے آزاد کریں۔ اور اس نظم میں لکھا تھا کہ علم و حکمت میں یونان نے یورپ اور خاص کر انگلستان اور فرانس کو کافی فائدے پہنچائے ہیں اور اس کا بدلہ آج تک یونان کو کچھ نہیں ملا۔ یہ نظم ۱۸۱۲ء میں شائع ہوئی اور یوروپی ممالک میں اس کی دھوم مچ گئی چنانچہ اس نظم کی ایسی تاثیر ہوئی کہ جیسے یونان نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی۔ تو اتحادی جنگی بیڑہ یونان کی مدد کو آیا اور ترکوں نے مجبوراً یونان کو آزاد کر دیا۔

انگلستان کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ویلز پر انگلستانیوں کی چڑھائی کے دوران ویلز کے شاعروں نے اپنے ہم وطنوں کے جذبۂ وطنیت کو اُبھارا۔ اور نہایت ہی ولولہ انگیز اشعار کہے اور لوگوں کو ہمّت اور غیرت دِلائی۔ گو ویلز انگلستانیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا تاہم شاعروں کے کلام نے لوگوں میں حُبِّ وطن کا جذبہ بھر دیا۔ اور اُنہوں نے شکست کھانے کے باوجود بھی بہت دیر تک اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا۔

ایران میں رودکی اور عمر خیام اور عرب کے اندھے شاعر اعشیٰ کے اشعار کی بھی یہی تاثیر تھی۔ اگر رودکی کے قصیدہ نے امیر نصر بن احمد کو خراسان فتح کر کے وہاں سے بخارا واپس آنے پر مجبور کیا تو عمر خیام کی رباعیوں نے لوگوں کو دیوانہ بنا دیا—

آتشی کے کلام کی یہ تاثیر تھی کہ جن لڑکیوں کو بر نہیں ملتا تھا اُن کی مدح میں قصیدہ لکھ کر ہزاروں لوگوں کو اُن پہ گرویدہ کرا دیتا تھا۔

ان مثالوں سے شعر کی تاثیر اور کرامت کا پُورا پتہ چلتا ہے اور یہ بات بھی مُسلّم ہو جاتی ہے کہ شاعر کا کتنا عظیم درجہ ہوتا ہے۔

ہماری ریاست میں حبّہ خاتون اور ارنہ مال، شیخ نُورالدین اور للّی (ایشوری) رسُول میر اور محمود گامی عوام کے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہیں۔ ان شاعروں اور شاعراؤں نے تصوّف اور حسن و عشق کے گیت گائے اور اُن کے اشعار آج بھی لوگوں کے وردِ زبان ہیں۔ لیکن ان سے قطع نظر ایسے بھی شاعر ہوئے ہیں جنہوں نے کشمیر کی سماجی زندگی کی عکاسی کی اور اپنے فن کو اس سے بہتر بنانے کے لئے وقف کر دیا۔ جہاں تک اُردو زبان کا تعلق ہے حالی اور اکبر الٰہ آبادی نے شعر سے بہت کام لئے۔ اسے سماجی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ حالی نے مسدّس لکھی اور مُسلمانوں کو اپنی پس ماندگی اور جہالت کا احساس دلایا۔ اور اُنہیں اپنی پس ماندہ حالت کو سُدھارنے کی تلقین کی۔ اکبر الٰہ آبادی نے ایک محبِّ وطن شاعر کی حیثیت سے انگریزی سامراج کے خلاف عوام کا غصّہ بھڑکایا اور جُوں جُوں ہندوستانی عوام کی جنگِ آزادی بڑھتی گئی، شاعروں نے بھی اپنے فرائض کو پہچانا اور اپنا حصہ ادا کیا۔ اقبال نے وطنیت اور خودی کا راگ الاپا اور جوشؔ نے انقلاب کا نعرہ بلند کیا۔ اور ہزاروں اور لاکھوں سرفروشوں نے اپنے تئیں آزادی کی قربان گاہ پہ پیش کیا۔

بھلا ہماری کشمیری شاعری ان اثرات کو کیسے قبول نہ کرتی! ہمارے ہاں مہجور نے شاعری کو نیا رنگ بخشا اور آزادی کی جد و جہد کے دَوران "نئی بہار" کی آمد کی اطلاع دی۔ آزادؔ نے لوگوں کو اپنی قوتوں کا احساس دلایا اور اُنہیں غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اُبھارا۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان نے ہماری ریاست پر حملہ کر دیا تو جہاں ہمارے عوام وطنِ عزیز کی حفاظت کے لئے مُتحد ہوئے وہاں شاعر بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے عوام کے حوصلوں کو بلند رکھا اور اُنہیں وطن کی حفاظت کے لئے منظم کرنے میں بڑی مدد دی۔ کشمیری عوام کے جنگی گیت — "قدم قدم بڑھیں گے ہم، محاذ پر لڑیں گے ہم —" کی گونج ابھی تک ہمارے کانوں میں مدھم نہیں پڑی ہے۔ یہ وُہ گیت تھا جس نے فوجی جوانوں کے لہو کو گرمایا اور ہر کشمیری مرد اور عورت میں جوش اور ولولہ پیدا کر کے اُنہیں دشمن کے خلاف صف آرا کیا۔ حتےٰ کہ کشمیری بچوں پر اس گیت کے اثر کا یہ عالم تھا کہ وہ لکڑی کی بندوقیں کندھوں پہ تانے سڑکوں اور گلیوں میں دن رات مارچ کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔

یہ چند باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ فنونِ لطیفہ میں شاعری کا کیا درجہ ہے اور ایک شاعر سماج پر کس طرح سے اثر انداز ہو سکتا ہے۔ جہاں شاعر سماجی حقائق سے تجربات حاصل کرتا ہے وہاں وہ عوام کو بدلتی ہوئی سماجی قدروں سے بھی رُوشناس کراتا ہے جب کبھی سماج میں کسی تغیّر کا رُجحان پیدا ہوا تو سب سے پہلے شاعر نے اس رُجحان سے عوام کو متعارف کرایا اور اس کی اچھائیاں اور بُرائیاں اُن کے ذہن نشین کر دیں۔

ہمارے آج کے سماج میں شاعری کی اہمیّت اور بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ ہم ایک ایسے دَور میں سے گذر رہے ہیں جہاں ہمارے سماج کی قدریں بالکل بدل رہی ہیں — زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب رُونما ہو رہا ہے اور انسان کے سوچنے اور سمجھنے کے طریقے میں تبدیلی آ رہی ہے۔ ان حالات میں شاعر ایک اچھا خاصا رول ادا کر سکتا ہے اور وہ ادا کرے گا۔

لیکن بدقسمتی تو یہ رہی ہے کہ اب تک ہمارے عوام جہالت کے تاریک گڑھے سے نہیں نکل پائے ہیں۔ وہ ناخواندہ ہیں۔ شاعر کا کلام کتابی صورت میں اُن تک نہیں پہنچ سکتا اور اگر پہنچے بھی تو وہ بوجہ اپنی ناخواندگی کے اس سے کسبِ نُور و فیض نہیں کر سکتے، لیکن اس کے باوجود اُن کا ذہن اس طرف مائل ہوتا ہے اور جب شاعر سماجی حقائق لطیف پیرایے میں بیان کرتا ہے اور جب ہمارے عوام اُسے براہِ راست سُنتے ہیں یا اُن تک اُس کا کلام سینہ بسینہ پہنچ پاتا ہے تو وہ اُس سے بہت محظوظ ہو جاتے ہیں اور اس کے اثرات قبول کرتے ہیں۔

اب جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، فنونِ لطیفہ کو مقبول بنانے کے مختلف ذرائع ہوتے ہیں اور سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ ان فنون کو عوام کے اجتماع میں پیش کیا جائے شاعری کے سلسلہ میں اس لحاظ سے مشاعروں کی اہمیت پر ہمیں غور کرنا چاہیئے۔ جب ایک شاعر پنڈال پر کھڑا ہو جاتا ہے اور اُس کے سامنے ایک جمِ غفیر اُس کا کلام سُننے کے اشتیاق میں بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ تو اُس وقت جو سماں بندھ جاتا ہے اُس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر ایک رہنما سے کسی بھی صورت میں کم نہیں۔ وہ اپنے وجد آگیں کلام سے سامعین کے دِلوں میں دھڑکنیں پیدا کرتا ہے، خوشی اور انبساط کا عالم طاری کرتا ہے، غم اور غصّہ بھڑکاتا ہے۔ شاعر یہ اثر اپنے مجموعہ کلام (شائع شدہ) کے ذریعہ بھی قارئین پر طاری کرتا ہے۔ لیکن تجربہ ہمیں سکھاتا ہے کہ قارئین پر اس درجہ اثر نہیں ہو سکتا جتنا کہ اُس کی براہِ راست گفتگو سے سامعین پر ہوتا ہے۔ اجتماعی گانے (Community singing) کا اُس میں حصہ لینے والوں پر ویسا اثر ہوتا ہے۔

جنگل اور کوہسار، ندی نالے اور نشیب و فراز غرض کہ ساری فضا اجتماعی گانے سے مسحور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سے شاعر بھی مشاعرہ میں جمع لوگوں کے سامنے ایک سماں باندھ دیتا ہے اور سننے والے سر دھنتے رہ جاتے ہیں۔ اگر شاعر کا وہی کلام اجتماعی کانوں کے لئے بھی استعمال ہو، تو ظاہر ہے کہ اس کا اثر دوبالا ہوگا۔

یوں مشاعروں کو مغلوں کے زمانے میں رواج دیا گیا تھا، لیکن جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے شاعری محض نوابوں اور امیروں کے محلوں کی لونڈی بن کر رہ گئی تھی۔ وہ اسے محض اپنے تفنن طبع کے لئے استعمال کرتے تھے۔ مشاعروں کی محفلیں درباروں میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جہاں مصاحبین کے علاوہ پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ لیکن جب شاعر اور سماج کا رشتہ استوار ہوتا گیا تو محلوں سے باہر بھی مشاعرے ہونے لگے اور عوام نے مشاعروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور سماج میں ان کے صحیح مقام کا تعین کیا۔

لیکن ابھی تک مشاعروں کی ترقی اور ترویج کی طرف وہ دھیان نہیں دیا جا رہا جو تھیٹر، ناچ، موسیقی اور مصوری کی طرف دیا جاتا ہے۔ ہماری ریاست میں مشاعروں کا عام رواج ۱۹۴۷ء کے بعد ہی سے ہوا۔ لیکن ان کی ترقی کے لئے منظم کوششیں نہیں ہو رہی ہیں۔ حالاں کہ ہم اپنی اقتصادی منصوبہ بندی اور تعمیراتی پروگرام میں مشاعروں سے کافی حد تک استفادہ کر سکتے ہیں۔ اجتماعی ترقی کا دار و مدار عوام میں کام کرنے کا جوش اور ولولہ پیدا کرنے پر ہوتا ہے۔ مشاعرے اس سلسلہ میں ہمارے معاون و مددگار ہو سکتے ہیں۔ سب سے بڑا مقصد، جو ہم مشاعروں کی بدولت حاصل کر سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ہماری ریاست کی مختلف قومیتوں اور آئینی اکائیوں کا اتحاد مضبوط و مستحکم ہوگا۔ مختلف قومیتوں کے شاعروں اور عوام کے ایک جگہ مجتمع ہونے سے کلچرل تال میل بڑھ جائے گا اور بڑھ کر مضبوط ہوگا۔ فرقہ وارانہ ذہنیت ختم ہو جائے گی۔ امن، آشتی اور بھائی چارہ کو تقویت ملے گی اور عوام کا ذہنی ارتقا ہوگا اور وہ وقت پھر آئے گا جب ہم وہ کلچرل روایات دوبارہ پیدا کر سکیں گے جو ماضی میں ہمارے ملک نے قائم کی تھیں۔

خواب دیکھنا سیکھئے!

"سمجھنے کی پہلی بات یہ ہے کہ ہم ایک عجیب و غریب زمانے میں پیدا ہوئے ہیں اور اس میں ہمیں کچھ ذمہ داریاں بھی اپنے اوپر لینا ہیں۔ اس میں ہمیں بہت سے انعام مل سکتے ہیں۔ انعام سے میرا مطلب پیسے ویسے کے انعام سے نہیں بلکہ ذمہ داری کے کام کرنے کا موقعہ اور خواب دیکھنے اور ان خوابوں کو ایک عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنے سے ہے۔ آج کل یہ زمانہ ہے اور غالباً کچھ دن تک رہے گا کیونکہ یہ باتیں کوئی جھٹ پٹ تو ہو نہیں جاتیں۔

ظاہر ہے کہ ان سب کاموں کو کرنے کے لئے طرح طرح کی قابلیت چاہیئے۔ آپ یونیورسٹی میں کتابوں سے پڑھ کر اور لیکچر سن کر جو باتیں سیکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت اور دوسری قسم کی باتیں بھی ہیں جو جاننی چاہئیں۔ یونیورسٹی میں پڑھنا تو اصل میں تعلیم کی شروعات ہے، خاتمہ نہیں۔ اکثر یہاں خیال ہوتا ہے کہ ڈگری لے کر یا ایم اے پاس کر کے پڑھائی ختم ہو گئی۔ یہ غلط خیال ہے۔ وہ تو آپ نے محض اپنے کو سنبھالنے اور کچھ سیکھنے کی جانب پہلا قدم رکھا ہے۔ اگر آپ نے یونیورسٹی میں اتنا پڑھ لیا کہ آئندہ آپ خود پڑھ سکیں تو آپ نے بہت پڑھا، کیونکہ یونیورسٹی میں دو چار برس میں آپ کتنا پڑھ سکتے ہیں؟ اس پڑھائی کا مقصد تو یہ ہے کہ عمر بھر آپ کے دماغ کی کھڑکیاں کھلی رہیں اور جس میدان میں آپ چاہیں اس میں آگے بڑھیں اور نئی نئی باتیں جاننے کے موقعے آپ کو ملیں اور آپ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔۔۔"

پنڈت جواہر لال نہرو

(۲۲ر اکتوبر ۱۹۵۶ء کو تال کٹورہ دہلی میں نوجوانوں کے تیسرے سالانہ میلے کا افتتاح کرتے ہوئے)

جناب بخشی غلام محمد
وزیر اعظم جموں و کشمیر

فلاحی معاشرے کی راہ پر

آزادی کو گیارھواں سال بیت چکا ہے اور ملک سماجی نشاۃ الثانیہ اور اقتصادی ترقی کی راہ پر تیزی سے قدم بڑھا رہا ہے۔ یہ سال ملک کے طول و عرض میں رہنے والے ہم سب پیر و جوان اور زن و مرد کے لئے زبردست محنت اور مشقت کے سال تھے۔ واقعی جاگیرشاہی سے جمہوریت تک کا عبوری دَور ایک طویل عمل ہے۔ اس لئے یہ سوچنا غیر حقیقت پسندانہ ہوگا کہ راتوں رات ہمارے ملک کے حالات میں زبردست تغیرات رُونما ہوں گے۔

صدیوں کے غیر ملکی راج کے دَوران ہمارے ملک میں لاتعداد سماجی اور اقتصادی بُرائیاں نشوونما اور فروغ پاتی رہی ہیں۔ ان ساری بُرائیوں کو دس بیس سال میں کُلی طور پر بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکنا ممکن نہیں۔ ہم نے بیرونی حکمرانوں سے شکستہ معیشت مثلاً غیر متوازن مالیات، افراطِ زر، بڑھتی ہوئی بے روزگاری، غذائی قلت اور نیم براعظم ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں ستم رسیدہ اور کراہتی ہوئی انسانیت کا سیلِ رواں ورثے میں پائے ہیں۔ تاہم ہمارے عوام نے انسانی کمالات کے مختلف شعبوں میں بڑے بڑے اور تیز تیز ڈگ بھر لئے ہیں اور اس طرح ہم ایک متحرک معیشت کی بُنیادیں رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

آج سارے ملک میں ایک نئی زندگی موجزن ہے اور نئے ارمان اور آرزوئیں مچل رہی ہیں۔ یہ بہت فخر کی بات ہے کہ اس موقعہ پر اُبھرتی ہوئی اور جوان ہندوستانی قوم کی ان اہم کامیابیوں کا اجمالاً جائزہ لیا جائے جو اس قوم نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اب تک حاصل کی ہیں۔ سارے ملک میں پہلے پانچ سالہ منصوبے کو کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچایا گیا۔ اس منصوبہ بندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری قومی آمدن میں منصوبہ میں گیارہ فی صدی کی مقررشدہ حد کے مقابلے میں اٹھارہ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ منصوبہ میں ملک کی صنعتی ترقی پر زور دینے کے نتیجے میں صنعتی پیداوار بڑھانے میں بھی خاصی ترقی ہوئی۔ قومی توسیعی سروس اور اجتماعی ترقی کے پروگراموں کو عمل میں لانے سے سارے ملک کے دیہات میں جہاں اصل ہندوستانی جنتا بُود و باش کرتی ہے، ایک خاموش انقلاب جنم لے رہا ہے۔ آج کل ملک کے چپے چپے اور قریے قریے میں دوسرے پنج سالہ منصوبے پر سُرعت سے کام ہو رہا ہے اور لوگ ترقیاتی سرگرمیوں میں جت چکے ہیں۔ عظیم ہندوستانی قوم کے ایک اٹوٹ حصے کی حیثیت سے ریاست جموں و کشمیر بھی منصوبہ بندی کی راہ پر سرپٹ دوڑ رہی ہے۔ چنانچہ ریاست نے تعلیم، صحت عامہ، زراعت، صنعت و حرفت، برقی قوت اور قومی تعمیرِ نو کے دوسرے شعبوں میں اب تک نمایاں ترقی کی ہے۔ آزادی سے پہلے کے زمانے کے مقابلے میں ہماری ترقیاتی سرگرمیوں کا دائرہ عمل کافی وسیع ہو چکا ہے۔ مثال کے طور پر ۴۸ — ۱۹۴۷ء کے دوران ہمارا تعلیمی بجٹ ۴۴ لاکھ روپے سے تجاوز نہ کر سکا۔ لیکن ۵۸ — ۱۹۵۷ء میں تعلیم کی مد پر ایک کروڑ ۳۶ لاکھ ۳۵ ہزار روپے خرچ کئے جا رہے ہیں۔ ان اعداد و شمار سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ زیرِ بحث دَور میں ہماری تعلیمی سرگرمیاں کافی بڑھ گئی ہیں۔ اور حمل و نقل کے جدید ذرائع کے طفیل تعلیم اور جدید تہذیب کی روشنی ہماری ریاست کے دُور اُفتادہ اور پس ماندہ علاقوں تک بھی پہنچ گئی ہے۔ آج ریاست کے دُور دراز دیہات میں بھی جابجا اسکول، ڈسپنسریاں، ماڈل فارم اور پنچایت گھر دیکھنے میں آ رہے ہیں اور دیہاتی علاقوں میں قومی توسیعی سروس اور اجتماعی ترقی کے پروگرام روز بروز مقبولیت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔

ریاست کے آئین کے تحت زبان، کلچر اور فنون کی اکاڈیمی قائم کرنا اس سال کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس آئین میں ریاست کے شہریوں کو اسی طرح یکساں اور مساوی حقوق اور مواقع حاصل کرنے کی ضمانت دی گئی ہے جس طرح ملک کے دوسرے حصوں میں رہنے والے عوام کو میسّر ہیں۔

گذشتہ سال ریاست میں قبل از وقت بہت [illegible] اور بے وقت کی بارشوں سے

جناب بخشی غلام محمد

جناب غلام محمد راجپوری

شری شیام لعل صراف

جناب میر اسد الہ صاحب

سپیکر جموں و کشمیر لیجسلیٹو اسمبلی

جناب شمس الدین

بھگت چھجو رام جی

فصلوں کو سخت نقصان پہنچا لیکن حکومت اس نازک گھڑی پر لوگوں کے آڑے آئی اور اس ناگہانی آفت سے پیدا شدہ مشکلات پر قابو پانے کے لئے ضروری اقدام کئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست میں غذائی صورت حال مستحکم ہو گئی۔ اور ترقیاتی سرگرمیاں بلا روک ٹوک جاری رہیں۔ ریاست کی ۸۵ فیصدی آبادی میں عارضی راشن کارڈ تقسیم کر کے ایک غیر معمولی قدم اُٹھایا گیا۔ سیلاب زدگاں میں ایک کروڑ ۵ لاکھ روپے سے زیادہ رقم ریلیف اور معاوضے کے طور پر تقسیم کی گئی۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ ریاست میں آفاتِ ناگہانی کے نازل ہونے کے باوجود ریاستی عوام کے حوصلے پست نہیں ہوئے اور وہ نہایت اطمینان اور مستعدی سے روزمرہ کا کام انجام دیتے رہے۔

حکومت غذائی خسارہ کو پورا کرنے کے لئے غذائی پیداوار بڑھانے کے لئے سخت کوششیں کر رہی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں کئی اسکیموں پر عمل ہو رہا ہے۔ صوبہ جموں میں نہریں تعمیر کرنے کے منصوبے کا سروے ہو رہا ہے۔ اس طرح وادیٔ کشمیر میں بھی دریائے لدر کے آبپاشی اور برقی قوت کے منصوبے کی جانچ پڑتال کی جا رہی ہے۔ اس منصوبے پر تقریباً دو کروڑ روپے لاگت آنے کا اندازہ لگایا گیا ہے توقع کی جاتی ہے کہ یہ منصوبہ ۵۹-۱۹۵۸ء میں مکمل ہو جائے گا۔ اندازہ ہے کہ جب یہ منصوبہ تکمیل کو پہنچ جائے گا تو ۷۵۰۰ ایکڑ زمین کی آبپاشی ہونے کے علاوہ دس ہزار کلوواٹ برقی قوت بھی پیدا ہو سکے گی۔

آئے دن ریاست کے دیہاتی علاقوں کو بجلی مہیا کی جا رہی ہے اور صوبہ جموں کے کنڈی علاقوں میں واٹر سپلائی کے نظام کو بہتر بنایا جا رہا ہے۔ نئی بانہال ٹنل کو کھول دینے اور ذرائع حمل و نقل کے دوسرے جدید اور بہتر ذرائع فراہم کرنے اور سیاحوں کو دوسری اور قسم کی سہولتیں مہیا کرنے سے ریاست میں سیاحوں کی آمد میں نمایاں اضافہ ہوا۔ چنانچہ سال رواں کے دوران اس جنت نظیر وادی میں سیاحوں کی خوب ریل پیل رہی۔ اس سلسلے میں مئی میں منعقدہ جشنِ بہار لوگوں میں جوش و خروش پیدا کرنے کا موجب بنا۔ چنانچہ جشن کے طفیل ریاستی عوام کے علاوہ یہاں آئے ہوئے سیاحوں کو بھی تفریح اور دل بہلائی کے مناسب مواقع میسر ہوئے۔

آج ریاست قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہندوستان کے اور زیادہ قریب آگئی ہے۔ گزشتہ سال اس سلسلے میں اہم واقعہ یہ رُونما ہوا کہ بہت سے ریاستی افسروں کو انڈین ایڈمنسٹریٹو اور انڈین پولیس سروس میں لے لیا گیا۔ واقعی اس اقدام کے نتیجے میں ریاستی افسروں کو نظم و نسق کے وسیع و فراخ میدان میں کام کرنے اور اپنی قابلیت اور ذہانت کا مظاہرہ کرنے کا بھرپور موقع ملے گا۔ شمالی زونل کونسل، جو ریاستوں کی تنظیم نو سے متعلق ایک سکیم کے تحت وجود میں آئی ہے، کی میٹنگ پہلی مرتبہ سرینگر میں منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ کی صدارت مرکزی وزیر داخلہ نے کی۔ یہ کونسل جموں و کشمیر، پنجاب، راجستھان اور ہماچل پردیش پر مشتمل ہے۔ کونسل کی میٹنگ نے اس خطہ میں شامل ریاستوں کو ساری قوم کی مجموعی ترقی کے مشترکہ مفاد کے معاملات پر غور و فکر کرنے کے لئے مشترکہ طور پر مشاورت کرنے کا موقعہ مہیا کیا۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے واقعات نے مرکز اور ریاست کے درمیان گہرے تعلقات کے بندھنوں کو اور بھی مضبوط کر دیا ہے۔

۱۵ راگست کا مقدس دن ہندوستانی عوام کی زندگی میں ایک یادگار دن ہے۔ آیئے ہم اس متبرک دن پر دل و جان سے ملک کی خدمت کرنے کا حلف اُٹھائیں!

قاضی غلام محمد
شعبہ پی ایچ ڈی (ریاضی)

رسول میر پر ایک نظر

رسول میر ہمارے وہ شاعر ہیں جنہوں نے اس حسین وادی میں عشق و محبت کے لافانی گیت گائے ہیں۔ اس ساز پر انہوں نے کچھ ایسے نغمات چھیڑے ہیں جن کی گونج آج تک باقی ہے اور بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ گونج روز بروز بڑھتی ہی رہے گی۔

محبت اُن کی کُل کائنات تھی اور اپنی مختصر سی عمر میں اُنہوں نے ہر پہلو سے اس کے اظہار کی کوشش کی ہے۔ اُن کی شاعری کے بیشتر حصے پر ایک جوانی چھائی ہوئی ہے۔ اس بنا پر اُن کا مقابلہ اردو کے مشہور شاعر اختر شیرانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ ایک خاص بات جو ان دونوں میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں شاعروں نے (روایات کے خلاف) اپنی محبوباؤں کو نام لے لے کر پکارا ہے۔ اختر نے اپنی محبوبہ کو سلمیٰ، ریحانہ اور مرجانہ کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ یہ اسما عرب شاعری سے ماخوذ ہیں۔ رسول میر نے اپنی محبوبہ کو "گنگی" اور "پوشہ مال" کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ دونوں شاعروں نے اپنی محبوباؤں کے جلووں کو ایک نوجوان کی نگاہوں سے دیکھا ہے اور ان سے متعلق اپنے جذبات کو ایک خوبصورت اور مجموعی طور پر ایک شائستہ زبان میں پیش کیا ہے۔ دونوں شاعروں کے جذبات میں غایت درجہ شدت موجود ہے۔ دونوں شاعر عالم نوجوانی میں چل بسے۔ مگر اس اشتراک کے باوجود ان میں ایک فرق بھی ہے۔ اختر کو محبت کے ساتھ ساتھ تیغ رانی اور ستیزہ کاری کا بھی شوق تھا اور اسی بنا پر ن م راشد نے اُن کو انگلستانِ قدیم کا ایک سرفروش سپاہی (Knight) کہا تھا برخلاف اس کے رسول میر دنیاوی عشق کے ساتھ ساتھ تصوف کا بھی دلدادہ تھا۔ چنانچہ ان کے کلام میں صوفیانہ رجحانات بھی ملتے ہیں۔ اختر کی سلمیٰ زیادہ ابھری ہے۔ اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ "ہاتھ آئے تو اسے ہاتھ لگائے نہ بنے۔" اس کے برعکس رسول میر کی "گنگی" مجاز کے الفاظ میں "اس دنیا کی عورت ہے۔" "گنگی" اور "پوشہ مال" دونوں نام روزمرہ ہیں۔ اس سے واقعیت پر کافی اثر پڑتا ہے۔ رسول میر کے یہاں جذبے کی شدت کا اندازہ کرنے کے لئے ذیل میں کچھ اشعار دئے جاتے ہیں ساتھ ہی ساتھ ان اشعار کی رُوح کی طرف بھی اشارہ ہوگا ترجمہ موزوں نہیں ہوتا۔

ژاہتس مے وتیہ مزار پیہ ام یار وفادار
راتس ہیتہ تہ سیپارہ پرنم چانہِ ولرے
شُتہ وُہ سامانہ، پیرام جانانہ
شُرِ ننہ دار سونہ شنزہ بنگرہ گرتہ چانہِ ولرے

پہلا شعر جذبات کے ساتھ معصومیت کی ایک تصویر بھی پیش کرتا ہے۔ جذبے کی پاکیزگی اور شدت کا اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاعر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بدعا ہے۔ اور قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہے کہ شاید ایسا کرنے سے اس کا محبوب خوش ہو کر آئے۔ یہ اندازِ بیان کشمیری شاعری کی خصوصیت ہے بلکہ یہ لوک گیتوں کی خصوصیت ہے۔ دوسرا شعر ہمارے سماج کی ایک تصویر پیش کرتا ہے۔ عورتیں زیورات کی رسیا ہوتی ہیں۔ دونوں شعروں میں سادگی، جذبات اور عام فہم طرزِ ادا قابلِ دید ہے۔ ردیف میں حرفِ "ل" کی صوتی کیفیت سے گھنگھرو سے بجنے لگتے ہیں۔

ہتے ویسی دِل دّدُم ادم — دزہ نس چارہ کُر تم
لالہ وَن لولہ چھنوک پیوم — چھوکُن بلغاد کوت گوم
رسولن نوش کیاہ دون — سخن دودُگوش تھاوُن

وندِسس نا ٹوٹھہ یاڈوانہ   سۆوَی لوکہ جاد کوٹ گوم

اوّل الذکر شعر ہماری زبان میں ضرب المثل بن گیا ہے۔ اوّل تو اس غزل کی بحر ہی بڑی مترنم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر شدّتِ جذبہ میں کیفِ غم سے سرشار ہو کر اپنی رُوح کی گہرائیوں سے نغمہ زن ہے۔ "لاؤن لول چھوک" کے ٹکڑے کو دیکھئے۔ حرف "ل" کی تکرار نے اس میں موسیقی کی لہریں پیدا کی ہیں۔ "دل دوُدم اوم" میں جذبے کی شدت اپنے پورے عروج پر ہے اور "کوتُو گوم" وہاں بھی کسر پُوری کر دیتا ہے۔ دوسرے شعر کی جان "ٹوٹھہ یاڈون" ہے۔ اس ترکیب کو دیکھ کر مجھے بے اختیار کیٹس یاد آتا ہے جس نے کہا تھا کہ خوبصورتی ایک کو میں ایک عاشق کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ بچپن کے فراق میں یہ شعر کس درجہ پُرتاثیر اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ جذبے کی شدت کا اظہار اس مصرعے میں موجود ہے :-

تھرہ تھرہ چھم مرہ شاید شرمہ دلکی ڈراونے

ترجمہ :- میں تھر تھرا رہا ہوں، شاید مر جاؤں گا۔ (افسوس کہ) میرے دل کے ارمان نہ نکلے۔

تھرہ تھرہ چھم مرہ شاید "کا ٹکڑا قاری کے ذہن میں ایک حسرت زدہ نقش بٹھا دیتا ہے۔ جو کوئی دم میں پریشان ہوا چاہتا ہے۔ ایک اور بند پیش کرتا ہوں -

آشنائی اے صنم   بے وفائی دم بہ دم
دوِن جُدائی چھے ستم   تازہ یارانک قسم

شاعر اپنی محبوبہ سے اس درجہ گھل مل گیا ہے کہ وہ اس کی شدت سے اس بات کا اندازہ کرتا ہے کہ جدائی کس قدر تلخ ہو سکتی ہے۔ یہ وہی "منطق" ہے جو غالب کے اس مصرعے میں ہے :۔ "نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا" یہ شاعرانہ استدلال کی کتنی اچھی مثال ہے۔

غرض جذبے کی شدت رسول میر کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔

رسول میر کے "رَوف" (لوک گیت) ہماری شاعری میں رومانی طرزِ فکر کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان میں جذبے کی شدت، موسیقی کا بدرجۂ اتم لحاظ، خوبصورت الفاظ اور اندازِ بیان اور کہیں کہیں تشبیہات اور استعاروں پر [illegible] زور صرف کیا گیا ہے۔ قبولِ عام ان کی دلکشی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ آج تک ہماری نوجوان لڑکیاں اور جفاکش محنت کش کسان سکونِ قلب کی خاطر ان کو مزے لے لے کر پڑھتے آئے ہیں۔ ان گیتوں میں نمایندگی کرنے والے مندرجہ ذیل ہیں :- (ہر گیت کا صرف پہلا مصرعہ دیا گیا ہے)

رِندہ پوشہ مال گِندنے ڈراپہ لولو
(وہ شوخ پھولوں کی مالا کھیلنے کو دوڑی جا رہی ہے)

روش مے روش ہیے پوشمالیے
(اے پھولوں کی مالا رُوٹھتی کیوں ہو؟)

گرشہتہ دیس اتھی استہ لولو
(اے سکھی جا، اور ہولے ہولے اُس کو بلالو)

اتھ لالر رویس ژورے وچھے نورانہ نے
(میں نے چپکے چپکے تیرے گُلِ لالہ جیسے چہرے پر نور کا ہجوم دیکھا)

"فن برائے فن" اور "فن برائے زندگی" کی بحث ان گیتوں کو پڑھ کر فرسودہ نظر آتی ہے۔ بظاہر یہ سب "فن برائے فن" کی غمازی کرتے ہیں مگر ان کا بے پناہ قبولِ عام اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ ہماری زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا تجربہ ہے کہ ہمارے کسان لوگ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے بلند آواز سے اور جھوم جھوم کر یہ گیت گاتے ہیں۔ اُس وقت میں مجاز کے ساتھ ہی محسوس کرتا ہوں کہ "گردش میں ہیں افلاک زمین گھوم رہی ہے" اسی طرح رمضان شریف کے مہینے میں جب ہماری نوجوان بہو بیٹیاں رسول میر کے گیت گاتی ہیں تو کچھ گیتوں کی اپنی خوبصورتی اور کچھ صنفِ نازک کی رسیلی آواز غرض دونوں مل کر ایک فردوسِ گوش بن جاتی ہیں۔ ان گیتوں میں جذبات سادگی اور خوبصورتی سے نظم ہوئے ہیں۔ موسیقیت ان کی خصوصیت ہے۔ کیونکہ "رَوف" کا مزاج ہی کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ موسیقی طلب ہے۔ "رِندہ پوشہ مال گِندنے ڈراپہ لولو" والے "رَوف" میں ایک اور خاص بات بھی ہے۔ اس گیت میں رسول میر تصویر کش اور صنم تراش دونوں کی حیثیت میں نظر آتا ہے۔ "رَوف" پڑھنے کے بعد ہمارے ذہن میں ایک ایسی لڑکی کی تصویر پیدا ہو جاتی ہے جو خوبصورتی میں پھولوں کی ایک مالا ہے اور جو اٹھکیلیاں کرتی ہوئی کھیلنے کو دوڑنے جا رہی ہے۔ اس کی پرچھائیاں ایسی ہیں کہ شاعر کی زبان سے "مرحبا" اور "شاباش" کے الفاظ بے ساختہ نکل

ترجمہ:۔ تیرے قد سے بہاؤر لرزہ براندام ہوجاتے ہیں اور تیر خم۔ تجھے شمشادِ سیمیں اور سروِ خراماں کہتے ہیں۔ ... ...

... ...

"شمشادِ سیمیں" کی ترکیب اس حسن کی ترجمانی کرتی ہے مگر کمال شائستگی سے۔ اس کے برعکس "سینگِ قبہ" اور "پستان" دونوں ہی محلِ نظر ہیں۔ اور ذوقِ سلیم اِن کی عُریانی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ رومانی شاعروں کے لئے یہ منزل بڑی کٹھن ہوتی ہے۔ کیونکہ یہیں جوانی کے تقاضوں سے مجبور ہوکر اور پھر بے قابو ہوکر اُن سے شائستگی کا دامن چھوٹ جاتا ہے اور رسول میر یہاں اس کا ثبوت پیش کرتے ہیں ۔

یہ غزلیں فارسی تراکیب سے بھری ہوئی ہیں۔ چنانچہ شاعر نے ان غزلوں میں مندرجہ ذیل تراکیب اکثر و بیشتر استعمال کی ہیں :۔

تشنہ لب، سروِ رواں، خورشید رُو، شمشادِ سیمیں، سروِ خراماں، ماہِ مہرباں، راحتِ جاں، غارتِ ایماں، خوبانِ عالم، کج نظر، تیرِ مژگاں، چشمِ مست، چشمِ بادام، موئے میان، پری رُخسار، چشمِ کافر، کبابِ دل وغیرہ وغیرہ۔

ان میں سے بیشتر تراکیب ایسی ہیں کہ کشمیری الفاظ کے ساتھ شیر و شکر نظر آتی ہیں۔ مگر کبابِ دل اور اس قبیل کی کچھ اور تراکیب میں یہ بات نہیں۔ بلکہ بعض اوقات ان کا استعمال گراں گذرتا ہے۔ "کبابِ دل" میں تصنع زیادہ ہے اس کا استعمال اس شعر میں ہُوا ہے :۔

رسولن خونِ جگر چانہ باپت کورنہ شراب
کبابِ دل بُو ژِی کیتھ تھاوِسے تلیو مد نو

ترجمہ:۔ رسول نے تیرے لئے دل کے کباب اور خونِ جگر کی شراب بنائی ہے شاعر کے جذبے سے پُوری ہمدردی رکھتے ہوئے بھی مجھے اس شعر میں سادگی کے بجائے ایک گونہ تصنع نظر آتا ہے۔ رسول میر نے جہاں سادہ جذبات کو روانی کے ساتھ نظم کیا ہے وہاں ایک ایک شعر وجد آور ہے اور جہاں نازک خیالی کی کوشش کی ہے وہاں مقابلتاً کم کامیاب ہیں۔ مثلاً یہ شعر لیجئے :۔

بُتِ رگ باؤشِ، کگک دُور، دِلک محرم شیلک دُور
ہیئیک چھم چشمِ بد دُور، سُو کتہ ہار گوو گوم

قریباً ترجمہ: وہ میرے دل کا محرم، میری رگِ جاں، میرا آویزہ اور دستانہ، چشمِ بد دُور! وہ میرے گلے کا موتیوں کا ہار کہاں گیا؟

جیسا کہ پہلے ہی کہا گیا ہے ہماری بہو بیٹیاں زیورات کی بڑی شوقین ہوتی ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ عورتیں زیورات کو اپنی جان سے زیادہ پسند کرتی ہیں۔ تو یہ شعر واقعی قابلِ تعریف ہے۔ شعر بظاہر عورت کی زبان سے نکلا ہے۔ زبان اور لب و لہجہ بالکل سادہ ہے اور خیال سادہ ہوتے ہوئے بھی بڑی رنگینیوں کا حامل ہے۔ مجموعی طور پہ رسول میر کے کلام میں جذبات نگاری کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہی اُن کی بساطِ شاعری ہے اور بھولے بھالے عوام کے سادہ جذبات کی ترجمانی محمود گامی کے بغیر ان سے بہتر اب تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ موسیقی کا لحاظ کم و بیش ہر غزل اور ہر رَوف میں ملے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رسول میر بھی اختر شیرانی کی طرح جمال دادۂ نغمہ تھا۔ بعض غزلیں جو فارسی تراکیب اور تشبیہات سے بوجھل ہیں، عوام میں رَوف کے مقابلے میں کم مقبول ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ

"طفلِ اشکم را عنت گہوارہ جُنباں اے صنم"

مجموعی طور پر خواص کی چیز ہے۔

رسول میر نے جہاں سلاستِ زبان پر توجہ دی ہے وہاں بہت ہی روانی پائی جاتی ہے۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ رسول میر کی زبان اتنی پیاری نہیں جتنی محمود گامی کی ہے۔ جذبات نگاری میں دونوں یکساں ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ محمود گامی اپنے صوفیانہ مزاج کے باوجود

کرہ یو منز جگر س جاے مہ نو ماے مشہ نی

ترجمہ:۔ اے محبوب آ میرے دل میں سما جا۔ میں تیرا پیار بھول نہیں سکتا!

ایسے رومانی گیت بھی کہہ گیا ہے! یہ ضرور ہے کہ محمود گامی کی کئی غزلیں ہیں جن کے متعدد اشعار فارسی میں ہیں۔ مثلاً "اے ترکِ قبا پوشِ یمن" والی غزل۔

مہجور نے رسول میر کے متعلق کہا تھا ؎

اتھ دردۂ شورش پردہ تُلتھ گو سُو رسول میر
مہجور لاگتھ آو بیہ دُوبارہ اتی روز

ترجمہ:۔ اس درد انگیز صورت سے پہلے پہل رسول میر نے پردہ اُٹھایا تھا اور وہ مہجور کی شکل میں دوبارہ نمودار ہوا ہے۔

چنانچہ ذراسی تلاش سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مہجور رسول میر سے کہاں تک متاثر ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل غزل کو دیکھئے :۔

پوت زُونہ ذرا یس بادہ بل تحسینہ کمان ہتھ دربغل

فندہ اکہ بند گو لول ژدُر   دُر دانہ موہیم دُور دُور

ترجمہ :- پچھلے پہر کی چاندنی میں بیا نگمٹ کی طرف چلنے لگی۔ بغل میں حسن کی توس قزح لئے۔ محبت کا چور ایک خاص ترکیب سے قابو ہوگیا اے دوست مجھ سے دُور نہ رہ۔

اس بند میں رسول میر کا اثر واضح ہے۔ مگر مہجور اس پہ قانع نہیں رہا۔ اُس رنگ کو اُس نے اور ترقی دی۔ چنانچہ اسی غزل کا شعر ہے ؎

پتھہ ون گژھت زاگی ہیی
ہیہ ہی فقرہ تل پادن پیٹھے

یہ مہجور کا مخصوص آرٹ ہے۔ رسول میر کے یہاں یہ چیز نہیں ملتی۔ البتہ محمود گامی کے اس مصرعے میں آپ کو اس کا عکس نظر آئے گا!

"چھتری بونین تلہ وتھراوس"

ترجمہ :- چھتری کی طرح گھنیرے چناروں کے تلے میں اپنے دوست کے لئے فرشِ بچھادوں گا

"چھتری بونین" کتنا پیارا استعارہ ہے اور اس میں کتنی جدت ہے بلکہ شاعر نے صرف اس ٹکڑے سے ایک Landscape کا نقشہ پیش کیا ہے۔ یہ بحث بڑی طویل ہوسکتی ہے۔ اس لئے خوفِ طوالت کی وجہ سے اسی پر بس کرتا ہوں۔ میرے قصبہ اسلام آباد میں (یادش بخیر) ایک جواں مرگ شاعر گذرا ہے جس کی بابت ہمیں بہت کم معلوم ہے۔ اُس کے ایک "رؤف" کا مقطع دیکھئے۔ پس منظر میں رسول میر موجود ہیں۔

تتہ عبداللہ آباد نیو توی   یتہ پوشن کو بوی متوتوی
گراہہ زلفچہ مایہ ڈولمتوہی   باگہ ونتے کوتوی گو

ترجمہ :- عبداللہ اُس دنیا سے اس دنیا میں آکر "پھولوں" پر شیفتہ ہوگیا۔ لہرائی ہوئی زلفوں نے اُس کو اپنا گرویدہ بنایا۔ دوست وہ کہاں چلا گیا؟

آخر میں میں یہی عرض کروں گا کہ رسول میر کے شعری کارنامے پر ہم بجا طور پر ناز کرسکتے ہیں۔ اس کے "سوزِ عاشقی نے شعلہ طراز" نغمے ازل تک ہمارے سینوں کو گرماتے رہیں گے۔ رسول میر نے خود ہی کہا تھا ؎

رسولن نارہ کتاب   دِتھنے چانہ غمے
آسیہ کس تاب ہو آب   جاوہ نے جامِ جمے

ترجمہ :- رسول نے تیرے غم کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ جذبۂ دروں سے سُلگ رہا ہے۔ اس کا جواب ممکن نہیں۔ اے دوست مجھے جامِ جم سے شراب پلا۔

"نارہ کتاب" اُس کی شاعری کی روح کو بخوبی واضح کرتا ہے۔ اشعارِ محبت کے جذبے کی دھیمی دھیمی آنچ سے گویا سُلگ رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح خود رسول میر کا دل غمِ جاناں کی حدت سے سُلگتا تھا۔ خوبصورت محاورے گویا ترشے ہوئے ہیرے ہیں۔ رسول میر دل کی بات بہ طریقِ احسن بیان کرگیا ہے۔ اس میں روانی ہے اور تصنع بہت کم۔ "نارہ کتاب" - "توٹھ یاوُن" - "للہ ون ولہ چھوک" اور اسی قسم کے انمول ٹکڑوں کا خالق ہمارا کیٹس ہے اور جذبے کی شدت اور یادِ محبوب میں اپنی عمرِ عزیز صرف کرنے والا ہمارا اختر شیرانی ہے۔ خدا اُس کے بے قرار دل کو ابدی سکون عطا کرے!

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

[یہ مضمون جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کلامِ رسول میر پر صرف ایک نظر ہے۔ اور مصنف کے ذہن میں شاعر سے متعلق تفصیلی مطالعے کا صرف ایک خاکہ ہے۔

شری شیام لال صراف
وزیر تعلیم و صحت

تعلیم ـ کارنامے اور منصوبے

۱۵ اگست ۱۹۵۸ء ریاست کی تعلیمی ترقی میں ایک اہم سنگِ میل ہے۔ جب ہم پچھلے گیارہ سالوں کا جائزہ لیتے ہیں جب کہ ہمارا ملک آزاد ہوا تو ہمیں یہ دیکھ کر ذہنی تسلی ہوتی ہے کہ ان تمام مشکلات کے باوجود جن سے ریاست کو پاکستانی حملہ کے باعث دوچار ہونا پڑا ریاست تعلیمی ترقی میں پچھڑی نہیں رہی ہے۔ جو کامیابی اس میدان میں ہمیں حاصل ہوئی ہے اُس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

گیارہ برس پہلے ہماری ریاست تعلیمی لحاظ سے بہت پیچھے تھی۔ خواندگی کا یہ حال تھا کہ مردوں میں چھ فی صدی پڑھے لکھے تھے اور عورتیں کثر ان پڑھ تھیں۔ چالیس لاکھ آبادی کی تعلیم کے لئے صرف ۲۵ لاکھ روپے سالانہ کی رقم مخصوص تھی۔ سکولوں کی تعداد صرف ایک ہزار کے قریب تھی اور تمام ریاست میں صرف تین کالج تھے۔ چنانچہ ہمارے سامنے یہ ایک مشکل کام تھا۔

۱۹۵۳ء میں حکومت نے ایک اہم قدم اُٹھایا۔ کنڈر گارٹن سے یونیورسٹی درجہ تک ٹیوشن فیس معاف کر دی۔ اس مفت تعلیم نے عوام کے تئیں ایک ولولہ پیدا کر دیا۔ کیونکہ اپنی غربت کی وجہ سے عوام فیس ادا کرنے کے قابل نہ تھے اور نتیجے کے طور پر اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلوا سکتے تھے۔ ریاست کے مختلف کونوں سے سکولوں اور کالجوں کے لئے تیزی سے مانگیں آنے لگیں۔ ان مانگوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کیا گیا اور ریاست میں جابجا تعلیمی ادارے قائم کئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک لاکھ تیس ہزار روپے طلبا اور طالبات کو مفلسی اور قابلیت کے لحاظ سے وظائف کے طور پر دئے جاتے ہیں۔ لداخ کے سرحدی اضلاع کے طلبا کے لئے مزید دس ہزار روپے کی امدادی رقم مخصوص ہے۔ ریاست کے ٹریننگ سکولوں اور کالجوں سے ہر سال ۱۵۰۰ اساتذہ اپنی تربیت مکمل کرتے ہیں۔ سکولوں کی عمارتوں کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں عوام کا تعاون قابلِ ستائش ہے۔ عمارتوں کی تعمیر کا کام جہاں محکمہ پبلک ورکس سرانجام دیتا ہے وہاں تحصیل پبلک

تعمیر

کمیٹیوں کے ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ سکولوں کی عمارتوں کے لئے دس لاکھ روپیہ رکھا گیا ہے جس میں سے ڈھائی لاکھ روپیہ ان تحصیل پبلک کمیٹیوں کے ذریعہ خرچ کیا جائے گا۔ اب اکثر سکولوں کے پاس اپنی اپنی عمارتیں ہیں جنہیں محکمہ تعلیم نے تعمیر کرایا ہے۔ سالِ رواں میں حکومت نے ایک اور سکیم منظور کی ہے جس کے تحت ریاست کی ۲۹ تحصیلوں میں پرائمری سکولوں کے لئے نمونہ کی عمارتیں تعمیر ہوں گی اور حکومت ہر بلڈنگ کے لئے ۱۵۰۰ روپیہ کی امداد مہیا کرے گی۔

بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے پرائمری اور سکنڈری تعلیمی ڈھانچے کی ازسرِ نو تنظیم کی گئی۔ اس احساس کے پیشِ نظر کہ سکولوں اور کالجوں کی تعداد میں اضافہ لانے سے ہی تعلیمی معیار بلند نہیں ہو سکتا ہے، حکومت نے اکثر تعلیمی اداروں میں قابل اور تجربہ کار سٹاف کے علاوہ لیبارٹریاں، سائنسی سامان، لائبریریاں اور کھیلنے کے میدان کی ضرورت کو پورا کرنے کی طرف توجہ دی۔

تعلیم کو مؤثر بنانے کے لئے ٹیکنیکل مضامین پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ریاست میں آٹھ جامع المقاصد ہائر سیکنڈری سکول کھولے گئے جہاں سے طلبا کامرس، بک کیپنگ، سٹینوگرافی، زراعت، گھریلو سائنس، بجلی، اُونی اور سُوتی بُنائی وغیرہ سے متعلق تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایسے سکولوں میں لڑکیوں کے لئے ہائر سیکنڈری سکول بھی شامل ہیں جو سری نگر میں واقع ہے۔ ان تعلیمی اداروں کو تربیت یافتہ سٹاف کے تحت کرنے کی غرض سے بہت سے ہیڈ ماسٹروں اور ہیڈ مسٹریسوں کو بیرونی ممالک میں تعلیم اور ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔

تعلیمِ نسواں کے شعبہ میں ترقی کی رفتار قابلِ ستائش رہی ہے۔ جب کہ ۱۹۵۳-۵۴ء میں صرف نو (۹) گرلز ہائی سکول تھے۔ ۱۹۵۶-۵۷ء میں اس کے مقابلہ میں ۲۵ گرلز ہائی سکول ہیں۔ ۱۹۵۳-۵۴ء میں کالج میں تعلیم پانے والی

لڑکیوں کی تعداد صرف ۳۶۲ تھی۔ لیکن اس کے مقابلہ میں آج کالجوں میں لڑکیوں کی تعداد ۹۰۰ سے تجاوز کر گئی ہے۔ اس طرح ۱۹۵۳ - ۵۴ء میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کی نسبت ۱ : ۵ تھی وہاں آج صرف ۱ : ۳ رہ گئی ہے۔

ریاست میں ایک اور تعلیمی ترقی کا نمایاں پہلو ٹیکنیکل تعلیم کا اجرا ہے اس غرض کے لئے پولی ٹیکنیک کالج سری نگر میں کھولا گیا ہے۔ جہاں سول میکنیکل اور الیکٹریکل انجینئرنگ کی تعلیم دی جائے گی۔ یہ کالج آل انڈیا کونسل آف ٹیکنیکل ایجوکیشن کے طریق کار پر چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ دو ٹیکنیکل سکول ایک جموں اور دوسرا سری نگر میں کھولے گئے ہیں جہاں سے آرٹس اور کرافٹس کی تربیت مہیا کی جا رہی ہے۔

طلبا کی جسمانی صحت کی طرف بھی خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ جسمانی ورزشوں کے لئے ہر سال مختلف سنٹروں پر کیمپ لگائے جاتے ہیں جہاں پر زونل، انٹرزونل اور انٹر پرانشل کھیلوں کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ ریاست میں سکاوٹنگ کا سلسلہ پھر سے شروع کیا گیا ہے جس میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے۔ سال رواں کی بجٹ میں اس شعبہ کے لئے دس ہزار روپے وقف کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ نیشنل کیڈٹ کور اور آگزلری کیڈٹ کور میں بھی طلبا اور طالبات کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ اب نیشنل کیڈٹ کور میں ۲۴ آفیسر ہیں جن میں ۱۳ گریژ آفیسر شامل ہیں اور ۱۳۷۷ کیڈٹوں میں ۴۰۰ سے زائد لڑکیاں ہیں۔ حال ہی میں چار نیشنل کیڈٹ کور کی طالبات نے ہندوستانی فوج میں کمیشن حاصل کیا ہے اور بہت سے کیڈیٹوں نے بھی کمیشن حاصل کیا ہے۔

تیراکی اور کشتی بانی کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے اور ہر سال سری نگر میں رگیٹا اور دیگر کھیلوں کا کام ہوتا ہے۔ حکومت کی طرف سے گلمرگ میں ایک بڑی بلڈنگ محکمہ تعلیم کے حوالے کی گئی ہے جہاں موسم گرما میں ریاست کے مختلف کونوں سے آنے والے طلبا کے یوتھ کیمپ لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ پہلگام، چترنار اور اچھ بل کے مقامات پر بھی یوتھ کیمپ لگائے جاتے ہیں۔ جموں اور سری نگر کی دو بڑی بلڈنگوں کو یوتھ ہوسٹلوں میں تبدیل کیا گیا ہے جو کہ یوتھ ہوسٹل ایسوسی ایشن آف انڈیا کے ساتھ ملحق کئے گئے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے ریاست میں آنے والی طلبا کی پارٹیاں ان ہوسٹلوں کا استعمال کرتی ہیں۔

ہماری ریاست کے سکولوں اور کالجوں سے مختلف پارٹیاں ہر سال تعلیمی معلومات حاصل کرنے کی غرض سے بھاکڑا، ننگل، امرتسر، دہلی، آگرہ، بمبئی اور مدراس جیسے تاریخی مقامات دیکھنے کے لئے بھیجی جاتی ہیں۔

حکومت ہند کی وزارت تعلیمات کی طرف سے نیشنل ڈسپلن سکیم کے تحت ۱۲۱ انسٹرکٹر اور سینئر سٹاف ریاست کے ہائی سکولوں میں پچھلے سال سے تعینات ہے۔ ٹیچرس ٹریننگ کالج سری نگر میں قومی توسیعی پروجیکٹ، آل انڈیا کونسل فار سیکنڈری ایجوکیشن کی پائلٹ پروجیکٹ سکیم کے تحت شروع کیا گیا تھا۔ اس کی میعاد دسمبر ۱۹۵۸ء تک بڑھا دی گئی ہے اور حکومت نے اس سکیم کو دوسرے منصوبہ کے آخر تک چالو رکھنے کی منظوری دی ہے۔ اس سکیم کے دائرہ میں آنے والے سکولوں کے کام کاج میں کافی اثر پڑا ہے اور اساتذہ کو کافی فائدہ پہنچا ہے۔

تمام ریاست میں طلبا اور دیگر لوگوں کی ضرورت کے لئے لائبریریوں کی سروس کو وسعت دی گئی ہے۔ حکومت کی طرف سے ریاست میں سات ڈسٹرکٹ لائبریریاں قائم کی جائیں گی۔

جولائی ۱۹۵۰ء میں محکمہ ہذا نے آل انڈیا سروے کے تحت تعلیمی ضروریات کو دیکھنے اور صحیح اعداد و شمار حاصل کرنے کے لئے جامع سروے شروع کروایا جو کہ مکمل ہو چکا ہے۔ نقشے اور چارٹ تیار کئے گئے ہیں جن میں سکولوں کی موجودگی اور متصل میں واقع جگہوں کی اطلاعات درج ہیں۔ سروے میں طلبا کی آبادی اور سکولوں کے لئے مخصوص جگہوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جس سے مستقبل میں تعلیمی پلان کو روبہ کار لانے میں بڑی مدد ملے گی۔

تعلیمی اخراجات میں ۱۹۴۷ء کے مقابلہ میں چھ سو فیصدی کا اضافہ ہوا ہے اب تعلیم پر ۱۵۰ لاکھ روپیے سالانہ خرچ ہو رہے ہیں۔

پہلے پنج سالہ پلان کے دوران محکمہ تعلیم نے کامیاب اقدامات اٹھائے ہیں جس سے خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے اور تعلیم کو مخصوص طبقوں سے عام لوگوں تک لایا ہے جس کا اندازہ ان اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے:-

کالج ۵، ٹیچرس ٹریننگ سکول ۳، ہائی سکول ۲۹، مڈل سکول ۴۸، لوئر سکول ۱۴، پرائمری سکول ۵۰۰، سنٹرل سکول ۶۷، مکتب اور پاٹھ شالائیں ۹۵

دوسرے منصوبہ کے دوران تعلیمی میدان میں ترقی کے نشانے یہ ہیں:-

بیسک ایکوٹی سکول ۱۵۰۰ کھولنے، ۳۵ ہائی سکولوں کو ہائر سیکنڈری سکولوں میں بدلنا۔ ۳۵ مڈل سکولوں کو ہائی سکولوں کا درجہ دینا۔ ایک سو پرائمری سکولوں کو مڈل کا درجہ دینا۔ اس کے علاوہ چھ پوسٹ میٹرک ٹریننگ سکول کھولے جائیں گے۔

انورؔ معینی اجمیری

وادئ کشمیر

شاہکارِ دستِ قدرت وادئ کشمیر ہے
اصل میں دنیا کی جنت وادئ کشمیر ہے

سر اٹھائے ہر طرف استادہ ہیں سرو و چنار
دیکھئے جس سمت آتی ہے نظر رقصاں بہار
ذرہ ذرہ صانعِ قدرت کا ہے اک شاہکار
جنت الفردوس ہے کشمیر تیرا لالہ زار
عکسِ حسنِ روئے فطرت وادئ کشمیر ہے
اصل میں دنیا کی جنت وادئ کشمیر ہے

گنگناتی وادیاں جیسے صدائے ارغنوں
چشمۂ ڈل مادرِ گیتی کی چشمِ نیلگوں
یہ فضائے نور ہے لاریب درمانِ جنوں
روح و دل کی بے قراری کے لئے وجہِ سکوں
الغرض رحمت ہی رحمت وادئ کشمیر ہے
اصل میں دنیا کی جنت وادئ کشمیر ہے

آبشاروں کا ترنم سرد چشمے اور ڈل
سبزہ و گل جیسے فطرت کی اچھوتی سی غزل

کون سمجھے کون جانے اس کے اسباب و علل
شعر کے سانچے میں کیسے ڈھل گئے دشت و جبل
شعر و نغمہ کی لطافت وادئ کشمیر ہے
اصل میں دنیا کی جنت وادئ کشمیر ہے

ہر طرف بکھرے ہوئے جلووں کا اک طوفان ہے
ہر تجلی میں نہاں گویا خدا کی شان ہے
ہر صباحت دعوتِ نظارہ کا ساماں ہے
ہر نظارہ واقعی غارت گرِ ایماں ہے
مرکزِ حسن و محبت وادئ کشمیر ہے
اصل میں دنیا کی جنت وادئ کشمیر ہے

بہرِ عارف دفترِ عرفاں ہے ہر برگ و شجر
حاملِ اسرارِ قدرت اس کی ہر شام و سحر
رنگ و بو کا راز یہ خطہ ہے قصہ مختصر
جس حقیقت تک نہیں پہنچی حقیقت بیں نظر
درحقیقت وہ حقیقت وادئ کشمیر ہے
اصل میں دنیا کی جنت وادئ کشمیر ہے

ہر شجر کا پتہ پتہ پیکرِ اعجاز ہے
ہر کلی ہر پھول جیسے حاملِ صد راز ہے
کیوں نہ ہو کشمیر پر ہندوستان کو ناز ہے
انفرادی شان کا حامل ہر اک انداز ہے

تیرے ہر پہلو میں ندرت وادیٔ کشمیر ہے
اصل میں دُنیا کی جنت وادیٔ کشمیر ہے

لذتِ تخئیل کا دھوکا میں کھا سکتا نہیں
جھوٹی آشا کے دیئے من میں جلا سکتا نہیں
عشرتِ موہوم کو خاطر میں لا سکتا نہیں
میں فریبِ جنتِ زاہد میں آ سکتا نہیں

جب تلک اے انورؔ سلامت وادیٔ کشمیر ہے
اصل میں دُنیا کی جنت وادیٔ کشمیر ہے

(بقیہ نظم "ہم کشمیر کے رکھوالے ..." (صفحہ ۴ سے آگے)

وقت ہے اب بھی ہوش میں آؤ، غور کرو اے دیوانو
اب بھی اپنے آپ کو دیکھو، اب بھی ہم کو پہچانو
تم ایسے سرکش دیوانے اپنے دیکھے بھالے ہیں
ہم کشمیر کے رکھوالے، آزادی کے متوالے ہیں
ہم اپنا مستقبل بھی ہیں، ہم اپنی تقدیر بھی ہیں
راگ بھی ہیں ہم آگ بھی ہیں ہم ساز بھی ہیں شمشیر بھی ہیں
ایک ہاتھ میں نیزا بھالا، ایک میں پھولوں کی مالا
ہم کشمیر کے رکھوالے، کشمیر ہمارا رکھوالا

صابر نعمت اللہ
(آئی، اے، ایس)

حقیقت کیا ہے؟
سائنس دان کی نظر میں!

حقیقت کیا ہے؟ یہ سوال دنیا کا سب سے زیادہ کٹھن اور پریشان کن سوال ہے۔ اس لئے نہیں کہ یہ کوئی ایسا لاینحل معمہ ہے جو انسانی ذہن کی گرفت میں نہیں آسکتا بلکہ اس لئے کہ حقیقت کی تلاش سے پہلے خود حقیقت کا تصور قائم کرنا پڑتا ہے اور یہ "تصور" قائم کرنے کے لئے ہمیں اپنی خارجی دنیا سے تاثر قبول کرنا پڑتا ہے۔ ہماری یہ خارجی دنیا اتنی تیزی سے بدلتی رہتی ہے کہ زمان و مکان کا کوئی واضح تصور ممکن ہی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود حقیقت کا تصور بھی بدلتا رہتا ہے اس طرح حقیقت کا تصور ہر دور اور ہر زمانے میں مختلف رہا ہے۔ اور جب تک یہ دنیا قائم رہے گی، حقیقت کی تعبیریں اور تفسیریں بدلتی رہیں گی۔ حقیقت مطلق کی تلاش تو انسان کی ازلی خواہش ہے لیکن حقیقت کی نوعیت اور اس کا تصور چونکہ ہر لمحے بدلتا رہتا ہے اس لئے دنیا میں کسی ایسی مطلق حقیقت کا وجود ممکن ہی نہیں جو انسانی شعور و ادراک کی گرفت میں آسکے۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر ہزاروں مفکروں، مذہبی رہنماؤں، سائنس دانوں، ریاضی دانوں اور سماجیات کے ماہروں نے حقیقت کی مختلف تعبیریں کی ہیں۔ ان میں سے ہر کوئی حقیقت کا ایک مخصوص اور محدود تصور رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کثرتِ تعبیر سے یہ سارا خواب پریشان ہو کر رہ گیا ہے۔ مذہبی رہنماؤں نے ایک مطلق حقیقت کی طرف اشارات کئے ہیں لیکن اس حقیقت کے ادراک کے لئے بھی ان حقیقتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے جو ہر لمحے بدلتی رہتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اس مطلق حقیقت تک پہنچنے سے پہلے ہمیں ان بدلتی ہوئی حقیقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو ہمارے شعور و ادراک کو بھی متاثر کرتی ہیں اور اس طرح اس مطلق حقیقت کے متعلق بھی ہمارے تصورات بدلتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں اس مطلق ہستی کا تصور بھی مختلف ہے جسے ہم تعبیر ذاتِ خداوندی سے تعبیر کرتے ہیں۔ شاعر کے ذہن میں حقیقت کا تصور بالواسطہ طور پر قائم ہوتا ہے، یعنی اس کا ذہن براہِ راست اثر قبول نہیں کرتا، بلکہ وہ اپنے مشاہدے کو اپنی تخیل کی بھٹی میں پگھلا کر اس سے مختلف سانچوں کے خوبصورت اور دل آویز گل بوٹے بناتا ہے، وہ اپنی خارجی دنیا سے متاثر ضرور ہوتا ہے، لیکن اس سے مغلوب نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کے ہاں حقیقت کا تصور دراصل اس داخلی دنیا کا پرتو ہوتا ہے، جس کے خواب وہ دیکھتا رہتا ہے۔ غرضیکہ شاعر کے ہاں حقیقت کا تصور اس کے خوابوں کی پیداوار ہوتا ہے۔ فلسفی خارجی حقیقتوں کا مشاہدہ کر کے اپنے تخیل کی مدد سے ایک نئی حقیقت کے تار و پود بنتا ہے اور پھر اس تخیلی حقیقت کو بنیاد بنا کر حقیقت کی تلاش شروع کر دیتا ہے، وہ حقیقت سے زیادہ حقیقت کے وجود میں آنے کے عمل پر زیادہ زور دیتا ہے اور مختلف حقیقتوں کے باہمی ربط اور مجموعی کردار سے بحث کرتا ہے۔ غرض صوفی ہو یا شاعر، ادیب ہو یا فلسفی سبھی حقیقت کا تصور ایک ایسے [illegible] سے کرتے ہیں جس سے حقیقت مختلف رنگوں میں بکھر کر دل آویز تو بن جاتی ہے لیکن اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہتی۔

حقیقت کے متعلق سائنس دان کا نظریہ سب سے زیادہ حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ دنیا میں کسی مطلق حقیقت کا کوئی وجود نہیں ہے اور کوئی حقیقت مستقل اور پائدار نہیں، یہی نہیں بلکہ حقیقت بجائے خود بدلتی رہتی ہے اور ایک حقیقت کے بدلنے سے دوسری حقیقتیں متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ سائنس دان حقیقت کا جائزہ ایک مخصوص نقطۂ نظر سے لیتا ہے۔ وہ سب سے پہلے حقیقت کے وجود میں آنے کے اسباب دریافت کر لیتا ہے، پھر اس کے وجود میں آنے کے عمل کا مطالعہ کرتا ہے اور اس عمل میں حصہ لینے والے اجزائے

ترکیبی کو جانچتا ہے، اس کے بعد وہ اس حقیقت کی مخصوص کیفیات اور خصوصیات پر توجہ دیتا ہے۔ اردگرد کی حقیقتوں سے اس کے باہمی ربط پر غور کرتا ہے۔ یہ طریقہ Synthesis کہلاتا ہے اور یہ طریقہ حقیقت کے وجود میں آنے کے عمل کو اچھی طرح واضح کرتا ہے۔ دوسرا طریقہ Analysis کہلاتا ہے۔ اس میں ایک حقیقت کو اس کے اجزائے ترکیبی میں بانٹ دیا جاتا ہے اور اسی طرح ان بنیادی عناصر کی خصوصیات اور ان کی جوہری فطرت (Atomic nature) کا مطالعہ کیا جاتا ہے تاکہ حقیقت کی مجموعی خصوصیات کا مطالعہ اس کے اجزائے ترکیبی کی انفرادی خصوصیات (Properties) کی روشنی میں کیا جا سکے۔

غرضیکہ سائنس دان کے ذہن میں حقیقت کا تصور اس وقت قائم ہوتا ہے جب وہ اس حقیقت کے اجزائے ترکیبی کا مطالعہ کر کے ان کے باہمی ردِعمل سے وہ ہیولیٰ تیار کر سکے، جو حقیقت کو جنم دے سکے، وہ اپنے اس مطالعے میں تخیل کی بجائے ٹھوس مشاہدے سے کام لے کر کچھ نتیجے اخذ کر لیتا ہے اور ان نتائج کو بنیاد بنا کر اپنی تحقیق شروع کر دیتا ہے۔ یعنی سائنس دان کسی نئی حقیقت کو تسلیم کئے بغیر حقیقت کو جانچتا ہے اور اس کی جانچ میں اس کی اپنی داخلیت کی بجائے حقیقت کی داخلیت پر زور دیا جاتا ہے۔ اسی ایک نکتے پر حقیقت سے متعلق اس کا تصور صوفی، شاعر اور فلسفی سے مختلف ہو جاتا ہے جو حقیقت کی خارجیت کو اپنی داخلیت کے تابع کر دیتے ہیں۔ سائنس دان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کوئی حقیقت خود بخود وجود میں نہیں آتی ہے بلکہ کچھ اور چھوٹی چھوٹی حقیقتیں اسے وجود میں لے آتی ہیں۔ اور ان چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کا مطالعہ کئے بغیر اس بڑی حقیقت کا تصور صحیح طور پر قائم نہیں ہو سکتا۔ مثلاً بادلوں کا بارش بن کر برسنا ایک حقیقت ہے لیکن یہ کوئی مطلق حقیقت نہیں ہے۔ اس حقیقت کے وجود میں پانی کا سورج کی گرمی سے گرم ہونا، بخارات بننا، بخارات کا بلندیوں پر جا کر پہاڑوں سے ٹکرانا سب کچھ شامل ہے۔ سائنس دان کے لئے بارش کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ان تمام چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے جو اس بڑی حقیقت کے عناصر ترکیبی ہیں۔ اور پھر سائنس دان کے لئے کوئی حقیقت مستقل وجود نہیں رکھتی ہے۔ ان کی حیثیت اضافی ہوتی ہے۔ مثلاً آگ کی حدت بجائے خود ایک حقیقت ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی ایک اضافی نتیجہ

حقیقت ہے۔ آگ کی حدت کا اندازہ آپ گرد و پیش کی حدت کا اندازہ کئے بغیر نہیں کر سکتے۔ اگر گرد و پیش کی فضا کا درجۂ حرارت کم ہے تو اسی تناسب سے آگ کی حدت میں اضافہ ہو گا۔ اور اگر گرد و پیش کی فضا کا درجۂ حرارت آگ سے زیادہ ہے تو آگ کی حدت آپ کو محسوس نہ ہو گی بلکہ آپ اسی نسبت سے آگ کی حدت کو سردی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہی اصول سردی کی شدت کا اندازہ کرنے پر بھی لاگو ہو سکتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سائنس دان کے لئے کوئی حقیقت مطلق نہیں ہے بلکہ حقیقتیں ایک اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے گرد و پیش کے ماحول کے بدلنے کے ساتھ ساتھ ان سے متعلق سائنس دان کا تصور بھی بدلتا رہتا ہے اور پھر چونکہ انسان کا ذہن اپنی لامحدود وسعتوں کے باوجود محدود ہوتا ہے، اس لئے سائنس دان کے لئے کوئی حقیقت ابدی اور آخری نہیں ہے۔ اگر زمین کا چپٹا ہونا سائنس دان کے لئے کبھی حقیقت کی حیثیت رکھتا تھا تو آج زمین کا گول ہونا ہی حقیقت ہے۔ کیونکہ تجربے اور مشاہدے نے ثابت کر دیا ہے کہ زمین گول ہے۔ سائنس دان کے تصورات کی اساس چونکہ تجربے اور مشاہدے پر ہی ہوتی ہے اس لئے وہ ان نتائج کو صرف اس لئے نہیں جھٹلاتا کہ ان سے ایک سابقہ حقیقت کی تکذیب ہوتی ہے۔ سائنس دان کے لئے وہی دلیل اور وہی فیصلہ قابل قبول ہے جو ٹھوس تجربے اور مشاہدے کے معیار پر پورا اترے۔ حقیقت کے متعلق سائنس دان کو جو چیز دوسرے لوگوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی حقیقت کے ساتھ سائنس دان کا لگاؤ جذباتی یا ذاتی نہیں ہوتا۔ وہ حقیقتوں کو بدلتی ہوئی دنیا کے ردِعمل سمجھ کر ہر اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے جو اپنے وجود کو منوا سکے، خواہ اس سے کسی دوسری حقیقت کی تکذیب ہوتی ہو یا نہ ہو۔

Synthesis اور Analysis دو مقررہ معیاروں پر پوری اترنے والی حقیقت سائنس دان کے لئے اس وقت تک ایک حقیقت رہتی ہے جب تک کوئی دوسرا اصول یا کوئی دوسری حقیقت اس کی تکذیب نہ کرے۔ نیوٹن کے قوانین حرکت جب تک بدستور قائم رہے جب تک کہ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت نے ان کی ترمیم کی ضرورت محسوس کی۔ آج سائنس کی دنیا کی سب سے بڑی حقیقت آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت ہے اور دنیا میں کوئی ایسا سائنس دان موجود نہ ہو گا جو نظریۂ اضافیت کو صرف اس لئے ماننے سے انکار کر دے کہ اس سے کچھ تسلیم شدہ حقیقتوں کی تکذیب ہوتی ہے۔

(بقیہ بر صفحہ ۴۳)

آئی بھٹناگر

کشمیر کی نئی صنعت

قدرت ریاست جموں و کشمیر کو صنعتی امکانات عطا کرنے میں ہمیشہ فیاض رہی ہے۔ جغرافیائی نقطۂ نظر، دستکاری، روایات اور ریاست کی خوشگوار، موافق آب و ہوا، صنعتوں کی وسیع ترقیات، نشو و نما اور ارتقا کو بہت ممکن بنا دیتے ہیں۔ ان سب عناصر کو سائنس کے موجودہ طریقوں سے اور دورِ جدید کی کلوں کے ذریعے استعمال کرنے کے بعد ریاست کی نمایاں ترقی میں کوئی شک نہیں۔

جنگلات ریاست کا سب سے بڑا قومی اثاثہ ہیں۔ یہ خود ہی صنعتی ترقی کے لئے روشن شاہراہیں ہیں۔ بدقسمتی سے سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے صنعت میں پرانے احکام و قواعد کی وجہ سے جو عمارتی لکڑی حاصل ہوتی تھی بہت کم لکڑی حاصل ہوئی۔ ریاست کی عمارتی لکڑی کو ریاست میں اچھے طریقوں سے استعمال کرنے کی بجائے صوبہ پنجاب کی کئی جگہوں پر لٹھوں کی صورت میں اور دریاؤں کے ذریعے برآمد کر دیا گیا۔ جہاں وہ سامانِ منقولہ کے لئے استعمال کی گئی۔

پہلے پہل سنہ ۱۹۵۱ء میں ریاست کی حکومت نے دروازوں اور کھڑکیوں کے بنانے کے لئے لکڑی کے کام کی ایک مل بنانے کا منصوبہ منظور کیا۔ سویڈن کی سٹین برگ کارپوریشن اس سکیم کی ضامن تھی (سویڈن دنیا میں کلوں کی ساخت اور جنگلات کی صنعت کے لئے ایک ممتاز و منفرد حیثیت رکھتا ہے)۔ اس کارپوریشن نے کلوں کی ریاست میں درآمد اور مکمل طور پر چلانے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ اس کارپوریشن نے جنگلات کے ایک افسر اور کلوں کے متعلق ایک انجینئر کی تربیت کے لئے بھی وعدہ کیا۔

نتیجے کے طور پر لکڑی کا سامان بنانے والی مل سری نگر سے سات میل دور پانپور میں قائم کر دی گئی۔ فیکٹری کی تعمیر میں بہت عرصہ لگا۔ اور ابھی فیکٹری کی عمارت مکمل نہ تھی کہ کافی لکڑی کو کاٹا اور بنایا گیا۔ تاکہ وہاں پر کام کرنے والے لوگ کچھ تربیت پا جائیں۔ اصل میں فیکٹری میں چیزوں کا بننا ستمبر سنہ ۱۹۵۴ء میں ہی شروع ہو سکا تھا۔

یہ مل دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر تعمیر کی گئی ہے۔ اس جگہ پر سڑکوں کے

تعمیر

علاوہ دریائی آمد و رفت بھی سارا سال ممکن ہے۔ سٹین برگ کارپوریشن نے اس مل کے بارے میں ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ یہ جگہ مقامی آب و ہوا کے مطابق چُنی گئی ہے جس کا چیزوں کی بناوٹ پر جغرافیائی، اقتصادی، ملکی اور سیاسی پہلو سے بہت زیادہ اثر ہے۔ علاوہ ازیں یہ جگہ دریائی طوفانوں کی زد سے باہر ہے۔ مل کی جگہ کے ساتھ ساتھ کچھ اراضیات مخصوص کر لی گئی تھیں جہاں پر سٹاف اور مزدوروں کے رہنے کے مکان، ایک پلائی ووڈ فیکٹری اور لکڑی کے صاف کرنے کی فیکٹری تعمیر ہوں گی۔

یہ مل ہندوستان میں اپنی قسم کی پہلی مل ہے۔ یہ ایک عجیب صنعتی مہم ہے۔ کیونکہ یورپ اور شمالی امریکہ کے علاوہ اس قسم کی صنعتیں دنیا کے دوسرے حصوں میں بہت کم ہیں۔ یہ مل جدید سائنس کے آلات سے آراستہ ہے اور ۳۶۰۰۰ دروازے اور اتنی ہی کھڑکیاں اس مل میں بن سکتی ہیں۔ یعنی ہر سال ۳۵ لاکھ روپے کا سامان یہاں تیار کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال دروازوں اور کھڑکیوں کے علاوہ مل میں چائے کی ٹرے، اسلحہ کے بکس، فرشی تختے اور تہہ دار شہتیر جو آزاد کھمبوں میں استعمال ہوتے ہیں، بھی تیار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مل میں اپنی خواہش کے مطابق خاص نقش کی چیزیں اور کسی بھی ابعادِ ثلاثہ کا سامان بنوایا جا سکتا ہے۔

خام مال کے وسیع امکانات، کلوں کی اچھی ساخت اور سستی مزدوری کی وجہ سے مل اپنے خریداروں کو عمارتی لکڑی خام حالت میں یا تکمیل کی صورت میں سستے داموں پر مہیا کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ مل میں چیزوں کو معمولی شرح کے عوض خریدار کے دروازے تک بھی پہنچایا جاتا ہے اور سامان لے جانے میں مل چیزوں کی ضامن ہوتی ہے۔ معمولی شرح کی وجہ سے خریدار کو ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ یہ سامان اُسے مہنگا پڑ رہا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ خریدار کو مندرجہ ذیل اور بھی سہولیات مہیا کی جاتی ہیں:۔

(۱) وہ اپنی پسند کی عمارتی لکڑی خرید تا ہے۔
(۲) اُسے اعلیٰ طریقہ سے سامان تیس کرکے دیا جاتا ہے۔
(۳) ساز و سامان پر بہترین پالش ہوتی ہے جو وہ اپنی خواہش کے مطابق کروا سکتا ہے۔

ان سب وجوہات سے مِل میں تیار شدہ سامان بہت مضبوط ہوتا ہے اور اس کے علاوہ ہندوستان میں بہترین قسم کی عمارتی لکڑی سیاہ رس دیودار (Cedrus - Deodar) سامان میں استعمال ہوتی ہے۔ اس لکڑی کو پہلے عمل نمی (water seasoning) کے لئے رکھا جاتا ہے تاکہ جبر آرہ کشی کی جائے۔ عمارتی لکڑی کو منی سفید لکڑی کے کیڑوں (دیمک وغیرہ) اور علم نباتات کے سماروغ (ایسی چیزیں جو لکڑیوں میں کسی موسم میں دفعۃً پیدا ہو جائیں) سڑنے گلنے اور خود بخود خراب ہونے سے بچانے کے لئے سائنس کے جدید طریقوں یعنی دباؤ اور کچھ اور مخصوص کیمیائی عناصر سے نہایت مستحکم بنا دیا جاتا ہے۔ یہ عمل نہ صرف سامان کی زندگی کو تقویت دیتے ہیں بلکہ گرم سیر ہواؤں کا مقابلہ کرنے کی بھی اُن میں پوری طاقت آجاتی ہے۔ دوبارہ آرہ کشی سے پہلے خام جنس کو بھاپ کا عمل دیا جاتا ہے۔ اور پھر مشینوں کے ذریعے اس کو سامان میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ مِل میں کام چیتاں چہ مندرجہ ذیل مختلف محکمہ جات میں تقسیم کیا گیا ہے:۔

(۱) لمبے تالاب اور آرہ کشی کا محکمہ
(۲) عمارتی لکڑی کو اکٹھا کرنے کا محکمہ
(۳) لکڑی کو مستحکم و مضبوط بنانے کا محکمہ
(۴) لکڑی کو کسی خاص شکل میں کاٹنے اور ڈھالنے کا محکمہ
(۵) مشینوں یعنی کلوں کا محکمہ
(۶) سامان جمع کرنے کا محکمہ

اس کے علاوہ کلوں کے کچھ اور حصے ہیں۔

(۱) گرم کرنے کا سینٹر
(۲) بجلی کے عمل کا سینٹر
(۳) پیسنے کا سینٹر (grinding centre)۔

انتظام

مِل کا انتظام ایک بورڈ کے ماتحت ہے جس کے مندرجہ ذیل رکن ہیں۔

وزیر ترقیات — میر مجلس، جنگلات کا خاص مہتمم — رکن
اعلیٰ انجینیر محکمہ تعمیرات — رکن، اعلیٰ الیکٹرک انجینیر — رکن
ناظم صنعات — رکن، وزیر مالیات یا معتمد مالیات — رکن
سیکرٹری ترقیات — سیکرٹری

مالیات

حکومت کے اندازے کے مطابق مِل کے قیام کے تخمینہ کی تصدیق ۲۵ لاکھ روپیہ تھی اور مِل پر اسوج سمت ۲۰۱۱ (۵۵-۱۹۵۴ء) تک خرچ مندرجہ ذیل تھا:۔

سمت ۲۰۰۸ (۵۲-۱۹۵۱ء) ۰۰ — ۱۳ — ۱۷۹۰۲۲ روپے
سمت ۲۰۰۹ (۵۳-۱۹۵۲ء) ۹ — ۵ — ۱۰۳۵۴۴۱ "
سمت ۲۰۱۰ (۵۴-۱۹۵۳ء) ۶ — ۱ — ۸۴۰۴۴۸ "
سمت ۲۰۱۱ اسوج (ستمبر-اکتوبر ۵۵-۱۹۵۴ء) ۶ — ۱۴ — ۳۶۶۰۲۲ روپے
کُل میزان ۹-۳-۲۴۱۱۴۳۶ روپے

فروخت

جو اسٹیشن پر کے منصوبہ کو آخری شکل ستمبر ۱۹۵۴ء میں دی گئی تھی اور اسی ماہ میں مِل میں سامان بننا شروع ہو گیا تھا۔ سال کے پہلے آدھے حصہ میں تو ضروری تعمیرات وغیرہ کو ختم کیا گیا تھا جیسے لکڑی کو مضبوط کرنے کا چیمبر یا ہال، خام مال کو مستحکم کرنے کا پلانٹ، کلوں کے ہال کی چھتوں اور فرشوں کی تعمیر اور بجلی کو پیدا کرنے کے لئے دو ڈیزل انجنوں کا استعمال۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ فوراً ہی سامان کے خریدار پیدا ہو جائیں۔ اس وقت کے وزیر ترقیات کی کوششوں سے میسرز لیور برادرس آف بمبئی نے (جو کہ ہند میں اسباب کے بکسوں کے سب سے بڑے خریدار ہیں) ایک گاڑی بھر بکسوں کا اچھی قیمتوں پر آرڈر دیا۔ اس کے علاوہ مختلف ریاستوں سے چھوٹے چھوٹے آرڈر لئے گئے اس کے ساتھ ساتھ دروازوں اور کھڑکیوں کی سپلائی کے لئے شمالی ریلوے کو ٹھیکوں کے تخمینے دئے گئے۔ علاوہ ازیں مرکزی اور صوبوں کے محکمہ جات تعمیرات اور کچھ پرائیویٹ فرموں سے بھی گفت و شنید جاری رہی اور ۱۹۵۵ء کے شروع تک مِل کو لیبر برادرس کے آرڈر کے علاوہ ۲۴۰,۹۸۲ روپے کے آرڈر مل گئے تھے اور ۱۹۵۶ء کے درمیان تک مِل نے مرکزی محکمہ تعمیرات کو ۶۱۷,۳۳۳ روپے کا سامان مہیا کیا۔

پہلے پہل و کل مزدوروں کو اچھی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے مِل کو کچھ پریشانیاں ہوئیں لیکن اب مِل کو اچھے آرڈر ملنے شروع ہو گئے ہیں اور اب مِل اپنی تقرر شدہ مد (Installed Capacity) تک آرڈرس قبول کرنے کی پوزیشن رکھتا ہے اور تکمیل شدہ سامان کی مخصوص قسم کی گارنٹی بھی کرتی ہے۔

مل کی ایک خاص مشکل یہ ہے کہ ہندوستان کے گھروں کا تو ذکر ہی کیا، ہمارے ملک میں دروازے اور کھڑکیاں بھی کسی خاص پیمانہ و معیار کے موافق نہیں۔

مل کی فروخت بڑھانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ریاست کی حکومت کی مل کو معاونت حاصل ہو اور فروخت کے فروغ دینے کے موجودہ ذرائع استعمال کئے جائیں۔ اس کے علاوہ معیار کے موافق چیزوں (Standardised goods) کی ساخت پہ دھیان دینا بھی ضروری ہے۔

ملازمت

مل کے منتظمان کے مطابق موجودہ مشینری کے ساتھ ۲۵۰ ورکروں کی ضرورت ہے لیکن اگست ۱۹۵۳ء سے پہلے مل میں صرف ۲۴ ورکرز تھے کیونکہ تنخواہیں کم تھیں اور مل کی تعمیر مکمل نہ تھی۔ ۱۹۵۴-۵۵ء کے اختتام تک ۸۰ تربیت یافتہ اور ۶۰ غیر تربیت یافتہ (Un skilled) ورکرز اس مل میں کام کرتے تھے۔ اس وقت مل میں دو سو (۲۰۰) آدمی کام کرتے ہیں اور مزدوری کی شرح ڈیڑھ سے تین روپے روزانہ تک کی ہے۔ ۱۹۵۴-۵۵ء کے شروع تک مزدوری کا کل بل ۵۰۰ سے ۶۰۰ روپے ماہوار کا تھا جو اب دس ہزار روپے ماہوار ہے۔

لوکل ورکرز کی تربیت میں بہت غور و فکر کیا گیا تھا۔ اب نمایاں مد اس سلسلے میں جسموں کے لئے داسوں (Wooden trusses) کی تعمیر تھی۔ ان داسوں کی تعمیر نے کشمیری مزدوروں کی ہونہاری اور دستکاری کو بھی، جو انہیں بزرگوں سے ورثہ میں ملی ہے، تقویت دی ہے۔

چونکہ مل سری نگر سے ۸ میل کے فاصلہ پر ہے، اس لئے مل کے منتظمان نے سری نگر میں رہنے والے ورکروں کے لئے مفت سواری کی سہولت بھی مہیا کر رکھی ہے۔ مل میں طبی امداد کا بھی انتظام ہے اور اس کے علاوہ ایک ڈسپنسری بھی ہے۔ ورکروں کے لئے دیگر سہولیات مل کے منتظمان کے زیر نظر ہیں۔

امکانِ ترقی

مل کی ترقی کے امکانات بہت ہیں۔ سکینڈے نیویا کے ممالک کی ملوں کی طرز پہ اس مل کو بھی جدید مشینری سے آراستہ کیا گیا ہے اور یہ مشینری بہت سے کمالات پہ حاوی ہے اور کئی اور چیزوں کے بنانے میں استعمال کی جا سکتی ہے۔ مل نے حال ہی میں فرنیچر فیکٹری اور Veneering (ایک لکڑی پر دوسری قیمتی لکڑی کی تہہ سے زیبائش) اور بیٹری جدا کرنے کے آلات (Battery Separators) کی فیکٹری بنانے کے لئے ریاست کی حکومت کو ایک تجویز پیش کی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ لکڑی کے مزید سامان کی تعمیر کے ساتھ یہ مزید پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ کی قیمت کا مال تیار کر سکے گی۔

جو انیری مل پانپور ریاست کی عمارتی لکڑی کی تجارت میں بہت پُر امید آثار کا پیش خیمہ ہے اور لکڑی کے سامان بنانے والی آیندہ فیکٹریوں کی پیشرو ہے۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس مل کا درجہ ریاست کی ایک مخصوص مل اور ہندوستان کی بہترین ملوں میں ہوگا۔

حقیقت سائنسدان کی نظر میں۔ صفحہ ۲ سے آگے :۔ میں نے اس مختصر سی صحبت میں صرف حقیقت سے متعلق سائنس دان کے بنیادی Approach کا ذکر کیا ہے۔ سائنس دان حقیقتوں کے بدلنے اور ان کے عمل میں آنے کا ہی مشاہدہ نہیں کرتا، وہ خود بہت سی حقیقتوں کو بدلتا ہے اور کچھ نئی حقیقتوں کو بھی جنم دیتا ہے۔ آج ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی ایجاد کر کے اس نے بہت سی حقیقتوں کو بدل کر ایک نئی حقیقت کو جنم دیا ہے اور وہ ہے انسانیت کی تباہی اور خاتمے کی حقیقت ـــ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس ناخوشگوار حقیقت کو کسی خوشگوار تاثر میں بدل سکتا ہے یا نہیں!

(بشکریہ ریڈیو کشمیر)

جناب شمس الدین
وزیر دیہات سدھار

قومی توسیعی سروس کی کامیابیاں

جموں و کشمیر کے دیہات میں اجتماعی ترقی کا کام زور و شور کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ ریاست کی بیشتر آبادی کی معیشت کا دار و مدار دیہات پر ہی منحصر ہے۔ لوگوں کی زندگی اور نقطۂ نظر میں تھوڑے ہی عرصے میں اب ایک نمایاں تبدیلی پائی جاتی ہے۔ گاؤں کی آبادی عزم و استقلال کے ساتھ خاموشی سے سینکڑوں برس پرانے جمود اور کاہلی سے چھٹکارا حاصل کر کے ایک مؤثر جد و جہد میں محو نظر آ رہی ہے۔ آج ہر ایک دیہاتی اپنے روزمرہ کام میں تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ دور افتادہ علاقوں کے رہنے والے عوام پہلے کی طرح تقدیر کے رحم و کرم پر نہیں رہے ہیں بلکہ اب وہاں پر تعلیم کے لئے مدرسے، علاج کے لئے دواخانے، کھیتی باڑی کے جدید طریقے سیکھنے کے لئے ماڈل فارم وغیرہ مہیا کئے گئے ہیں۔ حقیقی طور پر یہ ایک مسرت کی بات ہے کہ گاؤں والوں نے کافی تعداد میں رضاکارانہ طور پر اپنی بہبودی کے کاموں مثلاً سڑکیں تعمیر کرنے نہریں کھودنے، بچوں کے لئے مدرسے بنانے، پنچایت گھر اور دواخانے قائم کرنے میں اپنا دستِ تعاون آگے بڑھا دیا ہے۔

لوگوں کی طرف سے یہ صحت مند اشتراک و تعاون بے شک کامیابی کی ایک علامت ہے اور اس کی بدولت اجتماعی ترقی کا کام بہترین ڈھنگ سے جاری ہے۔ ان تعمیری پروگراموں کی ایک خاص خصوصیت اور مطلب یہ بھی ہے کہ لوگوں میں "اپنی مدد آپ کرنے" کا اور امداد باہمی کا جذبہ پیدا ہو۔

خوشی کا مقام ہے کہ کشمیر کے اُن علاقوں میں جہاں اصل کشمیر آباد ہے۔ جب کوئی شخص دورہ کرے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہاں کے لوگوں میں تعلیمی سہولیات اور جدید طریقۂ کاشت کے بارے میں کس قدر زبردست خواہشات اور شعور پایا جاتا ہے۔ اجتماعی ترقی کا کام جس کی بدولت لوگوں کے سوچنے اور سمجھنے میں آج یہ ساری تبدیلی رونما ہوئی، اکتوبر ۱۹۵۲ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ ابتدا میں تین بلاکوں پر مشتمل پروجیکٹ کا کام ریاست میں شروع ہوا۔ بعد میں صوبۂ کشمیر کے لئے ۱۹۵۴ء میں دس اور قومی توسیعی سروس بلاک الاٹ کئے گئے اور اسی طرح آج ساری ریاست میں اجتماعی ترقی و قومی توسیعی سروس بلاکوں کا جال سا بچھ گیا ہے۔ تمام تنظیمی مشینری کو نئے سر سے ساز و سامان مہیا کیا گیا تاکہ فلاح و بہبود کا یہ کام منصفانہ طور پر اور قابلیت کے ساتھ کیا جائے۔

پہلے اجتماعی ترقی کا کام محکمہ دیہات سدھار اور پنچایتوں کے ذریعہ کیا جاتا تھا جسے بعد میں ایک نئی تنظیم — محکمۂ اجتماعی ترقی اور قومی توسیعی سروس کے سپرد کیا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں دونوں محکموں کو آپس میں ملا دیا گیا اور ریاست میں ترقیاتی کاموں کو وسیع پیمانے پر چلانے کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس وقت ۵۲ بلاکوں میں سے ۴۲ بلاکوں کو اجتماعی ترقی کی مرکزی وزارت کی طرف سے مالی امداد دینے کی منظوری حاصل ہو چکی تھی اور ریاست کے تمام دیہی علاقوں میں قانونی پنچایتیں قائم ہو گئی تھیں۔

اپریل ۱۹۵۶ء میں جب اس تنظیم کو از سرِ نو تشکیل دی گئی تو ہر پنچایت کو بلاک حلقہ کے ساتھ ملحق کر دیا گیا۔ ترقی کا یہ سارا کام جس میں سڑکیں بنانا، کمیونٹی مرکزوں کا قائم کرنا، آبپاشی کے نئے ماخذ نکالنا اور دیگر کام شامل ہیں پنچایتوں کے سپرد کئے گئے ہیں اور محکمہ ان کاموں کو سرانجام دینے میں ضرورت کے مطابق مالی اور ٹیکنیکل امداد دیتا ہے۔

جہاں پہلے پنج سالہ پلان کے تحت اجتماعی ترقی کے لئے یہاں ۱۲۰ لاکھ روپے کی رقم دی گئی تھی وہاں دوسرے پلان میں اس کام کے لئے ۱۹۶ لاکھ روپے مخصوص کئے گئے ہیں۔ اور یہ رقم آیندہ ۲۱۰ لاکھ روپیہ تک بڑھانے کی اُمید کی جاتی ہے۔ پچھلے سال کے نمایاں پروگرام میں ریاست بھر کی پنچایتوں کے صدر مقامات پر پنچایت گھر تعمیر کئے گئے۔ یہ پنچایت گھر بذاتِ خود پنچایتوں نے اپنی لاگت پر بنائے تھے۔ حکومت

کی طرف سے ہر پنچایت گھر کے لئے صرف ایک ہزار روپیہ بطور امداد دیا جاتا ہے۔ چنانچہ صوبہ کشمیر میں ایسے ۴۵۰ پنچایت گھر تعمیر کئے جا چکے ہیں جن کی لاگت معہ قیمت زمین کے ۴۰۰۰ روپیہ آتی ہے۔ جموں میں اوسطاً ہر پنچایت گھر پر ۴۰۰۰ سے ۵۰۰۰ روپیہ تک لاگت آجاتی ہے جس پر حکومت ۱۰۰۰ روپیہ بطور امداد دیتی ہے جیسا کہ صوبہ کشمیر میں کیا گیا۔

حکومت نے ایک پروگرام کے مطابق اور پنچایتی ضابطے کے تحت ترقیاتی منصوبہ پر رقم تقسیم کی ہے اور اس طرح اس امکان کا بھی تدارک کیا گیا ہے جو ترقیاتی کام کی رفتار کو صرف بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر اور ویلیج لیول ورکروں کے ہیڈ کوارٹر تک ہی محدود رکھتا تھا۔ ہر ایک پنچایت کو ترقیاتی کام کے لئے ۴۰۰۰ روپیہ دئے گئے۔ سال رواں کے بجٹ میں ۱۶۹ لاکھ روپیہ کی رقم کام کو فروغ دینے کے لئے رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ۵۲ بلاکوں میں سے ۴۶ بلاکوں کو تاحال مرکز سے ہی امداد ملے گی۔

اس پروگرام کے تحت گاؤں میں سڑکوں کی تعمیر کے کام میں بہت ہی ترقی ہوئی ہے۔ دوسرے پلان میں ہر ایک گاؤں تک سڑک بنائے جانے کا تہیہ کیا گیا ہے — چنانچہ لوگوں نے اس کام کو سرانجام دینے میں تسلی بخش طور پر اپنا دستِ تعاون بڑھایا ہے۔ کثیر المقاصد پروگرام کے مطابق گاؤں میں کام کی زیادتی اور مشکلات کے پیش نظر ایک بلاک میں دس سے زیادہ ویلیج لیول ورکروں کو تعینات کیا گیا ہے حالانکہ پچھلے طریق کار کے مطابق ایک ویلیج لیول ورکر کے تحت دس گاؤں ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر ایک پنچایت میں ایک ویلیج لیول ورکر تعینات کیا گیا ہے۔ ایک بلاک کے تحت ۱۵ سے ۲۵ پنچائتیں کام کرتی ہیں۔

آج قومی توسیعی سروس بلاکوں سے تمام ریاست معہ لداخ زیر کار ہے۔ ریاست میں کل ۴۸ بلاک ہیں جن میں گیارہ منظور شدہ کیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک ہیں جہاں کافی سرگرمی کے ساتھ کام ہو رہا ہے۔ باقی ۳۷ قومی توسیعی سروس بلاک ہیں۔

حکومت دیہاتی کارکنوں کو کھیتی باڑی، ویٹرنری اور دیگر شعبوں میں تربیت دے رہی ہے۔ کمیونٹی پروجیکٹ کی تنظیم کے ساتھ وابستہ رہنے والے تجربہ کار کارکنوں کی تعداد ۵۴۶ ہے۔ ان میں سے ۲۷۰ کارکنوں کو، جنہوں نے تھوڑی تربیت حاصل کی ہے، دوبارہ تربیت دی جائے گی۔ چنانچہ ۱۴۹ کارکن ریفریشر کورس کے لئے بھیج دئے گئے ہیں۔

قومی توسیعی سروس اور اجتماعی ترقی کا کام ایک سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے جس پر کہ نئے ہندوستان کی تعمیر عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ اگر موجودہ رفتار کے مطابق کام جاری رہا تو وہ دن دور نہیں جب کہ سارے لوگ بہ حیثیت مجموعی مکمل طور پر ایک خوشحال زندگی بسر کرنے کے قابل ہوں گے۔

مظفر عازم

غزل

بآلِ عاشق بولہ نارن زآلِ کاتیا کاتیا
ماپہ چانے غم امارن زآل کاتیا کاتیا

دُانس کیاہ لب اِضطرابچہ رآز زیھا ناٹیسا
ژانک عشقن دردِ جگرک زآلِ کاتیا کاتیا

کیئت بُت خانس فدا کاتیا چھ کعبس قربان
اُم سرابن اصلہ چے دتہ ڈآلِ کاتیا کاتیا

دُوبھ ہوا تِرہ نادہ کشتِرن تیز گے صدِ بس تُرتھ
دُہ تھر بونیچھ پیہ ژرین ہندآل کاتیا کاتیا

کنہہ چھیہ تھہ سرمست یم بوزن مگر بوزان نہ آہ
تِریشہ ہُت تھو ترِیشہ ہُت کلہ ڈآلِ کاتیا کاتیا

از چھِیہ پرکینی پوشس کُرتام تمن تہ چھِ زردی
گُل چھولن ییتھ وارہ بوزُم کآلِ کاتیا کاتیا

دُون تھکتھ آس تِرہ کن کلہ دالہ یاری یارو
خرقہ پرآوِم یونہ ترآوِم نآلِ کاتیا کاتیا

کُوت بیقل چھک بچان چھک چشمہ تِرتھ عازم
چھوکہ زران چھک غم انان چھک سآلِ کاتیا کاتیا

•

میرے محبوب! عاشق محبت کی آگ میں جلتے رہے اور محبت تمہاری چاہت میں بے حساب
غم جھیلتی رہی

پریشانی کی رات بڑھتے بڑھتے بے انتہا لمبی ہو گئی۔ تو عشق دردِ جگر کے چراغ
روشن کرتا رہا

بُت خانے کے بھی پرستار کافی ہیں اور کعبے پر قربان ہونے والے بھی۔ آہ! یہ فریب
کتنے ہی لوگوں کو سیدھی راہ سے بھٹکاتا رہا

طوفان اٹھا۔ نئی توتوں کی کشتیوں کی رفتار تیز ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ ساحلِ مراد کو پہنچ
گئے۔ لیکن آہ! (ایسا ہوا ہے) کتنی ہی جڑ بوں کے گھونسلے ٹہنیوں سے گر پڑے

کچھ ایسے بھی ہیں جو سرمست ہیں اور اس لئے یہ بات سُن کر اَن سُنی کر دیتے ہیں کہ ساقی
کتنے ہی پیاسوں کو پیاسا ہی چھوڑ گیا

ابھی تو صرف پیلے رنگین گُلِ[1] کے پھول کھلے ہیں اور وہ بھی زرد رو ہیں۔ خدا جانے وقت آنے
پر اس پھلواڑی میں طرح طرح کے پھول کھلیں گے

کرم، کرم اے ساقی! کہ میں خرقہ و دستار پوشی کی زحمت سے بچ کر چور ہو کر تیرے حضور
آیا ہوں

اے عازم! کتنا ناداں ہے تو، جو آنکھیں کھول کر چلتا ہے اور اس طرح زخم کھاتا اور
شدتِ غم کو دعوت دیے جا رہا ہے

---

[1] ایک پھول جو بہار میں بہت پہلے کھلتا ہے اس کا رنگ پیلا ہوتا ہے، شاید جاڑے کی شدت یاد رہنے کی وجہ سے — عازم

عزیز کاشمیری

کشمیری زبان اور عبرانی

"بعض دانا نادانی کی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن کون ہے جو دانا کی نادانی کی بات کو پتھر پر لکیر نہ سمجھے"

"تعمیر" سری نگر جولائی ۱۹۵۸ء میں "کشمیری زبان اور عبرانی" کے عنوان سے مسٹر جی۔ ایل۔ کے جلالی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے اسی موضوع پر راقم کے مقالہ مندرجہ "تعمیر" جنوری ۱۹۵۸ء میں دئے گئے دلائل اور واقعات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے "بیرونی مورخین" کی رٹ لگائی ہے۔ اگرچہ متذکرہ صدر مقالہ میں کشمیری اور بیرونی مؤرخوں اور محققوں کے بیسوں مستند حوالہ جات دئے گئے ہیں۔ پھر بھی نگارندہ نے دلائل کی اہمیت کو ذیل کے نکات پیش کرتے ہوئے کم کرنے کی ناکام کوشش کی ہے:۔

(۱) جو لیکھک باہر سے آئے اور کشمیر کے متعلق لکھا، ان کو مغربی زبانوں کی زیادہ واقفیت ہونے کی وجہ سے کشمیری زبان کا ان زبانوں کے ساتھ "رشتہ" نکالنے میں خاص دلچسپی ہے۔"

(۲) الف۔ یہ خیال کرنا کہ یہاں تورانی آئے، عبرانی آئے، لاطینی آئے، بعید از عقل اور بعید از گمان ہے۔

ب۔ "عبرانیوں کا کشمیر آنا بالکل غیر اغلب تھا۔"

(۳) ان ایام میں ذرائع رسل و رسائل مشکل و محدود تھے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانا کار دارد والا معاملہ ہوا کرتا تھا اور دنوں کی کیا بات، مہینے لگتے تھے۔"

(۴) الف۔ کشمیری ایک خاص خطہ کے رہنے والے ہیں ان کی اپنی زبان ہے جو ناگوں کے وقت سے لے کر آج تک بنتی رہی۔ اس میں سوائے سنسکرت کے اور بعد میں فارسی کے اور کسی زبان کا اثر نہیں پڑا، اور نہ ہی کشمیری عبرانی ہیں نہ تورانی۔"

ب۔ یہ کہنا کہ چونکہ اس وقت کی کشمیری زبان میں چند الفاظ ایسے پائے جاتے ہیں جو عبرانی ہیں، تورانی ہیں، کچھ جچتا نہیں۔"

(۵) "اگر ایک یا دو یا دس لفظ کسی زبان کے دوسری زبان کے الفاظ کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں، اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ الفاظ اس وجہ سے اس زبان میں پائے جاتے ہیں کہ اس ملک کی حکومت غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں تھی یا وہ لوگ وہاں آ کر آباد ہوئے۔"

اب ہم شری جلالی کے پیش کردہ نکات کا واقعات و حقائق کی کسوٹی پر جائزہ لیں گے۔

بیرونی مؤرخین

عجیب بات ہے کہ ایک خواندہ شخص اس قسم کا اظہار خیال کرے کہ کشمیر سے متعلق اصلی حالات صرف ایک کشمیری ہی بیان کر سکتا ہے اور بیرونی "لیکھک" اس بارے میں نظر انداز کرنے کے قابل ہیں، حالاں کہ علم کسی کی میراث نہیں، علم کو محدود قرار دینا تنگ ظرف اور متعصب اشخاص کا کام ہوتا ہے۔ بھلا اگر آج فضا میں امریکی اور روسی حکومتوں کے مصنوعی چاند اور سیارے گھومتے نظر آئیں اور وہ آسمانوں کے سربستہ رازوں کا انکشاف کریں تو کیا ہم ان حکومتوں کی تحقیقات و معلومات کا محض اس لئے انکار کریں گے کہ وہ کسی کشمیری کے ذریعہ سے دریافت نہیں ہوئے؟

کون کہتا ہے کہ مغربی ماہر الالسنہ کو کشمیری زبان سے متعلق واقفیت حاصل نہیں؟ جوئندہ یابندہ۔ جسے تلاش علم ہو، وہ بہت کچھ سیکھ جاتا ہے اور جو چند ایک حروف ہی سے آشنا ہو کر۔۔۔ اپنے کو تمام امور کے لئے سند سمجھے اور اترانے لگے، اس سے بڑھ کر اور کون جاہل ہو سکتا ہے؟

بیرونی مؤرخ اور محقق صاحب ثروت اور قیاس ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں ہر قسم کے وسائل اور ذرائع حاصل ہوتے ہیں۔ ہم نے اکثر دفعہ انہیں گھنے جنگلوں، وسیع بیابانوں اور خطرناک کھائیوں میں پھرتے دیکھا۔ کتابوں کے پرتوں سے چمٹتے دیکھا، اس لئے ان کی رائے مستند ہو سکتی ہے یا اُن کی جو گھر بیٹھے، آنکھیں بند کئے، اپنی ہی ہانکتے رہیں؟ اور ایک پیسہ بھی خرچ کرنے سے دریغ کرتے ہوں؟ آج تک کسی وید، پران یا دیگر مذہبی صحائف کا کوئی کشمیری ترجمہ ہماری نظروں سے نہیں گذرا، ماسوائے بائبل

کے۔ کیا آج تک کسی کشمیری نے کشمیری زبان و ضرب الامثال سے متعلق کوئی ڈکشنری شائع کی ہے؟ — اگر ایسی کوئی کتاب ہے تو وہ ہے "ڈکشنری آف کشمیری پراوربس مصنفہ مسٹر جے۔ ہنٹن ناولز مطبوعہ بمبئی ۱۸۸۵ء Dictionary of Kashmiri Proverbs by J. Hinton Knowles Bombay 1885"۔ کیا کسی کشمیری عالم نے کشمیری زبان کی صرف و نحو لکھی؟ نہیں! اور اگر کشمیری زبان کی گرامر لکھی تو میجر پی، ڈی، ہنڈرسن صاحب نے ۱۸۷۰ء میں لکھی۔

ایسے حالات میں بیرونی مؤرخوں اور محققوں کی دلائل و حقائق کا انکار کرنا کسی بھی دانش مند کو ہرگز زیب نہیں دے گا۔ اس کے علاوہ بیرونی مؤرخوں کی دلائل سے آنکھیں بند کر کے واقعات کا انکار کرتے ہوئے مضمون نگار صاحب اپنا الو سیدھا بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ راقم نے کشمیریوں کے بنی اسرائیل ہونے اور حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کے کشمیر آنے کے حق میں متعدد و مشہور و مستند کشمیری تواریخ اور مشرقی محققوں کے حوالہ جات بھی درج کئے ہوئے ہیں جن میں خاص کر ذیل کی کتابوں کے حوالہ جات بھی شامل ہیں:-

(۱) تاریخ حشمت کشمیر مصنفہ عبد القادر
(۲) تاریخ اعظمی مصنفہ خواجہ محمد اعظم صاحب دیدہ مری
(۳) وجیز التواریخ
(۴) تاریخ گلدستۂ کشمیر مصنفہ پنڈت ہرگوپال کول
(۵) تاریخ خلیل مصنفہ ملا محمد خلیل
(۶) نگارستان کشمیر مصنفہ قاضی ظہور الحسن
(۷) بھوشیہ مہا پران
(۸) اینشنٹ مانومنٹس آف کشمیر مصنفہ پنڈت رام چند کاک
(۹) البرونی
(۱۰) ہسٹری آف پری مسلمانز آف انڈیا مصنفہ وی، رنگا آچاریہ
(۱۱) تاریخ کشمیر مصنفہ ملا نادری
(۱۲) اسرار الاخیار
(۱۳) تولیت نامہ بنام سمی رحمان خان منجانب مغل حاکمان وغیرہ

لہٰذا نگارندہ صاحب کا پہلا نکتہ بے بنیاد اور غلط ہے۔

کشمیر میں بنی اسرائیل۔ تواریخ اور محققوں کی شہادتیں اس سلسلے میں پہلے دی جا چکی ہیں جن میں ملکی اور غیر ملکی دونوں قسم کی شہادتیں شامل ہیں۔ اس بارے میں حوالہ جات کو دہرانا تکرار کے مترادف ہوگا اور رسالہ کے محدود صفحات بھی اس کی اجازت نہیں دیتے۔ البتہ واقعاتی لحاظ سے چند ایک امور کو درج ذیل کیا جاتا ہے:-

(۱) کشمیریوں کے عادات و اطوار، خصائل و شمائل، شکل و صورت، اخلاق و آداب سب بنی اسرائیل کے مشابہ ہیں اور ان میں سر مو فرق نہیں۔

(۲) کشمیری رات کے وقت اسرائیلیوں کی طرح بالکل ننگے سوتے ہیں۔

(۳) کشمیریوں کی ذہنیت اور پیٹھ پیچھے غیبت کرنے کی عادت اسرائیلیوں جیسی ہے

(۴) کشمیری یہودیوں کی طرح گھی اور چربی نہیں بلکہ تیل استعمال کرتے ہیں۔

(۵) کشمیری عورتیں صف باندھ کر رو کر تی ہیں۔ نانبائی دکان پر بیٹھتی ہے۔ زچگی کے بعد چالیسویں دن نہاتی ہے — یہ سب اسرائیلی رسمیں ہیں۔

(۶) کشمیر میں تابوت ایک طرف سے تنگ، دوسری طرف سے چوڑا اور پہلو دار ڈھکنے والا ہوتا ہے۔ قصائیوں کی چھریاں نوک دار اور ہانجیوں کے چپو پان کے پتے کی شکل کے ہوتے ہیں جو سب اسرائیلی طرز کے ہیں۔

(۷) کشمیری ہانجیوں کے ڈونگے بالکل اسرائیلیوں کے سے ہیں۔

(۸) کشمیری قبرستانوں میں عام طور پر برن اور برمیخ کے درخت لگے ہوتے ہیں جو ہندو نقطۂ نگاہ کے مطابق منحوس، لیکن اسرائیلی معتقدات کے مطابق مبارک، اور سایۂ بہشت کے مصداق قرار دئے جاتے ہیں۔

(۹) کشمیری بھنی ہوئی مچھلیاں (جنہیں کشمیری زبان میں "پھرہ" کہا جاتا ہے) بطور مرغوب غذا کے استعمال کرتے ہیں۔ مسیح ناصری علیہ السلام نے بھی صلیب سے بچ کر فلسطین سے بھاگتے وقت بھنی ہوئی مچھلی اور شہد کا قتلہ استعمال کیا تھا۔

(لوقا ۲۴: ۴۳)

گھاس میں بھنی ہوئی مچھلیاں استعمال کرنے کا طریقہ کشمیر کے سوا اور کہیں موجود نہیں جو اسرائیلی طریقہ ہے۔

(۱۰) کشمیر میں اکثر مقامات پر ہزاروں سال کی پرانی قبریں ہیں جن کا رخ عام مسلمان قبروں یعنی شمالاً جنوباً کے بجائے شرقاً غرباً ہوتا ہے اور مردوں کا منہ فلسطین کی طرف ہوتا ہے۔

(۱۱) پرانی کشمیری پنڈتانیوں کا لباس بالکل یہودیوں جیسا ہوتا ہے یعنی اسرائیلی عورتوں کی طرح وہ کمربند اور سرچادر استعمال کرتی ہیں۔

(۱۲) کشمیریوں کے معتقدات اسرائیلی ہیں، مثلاً اسلامیات کے بالکل برعکس

ان کا یہ اعتقاد کہ کریوہ (ڈمن) کے ایک کنوئیں میں (جیسے چاہِ بابل کہا جاتا ہے) دو فرشتے اوندھے منہ لٹکائے گئے ہیں۔ لوگ یہاں پر فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور ان سے مُرادیں بھی مانگتے ہیں۔

(۱۳) بیجبہاڑہ میں ایک قبر پر عبرانی کے الفاظ کندہ ہیں۔ وغیرہ

آرٹ اور فنون کی شہادت

اونتی پورہ کے نزدیک جو پُرانے کھنڈر ہیں وہاں پتھر کی محرابیں نہ ہندو، نہ بُدھ بلکہ صرف اسرائیلی آرٹ کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔

ہارون میں جو پُرانے آثار برآمد ہوئے ہیں ان میں بہت سارے ٹائل شامل ہیں جن پر ہرن، مُرغ، کندھوں پر پانی کے گھڑے رکھی ہوئی عورتیں، گھوڑوں پر نیزہ تانے سوار، عبرانی الفاظ میں گنتی کے حروف، آفتاب کے نقش، گھٹنے پیٹ سے لگا کر بیٹھے ہوئے لوگ (جس طریقہ پر کشمیری بیٹھتے ہیں اور کشمیری عورتیں نہاتی ہیں) اور مصری اور بابلی شکل کے لوگوں کی تصویریں کندہ ہیں جو ہندو اور بدھ آرٹ کے بالکل برعکس بابلی اور مصری آرٹ کا زندہ اور جاگتا نمونہ ہیں۔

ذاتیں اور گوتیں

کشمیری مسلمانوں اور ہندوؤں کی اکثر ذاتیں اسرائیلی ہیں جن کا بائیبل میں باقاعدہ طور نام آیا ہے۔ ذیل میں چند ایک کا حوالہ دیا جاتا ہے:۔

ذاتیں	حوالہ	ذاتیں	حوالہ
اماں	۱۔ تواریخ ۷: ۳۵	کوتر و۔ قطورہ	(پیدائش ۲۵: ۴)
اُٹل	۱۔ تواریخ ۱۲: ۱۱	لادی	۱۔ تواریخ ۲: ۱
بال۔ بالہ	(۱۔ تواریخ ۵: ۵، ۶: ۶)	ملک	۱۔ تواریخ ۶: ۴۴
بٹ	(۱۔ سلاطین ۷: ۲۶، غزل الغزلات ۷: ۴)	ہارون	۱۔ تواریخ ۶: ۴۹
بوکرو	(۱۔ تواریخ ۸: ۳۵)	میر	آستر ۱: ۱۴
ڈار۔ دار	۱۔ سلاطین ۴: ۱۱	نتر	قضاۃ ۱۱: ۳۳
ڈوم	۱۔ تواریخ ۴: ۴	موزا	۱۔ تواریخ ۸: ۳۶
گڈر۔ گدر	۱۔ تواریخ ۲: ۲	مشران	۱۔ ” ۶: ۱۹
ٹونی	۱۔ تواریخ ۶: ۷۵	متو	لوقا ۳: ۲۹
عشائی	۱۔ سموئیل ۱۴: ۴۹	نائیکو۔ نیکوہ	۲۔ سلاطین ۲۳: ۲۹
قرو	گنتی ۲۶: ۹	نہرو۔ نہور	۱۔ تواریخ ۱: ۲۶
کول	یسعیاہ ۳: ۱۸	پاؤ۔ پوہ	” ” ۷: ۱
سینہ۔ رینہ	۱۔ تواریخ ۴: ۲۰	شورا۔ شراہ	۱۔ تواریخ ۷: ۴۴
ریشی۔ رسیا	لوقا ۳: ۲۷	تکو۔ تکوع	” ۲: ۲۴
شہبری، شیہبیر	۱۔ تواریخ ۲۴: ۲۴	دانی۔ دانیاہ	عزرا ۱۰: ۳۹

افغانستان، صوبہ سرحد، سوات اور بخارا کی ذاتیں اور گوتیں یہاں خوفِ طوالت کی وجہ سے درج نہیں کی جاتی ہیں جو اسرائیلی ذاتوں کے عین مطابق ہیں۔

مقامات کی شہادت

کشمیر میں بہت سارے مقامات، دیہات اور جگہوں کے نام ایسے ہیں جو بالکل اسرائیلی ہیں اور باقاعدہ طور بائیبل میں درج ہیں۔ چند ایک حوالجات ملاحظہ ہوں:

مقام	اسرائیلی نام	حوالہ
اوری (سرینگر سے ۶۰ میل کے فاصلہ پر)	اوری	(خروج ۳: ۲)
ارہ بل (ارہ گام)	ارہ	۱۔ تواریخ ۷: ۳۹
اشم	اشیما	۲۔ سلاطین ۱۷: ۳۰
اسطور (کونگام اور گلگت میں)	اسطورات	۱۔ ” ۱۱: ۵
امیراہ (گلی کا نام)	میراہ	۱۔ تواریخ ۲۴: ۱۹ آستر ۱: ۱۴
اجس (بانڈی پور)	اجہ	(پیدائش ۳۶: ۲۴)
اچھ بل	اشبل	” ۴۶: ۲۱
برزلہ (سری نگر اور کونگام میں)	برزلی	۱۔ سلاطین ۲: ۷
بابل (تحصیل اننت ناگ)	بابل	پیدائش ۱۱: ۹
بابل (نہر کا نام ٹنگمرگ میں)		
بتھ پور (بانڈی پورہ کا پرانا نام)	بتھ پورا	استثنا ۳۴: ۶
ڈورو (اننت ناگ اور گلگت میں)	ڈور	۱۔ سلاطین ۴: ۱۱
گڈھ بازار (سرینگر)	گڈھ	۱۔ تواریخ ۲: ۱
گلگت	گلگوتھا	متی ۲۷: ۳۳ مرقس ۱۵: ۲۲
ہارون (سری نگر)	ہارون	۲۔ سلاطین ۱۹: ۱۲
ہشہ بوگ	ہسبون	گنتی ۲: ۲۷

ذرائع رسل و رسائل

نگارندہ نے تیسرا یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ کشمیر میں اسرائیلی نہیں آئے ہیں۔ کیونکہ

اور اقلیم میں تو وہ رنگ رسل و رسائل کا مشکل و محدود تھے۔ ایک دوسرے ملک میں جانا کارے دارد و دراز علاقہ جیسا کرتا تھا۔

غور سے دیکھا جائے تو یہی دلیل اسرائیلیوں کے یہاں آنے کے حق میں ہے کیونکہ جب بخت نصر اور دوسرے ظالم بادشاہوں نے بنی اسرائیل کا قتلِ عام کیا تو وہ وہاں سے بھاگ گئے۔ بارہ قبائل میں سے صرف دو قبیلے فلسطین میں رہ گئے اور باقی دس قبیلے مختلف دُور دراز علاقہ جات کو ہجرت کر کے وہاں آباد ہو گئے۔ کچھ افغانستان[1] اور صوبہ سرحد میں، کچھ بلخ بخارا و تبت میں اور اکثر حصہ کشمیر میں آباد ہو گیا۔ تاکہ مشکل جغرافیائی دوری کی وجہ سے کوئی ان کا پیچھا نہ کر سکے۔ چنانچہ تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں، یہاں تک کہ مشہور کشمیری مؤرخ محمد دین صاحب فوق (البرونی) کے حوالے سے "تاریخ اقوام کشمیر" کے صفحہ ۷ پر یہی کچھ لکھتے ہیں :-

"سر بہ فلک دیواروں نے جو وادی کے چاروں طرف چھائی ہوئی ہیں کشمیر کو ایک محفوظ جائے پناہ بنا رکھا ہے۔ اس لئے بار بار کے حملوں سے تنگ آ کر دوسرے ملکوں کے لوگ یہاں اقامت گزین ہو جاتے ہیں کشمیری برہمن یہاں کے اصلی باشندے نہیں ہیں بلکہ دوسرے ملکوں سے آئے تھے۔ وہ صرف برہمن ہی نہیں تھے بلکہ مختلف ممالک کے مختلف اقوام میں سے تھے۔ ان میں کئی لوگ حصولِ علم کے لئے آئے تھے اور کئی بیرونی حملوں کے خوف سے بھاگ کر یہاں پناہ لیتے تھے۔"

سنسکرت اور فارسی کا اثر

موصوف کا یہ کہنا کہ کشمیری زبان پر سوائے سنسکرت کے اور بعد میں فارسی کے اور کسی زبان کا اثر نہیں پڑا، واقعات اور حقائق کا منہ چڑانا ہے۔ ہندو مؤرخ پنڈت ہرگوپال کول یہ ماننے کے باوجود کہ کشمیر کی قدیم زبان سنسکرت تھی، پھر بھی برملا طور پر اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ کشمیری زبان میں صرف ۵ فیصدی سنسکرت، دس فیصدی فارسی، ۵ فیصدی ہندوستانی، دو فیصدی عربی اور باقی ۴۴ فیصدی کشمیری و ممالک متصلہ کے الفاظ ہیں۔

(دیکھئے تاریخ گلدستۂ کشمیر صفحہ ۷۴، ۷۵)

اس سے بھی یہی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اصل میں اہلِ کشمیر کی زبان عبرانی تھی۔ جسے سنسکرت بھی صدہا سال غلبہ اور اقتدار پانے کے باوجود بھی مسخ نہ کر سکی۔

اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ متعدد دوسری زبانوں نے اس پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ تاہم سیوارڈ اپنی تاریخ "نگارستانِ کشمیر" کے صفحہ ۹ پر لکھتے ہیں کہ :-

"کشمیر کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے آباد کیا۔ ان کی زبان عبرانی تھی۔ اس لئے یہ قوی قیاس ہے کہ کشمیر کی ابتدائی زبان عبرانی تھی۔ جب آبادی قائم ہو گئی تو اہلِ تبت یہاں آئے۔ تبت، ایران اور اس کے قرب و جوار کی نسلیں آباد ہوئی تھیں۔"

پنڈت جیالال کول ناظر نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ کشمیر میں عبرانی، یونانی اور چینی، ترک اور تاتاری وغیرہ آباد ہو گئے تھے۔" (دیکھئے "آج کل" اگست ۱۹۵۵ء صفحہ ۳)

دوسری زبان کے الفاظ

آخری نکتہ ستری جیالال صاحب کا یہ ہے کہ ایک زبان کے چند الفاظ دوسری زبان کے ساتھ مطابقت رکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس زبان کے بولنے والے اس ملک میں آباد ہوئے ہوں گے اور پھر انہوں نے خود بڑے فخر و مباہات سے کشمیری زبان اور سنسکرت کے ۹۴۰ الفاظ پیش کر کے ظاہر بہت بڑا ثبوت پیش کیا ہے کہ کشمیری زبان سنسکرت سے نکلی ہے!

اس خیالی طلسم کو مسمار کرنے کے لئے مناسب یہی ہے کہ خود موصوف کا استعمال کیا ہوا حربہ ان ہی پر استعمال کیا جائے اس لئے چار، پانچ سو کشمیری و عبرانی ہم معنی و مترادف الفاظ کو درج کرنے کی طوالت سے بچتے ہوئے، پھر بھی کم از کم نگارندہ کے پیش کردہ الفاظ سے دُگنی تعداد میں الفاظ درج ذیل کئے جاتے ہیں جن سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہوگا کہ کشمیری زبان عبرانی زبان سے بنی ہے :-

عبرانی	اردو معنی	کشمیری	اردو معنی
اب	باپ	بب	باپ
ابش	موٹا کرنا	ابشاوُن	دو دھاگوں کو ملا کر موٹا کرنا
اشاہ	جورو	اشین	جورو
افن	گھومنا	وفن	گھڑنا
اوہ	ہائے	اوہ	ہائے
اول	کچ زدہ ہونا، بیوقوف	وول	کچ زدہ ہونا۔ بیوقوف
آکھ	اکیلا	اکھ	اکیلا
ایم	ڈرانا	یم	موت، دھکاوُ
اجل	سمٹ جانا	اجل	موت

[1] اہلِ افغان چونکہ وطن کی یاد میں آہ و فغان کیا کرتے تھے اسلئے ملک کا نام افغانستان پڑا۔

تعمیر

عبرانی	اُردو معنی	کشمیری	اُردو معنی
ادہ	پچھاڑنا	ادہ	آدمی
اسر	قید کرنا	اسر	تنگ کرنا
اون	اندھا	اونن	اندھا
ازن	تول	وزن	تول
اطر	عیب، گناہ	اطر	عیب، گناہ
اوب	ہرڑ	اوپ	احمق
ازر	کمربند باندھنا	ایزار	پاجامہ
احد	ایک	احد	ایک
ادر	اُوپر لا کپڑا	ژادر	اُوپر لا کپڑا۔ کمبل
اہاہ	افسوس	اہاہ	افسوس
آز	اس وقت	از	آج
اہل	خیمہ کھڑا کرنا	ہل	کمربند (باندھ کر کھڑا ہونا)
اوہ	آرزومند ہونا	آوہ	اقرار
الہ	موٹا ہونا	الہ	کدو، کدو کی طرح موٹا ہونا
آرخ	دوسرا	بیارخ	دوسرا
اورشہ	دانا	اوشش	آنسو جو بہائے جاتے ہیں
بوم	بلند مقام	بام	مکان کا اُوپر کا حصہ۔ چھت
بوس	روندا جانا	بُس	روندا جانا
بنہ	تعمیر۔ گھڑنا	بہ	گھڑنا
بکہ	رونا	باک	رونا
بوا	حاصل ہونا	بوان	حاصل ہونا
بنہ	خاندان	بنہ	بہن
بخت نصر	ظالم بادشاہ	بخت نصر	کرخت۔ نامعقول
بار	کھودنا۔ دیوار	بر	دیوار میں سوراخ یا شگاف
بدر	الگ کرنا	بدر	الگ کرنا
بنز	بنانا	بنہ	بن جائے گا
ترک	تھوک	تھوک	تھوک
تلا	بلند کرنا	تلن	بلند کرنا۔ ن مصدر علامت
تعمیر			

عبرانی	اُردو معنی	کشمیری	اُردو معنی
تمم	تمام	تمام	تمام
تقر	توڑنا	تقر	ترانڈو جس سے توڑتے ہیں
توہ	پریشان ہونا	توہ	بھونرا جو پریشان پھرتا ہے
بتک	کاٹ ڈالنا	بیکت	چاک کر ڈالنا
تنہ	پھر	تنہ	جب سے
جبر	جبر	جبر	جبر
برح	دروازہ	بر	دروازہ
قل	قملا جانا	قملن	قملا جانا۔ ن علامت مصدر
زنہ	حرام کاری	زنہ	حرام کاری
صحن	بدبو	صحن	بدبو
فتت	توڑنا	فٹن	توڑنا
عبر	عبور کرنا	عبور	عبور کرنا
سکوت	خاموشی	سکوت	خاموشی
نفش	ذات	نفس	ذات
نفخ	پھونکا جانا	نفخ	پیٹ پھولنا
نیر	افتادہ زمین	نیور	چراگاہ۔ افتادہ زمین
شقد	گھاٹ میں رہنے والا	شقدر	گھاٹ میں رہنے والا
شفل	کمینہ	سفل	کمینہ
خطا	قصور	خطا	قصور
صفا	چمکنا	صفر	صاف۔ جو چمکتا ہے
فلس	بانٹ دینا	فلن	بانٹ دینا۔ ن علامت مصدر
مسس	دبلا ہونا	مس	لاغری جو بدن پر طاری ہوتی ہے
فاہ۔ فوہ	پھونکنا	فُو	پھونک
قبض	ہاتھ سے پکڑنا	قبضہ	اپنے تصرف میں رکھنا
شقص	مکروہ۔ نفرت	شقص	ذلت
شال	علیم ارواح جو بالآخر سب کو بلاتا ہے	سال	دعوت جس میں صاحب خانہ بلاتا ہے
رصہ	رضامندی	رضہ	رضامندی

اگست ستمبر ۱۹۵۱ء

عبرانی	اُردو معنی	کشمیری	اُردو معنی	عبرانی	اُردو معنی	کشمیری	اُردو معنی
رفا	مرمت کرنا	رف	مرمت کرنا	لیقیت	خوشہ چین	لیقل	گالی دینے والا
قطل	جان سے مارنا	قتل	جان سے مارنا	مسخ	طلا کرنا	مسخ	صورت بدل دینا
ہمہ	شور مچانا	ہمہ ہم	شور	گبھر	زور آور	گبر	جوان بیٹا
درا	نفرت	درہ	اظہار نفرت۔ کتے کو بھگاتے وقت کہا جاتا ہے	لاگ	ٹھٹھا کرنا	لاگن	نقل کر کے مضحکہ اُڑانا
				آدن	مالک	اذن	ہیلو ٹھا
درک	جگہ پکڑنا	ڈرک	جونک جو خون چوسنے کو جگہ پکڑتی ہے۔	احب	محبوب ہونا	حُب	محبت
				دکہ	کچلا جانا	دکہ	دھکا
رعوش	کانپنا	رعشہ	کانپنا	ہے	دیکھو	ہے	ارے (حرفِ ندا)
رکب	سوار کر کے چلانا	مرکبان	گھوڑے کو ہانکنے والا	لبد	اکگ	لب	اکگ
رزان	سردار	رازہ	سردار۔ راجہ	مالون	ٹھکنے کا مقام	مالیئون	میکے۔ والدین کا گھر
تشبع	خراد کے کام کی چیز	قشش	کھرکنا	شملاہ	پوشاک	شملہ	پگڑی کا شملہ
قرص	دانت سے کاٹنا	کرچ	دانت سے کاٹنے کی آواز	شالم	سلامت ہونا	سالم	پورا
سبب	کھانے پر بیٹھنا	سبے	دسترخوان پر آدمیوں کی صف	حرر	جلنا	حر	جلانے کی لکڑی
				شاس	ہانپنا	شانس	ہانپنا
یون	مستی	یاوَن	مستی	صنن	چُبھنا	صنن	چُبھنا
یلل	واویلا	لِل داد	واویلا۔ بددعا	راشہ	شریر	راشہ	شریر
یعلل	چھت کا بوجھ اُٹھانے والی شہتیر	یعلل	چھت کا بوجھ اُٹھانے والی شہتیر	جلہ	زمین چھوڑنا	ژلہ	علاقہ چھوڑ دوں گا
				دمم	خاموش ہونا	دم	خاموشی
طہر	اپنے تئیں پاک کرنا	طہر	کھانا صدقہ میں دے کر اپنے تئیں پاک کرنا	دمہ	اقبال مندی	دم	اقبال مندی
				دفہ	دھکا دینا	دفہ	دھکا دے کر نکالنا
شوطہ	چابک مارنا	شفطہ	سخت مارنا	دقر	چوٹ	دقر	ہتھوڑا جس سے چوٹ لگاتے ہیں۔ آلہ
ہرم	بلند ہونا	ہیرم	اُوپر والا				
زوہ	چھپانا۔ ذخیرہ خانہ	زوہ	زمین دوز ذخیرہ	لول	لپٹنا (محبت سے)	لول	محبت
دبر	دبانا۔ ہلاک کرنا	دبراون	زمین میں دفن کرنا	مسہ	انکار۔ روکنا	مسہ	مت کرو
تہوان	ناچیز جانا	تہون	گتی۔ ناچیز	مین	صورت دکھانا	مون	بوسہ
کتونتھ	زیر جامہ	کتونہ	تنگ پاجامہ	نکح	سامنے ہونا	نکح	قریب ہونا۔ سامنے ہونا
غیر	پرایا۔ نامحرم	غیر	پرایا	تلہ	تمام کرنا	تلہ	ختم کرنا۔ محروم کرنا
آصیل	آرام طلب۔ سست	آلس	سست	نقط	نفرت کرنا	نقہط	نفرت
تعمیر							

عبرانی	اردو معنی	کشمیری	اردو معنی
نسا	اُٹھا کر لے جانا	نِس	اُٹھا کر لے جائے
نتن	نکالنا	نیتن	بھیڑ کا پشم اُتارنا
تر	سردی سے تھر تھرانا	تیُر	سردی
عزل	ہٹا لے جانا	عزُل	ہٹانا۔ محروم کرنا
نوص	پھوٹ نکلنا	نوّص	پھوٹ گیا
نوت	کھوکھلا ہونا	نوّت	گوکری جو کھوکھلی ہوتی ہے
فلا	جُدا ہونا	فلئی	جُدا ہونا
فلہ۔ فلیح	ٹکڑے ہونا	فلہ	ٹکڑے
فرص	توڑ کر نقب لگانا	فرص	چُرائے گا
صدق	راست بازی	صدق	راست بازی
قور	کنواں کھودنا	قرپور	کنواں
رزہ	دُبلا کرنا	رز	رسّی۔ دُبلاپن
سوم	آراستہ کرنا	سُم	آراستہ، مانگ نکالنا
سشبح	تعریف کرنا	شوُب	تعریف، خوبی
شوہ	برابر ہونا۔ یکساں	ہوہ	برابر۔ یکساں
سشیت	ساتھ رکھنا	شیت	ساتھ
سشنا	بدل جانا	سشنا	ویران ہونا۔ بدل جانا
جعل	نفرت	جعل	مکر۔ فریب
ہیم	وہ	ہیُم	اُس نے
رہ	دوسرا مہینہ	رَہ	دُو
زکر	یاد	زکر	یاد
حول	گھومنا۔ مروڑا جانا	حُل	ٹیڑھا
طوح	لپیٹنا	توہ	چھلکا
طول	لمبا کرنا	طول	طوالت

عبرانی	اردو معنی	کشمیری	اردو معنی
کذب	جھوٹ	کذب	جھوٹ بولنا
مہر	عورت کا مہر	مہر	عورت کا مہر
مزہ	چوسنا	مزہ	چکھنا
نوُر	روشن	نوُر	روشن
سحر	روشنی	سحر	پَو پھٹنے سے پہلا وقت
صفت	آراستہ کرنا	صفت	تعریف کرنا
قبر	دفن کرنا	قبر	گور۔ قبر
قدم	قدم	قدم	قدم
ذبح	قربان کرنا	ذبح	قربان کرنا
زعف	اُداس ہونا	زعف	کمزوری
عند	باندھنا	غنڈ	گرہ
اِتر	جگہ	ہیتھُر	نیچے کی جگہ
بلہ	گھبرایا ہوا	بلیاگ مُت	گھبرایا ہوا
جرم	ہڈی چبانا	ارم	پچھلے دانت جن سے ہڈی چبائی جاتی ہے
نیا	کچا ہونا	نیُول	کچا

آخر میں کشمیر کی وجہ تسمیہ بھی قابل غور ہے۔ کشمیر کا اصلی نام کشیر ہے۔ ہام کا بیٹا اور حضرت نوح کا پوتا کشش تھا۔ جس کی نسلیں یہاں آباد ہوگئیں۔ ان کے یہاں آباد ہوجانے سے اس ملک کا نام کشیر پڑ گیا۔ کشیر عبرانی زبان میں حلال خور کو کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی چونکہ یہاں اسرائیلی ذبح کیا ہوا گوشت استعمال کرتے تھے۔ وہ کاشر کہلانے لگے۔ کشمیر کے ہانجی اپنے آپ کو برملا طور پر حضرت نوح علیہ السلام کی نسل میں سے قرار دیتے ہیں (دیکھئے "تاریخ اقوام کشمیر صفحہ ۴۲۵"، "نگارستان کشمیر صفحہ ۴۹"، "امپیریل گزیٹر جلد کشمیر مطبوعہ کلکتہ ۱۹۰۹ء") پس ثابت ہوا کہ کشمیر میں بنی اسرائیل آباد ہوئے ہیں اور کشمیری زبان عبرانی زبان سے ماخوذ ہے۔

میر غلام محمد راجپوری
وزیر صنعت

صنعتی ترقی کی رفتار

انیسویں صدی اور موجودہ صدی میں جہاں یوروپ اور دوسرے مغربی ملکوں میں وسیع صنعتی ترقی ہوئی وہاں ہندوستان بہت پیچھے رہا۔ اور اس کے ساتھ ہی کشمیر بھی صنعتی طور پر آگے نہ بڑھ سکا۔ اس لئے نہیں کہ یہاں ذرائع نہیں تھے۔ ذرائع تو یہاں وافر مقدار میں تھے جیسا کہ آج کل سروے کرنے سے پتہ چلتا ہے۔ لیکن ان ذرائع کو زیر کار نہیں لایا جاتا تھا۔ اس کے لئے جاگیرداری نظام کے سماجی رشتے اور شخصی حکمرانی ذمہ دار تھی۔ کیونکہ اس دور کی معیشت کی بنیاد چند افراد کی خوشحالی اور اکثریت کی زبوں حالی پر تھی۔ شخصی حکومت کے خاتمہ کے بعد ریاست میں جاگیرداری معیشت کی بنیاد ختم ہو گئی اور نئے سماجی رشتے وجود میں آئے جن کی بنیاد اکثریت کی فارغ البالی اور خوشحالی پر رکھی گئی۔ اس نئے ماحول میں اقتصادی ترقی کی نئی نئی راہیں ڈھونڈی جانے لگیں اور قدرتی ذرائع کو استعمال کر کے مزید دولت پیدا کرنے کی سکیمیں مرتب کی گئیں۔ ان سکیموں کو اجتماعی طور پر پانسالہ منصوبے کا نام دیا گیا اور اس منصوبے کے تحت جہاں ریاست میں زرعی ترقی کے لئے بڑی بڑی رقمیں مخصوص کی گئیں وہاں صنعتیں قائم کرنے کی سکیموں کو بھی عملی جامہ پہنایا جانے لگا۔

جیسا کہ ظاہر ہے نئی صنعتیں قائم کرنے کے خاص مقاصد تھے۔ اوّل یہ کہ ریاست کے قدرتی ذرائع کو کام میں لا کر لوگوں کو کاروبار فراہم کیا جائے۔ کاروبار کے ذرائع میں وسعت ہو جانے سے جہاں افراد کی خوشحالی کا سامان پیدا ہوگا وہاں ریاست کی مجموعی معاشیات پر بھی اثر ہوگا۔ زراعت کے شعبے میں ضرورت سے زیادہ جو افراد ہیں ان کو متبادل کام ملنے پر کام کسانوں کے حصے میں زیادہ زرعی پیداوار آئے گی جو ان کی خوشحالی کا باعث بنے گی اور اس طرح ان کی قوت خرید بھی بڑھ جانے سے اقتصادی سرگرمیاں بڑھ جائیں گی۔ یہ امر ریاست کی تجارتی اور صنعتی ترقی میں بڑا مددگار ثابت ہوگا۔ اسی طرح صنعتوں میں کام کرنے والوں کی خوشحالی بھی تجارت و صنعت کی ترقی میں امداد و معاون ثابت ہوگی۔ اس کے علاوہ ریاست کے اندر صنعتی پیداوار بڑھ جانے سے ہندوستان سے باہر جانے والی ہماری خام اشیاء اور دوسری چیزیں خریدنے کے لئے سرمایہ کافی حد تک بچا رہے گا اور ریاست صنعتی چیزیں تیار کرنے کے قابل ہو جائے گی۔

یہ مقاصد رفتہ رفتہ پورے ہو رہے ہیں اور پچھلے چند برس میں ریاست میں خوشحالی کی جو فضا پائی جاتی ہے اس میں یہاں کی صنعتوں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ گو ریاست میں صنعتی ترقی کے لئے ذرائع بھی ہیں لیکن ان کو کام میں لاتے وقت جہاں حکومت نے اپنے مخصوص جغرافیائی حالات کو مدنظر رکھا ہے وہاں اس بات کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ صنعتی ترقی کے پروگرام کو ریاست کی اپنی صلاحیتوں اور ضروریات کے مطابق ترتیب کیا جائے اور ساتھ ہی اسے ہندوستان کے مجموعی صنعتی پروگرام کا جزو بھی بنایا جائے۔ ایسا طریق عمل اس لئے اپنایا گیا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر اقتصادی اعتبار سے ہندوستان کا ایک جزو ہے اور ہندوستان کی مجموعی معاشی ترقی کا اثر یہاں کی اقتصادی زندگی اور ترقی کے پروگرام پر پڑ سکتا ہے۔ ریاست میں وسیع پیمانے کی انڈسٹری قائم کرنے میں جغرافیائی مشکلات بہت زیادہ ہیں۔ رسل و رسائل کی کمی کے مسائل ہیں خام مال کو زیر کار لانے میں رکاوٹیں ہیں اور مختلف تقاضے پورے کرنے میں پیچ در پیچ مشکلات ہیں جن سے ریاست کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر نظریں ایسے کارخانوں کی طرف متوجہ ہوتی ہیں جو بڑی آسانی سے اور کم سرمایہ کی مدد سے فوری طور پر قائم ہو سکتے ہیں۔ ایسی انڈسٹریاں چھوٹے پیمانے اور درمیانی درجے کی ہی ہو سکتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پچھلے چند برسوں میں یہاں اکثر چھوٹے اور درمیانے درجے کے کارخانے قائم کئے گئے ہیں۔

ریاست کے پہلے پانسالہ منصوبہ میں صنعتوں کے متعلق سکیموں کے لئے ۴۴ لاکھ روپے مخصوص کئے گئے۔ لیکن اس میں سے صرف ۱۴ لاکھ دس ہزار روپے صرف کئے گئے۔ اس رقم سے ریاست میں ایک تو مختلف دستکاریوں کو بڑھاوا دیا گیا، دوسرے مختلف مقامات پر چھوٹے پیمانے کے صنعتی مرکز قائم کئے گئے۔ ریاست میں پہلے پلان سے پیشتر

ہیں سلک انڈسٹری، ڈرگ انڈسٹری اور روزن ٹرپنٹائن انڈسٹری قائم تھیں۔ ان صنعتوں کو کافی حد تک وسعت دی گئی اور ان کی پیداوار کی صلاحیت میں اضافہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ حسب ذیل چھوٹے کارخانے اور صنعتی مراکز جزوی طور پر قائم کئے گئے۔

(۱) شالٹینگ سری نگر میں چمڑے کا کارخانہ (۲) جموں میں رنگ و روغن کا کارخانہ (۳) سری نگر میں لکڑی کی سیزننگ کا کارخانہ (۴) آلات جراحی بنانے کا کارخانہ (۵) جموں میں بنائی کا مرکز (۶) ترکھانوں اور لوہاروں کے مراکز (۷) چمڑے کی چیزیں بنانے کا کارخانہ (۸) قالین فیکٹری سری نگر (۹) نمدہ سازی کا کارخانہ (۱۰) سنگ سازی کا کارخانہ (۱۱) بسوہلی میں بانس کی چیزیں بنانے کا کارخانہ (۱۲) ٹھٹھہ میں لکڑی کی چیزیں بنانے کا مرکز (۱۳) سوپور اور سری نگر میں اونی کپڑے بننے کے مراکز (۱۴) کشتواڑ، رام نگر، بندھال، بھدرواہ اور پونچھ میں اون کی چیزیں بنانے کے مراکز (۱۵) بسوہلی میں پشمینہ بافی کا مرکز (۱۶) سانبہ میں سوتی کپڑے بنانے کا مرکز (۱۷) ہیرانگر میں کھادی بنانے کا مرکز (۱۸) میراں صاحب جموں میں ہاتھ سے کاغذ بنانے کا مرکز (۱۹) جموں اور سری نگر میں مٹی کے برتن بنانے کے مراکز

ہر کارخانے اور صنعتی مراکز قائم کرنے سے ایک مذکورہ صدر علاقوں کے دیرینہ آرٹ کو فروغ ملا ہے اور دوسرے سینکڑوں لوگوں کو مستقل کاروبار فراہم ہوا ہے۔ ان مرکزوں کے علاوہ سری نگر میں مناسب داموں پر چیزیں بیچنے کی ایک دکان قائم کی گئی اور رنگ سازی کا ایک مرکز اور کیلنڈرنگ اور فنشنگ کا ایک مرکز وجود میں لایا گیا۔ پہلے پلان میں ایک اور اہم انڈسٹری کو بھی بڑھاوا ملا ہے۔ جو پانپور میں واقع ہے اور جو ملزی مل کے نام سے موسوم ہے۔ اس کارخانے میں ہر سال ۳۶ ہزار دروازے اور اتنی ہی کھڑکیاں بنائی جاتی ہیں اور یہ ہندوستان بھر میں اپنی قسم کا واحد کارخانہ ہے۔ اس سے کئی سو افراد کو کام ملا ہے اور اس کی مدد سے ریاست میں پیدا ہونے والی عمارتی لکڑی کا ایک بڑا حصہ زیر کار لایا گیا ہے۔ یہ کارخانے قائم کرنے کے علاوہ پہلے پلان میں دست کاریوں کو بھی فروغ دیا گیا۔ کاریگروں کے مختلف مراکز قائم کئے گئے۔ ان کو مستقل کاروبار اور باقاعدہ اجرتوں کی ضمانت فراہم کی گئی۔ دست کاریوں کی مارکیٹ وسیع کرنے کے لئے ایمپوریم کھولے گئے اور ان کی تنظیم کو وسعت دی گئی۔ دوسرے پانسالہ منصوبہ میں جو رقم اور نشانوں کے لحاظ سے پہلے پانچ سالہ پلان سے تقریباً چار گنا بڑا ہے، بڑی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لئے دو کروڑ ۸۰ لاکھ روپے اور درمیانے درجے اور وسیع پیمانے کے کارخانوں کے لئے ۵۰ لاکھ ۱۵ ہزار روپے مخصوص رکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک فنانس کارپوریشن قائم کرنے کے لئے بھی رقم مخصوص کی گئی ہے ان رقموں سے جو صنعتیں قائم کی جائیں گی ان میں سے خاص خاص حسب ذیل ہیں:-

(۱) ڈیمانسٹریشن جموں:- اس میں ایک لاکھ روپے کی لاگت آئے گی اور اس میں نوجوانوں کو جدید مشینری استعمال کرنے کے ڈھنگ سکھائے جائیں گے۔

(۲) ڈیزائن تیار کرنے کا سکول:- یہ سکول تین لاکھ روپے کی لاگت سے سری نگر میں قائم کیا جائے گا اور اس میں دست کاریوں کے لئے اور بہتر ڈیزائن تیار کرنے کے سلسلے میں کاریگروں کو تربیت دی جائے گی۔

(۳) مختلف فنون کے ورک شاپ:- ایسے کئی ورک شاپ جن میں ترکھانوں اور لوہاروں کو تربیت دی جائے گی، قائم کئے جائیں گے۔

(۴) سلک سے متعلق مراکز:- یہ مراکز مختلف مقامات پر قائم کئے جائیں گے تاکہ کاریگروں کو خام مواد اور تربیت کی سہولیات دی جا سکیں۔

(۵) برتن بنانے کا کارخانہ:- یہ کارخانہ ایک لاکھ روپیہ کے ابتدائی سرمایہ سے قائم ہوگا اور اس میں سالانہ سات ہزار برتن تیار کئے جائیں گے۔

(۶) اینٹیں بنانے کا کارخانہ:- یہ کارخانہ دس لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوگا۔ اور اس میں اینٹیں اور ٹائلیں بنائی جائیں گی۔

(۷) بجلی کے سامان کا کارخانہ:- یہ کارخانہ پانچ لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوگا۔

(۸) کشلری فیکٹری:- اس کارخانے پر تین لاکھ روپے کی لاگت کا اندازہ ہے۔

(۹) آلات جراحی اور موزری کے کارخانے:- یہ کارخانے مقامی ضروریات پورا کرنے کے لئے قائم کئے جائیں گے۔

(۱۰) پنسل انڈسٹری:- یہ کارخانہ ۵ لاکھ روپے کی لاگت سے قائم کیا جائے گا۔ اور اس میں سالانہ ایک لاکھ گرس پنسلیں تیار ہوں گی۔

(۱۱) کشمیر وڈ ورکس:- اس کارخانے کو وسعت دینے کے لئے تین لاکھ روپے خرچ کئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ لکڑی چیرنے کا ایک کارخانہ اور لکڑی سے متعلق چند اور کارخانے قائم کئے جائیں گے۔

(۱۲) بانس کا سامان بنانے کا کارخانہ۔ یہ کارخانہ پہلے ہی قائم ہوا تھا اور اسے وسعت دی جا رہی ہے۔

(۱۳) سرامک فیکٹری:- اس فیکٹری کے قیام کے لئے یہاں حالات موافق ہیں۔ ابتدائی طور پر اسے ۲۰ لاکھ ۵۰ ہزار روپے کی لاگت سے قائم کیا جائے گا۔

(۱۴) سیمنٹ انڈسٹری:- یہ کارخانہ سوا کروڑ روپے کی لاگت سے بنایا جا رہا ہے۔

ان کارخانوں کے علاوہ ریشم اور دوسرے کارخانوں کو وُسعت دی جائے گی۔ گھریلو دست کاریوں اور نیم صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے بھی ۱۹ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی ہے جو قرضوں کی صورت میں فراہم کی جائے گی۔ اہم دست کاریوں کو بھی وُسعت دی جائے گی اور ۴۳ نئے پروڈکشن سنٹر قائم کئے جائیں گے اور اس سلسلہ میں ایمپوریم کی کئی شاخیں ہند اور بیرونِ ہند میں کھولی جائیں گی۔

ماضی میں یہاں کی گھریلو دست کاری اور گھریلو صنعتیں ہی صنعتی میدان میں سب سے بڑا سہارا رہی ہیں۔ حکومت نے صنعت و حرفت کو نہ صرف پھر سے زندہ کرنے، بلکہ ان کو ٹھوس طریقے پر بہتر بنانے کی خاطر بہت سے ایسے اقدامات کئے ہیں جن سے یہ جدید دَور کے تقاضوں اور مزاج سے ہم آہنگ ہوسکے۔ آل انڈیا صنعتی بورڈ کی مدد سے ایک سکول آف ڈیزائن کا بھی قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ جہاں اس وقت پیپر ماشی، ووڈ کارونگ، کشیدہ کاری اور ترکوئیس کے کام کا تجربہ رکھنے والے فن کار کام کر رہے ہیں۔ یہ سکول مختلف ڈیزائنوں کی چیزیں تیار کرتا ہے جو پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر میں کام کرنے والی مختلف جماعتوں کو نمونے کے طور پر مُفت بھیجے جاتے ہیں۔ اپنی دستکاریوں کی برآمد کو فروغ دینے کے لئے مختلف اقسام کی صنعتوں کے نمونے کُل ہند صنعتی بورڈ کے ذریعہ بیرونی ممالک میں بھی ہندوستانی سفارت خانوں کو بھجوائے گئے ہیں تاکہ ان کی زیادہ سے زیادہ تشہیر ہوسکے۔

سرینگر میں اخروٹ کی لکڑی کا سیزننگ پلانٹ لگایا گیا ہے۔ اس پلانٹ نے اپنا کام شروع کر دیا ہے اور یہ لکڑی پر نقاشی کا کام کرنے والوں کے ایک بڑے حصے کی ضروریات پُوری کر رہا ہے۔

جہاں تک ہاتھ کھڈی کی صنعت کا تعلق ہے مرکزی حکومت کے سیس ایکٹ کے ریاست جموں وکشمیر پر اطلاق ہونے سے اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ صنعت کے اس حصہ میں کواپریٹیو سوسائٹیوں کی تشکیل دی جائے۔ اس سلسلے میں جموں اور کشمیر میں اُون، سُوت اور سلک کی سوسائٹیاں قائم کرنے کے لئے متعدد اسکیمیں مرتب کی گئی ہیں۔ ان میں سے ریشمی کپڑے تیار کرنے کے لئے ایک ہینڈ لوم کواپریٹیو سوسائٹی قائم کی جا رہی ہے اور توقع ہے کہ یہ بہت جلد چالو ہو جائے گی۔ گورنمنٹ ووولن ملز نے بھی نمایاں ترقی کی ہے۔ اس کارخانہ نے سالِ گذشتہ یعنی ۵۷ - ۱۹۵۶ء میں سترہ لاکھ روپے کا مال فروخت کرکے ایک ریکارڈ قائم کیا۔ جب کہ اس سے پہلے کے سال میں صرف ساڑھے بارہ لاکھ روپے کا مال فروخت کیا گیا تھا۔ عنقریب ہی ان کارخانوں کی نئے سرے سے تنظیم کی جائے گی تاکہ اچھی کوالٹی کا دھاگہ تیار کرکے رفل شال بنانے والوں کی ضروریات پُوری کی جا سکیں۔ اُون، سُوت اور سلک کے جو بھی ملبوسات ریاست میں تیار ہوتے ہیں، ان کی رنگائی، کاہینڈرنگ اور فنشنگ کے لئے اب تک ضروری سہولیات میسّر نہیں تھیں۔ لیکن اب ان دُشواریوں پر قابو پانے کے لئے کوششیں ہو رہی ہیں۔ چنانچہ سرینگر میں ایک مرکزی ڈائنگ ہاؤس کھولا جا رہا ہے جہاں سائنسی بُنیادوں پر پکّے رنگ چڑھائے جاتے ہیں۔ نیز ایک کیلنڈرنگ اور فنشنگ پلانٹ بھی خریدا گیا ہے جس کو بہت جلد اس عمارت میں نصب کیا جائے گا جو اس غرض کے لئے سانبہ میں بنائی گئی ہے۔

پشمینہ انڈسٹری کو، جو کہ مرحوم لارنس کے قول کے مطابق اُنیسویں صدی کے آخری دَور میں ۲۸,۰۰۰ کاریگروں کو روزگار مہیا کرتی تھی، گذشتہ دس سال کے دَوران میں بھاری دھکا لگا ہے اور وہ اس لئے کہ ریشم بھاری قیمت کے عوض بیرونی ممالک کو برآمد کیا جاتا تھا۔ لیکن اب صورت یہ نہیں ہے۔ مرکزی حکومت کی سرپرستی سے ریاست اب ریشم کی برآمد کو محدود کرنے اور ریاست کی اس تاریخی صنعت کو بحال کرنے میں کامیاب ہوسکی ہے جو کہ ایک وقت تمام دُنیا میں مشہور تھی۔ اس صنعت کو اُستوار بُنیادوں پر کھڑا کرنے کے لئے حکومت نے فراخ دِلی سے رقمیں مہیا کی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ حکومت کی کوششیں بار آور ہو رہی ہیں۔ چنانچہ قدیمی کانی پشمینہ صنعت کو، جو کہ مکمل طور پر تباہ ہو گئی تھی، پھر سے بحال کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۵۷ء کے دَوران ریاست کے مختلف حصوں میں مہیا خام مواد کا جائزہ لینے کے لئے ایک جامع سروے کی گئی اور مختلف صنعتوں مثلاً ویلو ورکس، مٹی کے برتن بنانے وغیرہ کو جاری کرنے کے لئے کئی سکیمیں تیار کی گئیں اور ان میں سے کچھ سکیموں پر ۱۹۵۸ء کے دوران عمل درآمد شروع کیا گیا ہے۔ لداخ کے مُناسب مقامات پر موزوں صنعتیں جاری کرکے اس ضلع کو ترقی دینے کے لئے تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ یہاں دو موجودہ بُنائی کے مرکزوں کے علاوہ دو اور سنٹر قائم کئے گئے ہیں جن میں سے ایک نمدے بنانے اور دوسرا قدیم آرٹ پینٹنگ کے لئے مخصوص ہے۔ لیہ کے مشرق میں ۱۰۳ میل دُور ۱۴,۰۰۰ فٹ کی بلندی پر پانگ کانگ جھیل کے کھاری پانی سے نمک تیار کرنے کا جائزہ لینے کی کوششیں رُو بہ ترقی ہیں۔ سلک کی صنعت، جو کہ ساری ریاست میں تقریباً ساٹھ ہزار لوگوں کو جُزوی طور پر اور پانچ ہزار ہُنرمند اور غیر ہُنرمند لوگوں کو مستقل طور پر روزگار بہم پہنچاتی ہے، کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں سلک کا تار نکالنے سے متعلق تدریجی عمل میں کافی ترقی ہوئی ہے جس کے نتیجہ میں تار سلک کی قیمت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

سیرہ گنڈ میں توت کے پودوں میں پیوند لگانے کی نرسری کو ۲۰۰ کنال کے مزید رقبہ پر پھیلا دیا گیا ہے جس میں گذشتہ سال کے دوران ۵۰ ہزار پودے لگائے گئے۔ اسی قسم کی دوسری نرسری کو ننگام میں لگائی جا رہی ہے جہاں اس مقصد کے لئے ۲۰۰ کنال زمین کا ایک رقبہ خرید لیا گیا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ محکمہ کی اور زمینداروں کے ذریعے بھی ایک لاکھ ۲۲ ہزار پودے اگائے گئے ہیں۔

آرٹس ایمپوریم کی سرگرمیاں بھی کافی بڑھ گئی ہیں جس کے نتیجہ میں ایمپوریم نے گذشتہ سال میں تقریباً ۳۸ لاکھ روپے کا مال فروخت کیا۔ ایمپوریم نے سوویت روس کی حکومت سے مال کی فراہمی کے کافی آرڈر حاصل کرنے اور ہندوستان کے کئی مقامات میں اپنی شاخیں کھولنے کے علاوہ ہندوستان اور بیرونی ممالک کی نمائشوں اور میلوں میں بھی حصہ لیا جن میں پی کنگ اور مشرقی جرمنی میں منعقد کی گئی انڈین انڈسٹریل اگزیبیشن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ پبلک سیکٹر میں یکم اپریل ۵۷ء سے اپریل ۵۸ء تک ۸۰۵ صنعت کاروں اور مختلف صنعتی اداروں کو ۱۴ لاکھ روپے کی مالی امداد مہیا کی گئی۔

جموں اور سرینگر میں دو بڑی اور اننت ناگ میں ایک چھوٹی صنعتی بستی تعمیر کرنے کا کام بھی ہاتھ میں لیا گیا ہے۔ متعدد کوارٹروں اور چھوٹی عمارتوں کے علاوہ جموں کی بستی کے ۴۶ فیکٹری شیڈوں میں سے ۱۱ شیڈ مکمل کر لئے گئے ہیں۔ سرینگر کی بستی کے لئے شالٹینگ میں چار شیڈ بنائے گئے ہیں اور اننت ناگ میں بستی تعمیر کرنے کا کام جلد شروع کیا جا رہا ہے۔ ان بستیوں کو تعمیر کرنے کا سب سے بڑا مقصد پرائیویٹ سیکٹر کے لئے کرایہ یا پٹے پر یا بالکل قیمت فروخت پر کارخانوں کے لئے جگہ مہیا کرنا ہے۔ ان بستیوں پر کُل ملا کر ۴۰ لاکھ روپے لاگت آئے گی۔ جن میں مال تیار کرنے والے اداروں کو ڈائننگ ہاؤس، ڈاک خانہ، ٹیلی فون ایکس چینج، واٹر سپلائی، بجلی اور مزدوروں کی تفریح سے متعلق سہولتیں میسر ہوں گی۔

سرجیکل انسٹرومنٹ فیکٹری نے بھی اپنی پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں خاصی ترقی کی ہے۔ بجلی کے ہیٹروں کے علاوہ فیکٹری میں چھوٹے اور بڑے سائز کے اعلیٰ کوالٹی کے ہیٹر لائیزرس اور لاکرس وغیرہ تیار کئے جاتے ہیں جو میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں پسند کئے جاتے ہیں اور خریدے جاتے ہیں۔

جموں میں مارچ ۱۹۵۸ء میں ایک نٹنگ فیکٹری کھولی گئی۔ چنانچہ اس کارخانے نے اپنے قیام کے پہلے سال ہی میں کافی منافع کمایا ہے۔ شالٹینگ میں چمڑے کے سرکاری کارخانے کو، جس کی سرگرمیاں سال بہ سال بڑھ رہی ہیں، ایک مکمل کارخانہ بنا دیا جا رہا ہے۔ اس کارخانہ کے لئے مطلوبہ مشینری یہاں پہنچ گئی ہے اور وہ عمارت بھی تعمیر ہو چکی ہے جس میں مشینری لگائی جائے گی۔

روزن اینڈ ٹرپنٹائن فیکٹری کو، جو کہ ڈیڑھ سو لوگوں کو مستقل طور پر روزگار مہیا کرنے کے علاوہ جموں کے مختلف دیہات میں رہنے والے بارہ سو آدمیوں کو کام دیتی ہے، جدید لائنوں پر منظم کیا جا رہا ہے۔ فیکٹری کے نئے پلانٹ اور دوسری ضروریات کے لئے دوسرے پانچ سالہ منصوبہ میں پانچ لاکھ روپے مخصوص کئے گئے ہیں۔

میراں صاحب میں کشمیر وڈ فیکٹری کی سرگرمیوں میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ فیکٹری میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ فیکٹری میں اس وقت ۱۴۴ آدمی کام کرتے ہیں۔ جہاں اب ہاکی سٹکوں کے علاوہ فٹ بال، والی بال وغیرہ بھی تیار کی جاتی ہیں۔

اخروٹ کی لکڑی کے ٹُنڈوں اور بدسوں پر تہیں چڑھانے کے لئے ایک سکیم بنائی گئی ہے۔ پلانٹ اور دوسرا سامان خریدنے کے متعلق ضروری تجاویز فنی جائزہ لینے کے لئے مرکزی حکومت کے پاس بھیج دی گئی ہے۔

سالِ رواں یعنی ۱۹۵۸ء میں کھولے جانے والے کارخانوں میں اینٹیں اور ٹائیں تیار کرنے کے کارخانے کا قیام بھی شامل ہے جو ایشیا میں اپنی نوعیت کا پہلا کارخانہ ہے۔ یہ بلاشبہ کافی شاندار کارنامہ ہے۔ پلانٹ کے لئے جنوری ۱۹۵۸ء میں آرڈر دیئے گئے ہیں اور چیکوسلاواکیہ سے یہ سامان جلدی یہاں پہنچ جانے کی توقع ہے۔ اس کارخانہ کو قائم کرنے کی ضرورت کا اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے قیام سے نہ صرف ہمارے ایندھن کے محدود ذرائع پر سے دباؤ کم ہو جائے گا بلکہ ہم زیادہ سے زیادہ ۲۴ روپے میں ایک ہزار اینٹیں تیار کر سکیں گے جب کہ آج کل اینٹوں کے ایک ہزار کے لئے ۵۰ سے ۸۰ روپے تک خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اس کارخانہ میں ہر سال اسی ہزار اینٹیں اور دس ہزار چھت کے ٹائیل تیار کئے جائیں گے۔ دو امیدواروں کو اینٹیں تیار کرنے کے فن کی تربیت دلانے کے لئے چیکوسلاواکیہ بھیج دینے کے انتظامات مکمل کر لئے گئے ہیں۔

جموں میں سرامک فیکٹری، جو شمالی ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی ہو گی، کے لئے ضروری مشینری اور سامان کی تجاویز اُن ٹینڈروں کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے جو کہ اس سلسلہ میں باہر کے کچھ ملکوں سے موصول ہوئے ہیں اور فنی جانچ پڑتال کے لئے مرکزی حکومت کے پاس بھیج دئے گئے ہیں۔ اُمید ہے کہ سکیم ہٰذا کو بہت جلد عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ دریں اثنا سرینگر میں مٹی کے برتن بنانے والی فیکٹری کے لئے ضروری سامان پہنچ گیا ہے اور اسے نصب کیا جا رہا ہے۔

اگرچہ سیمنٹ تیار کرنے کا خام مواد یہیں دستیاب ہے لیکن پھر بھی سیمنٹ تیار کرنے کا کوئی ادارہ یہاں موجود نہ ہونے کی وجہ سے ریاست کے باہر سے گراں قیمتوں پر سیمنٹ برآمد کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا حکومت نے دو فیکٹریاں ایک سری نگر اور ایک جموں میں قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کشمیر میں ساٹھ لاکھ ٹن سیمنٹ تیار کرنے کا پلانٹ نصب کرنے کے بارے میں خط و کتابت کے سارے مراحل طے کئے جا چکے ہیں۔ حکومت ہند کی طبقات الارض کی ایک جماعت آج کل ریاستی کی سروے کر رہی ہے اور سروے کی رپورٹ موصول ہوتے ہی اس علاقہ میں دو سو ٹن کا پلانٹ نصب کیا جائے گا۔

لگنائٹ کے ذخیروں کی کھوج لگانے کے لئے جو کرسٹر پٹل میں کے اندازہ کے مطابق ایک لاکھ اٹھائیس ہزار ٹن کے قریب ہیں، ایک مفصل سکیم مرتب کی گئی ہے جس کا جائزہ وہ غیر ملکی ماہرین لیں گے جو کہ مرکزی حکومت اس سلسلے میں یہاں بھیج دے گی۔

اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ ریاست کے معدنی ذخیرے اب بھی مدفون ہیں جن کی کھوج لگانے کے لئے مناسب اقدام کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ماہر مائننگ انجینئروں اور دوسرے ماہروں کی خدمات حاصل کرنے کے لئے کوششیں کی جا رہی ہیں اور اس سلسلے میں بیرونی ملکوں سے جو خط و کتابت ہو رہی ہے وہ اس سال کے موسم سرما میں اختتام کو پہنچ جائے گی۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حکومت ہند کے محکمہ طبقات الارض نے کئی علاقوں میں کھدائی کا کام شروع کر دیا ہے اور توقع ہے کہ اس سلسلے میں جو مواد دستیاب ہوگا وہ نئی صنعتیں قائم کرنے میں مددگار و معاون ثابت ہوگا۔

مرکزی سرکار کے سکول آف ڈیزائن اور انسٹی چیوٹ سے قرضوں اور فنی تعاون کی شکل میں مالی امداد ملنے کے علاوہ مرکز کے سمال سکیل سروس انسٹی چیوٹ سے مختلف تجارتی اداروں کے لئے ضروری مشینری طویل مدت کے کرایہ کی بنیادوں پر خریدنے کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر میں کچھ نئے ادارے قائم ہو جانے کے علاوہ حال ہی میں سری نگر کے نواح میں ایک بڑے پیمانے کی رائز نیل فیکٹری بھی منصۂ شہود پر آگئی ہے۔ اندازہ ہے کہ مندرجہ صدر اقدامات کے نتیجہ میں تقریباً چھ ہزار لوگوں میں کام مہیا ہو سکے گا۔

ریاست کو صنعتی لحاظ سے ترقی دینے کے لئے ساتھ ہی ساتھ حکومت صنعتوں میں کام کرنے والوں کے تئیں اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہے۔ لیبر قوانین کو، جن کے طفیل ... مزدوروں کو متعدد سہولتیں ملی ہیں، حال ہی میں منظم کئے گئے ایک جامع آرگنائزیشن کے ذریعے نافذ کیا جا رہا ہے۔ انڈسٹریل ڈسپیوٹ ایکٹ، ٹریڈ یونین ایکٹ، فیکٹریز ایکٹ شاپس اینڈ کمرشل اسٹیبلشمنٹ ایکٹ وغیرہ کا نفاذ عمل میں لانے کے لئے ایک لیبر کمشنر، ایک لیبر ٹربیونل، کئی لیبر ویلفیئر آفیسر اور متعدد انسپکٹر بھرتی کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مزدوروں کو تفریح کی معقول سہولیات اور طبی امداد مہیا کرنے کے لئے سری نگر اور جموں میں دو لیبر ویلفیئر سنٹر بنائے گئے ہیں۔ نیز ریاست کے بڑے بڑے کارخانوں مثلاً سلک فیکٹری جموں، سلک فیکٹری سری نگر، گورنمنٹ وولن ملز سری نگر، راج باغ سلک ویونگ فیکٹری، گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم اور کشمیر وڈ اور روزن ٹرپنٹائن فیکٹری کے مزدوروں کو ابتدائی تعلیم دینے کے انتظامات مکمل کر لئے گئے ہیں۔

ریاست میں بڑے پیمانے کی صنعتوں، خاص کر جو ریاست کے اہم شہروں اور قصبوں کے نواح میں واقع ہیں، میں کام کرنے والے مزدوروں کو رہائش کے لئے جگہیں مہیا کرنے کے لئے چار لاکھ روپے منظور کئے گئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے جو کوارٹر تعمیر کئے جائیں گے ان کے لئے میراں صاحب جموں، پانپور اور سری نگر کے نواح میں جگہیں منتخب کی گئی ہیں۔

مستقبل میں اقتصادی خوش حالی پیدا کرنے کے لئے پرائیویٹ سیکٹر کے کام کی اہمیت واضح ہے۔ حکومت نے خاص طور پر اس نظریہ کے مطابق پرائیویٹ سیکٹر کو بڑھاوا دینے کی خاطر امسال ایسے اداروں کو بہت سی سہولیات بہم پہنچائی ہیں۔ حکومت کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ ریاست میں پرائیویٹ سیکٹر مالی، ٹیکنیکل اور ناموافق تاریخی پس منظر کی وجہ سے بہت سی مشکلات سے دوچار ہے اور اسی وجہ سے اس سیکٹر میں کام کرنے والوں کے منفی رجحانات ہیں اور انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ حکومت چاہتی ہے کہ صنعتی طبقہ کے ذہن سے غیر صحت مند میلانات اور گذشتہ روایتوں سے پیدا شدہ مردہ دلی کے اثرات کو مٹا دیا جائے۔ اس غرض کے لئے قدرتی طور پر جہاں ہمیں دوسرے اقدامات کرنے پڑیں گے وہاں اس بات کا شدید طور پر دھیان رکھنا پڑے گا کہ پیداواری کاموں میں کام کرنے والوں کی از سر نو تنظیم اور تشکیل کر کے انہیں واضح اور صحیح سمت میں چلایا جائے اور اس طرح انہیں اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کے توازن کا احساس دلایا جائے۔

مندرجہ بالا اقدامات بجائے خود ابتدائی نوعیت کے ہیں، لیکن ان سے ریاست کی معاشیات ایک نئے سانچے میں ڈھل جائے گی اور جہاں ریاست کی دولت میں اضافہ ہوگا وہاں عام لوگوں کی خوشحالی براہ راست اور بالواسطہ طور پر خوشگوار انداز میں متاثر ہوگی+

سی، راجگوپال آچاری

رادھا

بیمار راموُ نے ایکا ایکی اپنی آنکھیں کھول دیں۔

گیت کی لَے کتنی مدھر ہے، ہو بہو ویسی ہی — جیسے رادھا کی ماں گا رہی ہو! وہی گیت، وہی بول، وہی سُر — یقیناً وہی ہے۔ (مگر وہ کیسے ہو سکتی ہے؟ راموُ کا چہرہ مُرجھا گیا)

"رادھا، او رادھا!" دھیمی آواز میں راموُ نے پُکارا۔

"آئی بابا — ابھی آئی۔" آواز کے ساتھ ہی رادھا بھی کمرہ میں موجود تھی۔

"کیا چاہیئے بابا؟"

"یہ کون گا رہا ہے رادھا؟ کتنی پیاری آواز ہے۔ کہیں کوئی راہ گیر تو نیچے نغمے کی دُھن نہیں چھیڑ رہا — کون ہو سکتا ہے بیٹی؟" راموُ نے رُک رُک کر پُوچھا۔

"نیچے تو کوئی بھی نظر نہیں آ رہا — کوئی بھی تو نہیں گا رہا ہے بابا۔" رادھا نے تعجب کے ساتھ اپنے باپ کے سوال کو سُنا۔ پھر یکایک پُوچھنے لگی —

"کیا آپ ابھی سوتے سے اُٹھے ہیں؟"

"نہیں تو — میں سویا ہی کب تھا جو جاگنے کا سوال پیدا ہو۔" راموُ نے بیٹی نے جو سمجھا تھا اُس کا اندازہ لگا لیا۔

"میں نے گانے کی آواز سُنی ہے بیٹی — کیا پڑوس میں ریڈیو بج رہا ہے؟"

"نہیں بابا۔ پڑوس میں نہ تو ریڈیو ہی بج رہا ہے اور نہ ہی کوئی گا رہا ہے —"

رادھا ابھی تک اُلجھن میں تھی کہ دفعتاً راموُ کو کیا ہو گیا ہے۔ پھر بھی اُس نے بات کو ختم کرنا چاہا۔

"آپ تھوڑی دیر کو سو کیوں نہیں جاتے؟ کتنا اچھا ہو جو چند لمحے آپ آرام کر لیں۔"

"تُو غلط سمجھ رہی ہے بیٹی — میں کچی نیند سے نہیں جاگا ہوں۔ یقیناً میں نے گانے کی آواز سُنی ہے۔ وہ آواز اس وقت بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے — تیری ماں گا رہی ہے رادھا — وہی گیت، وہی بول، وہی سُر۔ اُس گانے کو تیری ماں کتنا پسند کرتی تھی — آخر یہ تجھے سُنائی کیوں نہیں دے رہا؟"

بہت دیر تک راموُ گیت کے بولوں میں ڈوبا رادھا کو یہ یقین دِلانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، یہ اُس کا واہمہ نہیں ہے۔ رادھا چُپ چاپ سُنتی رہی۔ آخر تھک ہار کر راموُ کی آواز دھیمی سے دھیمی ہوتی گئی اور دھیرے دھیرے اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

رادھا نے موقعہ غنیمت جانا اور دَبے قدموں وہاں سے کھِسک گئی۔

پانچ سال بیتے جب راموُ کی بیوی اپنے داماد اور بیٹی کو روتا چھوڑ کر موت کے اُن ویرانوں کی سمت چلی گئی تھی جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں لوٹا ہے۔ راموُ کا تو بُرا حال تھا۔ بیوی کیا مری اُسے ایسا لگا جیسے اس کی ساری متاعِ حیات لُٹ گئی ہو — اور وہ دُنیا میں غم سہنے کے لئے بالکل اکیلا رہ گیا ہے — وہ تب سے مستقل بیمار رہنے لگا۔ زندگی کے ان جاں گُسل ایّام میں رادھا کا دَم غنیمت تھا۔ لیکن رادھا خود غموں کے بوجھ تلے دَبی ہوئی تھی اور اس سب کا ذمّہ دار راجوُ تھا۔

راجوُ، رادھا کی ماں کا چھوٹا بھائی تھا۔ جنوب میں قرنہا قرن سے پڑی رسم کے مطابق عموماً قریبی عزیزوں میں شادی بیاہ کیا جاتا ہے۔ اور یہ امر مسلّمہ ہے کہ ایک بار جب کوئی رسم پڑ جاتی ہے تو اُس کی تکمیل کے لئے خاندانی دباؤ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ راموُ بھی اُس سے رُوگشی کی ہمت نہ کر سکا اور رادھا کا پلّو راجوُ کے پلّو سے باندھ دیا گیا۔

رادھا کی ماں کے انتقال کے وقت اُس کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ وہ عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکی تھی جب جوانی کی ہوا جذبات میں اُمنگوں کا طوفان جگانے لگتی ہے۔ لیکن وہ ہنوز اپنے خاوند کے ساتھ ازدواجی زندگی کی کامرانیوں کا مزا نہ چکھ

سکی تھی۔

بات کچھ بھی نہ تھی۔ ایک ذراسی غلط فہمی نے رامو اور راجو کے بیچ میں اختلافات کی خلیج حائل کر دی اور بات یہاں تک آگے بڑھی کہ مصالحت تو رکنار، دونوں گھرانوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور دشمنی کی بنا پڑ گئی۔

رامو نے راجو کے ساتھ کسی قسم کا بھی ناطہ رکھنے سے انکار کر دیا اور صاف لفظوں میں بتا دیا کہ رادھا اور راجو کی شادی اس کے نزدیک بے حقیقت بن گئی ہے اور اس رشتہ کو سدا کے لئے ختم سمجھنا چاہیئے۔

راجو کے باپ کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اس وقت راجو کی عمر بہت کم تھی اور وہ اُن ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے قطعاً نا اہل تھا جو باپ کی موت کے بعد اُس پر عائد ہو جاتی تھیں۔ خاندان کا بزرگ ہونے کے ناطے یہ بوجھ رامو کو اُٹھانا پڑا۔ اب راجو کے باپ کی چھوڑی تمام جائداد کی دیکھ ریکھ رامو کے ذمہ تھی اور وہ اپنے فرائض بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہا تھا۔

یہ دیکھ ریکھ راجو کے بعض رشتہ داروں کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ تو آس لگائے بیٹھے تھے کہ راجو کے باپ کے مرتے ہی اُس کی دولت سے اپنے کار و بار کو چمکائیں گے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی برعکس نکلا — نتیجہ میں ان رشتہ داروں نے راجو کے کان اپنے سسر کے خلاف بھرنا شروع کر دئے۔ انہوں نے الزام لگایا کہ رامو بے ایمانی پہ آمادہ ہے اور اس نے راجو کی جائداد اور دولت سے نہ صرف اپنے تمام قرضے چُکائے ہیں بلکہ وہ دھیرے دھیرے اس پیسے کو اپنے حسابات میں منتقل کر رہا ہے۔

راجو آخر انسان تھا۔ پہلے تو اُس نے ان باتوں کو اہمیت نہ دی۔ لیکن اس زور و شور کے ساتھ رامو کے خلاف محاذ قائم کیا گیا کہ ان حکایتوں پر راجو کو بھی یقین آ گیا۔ اُس نے شکایتی انداز میں یہ بات اپنے چند دوستوں اور عزیزوں سے کہی۔

یہ خبر رامو تک پہنچی۔ وہ ان سازشوں سے لاعلم تھا — راجو اس پر بے ایمانی کا الزام لگائے گا۔ یہ کبھی وہ تصور میں بھی نہ سوچ سکتا تھا۔ وہ غصّہ سے تپنے لگا۔ اُس نے تہیّہ کر لیا کہ آج سے رادھا اور راجو کا کوئی ناطہ نہیں ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی قسمت راجو کے ساتھ وابستہ کرنے پر کسی صورت میں آمادہ نہ تھا۔

رادھا کو سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں وہ اپنی تعلیم کی تکمیل کرنے لگی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد رامو نے اُسے ایک مقامی مدرسہ میں معلّم کی جگہ پر ملازمت دی — اب تعمیر۔

وہ اپنا سارا جیون بغیر کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے اطمینان کے ساتھ بِتا سکتی تھی۔

رامو مطمئن ہو گیا۔

تب کا دِن اور آج کا دِن رادھا نے اپنے شوہر کی صورت تک نہ دیکھی تھی۔ اُس کا باپ ہی اب اس کا سب کچھ تھا۔ ————————

پانچ سات منٹ تک بظاہر ایسا لگا جیسے رامو سو گیا ہو۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اُس نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔

"رادھا! تیری ماں ہی تو گا رہی ہے۔ یقیناً وہی ہے — کیا تمہارے کانوں میں اُس کے رام بھجن گانے کی آواز نہیں آ رہی؟ آخر تم سُن کیوں نہیں رہی ہو؟ — مجھے ایسا جان پڑتا ہے جیسے وہ مجھے لے جانے کے لئے آئی ہو — شاید میرا وقت پُورا ہو گیا ہے — ہاں رادھا اب شاید اور نہ جی سکوں گا — میری بچّی! خدا تیرا نگہبان ہو۔ تُو خوف زدہ نہ ہونا۔ دیوتا ہمیشہ تیری حفاظت کریں گے۔"

تھکی ہوئی آواز میں بوڑھا رامو اپنے ذہن میں موت کے تصوّر کو بسائے بڑی دیر تک بیٹی سے باتیں کرتا رہا — رادھا گھبرا گئی۔

"ایسی باتیں نہ کرو بابا — اب تو تم اچھے ہو گئے ہو — دیکھو تمہارا بدن ٹھنڈا ہو رہا ہے، بُخار تو کبھی کا اُتر چکا — بس ذرا دیر کے لئے سو جاؤ، پھر تم خود کو بالکل اچھا محسوس کرو گے۔"

لیکن رامو پہ رادھا کی اس جھوٹی تسلّی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور وہ زیرِ لب بڑبڑانے لگا — "رادھا کی ماں! میں آ رہا ہوں — میں تیرے پاس آنے کے لئے بالکل تیار ہوں میری جیون ساتھی!"

اُس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور ایک دفعہ پھر خاموشی پھیل گئی۔

رادھا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

دوسرے دن سویرے یہی کوئی دس بجے ہوں گے، رادھا کی آواز رامو کے کان کے پردوں سے ٹکرائی —

"بابا! ماما آئے ہیں — دیکھیئے وہ برآمدے میں داخل ہو گئے — میں نہیں جانتی وہ کاہے کو یہاں آئے ہیں۔"

(ماما سے رادھا کی مُراد اس کا شوہر تھا)

رادھا کی بات ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ راجو کمرے میں داخل ہو گیا — اور

آتے ہی وہ رامو کے قدموں میں گر گیا۔

"میں بہت بڑا گنہگار ہوں دولہا بھائی — اگر آپ نے مجھے معاف نہیں کیا تو میرے گناہ کا یہ احساس مجھے کبھی چین کی نیند نہ سونے دے گا — مجھے معاف کر دیجئے دولہا بھائی — "

راجو مضبوطی کے ساتھ رامو کے قدموں کو پکڑے ہوئے تھا۔ اظہارِ پشیمانی کے طور پر اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور وہ بدستور معافی کا خواہاں تھا۔

"دولہا بھائی ایک بار میری طرف دیکھئے اور کہہ دیجئے کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے ورنہ میں کبھی آپ کے پیر نہ چھوڑوں گا۔"

کچھ بھی ہو راجو آخر رامو کی بیٹی کا شوہر تھا۔ اس کی چہیتی بیوی کا بھائی تھا۔ اُسے ترس آ ہی گیا اور رامو نے کم زور آواز میں اُسے معاف کرنے کا اعلان کر دیا — وہ راجو کو سمجھانے لگا :

میں کون ہوتا ہوں تمہیں معاف کرنے والا — یہ تو بھگوان ہیں جن کی مرضی سے تمام نیکیاں اور گناہ جنم لیتے ہیں۔ جب تم مجھ سے بدگمان تھے وہ بھی اُسی کی مرضی تھی — آج جب تمہارے ذہن سے تمام بدگمانیوں کا میل دُھل گیا ہے تو یہ بھی اُسی کی وجہ سے ہوا — رامو ! بھگوان سے ہی اپنے بھول کی معافی مانگو، وہ بڑا دیالو ہے۔ وہ ضرور تمہیں معاف کر دے گا۔ "

دونوں طرف آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور ان آنسوؤں میں بدگمانیوں کا تمام میل بہہ گیا۔ اور چند لمحوں میں رامو اور راجو ایسے باتیں کرنے لگے جیسے اُن میں کبھی کوئی جھگڑا نہ تھا۔ پھر بھی راجو کو رہ رہ کر اپنی غلطیوں کا احساس ہو رہا تھا اور وہ اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے مُصر تھا۔

دولہا بھائی ! مجھے کل ہی آپ کے خلاف جو سازش کی گئی تھی اُس کا پتہ چلا۔ تب سے میں خود کو مجرم محسوس کر رہا ہوں۔ ایک ایسا مجرم جسے ضرور سزا ملنی چاہیئے۔ — میرے گناہ اُس وقت دُھل سکیں گے جب آپ مجھے اپنے قدموں میں جگہ دیں گے۔ مجھ چنڈال کے حق میں دُعا کیجئے دولہا بھائی۔ "

رامو پھر سمجھانے لگا :

"میرے بچے، جب تمہیں اپنے گناہوں کا احساس ہو گیا اور تم اپنے کئے پر پشیمان ہوئے تھے اُسی لمحہ سے بھگوان کی تمام مہربانیوں کے دروازے تمہارے لئے کھُل گئے ہوں گے — مجھ بُوڑھے کے کسی کو معاف کرنے یا نہ کرنے سے کیا ! میرا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اس جاں گُسل وقت میں، میں بھلا کاہے کو تم سے ناراض ہونے لگا —

مجھے یقین ہے کہ میری موت کے بعد تم رادھا کو سدا خوش رکھو گے۔ بھگوان تم دونوں پر مہربان رہیں میرے بچے ! "

" ہائے میں کتنا ابھاگا ہوں، کتنا احمق ! میں نے کچھ نہ سوچا، کچھ نہ جانا اور دوسری شادی کر لی — اب میں کیا کروں گا ؟ میں رادھا سے کس طرح کہہ سکوں گا کہ وہ ایک سوت کے ساتھ نباہ کرے ؟ — وہ کس طرح اس بُری زندگی کو سہن کر سکے گی ؟ — ہائے بھگوان، میں تو کہیں کا بھی نہیں رہا۔" راجو جذبات کی رَو میں بہہ کر چیخنے لگا۔ وہ خود کو کوس رہا تھا۔

"ماما — " روکنے پر بھی رادھا کے مُنہ سے آواز نکل ہی آئی اور پھر خاموشی فضا میں طاری ہو گئی۔

راجو عورتوں کی طرح چیخ کر رو رہا تھا۔

"تجھے کچھ کہنا ہے رادھا ؟ " رامو نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بابا — ماما سوت اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے بھی تو اس سلسلے میں کچھ کہنے کا حق ملنا چاہیئے — میں نے جب ماما کے مُنہ سے دوسری شادی کا سُنا تھا تو میں چونکی تھی اور تب ہی میں نے اپنے دِل سے پوچھا تھا — کیا میں اتنی خوش نصیب ہوں ؟ اگر ہوں تو پھر بولتی کیوں نہیں — اور میں نے خود کو مطمئن پایا تھا — " رادھا نے چھت پر نظر جمائے یہ الفاظ کہے۔ گویا وہ اپنے باپ یا شوہر سے آنکھیں مِلانا چاہتی ہو۔

" میں نے کتنی احمقانہ غلطی کی ہے — اور دَیوکی اب عنقریب ماں بننے والی ہے رادھا۔" بات ختم ہونے سے پہلے پھر راجو کی آواز ہچکیوں کے شور میں ڈوب گئی۔

" تو پھر کیا ہوا ؟ " رادھا بولی۔ " وہ بچہ میرے اپنے بچے کی طرح ہو گا اور میں اُسے اپنا سمجھ کر پالوں گی — "

ایکا ایکی رامو اُٹھ بیٹھا۔

" بچہ ! " اس کی آواز میں نہ جانے کہاں سے بے پناہ طاقت آ گئی تھی۔

" کتنی سچی ہیں ہماری مقدس کتابیں اور کتنا عظیم ہے ہمارا دھرم — میری بچی، میری لکشمی، میری رادھا ! تُو نے آج اپنے نام کی لاج رکھ لی ہے۔ تُو نے ثابت کر دیا ہے کہ تُو صحیح معنوں میں اس پیارے نام کی مستحق تھی۔ "

پھر وہ راجو کی طرف مُڑ کر کہنے لگا۔ " رادھا کو آج ہی اپنے گھر لے جاؤ — جاؤ اور اپنی بیوی کو ہمراہ لے لو۔ بھگوان تم دونوں پر مہربان ہوں۔ اُن کے کرم کی برکھا سے سدا تمہاری اُمیدوں کے چمن سیراب ہوتے رہیں — بھگوان تُو کتنا مہان ہے !

کہ ان لمحوں میں جب کہ موت میرے دروازوں پر دستک دے رہی ہے تُو نے میرے سامنے خوشیوں کے خزانے بکھیر دئے —— شاید رات کا نغمہ اسی خوشی کا پیغامبر تھا —— میرے تمام دُکھوں کا آج انت ہو گیا ہے۔ مجھے ایسا جان پڑ رہا ہے جیسے خوشیوں کے اس اُجالے میں دُکھ کے تمام اندھیرے دُور ہو گئے ہوں۔ ہر طرف سُکھ ہی سُکھ ہو۔"

وہ پھر اپنے بچھونے پر لیٹ گیا۔

رادھا اپنی جگہ سے اُٹھی، آنکھوں کو صاف کیا، اور ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔

آج اُس نے بھی زندگی کی سچی مسرت کا راز پا لیا تھا۔

دوسرے دن اپنے چہرے پر حسین مسکراہٹ کا پرتو لئے راجو اس جہانِ فانی سے چل بسا!

راجو اور اس کی دونوں بیویاں ایک ہی گھر میں کتنی سُکھی جیون بتا رہی تھیں۔ دیوکی کے بچے کی عمر دو سال ہو گئی تھی۔ وہ دونوں اپنی جگہ خوش تھیں اور اُن کے گھر کی پُرسکون زندگی میں آپسی بھید بھاؤ کی ذرا سی بھی رمق نہ تھی۔

"یہ کس کا بچہ ہے پیاری بہنو!"

جو بھی اُن کے پاس آتا، یہ سوال ضرور اُبھرتا —— تب رادھا کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ دیکھنے کی ہوتی۔ دیوکی غرور کے ساتھ اپنا سر جھکا لیتی

"مُنّے تمہاری ماں کون سی ہے؟"

تب یہ سوال بچے سے کیا جاتا —— بچہ بھاگتا ہوا رادھا کی گود میں جا بیٹھتا۔ گویا یہ اس کا "خاموش جواب" تھا —— وہ رادھا کو ہی "ماں" کہہ کر پکارتا۔ جب کہ دیوکی کے لئے وہ "مامی" کا لفظ استعمال کرتا۔

"کتنی عجیب بات ہے۔" آنے والیاں کہتیں: "کس نے سوتوں کو اس طرح ایک ساتھ خوش و خرم رہتے دیکھا ہے!"

(لیکن یہ اُن کی بات ہے جو دِلوں کی اچھی اور شریف تھیں اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود بھی خوش ہوتی تھیں۔ اس کے برعکس خدا انہیں سمجھ دے، وہ جن کی سرشت ہی دوسروں میں کیڑے نکالنا ہی سب کچھ ہے، جل کر کہتیں)

"یہ سب ظاہری ٹیپ ٹاپ اور دکھاوا ہے۔ ذرا دو تین سال تو گزر جائیں پھر دیکھنا ان میں آپس میں کیا لڑائی جھگڑے ہوں گے۔"

مگر دو تین کیا، کئی سال اور زیادہ ہی بیت گئے اور لوگوں کو اس طرح کسی جھگڑے کی سُن گُن تک نہ مل سکی۔ اور راجو کا گھرانہ اسی طرح ہنسی خوشی دنوں کو پیچھے چھوڑتا رہا۔

آدم اور حوا کی سرزمین میں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہی تو وہ ہماری دھرتی ہے جہاں پانچ پانڈو ایک دروپدی کے ساتھ زندگی بتایا کرتے تھے —— جو کچھ میں نے آپ سے کہانی کے روپ میں کہا ہے اگر اس کے بارے میں آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ محض میرے تخیل کی پیداوار ہے تو یقیناً آپ زیادتی کر رہے ہیں —— اگر تمہاری چشمِ دل روشن ہے تو ہم، ہمارے چاروں طرف بسی ہوئی ان سینکڑوں "رادھاؤں" کو دیکھ سکتے ہیں جن کی زندگی کا ہر لمحہ اس کہانی کے کردار کو آگے بڑھا رہا ہے —— یہ بھورے بادل جنہیں ہوا اپنے بازوؤں پر اُٹھا کر آکاش تک لے جاتی ہے اور پھر موتیوں کی طرح سفید سفید قطرے ہماری پیاسی دھرتی کا منہ چومنے لگتے ہیں اور چاروں طرف سبزے کے روپ میں ہماری اُمنگوں کی کھیتیاں بار آور ہونے لگتی ہیں —— یہ سب انہی پاکیزہ روحوں کی خاموش قربانیوں کی ہی تو دین ہیں —— "یجنات بھواتی پرجن یاہ" (ترجمہ آفاق احمد)

"تعمیر" کا آئندہ خاص نمبر

کشمیری زبان کے امام المتغزلین رسول میر کی یاد میں شائع ہو رہا ہے۔
معاونین سے استدعا ہے کہ آج سے ہی نگارشات ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کردیں۔ رسول میر کی حیات پر خصوصی مقالے شکریہ کے ساتھ قبول کئے جائیں گے۔

شری شیام لال صراف
وزیر صحت

بیماری کے خلاف جہاد

۱۹۴۷ء سے پہلے ریاست جموں و کشمیر میں دو صوبائی ہسپتال، کچھ ڈسپنسریاں اور ۵۵ عام قسم کی ڈسپنسریاں تھیں۔ ان میں بہت ہی کم سٹاف اور دوائیں اتنی کم مقدار میں تھیں کہ عام آدمی ان سے مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔ آنکھوں کی بیماریوں اور جنسی امراض کے علاج معالجہ کے لئے کوئی طبی ہسپتال نہیں تھا۔ مواصلات اور دُور دراز علاقوں میں طبی امداد بالکل میسر نہیں تھی جس کی وجہ سے ہزاروں جانیں تلف ہو جاتی تھیں۔ ریاست سے بیماریوں کا قلع قمع کرنے کے لئے ایک مہم شروع کی گئی جو تیزی سے کام کر رہی ہے۔ بیماریوں کی روک تھام کے لئے وسیع پیمانے پر مہم جاری ہے۔ ریاست کے مختلف حصوں میں ڈسپنسریاں اور شفاخانے کھولے گئے ہیں اور اب اقدامات کئے جا رہے ہیں جن سے آج ریاست کے ہر کونے میں بسنے والے انسان کو طبی امداد میسر ہے تاکہ ریاست کے ہر فرد کو موثر سہولیات مل سکیں۔ میڈیکل اور صحت عامہ کے محکمہ کی از سر نو تنظیم کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں مناسب ردّ و بدل اور نگرانی کے لئے ایک نیا طریق کار عمل میں لایا گیا ہے۔ مختلف شعبوں میں جو ترقی عمل میں لائی گئی ہے ان سب کا ذکر ذیل کے نقشوں میں درج ہے۔

محکمہ کی نئی تجدید

محکمہ کی اب نئی تجدید کی گئی ہے۔ محکمہ ڈائریکٹر ہیلتھ سروسز اور انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات پر مشتمل ہے۔ ڈپٹی ڈائریکٹر صحت عامہ اور جیل خانہ جات کے انچارج ہیں۔ ان کے ماتحت دو صوبائی ڈپٹی ہیں، ایک صوبہ کشمیر کے لئے اور دوسرا صوبہ جموں کے لئے جو کہ صحت عامہ کے ذمہ دار ہیں اور صوبائی شفاخانہ جات ضلع ہسپتالوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ اُن کی امداد کے لئے دو ماہر امراض وبائی کے ڈاکٹر اور دو صوبہ جات میڈیکل سروس کی نگرانی دو میڈیکل آفیسر اور دوسرا ضروری سٹاف کرتا ہے۔ ہر ایک ضلع میں ایک سول سرجن، ضلع کے صدر ہسپتال کا انچارج ہے جو کہ ضلع کی تمام آیورویدک، یونانی و آیورویدک ڈسپنسریوں کے انتظامیہ کا بھی ذمہ دار ہے۔

تعمیر

اس کے علاوہ وہ ضلع کا ہیلتھ آفیسر بھی ہے اور اس کی مدد کے لئے ہر ایک تحصیل میں ایک سینیٹری انسپکٹر اور دو ویکسی نیٹر ہیں۔ اس تجدید کی رُو سے طبی امداد صوبائی ہسپتالوں، ضلعوں تک پھیلی ہے اور صحت عامہ پر پوری دلچسپی سے دھیان دیا جا رہا ہے۔

مرکزی ہسپتال

مرکزی ہسپتال ایک سری نگر میں اور ایک جموں میں واقع ہے۔ ان میں بستروں کی تعداد بالترتیب سری نگر میں ۱۰۹ سے ۴۲۰ کر دی گئی ہے اور جموں میں ۱۰۰ سے بڑھا کر ۲۷۵ کر دی گئی ہے اور ان بستروں کی حالت کو مزید درست کیا گیا ہے۔ ان ہسپتالوں کو ہر قسم کے آلات، ادویات اور سامان سے لیس کیا گیا ہے۔

ضلعوں کے ہیڈ کوارٹر شفاخانہ جات

ضلع ہیڈ کوارٹروں میں پہلے چھوٹی ڈسپنسریاں تھیں جن کی بجائے مختلف ضلعوں میں ہیڈ کوارٹرز ہسپتال کھولے گئے ہیں۔ ان میں سے چار جموں میں اور تین کشمیر میں ہیں اور ہر ہسپتال میں تیس بستر رکھے گئے ہیں۔ ان ڈسٹرکٹ ہسپتالوں میں ایکس رے مشینیں اور دوسرا سامان مہیا کیا گیا ہے جن سے پیچیدہ بیماریوں کی تشخیص اور علاج ممکن ہو گیا ہے۔ مختلف بیماریوں کی تشخیص کے لئے علیحدہ لیبارٹریاں قائم کی گئی ہیں۔ عورتوں کی بیماریوں کے علاج کے لئے بھی مؤثر انتظامات کئے گئے ہیں۔ دانتوں کی بیماری کے لئے ان ہسپتالوں میں ڈینٹل سیکشن کھولے گئے ہیں۔ ان ہسپتالوں کو ہر قسم کے سامان سے لیس کیا گیا ہے جس سے عوام کو اعلیٰ قسم کی طبی امداد مہیا کی جا رہی ہے۔ پاگل جانوروں کے کاٹنے کا علاج اس وقت تک صرف سری نگر اور جموں میں ہوتا تھا جس سے دُور دراز علاقوں سے بیماروں کو صدر ہسپتالوں میں پہنچنے کے لئے بہت دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور بعض اوقات کئی بیمار راستہ میں ہی دم توڑ دیتے تھے۔ لیکن اب تمام ضلع ہسپتالوں میں ایسے علاج کا مکمل انتظام موجود ہے۔ ضلع

ہسپتالوں میں ادویات اور انجکشن محفوظ رکھنے کے لئے بجلی یا مٹی کے تیل سے چلنے والے ریفریجریٹر رکھے گئے ہیں۔ ضلع ہسپتالوں کے لئے نئی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں اور بعض صورتوں میں پرانی عمارتوں کو جدید طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔

تحصیل ہیڈ کوارٹر

تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتالوں کو بھی نئے طریقہ پر منظم کیا گیا ہے اور کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ انہیں بھی ڈسٹرکٹ ہسپتالوں کے معیار کے مطابق بنوایا جائے۔ تجویز ہے کہ ان ہسپتالوں میں ایک چھوٹا ایکس رے پلانٹ، تین ڈنٹل سیکشن اور ایک لیبارٹری ہو۔ اس فیصلہ پر عمل شروع کرتے ہوئے سرینگر ہری سنگھ ہسپتال میں سنٹرل ہیٹنگ سسٹم کے انتظامات کئے گئے ہیں اور جموں میں وارڈ کولر اور واٹر کولر نصب کئے گئے ہیں۔ جموں کے ہسپتال میں آپریشن تھیٹر کو ائیر کنڈیشنڈ کیا گیا ہے اور قریباً ایک لاکھ روپیہ کی لاگت سے سرینگر ہسپتال میں ایکس رے کی مشین نصب کی گئی ہے۔ دونوں ہسپتالوں میں ایکس رے کے شعبہ میں مزید سامان اور ایکس رے کی مشین بھی مہیا کی گئی ہے۔ ہر وقت گرم پانی مہیا کرنے کے لئے دونوں ہسپتالوں میں مشینیں لگائی گئی ہیں اور زمانۂ حال کی ضرورتوں کے مطابق ہسپتالوں کو سارا ضروری سامان مہیا کیا گیا ہے اس طرح سے ان ہسپتالوں کا معیار بلند کیا گیا ہے جو ہندوستان کے کسی بھی ہسپتال سے کم نہیں ہے۔

تپ دق کے ہسپتال

یہ ہسپتال ایک سرینگر میں اور ایک جموں میں واقع ہیں ابتدا میں ان ہسپتالوں کے اندر سرینگر میں ۸۵ بستر اور جموں میں ۳۵ بستر تھے۔ اب ان کی تعداد کو بڑھا کر سرینگر میں ۲۰۰ اور جموں میں ۸۰ کر دی گئی۔ ان ہسپتالوں کی حالت کو بہتر بنایا گیا ہے۔ سرینگر اور جموں میں آؤٹ ڈور مریضوں کے لئے ہسپتالوں کے ساتھ ایک ایک ٹی، بی کلنک کھولا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مریضوں کو اُن کے گھروں میں بھی امداد بہم پہنچانے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ دونوں ہسپتالوں میں مزید سامان اور آلات مہیا کئے گئے ہیں۔ سرینگر ہسپتال میں دو ایم اے ایکس رے پلانٹ اور جموں میں بی، ایس، سی ایک مشین لگا دی گئی ہے۔ دونوں ہسپتالوں کے ساتھ ایک ایک سینی ٹوریم ایک بٹوت اور دوسرا گلمرگ میں واقع ہے جو تمام سال لگے رہتے ہیں۔ ان میں اچھے ڈھنگ سے مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ مریضوں کی روزانہ خوراک کو بڑھا دیا گیا ہے اور انہیں قوی غذائیں دی جاتی ہیں۔ قومی توسیعی سروس کے پروگرام کے مطابق دس ہیلتھ سنٹر مختلف تحصیلوں میں کھولے جائیں گے جو کہ دوسرے تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتالوں کے لئے نمونہ کے طور پر ہوں گے۔ ان سنٹروں کے لئے مشینری وغیرہ کی خرید ہو چکی ہے جو کہ عنقریب ہی نصب کر دی جائے گی۔

(تعمیر)

دماغی امراض کا ہسپتال

ریاست میں دماغی امراض کا ایک شفاخانہ تھا جس کو پاگل خانہ کہا جاتا تھا اس میں ایسے مریضوں کا علاج کرنے کی بجائے انہیں اُلٹا مصیبت میں ڈال دیا جاتا تھا۔ دماغی امراض کے لئے ایک باقاعدہ ہسپتال حال ہی میں کھولا گیا ہے جس میں ۵۰ بستر رکھے گئے ہیں۔ ان کو بعد میں بڑھا کر ۱۰۰ تک کر دیا جائے گا دماغی امراض کی بیماریوں کے لئے دو ڈاکٹروں کو تربیت دی گئی ہے جو کہ اس وقت جموں اور سرینگر کے مرکزی ہسپتالوں میں جان فشانی سے کام کر رہے ہیں۔ ہر دو جگہوں پر بجلی کے ذریعہ علاج کرنے والی مشینیں لگائی گئی ہیں۔ سرینگر میں اس ہسپتال کو ادویات اور دوسرے ضروری سامان سے مزین کیا گیا ہے۔

چھوت چھات کی بیماریوں کا علاج

ایسا ایک ہسپتال سرینگر میں ہے جس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ پچھلے سال اس ہسپتال کی طرف فوری توجہ دی گئی اور اب اس میں تین سو مریضوں کے لئے جگہ مخصوص ہے۔ حال ہی میں انفلوئنزا کے بیماروں کی بھاری تعداد کا اس ہسپتال میں علاج معالجہ کیا گیا۔

دُور دراز مقامات پر طبی سہولیات

دُور افتادہ پہاڑی علاقوں میں بسنے والے لوگوں کو طبی امداد بہم پہنچانے کے لئے موثر اقدامات لئے گئے ہیں ایک ہزار فسٹ ایڈ صندوقچے، جن میں مختلف قسم کی ادویات رکھی گئی ہیں ایسے علاقوں میں تقسیم کئے گئے اور ان کی باقاعدہ دیکھ بھال کے لئے علاقہ کے بلاک آفیسر کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

گشتی یونٹ

ریاست بھر کے دُور دراز علاقوں میں بسنے والے عوام کے گھروں تک طبی امداد بہم پہنچانے کے لئے حکومت نے دو گشتی یونٹ قائم کئے ہیں جن میں ایک میڈیکل اور دوسرا آنکھوں کے علاج کا گشتی یونٹ ہے۔ ان یونٹوں میں قابل تجربہ کار ڈاکٹر اور محنتی سٹاف لگایا گیا ہے جو نہایت محنت اور جان فشانی سے لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس شعبہ سے ہزاروں مریضوں کا ہر سال علاج کیا جا رہا ہے۔

بیماریوں کی روک تھام

تپ دق کی روک تھام کے لئے ٹی، بی آرگنائزیشن، جنسی بیماریوں کی

بیماریوں کی روک تھام کے لئے ٹی بی، ڈی بی آرگنائزیشن، ملیریا کی روک تھام کے لئے اینٹی ملیریا آرگنائزیشن اور ٹائیفس آرگنائزیشن شاندار کام سرانجام دے رہی ہیں جس سے ہزاروں مریضوں کو فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

ایم، بی، ایس وغیرہ کی ٹریننگ

اُمیدواروں کو ہندوستان میں تربیت حاصل کرنے کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔ آج تک ایک سو چونتیس (۱۳۴) اُمیدواروں کو بھیجا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ کئی ڈاکٹروں کو سپیشل ٹریننگ کے لئے ہندوستان اور دوسرے ممالک میں بھی بھیجا جا رہا ہے۔ ریاست میں ایک میڈیکل کالج کھولنے کی تجویز زیرِ غور ہے جس کی تکمیل پر ڈاکٹری ٹریننگ کے لئے یہاں ہی تعلیم دی جائے گی۔

لوئر سٹاف کے لئے ٹریننگ

اس سٹاف کو تعلیم دینے کے سارے ضروری انتظامات پچھلے سال یہاں ہی کئے گئے تھے۔ ایک بورڈ جس کا نام سٹیٹ میڈیکل فیکلٹی ہے سرکاری طور پر قائم کیا گیا ہے۔ اس کے تحت اُمیدواروں کو ٹریننگ کے لئے کورس امتحان اور سرٹیفکیٹ دینے کے رُولز پاس کئے گئے ہیں۔ یہ ٹریننگ پچھلے سال جون سے شروع کی گئی ہے اور اس کا پہلا دستہ امتحان دے کر کام پر لگ چکا ہے۔ اُنہیں سرٹیفکیٹ بھی دئے گئے ہیں۔ آج تک مختلف شعبوں کے تحت جو اُمیدوار ٹریننگ لے چکے ہیں اُن کی تعداد نیچے دی جاتی ہے:-

کمپونڈر ۲، سینیٹری انسپکٹر ۱۸، نرسز پسنڈ وائف ۹، وارڈ سرونٹس ۱۱، ایکس رے ٹیکنیشن ۱۰، ڈینٹل ٹیکنیشن ۸، لیبارٹری ٹیکنیشن ۱۱

اس کے علاوہ دائیوں کو بھی ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ مزید براں دوسرے بیچ کی ٹریننگ شروع ہے جو اختتامِ سال پر امتحان پاس کر کے کام پر لگ جائیں گے اور اس طریقہ سے ریاست میں تربیت یافتہ ملازموں کی کمی پوری ہو جائے گی۔

آیورویدک اور یونانی طریقِ علاج

جموں و کشمیر میں اس وقت کُل ۳۲ آیورویدک اور یونانی ڈسپنسریاں ہیں اور جن کی حالت بہتر ہے جس کی طرف دھیان دیا جا رہا ہے۔ ان ڈسپنسریوں کے حکیموں، ویدوں کو ایک دو اساز بھی دیا گیا ہے۔ پہلے تو دو اسازوں کو ٹریننگ دینے کے لئے واضح سکیم مرتب کی گئی ہے جس کے تحت تجربہ کار دو اساز بہت جلد عوام کے لئے اچھی ادویات مہیا کر سکیں گے۔ حکیموں اور ویدوں کو آیورویدک و یونانی طریقہ علاج کی تربیت کے لئے ہند کے طبیہ کالجوں میں بھیجا گیا ہے اور اب تربیت حاصل کئے ہوئے وید حکیم بن کر عوام کا علاج کر سکیں گے۔

حکیموں اور ویدوں کو رجسٹر کرنے کا بورڈ

ریاست میں طبّی علاج کے تحفظ کے لئے حکیموں اور ویدوں کو رجسٹر کرنے کے لئے ایک سکیم گورنمنٹ کے زیرِ غور ہے۔ اس کے علاوہ دیسی طریقِ علاج کے لئے ادویات کی فراہمی ڈرگ ریسرچ لیبارٹری سے کی جا رہی ہے۔ جہاں بہت اچھی طرح سے یہ دوائیں تیار کی جا رہی ہیں۔

میڈیکل رجسٹریشن ایکٹ

یہ ایکٹ سٹیٹ میں سنہ ۱۹۴۸ء میں پاس کیا گیا تھا لیکن آج تک یہ لاگو نہیں ہو پایا تھا۔ گورنمنٹ نے ایک میڈیکل کونسل قائم کی ہے جس کی پہلی میٹنگ ۲۴ جون ۱۹۵۲ء کو ہوئی۔ اس میں ڈاکٹروں اور پرائیویٹ پریکٹیشنروں کو رجسٹر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جس کی رُو سے ڈاکٹروں کو رجسٹر کرنے کے بعد سرٹیفکیٹس دی جا رہی ہیں۔

مڈوائف اور ہیلتھ وزیٹر کے لئے رجسٹریشن ایکٹ

ان شعبوں کے لئے ایک ایکٹ تیار ہو کر اسمبلی میں پاس ہو چکا ہے اور اس کے رُولز وغیرہ مرتب کئے گئے ہیں جو کہ گورنمنٹ کی منظوری کے لئے بھیجے جا چکے ہیں۔

ڈینٹل ایکٹ

آج تک ریاست میں کوئی بھی ایسا ایکٹ نہیں تھا۔ اس شعبہ کے لئے ایک ایکٹ بہت دیر ہوئی مرتب کیا گیا ہے جو کہ اس وقت حکومت کے زیرِ غور ہے۔ اب یہ ایکٹ پاس ہو چکا ہے۔ اس سے عوام کو غیر تربیت یافتہ ڈینٹل سرجنوں سے نجات ملے گی۔

ڈرگس ایکٹ

کوئی بارہ سال ہوئے یہ ایکٹ پاس ہو چکا تھا مگر ابھی تک اس کا نفاذ ممکن نہیں ہو سکا۔ اب بہت جلد یہ ایکٹ لاگو کیا جائے گا۔ یہ معاملہ حکومت کے زیرِ غور ہے۔

دیگر آرگنائزیشن

سٹیٹ میں کوئی بھی ٹی بی آرگنائزیشن نہیں ہے۔ ایک سکیم ٹی بی ایسوسی ایشن بنانے کی حکومت کو بھیجی گئی تھی جس کی منظوری آ چکی ہے۔ اب ایک ٹی بی ایسوسی ایشن انڈیا کی طرح بنائی جائے گی۔ اس کے لئے ایک سیکرٹری بھی مقرر ہو چکا ہے۔

ریڈ کراس آرگنائزیشن

سٹیٹ میں ریڈ کراس آرگنائزیشن کو منظم کرنے کے لئے ایک سکیم بنائی جا چکی ہے جو پہلے کی سکیم کے نقائص کو دُور کر دے گی۔

پبلیکیشن

مندرجہ ذیل کتابیں محکمہ کی طرف سے ۵۷-۱۹۵۶ء میں شائع کی گئی ہیں:-

(۱) اسسٹنٹ میڈیکل فیکلٹی رولز (۲) جیل گارڈ (۳) رولز آف ہیلتھ (۴) ہاسپٹل فارماکوپیا (۵) فسٹ ایڈ (۶) میڈیکل ڈسپنسریشن ایکٹ (۷) میڈیکل رجسٹریشن ایکٹ کے تحت رولز (۸) ہاسپٹل کی ایڈمنسٹریشن کے لئے سرکلرز (۹) لوکل ہیلتھ [illegible] (۱۰) ڈیپارٹمنٹ آف نرسنز (۱۱) فارمیسی ایکٹ

لیڈی ہیلتھ وزیٹرز ٹریننگ سکول و میٹرنٹی ہوم

یہ سکول پچھلے ایک سال سے چل رہا ہے [illegible] کا پہلا بیچ نومبر ۱۹۵۸ء سے ٹریننگ لے رہا ہے جو کہ آئندہ سال امتحان دے کر کام پر لگ جائے گا اور ریاست میں کوالی فائڈ ہیلتھ وزیٹروں کی تعداد میں اضافہ کر کے [illegible] کمی کو پورا کرنے میں معاون ہوگا جو شدت سے محسوس کی جا رہی ہے

فیملی پلاننگ سنٹر

ریاست میں دو فیملی پلاننگ سنٹروں کے کام کو تسلی بخش طور پر چلا لینے کے بعد انہیں ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی رائج کیا جائے

ٹیوبرکلوسس سروے

گورنمنٹ آف انڈیا نے دو لاکھ روپے کی رقم اس بیماری کے سروے کے لئے منظور فرمائی ہے جس سے امید ہے کہ ملک کے عوام کو اس مرض سے نجات دلائی جائے گی

میڈیکل کالج

میڈیکل تعلیم کے لئے ریاست میں بہت بڑی کمی محسوس کی جا رہی ہے اور ٹریننگ کے لئے ہمیں امیدواروں کو ریاست سے باہر ہندوستان اور بیرونی ممالک بھیجنا پڑتا تھا۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے سری نگر میں ایک میڈیکل کالج کھولنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کی سکیم منظوری کے لئے گورنمنٹ کو پیش کی جا چکی ہے اور اس مقصد کے لئے ستر لاکھ روپے کی رقم کے خرچ کا اندازہ ہے۔

آیورویدک و یونانی علاج

جموں میں ایک آیورویدک اور یونانی کالج کھولنے کے لئے ایک سکیم حکومت کے زیر غور ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی اس کو عمل میں لا کر جموں میں اس کالج کو قائم کیا جائے گا۔ اس کالج پر دس لاکھ روپے کے خرچ کا اندازہ ہے۔

تھیٹر اسسٹنٹ ٹریننگ کلاس

آپریشن تھیٹروں میں تربیت یافتہ تھیٹر اسسٹنٹ لگانے کے لئے ایک ٹریننگ کلاس کھولنے کی تجویز پیش کی گئی ہے جو کہ سری نگر و جموں کے بڑے ہسپتالوں میں کھولی جائے گی۔ ٹریننگ چھ ماہ کی ہوگی۔ لیکن اس میں تربیت یافتہ کمپونڈروں کو ہی لیا جائے گا۔

سنٹرل و ٹی بی ہسپتالوں کے مریضوں کے لئے خاص مراعات

واٹر کولرز سری نگر اور جموں کے ہسپتالوں میں لگائے گئے ہیں جن سے موسم گرما میں کمروں کے اندر ٹھنڈک پہنچانے کا انتظام ہوگا اور پینے کا پانی بھی ٹھنڈا ملے گا۔ اسی طریقہ سے سری نگر کے ہسپتالوں میں سردی میں کمروں کو گرم رکھنے کا انتظام کیا گیا ہے جس سے موسم سرما کی سردی سے مریضوں کا بچاؤ کیا جا سکے گا۔

بھگت چھجو رام
وزیر مملکت

سماجی بہبود

کسی نے سچی بات کہی ہے کہ ملک کتنی بھی ترقی کر جائے اگر ایک بھی شخص پچھڑا ہوا رہ گیا ہے تو وہ ترقی کی راہ پر گامزن قوم کو ٹانگوں سے پکڑ لے گا اور اُسے رُکنے پر مجبور کر دے گا۔ جب تک ہم قوم کے تمام افراد کو ساتھ لے کر آگے نہیں بڑھتے یہ ناممکن ہے کہ پانچ سالہ پلان کے ہمہ پہلو پروگرام کو کامیاب بنا سکیں۔ پچھڑے ہوئے طبقے اور دلت جاتیاں قوم کا ناکارہ انگ ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ملک و قوم کی زیادہ قوت ان ہی میں پنہاں ہے۔ سماج وادی سماج کی طرف بڑھتے ہوئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس عظیم قوت کو ملک کی دوسری قوتوں کے ساتھ ملایا جائے۔ ملک کی بہبودی اور ترقی کے لئے ان کا تعاون لازمی ہے۔

دورِ جمہوریت میں سرکار کا ایک ممتاز کارنامہ یہ ہے کہ سماجی بہبود کے کاموں کے لئے ایک علاحدہ وزارت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ پچھڑی ہوئی اور دلت جاتیوں کی طرف کی تواریخ میں سرکار کا یہ قدم سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔

بروال، چیار، چوڑا، ڈوم، گارڈی، میگھ وغیرہ کو شیڈولڈ کاسٹ میں رکھا گیا ہے اور بوچ، بازی گر، بنجارہ، بکروال، دھوبی، دوسالی، گُل فقیر، گُجر، حجام، کمہار، لوہار، مداری، مراثی، موچی، سانسی، سکل گر، تیلی، ترکھان اور ان کے علاوہ اور بہت سی جاتیوں کو بیک ورڈ کلاسز میں شامل کیا گیا ہے۔

سماجی بہبود کا کام چلانے کے لئے یہ بہت ضروری تھا کہ ایک ہریجن ویلفیر بورڈ کا قیام عمل میں لایا جاتا۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۵۵ء کو اسی مقصد کے پیشِ نظر مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل ایک بورڈ بنایا گیا :-

(۱) بھگت چھجو رام راجیہ منتری چیئرمین (۲) بھگت منگت رام ممبر و سیکرٹری
(۳) شری ست دیو ایم۔ ایل۔ اے ممبر (۴) شری ملکھی رام ایم۔ ایل۔ اے ممبر
(۵) سپیشل آفیسر شیڈولڈ کاسٹ و بیک ورڈ کلاسز ممبر
(۶) مہاشہ ناہر سنگھ ایم۔ ایل۔ اے ممبر (۷) شری ایشر داس ٹھیکی ممبر
(۸) شری تیج رام ممبر (۹) شری وید پرکاش ممبر
(۱۰) شری مسو بھگت ممبر (۱۱) شری منشی رام ایم۔ ایل۔ سی ممبر
(۱۲) شری چندو رام ممبر (۱۳) شری سیلا رام ممبر
(۱۴) شری ۔ ام سرن بھگت ممبر (۱۵) شری آشا رام بھگت ممبر
(۱۶) شری لال چند ممبر

اس بورڈ نے کئی اہم قرار دادوں کے ذریعے حکومت کو مشورے دئے۔ جیسے چھوا چھوت کو سختی سے اور جلد از جلد کیسے مٹایا جا سکتا ہے، ہریجنوں کو مکان بنانے کی سہولیات بہم پہنچانی، ہریجنوں کو پینے کے پانی کی سپلائی کرنے کے انتظامات، ان کے لئے جموں میں ایک بورڈنگ ہاؤس بنانا، کپاس و سوت کی صنعت کو ترقی دینا، تمام ہریجن طلب کو وظائف دینا، ملازمتوں میں ہریجنوں کو خاص رعائتیں، پاکستان سے آئے ہوئے ہریجن پناہ گزینوں کو پھر سے بسانا، بے زمین ہریجنوں کو زمین دینا، اور ہریجنوں کی معاشرتی حالت میں سدھار۔ سوشل ویلفیر بورڈ نے ان تمام مسئلوں پر اچھی طرح غور کیا۔

اس بورڈ کے علاوہ دوسری پچھڑی ہوئی جاتیوں کے لئے بھی ایک مشاورتی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے مندرجہ ذیل ارکان ہیں :-

(۱) شری بھگت چھجو رام چیئرمین (۲) شری منگت رام سیکرٹری
(۳) شری محمد شفیع ایم۔ ایل۔ سی ممبر (۴) شری غلام حسن ایم۔ ایل۔ سی ممبر
(۵) شری نور الحسن ممبر (۶) شری نظام الدین ممبر
(۷) شری امیر چند ممبر (۸) شری عبد الغنی ممبر
(۹) شری چھجو رام (جموں) ممبر (۱۰) شری مدن لال ایم۔ ایل۔ سی ممبر
(۱۱) شری حکومت رام ممبر (۱۲) شری گیان چند ممبر
(۱۳) سوشل آفیسر برائے گجر و بکروال ممبر

(۱۴) شری بلاقی رام ممبر (۱۵) شری پچھو رام (پرمنڈل) ممبر

اس مشاورتی کمیٹی نے بھی اہم فیصلہ جات کے ذریعہ حکومت کو اپنے مشوروں سے آگے بڑھنے کی ترغیب دی، مثلاً چلتے پھرتے سکولوں کی تعداد میں مزید اضافہ، پچھڑی ہوئی جاتیوں کے لئے کمیونٹی سنٹر کا قیام عمل میں لانا، چلتی پھرتی ڈسپنسریاں کھولنا، پچھڑی ہوئی جاتی کے تمام طلبا کے لئے وظیفوں کی منظوری، پچھڑی ہوئی جاتی کے بے زمین لوگوں کے لئے زمین بہم پہنچانی، اُن کے لئے کنڈی میں پانی کی بہم رسانی، اور مکانوں کی تعمیر کے لئے کافی امداد دینا وغیرہ — یہ تمام سفارشات اس کمیٹی نے سرکار کے سامنے پیش کیں اور ان کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔

عام لوگوں کو فیملی پلاننگ کے اصول سمجھائے جاتے ہیں اور ان کی اہمیت جتلائی جاتی ہے تاکہ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکا جا سکے اور ایک بہت بڑے مسئلے کے سلجھاؤ کے امکانات روشن ہوں۔ عام عورتوں کو بچوں کی پرورش کے بارے میں کئی باتیں سمجھائی جاتی ہیں اور گھر کے بجٹ وغیرہ کے متعلق مشورے دئے جاتے ہیں۔ ان مرکزوں میں بغیر کسی بھید بھاؤ کے ہر جاتی کے بچے اور عورتیں آتی ہیں۔

اُن ہری جنوں کے لئے جن کے پاس زمین تھی مگر بیل اور کھیتی باڑی کا دوسرا سامان نہ تھا، سرکار نے دو ہزار روپے تقسیم کرنے کے لئے رکھے اور دس کنبوں کو دو سو (۲۰۰) روپیہ فی کنبہ کے حساب سے تقسیم کر دئے۔ ان میں سے تین کنبے ضلع کٹھوعہ کے تھے، ایک رنبیر سنگھ پورہ کا، تین تحصیل ریاسی کے اور تین تحصیل اودھم پور کے تھے۔ اسی طرح ایک ہزار روپیہ پچھڑی ہوئی جاتیوں کے پانچ کنبوں کو دو سو روپیہ فی کنبہ کے حساب سے دیا گیا۔ ہری جنوں کے لئے مکانات کی تعمیر یا مرمت کے لئے ۵۰۰ روپیہ رکھا گیا تھا جو ۲۵۰ روپیہ فی کنبہ کے حساب سے تحصیل ریاسی کے ۱۱، اور تحصیل اکھنور کے ۹ کنبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اسی طرح پچھڑی ہوئی جاتیوں کے لئے مکانات کی تعمیر اور مرمت کے لئے پندرہ ہزار روپیہ کی گرانٹ دی گئی۔ تفصیل یوں ہے :-

(۱) تحصیل رام نگر ۹ کنبے فی کنبہ ۲۵۰ روپے
(۲) " کٹھوعہ ۱۲ " " " "
(۳) " ریاسی ۵ " " "
(۴) " اودھم پور " " " " " "
(۵) " مینڈر (پونچھ) ۲۰ " " ۳۰۰ "
(۶) " بسوہلی ایک کنبہ " " ۲۵۰ "

تعمیر

ہری جنوں اور دیگر پچھڑی ہوئی جاتیوں کے لئے پینے کے پانی کی بہم رسانی کے لئے ۵۸-۱۹۵۷ء کے بجٹ میں بالترتیب ۳۰۰۰۰ اور ۱۰۰۰۰ روپے رکھے گئے۔ اس سے متعلق تمام کام پایۂ تکمیل کو پہنچ رہے ہیں۔ خیال ہے کہ سال رواں میں سب کام پورے ہو جائیں گے۔ صوبہ جموں میں اس قسم کے جن مختلف کاموں کے لئے سرکاری منظوریاں حاصل ہیں اُن کی تفصیل اس طرح ہے :-

(۱) چھاؤنی اپ تل میں ایک کنوئیں کی تعمیر (تحصیل سانبہ) ۵۷۷۹ روپے
(۲) ہری جن گاؤں پرودا میں ایک تالاب کی تعمیر (تحصیل رام نگر) ۱۸۲۹ "
(۳) کوکا چک کٹھوعہ میں ایک تالاب کی تعمیر ۳۱۴۵ "
(۴) مکند پور لبانیاں میں ایک کنوئیں کی تعمیر ۳۳۷ "
(۵) بھگوانا چک اور گری گڑھ میں ایک کنوئیں کی تعمیر (تحصیل رنبیر سنگھ پورہ) ۲۵+۵۰۰، ۱۲ روپے (صرف اینٹوں کے لئے)
(۶) اقبال رام نگر بر اُبڈل روڈ کی مرمت ۱۰۰۰ روپے
(۷) گاندھی نگر میں ایک کنوئیں کی مرمت (تحصیل کٹھوعہ) ۴۲۰ "
(۸) گاندھی نگر ہری جن کمیونٹی سنٹر میں کنوئیں کی تعمیر (تحصیل کٹھوعہ) ۴۶۸۶ روپے
(۹) ہیرانگر ہری جن کمیونٹی سنٹر میں ایک کنوئیں کی تعمیر (تحصیل ہیرانگر) ۸۱۴۵ "
(۱۰) دلیاں ہری جن کوہل کی مرمت (تحصیل بھدرواہ) ۱۳۰۸ روپے
(۱۱) بلیڑی نوشہرہ میں ایک باؤلی کی تعمیر ۷۷۰ "
(۱۲) سر میری میں ایک باؤلی، غسل خانہ اور ایک چھوٹے تالاب کی تعمیر (نوشہرہ) ۱۵۹۵ روپے
(۱۳) بھاکڑوں میں ایک کنوئیں کی تعمیر (تحصیل سانبہ) ۲۰۵۲ روپے
(۱۴) ترکھیل جھنگ میں ایک کنوئیں کی تعمیر " ۲۶۷۹ "
(۱۵) مانسر میں ایک باؤلی کی مرمت (تحصیل رام نگر) ۴۵۶ "
(۱۶) مجالتہ میں ایک ہری جن تالاب کی مرمت " ۶۴۵ "
(۱۷) تھالیری پنچایت گھائی میں پانی کے دو ٹینکوں کی تعمیر ۵۳۱۸ "

ہری جن اور دوسری پچھڑی ہوئی جاتیوں کے طلباء کے لئے کتابوں، کپڑوں اور وظائف کے لئے ۵۸-۱۹۵۷ء کے بجٹ میں ڈیڑھ کروڑ روپیہ رکھا گیا جس سے ۵۷۰۴ طالب علم مستفید ہوئے۔ رنبیر سنگھ پورہ میں ایک بورڈنگ ہاؤس اسی سال چالو کیا گیا ہے جس میں ۵۰ طلبا کے لئے رہائش کا انتظام ہے۔ یہ بورڈنگ ہاؤس صرف ہری جن طلبا کے لئے کھولا گیا ہے۔ مگر اس نظریہ کے تحت کہ چھوت چھات کا کینہ جذبہ

م ہو جائے، اس میں تمام جاتیوں کے طلبا کی رہائش کی اجازت ہے۔ اس بورڈنگ ہاؤس میں ہر قسم کی سہولیات بنا کسی معاوضے کے دی جاتی ہیں

ہریجن اور دیگر پچھڑی ہوئی جاتیوں کے لئے رنبیر سنگھ پورہ اور چھمب روڑیاں ہیرانگر میں چھوٹی صنعتوں کے دو تربیتی سنٹر کھولے گئے ہیں جن پر ۲۲۰۰۰ روپے سے کچھ اوپر ہی خرچ ہوا ہے۔ اُمید ہے کہ ان سنٹروں کے ذریعے بہت سے افراد کو روزگار فراہم ہو سکے۔

عملی طور پر اس وقت تین سپروائیزر کام کر رہے ہیں۔ سوشل ویلفیئر منسٹری کے قیام سے پہلے صرف ایک سپروائیزر کام کرتا تھا جو ہریجن کمیونٹی سنٹروں میں دورے کے دوران وہاں کے عملے کو گرینڈ بناتا تھا۔ انہیں کام کی ہدایات دیتا تھا۔ لیکن اصل کام دھرے کا دھرا رہ جاتا تھا وہ سپروائیزر ہریجنوں کی حقیقی زندگی سے دور رہتا تھا۔ اُن کی تکالیف کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ نتیجہ کے طور پر دو اور سپروائیزر مقرر کئے گئے۔ جموں، کٹھوعہ اور اودھم پور — صوبہ جموں کے ان تین حلقوں میں ان تین سپروائیزروں کا کام بانٹا گیا ان کا کام ہریجنوں کی شکایات کو رفع کرنا، چھوت چھات کی لعنت کے خلاف پرچار کرنا اور مختلف قسم کے کلچرل اور سماجی بہبودی کا انتظام کرنا ہے۔ اپنے اپنے حلقوں میں ہو رہے سماج کلیان کے کاموں کا جائزہ لینا بھی ان سپروائیزروں کے دائرہ فرض میں داخل ہے دوسری پچھڑی ہوئی جاتیوں کا خیال رکھنا بھی ان کے فرض میں شامل ہے۔

اس وقت چودہ کمیونٹی سنٹر ان مقامات پر سرگرم کار ہیں:۔

بسوہلی، کٹھوعہ، منڈ ہین (ہیرانگر) بھارتی انبال (سانبہ) چوہالہ (رنبیر سنگھ پورہ) بریری (نوشہرہ) ڈبڈی (ریاسی) دھیاڑی (رام نگر) پروری گجراں (راجوری) پونی (ریاسی) باہو (جموں) رہاڑی (جموں) اور ایک کلچرل سنٹر جلیبھہ ورکرز کالونی (جموں) میں۔ ان چودہ میں سے چار سنٹر تو اسی سال رواں میں چالو کئے گئے ہیں۔ پروری گجراں اور پونی سنٹر خاص کر گوجروں اور بکروالوں اور دیگر خانہ بدوش پچھڑی ہوئی جاتیوں کے لئے کھولے گئے ہیں۔ ان مرکزوں کے انچارج بھی ان ہی لوگوں میں سے ہیں۔ ان تمام مرکزوں میں ایک گرام سیوک، ایک کرافٹ اسسٹنٹ اور ایک دائی کام کرتے ہیں۔ ان تینوں کارکنوں کا کام عوام کی خدمت کرنا ہے۔ ان مرکزوں میں عورتوں اور بچوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے۔ بچوں میں خود اعتمادی کا جذبہ جگایا جاتا ہے۔ جدید ذرائع سے اُن کی پرورش کی جاتی ہے اُن میں روزانہ باقاعدگی سے دودھ بانٹا جاتا ہے اور اسی قسم کے دوسرے کام کئے جاتے ہیں تاکہ یہ بچے جو کل کے شہری ہوں گے، اپنے ملک اور قوم کا بار اپنے مضبوط کندھوں پر اُٹھا سکیں۔ ان مرکزوں میں جہاں تک ہو سکے لوگوں کی مالی امداد کی جاتی ہے۔ کلچرل سرگرمیوں کو بڑھاوا دیا جاتا ہے۔ عورتوں کو کشیدہ کاری، بُنائی، سلائی وغیرہ سکھائی جاتی ہے تاکہ مصیبت زدہ عورتیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھیں اور وہ مجبور ہو کر بُرائی کے راستہ پر نہ جائیں۔ کلچرل پروگراموں کے لئے ان مرکزوں میں گانے بجانے کے لئے ساز دئے جاتے ہیں۔ ہر مرکز میں ایک لائبریری کھولی جاتی ہے جس سے لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق بڑھتا ہے۔

مختلف کمیونٹی سنٹروں میں لگ بھگ دو ہزار روپے کی دوائیاں وغیرہ ہریجنوں میں مفت بانٹی گئی ہیں۔ نوکریوں کے سلسلے میں سرکار کی طرف سے ان تمام پچھڑے ہوئے طبقوں کو خاص مراعات حاصل ہیں۔ سالِ رواں میں اسی محکمہ کے جانب سے ان طبقوں کے ۲۹ اشخاص کو مختلف کمیونٹی سنٹروں میں ملازم رکھا گیا ہے۔ چھوٹی دست کاریوں کے مرکزوں پر ۹ اشخاص برسر روزگار آئے ہیں اور اسی طرح سے ہریجنوں اور دیگر پچھڑی ہوئی جاتیوں کے بہت سے افراد کو مختلف سرکاری شعبوں میں ملازم رکھا گیا ہے۔

خانہ بدوش جاتیوں — گجر اور بکروالوں میں تعلیم کو فروغ دینے کے لئے مندرجہ ذیل مقامی اور چلتے پھرتے سکول سرکار کی جانب سے کھولے گئے ہیں:۔

سردیوں کا ہیڈکوارٹر	تحصیل	گرمیوں کا ہیڈکوارٹر	تحصیل	سال
لستانا	مینڈر	ساری ستانہ	مینڈر	۱۹۵۴-۵۵ء
چنڈی مڑھ	″	مارگ پیرپنجال	کولگام کشمیر	″
سارتو	راجوری	رمن	نیابت گریز کشمیر	″
شاپانی	نوشہرہ	تلیل	″	″
دھرم سال	″	حبلوورا	″	″
بھارکھ	ریاسی	حاجی گاہ	کشتواڑ	″
چرایل	″	مراہ	ریاسی	″
بکھتا	بشیلی	مرواہ	کشتواڑ	″
جندراہ	جموں	مستیاں	کرگل	″
جگی مارگ	ریاسی	(مقامی)		۱۹۵۵-۵۶ء
ڈھنگری	راجوری	سونہ مرگ	گاندربل	″
منروٹ	مینڈر	ہل کاکا	مینڈر	″

سردیوں کا ہیڈ کوارٹر	تحصیل	گرمیوں کا ہیڈ کوارٹر	تحصیل	سال
جھلاوا	رام بن	(مقامی)		۱۹۵۵-۵۶ء
اندر وال	گاندربل	لال مرگ	گاندربل	۵۷-۱۹۵۶ء
چاندرگی	سوپور	نوشہرہ بہاک	گریز نیابت	״
منی بنڈیلہ	اننت ناگ	ناتھیر بہاک	اننت ناگ	״
ڈانڈی دارا	کولگام	باڑی چھالر	کولگام	״
آلاں گڈوال	اننت ناگ	(مقامی)		״
کاراموا	پلوامہ	ترال کنڈی	پلوامہ	״
ڈیری مارگ	״	(مقامی)		״
ہی سر	״	״		״
ڈرانا کرگجری	گاندربل	تاجوا	گاندربل	״
چیس دالیوار	״	جہاں مرگ	״	״
وال گت	״	(مقامی)		״

ان تمام مقامی و چلتے پھرتے سکولوں کی وجہ سے ریاست کے اُن کونوں میں بھی تعلیم کا پرچار ہوا ہے جہاں تعلیم کا پہنچنا کسی نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

نیچے تفصیل دیکھئے ہریجن کمیونٹی سنٹروں کی عمارتوں کے خرچ کی:-

نام سنٹر	خرچ ۵۸-۱۹۵۷ء	خرچ ۱۹۵۸-۵۹ء	کل میزان
کمیونٹی سنٹر چوالہ رنبیر سنگھ پورہ	۲،۵۰۰	۱،۰۰۰	۳،۵۰۰
کڈیڈی (بباسی)	״	۳۰۰	۲،۸۰۰
چھاؤنی امب تل (سانبہ)	״	۶۰۰	۳،۱۰۰
مٹھر چین (ہیرانگر)	״	۵۰۰	۳،۰۰۰
کٹھوعہ	״	۷۰۰	۳،۲۰۰
پچھڑی جاتیوں کے لئے بسوہلی کمیونٹی سنٹر		۲،۵۰۰	۲،۵۰۰
ہریجن کمیونٹی سنٹر باہو (جموں)		۲،۵۰۰	۲،۵۰۰
پچھڑی ہوئی جاتیوں کے لئے پروری گجرانی کمیونٹی سنٹر	۲،۵۰۰		۲،۵۰۰

اس مختصر سے جائزے سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دوسرے پانسالہ منصوبے میں سماجی بہبود کے کاموں کی طرف کس قدر توجہ دی گئی ہے اور ریاست جموں و کشمیر میں کس زور و شور سے اس سے متعلقہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ رہے ہیں کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ یہ بہت ضروری ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کی سرگرمیوں کو دوبارہ بڑھاپنے سماجک قدروں پر پھر سے نظر دوڑائی جائے اور اپنی پرانی روایتوں کو ایک بار پھر سنوارا اور نکھارا جائے۔

"ہر قوم کی تاریخ میں ایسی مثالیں ڈھونڈی جا سکتی ہیں۔ قومی عروج کے زمانے پر نظر ڈالو گے تو وہ سراپا عمل نظر آئے گا۔ لیکن تنزل کا عہد دیکھو گے تو عمل کی جگہ تخیل کی فرماں روائی ہوگی۔ پہلی حالت میں تخیل محدود مگر قدم بے روک ہوتا ہے دوسری حالت میں قدم رک جاتا ہے مگر خیال آسمان پیمائیاں شروع کر دیتا ہے۔ عربوں نے جب روم اور ایران کے تخت اُلٹ دیئے تھے تو اُن کی سادگیٔ فکر کا یہ حال تھا کہ قضا و قدر کے مسئلہ میں وہم و گمان کا دخل بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن جب قضا و قدر اور جبر و اختیار کی گتھی سلجھانے کے لئے انہوں نے پچاس سے زیادہ مذہب گڑھ لئے تو وحشی تاتاریوں کے جولانِ قدم سے اُن کے تمام دارالخلافے پامال ہو رہے تھے۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم)

حدیثِ دیگراں

مورن (کشمیر)

۳۰ جون ۱۹۵۸ء ۔ مکرمی شمیم صاحب!

آداب! "تعمیر" کا آزاد نمبر ایک دوست سے عاریتاً لے کر دیکھا۔ آپ کی علم دوستی اور محنت نے اسے ایک گراں بہا ادبی دستاویز بنا ڈالا ہے ؎

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

آپ کا گنگا دھر بھٹ دیہاتی ۔ مورن (کشمیر)

مکرم بندہ نواز تسلیم!

"تعمیر" کا آزاد نمبر دیکھ لیا۔ واقعی یہ کوشش بہت مستحسن ہے۔ کشمیری ادب کے گمنام گوشوں کو منصۂ شہود پر لانے کا سہرا آپ کے سر ہے۔ مجھے محمد یوسف صاحب ٹینگ کا تنقیدی مضمون بہت پسند آیا۔ واقعی ایسے مضامین ایک شاعر کی مختلف حیثیتوں کو عوام کے سامنے پیش کرنے میں وقت کے پردوں کو سرکانے کا کام کرتے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی آپ کی ایسی کوششیں جاری رہیں گی۔ ایک شکوہ ضرور ہے کہ "تعمیر" پابندیٔ وقت کے ساتھ ہمیں انتظار کی زحمت سے نجات نہیں دیتا۔ کشمیری ادب کے ایسے ترجمان رسالے کو ماہوار نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہونا چاہیئے تھا۔ نہ معلوم آپ کی کیا مشکلات ہیں! خدا کرے کہ آپ کی مشکلات رفع ہو کر "تعمیر" پوری آن بان اور تابناکی کے ساتھ نظر نواز ناظرین ہو!

ایک مضمون "مورخ حسن کیہامی کی شاعرانہ عظمت" زیرِ ترتیب ہے۔ چند دنوں تک مکمل ہوگا تو خدمت میں ارسال کروں گا۔

نیاز آگین رشید نازکی بانڈی پورہ کشمیر

ماہرِ شمیم صیبہ زندہ روز!

"آزاد نمبر" اِمہ شانہ کاڈنک چھُوی مُبارک۔ حق چھُو، کُنہِ مدرسس تام گو

حق ادا۔ آزاد نمبر چھُو پرٛتھ قسمہ شان دار۔ اگرچہ کی لبنہ یوان چھہ، سُو چھہ صرف سُہ اِشارہ، یُس دٔون جاین دٔدیو مضمون نِگارو غلام محمد ڈار زٔدہ ماسس کُن کوٗرمُت چھُو، یُس آزاد مرحوم سُند یارِ جان اوسمُت چھُو۔ کاشی تکلیف آسہ ہے آمٕت کرنہ، تہ تمُس نِشہ آسہ ہے آزاد مرحومس متعلق معلومات جمع کٔرتھ آزاد نمبرس منز شایع آمٕت کرنہ۔ خیر یہِ چھہ نُوژہ کتھاہ! اکتھ چھہ زِ یہِ قدم یُس زِ تُلتھ، اُمید چھہ اگر یِہوٗی قدم رٔود، کٔمی کاسس تام آسہ اسہ نِشہ پننین رازٔ مٕتین ادبی ماہ پارن ہُنٛزہ زندگی ہُند نقشہ موجود۔ شمیم صاب یہِ چھُو پُز زِ "تعمیر" چھُو کوڈٕمُت ادبی رِسالہ یُس امہ شانہ تہ امہ طریقہ دراو۔ اکھ شِکوہ تہ چھُم ضرور، خبر زِ آسیہِ اِتفاق، مگر تُو کرَے عرض۔ یِتہِ اُمنُز سُنٛزہ شاعری پٮ۪ٹھ بحث آسان چھہ، تیتہِ آسِتن ماجہ کشیرِ ہندِس کانٛسہ شاعرہ سُنٛدِس کلامس پٮ۪ٹھ تہِ کِنہہ بحث آسان آمٕت کرنہ۔ تہِ کیا زِ اُردو شاعرن ہندِ خاطرِ چھہ کیتیاہ رِسالہ تِمبرہ موجود، مگر چون "تعمیر" چھُو سانہِ باپت کنٛوہی خانہ مول رِسالہ یُس فقط سانہ باپت آسُن گوژھہ۔

چون فاروق بڈگامی ۔ بڈگام کشمیر

سرینگر ۔ مکرمی شمیم صاحب۔ آداب!

جولائی کا "تعمیر" ملا۔ اب کا شمارہ اپنے دامن میں بے شمار رعنائیاں لئے آیا ہے۔ مظفر عازم کی نظم عراق کے عوام کی فتح کا رزم نامہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک جوان اور تابندہ انسانی کارنامے کا ہدیہ سپاس بھی ہے۔ فضا ابن فیضی کی نظم بھی بلاغت اور دلکش اسلوب کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ مولانا آزاد کے خط اور اُن سے متعلق دوسرے مضامین نے پرچے کی افادیت کو بہت اونچا کر دیا ہے۔

آپ کا وید پرکاش

ہوہو

تلو دوٗلہ لگے گوٗیرہ دوٗلہ شونگ بوٗسا دتھ، دوٗلہ شونگ بوٗسا دتھ
مہ گوشام دوٗلہ تام سا دِتھ بوٗتھا دتھ، سا دِتھ بوٗتھا دتھ
چہ ہومہ دام رتھ لیفہ تل شونگ ژہ پانس، تل شونگ ژہ پانس
لگے رتھ وندے ہوتہ اوگن ژھینو مہ دانس، اوگن ژھینو مہ دانس
ٹھیچہ بنیٹھ کوپچے ہینتھ مہ گو کوٹ پانس، مہ گو کوٹ پانس!

لگے دوٗلہ ژہ ونہ ژون تہ ژوف بوزنا دتھ، تہ سا دِتھ بوٗتھا دتھ
ژہ مو ددہ لگے بہرہ چشمن لگے ہو، تہ چشمن لگے ہو
تلوکرتہ آلو ژہ ماطینو تہ مولو، ماطینو تہ مولو
ہن ہول تہ ترکجا، ججوی مال سندہیو، تہ ججوی مال سندہیو
کرے گوژہ گورے تہ ممہ چاو نادتھ، سا دِتھ بوٗتھا دتھ

دوٗلے ہے، دوٗلے ہے دوٗلے زون ماجی، دوٗلے زون ماجی
ژلن ووب چشم کم سونزِ شوب لاجی، سونزِ شوب لاجی
پہزلون ستارے ژہ چھی سیت باجی، ژہ چھی سیت باجی
جگر گوشہ دوٗلہ ژونہ نشہ داننا دتھ، تہ سا دِتھ بوٗتھا دتھ

ژہ ججوی بابہ افتا بہ ججوی دور گومت، سو ججوی دور گومت
اتھ خضرہ ہن، کھنڈہ فول آسہ اومت، سو ہو آسہ اومت
ژہ پھیران چھیو، چکہ توے مو ہرومت لگے چکہ ہرومت!

ژہ نوگاٹہ جارسں ہناہ چھے تعن دت، تہ سا دِتھ بوٗتھا دتھ
رتھ نالہ ہتہ لالہ دردانہ میانے، دردانہ میانے
گنجم آستان دشے دادہ چانے، دشے دادہ چانے
اچھن گاشں ججوہم، یہ کیاہ بیاکھ زانے، یہ کیاہ بیاکھ زانے
لگے لالہ فلہ، ادہ کلہ شونگ بوٗسا دتھ، تہ شونگ شونگ بوٗسا دتھ
تلو دوٗلہ لگے گوٗیرہ دوٗلہ شونگ بوٗسا دتھ، دوٗلہ شونگ بوٗسا دتھ

ننھے معمار

۱۴ نومبر کو ملک
بھر میں بچوں کا قومی
دن منایا جا رھا ھے

تعمیر

ماہنامہ

تعمیر

سرینگر

دسمبر سنہ ۱۹۵۸ء

جلد ۳ • شمارہ ۱۵

ایڈیٹر

شمیم احمد شمیم

جوائنٹ ایڈیٹر

محمد یوسف ٹینگ

فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے • قیمت سالانہ چھ روپے

عبدالغنی وڈیرا پرنٹر پبلشر نے گورنمنٹ پریس میں چھپوا کر لالہ رخ پبلی کیشنز سرینگر کی طرف سے شائع کیا

★

ترتیب

زاویے

۱۹۵۸ء کا سال قریب الاختتام ہے اور اس سال جو اہم واقعات رُونما ہوئے وہ بجا طور پر اسے ایک تاریخی حیثیت کا حامل بنا دیتے ہیں اور اپنے گوناگوں اثرات کی وجہ سے تاریخِ عالم ایک مدت تک اس برس کو یاد کرے گی۔ سائنسی میدان میں اس سال نوعِ انسانی نے جو عظیم فتوحات حاصل کیں اُن پر ہمارا سر فخر سے اُونچا ہو سکتا ہے۔ اولادِ آدم آج تک زمین کی قوتوں کے خلاف نبرد آزما تھی اور اُس کی اس کشمکش کا نام ہی ہماری موجودہ تاریخ ہے مگر سال ۱۹۵۸ء میں تاریخ کا یہ زمینی دَور ختم ہو گیا۔ زمین اور اُس کی قوتوں کو تسخیر کر کے اب انسان کی شوخیٔ اندیشہ وعمل فطرت کے وسیع تر میدانوں کا رُخ اختیار کر رہی ہے اور اب اُس کے فکرِ فلک رس کی باگ کائنات کے زیادہ گمبیر راز دا شگاف کرنے کی طرف پھر گئی ہے۔ آج سے ہزاروں سال پہلے مصری ریاضی دان ارشمیدس نے زمین کی کشش سے آزاد ہو کر کرۂ ہوائی میں ٹھہرا رہنے کی آرزو کی تھی مگر اُس وقت اس خواب کی حیثیت ایک خوابِ پریشاں سے زائد نہ تھی۔ مگر انسان منزلِ ماہ کو اپنے خوابوں میں بسا کر آگے بڑھتا رہا اور آج وہ جو خوابوں کو بے حقیقت اور بے حاصل سمجھتے ہیں، خود دیکھ سکتے ہیں کہ انسان اُس وقت تک پیچھے نہیں ہٹا جب تک کہ اُس نے خوابوں کے اس ویران خاکے میں حقیقت کے رنگ نہیں بھرے۔ آج زمین کی کشش مفتوح ہو چکی ہے۔ ذہنِ انسانی کے اختراع کردہ پیغام رساں خلائے بسیط میں انسان کی فتوحات کا پیش خیمہ بن کر محوِ گردش ہیں۔ مگر بقولِ شاعرِ مشرق ؎

بمنزلِ دِل بمیرد گرچہ باشد منزلِ ماہے

انسان ابھی مطمئن نہیں ہے اور وہ ماہ و مہر کی منزلوں سے گذر کر اور نہ جانے کہاں کہاں کی خبر لانا چاہتا ہے ؎

سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

نیر

اُمید کی جا سکتی ہے کہ آیندہ برس اولادِ آدم کی ان افلاکی فتوحات کا رُخ متعین کرنے میں سنگِ میل ثابت ہو گا۔

کشمیر کے مشہور صوفی شاعر صمد میر کا اپنے آبائی گاؤں منبلہ بار میں ۷۶ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا ہے۔ صمد میر کشمیری شاعری کے کلاسیکل سکول کی ترجمانی کرتے ہیں اور ہمارے دَور میں اُن کا وجود ایک تاریخی واقعہ تھی۔ مرحوم کشمیری ادب کے دَورِ قدیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ تصوف کے اُس سکول سے منسلک تھے جس کی زمزمہ پردازیاں شمس فقیر، شاہ قلندر، سوچہ کرال اور نعمہ صاحب کی زبانوں میں کشمیریوں کے قلب و نظر کو شاداب بناتی آئی ہیں۔ ہمارے دَور میں ایک مدت تک عام جنتا کا خیال تھا کہ صمد میر بھی ان ہی رفتگاں سے تعلق رکھتا ہے مگر جناب بخشی غلام محمد کی سرکردگی میں ۱۹۵۶ء کے ستمبر میں جو جشنِ کشمیر منعقد ہوا، اُس نے کشمیری ادب کے باقی شعبوں کی طرح اس بارے میں بھی ایک صحیح ادبی نشاۃ الثانیہ کا رول انجام دیا اور اسی جشن میں صمد میر کی کلاسیکل شخصیت تواریخ کے نہاں خانوں سے عوام کے پردۂ بصارت پر ظاہر ہو گئی۔ صمد میر نے عمر بھر جس فلسفے اور جس نقطۂ نظر میں زندگی بسر کی۔ اخیر تک اسی کے راگ الاپتا رہا اور اس کے کلام میں کہیں بھی بھولے سے بھی موجودہ دَور کے مسائل کا پرتو نہیں ملتا۔ مگر پھر بھی اُن کی شخصیت میں ہمارا ماضی ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ آخری ڈور بھی کٹ گئی ہے اور قدرتی طور پر ہم سب کو اس مفارقت سے کافی صدمہ ہوا ہے۔

خیال تھا کہ رسول میر نمبر جنوری کے اوائل میں پیش کیا جائے مگر اہلِ قلم کی بے اعتنائی کی وجہ سے یہ عزم پورا ہونے سے رہ گیا ہے۔ رسول میر کے فکر و فن سے متعلق مضامین کا کافی ذخیرہ پہنچ گیا ہے مگر ایک نمبر اُس وقت تک مبسوط نہیں کہلایا جا سکتا جب تک کہ شاعر کی حیات اور شخصیت کے بارے میں بھی کافی مواد اکٹھا نہ ہو جائے۔ اس تعلق میں ہماری شکایت یہ ہے کہ اہلِ قلم حضرات گرم جوشی سے اس سلسلہ میں مصروفِ اعانت نظر نہیں آ رہے ہیں۔ بہرکیف سارے امکانات کا جائزہ لے کر ہماری کوشش ہے کہ بہت جلد رسول میر نمبر کو اپنے شایانِ شان انداز میں

حامد الہ آبادی

انتباہ

تم کہ کشمیر کے حق دار بنے بیٹھے ہو
حامل جرأت یلغار بنے بیٹھے ہو
اپنے گھر کی تو کبھی آگ بجھائی نہ گئی
اور غیروں کے وفادار بنے بیٹھے ہو

بات کڑوی ہے مگر بات میں سچائی ہے
امن کو جنگ کے نعروں پہ ہنسی آئی ہے

اپنے پیغمبر برحق ﷺ کو نہ بدنام کرو
ہو مسلمان تو کچھ حرمتِ اسلام کرو
ملک گیری ہی نہیں عزت و عظمت کے نشان
خاکساری میں بھی پنہاں ہیں بڑے کام کرو

کام کرنا ہو تو میدان بہت خالی ہے
جنگجو قوموں سے تقدیس کی پامالی ہے

کل تھے ہم میں ہی سے تم آج مگر بچھڑے ہو
چھوٹی باتوں کا لئے دل پہ اثر بچھڑے ہو
صلح ہر ایک سے ہے شیوۂ اربابِ یقین
بھول جانا نہ کہیں راہ گذر بچھڑے ہو

سرحدیں بٹ گئیں انسان تو بٹ سکتا نہیں
رشتۂ صلح و محبت یوں ہی کٹ سکتا نہیں

باز آؤ کہ تمسخر نہ اُڑے جنگ نہ ہو
سرخیٔ خونِ شہیداں کبھی بے رنگ نہ ہو
رُوحِ عثمان علی خان یہ پکار اُٹھی ہے
حاملِ ظرف وہی ہے کہ جو دِل تنگ نہ ہو

ملکیتِ شیخ کی قبلہ سہی جنت تو نہیں !
اور جنت میں کوئی جُرمِ محبت تو نہیں

ان گنت لوگوں کی اِک خلدِ تمنّا یہ چمن
وجہِ تسکین دِلِ زار ہے تنہا یہ چمن
آج کشمیر کو جی کھول کے ہنس لینے دو
کتنے زخموں کا ہے بھرپُور مداوا یہ چمن

یہ چمن وُہ ہے کہ اِک عزم جواں ہے جس پر
یہ فضا وہ ہے کہ جنت کا گماں ہے جس پر

نخلِ شاداب کی ہر پھوٹتی کونپل دیکھو
سبزہ زاروں میں تمناؤں کے آنچل دیکھو
حرف آجائے گا خالق کی ہُنرمندی پر
خاک کا ڈھیر نہ ہو سبزۂ مخمل دیکھو

جنگ کا نام تم آسان سمجھ بیٹھے ہو
لذتِ نفس کو ایمان سمجھ بیٹھے ہو

زورِ ایٹم پہ نہ اتراؤ کہ مرہم تو نہیں
اسلحہ خانوں میں رُوحِ بنی آدم تو نہیں
نہ سہی یہ کہ کوئی ہم میں رہے یا نہ رہے
عہدِ جمہور کے مِٹنے کا تمہیں غم تو نہیں

آگ اور خوُن کی تاثیر کا احساس رہے
آدمیت کا بہر حال تمہیں پاس رہے

دسمبر ۱۹۵۹ء

تنویر

عبدالسلام
مدرس ہائر سکنڈری سکول سرینگر

عبدالغفور شوپیانی

آدم کی پیدائش سے اس وقت تک دُنیا کے ہر دَور اور ہر گردش میں مختلف قسم کی ذی قدر ہستیاں صفحۂ زندگی پر جلوہ افروز ہوئیں جن کے فیوض و برکات سے بعض اوقات ایک قبیلہ بعض اوقات ایک سماج بعض اوقات ایک قوم یا مُلک اور کبھی کبھی ساری دُنیا مرہونِ منت رہی ہے۔ ان بہترین انسانوں میں سے کئیوں نے سیاست و تجارت اور معاشی گتھیاں سُلجھائیں۔ کئیوں نے علم و ادب کے ذریعے سماج کی خدمت کی۔ کئیوں نے شعر و شاعری سے کام لے کر قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ کئیوں نے قانونی نکات اور فلسفہ و حکمت میں نام پیدا کیا۔ کئیوں نے مصلحانہ اور مُوحدانہ خدمات انجام دیں اور کئیوں نے اس مادّی دُنیا (Material world) کے پردوں کو چاک کیا اور عبادت و بندگی کا بہترین نمونہ پیش کرکے رُوحِ اعظم سے براہ راست تعلق بڑھا کر انسان کی بہبُودی اور اس کی دوامی (آفاقی) زندگی کے لئے ایسی ایسی زندہ جاوید اصول، قدریں اور ایک نظامِ حیات پیش کیا جو کہ زمین کی گردش اور آفتاب کی تمازت رہنے تک ہمیشہ رہیں گے۔ ان موخرالذکر ہستیوں میں سے پہلے پیغامبروں کا درجہ ہے اور بعد میں بڑے بڑے اولیاء، عارفاں، مجدّد، بُزرگ اور ریشی ہیں جو ہر دَور اور ہر گردش میں زمین کے مختلف گوشوں میں پیدا ہوئے اور ہوتے چلے جائیں گے۔

کشمیر کی سرزمین نے بھی زندگی سے متعلق ان ہر راہبروں، اہلِ قلموں، شاعروں ڈراما نویسوں، حکیموں، مصوّروں، فوجی جرنیلوں اور بڑے بڑے ولیوں، ریشیوں، بزرگوں اور عارفوں کو اپنی آغوش میں پالا۔ جنہوں نے اعلیٰ ترین فن کاری، آرٹ، مہارت اور ریاضت و اطاعت سے انسان کی زندگی کو صحیح سانچے میں ڈالنے کی کوشش کی۔ ایک طرف سے غنیؔ اپنے حشر آفریں نظموں سے غافل انسان کو بیدار کرتا ہے اور دوسری طرف سے کالی داس اپنے ڈراماؤں کے ذریعے ایک نئی رُوح پھونکتا ہے۔ ایک طرف سے چرک انسان کی صحت کو ٹھیک اور تندرست بنانے کے لئے اپنے کامیاب تجربے دِکھاتا ہے اور دوسری طرف سہوراے مصوّری کا اعلیٰ ترین آرٹ دِکھا کر نظروں کو مبہوت کرتا ہے۔ ایک طرف سے زی بھان صداقت اور شجاعت کے میدانوں میں پیش قدمی کرتا ہے اور دوسری طرف سے للہ ایشور، شیخ نورُالدین ولی اور حضرت سلطان شیخ حمزہ مخدومی کشمیری خدا کی بارگاہ میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے شرابِ حقیقت کے جام سے لب ریز ہوتے ہیں اور اپنی زندگی کے ریشے ریشے میں طلبِ حق، تقویٰ، پابندیٔ شریعت، مجاہدہ، رضا و زہد کے وغیرہ اوصاف سموتے ہیں جن سے ہزارہا بندگانِ خدا سرشار اور فیض یاب ہوکر اپنی زندگی کے دوامی آثار صحیح معنوں میں حاصل کرتے ہیں۔

ان ہی پاک بزرگوں میں سے قصبۂ شوپیان نے آج سے قریباً ڈیڑھ سَو سال پہلے شاہ عبدالغفور کو پیدا کیا۔ شاہ عبدالغفور کے ہم پایہ جیسے بُزرگ اگرچہ کشمیر نے بہت تعداد میں پیدا کئے ہیں۔ لیکن اس ہستی پر اس لئے کچھ لکھنا اور ناظرین کو اس نامعلوم ہستی سے اس لئے واقف کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ ہستی بُزرگ اور عارف ہونے کے علاوہ صاحبِ تصنیف ہیں اور صاحبِ تصنیف ہونے کی حیثیت ہی سے ان کی تصنیف "پنج گنج" (منظوم) کے کچھ اقتباسات بھی پیش کرتا ہوں تاکہ اربابِ ذوق ان کے میٹھے کلام اور پند و نصائح سے متمتع ہوجائیں۔

نام اور خاندانی حالات

اسم شریف عبدالغفور اور آبائی پیشہ رشد و ہدایت اور مسلک السلوکؒ کی راہِ ہدایت لوگوں کو بتانا تھا اور پُشت در پُشت ان کے اسلاف یہی راہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ علاقہ شوپیان میں ہزاروں لوگ ان کے خاندان سے اپنی خیر و

برکت اور فلاح و بہبود کی اُمیدیں وابستہ کئے ہوئے تھے اور وہ ان کی صحبت میں آ آکر ان کے احکام امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ ان کا یہ سلسلہ آج سے تقریباً گیارہ سال قبل تک ان کے آخری جانشین شاہ غلام احمد مرحوم تک زندہ رہا۔

شاہ مرحوم کی زندگی کے مختصر حالات

شاہ مرحوم نے کسی مکتب یا دارالعلوم میں تعلیم نہیں پائی تھی بلکہ ابتداً میں قرآن پاک اور بعد میں بالکل قلیل عربی و فارسی تعلیم حاصل کی۔ پھر روحانی کسبِ کمال حاصل کرنے کے لئے اذکار و افکار اور غور و فکر کا سلسلہ جاری کیا اور اپنی روح کی سینچائی اور آبیاری شروع کی۔ تاکہ پہلے خود مکمل عبدیت اور معرفتِ حقیقی کے جام سے لبریز ہو جائیں۔ پھر دوسروں کو اس راہ پر گامزن ہونے کے لئے تلقین و ہدایت و راہبری کریں۔ چنانچہ حکایات سے پُشت در پُشت چلتا آرہا ہے کہ انہوں نے اس سلسلہ میں اپنی عمر کا ابتدائی بلوغیت کا زمانہ غاروں اور پہاڑوں کی کھوہوں میں گذارا۔ جہاں صرف غور و فکر اور اذکار و افکار سے اپنے اعضاءُ و جوارح کو توجہ الی الذات میں متوجہ رکھتے تھے اور اپنے جسم کا ایک ایک سانس اور ایک ایک دَم یادِ خدا میں بسر کرنے لگے۔ باضابطہ شرعی حدود کے اندر پیہم مجاہدات و ریاضات سے اپنی رُوح کو روحِ اعظم سے واسطہ پیدا کرنے کی سعی و کوشش کی۔ چنانچہ اس بلند و برتر مقصد کے حاصل کرنے میں ان کو مرشدِ کامل کی ضرورت پیش آئی۔ یہاں پر یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ دُنیا کے ہر ہر کام اور ہر فن حاصل کرنے کے لئے اُستاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ پھر شاگرد میں جتنی ذہانت اور فطانت ہوگی۔ اُسی قدر وہ آگے بڑھتا جائے گا۔ بعض اوقات ایک شاگرد بھی اپنے اُستاد سے زیادہ میدانِ علم و عمل میں آگے بڑھ سکتا ہے۔ اگر حضرت موسیٰ جیسی ہستی کو شعیب جیسے اُستاد نہ ملتے تو وہ بھی قلیل جد و جہد میں بلند مقامات پر نہ پہنچ جاتے۔ یہی حقیقت ہے جس کو ترجمانِ حقیقت نے یُوں بیان فرمایا ہے:۔ سے

دمِ عارف نسیمِ صبح دم ہے اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسّر شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

چنانچہ شاہ مرحوم نے بھی رہبرِ کامل اور کسی شعیب صفت والے آدمی کی جستجو کرنا شروع کی تاکہ اچھی رہبری سے ان کا مقصد جلدی حل ہو جائے اور زیادہ وقت خار دار راہوں میں صرف نہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے پہلے پہل کرالہ پوشؒ میر تحصیل بڈگام کے ایک مقتدر ہستی شاہ علی صاحب کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور انہوں نے حتی الوسع ان کی رہبری اور سلک السلوک کی راہ پر نشان دہی کرنے کے علاوہ بہت سے حقائق و آثار سے مادی پردے ہٹا کر ان کی بصیرت میں وُسعت اور ان میں مزید قربِ الی اللہ حاصل کرنے کی توجہ اور بہت ذوق و شوق پیدا کیا اور بہت حد تک یہی ان کے مزید منازل و مدارجِ معرفت کے راہبر تھے۔ اس کے علاوہ اُس دَور کے مختلف اولیاءُ کی مجالس میں بھی رہ رہ کر اپنے دِل و دماغ اور دیگر قویٰ کو آلائشوں اور نفسانی خواہشات سے اپنے آپ کو پاک اور منزّا کرکے اخلاقِ مکارم سے اپنی رُوح کے لئے کیمیائی کھاد میسّر کی۔ شاہ مرحوم راتوں کو بیدار رہتے تھے اور ہمہ تن زندگی کا ایک ایک لمحہ یادِ خدا میں گذارتے تھے۔ میں نے شوپیان کے عمر رسیدہ آدمیوں سے سُنا ہے کہ شاہ صاحب اپنے تکیہ کے چنار کے ایک بڑے گدّے پر راتوں کو قبلہ رُو بیٹھ کر عبادت و ریاضت کرتے رہتے تھے، صرف اس لئے کہ نیند کا غلبہ نہ ہو۔ اس مقام پر پہنچ کر بعض اوقات ان سے مختلف قسم کی کرامات حسبِ ضرورت ظاہر ہوئیں، جن کا تذکرہ علاقہ شوپیان کے اربابِ ذوق اس وقت بھی کرتے ہیں۔

تعلیمات

جب شرابِ معرفت کے جام سے انہوں نے اپنی رُوح کو شاداب کیا تو یہ اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چل کر طالبانِ راہ کو صحیح راستہ کی رہبری کرنے لگے اور ہر ایک آدمی جو ان کی مجلس میں آ کر مُلاقات کا شرف حاصل کرتا، فیض یاب اور خیر و برکت لے کر نکلتا۔ اس کی مجلس میں جو آدمی جتنی دیر بیٹھتا اُسی قدر لذّت، رُوحانی سرور اور اطمینانِ قلب حاصل کرتا اور اس صحبت میں بیٹھنے کا اثر بہت دیر رہتا۔ اور بار بار ان سے ملنے کا اشتیاق کرتا۔ جو آدمی ایک دفعہ ان کی صحبت میں آتا اُس کو اس قدر چین اور آرام اور رُوحانی کیف حاصل ہوتا کہ اُس کا جی جانے کو نہ چاہتا ان کی شخصیت اتنی جاہ و جلال اور نُورانی تھی کہ دُور ہی سے ان کی شخصیت اور ان کے عارف ہونے کا دِل و دماغ اقرار کرتا۔ انکساری، عاجزی، استغنا، فقر، رضا اور خودی کُوٹ کُوٹ کر بھری تھی۔ جو آدمی ان کے دربار میں اپنی حاجت پُوری ہونے کے لئے آتا تو شاہ مرحوم اللہ پاک سے اس کی حاجت روائی کے لئے رجوع کرتے تھے تو فوراً حاجت مند کی حاجت پُوری ہوتی تھی اور ساتھ ساتھ شاہ مرحوم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تبلیغ فرماتے رہتے۔ ہر آدمی کی تربیت ظاہری اور باطنی طور کرتے تھے اور احکامِ شریعت کی پابندی - مقاماتِ اعلیٰ پر پہنچنے کے لئے پہلی

منزل فرماتے تھے۔ مرید، مخلص، طالب وغیرہ لوگ جو نذر و نیاز لاتے اُس کو اسی مجلس میں حاضرین میں اپنے اپنے حصہ کے مطابق بانٹ دیتے تھے اور اپنے پاس ایک کوڑی بھی نہ رکھتے تھے۔ مساکین اور فقراءُ ان کے دربار میں کافی تعداد میں جمع ہوتے تھے۔ شاہ مرحوم ہر ایک کو سیر ہو کر کھلاتے اور پلاتے اور وقت کے لحاظ سے کئی دنوں کے لئے خوراک بھی دیتے تھے اور ساتھ ساتھ اچھے کاموں کی تبلیغ اور اپنے ہاتھ سے روزی حاصل کرنے کے گر بھی سکھاتے تھے۔

تصنیفات

تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ شاہ مرحوم نے دو کتابیں پنج گنج اور گنج پنج لکھی ہیں۔ پنج گنج منظوم قلمی میں نے حاصل کی۔ لیکن گنج پنج کا کہیں پتہ نہیں۔ بہت تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ کتاب بھی تحصیل کولگام یا تحصیل پلوامہ کشمیر کے کسی علمی گھرانے میں ضرور موجود ہوگی۔ پنج گنج شاہ مرحوم نے ۱۲۲۵ھ میں ختم کی ہے اور قریباً دو ہزار چار سو ابیات پر مشتمل ہے۔ اس کے اختتام پر کتاب کا سارا نچوڑ اس طرح بیان فرماتے ہیں :-

دو ہزار و چار صد ابیات شُد　　جملہ نص و پند و اخبارات شُد
چوں صدف ہر بیت از اسرار پُر　　بلکہ ہر حرفی بدامنی ہمچو دُر
شعر خوانی نیست این جا اے عزیز　　اندریں اشعار پیدا کن تمیز
جملگے حالست و احوال و مقام　　رازہائے عارفاں دروی تمام
معنئ عرفاں نمودم این کتاب　　تا شود مر طالباں را فتح باب
۱۲۲۵ھ | یک ہزار و دو صد و دو دہ و پنج　　وقت دیگر ختم شد این پنج گنج
پنج گنج معنوی اتمام شُد　　از شراب معرفت پُر جام شُد

پنج گنج مذکور میں شاہ مرحوم نے اسلام کے پانچ ارکان — کلمہ، نماز، روزہ، زکواۃ اور حج پر الگ الگ بحث کر کے ان کے مقصد، رُوح اور ان کو اپنانے سے انسان میں جو عظمت، برتری اور انسانیت کے صحیح اوصاف پیدا ہوتے ہیں دہرائے ہیں اور خدا کی بارگاہ میں ان اصولوں کو اپنا کر کس طرح ایک خاکی انسان فرشتوں سے رتبہ اور درجہ میں بلند و اولوالعزم بن سکتا ہے۔ اور ان پانچ بنیادی اصولوں سے متعلق بحث کر کے اس کتاب کا نام "پنج گنج" رکھا ہے۔ کتاب کا آغاز حمد باری تعالیٰ اور نعتِ احمد مجتبیٰ سے ہوتا ہے۔ آغاز سخن کے مختلف ابیات یہ ہیں ؎

حمد لک یا واہب فیاضِ وجود　　واجب است بر ذات پاک تو وجود
کل اوقات لک الحمد الثنا　　من لسان الکل الیک ربنا
اے ز خورشید رُخت نُورِ ازل　　وی قدیم لایزال و لم یزل
ای وجود مطلقت گشتہ محیط　　فی السماء والارض ما فیہا البسیط
من چگویم وصفِ تُو ای ذوالجلال　　گنگ و لا یعقل ہمہ اہل کمال
ظلمت این ہستیم را دار دور　　محو اندر نور گرداں ای غفور
ہستیت شد ہستئ بر ہستہا　　وز شراب مستئ بر مستہا
عارفاں اندر وصالت شادماں　　عاشقاں بہر جمالت جانفشاں
ہر کجا عارف کہ بکشاید نظر　　ثم وجہ اللہ میند از بصر

اس طویل حمد، نعت اور دیگر منقبتوں کے بعد مختلف پند و نصائح سے انسان کو نصیحت فرماتے ہیں کہ تمہاری کامیابی اور کامرانی کن کن چیزوں پر منحصر ہے اور کن کن کاموں سے تجھے احتراز کرنا چاہیئے اور کون کون سی چیزیں تجھے بوالہوس بنا کر جہنم میں پہنچا دیں گی۔ یہ دُنیا انسان کے لئے ایک تربیت گاہ (Training Period) ہے۔ یہاں کے ہر ہر خیر اور شر کا ریکارڈ خدائی اہل کاروں کی فائلوں میں درج ہوتا ہے اور روزِ جزا کو اس کا جزا و سزا بھگتنا پڑے گا۔ چنانچہ خدا کا خوف اور اس کی محبت پیدا کرنے کے لئے فرماتے ہیں ؎

ای برادر از خدا شرمی بدار　　چند بفریبد ترا این روزگار
دلبرا پندی بگویم ہوش کن　　جملہ حس ہا ببین آر و ہوش کن
راحتِ دُنیا و این طولِ امل　　با قناعت باید کردن بدل
دل بیاد ذکر حق مشغول دار　　غفلت و طول و امل از دل برار
صبر مفتاح الفرج اندر خبر　　صابراں را وعدۂ جنت نگر
صبر را قدری نباشد جز عمل　　وضع شی بہتر بود اندر محل
گر عمل را نیت خالص بود　　عاملش با اہل حق جالس بود
گر عمل خالص بود از ہر ریا　　از آسماں آید ندا اینسو بیا
ہر عمل خود میرود بر آسمان　　در قبول افتد رود بالای آں

پنج گنج کے مقصد اور الگ الگ ابواب کی تشریح خود فرماتے ہیں ؎

گنج اول گویمت از شرع دین　　تا شوی اندر شریعت فخر دین
گنج اول کلمہ آمد اے رفیق　　گنج دوم شد صلواۃ اندر طریق

گنجِ سوم صوم باشد اے پسر　باش صائم تا کہ بکشایند در
گنجِ چارم شد ذکواۃ اے معتمد　گنجِ پنجم حج بود اندر سند

ان پانچ ابواب سے متعلق جن پر ساری کتاب مشتمل ہے اُکے بالکل مختصر ابیات درج ذیل ہیں :—

کلمہ :— کلمہ خواند خاص در روز و شباں　بلکہ در ہر لحظہ و در ہر زماں
قاعداً او قائماً او ماشیاً　سیرقاً، نائماً فراشیاً
اکلاً او شارباً او سارباً　کلِ لیالٍ و فی انہاریا
کلِ اوقاتٍ نفوس ساعۃٍ　کلَ آنٍ فی شدادٍ راحۃٍ

صلواۃ :—
شد صلواۃ مومناں معراجِ روح　در نماز از روح یابد صد فتوح
در خبر معراجِ مومن در نماز　زانکہ اندر نور دارد چشم ناز
آں یکے لذت بیابد از حضور　و اندگر در بعد صورت ماندہ دور
آں یکے در قربِ حق نزدیک شد　و اندگر در عادت تاریک شد
آں یکے شد بہرہ ور اندر نماز　و اندگر تا وال زدہ اندر مجاز
خاصکانرا قرب باشد اندر نماز　سجدہ آرند با خشوع و بانیاز

صوم :—
صومِ عارف دیدنِ حق است و بس　ایں چنیں صائم نباشد ہیچ کس
عارفانرا رویتِ حق شد صیام　ایں چنیں روزہ ندانند خاص و عام
صوم و افطارش ہمہ باشد بقا　زانکہ او مسرور بود اندر بقا
مغز و نغزِ صوم گفتم مختصر　از خواص الخاص از نصّ و خبر
تا نمیدانند صوفی را حقیر　کودکان و جاہلان خورد گیر

ذکواۃ
در شریعت فرض شد دادن ذکواۃ　بر غنی از نار تا باید نجات
در قرآن تاکید شد او توالزکواۃ　ہم چناں تاکید آمد از صلواۃ
گر سخی کافر بود دارد رجا　از سخاوت حق شود او را رضا
در دو اند جہاں مومن بخیل　دارد ش در دین و در دنیا ذلیل

حج :—
از حج و عمرہ کنوں گویم تمام　حج خاص الخاص و حج خاص و عام
حج بود بہتر از اعمالہا　بلکہ بہتر از ہمہ افعالہا
حاجیاں چوں عزم راہِ حج کنند　الوداع بر مال و ملکِ خود زنند
الوداع از خویش و فرزندان و زن　الوداع دارند از حُبِّ وطن
خاصکاں چوں سوی بیت اللہ روند　ارجعی از حق ندای بشنوند
عزم جزم نیتِ خاصانِ دین　در سفر کردن ہمی باشد ہمیں
گر میسر صحبتِ مرداں شود　صد ہزاراں حج بر و قربان شود
صحبتِ مرداں بہر مسِ کیمیا　کیمیا مس را بجوید ہیں بیا

ہر رکنِ اسلام کے ساتھ ساتھ دلفریب حکایات اور واقعات نہایت ہی دلکش پیرایہ میں بیان کئے ہیں اور بہت ہی اچھی طرح ان حکایات و واقعات کو اصل مضمون کے ساتھ منطبق کر کے اپنی فنی مہارت کا بیّن ثبوت دیا ہے۔ میں ان واقعات کو بھی تحریر کرتا۔ لیکن مضمون کی طوالت کی وجہ سے نظر انداز کرتا ہوں۔ کتاب تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔

مدفن

صحیح طور اس وقت تک راقم کو معلوم نہیں ہوا کہ شاہ مذکور نے کس سنہ اور کس تاریخ کو اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی۔ ممکن ہے کہ ان کے گھر کے پرانے کاغذات اور کتابی حاشیوں پر کسی جگہ اس کا ذکر تحریر ہو۔ بونہ گام شوپیان میں بادامی باغ کے ایک طرف ان کا تکیہ ابھی موجود ہے اور ان کے روضہ کے ارد گرد ایک مٹی کی چار دیواری بھی تھی جو کہ اب بالکل گر گئی ہے۔ اگر حکومت اس عارف باللہ کے مدفن کو بہ حیثیتِ ایک مصنف کے محفوظ کراتی تو اربابِ ذوق و شوق شاکر و ممنون رہتے !

فضا ابن فیضی

خندۂ آغوش

زندگی بے خلشِ دردِ طرب کوش نہیں
ہائے وہ پھول جو کانٹوں سے ہم آغوش نہیں

اب تو ہر سانس پہ لَو دیتی ہے یادِ غمِ دوست
اُف وہ لمحے جو مجھے اب بھی فراموش نہیں

بڑی مشکل سے تری یاد بھی آئی ہے ابھی
ورنہ اپنا تو زمانے سے ہمیں ہوش نہیں

بارہا میں نے اسے دِل سے مخاطب پایا
وہ نظر میرے لئے تو لبِ خاموش نہیں

یُوں تو بھُولا ہی کہو حادثۂ عہدِ جنوں
اِک وہ معصوم نظر ہے جو فراموش نہیں

خلوتِ شوق پہ اِک عمر سے چھایا ہے سکوت
اب تصوّر بھی تِرا خندۂ آغوش نہیں

ہے تری نرگسِ سرشار کا یہ فیض کہ میں
ہوش میں رہ کے بھی تہمت زدۂ ہوش نہیں

جل کے بھی ہے تپشِ افروزیٔ پنہاں باقی
منتِ شمع سے پروانہ سُبک دوش نہیں

جانے کیا کہہ گئی چُپکے سے نسیمِ سحری
سُن لیا ہے جو کلی نے تو اسے ہوش نہیں

مئے ساغر نہ سہی، بوسہ ساغر ہی سہی
شکر صد شکر میں ساقی کو فراموش نہیں

اور افسانۂ مستی کوئی دے لو ترتیب
کیا ہُوا زلفِ معنبر جو سرِ دوش نہیں

ہر سکوتِ نگہ شوق میں ہے کوئی پیام
تُو ہی اے جلوۂ جاناں ہمہ تن گوش نہیں

اے فضاؔ! بے خودیٔ غم کا نشہ ہے ازلی
میں کبھی ہوش میں بھی تھا یہ مجھے ہوش نہیں

کبیر احمد جائسی

مولانا عبدالسلام کی نثر نگاری

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کے کارنامے اتنے زیادہ اور اتنے مختلف النوع ہیں کہ ایک مقالہ میں ان کی تفصیل نہیں کی جاسکتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایسے نقاد ہیں جن کے قلم سے "شعرائے ہند" اور "اقبال کامل" جیسی کتابیں نکلی ہیں تو دوسری طرف سے آواز اٹھے گی کہ انہوں نے "اسوۂ صحابہ" اور "سیرت عمر بن عبدالعزیز" وغیرہ بھی لکھی ہے اور اس لحاظ سے وہ ایک مذہبی مصنف ہیں اور ان کی زندگی کا مشن مذہب اور مذہب کی صالح روایات کو دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مولانا ایک مؤرخ ہیں جنہوں نے "ہندوستانی تمدن" اور "تاریخ اخلاق اسلامی" پر کتابیں لکھی ہیں تو فلسفہ و حکمت کے حلقہ سے صدا آئے گی کہ وہ ایک فلسفی ہیں اور انہوں نے "حکمائے اسلام" لکھی ہے اور اسلام کے حکما اور فلاسفہ کے نظریات اور ان کے فلسفہ پر بحث کی ہے۔ اگر ان کی غزلیات دیکھ کر یہ حکم لگایا جائے کہ وہ ایک شاعر ہیں، جن کی ساری زندگی شعر و نغمہ ہے تو "الندوہ" "الہلال" "البلاغ" اور "معارف" کے صدہا مضامین گواہی دیں گے کہ وہ ایک نثر نگار ہیں، جنہوں نے زمانہ کے ذوق کو متاثر کیا اور کتنے ادیب اور اہل قلم ان کے قلم کے سایہ میں پروان چڑھے۔ ایسے ہمہ گیر انسان کے کارناموں پر نظر ڈالنے کے لئے جس وقت نظر اور فرصت کار کی ضرورت ہے وہ کہاں میسر ہے۔
اس لئے اس مقالہ میں صرف مولانا کے طرز تحریر اور اسلوب بیان پر بحث کی جائے گی، جس سے اندازہ ہوگا کہ ان کا قلم مختلف موضوع پر کس روانی اور بے باکی سے چلتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم کے شاگردوں میں ان کی ادبیت اور انشا پردازی مولوی عبدالسلام کو ملی اور تحقیق سید سلیمان کے حصہ میں آئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مرحوم کا قلم ادب و انشا میں کچھ اس طرح منجھ گیا تھا کہ پورے شبلی اسکول میں ان کے برابر کا پھر کوئی انشا پرداز پیدا نہ ہوسکا۔ ان کا اشہب قلم مذہب، فلسفہ، تاریخ و ادب، شعر و سخن، کلام و عقائد سارے میدانوں میں یکساں چلتا ہے اور میں سے ہر موضوع پر اتنا ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ ان کی تحریر کی کیا کیا خصوصیات ہیں اور انہوں نے مولانا شبلی کا کس حد تک تتبع کیا ہے؟ اور ان کو اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے؟ اسی پر ہم ذیل میں بحث کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا شبلی کے ادب کی تین اہم خصوصیات ہیں — روانی، ایجاز و اختصار جوشِ بیان۔ ان ہی تین چیزوں کو سامنے رکھ کر مولانا عبدالسلام مرحوم کی علمی اور ادبی کاوشوں کا جائزہ لینا ہے۔

متانت

مولانا شبلی کی طرح مولوی عبدالسلام مرحوم کی عبارت میں بھی بڑی روانی پائی جاتی ہے۔ برجستگی، برمحل الفاظ کا استعمال، لہجے کی بلندی دلچسپی نے ان کی عبارت کو اور بھی دل کش اور دلآویز بنا دیا ہے۔ ان کی ہر تصنیف اور ان کا ہر مضمون ان کے قلم کی ان خصوصیات کا مظہر ہے۔ خشک سے خشک مضمون کو بھی اپنے حسن قلم سے پر کیف بنا دیتے ہیں۔ موضوع خواہ تاریخ کا ہو، یا ادب کا، فلسفہ کا ہو یا عقائد کا، فقہ و حدیث کا ہو یا قرآن و حدیث کا، ان کے قلم کی شگفتگی میں فرق نہیں آتا۔ مثلاً صحابہ کرامؓ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے متبعین کا موازنہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:—

"اگر ہم شناوراں طوفان نوحؑ کے حالات کا پتہ لگانا چاہیں تو ناکامی کے سوا ہم کو کیا ملے گا۔ اگر ہم معتکفان وادی تیہ کے اخلاق و عادات سے واقف ہونا چاہیں تو خاک بیزی کے سوا ہم کو کیا حاصل ہوگا؟ اگر ہم حواریین عیسیٰ کے سوانح تلاش کریں تو چند غیر مرئی نقوش کے سوا ہم کو تاریخ کے صفحوں میں کیا نظر آئے گا۔ لیکن اصحاب محمدؐ کے ایک ایک خط و خال کو ہم تاریخ کے مرقع میں دیکھ سکتے ہیں اور اس مرقع کو مذہبی، علمی، سیاسی، اخلاقی غرض ہر حیثیت سے دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔"

(اسوۂ صحابہ ج ۱ ص ۳)

۱؎ مولانا کی یہ تصنیف غیر مطبوعہ ہے جس کا مسودہ دارالمصنفین میں موجود ہے

یہ انتخاب صاحب کی مشہور ترین کتاب "اسوۂ صحابہ" سے لیا گیا ہے جس میں اُن مقدس و برگزیدہ انسانوں کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کے فیوض و برکات سے آج بھی ایک عالم مستفید ہو رہا ہے۔ یہ ایک تاریخی اور مذہبی تصنیف ہے اور اس کے اعتبار سے وہ اور بھی اسلوب اختیار کر سکتے تھے مگر ان کی ادبیت نے اس کے لئے بھی انشا پردازانہ ہی اسلوب پسند کیا۔ اور اس نے اس تصنیف میں ایک جان ڈال دی ہے۔ الفاظ کی نشست، ان کا برمحل استعمال اور لہجے کی بلند آہنگی نے عبارت میں بڑا زور پیدا کر دیا ہے۔ اگر اس وصف پر ان کا قلم یہ دعویٰ کرے کہ

ع موج بر موج شکستم چو بہ عمال رفتم

تو بے جا نہ ہوگا۔

مرحوم کا یہ اندازِ بیان صرف مذہبی تحریروں تک ہی محدود نہیں بلکہ ادب کی ہر صِنف میں ان کا قلم اسی طرح موتی بکھیرتا ہے اور ان کی تحریر اسی طرح شگفتہ اور رواں ہوتی ہے۔ مثلاً اکبر الہ آبادی کی شاعری پر ایک مقالہ کی تمہید میں لکھتے ہیں :-

"ارسطو فلسفہ کی تعلیم ٹہل ٹہل کے دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ فلسفیانہ مسائل کی تشریح ہنس ہنس کے کرتا تو دُنیا ان کو بازیچۂ اطفال جانتی اور فیلسوف کی جگہ ایک خوش طبع ظریف کا لقب پاتا۔ لیکن اکبر نے قوم کو اخلاق، تمدن اور طرزِ معاشرت کے جو دقیق نکتے سکھائے ان کی تلقین تعلیم میں بھی غلطی کی۔ اس لئے قوم نے ان کے کلام کو صرف اس حیثیت سے دیکھا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں "کیونکر" کہتے ہیں۔ ان کے کلام کو کسی نے اس حیثیت سے نہیں پڑھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن صورت اور مادہ میں تفریق و امتیاز بالکل ممکن ہے اور کیونکر سے کیا کو نہایت آسانی کے ساتھ جُدا کیا جا سکتا ہے۔" (معارف جون ۱۹۳۷ء)

مولانا مرحوم کے ترجموں میں بھی یہی شان ہوتی ہے۔ "ابنِ خلدون" "تاریخ فقہ اسلامی" اور "انقلاب الامم" جو مختلف الفن عربی کتابوں کے ترجمے ہیں، اس دعوے کی تصدیق میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ترجمہ کتنا مشکل کام ہے، اگر مترجم حُسنِ الفاظ اور عبارت آرائی پر نظر رکھتا ہے تو اصل مضمون خبط ہو جاتا ہے۔ اگر تحت اللفظ ترجمہ کرتا ہے تو اس کی کاوش صوری اعتبار سے ناقص ہوتی ہے۔ مسٹر عنایت اللہ دہلوی کے بعد مرحوم وہ پہلے مترجم ہیں جن کے ترجمے روانی، سلاست اور برجستگی کے لحاظ سے اوریجنل تصانیف کا حکم رکھتے ہیں۔ انقلابِ امم موسیو لیبان کی ایک فرنچ تصنیف کا بالواسطہ ترجمہ ہے، جسے عرصہ ہوا مولانا نے عربی سے اُردو میں منتقل کیا تھا۔ جب یہ کتاب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے دیکھی تو مترجم کو بہت داد دی اور اسے اُردو کا بہترین ترجمہ قرار دیا اور مولانا سید سلیمان ناظم دارالمصنفین کو لکھا کہ اب بھی ہمارے مولانا کی ادبی صلاحیتوں کے بارے میں شُبہ کیا جا سکتا ہے؟

غرضیکہ مولانا مرحوم کے ترجموں میں بھی وہی ادبیت ہوتی ہے جو اُن کی دوسری تصانیف میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً

"ہندوستان درحقیقت ایک تاریخی کتاب ہے جس کے آگے حکمت و بیان کی تمام کتابیں ہیچ ہیں۔ دُنیا میں وہی صرف ایک ایسا ملک ہے جہاں سیاح ایک طرف سے نکل کر دوسری طرف کو جاتا ہے تو گویا ایک زمانہ کی حدود سے نکل کر دوسری طرف کو جاتا ہے۔ دوسرے زمانہ کے حدود میں قدم رکھتا ہے اور انسان نے ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک وحشت و تمدن کے جو مراحل طے کئے ہیں وہ بہ یک نظر اس کی نگاہ کے سامنے آجاتے ہیں۔ تمام دُنیا کے انقلابات کی تصویریں وہاں موجود ہیں۔" (انقلاب الامم ص ۱۱۵)

ان چند مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا مرحوم کی تحریر خواہ مذہبی ہو یا ادبی، فلسفیانہ ہو یا تاریخی، اس کی سلاست اور روانی میں ذرّہ برابر فرق نہیں آتا۔ ان کے معاصروں میں کوئی بھی قلم برداشتہ اتنی رواں، اتنی شگفتہ، اتنی سلیس عبارت لکھنے پر قادر نہیں تھا۔ قلم برداشتہ کی قید اس لئے ہے کہ وہ جب کوئی تحریر لکھتے تو اس میں بالکل کانٹ چھانٹ نہ کرتے۔ مولانا محمد حسین آزاد کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے مسودہ میں چٹ پر چٹ لگاتے چلے جاتے۔ یہاں تک کہ اصل اوراق سے زیادہ چٹ کی ضخامت بڑھ جاتی۔ لیکن مولانا عبدالسلام ندوی کا کمال یہ تھا کہ وہ جو کچھ ایک مرتبہ لکھ دیتے اس میں کسی قسم کی ترمیم اور حک و اضافہ نہ کرتے، اپنے مسودہ کی نظرِ ثانی بھی کرنا پسند نہیں کرتے اور نہ کبھی عام اہلِ قلم کی طرح صاف کرتے اور کراتے۔ ان کا پہلا ہی مسودہ ایسا ہوتا جیسے خود انہوں نے ازسرِ نو صاف کیا ہو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو اپنے قلم پر کتنی قدرت تھی اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی انشا پردازی کا یہ ذوق بالکل وہبی تھا، کسب و ریاضت کا اس میں مطلق دخل نہ تھا۔

جوشِ بیان

مولانا بڑے ہی خاموش، متین اور سنجیدہ واقع ہوئے تھے، دُنیا سے الگ تھلگ اور نام و نمود اور شہرت و قیادت سے کوسوں دُور رہتے تھے۔ ان کی زندگی دو خانوں میں بٹی ہوئی تھی، یعنی رجائیت اور قنوطیت میں۔ قنوطیت کے زمانہ میں ان کا قلم

گونگا ہو جاتا تھا اور رجائیت کے زمانہ میں جب تن نشاط سے جاگتے تھے اور ان کا قلم بیدار اور گویا ہو جاتا تھا، جس طرح خود زندگی اور نشاط سے لبریز رہتے تھے۔ اسی طرح ان کے قلم سے بھی جوش و خروش اُمنڈ تا رہتا تھا، ان کی تحریر میں جہاں تڑپ، جوش اور اُمنگ نظر آئے، سمجھنا چاہیئے کہ وہ اسی دَور کی ہے جب زندگی ابلی پڑتی تھی، ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"لطافتِ طبع، رقتِ قلب اور اثر پذیری ایک نیک سرشت انسان کا اصلی جوہر ہیں اور ان ہی کے ذریعہ سے وہ ہر قسم کے پند و موعظت، تعلیم و تربیت، ارشاد و ہدایت کو قبول کر سکتا ہے، پھولوں کی پنکھڑیاں نسیم صبح کی خاموش حرکت سے ہل جاتی ہیں، لیکن تناور درختوں کو بادِ صرصر کے جھونکے بھی نہیں ہلا سکتے۔ شعاعِ نگاہ آئینہ کے اندر سے گزر جاتی ہے۔ لیکن پہاڑوں میں فولادی تیر بھی نفوذ نہیں کرتے، بعینہٖ یہی حال انسان کا بھی ہے، ایک لطیف الطبع، رقیق القلب اور اثر پذیر آدمی ہر دعوتِ حق کو آسانی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے، لیکن سنگ دل اور غلیظ القلب لوگوں پر بڑے بڑے معجزے بھی اثر نہیں کرتے۔ " (اسوۂ صحابہ ج۲ ص۲۴)

یہ جوشِ بیان اسی کتاب تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی ہر کتاب اور ان کا ہر مضمون اس وصف کا حامل ہے۔ ان مضامین کا تو ذکر ہی کیا جن میں سے بعض "الہلال" و "البلاغ" میں گم نام شائع ہوئے اور ناشروں نے بلا تحقیق ان کو مولانا آزاد کی طرف منسوب کر دیا۔[1] "الندوہ" اور "معارف" کے صفحات بھی اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کے ہاتھ سے جوشِ بیان کا دامن نہیں چھوٹتا۔ اس موقعے پر خاص طور سے ہم ان کے ایک مضمون کا ذکر کریں گے۔ عرصہ ہوا مولانا نے اشتراکیت پر ایک جامع مقالہ سپردِ قلم فرمایا تھا۔ اس کی تمہید میں اشتراکیت کی ابتدا اور اس کی نشو و نما سے بحث کی ہے۔ اس کو دقیع اور مدلل کرنے کے لئے مرحوم نے جس طرح جوشِ بیان کا اظہار کیا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔

"مذہبی حیثیت سے اگرچہ قدرت کے رازہائے سربستہ نہایت دقیق مصالح پر مبنی ہیں لیکن دُنیا کی سطحی نظر سے نظامِ فطرت میں ہر جگہ نشیب و فراز نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو فطرت اس قدر مسرفانہ فیاضی کرتی ہے کہ نہایت سفلہ، مبتذل اور کمینہ لوگوں کے جیب و دامن کو مال و دولت، زر و جواہر اور سیم و زر سے بھر دیتی ہے، دوسری طرف یہ بخیلی ہے کہ بڑے بڑے حکما، بڑے بڑے فلاسفر، بڑے بڑے انبیا کو نانِ شبینہ کے محتاج نظر آتے ہیں۔ اس درد انگیز منظر کا نظارہ جذبات پر مختلف اثر ڈالتا ہے۔ زہد پیشہ لوگ صبر، توکل اور قناعت کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ صوفی منش مسئلہ تسلیم و رضا کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں، حکما اُن ناہمواریوں کی تہ میں سلسلۂ علل و اسباب اور مصالح عالم کا سُراغ لگاتے ہیں۔ شعرائے چرخ سفلہ پرور کی ہجو میں معروف ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایک سریع الانفعال شخص کا آتش کدۂ جذبات اس شرارہ سے دفعتاً بھڑک اُٹھتا ہے اور وہ اشتعال کی حالت میں اگرچہ فطرت سے کسی قسم کا انتقام نہیں لیتا، تاہم سلطنت کو اس بے اعتدالی کا اصل مجرم قرار دیتا ہے۔ کیونکہ دُنیا میں وہی فطرت کی جانشین اور روایات کی رُو سے خدا کا سایہ ہے"

(معارف جون ۱۷ء)

ایجاز و اختصار کے ساتھ اطناب بھی نثر نگاری کا ایک ہُنر ہے۔ ضرورت اور محل کے لحاظ سے بات کو کم سے کم الفاظ میں بیان کرنا اور اس میں زیادہ سے زیادہ معنویت پیدا کرنا نہایت مشکل کام ہے لیکن اطناب بھی کچھ آسان نہیں ہے، ایک چھوٹی سی بات کو زیادہ سے زیادہ الفاظ میں اس طرح بیان کرنا کہ بات کا مختصر ہونا بھی ظاہر نہ ہو، اور قاری کو ذرہ برابر تکدر بھی نہ ہو، ایک بڑے فن کار ہی کا کام ہے، اطناب کا حسن صرف اُس وقت تک قائم رہ سکتا ہے، جب فن کار کے پاس الفاظ کا کافی ذخیرہ ہو، اور اسے زبان و بیان پر اس قدر قابو ہو کہ ایک ہی بات ہزار پہلو سے بیان کرنے پر بھی نئی معلوم ہو۔ مولانا مرحوم کی یہ خصوصیت ہے کہ اطناب کے موقع پر بھی جوشِ بیان کو برقرار رکھنے کا پورا اہتمام کرتے ہیں، مندرجہ بالا اقتباس میں اطناب ہی نے جوش اور زور پیدا کر دیا ہے، اس وادی میں بھی مولانا یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں۔

در راہ عشق پیرو پیشینیاں نہ ایم
ایں شیوہ را بطرزِ دگر می کنیم ما

ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ مسجد نبوی پر ایک مقالہ لکھا ہے۔ اس میں پورے اطناب کے ساتھ دُنیا کے تغیر و تبدل پر نظر ڈالی ہے، اس کا جوشِ بیان ملاحظہ ہو

"سبزۂ خوابیدہ کو دستِ خزاں کی تھپکیوں نے موت کی نیند سُلا دیا بادِ صرصر کے جھونکوں سے مرجھا کر گُلِ خنداں گلزار کے بدنما داغ بن گئے، غنچوں نے آنکھ کھولی تو گُل چیں کے دستِ بیداد بھی نظر آئے۔

---

[1] یہ ظلم صرف حضرت الاستاذ ہی کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ قبلہ سید صاحب بھی اسی ہدف کے شکار ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آج تک اس ظلم کا تدارک نہ کیا گیا۔ نعیم

آدم شجرِ خزاں رسیدہ کی طرح عریاں ہو گئے۔ اعجازِ عیسیٰ کی زبان چند ہی دِنوں کے بعد گنگ ہو گئی۔ عصائے موسیٰ پھر اپنی سیرتِ اوّلین کی طرف لوٹ آیا۔ بیت المقدس کے کنگرے شرک کا نشیمن بن گئے اور بیت الحرام کی دیواروں پر بتوں کی نمائش کی گئی جن کی بے زبانی نے توحید الٰہی کے راگ کو دفعتاً خاموش کر دیا۔"

("معارف" جولائی سنہ ۱۶ء)

اقتباسِ بالا میں صرف اتنا کہنا ہے کہ توحید کی جگہ کفر و شرک نے لے لی۔ جہاں تکبیر کی صدائیں گونجا کرتی تھیں وہاں ناقوسِ برہمن کا شور بلند ہونے لگا۔ لیکن اتنی سی بات کو مولانا نے اس قدر دلچسپ اور پُر زور کر دیا ہے کہ اس کا اطناب ہمارے ذہن پر ذرّہ بھی گراں نہیں گذرتا بلکہ طبیعت چاہتی ہے کہ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جایئے۔ اس اطناب کے ساتھ جوشِ بیان کو اول سے آخر تک قائم رکھنا انشا پردازی کا بہت بڑا کمال ہے ؏

ایں سعادت بزورِ بازو نیست!

ایجاز و اختصار

گذشتہ صفحات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ایجاز و اختصار نثر نگاری کا زیور ہیں۔ علامہ شبلی اپنے کو ایجاز کا بادشاہ کہا کرتے تھے۔ یوں تو ان کے تمام شاگردوں نے ان کے اس اسلوب کا تتبع کیا ہے، لیکن مولانا عبد السلام ندوی ان سب میں آگے ہیں۔ کہیں کہیں ان کی تحریروں میں اطناب کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ مگر یہ مولانا آزاد مرحوم کی صحبت کا اثر تھا[1] جن کو مولانا شبلی اپنے مقابلہ میں اطناب کا بادشاہ کہا کرتے تھے، ان کے شروع کے مضامین میں یہ پہلو نمایاں ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ کم ہوتا چلا گیا اور اختصار و ایجاز بڑھتا گیا، ایجاز کا ایک کمال ملاحظہ ہو:—

"انسان جو کچھ سیکھتا ہے وہ عالمِ بالا کے رموز و اسرار نہیں بلکہ اس کے اجزا تمام تر عجائب خانوں میں، لیبارٹریوں میں اور نباتات کے باغوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ علوم و فنون کے لئے جو ہیکل قائم کرنا ہوگا وہ ان ہی کے مجموعہ کا نام ہوگا۔" (معارف)

یہ اقتباس "فنِ تعلیم و تربیت" کے ایک سلسلۂ مضمون سے لیا گیا ہے جو وسائلِ تعلیم سے متعلق ہے۔ اگر وہ چاہتے تو اسی بات کو اور طول دے سکتے تھے۔ کہ وہ کم عالمِ بالا کے اسرار و رموز کی تشریح کر سکتے تھے اور یہ بتا سکتے تھے کہ تجربہ گاہوں میں، کتب خانوں میں اور نباتات کے باغوں میں وہ کون کون سی چیزیں ہیں جن سے انسان کچھ سیکھ سکتا ہے اور ان کے سیکھنے کا طریقہ کیا ہے یا کیا ہونا چاہیئے لیکن انہوں نے ایک طول طویل دفتر کو چند جملوں میں لکھ دیا ہے۔ اس میں زورِ بیان، بلند آہنگی، حسنِ تراکیب، الفاظ کا با موقع استعمال سب ہی کچھ ہے۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:—

کہنا یہ ہے کہ انسان کی سماجی زندگی کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے اور اس کی نفسیات کچھ اس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں سے کٹ کر، الگ ہو کر، جُدا رہ کر سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے سے قاصر ہے، اس کی فطرت ہے کہ وہ جب غم گین ہو، اس پر مصائب و آلام کے پہاڑ لوٹ پڑے ہوں، دِل کی وادیاں سونی ہو گئی ہوں، ہر طرف ایک مہیب گھٹا چھائی ہو، گُل تر بھی اس کی نگاہوں میں خارِ خشک کی طرح کھٹکتا ہو تو اس وقت اس کا کوئی ہم جنس اس کی دل دہی کرے، اسے تسکین دے اور کہے کہ یہ تو ہوتا ہی آیا ہے اور جب تک انسان قیدِ حیات و بندِ غم میں رہے گا، ہوتا ہی رہے گا یا جب وہ مسرت و انبساط کے بے پایاں سمندر میں غرق ہو، دُنیا کا ایک ایک ذرّہ حسین نظر آتا ہو، ارمانوں کا ہجوم ہو، تمنائیں اٹھکیلیاں کر رہی ہوں، اُمیدوں کا چراغ روشن ہو، اس وقت وہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کی خوشیوں میں شریک ہو، اور اس کو محسوس ہو کہ وہ تنہا نہیں، اس عالمِ آب و گِل کا ذرہ ذرہ اس کے ساتھ خوشیاں منا رہا ہے اور شریک بزمِ رقص و سرود ہے۔ اسی فطری طلب و خواہش کی بنا پر انسان سماج سے دُور رہ کر زندگی نہیں گذار سکتا بلکہ مِل جُل کر رہنا چاہتا ہے۔ یہی جذبات ہیں جو تمدن اور معاشرت کی بُنیاد ہوتے ہیں۔ بات کتنی طویل ہے۔ لیکن مولانا نے چند جملوں میں اس کو سمیٹ لیا ہے، فرماتے ہیں:—

"انسان فطرتاً مدنی الطبع پیدا ہوا ہے، اس لئے وہ تمدنی، مالی، اخلاقی غرض متعدد حیثیتوں سے دوسرے افراد کے تعاون کا محتاج ہے۔ امانتِ باہمی کا یہی اصول تمدن کا سنگ بُنیاد ہے اور یہ اصول جس قدر منضبط اور مستحکم ہوتا ہے اسی قدر انسانی زندگی پُر لطف، خوش گوار اور دلچسپ بلکہ دیرپا ہو جاتی ہے۔ اگر کشمکشِ حیات میں اس اصول کو نظر انداز کر دیا جائے تو دفعتاً حیاتِ انسانی خطرہ میں پڑ جائے۔" (الہلال جولائی سنہ ۱۴ء)

[1] بقولِ سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب (ملاحظہ ہو معارف جولائی ۱۹۵۸ء)

اس اقتباس کی اُوپر ہم نے جو تشریح کی ہے' پھر بھی تشنہ ہے' اس کا صحیح حق ہم نہیں ادا کر سکے ہیں۔ مولانا کا کمال ہے کہ چند لفظوں میں لمبی سے لمبی بات کو سمیٹ کر اور پُورے حسنِ بیان کے ساتھ لکھ دیتے ہیں۔

مولانا کی مذہبیت ایک عالم پر ظاہر ہے۔ ان کی مذہبی تصانیف اور تحریروں میں جو جوش، شکوہ اور بلند آہنگی ہوتی ہے۔ اس سے اگرچہ ان کی دوسری تصانیف خالی تو نہیں ہے لیکن مقابلتاً ان میں اس کی کمی ضرور ہے۔ ان کو مذہب سے جو لگاؤ تھا' اس کا اثر ان کے اندازِ بیان پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً

کہنا یہ ہے کہ اسلام ایک مشن، ایک مذہب اور ایک مکمل نظامِ حیات کا نام ہے۔ اس کی نگاہ میں شکست و فتح کی کوئی اہمیت نہیں ہے' اگر اسے شکست ہوتی ہے تب بھی اپنے پیام کو پُوری دُنیا کے کانوں تک پہنچانے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ یہ شکست نہ تو اسے پسپا کرتی ہے اور نہ ہی اس کے جذبات کو سرد کرتی ہے۔ اس کی زندگی ادائیگی فرض سے عبارت ہے جس سے وہ شکست کے بعد بھی رُوگردانی نہیں کرتا۔ اگر اسے فتح ہوتی ہے تو دوسری فاتح اقوام کی طرح موت اور غارت گری کا بازار گرم نہیں کرتا۔ غریبوں، مسکینوں اور یتیموں کے مال و دولت پر نالبض نہیں ہوتا۔ عورتوں اور لڑکیوں کی عصمت سے نہیں کھیلتا۔ یہ فتح نہ تو اسے مغرور بناتی ہے نہ اس فتح پر وہ فخر کرتا ہے بلکہ اسے تو اپنا فرض ادا کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ اپنا فرض اس عالم میں بھی ادا کرتا ہے۔ لیعنی اس کے دامن میں جو دولت ہے اس سے کسی کو بھی تہی دست نہیں دیکھنا چاہتا۔ یہی اسلام کی فطرت ہے اور یہی اس کی اصل حقیقت ہے۔ اسی بات کو وہ ایجاز و اختصار کے ساتھ یُوں تحریر فرماتے ہیں :۔

> " وہ حق کا علم بردار ہے اور رایتِ صدق شکست کے اعتراف کے ساتھ بھی اسی طرح لہراتا رہتا ہے جس طرح فتح کی بشارت اس کو بلند رکھ سکتی ہے۔ اس لئے اس نے نہ شکست کے اعتراف میں شماتتِ اعدا کی پرواکی، نہ فتح کے اعلان کو فخر و غرور کا مظہر بنایا بلکہ ہر حالت میں سچائی کا بول بالا رکھا۔ "
>
> (معارف دسمبر سنہ ۱۶ء)

فطرت کے رازہائے سربستہ کی نشان دہی کرتا ہے اور یہ بیان کرتا ہے کہ افریقہ کے خشک ریگستانوں سے، عرب کے بے آب و گیاہ میدانوں سے، قطب شمالی کی برف آلود چٹانوں سے چشمِ عبرت بیں تاریخ کے اسرارِ سربستہ کا پتہ لگالیتی ہے۔ لیکن تاریخ کا اصل صفحہ وہ ہے جو خون کے چھینٹوں سے رنگین ہے اور دُنیا کی تعمیر

ترقی و انحطاط اور تغیر و انقلاب کے معلوم نہیں کتنے راز خون کے ان ننھے چھینٹوں میں پوشیدہ ہیں۔ عبرتِ زمانہ کے لئے جن کو بے نقاب کرنا مؤرخ کا اصلی فرض ہے' اس بات کو نہایت ایجاز کے ساتھ ان پُر زور الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

> "دُنیا کی ترقی و تنزل، عروج و زوال اور تغیر و انقلاب کے اسرارِ نہانی سب سے زیادہ خونیں چادروں کے اندر چھپے ہوتے ہیں۔ افریقہ کا صحرائے اعظم، عرب کا چٹیل میدان، قطب شمالی کی برف آلود سطح اگرچہ بالکل سادہ ہے تاہم چشمِ عبرت بیں کو اس میں تاریخ عالم کے سینکڑوں اسرار و رموز نظر آتے ہیں۔ لیکن اس تاریخ کا سب سے عبرت انگیز وہ صفحہ ہے جس کو خون کے چھینٹوں نے رنگین کر دیا ہے۔ "
>
> (معارف ستمبر سنہ ۱۹ء)

یہ موضوع تو اس کا متقاضی تھا کہ اس کو زیادہ سے زیادہ پھیلا کر لکھا جاتا اور تخیل کی بلند پروازی خوب دکھائی جاتی۔ مگر مرحوم نے حسنِ الفاظ سے اس ایجاز میں وہ اطناب اور اجمال میں وہ تفصیل پیدا کر دی ہے جو تنہا ان ہی کا حصہ ہے اور اس حیثیت سے شبلی کے اسلوبِ نگارش کے تتبع کا انہوں نے حق ادا کر دیا ہے۔

مرحوم کی تصانیف میں بہت سے ایسے مواقع آئے ہیں کہ اگر وہ پھیلنا چاہتے اور بیان پر آتے تو اس کو طلسم ہوشربا بنا دیتے۔ لیکن انہوں نے اپنے اُستاد کے تتبع میں کہیں بھی ایجاز کا سررشتہ نہیں چھوڑا ہے' مضامین کی تمہید میں تو اور زیادہ اس کا خیال رکھتے ہیں کہ طویل سے طویل داستان اور وسیع سے وسیع مفہوم کو استعارات و تشبیہات کے پردہ میں اس طرح لکھ دیتے ہیں کہ اس کے زور و اثر میں ذرہ برابر کمی نہیں آتی۔

ابھی تک ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنے اُستاد شبلی نعمانی کا کامیاب تتبع کیا ہے' ان کو اپنے اُستاد کے ترکہ میں سے جو کچھ ملا اس میں وہ کوئی اضافہ تو نہ کر سکے لیکن اس پر بلا شرکتِ غیرے قابض ضرور رہے۔ وہ فضل و کمال ہی میں نہیں، اخلاق و عادات و معمولات میں بھی شبلی کے سچے شاگرد تھے۔ ان کی زندگی میں ان کی کتاب شعرائے ہند پر سخت سے سخت تنقیدیں ہوئیں اور بعض نے تو تنقید سے گذر کر اس کی تنقیص بھی کی۔ لیکن اپنے اُستاد کی طرح وہ خاموش رہے اور انہوں نے کسی کا بھی جواب نہیں دیا۔ ان کی زندگی اس شعر کی سراپا تفسیر ہے ؎

چیں بر جبیں ز جنبشِ ہر خس نمی رسد
دریا دلان چو موج گہر آرمیدہ اند

محمد امین رفیقی

ایبہ خان چک

سرزمینِ کشمیر جہاں قدرتی مناظر میں عدیم المثال ہے وہاں اس نے وقتاً فوقتاً بہت سے قابلِ فخر علماؑ، فضلاؑ، شعراؑ اور فوجی جرنیل بھی پیدا کئے جو اپنے وقت کے مشہور اور تجربہ کار سپہ سالار تھے۔ لیکن زمانہ کی قدر ناشناسی اور گذشتہ ساڑھے تین سَو سال کی مسلسل غلامی نے اس سرزمین کے عالی حوصلہ بہادُروں کے حوصلے ہمیشہ پست کردئے۔

آج ہمارا مقصد ۱۶ ویں صدی عیسوی کے ایک بہادر فوجی جوانمرد کا تذکرہ ہے جس کا نام ایبہ خان تھا۔ ایبہ خان دراصل مخفف نام ہے ابراہیم خان کا۔ آج تک مؤرخین نے اسی مختصر نام سے اس بہادُر کو تاریخوں میں یاد کیا ہے۔ لیکن بعض مورخین کے چھاپ شدہ نسخوں میں بوجہ سہوِ کاتب یہ نام ایبہ سے بگڑ کر "انبہ یا امبہ" تحریر ہوا ہے۔

ایبہ خان بنِ ابدال خان چک ملکہ حبہ خاتون کے شوہر یوسف شاہ چک فرمانروائے کشمیر کا چچیرا بھائی تھا۔ یوسف شاہ چک علی شاہ چک کا بیٹا تھا اور یہی علی شاہ چک میدانِ عیدگاہ میں چوگان کھیلتے کھیلتے گھوڑے سے گر گیا اور گھر لے جانے پر وہ راستہ میں ہی فوت ہوگیا۔ اس کے مرنے کی خبر سُنتے ہی اس کے چھوٹے بھائی ابدال خان والد ایبہ خان نے اپنے مشیروں اور مددگاروں کی ایک جماعت تخت حاصل کرنے کی غرض سے منظم کی۔ کیونکہ خاندانی روایات کے پیشِ نظر چک خاندان میں بھائی سے بھائی نے تخت حاصل کیا تھا۔ اسی کو مدِنظر رکھ کر ابدال خان چک نے محلہ نوہٹہ میں بغاوت برپا کی۔ یوسف شاہ نے اپنے چچا کی بغاوت کی خبر سُنتے ہی اپنے باپ علی شاہ کی لاش جامع مسجد میں رکھی اور سید مبارک خان بیہقی نے جو کہ اُس وقت کشمیر کا وزیر اعلیٰ تھا، یہ حال دیکھ کر لشکر کشی سے پہلے چند ایک معتبر اشخاص ابدال خان کے پاس بطورِ مصالحت و صلح بھیجے جن میں خاص طور پر ابدال خان کا خسر محمد چک اور بابا خلیل شامل تھے۔ لیکن ابدال خان پر ان کی نصیحت کا کچھ اثر نہ ہوا بلکہ وہ ہر صورت میں تخت حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ سید مبارک خان بیہقی نے جب ابدال خان کی یہ خبر سُنی تو اس نے فوراً اسی وقت یوسف شاہ کی تخت نشینی کی رسم سرسری طور ادا کی اور ساتھ ہی ایک لشکر تیار کرکے محلہ نوہٹہ میں ابدال خان سے مقابلہ کے لئے نکلا۔ میدانِ کارزار میں سید مبارک خان بیہقی کے بیٹے سید ابو المعالی نے ایک تیر ابدال خان کے سر میں مارا۔ وہ تیر کھاتے ہی زمین پر گر پڑا۔ ادھر سے حسین خان نے موقعہ پاکر ابدال خان کا سر میدان میں ہی تن سے جُدا کردیا اور فتح کے نعرے بلند کئے۔

قاضی موسیٰ نے ابدال خان کی بے سر لاش میدانِ جنگ سے اُٹھا کر علی شاہ سے پہلے ہی اس کے آبائی مقبرہ میں دفنا دی اور دوسرے روز پھر یوسف شاہ نے علی شاہ کی لاش مسجد جامع سے اُٹھا کر سپردِ خاک کی۔ ایبہ خان کو باپ کا یہ حال دیکھ کر نہایت رنج ہوا، اور ساتھ ہی ساتھ حسد اور مخالفت کی آگ سینے میں روز بروز بھڑکتی گئی وہ یوسف شاہ اور اس کے بیٹے یعقوب خان چک کی بربادی میں کوشاں رہا۔ جب کبھی بھی کہیں بغاوت یا فساد ہوا، ایبہ خان کا ہاتھ ضرور اس میں ہوتا تھا۔

آخرکار ۱۵۸۶ء میں جب مغلیہ فوج نے کشمیر پر حملہ کیا، بہادر اور جنگجو کشمیریوں نے مغلیہ فوج کے دانت کھٹے کردئے لیکن شامتِ اعمال یا بدقسمتی سے کشمیری فوج کے چند سردار مخالف فوج کے ساتھ مِل گئے اور اسی وجہ سے کشمیری فوج مغلوب ہوگئی۔ اور سرزمین کشمیر مغلوں کے قبضہ میں آگئی۔ باوجود شکست کے ایبہ خان بنِ ابدال خان باغیوں کی ایک جماعت اپنی سرکردگی میں لے کر مسلسل تین سال کشمیر کو آزاد رکھنے کی خاطر مغل افواج کے ساتھ گوریلا جنگ لڑتا رہا۔ آخرکار تین سال کی مکمل شورش و بغاوت کے باوجود اس کے ساتھیوں نے ہتھیار چھوڑ دئے۔ بے چارے ایبہ خان کو بھی ہار ماننی پڑی۔ اور مغلیہ حکومت کشمیر میں تسلیم کرنی پڑی۔ بادشاہ اکبر نے جب ایبہ خان کی اطاعت کا حال سُنا تو اس نے اس کو شاہی فوج میں ایک اچھے عہدہ پر سرفراز کیا۔ اپنی خداداد لیاقت اور جواں مردی سے آہستہ آہستہ بادشاہ جہانگیر کے عہدِ حکومت میں اس کو ایک ہزاری کا منصب عطا ہوا اور دار الخلافہ دہلی سے قطب الدین خان کوکہ گورنر بنگال کی مُلازمت میں شاہی حکم سے بنگال چلا گیا۔

سنہ ۱۶۰۷ء[11] میں قطب الدین خان کوکہ صوبہ دار بنگال نے بادشاہ جہانگیر کو جاگیردار موضع بردوان علی قلی استاجلو عرف شیر افگن کے خلاف ایک شکایت لکھی جس میں یہ لکھا کہ "یہ شخص شاہی احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے اور باج گذاری سے بھی انکار کرتا ہے۔" بادشاہ نے اس کے جواب میں قطب الدین خان کو لکھا کہ علی قلی استاجلو کو یہاں روانہ کر دو۔ اور اگر وہ اس حکم سے سرتابی کرے تو اس کو سزا دی جائے۔

شاہی حکم کی تعمیل میں مارچ سنہ ۱۶۰۷ء کو شیر افگن سے ملنے کے لئے قطب الدین خان بنگال سے قریباً دو ہزار سپاہ اپنے ہمراہ لے کر بردوان روانہ ہوا۔[12] ۳۰ مارچ سنہ مذکور کو شیر افگن گورنر بنگال قطب الدین خان کے استقبال کے لئے اسی سواروں کے ہمراہ آیا۔ جوں ہی شیر افگن شاہی خیموں کی حدود میں استقبال کے لئے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ داخل ہوا تو شاہی سپاہیوں نے اچانک شیر افگن کا محاصرہ کیا اور قطب الدین خان کے فیل بان نے شیر افگن کی طرف شاہی ہاتھی کا رخ کیا تو شیر افگن کا گھوڑا بدھک گیا اور وہ اس حرکت کو تاڑ گیا ادھر اُدھر نظر دوڑا کر بھی جب اس نے خود کو ہمراہیوں کے ساتھ محاصرہ میں دیکھا تو اس نے قطب الدین خان سے پوچھا کہ اصل معاملہ کیا ہے اور وہ کس نیت سے یہ سب کچھ کر رہا ہے؟ قطب الدین خان نے لیت و لعل سے کام لیا۔ یہ دیکھ کر شیر افگن کے ہمراہیوں نے ترکی زبان میں شیر افگن کو اس بے عزتی پر کوسا اور کہا کہ جوانمردی اور غیرت کا یہی وقت ہے۔ اس وقت بے غیرتی سے کام لینا ایک ترک بہادر کے شایانِ شان نہیں ہے۔ یہ سن کر شیر افگن نے قطب الدین خان کوکہ پر حملہ کیا۔ پہلے ہی وار میں اس کا ایک بازو کندھے سے جدا کیا اور دوسرے وار میں اس کا شکم خنجر سے چاک کر دیا اور وہ زمین پر گر کر سسکنے لگا۔

بعد ازاں شیر افگن نے قطب الدین خان کے فوجی افسروں پر حملہ کر کے ان کو بُری طرح مجروح کیا۔ بعض مقابلہ کی تاب نہ لا کر میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دشمن کو پسپا خیال کر کے شیر افگن میدان سے واپس جانے کو ہی تھا تو پیچھے سے ہمارے بہادر ایبہ خان نے طنزاً آواز دی اور کہا :-

"بہادروں سے معرکہ سر کئے بغیر میدان سے واپس جانا بزدلی ہے۔"

یہ آواز سنتے ہی شیر افگن کو واپس موڑنا پڑا، اور ایبہ خان کے ساتھ زور آزمائی کرنی پڑی۔ دونوں بہادر ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح لڑنے لگے کہ تھوڑی ہی دیر میں تلواریں بیکار ہوگئیں۔ آخر یہاں تک نوبت آئی کہ دونوں گھوڑوں سے نیچے اُتر کر پیادہ پا ہو کر دست بدست لڑنے لگے۔ یہ دیکھ کر تمام سپاہی دنگ رہ گئے۔ ایبہ خان نے زمین پر گرتے گرتے ایک ہی وار میں تلوار سے شیر افگن کے سر کے دو حصے کر دئے لیکن بہادر حریف کی تلوار کی نوک اس کے شکم میں اس طرح پیوست ہوگئی کہ اس کا شکم چاک ہوگیا۔ دونوں میدان میں ہی ایک دوسرے کے آمنے سامنے دم توڑ گئے۔ قطب الدین خان اس کے بارہ گھنٹے بعد دم توڑ گیا۔ ایبہ خان مذکور کو شاہی احتشام کے ساتھ موضع بردوان میں آستانۂ بہرام سقہ میں دفنایا گیا۔ اس طرح اس زمانہ کے مشہور جرار جس کی بہادری کی دھاک تمام ایران و ہندوستان میں بیٹھی ہوئی تھی، کا خاتمہ کشمیر کے ایک معمولی سپاہی کے ہاتھ سے ہوا جس کا اعتراف خود بادشاہ جہانگیر کو بھی کرنا پڑا۔

ایبہ خان کے علاوہ اس معرکہ میں یوسف خان بن حسین خان چک منصب دار ڈیڑھ ہزاری اور مشہور مؤرخ کشمیر حیدر ملک چاڈورہ بھی تھا۔ شاہد عینی حیدر ملک چاڈورہ نے ایبہ خان کے مرنے کا حال تاریخ کشمیر میں اس طرح بیان کیا ہے :-

"زناں[13] حسین ایبہ خان کشمیری پیدا شد و بدشنام نام شیر افگن گرفت چوں دشنام از ایبہ خان شنید برگشتہ بہ یک حملہ شمشیر کار او تمام کردہ خواست کہ بجماعت خود ملحق شود یوسف خان کشمیری پیش آمدہ بیک ضربتِ شمشیر انتقام ایبہ خان از وے کشید۔"

لیکن دوسرے مستند مؤرخِ کشمیر یعنی مصنفِ "بہارستان شاہی" اور خود بادشاہ جہانگیر نے اپنی تزک میں اس کے خلاف تحریر کیا ہے۔ مصنف تاریخ بہارستان شاہی یوں رقمطراز ہے :-

"ایبہ[14] خان ولد ابدال خان پای سبقت در میدان مبارزت نہادہ شمشیری بر روی او حوالہ نمودہ کاسۂ سر او را تا نیمہ برید آں مرد مردانہ کہ بقوت رمق حیات کہ در بدنش باقی ماندہ بود حملہ مردانہ بر ایبہ خان آوردہ بیک زخم شمشیر آبدار سیکی طور در شکم او حوالہ نمودہ کار عمرش بسر انجام رسانید و خود در ہماں نفس جان بحق تسلیم نمود۔"

خود بادشاہ جہانگیر نے تزک میں یوں تحریر کیا ہے :- (بقیہ بر صفحہ ۱۳۱)

[11] ہسٹری آف جہانگیر حصہ اول مصنفہ بینی پرشاد صفحہ ۱۷۹ مطبوعہ مدراس ۱۹۲۲ء

[12] مخطوطہ تاریخ بہارستان شاہی صفحہ ۲۰۹ مملوکہ ریسرچ و پبلی کیشن ڈیپارٹمنٹ

[13] مخطوطہ تاریخ کشمیر مصنفہ حیدر ملک چاڈورہ صفحہ ۹۵ مملوکہ ریسرچ و پبلی کیشن ڈیپارٹمنٹ

[14] مخطوطہ تاریخ بہارستان شاہی صفحہ ۲۰۹ مملوکہ ریسرچ و پبلی کیشن ڈیپارٹمنٹ

بلراج حیرت

غزل

پندارِ خود روی نے اجازت نہ دی مجھے
اکثر بُلا کے لُوٹ گئی زندگی مجھے

پھر مُسکرا کے دیکھ رہا ہے کوئی مجھے
پھر مِل رہی ہے دعوتِ آوارگی مجھے

مقصود تیرے غم کی نہ توہین تھی مجھے
ایک اتفاق تھا کہ ہنسی آگئی مجھے

اب تک مقامِ عشق سے ناآشنا تھا میں
تجھ سے بچھڑ کے اِک نئی وُسعت مِلی مجھے

تشریحِ آرزو مِرا مقصد نہ تھا مگر
مجبور کر رہی ہے تری بے رُخی مجھے

شاید تمہیں خیال ہو اِک وقت وہ بھی تھا
کہتے تھے لوگ چاند تمہیں چاندنی مجھے

ہاں اب مزاجِ حُسن و محبّت بدل گیا
ہاں اب کہاں ہے جرأتِ نظارگی مجھے

یا ربّ یہ کِس مقام پہ ہے کاروانِ زیست
رستہ دِکھا رہی ہے مِری گمُرہی مجھے

اللہ رے وہ دَورِ محبّت کہ ہائے ہائے
کہتے تھے کِس خلوص سے تُم زندگی مجھے

ہاں اہتمامِ بزمِ چراغاں کیا تو ہے
لیکن جو راس آنہ سکی روشنی مجھے

حیرتؔ اسی کو لوگ محبت نہ مان لیں
محسوس پھر کسی کی ضرورت ہوئی مجھے

تمکین کاظمی

گلہائے کشمیر گلدستۂ دہلی میں

کشمیر جنت نظیر بڑا مردم خیز خطہ رہا ہے۔ دہلی کے بیشتر مشاہیر علماؐ و شعرا و حکماؐ کشمیر ہی کے گل سرسبد تھے جو دہلی کی مشام جان کو معطر و معنبر کرتے رہے۔ چنانچہ مفتی صدرالدین خان آزردہ، حکیم مومن خان مومن، حکیم محمود خان وغیرہ مشاہیر دہلی کا خاندانی تعلق کشمیر ہی سے تھا۔

آخری شعرائے دہلی میں نواب فصیح الملک بہادر داغ بھی کشمیر ہی کے بیل بوٹے تھے۔ داغ کے نانا محمد یوسف سادہ کار کشمیری فن کار تھے جو کشمیر سے آکر دہلی میں بس گئے تھے۔ ان کی تین چار لڑکیاں تھیں جن میں سب سے چھوٹی بیٹی کو داغ کے جنم دینے کا فخر حاصل ہوا۔ اس طرح داغ ماں کی طرف سے کشمیری تھے مگر جس طرح بعض لوگوں نے مختلف تجربے کرکے گلاب میں مختلف رنگ پیدا کر دئے اور آخر میں کالا گلاب تک پیدا کیا اسی طرح یہ معطر پھول بجائے اپنے ذاتی گلابی رنگت کے سیاہی مائل ہو گیا تھا مگر بو باس گلاب ہی کی بلکہ بہتر از صد گلاب تھی اسی لئے نواب عبداللہ خان (رام پور) نے داغ کے متعلق فرمایا تھا کہ "تینتر سے میں گلاب بھرا ہوا ہے" داغ کی صورت اور سیرت پر اس سے اچھی تنقید یا اس سے بہتر طنز کوئی کر سکا اور نہ کر سکے گا۔

خوش نصیبی سے محمد یوسف سادہ کار کی چھوٹی لڑکی نواب شمس الدین خان، والئی فیروزپور سے متعلق ہو گئیں اور اس تعلق کا ثمر نورس داغ تھے۔ مگر داغ کے جنم لینے کے بعد ہی شمس الدین خان نے دہلی کے ریزیڈنٹ سر ولیم فریزر کو قتل کرا دیا اور اسی الزام میں انہیں پھانسی دی گئی۔ جس وقت شمس الدین خان کو پھانسی ملی ہے داغ کی عمر ساڑھے چار سال کے قریب تھی، انگریزوں نے شمس الدین خان کی جائداد ضبط کر لی، ان کے متعلقین کو پریشان کرنا شروع کیا۔ اس وجہ سے داغ کی والدہ نے داغ کو اپنی بڑی بہن عمدہ خانم کے پاس چھوڑ دیا اور خود روپوش ہو گئیں۔

چند سال تک تو داغ دہلی ہی میں پروان چڑھتے رہے مگر عمدہ خانم متعلق تھیں نواب یوسف علی خان سے (جو بعد میں والئی رام پور ہوئے) چونکہ نواب سعید محمد خان نے تخت رام پور پر رونق افروزی کے بعد اپنے پورے خاندان کو رام پور منتقل کر دیا۔ اس لئے نواب یوسف علی خان بھی رام پور چلے گئے جن کے ساتھ عمدہ خانم بھی گئیں۔ اور داغ کو بھی ساتھ لیتی گئیں۔

رام پور پہنچنے کے بعد داغ کی تعلیم باقاعدہ شروع ہوئی۔ من جملہ اور اساتذہ کے مولوی غیاث الدین خان مؤلف "غیاث اللغات" نے بھی پڑھایا اور خود نواب یوسف علی خان نے بھی غالباً گلستان پڑھائی۔ اس طرح داغ کی تعلیم و تربیت دارالامارت رام پور میں شاہانہ انداز میں ہوتی رہی۔

ادھر داغ کی والدہ چھوٹی بیگم دار و گیر میں مبتلا رہیں کٹھنائیاں جھیلیں — مصیبتیں اٹھائیں اور بڑی دقت سے ادھر ادھر گھوم پھر کر پھر دہلی آگئیں اور آغا تراب علی کے گھر میں چھپی رہیں، جہاں انہوں نے آغا مرزا شاغل کو جنم دیا اور پھر ان کا ستارہ چمکا تو ولی عہد سلطنت نواب فخرالدین خان مرزا فخرو نے عقد نکاح کر لیا اور قلعہ معلی میں جا براجیں اور قلعہ میں پہنچنے کے بعد داغ کو بھی رام پور سے بلا لیا۔

داغ قلعہ میں پہنچے تو مرزا فخرو نے ان کی تعلیم و تربیت میں ذاتی دلچسپی لینا شروع کی، شہزادوں کے ساتھ کتب شاہی میں بٹھائے گئے اور باضابطہ تعلیم ہونے لگی۔ مگر قلعہ کی رنگین فضا نے داغ میں شاعری کی لہر دوڑا دی اور انہوں نے

بچپن ہی سے دلچسپی سے شاعری شروع کردی۔ اور اس شوق کو دیکھ کر مرزا فخرو نے داغ کو استاد ذوق کا شاگرد کرا دیا۔

ذوق نے داغ کو ہونہار، محنتی اور شعر و شاعری کے لئے موزوں پاکر بڑی محنت کی اور آٹھ دس سال ہی میں داغ کو استاد بنا دیا۔ داغ پیدائشی شاعر تھے۔ فطرت نے شاعرانہ دل و دماغ عطا کیا تھا اور طبیعت بھی اسی فن کی طرف مائل تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ادنیٰ کوشش اور تھوڑی سی محنت میں داغ نے وہ مرتبہ حاصل کیا جو دوسروں کو عمر بھر کے ریاض کے بعد بھی نہ مل سکا۔

دہلی میں جو مشاعرے ہوتے ان میں ذوق خود داغ کو ساتھ لے جاتے اور بانیانِ مشاعرہ خود بھی بڑے ہی اشتیاق سے بلاتے تھے۔ پہلے مشاعرے ہی میں داغ نے اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ مفتی صدر الدین خان، مومن خان، صہبائی، غالب، شیفتہ، تسلیم سب معترف تھے۔ قلعہ میں جو مشاعرے ہوتے اُن میں بھی داغ ہی کا طوطی بولتا تھا اور دہلی بھر میں داغ کا ڈنکا بج رہا تھا۔ داغ کی کم سنی، ان کا طرز تغزل، ان کی غزل خوانی اور پھر آداب و تہذیب، رکھ رکھاؤ سبوں کو پسند تھا۔ اسی لئے کبھی شیفتہ پیٹھ ٹھونکتے تو کبھی مومن داد دیتے، کبھی غالب پھڑک جاتے تو کبھی صہبائی گلے سے لگا لیتے۔ کبھی بادشاہ خود پیشانی چوم لیتے۔ عوام کا کیا پوچھنا، مارے واہ وا، سبحان اللہ و ماشاءاللہ کے نعروں کے مشاعرہ سر پہ اٹھا لیتے۔ مگر اس ہر دلعزیزی اور شہرت نے داغ کو بد دماغ نہیں بنایا بلکہ وہ اور سنجھ گئے اور زیادہ محتاط ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذوق کے انتقال کے بعد ان کے تقریباً سب شاگرد غالب کے شاگرد ہوگئے مگر داغ نے غالب کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ گو ان بزرگانہ شفقت غالب شروع ہی سے داغ پر فرماتے تھے کیونکہ داغ کے پھوپھا تھے اور داغ بھی ان سے بہت مانوس تھے ہمیشہ غالب کے پاس جاتے شطرنج کھیلتے، غالب کی غزلوں پر غزلیں کہتے اور سنا سنا کر غالب سے داد لیتے تھے۔

غدر سے نو مہینے پہلے مرزا فخرو نے انتقال کیا اور داغ سے قلعہ چھوٹا۔ قلعہ سے شہر آکر ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا، اور داغ کا گھر بھی لٹا اور داغ سراسیمگی کے عالم میں رام پور چلے گئے۔ نواب صاحب رام پور نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور بطورِ مہمان رکھا۔ رام پور پہنچنے کے بعد پہلا مشاعرہ جس میں داغ شریک ہوئے، نواب صاحب رام پور کے داماد رضا محمد خان کا مشاعرہ تھا جس میں داغ نے مطلع سنایا ؎

بھولے بھٹکے جو ترے گھر میں چلے آتے ہیں

اپنی تقدیر کے چکر میں چلے آتے ہیں

یہیں داغ نے وہ شہر آشوب کہی ہے جس کا ایک ایک شعر تیر و نشتر ہے اور جو غدرِ دہلی پر بہترین نظم سمجھی جاتی ہے۔

گو داغ رام پور میں رہنے لگے مگر ان کا کوئی مستقل انتظام نہ تھا۔ نواب صاحب اپنے نجی (ذاتی) کام کاج لیتے رہے۔ کبھی دہلی بھجواتے، کبھی علی گڈھ۔ اور جیبِ خاص سے داغ کو کچھ نہ کچھ دیتے رہے۔ اس طرح مدت گذر گئی بالآخر کارخانہ جات سرکاری اصطبل وغیرہ کی نگرانی کی خدمت تفویض ہوئی اور برائے نام ساٹھ ستر روپے تنخواہ بھی مقرر ہوگئی مگر نواب صاحب جو پہلے دیتے تھے اب بھی دیتے رہے۔ اب ذرا اطمینان ہوا اور داغ نے دلجمعی کے ساتھ زندگی شروع کی

غدر کے بعد مظفر الدین اسیر، امیر مینائی، منیر شکوہ آبادی، جلال لکھنوی وغیرہ بڑے بڑے استاد رام پور پہنچ گئے تھے۔ ان سے مقابلہ ہونے لگے۔ یہ سب لکھنؤ کے اساتذہ تھے۔ خود نواب صاحب بھی طرزِ لکھنؤ کے دلدادہ اور شیفتہ تھے۔ داغ تنہا دہلی اسکول کے علم بردار تھے۔ مگر داغ نے باوجودیکہ تنہا ہونے کے سب کا مقابلہ کیا اور اپنا لوہا منوا لیا۔ انتہا یہ کہ امیر مینائی نے اپنی قدیم طرز چھوڑ کر داغ کی پیروی شروع کی۔ یہ انتہائی کامیابی داغ کی تھی۔ اسی طرح داغ نے مطمئن ہوکر پہلا اور دوسرا دیوان گلزارِ داغ اور آفتابِ داغ چھپوا لیا۔ ایک مثنوی فریادِ داغ بھی چھپوائی۔ ابھی تیسرے دیوان کی طباعت کی نوبت نہ آئی تھی کہ نواب صاحب رام پور نے انتقال کیا اور داغ پھر پریشان ہوگئے اور رام پور چھوڑ کر دہلی پہنچ گئے۔ پہلے تو بعض مقامات کا سفر کیا۔ وہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھے۔ مگر کہیں قدم جما نہ سکے۔ مجبوراً واپس آگئے اور پھر حیدرآبادی احباب سے مراسلت شروع کی۔ حیدرآباد میں داغ خاصے مقبول تھے اس لئے حیدرآباد والوں نے انہیں دعوت دی کہ آپ حیدرآباد آجائیں تو بہت اچھا ہوگا۔ چناں چہ داغ نے رختِ سفر باندھ ہی لیا۔

حیدرآباد پہنچے تو یہاں خاصی آؤ بھگت ہوئی۔ محمد ابراہیم خان سامانِ شاہی حضور نظام اور راجہ گردھاری پرشاد باقی سر رشتہ دار فوج و مہتمم منیر خانہ وغیرہ نے خاصی مدد کی۔ داغ کا قصیدہ جس کا مطلع تھا ؎

سیر ہوا جو سے بیاطرف ملک دکن

سرمۂ چشمِ غزالاں ہوئی گردِ دامن

حضور میں پیش کیا۔ حضور نظام نے قصیدہ ملاحظہ فرمایا اور چند روز کے بعد داغؔ کو یاد فرمایا۔ داغؔ نے پیش ہو کر چند رُباعیات سُنائیں اور حضور نظام بہت مسرور ہوئے۔ اسی مُلاقات کی تاریخ داغؔ نے کہی ہے ؎

یہ کہہ دو ملے داغؔ سُلطان سے !

۱۳۰۵

اس کے بعد داغؔ نے حیدرآباد کے مقتدر عہدے داروں، امیروں اور رئیسوں سے بھی مراسم پیدا کر لئے۔ عوام تو ان کی آمد کے بعد ہی سے متاثر تھے۔ روزانہ لوگ شاگرد ہونے لگے اور حیدرآباد میں داغؔ کی خاصی شہرت اور مقبولیت ہو گئی۔ مگر سوا سال گذر گیا اور حضور نظام نے تقرر نہیں فرمایا۔ چونکہ دہلی میں متعلقین پریشان تھے اور داغؔ بھی سوا سال تک متعلقین سے دُور رہ کر پریشان ہو گئے تھے اس لئے مجبوراً دہلی واپس ہو گئے۔ مگر حیدرآباد سے نہ تو قطع اُمید کی اور نہ تعلقات قطع کئے بلکہ مدار المہام اور امراء کو خطوط لکھتے رہے اور حضور نظام کی خدمت میں بھی غزلیں اور قصیدے بھجواتے رہے۔ بارے نو مہینے کے بعد حضور نے یاد فرمایا اور داغؔ طلب ہوئے۔

اس اطمینان پر کہ اب کی بار خود حضور نے یاد فرمایا ہے داغؔ نے افضل گنج میں ایک مکان کرایہ پر لے کر قیام کیا۔ اور پھر تگ و دَو میں لگ گئے۔ مگر یہ مدت گذر گئی نہ تو حضور نے اپنی غزل ہی اصلاح کی غرض سے بھجوائی اور نہ تنخواہ ہی مقرر ہوئی۔ سال بھر کے بعد حضور کی غزل اصلاح کے لئے پہنچی تو داغؔ کی جان میں جان آئی۔ اس کے بعد بھی تقریباً چھ مہینے گذر گئے تب کہیں تقرر کا حکم ملا اور اس شان سے ملا کہ پہلی دفعہ حیدرآباد پہنچنے کی تاریخ سے تقرر کیا گیا۔ ساڑھے چار سو روپے تنخواہ مقرر ہوئی اور بقایا بھی فوراً ہی دلوایا گیا۔ چند مہینوں کے بعد ہی خطابات سے سرفراز ہوئے اور نواب مرزا داغؔ دہلوی اُستادِ السلطان فصیح الملک بہادر بن گئے۔

پھر تو رئیسانہ ٹھاٹھ شروع ہو گئے۔ بالکل امیرانہ رہن سہن اختیار کیا اور بڑی ہی عمدگی سے بسر کرنے لگے۔ اس کے بعد تنخواہ میں ساڑھے پانچ سو ماہوار کا اضافہ اُسی تاریخ سے منظور ہوا جس تاریخ سے داغؔ پہلی مرتبہ حیدرآباد آئے تھے۔ اس کی تاریخ کہی ؎

ابتدا سے اپنی ساڑھے پانچ سو نقدی بڑھی !

اس طرح ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ ملنے لگی اور وہ تقرب حاصل ہو گیا کہ داغؔ نے اپنی آغوشی بیٹی کے متعلق عرض کر کے تین سو روپے ماہوار منصب جاری کرالی اور کم سن نواسے کے نام چار سو روپے ماہوار منصب جاری کرائی پھر اخیافی بھائی صاحب عالم خورشید عالم خلف مرزا فخرو کے نام دو سو روپے منصب اجرا کرالی۔ اس طرح داغؔ کے ایک ہزار روپے کے علاوہ نو سو روپے ان کے خاندان والوں کو بھی ملنے لگے۔

داغؔ نے حیدرآباد میں ایک مستقل کاتب (خوش نویس) دیوان صاف کرنے کے لئے ملازم رکھا اور اُسی سے اپنا تیسرا دیوان مہتابِ داغؔ لکھوا کر چھپوایا اور روزمرہ کی غزلیں، نظمیں وغیرہ بھی مسودۂ دیوان میں اسی کاتب کے ہاتھ سے صاف ہوا کرتی تھیں۔ یہ پہلی مثال تھی کہ اُردو کے کسی شاعر نے اپنا دیوان صاف کرنے کے لئے مستقل خوش نویس کو ماہوار تنخواہ دے کر ملازم رکھا ہو۔ ورنہ شعرائے اُردو تو خود کتابت کر کے پیٹ پالتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اور سارے ہی اسباب عیش جو روپیہ فراہم کر سکتا تھا، داغؔ کو میسر تھیں۔ ایک رنڈی مستقل طور پر دو سو روپے ماہوار تنخواہ کی نوکر تھی جو روزانہ شام میں مغرب سے عشا تک گانا سُنایا کرتی تھی اور زیادہ داغؔ ہی کی غزلیں گاتی تھی۔ ایک قوال پچاس روپے ماہوار تنخواہ پر ملازم تھا جو داغؔ ہی کی غزلیں گا کر سُنایا کرتا تھا۔ ایک پنڈت بھی سال بھر کا زائچہ اور اس برس پہل کے علاوہ ماہوار ماس پہل بنانے پر مستقل نوکر تھے۔ گھر کے کاروبار کی نگرانی کے لئے ایک منیجر، ایک کارندہ، چار چھ خدمتگار دوسرے کاموں کے لئے مختلف نوکر، ایک باورچی، مہترانی، انا، چھوکریاں، مالن مالی، سائیس کوچوان علیحدہ تھے۔ اس طرح صرف خانگی نوکروں کا خرچ تین سو روپے ماہوار تھا۔ داغؔ کہتے تھے ؎

دُنیا کا مال اور ہے کس کام کے لئے

کرتا ہے خرچ آدمی آرام کے لئے

گھر کا یہ حال تھا کہ پورے امیرانہ لوازمات تھے، خود بدولت کا سونے کا کمرہ حجلۂ عروسی بنا ہوا رہتا تھا۔ چھپر کھٹ پر ریشمی تو شک، ریشمی رضائی، ریشمی مسہری (مچھر دان) اس پر ریشمی انگوری بیل ٹنکی ہوئی گویا شبِ مسلمی ستارا لگا ہوا، بستر پر پھولوں کی سیج تکیے عطر سہاگ سے معطر کھونٹیوں پر

تا بلی موتیا کے پھولوں کے ہار لٹکتے ہوئے۔

خدا ایسا کہ دیکھ کر جی خوش ہو جائے، خمیرہ ایسا دھواں دھار کہ مارے خوشبو کے گھر مہک جائے، باس اتنا صاف ستھرا، پاکیزہ اور قیمتی کہ لوگ دیکھ کر دنگ ہو جائیں۔ دسترخوان کے وہ ٹھاٹھ کہ نواب رام پور کا دسترخوان یاد آجائے۔ نت نئے پکوان روزانہ اور ہر دسترخوان پہ دو چار مہمان ضرور شریک رہتے۔

خوش خوری کا یہ عالم کہ مرغ مسلم باتیں کرتے کرتے چٹ کر جاتے۔ اس طرح لذیذ کھانا خود بھی پیٹ بھر کر کھاتے اور یار دوستوں، شاگردوں کو بھی کھلاتے۔ دینے دلانے میں بھی سخی تھے۔ رنڈیوں کو خوب دیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ یہاں تک کہہ دیا ؎

کیا دوں تجھے کچھ پاس دکھائی نہیں دیتا

کیوں مجھ کو خدا ساری خدائی نہیں دیتا ؟

اور پھر اُن سے روپیہ بٹورنے والے بھی غضب کے تھے۔ چنانچہ ان کا حال خود داغؔ نے کہا ہے ؎

داغؔ سے کہتے ہیں سب دے دو ہمیں

جو ملا ہے تم کو آصف جاہ سے !

اس طرح ظاہر بھی دیتے اور چھپا کر بھی دیتے تھے ؎

دیا جو داغؔ نے ظاہر وہ سب کو ہے معلوم

ملی ہے آپ کو چپکے سے جو رقم کیا ہے ؟

مگر باوجود اس داد و دہش کے بڑے وقت کے لئے پچاس ساٹھ ہزار روپے اٹھا رکھے تھے۔ غرض اٹھارہ سال تک داغؔ نے خوب مزے سے گذاری۔

ہوش سنبھالنے کے بعد سے مرنے تک شاعری کی اور ساری عمر زبان کی خدمت کرتے رہے۔ لاکھوں شاگرد تھے۔ سب کا کلام دیکھتے۔ ڈاک سے ہزاروں غزلیں آتیں۔ ان کی اصلاح کے بعد اپنے صرفے سے واپس کرتے۔ اس طرح ملک کی خدمت بھی کی۔

ہندوستان کا سب سے بڑا رئیس (حضور نظام) ان کا شاگرد، ہندوستان کا سب سے بڑا فلسفی (سر ڈاکٹر اقبال) ان کا شاگرد، ہندوستان کا سب سے بڑا مصلح (سر سید احمد خان) ان کا معترف، ہندوستان کا سب سے بڑا عالم (شبلی نعمانی) ان کا معتقد تھا۔ اس سے زیادہ اور کیا اعزاز نصیب ہوتا !

آخری اعزاز اللہ تعالیٰ نے یہ سرفراز فرمایا کہ عین عید الضحیٰ کے روز عید ہی کی رات انتقال ہوا۔ نمازِ جنازہ عید کی نماز کے بعد حیدرآباد کی شاہی مسجد مکہ مسجد میں پڑھی گئی اور حضرت یوسف شریف کی درگاہ میں آسودہ ہو گئے

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آج تک شاگردوں کے شاگرد اور پھر ان کے شاگرد ہزاروں موجود ہیں اور داغؔ کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ کشمیری کا لا گلاب مہک رہا ہے اور اس کی خوشبو قیامت تک مشامِ ادب کو معطر کرتی رہے گی۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا !

"تعمیر" کا آیندہ خاص نمبر

کشمیری زبان کے امام المتغزلین رسول میر کی یاد میں شائع ہو رہا ہے۔ معاونین سے استدعا ہے کہ آج سے ہی نگارشات ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کر دیں۔ رسول میر کی حیات پر خصوصی مقالے شکریہ کے ساتھ قبول کئے جائیں گے ——— ادارہ

احتشام ین حسن
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مہدی افادی

رومان وشخصیت

ہر زبان کے بعض ادیب و انشاپرداز ایسے ہوتے ہیں جن کا رقبۂ تحریر گو محدود ومختصر ہوتا ہے تاہم اُن کا وجود زبان وادب کے لئے مایہ ناز ہوتا ہے۔ مہدی افادی اُردو ادب میں ایسے ہی ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے مضامین اگرچہ حجم میں زیادہ نہیں لیکن ندرتِ خیال، پُرکار اسلوب اور جدتِ فکر سے لبریز ہیں۔ دراصل یہی وہ عطیات ہیں جن سے ایک ادیب دِل کش سنگتراشی کا کام لیتا ہے اور اپنی جدّتِ طبع سے ایسے نقوش اُبھارتا ہے جو اس کے فن کارانہ شہرت اور عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔ مہدی کی شخصیت اُردو ادب کی رومانوی تحریک میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ رومان یا رومانویت زندگی کے اُن احساساتِ لطیف اور کیفِ جمال سے جِلا حاصل کرتی ہے جس میں غور وفکر اور کاوش کو کم دخل ہوتا ہے۔ طبعِ لطیف پر ہر احساس کا نسبتاً گہرا نقش پڑتا ہے اور قوتِ مدرکہ میں غیر شعوری (Unconsciously) زندگی نمود کرکے ایک ایسا زاوئیہ فکر بناتی ہے جس میں انسانی خواہشات، محبت و اخلاق، افراطِ جذبات، وارداتِ قلب، تلاشِ حسن اور محاکات کی آرائش ہوتی ہے دراصل رومانی ادیب اُن احساسات کی ترجمانی کرتا ہے جو طلب حسن اور ادراک کی حس کو تیز کرنے کے بعد انسانی شعور کو جذبات کا طابع بناتی ہے۔ تلاشِ حسن کی نفسی خواہش اور انسانی فکر کا جوہر اسی میں ہے کہ وہ اپنے دِل کے آئینے میں اُن خیالات کا عکس دیکھے جن میں کیف و سرور کے ساتھ خود اس کا اِدراک اور ذوقِ جمال غیر شعوری طور پر اُن کیفیات کا تجزیہ کرتے ہیں جن میں حسِ جمالیات جنسی میلانات حدِ عشق تک رساں ہیں۔ جمالیات ایسی لطیف و نازک شے ضرور کہلاسکتی ہے جس کا ادراک شیشے کی نازک زندگی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہی احساس اُن لطیف اور پُر کیف لذّتوں کی ترغیب دیتا ہے جن میں جمال یا حسن رُونما ہو۔ ایک نقاد رومانیت کی تعریف یہ کرتا ہے ——

"…… بہرکیف ماضی سے عقیدت، حسن کی تلاش، وفورِ جذبات، مرکزیت سے گریز، جذبہ، احساس و وجدان پر بھروسہ، تخیل کی خودکفالتی، مہم کی اُمنگ، زندگی کے ہیولے کو منقلب کرنے کا جذبہ، زبان میں صحت وصفائی اور وضاحت سے بڑھ کر ترنم، اشاریت اور ان کے مطالب کی تہوں اور ان پُرزور رومانیت کے عناصرِ ترکیبی قرار دئے جاسکتے ہیں۔"

اس تعریف کی روشنی میں ہم مہدی کی رومانویت کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ بدیہی حقیقت ہے کہ انسانی فطرت اور جذبات کا ماحصل طلب حسن ہے جو جنسِ لطیف کی رغبت دِلاتی ہے۔ چونکہ جنسِ لطیف اور حسنِ جمال میں ایسا نازک فاصلہ ہے جس کا سمجھنا اور الفاظ کے رُوپ میں پیش کرنا دُشوار ہے، لیکن مہدی کے مضامین میں حسن کو مادی اور خیالی پیکروں میں تلاش کرنے کا جذبہ ملتا ہے۔ موہوم اشاروں سے وہ مکمل تصویریں بناتے ہیں اور یہ تصویریں ایسی ہیں جن کو اس دَور کا پُرانا وضع دار عُریاں اور فحش بھی کہہ سکتا ہے۔ لہذا احسن مارہروی کے اعتراضات اسی احساس کے ماتحت ہوئے۔ "حسنِ نسوانی" جسے خلیقی نے نسائیت کا نام دیا تھا، مہدی کی زبان میں عورت محبت کی چیز ہے اور دُنیا میں محض اسی لئے آئی ہے۔ (صفحہ ۱۷۳)

"عورت کتنی ہی پاکیزہ وش ہو، اس خیال سے خالی نہیں ہوتی کہ کوئی اس کی کافر ادائی کا شیدائی ہو، اس کی فتوحات "اس کا سرمایۂ نشاط ہیں، جن سے اس کے دِل کو راحت ملتی ہے اور جن سے وہ جیتے جی کبھی دست بردار نہیں ہوسکتی …… ڈھرائے ہوئے آنچل میں دراصل اُسے سینے کا اُبھار غائب کرنا منظور نہیں بلکہ وہ چاہتی ہے کہ اور نظر جماکر دیکھئے۔ محرم کا جائزہ

نظری ایک طرح کی داد حسن ہے جو ہزار پارسائی کے ساتھ بھی وہ آپ سے لے کر رہے گی۔ اسی لئے جوانی کی آرائشوں میں دستانے کی طرح چھبتی ہوئی چیز اسے دل سے پسند ہے جس میں یہ ان سرکشوں کو قید کرتی ہے جنہیں عورت کے ایمان مجسم کہئیے ـــــ (ص ۱۷۴)

مہدی افادی صرف عورت کو جمالیاتی حس اور ذوقِ نظر کی تسلی سمجھ کر اُسے پھولوں کی سیج اور عشوہ گری تک محدود رکھتے ہیں۔ وہ صرف محبت کے لئے بنائی گئی ہے، وہ زندگی کی تکمیل کے لئے پیدا کی گئی ہے (ص ۱۷۸) اور یہی زندگی کی ساری خوش مذاقی، زندہ دلی اور سلامتِ طبع کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے مہدی کے تلاشِ حسن میں یونانی نقطۂ نظر کی پرچھائیاں بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ

"مہدی نے جمالیات کو فلسفے کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ جذبے اور احساسِ حسن سے پوری طرح لطف اندوز ہوئے اور اس کا اظہار کیا۔ ان کے الفاظ جمالیات کے کرّہ میں خیال کی پرواز ہیں، اس پرواز میں والہانہ جذباتیت زیادہ ہے اور فکری عنصر بہت کم۔ وہ خوش مذاق پہلے ہیں اور کچھ بعد کو۔"

پھر لکھا ہے کہ :-

"مہدی کے مذاق میں مغرب کی ساری رومانیت، یونانی مجسموں کا کفرِ حسین (PAGANISM) اور مشرق کی محبت اور اس کی مذہبی اور روحانی روایات سے لگاؤ پایا جاتا ہے۔ ادبی تنقید ہو یا سیاسی مضامین ہر جگہ وہ ایک برطانوی لبرل کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔"

رومانی ادب میں تمام تر زور احساس، وجدان اور جذبہ پر ہوتا ہے۔ مہدی اس جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں۔ ان کے مضامین تلاشِ حسن اور رموزِ محبت کی پُرکیف امتزاجی احساس کے آئینہ دار ہیں جس میں نزاکتِ خیال اور صحت مند برجستگی اور فراخی جو مشرقی رنگ و بو اور مغربی زیب و آرائش میں متوازن امتزاج کی پیداوار ہے بھرپور نمایاں ہے جس کی وساطت سے وہ عشق کی نفسیات تک رسائی پاتے ہیں۔ اس طرح پر بھی ان کے طرزِ نگارش میں عریاں نگاری یا ہوس پرستی نہیں جھلکتی۔ بقولِ عبد الماجد صاحب دریابادی "بعض مضامین کی شوخیاں سنجیدگیٔ ادب کی حدود سے متجاوز نظر آئیں گی۔ اس کا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ حضرت مہدی معلمِ اخلاق نہ تھے، ادیب و انشا پرداز تھے ... تو کوئی وجہ نہیں کہ اس نثر کے شاعر پر انشائے عریاں حرام رہے۔" اور اگر مہدی کے تعبیر

یہ مضامین جو تخئیل اور انشا کے بہترین خزینے ہیں، بقول سید سلیمان ندوی مرحوم جو کہ تعویذِ ادب بن کر حرزِ جاں کی حیثیت سے محفوظ ہیں" ان الزامات کی زد میں آتے ہیں تو پھر شاعری، سنگ تراشی اور رقص سب ہی ایک طرح کی "معصیتِ رنگین" ہیں۔ درحقیقت ان کے نزدیک جو حسین شے ہے وہ میری رشتہ دار ازلی ہے۔" اسی لئے وہ حسنِ مطلق کے شیدائی ہیں۔ ایک سچے حسن پرست رومانی کی طرح ان کا ذوقِ جمال، جذبۂ رنگین صرف عورت کے پیکر میں احساس کی تسکین پاتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے عورت کی کافرادائی کے ساتھ شریفانہ جذبات کی قید لگا دی ہے جس سے خالص حسن و عشق کے معاملات میں بھی ایک یونانی اعتدال پسندی پیدا ہوگئی ہے۔ ان کی تحریریں حسیات پسندی (Sensuousness) کا ایک حسین مرقع ہے اور حسیاتی تصویرکشی میں وہ ایک خاص سلیقۂ نفاست ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان سے ان احسانات کو "خوابِ طفلی" کے زیرِ عنوان تلاش کیجئے۔ "صرف خوبصورت ! جس کی سرسری جلوہ گری یعنی ایک جھپک اچھے اچھوں کے لئے صاعقۂ جان سوز سے کم نہ ہو۔" یا "عورت وہی باکیف ہوگی جو لذت آشنا ہو اور جس میں لذتِ احساس کامل ہو" یہ عالمِ فطرت کی نیرنگیاں ہیں، شراب کی طرح کہ جتنی پرانی ہو، مزے دار ہوتی ہے۔ عورت کی عمر کا وہ حصہ جو تیز روشنی کی جگہ تاروں کی چھاؤں یا پچھلے پہر چاندنی سے مشابہ ہے، جان دینے کے لائق ہوتا ہے"

"آنچل سامنے کچھ اس طرح ڈالا گیا ہے کہ انداز کہہ رہا ہے، پردہ داری مقصود نہیں، بلکہ گول اور بھرے بھرے برہنہ شانے اور جوانی کے "فتنہ طناز" یعنی حسنِ بے پردہ کا بانکپن دکھانا مقصود ہے۔"

ان کا خیال ہے کہ عورت سے متعلق نازک خیالی اگر "فحش بیانی" ہے تو فلسفہ کی یہ ڈانٹ سن رکھیئے کہ

"خود عورت فحش ہے اور اس سے زیادہ وہ ترکیب فحش ہے جو انسان کے عالمِ وجود میں آنے کا سبب ہوئی جسے اخلاقاً میں صرف سنجیدگی کہوں گا!" پھر ان کا یہ احساس اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ "آہ عورت! تو افسانۂ زندگی ہے۔ جس طرح اپنی صاف شفاف ہستی سے ایک جھونپڑے کو شیش محل بنا سکتی ہے، بڑے بڑے ایوانِ عیش کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تیری موجودگی کے آثار اس میں نہ پائے جائیں اس کے لئے "چھڑوں کی جھنکار" ضروری نہیں محض تیرا یہیں پردہ ہونا، کہیں ہو، کسی کے لئے ہو، کافی ہے ـــ"

ماسینۂ افق" بالکل کھلا ہوا ہے اور اودی اودی رگوں کے پیچ و خم
اور اعصاب کی کھینچ تان بتا رہی ہے کہ سرکشی لباس کی ممنون نہیں
بلکہ لباس خود سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ نہایت باریک ریشم کی ساری
آج کل کے مروجہ چست زیرسایہ زیب کمر ہے۔ نرم اور لچک دار جسم
کے ساتھ قلم کار ساق بلوریں سات پردوں میں بھی پاک باز شوہر کے
تارِ نظر کا مرکز بنی ہوئی ہے۔" (ص ۲۴۸)

ان اقتباسات سے نہ صرف ان کے خیالات کی رنگینی اور محاکاتی ذوق کی
تصویرکشی ہوتی ہے بلکہ ان کی زبان و اسلوب پر جس میں لطیف و نازک مسائل
کو زبانِ ادب کی لڑی میں پرو کر پیش کیا ہے جو نہ کوئی جسمانی تعیش یا فکری
ہیجان کے آئینہ دار ہیں اور نہ ان میں کوئی چھچھورا پن یا سطحیت ٹپکتی ہے۔ اس
کے برخلاف ادب و زبان کی تمام تر اثرات کو باقی رکھتے ہوئے ادائے مفہوم میں
ایک صحت مند، بامذاق اور حسن پرستی کی آرزومندی اور بلند شوقی ہے۔ ان کے
انداز میں تخئیل کی پرکاری کے ساتھ مردانہ پن ہے۔ وہ حسن کے ہر مظہر کے شیدائی
ہیں۔ وہ عورت کو گڑیا سمجھ کر کھیلتے نہیں بلکہ اس کو نازنینِ حرم کی منزلت بخشتے
ہیں۔ ان کے نزدیک عورت کا مادی حسن لطیف ترین مظہر ہے جو ادراک و شعور
پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اس بتِ ہزار شیوہ کو اپنی توجہ
کا مرکز بناتے ہیں۔ ان کے جملوں میں الفاظ کے نشتر ہی نہیں بلکہ زبان کی رعنائی
بھی ہے۔ ان کا قلم محض زلفِ بنگالہ کی سحر آمیزی پر ہی رقصاں نہیں ہے بلکہ
جذبات کی عکاسی کرنے میں وہ ایسے معرکہ سر کرتا ہے جس میں مصور کی جنبشِ موقلم
اور شاعر کے اضطرابِ بے پایاں کا ارتعاش جھلکتا ہے۔ وہ حسن کے قائل ہیں،
لیکن ان کے نزدیک حسن عیشِ دماغ ہے، عیشِ جسم نہیں۔ وہ PAGANISM
کے قائل معلوم ہوتے ہیں جو مادی لذتوں کو ذہنی پس و پیش کے بغیر قبول کرتی
ہے۔ درحقیقت وہ عورت کو عورت کے روپ میں دیکھنا پسند کرتے ہیں اور اس
کے جلوؤں پر کوئی نقاب نہیں ڈالنا چاہتے۔ یہ احساسِ جمال، یہ صحت مندی،
حسن و عشق کے باہمی تعلق میں بصیرت اور اس کے اظہار میں صفائی و لطافت
اور بے باکی اردو نثر میں پہلی چیز ہے۔ یہی ان کی شانِ امتیاز ہے کہ وہ تکمیلِ
حسن کے قائل ہیں جس کے لئے مادیت شرطِ اولین ہے۔ چناں چہ ذیل کے
اقتباس میں ان کے اس نظریہ کی بھی جھلک نمایاں ہے:—
"جس طرح پھول کی پتیوں میں نازک رگیں، نسیں اور باریک نقش و
تصویر

نگار ہوتے ہیں۔ عورت کا دل و دماغ بھی ہر طرح کی لطافتوں اور
نزاکتوں کا مخزن ہوتا ہے جس کے بیل بوٹے قدرت کی بہترین نقاشی کے نمونے
ہیں۔ ان ہی باریک حسیات اور جذبات کا ابھارنا اور نشو و ارتقا
تدریجی کے سلسلہ کو قائم رکھنا، چاہنے والے کا اصلی فرض ہے۔"
مہدی کے مضامین خود ان کی زبان میں جمالیات کی اختراعِ فائقہ
(Master Piece) ہیں۔ وہ جنسِ لطیف کے مغربی میلانات سے بے خبر
نہ تھے، مشرقیت ان کا شعارِ حسن تھا لیکن جلوہ گاہِ حسن میں وہ کھوئے
ہوئے نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں عورت کی عظمت اور لوازماتِ نسائیت
کی اہمیت کا اکثر ان کو خیال رہتا تھا۔ ان کی رنگین نگاری اور شوخ اشارے
بہت حد تک اس رجحان کی مرہون ہے وہ "دارالمصنفین" سے اگرچہ گہری
وابستگی رکھتے تھے لیکن وہاں کی بے نمکی پر ایک خط میں مولوی عبدالباری ندوی
کو لکھتے ہیں کہ "دارالمصنفین" میں کہیں عورت کا گذر نہیں۔ ایرانی سبزہ رُخی
کا نشہ ابھی تک آنکھوں میں چھایا ہوا ہے (مکاتیبِ مہدی) یہی نہیں، ان کی
طرزِ نگارش بعض اوقات ہمارے شعرا کی اتفاقیہ برہنہ رقاصی کا جواب پیش
کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان کے چست فقرے، استعارے، کنایے اردو
ادب میں نیا رمزی و ایمائی معیار قائم کر دیتے ہیں اور حسین خیالات کو الفاظ
کے پیکر میں اس طرح ملبوس کرتے ہیں جیسے لالہ و گل کی پوشاک میں عطر بسا
ہے۔— چنانچہ یہ الفاظ ملاحظہ ہوں جو انہوں نے علامہ شبلی کو لکھے ہیں—
"مدت کی تلاش کے بعد وہ جنسِ لطیف ہاتھ آئی جو آپ لوگوں کو دوسری
دنیا میں ملے گی۔" اور ایک صاحب کو لکھتے ہیں—"ہاں جناب ماجد ہوں یا
آپ دونوں صاحبوں کی مدرسیت میری سمجھ میں نہیں آتی کہ عورت کو مرد بنا کر
پیش کی جائے اور اس سے انشا پردازی کی سنجیدگی پر استدلال ہو—"
پھر ان ہی کو یہ چبھتا ہوا جملہ لکھتے ہیں— "جسے بستر شکن ہونا تھا وہ شاعری
کی اصطلاح میں بستر شکن نکلا—" اپنے ذوق کی داد دیتے ہوئے پھر فرماتے
ہیں کہ "وہ آتشہ ابھی کھنچی ہوئی ہو تو نشاطِ ہستی کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔
میں اس نشے کا اثر آپ کے لٹریچر پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ پروفیسر آل احمد سرور
نے لکھا ہے کہ مہدی کی بالغ نظری اور پرلطف اندازِ بیان کے بڑے بڑے
قائل تھے۔ علامہ شبلی جیسا اونچا آدمی جو اپنا معیارِ تنقید بھی اونچا رکھتا
تھا اور معاصرین میں سے کم کو خاطر میں لاتا تھا، ایک جگہ کہنے پر مجبور ہو گیا

مضمون دیکھا ہے جو مہدی حسن کے دستخط تھے۔ حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزا پگوڑی دوست ہیں یا نذیر احمد،" آزاد کی روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن دیکھا اور احباب کو دکھلاتا رہا۔" ایک اور جگہ لکھتے ہیں ۔ "کاش شعر العجم کے مؤلف کو ایسے دو فقرے بھی لکھنے نصیب ہوتے!" شروانی کو ان کے انداز بیان میں "یونان کے سنگ تراشوں کی سی نزاکت اور مصوری نظر آتی ہے۔"

اس سے مہدی کے معاصرین میں ان کی قدر افزائی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی ان کی سیرت و کردار کو خود ان کے مضامین سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ صرف ایک خوش زبان ادیب ہی نہ تھے بلکہ زندہ دل، دوست نواز اور باوقار شخصیت کے مالک بھی تھے۔ ان کا علمی و ادبی ذوق نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ تھا۔ وہ انگریزی ادب کے علاوہ عربی و فارسی کے بھی شائق تھے اور تمام تازہ ترین مطبوعات ان کی لائبریری کی زینت بنتی تھیں۔ اس سلسلہ میں وہ اپنی تنخواہ کا کافی حصہ خرچ کرتے تھے اور کتابوں کی حفاظت وغیرہ میں وہ اہتمام کرتے تھے کہ بقول عبدالماجد صاحب دریابادی "مرحوم وہ اہتمام کرتے تھے جو خود مصنف سے بھی نہ بن پڑتا تھا۔" انہوں نے اپنے ذوقِ سلیم کی رہنمائی میں علم و ادب کی شناوری کی اور غواصی سے وہ موتی بکھیرے جن کی تب و تاب جاویدانہ رہے گی۔ ان کا پہلا مضمون جس کا عنوان "تمدنِ عرب پر ایک کھلی چٹھی" فروری ۱۸۹۹ء میں "ریاض الاخبار" میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مختلف مضامین لکھتے رہے جو ملک کے مشاہیر رسائل کی زینت بنتے رہے۔ اس سلسلہ میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا آزاد حالی اور شبلی سے تعلقات قائم ہوئے۔ یہ سلسلہ برابر ترقی کرتا رہا۔ آخر کار علامہ سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی، پروفیسر عبدالباری، ہوش بلگرامی اور ریاض الحق خیرآبادی سے خاصے قریبی تعلقات، محبت و یگانگت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ ان کے بیشتر خطوط ان ہی حضرات کے نام ہیں۔ اس موقعہ پر اگر "مکاتیب مہدی" کا تذکرہ نہ کیا جائے تو ایک گوشہ سونا رہ جائے گا۔ مہدی کی طرزِ نگارش جس طرح مضامین میں جداگانہ طرزِ انشا کا نمونہ ہے، اسی طرح ان کے مکاتیب سے بھی ان کے خیال کی رعنائی، پاکیزگی، نفاستِ طبع اور جدت طرازی کی غمازی ہوتی ہے۔ خصوصاً مولویوں کی محفل میں ان کی رندانہ شوخیاں اور طنز و مزاح کے پیرایہ میں بے تکلف نوک جھوک اور باتوں باتوں میں مسائلِ ضروریہ پر نقد و نظر، چبھتی ہوئی فقرہ بازی اور مصنفین کے دماغوں کی رگڑ، ان کے ذوقِ لطیف کی اس طرح داد لیتی ہیں جیسے سبزۂ نورسیدہ کی پُر بہاری، جس کی بدولت ان کے ذہن نے دل کش ارتقا حاصل کر کے شعوری طور پر بے تکلف ادب اور سماج کا رشتہ مستحکم بنایا۔ اپنی تنقید کو جمالیاتی، وجدانی اور جذباتی قوتوں سے آراستہ کر کے تشنہ کامانِ ادب کی سیرابی کی۔ "مکاتیب مہدی" پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ "ان خطوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا ادب کا ذوق فطرت کی طرف سے لے کر آیا تھا ... بلا کی شوخ و شگفتہ طبیعت پائی تھی جو اچھے خاصے خشک فلسفیانہ مباحث میں اپنے طرزِ بیان سے رنگینی پیدا کر دیتے۔ بڑے بڑے مولویوں کی تقدس مآب بارگاہوں میں وہ ادبِ لطیف کی شمع روشن کرتے۔ جس طرح لب ریز ساغر سے شراب چھلک جاتی ہے ان کی طبیعت کی رنگینی الفاظ میں بکھری رہتی ہے۔"

مہدی کی تنقید نگاری، ترقی پسندی اور ادب نوازی ایسے بسیط موضوع ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن یہ مضمون اس کی کفالت نہیں کر سکتا۔ بقولِ ایک ادیب کے "مہدی حسن کے افادات اور مکاتیب سراسر کچھ ایسی ادبی پھلجھڑیوں سے بھرے ہوئے ہیں کہ کہیں تو یہ پھول آتشِ سیال بن کر دل و دماغ کو سرور پہنچاتے ہیں اور کہیں قدیم اقدار کے پرستاروں کے دامن تک پہنچ کر بسترِ نرم سے ان کو خاکسترِ گرم پر بٹھلا دیتے ہیں۔ وہ ایک روشن ستارۂ ادب تھے جس نے سرکاری ملازمت اور پٹواری کے کاغذات کی تاریکیوں میں بھی راہیانِ ادب کی راہنمائی کی اور آیندہ نسلوں کے لئے غیر فانی نقوش "افادات" اور "مکاتیب" کی شکل میں چھوڑ گئے۔

ان کے یہ خطوط نمایاں طور پر ان کی زندگی کے حالات اور روزمرہ کو پیش کرتے ہیں۔ ایک تحصیلدار کے مواقیت اور حالات، اس کا ماحول غرضیکہ سارے اس کے حواری یا تو پٹواری ہوتے ہیں یا اہل کار اور کارندے۔ لیکن ایسے ماحول میں بھی شخصیت کو امتیازی شان دینا از خود ایک کمال ہے۔ ان میں خود نمائی بالکل نہ تھی۔ لیکن احساسِ خودی اور اپنی انفرادیت کا تیقن بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اس کے ساتھ ہی جذبات کی روانی اور خیالات کی پرواز بھی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد شادی اور نوکری کے مراحل طے کرنا پڑے۔ لیکن طبیعت حساس اور نفاست پسند پائی تھی۔ اگر دیکھا جائے تو ملکی حادثات و واقعات کا اثر ایسے طبائع کے بنانے میں بڑا دخیل ہوتا ہے۔ گویا ان میں ایسا مادہ موجود تھا جس کی جلا کے لئے قومی افکار آبِ حیات کا کام دیتے ہیں۔ چنانچہ مہدی کی تعمیرِ سیرت میں قومی حیثیت سے خود سرسید رحمہ اور ان کی تحریک بڑی حد تک اثر انداز ہوئے اور

بقول ان کے "وہ تہذیب الاخلاق " کے ساختہ پرداختہ تھے : علی گڑھ تحریک اور سرسید ؒ کی ہمہ گیر کوششیں قومی بیداری، اصلاح، اور مغربی تعلیم کے حصول کے مقاصد کے لئے برابر رنگ لا رہی تھیں۔ ہزاروں مخالفتوں کے باوجود دیوپیکر انسان سرسید ؒ عزم و حوصلہ کا مجاہد اپنے پاک خیالوں کی گرمی اور سوزِ دروں سے سرشار اپنی کوششوں میں سرگرداں تھا۔ ایک طرف ان کی بساطِ محفل سے قومی رسومات کی اصلاح اور معاشرہ کی تنظیمِ نو کی آواز بلند ہوئی تو دوسری جانب قوم کو اپنی حالت بہتر بنانے اور مغربی علوم و فنونِ جدیدہ حاصل کرکے ملکی حالات کو سازگار بنانے کی ترجمانی ملتی۔ وہ حاکم اور محکوم کی آپسی منافرت کو دُور کرنا چاہتے تھے تاکہ مسلمان قوم اپنے مقام کو سمجھے اور اس کو حاصل کرنے کی سعی کرے۔ دوسری جانب قوم میں غیر اسلامی اوہامِ فاسدہ اور فرسودہ رسومات مشرق کی اندھی تقلید کے خلاف بغاوت کی رُوح پھونکنا چاہتے تھے۔ غرض ہر طرح پر قوم کو بہتر بنانے کے کوشاں تھے۔ تحریر، تقریر، مدرسہ، اخبار ہر طریقِ اصلاح کو اپنا رہے تھے۔ چنانچہ "سائنٹفک سوسائٹی" علومِ مغربی کو اُردو کے ذریعہ عام کرکے افکار میں وُسعت اور فراخی پیدا کر رہی تھی ــــ اور "تہذیب الاخلاق" کے معرکتہ الآرا مضامین اصلاحی آب و تاب اور قومی جوش و ولولہ کو تازہ خون دے کر قوم کے مُردہ دماغوں میں نیا خون پہنچا رہے تھے تاکہ "مدرستہ العلوم" میں مسلمان بچے داخل ہوکر قومی زندگی کی بُنیاد رکھیں غرض کہ سرسید نے اپنی مقناطیسی شخصیت سے ملک کے ہوش مند صاحبِ قلم افراد کو اس ہمہ گیر تحریک سے وابستہ کر دیا تھا۔ حالی سے "مسدس" لکھوا کر ماضی کے احساس کو اُبھارا، اور مستقبل بنانے کی فکر دِلائی تھی اور اسی غرض سے ان کے "تہذیب الاخلاق" کے شمارے برابر اصلاحی و تعمیری مضامین سے بھرپور ملتے ہیں۔ مثلاً وہ حُسنِ معاشرت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں ـــ "حُسنِ معاشرت میں جو نقص ہیں وہ رفع ہوں۔ جن بد رسموں اور خراب عادتوں سے غیر قومیں مسلمانوں کو اور اسلام کو حقیر و ذلیل سمجھتی ہیں وہ موقوف کی جاویں۔ جو خلافِ شرع تعصبات و توہمات ہیں اور ہر طرح کی ترقی کے مانع ہیں وہ دُور کئے جائیں" (تہذیب الاخلاق جلد دوم) ایک بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح اور ایک نئے نظامِ حیات کی تعمیر کوئی آسان کام نہ تھا۔ جتنا یہ کام مُشکل تھا اتنا ہی تاثیر کے لحاظ سے دیرپا اور خوش آئند بھی۔ خصوصاً مذہبی مسائل میں جہاں علماء کی خود ساختہ روِش عام ہو اور تنگ نظری نے اخلاقِ حسنہ کی جگہ لے رکھی ہو، بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ چونکہ یہ تحریک مُلک گیر تھی اور صداقت و خلوص پر مبنی تھی، اس لئے اس کے اثرات عام ہونے شروع ہو گئے اور جلد "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کی قرار دادیں عملی شکل اختیار کرنے لگیں۔

سرسید ؒ مذہبی افکار اور رسوم میں اصلاح اور مغربی تعلیم ہی کے محرک نہ تھے بلکہ وہ اُردو کو ترقی دے کر مُلک کی عام زبان بنانے کے خواہش مند تھے۔ وہ زبان میں تصنع کے خلاف تھے۔ انہوں نے زبان کو وُسعت دینے کے لئے سادہ و شُستہ طریقہ اپنایا اور ہر نوع کے عنوانات پر قلم جنبانی کرکے دامنِ اُردو کو وُسعت بخشی۔ ان کی کوششیں اُردو کی بقا و ترقی میں ایک مجاہدانہ عمل کی مصداق ہیں۔ وہ طرزِ نگارش کو نہایت سُتھرا اور پاکیزہ دیکھنا چاہتے تھے جس میں ہر قسم کے خیالات بغیر کسی دُشواری کے پیش کئے جا سکیں۔ چنانچہ ان کی تحریک کے نقیب "تہذیب الاخلاق" اور "مسلم انسٹی ٹیوٹ گزٹ" نے اس سلسلہ میں بے پایاں خدمات انجام دیں۔ ان کے اصلاحی پروگرام میں اُردو کی طرزِ نگارش پر ذیل کے اقتباس میں ایک جھلک دیکھئے :ـــ

"شعر و ادب میں انقلاب پیدا کرنا، جھوٹی اور بناوٹی تحریروں سے لوگوں کا دِل پھیرنا اور شاعری کی مروجہ خرابیوں اور خیال بندی کے ناقص طریقوں سے بچنے کی ترغیب کرنا، تاکہ نیک جذباتِ انسانی ظاہر کئے جا سکیں اور فطری جذبات اور ان کی قدرتی تحریک اور ان کی جبلی حالت کا صحیح مقام اپنے ادب میں پیدا کیا جا سکے اور ممالکِ غیر کے معاصرانہ ادبی رُجحانات اور علمی تحقیقات سے پُورا فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ اس سلسلے میں خط و کتابت میں لمبے چوڑے القاب و آداب کو غیر ضروری قرار دینا اور ثابت کرنا کہ وہ دُنیاوی باتوں کے خطوط کی ابتداء میں بسم اللہ نہ لکھنا یا لفافہ پر انشا اللہ کی چڑیا نہ بنانا مبینِ اسلام اور اللہ کے نام کا احترام ہے نہ کہ بے دینی۔" (تہذیب الاخلاق مضمون ص۱۲)

آخر کار تحریک نے کامیابی کے منازل طے کرنا شروع کئے اور مدرستہ العلوم نے کالج اور یونیورسٹی کے مدارج طے کئے۔ دوسری جانب قوم نے ان خیالاتِ باطلہ کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کئے اور نئے سماج و ماحول میں ایک اعلیٰ اقدار پر معاشرہ تعمیر کیا جانے لگا جس کا اثر اس دَور کے ہر نوجوان پر پڑا اور مختلف الاوصاف لوگ ایک کاروانِ خیال کے ساتھ ہو کر جادہ پیما ہوئے۔ اُس دَور میں جس کا ابھی ذکر کیا گیا۔ بہت سے ادیب، نقاد اور مُصلح بھی نِکلے جنہوں نے ادب، مذہب اور دوسرے علوم میں اپنے جوہر مایہ سے گراں بہا حیات بخشی۔ اُردو ادب میں بھی رومانوی تحریک سرسید ؒ کی تحریک (بقیہ بر صفحہ ۴۴)

غلام رسول کامل

اے وادیٔ کشمیر

اے ملتِ کشمیر تیری شان تیری آن　　یزداں نے بنایا تجھے جنت کا نگہباں　　پیشانیٔ اقبال تیری مشرق تنویر

اے وادیٔ کشمیر

رقصاں ہے نسیم اور نشاط حسن پہ تیرے　　فوارہ نے گلشن پہ نچھاور کیئے ہیرے　　نازاں ہے تیرے حسن پہ خود کاتب تقدیر

اے وادیٔ کشمیر

گل پوش چمن زیب سمن شبنم غلطاں　　ہر شاخِ شجر وجد اثر بربط یزداں　　باسوز سحر حسن گل و لالہ شرر گیر

اے وادیٔ کشمیر

کہسار کے دامن میں چناروں کی بہاریں　　شمشیر بکف تیرے سفیدوں کی قطاریں　　ہر وارد کشمیر کو حیرت ہے نظر گیر

اے وادیٔ کشمیر

چشموں کی روانی ہے کہ کوثر بھی ہے حیراں　　پھل پھول کی وسعت ہے کہ شاداں ہے رضواں　　ہے سحر ملک صید تیرا حسن فلک گیر

اے وادیٔ کشمیر

شبنم کے بکھیرے ہیں گہر بادِ سحر نے　　آویزہ بنایا ہے جنہیں نرگسِ تر نے　　ہے شوق جوان پھول کی لعبت سے بغلگیر

اے وادیٔ کشمیر

سازوں کا ترنم ہے رواں کوہ کمر میں　　دھوتی ہے بدن حورِ سحر جھیل اُولر میں　　دلِ سوختہ کو ملتی ہے ہر صبح تباشیر

اے وادیٔ کشمیر

ہے تیرے پہلگام کے مسحور سحر شام ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے رنگینیٔ ایام صناعیٔ قدرت کے حسیں ہاتھ کی تصویر

اے وادیٔ کشمیر

مستی ہے جواں سال و بلاخیز چمن پر زلفوں کو بکھیرا ہے بنفشہ نے سمن پر گل محو نظر غنچۂ گل سینہ میں دم گیر

اے وادیٔ کشمیر

مہتاب کے جلوؤں کی چمک تیری تب و تاب گلمرگ میں خورشید کی سوزش کا جگر آب فطرت کے حسیں خواب کی تو جلوہ تعبیر

اے وادیٔ کشمیر

با نزہت و رنگ سبزۂ صحرا ہے فلک تاب مستی میں جنوں خیز تیری وادیٔ لولاب بالندہ فضاؤں میں تیری شوق طرب گیر

اے وادیٔ کشمیر

سرسبز درختوں کی قطاریں سر کہسار قدرت کے حسیں ہاتھ کی آرائش و شہکار خاموش فضا ہوش ربا اس کے بم و زیر

اے وادیٔ کشمیر

فطرت نے دیا خون شفق عارض گل کو اور لالۂ صحرا نے بھرا ساغر گل کو ہر ذرہ خم خانۂ کشمیر سحر گیر

اے وادیٔ کشمیر

شادابیٔ کہسار میں ندی ہے خراماں اور سوز جگر تاب سے گل چاک بداماں ہر سنگ فلاخن ہے تیرا گوہر تطہیر

اے وادیٔ کشمیر

جنگل کی فضاؤں میں صنوبر کی ادائیں لبریز ترنم تیری وادی کی ہوائیں کہسار کی رفعت کو ملائک ہے جلوگیر

اے وادیٔ کشمیر

بڈشاہ کے اولوالعزم مآثر کا یہ مسکن عظمت کی نشانی ہے دل آویز یہ گلشن بلبل کی نواؤں سے تڑپنے کی اثر گیر

اے وادیٔ کشمیر

کشمیر کی صنعتی جائداد

ریاست کشمیر کی صنعتی ترقی کی طرف بہت عرصہ تک کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ ریاست میں اعلیٰ پیمانہ کی اور اوسط درجے کی صنعتوں کا پھیلنا کوئی دیرینہ بات نہیں ریاست میں محکمہ انڈسٹریز صرف ۱۹۲۳ء میں قائم کیا گیا۔ پیشتر ازیں یہاں کے جاگیرداروں، بادشاہوں نے ریاست کی ترقی میں کوئی غور و فکر سے کام نہ لیا اور بخشی غلام محمد کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے بھی جتنے بھی اقدام اس جانب اُٹھائے گئے وہ کچھ زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوئے۔

گذرے زمانے میں ریاست کشمیر میں صنعتوں کے قائم کرنے کی جگہ — (Industrial Location) کا مسئلہ شاید ہی رُونما ہوا ہو۔ کیونکہ اعلیٰ اور درمیانہ درجوں کی صنعتوں کے لحاظ سے ریاست بڑی پسماندہ تھی۔ ریاست کی موجودہ صنعتوں کے قیام کی جگہیں اقتصادیات کے اصولوں کے مطابق نہیں۔ بیشتر صنعتیں ایسی جگہ قائم کی گئی ہیں جہاں بجلی، خام جنس، مارکیٹ اور لیبر کی مشکلات درپیش ہیں اور اوسط درجوں کی صنعتوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی صنعتوں کی حالت تو اس بارے میں قابلِ تشویش ہے۔ چھوٹی گھریلو صنعتوں میں کام کرنے والے لوگ بدبودار اور تعفن گلی محلوں میں کام کر رہے ہیں۔ کئی شہری سہولیات کے باعث وہ شہر کے گھنے محلوں اور شکستہ حال جگہوں پر رہنا پسند کرتے ہیں حالانکہ شہری بھیڑ بھاڑ نہ صرف صحت کے لئے ناموافق ہے بلکہ رہائش کی شکستہ حالی زندگی کے لئے بھی خطرہ ہے۔

کشمیر میں چھوٹی صنعتوں کی ترقی میں ایک اہم رُکاوٹ فیکٹری کے چلانے یا کام کو جاری رکھنے کے لئے مُناسب جگہ کی قلت بھی ہے۔ اچھی جگہ کی قلت اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری مُشکلات نے چھوٹے کارخانہ داروں کے حوصلے ہمیشہ پست رکھے ہیں اور اس طرح نہ صرف پیداوار پر ہی اثر پڑا ہے بلکہ صنعتوں کا پھیلاؤ بھی رُک گیا ہے۔ ان مُشکلات کے پیشِ نظر صنعت کاروں میں نئی صنعتوں کے قائم کرنے میں ہچکچاہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ کیونکہ انہیں اپنا بہت وقت اچھی جگہ تلاش کرنے میں، بجلی کو حاصل کرنے، سڑکوں سے کارخانہ کو مِلانے، ٹیلی فون حاصل کرنے وغیرہ میں ضائع کرنا پڑتا ہے۔

ان دِقتوں کو دُور کرنے کے لئے بخشی حکومت نے حال ہی میں مرکزی حکومت کی مدد سے ایک منصوبہ تیار کیا ہے جس میں صنعتوں کے تعیّن قیام کی تدبیروں کو ایک خاص اہمیت دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ریاست میں بجلی کی بڑھتی ہوئی سپلائی سے چھوٹی صنعتوں کے لئے ترقی کی راہیں کھُل گئی ہیں۔

صنعتی جائدادیں پہلے پہل برطانیہ میں قائم کی گئیں۔ برطانیہ میں دوسری جنگِ عظیم سے پہلے کئی دبے ہوئے، پست اور مصیبت زدہ علاقوں کی امداد کے لئے ان جائدادوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ صنعتی جائدادیں ان علاقوں کے لئے ایک نئی زندگی کا مظاہر ثابت ہوئیں۔ یہاں تک کہ ان کے قیام سے وہاں کے لوگوں کی زندگی میں ایک اقتصادی انقلاب آگیا تھا اور ان علاقوں کو ترقی و فلاح کے علاقے کہا جانے لگا تھا۔ برطانیہ کے اس کامیاب تجربہ کے بعد حکومت ہند کے چھوٹی صنعتوں کے بورڈ نے مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کی مدد سے صنعتی جائدادوں کے قیام کا فیصلہ کیا۔ دوسرے پنج سالہ پلان کے تحت مُلک میں ایک سَو دس صنعتی جائدادوں کا قیام عمل میں لایا جائے گا جن میں سے ۶۵ کے لئے حکومت ہند نے منظوری دے دی ہے اور حالیہ فیصلوں کے مطابق سات اور اس قسم کی جائدادوں کے لئے ٹیکنیکل منظوری دے دی گئی ہے۔ پہلی ۶۵ جائدادوں میں ایک جائداد جموں میں اور آخری سات جائدادوں میں ایک اننت ناگ (کشمیر) میں قائم کی جائے گی۔ چنانچہ دو صنعتی جائدادیں جوکہ اندازاً چالیس لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوں گی، جموں شہر میں گاندھی نگر اور دوسری شیل ٹینگ (Sheltang)

زد سری نگر میں بنائی جا رہی ہیں۔ اننت ناگ کی صنعتی جائداد مقابلتاً چھوٹی ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ یہ سالِ رواں میں مکمل ہو جائے گی۔

جموں کی صنعتی جائداد میں بارہ فیکٹری عمارتیں اور شالٹینگ میں دو فیکٹری عمارتیں اکتوبر ۱۹۵۸ء تک تیار تھیں۔ چھوٹے و بڑے صنعت کاروں کو مدعو کیا جا رہا ہے کہ وہ ان جائدادوں میں اپنی فیکٹریاں لگائیں۔ یہ فیکٹری عمارتیں یا تو رعایتی شرح پر کرایے پر دی جائیں گی یا رعایتی قیمت پر اقساط میں فروخت کر دی جائیں گی۔ چھوٹی صنعتوں کی قومی کارپوریشن اور اس کے ماتحت دوسرے ادارے صنعت کاروں کو قسطوں کے ادھار پر مشینری اور آلات مہیا کریں گی اور ان کو بڑے کارخانوں سے ٹھیکہ جات لینے میں ہر قسم کی امداد بہم پہنچائیں گی۔ اس کے علاوہ سامان لانے اور لے جانے کے لئے گاڑیوں کی سہولت اور تھوک ڈپو کا قیام وغیرہ بھی اس کارپوریشن کے تحت ہوں گے۔ ان صنعتی جائدادوں میں انڈسٹریل ایکس ٹینشن سروس انجینیئر عملی تجربات دکھائیں گی اور اس طرح سے وہاں پر کام کرنے والے نئی دست کاریاں، جدید فنی قابلیتیں اور طریقِ کار آسانی سے سیکھ لیں گے۔ اس کے علاوہ حکومت ہم مرکز صنعت کاروں اور کوآپریٹیوز (Co-operatives) کو صنعتی قرضوں کی بیشتر سہولیات بھی فراہم کرے گی۔ یہ بھی تجویز ہے کہ ان صنعتی جائدادوں میں مشترکہ سروس ورکشاپ (Common Service Workshops) جو کہ برقی قلعی (Electroplating) دھات کی جانچ (Metal testing) مناکاری (Enamelling) وغیرہ کی سروس مشترکہ طور پر سب فیکٹریوں کو مہیا کریں گی، قائم کی جائیں۔ علاوہ ازیں ان میں ڈاک خانہ، ایمپلائمنٹ ایکس چینج، شفاخانہ، کلب، دکانیں، کنٹین، لائبریری کھولنے اور حفظانِ صحت اور واٹر سپلائی کی سکیموں پر عمل کرنے کی تجاویز بھی زیرِ غور ہیں۔

ریاست کے دوسرے پنج سالہ پلان میں اس قسم کی جائدادوں کے قیام کے لئے پندرہ لاکھ روپے صرف کرنے کا تخمینہ ہے اور توقع ہے کہ ریاست میں اور بھی صنعتی جائدادیں قائم ہو سکیں گی۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ جائدادیں نئی صنعتوں کی ترقی اور نشوونما میں ایک اہم دورِ آفریں واقع ثابت ہوں گی اور موجودہ ملوں اور کارخانہ داروں میں ایک خوشگوار اور امید افزا ماحول بنائے رکھیں گی۔ ان صنعتی جائدادوں کا قیام یقیناً ریاست کی صنعتی ترقی کی تاریخ میں ایک سنہرا باب ہے۔

تعمیر

ایبہ خان چک

(بقیہ از صفحہ ۱۷)

"ایبہ خان[1] کشمیری کہ از حاکم زادہائے کشمیر بخان مشارٌ الیہ نسبت و جہت تمام داشتہ از روے حلال نمکی و مردانگی خود را رسانیدہ زخم کاری بر سر علی قلی می زند و آن متفنی شمشیر سینگی با ایبہ خان زدہ زخمش کاری می افتد۔"

اسی طرح مصنفِ اقبال نامہ جہانگیری معتمد خان نے اس واقعہ کو یوں تحریر کیا ہے :-

"ایبہ خان[2] کشمیری کہ از بندہای عمدہ بود از شجاعت و جلادت بہرۂ تمام داشت اسپ را برانگیختہ زخم شمشیری بفرق او زد و شیر افگن شمشیر سینگی بہ ایبہ خان زدہ کارش تمام ساخت۔"

لیکن مؤرخ اور شاہدِ عینی حیدر ملک چاڈورہ نے اس کے خلاف یہ واقعہ کیوں غلط تحریر کیا ہے؟ دراصل اس کی ایک یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ میدان میں زخمی ہو کر حریف کو میدان میں ہی چھوڑ کر خود بھاگ گیا تھا۔ اس لئے صحت یاب ہونے پر بعد میں جو کچھ اس نے لوگوں کی زبانی سُنا، وہی تحریر کیا۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ یوسف خان بن حسین خان چک منصب دار ڈیڑھ ہزاری کا ملازم اور معتمد خاص تھا، اپنے آقا کو شاید خوش اور مشہور کرنے کی غرض سے اس نے ایسا لکھا! واللہ اعلم بالصواب!

---

[1] کتاب تزکِ جہانگیری مطبوعہ منشی نولکشور صفحہ ۵۵

[2] کتاب اقبال نامہ جہانگیری مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی جزوِ اول صفحہ ۴۴

مہدی افادی ــــــ (بقیہ از صفحہ ۲۷) : کی کامیابی سے وجود میں آئی اور اس تحریک کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے افراد مثلاً سجاد حیدر یلدرم، سجاد انصاری، عبدالرحمٰن بجنوری اور مہدی افادی وغیرہ نے ادب میں نئے دَور کا آغاز کیا اور اپنے ذوقِ سلیم اور فکرِ بلیغ سے الفاظ کے پیکر میں وہ مجسمے تعمیر کر دئے جو آنے والوں کے سنگِ راہ کا کام دیں گے۔ میں نے مہدی کی تعمیرِ سیرت کے بارے میں جس پسِ منظر کا ذکر کیا وہاں یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ مشرقی و مغربی تمدن کے ٹکرانے سے یہ شیرازہ پیدا ہوا تھا جس کا دل مشرقی جذبات سے شررفشاں اور جس کا دماغ مغربی افکار کا سیل [illegible]

تعمیر

حدیثِ دیگراں

جموں — ۸ ر دسمبر ۱۹۵۸ء

مکرمی شمیم صاحب. تسلیمات! ماہنامہ "تعمیر" سری نگر کے "رسول میر نمبر" کے لئے ایک مضمون بخدمت بھیج رہا ہوں، شائع فرمائیں. یہ مضمون کہیں بھی شائع نہیں ہوا ہے۔ میری دو کشمیری نظمیں بھی آپ کے پاس پڑی ہیں جنہیں کافی مدت گذرنے کے باوجود ابھی تک شائع ہونے کا فخر حاصل نہیں ہوا۔

آپ کا :- گنگا دھر بٹ دیہاتی

شوپیان (سونا واری)

محترم! ٹریکیڑ چلانے کی محنت شاقہ کے بعد کل "تعمیر" کا پرچہ ملا۔ اور گویا ساری تھکن دور ہوگئی۔ رسول میر کا تو میں نے بس نام ہی نام سنا تھا اور اس کے کچھ گیت بھی۔ مگر قاضی غلام محمد کا مضمون پڑھ کر اندازہ ہوا کہ یہ شاعر کتنی عظمت کا حامل ہے اور اس کی عظمت کے عناصر کیا ہیں۔

مہاراج گوپال اچاری کی کہانی "رادھا" مجھے پسند نہیں آئی۔ پتہ نہیں ترجمہ کا سقم ہے یا کچھ اور۔ ویسے تم نے نئے کشمیر کی تعمیر کی جو جھلکیاں اپنے صفحات پر بکھیری ہیں، میں تو اُن کو ٹھوس شکل میں اُبھرتا دیکھ رہا ہوں۔ اس لئے قدرتی طور جی چاہتا ہے کہ میں بھی سوناواری کی عظیم ترقیاتی مہم کا ایک نیا خاکہ تمہارے لئے بھیج دوں۔

تمہارا :— تیج بہادر بھان

سری نگر۔ محترم ایڈیٹر صاحب!

"تعمیر" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اب تو جب تک "تعمیر" کو دو تین بار اُلٹ پلٹ کر نہیں دیکھتا، یقین ہی نہیں آتا کہ یہ وہی پرچہ ہے جس کا انتظار کرتے کرتے کتنے مہینے بیت جاتے ہیں۔ مگر وہ آتا نہیں!

تازہ شمارے میں مجھے میر نصر اللہ کا مضمون "حقیقت سائنس دان کی نظر میں" بہت پسند آیا۔ حقیقت کا اتنا زندہ اور جوان تصور جس زبان میں ادا کیا گیا ہے، بے ساختہ اُس کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ گو کہیں کہیں پر نفسِ مضمون سے متعلق مجھے مضمون نگار کی تاویلات سے اتفاق نہیں ہے، "حقیقت اپنی آخری حدوں میں صرف مظاہر اور مادے کا بازیچہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کا ایک ماورائی اور غیر حیاتی وجود بھی ہوتا ہے جس کا دُنیا کے بہت سے اہلِ سائنس بھی اعتراف کر چکے ہیں. یہی وجہ ہے کہ وہ موجودہ حقیقتوں پر ہی قانع نہیں رہتے بلکہ ایک ایسی حقیقت کو پانے کی دوڑ میں مصروف ہو جاتے ہیں جو کبھی کبھی ایک خواب اور ایک سراب نظر آتی ہے. اسی لئے شاعر کے خوابوں کی حقیقت کو سرے سے ہی جھٹلایا نہیں جا سکتا اور اگر یہ خواب نہ دیکھے جائیں تو حقیقت کی پیاس بجھ جائے اور نئے اُفق دریافت کرنے کی لگن پژمردہ ہو جائے۔ اسی لئے حقیقت کے ایک حتمی تصور کو صرف سائنس دان کی میراث قرار نہیں دیا جا سکتا!

آپ کا :- غلام رسول

جناب ایڈیٹر صاحب "تعمیر" سری نگر

"تعمیر" کا تازہ شمارہ ملا۔ پریم وار برشنی کا ترانہ بڑا پسند آیا۔ "امن کی دیوی کو پہنائی چاند ستاروں کی مالا — ہم پھولوں کے حسن کی خاطر انگاروں سے کھیلے ہیں۔" "راگ بھی ہیں ہم آگ بھی ہیں ہم ساز بھی ہیں شمشیر بھی ہیں" — اور ایسے ہی کتنے مصرعے حسنِ بیان کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم صرف نظم لکھنے کے لئے نہیں لکھی گئی بلکہ شاعر کے پاس کچھ کہنے کے لئے تھا۔ آزدیبل میر نصر اللہ کا مضمون بھی اچھا خاصا ہے اور شاعروں کو ذہنی تعصب [illegible] کے لئے جو تجویز اُنہوں نے پیش کی ہے اُس پر سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے!

فقط :- محمد شفیع [illegible] سرینگر

[illegible]

بخشی صاحب عوام کے جم غفیر سے خطاب کر رہے ہیں

تعمیر
جلد ۲
۱۹۵۹

سری نگر

مارچ سنہ ۱۹۵۹ء

جلد ۴ —————— شمارہ ۱۶

ایڈیٹر

شمیم احمد شمیم

جوائینٹ ایڈیٹر

محمد یوسف ٹینگ

قیمت سالانہ چھ روپے — فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے

عبدالغنی وڈیرا پرنٹر و پبلشر نے گورنمنٹ پریس میں چھپوا کر ڈائرکٹر انفارمیشن پبلی کیشنز سری نگر کی طرف سے شائع کیا

ترتیب

زاوئیے

ہندوستان تعمیر و ترقی کے جس انقلابی دَور میں سے گذر رہا ہے اس کا صحیح تصور قائم کرنے کے لئے بصارت سے زیادہ بصیرت کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے دورِ حاضر میں پروپاگنڈا اور پبلسٹی کو جن مکروہ مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جارہا ہے انہوں نے اس کی وُقعت کم کردی ہے۔ دورِ حاضر دراصل تشکیک کا دَور ہے۔ اسی لئے جب ہم اخبارات یا رسائل میں قومی تعمیر کے عظیم منصوبوں کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا اندیشہ لگا رہتا ہے کہ پڑھنے والے ہمارے بیان کو مبالغے پر محمول کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنا سارا زور اعداد و شمار پیش کرنے پر صرف کردیتے ہیں۔ ایک عام پڑھنے والے کو اعداد و شمار سے زیادہ اس تعمیری پروگرام کے سماجی اور انسانی پہلو سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے، اسی لئے وہ اعداد و شمار کی تکرار سے گھبرا کر اس نوع کی نظمیں، مقالے یا کہانیاں پڑھنے سے گریز کرتا ہے، ہمارے ہاں ہر سال پنج سالہ منصوبوں کی پبلسٹی پر ایک زرِ کثیر صرف ہوتا ہے، لیکن مجھے یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ زرِ کثیر کے صرفے کے بعد بھی ابھی تک مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوسکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود پلان پبلسٹی میں بھی ایک پلاننگ کی ضرورت ہے۔ اور چونکہ ہم پبلسٹی کو اشتہار بازی کے مترادف سمجھتے ہیں اسی لئے نہ ہم سنجیدگی سے اس کی طرف توجہ کرتے ہیں اور نہ ہماری اشتہار بازی کو کوئی سنجیدگی سے قبول کرتا ہے۔

گذشتہ دسمبر میں مجھے جموں و کشمیر کے اخبار نویسوں کے ایک وفد کے ساتھ یُو، پی سرکار کی دعوت پر یُو، پی کا دَورہ کرنے کا موقع مِلا۔ یُو، پی ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے اور اپنے دس روزہ سفر میں ہم نے جو کچھ دیکھا اُس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کس سُرعت اور برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ یُو، پی میں ترقی او[illegible]کا جو عمل جاری ہے وہ دراصل اُس وسیع اور مسلسل عمل کا ایک حصہ ہے جو کشمیر سے لے کر راس کماری تک جاری ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے اس عمل کو سمجھنے کے لئے بصارت سے زیادہ بصیرت کی ضرورت ہے اور یہ بصیرت جبھی حاصل ہوسکتی ہے جب ہم کنوؤں کو پھاند کر اپنے اردگرد کی دُنیا کو دیکھ کر اس کے تغیرات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یُو، پی کے دَورے کے بعد مجھے اس بات کا شدید احساس ہوا ہے کہ جب تک ہم تعمیر و ترقی کے اس عمل کا خود مشاہدہ نہ کریں، ہم میں وہ بصیرت پیدا ہی نہیں ہوسکتی جو ہمیں حیاتِ نو کے تقاضوں سے رُوشناس کرسکے۔ آج سے کئی سَو سال پہلے شاہ جہاں نے تاج محل بنا کر ممتاز محل کے تئیں خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔ آج نئے ہندوستان کے معمار ریحانڈ ڈیم بنا کر اسے لاکھوں لوگوں کی نذر کر رہے ہیں۔ تاج محل سے ریحانڈ ڈیم تک کا فاصلہ صرف چند صدیوں ہی کا فاصلہ نہیں بلکہ اقدار کی کشمکش کی تاریخ بھی ہے اور ریحانڈ ڈیم کی تعمیر اس بات کا ثبوت ہے کہ زندگی کی نئی قدریں پُرانی قدروں پر غالب آگئی ہیں۔

سرکاری دَورے کے اختتام پر لکھنؤ میں چند روزہ قیام کے دَوران میں احتشام صاحب، صباح الدین عمر اور حیات اللہ انصاری سے ملاقات ہوئی۔ احتشام صاحب کا "تعمیر" کے لئے کچھ لکھنے کا وعدہ اب اڑھائی سال پُرانا ہوچکا ہے۔ میں نے انہیں یاد دلایا تو انہوں نے پھر وعدہ کیا اور میں پھر اڑھائی سال کے لئے مطمئن ہوگیا۔ یہی کیا کم ہے کہ وہ "تعمیر" کا ذکرِ خیر کرتے رہتے ہیں اور اب انہوں نے "تعمیر" کے ساتھ مدیرِ "تعمیر" کا ذکر کرنا بھی شروع کردیا ہے ؎

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے، تری محفل میں ہے

صباح الدین عمر سے میں تقاضا کرنے ہی والا تھا کہ انہوں نے "نیا دَور" کے لئے تقاضا کردیا۔ عمر بڑے زندہ دِل آدمی ہیں، میں سمجھا مذاق کر رہے ہیں اور ٹال گیا۔ لیکن ان سے پھر تقاضا کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حیات اللہ انصاری صاحب

[illegible] اہم مضمون "کشمیری زبان کے لئے رسم الخط" اس شمارے کی زینت ہے۔ میں ان کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے یہ مضمون مجھے مرحمت فرمایا۔ حالاں کہ وہ اسے "اُردو ادب" میں اشاعت کے لئے روانہ کر چکے تھے۔ انصاری صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ اُردو کی بقا کے لئے جو اہم کام کر رہے ہیں، اس سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ ذاتی نمود اور نمائش سے بے نیاز ہو کر بے لوث خدمت ہی اُردو کو زندہ رکھ سکتی ہے اور یہ مقدس فریضہ انصاری صاحب اور بیگم انصاری بہ احسن انجام دے رہے ہیں!

لکھنؤ سے دلّی ہوتا ہوا میں جنوری کے پہلے ہفتے میں بمبئی پہنچا۔ دلّی کی ادبی بساط ہی مٹ چکی ہے۔ ادبی محفلیں اب زیادہ تر کافی ہاؤس ہی میں منعقد ہوتی ہیں۔ بمبئی کی ادبی دُنیا فلم نے لُوٹ لی ہے۔ ادب جب تجارت کی سطح پر آجاتا ہے تو ادیب پر اس کا ردّ عمل کیا ہوتا ہے، اس کا اندازہ کرنا ہو تو بمبئی کی سیر کیجئے۔ مجروحؔ کے ہاں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سردار جعفری، خمارؔ بارہ بنکوی اور پاکستان کے ماہر القادری سے مُلاقات ہوئی۔ سب لوگوں نے "تعمیر" کے لئے کچھ نہ کچھ لکھنے کا وعدہ کیا۔ کرشن چندر نے بانہال ٹنل سے متعلق ایک ڈرامہ لکھا ہے اور بیدیؔ کشمیر سے متعلق اپنا ناول مکمل کر رہے ہیں۔ اختر الایمان فلمی دُنیا میں رہتے ہوئے بھی فلمی دُنیا سے دُور نظر آتے ہیں۔ وہ خود مجروح ہیں، لیکن انہوں نے اپنی شاعری کو ابھی تک مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔ یہ ان کا کارنامہ ہے یا اعتراف شکست؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کے شہید ہیں!

بمبئی کی بیشتر فلمی شخصیتوں سے میں کشمیر ہی میں مِلا ہوں، دلیپ کمار سے بھی میری پہلی مُلاقات آج سے دو سال پہلے یہیں ہوئی تھی۔ بمبئی میں اپنے قیام کے دَوران مجھے اس کے بہت قریب رہنے کا موقع مِلا۔ دلیپ عظیم فن کار ہی نہیں، ایک بہت ہی ذہین اور سُلجھا ہوا نوجوان بھی ہے۔ وہ اپنے فن کے لئے بے پناہ ریاض کرتا ہے۔ —— اور بقول اس کے ابھی اپنے کام سے مطمئن نہیں ہے۔ اس کی گھریلو زندگی بڑی ہموار اور خوش گوار ہے۔ اس کے سبھی بہن بھائی بے حد ذہین ہیں، لیکن دلیپ کی شخصیت اتنی نمایاں ہے کہ تمام تر توجہ اسی پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ وہ ان دِنوں اپنی فلم "گنگا جمنا" بنانے میں مصروف ہے۔

بمبئی کی ایک اور اہم شخصیت بابو راؤ پٹیل ہیں۔ ان سے میری مُلاقات دلیپ کمار کے ہی محلے ہوئی۔ ذہانت، فطانت، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کا یہ مجسمہ تعصّب اور تنگ نظری کا شکار ہو کر مسخ ہو گیا ہے۔ بابو راؤ پٹیل میں متاثر کرنے کی بڑی صلاحیتیں ہیں۔ لیکن وہ اپنی ہیبت سے مرعوب کرنے پر ہی مطمئن ہے۔

بمبئی سے حیدر آباد ہوتا ہوا میں ۲۶ر جنوری کو دِلّی پہنچا۔ حیدر آباد کا سالار جنگ میوزیم ایک ایسا نادر روزگار عجوبہ ہے کہ اسے ایک بار دیکھ کر بار بار دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں جناب عبدالقادر سروری سے مُلاقات ہوئی۔ انہوں نے شعبۂ اُردو کے دیگر اصحاب سے بھی مِلایا اور بڑی خاطر مدارات کی۔ مجھے یہ سُن کر بڑا تعجب ہوا کہ وہ ابھی تک کشمیر نہیں آئے ہیں۔

اڑھائی ماہ کی غیر حاضری کے بعد جب میں کشمیر واپس لوٹا تو چاروں طرف برف کے پہاڑ نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ اب کی کشمیر میں وہ جاڑا پڑا کہ گذشتہ تیس برسوں میں نہ پڑا تھا۔ اب موسم خوش گوار ہے اور سیاحوں کی آمد شروع ہو گئی ہے!

کشمیر

اِک حسینہ کے سُنہرے خواب کی تعبیر ہے
جنّتِ ارضی کہیں اس کو کہ یہ کشمیر ہے

تیری شادابی پہ قرباں باغِ جنّت کی بہار
قدرتِ یزداں کی تُو اِک بولتی تصویر ہے

باعثِ صد فخر و نازش بن گیا تیرا وجود
مادرِ ہندوستاں کی بھی عجب تقدیر ہے

شعر و نغمہ تیرے ہر چشمہ کے پانی میں رواں
تیرا ہر گوشہ بہارِ حُسن کی تفسیر ہے

وُہ مقدّس چوٹیاں ہے برف ہی جن کا لباس
ان پہ گویا اِک رُوپہلے کام کی تحریر ہے

غنچۂ نورس ہیں تیرے نازشِ صبحِ بہار
صوتِ بُلبل جس چمن کی ناز شب گیر ہے

سازِ دلکش چھیڑتے ہیں جس کے رنگیں آبشار
حاملِ صد رنگ و نکہت وادیٔ کشمیر ہے

وہ طلسمِ رنگ و بُو کر لے جو عقلوں کو اسیر
کیف و مستی دِل میں بھر دے اسکی یہ تاثیر ہے

تیرے سودائی ہر اِک دُنیا کے گوشہ میں بسے
مرغزاروں پر ترِے شیدا ہر اِک رہ گیر ہے

کھینچ کے آجاتا ہے تجھ میں شام و صبح کا جمال
تیرا ہر جلوہ ہے دِلکش ہر سماں دِلگیر ہے

درسگاہوں کا اضافہ اور صنعت کا عروج
ہر طرف ذکرِ ترقی ہر طرف تعمیر ہے

صحنِ عالم میں جوا ے سرِ تاج ہنستے ہیں یہ گُل
غور اگر کیجئے تو یہ اس کی ہی اِک تنویر ہے

کشمیری زبان کے لئے رسم الخط

کشمیری زبان کے لئے رسم الخط وضع کرنے کا مسئلہ گذشتہ چار پانچ سال سے خاص اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ آج سے چند سال پہلے حکومت جموں و کشمیر نے ایک خاص کمیٹی قائم کر کے اس کی سفارشات کی بنیاد پر ایک رسم الخط وضع کیا تھا۔ یہ رسم الخط اس وقت رائج تو ہے لیکن اسے قبولِ عام حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ دراصل یہ رسم الخط اس بنیادی دقت کو دور نہیں کر سکا ہے جس کے لئے اسے وضع کیا گیا تھا اور یہ دقت ہے مختلف آوازوں کو ادا کرنے کے لئے مخصوص اعراب کا عدم وجود۔

ہم بڑے فخر کے ساتھ جناب حیات اللہ انصاری صاحب مدیر "قومی آواز" لکھنؤ کا یہ مضمون مباحثے کے لئے شائع کر رہے ہیں۔ موصوف نے اپنے رسم الخط کی بنیاد خالص (Phonetics) پر رکھی ہے۔ کشمیری زبان سے ناواقفیت کی بنا پر اپنے مطالب واضح کرنے کے لئے کہیں کہیں کچھ ایسی مثالیں دی ہیں جن کی صحت پر شبہ کی گنجائش موجود ہے، لیکن اس سلسلے میں ہم نے کسی ترمیم یا تحریف کی بجائے مسودہ کو من و عن شائع کیا ہے۔ ان کا تجویز کردہ رسم الخط اردو رسم الخط کے اس قدر قریب ہے کہ اردو جاننے والوں کے لئے کشمیری زبان کا سیکھنا آسان تر ہوگا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ انصاری صاحب کا وضع کردہ رسم الخط موجودہ رسم الخط کی بہت سی دقتوں کا حل پیش کرتا ہے۔ اس مضمون اور موضوع پر صائب الرائے اصحاب کے مقالے شکریہ کے ساتھ قبول کئے جائیں گے۔

(مدیر)

پیشِ لفظ

عجیب سی بات ہے کہ میں جو مشکل سے کشمیری زبان کے سو الفاظ جانتا ہوں اس کے لئے ایک رسمِ خط پیش کرنے کی جرأت کروں۔

۱۹۵۶ء کی بات ہے کہ میں سری نگر میں چند کشمیری ادیبوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت ایک ادیب نے دل دوز آہ کے ساتھ کہا۔ "افسوس کشمیری زبان کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ کیونکہ اس کا رسمِ خط ایسا نہیں ہے جو اس کے الفاظ کے صحیح تلفظ کو ادا کر سکے۔ اس وجہ سے جو کچھ لکھا جاتا ہے اسے دوبارہ پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بکثرت الفاظ ایسے ہیں جو اس رسمِ خط میں لکھے جانے کے بعد کئی طرح سے پڑھے جا سکتے ہیں۔

میں جانتا تھا کہ کشمیری میں بہت بڑا اور صدیوں کا ادبی ذخیرہ موجود ہے۔ اس میں بڑے بڑے شاعر اور مفکر گذرے ہیں۔ ایسی عظیم الشان ادبی زبان محض رسمِ خط نہ ہونے کی وجہ سے زمانے کے ساتھ چلنے سے معذور ہو۔ اور نزع کے عالم میں پڑی ہو۔ ایک ادیب کی زبان سے ایسی بات سن کر میرے دل کو سخت چوٹ لگی۔

دوسرے دن میں ایک کشمیری کتب فروش کے یہاں ایسی کتاب کی تلاش میں گیا جس سے کشمیری زبان کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ وہاں ایک کتاب "کشمیری بول چال" مل گئی۔ اس کے آخر میں مصنف کی ایک عرضداشت تھی جو میرے دل میں پیوست ہو گئی۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:-

"ہماری زبان بھی دیگر عملی زبانوں کی طرح ایک مستند علمی زبان ہو سکتی ہے، بشرطیکہ مادرِ کشمیر کے سپوت اس کے لئے کمرِ ہمت باندھیں۔ مجھے امید ہے کہ معزز قارئین اس نسخے کو کمال توجہ سے پڑھ کر اس پر غور کر کے اپنی صائب رائے ظاہر کریں گے اور مجھ کو کمال مہربانی سے اس امر سے مطلع فرمائیں کہ کشمیری زبان کو ایک مستند علمی زبان بنانے اور اس کو فروغ دینے کے لئے ہم کو کیا وسائل اختیار کرنے چاہئیں۔ نیز یہ کہ کشمیری زبان کے لئے کتنے اور کون کون سے حروفِ تہجی لازمی ہیں۔ اس طرح حرکات و سکنات وغیرہ اس زبان کے لئے کیا کیا رکھے جائیں۔ یہ ضروری عرضداشت ہے جس کے لئے میں اپنے ہم وطن بزرگوں سے پُر زور لفظوں میں التماس کرتا ہوں۔ امید واثق ہے کہ سب بزرگانِ وطن میری اس عرضداشت پر فوری خاص توجہ دے کر اس مردہ جسم زبان میں روح پھونک کر اس کو جلد ہی جوانی کا لباس پہنا کر تہذیب کے نشیمن میں ایک باعزت کرسی پر بٹھانے کا موقع دیں۔

کار نہ این گنبد گرداں کند
ہر چہ کند ہمت مرداں کند

اس درخواست نے میرے دل میں یہ آرزو پیدا کر دی کہ کاش میں بھی کشمیری بھائیوں کی اس سلسلے میں کچھ خدمت کر سکتا!

یہ کتاب پڑھ کر اور کشمیری دوستوں سے باتیں کر کے مسئلہ کی اہمیت کا مجھے اندازہ ہوا۔ کشمیری میں "لار" اور "لَر" سے ملتے جلتے پانچ لفظ ہیں جن کو ان دو طریقوں سے لکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پڑھنے میں کتنی دشواریاں ہوتی ہوں گی۔ کشمیری میں واحد سے جو جمع بنتی ہے اس میں صرف اتنا فرق ہو جاتا ہے کہ واحد کے اعراب پر ذرا سا جھٹکا آ جاتا ہے جسے موجودہ رسمِ خط میں کسی طرح ظاہر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے واحد اور جمع کا ایک ہی املا رکھا ہے مثلاً لَٹ (دُم) اور لَٹ (دُمیں)۔ ظاہر ہے کہ اس سے کیا کیا الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں۔

رسمِ خط بنانے کے لئے زبان کا جاننا ضروری نہیں۔ حروف اور اعراب کی سائینس، الفاظ کے معنی اور جملوں کی گرامر اور عبارت کی نزاکتوں سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ میں کئی برس سے اردو اور کئی [illegible] میں ہندی کی تیاری کے سلسلے میں

مارچ ۱۹۵۹ء

حروف اور اعراب کی ساخت پر سترہ سال سے غور کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے اعراب کو پیچیدہ گتھی کو سمجھتا تھا اور میرے کان کافی حد تک اعراب کا تجزیہ کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ اس اہمیت کو کشمیری کے لئے استعمال کیا جائے۔ سری نگر سے واپس آکر میں ریڈیو کشمیر کا کشمیری پروگرام سننے لگا اور اس کی مدد سے اپنے کانوں کو اس زبان کے تلفظ کا عادی کیا اور پھر اس کا تجزیہ کرتا رہا۔ ڈھائی سال میں بعض فارمولے بنا لئے۔

اس کام کی تکمیل کے لئے کسی کشمیری ادیب کی اعانت کی ضرورت تھی۔ جو مختلف قسم کے الفاظ مہیا کر دے اور بنائے ہوئے رسم خط کے اصول پر مختلف الفاظ کے ادا کا جائزہ لے سکے کہ وہ کہاں تک صحیح تلفظ ادا کرتا ہے۔ اتفاق سے غلام نبی طور قآصاحب جو کشمیری کے ایک نوجوان ادیب ہیں، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں مارچ ۱۹۵۸ء میں لکھنؤ آئے اور میری درخواست پر ٹھہر گئے۔ انہوں نے اس سلسلے میں میری امداد کی اور اس طرح یہ کام تکمیل کو پہنچا۔ اب میں اس خدمت کو کشمیری رسم خط کے نقادوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں ابھی کچھ کمزوریاں رہ گئی ہوں۔ لیکن وہ جیسی بھی ہوں، رسم خط کے قائم کردہ اصولوں کی مدد سے حل ہو جائیں گی۔

بنیادی مسئلہ

کشمیری زبان کے تلفظوں کا، جہاں تک میرے لئے ممکن تھا، میں نے جائزہ لیا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی خاص اُلجھن صرف اعراب کی ہے۔ کشمیری اعراب کا باہمی فرق بہت نازک ہے۔ صرف الف اور زبر کے خاندان کے وہاں چھ چھ اعراب ہیں۔ بہت سے ایسے اعراب ہیں جو آتار و چڑھاؤ یا جھٹکے سے ادا ہوتے ہیں۔ ان کو رومن یا دیوناگری یا اُردو کے اعرابوں سے کسی طرح بھی ادا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ بہت کچھ تبدیلیاں کرنے کے بعد بھی ان رسم خط کو اس قابل نہیں بنایا جا سکتا ہے کہ وہ کشمیری زبان کی ذمہ داریوں کو پوری طرح نبھا سکیں۔ یہ کام اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس صورت میں کہ ان اصولوں کو دریافت کیا جائے جو ان زبانوں کے، جن کے رسم خط کو ہم اپنا سکتے ہیں، اعرابوں کی تہہ میں کام کرتے ہیں۔ پھر ان اصولوں کا جائزہ لیا جائے کہ وہ اس سلسلے میں کہاں تک کارآمد ہو سکتے ہیں۔ جن اصولوں سے کام نکلتا نظر آئے ان سے کشمیری کے لئے اعراب اخذ کئے جائیں۔

کشمیری رسم خط بنانے کے لئے پانچ رسم خط کا جائزہ لیا گیا ہے (۱) عربی
تعبیر

(۲) فارسی (۳) اُردو (۴) دیوناگری اور (۵) رومن ——— دیکھنے میں پہلے تینوں رسم خط ایک ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں کافی فرق ہے اور ان تینوں میں زیادہ وسیع اُردو رسم خط ہے۔ اس جائزے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کشمیری کے لئے سب سے زیادہ موزوں اُردو رسم خط ہے۔

ان پانچوں خطوں کا مقابلہ کرنے کی میں نے اس مضمون میں کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ صرف دیوناگری پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ عربی اور فارسی پر بحث یوں بے کار تھی کہ وہ صرف علمی موشگافیاں ہوتیں جن سے کوئی عملی فائدہ نہ پہنچتا ———

اسی طرح رومن پر بحث بھی بے کار نظر آئی۔ اس کے سلسلے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اسے اپنانے کے لئے اتنے حروف اور علامات ایجاد کرنا پڑیں گے کہ اس خط کے حرفوں اور نشانوں کی تعداد دوگنی ہو جائے گی۔ جس کی وجہ سے لکھنے پڑھنے میں بہت وقت صرف ہوگا اور چھپائی میں پیسہ بہت برباد ہوگا۔

مضمون میں بعض اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ ان کی تشریح یہ ہے:-

اعراب

اعراب یعنی ضمہ، فتحہ اور کسرہ اور حروفِ علت یعنی الف، واو اور یے کے لئے صرف یہی ایک اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ واحد اور جمع دونوں حیثیتوں سے یہ لفظ آیا ہے۔ کہیں کہیں حرکات یا حرکت لکھا گیا ہے۔ ان سے مراد زبر، زیر اور پیش ہے۔

حرف اور حروف

یہ صرف حروفِ صحیحہ کے معنی میں استعمال کئے گئے ہیں۔

اعراب کی قسمیں

اُردو میں دو قسم کے اعراب استعمال ہوتے ہیں، مفرد اور مرکب

مفرد اعراب

مفرد اعراب میں زبر، زیر، پیش اور ''ا'' ہے ہیں۔ ان کی کئی کئی قسمیں ہیں۔

زبر دو طرح کا ہوتا ہے۔ سادہ، امالہ دار

(۱) سادہ زبر۔ جیسے کہا۔ بند۔ پل

(۲) امالہ دار۔ جیسے رہنا۔ کہنا۔ سہنا۔ احمد (ا۔ ح کے درمیان کا زبر)

زبر کی طرح الف بھی دو قسم کا ہوتا ہے۔

(۳) سادہ الف۔ جیسے بال۔ جال

(۴) امالہ دار الف۔ یہ لکھنے میں استعمال نہیں ہوتا۔ لیکن بعض لفظوں کے لہجے میں

آتا ہے۔ گانے والے بھیرویں راگ میں اسے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن تحریر میں نہیں آتا
ہے۔ امالہ دار عربی میں اور قرآن کی قرأت میں باقاعدہ استعمال ہوتا ہے۔ عربی
صرف کی کتابوں اور تجوید کی کتابوں میں اس پر باقاعدہ بحث کی گئی ہے۔[ع۵]

اُردو میں دونوں قسم کے زبر اور دونوں قسم کے الف ایک ہی طرح لکھے جاتے
ہیں۔ زیر دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(۵) ثقیل زیر۔ جیسے بِکل۔ بِل۔ پِیا

(۶) خفیف زیر۔ جیسے پیارا۔ پیالا۔

اگر بِل اور چھِل پہل کے بل کے تلفظ کا مقابلہ کیا جائے تو دونوں زیروں
کا فرق بہت واضح ہو جاتا ہے۔

فارسی اضافت کا تلفظ اُردو والے جب ادا کرتے ہیں تو اس میں اسی خفیف
زیر کو استعمال کرتے ہیں جیسے مادرِ ہند۔ برگِ گاؤ زبان۔ آبرو رنگ

(۷) چھوٹی ی۔ جیسے بیوی، نیلا

(۸) بڑی ے۔ جیسے میرا۔ ریل

ان دونوں 'یے' کی مکمل شکلیں تو الگ الگ ہیں۔ لیکن جب ان کو شوشے
اور دو نقطوں کی شکل میں لکھا جاتا ہے تو ان کی لکھاوٹ میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔

پیش دو قسم کے ہوتے ہیں۔ خفیف اور ثقیل

(۹) ثقیل جیسے بُلانا۔ مُدت

(۱۰) خفیف جیسے مُقرر۔ وُہ

(۱۱) ثقیل واو جیسے چوہا۔ چونا

(۱۲) خفیف واؤ جیسے دو۔ تونا

یہ سب اعراب دیوناگری میں بھی موجود ہیں' صرف چند باتیں الگ ہیں۔

(۱) امالہ دار زبر دیوناگری میں نہیں ہے اور نہ ان کا تلفظ۔ اس وجہ سے
احمد جس تلفظ سے اُردو میں رائج ہے دیوناگری میں نہ لکھا جا سکتا ہے اور نہ پڑھا جا سکتا ہے۔

(۲) بڑی ے' اور چھوٹی ی کی۔ ثقیل واو اور خفیف واو کی وہاں
الگ الگ شکلیں ہر جگہ برقرار رہتی ہیں۔

لیکن خفیف و ثقیل زیر اور ثقیل پیش کے لئے دیوناگری میں بھی ایک ہی
شکل ہے۔ خفیف پیش وہاں استعمال نہیں ہوتا ہے۔

کشمیری علامات

کشمیری کے لئے ہم کو ان بارہوں اعراب کے لئے الگ الگ علامتوں کی
ضرورت ہے۔ یہ ضرورت یوں پوری کی جا سکتی ہے۔

(۱) الف سادہ اُردو میں موجود ہے اُسے برقرار رکھا جائے۔

(۲) الف امالہ دار عربی کی چیز ہے۔ اس لئے اس کی شکل عربی کتابت سے
لینا مناسب ہوگا۔ کشمیری میں وہ یوں لکھا جائے گا۔ جاٗ۔ پاٗ اسے کھڑی دار
الف کہا جائے گا۔

(۳) زبر سادہ وہی رکھا جائے جو اُردو میں استعمال ہوتا ہے۔

(۴) امالہ دار زبر کو بھی امالہ دار الف کی طرح عربی سے لینا چاہئے اس لئے
اس کی شکل یہ مقرر کی ہے۔ ـٔـ یعنی قلم کو ذرا سا پیچھے کی طرف دبا دیا جائے۔
جیسا کہ عربی کی کتابت میں کبھی کبھی کیا جاتا ہے۔ اسے سایہ دار زبر کہا جائے گا۔

(۵) ی۔ عربی میں اس ی کی جگہ کہیں کہیں کھڑا زیر (ٖ) بھی استعمال
کیا جاتا ہے۔ اس استعمال سے فائدہ اُٹھا کر یہ قاعدہ بنایا جا سکتا ہے کہ یہ یا
جب بیچ میں شوشے کی شکل میں آئے گی تو اس کے دونوں نقطے برابر لگانے کے
بجائے تلے اُوپر (:) لگائے جائیں گے۔ اس طرح اس میں اور بڑی ے میں
تمیز ہو سکے گی۔ اس علامت میں کھڑے زیر کی شباہت ہے جو کہ چھوٹی یے کی علامت
ہے اور دو نقطوں کی موجودگی اسے اُردو سے دُور بھی نہ کرے گی۔ کشمیری پڑھنے
والے اُردو کی ی کو اور اُردو پڑھنے والے کشمیری کی ی کو بلا رکاوٹ کے پڑھ
لیں گے۔

(۶) ے۔ اس کی صورت میں تبدیلی کرنے کی ضرورت نہیں۔ درمیانی شکل میں
بھی یہ چھوٹی ی سے' نقطے برابر ہونے کی وجہ سے ممتاز ہو جائے گی۔

(۷) زیر ثقیل۔ اس کی صورت وہی رہے جو اُردو میں رائج ہے۔

(۸) زیر خفیف۔ امالہ کے زبر سے یہ قریب تر چیز ہے۔ اس کے علاوہ زیر اور
زبر میں صرف اُوپر نیچے کا فرق ہوتا ہے۔ اس لئے امالہ والا زبر جب نیچے لگایا جائے
تو اس کو زیر خفیف قرار دیا جائے۔ اسے سایہ دار زیر کہا جائے۔

(۹) واؤ مجہول یا خفیف۔ وہی رکھا جائے جو اُردو میں ہے۔

(۱۰) واؤ معروف یا ثقیل۔ عربی میں اس کی جگہ کبھی اُلٹا پیش بھی استعمال
کرتے ہیں۔ اُردو میں اس قاعدے کی بنا پر کہیں کہیں یہ اصطلاح رائج کی گئی

ع۵ عربی صرف کی مشہور درسی کتاب "فصول اکبری" میں امالہ کی تعریف یوں کی گئی ہے:۔
"امالہ آنست کہ فتحہ را مائل بکسر سازند پس الف را مائل بیا"

ہے کہ واؤ مجہول سے ممتاز کرنے کے لئے اس پر اُلٹا پیش لگا دیتے ہیں۔ کشمیری میں یہ طریقہ اپنایا جائے۔ اسے کلغی دار واؤ کہا جائے۔

(۱) پیش ثقیل۔ وہی رہے جو اُردو میں ہے۔

(۲) پیش خفیف کو امالہ کے زیر کی طرح سایہ دار بنایا جائے جیسے ۔ مے

اسے سایہ دار پیش کہا جائے۔

ان علامتوں کی ایجاد میں تین باتیں پیشِ نظر رکھی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جو علامت اُردو میں عام طور سے استعمال کی جاتی ہے اس کو بدستور رہنے دیا جائے اور دوسری یہ کہ نئی علامت کی شکل اپنی بُنیادی علامت کے قریب ترین شکل ہو۔ تیسری یہ کہ وہ شکل قلم کی کشش کو خوش خطی اور گھسیٹ دونوں میں قبول کر سکے

ان واضح علامتوں سے کشمیری کے تمام مفرد اعراب والے الفاظ صحیح تلفظ کے ساتھ لکھے جا سکیں گے۔ جیسے آہز وَزُل۔ مچھ

زیر حرفی

کشمیری زبان میں بعض الفاظ خاص کر جمعیں اور تصغیر جو آتی ہیں ان کے آخر میں ایک جھٹکا مائل بہ زیر ہوتا ہے۔ یہ حرکت اُردو، فارسی یا عربی میں نہیں ہے۔ دیوناگری میں ہے۔

دیوناگری اور اُردو کے اعراب میں ایک بڑا دلچسپ فرق ہے۔ وہ یہ کہ یہ زبر، زیر اور پیش جب حرف کے آخر میں آتے ہیں تو ان کا تلفظ دیوناگری میں چھوٹا ادا کیا جاتا ہے لیکن اُردو میں لمبا۔ مثلاً مادرِ ہند۔ برگِ گاؤزبان۔ قولِ رسُول کے اضافی زیر کو دیوناگری میں نہیں لکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اگر اسے ای کی چھوٹی ماترا سے لکھا جائے گا تو تلفظ بہت چھوٹا ہو جائے گا اور بڑی ماترا سے لکھا جائے گا تو وہ بڑی سیے کے برابر طویل ہو جائے گا۔ دوسری طرف पानि کو اُردو میں نہیں لکھا جا سکتا ہے۔ اگر لکھا جائے گا تو زیر سے لکھا جائے گا۔ اور اس کا تلفظ مادرِ ہند کی اضافی زیر کی طرح ادا کیا جائے گا اور یہ تلفظ اصل تلفظ سے کافی طویل ہوگا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ جب نِکالا۔ دِل اور جِلد لکھا جائے تو دونوں رسم خط میں وہی زیر استعمال ہوتا ہے جو وہاں رائج ہے اور اس وقت ان کی آوازوں کی بڑائی چھوٹائی غائب ہو جاتی ہے اور ایک ہی طرح کی آواز ادا ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لفظ کے شروع یا درمیان میں آکے اُردو کا زیر اور دیوناگری کا ی کی چھوٹی ماترا برابر ہو جاتی ہیں۔

کشمیری کا خط بنانے کے لئے اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ زیر کی آخری آواز کون سی دُرست ہے۔ وہ جو ہندی میں ادا ہوتی ہے یا وہ جو اُردو میں ادا ہوتی ہے؟ اگر یہ مسئلہ صاف نہیں ہو جاتا ہے تو ایک اُلجھن رہ جائے گی۔ بابِ کعبہ لکھیئے اور اس میں اضافی زیر کا وہ تلفظ ادا کیجئے جو ایرانی ادا کرتے ہیں۔ یعنی ثقیل لیکن ع کا وہ تلفظ ادا کیجئے جو اُردو والے ادا کرتے ہیں۔ یعنی الف کا ان تلفظ کے ساتھ بابِ کعبہ کو دس بارہ مرتبہ دُہرایئے اور دوسروں سے کہیئے وہ بھی دُہرائیں۔ غور کیجئے گا تو دونوں لفظوں کے بیچ میں لفظ "بِکا" (جو بِکنے کا مشتق ہے) صاف سُنائی دے گا اور اس میں بے کا زیر اتنا ہی طویل ہوگا جتنا دیوناگری کی چھوٹی ای کی ماترا سے لکھا جاتا ہے۔ اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ زیر یا چھوٹی ای کا وہ تلفظ صحیح ہے جو فارسی کی اضافت میں اُردو والے ادا کرتے ہیں۔

مزید جانچ کے لئے ان الفاظ کو دیوناگری میں ترتیب سے لکھیئے

बाबकाबा, बाविका, विका ان کو بار بار پڑھیئے اور پڑھوا کر سُنیئے تو صاف بابِ کعبہ ادا ہوگا۔ یعنی اضافی زیر کی پوری آواز سُنائی دے گی۔ کشمیری میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیوناگری کے اصول پر ایک ہی زیر کو بڑی اور چھوٹی دونوں آوازوں کے کام میں لایا جائے۔ لیکن یہ چیز کشمیری کے نازک اعرابی فرق کو دیکھتے ہوئے مُناسب نہ ہوگی۔ اس کے لئے کسی علامت کو ایجاد کرنا ہی مُناسب ہوگا۔ اس بات کو پیش نظر رکھ کر یہ بات ضروری ہے کہ کشمیری شاعری میں جا بجا فارسی اضافت آتی ہے۔

یہ جھٹکا جو مائل بہ زیر ہوتا ہے اس کی آواز ہائے مخفی اور زیر سے ملتی جُلتی ہے۔ اس سے جو علامت بنائی جائے اس میں زیر اور ہائے مخفی کی مشابہت ہونا چاہیئے۔

اُردو میں ایک علامت ایسی ہے جس کو اسی کام کے لئے اپنایا جا سکتا ہے۔ نستعلیق میں اللہ کی جو "ا" ہوتی ہے، اگر اسے ترچھا نہ بنایا جائے بلکہ کھڑے زیر کی طرح بنا دیا جائے تو اس سے یہ کام نکل آئے گا۔ اس میں ہائے مخفی اور زیر دونوں کی مشابہت آ جائے گی۔ اس علامت کو زیر حرفی کہا جائے۔

زیر حرفی کی بناوٹ کچھ ایسی ہوگی جیسے دو کے ہندسے کی ہوتی ہے۔

زیر حرفی کی مدد سے حسبِ ذیل الفاظ کا املا صحیح لکھا جا سکے گا

مُزِ ۲ ۔ بارِ ۲

زیرِ حرفی جب ماسبق سے ملایا جائے گا تو اس کا شوشہ صرف ایک ہوگا یعنی آخر والا شوشہ جس کے بعد قلم نیچے آجاتا ہے۔ جیسے کِنہٕ

دو کا ہندسہ

دو کا ہندسہ اُردو میں دو طرح سے لکھا جاتا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ دو دندانے بن جاتے ہیں اور ان کے بیچ میں گہرائی ہوتی ہے اور دوسرا اس طرح گویا کہ وہ بے سر کا میم ہو۔ کشمیری میں چونکہ پہلی شکل زیرِ حرفی کے لئے لے لی گئی ہے۔ اس لئے وہاں دو کے ہندسہ کے لئے صرف دوسری شکل رہے گی۔

تشدیدِ خفیف

لفظ جنگل دو جزی لفظ ہے جس کا دوسرا جز گل ہے۔ لیکن پہلا نہ تو جن ہے اور نہ جنگ۔ بلکہ ان دونوں کے درمیان کی ایک چیز ہے۔ یعنی کے ساتھ گاف کی آواز شامل ہوتی ہے۔ یہ اتنی خفیف کہ اس پر تشدید لگا غلط ہوگا۔ اسی طرح کے جز رکھنے والے الفاظ اور بھی ہیں جیسے کنگھا۔ منگا وغیرہ۔

اُردو میں کوئی ایسی علامت نہیں ہے جو اس قسم کی تشدید کو ادا کرے کشمیری میں بھی کہیں کہیں زیرِ حرفی کے ساتھ تشدیدِ خفیف آتی ہے۔ وہاں بھی اس کے لئے کسی علامت کو مقرر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ قا بنا لینا کافی ہوگا کہ جس حرف کے بعد زیرِ حرفی ہو، وہ اس حرکت کے ساتھ آواز ضرور دے گا۔ وہ حرف ساکن ہے تو، اور جزم دار ہے تو۔ اس قاعدے کا ا یہ ہوگا کہ اگر زیرِ حرفی بجزم دار حرف کے ساتھ آئے گا تو صرف ایک طرف حرکت ماقبل اور جزم کے ساتھ آواز دے گا اور دوسری طرف زیرِ حرفی کے ساتھ۔ یہ آواز بھر پور ہوگی۔ لیکن دوسری زیرِ حرفی کی خفیف حرکت کی وجہ سے ویسی ہی خفیف جیسے کنگھا اور جنگل کے پہلے جزی گاف کی آواز ہوتی ہے۔

حروفِ علت حروفِ صحیح کے رُوپ میں

اس جگہ ایک بات واضح کر دینا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ الف۔ و۔ ی حروف بن کر بھی آتے ہیں۔ مثلاً آنا، والا۔ یاد کے شروع میں یہ حرف بن کر آئے ہیں۔ اس کے ثبوت یہ ہیں :۔

(۱) اعراب سے پہلے اگر حرف ملا دو تو آواز نکل آتی ہے۔ لیکن اسی جگہ الف۔ ی۔ و سے پہلے اگر حرف لگا دو تو کوئی آواز نہیں بنے گی۔

(۲) اس جگہ الف۔ و۔ ی اسی طرح اعراب کے محتاج ہیں جیسے حروف ہوتے ہیں۔ جب الف۔ و۔ ی حروف بن کر آتے ہیں تو ان کا تلفظ بھی ذرا الگ ہوتا ہے۔ مثلاً لَو کے وزن پر کَو بنا لیجئے۔ (اس جگہ واؤ اعراب کے طور پر استعمال ہوا ہے) پھر "کَو" کے بعد "وا" لگا دیجئے۔ اس طرح کَووا بن جائے گا۔ لیکن اس کا تلفظ وہ نہیں ہوگا جو کوّا کا ہوتا ہے۔ جس میں کہ دونوں واؤ حرف ہیں۔

اُردو میں انگریزی لفظ "love" کو "لَو" لکھتے ہیں اور تلفظ وہ ادا کرتے ہیں جو دوڑا میں دَو کا۔ اس طرح صحیح تلفظ ادا ہونے سے رہ جاتا ہے اگر لکھنے میں کسی طرح یہ ظاہر کیا جا سکے کہ اس جگہ واؤ حرف کی طرح استعمال ہوا ہے اور اس کا تلفظ وہ ہوگا جو کوّا اور پوّا کے پہلے جزوں میں واؤ کا ادا ہو رہا ہے تو love کا صحیح تلفظ آجائے گا۔

الف، واؤ، ی جب متحرک ہوں تب تو یہ حرف ہوتے ہی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی یہ اس وقت بھی حرف کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔ جب ساکن ہوں۔ اس وقت یہ خود ماسبق کے حرف کی آواز کو بڑھاتے نہیں ہیں بلکہ اس کی آواز آگے ان کی آواز پر گرتی ہے۔ جیسے کوّا۔ لیّا۔ گھُنیّاں وغیرہ۔

جب الف، واؤ اور یے اعراب کے طور پر استعمال ہوں تو ان پر اعراب یا جزم لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کو بالکل اسی طرح سمجھنا چاہیئے۔ جیسے زبر، زیر اور پیش کو۔ مثلاً باجا لکھنا ہے تو ب کے ساتھ الف لگاتے ہیں۔ وہ "با" کی آواز دے دے گا۔ اسی طرح جیم کے ساتھ الف لگتے ہی اس کی آواز "جا" ہو جائے گی۔

الف۔ و۔ ی اعراب اور الف۔ و۔ ی حروف کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جب یہ حروف کی شکل میں آئیں تو ان پر حرکات جزم لگا دئے جائیں۔ جیسے کوّا۔ پوّا۔ بہَرْوَر وغیرہ۔

والا۔ یاد اور آگ میں حرکت لگانے کی یوں ضرورت نہیں کہ ان کے بعد ن اور مد اعراب ہیں۔ اور وہ اس بات کی واضح علامت ہے کہ ان کے پہلے جو آئی ہے وہ حرف ہے۔ لیکن جب وہ حرف کے طور پر استعمال ہوں اس وقت حرکت، جزم یا تشدید لگا دینا چاہیئے۔ جیسے کوّا۔ پوّا۔ بہروَر وغیرہ۔ اس طرح ان حروف کے ان دونوں استعمالوں میں فرق پیدا ہو جائے گا۔ اسی طرح [illegible]

قاعدے کے بموجب ... کو یوں لکھا جائے گا۔ نَوْ

بعض ناموں کے آخر میں دیو آتا ہے۔ جیسے نریندر دیو۔ ان کو اُردو میں اس طرح پڑھا جاتا ہے جیسے سیو کو۔ یہ غلط ہے۔ اس جگہ واؤ کا وہ تلفظ ادا ہونا چاہیئے جو اس کے حرف ہونے کی صورت میں ادا ہوتا ہے۔ یعنی جو والا اور کوا میں ہے اور کوٗ میں آیا ہے۔ اس لئے اس کو اس طرح لکھنا چاہیئے۔ دیوْ

یہ اصول کہ الف۔ واؤ اور ی پر جزم نہ لگایا جائے، عربی میں نہیں چل سکتے ہیں۔ کیونکہ وہاں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ الف، واؤ اور ی موجود ہوتے ہیں لیکن پڑھنے میں نہیں آتے۔ جیسے کہ عبدالرحمٰن میں الف یا ابوالحسن میں واؤ اور الف یا ابی الحسن میں ی اور الف۔ اس لئے عربی میں یہ قاعدہ ہے کہ اگر الف، واؤ اور ی پر جزم نہ ہو تو ان کو نہ پڑھا جائے۔ مثلاً

ذُوال (ذُل) ذِیْ (ذا) لی (لا) وُاَ (عرا) (یہ طریقۂ اِملا کیوں اختیار کیا جاتا ہے اس جگہ اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں)

کشمیری میں الف، واؤ اور ی کے دونوں استعمالوں کے لئے جو قاعدہ بنایا ہے اس سے عبدالرحمٰن اور اس قسم کے عربی ناموں کے پڑھنے میں کوئی خاص دشواری نہ ہوگی۔ یہ عربی ہی کے قاعدے سے پڑھے جائیں گے۔

جب واؤ اور ی حرفِ صحیح کے طور پر استعمال ہوں تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ واؤ مجہول اور بڑی "یے" ہے۔ اس لئے نہ واؤ کے اوپر اُلٹا پیش لگایا جائے اور نہ "یے" کے نیچے۔ تلے اوپر نقطے۔ غرض یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، خط میں کم سے کم تبدیلی کی جائے اور اُردو سے اس کی مشابہت زیادہ سے زیادہ رکھی جائے تاکہ ایک خط کے جاننے والے کو دوسرا خط پڑھنے میں زیادہ سے زیادہ آسانی ہو۔

مرکب اعراب

اُردو کے بہت سے ایسے تلفظ ہیں جو مرکب اعراب سے ادا ہوتے ہیں۔ دَوڑو۔ لَو۔ بَیل۔ ہَے۔ یہ واؤ اور زبر اور بڑی یے اور زبر سے ادا ہیں۔ گَیّاں۔ لِیَا۔ چھوٹی ی اور پیش اور چھوٹی ی اور زبر سے ہیں۔ نیو چھوٹی ی اور واؤ سے اور نیولا بڑی یے اور واؤ سے ادا ہیں۔

مرکب اعراب کے ان اصولوں سے اُردو میں مفرد اعراب کا کم کام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ کم ہی لفظوں میں اسے اعراب کی ضرورت ہے۔ البتہ جب دوسری زبان کے الفاظ کو اُردو میں لکھنا ہو تو ان اصولوں کو کافی برتا جاتا ہے لیکن چونکہ اُردو والے مرکب اعرابوں کی ان شکلوں سے جو اُردو میں رائج نہیں ہیں، ناواقف ہیں۔ اس لئے ان کو ان کا صحیح تلفظ ادا کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔

اگر مرکب اعرابوں کے اصولوں کو مرتب کرکے ان سے اعراب اخذ کئے جائیں تو اُردو رسم خط کو سیکڑوں اعراب مل جائیں گے اور بعض بعض پہلوؤں آواز کی ہر ممکن لَے کو ادا کر دیں گے۔ ان اعرابوں کی مدد سے سیکڑوں بولیوں اور زبانوں کا رسم خط تیار کیا جاسکتا ہے۔ ان ہی کی مدد سے ہم کشمیری کے لئے ایک رسم خط تجویز کر رہے ہیں۔

ذیل کی جدولیں ملاحظہ ہوں۔ پہلی جدول میں دو اعراب مل کر ایک اعراب اور دوسری میں تین اعراب مل کر ایک اعراب بنیں گے۔

جدول نمبر ۱

(۱)	زبر سادہ ـَـ	زبر سادہ ـَـ
(۲)	زبر امالہ دار	زبر امالہ دار
(۳)	الف سادہ	الف سادہ ا
(۴)	الف امالہ دار	الف امالہ دار ا
(۵)	زیر خفیف	زیر خفیف
(۶)	زیر ثقیل	زیر ثقیل
(۷)	ی	ی
(۸)	ے	ے
(۹)	پیش خفیف	پیش خفیف
(۱۰)	پیش ثقیل	پیش ثقیل
(۱۱)	واؤ خفیف و	واؤ خفیف و
(۱۲)	واؤ ثقیل وٗ	واؤ ثقیل وٗ

جدول نمبر ۲

(۱)	زیر سادہ	زیر سادہ	زیر سادہ
(۲)	زیر امالہ دار	زیر امالہ دار	زیر امالہ دار
(۳)	الف سادہ	الف سادہ	الف سادہ

(۴)	الف امالہ دار	الف امالہ دار	الف امالہ دار
(۵)	زیرِ خفیف	زیرِ خفیف	زیرِ خفیف
(۶)	زیرِ ثقیل	زیرِ ثقیل	زیرِ ثقیل
(۷)	ی	ی	ی
(۸)	ے	ے	ے
(۹)	پیشِ خفیف	پیشِ خفیف	پیشِ خفیف
(۱۰)	پیشِ ثقیل	پیشِ ثقیل	پیشِ ثقیل
(۱۱)	واؤ خفیف	واؤ خفیف	واؤ خفیف
(۱۲)	واؤ ثقیل	واؤ ثقیل	واؤ ثقیل

پہلی جدول میں اعراب ملانے کے لئے یہ کیجئے کہ ایک اعراب پہلے خانہ کا لیجئے اور پھر اس کے ساتھ دوسرے خانے کے ۱۲ (اعراب بارہ) باری باری ملاتے جائیے۔ اس طرح دوہرے اعراب بارہ عدد بنیں گے۔ اس کے بعد پھر پہلے خانے کا دوسرا اعراب لیجئے اور اس کے ساتھ پھر دوسرے خانے کے بارہ اعراب ملا لیجئے۔ اس طرح پہلی جدول سے ۱۴۴ اعراب ملیں گے۔ دوسری جدول میں پہلے خانہ کا پہلا اعراب، دوسرے خانے کا پہلا اعراب لیجئے اور اس جوڑے کے ساتھ تیسرے خانے کے بارہ اعراب باری باری ملا لیجئے۔ اس طرح بارہ اعراب بنیں گے۔ اس کے بعد پہلے خانے کا تو اعراب برقرار رکھیئے لیکن دوسرے خانے کا دوسرا اعراب لے لیجئے اور پہلے جوڑے کی طرح اس کے ساتھ بھی تیسرے خانے کے باری باری بارہ اعراب ملا لیجئے۔ یہ بھی بارہ اعراب بنیں گے۔ جب دوسرے خانے کے بھی ایک ایک کرکے بارہ اعراب آ جائیں تو پہلے خانے کا دوسرا اعراب لیجئے۔ اس طرح تیسری جدول سے ۱۲ × ۱۲ × ۱۲ = ۱۷۲۸ اعراب بنیں گے۔

ان جدولوں کے بموجب اعراب کی تعداد حسب ذیل ہوگی :۔

سادہ اعراب ۱۲

دو اعرابوں سے مرکب اعراب ۱۴۴

تین اعرابوں سے مرکب اعراب ۱۷۲۸

۱۸۸۴

مرکب اعراب تین سے آگے چار اور پانچ تک بھی جا سکتے ہیں یہ بات دوسری ہے کہ ہم اردو والے ان کا تلفظ ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ مثلاً (Boy) برائے کے بعد واؤ بڑھا کر " بوایو " لکھا جا سکتا ہے۔ ہم اسے بہت مشکل سے ادا کر سکیں گے۔

ان اعرابوں کی مزید تشریح کے لئے دو ایک مثالوں کی ضرورت ہے۔ اردو میں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ نیو۔ نیوٹن۔ نیولا۔ سیو۔ ریڈیو وغیرہ ان میں حسب ذیل اعراب استعمال ہوتے ہیں :۔

ی + واؤ ثقیل

ے + واؤ خفیف

اس قسم کے اعراب کی اور شکلیں بھی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اعراب کے پہلے جزو کو خفیف کرنے کے لئے ی اور ے کی جگہ زیر یا زیرِ خفیف استعمال کیا جا سکتا ہے اور دوسرے جزو کو خفیف کرنے کے لئے پیش یا پیشِ خفیف۔ اس طرح اعراب کی سولہ شکلیں ہو سکتی ہیں :۔

ی	و
ے	وَ
زیرِ ثقیل	پیشِ ثقیل
زیرِ خفیف	پیشِ خفیف

۴ × ۴ = ۱۶ اعراب

ان سولہ شکلوں میں ایک خاص قسم کے اعراب کی ہر ممکن لہر آ جائے گی۔ کشمیری کے حسب ذیل الفاظ اسی قسم کے اعراب سے ادا ہوں گے :۔

ہیوٹھ (میٹھا) کریوٹھ (مشکل)

دیور (پھولوں کا رس)

یہ طے کرنا کشمیری کے ماہروں کا کام ہے کہ مذکورہ سولہ اعراب میں سے کون سی شکل اس قسم کے الفاظ کے لئے موزوں ہوگی۔

اردو میں گوالا لکھتے ہیں۔ اس کا صحیح تلفظ یہ ہے کہ گوا کو ایک جزو بنا کر پڑھا جائے۔ اس اعراب کی شکل یہ ہے :۔

و + ا

اس میں بھی واؤ کو خفیف کرنے کے لئے پیش اور الف کو خفیف کرنے کے لئے زبر استعمال کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے اعراب کی اتنی شکلیں ممکن ہیں۔

واؤ مجہول	الف سادہ
واؤ معروف	الف امالہ دار

پیشِ ثقیل   زبر سادہ

پیشِ خفیف   زبر امالہ دار

۴×۴ = ۱۶ شکلیں

اس جگہ ایک اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر مثلاً زبر اور پیش کو ایک ساتھ کسی حرف پر دینا ہو تو یہ کیسے ظاہر کیا جائے کہ پہلے کون ہے اور بعد کو کون۔

قرآن پاک کے طریقہ کتابت میں فاصل شوشوں کا استعمال کیا جاتا ہے جیسے نرمک۔ میکئل۔ بنجوالسمم۔ بائید۔ ماؤلسمم (یہ طریقہ کتابت کیوں اختیار کیا جاتا ہے یہاں اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں) اس طریقہ کو اگر اپنا لیا جائے تو یہ مشکل آسان ہو جائے گی۔

وہ یُوں کہ جس حرف میں دو حرکتیں لگانا ہوں اس کے آگے ایک فاصل شوشہ دے دیا جائے۔ پہلی حرکت اس حرف پر لگائی جائے اور دوسری فاصل شوشے پر۔ کشمیری میں طلا یعنی سونا کے لئے جو لفظ ہے وہ س اور ن سے اس طرح مرکب ہے کہ سین سے پہلے پیش اور پھر زبر آتا ہے نُون ساکن اسے اس طرح لکھا جائے گا:۔ سُـَنْ

پہلے سین لکھ کر اس پر پیش دے دیا گیا۔ پھر فاصل شوشہ بنا کر اس پہ زبر۔ اس کے بعد نُون اور اس پہ جزم۔ اس طرح لفظ کا صحیح تلفظ ادا ہو جائے گا۔

فاصل شوشے کی علامت سے ایک فائدہ ہوگا کہ فاصل شوشہ اس بات کی نشان دہی کرے گا کہ اس جگہ مرکب اعراب ہے۔ اس وجہ سے بہت سی جگہوں پر بلا اعراب لگائے کام بن جائے۔

اعراب کی بھی ایسی شکلیں بنائی جاسکتی ہیں کہ فاصل شوشے کا کام ان سے لیا جائے۔ لیکن عملی لحاظ سے وہ چیز اتنی مفید نہ ہوگی جتنی فاصل شوشہ۔

ایک ہی اعراب دو یا تین بار

جس طرح ی + و اور ـــ + و اور و + ا آسکتے ہیں۔ اسی طرح ـَ + ـَ اور ـِ + ـِ اور ـُ + ـُ بھی آسکتے ہیں۔ ان کی آواز وہ نہیں ہوگی جو ا اور ی اور و کی ہوتی ہے۔ گانے والے جَل۔ دِل اور بُلبُل کو جب کھینچتے ہیں تو وہاں جَل سے جال، دِل سے دیل اور بُلبُل سے بول بول نہیں ہو جاتا ہے۔ کھینچنے کے باوجود زبر زبر ہی رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے خط کو چاہے جتنا بڑھاؤ، [illegible] نہیں بنتا، خط ہی رہتا ہے۔ ایسی کھینچی ہوئی آواز کو صرف دو اور تین زبروں سے ادا کیا جاسکتا ہے جو حرف کے آگے ایک یا دو خالی شوشوں پر بنائے جائیں گے۔

دو زیر اور دو زبر کی طرح دو واؤ، دو یے اور دو الف بھی ادا ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح واؤ کے بعد پیش، ی کے بعد زیر اور الف کے بعد زبر بھی آسکتا ہے۔ ان اعرابوں کو ہمارا حلق اور تالو نہیں ادا کرسکتا ہے۔ لیکن اگر وہ کہیں کسی زبان میں ادا کئے جاتے ہوں تو اُردو رسم خط میں ان کو اسی طریقہ سے لکھا جائے گا۔

پنجاب کے لوگ اقبال اور اس قسم کے الفاظ جب ادا کرتے ہیں تو الف سے پہلے ایک لہر آجاتی ہے۔ اس لہر کو یُوں لکھا جاسکتا ہے کہ ب پر حسب ذیل اعراب لگایا جائے:۔ ـَــَ + ا

کتابت کا طریقہ یہ ہوگا کہ بے پر زبر لگا دیا جائے۔ اقبَال

یہ بات ملحوظ رہے کہ ایک حرف پر دو مختلف قسم کی حرکتیں اور دو ایک ہی قسم کی حرکتیں، ان کے ادا کرنے میں فرق ہوگا۔ مختلف قسم کی حرکتیں تو بلا کسی پھیلاؤ کے ایک مفرد اعراب کی طرح ادا کی جائیں گی۔ جیسے مُبنِل۔ مِنُد وغیرہ۔ لیکن اگر ایک قسم کی دو حرکتیں اس طرح ادا کی گئیں تو ان کے دو ہونے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس شکل میں دو ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو اس طرح ادا کیا جائے کہ جو آواز ہو اسے دُوگن کر دیا جائے۔ جیسے ترَ (سردی)

مرکب اعراب اور دیوناگری

دیوناگری جہاں تک اعراب کا تعلق ہے، بہت اچھا رسم خط ہے۔ اس میں ہر لفظ کے ساتھ اس کا اعراب شامل رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا تلفظ کبھی غلط نہیں ہوسکتا ہے۔ دوسرے وہاں ہر آواز کے لئے مفرد اعراب ہیں۔ اُردو میں تَو اور تَے کو مفرد اعرابوں سے نہیں لکھا جاسکتا ہے۔ لیکن دیوناگری میں [illegible] اور [illegible] کرکے لکھا جاسکتا ہے۔ اس رسم خط میں اگر کچھ نقص ہے تو یہ کہ زیرِ خفیف اور زیرِ ثقیل اور زبرِ صغیر کے لئے ایک ہی علامت ہے۔ پیشِ خفیف بھی ہندی میں نہیں ہے۔ لیکن ان علامتوں کے نہ ہونے سے تلفظ میں کوئی بڑی رُکاوٹ نہیں پڑتی ہے۔

دُشواری اُس وقت پڑے گی جب دیوناگری سے مرکب اعراب بنانے کی کوشش کی جائے۔ ایسی صورت میں دیوناگری کو اتنا بدل دینا پڑے گا کہ ایک ہندی پڑھنے والا اس نئے رسم خط کو بلا محنت سے سیکھے ہوئے نہ پڑھ سکے گا۔

ہندی میں جزم نہیں ہے۔ وہاں   کا نشان ہے۔ لیکن وہ صرف خاص خاص جگہوں پر لگایا جاتا ہے۔ جزم کے نہ ہونے کی وجہ سے ہندی میں ہمہ اور ہم ایک ہی طرح سے لکھے جاتے ہیں۔ کَل۔ ڈَم۔ دِل جب لکھے جاتے ہیں تو وہ دراصل کَلْ۔ ڈَمْ اور دِلْ ہوتے ہیں۔

دیوناگری میں اگر طلبہ لکھا جائے تو اُسے طلبا بسکون با بھی پڑھا جا سکتا ہے اور بفتح با بھی۔ اس طرح چھپکلی کو چھ پَ کَ لی بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

وہ زبانیں جہاں جزم کو خاص اہمیت حاصل ہے وہاں دیوناگری رسم خط بلا تبدیلی کے کام نہیں دے سکتا ہے۔ لیکن یہ تبدیلی معمولی قسم کی ہوگی۔

اصل دُشواری مرکب اعراب بنانے میں پڑے گی۔ وہ یُوں کہ دیوناگری میں ہر حرف پہ زبر تسلیم کر لیا جاتا ہے اور زبر پہ ہی زیر اور پیش اور دوسرے اعراب لگائے جاتے ہیں۔ اس طرح اس کا ہر متحرک حرف دراصل دو اعراب کا حامل ہوتا ہے۔ جن میں سے پہلے کو پڑھا نہیں جاتا ہے۔ اس حالت میں اگر اس رسم خط میں مرکب اعراب رائج کئے جائیں تو حروف کو بُنیادی خصوصیت یعنی ان کے بازبر ہونے کو بدلنا پڑے گا۔ اس سے اس کے ڈھانچے میں بہت بڑی تبدیلی آجائے گی۔

ابتدا بہ سکون

عربی صرف میں یہ بُنیادی اصول مان لیا گیا ہے کہ کسی لفظ کی ابتدا بہ سکون یعنی جزم سے نہیں ہو سکتی ہے۔ اصولی لحاظ سے یہ ٹھیک بھی ہے۔ حرف کی قدرتی بناوٹ ایسی ہونا چاہیئے کہ وہ ہر قسم کے اعراب کو یکساں طور پر قبول کر سکے۔ اگر اس پہ کوئی حرکت تسلیم کر لی گئی تو وہ اس قسم کی حرکت کو دوسری حرکتوں کے مقابل زیادہ قبول کر سکے گا اور اس سے اِملا غلط ہو جائے گا۔

لیکن عملی طور پہ ابتدا بہ سکون ہوتی ہے۔ انگریزی لفظ سکول اور ہندی لفظ گرام میں پہلا حرف ساکن سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے لفظ میں سین اور دوسرے میں گاف ہیں تو متحرک۔ ورنہ وہ ادا کیسے ہوتے۔ لیکن ان کی حرکت اتنی خفی ہوتی ہے کہ یہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ زیر ہے یا زبر یا پیش۔

اُردو میں ایسے الفاظ موجود ہیں جن میں ابتدا بہ سکون ہوتی ہے۔ جیسے کیا، کیوں۔ میاں وغیرہ

"کیا کیا خضر نے سکندر سے!

اس میں پہلے دونوں لفظوں کا اِملا ایک ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے لفظ ہی کا کاف ساکن ہے۔ دوسرے لفظ کے کاف کے نیچے زیر ہے۔

"جس کو ہو دین و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں

کیوں میں کاف ساکن ہے!

میاں کے دو تلفظ ہیں۔ ایک میں جو طنزیہ ہے میم ساکن رہتی ہے۔

· ابتدا بہ سکون اور مرکب اعراب کو استعمال کر کے

اُردو میں انگریزی الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً SKY کو سکائی لکھا جائے تو اس کا صحیح تلفظ آجائے گا۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس قسم کے الفاظ اُردو میں نہیں ہیں۔ اس وجہ سے یہ تلفظ نامانُوس ہے۔

کشمیری میں بہت سے الفاظ سکون سے ادا ہوتے ہیں۔ ان کا اِملا یُوں ہی ہوگا کہ پہلے حرف پر جزم دے دیا جائے گا۔

جیسے ښْتھر (کپاس) گْرائے (لہر)

ابتدا بہ تشدید

کشمیری میں بعض الفاظ اس طرح ادا ہوتے ہیں کہ پہلے حرف پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس طرح کہ حرف گویا دُوگنا ہو جاتا ہے۔ جیسے گَٹْ

مذکورہ قاعدے یعنی ابتدا بہ سکون کی رُو سے اس کی وضاحت یُوں کی جا سکتی ہے کہ یہاں دو گاف ہیں۔ پہلا ساکن دوسرا متحرک۔ اس وجہ سے دونوں مِل کر ادا ہوتے ہیں۔

اس لئے ایسے لفظ کے لکھنے کی صورت یہ ہو سکتی ہے

گْگَٹْ (گھونٹ)

اس کا خلاصہ یُوں ہو سکتا ہے :- گّٹْ

جب ایک ہی حرف دوبار اس طرح آتا ہے کہ پہلا ساکن اور دوسرا متحرک ہو تو وہاں دونوں کو ایک کر کے اُوپر تشدید دے دی جاتی ہے۔ یہی صورت یہاں بھی ہے اس لئے اس جگہ تشدید دے دینا کافی ہوگا۔

اس طرح کا ایک لفظ ہے :- ڈّژک (جونک)

کشمیری کا خاص مسئلہ اور مرکب اعراب

کشمیری الفاظ کو اگر تجزیہ کے خوگر کانوں سے بار بار سُنا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس زبان کے اعراب زیادہ تر ہلکے قسم کے مرکب اعراب ہیں۔ مثلاً لفظ ٹھوک کو

کشمیری نے اپنایا تو اس کا اعراب جو واؤ معروف تھا، بدل کر (ـُـ و ـَـ) ہوگیا۔ کشمیری کے بہت سے الفاظ ہیں جن کا اعراب یہی ہے جیسے۔ ژُپھ۔ ششُن۔ وُنٹھ۔ وُسپھ۔ گُپھ۔

کشمیری کو جتنے بھی مرکب اعراب کی ضرورت ہو وہ سب مذکورہ قاعدوں کو برت کر صحیح تلفظ کے ساتھ لکھے جاسکتے ہیں۔ اگر کوئی اُلجھن پڑسکتی تو صرف اُسی وقت جب لفظ کے اعراب کا صحیح تجزیہ نہ کیا۔ لَنڈ اور لِچھ کے تجزیہ میں شروع میں غلطی ہوگئی تھی۔ میں اس کے زیر کو سمجھ نہیں پاتا تھا۔ اس وجہ سے اعراب کے قاعدوں میں بعض باتوں کا اضافہ کرنا پڑا تھا۔ لیکن کہنہ میں جہاں یہ اعراب نوُن کی وجہ سے بہت واضح ہوگیا ہے وہاں سمجھ میں آیا کہ یہ امالہ دار زبر سے شروع ہوکر زیر پر ختم ہوتا ہے۔ اس دریافت سے مذکورہ اضافوں کو خارج کردیا گیا۔

کشمیری میں الفاظ کے تلفظ میں کافی اختلاف ہے۔ مثلاً لَنڈ میں کہیں خفیف زیر بولا جاتا ہے تو کہیں ثقیل۔ یہ طے کرنا کشمیریوں کا کام ہے کہ تحریر میں مستند تلفظ کیا رکھا جائے گا۔ مذکورہ اعرابی جدولوں کی مدد سے ہر قسم کے خفیف و ثقیل تلفظ لکھے جاسکتے ہیں۔ اس لئے یہ رسم خط اس کام میں کسی درجہ پر بھی تنگ دامن ثابت نہ ہوگا۔

اعراب کا تجزیہ کرنے کے لئے یہ طریقہ کار مناسب ہوگا کہ جو اعراب مفرد اعراب سے ادا نہ ہوسکے اسے سمجھ لیا جائے کہ وہ مرکب ہے اور پھر تلاش کیا جائے کہ اس کا پہلا جزو کیا ہے، دوسرا کیا ہے اور اگر تب بھی کچھ رہ جاتا ہے تو تیسرا جزو تلاش کیا جائے۔

مرکب اعراب کا بدل

کشمیری کے اعراب کا مسئلہ یوں بھی حل ہوسکتا ہے کہ ہر قسم کے مرکب اعراب کے لئے ایک علامت مقرر کرلی جائے۔ مثلاً ششُن کے اعراب کے لئے ایک الگ علامت ہو اور وہ ٹھیل کے لئے الگ۔ ترُ کے لئے الگ ہو اور لَنڈ کے لئے اور۔ اگر یہ راہ اختیار کی گئی تو اعراب کی تعداد بہت بڑھ جائے گی جن کا یاد رکھنا اور برتنا وقت طلب ہوگا۔ اور پھر کشمیری کا رشتہ اُردو خط سے قریب قریب کٹ جائے گا۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ مرکب اعراب استعمال کئے جائیں۔

حروف

ان اعرابی تبدیلیوں کے ساتھ اُردو کے تمام حروف فارسی کے ڈ کے اضافے کے ساتھ کشمیری میں استعمال کئے جائیں۔ کشمیری میں بہت سے عربی کے حروف مثلاً ق، ص، ذ وغیرہ نہیں آتے ہیں۔ لیکن ان کو برقرار رکھنا مناسب ہوگا۔ کیونکہ کشمیری ناموں میں وہ حروف آتے ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیری میں فارسی کے اور عربی کے الفاظ بھی آتے رہتے ہیں۔

کشمیری کو بظاہر کسی نئے حرف کی ضرورت نہیں۔ لیکن اب جو اعراب لفظوں کی شکل اور آواز کو متعین کردیں تو ہوسکتا ہے کہ کسی حرف کی ضرورت محسوس ہو۔ اگر ایسا ہوا تو قریب ترین آواز کے حرف پر ایک نقطہ بڑھا کر ایک نیا حرف بنالیا جائے گا۔

کشمیری پرائمریں

حروف کی ترتیب میں صرف اتنا فرق کیا جائے کہ سادے الف کے بعد امالہ دار الف، واؤ کے بعد کلغی دار واؤ اور ہ کے بعد زیر حرفی کا اضافہ کردیا جائے۔ باقی اعراب کو اعراب کے طور پر مشقوں میں بتلایا جائے۔

مفرد اعرابوں کی الگ الگ تختی بنانے کی ضرورت ہوگی۔ لیکن مرکب اعرابوں کو چند ایسی تختیوں میں بتلادینا کافی ہوگا جن سے یہ اندازہ ہوجائے کہ مختلف اعراب کس طرح مل کر ایک اعراب کی طرح کام دیتے ہیں۔ اُردو پرائمروں میں بھی اس طرح مرکب اعراب سکھائے جائیں

لکھنے میں آسان

جن علامتوں کا کشمیری میں اضافہ کیا گیا ہے وہ نستعلیق کے قلم سے بھی اس خوبصورتی سے ادا ہوسکتے ہیں۔ جس طرح نسخ کے قلم سے۔ اور وہ ان کی عبارتوں میں کھپ سکتے ہیں۔ ان کی ایجاد میں قلم کی کشش کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے۔

اُردو رسم خط ایک طرح کا شارٹ ہینڈ ہے جس کے لکھنے اور پڑھنے میں بہت کم وقت صرف ہوتا ہے۔ لیکن دوسری زبانوں والے اعتراض کرتے ہیں کہ زیر، زبر نہ ہونے کی وجہ سے اس کا پڑھنا مشکل ہے۔ یہ اعتراض اس حد تک صحیح ہے کہ جو چیزیں اچھی اُردو جاننے والوں کے لئے لکھی جاتی ہیں، ان کو معمولی اُردو جاننے والے نہیں پڑھ سکتے ہیں اور جس لفظ کو جو شخص نہ جانتا ہو، اس کا صحیح

تلفظ بلا کسی سے پوچھے یا لغت میں دیکھے ادا نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن یہ بات انگریزی، فرانسیسی اور دوسری زبانوں میں بھی ہے۔ جہاں کہ اعراب لفظ میں شامل ہوتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ عام الفاظ مثلاً وُہ، ہم، تُم وغیرہ بھی جہاں آئیں وہاں ان پر اس ڈر سے اعراب ضرور لگائے جائیں کہ کہیں وہ غلط نہ پڑھ لئے جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عبارت میں اسّی نوّے فیصدی الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن پر اس معیار کی عبارت پڑھنے والوں کے لئے اعراب کی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف ایسے الفاظ پر اعراب لگانا ضروری ہوتا ہے کہ جو کبھی کبھی آتے ہوں یا جن کا تلفظ مشکوک ہو یا غیر زبان کے ہوں یا کوئی اور پیچیدگی ہو۔

کشمیری لکھنے میں بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر لفظ پر اعراب لگایا جائے۔ اس میں بھی بہت سے لفظ ایسے ہی ہوں گے جو بہت رائج ہیں اور جن کے بارے میں کوئی اشتباہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ خالی شوشے اور زیر حرفی بھی الفاظ کی صحت کی کسی حد تک ضمانت کرتے ہیں۔ اعراب صرف اس جگہ لگانا ہوگا جہاں اشتباہ کا اندیشہ ہو۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ کشمیری کی ایک ڈکشنری مرتب ہو جائے جس میں ان الفاظ کا صحیح تلفظ دے دیا جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ گرامر بنا کے اس کے مشتقات کو مرتب کیا جائے۔

اُردو کے مقابلہ میں کشمیری کے مجوزہ خط میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہے صرف ایک امالہ دار الف اور ایک ہائے مخفی مائل بہ زیر اور لکھنے میں فاضل شوشے کا اضافہ کیا گیا ہے۔ باقی سب اعراب وہی ہیں جو اُردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ کشمیری کے لہجے کی ضروریات محسوس کر کے خاص قسم کے زیر، زبر اور پیش کو سایہ دار بنا دیا گیا ہے۔

یہ رسم خط نسخ اور نستعلیق دونوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب نسخ کو اس لئے بہت پسند کیا جاتا تھا کہ اس میں ٹائپ کو استعمال کیا جا سکتا ہے اور ٹائپ کے استعمال کے بعد طباعت کی وہ سب آسانیاں حاصل ہو جاتی ہیں جو انگریزی کو حاصل ہیں۔ یعنی تصویریں چھاپنا اور ہزاروں اور لاکھوں کے ایڈیشن ایک ساتھ نکالنا۔ لیکن اب آفسیٹ کی ایجاد سے ٹائپ والی سب آسانیاں نستعلیق کو بھی حاصل ہو گئی ہیں۔ اس لئے اب نسخ کی طرف جھکنے کی [illegible] کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔

جو شخص اعلیٰ طباعت کے لئے اتنا خرچ سکتا ہے کہ ٹائپ میں اپنی کتاب چھپوائے، وہ اتنے ہی داموں میں آفسیٹ کی طباعت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے [illegible] اور نہ آفسیٹ سے۔ ایسے شخص اور ایسے اداروں کے لئے رائج لیتھو بہت غنیمت چیز ہے۔ اس میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور سستی سے سستی طباعت ممکن ہے۔ کاغذ بھی کم خرچ ہوتا ہے۔

اس بحث پر میں "ہماری زبان" میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ تکرار کی ضرورت نہیں۔

پڑھنے کی کُنجی

اس رسم خط کو فوری طور پر برتنے کی صورت یہ ہوگی کہ جس رسالے یا اخبار یا کتاب میں ایسے استعمال کیا جائے۔ اس میں بطور فٹ نوٹ کے اس کی علامتوں کی مِثالیں اس طرح دے دی جائیں جیسے انگریزی ڈکشنری میں تلفظ کی وضاحت کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ مثلاً چیمبرس ڈکشنری میں ہر آمنے سامنے کے صفحوں پر ذیل کے الفاظ لکھے رہتے ہیں:- fate, far, me, her, mine,

Them, mate, mute, moon,

کشمیری رسم خط کے لئے حسب ذیل اعراب کی مثالوں کی ضرورت ہوگی:-

(۱) بارہ مفرد اعراب (۲) زیر حرفی

(۳) مرکب اعراب اور فاضل شوشے

آخر الذکر کو تین چار مثالوں سے سمجھانا ہوگا مثلاً "سُتَن - مِیکَد - تُرَی - لَبَٹ"۔ اس طرح سولہ سترہ مثالوں سے سب اعراب واضح ہو جائیں گے اور جو شخص ان کو سمجھ لے گا، چاہے وہ کشمیری جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ اگر اُردو رسم خط سے واقف ہے تو کشمیری الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ لے گا۔

مِثالیں

ان نظریاتی وضاحتوں کے بعد اب ہم مثالوں سے دکھلائیں گے کہ ان اعراب کی مدد سے کیسے کشمیری الفاظ صحیح تلفظ کے ساتھ لکھے جا سکتے ہیں:-

(۱) زبر سادہ:- نَل - کَل - اَز (آج)

بَر (دروازہ)

وَچھ (سینہ)

گرہ گیا

وَر بل دینا

(۲) زبر امالہ دار تہا ۔ احمد سَگ جَکل

گَگ چولا

دَر سُرخ مرچ کی ٹکیا

بَس چورا

رَ گھر

لَٹ دُم

مَچہ مکھی

(۳) الف سادہ جال ۔ سال گام گاؤں

چار جلدی

(۴) الف امالہ دار لار کھیرا

چار گوگلی

جب ذیل کا مصرعہ بھیرویں میں گاتے ہیں تو جاگ اور مسافر کے الف کو امالہ کے ساتھ ادا کرتے ہیں :۔

"اُٹھ جاگ مسافر بھور بھئی اب رین کہاں جو سووت ہے۔"

(۵) زیر سادہ دِل ۔ بِکا چِل سیخ

وِز ساعت

گِل ایک پرندہ

تِم وُہ (جمع)

یِم یہ (جمع)

(۶) زیر خفیف محلی ۔ چھِل چھِلا ۔ ٹِل مٹکنا

پِل زمین کا ٹکڑا

وِیار پیسہ

بِہنز بہن

اَبِز

ٹِل چاق و چوبند رہنا

پِل ٹکڑا

(۷) ی چیز ۔ چیل وِہر بید کا درخت

چِیر دبانا

(۸) ے ریل ۔ شیر گیر گھیرا

ہیر سیڑھی

ژیر دیر ہو جانا

(۹) پیشِ ثقیل دُم ۔ مُدّت وُل سوراخ

کُزُل کاجل

رُم دراز

ہُم وُہ (جمع)

ہُم ایک قسم کی ترکاری

(۱۰) پیشِ خفیف مرغے ۔ دُہ گُل پگھل گیا

گُہن گہرا

کُھٹ کھوٹا

وُزُل سُرخ

وُکھُل ادکھلی

ٹُبھ ڈھلوان

(۱۱) واؤ خفیف (مجہول) موم ۔ کوٹ تروٹ نقصان

اوم ادھ پکا

گور گرو

تور وہاں

چور ہلکا

بور بوجھ

(۱۲) واؤ ثقیل چوہا ۔ دُور مؤد مرگیا

وؤنٹ اُونٹ

گؤر دودھ والا

ٹؤر ایک قسم کا ہاتھی

لؤر ڈنڈا

ٹؤر گھونسا

غزل

سلام اے حسرتِ نشیمن، قفس کا بھی آسرا نہیں ہے !
چمن سے اُڑ جاؤں بن کے خوشبُو، یہ بے وفائی روا نہیں ہے

لئے ہوں کونین دِل کے اندر، مرے مقدّر میں کیا نہیں ہے
خفا نہ ہو وقت کے خُداؤ، مِری کوئی التجا نہیں ہے

خبر رہائی کی مِل چکی ہے، چراغ پھولوں کے جل رہے ہیں
مگر بڑی تیز روشنی ہے، قفس کا در سُوجھتا نہیں ہے

مِرا مزاجِ جنون بہاروں کے معجزوں کا نہیں ہے قائل
نگاہِ فن کار نے ابھی تک کوئی گریبان سِیا نہیں ہے

ستم کے بانی تِرے مظالم میں اور اللہ برکتیں دے
ابھی مِرا امتحان لئے جا ابھی یہ دِل کربلا نہیں ہے

سوادِ غم مُسکرا رہا ہے اُمید کی جھوٹی روشنی پر
فریبِ رنگ سحر نہ کھانا ابھی سویرا ہُوا نہیں ہے

بہشت آدم نہیں ہے دُنیا کرم محبّت کے مجرموں پر
فریب دینا خطا ہے لیکن، فریب کھانا خطا نہیں ہے

یہاں کے جھگڑوں سے تو نپٹ لو فلک کے تارے بھی توڑ لانا
نئے جہاں کی تلاش کیوں ہے تمہاری دُنیا میں کیا نہیں ہے

یہ عالمِ ممکنات صدقے، تمام نظمِ حیات صدقے
ان آنکھوں پر کائنات صدقے، تِرے اِشاروں میں کیا نہیں ہے

نہ پاس تازگیٔ شبنم، بہارِ جوشِ نمو ٹھہر جا
جمی ہے اس پر نگاہِ گُلچیں، جو پھول ابھی تک کھِلا نہیں ہے

زہے دِل آویزیٔ تکلّف نہ کیوں ہو حشرِ سکوت برپا
سراجؔ لب بندِ مدعا ہم وہ حالِ دِل پُوچھتا نہیں ہے

شمیم احمد شمیم

"ست سنگر" کی ثقافتی اہمیت

"ست سنگر" کا یہ جائزہ دراصل بہت پہلے شائع ہو جانا چاہیئے تھا، لیکن میری مصروفیات اور تساہل پسندی نے مل کر اس کی اشاعت کو ٹالے رکھا۔ آج سے تقریباً آٹھ ماہ پہلے کی بات ہے کہ اختر نے "ست سنگر" کی ایک کاپی نذر کرتے ہوئے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس پر کچھ لکھوں۔ میں نے "ست سنگر" کی بیشتر کہانیاں اختر کی زبانی سُنی تھیں۔ مجھے یہ کہانیاں بے حد پسند تھیں اور پھر اختر پہلے کشمیری افسانہ نگار ہیں جنہوں نے کشمیری کہانیوں کا ایک مجموعہ چھاپنے کی جراُت رندانہ کی۔ اس لئے اس مجموعے کی ادبی اہمیت اور اس کے فنی محاسن پر کچھ نہ کچھ لکھنا میں ایک اہم فریضہ سمجھتا تھا۔ میں نے اختر سے وعدہ کیا کہ میں لکھوں گا اور ضرور لکھوں گا۔ اس کے بعد آج تک یہ وعدہ ایفا نہ ہو سکا!

اس دَوران میں "ست سنگر" کو ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے سال ۱۹۵۸ء میں کشمیری زبان کی بہترین کتاب قرار دے کر اختر محی الدین کو پانچ ہزار روپے کا انعام بھی دیا گیا۔ جن دنوں انعام کا اعلان ہوا، میں بمبئی میں تھا۔ انعام کے اعلان کی خبر سُنتے ہی میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ پہلی بار ساہتیہ اکاڈمی نے کشمیری زبان اور کشمیری ادیبوں کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اس سے قبل ماسٹر جی کے مجموعۂ کلام "سُمرن" کو بھی سالانہ ایوارڈ مِل چکا ہے، لیکن "سُمرن" اور "ست سنگر" پر دیئے گئے ایوارڈوں میں ایک بُنیادی فرق ہے۔ "سُمرن" کا ایوارڈ ماسٹر جی کی بزرگی اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف تھا، اس کے انتخاب میں "سُمرن" سے زیادہ ماسٹر جی کی شخصیت کا احترام ملحوظِ خاطر رکھا گیا تھا۔ لیکن "ست سنگر" کشمیری زبان اور ادب کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو نظر انداز کر کے ساہتیہ اکاڈمی اپنے وقار کو مشکوک کر دیتی اور جس کو منتخب کر کے ساہتیہ اکاڈمی نے کشمیری ادیبوں کا اعتماد حاصل کر لیا۔

بمبئی سے واپس آتے ہوئے جموں میں اختر محی الدین سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اُسے مبارک باد دی تو اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا کہ "اب مجھے تمہاری تنقید کی ضرورت نہیں ہے، میرے فن کو جانچنے والے ایک تم ہی نہیں ہو، اسے ہندوستان کے بہترین ناقدوں نے جانچ کر منتخب قرار دیا ہے۔" اختر کے لہجے میں آج التجا نہیں تھی، اعتماد تھا ــــ اور مجھے محسوس ہوا کہ "ست سنگر" کے تنقیدی مطالعے کی ضرورت اب پہلے سے کہیں زیادہ ہے!

کشمیری ادب کا بیشتر ہی نہیں بلکہ تمام تر سرمایہ شعر و شاعری پر مشتمل ہے لل دید کے دَور سے ۱۹۴۷ء تک کشمیری نثر کا تصور مشرقی شاعری کے محبوب کی کمر کی طرح ناپید تھا۔ کشمیری زبان میں دیگر زبانوں کے جو قصے کہانیاں ترجمہ ہوئے وہ بھی منظوم ہیں اور کشمیری ادب میں فن کار کا تصور صرف شاعر تک محدود تھا، شاعری کے علاوہ ادب کی اور بھی کئی اصناف ہیں۔ اس سے لوگ ناآشنا نہیں تھے۔ لیکن نامانوس ضرور تھے۔ کشمیری زبان کو بول چال کی ایک ایسی زبان سمجھا جاتا تھا جس میں یا تو روزمرہ کی گفتگو ہو سکتی ہے یا شاعری ہو سکتی ہے۔ مستند رسم الخط کی عدم موجودگی نے اس خیال کو تقویت پہنچائی کیونکہ نثر کے لئے رسم الخط کی جو اہمیت اور ضرورت ہے، شاعری کے لئے وہ نہیں ہے اور پھر جس صنفِ سخن کی کوئی تاریخ ہی نہ ہو، کوئی روایات یا کوئی اسلوب ہی موجود نہ ہو، اس میدان میں طبع آزمائی کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیری زبان کو نثر کے "خطرناک تجربے" کے لائق نہیں سمجھا گیا اور اس طرح زبان و ادب کا یہ صحرا صحرا ہی رہا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہماری ادبی تحریک ایک ہنگامہ خیز دَور میں داخل ہوئی۔ تو کچھ اہم تاریخی تقاضے ہمارے سامنے آئے۔ روایت سے بغاوت کا سلسلہ دراصل تحریکِ آزادی کے ساتھ ہی شروع ہوا تھا۔ لیکن

۱۹۴۷ء کے ہنگامے نے ضبط و توازن، ہمواری اور میانہ روی کی اصلاحی قدروں کو انقلابی تصورات سے بدل دیا۔ ہمارے سامنے سب سے اہم تاریخی تقاضا یہ تھا کہ ہم اپنی زبان کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کر کے اپنی آواز زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں۔ دشمن سری نگر سے چند میل کے فاصلے پر تھا اور بحث مباحثے کے لئے وقت نہیں تھا۔ ایک کلچرل فرنٹ قائم ہوا۔ اور ڈرامے، رقص و موسیقی اور شعر و شاعری کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ کشمیری شاعروں نے مہجور اور آزاد کی آواز سے آواز ملا کر انقلابی نغمے اور جنگی ترانے گائے۔ ان کے ہاں سکون کی جگہ اضطراب تھا اور ضبط و توازن کی جگہ ایک ہنگامی کیفیت تھی۔ کشمیری ادب کی تاریخ میں پیداوار کے لحاظ سے یہ دَور انتہائی زرخیز ہے۔ لیکن اس زرخیز ترین دَور میں بھی کشمیری نثر کے لئے کوئی لگن پیدا نہ ہو سکی۔ حالانکہ کشمیری نثر کی اہمیت اور ضرورت کا احساس سبھی کو تھا۔ ہنگامہ ختم ہوا، ہنگامی کیفیت بھی جاتی رہی۔ سیلاب کے گذر جانے کے بعد اب ان تقاضوں کا تجزیہ ہونے لگا جو اس سیلاب سے پیدا ہو گئے ہیں، فن کاروں کی ایک متحدہ انجمن کی ضرورت محسوس کی گئی اور کلچرل کانفرنس کا وجود عمل میں آیا۔ اختر ان دنوں اُردو میں لکھ رہا تھا اور اُردو کے نہایت معمولی رسالوں میں لکھ کر اپنا مقام بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اختر کو پہلی مرتبہ کلچرل کانفرنس کے ایک اجلاس میں اپنی ایک کہانی سناتے ہوئے دیکھا تھا، اس کے ناگوار تلفظ اور اوسط درجے کی زبان کے باوجود میں کہانی سے متاثر ہوا تھا۔ میں نے کہانی پر تنقید کی اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا کچھ کہا تھا۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۵۳ء کے اوائل کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد "ملاپ" دہلی کے تحت اُردو کی کہانیوں کا ایک مقابلہ ہوا۔ اور اختر کو اس کی کہانی "پونڈرِ رچ" پر تین سو (۳۰۰) روپے کا پہلا انعام ملا۔ ان ہی دنوں ایک رَو چلی اُردو کے بیشتر لکھنے والوں نے کشمیری میں لکھنا شروع کیا اور اختر نے ایک بار مجھ سے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ میں نے بھی کشمیری زبان میں لکھنا شروع کیا ہے۔

مجھے حیرت ہوئی اور میں نے پوچھا کہ تم شاعر کب سے ہو گئے!

اختر نے کہا۔ "نہیں میں کشمیری میں کہانیاں لکھوں گا۔" میں نے اختر کے اس بیان کو ایک مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔

اور پھر کلچرل کانفرنس کے ایک اجلاس میں اختر نے اپنی کشمیری کہانی "موند وزُن" سنائی۔ یہ اس کی پہلی کشمیری کہانی تھی یا دوسری، تیسری، یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن جدید افسانے کی ٹیکنیک کے اعتبار سے یہ ایک مکمل افسانہ تھا۔ ان ہی دنوں کشمیری زبان کے کچھ اور قلم کاروں نے بھی کشمیری افسانہ کی طرف توجہ دی۔ ماہنامہ "کونگ پوش" میں سوم ناتھ زتشی، نور محمد روشن اور دینا ناتھ نادم نے کہانیاں لکھیں۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف نادم کی کہانی "ستینہ پیتو پیتو" ہے جو ان کی پہلی اور آخری کہانی ہے۔ اس کے بعد وہ خود کہانی بن گئے!

اختر وہ پہلا کشمیری ادیب ہے جس نے کشمیری افسانہ کو ایک سنجیدہ صنف کے طور پر استعمال کیا۔ اور مسلسل افسانے لکھے۔ "ست سنگر" اس کی اس مسلسل کاوش، لگن اور اس اُپج کی پیداوار ہے جو اس کے فن کی اساس بھی ہے اور اس کے مستقبل کی ضمانت بھی! اختر کی شخصیت اور اس کے فن کو صحیح طور جانچنے کے لئے اس پس منظر سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔ اختر نے عین اُس وقت اُردو میں لکھنا ترک کر دیا جب کہ وہ آل انڈیا مقابلے میں اپنی کہانی پر انعام پا چکا تھا۔ اس کی کہانیاں اُردو کے بیشتر رسائل میں چھپ چکی تھیں اور وہ خراماں خراماں آگے بڑھا جا رہا تھا!

اس منزل پر پہنچ کر اُردو میں لکھنا ترک کر کے کشمیری زبان میں لکھنے کا فیصلہ بظاہر کوئی دانش مندانہ فیصلہ معلوم نہیں ہوتا تھا اور کم از کم میں نے یوں ہی محسوس کیا تھا۔ خاص طور پر جب کہ کشمیری نثر کی کوئی روایت نہیں تھی۔ اور اس کا مستقبل نہایت مبہم اور غیر واضح تھا۔ مستند رسم الخط کی عدم موجودگی میں کشمیری نثر کا سنجیدہ تجربہ ہر لحاظ سے ایک adventure تھا اور پھر کشمیری پڑھنے والوں کی تعداد ہی کیا تھی؟ تعلیم یافتہ طبقہ تو کشمیری زبان کو قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھتا تھا اور پھر کشمیری نثر کا تصور تو ان کے لئے انتہائی ناگوار تھا، کم از کم "تعلیم یافتہ" دوست ایسے بھی تھے جو کشمیری رسم الخط سے آشنا ہونے کو گنوار پن کی نشانی سمجھتے تھے۔ ان حالات میں اُردو دنیا کی وسعتوں سے باہر آ کر کشمیری زبان کی

تنگن نے میں قدم رکھنا کوئی نفع بخش سودا نہیں تھا۔ لیکن اختر نے ان تمام خطرات اور اندیشوں کے باوجود کشمیری میں افسانہ لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کا یہ فیصلہ اضطراری نہیں تھا۔ اس نے ان تاریخی تقاضوں کو محسوس کیا تھا جو نئے شعور اور نئے سماجی حالات نے پیدا کر دئے تھے۔ نیا دَور کچھ نئے مسائل لے کر آیا تھا۔ ان سے نپٹنے اور انہیں سلجھانے کے لئے ایک نئے ذہنی شعور کی ضرورت تھی۔ یہ نیا شعور پیدا ہو رہا تھا، لیکن اس کی تربیت اور تہذیب کے لئے ایک نئے زاوئیہ نگاہ کی ضرورت تھی اور یہ زاوئیہ نگاہ صرف ادیب پیدا کر سکتا تھا۔ فکر کو فن کے پیمانے میں ڈھالنے کے لئے اختر کو ایک ایسے قالب کی ضرورت تھی جو شدّتِ تاثیر کو کم کرنے کی بجائے اسے اور تیز کر دے اور اس کے لئے مادری زبان سے بہتر کوئی اور ذریعہ اظہار نہیں ہو سکتا تھا ــــ اختر کو اپنی زبان کی کم مائگی اور تنگ دامنی کا احساس تھا، لیکن اس کے دامن کو وسیع کرنے کی لگن بھی تھی۔ اختر کا فیصلہ ایک تاریخی فیصلہ تھا۔ اور اس تاریخی فیصلے نے کشمیری زبان و ادب کو ایک نئی صنف ہی نہیں دی بلکہ یہاں سے ہماری زبان میں نثر کی تاریخ اور روایات کا آغاز بھی ہوتا ہے۔

اختر کی کہانیوں میں جس دلچسپی کا اظہار کیا گیا، اس سے نہ صرف خود اختر کی حوصلہ افزائی ہوئی، بلکہ اس نے ایک پوری پود کو کشمیری افسانہ کی طرف راغب کر دیا۔ ہمارے ہاں آج کل کشمیری افسانہ نگاروں کی کثرت اس بات کا ثبوت ہے کہ کشمیری افسانے سے متعلق جو اندیشے لاحق تھے وہ دُور ہو گئے ہیں اور کشمیری افسانہ اب تجرباتی منزل سے گذر کر ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ امین کامل، صوفی غلام محمد، اُمیش کول، علی محمد لون اور سوم ناتھ زتشی نے کشمیری افسانے کے سرمایے میں بیش بہا اضافے کئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ جب کبھی ان فن کاروں کی تخلیقات کتابی شکل میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئیں گی تو کشمیری ادب کی کم مائگی اور تنگ دامنی کا احساس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مِٹ جائے گا۔ اختر نے کشمیری زبان اور ادب کو جو وسعتیں عطا کی ہیں وہ کشمیر کی علمی، ادبی اور ثقافتی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہوں گی، لیکن خود کشمیری زبان نے بھی اختر کو بہت کچھ دیا ہے۔

"ست سنگر" سات مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۵۵ء کے اوائل میں شائع ہوا ہے۔ اس میں چھ کہانیاں تو طبع زاد ہیں اور ایک کہانی "ششتہ داژ" موپساں کی کہانی (A piece of string) سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ آغاز میں اختر نے ان الفاظ میں اپنا نظریۂ فن پیش کیا ہے:۔

"عظیم فن وہ ہے جس میں زندگی کے دل کی دھڑکنیں ہوں اور جس کے ہونٹوں پر معصوم شیر خوار بچے کی مسکراہٹ ہو۔ اور جس فن میں یہ دو چیزیں نہ ہوں وہ مُردہ بے جان اور بے اثر ہوتا ہے۔"

اور اس کے بعد اپنے پڑھنے والوں سے پورے اعتماد کے ساتھ کہا ہے "میرا فن اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیجئے۔ اگر اس پہ پورا نہیں اترتا تو اسے جلا ڈالئے۔ میری پوری پوری اجازت ہے۔"

اختر نے اپنے فن کو پرکھنے کے لئے جو معیار مقرر کئے ہیں وہ اتنے تشنہ، نامکمل، غیر واضح اور مبہم ہیں کہ اختر تو کیا، کسی بھی فن کار کو اس کسوٹی پر پرکھ کر اس کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ عظیم فن کے لئے اختر کے ہاں سب سے مقدّم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زندگی کے دل کی دھڑکنیں ہوں۔ یہ بیان اس قدر تشنہ اور نامکمل ہے کہ اس کو بنیاد بنا کر کوئی نتیجہ اخذ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہر فن پارہ چونکہ "زندگی" کی پیداوار ہوتا ہے اس لئے اس میں زندگی کے دل کی دھڑکنوں کا شامل ہونا فطری بات ہے۔ زندگی سے الگ ہو کر نہ فن کار خود زندہ رہ سکتا ہے اور نہ فن کی تخلیق کر سکتا ہے۔ ان لوگوں کے فن میں بھی جو فن برائے فن کے نظریے کے قائل ہیں، زندگی کے دل کی دھڑکنیں شامل ہوتی ہیں۔ اسی لئے ادب کی عظمت کا اندازہ صرف اس امر سے نہیں ہو سکتا کہ اس میں زندگی کی دھڑکنیں ہیں یا نہیں بلکہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ایک فن پارے میں فن کار کا زندگی سے متعلق نظریہ کیا ہے؟ اور ان نظریات کو پرکھنے کے لئے ہمیں خود تنگ نظر نہیں ہونا چاہیئے۔ ادب میں سارا فساد اسی تنگ نظری کی پیداوار ہے۔ اختر نے عظیم فن کے لئے ایک اور خصوصیت یہ قرار دی ہے کہ اس کے ہونٹوں پر معصوم شیر خوار بچے کی مسکراہٹ ہو ــــ" یہ تعریف بڑی مبہم، غیر واضح اور نامکمل ہے۔ غالباً اختر کا مقصد ادب میں دیانت، خلوص اور سادگی کے عناصر پر زور دینا ہے۔ خود اختر کے فن میں مجھے ان خصوصیات نے بے حد متاثر کیا ہے۔

اختر کی کہانیوں کا کینوس بہت مختصر ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں اپنی معاشرت کی بڑی عمدہ تصویریں پیش کرتا ہے۔ ان کے موضوعات میں زیادہ تنوع نہیں۔ لیکن اس زندگی میں بھی تو کوئی تنوع نہیں، جس کو وہ پیش کرتے ہیں۔ یہ زندگی آج صدیوں سے ایک ہی ڈھرے پر چلی آئی ہے، اس میں کوئی غیر معمولی یا قابلِ ذکر تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ یہاں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں ہوتی۔ یُوں محسوس ہوتا ہے کہ باہر کی دُنیا کا کوئی ہنگامہ اس پر اثر انداز نہیں ہوا۔ یہاں زندگی کے مسائل آج بھی وہی ہیں جو آج صدیوں سے پہلے تھے۔ اخلاق، شرافت اور انسانیت کی وہی قدریں ہیں جو آباؤ اجداد سے چلی آ رہی ہیں۔ ان لوگوں میں نہ کوئی بڑی تبدیلی پیدا کرنے کا حوصلہ ہے اور نہ کسی بہت بڑی تبدیلی کو تسلیم کرنے کی جرأت۔ انہیں اس بات کا یقین سا ہو گیا ہے کہ موجودہ نظامِ زندگی مستقل اور پائدار ہے اور اس میں کوئی بڑی تبدیلی پیدا کرنا سعیٔ لاحاصل ہے۔ اسی لئے جب کبھی یہ کسی بہت بڑی تبدیلی سے دوچار ہوتے ہیں تو اس پر اعتماد کرنے کی بجائے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ صدیوں کی غلامی، مجبوری اور لاچاری نے ان کی شکلیں مسخ کر دی ہیں۔ ان سے ان کا اعتماد اور عزم چھین لیا ہے۔ یہ اپنی اس ذلّت پر قانع دکھائی دیتے ہیں جو ان کے آباؤ اجداد سے ان کو ورثے میں ملی ہے۔ اختر نے بڑے خلوص اور سچائی سے اس معاشرے کی تصویر پیش کر دی ہے۔ اس نے یہ دُنیا کسی فلسفی یا ماہرِ نفسیات کی آنکھ سے نہیں دیکھی۔ وہ خود اس ماحول میں رہا ہے اور آج بھی اسی ماحول میں سانس لے رہا ہے۔ اس کے شعور نے کوڑے کرکٹ کے ان ہی ڈھیروں میں پرورش پائی ہے جو آج بھی اس کے اِردگرد تاحدِ نظر پھیلے ہوئے ہیں۔ افلاس، مجبوری اور ذلّت کے اسی اندھیارے میں اختر نے آنکھیں کھولیں اور اسی فضا میں اختر نے جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھا۔ جہاں اختر جیسے سینکڑوں بچے جنم لیتے ہیں اور جوان ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی انسانیت اور اپنی صلاحیتوں کو کھو دیتے ہیں۔ اختر کا فن اس ذلیل معاشرے سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا [illegible] انسانیت کا وہ چراغ روشن کرتا ہے جو تعفن اور [illegible] میں ہمیں کھوئی ہوئی انسانیت، مسخ شدہ چہروں اور [illegible] روحوں کو تلاش کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ اس کے لہجے میں کہیں تلخی نہیں آتی ہے۔ وہ زندگی کے اس جابرانہ نظام اور استحصال کے وحشیانہ چکر پر خود بھی ہنستا ہے اور ہمیں بھی ہنساتا ہے۔ لیکن اس کی ہنسی میں خود اذیتی یا [illegible] Cynic نہیں بلکہ اُمید کا ننھا سا چراغ روشن نظر آتا ہے۔ وہ ہنستا اس لئے ہے کہ اس میں ابھی تک اپنی مصیبتوں پر ہنسنے کا حوصلہ باقی ہے اور یہی ایک چیز اسے اپنے ماحول سے ممتاز کرتی ہے۔

" دند وڑن " اختر کی بہترین کہانیوں میں سے ہے۔ یہ نچلے طبقے کی معاشرت کی ایک صحیح تصویر ہے اور پھر اس تصویر میں اختر نے مختلف رنگوں کے امتزاج سے جو گہرائی اور شدّت پیدا کی ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ اقتصادی بدحالی اور معاشی غلامی نے اس طبقے کے لوگوں کو ان قدروں سے محروم کر دیا ہے جو متوسط طبقے کے لوگوں کو عزیز ہوتی ہیں۔ شرافت، ننگ و ناموس، غیرت اور اس نوع کی تمام اصطلاحیں ان کے ہاں ذہنی تعیش سے منسوب کی جاتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو نہ ان سے وابستہ سمجھتے ہیں اور نہ ان کا محافظ۔ گالی گلوچ، مار دھاڑ، چوری کے ہنگامے ان کے ہاں روزمرہ کا معمول ہے۔ میاں بیوی کو مارتا ہے تو بیوی غیرت اور شرافت کے نام پر خاموش رہ کر سب کچھ نہیں سہہ لیتی۔ وہ میاں کو گالیاں دے دے کر محلے کو جمع کرتی ہے۔ وہ جسمانی لحاظ سے کمزور سہی لیکن اس کی زبان پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ وہ محلے کے سبھی لوگوں کے سامنے اپنے میاں کو گالیاں اور بد دُعائیں دیتی ہے۔ میاں بیوی کے سسرال والوں کو کوسنے لگتا ہے تو بیوی اپنا حملہ تیز تر کر دیتی ہے۔ وہ مار کھائے جاتی ہے لیکن اپنی زبان بند نہیں کرتی۔ محلے کے کچھ لوگ بیچ بچاؤ کرتے ہیں اور یہ ہنگامہ کچھ مدہم پڑ جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج برکیست چمار کو تنخواہ ملی تھی اور اس نے اپنی لڑکی کے لئے کپڑے نہیں لائے تھے۔ اس پر چمارن نے ہنگامہ بپا کیا۔ اور برکیست چمار نے غصّے میں آ کر اس کو پیٹنا شروع کر دیا۔ آخر ۲۵ روپوں میں وہ کیا کیا خرید لاتا۔ اسی میں سے تو پچھلے مہینے کا قرضہ بھی چکانا تھا۔ اس نے محلے والوں کو تو مطمئن کر دیا۔ لیکن چمارن کو وہ مطمئن نہ کر سکا۔ اس کے بعد ایک اور ہنگامہ بپا ہوتا ہے۔ برکیست چمار کی نگاہ چولھے پر پڑی تو چولھا خالی نظر آیا۔ اس نے آج بڑی مدّت کے بعد دو روپے کے پائے لائے تھے اور اس کی بیوی نے یہ بڑے ارمانوں سے پکائے تھے، مار پیٹ کے اس ہنگامے میں غلہ چولھے پر سے

ہانڈی بچا لے اُڑا ۔۔۔ چمار اور چمارن اپنی لڑائی بھول گئے اور فلّو چمار کے پیچھے دوڑے۔ مگر بے سود! فلّو چمار تو چھپا رہا، لیکن اس کی ماں جھوٹی قسمیں کھاتی رہی۔ رات کو برکیست چمار چمارن کے زخموں پر ہلدی لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ گھر میں لڑائی جھگڑا اچھا نہیں ہوتا اور چمارن فلّو بدمعاش کو بددعائیں دے کر برکیست کے صدقے ہوتے جا رہی تھی۔ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، یہ قریب قریب روز کا معمول ہے۔ معاشی بدحالی نے انہیں وحشی بنا دیا ہے۔ انسانی عظمت (Human dignity) کا تصور یہاں ناپید ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات میں بھی وہ تقدس نظر نہیں آتا جو اوسط درجے کے گھرانوں میں اس سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ معاشی پستی سے پیدا شدہ تضادات نے انسانی صورتوں کو مسخ کر دیا ہے۔ "دند دوزخ" میں اختر نے بڑی چابکدستی سے ان تضادات اور پیچیدگیوں کو پیش کیا ہے۔ جس نے اس سماجی ڈھانچے کو انسان کے لئے ایک ایسا ناقابل برداشت بوجھ بنا دیا ہے کہ اس میں رہتے رہتے انسان کی کمر دہری ہو گئی ہے۔ اس کی نگاہیں مستقبل کے اُفق سے ہٹ کر زمانۂ حال کے دھندلکے میں کھو گئی ہیں۔ اور یہاں سے وہ اپنے لئے کوئی راہِ فرار نہیں پاتا۔ اختر کو روزمرہ کی زبان پر جو قدرت حاصل ہے وہ اس کے کسی ہم عصر کو نصیب نہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں واقعات سے زیادہ مکالموں سے فضا پیدا کرتا ہے۔ یہی اس کا حسن بھی ہے اور یہی اس کی کمزوری بھی۔ اس کی کہانیوں میں مکالمے اتنے برجستہ، برمحل اور فطری ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کوئی کہانی پڑھنے کی بجائے خود اس گفتگو میں شریک ہے۔ "دند دوزخ" میں زبان پر اختر کی یہ قدرت اپنے پورے عروج پر ہے۔ اس کے ہاں تصنع یا آورد کا شائبہ بھی نہیں۔ برکیست چمار جب اپنے پچیس روپوں کا حساب دیتا ہے تو وہ اپنے طبقے کی ساری معاشرت کی تصویر پیش کرتا ہے۔ وہ اُن شیطانوں کا ذکر بھی کرتا ہے جو اپنا قرضہ وصول کرنے میں بڑے سخت گیر ہوتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس کی توجیہہ بھی کرتا ہے۔ وہ اُن فرشتوں کا بھی ذکر کرتا ہے جو دو چار گالیاں دے کر تسکین حاصل کر لیتے ہیں اور قرضے کی وصولی ملتوی کر دیتے ہیں۔ اس کہانی میں کوئی سنسنی خیز واقعہ نہیں ہے۔ کوئی ایسا Climax بھی نہیں، جو ہم کو چونکا دے۔ فلّو بدمعاش کا ہانڈی چرانا بھی ہمیں نہیں چونکاتا۔ لیکن اس کے

تعمیر

باوجود ہمارے ذہن میں اس معاشرے کو تبدیل کرنے کا ایک احساس پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں ان لوگوں سے نفرت کی بجائے ان کے دکھوں سے ہمدردی ہو جاتی ہے ۔۔ انسانیت ان کے ہاں مسخ ہو گئی ہے، ختم نہیں ہو گئی ہے۔ برکیست چمار اور اس کی چمارن گالی گلوچ اور مار پیٹ کے بعد بھی ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں ۔ یہ انسانیت کا وہ ٹمٹماتا چراغ ہے جس کی طرف اختر نے اشارہ کیا ہے۔

"ست سنگر" کی دوسری اہم اور قابلِ ذکر کہانی "دریا پہ ہُند ایزار" ہے یہ ایک نفسیاتی مطالعہ ہے۔ نبر شالہ اور خوتن دید اس مطالعے کے دو کردار ہیں۔ نبر شالہ کی عمر ستر (۷۰) سال سے زیادہ ہے اور خوتن دید کے منہ میں صرف ایک دانت ہے۔ ایک سرخ شلوار، جو ان کی شادی کے ایام کی یادگار ہے، دیکھ کر خوتن دید کے دل میں ایک عجیب سا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے شرمانے لگتی ہے اور اس کے ذہن میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اُسے اپنی جوانی کے دن یاد آتے ہیں اور اُسے نبر شالہ ایک دولہے کی طرح جوان دکھائی دیتا ہے اور اپنا وجود ایک نئی نویلی دلہن محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس دوران میں نبر شالہ کی نظر بھی سرخ شلوار پر پڑتی ہے اور وہ خوتن دید سے اصرار کرتا ہے کہ وہ سرخ شلوار پہن لے۔ کافی حیل و حجت کے بعد خوتن دید شلوار پہن لیتی ہے ۔۔ اختر نے اس کیفیت کو بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ جوانی کی منزلوں سے بہت دُور جا کر بھی کبھی کبھی انسان اپنی عمرِ رفتہ کو آواز دینا چاہتا ہے۔ وہ اپنے بڑھاپے کے کھنڈروں میں کبھی کبھی ان چنگاریوں کی تلاش کرنے لگتا ہے جو جوانی کے خاکستر میں دب کر بجھ چکی ہوں۔ بڑھاپے میں انسان کو مشکل سے یقین آتا ہو گا کہ وہ کبھی اُن راہوں سے بھی گذرا ہے جو اس کے پیچھے ایک لا متناہی سلسلے کی طرح پھیلی ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں ان راہوں پر سے گذرنے کی ہوس بیدار ہوتی رہتی ہے۔ اسی لئے کبھی کبھی انسان اپنے نقشِ پا دیکھ کر مچل جاتا ہے اور عمرِ رفتہ کو آواز دینے لگتا ہے۔ ایک سرخ شلوار نے نبر شالہ اور خوتن دید کے دل میں جو تلاطم اور ہنگامہ پیدا کیا وہ کوئی غیر فطری اور ناقابل توجیہہ کیفیت نہیں بلکہ بڑھاپے کے دلکش دوران سے جوانی کے [illegible] نظارہ ہے۔ یہ ذہنی تعیش نہیں بلکہ دو ہم سفروں کی نگاہِ واپسیں ہے۔ لیکن اختر نے اس کیفیت کو پھیلا کر تاثر کی شدت کو کم کر دیا ہے اور فنی نقطۂ نگاہ سے یہ

اُس کہانی کی بہت بڑی خامی ہے! یہ پھیلاؤ اس وقت شروع ہوتا ہے جب نبرّشالہ اور خوتن دید بہ یک وقت اور مشترک طور اس کیفیت میں شریک ہوتے ہیں۔ خوتن دید کے دِل میں اُس وقت یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے مرحوم بیٹوں کے پُرانے کپڑے دیکھ کر کہتی ہے — "گندر ہیّوَیے زوّان آسیم، پچھ کشس آدم تہر اوسکھ گژھان۔" (اتنے تومند، بیٹے کیسے پیدا ہو کر انہیں کون سا قہر کھا جاتا تھا!) خوتن دید کی چھاتیوں میں ایک سرسراہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی سوئی ہوئی مامتا کروٹ لینے لگتی ہے، جو زخم وقت کے مرہم سے مندمل ہو چکے تھے ان میں ایک ٹیس سی اُٹھنے لگتی ہے اور عین اس وقت اُس کی نظر سُرخ شلوار پر پڑتی ہے۔ اس پس منظر میں خوتن دید کے دِل میں وہ عجیب و غریب کیفیت پیدا ہونا، جو اس کہانی کی اساس ہے۔ ممکن ہے لیکن Convincing نہیں۔ خوتن دید کے دِل میں یہ کیفیت پیدا ہونے کے بعد نبرّشالہ بھی اس میں شریک ہے۔ وہ خوتن دید سے اصرار کرتا ہے کہ وہ سُرخ شلوار پہن لے۔ یہاں سے یہ کہانی ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت آگے بڑھتی ہے۔ اس میں وہ فطری ارتقاء نہیں جو اسے ایک شاہکار بنا دیتا۔ نبرّشالہ کافی اصرار کرتا ہے۔ خوتن دید نہیں مانتی۔ وہ شرما جاتی ہے۔ اس کے بعد نبرّشالہ بازار جاتا ہے وہاں سے گوشت لاتا ہے۔ اس سارے وقفے کے دَوران میں بھی خوتن دید شلوار نہیں پہنتی۔ واپس آکر نبرّشالہ پھر اصرار کرتا ہے اور خوتن دید کو شلوار پہننا پڑتا ہے۔ یہ سارا وقفہ اس نفسیاتی کیفیت یا تاثر کی شدت کو کم کرتا ہے جو اس کہانی کی بُنیاد ہے۔ اگر خوتن دید اس نامعلوم کیفیت کے تحت شلوار پہن لیتی اور پھر اتفاقاً نبرّشالہ کی اس پر نظر پڑتی تو یہ خوش گوار حادثہ ایک بہترین نفسیاتی مطالعہ بن سکتا تھا۔ لیکن اختر نے دونوں کو بیک وقت اس کیفیت میں شریک کر کے اسے ان کے لئے ایک Adventure بنا دیا ہے۔ شلوار پہننے کے بعد خوتن دید کے جذبات کا جو مرقع اختر نے پیش کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ کہانی کی تمام کمزوریوں کے باوجود خوتن دید نے آخر پر کہانی کو بچا لیا ہے اور یہ اختر سے زیادہ خود خوتن دید کا کارنامہ ہے۔

میں نے کچھ تفصیل کے ساتھ "دند وزّن" اور "دریایہ ہُند ایزار" کا ذکر کیا ہے کیونکہ میں "ستاسنگر" میں ان ہی دو کہانیوں کو قابلِ ذکر سمجھتا ہوں — باقی کہانیاں موضوع اور فن کے اعتبار سے اوسط درجے کی کہانیاں ہیں۔ "چھوٗنا سپدان" اور "میہ تہ ژوگ نہ کنہہ!" سماجی طنز کی مثالیں ہیں، لیکن فنی لحاظ سے بہت کمزور ہیں۔ "چھوٗنا سپدان" منٹو کے "نیا قانون" کی صدائے بازگشت ہے۔ لیکن اس میں طنز کے تیکھے پن کی بجائے ایک عجیب بوکھلاہٹ پیدا ہو گئی ہے۔ یہاں اختر کے فن نے نہیں بلکہ اس کے شعور نے ٹھوکر کھائی ہے، وہ زندگی کی گردش کو اِمروز و فردا سے ناپتا ہے، وہ اِنقلاب کا تجزیہ تاریخ کی روشنی میں نہیں بلکہ انفرادی واقعات کے آئینے میں کرتا ہے۔ اس کے ہاں انقلاب کی قدر و قیمت کا تعیّن تاریخی قوتوں سے زیادہ اخلاقی معیاروں پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک فن کار اخلاقی قدروں سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک عظیم انقلاب کے Impact کو سمجھنے کے لئے اخلاقی قدروں سے زیادہ تاریخی شعور کی ضرورت ہوتی ہے اور "چھوٗنا سپدان" میں تاریخی شعور سے زیادہ ایک سطحی داخلیت کی کارفرمائی ہے۔ اس کہانی میں گہرے طنز کے امکانات موجود تھے، لیکن طنز کا جو وار اوچھا پڑ جاتا ہے وہ خود فن کار کو زخمی کرتا ہے۔ "چھوٗنا سپدان" کے طنز میں وہ گہرائی، شدت اور تیکھا پن پیدا نہیں ہو سکا ہے جو پڑھنے والے کو سوچنے کی ترغیب دے۔

اسی طرح "میہ تہ ژوگ نہ کنہہ!" بھی طنز سے زیادہ ایک چٹکلہ ہو کر رہ گئی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اختر نے اچھی خاصی کہانیوں کو چٹکلہ بنا دیا ہے۔ وہ مزاح اور طنز میں فرق نہیں کر سکتا اور مزاح پیدا کرنے کے لئے وہ واقعات سے زیادہ زبان کا سہارا لیتا ہے۔ اسی لئے اس کی کسی کہانی میں طنز پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ وہ ساری محنت روزمرے کے استعمال پر کرتا ہے۔ اس کی کہانیوں کا طلسم زیادہ تر اس کی زبان سے قائم رہتا ہے۔ اس کی کہانیوں میں کرداروں کو ثانوی حیثیت حاصل ہے اور وہ ہر کہانی میں پہلے اپنے وجود کو منواتا ہے۔ اُسے اپنے پڑھنے والوں کی ذہانت اور ان کے قوّتِ فیصلہ پر اعتماد نہیں۔ وہ انہیں ہر بات سمجھانا چاہتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے پڑھنے والے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔

"زلہ" اور "کچھوہ" تیسرے درجے کی معمولی کہانیاں ہیں۔ "زلہ" میں ایک نہایت ہی فرسودہ سماجی مسئلے کو ایک فرسودہ ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ فنی لحاظ سے بھی اس میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں۔ "کچھوہ" ایک نعرہ ہے۔

جس میں امنِ عالم کے لئے اپیل کی گئی ہے۔ یہ کہانی سے زیادہ ترقی پسند ادیبوں کا ادبی مینی فیسٹو ہے۔ اگر "کچھوہ" "ست سنگر" میں شامل نہ ہوتی تو "ست سنگر" کی ادبی عظمت کم ہونے کی بجائے اور بلند ہوتی!

"ستلِہ داؤ" موپساں کی کہانی سے ماخوذ ہے۔ اس کو کشمیری ماحول پر منطبق کرنے کی کوشش بجائے خود قابلِ تعریف ہے، لیکن یہ کوشش زیادہ کامیاب نہیں رہی ہے۔ کیونکہ موپساں کے دَور اور آج کے کشمیر میں جو فاصلہ ہے اُسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور نتیجہ کے طور پر کہانی ٹیکنیک کے اعتبار سے مکمل ہونے کے باوجود کمزور ہو گئی ہے۔ کہانی کی فضا اور اس کا ماحول اس کے کرداروں سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتا۔

مجموعی حیثیت سے اپنی تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود "ست سنگر" ایک ایسا عظیم تہذیبی کارنامہ ہے جسے ہماری ثقافتی تحریک میں ہمیشہ ایک نمایاں مقام حاصل رہے گا۔ میں نے اس کی ادبی اہمیت سے زیادہ اس کے تہذیبی پہلو پر زور دیا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ادبی حیثیت سے اس کے مقام کا تعین کرنا اس مرحلے پر دشوار ہے جب کہ ابھی تک ہمارے پیش نظر صرف یہی ایک مجموعہ ہے۔

رحمان راہی

غزل (کشمیری)

دِلُک وُجارہ یوتامت نہ لول کرِہ آباد
نہ چون زُونہِ کھسُن سۆچہ نہ میُون شارِ وُنُن

مُدا تہِ معنہِ چھُہ کیاہ زندگی مہ سُن تفظن
پِلو یہِ پیالہ ہمُس کُن مہِ شیُورسازنُن

پھیبیوُ نہ کنہ تہِ زمانس تُفنگ تہِ تیر گرُتھ
بدأ کتھاہ چھہ دِلاہ کأنسہ مُہند بدست انُن

چھُہ از تہِ حدِ نظر میُون سُوی شریف شباہ
دِلس قریب رٹُن نالہ دِل قرار پنُن

ہل کتھاہ چھےَ نہ اِنسانہ سُند ضمیر پرُن
یہِ گو گُلالہ وُچھِت ہیرِہ بوّن آلاو بنُن

نہ دُور ہیۆتہ چھےَ مشان کل نہ بڑ وَنہہ یکچہ تہ سکھان
یہِ زندگی چھےَ عجیبی ژھرِین کتھن چھہ سنُن

خبر ژِہ لو بتہِ مُقاماہ چھُہ تیۆتہ تہِ عشقس منز
وفا یژھان چھُہ ہوس گوژھہ نہ نابکار زنُن

اگر نہ از ژِہ دِکھیں دُرِہ ژلی غزل بوزتھ
فریب میانِ یہِ دۆدھہ کوٗل تماشہ میُون کھنُن

غالب

ذیل میں پروفیسر کول کی وہ تقریر درج کی جاتی ہے جو اُنہوں نے انجمن ترقی اُردو کشمیر کے زیرِ اہتمام منعقدشدہ "یومِ غالب" کے موقعے پر خطبۂ صدارت کے طور پر نذرِ سامعین کی تھی :-

آپ نے قابل قدر مقالے سُنے۔ ان سب صاحبان کا میں آپ کی طرف سے، اپنی طرف سے اور تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان مقالوں کے بعد ایک ایسے شخص کے لئے جو اُردو زبان کے لب ولہجہ سے بھی (تذکیر و تانیث کا کہنا ہی نہیں) ناواقف ہو، غالب جیسے ممتاز شاعر کے کلام پر کچھ کہنا واجبی جرأت کی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ آپ نے مجھے اس ادبی مجلس کا صدر چُنا۔ میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔ مگر آپ کی یہ ذرہ نوازی مجھے سے بھی مجھے کسی ایسی غلطی یا خوش فہمی کا شکار نہیں ہونے دے گی کہ میں اس عزت افزائی کا مستحق تھا۔ البتہ میں نے غالب کو تعظیم اور غور و فکر کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی کہ جُوں جُوں میں پڑھتا گیا اُس کے کلام کے نئے زاویے نئے نقطے اور نئے معنی مجھ پر آشکارا ہوتے رہے۔

کسی ممتاز شاعر کے کلام کی یہ ایک یقینی پہچان ہے کہ آپ اُس کے کلام کو کئی بار شوق سے پڑھ سکتے ہیں۔ بیسویں دفعہ پڑھنے پر آپ پر وہ کیفیت طاری ہوجائے جو اُنیسویں دفعہ پڑھنے سے نہیں ہوئی تھی۔

دوسری بات یہ کہ غالب کا کلام غور و فکر سے پڑھنا لازم ہے۔ یہ ایسا کلام نہیں کہ "who runs may read" جو دوڑے وہ پڑھے اور سمجھے۔ غالب کے بہت سارے ایسے اشعار ہیں جو دیکھنے میں تو ایسے سیدھے سادے ہیں کہ آدمی پڑھتا ہے اور "سبحان اللہ کیا شعر ہے" جیسے کہ اُس نے ان اشعار کو مکمل طور پر سمجھا ہے۔ یعنی اُس کے دِل میں یہ گمان بھی نہیں گذرتا کہ ان اشعار میں اور بھی کچھ ہے "موت کا ایک دِن معیّن ہے، نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔" موت کا دِن مقرر ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی نہیں بلکہ محاورے کی رُو سے بھی۔ مگر موت کی رات تو معیّن نہیں۔ ایسا کوئی محاورہ نہیں۔ تو نیند رات بھر کیوں نہیں آتی۔ تو کیا صرف اس محاورے کی خاطر۔ یعنی محض الفاظ کی چالاکی۔ شاید نہیں۔ ذرا سوچئے، ہجر میں نیند نہیں آتی۔ کیفیت یہ ہے کہ موت کو مدعو کیا جاتا ہے۔ مگر موت آتی ہے جب آتی ہے۔ عاشق کے بس کی بات نہیں۔ ذرا اور بھی سوچئے۔ غالب ہے، معشوق کا آنا یقینی نہیں، وہ نہیں آئے گا۔ زندگی موت سے بدتر ہوگی، پھر بھی شکر ہے، موت کا ایک دِن معیّن ہے۔ وہ نہ آئے گا، موت تو آئے گی اور رنج و الم ختم ہوجائے گا۔

اور لیجئے — "درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہوجانا" یعنی مرجانا۔ لاعلاج مرض کی دوا موت ہے۔ بہتر، شاید یہی معنی مطلوب ہو تو کوئی حدِ ادب نہیں ہوگا اگر پڑھنے والا اس شعر میں شاعر کی "نگاہِ تیز" کا کوئی ثبوت نہ پائے۔ پھر دوسری بات — "عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا" تو ان دو مصرعوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ ذرا سوچئے تعلق ہے اور بہت گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ دردِ عشق ایک ایسا درد ہے جس کا علاج حد سے گذرنے میں ہی ہے۔ علاج بھی اور عشرت بھی جیسے قطرے کی عشرت دریا میں فنا ہوجانے میں ہے۔ جب تک عشق ان تنگ حدود میں تڑپتا ہے تب تک یہ درد اور دردِ عشق کے سوا کچھ نہیں۔ جب ان حدود کو پھاند کر لامحدود ہوجاتا ہے تب درد، درد نہیں رہتا بلکہ عشرت کی کیفیت بن جاتا ہے جیسے بحر میں موج۔ تو مطلب سخن یہ کہ غالب کو پڑھیئے، غور سے پڑھیئے، بار بار پڑھیئے۔ گنجینۂ معنی کا طلسم ہے۔ پڑھنے کی چیز ہے۔

اور بھی لیجئے — "لرزتا ہے موج مئے تیری رفتار دیکھ کر — " چلئے یہ بھی صحیح۔ مگر اس سے کیسے "ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق —"

ہاں یہ بھی کہوں، پڑھنے کی چیز اس لئے بھی ہے کہ غالب کے کلام سے پڑھنے والے کو جذباتی وسعت ہی نہیں بلکہ قلبی وسعت بھی ہوتی ہے اور دِل کا تطہر بھی

تیز تر ہو جاتی ہے"۔ "سُرمہ مفت نظر ہوں"۔ میں نے یہ غیر معمولی (شاید غیر مانوس بھی)
فقرہ "دل کی نظر" عمداً استعمال کیا۔ غالباً میں یہ کہنے میں غلطی نہیں کرتا ہوں کہ
اُردو میں عموماً طور کئی ممتاز شاعر ہیں جن کو دل کا شاعر کہا جائے — جگر کا نام نہیں
رکھتے کو کھودیں جاکے معدن کو۔" اور کئی ایسے بھی ہیں جو دماغ کے شاعر کہے
جا سکتے ہیں۔ میر دل کے شاعر تھے۔ داغ دل کی نسبت دماغ سے کام لے کر شعر کہتے
تھے۔ غالب ایک ایسے ممتاز شاعر ہیں جن کے کلام میں دونوں یعنی دل و دماغ،
احساس و نظر اور تخیل و درد کا ایک عجیب و غریب امتزاج ہے:-

(۱) ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکر ہو؟

(۲) سیماب پشت گرمیٔ آئینہ دے ہے ہم
حیراں کئے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے

(۳) نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

(۴) تنگیٔ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا!

(۵) ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

(۶) وفا کیسی، کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

(۷) پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظارِ تمنا کہیں جسے

ایسا کرنے میں اگر شاعر نے روایتی اور استعمال شدہ استعاروں اور تشبیہوں
سے بھی کام لیا ہے تو بھی بات میں کچھ ایسی بات پیدا کی ہے کہ اپنی جگہ لاجواب چیز
بن جاتی ہے ؎

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بے داد نہیں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کوہ کن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستونِ آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

غالب نے اُردو ادب — دونوں نظم و نثر کو زیر بارِ احسان رکھا ہے!
ادبی تواریخ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو غالب نے نئے رجحان کی ترجمانی کی
ہے اور نئے طرزوں کی ابتدا بھی۔ اس کی دو صورتیں ہیں:-

(۱) وہ اثر جو غالب کے خطوط سے اُردو نثر پر پڑا۔ اُس نے روزمرہ کی گفتگو کے
اندازِ بیان کو اپنایا، بہ نسبت اُس رنگین درباری زبان اور اظہار کے، جو کہ اُس وقت
کی ایک عام خصوصیت تھی۔ یہ اثر اُس کے خطوط سے ہی نہیں بلکہ بہت سارے اشعار
سے بھی پڑا۔ ابتدائی کلام کے بعد جب کہ وہ بیدل کے اثر سے کچھ الگ ہونے لگا، اُن
کے مشکل اور مہمل شعر کہنے کا دور ختم ہو گیا تو اُس کے کلام میں سادگی، صراحت اور
شگفتگی آنے لگی۔ مثلاً

(۱) لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
(۲) لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
(۳) راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائیں کیوں؟
(۴) ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
(۵) نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو بہار تو ہے!
(۶) نہیں نگار کو الفت، نہ ہو نگار تو ہے!

دوسری بات یہ کہ غالب کے کلام میں ایک عنصر ایسا بھی ہے جس کو آج کل زبان
میں تشکیک اور (Scepticism) (Introgation) استفہامیہ
انداز کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً قصیدہ نمبر ۲ کے یہ شعر:-

نقشِ مانیٔ ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسین

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

مثلِ مضمونِ وفا باد بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکین

عشق ہے ربطِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصلِ زنگارِ رُخِ آئینۂ حسنِ یقین !

دوسری مثال :-

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے ؟

یا دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اس کے ساتھ ساتھ غالب کی زندگی کے لئے تڑپ ؎

(۱) نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ !

(۲) نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا

(۳) ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے !

یا عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا

ہمیں بھولنا نہیں چاہیئے کہ جہاں یاس و غم پر غالب نے اُردو میں ایک سو پچاسی شعر کہے ہیں وہاں عشق اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک ہزار بہتر (۱۰۷۲) شعر کہے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ یاس و غم غالب کے کلام کا ایک نمایاں عنصر ہے۔ مگر یہ کہنا سچ نہیں ہے کہ اُس کا کلام مجموعی طور پر کسی فلسفۂ یاس کا آئینہ دار ہے۔ یاد رکھنے کی چیز یہ ہے کہ یاس و غم بھی زندگی کی تصویر کا ایک نمایاں رُخ ہے۔ غالب نے کہا ہے ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے !

یہاں یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ غالب کے اُردو کلام میں صرف چودہ شعر ایسے ہیں جن کو محض پند و نصائح (Didactic) کے شعر کہا جا سکتا ہے اور اُس کی کئی غزلیں ایسی ہیں جن میں خیال کا تسلسل پایا جاتا ہے جو غزل میں ضروری نہیں۔ اس نقطے سے ہم یہ بات بھی سمجھ سکتے ہیں کہ غالب نے اپنے وقت کے مروجہ معیاروں سے باہر نکلنے کی جد و جہد کی اور غزل میں ایک ایسا انداز اختیار کرنے کی کوشش کی جس میں ایک واضح احساسِ تعبیر جھلکتا ہے اور تخیل کو ایک باضابطہ انداز سے تعبیر کرنے کا سراغ ملتا ہے۔ ان خصوصیات سے نئی روشیں قائم کیں جن سے حالی سے اقبال تک اور اُن کے بعد آج تک بھی اکثر شاعر

تعبیر

متاثر ہوئے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب نے غزل جیسی تنگ ظرف صنف میں نئی رُوح پھونک دی۔

جہاں غزل کی تنگ ظرفی کا ذکر ہو وہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ غزل کی کامیاب خصوصیتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ ایک آدھ شعر کے تھوڑے ہی الفاظ میں ایک مکمل تصویر کھینچی جا سکے اور وسیع کیفیت بیان ہو سکے۔ جیسے غالب کے ؎

قفس میں مجھ سے رُوداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو ؟

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے !

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا !

شاعری کا ایک نمایاں عنصر عشق بلکہ عشقِ مجازی ہے۔ ("میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں۔ مانا کہ تیرے رُخ سے نظر کامیاب ہے") اور اُردو شاعری میں اُس کے اظہار کے جو انداز ہیں وہ سبھی غالب کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً چھیڑ خانی ؎ (یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ)

طعنہ۔ اپنے اُوپر ملامت یا معشوق پر طنز و ملامت۔ ہجر، تغافل، وصال، فراق، آہ و زاری، رقیب سے ضد وغیرہ وغیرہ۔ مگر غالب کے عشقیہ کلام میں ایک ایسی نادر خصوصیت پائی جاتی ہے جو شاذ ہے، جس کی بڑی مثالیں حافظ کا کلام، شیکسپیر کا "رومیو جیولٹ" اور جے دیو کا گیت گووند ہیں۔ یعنی جن میں اُتم درجے پہ درد اور جنون یعنی Passion and Rapture پایا جاتا ہے۔ مثلاً غالب کی غزل —

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے۔ آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

شاعر کو شاعری کے علاوہ بھی کئی ذوق ہوا کرتے ہیں اور ان کے مشاہدے اُس کی شاعری میں ضرور جگہ پاتے ہیں۔ ایسا نہ ہو تو شاعری ایک خیالی (ذہنی) اور آواز ول کا ایک مجموعہ بن کے رہ جائے۔ مگر شاعر جب شاعر کہلاتا ہے جب وہ یہ اپنے مشاہدے اور یہ اپنے تفکر شاعری میں تبدیل کر سکتا ہو۔ محض اپنے فکر یا مشاہدے کو اظہار کرنا شاعری نہیں ہوتا۔ کیونکہ شاعری محض خیال یا فکر سے ہی نہیں بنتی، اس میں الفاظ کی بلاغت اور شاعری کا خاص لب و لہجہ ہی اُسے شعر بنا دیتا ہے۔ حکمت، پند و نصائح اور سُننے سُنانے کی قدرت کے راز — یہ سب شاعری کے مواد ہو سکتے ہیں۔ مگر

ایک خطرہ تو ضرور ہے کہ شاذ و نادر ہی فلسفہ کامیاب شاعری بن جاتا ہے۔ غالب میں رجحانِ وقت کے مناسب کچھ فلسفی اور تصوّفی شعر ہیں اور اُن میں کئی کافی اچھے ہیں ؎

ع محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ع ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال

ع ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب

ع کر دئے ہیں شوق نے بند نقابِ حُسن

مگر غالب کو محض اُن کی بِنا پر کسی اور شاعر سے کم سمجھنا اس بات کا مترادف ہے کہ ہم شاعری کو فلسفہ یا حکمت کی کسوٹی پر پرکھ لیں جو صریحًا ناانصافی ہی نہیں بلکہ غلط ہے اور ظاہر ہے کہ غالب میں کوئی سیاسی یا سماجی تصوّرات نہیں ہیں کہ جیسے ؎

مثلاً الف :۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
(۲) تیرے نام پہ تلوار اُٹھائی کس نے
(۳) اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ب :۔ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
(۲) زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

غالب کے کلام میں اُوپر الف کی کوئی مثال نہیں اور ب کے طرزِ بیان کی بہت کم! غالبًا ایک آدھ جگہ گرد و نواح کے حالات کا کچھ اِشارہ ہو، تو ہو، مثلاً ——— اسے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دِل ... ... مگر نہ اُس کے کلام میں کوئی خطیبانہ حبُّ الوطنی اور نہ مِلّی سیاست کا جذبہ موجود ہے۔

اب رہی غالب کی شخصیت! مختصرًا یہ کہنے میں مجھے خوشی ہے کہ اُس کو ہزاروں آدمیوں سے تمیز کیا جاسکتا ہے۔ وہ تنگ دِلی اور کوتاہ قلبی سے آزاد تھا ؎

نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملّت کا

ع وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایماں ہے!

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
اِس قدر تنگ ہُوا دِل کہ میں زِنداں سمجھا

ہرچند سُبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

واعظ نہ خُود پیو، نہ کسی کو پِلا سکو
کیا بات ہے تمہارے شرابِ طہور کی!

بندگی میں بھی وہ آزادہ خُود بِیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہُوا

پابستگیٔ راہ و رہِ عام بہت ہیں
آزادہ رَو ہوں مسلک ہے میرا صُلحِ کُل
ہرگز کسی سے کوئی عداوت نہیں مجھے

اُس کو نہ ستائش کی تمنا تھی اور نہ صِلے کی پروا۔ اپنے ایک شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں لکھا :—

"بھئی میں تو سب بنی نوعِ انسان کو، چاہے وہ مسلمان ہو، ہندو ہو یا عیسائی، بہت پیار کرتا ہوں اور اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔"

اور غالب نے ہندوستان کی اُس شان دار روایت کو، جو ویدِ مقدّس کے قدیم زمانے سے یعنی "حق ایک ہے مگر اہلِ نظر اس کو کئی ناموں سے پکارتے ہیں۔" ایکم ست وِپرا بہُدا وَدنت) کو اپنے پیرایہ میں اظہار کیا ہے۔

ہے رنگِ لالہ و گُل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے!

(۲) دہر جُز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں

ہم بات بات میں اور ادبی تنقید میں بھی مبالغہ سے بھی کام لیتے آئے ہیں اور اب بھی ڈسٹرکٹ (District) کے شاعروں کو مہاکوی اور علامہ اور شاعر کا خطاب دیتے ہیں۔ خود غالب کے لئے بجنوری نے مبالغہ کی حد کردی۔ اس سے نہ ادب کی اور نہ شاعر کی کوئی خدمت ہوئی ہے۔ لیکن غالب پر اور اکثر شاعروں کی نسبت کچھ کہتے ہوئے مبالغہ آمیزی کا اُتنا خدشہ نہیں رہتا، کیونکہ وہ اپنے دَور کے ممتاز ترین شاعر تھے اور ہندوستانی ادب کی ایک بہت بڑی ہستی تھے۔

محفلِ ہستی تیری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار (اقبال)

کیا آزاد مرد تھا، خدا مغفرت کرے!

کمال احمد صدیقی

سرما

پھر برف گری ہے، حُسنِ کشمیر
کچھ اور بھی ہوگیا زیادہ
دیکھو تو، بہار آ رہی ہے
اوڑھے ہوئے برف کا لبادہ
سَو رنگوں کا ایک رنگ ہے برف
جاڑے کا ہے حُسن کتنا سادہ
جب برف گری تو ہو گئی ہے
آرائشِ حُسن بے ارادہ
ہے کون کمال کے سِوا، جو
موسِم سے کرے گا اِستفادہ
مُطرب سے کہو کہ چنگ و نغمہ
ساقی سے کہو کہ جام و بادہ

•

کے، این پنڈتا
لیکچرار گورنمنٹ کالج پونچھ

ہندوستان اور قدیم یونانی حملہ آور

ہندوستان کی تاریخ میں چوتھی صدی قبل مسیح کے یونانی حملہ کو توضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ مگر ایرانیوں کے اُن حملوں کی تفاصیل بہت کم بہم پہنچائی جاتی ہیں جو سکندر کے حملہ سے پہلے اُن کی طرف سے ہندوستان کے سرحدی اور سرحد سے ملحقہ علاقہ جات پر ہوئے تھے۔ اگرچہ ہندوستان کی سرزمین پر ایرانی اُس مقام تک نہ بڑھ سکے تھے جس مقام تک یونانی بڑھے۔ تاہم تقریباً دو سو سال تک ہندوستان کا شمال مغربی علاقہ ایرانیوں کی ترک تازیوں کا میدان بنا رہا۔

چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط میں شمال مشرقی ہندوستان کی مگدھ سلطنت کی توسیع و استحکام کا کام زوروں پر تھا۔ آس پاس کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اس میں مدغم کی جا رہی تھیں اور ایک عظیم سلطنت کی بنیاد ڈالی جا رہی تھی۔ مگر اُسی وقت شمال و مغرب کا علاقہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر کمزور اور خودمختار ریاستوں کو وجود دے رہا تھا۔ گو انفرادی حیثیت سے یہ ناعاقبت اندیش ریاستیں آسودہ حال تھیں۔ مگر آپس کے حسد اور باہمی ناانصافی نے انہیں اپنی سرحدوں سے دُور بیرونی طاقت ور ممالک کو مدعو کرکے ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی ترغیب دینے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔ اُس وقت ایران طاقت ور ملک تھا اور ہندوستان کے اس علاقہ کی بدانتظامی کا فائدہ پہلے ایرانیوں نے اُٹھایا اور پھر یونانیوں نے۔

چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط میں ایران میں ہخامنشی (Achaemenian) خاندان برسرِ اقتدار آیا۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ کُروش (Kurush) تھا۔ ایران میں اپنی سلطنت مستحکم کرنے کے بعد کُروش نے اپنی مملکت کی توسیع کے منصوبے باندھے۔ چنانچہ تیر

سنہ ۵۱۵ قبل مسیح کے لگ بھگ اس فرمان روائے ایران نے Gedrosia یعنی بلوچستان کے راستے ہندوستان کے سرحدی علاقوں پر چڑھائی کرنے کی غرض سے ایک مہم روانہ کی۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ خود کُروش ان فوجوں کی کمانڈ کر رہا تھا۔ اس مہم میں ایرانی عساکر نے غور بند میں آباد مشہور شہر کاپسی (Kapisa) کو تاخت و تاراج کیا۔ لیکن بتلایا جاتا ہے کہ کُروش کو وادیٔ کابل میں بڑی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی افواج ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ کو یکسر مسخر کیے بغیر لوٹ گئیں۔ تاریخ میں درج ہے کہ اس مہم میں کُروش کو سخت جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔ حتےٰ کہ اس کی بہت بڑی فوج سے صرف سات آدمی زندہ واپس گھر پہنچ گئے تھے۔ یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ کُروش کی موت اسی مہم میں ایک ہندوستانی تیرانداز کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ یہ واقعہ دُرست ہو یا غلط، اتنا ضرور ہے کہ کُروش وادیٔ کابل تک پہنچ چکا تھا بلکہ اس نے کوہ ہندوکش کے دامن میں آباد قبائیلیوں کو بھی مطیع کیا تھا۔ بہرحال کُروش نہ تو وادیٔ کابل سے ہی آگے بڑھ سکا اور نہ ہی اُس کے حملہ کا اثر وادیٔ کابل سے آگے تک پہنچ سکا۔

ہخامنشیوں (Achaemenian) کے تیسرے فرمانروا داریوش (Darayavash) نے ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں کی تسخیر میں نمایاں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ ہمارے پاس داریوش کی تسخیر اضلاع ہند کی روایت کے لئے دو ثبوت موجود ہیں۔ اوّل اس بادشاہ کے کتبے جو بیہستون (Behistan) اصطخر اور نقشِ رستم میں موجود ہیں۔ بیہستون کے کتبے میں جن ممالکِ محروسہ کا نام آیا ہے ان میں گادہار یعنی گندھار یا قندھار کا نام بھی ملتا ہے۔ اصطخر اور نقشِ رستم (Naqsh-i-Rustam) کے کتبوں میں

اُن نواحی کے ساتھ ساتھ سندھو کا نام بھی درج ہے جو شہنشاہ کے مطیع تھے۔ سندھو آج کل کی سندھ وادی کا نام ہے۔ مؤرخین نے ان کتبوں کی تاریخ اجرا ۵۱۸ سنہ اور ۵۱۵ سنہ قبل مسیح کے مابین معین کی ہے۔ داریوش نے ۵۲۲ سنہ سے لے کر ۴۸۶ سنہ قبل مسیح تک حکومت کی تھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس دَوران میں قندہار سے لے کر سندھ تک کا علاقہ ہخامنشیوں کے قبضہ میں تھا۔ چنانچہ شوشتر (Shushtar) کے کتبے میں درج ہے کہ شاہی محل کی تعمیر کے لئے ساگوان کی لکڑی قندہار سے لائی گئی تھی۔ دوسرا ثبوت یُونانی نامور مؤرخ ہیرو ڈوٹس (Herodotus) کے بیانات ہیں۔ جو مندرجہ بالا کتبوں سے حاصل کی گئی اطلاعات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ یونانی مؤرخ رقمطراز ہے کہ داریوش کی سلطنت بیس اضلاع پر مشتمل تھی۔ اور ہندوستانی مملکت اس کی سلطنت کا بیسواں ضلع تھی۔ وہ آگے چل کر تحریر کرتا ہے کہ بیسواں ہندوستانی ضلع دیگر تمام اضلاع سے کہیں زیادہ خراج سلطنت ادا کرتا ہے جو کہ تین سَو ساٹھ (۳۶۰) مثقال ریزۂ زر یعنی دس لاکھ پونڈ کی مالیت کا ہے۔ قیاس ہے کہ سونے کے ذرّات کی اتنی بڑی مقدار دریائے سندھ کے بالائی طاس سے دستیاب ہوتی ہوئی ہوگی۔ علم معدنیات کے ماہروں کا خیال ہے کہ ان دِنوں ضرور دریائے سندھ کے شمالی طاس میں زرآلود مٹی پائی جاتی ہوگی۔ ہیرو ڈوٹس نے بھی "سونا کھودنے والی چونٹیوں" کا ذکر کیا ہے۔ یہ "سونا کھودنے والی چونٹیاں" تبت کے پیشہ ور زر فروش ہو سکتے ہیں۔ جو "دردستان" (Dardistan) میں واقع سونے کی کانوں کی محافظت کرتے تھے۔ مہابھارت میں بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے۔ یُونان کے اس مورّخ نے لکھا ہے کہ ۵۱۷ سنہ قبل مسیح میں داریوش نے سکائی لیکس (Skylax) نامی یُونانی النسل سپہ سالار کی قیادت میں ایک بحری مہم ہندوستان بھیج دی تھی تاکہ دریائے سندھ کی سالم گذرگاہ کو دریافت کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ مہم تب ہی بھیجی جا سکتی تھی جب کہ سندھ وادی پر پہلے ہی سے قبضہ ہو چکا ہو۔ یُونانی سپہ سالار نے اس مہم کو سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی صوبہ کی تسخیر کا کام بھی مکمل کر لیا تھا۔

داریوش کی موت ۴۸۶ سنہ قبل مسیح میں ہوئی۔ جیسے کہ اصطخر کے کتبے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی سلطنت میں دریائے سندھ کا مشرقی علاقہ، قندہار اور ہرات بھی شامل تھے۔ داریوش کے جانشین خشیارش (Khashyarash) کے عہد میں بھی ہخامنشیوں کا تسلط ہندوستان کے صوبۂ سندھ پر بدستور قائم رہا۔ چنانچہ اصطخر کے کتبے میں گندہار اور سندھ کو ممالکِ محروسہ میں درج کیا گیا ہے۔ اس تاریخی بیان کی تصدیق اس فوج کی مخصری سے بھی ہوتی ہے جو خشیارش نے یُونان کی تسخیر کے لئے ہندوستان سے بھرتی کروائی تھی۔ یُونانی مؤرخ ہیرو ڈوٹس نے اس ہندوستانی فوج کے اسلحہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ رقمطراز ہے کہ ہندوستانی فوج سُوت کے بنے ہوئے کپڑوں میں ملبوس ہے۔ وہ تیر و کمان سے لیس ہیں اور ان کے تیروں کے سرے فولاد کے بنے ہوئے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ تاریخی مواخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہخامنشیوں کا قبضہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ جات پر اس خاندان کے آخری فرمان روا داریوش سوم کے عہد کے اختتام تک قائم رہا۔ کیونکہ یُونان کے ایک اور مؤرخ آریّن (Arrian) نے بیان کیا ہے کہ ہخامنشیوں کے بادشاہ داریوش سوم نے سکندر کے خلاف ۳۳۱ سنہ قبل مسیح میں اربیلا (Arabela) کے مقام پر اپنی آخری جنگ میں ہندوستانی افواج بھی تعینات کر دی تھیں۔

ان حملوں کے بعد سکندر اعظم کی وہ عظیم یلغار پیش آئی جو دُنیا کی تاریخ میں ایک منفرد واقعہ ہے۔ اس حملے کے فوری نتائج خواہ کچھ بھی رہے ہوں مگر تاریخی لحاظ سے اس کے اثرات پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے مشرق اور مغرب کو ایک کر دیا اور تہذیب و تمدّن کے مختلف مرکزوں کو باہم منسلک کر کے انسانی تاریخ کا دامن نئے امکانات سے مالامال کر دیا۔

نازشؔ پرتاپ گڑھی

ترکِ محبّت کے بعد

وقت نے شیشۂ پیمانِ وفا توڑ دیا
رہ گذاروں پہ بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا

شبنمستانِ تخیل کی حسین وادی میں
نقرئی لہریں اُبھرتی تھیں، مگر کون کہے
اجنبی راہیں سنورتی تھیں، مگر کون کہے
وقت کی بات نکھر آئی بہ اندازِ جنوں
لہریں لینے لگا سینے میں انوکھا سا خیال
پھینکتا ہی گیا خود داریٔ احساس کا جال
آن کی آن میں ارماں نے سمیٹا بستر
چند لمحوں میں کرن یاد کی کجلا ہی گئی
صورتِ آئینۂ شوق بھی دُھندلا ہی گئی

مطمئن اب ہوں کہ ارماں کو ندامت نہ ہوئی
کوئی آفت نہ ہوئی، کوئی قیامت نہ ہوئی

درد لپکے گا نہ اب جھوٹے سہاروں کی طرف
داغ جائے گا نہ اب چاند ستاروں کی طرف
اب تخیل میں کوئی رنگ کا طوفان نہیں
اب کوئی در مرے افسانے کا عنوان نہیں

وقت نے شیشۂ پیمانِ وفا توڑ دیا
رہ گذاروں پہ بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا

اور۔ کچھ دیر میں مہتاب اُبھر آئے گا
ذہن رنگین خیالات سے ٹکرائے گا
شاہدِ وقت کے اس اُبھرے ہوئے سینے سے
ظلمتِ شب کی قبا کھُل کے ڈھلک جائیگی
دستِ ماضی کہ لرز اور لرز جائے گا
مَے امروز چھلک اور چھلک جائے گی
اور پھر۔ میکدۂ یاد کے ہنگامے میں
میری تخئیل پھر اِک بار بھٹک جائیگی

نغمہ و نور کے ڈھلے ہوئے رنگیں پیکر
گنگناتے ہوئے نکلے تو فضا جھُومے گی
لبِ گلرنگ پہ ہلکا سا تبسم ہوگا
مرمریں جسموں کو رہ رہ کے قبا چُومیگی
کئی اِٹھلاتے ہوئے رنگ اُبھر آئیں گے
نِت نئے زمزمے ہونٹوں پہ بکھر جائیں گے
آن کی آن میں پھر وقت گذر جائیگا
آن کی آن میں پھر سحر بکھر جائے گا
کون جانے کہ پھر اس دِل کا تقاضا کیا ہو
کس کو معلوم کہ پھر رنگ تماشا کیا ہو

ساگر کاشمیری

موہن یاور کے افسانے

موہن یاور ریاست کشمیر کے ایک جواں سال جوان فکر افسانہ نگار ہیں۔ ریاست کی ادبی زندگی کے معماروں میں سے ہیں۔ بلا مبالغہ یاور نے نہایت ہی مختصر عرصہ میں ادبی دُنیا میں اپنے لئے ایک ممتاز جگہ پیدا کر لی۔ اُس کی تخلیقات میں پُختگی اور شگفتگی ہے، ندرت اور جدت ہے۔ وہ اپنے بھرپور انداز سے زندگی کے ہر زاویے کی عکاسی کرتا ہے۔

موہن یاور اپنے ماحول کا انسان ہے۔ اپنے ماحول کا اس نے بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے۔ زندگی کے میدان سے پھول اور کانٹے دونوں چُنتا ہے۔ کیونکہ اس کے دِل میں لگن ہے۔ اُس کے دِل میں اپنی دھرتی اور اپنے لوگوں کا درد ہے۔ وہ زندگی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تڑپ اُٹھتا ہے۔ اُس کا حساس دِل چیخ اُٹھتا ہے — اور وہی چیخ ایک کہانی کا رُوپ دھارن کر لیتی ہے۔ اُس کی نظر میں وُسعت، خیالات میں رفعت اور بلند پروازی ہے۔ وہ زندگی کو حسین اور خوبصورت بنانے کا متمنی ہے۔ اُسے نیا حُسن، نیا نکھار، نیا رُوپ، شادابی اور شگفتگی دینا چاہتا ہے۔ وہ ایک نئے سماج کی تشکیل چاہتا ہے۔ یہی آرزو اور ارادہ لے کر وہ اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ "وِسکی کی بوتل" پیش کرتا ہے۔ میں نے بہ نظرِ غائر اس مجموعے کا مطالعہ کیا ہے اور میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ یاور ہماری حقیقی زندگی کا ترجمان ہے نقیب ہے۔ اُس کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے قلم اُسے قلم بند کرتا ہے۔

اس مجموعے میں کُل بارہ کہانیاں ہیں۔ دیوداس۔ تین شہزادے۔ تیاجم۔ پُرانے زخم، ڈالی، تین لڑکیاں، تین ٹیوٹر، جہلم کی مچھلی، چائے کی پیالی، جھڑیاں، منظر پس منظر، مرکھیل والا شاہ اور وِسکی کی بوتل — یاور ریاست کا سعادت حسن منٹو ہے۔ وہ انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ماہرِ نفسیات ہے۔ وہ اپنے کرداروں کی عمل و حرکت کے ساتھ ساتھ ہمیں اُن کی دِلی کیفیت سے بھی روشناس کراتا ہے۔ بقولِ ٹھاکر پونچھی "مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ سعادت حسن منٹو کے علاوہ اگر کسی نے افسانہ نگاری کی بنجر پتھریلی دھرتی میں بیج بوئے، کھیتی کاٹی اور اُس فصل کے بل بوتے پر اپنی پیاسی سانسوں کی آبیاری کی تو وہ موہن یاور ہے۔ جو سراپا افسانہ نگار ہے۔ سراپا ایک سربستہ راز — یہ البیلا افسانہ نگار حقیقی معنوں میں عظیم سرکش اور باغی افسانہ نگار ہے۔"

پہلی کہانی "دیوداس" ایک نفسیاتی کہانی ہے۔ ہیرو دیوداس کو ہاتھ کی ریکھائیں دیکھنے کی عادت ہے اور وہ بھی خوبصورت لڑکیوں کی۔ لڑکیاں اُس کے نزدیک ہو کر اُس سے کچھ نہ پا کر چھوڑ کے چلی جاتی ہیں۔ سکون کی تلاش میں، ضروریاتِ زندگی کو پُورا کرنے کی تلاش میں۔ اور وہ صرف ریکھاؤں میں ہی کھویا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی سہاگ رات کو خوبصورت بیوی کے جذبات و احساسات سے غافل اُس سے فرمائش کرتا ہے — "جانِ من! آج میں تمہارا ہاتھ دیکھوں گا۔ دُنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی کا ہاتھ ... ... آ ہا ہا ہا!" اور اسی ایک سطر میں کہانی کی جان ہے۔ خاص کر کہانی کی اختتامی سطر، دیوداس کا سر تمام رات دُلہن کے ہاتھ پر پڑا رہا۔ دُلہن رات بھر روتی رہی — اور صبح ہو گئی۔

دوسری کہانی "تین شہزادے" میں وہ ماحول پر طنز کرتے ہوئے بے کار ادیب، شاعر اور موسیقار کی فاقہ کشی کا نقشہ کھینچتا ہے۔ یہ ہمارا ہی دَور ہے — یہ معاشرہ جس میں یاور تو زندہ رہتا ہے، ابدی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ اُسے

دائمی عمر حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن موہن پیٹ بھرنے کی جد و جہد میں تھک ہار کر سوچنے لگتا ہے کہ آخر زندگی کیسے کٹے گی۔ اور ایسے واقعات سے اکثر ادیبوں، شاعروں اور نغمہ کاروں کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔

تیسری کہانی "نیا جنم" میں یاور فلمی دُنیا کی خیرہ کُن روشنیوں کے پیچھے والے اندھیرے سے متعارف کراتا ہے۔ اور آج کل کے فلم زدہ نوجوانوں کی ذہنی تصویر کھینچتا ہے۔ جہاں سب نرگس اور دلیپ بننے کی تمنا رکھتے ہیں۔ اور اسی ادھیڑ بن اور کشمکش میں کوئی خودکشی کرتا ہے، کوئی کسی ہوٹل کا ویٹر بنتا ہے۔ اور لڑکیاں اپنے گھر کا پاکیزہ نام لیتے ہوئے بھی شرم محسوس کرتی ہیں۔ "نسیمی! میرا نام رفیقہ نہیں ہے۔ رفیقہ تو چھ سال ہوئے مرگئی تھی۔ اب تم میرا کوئی نیا نام رکھو۔" کیا آپ کو اس جملے میں شدت کا درد اور کرب ہونے کے علاوہ ندامت کا احساس دکھائی نہیں دیتا؟ بس یہی تو یاور ہمیں دکھانا چاہتا ہے۔

مجموعے کی چوتھی کہانی "پرانے زخم" میں مصنف کا ایک کردار اوشا کے خد و خال میں شسی کو تلاش کرتا ہے اور اوشا اپنے ماضی میں گم ہے۔ اور اس مہاجن دَور میں ہر کوئی زخمی ہے۔ یہاں ہر کسی کی رُوح مجروح ہے۔ اور وُہ اپنے زخموں کے مرہم کی تلاش کرتا ہے۔ اور پھر سوائے وقت کے انتظار کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اور وُہ ایک اُمید لے کر اُس وقت کا انتظار کرنے لگتا ہے جب اُس کے زخم مندمل ہو جائیں گے۔ اس کہانی میں بھی یاور ہمیں انسانی زندگی کے مختلف زخموں سے متعارف کراتا ہے۔

پانچویں کہانی "ڈالی" میں بقولِ ٹھاکر پونچھی "مصنف ہمیں اندھیرے اور اُجالے موت اور زندگی کی ازلی کشمکش کو کچھ ایسے انداز میں پیش کرتا ہے کہ ایک مہیب سوالیہ نشان نگاہوں کے سامنے اُبھرتا ہے۔ جس کا سوائے ندامت کے کوئی جواب نہیں بنتا۔" اور ان جملوں میں بلا مبالغہ کہانی کی تفسیر پوشیدہ ہے۔

چھٹی کہانی "تین لڑکیاں تین ٹیوٹر"۔ اس کہانی میں زندگی کی نامحرمیوں کی حقیقی ترجمانی کی گئی ہے۔ اس کہانی میں مصنف چھوٹی سی بات کے ذریعے بڑی بات کہہ گیا ہے۔ اور یہ برسوں کی محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے کہ وہ اس منزل تک پہنچ سکا ہے۔ خاص کر کہانی کے یہ جملے کتنے دردناک اور کرب ناک ہیں — "میں نے اس کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ میں روپے مانگتا، میری نظروں کے سامنے اُس کی پھٹی ہوئی قمیص گھوم گئی۔ جس کے اندر سے شمیز جھانک رہی تھی۔ شلوار ہو گھٹنے سے مسکی ہوئی تھی، بار بار سیلنے کے باوجود ادھڑ سی گئی تھی۔" میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ پھر میں نے دیکھا۔ میرے سامنے اسّی (۸۰) روپے پڑے تھے۔ لیکن میں چپکے سے اُٹھا اور باہر نکل گیا۔" یہ سطر ظاہر کرتی ہے کہ یاور انسان اور اُس کی انسانیت سے ابھی مایوس نہیں۔ نا اُمید نہیں۔ اور یہ برسوں کی ریاضت کا نتیجہ ہے۔

ساتویں کہانی "جہلم کی مچھلی" میں مصنف شکارے والی کے شعلہ بار حسن اور اردگرد کے دِل کش ماحول سے متاثر ہو کر کہہ اُٹھتا ہے — "چاند کتنا خوبصورت ہے!" اور جواب میں وہ کہتی ہے — "اور بابوجی یہ پیٹ؟" اور واقعی فطرت کی خوبصورتی اور دِل کشی سے یہ پیٹ کا جہنم زیادہ خوبصورت ہے جس کے لئے گل بانو کے نازک ہاتھوں کو چپو چلانا پڑتا ہے۔ اس کہانی میں گو مصنف کشمیر کے حسن و شباب سے ہمیں متاثر کرتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی دِکھاتا ہے کہ اس حسن پر بھوک اور افلاس کی کتنی گہری چادر پڑی ہوئی ہے جس نے اس کے تمام احساسات کو مُردہ بنا دیا ہے۔ اور میرے نزدیک یہی فن کا طرۂ امتیاز ہے۔

"چائے کی پیالی" مجموعے کی آٹھویں کہانی ہے۔ اس میں یاور فن کار کی زندگی کی جھلک دِکھاتا ہے۔ جو زندگی کی ہر خوشی سے محروم ہے۔ جو خود زخمی ہے، لیکن دوسروں کو خوش کرنے کے لئے مُسکراتا ہے۔ اور جب وہ اپنی زندگی کی خوشی کی کھوج میں نکلتا ہے تو اُسے کیا مِلتا ہے۔ ایک دوّنی، چائے کی ایک پیالی کی قیمت۔ اور کہانی کا یہ اختتام کتنا حسرت ناک ہے!

"جھریاں" اُن ادیبوں کی کہانی ہے جو زخم خوردہ ہیں اور اُن زخموں کے پیچھے ماحول کا ہاتھ ہے، حالات کا ہاتھ ہے۔ جنہیں اپنے درد کے درماں کی تلاش ہے لیکن ان سے بھی یاور مایوس نہیں۔ کیونکہ ان ہی میں سے ایک کے مُنہ سے یہ اگلوا کر یاور اُن کو فیض کے اس مصرعہ کے الفاظ میں ؎

"اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا" اپنے فرض سے رُوشناس کراتا ہے۔" وہ پُرانی کہانی — دوست وہ کہانی مرگئی۔ وہ کہانی صرف ایک لڑکے

مرزا کمال الدین شیدا

ساقی

جہاں ہے کشتۂ آلام ساقی — اُٹھو لے کر خدا کا نام ساقی

بلاگرداں ہے دورِ جام ساقی — یہی تیرا اصلائے عام ساقی

عنایت جام پر ہو جام ساقی — ابھی میرا جنوں ہے خام ساقی

بہا کر بے تحاشا خونِ انگور — کیا ہے تو نے خیر عام ساقی

رخِ روشن دلیلِ صبحِ تاباں — غمِ گیسو پیامِ شام ساقی

تمہاری چشمِ میگوں فتنہ زا کا — قیامت رکھ دیا ہے نام ساقی

میری بے ربط دل کی دھڑکنوں کا
رکھا ہے زندگانی نام ساقی

•

موہن یاور کے افسانے

بقیہ از صفحہ ۳۷

اور ایک لڑکی کی کہانی تھی۔ مگر اب جو کہانی لکھ رہا ہوں اس میں چالیس کروڑ لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔" اور یہ سچ ہے کہ انفرادی طور پر کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ بلکہ ہونا کچھ ایسے چاہیئے۔" میری اس کہانی کے چالیس کروڑ کردار ہیں۔ جانتے ہو جب ان چالیس کروڑ انسانوں نے بغاوت کردی تو کیا ہوگا... ؟"

اور آخر میں "میرے ہمدم! یہ جھریاں — جھریاں نہیں بلکہ زندگی کی پیامبر ہیں۔ ہم ان جھریوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہمیں منزل تک لے جائیں گی۔

اور اب میں آپ سے سوال کرتا ہوں کیا مصنّف کے چہرہ کی یہ جھریاں قابلِ تعظیم نہیں ؟

"منظر، پس منظر" اور "مرکیوں والا شاہ" اس مجموعے کی دو ایسی کہانیاں ہیں جن میں زندگی کی ازلی و ابدی کشمکش ہے۔ زندہ رہنے کے سہارے ڈھونڈنے کی جستجو ہے۔ اور ان کا حل — ؟ یہ آپ لوگوں کے ہاتھ ہے۔

مجموعے کی آخری کہانی "وِسکی کی بوتل" جو اس مجموعے کا عنوان بنی ہے اس ماحول اور معاشرت کی مُنہ بولتی تصویر ہے۔ جہاں روپیہ حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کیا جاتا ہے۔ جہاں اپنی کنواری لڑکیوں کو "وِسکی کی بوتلوں" کی شکل میں ہوسناکی کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اُس متعفن اور گھناؤنے ماحول کی حقیقی تصویر ہے۔ جس میں روپیہ کو عزت، عصمت اور عفت پر ترجیح دی جاتی ہے، نیلام کیا جاتا ہے یہی کہانی میرے اس دعوے کا ثبوت ہے کہ یاور ریاست کا منٹو ہے بے باک اور نڈر افسانہ نگار، حقیقت پسند۔ یاور نے راستہ پالیا ہے۔ اب وہ دن دُور نہیں جب وہ منزل کو چھُولے گا۔ مجھے ذاتی طور پر یاور سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ اور چونکہ وہ لغزشوں کے عبوری دَور سے آگے نکل گیا ہے اس لئے مجھے اُمید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ وہ لازوال ادب کی تخلیق کرے گا۔ کیونکہ وہ ادیب ہے قلم کا مزدور۔ اُسے زندگی سے پیار ہے اور محبت ہے۔ وہ اُسے حسین اور دلکش بنانا چاہتا ہے۔ یہی لگن کامیابی کی ضامن ہے!

میرے نزدیک ادب کو جانچنے اور پرکھنے کا ایک ہی طریقہ اور کسوٹی ہے۔ میں دیکھتا ہوں آیا کہ وہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے کہ نہیں؟ اور مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ موہن یاور کے افسانے اس کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں!

تنہا انصاری

ساقی

یِمن چانیِٚن اِرادن خیر ساقی
بیَن پھیرنَس گیٔی ما تیٔر ساقی
وُچھِت اَنوار میأنِ کھاجِت ڈٕکٕھس گیٚن
پھرُت قطراہ تہٕ نارٕ تھ کیٔر ساقی

•

کورُم چانیِٚن خیالن سیٖل ساقی
ونٕے زٕ ژھوٚٹ بوزہ ہم کیاہ لیٖل ساقی
ییٚوَ چانیو گلیوٚ دامَو اندیٚم کیاہ
نیٚو ناریوٚ چنَس چھیم میٖل ساقی

•

ھری کرشن کول

بادلوں کی دیوار

آسمان بادلوں سے گھرا تھا!

کانتا نے سٹاف روم میں داخل ہوتے ہی اپنے آپ کو ایک کٹے ہوئے درخت کی طرح آرام کرسی پر گرا دیا۔ ننھی سشما کے معمولی سوال نے اس کے جذبات میں ہل چل سی پیدا کی تھی۔ ان زخموں کو ہرا کیا تھا جن کی موجودگی کا احساس وہ بھلا چکی تھی۔ سوال معمولی تھا۔ پر معمولی سوال کا جواب دینا بھی کئی بار مشکل ہو جاتا ہے۔ اور پھر جواب معلوم ہوتے ہوئے بھی وہ دل کی بات سشما سے کہہ نہ سکی تھی۔ یہ ایک کمزوری تھی۔ ایک مجبوری تھی!

اُس کا دل بے چین تھا۔ اُداس تھا اور جی چاہ رہا تھا کہ وہ کہیں دُور چلی جائے! بہت دُور! جہاں تک آدمی کا تصور بھی نہ پہنچ سکے۔ جہاں کوئی بھی نہ ہو۔ کچھ بھی نہ ہو!

وہ اُٹھی اور کھڑکی کھول کر باہر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے دل نے چاہا کہ وہ اپنی نظر کے سہارے ہی نیلے آکاش میں اُڑتی جائے۔ اُس کی بے پناہ گہرائیوں میں ڈوب جائے ـــــ لیکن آسمان بادلوں سے گھرا تھا اور دوسرے ہی لمحے اُس کی نظر بادلوں کی دیوار سے ٹکرا کر چور چور ہو گئی۔ اُس کی بے چینی بڑھ گئی اور واپس آکر وہ دوبارہ کرسی میں دھنس گئی!

آج وہ ذرا سویرے ہی سکول پہنچ گئی تھی۔ اُس وقت وہاں صرف تھرڈ پرائمری کی سشما تھی۔ پیارا سا مکھڑا۔ بڑے بڑے پھولوں والا نیلے رنگ کا فراک سنہرے بالوں میں لال رنگ کا شوخ ربن۔ اور نہ جانے کیوں کانتا کا دل اُسے گلے لگانے کو مچل اُٹھا!

"بڑا پیارا فراک ہے!" کانتا نے کہا تھا۔

"کل ہی ڈیڈی جی نے بمبئی سے لایا ہے۔"

کانتا نے اُسے گود میں اُٹھا کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ کچھ دیر کے لئے دونوں چپ رہی تھیں۔ اور پھر سشما نے پوچھا تھا ـــــ

"کانتا بہن جی! آپ کیوں ہمیشہ سفید ساڑھیاں پہن کر سکول آتی ہیں؟ آپ کو ایسے پھولوں والے کپڑے پسند نہیں ہیں کیا؟"

"نہیں!"

"کیوں؟"

"اری ـــ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ تم ننھی منی ہو۔ تم پر یہ کپڑے پھبتے ہیں۔ میں بڑی ہوں۔ مجھے سادہ لباس ہی اچھا لگتا ہے۔"

"مگر شیلا بہن جی بھی آپ ہی کی طرح بڑی ہیں۔ وہ کیوں چمکیلی اور رنگین ساڑھیاں پہنتی ہیں؟"

"اس لئے کہ مجھ میں اور شیلا میں کافی فرق ہے۔"

"کیا فرق؟" اور یہی تھا وہ سوال، جس کا جواب کانتا سے نہ بن پڑا تھا اور جس وجہ سے اس نے سٹاف روم میں داخل ہو کر اپنے آپ کو ایک کٹے ہوئے درخت کی طرح آرام کرسی پر گرا دیا تھا۔

آج اس کے دل میں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی۔ کاش وہ نیلے آکاش کی اتھاہ گہرائیوں میں کھو جائے! کوئی غیبی قوت کسی نامعلوم سمت سے آئے اور اُسے اس دُنیا کے باہر پھینک دے! اس دُنیا کے ساتھ اُس کا ناطہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائے۔ جہاں وہ سفید اور سادہ لباس پہننے پر مجبور تھی۔ صرف اس لئے کہ وہ ایک سکول مسٹریس تھی ـــ پچیس (۲۵) برس کی ایک نوجوان عورت تھی ـــ اور پھر غیر شادی شدہ تھی ـــ

غیر شادی شدہ! اور کانتا کو وہ دن یاد آئے جب شادی کا مسئلہ

اس کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اُسے جنتی سے محبت تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ بی۔ اے کرنے کے بعد وہ اُسی کے ساتھ شادی کرے گی۔ لیکن جب اس نے بی۔ اے کیا تو جنتی نے اس کے سامنے ایک اہم بات رکھی۔ "کانتا!" اُس نے کہا تھا۔ "مجھے تم سے محبت ہے اور اگر میں ساری دُنیا چھان ماروں مجھے تم جیسی بیوی کہیں نہیں مل سکتی! مگر تمہیں نہیں معلوم میری بڑی بھابی سونے کے ایک سو بیس (۱۲۰) تولے کے گہنے گھر آئی تھی اور میرے باپ نے بھی میری بہن کی شادی میں نو ہزار (۹۰۰۰) روپے خرچ کر ڈالے ہیں۔ کانتا تمہارے بغیر میرا وجود نامکمل ہے اور میرا وشواس ہے کہ اس جنم میں نہ سہی، تو اگلے جنم میں ضرور ..... "

تب کانتا سمجھ گئی کہ شادی محبت جیسی کوئی آسان چیز نہیں ہے۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ شادی ہی نہیں کرے گی۔ زندگی [illegible] مگر دھیرے دھیرے اسے معلوم ہوا کہ یہ بات ناممکن ہے، [illegible] ہے۔ شادی کے بغیر ایک عورت زندہ نہیں رہ سکتی۔ کم از کم اُسے زندہ رہنے نہیں دیا جائے گا۔ کنواری رہ کر وہ بغیر روک ٹوک کہیں آ جا نہیں سکتی۔ کچھ کہہ نہیں سکتی۔ وہ وہ نہیں کر سکتی جو اُس کا دل چاہے۔ اور کانتا کو اپنی زندگی کے وہ لمحے یاد آئے جب اُسے ٹشو کی چمکیلی ساڑھی خریدنے کی خواہش ہوئی تھی — گہرے نیلے باڈر والی بنگلور سلک کی سُرخ ساڑھی خریدنے کو دل مچلا تھا۔ ناخنوں کو کیوٹیکس سے رنگنے کی دبی آرزو نے انگڑائی لی تھی۔ مگر ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے وہ ململ کی سفید ساڑھی باندھتی تھی۔ سادہ لباس پہنتی تھی۔ سیدھی مانگ نکال کر ہی اپنے بال گوندھتی تھی۔ وہ کنواری تھی۔ کمزور تھی ... ...

گھر پر اُس کی ایک ماں تھی جو ہر وقت کھانستی رہتی تھی۔ ایک باپ تھا جسے ایک سال پہلے پنشن ملی تھی۔ کانتا کی بڑھتی عمر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس نے زندگی بھر پراویڈنٹ فنڈ کے طور پر دو ہزار روپے کی بچت کی تھی — مگر یہ دو ہزار روپے اس کام کے لئے کافی کم تھے اور اسی کمی کو پورا کرنے کی غرض سے شاید کانتا نے سکول میں نوکری کرنا منظور کیا تھا ... ...

"ارے، تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟ دیکھو بادل چھٹ گئے ہیں — دھوپ نکل آئی ہے۔ چلو گھڑی بھر کے لئے لان میں بیٹھیں۔"

کانتا نے دیکھا سامنے شیلا کھڑی ہے سنہرے باڈر والی ریشم کی کالی ساڑھی پہنے۔ ساٹن کا سُرخ بلاوز۔ ماتھے پر چمچاتی ہوئی ایک بندی۔

"اٹھو بھی نا۔ یہاں بیٹھی کیا جھک مار رہی ہو؟"

کانتا اُٹھی اور لان میں شیلا کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اب ہمیں مٹھائی کس دن کھانی ہے؟" شیلا نے بات شروع کرتے ہوئے پُوچھا۔

"مٹھائی! کیسی؟" کانتا کچھ سمجھ نہ سکی۔

"میں نے پُوچھا تمہاری شادی میں اب کتنے دن رہ گئے ہیں؟"

کانتا نے نظریں جھکا لیں اور یُوں ہی اپنی سینڈل کی نوک سے گیلی زمین پر ایک لکیر کھینچی۔

"کہو کہیں، جگہ بات پکی ہوئی؟" شیلا نے اس بار ذرا سنجیدگی سے پُوچھا۔

کانتا نے سر ہلا کر نفی میں جواب دے دیا اور زمین پر ایک اور لکیر کھینچی۔

شیلا کچھ دیر کے لئے چُپ رہ کر کانتا کی طرف دیکھنے لگی جو نظریں نیچی کئے ہوئے زمین پر بغیر کسی مطلب کے لکیریں کھینچ رہی تھی۔ سیدھی ٹیڑھی۔ ترچھی!

"اب وہ بھی اپنے بھائی یعنی میرے دیور کی شادی کرنے کی سوچ رہے ہیں۔" شیلا ویسے ہی اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اُس کی آنکھیں شاید کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

سینڈل کی نوک نے زمین پر ایک اور لکیر کھینچی اور کانتا کو لگا کہ یہ بے مطلب لکیریں ایک خاص شکل اختیار کر رہی ہیں۔ ایک چھوٹے سے پیارے سے گھر کا خاکہ۔

"لیکن ابھی کسی جگہ بات پکی نہیں ہوئی!"

گیلی زمین پر ایک اور لکیر کھنچ گئی اور خاکہ اُبھرنے لگا۔

"ابھی ہمیں کوئی اچھا رشتہ نہیں مل سکا ہے!"

"کسی موٹی مُرغی کی تلاش ہوگی۔ کیوں؟" کانتا بول اُٹھی۔

"نہیں، ہم دھن و دولت کے بھوکے نہیں ہیں۔" شیلا مسکرانے لگی۔ "ہم صرف ایک اچھی لڑکی چاہتے ہیں۔ خوبصورت! نیک سیرت! پڑھی لکھی ... ..."

کانتا زمین پر لکیریں کھینچ کر خاکے کو اُبھارتی رہی۔

"یعنی تم جیسی!" کچھ سوچ کر شیلا نے شوخی سے کہا اور اس بات کا

مدد حاصل کرنے کے لئے کانتا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی لالی چھا گئی تھی اور وہ نظریں نیچی کئے ہوئے زمین کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں ایک گھر کا خاکہ بچوں کی طرح ابھر چکا تھا۔ ایک ننھا سا گھر۔ ایک پیارا پیارا گھر۔

پھر دونوں کچھ دیر کے لئے چپ رہ کر آکاش کی طرف دیکھتی رہیں جہاں بادل پھٹ گئے تھے۔ جہاں سورج چمک رہا تھا۔

اچانک شیلا کو کوئی بات یاد آئی اور اس کے منہ سے نکل پڑا۔ "مگر جگدیش تو ابھی بچہ ہی ہے جس کے منہ سے دودھ کی سی بو آتی ہو۔ زیادہ سے زیادہ اس کی عمر انیس سال ہوگی۔"

یہ کہہ کر اس نے انگڑائی لی اور ٹانگیں پھیلا کر اپنے پیروں سے اس خاکے کو مٹا دیا۔ جسے کانتا نے سیدھی، ٹیڑھی اور ترچھی لکیروں سے گیلی زمین پر بنایا تھا۔

تب یکایک اس کا سر دکھنے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا اور چھٹی لے کر اسے گھر لوٹنا ہی پڑا۔

بادل پھر چھا گئے۔ دھوپ پھر چھپ گئی اور گھر پہنچ کر شیلا اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ صبر کا باندھ ٹوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں بھی جگدیش کی ایک بڑھیا ساڑھی پہنوں گی۔ ماں!" اس نے سسکیوں کے بیچ کہا۔

"تو اس میں رونے کی کیا بات ہے بیٹی۔" ماں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ کل ہی تمہیں تنخواہ ملنے والی ہے۔ اپنی پسند کی ساڑھی خرید لینا۔ سو میں ہی تو آتی ہوگی۔"

"نہیں ماں ویسی ساڑھی کم از کم چھ سات ہزار میں ملے گی اور ابھی ہمارے پاس صرف دو ہزار روپے ہیں۔"

لیکن وہ جلد ہی سنبھل گئی اور آنسو پونچھ کر اس نے اپنے آپ کو ماں کی گود سے الگ کیا اور کہا۔ "مگر ماں میں بچی نہیں جس کے منہ سے دودھ کی سی بو آتی ہو۔ چھبیسویں سال میں چل رہی ہوں۔ ایسے بھڑکیلے کپڑے پہننا کیا مجھے شوبھا دے گا؟"

آسمان بادلوں سے گھرا تھا!

آنند وہ ما

غزل

نہ ہوتا میکدہ ہمدم سکوں پانے کہاں جاتے
کہاں جاتے دلِ مضطر کو بہلانے کہاں جاتے

ترے تیروں نے ارماں کی طرح گھر کر لیا دل میں
رہے مانند اپنوں کے یہ بیگانے کہاں جاتے

ان ہی کے دم سے ہوتی ہے تجلی غمکدوں میں بھی
نہ ہوتے میکدے ہمدم تو غم خانے کہاں جاتے

ہمارے عشقِ پنہاں نے ہمیں تشہیر بخشی ہے
وگرنہ ہم زمانے بھر میں پہچانے کہاں جاتے

محبت کے اثر سے اُن کا دِل پگھلا ہے اب شاید
وگرنہ وہ کسی کے دِل کو بہلانے کہاں جاتے

نہ ملتا سایۂ گیسو رہِ ہستی میں تو ہمدم!
جو تھک کر چور ہو جاتے وہ سستانے کہاں جاتے

رہِ اُلفت میں وہ، جن کے نہ آنسو کوئی کام آئے
خدارا تم بتا دو ہوئے خوں رلاتے کہاں جاتے

تو آنکھوں سے پلا دیتا تو تیرے ہو کے رہ جاتے
تری آنکھوں سے پی کر ہوش میں لانے کہاں جاتے

ہمارے ہی [illegible] سے رونقیں ہیں بادہ خانوں کی
نہ ہوتا [illegible] تو [illegible] کہاں جاتے

دو غزلیں

ماہر التقوی لکھنوی

توبہ پہ بھروسہ ہے انجام مگر کیا ہو
کیا جانیئے ساقی سے ملتے ہی نظر کیا ہو

لے جاؤں کہاں دامن یہ خونِ جگر کیا ہو
انجان وہ ہیں بیٹھے اے دیدۂ تر کیا ہو

جب دیدۂ تر کیا تھا اب دیدۂ تر کیا ہو
وہ موڑ چلے مجھ سے مینائے نظر کیا ہو

اے شمع غنیمت ہے پروانے کا دم ورنہ
شعلے سے الگ رہ کر انجامِ شرر کیا ہو

میں سوچ کے ڈرتا ہوں انجامِ قفس یا رب
بڑھ جائے اگر حد سے بے تابیٔ پر کیا ہو

اس وہم نے ساقی سے نظریں نہ ملانے دیں
دل جانیئے کیا سمجھے منشائے نظر کیا ہو

اُن مست نگاہوں سے دل مجھ کو بچانے کیا
جو آپ نشانہ ہو وہ سینہ سپر کیا ہو

اشکِ سرِ دامن نے دل توڑ دیا ماہر
اب کس کا سہارا لوں اب صرفِ نظر کیا ہو

حاصل ہوئی آگاہی عشرت گہہِ باطل سے
ہم شمع اٹھا لائے سوئی ہوئی محفل سے

اُمید جھلک اٹھی آلام کے طوفاں میں
ٹکرا ہی گئی کشتی ڈوبے ہوئے ساحل سے

دیوانوں سے زنداں تھا پُر شور مگر مجھ کو
پہچان لیا اُس نے آوازِ سلاسل سے

اِک تازہ کلی غم کی ہر سال چٹکتی ہے
مدت ہوئی گذرا تھا کوئی چمنِ دل سے

ہوتا ہے تصور جب اُس حسنِ خود آرا کا
آئینے گذرتے ہیں نظروں کے مقابل سے

اُبھرا ہوں اندھیروں میں ڈوبا ہوں اُجالوں میں
احساس بنایا ہے احساس کو مشکل سے

یہ ترکِ تمنا کا نیرنگ نہ تھا کوثر
ہم نے بھی ملایا ہے اس راہ کو منزل سے

کوثر جائسی

جے، ایل، کے جلالی

کشمیری زبان اور عبرانی

(ایک مُسلسل مباحثہ)

"تعمیر" ستمبر ۱۹۵۵ء میں مسٹر عزیز کاشمیری نے مضمون بالا پر مقالہ سپردِ قلم کیا ہوا ہے۔ جواب دینے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ جب کسی موضوع پر بحث چھڑ جائے تو ہر ایک شخص کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی رائے اور ذاتی نقطۂ نگاہ کو پیش کرے۔ چونکہ حوالہ میرے مضمون کا دیا گیا ہے ... ... اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کچھ تحریر کیا جانا لازمی ہے۔

میں نے موصوف کے مضمون کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ اُس نے پہلے بھی یہی طوطے کی رٹ لگائی ہے اور اب مباحثہ کو علمی تحقیق کی بجائے سطحی قسم کی باتوں سے ٹال رہے ہیں اور اصل حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی بجائے اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھ گئے ہیں۔

اور اپنی تنگ واقفیت کے بل بوتے پر ... کہانی کے منوانے پر بعند ہیں۔ پڑھنے والے سوچتے ہوں گے کہ واقعی گولڈ سمتھ کے ویلیج سکول ماسٹر کی طرح اس نگارندہ کے چھوٹے سے سر میں کتنا بھرا ہوا ہے۔ واقعی اس نے دُنیا کی سیر برسوں کی ہوگی۔ بڑے بڑے لکھکوں کے علم و ادب کے خزینہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوگا۔ اور واقعی روپیہ پانی کی طرح بہا کر علم حاصل کرنے کا کشمیری میں ترجمہ کرنے اور کشمیری زبان کو فروغ دینے کے متعلق کئی کتابیں تصنیف کی ہوں گی۔ جب اصلیت کی طرف نظر دوڑائی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کی منطق کی سطح کیا ہے اور "مُلّا کی دوڑ مسجد تک" کے مصداق بے چارے موصوف نے خواجہ نذیر احمد کی کتاب "Jesus in Heaven on earth" کی سرتاپا نقل اُتاری ہے۔ اور جو کچھ اُس میں درج ہے وہی "تعمیر" کے مضامین میں تحریر کر دیا ہے۔ کتاب مذکور سنہ ۱۹۵۵ء میں پاکستان میں ربوہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس تصنیف میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰ کو جب صلیب پر چڑھایا گیا وہ بہشت میں نہیں گئے اور خدا کے دائیں ہاتھ پر نہیں بیٹھے جیسا کہ ہر ایک عیسائی مانتا ہے بلکہ سولی سے اُتار کر اُن کے زخموں کی مرہم پٹی کی گئی اور ان کو دُور لے جایا گیا۔ چنانچہ شالواہن سموت کے دوسرے سال میں وہ کشمیر آئے اور کشمیر میں رہ کر ۱۲۰ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ یہاں تک کہ کشمیر میں ان کے نام سے ایک قبر بھی موسوم کی جاتی ہے۔

یہ مسئلہ تاریخ کا مسئلہ ہے اور یہاں پر ہمیں یہ روّیہ اختیار کرنا چاہیئے کہ تاریخ کے اصل اور مستند ماخذوں کی طرح رجوع کریں۔ اور اس سلسلہ میں کسی جانب داری کو بالکل پاس نہیں آنے دینا چاہیئے۔ بلکہ اس سلسلہ میں ایک وسیع علمی نقطۂ نظر کو بڑھانا چاہیئے۔ جہاں اپنی ذاتی رائے سے زیادہ تاریخ کے دوٹوک فیصلوں کو ہی اہمیت دی جاسکے۔ اس مسئلہ کے متعلق بھی اگر ہم روایت اور درایت کے اس اصول کو مدِنظر رکھیں تو ہماری ساری مُشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ حیرانی یہ ہے کہ ہماری قدیم تاریخوں میں اس اہم واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ اس سلسلہ میں کوئی تفصیلی بیان ملتا ہے۔ یہاں پر سمجھ نہیں آتا کہ اتنے اہم مسئلہ کے متعلق ہماری تاریخ کیوں خاموش ہے۔

یہ روایت کہ نوح کا پوتا کشش تھا اس لئے کشمیر کا نام کشمیر پڑ گیا، یا یہ کہ کشمیری ہانجی اپنے آپ کو نوح (Noah) کی نسل میں سے قرار دیتے ہیں اس لئے کشمیر نوح اور اُس کی اولاد کی سرزمین ہے۔ ایسا دعویٰ نوح کی اولاد نے آج تک کبھی نہیں کیا۔ موصوف بھول گئے ہیں کہ کشمیری ہانجی مسلمان ہیں اور اسلام چودھویں صدی میں کشمیر میں آیا اور اس کے بعد اسلامی تواریخ سے عوام آگاہ ہوئے۔ مسٹر عزیز کاشمیری نے کشمیر کی تواریخ کو خود نہیں پڑھا اس نے

ان کتابوں کی شکل بھی دیکھی ہوگی جن کا حوالہ خواجہ نذیر احمد صاحب کی کتاب سے لے کر دیا گیا ہے اور اپنے "دلائل" پیش کئے ہیں۔ اس کتاب میں وہ وہ باتیں کشمیریوں اور اس کی تاریخ کے متعلق درج کی گئی ہیں۔ جن کی تردید کشمیر کی تواریخ خود کرتی ہے۔ یہ مسلمہ ہے کہ سوات کا ایک مسلمان چودہویں صدی میں کشمیر آیا۔ کانڈر اجیف رام چند نے اس کو پناہ دی۔ اس کا نام شاہ میر تھا۔ اس نے ... ... خاندان سلاطین کی بنیاد ڈالی۔ مابعد اسلام نے زور پکڑا۔ اور... اسی... لئے ... ... فارسی کا رواج ہوا مسلمانوں نے قرآن پڑھنا شروع کیا۔ فارسی بول چال کے ذریعہ بیرونی الفاظ کشمیری زبان میں آنے لگے۔ چونکہ فارسی کا تعلق ادر ہمسایہ زبانوں کے ساتھ تھا لہذا نئے الفاظ اب آہستہ آہستہ تسلط کرنے لگے وہ کشمیری زبان میں کھپ گئے۔ البیرونی اپنی کتاب "الہند" میں لکھتا ہے

"کشمیری اپنے ملک کی مضبوطی کے متعلق بہت ہی ہوشیار ہیں اور ہمیشہ اندر جانے کے راستوں اور دروازوں پر خوب نگہداشت رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے ساتھ تجارت کرنا بہت مشکل ہے۔ پہلے زمانے میں وہ ایک دو ودیشیوں کو اپنے ملک میں داخل ہونے کی اجازت دیتے تھے، خاص کر یہودیوں کو۔ مگر اب وہ کسی ہندو کو، جس کو وہ نہ جانتے ہوں، اندر آنے نہیں دیتے چہ جائیکہ کسی غیر شخص کو۔"

گویا اگر کبھی یہودی آئے بھی، وہ گنتی کے تھے جو تجارت کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ اُن کا کیا خاص اثر کشمیری زبان پر پڑ سکتا تھا۔ موصوف نے پنڈت ہرگوپال کول کا ذکر کیا ہے کہ بقول اس کے کشمیری زبان میں صرف ۵ فیصدی سنسکرت، دس فیصدی فارسی، پانچ فیصدی ہندوستانی، دو فیصدی عربی اور باقی ۳۳ فیصدی کشمیری و ممالک متصلہ کے الفاظ ہیں۔ مگر اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ کشمیری عبرانی زبان ہے۔ یہ داستان خواجہ نذیر احمد کی کتاب میں مفصل درج ہے اور مسٹر عزیز کاشمیری کو چاہیئے تھا کہ وہ قارئین کو صاف صاف الفاظ میں اس کا حوالہ دے کر بتلاتا اور اس سلسلہ میں کشمیر کی مستند تاریخ سے اپنے نظریات کو منوانے کے لئے درست حوالے دیتے۔ یہ روایت

کہ سلیمان نے کشمیر کو آباد کیا۔ اس لئے شنکر اچاریہ کی پہاڑی کو تخت سلیمان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دُہراتے وقت بعض مؤرخ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اسلام چودہویں صدی کے بعد کشمیر میں آیا۔ اور تخت سلیمان یا ہمچو قسم کی اسلامی روایات مابعد کی ہیں۔

بعض مؤرخین ہرکمہ پہاڑ کی وجہ تسمیہ کے لئے یہ بات قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ بائبل میں کسی جگہ لفظ "ہرا" آتا ہے۔ تاریخ کی تحقیقات کا دروازہ ہر ایک پر کھلا ہے۔ اور اگر تاریخ سے یہ واقعات ثابت ہو جائیں تو کسی کو چون و چرا نہیں کرنا چاہیئے۔ مگر جب ہماری قدیم تاریخ ہرکمہ پہاڑ کی اس سے زیادہ قابل باور وجہ تسمیہ پیش کرتی ہو تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم خیالی گھوڑے کیوں دوڑائیں؟ اس سلسلہ میں ضرورت اس بات کی ہے کہ فیصلے صادر کرتے وقت تساہل پسندی سے کام نہ لیا جائے۔ بلکہ تاریخ کے اوراق کو عرق ریزی سے پڑھا جائے اور اس سلسلہ میں ہر ایک مستند ماخذ کی کھوج لگائی جائے اور اس کے بعد کھلے دل و دماغ سے کسی نتیجے پر پہونچا جائے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں پر بحث و مباحثہ میں اڑے رہنے کی بجائے اس حقیقت کی کھوج مقدم امر ہونا چاہیئے۔ اور ہمیں نہایت فراخدلی سے اس کو تسلیم کرنا چاہیئے۔

مزید لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر مسٹر عزیز نے ۱۵۳ الفاظ خواجہ نذیر احمد کی کتاب سے نقل کر کے لکھے ہیں۔ (دیکھو صفحات ۳۰۲ — ۳۱۱) وہ انگریزی میں دئے گئے ہیں۔ موصوف نے اب ان کو فارسی رسم الخط میں درج کیا ہے۔ نہ معلوم اصلیت سے کتنے دُور ہوں گے۔ خیر میں ایک جزو کو لے کر بتلا دینا چاہتا ہوں کہ یہ الفاظ کشمیری میں پہلے کبھی نہیں تھے۔ اگر اب بقول موصوف کے بولے جاتے ہیں وہ اسلامی دَور کے آغاز کے بعد کے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے (میں نے یہ الفاظ "تعمیر" ۱۹۵۸ء عزیز صاحب کے مضمون سے لئے ہیں معہ اُردو معنی کے)

تعمیر صفحہ	عبرانی	اُردو معنی	کشمیری	اُردو معنی
۳۰	اب	باپ	بب	باپ
〃	اشاہ	جورو	آشین	جورو

(راقم کے ریمارک):- یہ پہلے کا کشمیری لفظ نہیں۔ صرف کشمیری آج "بب" کا استعمال کرتے ہیں۔ "اشاہ" "آشین" کے متعلق بھی راقم کی یہی رائے ہے۔

تعمیر

صفحہ تعبیر	عبرانی	اُردو معنی	کشمیری	اُردو معنی	
۳۰	آکھ	اکیلا	اکھ	اکیلا	اکھ۔ اکیلا نہیں بلکہ ایک، ہوتا ہے اور سنسکرت ایک سے نکلا۔
〃	اَدہ	ہائے	اوہ	ہائے	کشمیری میں "اوہ" ہائے کے لئے استعمال نہیں ہوتا ہے۔
〃	یم	ڈرانا	یم	موت	"یم" سنسکرت "یم راج" سے آیا ہے۔ "یم راج" موت کا دیوتا ہے۔
〃	اجل	سمٹ جانا	اجل	موت	اجل کشمیری لفظ نہیں۔ یہ فارسی کے ذریعہ آیا ہوا ہے۔
۳۱	ادہ	پھاڑنا	ادہ	اری	"ادہ" کشمیری لفظ نہیں۔ نہ "آری" کے لئے استعمال ہوتا ہے۔
〃	اون	اندھا	اوّن	اندھا	یہ سنسکرت اور پراکرت اندھ سے آیا ہوا ہے۔
〃	اذن	تولنا	وزن	تول	یہ کشمیری لفظ نہیں۔ یہ فارسی سے آیا ہوا ہے
〃	اند	کمربند	ایزار	پاجامہ	یہ کشمیری لفظ نہیں۔ یہ فارسی کے ذریعہ آیا ہے۔
〃	احد	ایک	احد	ایک	ایضاً ایضاً
〃	اور	اوپر کا کپڑا	ڈادر	اوپر کا کپڑا	ان دو لفظوں میں مطابقت ہی نہیں۔ ڈادر اور چیز ہوا کرتی ہے
〃	اہاہ	افسوس	اہاہ	افسوس	کشمیری میں اہاہ کوئی لفظ ہی نہیں، خاص کر افسوس کے لئے
〃	اوہ	آرزومند	اَدہ	اقرار	آرزومند اور اقرار میں کیا مطابقت ہو سکتی ہے۔ "اوہ" سنسکرت "اوم" سے آیا ہے۔ معلوم نہیں عبرانی کا کیا تلفظ ہے۔
〃	الہ	موٹا ہونا	الہ	کدو	واہ رے مطابقت۔ خدا حافظ
۳۲	بوم	بلند مقام	بام	چھت	یہ کشمیری لفظ نہیں۔ بام فارسی سے آیا ہوا ہے۔
〃	بدر	الگ کرنا	بدر	الگ کرنا	〃 〃 〃 〃
〃	تلا	بلند کرنا	تھکن	بلند کرنا	یہ سنسکرت "تلنا" سے آیا ہوا ہے۔
〃	تمم	تمام	تمام	تمام	یہ کشمیری لفظ نہیں۔ یہ فارسی سے آیا ہوا ہے
〃	جبر	جبر	جبر	جبر	〃 〃 〃 〃
〃	زنہ	حرامکاری	زنہ	حرامکاری	〃 〃 〃 〃
〃	عبر	عبور کرنا	عبور	عبور کرنا	〃 〃 〃 〃
〃	سکت	خاموشی	سکوت	خاموشی	〃 〃 〃 〃
〃	نفس	ذات	نفس	ذات	〃 〃 〃 〃
〃	خطا	قصور	خطا	قصور	〃 〃 〃 〃
〃	صفا	چمکنا	صفہ	صاف	〃 〃 〃 〃
〃	قبض	ہاتھ سے پکڑنا	قبضہ	اپنے تصرف میں رکھنا	〃 〃 〃 〃
〃	شقص	مکروہ	شقص	ذلت	〃 موصوف نے جان بوجھ کر شکست کو شقص لکھدیا ہے کہ یہ عبرانی خیال کیا جائے۔
〃	شال	عالم از دواج	سال	دعوت	واہ رے مطابقت!
〃	رضہ	رضامندی	رضہ	رضامندی	یہ کوئی کشمیری لفظ ہی نہیں۔

تعبیر

[illegible]

صفحہ نمبر	حوالہ	اُردو معنی	کشمیری	اُردو معنی	راقم کے ریمارک
۳۲	پلہ	کھوڑنا	بر	دیوار میں سوراخ	اس میں کیا مطابقت ہو سکتی ہے
"	بخت نصر	ظالم [illegible]	بخت نصر	کرخت، نامعقول	یہ کشمیری لفظ ہی نہیں، نہ استعمال ہوتا ہے
"	مس	دُبلا ہونا	مس	لاغری	یہ کشمیری لفظ ہی نہیں
۳۳	قطل	جان سے مارنا	قتل	جان سے مارنا	یہ کشمیری لفظ نہیں۔ یہ فارسی سے آیا ہوا ہے
"	ہمہ	شور مچانا	ہمہم	شور	ہم ہم کشمیری لفظ ہے۔ اس کے اور معنی ہیں
"	درا	نفرت	دُرہ	کتے کو بھگانا	یہ لفظ پراکرت اور سنسکرت "دُور" سے آیا ہوا ہے، عبرانی نہیں
"	درک	جگہ پکڑنا	دُرک	جونک	یہ کشمیری لفظ فارسی کے ذریعہ آیا ہوا ہے
"	رعوش	کانپنا	رعشہ	کانپنا	یہ کشمیری لفظ نہیں۔ یہ فارسی سے آیا ہوا ہے
"	رزن	سردار	رازہ	سردار۔ راجہ	واہ رے مطابقت۔ "رازہ اور راجا" ایک لفظ ہیں صرف تلفظ کا فرق
"	قشنع	خراد کے کام کی چیز	قشنُ	کھرکنا	یہ لفظ سنسکرت سے آیا ہے
"	سبب	کھانے پر بیٹھنا	سبے	دسترخوان پر آدمیوں کی صف۔	یہ کشمیری لفظ نہیں، یہ فارسی "صف" ہے۔
"	یون	مستی	یاون	مستی	یہ سنسکرت "یووون" ہے جس کو کشمیری میں "یاون" پڑھتے ہیں
"	ہون	ناچیز جاننا	ہون	کتا	یہ لفظ سنسکرت "شون" کتا ہے جس کو کشمیری "ہون" پڑھتے ہیں
"	غیر	پرایا	غیر	پرایا	یہ کشمیری لفظ نہیں۔ یہ فارسی سے آیا ہے
"	اصیل	آرام طلب	آلٹس	سست	واہ رے مطابقت! یہ سنسکرت شبد "آلس" ہے
"	مسخ	طلا کرنا	مسخ	صورت بدل دینا	یہ کشمیری لفظ نہیں
"	احبب	محبوب ہونا	حب	محبت	یہ کشمیری لفظ نہیں۔ یہ فارسی سے آیا ہوا ہے
"	دکر	کچلا جانا	دکر	دھکا	" " یہ ہندوستانی "دھکا" ہے
"	شملا	پوشاک	شملہ	پگڑی کا شملہ	" " یہ فارسی سے آیا ہوا ہے
"	شالم	سلامت ہونا	سالم	پورا	" " " "
"	شاس	ہانپنا	شانس	ہانپنا	یہ سنسکرت لفظ "شواس" ہے
"	راشہ	شریر	راشہ	شریر	یہ کشمیری لفظ نہیں
"	دمم	خاموش	دم	خاموشی	یہ سنسکرت "دم" ہے
"	طول	لمبا کرنا	طول	طوالت	یہ کشمیری لفظ نہیں۔ یہ فارسی سے آیا ہوا ہے
"	ذکر	یاد	ذکر	یاد	" " " " " فارسی "ذکر"
"	حجل	نفرت	حجل	مکر۔ فریب	" " " " "
"	شتا	بدل جانا	شتا	ویران	ان میں کیا مطابقت؟ یہ کشمیری لفظ سنسکرت "شونی" سے آیا ہے، عبرانی نہیں
"	عزل	ہٹائے جانا	عزل	ہٹانا	یہ کشمیری لفظ نہیں۔ یہ فارسی سے آیا ہوا ہے
"	مہر	عورت کا مہر	مہر	عورت کا مہر	" " " " "

تعبیر

صفحہ تعبیر	عبرانی	اُردو معنی	کشمیری	اُردو معنی	ساقم کے ریمارک
۳۲	[illegible]	جھوٹ	کذب	جھوٹ بولنا	یہ کشمیری لفظ نہیں۔ یہ فارسی سے آیا ہوا ہے
"	مزہ	چسنا	مزہ	چکھنا	" " " " " "
"	نُور	روشن	نُور	روشن	" " " " " "
"	سحر	روشنی	سحر	روشنی	" " " " " "
"	صفت	آراستہ کرنا	صفت	تعریف کرنا	" " " " "
"	قبر	دفن کرنا	قبر	قبر	" " " " " "
"	قدم	قدم	قدم	قدم	" " " " " "
"	ذبح	قربان کرنا	ذبح	قربان کرنا	" " " " " "
"	ضعف	اُداس	ضعف	کمزوری	" " " " "
"	عند	باندھنا	غنڈ	گرہ	" یہ عبرانی نہیں۔ یہ سنسکرت گنٹھ اور گنٹھ سے مشتق ہے
"	ادو	ڈھیلا کرنا	رز	رسی	جو بھی لفظ ہے مطابقت اور مشابہت نکالتے جائیے۔ دراصل کشمیری رز، سنسکرت "رجو" ہے۔ صرف تلفظ کا فرق ہے۔
"	صدق	راست	صدق	راست بازی	یہ کشمیری لفظ نہیں۔ یہ فارسی لفظ ہے۔

اس کے علاوہ موصوف کاشمیری نے عبرانیت کے حجم کو صرف کشمیر تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ گلگت، لداخ، اسکردو وغیرہ تک پھیلا دیا ہے۔ مثلاً

صفحہ تعبیر	عبرانی	کشمیری	ریمارک
۲۹	میراہ	امیراہ (پُل کا نام)	گویا امیراکدل کا نام عبرانی سے آیا ہے۔ چونکہ بائبل میں امیراہ درج ہے نہ کہ امیر خان کے نام سے مشہور ہے جیسا کہ تواریخ کہتی ہے۔
"	ارہ	ارہ بل	بائبل میں اُن کے تین لڑکوں میں سے ایک کا نام آرہ ہے۔ ارہ بل کے ساتھ کیا واسطہ؟
"	اشبل	اچھہ بل	بائبل میں "عیش بیل" نام بنیامن کے دس لڑکوں میں سے ایک لڑکے کا ہے۔ اچھہ بل کے ساتھ کیا مطابقت؟
"	اجر	اجس (بانڈی پورہ)	اجا اور آنا دو لڑکے ہیں زبعون کے۔ اجس کے ساتھ کیا واسطہ؟ چونکہ بائبل میں درج ہیں اس لئے "اجا" کشمیری اجس بتلایا جاتا ہے۔ اجس مقام کا نام ہے۔
"	ہاردن	ہاردن	بائبل میں لاٹ ہرن کا لڑکا بتلایا گیا ہے۔ ہاردن دراصل شنڈ ہردون کہلاتا تھا۔ جس کو آہستہ آہستہ ہاردن کشمیری میں کہنے لگے۔
"	اشیما	اشم	بائبل (سلاطین ۳۰) میں بتایا گیا ہے کہ سماتھ کے لوگوں نے "اشیما" کی مورتی بنائی۔ اب اشم اور اشیما میں کیا مطابقت ہو سکتی ہے؟

گویا جو بھی نام بائبل میں درج ہے وہ کشمیری نام کے ساتھ اگر کسی قسم کی مطابقت تلفظ رکھتا ہو، وہ کشمیر میں عبرانیوں سے آیا ہے۔ خوب Logic اور Linguistic Survey.

اب ذاتیں اور گوتیں ملاحظہ فرمائیے :-

تعبیر

بٹ۔ یہ دراصل "بھٹ" ہے جو کشمیری ذات ہے نہ کہ عبرانی۔ بائبل میں حوالہ نہیں پایا گیا۔

کوترو :- بائبل میں کیتورہ کے بچوں کا نام (پیدائش ۲۵-۴ میں) دیا گیا ہے۔ یہ ذات کہاں سے آئی؟ کوتر کشمیری میں کبوتر کو کہتے ہیں اور کبوتر پالنے والے کی "ریژھ" "کوتر" ہے۔ ورنہ ان کا اصل گوت نہیں ہے۔

میر۔ عشائی۔ گونی۔ قریشی۔ ملک۔ مرزا وغیرہ مسلمان کشمیریوں کی ذاتیں ہیں اور یہ وہ مسلمان ہیں جو باہر سے آکر یہاں آباد ہوئے۔

نہرو۔ نہور۔ چونکہ نہور بائبل (اتواریخ ۱-۲۶) میں سیرگ۔ تیراہ ابرم کے ساتھ آیا ہے جو جوکتان کے لڑکے ہیں۔ اس لئے بقولِ موصوف یہ نہرو ذات ہے۔ . دراصل نہرو کوئی ذات نہیں ہے یہ "ریژھ" ہے۔ کشمیری میں "نور" کہتے ہیں۔ نہرو پنڈت موتی لال نہرو کے باپ کے وقت سے "ریژھ" شروع ہوئی کیونکہ وہ نہر کے نزدیک رہتے تھے۔

کول :- بائبل کا حوالہ نہ ملا۔ کوئی نادان ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ "کول" ذات کشمیری نہیں ہے۔ کشمیریوں کی ایک سو تنتیس (۱۳۳) گوتیں ہیں جن کا حوالہ مردم شماری رپورٹ سن ۱۹۱۱ء میں دیا گیا ہے۔ موصوف کو چاہیئے کہ وہ اپنی واقفیت بڑھانے کے لئے اس کا ملاحظہ کرے۔ کشمیری گوتیں رشیوں اور منیوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور کشمیری ان ہی کی اولاد ہیں نہ کہ عبرانی ہیں۔ کول دتاتری رشی کی اولاد ہے۔

منٹو :- فضول کوشش کی گئی ہے اس کو بائبل کے ساتھ ملانے کی۔ منٹو کشمیری نہ ذات ہے نہ گوت۔ یہ "ریژھ" ہے۔ کشمیری میں "چھ پاؤ" کو "منٹ" کہتے ہیں۔

سر مینہ :- بائبل (اتواریخ ۴ : ۲۰) میں شیمان کے لڑکے امنان۔ رناہ۔ بن حنان اور تِلان بتلائے گئے ہیں۔ چونکہ رناہ اس میں درج ہے اس لئے خواجہ نذیر احمد کی کتاب میں اس کو رینہ کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ باقی نام کیوں چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ رینہ دراصل "راجانک" کہلاتے ہیں۔ راجانک کو کشمیری میں رازدان کہتے ہیں اور رازدان کا مخفف رینہ ہے جو کہ ڈوگروں کے آنے سے مروج ہوا۔

شورا :- یہ کشمیری مسلمانی ذات نہیں ہے۔ یہ "ریژھ" ہے۔ جو لوگ "شورہ" یعنی بارود سازی کا کام کرتے تھے اور آتش بازی کا سامان بناتے تھے وہ "شورہ" کہلاتے ہیں۔

عراقی :- اسی طرح ذات یا گوت نہیں ہے جو دکان داری کرتے ہیں۔

ان کو کشمیری "ہرؔ" "ووڈ" کہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

نگارندہ نے افغانستان، صوبہ سرحد، بخارا و سوات کا حوالہ دیا ہے اور کہتا ہے کہ طوالت کی وجہ سے یہاں کی ذاتیں درج نہیں کی جاتی ہیں۔ شاید موصوف یہ غلطی نہ کرتا۔ مگر کرے کیا؟ Jesus in Heaven on Earth میں مصنف نے اسی طرح ایک باب میں لکھا ہے۔ مصنف اور نگارندہ بقول ان کے ہیں کہ جن ذاتوں اور گوتوں کا وہ حوالہ دیتے ہیں وہ ذاتیں مسلمان افغانوں کی تھیں اور وہ اُن کے عہد میں کشمیر میں رائج ہوئیں۔ افغان اٹھارہویں صدی میں کشمیر آئے۔ اُس کے بعد اُن کی ذاتیں رائج ہوئیں نہ کہ عبرانیوں کی۔

اب کشمیریوں اور اسرائیلیوں کی عادات کے متعلق سنیئے :-

(۱) بالکل ننگا سونا :-

یہاں کوئی بالکل ننگا نہیں سوتا۔ نہ ہندوستان کے کسی پردیش میں ایسی عادت ہے۔ ننگا سونا موسمی حالات پر منحصر ہوا کرتا ہے۔ مگر تو بھی کوئی بالکل ننگا نہیں سوتا ہے۔ شاید اسرائیلی بھی نہیں سوتے ہوں گے!

(۲) تیل کا استعمال کرنا :- تیل صرف کشمیری نہیں بلکہ مدراسی، بنگالی وغیرہ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے کیا وہ بھی اسرائیلی ہیں۔ گھی کشمیر میں استعمال کیا جاتا ہے۔ گو کشمیری مسلمان اس کا زیادہ استعمال نہیں کرتے ہیں وہ بھی موسمی حالات کی وجہ سے اور اقتصادیات کے کارن!

(۳) عورتوں کا رونا :- کیا مشابہت کی بات موصوف کو ملی۔ عورتیں ہر جگہ اسی طرح روتی ہیں۔

میں یہاں پر صاحبِ موصوف سے عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ وہ تاریخی معاملات میں اس قسم کی معمولی باتوں پر بنیاد رکھ کر عمارتیں بنانے کی کوشش نہ کریں۔ یہ ایک عالمگیر حقیقت ہے کہ عورتیں ہر جگہ روتی ہیں۔ اسے کسی خاص قوم کے ساتھ وابستہ کرنا تاریخ کے ساتھ ظلم کرنا ہے۔

(۴) زچگی کے بعد نہانا :- یہ رسم عام نہیں۔ ساتویں آٹھویں دن ہی نہایا جاتا ہے۔

(۵) تابوت :- تابوت مسلمانوں کے ساتھ کشمیر میں آیا۔ اس سے پہلے کشمیر میں تابوت تھا ہی نہیں۔ اگر چوڑا ہو یا تنگ ہو، یہ مسلمانوں کی مذہبی روایات کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ عبرانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!

(۸) قصابوں کی چھریاں :- ایسی چھریاں ہر جگہ ہندوستان میں پائی جاتی ہیں۔ اسرائیلی کا سوال ہی کہاں ؟

(۹) ھانجیوں کے چپو :- چوں کہ کشمیری چپو "دِل" کی شکل کا ہے اور دِل کو ایک اہم درجہ حاصل ہے اس لئے اس قسم کا چپو پُرانے زمانے سے چلا آتا ہے۔ اسرائیلیوں نے کشمیریوں سے سیکھا ہوگا۔ کیونکہ وہ بے چارے تمام عمر ریگستانوں، صحراؤں اور وادیوں سے نکل کر اور دربدر پھر کر واپس گھر پہنچنے میں کام یاب ہوئے۔ اسی طرح ڈونگوں کا استعمال کرنا بھی۔ یہ من گھڑت کہانی کہ کشمیریوں نے "persecuted Jews" سے سیکھا' بے کار نہیں تو اور کیا ہے ؟

(۱۰) قبرستان :- قبرستان چودہویں صدی سے پہلے کشمیر میں تھے ہی نہیں۔ یہ مسلمانوں کے ساتھ آئے۔ نگارندہ کو تو Confusion تھا ہی' وہ اوروں کو بھی پریشان کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اگر برن کا رواج کشمیری قبرستان پر ہے' یہ مسلّم باہر سے مسلمانوں کے ساتھ آیا ہے۔

(۱۱) بھُنی ہوئی مچھلیاں

یہ طریقہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کشمیر میں آیا۔ کشمیری ہندو اب بھی بھُنی ہوئی مچھلیاں کھاتے ہیں نہ مسلمانوں سے پہلے کھانے کا رواج تھا۔ اس میں مچھلیاں بھُننے کا طریقہ بھی مسلمانوں کے ساتھ آیا۔ پہلے یہ تھا ہی نہیں !

(۱۲) کشمیر میں ہزاروں سال کی قبروں کا ہونا مستند روایت نہیں ہے۔ قبریں چودہویں صدی کے بعد شروع ہوئی ہیں۔ اس لئے ان کے رُخ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ "سمادھی" جس کا نگارندہ کو علم ہی نہیں' ہندوؤں کی ہوا کرتی تھیں' وہ قبریں نہیں۔ اس لئے اُس نے ان کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ اسرائیلی کیا' عیسائیوں کا بھی یہاں مسلمانی حکومت سے پہلے وارد ہونا نہیں پایا جاتا۔ اگر بقولِ "البیرونی" کشمیری کسی غیر شخص کو اندر آنے ہی نہیں دیتے تھے تو یہودیوں کا یا عیسائیوں کا کشمیر میں آنا ہی ناممکن تھا۔ جو قبریں کشمیر میں حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کی بتلائی جاتی ہیں۔ اُن کے وجود کی کوئی مستند روایت نہیں ملتی !

(۱۳) کشمیری پنڈتانیوں کا لباس

یہ یہودیوں کا نہیں۔ لمبا چوغا کشمیری مرد اور عورتیں پہنتی تھیں صرف فرق اتنا تھا کہ عورتیں آستین کھُلا رکھتی تھیں۔

(۱۴) کشمیری معتقدات

یہ معتقدات مسلمانوں کے ہیں اور مسلمان ہی فرشتوں کو مانتے ہیں۔ فاتحہ خوانی مسلمان کرتے ہیں اور مسلمانی وقت کے بعد کا ہے۔

(۱۵) بیبم بھاٹہ کی قبر

چونکہ قبریں مسلمانی وقت سے شروع ہوئی ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی اسرائیلی تاجر کشمیر آیا ہو اور اس کی قبر بنی ہو۔ جس پہ عبرانی الفاظ ہوں۔

آرٹ اور فن

اس کے متعلق بہتر یہ ہوگا کہ تواریخ کا ملاحظہ کیا جائے۔

سکندر ہندوستان آیا اور یونانیوں کا آرٹ ہندو آرٹ کے ساتھ مِل کر مروّج ہوا۔ اس موضوع پر بحث کرنا تضیعِ اوقات ہے۔ جب اسرائیلی تواریخ سے بھی ایسا نہیں پایا جاتا سر آرل سٹائن، مسٹر کنگھم وغیرہ وغیرہ کی تصانیف کا مطالعہ اس کے متعلق ہر ایک شک رفع کر سکتا ہے۔

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ آرین لوگ وسطِ ایشیا میں تھے اور تمام یورپین مؤرخوں اور لوکمانیہ بال گنگادھر تلک کی پُستک "Artic Home in Vedas" کے مطابق ثابت ہے کہ آریا لوگ ہی ایشیا اور یورپ میں پھیل گئے اور جہاں جہاں وہ گئے وہ اپنی تہذیب اور تمدّن کو ساتھ لے گئے۔ اگر اسرائیلیوں نے ان سے کچھ سیکھا ہوگا اُس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کشمیر آئے اور کشمیری زبان اُن کی ہے۔ چونکہ کشمیری زبان کے متعلق ڈاکٹر گرائرسن مسٹر بوہلر وغیرہ نے بہت کچھ لکھا ہے اس لئے میں کسی دوسری اشاعت میں اس زبان کے متعلق لکھنے کی کوشش کروں گا۔

غزل

(مزاحیہ)

اُن کا جنوں برقرار دیکھئے کب تک رہے
قیس کی یہ یادگار دیکھئے کب تک رہے

دِل میں غمِ روزگار دیکھئے کب تک رہے
تھانے میں یہ تھانیدار دیکھئے کب تک رہے

اہلِ دُوَل کا مزاج گرم ہے کچھ آج کل
اہلِ دول کو بُخار دیکھئے کب تک رہے

اُف یہ تموّل کا جوش باقی نہیں عقل و ہوش
بھوت یہ سر پر سوار دیکھئے کب تک رہے

رازِ چمن گر یونہیں کھلتا رہا دہر میں
برہنہ عروسِ بہار دیکھئے کب تک رہے

تنگ نظر تنگ دِل خود ہی نہ جو کھا سکے
رِزق کا وہ ٹھیکیدار دیکھئے کب تک رہے

خندہ لبی میں نہاں تُرش مزاجی بھی ہے
ہانڈی میں یہ بند اَچار دیکھئے کب تک رہے

انجمنِ ناز میں مسندِ زرتار پر
غیر مہذب گنوار دیکھئے کب تک رہے

جلوہ گہِ ناز میں اُس نگہِ ناز کا !
شوق بھی اُمیدوار دیکھئے کب تک رہے

فاضل کاشمیری

غزل

لانکہِ پٹھ پمپوش لۄگتھ ؤچھ مہِ یار آبس اندر
پِیٚ ڈلس منز عام گو ہگو اشتہار آبس اندر

میں نے ایک کنول کے رُوپ میں اپنے معشوق کو پانی میں دیکھا۔ یہ خبر جھیلِ ڈل میں عام ہوگئی اور پانی میں اُس کے اشتہار لگ گئے۔

بالہ پٹھو ہر جایہِ اِستقبالہ باپت لالہ ڈْراسے
بْرونٹھہ ڈُتھو باغِ نشاطکو آبشار آبس اندر

پہاڑوں کے دامن میں ہر جگہ لالے استقبال کو نکلے اور اس میں باغِ نشاط کے آبشار پانی میں سبقت لے گئے۔

زُون ہیٚتھ، افتابہ ہیٚتھ، تارک تہٕ صبح وشام ہیٚتھ
حُسنِ قدرت ہیٚتھ ہیوو پروردِگار آبس اندر

چاند، سُورج، ستارے اور صبح و شام ... ... الغرض فطرت کی تمام نیرنگیاں ساتھ لے کر خوُد پروردگار پانی میں جھکا۔

لالہ زارک شوخ رنگ تَے خامشی ہُند جل ترنگ
کوہسار ہیٚتھ ووتھ دِہس پٹھ شالہ مار آبس اندر

لالہ زار کا شوخ رنگ، خامشی کا جل ترنگ اور سارا کوہسار ساتھ لے کر شالمار پانی میں اُتر آیا۔

دُورہِ دْرہِ گنڈ ؤیرہ زارَو، جوے بارَو ہیٚوتھ گیوٚن
بالہ داہنز ترٛنہٕ ہگو پھرِیس کینہو چنار آبس اندر

دُور سے بید زاروں نے صف باندھ لئے۔ ندیاں گانے لگیں اور کوہسار کی گود میں سفیدے اور چنار پانی میں ناچنے لگے۔

آنہ خانس منز سجوو ڈُلی حُسنچے پرِیہِ محل
دارِہ پٹھ تس نظرِہ رُوز در اِنتظار آبس اندر

ایک حسین پری نے جلد ہی پہلا ایک آئینہ خانے میں محل سجایا اور پانی میں اس کی ایک کھڑکی پر بیٹھ کر پریتم کو تکنے اور انتظار کرنے لگی۔

چھکنہ باپت تس کھیٚلوَ ہر جایہِ تھالن موختہ بھوٚر
مُنتظر رُودی، زاگ ہیٚتھ رُود بے قرار آبس اندر

کنول کی پتیوں نے اُس پر نچھاور کرنے کے لئے اپنے تھالوں میں موتی بھر لئے اور اپنے معشوق کی تاک میں پانی میں اضطراب کے ساتھ انتظار کرنے لگے۔

ناگ رادن ہیٚتہ بُٹھو بُٹھو گرایہِ ماران خسم کھیٚوان
لولہ سان سَر آلہ وان رُودی شہار آبس اندر

ڈل کے کنارے کنارے یعنی چشموں کی سرزمین پر شاہچاروں نے پانی میں پیچ و خم کھائے اور اپنے سروں کو ہلا ہلا کر قربان کرتے گئے۔

فاضلا! ؤچھ پربتکِ ساری صنم پوٗزایہِ ڈُتھو
درشنس پٹھاران قطار اندر قطار آبس اندر

اے فاضل! ہری پربت کے تمام صنم اس کی پوجا کے لئے ڈل کے اندر کنارے پر اُتر گئے اور پانی میں قطاروں میں رہ کر درشن کے لئے انتظار کیا۔

شباب ملت
ایم اے بی ٹی

اے جانِ وفا

اے جانِ محبّت، جانِ وفا
اے سُرخیٔ صد عنوانِ وفا

مجھ سے تو مقدر تھا ہی خفا تقدیر کی ہیٹی تھی تو بھی
فرزند تھا میں اِک دہقاں کا دہقان کی بیٹی تھی تو بھی
تکمیلِ محبت کی خاطر تو نے مجھے اپنا ہاتھ دیا
اخلاص کی رنگیں وادی میں ہر گام پہ میرا ساتھ دیا

اے جانِ وفا! ہم نے مِل کر ہر دورِ مصیبت دیکھا ہے
یلغارِ حوادث دیکھی ہے طوفانِ ہلاکت دیکھا ہے
تقدیر کے چکر دیکھے ہیں آفات کے لشکر دیکھے ہیں
اور وقت کے ماتھے پر ہم نے بگڑے ہوئے تیور دیکھے ہیں

محفوظ ہے اب تک ذہنوں میں غیروں کی حکومت کا نقشہ
دیکھا ہے قیامت سے پہلے آنکھوں نے قیامت کا نقشہ
جب ساہوکار کی چوکھٹ پر دِن رات جبینیں گھستے تھے
قرضے کی مسلسل چکی میں دہقانِ جفاکش پستے تھے

عصمت مجبور تھی بکنے پر غیرت نہ رہی تھی مردوں میں
یہ تلخ حقائق پنہاں ہیں ماضی کے بھیانک پردوں میں
ہفتوں وہ مسلسل فاقہ کشی بچوں کے تڑپنے کا منظر
آنکھوں میں ابھی تک ہے جیسے کل رات کے سپنے کا منظر

آ دیکھ مگر ان خوابوں کی کِس درجہ حسیں تعبیریں ہیں
مستقبل کے آئینے میں رنگین تریں تصویریں ہیں

بچپن سے ہمیں درپیش رہی بس پیٹ کی اُلجھن شام و سحر
افلاس میں تھے یُوں خاک بسر ہم کو نہ رہی اتنی بھی خبر
کب دَورِ غلامی بیت گیا

اے جانِ محبت! جانِ وفا

گو برق و باد کے نرغے تھے اس پر بھی گلستاں باقی ہے
کی لاکھ خزاں نے پامالی وہ لُطفِ بہاراں باقی ہے
وہ دَورِ رذالت بیت گیا جمہور کی اب سرداری ہے
شاہوں کے زمانے آج کہاں اب جنتا کی مختاری ہے

ماضی کے سُنہرے خوابوں کی تعبیر ہمارے ہاتھ میں ہے
تدبیر ہمارے ہاتھ میں ہے تقدیر ہمارے ہاتھ میں ہے
مرنے کی دُعا کرنے والی! آئے گا مزا اب جینے میں!
کچھ عزم نئے لہرائے ہیں ہر مردِ جواں کے سینے میں

کچھ دن میں نظر آجائے گا کیا رنگِ گلستاں ہوتا ہے
آزاد وطن میں آج نئی تعمیر کا ساماں ہوتا ہے
اب راہ نئی ہے عزم نیا
اے سُرخیٔ صد عنوانِ وفا

دیکھی تھی جو ہم نے خوابوں میں وہ حُسن کی دُنیا دُور نہیں
ہم خاک بسر انسانوں کی پستی کا مداوا دُور نہیں

بجلی کے کنوؤں سے نہروں سے شاداب زمین ہو جائیگی
ہر عزم جواں ہو جائے گا ہر چیز حسین ہو جائے گی

ہر گاؤں میں برتے جائیں گے کھیتی کے طریقِ کار نئے
صنعت کی مشینیں کل پُرزے آلات نئے اوزار نئے

ہو جائیں گی پُختہ ساری کیچڑ سے بھری کچی راہیں
باغوں میں بنائی جائیں گی بچوں کے لئے ورزش گاہیں

ہر بستی ہر آبادی میں کھل جائیں گے اسکول یہاں
ذرّات بنیں گے شمس و قمر کانٹے بھی بنیں گے پھول یہاں

لے گا نہ کوئی اسکولوں میں بچوں سے پڑھائی کی فیسیں
اُٹھ اُٹھ کے رُلائیں گی نہ ہمیں اب دردِ غریبی کی ٹیسیں

پھولوں سے مزیّن پارک کہیں بن جائیں گے ریڈنگ روم کہیں
تعلیم کی اعلیٰ دولت سے ہوگا نہ کوئی محروم کہیں

جنتا کی حکومت کے حامی سب پیر و جواں بن جائیں گے
رہنے کے لئے ہر بستی میں ہر سمت مکاں بن جائیں گے

تبدیل گلستاں میں ہوں گے لمبے چوڑے ویرانے بھی
ہو جائیں گے بجلی سے روشن مزدوروں کے کاشانے بھی

رقص و رامش کی انجمنیں، پُر کیف کلب، تفریح کدے
مل جائیں گے چپے چپے پر سامان سبھی آسائش کے

ہر فرد و بشر کے ہونٹوں پر تعمیر کے افسانے ہوں گے
دیہات میں چپے چپے پر تعمیر شفا خانے ہوں گے

مجبور و ضعیف انسانوں کو کچھ تاب و تواں مل جائے گی
ساہوکاروں کے بندھن سے دہقاں کو اماں مل جائے گی

پھٹکار ہمیشہ برسے گی غنڈوں پر قوم فروشوں پر
اب مُہر نہ ہوگی بنئے کی گندم کے سُنہری خوشوں پر

اشجار خوشی سے جھومیں گے ہر وادی ناچے گائے گی
ویرانوں میں ہُن برسے گا آبادی ناچے گائے گی

کٹ جائیں گے اب سارے بندھن کُہنہ بدنام رِواجوں کے
ہم فاقہ کشوں کے آنگن میں لگ جائیں گے ڈھیر اناجوں کے

آزاد وطن کے ماتھے سے مِٹ جائے گا داغِ بے کاری
ہوگی نہ کبھی پیکارِ طلب مزدُور سے سرمایہ داری

نکلیں گے مسرّت کے نغمے ہر سازِ دل کے تاروں سے
ڈھل جائے گی ماتم کی زردی اے جان ترے رُخساروں سے

اے رشکِ قمر کچھ تُو نے سُنا
اے سُرخیٔ صد عنوانِ وفا!

میں کرشن کنھیا بن کے ترا بن بن میں راس رچاؤں گا
تو رادھا بن کر ناچے گی میں مُرلی مدھر بجاؤں گا

بیدار کروں گا بھارت کے بے بس مظلوم کسانوں کو
گمراہ نہیں ہونے دوں گا بھولے بھالے انسانوں کو

افسردہ دِلوں میں گیتوں سے احساسِ حمیّت بھر دوں گا
اِک جوشِ رفاقت بھر دوں گا اِک عزمِ ریاضت بھر دُونگا

بیدار کریں گے رُوحوں کو نغمات مرے اشعار مرے
ذہنوں میں اُجالا کردیں گے جذبات مرے افکار مرے

ہم پیار سے مل کر دونوں خدمت کے ترانے گائیں گے
گلیوں کوچوں میں باپو کا پیغامِ عمل پہنچائیں گے

فولاد کی سختی بخشیں گے تعمیر کے پاک اِرادوں کو
سچّا آدرش دِکھا دیں گے ہم ہند کے دہقاں زادوں کو

حدیثِ دیگراں

دفتر الیکشن کمشنر جموں ۳۰/۳۱ر جنوری ۱۹۵۹ء

یوسف ٹینگ — چانٛہ چِٹھی ہا واتٕز۔ رٕژُ جواب تہٕ وُچھو واسرایے!

بُہ ہا چھُس زامُت ۷ار اپریل ۱۹۲۸ء، ژٕہ کھسراکھا؟ بیہ کیٛاہو گژھی لیکھُن؟ ہا تٕلٕو لیکھو دٕہ ژٕ پانے۔ اد فوٹو سوزٕمے نہ کینٛہہ۔ تہٕ کیازِ میوٚن پرٛون فوٹو چھوٚی اُتھ۔ نوٚو فوٹو تُلنَس سٕوٚنبر چھی نہ میٛانہ دِیار۔ پٕژھہ نے بیٚہی سنتوشس پرٛژھ نِٕہ دِے میوٚن فوٹو لبکھ تتھی کرِٕو زِہ اورہ کنہٕ یور کُن۔ اگر نہ اتھہ لگی تراٛوتہٕ تیٛلہِ فوٹو بیٚہ کتھ۔

بُہ کُس چھُس تہٕ کیاہ چھُس — ژٕ کن چھا اِچ پَنٛیٹھ۔ ژٕ کن غرض میٛانیٚن افسانن سیتو، تہٕ وِژھناوتک تہ دھونس راونک بٕتھ رِژھ کھنڈ دَتھ ہِش لگہِ بکھ — بیہ کیاہ چھہٕ آسان ضرورت۔

گوڈٕ تنٛہ نتٕ ازکتھ چھوٚی پست آمُت۔ بُہ اوسُس نا ایوارڈ کہ اعلانہ کالہٕ تام ستوٚی لیٚس ازچھُس۔ ایوارڈ کہٕ اعلانہٕ پتہٕ ہے وُنہٕ مینٛہ اکا سٹوری لیچھ تہ امہِ برٛونٛہہ ہے واریاہ لیوٚکھُم تنہٕ کوٚتہ پیوٚی ژٕہ مضمون لیکھنک ظلون تہ از چھی تارِہ تیٛونگل لگان — کرِتھ دٕہ ژٕ رٕتن بے دوفن سیتو شاملِ یم رات تام میٛانہ افسانہ نگار آسنہٕ کیٛو چوراٛسو زانان۔ کاشُر لیکھنہٕ کیٛو احمق آسو تصورکران تہٕ واتلن، چھانن، دُسلن تہٕ رنگرن ہنٛزہ کتھہٕ لیکھنہٕ کیٛو پاگل آسو ونان — مگر از چھم GENIUS ونان — ژٕہ تہٕ ما چھکھ تمی ہیوٚ فاتر؟ نتہٕ کیاہ گو از تام پیوٚی نہ ژٕہ خیال تہٕ از پیوٚی۔

خیر ژٕ ونہٕ گو نہ ژٕیر۔ ژٕہ ہے کینٛہہ لیکھمک، میٛانہ نیرن پتہٕ بس ذہنس شروکہ۔ مگر حقیقتس یُتھ لطیف بیٛہِم کورتہٕ تہٕ میٛانہ کرکھ پھیر۔ میوٚن مرُن چھوٚی تی نے لیکھمک یہ پرٛزِ پانٛٹھ FEEL کوٚرمت چھُت۔

تہٕ کر شروع۔ بُو چھُسے پرٛاران۔ باقی چھ اُسو وارٕے۔ شمیم دِپان اکس دوٚن دٕہ ہن تام واتہ۔ چون بھوٚی: — اختر محی الدین

گرلز کالج سری نگر۔ ۱۹ر فروری ۱۹۵۹ء

محترمی شمیم صاحب السلام علیکم!

آپ کا ماہِ دسمبر ۱۹۵۸ء کا "تعمیر" ملا۔ شکریہ! عبدالغفور شوپیانی اور ایبہ خان چک بہت پسند آیا۔ ایسی مایہ ناز ہستیوں کا ذکر آج تک بہت کم لکھنے میں آیا ہے۔ اُمید ہے کہ رسول میر نمبر بھی ارسال فرمائیں گے۔ شکریہ!

فقط شملہ بیگم گورنمنٹ کالج فار ویمن سرینگر

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۸ء

مکرمی شمیم صاحب، تسلیم!

اُمید ہے کہ مزاج اچھا ہوگا۔ "تعمیر" کو ایک عرصہ سے پڑھتا ہوں، پرچہ کا آپ نے بہت اچھا معیار رکھا ہے۔ اس کی مبارک باد قبول کیجئے۔ کیونکہ آپ نے اس کو صرف کشمیریوں کی حد تک ہی محدود نہیں کیا ہے۔ بلکہ آپ نے اس کو ہندوستان کے صفِ اوّل کے پرچوں میں جگہ دِلائی ہے۔ میں یہاں یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔ حیدرآباد دکن کا باشندہ ہوں۔ عرصہ سے ادبی دُنیا میں ہوں۔ لیکن ہمیشہ میں نے چھپنے چھاپنے کی طرف توجہ نہیں دی۔ چونکہ سُنا کہ آپ بڑے با ذوق شاعر اور ایڈیٹر ہیں۔ اسی لئے یہ غزل تعمیر کی اشاعت کے لئے ارسالِ خدمت ہے کسی قریبی اشاعت

میں شائع فرمائیں۔ آپ کی گراں قدر رائے کا مجھے انتظار رہے گا۔

امیر عارفی

اندرون جامع مسجد۔ اُردو بازار گورکھپور

۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء

میاں شمیم۔ دُعائیں۔

یاد آوری کا شکریہ۔ معلوم ہوا کہ میرا مضمون "تعمیر" میں ماہِ جولائی میں شائع ہوا۔ غالباً "اُردو شاعری میں تصورِ شیخ" ہی والا مضمون رہا ہوگا۔ یہاں جولائی کا شمارہ نظر سے نہیں گذرا، کم سے کم بواپسی ڈاک ایک کاپی بھجوا دو تاکہ ریکارڈ میں رکھ سکوں۔ اب غالباً میرے مضامین کا سلسلہ جاری رہے گا۔ "تعمیر" واقعی ادب کی تعمیر کی جدید کر رہا ہے اور موجودہ دَور کی دھڑے بندیوں سے اسے کوئی لگاؤ نہیں ہے بلکہ ایک خاص آزادانہ پالیسی ہے جو کشمیری کردار کی آئینہ دار ہے۔

والسلام۔ خیر اندیش :۔ عبدالغفار بجنوری

مسلم لائبریری ۲۰ر نور اللہ روڈ۔ الہ آباد ۳

مکرمی ایڈیٹر صاحب ماہنامہ "تعمیر" سری نگر۔ آداب!

آپ کا ماہنامہ ایک صاحب کے پاس تھا، نظر سے گذرا۔ شمارہ ماہ جولائی ۱۹۵۸ء کا تھا۔ دیکھ کر خوشی ہوئی اتنا شاندار رسالہ۔ طبیعت خوش ہوگئی۔ لائبریری میں چند دوسرے حضرات تھے۔ انہوں نے دیکھا اور پسند کیا۔ خصوصاً عبدالغفار بجنوری کا مضمون بہت پسند کیا گیا۔ عبدالغفار صاحب بجنوری چونکہ ہمارے ہی ہیں اس لئے اور بھی ہم لوگ خوش ہوئے۔ خدا کرے یُو، پی اور سری نگر کا یہ ادبی رشتہ اور بھی ترقی کرے۔ اُمید ہے کہ بجنوری صاحب کے رشحاتِ قلم سے مزید نوازیں گے اور وقتاً فوقتاً اُن کے مضامین آپ کے رسالہ میں آتے رہیں گے۔ اسی سلسلہ میں عرض ہے کہ اگر ہماری لائبریری کو ایک کاپی "تعمیر" کی اعزازاً بھیجتے رہیں تو اور بھی نوازش ہوگی۔ والسلام آپ کا مخلص : خالد انعام لائبریرین

برادرِ مکرم! سلام شوق

کسی کی چشمِ بہار آفریں کی تم کو قسم
اُداس کیوں ہو مری زندگی کے ویرانو!

یہ کہہ کر میں اپنی خلش ناک افسردگی کو کب تک بہلاؤں۔ گل گشتِ کشمیر سے واپس آنے کے بعد میں نے آپ کو ایک خط لکھا تھا۔ صد حیف کہ اب تک اس کے جواب سے محروم ہوں۔ اس تغافل رنگینی کا گلہ کس سے کروں، نگہ بے نیازی کی اس ادائے گریز سے لطف لیتا ہوں اور جیتا ہوں۔

ستمبر میں پھر آپ کے "کوچۂ ناز" میں "محشرِ رنگ و نوا" برپا ہوا تھا۔ محترم اثر لکھنوی مدظلہ کے گرامی نامہ سے معلوم ہوا تھا۔ غالباً موصوف بھی تشریف لے گئے تھے۔ اُمید ہے آپ اس گذشتہ پروگرام کی تفصیل سے آئندہ محبت نامہ میں مجھے آگاہ فرمائیں گے تاکہ ان طرب ناک و خوابناک نظاروں سے نصف ملاقات تو کر لوں۔ "تعمیر" کے شمارے کئی ماہ سے نہیں ملے۔ اگر شائع ہوئے ہوں تو ارسال فرمائیں۔ بڑا انتظار رہتا ہے۔ اس تقریب کو خوش آئند بنانے کے لئے "تعمیر" کے لئے ایک غزل مرسل ہے۔ اُمید ہے کہ پسند فرمائیں گے۔ والسلام آپ کا فضا ابن فیضی

ماہنامہ

سری نگر

تعمیر

کشمیر کی جھیلیں۔

ماہنامہ

تعمیر

سرینگر

اگست سنہ ۱۹۵۹ء

جلد ۴ —————— شمارہ ۱۹

ایڈیٹر

محمد یوسف ٹینگ

قیمت فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے —————— سالانہ ۶ روپے

ترتیب

سرورق:- وادئ کشمیر میں خزاں کی آمد آمد
سیب آنار سے بار ہے ہیں!

زاویے

۱۵ اگست ہم ہندوستانیوں کے لئے فقط ایک تاریخ کی حیثیت ہی نہیں رکھتا بلکہ ایک ایسی علامت کی بھی جو ماضی کی قربانیوں اور مستقبل کے خوابوں کا عظیم اور گمبھیر مفہوم بھی رکھتی ہے۔ یہ علامت ہمارے جذبۂ حریت کی سرخروئی اور ہمارے تعمیری تخیل کی رسائیوں کا ایک افسانۂ خاموش ہے۔ آزاد رہنے کا جذبہ انسان کا سب سے ارفع جذبہ ہے اور اس لحاظ سے ہماری قوم کے لئے یہ تقریب سب سے متبرک اور مقدس تہوار بن گئی ہے۔ اس دن ہم ماضی کے اُن شہیدوں کی یاد بھی مناتے ہیں جن کا جوان خون ہمارے سندر دیش کے صفحۂ زمین پر گرا اور آخر میں اُفق کو حریت کے گلنار رنگ سے رنگ دیا۔ یہ دن اُن کی یاد کا سوگ نہیں بلکہ اُن کے خوابوں کی کامرانی کا نغمۂ جاودانی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ دن ہمارے ماضی اور مستقبل کے ڈانڈوں کو ملانے والا سنگم بھی بن گیا ہے۔ کیونکہ اسی دن ہم ماضی کے تمنا زار کا جب تصور کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی ساتھ گل کدۂ خیال کے ان نقوش کو حقیقت کی صورت گری سے آشنا کرنے کے لئے ارمان بھی انگڑائیاں لیتے ہیں اور ہم خیال و حقیقت کی اس خلیج کو عبور کرنے کے نئے عزم اور نئے منصوبے باندھتے ہیں۔ اس لحاظ سے جب ہم گذشتہ بارہ برس کی تاریخ پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں کسی طور بھی مایوسی نہیں ہوتی بلکہ اپنی پُر مشقت جدوجہد اور قریب آئی ہوئی منزل کے احساس سے ہمارا سر فخر سے تن جاتا ہے۔ ہماری متوازن پیش رفت کی صحت مندی کے لئے اس امر کا اظہار لازمی ہے کہ نہ صرف داخلی تعمیر میں ہم ایک جمہوری روح کو کارفرما پاتے ہیں بلکہ خارجی معاملات میں بھی ہمارے تعمیری احساس کی جلوہ گری عالمی امن کی استواری کے لئے ایک فیصلہ کن اثر بن گئی ہے۔ ہم نے عسکری جتھہ بندی اور آمرانہ رجحانات کو ترجیح نہیں کی۔ مگر اس کے باوجود ترقی کے میدان میں ہمارے کارنامے کسی سے کم نہیں ہیں اور اس طرح ہم نے جمہوریت کے اس چراغ کو، جو پچھلے برسوں سے ناسازگار ہواؤں کی زد میں تھرتھرا رہا ہے ایک نئی پناہ اور نئی آب و تاب بخشی ہے جو بجا طور اس کی تقدیر کا حکم رکھتی ہے۔

کشمیر میں سیلاب نے جو تباہی مچائی اُس کا تاثر کتنا شدید ہے، اُس کا اندازہ ہندوستان بھر میں سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں کے ردِعمل سے لگایا جاسکتا ہے۔ یوم آزادی کی مبارک تقریب پر صدر ریاست شری کرن سنگھ جی کا پیغام بھی سیلاب کا شدید تاثر لئے ہوئے تھا۔ مبارکباد دینے کے دوسرے ہی لمحے اُنہوں نے سیلاب کی تباہ کاریوں اور سیلاب زدگان کے بے اندازہ نقصان کا ذکر کرکے ریاستی عوام کے موڈ کی برمحل ترجمانی کی۔ درحقیقت یہ احساس اب صرف احساس ہی نہیں رہا بلکہ اس نے سیلاب روک اقدامات کے ایک ہمہ گیر اور عظیم منصوبے کی شکل اختیار کرلی ہے۔ مرکزی حکومت نے اس سلسلہ میں جو ماسٹر پلان تیار کیا ہے وہ کشمیر کی حسین وادی کو سیلابی اژدہے کے خونخوار جبڑے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باہر نکالے گا۔ کروڑوں روپے کی لاگت سے پایۂ تکمیل کو پہنچنے والا یہ عظیم منصوبہ تین مرحلوں میں مکمل ہوگا جس کے دوران جہلم کی کھدائی ہوگی۔ اس کے پشتے تعمیر کئے جائیں گے اور اس کے کناروں کو اونچا کیا جائے گا۔ اس وقت اس منصوبے کی کاغذی تیاریوں کے سلسلے میں جو سرگرمی دکھائی جارہی ہے اُس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ اس پر فوری طور پر عملدرآمد شروع ہوگا اور اسے سُرعت کے ساتھ کم سے کم وقت میں اختتام پذیر کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جائے گا!

آچاریہ ونوبا بھاوے نے اپنے دورہ کشمیر میں بہت سے اہم مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور بہت سی قابل توجہ باتیں کہی ہیں۔ کشمیری زبان سے متعلق انہوں نے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ قابل غور ہی نہیں بلکہ اس لائق ہیں کہ ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے فوری طور اقدامات کئے جائیں۔ آچاریہ جی نے کہا کہ جو لوگ کشمیری زبان سیکھنا چاہتے ہوں اُن کے لئے ایسا کرنا اس لئے مشکل بن جاتا ہے کیونکہ کشمیری زبان کی اپنی کوئی ڈکشنری یا گرامر نہیں ہے۔ اس سلسلے میں کچھ کام آج سے ۵۰ برس پہلے چند انگریز محققوں نے کیا ہے مگر اہل زبان اس سلسلے میں آج تک خاموش ہیں۔ مناسب ہوگا اگر وزارت تعلیم کلچرل اکاڈمی کے تعاون سے اس نیک کام کو ہاتھ میں لیتی اور زبان و ادب کی مفید خدمت

بشیشور پرشاد منور لکھنوی

پیمانِ وفا

تمام ہند بہ کشمیر جاں نثار شود — تمام ہند بہ کشمیر جاں سپار شود

تمام ہند کند نقشِ پاک را باطل — تمام ہند بہ کشمیر حق گذار شود

تمام ہند درآید نجوم سعد بدست — تمام ہند بہ کشمیر سازگار شود

تمام ہند ز کشمیر یافت ہم نفسے — تمام ہند بہ کشمیر غم گسار شود

تمام ہند بہ کشمیر نالہ برلب ہست — تمام ہند بہ کشمیر نغمہ بار شود

تمام ہند ز کشمیر می کشد دردے — تمام ہند بہ کشمیر دستِ یار شود

تمام ہند بہ کشمیر التفات کند — تمام ہند بہ کشمیر دل بہ کار شود

تمام ہند ز کشمیر نیست در غفلت — تمام ہند بہ کشمیر ہوشیار شود

تمام ہند فشاند سرشک خوں بہ غمش — تمام ہند بہ کشمیر بے قرار شود

عدو در آتشِ پیکار خاک خواہد شد

ز پاک خطۂ کشمیر پاک خواہد شد

شکیل الرحمان

تنقیدیں

ایک شخص ہمیشہ ایک ٹیڑھے لمبے راستے سے ہوکر اپنے بنگلہ پر جایا کرتا تھا اسے خود معلوم نہ تھا اس کی وجہ کیا ہے۔ وہ کیوں ٹیڑھے لمبے راستے سے ہوکر گذرتا ہے حالانکہ اس کے بنگلہ تک ایک سیدھا راستہ بھی موجود تھا اس کے پاؤں خود بخود ٹیڑھے راستے کی طرف اُٹھ جاتے تحلیل نفسی (PSYCHO ANALYSIS) کے بعد تجزیہ سے یہ معلوم ہوا کہ اس سیدھے راستے پر اس نے ایک مکان کے دروازے کے باہر ایک "کالا کوٹ" لٹکتے دیکھا تھا۔ بچپن میں اسے اپنے ایک رشتہ دار سے سخت نفرت تھی اور وہ اس قسم کا کوٹ پہنا کرتا تھا۔ یہ تھا بچپن کی دبی ہوئی ایک یاد کا عجیب اظہار! جدید اردو تنقید میں بھی ٹیڑھے لمبے راستے پسند کئے جاتے ہیں۔ تنقید میں سلجھی ہوئی صاف باتیں کم ہیں جدید تنقید کی تحلیل نفسی کی ضرورت ہے یا نہیں یہ فیصلہ تو ماہرین نفسیات کریں گے، ہم صرف یہ سوچتے ہیں کہ اگر کوئی "کالا کوٹ" یہاں بھی موجود ہے تو ہمارے شعور اور لاشعور کا اس سے کیا تعلق ہے؟ ہمیں کیوں ناحق الجھایا جاتا ہے؟ بعض جدید نقاد بنیادی حقیقتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ ٹیڑھے لمبے راستے سے چلنا پسند کرتے ہیں۔ کبھی فقرے بازی کو تنقید سمجھتے ہیں اور کبھی ابہام اور الفاظ کے طلسم میں انہیں مزہ ملتا ہے۔ تنقید میں انشا پردازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ تنقید نگاری کے تقاضے کیا ہیں اور تنقید میں سماجی عمرانی اور جمالیاتی اقدار کے مطالبے کیا ہیں؟ جن نقادوں نے ادبی مسائل کو پیداواری رشتوں اور اس کے تضاد اور کشمکش کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے انہوں نے اردو تنقید کو زیادہ سرمایہ دیا ہے اور انہوں نے بھی جدید تنقید میں اضافے کئے ہیں جنہوں نے تاثراتی اور جمالیاتی اقدار کی قدر و قیمت کا اندازہ ان کے سماجی حالات کے پس منظر میں کیا ہے ان نقادوں کے یہاں اپنا نقطۂ نظر ہے۔ تشریح اور تجزیہ کے وقت ان کا نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری۔ سید احتشام حسین۔ اختر انصاری۔ آل احمد سرور وقار عظیم اور ممتاز حسین اور پھر نیاز فتح پوری اور کلیم الدین احمد کے تنقیدی مقالے مثال کے لئے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ حقیقت کے متعلق ان کے ذہنی رجحان کو سمجھنے میں قطعی کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ خورشید الاسلام کے متعلق سوچتے ہوئے اردو تنقید کی ان اہم باتوں کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا تنقید میں فکر کی تدریجی تاریخ کے پیش نظر ان کا یہ مجموعہ واقعی کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

خورشید الاسلام کی زبان بہت پیاری ہے۔ اُن کے اسلوب نے مولانا ابوالکلام آزاد۔ نیاز فتح پوری اور مولوی عبدالحق کو بھی تڑپایا ہے اُن کے اسلوب سے ہر ذہین انسان متاثر ہوگا اس لئے کہ ان کے لب و لہجہ میں بڑی دلکشی اور کشش ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ جدت اور شاعرانہ لطف و انبساط کے لئے تنقید کی راہ سے ہٹ جاتے ہیں کسی کے اسلوب سے متاثر ہوکر اپنا ایک اسلوب پیدا کرنا بہت دشوار ہے رشید احمد صدیقی کے لب و لہجہ اور ان کے اسلوب کا رنگ ان کے طنز و ظرافت میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے یہ تو آنے والی نسلیں فیصلہ کریں گی کہ وہ ایک بڑے نقاد ہیں یا نہیں، ان کی تنقید میں بھی ان کے اسلوب کا جادو جا بجا موجود ہے، رشید احمد صدیقی کی نثر کا جو منفرد اسلوب ہے اس میں خوبصورت شیشوں کے نہ جانے کتنے ٹکڑے ایک ساتھ مل گئے ہیں۔ ان کے اسلوب سے متاثر ہوکر اپنا ایک اسلوب پیدا کرنا ممکن نہیں۔ تنقید کے لئے ایسے اسلوب کو اپنانے کی کوشش جدید نقادوں کے لئے شاید زیادہ مناسب نہ ہو، رشید احمد صدیقی سے خورشید الاسلام تک اردو تنقید نے جو سفر کیا ہے، اس کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ مختلف نظریوں نے جنم لیا اور تنقید کے

مختلف اسلوب سامنے آئے۔ متاثر ہونا فطری ہے لیکن نقالی کی حد تک مناسب نہیں اور اس وقت جبکہ خود اپنے پاس پیاری زبان ہو یہ اور بھی عجیب بات ہے۔ یہ اثرات مختلف رنگ میں سامنے آتے ہیں کہیں تو صرف فقرے بازی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"زندہ رہنے اور خط لکھنے کے لئے زندگی کا احترام ضروری ہے زندگی سے میری مراد ہے اونچی نیچی سڑکیں۔ چھوٹی بڑی دوکانیں۔ جیٹھ کی دھوپ۔ برسات کی اندھیری بھیانک مچل جانے والی راتیں۔ قہوہ خانے گلابی جاڑوں میں نظریں۔ بچا بچا کر مسکرانے والے پھول۔ مرجھائے ہوئے معصوم چہرے۔ پرانی چیزوں کا نیا پن۔ سادگی میں بناوٹ نیکیوں میں چھپی ہوئی کمزوریاں۔ پندار کی تہہ میں انکسار علم الکلام اور سنگر مشین"۔

"دیوبند کا نقطہ نظر تو صاف ہے . . . . یہ اور بات ہے کہ اس کے خمیر میں خود سقراط اور بطلیموس کا خون ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس میں ابھی تک کوئی فساد واقع نہیں ہوا اور بفرض محال ہو بھی جائے تو کچھ نسخے جو سینہ بہ سینہ چلے آ رہے ہیں اُن پر بزرگوں کو ایسا ہی اعتماد ہے۔ جیسا قرآن کے غیر مخلوق ہونے پر"

". . . . حالی اس خوبی سے یقیناً محروم ہیں جو شبلی میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور شبلی ہی پر کیا منحصر پوری جرمن قوم میں پائی جاتی ہے۔"

خورشید الاسلام کے نزدیک شبلی پہلے یونانی ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے "حالی خالص روحانی اعتبار سے پہلے بدھ ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے "شیفتہ عربوں کا مزاج لے کر پیدا ہوئے تھے" (معلوم نہیں ہمارے ادب میں اب کوئی دلائی لاما بھی پیدا ہوا ہو) اسلوب کی دلکشی اور رنگینی میں وہ اس طرح کھو گئے ہیں کہ انہیں شبلی کی زبان کی سرمستی یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ "حالی کوئی بڑے فن کار نہیں تھے" اس لئے کہ "حالی کے الفاظ پگھل کر کچھ اور نہیں بنتے" انہیں حالی سے یہ شکایت پیدا ہو جاتی ہے کہ "وہ روحانیت کی اس منزل تک نہ پہنچ سکے جہاں تضاد۔ آہنگ سے اور کشمکش آسودگی سے بدل جاتی ہے" خورشید الاسلام تسلیم کرتے ہیں کہ خطوط میں انشا پردازی کے نمونے نہیں ہوتے اور نہ ہونے چاہیں لیکن اس کے باوجود انہیں شبلی کی انشا پردازی متاثر کرتی ہے اُن کے تینوں مقالوں "خطوط نگاری" "حالی" اور "شبلی" میں تنقیدی اشارے کم ہیں اور "ایسے" (ESSAY) کی دلکشی اور دلربائی زیادہ کہیں کہیں بڑی جان پر ور فضا ہے۔ ان کے مزاج کی حسیاتی کیفیت SENSUOUSNESS اور جذبے کی شدت کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ رمزیت اور ایمائیت تلمیحوں اور تمثیلوں کے سہارے ابھری ہے اور پھر ایک بانکپن پیدا ہو گئی ہے لیکن اچھوتے پن اور جدت کی تلاش میں انہیں ناکامی بھی ہوئی ہے جہاں وہ مکتوب نگاری کی ابتدا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں وہاں محسوس ہوتا ہے جیسے انہوں نے براہِ راست کوئی مطالعہ نہیں کیا یہاں وہاں سے کچھ باتیں مل گئی ہیں اور انہیں پیش کر دیا ہے۔ دو چار اچھی کتابوں سے بھی کچھ معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ لیکن انہوں نے سُنی سنائی چند باتوں پر بھروسہ کیا اور اظہار کے لئے جب ٹھوس حقیقتیں نہ مل سکیں تو انہوں نے "سیاروں" "فرشتوں" "گرمیوں کی چاندنی" اور "انجیل کی پہیلیوں" کا سہارا لیا۔ ان میں کوئی تنقیدی اشارہ نہیں ملتا پس منظر پر محنت زیادہ ہے۔ اس پس منظر میں اپنے سرمایہ کے بارے میں جو باتیں کی گئی ہیں وہ بہت حد تک تشنہ ہیں۔ خورشید الاسلام خدانخواستہ یہ ثابت کرنا نہیں چاہتے تھے کہ مغربی خطوط نگاری کے ہمارے سرمایہ پر کیا اثرات ہیں اور وہ مغربی خطوط نگاری اور اپنے سرمایہ کا تقابلی مطالعہ بھی کسی خاص نقطہ نظر سے نہیں کر رہے تھے ایک بے ربطی سی پیدا ہو گئی ہے، سپسرد۔ گیرے۔ ولیم کوپر۔ چارلس لیمب شیلی۔ بائرن اور کیٹس کے خطوط کی خصوصیتیں کسی حد تک معلوم ہو جاتی ہیں لیکن غالب اور مہدی افادی کے متعلق کوئی بات معلوم نہیں ہوتی، ظاہر ہے خورشید الاسلام کا موضوع "خطوط نگاری" ہے لیکن جب وہ غالب اور مہدی افادی کا ذکر کر رہے ہیں تو ان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے۔ انہوں نے توازن پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مغرب میں مکتوب نگاری کا جائزہ لیکر وہ یہ ضرور کہتے ہیں "اس روشنی میں ہمیں اپنے سرمایہ پر نظر ڈالنی ہے لیکن اس مضمون میں کوئی سرسری جائزہ بھی نہیں۔ دوسرے دو مضامین میں حالی اور شبلی کو ان کے خطوط میں دیکھنے کی کوشش ہے لیکن اس کے باوجود تشنگی موجود رہتی ہے۔ غالب کے خطوط کے متعلق جو اشارے ملتے ہیں ان میں بھی کوئی خاص بات نہیں۔ حیرت ہے کہ خورشید الاسلام کو حالی اور شبلی کے خطوط تڑپا دیتے ہیں اور تاثرات کو پیش کرنے کے لئے خورشید صاحب یونانی کردار۔ گوتم بدھ۔ سقراط اور بطلیموس کا خون حضرت صالح کی اونٹنی شمس تبریز کا عصا۔ یزید کا دربار۔ غزالی اور ابن رشد کی شاعری حضرت مریم

کی تصویر بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش کی باتیں کرتے ہیں تلمیحوں
اور اشاروں سے کبھی کبھی ایک دلفریب فضا بھی قائم کر دیتے ہیں لیکن غالب
کی خطوط نگاری کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے کہ ان کے مکاتیب
زبان کے ارتقا میں نشان میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اکبر اور مہدی افادی
کے متعلق بھی کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا۔ حالی پر لکھتے ہوئے وہ اپنی انشا پردازی
کا مظاہرہ زیادہ نہ کر سکے تو اس مضمون کے اختتام پر زیادہ محنت کرنے کی
کوشش کی (انسانیت کی تشریح اپنے خاص انداز سے کی ہے معلوم نہیں اس
کی ضرورت کیا تھی) ایک عجیب خطیبانہ انداز پیدا ہو گیا ہے بے ربطی اور انتشار
کا اندازہ کیجیے۔

"میرا ایمان ہے کہ تندرست آدمی وہ ہے جو مضمون پر آنسو بہا سکے
اور مضمون پر آنسو بہانے اور بہا سکنے کا دوسرا نام انسانیت ہے۔ یہ وہ
خوبی ہے جو مذہب کی طرح ہر جگہ پائی جاتی ہے لیکن اس کی تعریف نہیں کی
جا سکتی، حالی میں بس یہی ایک بات تھی، موت اور ہمارے درمیان جو کچھ ہے وہ
کھلونے ہیں۔ دماغ کی آوارگی ہے۔ راتوں کے خواب ہیں بے جا نمائشیں ہیں
کڑی مصیبتیں ہیں جنہیں دو چار قہقہے رنگین بنا دیتے ہیں۔ حبابوں کی اس
قیامت میں ایک گرم رو ہے جو تمہیں زندہ رکھتی ہے اور زندگی کو ہمارے
لئے معتبر بناتی ہے وہی انسانیت ہے۔" اگر یہاں سے صرف حالی کا نام نکال
دیا جائے تو بھلا کیا رہ جاتا ہے؟ کسی نہایت ہی سطحی ناول کے اسلوب کا
عکس اور کچھ نہیں۔ خورشید الاسلام کے اسلوب کی دلکشی اور دلربائی یہاں
نہیں ہے۔ جذبے کی شدت کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں۔ مزاج کی
حیاتی کیفیت کی جگہ سپاٹ پن ہے۔ ایک عجیب سطحیت ہے تنقید اور ایسے
(ESSAY) دونوں کی تکنیک یہ صدمہ کہاں برداشت کر سکتی ہے؟

"طنز و ظرافت" میں چند نکتے اور کچھ اشارے ملتے ہیں، چونکہ
یہ مضمون ریڈیو کے لئے لکھا گیا تھا اس لئے اختصار ضروری تھا۔ اس
مضمون میں جہاں خورشید الاسلام "خوجی" کے متعلق یہ کہتے ہیں "خوجی لکھنو
کی وہ قدیم معاشرت ہے جو اپنی آخری سانس پوری کر رہی ہے" وہاں
سجاد انصاری اور مہدی افادی کی تحریروں کا فرق اس طرح سمجھاتے
ہیں "سجاد انصاری اور مہدی افادی کی تحریروں میں بھی کچھ اتنا ہی فرق
ہے جتنا فلسفہ اور شاعری میں لیکن ان کے یہاں انسانی اور آفاقی قدریں ملتی
ہیں" قاضی عبد الغفار اور رشید احمد صدیقی پر جہاں اچھی رائے ملتی ہے وہاں
فرحت اللہ بیگ اور پطرس کے متعلق کہی ہوئی سطحی باتیں دہرائی گئی ہیں
خورشید الاسلام "شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں" (میر محفوظ علی) کو کامیاب
نہیں سمجھتے ہیں "میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اردو ظرافت میں اس کی نمایاں
جگہ ہے۔ آل احمد سرور کا بھی خیال ہے کہ شیخ سماء اللہ خاں کی صاحبزادیاں
یا صاحب دیں ظرافت کے بلند ترین نصب العین پر پورے اترتے ہیں۔
پتہ نہیں خورشید صاحب کے پاس ظرافت کا معیار کیا ہے۔ وہ میر محفوظ علی
(جنہوں نے اپنے نام سے کبھی نہیں لکھا) سے چاہتے کیا تھے؟

خورشید الاسلام "فسانہ آزاد" کے تجزیہ میں زیادہ کامیاب ہیں۔
جدت نظر بھی ہے اور اظہار بیان کا حسن بھی، ایک سنبھلی ہوئی کیفیت
ہے، غدر کی سیاسی کشمکش کی اہمیت کو بھی سمجھتے ہیں اور نئی اور پرانی
قوتوں کے متعلق تاریخ کے فیصلے پر بھی ان کی نظر ہے ایسی صورت میں
ایک ادیب کی شخصیت میں گرد و پیش کے زندہ عناصر کو جذب ہوتے
دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے کہ اسی کے بعد ادیب اپنی داخلی دنیا کو
موزوں اور مؤثر ہیئت میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے اس سلسلہ میں
خورشید الاسلام نے اچھی بات کہی ہے:۔

"(آزاد) ایک ایسے زاویہ نظر کے ترجمان ہیں جس کی روشنی میں
خوجی کے خد و خال نہ صرف واضح ہو جاتے ہیں بلکہ وہ ہمارے لئے مذاق
کا سامان بن جاتا ہے۔ . . . ظرافت خوجی میں نہیں ہے ظرافت اس فضا
میں ہے جہاں خوجی ہے، خوجی خود ظریف نہیں ہے وہ ظرافت کا نشانہ ہے"
آزاد اور خوجی کے کردار کا تجزیہ نئی اور پرانی تہذیب کا تجزیہ ہے۔ اردو
ناول کے کرداروں کے مطالعہ کے لئے خورشید الاسلام کے یہ اصول مفید
ثابت ہوں گے۔ "ناول کا فن" میں کلاس روم لیکچر کا مزہ ملتا ہے باتیں
سب وہی ہیں جو شروع سے اب تک ہمارے ناقدین دہراتے رہے
ہیں۔ اس مضمون کی تمام باتیں خطرناک حد تک ڈبلیو۔ ایچ۔ ہڈسن (جو
کوئی بڑا نقاد نہیں ہے) کے مضمون THE STUDY OF PROSE
FICTION سے ملتی جلتی ہیں۔ ڈرامہ اور ناول کا فرق۔ پلاٹ اور پلاٹ

کی قسمیں۔ ناول کا موضوع اور دائرہ عمل۔ زاویہ نظر اور کردار نگاری ہر پہلو پر خورشید الاسلام کی نظر نہیں ہڈسن کی نظر معلوم ہوتی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ ٹالسٹائی۔ ہنری جیمس۔ جین آسٹین۔ ترگنیف اور ڈکنس کے متعلق تمام وہی باتیں کہی گئی ہیں جو ہڈسن نے کہی ہیں۔ دونوں جگہوں پر ایک ہی انداز ہے دونوں جگہ اختصار کا ایک ہی عالم ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ رسوا اور پریم چند کا ذکر ضرور ہے لیکن اس ذکر سے کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا اور اس سے اردو ناول نگاری کے فن پر بھی کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

"امراؤ جان ادا" دراصل "شرح امراؤ جان ادا" ہے۔ یہ خورشید الاسلام کا سب سے طویل مضمون ہے (غالباً نوے صفحوں پر پھیلا ہوا ہے) اس مضمون کو ایک وقت کافی مقبولیت حاصل ہوئی تھی یہاں خورشید الاسلام نقاد کم اور شرح نگار زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کا یہ خیال "امراؤ جان پورے لکھنو اور اس کے زوال پذیر تمدن کی داستان ہے" سو فیصدی حقیقت پر مبنی ہے۔ خورشید صاحب نے اس ناول کا تجزیہ ایک خاص ڈھنگ سے کیا ہے۔ اس مضمون میں اقتباسات اتنے ہیں کہ طبیعت گھبرا جاتی ہے' اقتباسات کے فوراً بعد تشریح ہے اور الجھن ہوتی ہے۔ جہاں تک انشا پردازی کا تعلق ہے خورشید صاحب "امراؤ جان ادا" میں بھی اپنے مخصوص انداز کے ساتھ موجود ہیں' یہاں زبان میں زیادہ گھلاوٹ' نرمی اور حسن ہے تنقیدی شعور کی بلندی کا احساس کہیں نہیں ہوتا البتہ کرداروں کے تجزیہ میں بڑی جان ہے۔ تشریح محض اور اکتساب لذت کی کوششیں موجود ہیں حقیقت کی جستجو نہیں ہے پورے مقالہ میں ایک خاص قسم کا اطمینان اور سکون ہے۔ اچانک بھی ان کی انگلی کہیں ایسی جگہ نہیں پڑتی جہاں وہ اپنے ذوق اور وجدان سے کچھ ہٹ کر اصول کے متعلق سوچیں' ظاہر ہے تنقید میں صرف اپنی پسند اور اپنا ذوق ہی سب کچھ نہیں ہے۔ وجدان اور شعور اور لاشعور ہی تنقید کا محور نہیں۔ اصول نقد تاریخ۔ معاشیات۔ سائنس اور نفسیات سے مرتب ہوئے ہیں۔ خورشید الاسلام کے اس مقالہ میں کبھی ایسا لگتا ہے۔ جیسے نقاد کی روح "امراؤ جان ادا" کے کرداروں کے ساتھ ہے اور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سر ہنری اوٹن (WOTTON) ہمارے کان میں آہستہ سے کہہ رہا ہے :-

CRITICS ARE LIKE BRUSHERS OF NOBLEMEN'S CLOTHES. اور ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

ان کے مضمون "ذات شریف" میں بھی وہی تمام خامیاں ہیں جو "امراؤ جان" میں ہیں مثلاً اقتباسات تنقید سے زیادہ ہیں' تنقیدی اشارے جابجا موجود ہیں لیکن تشریح محض والی بات یہاں بھی ہے۔ بعض اشارے بہت خوب ہیں مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں "رسوا جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں لیکن وہ "ذات شریف" میں لکھنو اور ہندوستان کے جاگیرداروں کو اپنے ہاتھوں دفن کر دیتے ہیں" یا "امراؤ جان میں رسوا غدر سے پہلے کی معاشرت کا جائزہ لیتے اور یہ دکھاتے ہیں کہ اس کا ختم ہو جانا فطرت اور تاریخ کا تقاضا تھا' ذات شریف میں وہ غدر کے بعد نوابین اور ان کے گرد و پیش کا مطالعہ کرتے اور اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ ان عناصر کی ہمارے سماج میں کوئی ضرورت اور گنجائش نہیں" ــــ کرداروں کے تجزیہ میں خورشید الاسلام نے محنت کی ہے۔ "غالب کا محبوب" "زوال پسندی" اور "متاخرین شعرائے فارسی اور ناسخ" خورشید الاسلام کے ایک طویل تحقیقی مقالہ کے حصے ہیں۔ یہاں دوسرے مضامین کی طرح انشا پردازی کا کمال نہیں' تحقیق کی طرف ایک بھرپور نظر ہے' یہ نظر گہری ہو جائے تو خورشید الاسلام ہمیں واقعی بہت کچھ دیں گے نفسیاتی تنقید کی بھی بے شمار خوبیاں ان کی تنقید میں جھلکتی ہیں' بنیادی اقدار کا احترام بھی موجود ہے وہ چاہیں تو ان سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں FOR WHOM THE BELL TOLLS میں ماریا عورت سے زیادہ ایک خواب معلوم ہوتی ہو یا نہیں' اس مجموعہ کے مضامین تنقید سے زیادہ تشریح ضرور معلوم ہوتے ہیں اور ظاہر ہے تنقید کے لئے صرف تشریح کافی نہیں ؏

غزل

رندانِ بادہ نوش کی چھاگل اٹھا تو لا ‏ ‏ ‏ ‏ بادِ بہار دوڑ کے بادل اٹھا تو لا

آ عمرِ رفتہ حشر کے دم خم بھی دیکھ لیں ‏ ‏ ‏ ‏ طوفانِ زندگی کی وہ ہلچل اٹھا تو لا

سر سے دیارِ غم کے سنیچر اتار دے ‏ ‏ ‏ ‏ منگل ہے جس میں جا کے وہ جنگل اٹھا تو لا

لالچ بتا کے دور سے واعظ کو دیکھ تو ‏ ‏ ‏ ‏ خالی ہی کیوں نہ ہو کوئی بوتل اٹھا تو لا

اے زندگی جنوں نہ سہی بے خودی سہی ‏ ‏ ‏ ‏ تو کچھ بھی اپنی عقل سے پاگل اٹھا تو لا

اربابِ اتقا کی سلامت روی بھی دیکھ ‏ ‏ ‏ ‏ ہم جس میں جا پھنسے تھے وہ دلدل اٹھا تو لا

آتی ہے یادِ صبحِ مسرت کی بار بار ‏ ‏ ‏ ‏ خورشید آتے آتے اسے کل اٹھا تو لا

کشتی ہے گھاٹ پر تو چلے کیوں نہ دور آج ‏ ‏ ‏ ‏ کل بس چلے چلے نہ چلے چل اٹھا تو لا

ناطق جنونِ خدمتِ احباب کس لئے

دیکھیں تو کیا ملا ہے تجھے پھل اٹھا تو لا

ثریا جبین [illegible]
ایم اے

پیپر ماشی کی صنعت

(معاشیاتی تحلیل و تجزیہ)

کشمیر کا حسن، کشمیر کی وادیوں کے ترانے، وہاں کی صحت بخش آب و ہوا اور قدرتی دولت کے افسانوں کے ساتھ کشمیریوں کی غربت اور فلاکت کی داستان اگل اور بے جوڑ سہی، لیکن ایک تلخ حقیقت اور دل سوز سچائی ہے. ایک کشمیری قدرت کی فیاضیوں کی گود میں پرورش پانے کے باوجود ان نعمتوں سے بہرہ ور کیوں نہیں؟ معاشیات کا ایک معمولی طالب علم بھی ان باتوں کا جواب بڑی آسانی سے دے سکتا ہے۔ قدرت کی فیاضیوں کا صحیح مصرف اور دولت کی مساوی تقسیم کا فقدان اور یہاں کی صنعت و حرفت کو مناسب آب و ہوا اور فضا میسر نہ آنے کے باعث معاشرہ پر جو اقتصادی بدحالی کے اثرات ہونے چاہئیں وہ یہاں مکمل طور پر نمایاں ہیں۔ اگر یہاں کی انسانی طاقت معدنیات اور قدرتی وسائل کا صحیح مصرف نکال لیا جائے تو جنت نظیر کشمیر صحیح معنوں میں فردوس بر روئے زمین کا نمونہ بن جائے۔

کشمیر صدیوں سے اپنی اعلیٰ صنعت و حرفت اور فن کاری کے لئے دنیا بھر میں مشہور رہا ہے۔ یہاں کی بہت سی صنعتیں اور فن مسلمان حکمرانوں کے ساتھ یہاں آئے۔ مناسب وسائل، شاہی سرپرستی اور فضا کی سازگاری نے انہیں دن دونی ترقی دی۔ جس میں سے قالیچہ بافی اور پیپر ماشی کی صنعت کو تو ہم یقینی طور پر ایرانی نژاد کہہ سکتے ہیں۔ شال بافی، کندہ کاری اور کشیدہ کاری کی صنعتیں بھی اسی قبیل میں آجاتی ہیں۔ اس مشینی دور میں یہ تمام صنعتیں اپنے وجود کو قائم رکھنے کے سلسلے میں صرف ایک عام بنیاد رکھتی ہیں۔ وہ یہ کہ ان کی تخلیقات فن کاری کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے باوجود جن میں انسانی ہاتھوں کی محنت کے ساتھ انسانی ذہن و دماغ کا شعور اور دل کی دھڑکنوں کا ترنم شامل ہے، پائداری میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ فنی صنعت تکنیکی ترقی اور ریاضت کی مثال بھی ہے۔ جس کے حاصل کرنے اور سیکھنے کے لئے ایک مدت کے شب و روز کی محنت اور عرق ریزی درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشین کی پیدا کردہ ارزاں چیزوں کے مقابلے میں بھی یہ اپنی فنی خوبیوں اور اعلیٰ کارکردگی کا نمونہ ہونے کی حیثیت سے اہل نظر کی نگاہوں میں ایک گراں قدر تحفہ کی حیثیت رکھتی ہیں جس کی خوبیوں کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے بھی اعلیٰ ذوق کی ضرورت پڑتی ہے۔

پیپر ماشی کی صنعت بنیادی طور پر پینٹنگ کا فن ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ کاغذ کے اوپر رنگین اور سنہری نقاشی کا فن ہے۔ اور بعد کی ترقیوں کے نتیجے کے طور پر اب تو فن کاروں نے لکڑی اور پیتل پر چھاپہ مارا ہے اور فن کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں۔ اس کی پیدا کردہ اشیاء عام طور پر زینت اور سجاوٹ کے کام کی ہیں۔ مشکل ہی سے ایک دو چیزیں روزانہ استعمال کی شکل آئیں تو نکل آئیں۔ بیشتر تخلیقات جو کارخانے سے باہر آتی ہیں اگر اُن کا مطالعہ کیا جائے تو مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے ایک کا تعلق بھی (علم معاشیات کی زبان میں) ضروریات زندگی سے ہے۔ مثال کے طور پر گلدان، ٹرے، ٹیبل لیمپ، پاؤڈر بکس، عطر دانی، بک شیلف، زیورات کے ڈبے، آئینوں کے فریم اور فوٹو فریم کو لے لیجئے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان چیزوں کی طلب کے سلسلے میں ہمیں اُن لوگوں کو دیکھنا ہوگا جن کا تعلق اوپر کے متوسط طبقے اور امراء لوگوں سے ہے۔ اور نہ صرف یہ، بلکہ اُن کا فنی شعور نکھرا ہوا اور ذوق کا بلند ہونا بھی ضروری ہے۔ تاکہ وہ مشین کی پیدا کی ہوئی سستی چیزوں کے مقابلے میں ہاتھ کی بنائی ہوئی ان سبک اور حسین چیزوں کی قدر و قیمت ادا کر سکیں اور اُن پر گراں بھی نہ گزرے۔ اس پس منظر میں جگہ کی

کمی اور طلب محدود ہونے کے ناطے پیپر ماشی کی انڈسٹری بھی محدود رہی ہے۔
(جیسا کہ ایک سروے سے واضح ہے) اس میں کام کرنے والے تقریباً چار سو
افراد ہیں اور اس کی وُسعت صرف سرینگر تک محدود ہے۔ اس کے مشہور
مراکز — حسن آباد، عیدگاہ، حول، زیڈی بل، رعناواری اور کامگار
پورہ ہیں۔ اس صنعت کی تنظیم کے سلسلے میں سب سے دلچسپ بات تو یہ
ہے کہ اس میں کام کرنے والے سارے کے سارے کاریگر شیعہ ہیں۔

کشمیر کی تمام فنی صنعتیں یا تو گھریلو قسم کی ہیں یا کاٹیج انڈسٹریز کے
تحت آتی ہیں، لیکن جہاں تک آدمیوں کی کارکردگی، انتظام، مشینوں کا
عمل اور سرمایہ کا تعلق ہے ان دونوں قسموں کا امتیاز محض علمی اور برائے
نام ہے۔ کاٹیج انڈسٹریز کے تحت آنے والے انتظام میں خام مواد خود کاریگر
مہیا کرتے ہیں۔ البتہ گھریلو صنعت کے تحت آنے والے انتظام میں خام مواد
کی رسد کی ذمہ داری کسی دوسرے شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے، جو تیار
کردہ مال کے فروخت کا انتظام بھی کرتے ہیں۔ کاریگر کو صرف کام کی اُجرت
مل جاتی ہے۔ کبھی کام کے ختم کرنے کے بعد، کبھی بطور پیشگی۔ پیپر ماشی
کی صنعت بھی ان ہی دو قسموں پر مشتمل ہے، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔

اصل کام کرنے والے، جیسا کہ دوسری صنعتوں میں بھی ہیں، اُستاد
کہلاتے ہیں۔ اُستاد کام کرنے کی صلاحیت اور خوبی بطورِ ورثے کے
اپنے والدین سے پاتے ہیں۔ یا بعض اوقات سال ہا سال کی محنت اور
عرق ریزی سے کسی ماہرِ فن کے ماتحت کام کرکے حاصل کرتے ہیں۔ یہ تو
صحیح ہے کہ اُستاد اپنے کام اور فن میں ماہر ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کو
یہ نہیں معلوم کہ سرمایہ کہاں سے حاصل کیا جائے اور ہماری پیداوار کے
لئے بازار کہاں ہے۔ اور اُسے فروخت کس طرح کیا جائے۔ فن کی سب سے
بڑی ٹریجیڈی یہی ہے جس کی وجہ سے فن اور فن پارے دونوں ہی
کوڑیوں کے مول بک جاتے ہیں۔ چنانچہ ان ہی بنیادوں پر ماضی قریب
میں کچھ ایسے لوگوں کا داخلہ بھی اس صنعت میں ہوگیا ہے جو "درمیانہ
آدمی" (Middle Man) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ کاریگروں کو خام مال اور اُن کی پیداوار کے لئے مارکیٹ کا انتظام کرتے
ہیں۔ سرمایہ بھی وہی سپلائی کرتے ہیں۔ دلالوں کا عمل و دخل کشمیر کی تقریباً
تمام صنعتوں میں ہو چکا ہے۔ وہ صرف ایک شو رُوم قائم کرتے ہیں اور
کاریگروں کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔ صرف اس خیال سے کہ خود ان کا
پر اس قسم کا تأثر قائم کرسکیں کہ یہ صنعت اُن کی سرپرستی اور دیکھ ریکھ
میں فروغ پا رہی ہے۔ اور انہیں بھی اس فن میں کچھ درک حاصل ہے۔
بعض اوقات کاریگروں کو شو رُوم میں بٹھا کر خریداروں کے سامنے کام کی
نمائش بھی کرا دیتے ہیں۔ اس طرح تجارتی اثر اچھا پڑتا ہے۔ صنعتی مراکز
یا اُستاد تو تمام شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انتظام کاروں کا کام ہے
کہ وہ ان اُستادوں کو خام مال اور کچھ سرمایہ مہیا کردیں۔ وہ تو کام ختم
کرکے تیار شدہ مال شو رُوم میں حاضر کرتے ہیں اور اپنی اُجرت لے جاتے
ہیں۔ چنانچہ یہ اُجرت بھی (معاشیات کی زبان میں) مقابلہ والی اُجرت
نہیں ہے جو بازار کی طلب و رسد (Demand and
Supply) کے ذریعہ قائم ہوتی ہے بلکہ دلالوں کی قائم کردہ ہوتی
ہے۔ اس لئے کہ اُن کا اثر صنعت پر مسلّم ہے۔

کارخانہ اور طریقِ پیداوار

کارخانہ ایک معمولی سے کمرے کا نام ہے۔ جہاں مطالعہ کی کوئی
خاص شئے نہیں۔ بلکہ روزانہ کے رہنے سہنے کے کمرے کا دوسرا نام کارخانہ
ہے۔ جہاں بوریے یا چٹائی قسم کی کوئی چیز بچھی ہوتی ہے۔ مشکل ہی سے
ہوا اور مناسب روشنی کے لئے کوئی دریچہ یا روشن دان ہوتا ہے۔
البتہ حقّہ ایک ایسی چیز ہے جس کا وجود کارخانے کے لئے جزوِ اعظم کا
حکم رکھتا ہے۔ کاریگر بھی کارخانہ میں کچھ زیادہ نہیں ہوتے۔ دو تین
یا زیادہ سے زیادہ چار۔ بلکہ ایسے کارخانے جہاں صرف ایک اُستاد
ہی سب کچھ ہوتا ہے، تعداد میں کچھ کم نہیں۔ اُستاد کی معیت میں کام
کرنے والے کاریگر اکثر گھر ہی کے افراد ہوتے ہیں۔ یا پھر باہر کے
کام سیکھنے والے شاگرد، جنہیں طے شدہ مزدوری دی جاتی ہے۔ جو
چاہتے ہیں کہ کام سیکھ کر خود کوئی کارخانہ کھولیں اور اُستاد بنیں۔ اب
آئیے دیکھیں کہ ان کارخانوں میں کس قسم کے کام اور کس طرح کئے
جاتے ہیں۔

پیپر ماشی کی صنعت کے لئے کچھ جزوی صنعتیں بھی ہیں۔ جو اس
کے لئے خام مواد مہیا کرتے ہیں۔ جیسے چتو انڈسٹری "جسے کاریگر سکتہ
ساز" کہلاتے ہیں۔ چتو ایک قسم کا ماڈل ہے جس پر پیپر ماشی کے
کاریگر اپنا کام کرتے ہیں۔ ایک سکتہ ساز کے گھر میں مختلف قسم کے چتو ملا

کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً گل دانی، پاؤڈر بکس اور ٹرے وغیرہ، جس پر کہ پیپر ماشی کے کاریگر مرقع کاری کر کے اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ سکتہ ساز بھی اپنا آرڈر ڈیلروں ہی سے پاتے ہیں، بعض اوقات اُستاد کی فرمائش بھی پوری کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر گل دانی کی فرمائش پاتے ہی ایک سکتہ ساز پہلے بے کار قسم کے کاغذ اور گتے کو چند دنوں تک پانی میں گلنے کے لئے ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد کاغذ کو باہر نکال کر چاول کی بنی ہوئی لئی کے ساتھ کوٹتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ ایک گاڑھے مادّے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اسی مادے کو فرمے پر چڑھایا جاتا ہے۔ اور جس قسم کی شکل بنانی منظور ہو، بنا لیتے ہیں اور خشک ہونے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ قبل اس کے کہ یہ پوری طرح خشک ہو جائیں، اسے چاروں طرف سے دبایا جاتا ہے۔ تاکہ اپنی اصلی شکل پر آجائیں اور ان میں مضبوطی بھی پیدا ہو۔ جب یہ خشک ہو جاتے ہیں تو انہیں درست کر کے اُستاد کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور یہی چتو اُستاد کے لئے خام مال کا کام کرتا ہے۔

اب یہ اُستاد کا کام ہے کہ وہ چتو کی کھردری سطح کو چکنا اور مسطح بنائے جس کے لئے وہ مختلف طریقے استعمال کرتا ہے۔ بعد میں اُسے سریس پیپر سے گھس کر مناسب اور کام کے لائق بنا لیا جاتا ہے تاکہ چتو میں نقاشی اور مرقع کاری کے وقت کسی قسم کا شگاف پیدا نہ ہو۔ اب چتو پیپر ماشی کے کام کے لئے تیار ہے۔ اُستاد رنگ اور برش اکٹھا کرتا ہے۔ اس کام کے لئے اُسے چند چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے جسے مہیا کرنا خود اس کا کام ہے۔ برش کی تیاری میں بلی کے روئیں سے کام لیا جاتا ہے۔ رنگ بھی پہلے درختوں کی چھال اور مختلف قسم کی گھریلو چیزوں سے تیار ہو جاتا تھا۔ جو عمدہ بھی ہوتا تھا۔ اور جس کی وجہ سے فن میں نکھار آتا تھا لیکن جب سے کہ معمولی قسم کا بازاری رنگ استعمال ہونے لگا ہے، فن کی عظمت میں کمی آگئی ہے اور جس نے صنعت کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس لئے کہ بازاری رنگ عمدہ قسم کی چیزوں کی پیداوار میں معاون نہیں۔ اور اس کا قیام بھی وقتی ہوتا ہے۔

تقسیم محنت کا اصول بھی پوری طرح اس صنعت میں کارگر نہیں۔ اُستاد مشکل ہی سے کسی خاص کام کو اُجرت پہ لئے ہوئے مزدوروں یا شاگردوں کے حوالے کرتا ہے۔ عام طور پر چتو کی سطح کو چکنا کرنا یا بعض اوقات اُستاد کے پھیرے ہوئے رنگ کے کنارے کسی اور رنگ کا حاشیہ لگانا یا اس پر شیڈ چڑھانے کا کام ہی مزدوروں یا شاگردوں کے حوالے کیا جاتا ہے۔ اور جس گھر میں ایک ہی خاندان کے چند افراد کسی کام میں برابر کا تجربہ رکھتے ہیں۔ وہ عام طور پر مختلف کام انجام دیتے ہیں۔

سرمایہ والوں کے چتو مہیا کر دینے اور اُستادوں کے ذریعہ برش اور رنگ اکٹھا ہو جانے کے بعد چتو کے اُوپر ڈیزائن اور رنگ کاری کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ جو اصل پیپر ماشی کا کام ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کاریگروں کی کاریگری اصل میں نقاشی اور ڈیزائن کی مرقع کاری سے شروع ہوتی ہے۔ ایک ایسی چیز پر جو دوسروں کی تیار کردہ ہوتی ہے، اسی بنا پر ہم اس فن کو دو شعبوں یا دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں :-

(۱) ڈیزائن یا مرقع کاری کی خصوصیت

(۲) ڈیزائن اور مرقع کاری میں فنی مہارت کا اظہار

جہاں تک اُستاد کی فنی مہارت کے اظہار کا سوال ہے، یہ اپنی جگہ مسلّم ہے، لیکن ڈیزائن اور مرقع کاری اپنی جگہ اتنی جامد اور بے جان ہے کہ سینکڑوں برس کی ترقی کا اثر اس فن پر کچھ نہیں پڑا ہے۔ اور یہ جہاں سے چلا تھا، وہیں کا وہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ فن بطور وراثت کے کاریگروں کو ملتا ہے۔ اسی کے ساتھ ڈیزائن بھی۔ جس پر مزید کسی قسم کا تجربہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اُستاد ایک ہی چیز پر ایک ہی قسم کے ڈیزائن کو پینٹ کرنے میں مختلف اوقات کا وقفہ لیتا ہے۔ ایک پاؤڈر بکس پر ایک خاص قسم کی مرقع کاری کے سلسلے میں تین دنوں سے دس دنوں تک کے وقفے کا صرفہ ممکن ہے۔ تیار شدہ شے کی قیمت چیز کی عمدگی، چتو کی خصوصیات اور رنگ کاری کے کمال پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس بات پر کہ کس قسم کی مرقع کاری کی گئی ہے اور کس فن کارانہ انداز سے کی گئی ہے! یہی اس شے کی قیمت کو گھٹانے اور بڑھانے کی ذمہ دار ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ڈیزائن اور مرقع کاری ہی اس صنعت کی جان اور اصل بنیاد ہے۔ اس لئے مرقع کاری پہ اظہار خیال بھی ضروری ہے۔

مُرقع کاری

جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے مرقع کاری اس صنعت کی بنیادی شے ہے۔ اور یہی وہ شے ہے جو کسی چیز کو حسن و لطافت سے معمور کرتی

ہے۔ وہ تمام مرقعے اور ڈیزائن جو آج کل اس صنعت کاری میں استعمال ہوتے ہیں، تعداد میں کچھ زیادہ نہیں۔ اُستاد چونکہ بیشتر غیر تعلیم یافتہ اور ان پڑھ ہوتے ہیں اور فن روایتی طور پر اپنے گھروں میں سیکھتے ہیں، اس لئے ڈیزائن بھی ان کو وِرثے میں ملتا ہے۔ جس پر کسی قسم کی زیادتی یا کمی ممکن نہیں۔ اور نہ تو اس سلسلے میں کسی تجربے کو راہ دی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ ڈیزائن ہمیشہ باپ سے بیٹوں میں منتقل ہوتا رہا اور ایک جامد شئے بنا رہا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مختلف خاندانوں کے لوگ اپنے پاس مختلف ڈیزائن رکھتے ہیں۔ یا کچھ ایسے ڈیزائن بھی ہیں جن پر کسی خاندان کا بلا شرکتِ غیرے قبضہ ہے۔ اگر ایسا ہو بھی تو صرف چند کے ساتھ ممکن ہے۔ عام طور پر ڈیزائن کو "روایتی" اور "غیر روایتی" کی شکل میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ روایتی ڈیزائن وہ ہے جو اُستادوں کا حصہ ہے اور ان ہی کے سینے میں محفوظ ہے اور پھر سینہ بہ سینہ یہ منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اسی لئے اُن مرقعوں کو "ہم خیالی مرقعے" بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو یادوں کے تہہ خانوں میں سال ہا سال سے محفوظ چلے آتے ہیں۔ اُن مرقعوں کے سلسلے میں سرمایہ داروں اور ڈیلروں کو بھی بڑی آسانی ہوتی ہے۔ چونکہ وہ جانے بُوجھے ہوتے ہیں اس لئے نام بہ نام اپنی پسندیدہ وضع کے آرڈر دے دیتے ہیں اور کام تیار ہو جاتا ہے۔ مرقعے جو عام طور پر ان دنوں استعمال ہوتے ہیں وہ "روایتی" وضع کے ہی ہوتے ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں:-

(۱) ہزارہ (۲) شرک پوشش (۳) دَور دار ہزارہ
(۴) دور دار شرک (۵) شرکِس پیٹھ شرک
(۶) شال (۷) گل دُلستہ وغیرہ

اس کے علاوہ ایک اور ڈیزائن بھی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عوام پسند اور ہر دل عزیزی میں اولیٰ تر ہے جسے "سوزن پوشش کا نجہ دار" کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ تمام مرقعے ایرانی نژاد ہیں۔ اور کچھ اتنے زیادہ بھی نہیں کہ ایک کے بدلے دوسرے کو پسند کیا جائے اور ترجیح دی جائے۔ اس لئے کہ سب کے سب مثالی ہیں۔ حالانکہ پچھلے چند سالوں میں صنعتِ پیپر ماشی کی تیار کردہ اشیاء کی مانگ کافی بڑھی۔ لیکن جس رفتار سے مانگ بڑھی اُس رفتار سے ڈیزائن اور مرقع کاری کی ترقی نہیں ہو سکی۔ وجہ ظاہر ہے۔ اور وہ یہ کہ ڈیزائن اور ہُنر دونوں ہی باپ سے بیٹوں کو ورثے میں ملتا ہے۔ کاریگروں کی معاشی حالت درست نہ ہونے کی وجہ سے توجہ کام کی خوبی اور اس کے تجرباتی پہلو سے ہٹ کر ضروریاتِ زندگی کے حصول کی طرف مبذول رہتی ہے۔ خیال صرف یہ رہتا ہے کہ بچہ کسی نہ کسی طرح جلد سے جلد اس قابل ہو جائے کہ روٹیوں کا سہارا حاصل کر سکے۔ ایسی صورت میں فنی مہارت کی ترقی اور فن کے تحقیقی اور تجرباتی پہلو کو نظر انداز کر دینے کی وجہ صاف طور سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ پھر نئے مرقعے نکالنے اور نئے ڈیزائن تلاش کرنے کی فرصت کسے ہے؛ علاوہ ازیں اُستادوں کی غربت اور افلاس انہیں اپنی فنی مہارت کی خوبیوں اور خصوصیات کو سمجھنے اور پرکھنے کی مہلت عطا نہیں کرتی۔ وہ تو صرف کام کے اقتصادی پہلو کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ انہیں اس بات کا کم تجربہ ہے کہ صرف ڈیزائن اور مرقع کاری کی ترقی ہی پر اُن اشیاء کی قوتِ فروخت کا انحصار ہے۔ اگر ڈیزائن میں نئے تجربوں کو راہ دی جائے تو فروخت بھی بڑھ سکتی ہے۔ اور جب ڈیزائن کی یہ حالت ہے کہ وہ صدیوں سے اپنی جگہ جامد ہے تو ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ یہ صنعت بھی تقریباً مُردہ ہے۔ اُستادوں کی سب سے بڑی کمزوری تو یہی ہے کہ وہ کوئی نئی وضع یا نیا ڈیزائن پینٹ نہیں کر سکتے، سوائے اس کے جسے وہ صدیوں سے پینٹ کرتے چلے آ رہے ہیں اور جس میں انہیں مہارت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ اس چیز کا ثبوت ہے کہ تخلیقی فن کا دل اور کاریگروں کی کمی ہے۔ اور جب تک پیپر ماشی کی صنعت کو تخلیقی فن کار نصیب نہیں ہوتے، اس صنعت کی ترقی مشتبہ ہے۔

ہر چیز کے کچھ EXCEPTIONS بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس صنعت کے سلسلے میں کچھ اُستاد ایسے بھی ہیں جنہیں اپنی فنی مہارت اور قوتِ کارکردگی پر بجا طور پر فخر اور مسرت ہونی چاہیئے۔ اور یہ اس لئے کہ اُن میں سے کچھ ایسے ہیں جو تاریخی داستانوں، جنگوں اور محبت کی داستانوں کو بہت ہی اچھی طرح مرقع کی شکل میں ثبت کر سکتے ہیں۔ یہ مرقعے روایتی داستانوں اور تاریخ کے اوراق سے

وابستہ ہوتے ہیں۔ جو تعداد میں صرف چند ہیں۔ اور جس کے پینٹ کرنے والے بھی تعداد میں چند ہی ہوں گے۔ برخلاف اس کے "روایتی" مرقعے صنعت کی عام ملکیت ہیں۔ جنہیں کم و بیش ہر اُستاد ثبت کر سکتا ہے۔ "غیر روایتی" مرقعوں کے سلسلے میں عرض ہے کہ کچھ اُستاد اُسے ثبت ضرور کرتے ہیں اور نئے ڈیزائن نکالتے ہیں۔ لیکن اُن میں وہ عام اپیل نہیں جو "روایتی" مرقعوں میں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک ہی وقت میں ایک ہی مرقعے میں پہاڑ، دریا، درختوں کے جھنڈ اور پھولوں کی قطار سب ہی کچھ دِکھلا دیتے ہیں۔ اور جن میں رنگوں کی مناسبت بھی نہیں کھلتی جو پروردۂ ذوق کے لئے بارِ گراں سے کم نہیں!

صاحبِ ثروت اور اُستاد

جیسا کہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے صاحبِ ثروت یا انتظام کار صنعتِ پیپر ماشی کا ایک نہایت اہم رُکن ہے۔ اُن کے نشو و نموں کے مطالعے ہی سے اُن کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ صنعت کے لئے سرمایہ، جو بُنیادی شے ہے، وہی مہیا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی تیار شدہ مال کے فروخت کی ذمہ داری بھی وہی لیتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ وہ اُن کے یہاں فرمائشات رکھتے ہیں اور انہیں وقت پر کام کی اُجرت ادا کر دیتے ہیں۔ بلکہ آڑے وقت میں بھی، جب کہ اُستادوں کے پاس کام نہیں ہوتا، اُن کی امداد کرتے رہتے ہیں۔ چوں کہ اس صنعت کے تنظیم کار بُنیادی طور پر سرمایہ دار ہی ہیں اس لئے منافع کے بیش تر حصے کا اُن کے پاس چلا جانا کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔ معاشیاتی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ چوں کہ وہ سرمایہ مہیا کرتا ہے، تنظیم اور خام مواد اکٹھا کرنے کے ساتھ ساتھ فروخت کی زحمت بھی اُٹھاتا ہے، جس سے کہ سُود و زیاں وابستہ ہے، اس لئے ننانوے (۹۹) فی صدی منافع کا چلا جانا قرینِ قیاس بھی ہے۔ اُن کے منافع کے عظیم ہونے کی وجوہات بھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ فروخت اور مارکیٹ کی تنظیم بہتر انداز سے کرتے ہیں۔ دوسرے بازار میں ان چیزوں کا نعم البدل کوئی دوسری شے نہیں جس سے کہ مقابلہ ہو۔ اور مقابلے کی وجہ سے قیمت میں کمی کرنی پڑے۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ "اجارہ دارانہ قیمت" (Monopoly Price) وصول کرتے ہیں۔ مگر حکومت کی مساعی سے یہ ناموزون سلسلہ اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم کے قیام سے کاریگروں کی فن کاری کی بہتر طریقے پر نمائش کرنے اور اس سلسلہ میں اُنہیں مناسب قیمتیں دینے کا سلسلہ رائج ہو چکا ہے۔ آرٹس ایمپوریم ان کاریگروں کی پُوری حوصلہ افزائی کرنے کے لئے انہیں متعدد قسم کی سہولیات بہم پہنچا رہا ہے اور انہیں زیادہ سے زیادہ دام دینے کی کامیاب کوششیں کر رہا ہے۔ چناں چہ پچھلے برسوں میں ان فن کاروں کے اوسط روزینے میں کافی اضافہ ہو چکا ہے۔

یہ تو عیاں ہے کہ ایک اُستاد ایک ڈیلر سے قطع تعلقات کر کے بطورِ خود اپنا کام جاری رکھ سکتا ہے۔ اس لئے کہ بُنیادی سرمایہ، جس کی اس صنعت میں ضرورت پڑتی ہے، مختصر ہی ہے۔ لیکن اُستاد تکمیل کردہ اشیاء کی فروخت کی تنظیم کے سلسلے میں بالکل بے بس ہے جس کا اندازہ ہر اُس شخص کو آسانی سے ہو سکتا ہے جو کشمیر کی کاٹیج انڈسٹریز کی پیدا کردہ اشیاء کی فروخت کی تنظیم کے سلسلے میں تھوڑا بہت بھی جانتے ہیں۔ ڈیلر اس صنعت کا ایک اہم رُکن ہے۔ اس لئے بھی کہ وہ تعلیم یافتہ ہوتا ہے یا تعلیم یافتہ مُلازموں سے کام لیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے تعلقات اندرون و بیرونِ کشمیر کی تجارتی فرموں سے بھی اُستوار ہوتے ہیں۔ فروخت کی تنظیم چونکہ چند برس پیشتر تک غیر ترقی یافتہ تھی اور مارکیٹ میں مقابلہ کا بھی فقدان تھا اس لئے منافع کے بیش تر حصے کا، جو ڈیلر خریداروں سے قیمتوں کی شکل میں وصول کرتے تھے، اُن کے پاس رہ جانا دستوری شے تھی۔ ایمپوریم کے قیام نے اس مسئلے کو بھی باحسن و خوبی حل کر دیا ہے۔

مقابلہ کے بازار (Competitive market) کا فقدان منافع کو سرمایہ داروں یا ڈیلروں تک محدود کر دینے والا بُنیادی عنصر ہے۔ منافع کبھی بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتا اگر ایک ہی قسم کی چیز کے فروخت کرنے والے ایک سے زیادہ افراد ہوں۔ اگر ایک چیز ایک ڈیلر سے زیادہ کے پاس موجود ہو، اور ایک ہی خصوصیت رکھتا ہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ خریدار ایک کے عوض دوسرے

کے پاس نہ جائیں۔ اس طرح ڈیلروں کو مناسب اور یکساں قیمتوں کا چلن رکھنا ہوگا۔ جس کا تعلق لامحالہ اشیائے فروخت کی لاگت سے ہوگا۔ لیکن ان دِنوں ایسا نہیں ہوتا! خریدار چونکہ ایک خاص قسم کی چیز کے خواہاں ہوتے ہیں جو انہیں کسی خاص ڈیلر کے پاس ہی ملتا ہے، اس لئے ڈیلر بھی من مانی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ جس میں معاشیاتی اور اقتصادی پہلو تو نہیں، البتہ نفسیاتی پہلو ضرور کارگر ہوتا ہے۔ اس طرح ڈیلر خریداروں سے ایسی قیمت وصول کرتے ہیں جو اُس لاگت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جسے وہ اُستادوں کو اُجرت کی شکل میں ادا کرتے ہیں۔ ایک ڈیلر اس معاملہ میں بہت ہی تجربہ کار اور عاقبت اندیش ہوتا ہے کہ کس طرح خریداروں سے زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرے اور اُستادوں کو کم سے کم اُجرت ادا کرے۔ خریدار پورے بازار کا چکر لگائے اور قیمتوں کا مقابلہ کرے، ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کوئی ضروری نہیں کہ ایک ہی قسم کی چیز، جو ایک ڈیلر کے پاس موجود ہے، وہ کسی دوسرے کے پاس بھی ملے۔ اس لئے کہ ڈیلر اس معاملے میں بھی ہوشیار ہے کہ خریدار آسانی سے اُستادوں تک نہ پہنچ سکے۔ اور اس اقدام میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہے۔ اُستاد ڈیلروں کی فرمائش پر چیزیں تیار کرتے ہیں۔ اگر وہ سوچیں کہ ڈیلروں سے خام مال خرید کر چیزیں تیار کریں اور زیادہ قیمتوں پر بطورِ خود فروخت کریں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں؛ لیکن سوچتے ہیں کہ یہ دھندا کتنے دِنوں تک چلے گا۔ ایسی صورت میں موسم سرما میں، جب کہ کاروبار بالکل ٹھپ ہوتا ہے، ڈیلروں کا سلوک اُن کے ساتھ ہمدردانہ نہیں رہے گا۔ وقتِ ضرورت وہ اُن کو قرض بھی نہیں دیں گے۔ اگر ایک اُستاد باری باری سے مختلف ڈیلروں کے ساتھ تعلقات اُستوار کرے، یہ بھی اس کے لئے صحت مند نہیں۔ اس طرح وہ اپنا وقار اور بھرم کھوتا ہے جو تجارتی نقطۂ نظر سے نقصان دہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بلاواسطہ اُستادوں سے چیزیں حاصل کرنا خریداروں کے لئے امرِ محال تو نہیں، البتہ مشکل ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیلر ان باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خریداروں سے من مانی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ اگر اتفاق سے کبھی کوئی خریدار کسی شو رُوم سے ویسی شے کچھ کم قیمت پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ڈیلر کہتے ہیں کہ خصوصیات کے لحاظ سے وہ کم قیمت شے معمولی ہوگی۔ ورنہ اتنی کم قیمتوں پر ملنا محال ہے۔ جسے سیدھے سادے خریدار باور بھی کر لیتے ہیں۔ گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم اس مشکل کو حل کرنے میں بھی کافی کامیابی حاصل کر چکا ہے۔ کیونکہ ایمپوریم کے ذریعہ سردیوں میں بھی کام جاری رہتا ہے اور اُس کو مارکیٹ میں لانے کے لئے تسلی بخش انتظامات کئے جاتے ہیں۔

خاتمہ:۔

میری تجویز یہ نہیں کہ ڈیلروں کو اس صنعت سے خارج ہی کر دیا جائے۔ اس لئے کہ وہ بھی تو ایک بُنیادی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اور موجودہ حالات میں تو انہوں نے اپنے وجود کا لوہا منوا لیا ہے۔ اور جن کے بغیر اس صنعت کی تنظیم ہی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اُستادوں میں سے اکثر کا خیال ہے کہ بغیر اُن کی امداد کے اُن کا کام بِلا اُلفت انجام دینا محال ہے۔ چناں چہ ڈیلروں کے وجود کو باقی رکھتے ہوئے مارکیٹ کو وسیع کر کے اُستادوں کو زیادہ سے زیادہ کام کے مواقع مہیا کرنا اور اس طرح اُن کو منافع کا شریک دار بنانا بہتر صورت ہے۔ اور یہ اُس وقت ممکن ہے جب کہ بازار میں مقابلہ (Competition) کی صورت پیدا کی جائے۔ حکومت کشمیر کے محکمۂ صنعت و حرفت کے اقدامات (اور جیسا کہ پنج سالہ منصوبہ کے سلسلے میں ہو بھی رہا ہے۔ اس معاملے میں بہت سی مفید خدمتیں انجام دے سکتے ہیں۔ جس کے لئے محکمہ کو موجودہ ڈیزائن اور مرقعوں کی فہرست (Catloug) رکھنی ہوگی۔ جس میں وقتاً بہ وقت تحقیق و تجسس کے ذریعے نئے ڈیزائنوں اور مرقعوں کا اضافہ بھی ضروری ہے۔ اس محکمہ میں ڈیلروں کے رجسٹریشن کے بعد اُن کو حق ہوگا کہ محکمہ کی تیار کردہ فہرست کے مطابق وہ اپنی پسند کے ڈیزائنوں کے لئے اُستادوں کو فرمائش دیں؛ یہ حکم اُن اُستادوں پر بھی لاگو ہوگا جو انفرادی طور پر اس کام کو کرتے ہیں۔ انہیں بھی منظور شدہ اور فہرست کے مطابق ڈیزائنوں پر کام کرنا ہوگا۔ اسی طرح اس محکمہ کے تحت ایک سنٹرل شو رُوم بھی قائم ہونا چاہیئے۔ جس کا کام یہ ہو کہ وہ نئے اور پرانے ہر قسم کے ڈیزائن بطورِ نمونہ نمائش کے لئے موجود رکھے۔ محکمہ وقتاً بہ وقت تیار

کردہ اشیاء کی عام نمائش کا بھی بندوبست کرے جس میں اُن کاریگروں کو اچھے انعامات دیئے جائیں جنہوں نے نئے ڈیزائن نکالے اور مرقع کاری کے میدان میں ایجاد و تخلیق کا نمایاں انجام دیا ہو۔ اس طرح اُستادوں کی بھی ہمت افزائی ہوگی۔ اور بازار میں مقابلہ (Competition) کا انداز بھی پیدا ہوگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیمتیں گریں گی۔ قیمتیں گریں گی تو طلب میں بھی زیادتی ہوگی۔ طلب میں زیادتی ہوگی تو مارکیٹ وسیع ہوگی۔ اور مارکیٹ وسیع ہوگی تو اُستادوں کو کام کے مواقع زیادہ ہاتھ آئیں گے۔ اور اس طرح بے روزگاری کی جڑ کٹے گی اور یہ لعنت کشمیر سے ختم ہوگی۔ اس لئے کہ کشمیر کا مستقبل وہاں کی صنعت و حرفت ہی سے وابستہ ہے۔ جس کے لئے فن کاروں کی ہمت افزائی اور پیدا کردہ اشیاء کے لئے بین الاقوامی قسم کی مارکیٹ کا انتظام ضروری ہے۔

دوسرے پنج سالہ منصوبے کے سلسلے میں حکومت کشمیر نے اس طرف جس بیدار مغزی سے توجہ دی ہے وہ قابل ذکر ہے۔ کشمیر ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں ایمپوریم اور بڑے بڑے اسٹورز کھول کر اور دوسری قسم کی نشر و اشاعت سے کام لے کر بازار کی توسیع میں جو حصہ لیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ اُستادوں کو کواپریٹو یونین اور کواپریٹو سوسائٹیز کے تحت متحد ہو کر کام کرنے کی ترغیب دینا بھی ایک بہتر اقدام ہے۔ کواپریٹو سوسائٹی کے کام کو اور بھی آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اُستادوں کی تیار کردہ اشیاء کی فروخت کا انتظام کرے۔ اور انہیں وقت پر مناسب شرطوں پر قرض دے بلکہ بے کاری کے زمانے میں بھی اُن کی امداد کرے۔ تاکہ اس صنعت میں کام کرنے والوں کی ہمت افزائی ہو اور انہیں ڈیلروں سے نجات ملے۔ خوشی کی بات ہے کہ گورنمنٹ نے کامگاروں کی ٹریننگ اور مرقع کاری کے سلسلے میں ریسرچ کی طرف بھی توجہ دی ہے جو اس صنعت کی بُنیادی شے ہے۔ مجموعی طور پہ کہا جا سکتا ہے کہ حکومت کشمیر نے کافی ہمدردی کے ساتھ پیپر ماشی کی صنعت میں کام کرنے والے کامگاروں اور فن کاروں کی مشکلات کو سمجھ کر اُن کو دُور کرنے کی سعی کی ہے۔ لیکن ہر کام کچھ وقت چاہتا ہے۔ جڑیں دیر سے قائم ہوتی ہیں۔ تغیر اور انقلاب گردش روزگار کا منتظر رہتا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ پیپر ماشی کی صنعت حکومت کشمیر کے محکمۂ صنعت و حرفت کے تحت دِن دُونی ترقی کرے گی اور اس طرح اس کی دولت سے کشمیر کی قومی دولت میں اضافہ ہوگا جو غربت اور فلاکت کی جڑ کاٹنے میں ممد و معاون ہوگا۔

کشمیر کا مستقبل صنعت و حرفت ہی سے وابستہ ہے۔ اگر اس گُر کو حکومت جموں و کشمیر سمجھتی ہے تو اُسے فن کاروں اور کامگاروں کی ہمت افزائی کرنی ہوگی اور تیار کردہ اشیاء کے لئے بین الاقوامی قسم کا بازار تلاش کرنا ہوگا۔ جب ہی جنتِ کشمیر "فردوس بروئے زمین" کی مثال قائم کرسکتا ہے!

روشن مستقبل

صدر ریاست شری کرن سنگھ جی نے کہا ہے کہ "سوویت یونین اور دوسرے یوروپی ممالک میں کشمیری دست کاریوں کی کھپت کے امکانات کافی روشن ہیں۔ مرکزی سرکار اور ریاستی حکومت مقامی دست کاروں کی مصنوعات کے لئے بیرونی منڈیاں تلاش کرنے کی جو کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں اُن سے ہمارے کاریگروں اور دست کاروں کو معاشی اعتبار سے خاطر خواہ فائدہ ہونے کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ ہمارے صناعوں اور کاریگروں کو لازم ہے کہ وہ بیرونی ممالک کی دست کاریوں کے ڈیزائن اور تیکنیک کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں تاکہ اُن کے فن میں تنوع اور جدت پیدا ہوجائے!"

سیلاب تہٕ ساحِل

اگر اَز تہٕ کُر بانٛبرِی سونٛتس واوَن
خبردار چھُکھ ہو دِلو! ییٚتھنہٕ راوَکھ
اگر اَز تہٕ سنبلُن ژلَن روگہٕ روگی
ینو بُلبُلو نیب ہیُو گژھی ووش ژہٕ تراوَکھ

(۱)

مزارَس چھُ پارُد بٕنیس کھ کاینٲتس
ہوا ڈوٗل شمع ژھیٚو دُ ژھوکیو شب منٛج پھوٗل
وِنی اوس کفنَس وُلِتھ ماگ ڈولان
وِنی دوشلہٕ شراوُن بہارَن مُشک موٗل

(۲)

ہمو سیتی شوٗبیا وِچھُن وونت سوٗدرَس
چھہ مُژ زِندگی آینٕ منزٕ آینٕ ہاوان
دَبابس غلط ناو تھووُتھ گُنگُ سوکھ
یہٕ بیدل چھُ بعضے دِلکِ داد باوان

(۳)

قدرس لاگہٕ ہِندس قدر کرُ زمانن
دُدُن میوٗٹھ نہٕ مجلوٗنہٕ شُند نجُدہ بالَس
یمی سانہٕ بُتراژ پٔیٹھو پوک ہلاکو
سُیہے حافظس مس بہال اُس پیالَس

(۴)

کتین منز چھہ ژعیب ہیٚتھ مح ... آسان
کنی رنگہٕ کرکھ گژھ ... [1] ژندٕل آسانَس

[1] سدوم سام بُد بیٚزٕ دَصرٕ - قومی قرزہ

چھ ییتہ لنجہ پیٹھ کاوشو نگنک کراں سنز
تتی نیتھ درہ بلبل تلاں بوستانس

(۶)

دلو ایتھ بُلہ داہنس لادہیاوکھ
چھ باغس اندر رنگ برنگہ ذاتہ پوشن
مہ کرغانہ بندی صبح شام وقتس
گہے لوسہ اختابہ گہہ زُون روشن

(۸)

اگر رُٹ نہ یمبر زلو پہارہ پنچ خوی
بوئمبر زندہ تھاواں چھ سونچ روایت
اگر زن ہرُد آسہ سوزاں وندس سے
دُزتھ بونہ زُرحراں چھ گرشمک امانت

(۱۰)

(۵)

چھ ییتہ عالمس آڈرن اختلافچ
ازل شینہ بالاہ، ابد تا پہ کالاہ
ونس منز چھ پادر دہنو گریز حقیقت
ینن مد چھ ہرنس دزن شوخ ڈالاہ

(۷)

اگر لول پریز لاوہ فونوس زہنکہ
جدائی چھ حسنک ملاقات باساں
اگر زن ییس منز یوٹھکہ خواب وتلن
مرُد زندگی ہند کرامات باساں

(۹)

دُل گونہ چون ہاوس تہ شونچ شرافت
دلو اتھ چھ عشقکہ یم اطوار پہاونہ
منہ گوب باسہ روتل ژنیہ سحر جلنہ کتھ
یہ دوہ ٹھلایہ نارس، ژنیہ گل شگفتاونہ

ایک سیاح کے قلم سے

معرکہ مکر کوٹ

مکر کوٹ اُس قومی شاہراہ پہ واقع ایک چھوٹا سا اور ناقابلِ توجہ گاؤں ہے جو جموں اور سرینگر کو ملاتی ہے۔ ممکن ہے کہ پچھلے زمانے میں یکے یا بیل گاڑیاں یہاں پہ واقع باولی کی وجہ سے اس جگہ ٹھہر جاتی ہوں۔ کیونکہ اس پہاڑی مقام پہ اب بھی صاف اور شیریں پانی مل جاتا ہے۔ مگر زمانے کی تیز رفتاری نے اس کی وہ اہمیت بھی ختم کر دی ہے اور شیورلیٹ اور مرسڈیز گاڑیاں اب یہاں سے فراٹے بھرتی گذر جاتی ہیں۔ صرف کسی وقت جموں یا امرت سر سے آنے والے چھوٹے تاجر یہاں کی دُکانوں میں اخروٹ یا خود رَو سبزیوں کی تلاش میں آجاتے ہیں۔ جو کہ پہاڑی ڈھلوانوں میں بہ کثرت ملتے ہیں۔ مگر عام حالات میں مکر کوٹ کو کوئی نظرِ اعتناء سے نہیں دیکھتا۔ یہاں تک کہ اکثر وہ لوگ بھی، جو قومی شاہراہ پہ سفر کرتے ہیں، اس کے وجود سے بے خبر رہتے ہیں۔ اس جگہ پہ نہ تو آرام کے وہ وسائل مہیا ہیں اور نہ ہی زندگی کی وہ ہماہمی جو برسرِ راہ مقامات، مثلاً کُد، بٹوت، رام بن یا بانہال کے ساتھ وابستہ ہے۔

اور اندازہ کیجیے کہ اب یہی مکر کوٹ ایک گرم خبر بن کے تہلکہ مچا رہا تھا۔ پاس کی پہاڑی ڈھلوان، جس کے ساتھ سڑک ایک بالکونی کی طرح چپکی ہوئی پھسلتی جا رہی تھی اور اسی طرح سے ہر اُس چیز کو بھی اپنے چنگل میں داب رہی تھی، جو پہلے یہاں پہ نظر آتی تھی۔ ان چیزوں میں وہ بھاری بھرکم گھِسی ہوئی چٹانیں بھی شامل ہیں جو اپنا مرکزِ ثقل جیسے کھو بیٹھی ہوں۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر پُل، کلورٹ، سڑک کو ایستادہ رکھنے والے پُشتہ کنارے یا خود سڑک نام کی کوئی چیز منصۂ شہود پہ سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔

جب نور جولائی کو صبح سویرے بخشی غلام محمد جائے وقوع پہ پہنچے تو "مون سون" کی گھٹائیں اپنی پُرغضب کیفیت میں بل کھا رہی تھیں۔ اور زوروں کا مینہ برس رہا تھا۔ دریا کے پار سڑک کا کوئی سُراغ نہیں مِلتا تھا۔

پتھر چاروں طرف سے یلغار کر رہے تھے اور لڑھکتی ہوئی چٹانیں وہ خوفناک شور پیدا کر رہی تھیں جیسے آتشیں توپ خانوں کے دہانے کھول دئے گئے ہوں۔ دیہاتی باشندے، جن کے مکان اب کیچڑ کے انباروں میں تبدیل ہو گئے تھے، تشویش اور وحشت کے مارے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ انجینئر بڑی حسرت ناک نگاہوں سے نیچے دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ سڑک کو کھلا رکھنے کے لئے اُنہوں نے جو جان توڑ کوششیں کی تھیں، مکر کوٹ کی پھسلن نے اُن سب پر پانی پھیر دیا تھا۔ اور اس کاری ضرب سے مجروح ہو کر وہ ہتھیار ڈالے بیٹھے تھے۔ ایک ہزار سے زائد کشمیری مزدور، جو سڑک کی بحالی کا کام کرنے کے لئے لائے گئے تھے، اس ہیبت ناک منظر کو خوف اور کرب کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

مکر کوٹ کے اس ہیبب سماں میں بخشی غلام محمد کے سامنے صرف یہی مسئلہ نہیں تھا کہ عناصر کے اس اچانک غیض و غضب کا کس طرح مقابلہ کیا جائے بلکہ اس کے ساتھ دوسرا اہم تر مسئلہ یہ تھا کہ اُن دو ہزار سیاحوں کا کیا بندوبست کیا جائے جو سڑک کی اس رُکاوٹ کی وجہ سے یہیں پر محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ سیاح پہلے ہی دو ہفتوں کے لئے سرینگر، پہلگام اور دوسرے مقامات پہ بے چینی سے سڑک کھلنے کا انتظار کر چکے تھے اور اب عملاً ان کے سارے ذخیرے ختم ہو چکے تھے۔ اضطراب اور بے کسی کی کیفیات اُن کے بُشرے سے ٹپکتی پڑتی تھیں۔ اور اُن پر نظر ڈال کر کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ لوگ ریاستی حکومت سے توقع رکھتے تھے کہ اُنہیں کسی حال میں بھی اُن کی منزلِ مقصود تک پہنچایا جائے۔ اور اس سلسلہ میں معجزے کر دکھائے

جائیں۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ بخشی غلام محمد بحران کے ان اوقات میں اپنی قوتِ عمل سے معجزے دکھا چکا ہے۔ بخشی صاحب کو بھی سیاحوں کی ان محسوسات کا بخوبی علم تھا۔

بخشی صاحب نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ سیاحوں کو محفوظ جگہ پر پہنچایا جائے۔ وہ خود کشمیری مزدوروں کی بھیڑ میں گھس گئے اور انہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ انہوں نے کہا:۔

"ہماری تجویز یہ ہے کہ سیاحوں کو دوسرے کنارے تک پہنچایا جائے۔ یہ بڑا کٹھن اور بڑا پُرخطر کام ہے۔ انہیں گھاٹی کے چوڑے پاٹ کو عبور کرنا ہے۔ جس میں سیلاب کا پانی موجیں مار رہا ہے۔ ہمیں بہت سے ننھے منے بچوں، بوڑھوں اور ناتوانوں کو پار لے جانا ہے۔ اُن کے ساتھ اُن کی چھوٹی چھوٹی جائدادیں بھی ہیں۔ اور دوسری طرف سے موسلادھار بارش برس رہی ہے۔ ان حالات میں صرف یہی ایک حل ہے کیونکہ اس لمحے سڑک کی آئندہ کیفیت سے متعلق کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ اس مقدس کام کا بیڑا اُٹھائیں گے؟ کیا آپ کو احساس ہے کہ یہ کام کتنا متبرک ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کی زندگی، ان کی جائداد اور ان کی عزت اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ کیا میں بھروسہ رکھوں کہ آپ اس مشکل مرحلے کو طے کر سکیں گے؟"

بخشی غلام محمد بڑی آہستگی اور بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ کشمیریوں سے مخاطب تھے۔ ایک بوڑھا مزدور آگے بڑھا اور اس نے "خالدِ کشمیر زندہ باد" کا نعرہ بلند کیا۔ باقی مزدوروں نے اس آواز میں اس زور سے آواز ملائی کہ پہاڑیوں میں اس نعرے کی صدائے بازگشت گونج اُٹھی۔ اس کے بعد انہوں نے بخشی صاحب کو بتایا کہ "ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اپنے بھائیوں اور بہنوں کو حفاظت کے ساتھ دوسرے کنارے پہنچائیں گے اور ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ایک معمولی سوئی بھی کھونے نہ پائے گی!"

اور اس انداز میں کٹر کوٹ کے عظیم معرکے کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے پہاڑی کی ڈھلان میں چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں کھودی گئیں تاکہ پیدل چلنے والے لوگ دریا کے کنارے تک اُتر سکیں۔ اس کے بعد ایک کارنیس طرز کا پل اس جگہ پر آر پار ڈالا گیا جہاں دریا کا پاٹ سب سے تنگ تھا۔ اس کے بعد دوسری طرف کی پہاڑی میں بھی سیڑھیاں کھودی گئیں تاکہ دریا کو عبور کرنے والوں کو پہاڑی پر چڑھنے میں سہولت میسر ہو۔ اسی اثنا میں سیاحوں کی مختلف ٹولیوں کو اپنے ساز و سامان کے سمیت مزدوروں کے مختلف گروہوں کے سپرد کر دیا گیا۔ اور ہر ایک گروہ کا انچارج ایک ایک میٹ کو رکھا گیا۔ اس کے بعد اصل کوچ کا نقارہ بج گیا۔ بچوں کو آرام دہ طریقے پر "پھرنوں" میں لپیٹا گیا اور انہیں گرم رکھنے کے لئے اُوپر سے چادریں تانی گئیں۔ بوڑھے مرد اور عورتیں، جو اپنے پاؤں پر سیڑھیاں اُترنے کے قابل نہیں تھے انسانی کندھوں پر سوار ہو گئے۔ اور دوسری طرف کی عمودی چڑھائی طے کرنے کے بعد انہیں زمین پر اُتارا گیا۔ قافلے کے عقب میں دو سو (۲۰۰) مزدور اسباب اور سامان لے کر روانہ ہوئے۔ دریا میں جس جگہ پر خطرے کا مقام آ جاتا تھا، کشمیری ایک "انسانی رسی" کو تشکیل دیتے تھے اور ایک دوسرے کے بازوؤں میں بازو ڈال کر حیران و پریشان سیاحوں میں حوصلہ بھی پیدا کر دیتے تھے اور انہیں پُرخطر مقامات سے آگے بھی لے جاتے تھے۔ جتنے عرصے یہ معرکہ جاری رہا، فضا لڑھکتے ہوئے پتھروں کے لرزہ خیز شور و شغب سے معمور رہی۔ مگر نیچے نالے سے ایک خاص تال سم رکھنے والی آواز کا سلسلہ ہمارے کانوں میں پہنچتا رہا ــــــــ

"یا پیرِ دستگیر
یا علی مدد کر
یا شاہِ بغداد
یا شاہِ ہمدان
یا پیرِ دستگیر
یا علی مدد کر"

کشمیری اپنے بزرگوں اور اپنے مرشدِ دل کو آواز دے رہے تھے کہ وہ مشکل کے اس وقت میں اُن کی رہنمائی کریں اور انہیں کنارے لگا دیں!

اسی درمیان میں سڑک پر ایک اور ناکہ کی تیاریاں مکمل ہو رہی تھیں۔ دو گھنٹے پہاڑ کی پھسلن رُک جانے کے فضول انتظار کے بعد بخشی غلام محمد نے فیصلہ کیا کہ پھسلتے ہوئے تودے کو پیدل عبور کر کے انجینئروں اور مزدوروں

کی سڑک کے دوسرے کنارے تک راہبری کی جائے۔ بخشی صاحب بول اُٹھے کہ وہ غیر معین عرصہ تک اس بات کا انتظار نہیں کر سکتے کہ پہاڑ کا غضب کب تھمنے کو آئے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ پہاڑ کا غصہ ٹھنڈا ہونے میں کئی دن کا وقت لگ جائے۔ انجینئروں نے اُن سے بحث کی کہ کل ہی رات ایک لڑھکتے ہوئے ٹیلے کے نیچے آ کر تین مزدور اپنی جان کھو بیٹھے اور ایک جرمن انجینئر بُری طرح کچلا گیا۔ لہٰذا دانش مندی اور تجربے کا تقاضا یہی ہے کہ اس موقعے کو غنیمت جان کر اس جان لیوا منظر سے راہِ فرار اختیار کی جائے۔ اس کے جواب میں بخشی صاحب نے صرف اتنا ہی کہا کہ "میں اس خطرے کو آزما کے دیکھ لوں گا!"

جوں ہی اُن کے قدم آگے بڑھے، مجمع میں ایک ہل چل سی مچ گئی — پتھروں کا ایک ریلا پھسل آیا۔ بخشی صاحب رُک گئے — دوسری یلغار ہوئی۔ بخشی صاحب پھر رُک گئے۔ چشمِ زدن میں سب نے کیا دیکھا کہ بخشی صاحب پُوری پامردی سے قدم بڑھا رہے تھے۔ موقعے پر جو بھی موجود تھا، اُس نے سانس روک کے دُعا کی کہ اس جری کشمیری راہنما کی جان سلامت رہے جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس غرض کے لئے کوشاں تھا کہ سڑک کھل جائے اور وادی کے سیلاب زدہ علاقوں میں ضروریاتِ زندگی کی اشیاء پہنچ سکیں۔ وہ بڑے ضبط کے ساتھ تھوڑا تھوڑا آگے سرکتے رہے۔ یہاں تک کہ سب سے زیادہ پُرخطر مقام اُن کے عزمِ صمیم کے آگے سپر ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ موت کی وادیاں اُن کے قدموں کے نیچے روندی گئیں۔ اور وہ صحیح وسلامت دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ ناگاہ فضا میں "خالد کشمیر زندہ باد" کا فلک شگاف نعرہ گونج اُٹھا۔ اور اس کے چند لمحے بعد ہی انجینئر اور مزدور سڑک صاف کرنے اور چٹانیں کاٹنے کے کام میں ہمہ تن معروف ہو گئے۔ قسمت اب مہربان تھی۔ پہاڑ کا خشم جیسے تھم گیا۔ یکایک بادل چھٹ گئے اور نیلا مُسکراتا آسمان نمودار ہو گیا۔ ۱۸۰۰ پر سڑک کھل گئی جب کہ بخشی صاحب نے پھر ایک جیپ میں بیٹھ کر اسے عبور کر لیا۔ دوسری صبح کو وادی کشمیر سے آنے والی ۴۰۰ سے زائد لاریاں، یاتریوں سے لدی ہوئی۔ ۵ بسیں اور بہت سی موٹر کاریں یہاں سے گزر گئیں اور وہاں سے بھی تک بھگ اسی مقدار کی گاڑیوں نے کشمیر کا راستہ لیا۔ ہندوستانی فوج کے ایک جرنیل نے جو کئی دنوں تک "کنواسے" کے ساتھ رُکے پڑے تھے اور جنہوں نے بخشی غلام محمد کو پچھلے دن فطرت کی بربریوں سے مصروفِ جہاد دیکھا تھا اور یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ کٹھن سے کٹھن رُکاوٹ کو خاطر میں نہ لا کر آگے بڑھتے گئے۔ بٹوت کے قریب بخشی صاحب کی موٹر کار کو راستہ دینے کے لئے اپنی سواری رُکوالی اور اُس کے بعد بخشی صاحب سے مخاطب ہوئے :-

"جناب والا!
آپ نے اپنے عزم اور شجاعت سے ہماری "کنواسے" کی رہنمائی کرنے کا حق حاصل کر لیا ہے!"

اعلیٰ تربیتوں کے لئے سہولیات کی فراہمی

اعداد و شمار کی روشنی میں

اپریل ۱۹۵۳ء سے مارچ ۱۹۵۹ء تک

منظور شدہ قرضے ۴۷،۴۲،۳۰۰ روپے

وظائف جو دئے گئے ۷۳،۶۰۰ روپے

طلباء جو مختلف تربیتوں کے لئے باہر بھیجے گئے ۲۱۲۹

طلباء جو مختلف شعبوں میں تربیت حاصل کر رہے ہیں :-

ایم۔بی۔بی۔ایس ۱۵۵ ڈگری انجینیرنگ ۴۶۶ بی۔ایس سی اگریکلچر ۳۴۴ ڈپلوما انجینیرنگ ۴۵۲

ساحر لکھنوی

پندرہ اگست

نویدِ شادمانی صبح کی پہلی کرن لائی
مبارک ہو عروسِ رنگ و بو کی جلوہ فرمائی

فضا میں گونج اٹھے ہر طرف نغماتِ آزادی
بہت دلکش ہے سازِ زندگی کی نغمہ پیرائی

طلوعِ مہرِ روشن کا نظارہ کتنا رنگیں ہے
کسی الھڑ نے جیسے اورِ معنی شانے سے ڈھلکائی

گماں ہوتا ہے بادِ صبح کے جھونکوں کی آہٹ پر
کہیں میٹھے سروں میں بج رہی ہو جیسے شہنائی

گلستاں کی فضا میں یہ ادا خوش رنگ کلیوں کی
شبِ مہتاب میں جیسے کسی کافر کی انگڑائی

نشاط افروز ہیں فیاضیٔ فطرت کے آئینے
بہارِ نور و نکہت سیلِ رنگینی و رعنائی

سرور و کیف کی اک موج سی رقصاں ہے رگ رگ میں
دماغ و دل پہ ہے اک مستیٔ بے نام سی چھائی

بتائے کیا کوئی بیداریٔ احساس کا عالم
سکوتِ غنچہ و گل بھی ہے محوِ نغمہ پیرائی

یہ لہراتے ہوئے آنچل، یہ رنگا رنگ پوشاکیں
یہ سطحِ ارض پر قوسِ قزح کی جلوہ فرمائی

بہ ایں سیلِ غمِ دنیا۔ بہ ایں سیلِ غمِ ہستی
ہر اک کے رخ پہ موجِ شادمانی ہی نظر آئی

سرورِ جاوداں جس میں عطا ہوتا ہے رندوں کو
اسی خمخانۂ جاوید سے ہے بادہ پیمائی

حیاتِ دائمی کے مقتضی ہیں جہدِ پیہم سے
یہ جلوے، یہ بہارِ روح پرور، یہ دل آرائی

اٹھو ساحرؔ تقاضے وقت کے پورے بھی کر ڈالیں
بہارِ جاوداں ہو جائے عکسِ حسنِ یکتائی

ہمارے جنگلات — کچھ اعداد و شمار

کانیفر کے جنگلات ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ ریاست جموں و کشمیر کے علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ ریاست کا کل رقبہ ۵۰ ہزار مربع میل ہے جس میں سے گیارہ ہزار مربع میل صرف جنگلات سے گھرا ہوا ہے۔ چنانچہ اس وقت اس رقبے کا نصف سے زیادہ حصہ اُن ورکنگ پلانوں کے تحت زیر کار ہے جو کہ حکومت نے منظور کئے ہیں۔ اور جوں جوں نئی سڑکیں تعمیر ہوں گی زمینوں کے مزید خطوں پر جنگلات اُگائے جائیں گے۔

محکمۂ جنگلات کے سرسری اندازہ کے مطابق جنگلات کا ۵۵ فیصدی رقبہ صنوبر اور سرو کے درختوں سے بھرا ہوا ہے۔ جب کہ ۲۲ فیصدی رقبہ چیر کے درختوں سے ڈھکا ہوا ہے۔

ایک اور اندازہ کے مطابق جنگلات کے اکثر حصوں میں ۴ سے ساڑھے چار ہزار مکعب فٹ لکڑی فی ایکڑ علاقے میں پائی جاتی ہے۔ ریاست میں دیودار کے درختوں سے جو لکڑی حاصل ہوتی ہے وہ اس قدر اعلیٰ قسم کی ہے کہ اس کو عام طور پر "شمال کا ساگوان" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ جموں کے علاقے میں جنگلات کا رقبہ ۴۴۱۷ مربع میل ہے، اس رقبہ کو جن آٹھ ڈویژنوں میں تقسیم کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:-

بھدرواہ، کشتواڑ، ڈوڈہ، رام بن، بلاور، اودہم پور، ریاسی، پونچھ اور راجوری۔ ان میں سے پونچھ، راجوری ۱۹۴۷ء کے قبائلی حملے سے پہلے دو ڈویژن تھے۔ لیکن اب یہ ایک ڈویژن بنایا گیا ہے۔ کیونکہ ان دو سابقہ ڈویژنوں کا ۱۵۰۰ مربع میل جنگلاتی رقبہ دشمن کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے۔ باقی جو علاقہ بچ گیا، اس کو ملا کر ایک ڈویژن بنایا گیا۔ جس کا نام پونچھ راجوری ڈویژن رکھا گیا ہے۔

محکمہ جنگلات نے جنگلات کے علاوہ بہت سی بہکوں (Bahaks) کو بھی اپنے کنٹرول میں رکھا ہے۔ ان بہکوں کو چراگاہوں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ان چراگاہوں سے سالانہ ایک لاکھ ۲۵ ہزار روپے چرائی ٹیکس کے طور پر حاصل ہوتے ہیں۔

محکمہ جنگلات کے ہاں کوئی بیس رکھیں بھی ہیں جن کو شکارگاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جنگلات سے پیداوارِ خفیفہ بھی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ کُٹھ، بیلوڈونا، پیریتھرم، کاڈر، پانس، آرٹیمیا، گچھیاں، زیرہ، بنفشہ وغیرہ ان جنگلوں میں کثرت سے پایا جاتا ہے اور ان سے محکمہ کو سالانہ دو لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔

محکمہ جنگلات کی طرف سے ایسے انتظامات کئے جا رہے ہیں جن کی موجودگی میں جنگلات کے ٹھیکیداروں کی لاپروائیاں اور جعل سازیاں اگر کچھ ہوں، تو دُور کی جا سکتی ہیں۔

دیودار، کایل یا چیر کا درخت اُس وقت ایک شاندار چیز بن جاتی ہے جب اس کا لپیٹ کم سے کم ۶ فٹ ہو جاتا ہے۔ ایسا گھیرا حاصل کرنے میں ایسے درختوں کو کوئی ڈیڑھ سَو سال کی عمر لگتی ہے۔ اسی طرح صنوبر کے درخت کا زیادہ سے زیادہ محیط ۸ فٹ ہوتا ہے۔ اس کو بھی قریب ۱۵۰ سال اس درجہ تک پہنچنے میں لگتے ہیں۔ جموں کے علاقے میں ایسے درخت بھی پائے جاتے ہیں جن کا گھیرا ۳۰ فٹ کے قریب ہوتا ہے۔ ایسے درختوں سے تین سَو سے چار سَو تک شہتیریاں فراہم ہوتی ہیں۔ چیر کے درخت سطح سمندر سے ایک ہزار سے ساڑھے چار ہزار فٹ کی اونچائی پر اُگتے ہیں جب کہ کایل ۴۵۰۰ فٹ سے ۱۰۰۰۰ فٹ تک کی اونچائی والے علاقہ میں دیودار ۴۵۰۰ فٹ سے ۸۰۰۰ فٹ تک کی اونچائی والے علاقے میں اور صنوبر کے درخت ۷ ہزار فٹ سے ۱۱ ہزار فٹ تک کی اونچائی والے علاقے میں اُگتے

[illegible] میں صنوبر کے درخت ۵ ہزار فٹ کی اونچائی والے علاقوں میں پائے گئے ہیں۔

چیڑ کے درخت سے جو لکڑی حاصل ہوتی ہے وہ اگرچہ عمدہ قسم کی نہیں ہوتی، لیکن اسے دوسرے درختوں پر فوقیت اس لئے حاصل ہے کیونکہ رال کی صورت میں انسان کی خوشحالی کے لئے خون فراہم کرنے کا کام انجام دیتا ہے۔ اسی لئے اس کو "خون بخشنے والا (Blood donor)" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اگرچہ رال نکالنے کا یہ سلسلہ کوئی ۷۰ سال ہوئے جاری ہوا تھا، لیکن اس کو سائینسی بنیادوں پر درختوں سے نکالنے کا طریقہ صرف بیس برس قبل اختیار کیا گیا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک چیڑ کے درخت سے اوسطاً ۳ سیر ۵ چھٹانک رال مہیا ہوتی ہے۔ ایسے درخت زیادہ تر ادھم پور، بلاور اور ریاسی کے ڈویژنوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان ڈویژنوں سے عموماً سالانہ ۹۲ ہزار من رال چیڑ کے درختوں سے نکالی جاتی ہے۔ اس میں سے ۴۵ ہزار من صرف ادھم پور ڈویژن سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ محکمۂ جنگلات کو رال سے کوئی دس لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدن ہوتی ہے اور اس سے تقریباً سات ہزار کنبوں کو چھ مہینوں کے لئے روزگار ملتا ہے۔ یہ لوگ تقریباً دو لاکھ پانچ ہزار روپے اُجرت کے طور پر حاصل کرتے ہیں؛ اس کے علاوہ یہ لوگ رال اور ٹرپنٹائن فیکٹری سے بونس حاصل کرتے ہیں۔ یہ فیکٹری محکمۂ جنگلات کے رال کی واحد خریدار ہے۔

حکومت جموں وکشمیر کو ریاست کے جنگلات کے آٹھ ڈویژنوں سے سالانہ ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے کی آمدن ہوتی ہے۔ محکمۂ جنگلات تقریباً چوبیس ہزار لوگوں کو سال میں چھ مہینوں کے لئے روزگار فراہم کرتا ہے۔ اگرچہ مزدور کی یومیہ اُجرت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے ہے لیکن اس کو راشن کم نرخوں پر دلوایا جاتا ہے۔ اس کو مفت طبی امداد بھی بہم پہنچائی جاتی ہے۔ حال ہی میں ان کے لئے "لیبر ویلفیئر فنڈ" کھولا گیا۔ اور مزدوروں کو ناگہانی آفتوں سے دوچار ہونے کی صورت میں اس فنڈ سے نقدی امداد دی جاتی ہے۔ اگر کوئی مزدور فوت ہوجائے تو ۵۰ سے ۷۰ روپیہ تک معاوضہ اس کے وارثوں کو دیا جاتا ہے۔

زیادہ درخت اُگانے کی طرف محکمہ خاص طور سے توجہ دیتا ہے۔ اور اس بات پر نگاہ رکھتا ہے کہ اگر کہیں ایک درخت گرایا جائے تو اس کے مقابلے میں کم از کم دس درخت اُگائے جائیں۔ محکمہ بیج بونے کے طریقے کے علاوہ نرسریاں بھی قائم کرتا ہے۔ اور اس طرح سالانہ پندرہ لاکھ پودے اُگائے جاتے ہیں۔

صوبہ جموں میں پائیں علاقوں میں پچھلے چار پانچ سال کے دوران چھوٹے پیمانہ پر ساگوان کے درخت اُگانے کے تجربے کئے جاتے رہے۔ اور اس وقت تک اس کے نتائج کافی حوصلہ افزا نکلے ہیں۔ چناں چہ محکمہ اس بات پر غور کر رہا ہے کہ کٹھوعہ اور جموں کے ضلعوں میں دو ہزار ایکڑ زمین کے رقبہ میں ساگوان کے درخت اُگائے جائیں۔ اگر ساگوان کے درختوں کو موافق زمین اور آب و ہوا مہیا ہو تو مستقبل قریب میں سارے جموں کے جنگل ساگوان کے درختوں سے بھر جائیں گے۔ اس سے صوبہ کی خوشحالی میں اضافہ ہوگا۔

محکمہ جنگلات کے تحت کٹھوعہ اور جسروٹہ میں تقریباً تین ہزار ایکڑ کا رقبہ ہے۔ اس رقبہ میں بانس کے درخت اُگائے جاتے ہیں۔ بانس آسانی سے اُگ سکتا ہے۔ اگر ریاست یا بیرونِ ریاست میں بانس کو منڈی مل جائے تو ایسے درختوں کو مزید رقبے میں بھی اُگایا جا سکتا ہے۔

محکمۂ جنگلات میں ورکنگ پلان کے تحت جاری کئے گئے کام کو ماہروں نے کافی حوصلہ افزا قرار دیا ہے۔ ورکنگ پلان پر جنگلات کے صحیح اور باقاعدہ انتظام کا دارومدار ہے۔ ریاست میں سڑکوں کا جال بچھ جانے سے جنگلات کو زیر استعمال لانے میں مدد مل جائے گی۔ اور اس طرح ریاست کے وسائل بڑھ کر اس کی مجموعی خوشحالی میں نمایاں اضافہ ہوگا۔

نگارشات ارسال کرتے وقت اس امر کا خاص خیال رکھیئے کہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہوں۔ دوسری صورت میں آپ معاوضے کے حق دار نہیں ہو سکتے!

کشمیر کی جھیلیں۔
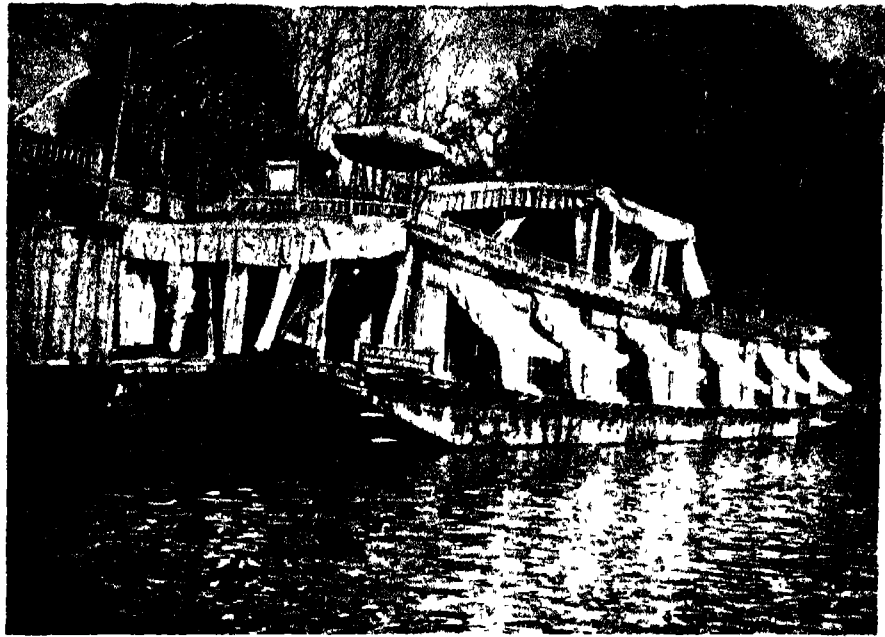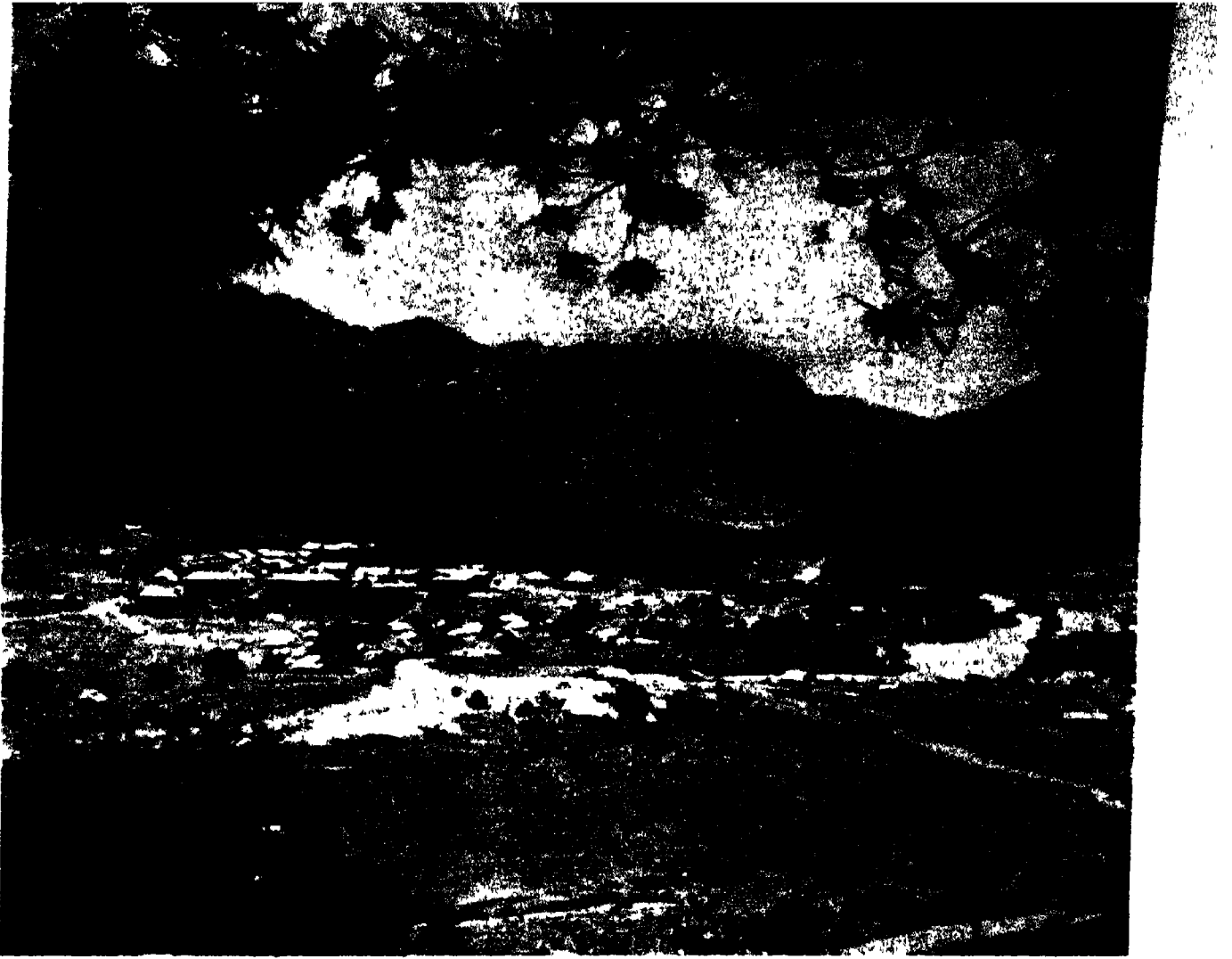
شہر کے ہنگاموں سے دور

دو آتشہ

سُنو نہ میری شکستہ دِلی کے افسانے
کہ میرے سامنے توڑے گئے ہیں پیمانے

جو کہہ رہا تھا تو کچھ بھی سُنا نہ دُنیا نے
جو چُپ ہوا ہوں تو بننے لگے ہیں افسانے

چمن میں قطرہ بہ قطرہ، مژہ پہ افسانے
مزاجِ شبنم بے عمر کون پہچانے

مرا غرورِ طلب ہی قبول کر نہ سکا
تری نگاہ تو اُٹھی تھی دِل کو بہلانے

یقینِ غم کے بھی قدموں کو ڈگمگا نہ سکی
چلی تھی سعیٔ کرم زندگی کو بہکانے

مزاجِ درد کو آ ہی گیا سلیقۂ ناز
بڑے شعور سے دھوکے دئے ہیں دُنیا نے

نہ ہو سکا کوئی میرا شریکِ خلوتِ شوق
کبھی مِلے بھی تو کترا گئے ہیں ویرانے

وہ غم ہمیشہ لٹائے میں نے زندگی کے لئے
تری نگاہِ کرم بھی جنہیں نہ پہچانے

یہ چاندنی، یہ ستارے کہاں گئے آخر
نظر تو خیر گئی ہے کسی کو پہنچانے

گذر گئے ہیں وہ لمحے بھی عشق میں اے دوست
ترے بغیر بھی جب خوش رہے ہیں دیوانے

مری ہنسی میں مگر زہر گھل گیا نازشؔ
میں چاہتا تھا مرا غم کوئی نہ پہچانے

مِلا دیتا ہے ان کے ذِکر میں اپنا بھی افسانہ
بہت ہُشیار ہوتا ہے بکارِ خویش دیوانہ

نہ مانگے گا کرم کی بھیک کہہ کر اپنا افسانہ
ترے احساس کا صرف امتحاں لیتا ہے دیوانہ

اُداسی، خامشی، بے رنگی، اضمحلال، سناٹا
بڑے ساماں ہوا کرتے ہیں جب بنتا ہے ویرانہ

کہاں ہے عشق کو فرصت کہ بیٹھے داستاں کہنے
حقیقت خود ہی آگے چل کے بن جائے گی افسانہ

قیامت ہے چمن میں غیر کے دو دن کا کٹنا بھی
گذر جاتی ہے راحت سے جو ہو اپنا ہی ویرانہ

اجازت ہو تو شامِل کر لوں میں رُودادِ امیں بھی
مُرتب کر رہا ہوں عشق کی جُرأت کا افسانہ

کہاں ہر ایک کو مِلتا ہے یہ اعزازِ رُسوائی
کہ صدیوں میں ہوا کرتا ہے کوئی ایک دیوانہ

کِسے جُرأت کہ نازشؔ ان کی بزمِ ناز میں کہہ دے
جو دیوانہ بنانا ہو تو پہلے خود ہو دیوانہ

سک۔ این پنڈتا

داغ و غالب

(قسط دوم)

پہلی قسط میں ہم نے جناب شہاب مالیر کوٹلوی کے رسالہ آج کل کے ماہ فروری کی اشاعت میں چھپے ہوئے مضمون بعنوان "دیوان غالب اور گل کدہ داغ کا سیر" کے چند اشعار پر نظر ثانی کی تھی اس قسط میں ہم اسی سلسلہ کی دوسری اشاعت کے چند اشعار پھر زیر غور لاتے ہیں۔

شعر ملا "بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بین ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا (غالب)
میں وضع کا پابند ہوں سر جائے تو جائے
جب کوئی بلانے نہیں آتا نہیں جاتا (داغ)

غالب کے شعر کا مقابلہ داغ کے شعر کے ساتھ کرنا زبردستی نہیں تو اور کیا۔ غالب کا شعر صوفیانہ بلکہ فلسفیانہ مضمون کا ہے اس کے برعکس داغ کا شعر محض شوخیانہ۔ موازنہ کے لئے ان اشعار کا انتخاب نامعلوم غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ داغ کی حمایت کرتے ہوئے جناب شہاب رقمطراز ہیں "جب محبوب کا اشارہ ہو تو قدم بڑھاتا ہوں" ظاہر ہے کہ حقیقی عشق میں محب کی طرف سے اشارہ کی توقع ہی نہیں رکھی جاتی۔ سالک راہ عشق پر بغیر کسی سہارے کے گامزن ہوتا ہے پھر حقیقی محبوب نے کب کسی سے اپنی طرف آنے کی دعوت اٹھا رکھی ہے اس کا عشق نعمت سرمدی ہے اور مستقل بلاوا۔

اس کے برعکس غالب کے شعر میں جو بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے وہ شاہانہ ہے۔ انسان ہر حالت میں اپنی خودی قائم رکھ سکتا ہے۔ بندگی میں فی الحقیقت سپردگی ہونی چاہیئے مگر اہل نظر سپردگی کے بعد منزل انانیت پر بھی پہنچ جاتے ہیں۔ یہ بندگی کی انتہا بھی ہے اور رفعت بھی۔ داغ کا مضمون غالب کے مضمون کے ساتھ دور کا واسطہ تک نہیں رکھتا "سر جائے تو جائے" منہ پھٹ بات ہے جو تنک مایہ لوگوں کے سوا اور کسی کو نہیں سوجھتی۔ ایسا دعویٰ صرف سودا زدہ سر ہی کر سکتا ہے۔

شعر ملا ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے (غالب)
میں گنہ گار اگر عشق مجازی ہے گناہ
میں خطاکار اگر اس کو خطا کہتے ہیں (داغ)

اوپر کے اشعار کی طرح ان اشعار میں بھی موازنہ کی کوئی صورت نہیں نظر آتی معنی کے لحاظ سے محولہ اشعار ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ داغ کے شعر کی جو تشریح کی گئی ہے اس کے ساتھ اتفاق تو کیا جا سکتا ہے مگر غالب کے شعر کی تشریح نہیں کی گئی ہے تو موازنہ کیا ہوا۔ اگر داغ نے یہ ظاہر کرنا چاہا کہ عشق مجازی گنہ گاری نہیں تو غالب نے کب اس کے ساتھ اتفاق کیا یا انکار کیا۔ وہ تو صرف یہ کہہ دینا چاہتا ہے کہ جن گناہوں کا ارتکاب میں نے کیا ہے ان کی سزا تو مجھے مل ہی جائے گی لیکن اے میرے خدا چونکہ تو دلوں کا حال جاننے والا ہے اور تجھے معلوم ہے کہ میرے دل میں کتنے اور گناہ کرنے کی حسرت باقی ہے۔ اس لئے میں تم سے اس حسرت کی داد پانے کی امید رکھتا ہوں۔ غالب کا شعر لافانی و لاثانی ضرور ہے لیکن داغ کے شعر پر اس کو فوقیت دینا یا داغ کے شعر کو غالب کے شعر پر فوقیت دینا بڑی نامناسبت ہے کیونکہ نفس مضمون کے لحاظ سے دونوں کوسوں دور ہیں۔

(شعر ملا) سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں (غالب)
قاتل نے دیکھے اس میں ہزاروں پری جمال
دل چاک کیا ہوا کہ پری خانہ کھل گیا (داغ)

شہاب صاحب نے والہانہ انداز میں داغ کے شعر کی داد دی ہے حالانکہ بغور دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ یہ داغ کی عام طبیعت کا اچھا خاصہ نمونہ ہے۔ داغ دنیا بھر کے حسینوں کو اپنے دل میں چھپائے پھرتا ہے وہ ایک معشوق پر اکتفا نہیں کرتا۔ گویا دل نہیں ایک حرم سرا ہے جب چلمن اٹھتی ہے تو ماہ جبین پری رو جوق در جوق بصد رعنائی جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ عجب نہیں کہ داغ دنیا بھر کے حسینوں کو دل میں چھپا کر عالم تخیل کا سہارا لیتے ہیں اور سلسلۂ بوس و کنار شروع ہوتا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ عامیانہ اور سوقیانہ مضمون ہے۔ شاعر کا دل حسینوں کا نہیں بلکہ حسن کا مدفن ہوتا ہے وہ بوس و کنار کا دلدادہ نہیں ہوتا بلکہ سرمدی سوز و ساز کا منبع ہوتا ہے۔ وہ حسینوں کے ساتھ اٹکھیلیاں نہیں کھیلتا بلکہ کائنات کے سربستہ اسرار کی عقدہ کشائی میں منہمک رہتا ہے۔ اس کا دل حرم سرا نہیں بلکہ ماتم سرا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس غالب کا شعر فلسفۂ حیات و ممات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ آدم زادوں کا خاک میں ملنا قانون قدرت کے عین مطابق ہے۔ یہ بھی خیال ہے کہ داغ کا سینہ جب چرا جاتا ہے تو حسین و جمیل معشوق بصد شان رعنائی جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس غالب انسانی صورتوں کو قانون تغیر کے تحت گل و لالہ میں دیکھ پاتا ہے۔ یہ عبرت آموز سبق ہے اور شاعر کے صاحب نظر ہونے کی دلیل۔ عمر خیام نے گدھے کی شکل میں معلم کو پہچانا۔

(شعر ۱۶) لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں (غالب)
ہم مٹ گئے تو پرسش نام و نشاں ہے اب
اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب (داغ)

شہاب صاحب رقمطراز ہیں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے دل میں عموماً محبت و شوق میں سپردگی اور عشق میں فنا اور خود فراموشی کا عنصر ذرا نظر سے اوجھل ہی رہتا ہے اور اس کے بجائے لین دین اور ناپ تول کی گفتگو کا سلسلہ چل رہا ہے۔ یہ الزام صاحب موصوف ان تمام اشعار پر لگاتے ہیں جو بقول ان کے "اوپر نقل ہو چکے ہیں" کس قدر غیر ذمہ دارانہ مقولہ ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ غالب کی شاعری میں یہی محاسن بدرجہ اتم موجود ہیں جن کا بقول شہاب ذوق [illegible] دلائل کی ضرورت نہیں۔

اگر بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ موازنہ کے لئے ان دو اشعار کو منتخب کرنا بے معنی سا ہے۔ کیونکہ ان میں کسی طرح کی مطابقت نہیں پائی جاتی۔ غالب کا مطمع نظر کچھ اور ہے اور داغ کا کچھ اور۔ داغ اس بات پر زور دے رہا ہے کہ اس کی موت کے جنس محبت کا فروشندہ دنیا میں اور کوئی نہیں۔ اس کی موت کے ساتھ مہر و وفا بھی فوت ہو چکے اور غالب کو اس بات پر افسوس ہے کہ اتنی قربانیوں کے باوجود محبوب کو مجھے بے ننگ و نام بتلانے میں عار نہیں۔ اب بھلا ان دونوں میں کیا مطابقت ہے کہ انہیں موازنہ کے لئے منتخب کیا جائے۔

(شعر ۱۵) پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے (غالب)
کب گدائے در میخانہ کو عار آتی ہے
اوک سے پی جو میسر قدح مل نہ ہوا (داغ)

شہاب صاحب نے داغ کے شعر کی برتری کے جو وجوہ پیش کئے ہیں ان میں زبان درازی زیادہ ہے اور وضاحت کم۔ غالب کے شعر کی تکذیب کے لئے مودبانہ بہتان تراشی سے کام لیا ہے۔ ساقی کو غالب کے "دولت کدہ کی رونق" اور گھر کے فرنیچر کا جز بنا دیا ہے۔ یہ بیلے تکا سا مواد شہاب میں ٹھوس دلائل کی جگہ امیر حمزہ کا قصہ بیان کیا ہے۔

داغ کے شعر کی وضاحت کرتے ہوئے جناب شہاب رقمطراز ہیں۔ ساقی ادھر ادھر دیکھ رہا ہے کہ کوئی برتن ملے تو اسے (داغ کو) شراب پلا دے۔ گویا ساقی کی محفل نہ ہوئی، برتن فروشوں کی دکان ہوئی۔ ساقی کے پاس اگر پیالہ نہیں تو وہ ساقی کس چیز کا۔ اس نے جب شراب دینی شروع کی تو پیالہ میں ہی دینی ہوئی۔ خاص کر اس پینے والے کو جس پر اس کی نظر التفات ہو۔ جناب شہاب تو ایک طرف داغ کو ساقی کا منظور نظر جتلاتے ہیں۔ دوسری طرف قدح مل سے محروم کر کے اوک سے پینے پر مجبور کرتے ہیں۔ داغ کا محبوب بھی مجموعۂ اضداد ٹھہرا۔ [illegible]

سے پڑھنے والے کی ذہن میں الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں جناب شہاب نے داغ کا انداز گفتگو گدایانہ اور غالب کا جابرانہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب کے رویہ کو اس کے مصرعہ اوّل کے کلمہ "ہم سے نفرت ہے" کی بنا پر جابرانہ کہا گیا ہے لیکن لفظ "نفرت" ساقی اور غالب کے باہمی نازک تعلقات کا اظہار نہیں کرتا۔ بلکہ ان کا تجزیہ کرنے میں بھی کافی اشارہ دیتا ہے۔ غالب اسی لفظ کی مدد سے اپنی آتش آشامی اور ساقی کی بخیلی بھی ظاہر کر رہا ہے۔ ساقی کے ساتھ [illegible] گفتگو غالب اسے مطمئن کرنے میں ناکام ہوتا ہے پس ہزیمت خوردہ کی طرح ساقی سے کہتا ہے کہ میں تمہاری منشا کا احترام کرتا ہوں اور پیالہ کا تقاضا نہیں کرتا۔ میں ڈوک سے پی لونگا۔ یہ نکتہ فراموش نہ کیا جائے کہ غالب نے ساقی کی منشا کا احترام کرتے ہوئے بھی اپنے مقصد کو پورا کرنے کی سبیل نکالی ہے۔ پیالہ ملتا تو شراب ناپ تول کر مل جاتی۔ ڈوک سے ملیگی تو ناپ تول کہاں رہا۔ یہ غالب کا مخصوص انداز مزاح ہے سچ پوچھئے تو داغ نے غالب کے شعر کی نقل اتاری ہے اور وہ بھی بھونڈی سی

(شعر ۱۹) کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد (غالب)

معرکہ ہے آج حسن و عشق کا
دیکھئے وہ کیا کریں ہم کیا کریں (داغ)

جناب شہاب نے غالب کے اس مشہور شعر کی تشریح میں بڑی کاوش کی ہے اور اس کے ساتھ متفق ہونا حقیقت پسندانہ رویہ ہے یہ اعتراض [illegible] جام عشق پینے کے بعد اس کی کیا قدر رکی ہے

بجا ہے۔ آخر معشوق اگر صرف نعرہ بازی کرتا ہے اور یکے بعد دیگرے مدعیان عشق کو آزماتا ہے تو اس کی صادق دلی پر حرف آتا ہے۔ عاشق کو آخر قربانی کا صلہ کیا ملا۔ عاشق کی شہادت کے بعد معشوق کی خودستائی و رعنائی چہ معنی دارد۔

لیکن بات دھیان میں رکھنی چاہیئے کہ محبوب کے چاہنے والے کئی منچلے ہوتے ہیں جو عشق کا دم بھرتے ہیں ان کی نیات صادق نہیں ہوتیں بلکہ وہ سچے عاشقوں کی بے حرمتی کا باعث بن جاتے ہیں جیسے غالب نے کہا ہے :۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی۔ اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی۔

عشق جانبازی کا نام ہے محض دل لگی کا نہیں۔ سوقیانہ اور عامیانہ افراد کے منچلوں سے دنیا بھری پڑی ہے عشق کی قربان گاہ پر جان کی بازی لگانے والے خال خال۔ اس لئے ایسے بوالہوسوں کے لئے کوئی امتحان تو ضرور ہے "مے مرد افگن" کو نوش کرنا محبوب (ساقی) کی عزت افزائی ہے۔ ساقی کا بس اتنا کہدینا کہ "کون حریف مے مرد افگن ہونے کی جرأت کرتا ہے" ہی عاشق کے لئے صلہ کرم ہے گویا معشوق نے خود اقبال کیا کہ درحق اگر کوئی میرے عشق کا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ غالب ہے یوں تو معشوق پر قربان ہونیکے عوض میں صلہ کی امید رکھنا آداب عاشقی سے باہر ہے

مجھے امید ہے میری محنت جدانہ تنقید کے پیش نظر جناب شہاب کے مواخذہ کو قارئین نئی روشنی میں دیکھ لیں گے گو مواخذہ سے ایک شاعر کو دوسرے پر فضیلت دینے میں [illegible]

ایک دن میں ایک سکول

دوسرے پانچسالہ منصوبے کے پہلے تین برسوں میں تعلیمی ترقی کا ریکارڈ

تفصیلات	کارکردگی	تفصیلات	کارکردگی
(۱) [illegible] ہائی سکول	۸۱۸	(۷) [illegible]	۸
(۲) [illegible]	۹۰۲	(۸) [illegible]	۱
(۳) پرائمری سکول جنہیں بیسک سکولوں میں تبدیل کیا گیا	۵۰	(۹) [illegible]	۲
(۴) پوسٹ میٹرک بیسک اسکول	۲	(۱۰) ڈسٹرکٹ لائبریریاں	۷
(۵) [illegible] سکولوں کا درجہ بڑھایا گیا	۱۰۱	(۱۱) مستحق اور غریب طالب علموں کو وظائف	[illegible] ۰۰ روپے
(۶) [illegible] سکول جنہیں ہائی سکولوں میں تبدیل کیا گیا	۳۰		

ڈاکٹر آر۔ کے بکاؤ

کشمیر میں سیلاب و قحط اور انسدادی جدوجہد

تواریخِ کشمیر کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیر زمانہ قدیم سے نہ صرف سیاسی انتشار کے گردابوں میں پھنسا رہا بلکہ قدرت کی آفتوں کا بھی شکار بنا۔ اس کی وجہ سے اس کو طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے خلاف جدوجہد کرنی پڑی۔ کشمیر پر قدرت کی آفتیں کئی صورتوں میں نازل ہوئیں مثلاً سیلاب۔ قحط۔ آگ۔ بھونچال۔ بیماریاں۔ شدت کی سردی وغیرہ۔ اس مضمون میں صرف سیلاب و قحط کے پہلو سے متعلق واقعات کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔

ہمارے ملکی مورخوں نے بڑے بڑے قحطوں اور کئی سیلابوں کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ ان کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر میں قحط یا تو بے وقت برف باری کی وجہ سے پڑے ہیں یا لگاتار بارشوں کی وجہ سے۔ جن سے اکثر سیلاب آتے رہے ہیں۔ وادیٔ کشمیر کی جغرافیائی ساخت قدرتی طور ایسی ہے کہ سیلاب سے تقریباً سارا ملک غرقاب ہوتا ہے اور سب فصل۔ جان و مال اور مکانات پانی سے برباد ہوتے رہے ہیں۔

قدیم ہندو زمانے کے بیان میں مصنّف کلہن پنڈت نے پہلے قحط کا تذکرہ شاہ تنجین اول کی عہدِ حکومت (یعنی تقریباً چھٹی صدی عیسوی) میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس دفعہ جب بہادوں کے مہینے میں تمام کھیتوں میں شالی کی فصل پک رہی تھی اتفاقاً زبردست برف باری ہوئی جس سے ساری کی ساری فصل برباد ہوگئی اور لوگوں پر سخت مصیبت آپڑی۔ کشمیر کی تواریخ میں سب سے بڑا سیلاب [illegible] جب کہ [illegible] پہاڑی کے گرنے سے دریائے جہلم کا بہاؤ رک گیا [illegible] وادیٔ کشمیر کا بہت سا حصہ پانی میں ڈوب گیا اور جان و مال کا [illegible] نقصان ہوا۔

مہاراجا پارتھ (۹۰۶-۲۱ء) کے عہدِ حکومت میں ایک اور سخت قحط پڑا۔ اس دفعہ ایک خروار شالی کی قیمت ۱۰۰۰ دینار ہوگئی۔ مصنّف کا بیان ہے کہ اس دفعہ دریائے جہلم خشک سالی کی وجہ سے سوکھ گیا۔ فصل سوکھ گئی اشیائے خوردنی نایاب ہوگئی اور لوگوں پر ایسی مصیبت آپڑی کہ ہر طرف لاشوں اور ہڈیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ دریا کے اندر بھی لاشیں ہی لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسے دہشت انگیز حالات بپا ہوئے کہ سب لوگ گھبرا گئے۔ مہاراجہ ہرش کے زمانے (۱۰۸۹-۱۱۰۱ء) میں ایک دفعہ اتنی سخت بارش ہوئی کہ تمام دیہات غرقاب ہوگئے جس سے سخت قحط پڑا۔ شالی کی قیمت ۵۰۰ دینار فی خروار ہوگئی۔ مہاراجہ سوشل کے دورِ حکومت (۱۱۲۱-۲۸ء) میں ایک قحط پڑا جس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ حود ران جنگ میں دشمنوں نے تمام ملک اور فصل برباد کر دیئے۔

کلہن کے بعد جونراج۔ شری ور۔ پراجیہ بٹ اور شک کی لکھی ہوئی راج ترنگنی میں بھی کئی سیلابوں اور قحطوں کا تذکرہ ہے۔ زین العابدین بڈشاہ کے عہدِ حکومت (۱۴۲۳-۷۴ء) میں ایک بار زبردست سیلاب آیا [illegible] ایک سخت قحط پڑا۔ سیلاب سے نہ کہیں کوئی درخت۔ نہ پل اور نہ مکان [illegible] نہ زمین کی حد بندی۔ ہر جگہ [illegible] کے کناؤ ہی کناؤ نظر آتے تھے۔ [illegible] بار بہادوں کے مہینے میں برف باری ہوئی جس سے تمام فصل ختم ہوئی۔ [illegible] سے پہلے شالی کی قیمت ۳۰۰ دینار فی خروار تھی اب ۱۵۰۰ دینار ہوگئی۔ مصنّف نے اس سیلاب کا بھیانک حال یوں بیان کیا ہے کہ کشمیر کے سارے دریا۔ وتستا۔ لدر۔ سندھ وغیرہ سمندر کی طرح پھیل گئے اور دیہات

اور آس پاس کی تمام زمینیں غرقاب ہوگئیں۔ بے شمار جاندار۔ انسان و حیوان پانی میں بہہ گئے۔ فصل کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ مادھو راج جس کو آج کل علاقہ مراج کے نام سے پکارا جاتا ہے میں مکانوں کی قطاریں دریا کے اندر گر پڑیں۔ شہر کے گلی کوچوں میں بھی پانی پھیل گیا اور کئی مکان برباد ہوگئے۔ تمام ملک ایک بڑی جھیل بن گیا۔ مصنف نے ایک اور مصیبت کا یوں تذکرہ کیا ہے کہ ملک خراسان میں شدت کے اولے پڑے۔ چنانچہ لاکھوں کی تعداد میں خراسانی باشندے کشمیر میں وارد ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر کے اناج کے ڈھیر ختم ہوگئے اور پھر زبردست قحط پڑا۔ جس سے یہاں خوف ناک حالات پیدا ہوگئے۔ شاہ محمد شاہ کی حکومت میں سنہ ۱۵[illegible]ء میں خشک سالی کی وجہ سے ایک قحط پڑا جس کا اثر تمام ملک پر پڑا۔ غلہ نایاب ہوگیا لوگ بھوک اور پیاس کا شکار ہوگئے اور ہزاروں کی تعداد میں لقمۂ اجل ہوگئے۔

مغلوں کے زمانے میں اکبر بادشاہ کی عہد حکومت میں سنہ ۱۶۲۳ء میں بوجہ زبردست طغیانی کے ہزاروں جانوں کا اتلاف ہوا۔ تمام فصل برباد ہوگئی۔ اس دفعہ اکبر بادشاہ نے باہر سے اناج ذخیرہ کشمیر بھیج دینے کا انتظام کیا اور ایک کروڑ اور دس لاکھ روپے کی رقم مصیبت زدگان کی امداد کے لئے آگرہ سے بھیجدی جو مزدوروں اور مستریوں میں بانٹ دی گئی۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں سنہ ۱۶۲۴ء میں خشک سالی سے ایک قحط پڑا۔ اس دفعہ لاہور۔ گجرات اور سیالکوٹ سے غلہ کشمیر لایا گیا۔ افغانوں کے زمانے میں راجہ سکھ جیون کی وزارت میں سنہ ۱۷۶۵ء میں کشمیر پر ایک بھیانک قحط کی آفت پڑی۔ سکھ جیون نے لوگوں کی امداد کے لئے کئی قدم اٹھائے۔

سکھوں اور ڈوگرہ مہاراجوں کے عہد حکومت میں بھی لگاتار سیلاب آتے رہے۔ ۳۳-۱۸۳۲ء کے قحط میں ساری فصل برباد ہوگئی۔ لوگ [illegible] کا شکار ہوگئے۔ بے شمار جاندار مر گئے۔ اشیائے خوردنی باہر سے منگوائی گئیں۔ سنہ ۱۸۴۱ء میں سخت سیلاب آیا جس سے ازحد جان و مال ضائع ہوگیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد حکومت میں ۷۷-۱۸۷۶ء میں شدت کی بارش پڑی جس سے ملک میں قحط پڑا۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں ملک چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد حکومت میں ۱۸۹۳ء اور ۱۹۰۳ء کے سیلابوں سے ازحد جان و مال کا نقصان ہوا۔ ۱۸۹۳ء کے سیلاب میں ۲۵,۴۲۶ ایکڑ زمین غرقاب ہوگئی۔ ۲۲۲۵ مکانات گر گئے اور ۳۲۹ مویشیوں کی رپورٹ ریکارڈ کی گئی۔

۱۸-۱۹۱۷ء میں جو قحط پڑا اس میں غلہ داروں نے لوٹ مچائی۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۱ء کے سیلاب گذشتہ سیلابوں کے حد سے بڑھ گئے۔ ۱۹۳۱ء سے آج تک بھی کشمیر میں لگاتار سیلاب آتے رہے۔ انہیں واقعات کے پیش نظر لارنس صاحب نے اپنی کتاب "ویلی آف کشمیر" میں تحریر کیا ہے کہ کشمیری ہمیشہ قدرتی آفتوں سے بے تحاشا نقصان ہوتا رہا ہے۔

ان آفات سماوی کی روک تھام کے لئے انسان کا ہاتھ اور دماغ ہر وقت متحرک رہا اور اپنی تمام تر طاقتوں سے مقابلے پر تیار رہا۔ چنانچہ مہاراجہ للتادتیہ (۷۳۸-۶۹۷ء) نے جھیل ولر سے پانی خارج کرنے کی سکیم مرتب کی اور اس سے عملی جامہ بھی پہنایا۔ مہاراجہ اونتی ورما (۸۸۳-۸۵۵ء) نے سویا نامی ایک ملکی انجنیر کی خدمات حاصل کی جس نے دریائے جہلم کو جھیل ولر سے کھادن یار تک مٹی۔ ریت و چٹانوں سے صاف کیا۔ سویا انجنیر کے یہ اقدامات اس قدر کامیاب رہے کہ اس کو ان داتا (LORD OF FOOD) کے نام سے پکارا گیا۔ اس کی کارکردگی کی بدولت شالی کی قیمت فی خروار ۳۶ دینار ہوگئی جبکہ معمولی حالات میں شالی کی قیمت ۲۰۰ دینار فی خروار سے کم نہیں ہوا کرتی تھی اور سیلاب و قحط کے دنوں میں جس شالی کی قیمت ۱۰۵۰ دینار فی خروار ہوا کرتی تھی۔ شاہ زین العابدین (۷۴-۱۴۲۳ء) نے بھی سیلابات بچاؤ کے لئے کئی اقدام کئے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ان ہی خطرات و مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک بھاری سکیم عمل میں لائی جس کے تحت مہورہ میں ایک بجلی گھر بنوا دیا گیا اور دریائے جہلم کو جھیل ولر سے کھادن یار تک ریت مٹی اور چٹانوں سے صاف کرنے کے لئے ڈرہ جوں (DREDGES) کا سلسلہ بجلی کے ذریعے جاری کروایا جو کام کئی سال تک جاری رہا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ کشمیر میں سیلابوں کے نقصانات کافی حد تک کم ہوگئے۔

جب سے ہمارا دیش آزاد ہوگیا ہماری حکومت سیلابوں کو روکنے کے لئے لاکھوں روپے اپنی پنج سالہ پلانوں میں مخصوص کئے ہیں اور کئی سکیموں کو عمل میں لایا گیا ہے جن کے تحت ہر طرف بنڈوں کے بنانے سے سیلاب کا انسداد کرنے کی اور کوششوں کا بھی راج ترنگنی میں ذکر کیا گیا ہے۔ قدیم عہد کے ایک بادشاہ دامودر نے وتستا کے کئی کناروں پر پتھر کے بند تعمیر کئے تھے۔ اسی طرح راجہ بالادتیہ کے عہد میں بھی سیلاب روکنے کے لئے کئی ایسے قدم

ہوئے۔ (راج ترنگنی کتاب (۱)، ۱۵۹، کتاب (۲)، ۲۸۳۔

نہروں کے کھودنے وغیرہ کا کام کئی سالوں سے جاری ہے۔ سرینگر سے جھیل وُلر تک تقریباً ۲۵ میل لمبی فلڈ سپل چینل (طغیانی نہر) کو کشادہ کر دیا گیا اور بٹہ مالو جھیل ہوکرسر، ناؤ کام اور دوسری جھیلوں کے گرد بند بنوائے گئے۔ دریائے جہلم کے بندوں اور سرینگر سے اوپر کی طرف کی سیلابی نہروں کو اونچا اور مضبوط کر دیا گیا۔ اس سے یہ نتیجہ ہوا کہ اب طغیانیوں میں دریائے جہلم کا پانی پہلے سے زیادہ مقدار میں یعنی ۳۰،۰۰۰ کیوسک (CUSECS) سے ۵۰،۰۰۰ کیوسک (CUSECS) تک نہروں کے ذریعے سے بہہ سکتا ہے۔ اس سے دلدل زمینوں کی حالت بھی بہت حد تک بہتر ہوگئی۔ جموں پراونس میں بھی ۱۹ جگہوں پر مثلاً ہمیرپور، سدھر کٹھوعہ، تورہ منا سان، بجد رواہ وغیرہ میں طغیانیوں سے بچاؤ کے لئے دریاؤں کے بندوں کو مکمل طور پر بنا دیا گیا۔ یہ سب کام پہلے پنج سالہ منصوبے کے تحت پورے کر دئے گئے۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے کے تحت سیلابوں کے روک تھام کے لئے بندوں کو اور اونچا کرنے اور نہروں اور نالوں کو کھودنے کا کام جاری رکھا گیا ہے اور زرخیز زمینوں کو کٹاؤ سے بچانے کے لئے کئی نئی سکیموں کو عمل میں لایا جارہا ہے۔ جن کاموں پر لاکھوں روپیہ بہایا جارہا ہے تاکہ لوگوں کو سیلابوں کے نقصانات سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل ہو۔ پادشاہی باغ سے نیل ولر تک (طغیانی نہر) کو اور کشادہ اور گہرا کر دیا گیا۔ جھیلوں اور نمبلوں کو نئے بند بنوائے گئے۔ کئی پرانے بندوں کو مضبوط بنا دیا گیا۔ تاکہ طغیانیوں میں ۵۰،۰۰۰ کیوسک (CUSECS) مقدار تک پانی بغیر کسی نقصان کے بہہ سکے۔ اس کے علاوہ دریا کے معاونوں کی کمزور جگہوں کو مضبوط کر دیا گیا تاکہ زرخیز زمینیں سیلاب کے نقصانات اور کٹاؤں سے محفوظ رہ سکیں۔ سوپور سے کھادن یار تک دریائی اوٹ فال (OUT FALL) چینل کو گہرا اور کشادہ کرنے اور ساتھ ہی ایک ڈائی ورجن (DIVERSION) چینل (طغیانی نہر) کھودنے کی سکیم کو بھی عمل میں لایا جائے گا جن سے ۲۵،۰۰۰ سے ۳۵،۰۰۰ (CUSECS) (کیوسک) مقدار تک پانی بہہ سکے گا۔ صوبہ جموں میں بھی سیلابوں کے پانی کو روکنے کے لئے اور زمینوں کو کٹاؤ سے بچانے کے لئے ۲۹ جگہوں پر بندوں کے بنانے کا کام عمل میں لایا گیا۔ دوسرے کھڈوں اور نالوں پر بندوں کے بنانے کا کام بھی جاری کیا گیا۔ ضلع اودھم پور میں ندی چاکوٹ سے سپلوک تک بندوں کے بنانے کی سکیم کو بھی عمل میں لایا جارہا ہے۔ تاکہ وہاں بھی زمینیں سیلاب کے پھیلنے اور کٹاؤں سے محفوظ رہ سکیں۔

منوہر لال دِل

غزل

لگ گیا کوئی صراحی کے کوئی جام کے ہاتھ
رِند بکتے ہی رہے بادۂ گلفام کے ہاتھ

صبح کے ہاتھ کبھی اور کبھی شام کے ہاتھ
زندگی اپنی رہی گردشِ ایام کے ساتھ

منزلِ عشق میں کچھ ہم سے بنائے نہ بنی
پاؤں بھی ٹوٹ گئے جب نہ رہے کام کے ہاتھ

عیش کی فکر میں جینے کی مصیبت توبہ
ہم نے تکلیف اُٹھائی بہت آرام کے ہاتھ

سخت جاں سے تو قضا تک بھی لرز جاتی ہے
کیا مٹائیں گے مجھے گردشِ ایام کے ہاتھ

ہائے وہ آنکھ جو حسرت سے ٹپکتی ہی رہی
آہ وہ دِل جو لٹا زلفِ سیہ فام کے ہاتھ

عاقبت مل نہ سکی منزلِ راحت ہم کو
ٹھوکریں کھاتے پھرے حسرتِ ناکام کے ہاتھ

اپنی دُنیا کو الگ دیر و حرم سے رکھا
کفر کے ہاتھ بکے ہم تو نہ اسلام کے ہاتھ

ہوگیا کام ہی آخر کو ہمارا تو تمام
سونپ کر کام جو بیٹھے دلِ ناکام کے ہاتھ

چھیڑنے کی بُتِ سفاک کو عادت نہ گئی
آبرو اپنی رہی لذتِ دُشنام کے ہاتھ

سر سے اُونچا ہوا جاتا ہے اب اے دِل پانی
ہم کہیں کے نہ رہیں گے غم و آلام کے ہاتھ

فدا محمد حسنین

کشمیری لباس اور بناؤ سنگار

صنفِ نازک کا یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ بناؤ سنگار پر جتنا وقت یا جتنی دولت صرف کرنا چاہیں، کریں۔ ایک زمانہ تھا کہ مرد اور عورت شکل و صورت، لباس، سامانِ زیبائش، کام کاج وغیرہ میں برابر کا درجہ رکھتے تھے۔ مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ مرد ہر ایک چیز کم کرتا گیا، خواہ وہ سر کے بال ہوں یا اوڑھنے کی چیزیں یا سامانِ زیبائش، مگر صنفِ نازک کی چال میں کوئی کمی نہ آئی۔ قومیں مِٹ جائیں، بھونچال آئیں یا سیلاب، خواتین کی آرائش اور بناؤ سنگار کا دائرہ حکومت پھیلتا ہی پھیلتا جا رہا ہے۔ آپ شاید یہ خیال کرتے ہیں کہ میک اَپ کے انوکھے اور لاتعداد طریقے موجودہ زمانے کی پیداوار ہیں۔ مگر آئیے ہم آپ کو بتائیں کہ کشمیر کی دادیاں امائیں کس طرح کا لباس کون سے زیورات اور کون سے میک اپ کا استعمال کرتی تھیں۔

لباس، پُوڑ، قصابہ، پھرن، کرتنز، پیزار پر مشتمل تھا۔ پُوڑ یعنی ڈوپٹہ دوگنا کرکے سر پر قصابے کے ساتھ ساتھ ٹانکا جاتا تھا۔ "پُوژ" عام طور پر لٹھے کی ہوا کرتی تھی۔ ململ صرف مرد صافے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ پہناوا "پھرن" کہلاتا تھا۔ جو کھلا ڈھیلا پیراہن ہوتا ہے۔ اس کی دو قسمیں تھیں۔ ایک عام پھرن اور دوسرا "کرابہ دار پھرن" کہلاتا تھا۔ جس کے آستین اتنے لمبے ہوتے تھے کہ مونڈھوں سے کندھوں کے ساتھ ٹانکے جاتے تھے۔ اندر دو قمیضیں پہنی جاتی تھیں۔ ایک جسے "کرتنز" کہتے ہیں۔ دوسری بنیان نما قمیض، جسے "تل قمیض" کہتے تھے۔ قمیضوں کے گلے اور کہنیوں پر زردوزی کا کام ہوتا تھا۔ پھرن کے سامنے سینہ پر زردوزی اور ریشم کے پھول بوٹے کاڑھے جاتے تھے۔ شلوار یعنی ٹانگوں کا پہناوا "پیزار" کہلاتا تھا۔ جس کی دو قسمیں تھیں۔ ایک چوڑی دار تنگ پاجامہ اور دوسرا کھلے پہنچے والی شلوار، جس کے سرے زردوزی کے کام سے سجائے جاتے تھے۔

پھرن میں ایک طرف بڑی تھیلا نما جیب ہوا کرتی تھی۔ جس میں خواتین خاطر تواضع کی چیزیں، چائے کی پتی، کوزہ مصری، نمک، نسوار کی بوتل، میک اپ کا سامان مثلاً سُرمہ دانی، کنگی، شیشہ، ولیسی صابن کی چاکی، منہ پونچھنے کا رومال اور گھر کی چابیاں رکھتی تھیں۔ رات کو سر ہمیشہ رومال سے باندھا جاتا تھا جس کے چار کونوں پر چار گھنگرو ہوتے تھے۔ یہ رومال اس لئے باندھا جاتا تھا کہ کھٹن یا گھی، جو کہ سر کی ہزاروں ننھی ننھی لٹوں میں لگا ہو، بستر کو خراب نہ کردے اور بال خراب نہ ہو جائیں۔ سر کے بال دو دو تین تین مہینے کے لئے کئی دنوں کی عرق ریزی کے بعد گوندھے جاتے تھے۔ پیروں میں زری جوتے پہنے جاتے تھے یا چمڑے کی سینڈل۔ زری جوتوں کو "نانگلہ" کہتے تھے۔ اس کی چونچ کے اوپر ریشم کا ایک بڑا پھول نما پھندنا ہوا کرتا تھا۔ سینڈل کو "کرنش" کہتے تھے۔ اونچی ایڑی والی سینڈل کو "کوچہ کرنش" کہتے تھے۔ غریب خواتین گھاس کی بنی ہوئی سلیپر جنہیں "پلہور" کہتے ہیں، پہنتی تھیں۔

آج کی دنیا میں صنفِ نازک کو مختلف قسم کے بنے ہوئے نئے نئے بھڑکیلے اور زرق برق کرنے والے کپڑے حاصل ہیں۔ جن کے نام بن جارے عموماً فلمی یا ایکٹریسوں کے نام پر رکھتے ہیں۔ مثلاً ناگن، آوارہ، جھنک جھنک، یا نرگس، مدھوبالا، ثریا یا ایجیک دانہ وغیرہ۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ متوسط زمانے کی خواتین کو اچھے کپڑے حاصل نہ تھے۔ تب پہناوے کے لئے یہ کپڑے استعمال میں لائے جاتے تھے:۔ دریائی کنا ویز، زربفت، کمخواب، مخمل، پارچہ، کشمیرو، پشمینہ اور ریشم۔ کنا ویز اور ریشم روس سے اور دریائی آگرہ سے آتی تھی۔ اس کے علاوہ دیسی بنا ہوا

کہ ر جیلی، ڈبل مین، ململ اور شیطان تر استعمال کیا جاتا تھا۔ ہمیشہ شوخ رنگ چُنا جاتا تھا۔ گلابی، سُرخ رنگ، زعفرانی اور سبز رنگ کو ہمیشہ فوقیت دی جاتی تھی۔

یہ تو تھا پہناوا، اب ذرا زیورات پر نظر ڈالیں۔ تو معلوم ہوگا کہ اس معاملے میں کشمیری کاریگروں نے بڑی دماغ سوزی کے بعد اَن گنت زیور تیار کئے تھے۔ ماتھے کا جھومر "ٹیکہ" کہلاتا تھا اور ۵ سے ۵ ٹانک کے ہوا کرتے تھے۔ دوسرا تکون نما زیور جسے تعویذ کہتے ہیں، ایک کان سے دوسرے کان تک بالوں اور اوڑھنی یا قصابے سے ٹانکے جاتے تھے۔ لڑکیاں سر پر ایک ٹوپی جس میں فیتہ کے طور پر "گل تن" یا "تمار" جو چاندی کی گول گول لڑیاں ہوتی تھیں، پہنا کرتی تھیں۔

ناک پر حُسن کا دارومدار ہوتا تھا اور خاندان کی عزت کا بھی۔ اس کو ہماری دادی امائیں نہیں بھولی تھیں۔ ناک میں "ڈنگہ" یا تیلی پہنی جاتی تھی یا "اَسنہ واَج" یعنی ایک قسم کی نتھ۔ خاندانی بڑھیاں بائیں نتھنے میں اور عام عورتیں دائیں نتھنے میں "ڈنگہ" استعمال کرتی تھیں۔ جس کے بیچ میں ایک نگینہ اور اِردگرد ۷ یا ۹ یا ۱۱ موتی لگائے جاتے تھے۔ کان کے زیورات بڑی عرق سوزی کے بعد بنائے جاتے تھے۔ چھوٹی بچیاں "گل تنی" لگایا کرتی تھیں۔ گول گول "ڈولنے" لڑیوں سے پرو کر ایک ٹوپی کے ساتھ ٹانکے جاتے تھے جو سر پر پہنی جاتی تھی۔ دوشیزائیں "جھکہ ہور"، "دورہ ہور" "ڈیجہ ہور" "ستہ ہور"، "الکہ ہور" اور "تالہ رزہ" پہنا کرتی تھیں۔ عورتیں "کنہ دُس" یا "کنہ واَج" کانوں میں پہنا کرتی تھیں۔ یہ زیور سونے چاندی کے جھُمکے، آویزے اور بالیوں پر مشتمل تھا۔

گلے کے زیور "ہیٹہ فول"، "حلقہ بند" اور "ہنزرہ" کہلاتے تھے۔ "ہیٹہ فول" میں سونے چاندی کے بڑے بڑے چکور تختے رنگا رنگ کے نگینوں سے منقش کئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ طرح طرح کے نکلس مثلاً جگنی، ڈولنہ، بیہ کر و ڈی مال کا استعمال کیا جاتا تھا۔ بالوں کی لٹیں وانکرین کی جھالروں سے مزین کر لی جاتی تھیں۔ طرح طرح کی چوڑیاں اور کڑے، "دستہ نگرہ"، "ڈُنبکرہ"، "جنگرہ بند" ہیں۔ جن کے سرے پر شیر، مچھلی، گائے کے مُکھ بنائے جاتے تھے۔ (براسلٹس) جنگرہ بند کہلاتے تھے جو سونے یا چاندی کی

چوڑی پٹی ہوا کرتی تھی جو کنجی کے ساتھ بند کی جاتی ہے اور انگوٹھیاں سارے انگلیوں میں پہنائی جاتی تھیں جو "واَج" کہلاتی تھیں۔ ان میں دو انگوٹھیاں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ ایک "اَنہ واَج" یعنی آئینہ والی انگوٹھی اور دوسری واَج جس میں ایک بڑا نگینہ ہوتا ہے۔ انگوٹھے کی چھاپ "نیتھہ کوٹ بوگ" کہلاتی تھی۔ ایزاربند کے دو سروں پر چاندی کے گھنگرو ہوا کرتے تھے۔ یہاں ایک خاص بات کا ذکر کرنا ضروری ہے جسے "آلہ خلدہ" کہتے ہیں۔ یہ ایک لڑیوں میں پرویا ہوا سونے یا چاندی کا ڈبہ ہوا کرتا تھا جس میں الائچیاں ہوا کرتی تھیں۔ اس سے سانس کو معطر کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔

یہ تو ہوا لباس اور زیورات کا بیان، اب میک اَپ کا حال بھی سُن لیجئے! بنگال کی زُلف شاعروں کی تخلیق ہو یا نہ ہو۔ مگر یہاں کی خواتین بالوں پر جتنی توجہ دیتی تھیں وہ ثابت کرتا ہے کہ زُلفِ کشمیر شاعر کے خیال سے زیادہ حسین اور جاذبِ نظر ہے۔ یہاں ماتھے پر بالوں کی ننھی ننھی زُلفیں سوم سے مل کر ماتھے اور رُخسار پر لہرائی جاتی تھیں۔ سر کو گوندھنے کا اہتمام بڑی محنت سے دو دو تین تین بالوں کو ملا کر ہزاروں ننھی ننھی لڑیاں بنائی جاتی تھیں۔ اور سارے سر کو بہت دنوں کی عرق ریزی کے بعد بہت ہی خوبصورت طریقہ سے ننھی ننھی جھالروں میں تبدیل کیا جاتا تھا جو آنکھوں کو بہت جچتی تھیں۔

چہروں پر کریم کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اسے "اِسبد ہار" کہتے ہیں جو مکھن اور چند دیسی دوائیاں مِلا کر بنائی جاتی ہے۔ چہرے پر ایک طرح کی دیکس کریم بھی مل جاتی تھی جس میں موم مِلا ہوتا تھا۔ اس کو چہرے پر مل کر بندیاں سجائی جاتی تھیں۔ تِل اور ستارے سجائے جاتے تھے۔ جو مختلف رنگوں کے ہوتے تھے اور جنہیں "خال" کہتے ہیں۔ سارے چہرے پر میک اپ پھیلایا جاتا تھا تاکہ چہرہ آفتاب و ماہتاب کی طرح دِیئے کی طرح میں چمک اُٹھے۔ آنکھ اور ابرو پر سُرمہ لگایا جاتا تھا۔ پیروں اور ماتھے پر مہندی سے بیل بوٹے اور پھول منقش کئے جاتے تھے۔

کشمیر میں کاغذ کی صنعت

ایک وقت تھا جب ریاست کشمیر میں دستاویزات عام طور پر برج (BIRCH) کے درخت (جس کی شاخیں پتلی اور چھال چکنی ہوتی ہے) کے پتوں پر لکھی جاتی تھیں۔ ایسی کتابیں سنسکرت میں لکھی گئی ہیں اور ہندو عہد سے تعلق رکھتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کاغذ بنانے کا جنم چین میں ہوا۔ کشمیر میں اس کا آغاز پندرھویں صدی میں خیال کیا جاتا ہے پہلے پہل یہ صنعت گاندربل اور دچارناگ میں قائم کی گئی۔ گاندربل میں کاغذ کا گودا خام اشیا کو بجلی کی مشینوں سے دبا کر بنایا جاتا تھا جبکہ دچارناگ میں۔ گاندربل میں بنائے ہوئے گودے کو کاغذ کی شکل دی جاتی تھی۔ خام اشیا عموماً سوتی کپڑے (چیتھڑے اور دھجیاں) سن۔ ساز (ایک جڑ) اور چاول کا نشاستہ ہوتی تھیں۔

کشمیر میں دیسی کاغذ اپنی مضبوطی کے سبب بہی کھاتے بنانے کے کام آتا تھا پھر مشین کے بنائے ہوئے سستے کاغذ کی درآمد نے اس صنعت کو کاری ضرب لگائی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جب کاغذ ملنا مشکل ہو گیا ریاست میں کاغذ کی صنعت کو پھر جاری کیا گیا لیکن یہ صرف عارضی قدم تھا۔ جونہی جنگ بند ہوئی اور حالات معمول پر آئے صنعت کاروں کو پھر سے اس صنعت کو بند کرنا پڑا۔

ڈاکٹر آر۔ بال کرشن نے اپنی مشہور کتاب ریجنل پلاننگ ان انڈیا میں لکھا ہے کہ آسام اور کشمیر میں کاغذ کی صنعت کو فروغ دینے کے بڑے امکانات ہیں۔ لکڑی کے گودے کی ساخت جنگلات کے نزدیکی علاقوں میں بڑی اچھی طرح سے کی جا سکتی ہے اور کاغذ بنانے کا عمل ان جگہوں کے نزدیک ہو سکتا ہے جہاں بکری کے ذرائع آسان ہوں۔ ۱۹۵۳ء میں جب بخشی حکومت نے ریاست کی باگ ڈور سنبھالی تو ریاست میں چھوٹی صنعتوں کی ترقی پر از سر نو غور کیا گیا۔ اسی عرصہ میں بخشی حکومت نے کاغذ کی صنعت کو بھی جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔

ریاست کے پہلے پنج سالہ پلان میں کاٹیج صنعتوں اور ایمپوریم کے لئے ۲۵½ لاکھ روپیہ منظور کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں بہت سے ایسے سینٹر کھولے گئے جہاں صنعتی چیزوں کی پیداوار کے علاوہ اُمیدواروں کو تربیت بھی دی جاتی ہے ایک ایسا ہی سینٹر کاغذ کی صنعت کے لئے میراں صاحب (جموں) میں کھولا گیا۔ اس سینٹر کی سکیم کو ۱۹۵۴ء میں ہی اصلی صورت دی جا سکتی جبکہ مختلف ساز و سامان مشینری اور دیگر لواحقات مکمل کر لئے گئے تاہم سینٹر فروری ۱۹۵۶ء سے ہی پیدا شروع کر سکا۔ پہلے پہل اس جگہ پر لکھنے کا کاغذ ڈرائینگ پیپر اور سیاہی چوس کاغذ بنایا گیا جن کو کہ مارکیٹ میں کافی سراہا گیا پھر یہاں پر بونڈ پیپر گتّا اور فائل کور بھی بنائے جانے لگے۔ حال میں ہی سینٹر میں بیبیں (BABIYAN) گھاس سے گتّا بنانے کے تجربات کئے گئے جو بہت حد تک کامیاب رہے ہے۔ اب گتّے کو بڑے پیمانے پر بنانے کے انتظامات کئے جا رہے ہیں اور سینٹر میں مناسب مشینری لگائی جا رہی ہے اُمید ہے کہ اس نئی مشینری کے ساتھ سینٹر ایرمیل پیپر اور ہائی کلاس بونڈ پیپر بھی جلد ہی بنانے لگے گا۔

یہ سینٹر ریاستی محکمہ صنعت کے زیر اہتمام ہے اور تقریباً سات سو روپیہ ماہوار کی لاگت کا کاغذ تیار کرتا ہے پہلی پلان کے عرصہ میں سینٹر نے کوئی ۲۷۰۰۰ روپیہ کی قیمت کا کاغذ تیار کیا۔ ۲۵ اُمیدوار اس سینٹر میں

کام کرتے تھے جنہیں ۱۵۰۰ روپیہ ماہوار دیا جاتا تھا ۵۶-۱۹۵۵ء میں ۷۵۰۰ روپیہ اور ۵۷-۱۹۵۶ء میں کوئی ۴۰۰۰ روپیہ سنٹر میں بطور تنخواہ اور مزدوری تقسیم کیا گیا ۵۶-۱۹۵۵ء میں آل انڈیا کھادی اور ولیج انڈسٹریز بورڈ نے سنٹر کو ۲۰۰۰ روپیہ کی مالی امداد دی۔

سنٹر میں ۵۷-۱۹۵۶ء اور ۵۸-۱۹۵۷ء میں مندرجہ ذیل خام مال استعمال ہوا

	۵۷-۱۹۵۶ء	۵۸-۱۹۵۷ء
چیتھڑے اور دھجیاں	67=00 روپیہ	53=10 روپیہ
چاول کا بھوسہ	-	67=30 "
بیبن گھاس	124=37 روپیہ	10=0 "
ردی کاغذ	37=00 "	4=20 "

چیتھڑے اور دھجیاں پنجاب میں بٹالہ اور ریاست میں گرد و نواح سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ چاول کا بھوسہ گرد و نواح کے گاؤں سے مل جاتا ہے بیبن گھاس ریاست میں کنڈی علاقہ سے ملتی ہے ردی کاغذ پرلیس اور گورنمنٹ دفاتر سے مل جاتا ہے یہ سب خام مال ریاست میں کافی مل جاتا ہے۔ اس سنٹر کے بغیر یہ ضایع ہی جاتا۔

سنٹر کے مینجمنٹ کے کہنے کے مطابق یہ سنٹر ایسا کاغذ تیار کرنے کے قابل ہے جو صدیوں تک رہ سکتا ہے۔ سنٹر کافی لوگوں کو کاغذ سازی کی صنعت میں تربیت دے رہا ہے اور اُمید ہے کہ ریاست کی مستقبل کی صنعتوں میں اس سنٹر کو بڑی اہمیت حاصل ہوگی۔ دستی کاغذ آج کل گورنمنٹ دفاتر میں استعمال ہو رہا ہے اور پرائیویٹ دفاتر اور فرم بھی اس کو خریدتی ہیں۔ جوں جوں کشمیر میں تعلیم فروغ پائے گی کاغذ کی فی آدمی کھپت بڑھے گی اور اس کے ساتھ ساتھ دستی کاغذ کی صنعت بھی روبہ ترقی ہوگی۔

کچھ ماہروں کا خیال ہے کہ ریاست میں اخبار کا کاغذ تیار کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت نے ڈیرہ دُون فارسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر بھٹ کو دعوت دی تھی جنہوں نے کچھ مشورہ اس سلسلہ میں دیا ہے۔

کاغذ کی دوسری قسموں کے ساتھ ساتھ ریاست میں مکھنی کاغذ (BUTTER PAPER) کو بنانے کی بھی بڑی گنجائش ہے۔ یہ کاغذ عموماً ٹراونکور میں بنایا جاتا ہے جہاں اس پیپر کے لئے خام اشیا غیر ممالک سے درآمد کی جاتی ہیں۔

کشمیر میں فر (FIR) کا درخت جو لکڑی کے ڈبہ جات بنانے کے کام آتا ہے۔ اصل میں سونا اگل سکتا ہے۔ اس درخت کی چھال میں مکھنی کاغذ اور مصنوعی ریشم (RAYON) کے لئے بخوبی استعمال کی جا سکتی ہے۔

زراعتی ترقی

ریاست جموں و کشمیر کی اقتصادیات کا دارومدار زیادہ تر زراعت پر ہے۔ اس لئے زراعت کی ترقی ہی عوام کی فلاح و بہبود کی ضامن ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ریاست میں پچھلے کئی برسوں سے منصوبہ بندی کے تحت کئی اسکیمیں مرتب کی گئیں جن کی بدولت زراعت کی ترقی سے متعلق خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

دوسرے پانچسالہ منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں زراعت کی ترقی کے پیش نظر ریاست میں جو اقدامات کئے گئے اُن کی تفصیل یوں ہے۔

- پھلوں کے ۳۸ نئے فارم قایم کئے گئے
- ۱۵۴۶۰۰۰ من کھاد تقسیم کی گئی
- کاشتکاروں میں ۱۱۲۴۵۶۸ من اعلیٰ قسم کے بیج تقسیم کئے گئے
- میوے کے پودوں کی ۱۲ نرسریاں قایم کی گئیں

۹ ییری تے شہنشاہی تعزرنا وک ڈیگ بجراہ
وژان کنہ نے تھیکان چھک کیاہ سرت ناتا ونن با زر
آسان چھوئی موت چانس تھیکنسی وونہ رُود کیاہ حصراہ
تعزرتے شان وشوکت دسی پیوان، آخر ترہ کر بادر

۱۰ نہ چھک کانہہ پیر قبرے پیٹھ تھنز کانہہ چھکنہ محتاجی
چھکان کس پوشہ ژالان ڈونگ کس تمہ کوئی مین غم کیاہ
نہ کانژھاہ چھک کران نزاہ قبرہ پی پیٹھ فاتحہ خوانی
چھنہ باکھاہ مین ترادان نہ نہہ تے کانہہ مین غم کیاہ

۱۱ کرن کیاہ ژاگر نہ اَلتہ قبرہ پیٹھ یا پوش چھکرن واتا
یا پھیرتھ شہ ودامت شہ زوک ژونگ اَتھ مرس پتہ نیا
کرن تعریف مین یا ہیندہ باپت پان مارن واتا
تہ سورُدی کرہیکلہ آبا زن، مین آواز واتیا زاژہ

۱۲ دفن یتھ شینس منز آسہ نے رت رت خبرکم کم
خبرکم کم ولی تے صاحب دِل یم چھہ لہ ترا ادِتھ
دفن یتہ گاشہ تارک تو کینی ہندی ویت خبرکم کم
خبرکم کم چھہ میژہ سیتی بادشاہ یتہ پان ہناوِتھ

۱۳ مگر ژانہہ سرمہ علمک ہینزہ چشمن نہ لاگنہ آو
اُچھو ڈیچھہن یہ دُنیاہ اوس کیاہ، وُنکین چھہ کیاہ دُنیا
غریبی تے مُصیبتہ ہینزہ عقلے نقودنے کانہہ بھاو
مین منز لال تہ کم گل، مگر چھک اُندی یتی شیناہ

(باقی)

صنعتی ترقی کی جانب

صنعتی ترقی کے سلسلے میں ریاست میں دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے تحت جو منصوبے قائم کئے گئے تھے وہ تقریباً تمام کے تمام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں حسب ذیل اقدامات کئے گئے:۔ ادویات تیار کرنے کی صنعت کے تحت جہاں پہلے منصوبے کے دوران چھ لاکھ ۴۹ ہزار روپے کی مالیت کی ادویات تیار کی گئیں وہاں دوسرے منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں بارہ لاکھ روپے کی مالیت کی ادویات تیار کی گئیں۔
چمڑا اور جوتے تیار کرنے کی فیکٹری میں جہاں پہلے پلان کے دوران ۸۰۰ من چمڑا اور ۵۰۰ جوڑے جوتے تیار کئے گئے وہاں ۴۰۰۰ من چمڑا اور ۴۰۰۰ جوڑے جوتے تیار کرنے کے قابل ہو گئی ہے۔ سکول آف ڈیزائن کے تحت وڈ کارونگ، پیپر ماشی، ایمبرائیڈری، نمدہ وغیرہ کے ۲۰۰ نئے اور جدید ڈیزائن تیار کئے گئے

اختر عادل رؤف

نغمے کی موت

چلتے چلتے رُک کر اس نے ایک دیوار کے سایے میں آرام کرنے کے لئے زمین پر بیٹھکر آہستہ سے ٹیک لگا دی اور اپنے کندھے سے لٹکے ہوئے ستار کو اتار کر گود میں رکھ لیا۔ سچ مچ وہ بہت تھک گیا تھا اور اس کے قدم آپ ہی آپ یہاں پہنچکر رُک گئے تھے جیسے یہی منزل تھی جسے زندگی کے صحرا میں اب تک بھٹکتے رہے تھے۔ جو اس نے پا لیا تھا، ہوا یہاں کتنی ٹھنڈک تھی؟ اس کے ماتھے کا پسینہ نامعلوم مہک بن کر غائب ہو گیا تھا اور یہ نرم رو جھونکے اُسے نئی تازگی دے رہے تھے۔

ہوا کی خنکی سے اس نے محسوس کیا کہ شام ہو چکی ہے اس کا گھر ابھی دُور ہے شہر کی آبادی سے دُور۔ پگڈنڈیوں کے پیچ و خم کی گذرگاہ سے پرے ایک خاموش گوشے میں جہاں ماں اُس کی منتظر ہو گی اور جب وہ وہاں پہنچے گا تو اپنی جھولی سے دن بھر کی کمائی نکال کر اس کی گود میں ڈال دے گا پھر اپنے ستار کو دل سے لگا کے چومے گا۔ پھر اُسے احتیاط سے سرہانے رکھ کر خوابوں کے نامعلوم جزیروں میں چلا جائے گا۔ یہ خوابوں کے جزیرے اس کی زندگی کی سب سے عزیز متاع تھے کیونکہ ان میں پہنچکر ایک خوبصورت پری اُسے اپنی نظر آیا کرتی تھی اُسے دیکھ کر اس کے نازک لبوں پر مسکراہٹ کی لہر پیدا ہوتی تھی جو دائرہ بناتی ہوئی اس کے کانوں کی لووں میں گم ہو جاتی تھی جن میں سبک موتیوں کی بالیاں کپکپاتی ہوتی تھیں پھر اس کی وہ خوبصورت اور گہری سیاہ آنکھیں اٹھتیں جن کی پلکیں اُسے اپنے ستار کے تاروں جیسی نازک معلوم ہوتی تھیں وہ وہیں اس کے سامنے بیٹھ جاتا اور اپنی ستار سے ایک دلنواز دُھن نکال کر اُسے سُناتا۔

ایسے ہی خوبصورت انداز میں رات گذرتی کہ صبح ہوتے اُسے پھر شہر کی طرف آنا پڑتا تھا جہاں کے جانے پہچانے راستوں پر وہ دن بھر بھٹکتا رہتا۔ لوگ اس کے نغمے سُننے کے لئے جمع ہو جاتے وہ محویت سے ستار بجاتا رہتا پھر دُھن ختم ہوتی تو اس کے پھیلے ہوئے دامن میں آنے پائیوں کا ڈھیر لگ جاتا اُسے سمیٹ کر وہ کھڑا ہو جاتا اور کوئی اُسے ہاتھ پکڑ کر آگے پہنچا دیتا۔

شروع شروع میں اُسے دوسروں کے سہارے چلنے میں کافی مشکل کا سامنا ہوتا تھا وہ شدت سے چاہتا کہ اس کی آنکھوں میں روشنی آ جائے اور حدِ نظر تک پھیلا ہوا یہ اندھیرا —— یہ لامحدود وسیع کراں اندھیرا چھٹ جائے اور وہ راستہ ہی دیکھ بھال کے چل لیا کرے لیکن بعد میں یہ مشکل دُور ہو گئی تھی اب اس کے قدم جانے پہچانے راستوں میں اس طرح مسافت طے کرنے لگے تھے جیسے وہ ہمیشہ سے ان پر چلتا رہا ہے اور خاک کا ایک ایک ذرہ اُس سے مانوس ہے اس زمین کا دل اس کے لئے اور صرف اس کے لئے دھڑکتا ہے جب وہ اس پر چلتا ہے لیکن یہ مشکل دُور ہو جانے کے بعد بھی روشنی کی آرزو اس کے دل سے نہ مٹ سکی تھی اور مٹتی بھی کیسے جبکہ وہ اسی روشنی میں چلتا پھرتا رہتا تھا اور اپنے نغموں کا بازار سجایا کرتا تھا۔

یہ آرزو آج کی نہیں برسوں پہلے کی تھی اُسے اتنا ضرور یاد تھا کہ جب اس نے اس دنیا میں آنکھیں کھولی ہونگیں اور ماں کی گود میں پہلی بار پہنچا ہوگا۔ تو اس گود کو اس نے دیکھنا چاہا ہوگا۔ ان آنکھوں کو دیکھنا چاہا ہوگا جن میں ممتا بھی تھی اور آنسو بھی تھے اس چراغ کو دیکھنا چاہا ہوگا جو اس کے کچے مکان کے کمرے میں جگمگاتا تھا اور جب سورج کی پہلی کرنیں اس کے صحن میں آئی ہوں گی تو اُسے بھی دیکھنا چاہا ہوگا —— نہ معلوم ایسی کتنی چیزیں تھیں جنہیں اس نے اب تک دیکھنا چاہا تھا اپنے باپ کے کھردرے ہاتھوں کو اپنی ماں کے نرم لمس کو مٹی کے کھلونوں کو سرسراتے ہوئے کپڑوں کو۔ نرم روٹیوں کو، دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو اور اس ستار کو جس کے تاروں

کو چھیڑ کر وہ در د بھرے نغمے پیدا کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے چندا ماما کی کہانیاں سنی تھیں جو ستاروں کے جھرمٹ میں روز رات کو آنکھ مچولی کھیلا کرتے ہیں اور پریوں کے دیس میں رہنے والی شہزادیوں کی کہانیاں بھی سنی تھیں اور اس دنیا کی کہانیاں بھی جس میں وہ رہتا تھا۔ پہلے جو کچھ سنتا تھا باہر آکے وہ سب کچھ اس نے محسوس کر لیا تھا اس کے قریب سے چکنی سڑک پر پھسلتی ہوئی موٹریں بھی گذریں تھیں اور ہوا میں اڑتے ہوئے جہاز بھی۔ سچ مچ یہ دنیا کتنی خوبصورت ہوگی۔ کیسے خوبصورت باغات ہوں گے۔ کیسے سمندر ہوں گے کیسا نیلا آسمان ہوگا اور کیسے خوب صورت اس جہاں کے رہنے والے ہوں گے

اس جہاں کے رہنے والوں کا جب اُسے خیال آتا تو بے ساختہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس پری کی تصویر آجاتی جو اُسے خوابوں کے جزیروں میں ملا کرتی تھی اور جسے وہ اپنے ستار کی ایک مخصوص دُھن سنایا کرتا تھا۔ وہ دھن ان تمام دھنوں سے الگ تھی جنہیں وہ سڑکوں پر سنایا کرتا تھا۔ اس کے تحت الشعور میں وہ پوری طرح محفوظ تھی لیکن آج تک اس نے ستار پر اُسے سچ مچ بجانے کی ہمت نہیں کی تھی۔ کبھی کبھی اُسے یہ خیال آتا کہ لاؤ اس کا تجربہ ہی کیا جائے لیکن نہ معلوم کیوں اس کی انگلیاں تاروں پہ کانپ جاتیں جیسے اس کی محبت کا راز افشا ہوا چاہتا ہے جیسے اس کی آرزوؤں کی ساری خوشبو رسوا ہوا چاہتی ہے جیسے اس کے خوابوں کی شہزادی اس سے ہمیشہ کو روٹھ جائے گی اور پھر کبھی اسے اپنی صورت نہ دکھلائے گی . . اس خیال کے آتے ہی وہ اس ارادے سے باز رہتا اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اس دُھن کو پاکر اس طرح خوش ہوتا جیسے اس کے پاس ایک سیپی ہے اور سیپی میں کوئی بہت ہی بیش قیمت موتی ہے جو اگر باہر نکلا تو اپنی ساری چمک اپنی ساری خوبصورتی کھو دے گا . . . .

اور پھر وہ یہ دُھن سناتا بھی کیوں جب کہ آج تک اس دنیا کی کسی پری نے اس سے بات نہیں کی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنوں پہ ہاتھ رکھ کے اس نغمہ کو سننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی جو ان گہرائیوں میں پوشیدہ تھا اور اس نے تو آج تک کسی کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ یہ بھی ایک ناتمام آرزو تھی . . .

اُسے یاد تھا کہ بچپن میں اس کی ماں کہا کرتی تھی کہ جب وہ بڑا ہو جائے گا تو اس کی شادی کر کے ایک چاند سی بہو لائے گی۔ اس کی آنکھیں نہیں ہیں تو کیا دیکھنے میں وہ کتنا خوبصورت ہے۔ ماں اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیتی اور اس کے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرتی رہتی۔ اس وقت اس کا دل چاہتا کہ وہ جلدی سے بڑا ہو جائے تاکہ چاند سی دلہن آئے۔ اس نے چاند نہیں دیکھا ہے تو کیا ـــ اب وہ اُسے چھو کر اپنے پاس چاند کو محسوس کر لے گا . . . . ان باتوں سے اس کے دل میں ایک نئی امنگ پیدا ہو جاتی اور وہ اس دن اپنے باپ سے ستار کا نیا سبق بہت توجہ سے لیا کرتا اور بڑی محنت سے ریاض کرتا . . . .

چند سالوں کے ریاض کے بعد ہی اس کا باپ کہنے لگا تھا کہ وہ ستار بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اس کی انگلیوں میں ایسا جادو ہے جو سننے والوں کے دلوں کو جیت لے گا۔ اب نوابوں راجاؤں کا زمانہ تو رہا نہیں ورنہ وہ ضرور کسی دربار میں رسائی حاصل کر لیتا اور اپنے پیچھے تاریخ میں اپنا نام چھوڑ جاتا" لیکن اس کے باوجود بھی اس کے باپ کو امید تھی کہ کھانے کمانے کے لئے اُسے مشکلیں پیش نہ آئیں گیں اور اسی لئے شاید ایک روز وہ اُسے اس بھری دنیا میں تنہا چھوڑ گیا . . . .

وہ رات کیسی قیامت خیز تھی جب اس کے باپ نے زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں اور اُسے اپنے پاس بُلا کر ستار اس کے ہاتھوں میں دیا تھا اور کچھ کہا تھا وہ اب اُسے یاد نہیں تھا کیونکہ اس وقت وہ بے قرار ہو کے اپنے باپ کے ٹھنڈے جسم سے لپٹ گیا تھا اور روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں کیونکہ آخری وقت میں بھی رخصت ہونے والے راہی کو وہ نہ دیکھ سکتا تھا۔

پھر یکایک اس کے آنسو تھم گئے تھے اور ایک عزم کے ساتھ اس نے ستار کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور اپنی ماں کو تسلیاں دینے لگا تھا اور اس رات وہ دیر تک ایک غمگین دُھن بجا رہا تھا۔ وہ دُھن بھی اس کی انگلیوں میں محفوظ تھی لیکن اس دن کے بعد سے آج تک اس نے دوبارہ نہیں بجائی تھی۔ ہر چند کہ کبھی کبھی اُسے اپنی محرومیوں کا احساس بڑی شدت سے ہوتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ دل میں چھپے ہوئے طوفان کو ستار کے تاروں کے ذریعے آشکارا کر دے لیکن جب بھی اس نے

[illegible] طوفان گذر گیا اور ستار بجتا رہا ایک آہ نکل گئی۔

اس کے بعد کا زمانہ اس کے لئے بڑی آزمائشوں کا زمانہ تھا۔ اس نے اس دنیا میں پہلا قدم رکھا۔ اپنے ستار کو کندھے پہ رکھ کے زندگی کے ناہموار راستوں پہ پہلا قدم۔ پہلی بار جب اس نے ستار بجایا تو اس کے گرد لوگوں کا ایک ہجوم لگ گیا۔ ان کی ملی جلی آوازوں سے اس نے محسوس کیا کہ کتنے ہی لوگ رک کے کھڑے ہیں اور پہلی بار اسی دن اسے اپنے فن کی عظمت کا احساس ہوا اب تک جو تعریف اسے باپ سے ملی تھی اسے سن کر کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی لیکن اب اجنبی لوگوں کی رائے جان کر اسے لا انتہا مسرت کا احساس ہوا اور وہ اپنے دکھوں کو اپنی محرومیوں کو ستار کے نغموں میں بھول گیا پھر جیسے جیسے دن گذرتے گئے وہ اپنے آپ کو اس دنیا کا ایک فرد سمجھنے لگا اور دنیا کی خوبصورتیوں میں شریک ہونے کی آرزو شدت سے پیدا ہوتی گئی۔

ایسا ہوتا کہ وہ ستار ختم کرکے ایک طرف رکھ دیتا تب بھی کچھ لوگ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے اسے پیاس لگتی تو پینے کے لئے پانی لا دیتے اسے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی خرید دیتے اور یہی نہیں شہر سے واپس جاتے وقت اسے دنیا بھر کی خبریں مل جاتی تھیں۔ محلے کی چوری کی وارداتوں سے لے کر امریکہ اور روس جیسے دور دیس کی خبریں۔ . . .

اب وہ سچ مچ بڑا ہو گیا تھا اسے رہ رہ کر ماں کے اس وعدے کا خیال آتا جو چاند سی دلہن لانے کے لئے وہ بچپن میں کہا کرتی تھی۔ اب تو ایفائے وعدہ کا وقت آگیا تھا لیکن ماں سے کبھی اس کا ذکر کرنے کی اس میں ہمت نہ آئی تھی کیونکہ جہاں اس نے اپنے دل کی آرزوؤں کو اب سمجھ لیا تھا وہاں اسے اپنی محرومیوں کا احساس بھی ہونے لگا تھا وہ جانتا تھا کہ اس کی قسمت میں کوئی چاند سی دلہن نہیں بہاروں کا کوئی شگوفہ نہیں۔ لالے کا کوئی پھول نہیں کسی کی زلفوں کی مہک نہیں نرم انگلیوں کا لمس نہیں۔ سبک ہونٹوں سے نکلے ہوئے محبت کے بول نہیں نہ اس کے لئے نیلا آسمان ہے نہ زمین کا پھیلا ہوا وسیع دامن اس کے لئے بس اندھیرا ہے۔ تاریکی ہے اور اندھیرا ہے۔

اس اندھیرے میں اس تاریکی میں وہ دلنواز نغموں کی تخلیق کرتا ہے دوسروں کے دل بہلانے کے لئے لیکن اس کے دل کے زخموں پہ پھاہے رکھنے والا کوئی نہیں۔ کوئی نہیں جو ان تاریکیوں کے پردے چاک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے حسن کو مسکرانے دے بے چارہ ستار کتنا اچھا بجاتا ہے . . . بے چارے کی آنکھیں نہیں بے چارہ وہ ہے۔ بے چارہ یہ ہے۔ کہہ دینے والے بہت ہیں۔

کبھی کبھی وہ غصے سے بے تاب ہوا تھا اسے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہاتھ کپکپانے لگتے اور ستار کے تار لرز اٹھتے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ایک آتشیں نغمہ بجائے گا اور دنیا کی اس ساری خوبصورتی میں آگ لگ جائے گی جس میں اس کا کوئی حصہ نہیں لیکن ایسے عالم میں یکایک خوابوں والی پری کا چہرہ سامنے آجاتا تب اس کا سارا غصہ مٹ جاتا وہ گہری گہری سانسیں لینے لگتا اور رفتہ رفتہ پرسکون ہو جاتا۔ . .

اور رات کو گھر پہنچ کر جب وہ سونے کی تیاری کرتا تو پلنگ پر پڑے پڑے دیر تک وہ دن بھر کے واقعات پر غور کرتا رہتا اور ان خوبصورت اور حیرت انگیز چیزوں کے بارے میں سوچتا رہتا جنہیں وہ باہر رہ کر محسوس کیا کرتا تھا اور جن کے بارے میں سنا کرتا تھا لیکن جنہیں دیکھ نہیں سکتا تھا پھر یکایک اس کی آنکھ میں آنسو ڈھلک آتا یہ دنیا کتنی خوبصورت ہے لیکن وہ اسے دیکھ نہیں سکتا اس کا کوئی حصہ اس میں نہیں . . . وہ اور اس کا ستار بالکل اکیلے ہیں ان کا کوئی بھی نہیں . . . .

"ماں ——" وہ یکایک تڑپ اٹھتا —— "یہ دنیا کیسی ہے۔ تو تو روز دیکھا کرتی ہے!"

"بہت خراب بیٹا" ماں آہستہ سے کہتی "اس میں نہ رہنا اور نہ دیکھنا ہی اچھا ہے۔ . . ."

"تو پھر ماں ——" وہ اٹھ بیٹھتا —— "دنیا جلدی سے ختم ہو جائے تو کتنا اچھا ہو —— ہم سب ختم ہو جائیں۔ پھر کسی کو کوئی دکھ نہ رہے گا۔ . . ."

ماں اسے ایسی بری باتیں سوچنے سے منع کرتی تو وہ خاموش ہو جاتا لیکن دل ہی دل میں ساری دنیا کے مٹ جانے کا خیال اسے ایسا

سکون اور [illegible] کا [illegible] ہی جاں سکتا تھا۔

وہ [illegible] کے بعد [illegible] اب تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایسے خیالات ہر وقت بہتے اور وہ تھکا تھکا بے زار اور مضمحل دکھائی دیتا۔

اس وقت جب وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا بے حد تھک چکا تھا کیونکہ زندگی کی یہ ساری تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھیں۔

شام ہو چکی تھی کیونکہ ہوا ٹھنڈی تھی۔

اس نے ستار کو کندھے پر رکھا اور اٹھنے کا ارادہ کیا لیکن یکایک اُسے ایک آدمی نے روک لیا — "کہاں چل دئیے بھائی؟"

"اب گاؤں جاؤں گا ورنہ رات ہو جائے گی۔"

"نہیں ابھی تو بہت وقت ہے میرے ساتھ اندر آؤ سیٹھ جی تمہارا ستار سنیں گی —"

وہ ساتھ ساتھ ہو لیا اندر پہنچ کر اسے نرم فرش پر بٹھایا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب اُسے ایسے نرم فرش پر بیٹھنے کو ملا بے اختیار اس کی آنکھوں کے سامنے باپ کا چہرہ آگیا جو کہا کرتا تھا راجہ نوابوں کا زمانہ ہوتا تو وہ ضرور کسی دربار میں رسائی حاصل کر لیتا۔ درباروں کا ایک دھندلا سا نقشہ اس کے نارسا تصور نے اس کی آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا وہ محو تھا کہ یکایک ایک آواز نے اُسے چونکا دیا — ایسے میٹھے ایسے نرم لہجے میں آج تک کسی نے اس سے بات نہ کی تھی۔

"تم ستار بہت اچھا بجاتے ہو نا — ابھی تمہیں بیٹھے دیکھا تو بلوا لیا اس وقت سناؤ گے!"

"ضرور —" اس نے ستار گود میں لے لیا اور اس آواز کی جانب منہ کر کے انگلیوں کو جنبش دی تو وہ سارے جسم سے کانپ اٹھا لیکن وہ اپنے ہاتھ روک نہیں سکا بے اختیار ہی ایک دھن نکلتی چلی گئی یہ وہی دھن تھی جسے وہ اپنی خوابوں کی پری کے سامنے سنایا کرتا تھا بالکل اسی انداز میں اس کی انگلیاں تاروں پر تھرکتی رہیں پیاروں کے نغمے مسکرانے لگے اور اس کی نگاہوں کے سامنے [illegible] کے پھول کھلتے چلے گئے۔ یہ کیسا اُجالا تھا جو پھیلتا چلا جا رہا تھا یہ دنیا کیسی خوبصورت تھی کیا یہ خواب تھا کیا اس کے سامنے ان پریوں کی شہزادی تھی!

ستار بجتا رہا اور کائنات خاموش تھی جیسے ساری کائنات ساری دنیا کا وجود ایک نغمہ تھا سچ مچ اس کی انگلیوں میں جادو ہے سچ مچ آج ستار کا سینہ چاک ہو گیا ہے اور نغمے کی خوشبو بکھر گئی ہے . . . .

اس نے اپنے شانوں پر ایک ہاتھ کا لمس محسوس کیا — "سچ سچ تم نے بہت اچھا بجایا۔"

وہ رسیلی آواز تھی جیسے گھنگھرو بج رہے ہوں!

اس نے مڑ کر اپنا ہاتھ اس ہاتھ پر رکھ دیا — "آپ کون ہیں؟"

اور پھر اسے اپنے ہاتھ میں سرسراتے ہوئے چند نوٹ محسوس ہوئے — "کبھی کبھی یہاں ہو جایا کرو۔ ڈیڈی بھی سنیں گے۔ وہ بہت پسند کریں گے —"

اس نے اپنے ہاتھ میں نوٹ لئے اور اس پر جو کیفیت طاری ہوئی اُسے دیکھنے والے نہ سمجھ سکے کوئی نہ جان سکا کہ کیوں اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ ہاتھ کپکپانے لگے اور ستار کے تار لرز اٹھے کیا وہ آتشیں نغمہ بجا کر دنیا کی اس ساری خوبصورتی میں آگ لگا دے گا جس میں اس کا کوئی حصہ نہیں؟ جہاں کوئی اس کے دل کی دھڑکنوں کو سمجھنے والا نہیں؟ پھر اس کی آنکھ میں آنسو ڈھلک آیا اور اس نے دوسرا نغمہ شروع کر دیا۔ یہ نغمہ پہلی مرتبہ اس نے اس وقت بجایا تھا جب وہ اپنے باپ کے ٹھنڈے جسم سے لپٹا تھا اور دل میں چھپے ہوئے طوفان کو اس طرح ظاہر کیا تھا یا اب آج آپ ہی آپ اس کی انگلیاں ان دھنوں کو بجانے لگی تھیں جیسے اس کی ساری آرزوئیں ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔

ان دونوں نغموں کے بعد شاید اس کے پاس کوئی نیا نغمہ نہیں رہا تھا اس لئے وہ خاموشی سے اٹھا اور ستار کو کندھے پر رکھ کر باہر چلا آیا۔

اس کے جانے کے بعد دیکھا گیا کہ نوٹ وہیں پڑے تھے اس نے — آج ساری دنیا کی محرومیاں قبول کر لی تھیں اور اب اسے [illegible]

مکھن لال بیکس

آخری کش

دُور یتھ سنسان کُٹس منز تہٕ یتھ وتہٕ پیٹھ کھڑا
کیُتہٕ پھِرٕ سوچن ہیوٚتمُ میہٕ زِندگانی ہُند سوال
کیُتہٕ پھِرٕ بے باک وٕانجہ باکہٕ ژھنڈنہٕ پھیرٕ آسے
کیُت سگریٹ پیٚنہٕ گیہٕ قربان یتھ سوچس اندر
کیُتہٕ پھِرٕ پیٚیہٕ سوچنس بنیہٕ واریہٕ سگریٹو بغیر
کیُتہٕ پھِرٕ اُتھہٕ زہرہ دامس یتھ میہٕ آنو ٹوٹھ بان
کیُتہٕ پھِرٕ جُنگ سیٚٹھاہ تھوٚدنیاے گومُت آنزرادنے
کیُتہٕ پھِرٕ باسیوٚم دامن ییٚن پوشو ہوٚت بھرِتھ
کیُتہٕ پھِرٕ باسیوٚم جگرس چاک دامن تار تار
دُور یتھ سنانس منز ہیوٚچھ میہٕ سوچن داریاہ
ساتھہٕ کیوٚتھ یتھ گاشس زندگی کرِ میہٕ مذاق

داریاہ لٹہٕ داریاہ
آیہٕ کیُتیاہ ساعت یتھ یتھ زِندگی منز بارہا
یُم دِلن شرٕ پہٕ راٹھی کم کم دام کم کم نادِرہ گلی
کیُت حسرت ترٲوی فرِشتین سیٚتہٕ گِندنے بٕ ونتھ کٔن
وُہہ شرعٕ گژھنے ییٚن آد اِنتہا
کیُت زہرک پیالہٕ چے میٚتہٕ زندگی ہنزہ بنٲنہٕ کیٚنو
اکھ ہلاہل بے دغا

یُس چھُ ہاوان زِندگی کیتھہٕ کنٕز بنان اکھ رُت مذاق
اکھ سرٕ دراہ مُشتیاہ !
یتھ کشس سیٚتی گژھیا سوچن ختم خوابک اثر
تارِہ کُرُشن پیٹھ چھُ بجلی ژونگ تام زون کن وُچھان
زُونہٕ تامت ہیٚتن اوٚبرک کالہٕ لمبک ہیٚتھو پکُن
چانٛدی کارِ تھہٕ ترٲومُت اُس زُونہٕ تتھہٕ پھیر ژھلے ہِش
اَبرہ آکاشس اندر گاٹراہ حسین باسان چھُ زوٗن
یتھ دِہس اندر چھُ باسان زندگی دِہ لدٕ گیٚٹر
دُور یتھ سنسان طرفس کُن تہٕ چھا کانہہ روشنی
وُہہ میہٕ یتھ تصویرِ کِس نقشس چھُ نوٚہ رکھ ترٲوِہ نے
باسہٕ کیتھہٕ کنٕز ہتھ کُلس تل تاگہٕ وگنیٚن ہُند صدا
وُہہ ہٕمس ہیالہٕ چھم گمُت مُشتتھ ہلہٕ بند گنڈٕن
وُہہ یمس شیرٕ پیٚنہٕ چھم چشمن سُرمہٕ تیٚج ڈٲلنے
سوچنس گژھ فرصتاہ آسنہٕ نہٕ کیتھہٕ کنٕز سوچِہ بٕ
سوٚرٕ گژھ گژھ کیٚڑہٕ ہن پیوٚ آخری سگریٹ تام
یتھ کشس سیٚتی گژھیا سوچن ختم خوابک اثر
تارِہ کُرُشن پیٹھ چھُ بجلی ژونگ تام زون کن وُچھان
دُور یتھ سنسان طرفس کُن تہٕ پیٚیہٕ نا روشنی

ورق ورق

(مہینے بھر کی سیاسی ثقافتی اور سماجی سرگرمیاں)

• صدر ریاست کے تاثرات • محفلِ مشاعرہ • شری نہرو کا دورہ کشمیر • ونوبا جی سری نگر میں

صدر ریاست کے تاثرات

جموں وکشمیر یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۲۰ر جولائی ۱۹۵۹ء کو ایس۔ پی کالج ہال میں شہریوں کے ایک چیدہ اجتماع سے شری کرن سنگھ جی نے خطاب کیا اور اُن کا موضوع تھا "دورہ روس کے تاثرات" اس طرح کی بامقصد محفلوں کا انعقاد سری نگر میں کچھ عرصہ سے بہت شاذ دیکھنے میں آرہا ہے۔ شری کرن سنگھ جی روس کے برصغیر جس کی ایک سرحد بحر منجمد شمالی اور دوسری کشمیر سے ملتی ہے میں تین ہفتے رہے اور اس دوران میں ہزاروں میل کی مسافت طے کی ظاہر ہے کہ ایسے وسیع سفر کے تاثرات صرف ۴۵ منٹ میں برق وصوت کی قوت ایجاد کے اسیر نہیں ہوسکتے مگر اس کے باوجود فاضل مقرر نے اپنے دلنشین اور سادہ انداز میں اپنے سفر کی جو کہانی سنائی۔ اس نے حاضرین کو کافی محظوظ کیا۔ حاضرین کی دلچسپی کا یہ عالم رہا کہ آخر پر وہ تشنہ لبی کے اس احساس کے ساتھ اُٹھے جو جناب علی اصغر فیضی کے الفاظ میں کسی کامیاب تقریر کا خاصۂ طبعی ہوتا ہے مگر یہ سامعین کی رائے میں موضوع کی وسعت اور گفتگو کی تنگ دامنی سے زیادہ تعلق رکھتا تھا۔

سوویت یونین کے ساتھ ہماری دلچسپی ایک عظیم ملک اور عظیم تر عالمی طاقت کی حیثیت سے ہی وابستہ نہیں ہے۔ سوویٹ یونین ایک نئی انقلاب آفرین تہذیب کی تجربہ گاہ ہے جس نے افکار و اقدار کی پرانی تنظیم کو للکار کر ایک نیا ضابطۂ حیات اور ایک نیا قاعدۂ اخلاق پیش کیا ہے۔ اس نئی تہذیب کے اعمال و افعال اس کی صورت پذیری اور پیکر تراشی کے عمل سے نوع انسانی کے مستقبل کا بڑا گہرا رابطہ ہے۔ اس لئے سوویت یونین کے حالات سے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش قدرتی ہے اس نظام کے حسن اور قبح کے بارے میں تضاد آرائیوں کا جو سلسلہ قائم ہے وہ جاننے کی اس خواہش کو اور تیز کر دیتا ہے صدر ریاست کی تقریر میں بھی ان دو پہلوؤں کی آنکھ مچولی صاف نظر آتی تھی انہوں نے جہاں کھلے دل سے اس عظیم تہذیب کے کارناموں کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس کے اچھے پہلوؤں کو اپنانے کی دعوت دی۔ وہاں بڑے شائستہ اشارات میں وہاں کی زندگی کے بعض تاریک گوشوں پر بھی روشنی ڈالی۔

یوراج کی تقریر کی خوبی اس کا بیانیہ انداز تھا۔ انہوں نے ایک مفکر یا سیاست دان کی حیثیت سے سوویت زندگی کا تجزیہ کرنے کی بجائے ایک ایسے سیاح کی نگاہ سے اسے دیکھا جسے زندگی کے تمام گوشوں سے یکساں دلچسپی ہو اور جیسا کہ ایک فطرتی بات ہے وہ زیادہ تر ہندوستانی کی عینک سے حالات و کوائف کی تعبیر کرتے رہے۔

ماسکو کے شہر کو انہوں نے کافی بڑا اور پرسطوت تو بتایا مگر انہیں اس میں حسن کی کمی نظر آئی۔ لینن گراڈ میں انہیں ایک ایسا روسی ملا جسے ہندوستانی یوگا سے کافی دلچسپی تھی۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس روسی کو یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا ہے مگر صدر ریاست یہ نہ جان سکے آیا اس عتاب کی وجہ یوگا سے دلچسپی تھی یا کچھ اور۔

سٹالین کے آبائی صوبے جارجیا میں انہوں نے سوویت یونین کے باقی مقامات کے برعکس سٹالین کی زیادہ تصویریں اور بُت دیکھے اور وہاں کے لوگوں کو سٹالین سے متعلق عقیدت کے جذبات سے معمور پایا

تاشقند میں انہیں کشمیر اور قدیم وسطی ایشیا کے تعلقات کی بہت سی شہادتیں ملیں۔ وہاں انہوں نے کشمیر سے متعلق ایک ڈرامہ دیکھا جس کی ہیروئین کی ملبوسات حیرت انگیز طور پر کشمیری عورتوں سے مشابہ تھیں۔ یہیں پر انہوں نے ایک منظر میں ایک ایسی سنگ کا مشاہدہ کیا جو [illegible] سری نگر کے مسجد شاہ ہمدان کا ہو بہو ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا

کے جوتوں کے ساتھ پیوست کرکے تشکیل دی گئی تھی۔

کوثر و گنگا کو اک مرکز پہ لانے کے لئے
اک نیا مرکز بناؤں گا زمانے کے لئے

اس ڈرامے میں جو موسیقی استعمال کی گئی تھی وہ کشمیری موسیقی سے کافی مشابہت رکھتی تھی۔ سمرقند میں شری کرن سنگھ نے مقامی جامع مسجد اور دوسری تاریخی عمارتوں کے علاوہ مشہور چغتائی فاتح تیمور لنگ کے مقبرے کی سیر بھی کی۔ تیمور کی ہڈیوں کو روسیوں نے سائنسی مطالعے کے لئے اُکھاڑا ہے اور انہوں نے اس کی ہڈیوں کی ساخت سے اُس کے جسمانی حلیے کا نقشہ مرتب کیا ہے اور وہ اس بات کی تصدیق کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے ہیں کہ تیمور کی ایک ٹانگ واقعی چھوٹی تھی۔ شالن آباد میں شری کرن سنگھ نے کشمیر کا گھنیرا اور سایہ دار چنار اپنی پوری رعنائی سے جھومتے دیکھا وہاں انہوں نے اپنی اردو واقفیت کے بل بوتے پر مقامی لوگوں سے بات چیت کی جو فارسی زبان بولتے ہیں اور اردو کے الفاظ بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ یہاں کی لائبریری میں انہوں نے فارسی اور عربی کے قدیم مخطوعات دیکھے جن میں بہت سے کشمیری شاعروں کے نسخے بھی شامل ہیں۔ وہ یہاں سے دیوان غنی کے قلمی نسخے کی ایک مائیکرو فلم کاپی بھی ساتھ لیتے آئے ہیں۔

انہوں نے وہاں کے فن تعمیر کو پسند نہیں کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ وہ یہ اُمید لیکر گئے تھے کہ اشتراکی سوسائٹی میں فن تعمیر سادگی، جدت اور کم خرچی کی خصوصیات پر مشتمل ہوگا۔ مگر وہاں انہوں نے اٹھارہویں صدی کے بڑے بڑے محلات کے اُبھرتے ہوئے ڈھانچے دیکھے جن میں حسن تناسب کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ انہوں نے سکنڈے نیویا کے ملکوں کے فن تعمیر کو زیادہ خوبصورت پایا اور بقول اُن کے حال ہی میں روسی وزیر اعظم مسٹر کروشچوف نے بھی ہدایت کی ہے کہ فن تعمیر کو جدید بنیادوں پر منظم کیا جائے۔

موسیقی کے بارے میں بھی صدر ریاست کے تاثرات حوصلہ افزا نہیں ہیں وہاں کلاسیکل موسیقی سے زیادہ سطحی نغمات کو زیادہ ترویج مل رہی ہے اور ہندوستانی موسیقی میں بھی کلاسیکل موسیقی سے زیادہ اقدارہ کے ریکارڈ زیادہ مرغوب خاطر ہیں۔

سوویت روس کے نظام تعلیم نے یوراج کو بھی طور گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ سوویت نظام تعلیم میں زیادہ زور سائنس اور ٹیکنالوجی پر دیا جا رہا ہے اور اس سلسلہ میں سوویٹ روس کے کارنامے دُنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے اس معاملہ میں ہندوستان کو روس سے سبق سیکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔"

لوک رقص کو روس میں جو غیر معمولی اہمیت دی جا رہی ہے اُس کا انہوں نے مفصل تذکرہ کیا۔ ان رقصوں کو آراستہ اور پیراستہ کر کے زندگی اور جوش سے معمور بنا دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے یہاں بھی لوک رقصوں کی پوری طرح نگہداشت اور ترویج کی سخت ضرورت ہے۔ یوراج نے اپنی تقریر کے آخیر میں اُن دوستانہ جذبات کا ذکر کیا جو روسی عوام کے دلوں میں ہندوستان اور اس کے عظیم رہنما شری نہرو سے متعلق پائے جاتے ہیں۔ امن عالم کے لئے ہند جو کوششیں کر رہا ہے اُن کی روس میں قدر کی جاتی ہے

طرحی مشاعروں کا رواج ہمارے یہاں نہ ہونے کے برابر ہے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ پچھلے دس بارہ برس کے اندر اندر اس نوعیت کا کوئی معیاری مشاعرہ سری نگر میں منعقد نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے ۲۳ جولائی کو ایس۔ پی۔ کالج ہال میں محکمہ اطلاعات کے شعبۂ ثقافت کی جانب سے جو محفل مشاعرہ سری نگر کے جواں سال ڈپٹی کمشنر میر نصر اللہ کی صدارت میں انعقاد پذیر ہوئی۔ وہ ایک نئی روایت کا تعارف تھا۔ مشاعرے کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ یہ سیلاب زدگان کی امداد کے سلسلہ میں منعقد ہوا اور اس میں کشمیری زبان کے تقریباً ہر قابل ذکر شاعر نے شمولیت کی۔ مشاعرے کی تیسری خصوصیت بقول کلچرل آفیسر مسٹر شمیم احمد شمیم یہ تھی کہ اس کی وجہ سے کشمیری ادب میں لگ بھگ دو درجن نئی غزلوں کا اضافہ ہوا۔ عام طور پر ہمارے شاعر ایک آدھ غزل کہہ لینے کے بعد دو تین سال کے تقاضے باقی کر دیتے ہیں۔ مگر مصرع طرح پر طبع آزمائی کرنے کے سبب انہیں بہر حال اپنی طبیعت کی جولانیوں کا زور آزمانا پڑا۔ مشاعرے میں جہاں چند کم سن شاعروں نے بڑی محنت کی غزلیں پڑھیں وہاں بعض دوستوں کو یہ دیکھ کر کافی مایوسی ہوئی کہ ہمارے بعض اُستاد شاعر وقت آنے پر ناموزوں شعر

کہنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

مشاعرے کے اختتام پر شعرائے کرام کے اُس اعلان کا پُرجوش تالیوں سے خیر مقدم کیا گیا کہ انہوں نے اپنی جیب سے پانچ پانچ روپے سیلاب زدگان کے امدادی فنڈ میں دے دئے ہیں۔

جو دوست کسی وجہ سے مشاعرے میں شریک نہ ہوسکے اُن کے تفنّنِ طبع کے لئے مشاعرے کی چیدہ غزلوں کو اسی شمارے میں شایع کیا جا رہا ہے۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤

شری نہرو کو کشمیر سے جو لگاؤ اور کشمیریوں کے دکھ سکھ سے جو دلچسپی رہی ہے وہ تاریخ کا ایک ممتاز باب ہے۔ ایک کشمیر کو سیلاب کی شکل میں ایک اور مصیبت کا سامنا ہوا تو شری نہرو کا دردمند دل پھر تڑپ اٹھا اور طبیعت کی علالت کے باوجود وہ زیادہ دیر تک اس سے دُور نہ رہ سکے اور بالآخر ۲۷ جولائی کو صدر کانگریس شریمتی اندرا گاندھی اور وزیر دفاع شری کرشنا مینن کی ہمراہی میں وارد سری نگر ہو گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے سیلاب زدہ علاقوں کا فضائی جایزہ لیا اور اس کے بعد سری نگر تشریف لائے۔ کشمیریوں کے لئے شری نہرو کی آمد ہمیشہ جوشِ عقیدت اور پُرمسرت خروش کا مژدہ لیکر آتی ہے۔ اس موقعہ پر بھی انہوں نے اپنے اس عظیم رہنما کے قدموں میں عقیدت کے پھولوں کی بارش کی اور انتہائی کم وقت ملنے کے باوجود اپنے جذبۂ احترام کا متاثر کن مظاہرہ کیا۔ شری نہرو نے اپنے مختصر قیام کے دوران اُس عظیم منصوبے کے چند پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ جو کشمیر میں سیلابات کو روکنے کے سلسلے میں تیار کیا جا رہا ہے اور جسے عملی جامہ پہنانے میں مرکز اپنے وسیع ذرایع استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہے انہوں نے اس سلسلہ میں صدر ریاست۔ وزیر اعظم اور ریاستی حکومت کے دوسرے اہل کاروں سے بحث و تمحیص کی۔ کشمیریوں سے اپنے خطاب کے دوران انہوں نے نہ صرف ہمیں حوصلہ اور استقلال بخشا بلکہ مرکز اور ملک کے باقی حصوں کی امداد کا یقین بھی دلایا۔ سری نگر سے واپسی کے بعد انہوں نے دہلی میں جن خیالات کا اظہار کیا اُن سے اس امر کا سُراغ ملتا ہے کہ نہرو کو کشمیر کے حالیہ سیلاب سے کتنا دُکھ پہنچا ہے۔ اور وہ مصیبت زدگان کی امداد اور کشمیر کو سیلاب کی تباہ کاریوں سے ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھنے کے لئے کس قدر فکرمند ہیں۔ سیلاب روک منصوبے کے سلسلے میں انہوں نے کشمیر کی تاریخ کا جائزہ لیکر جو تجاویز پیش کی ہیں وہ بڑی اہم اور قابلِ غور ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وادی کشمیر ایک پیالی کی شکل میں ہے جونہی پہاڑوں پر پانی برستا ہے وہ ایک دم نیچے اُتر کر بستی علاقوں میں جمع ہو جاتا ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ جس جگہ جہلم وادی کو چھوڑتا ہے اُس جگہ کو کافی وسیع اور گہرا بنایا جائے تاکہ پانی کا نکاس بڑی تیزی سے ہو سکے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں کھدائی (DRUGING) کے قدیم طریقے سے کام لینے پر زور دیا اور کہا کہ صرف پشتے اور کنارے تعمیر کرنے سے ہی سیلاب کے خطروں سے حفاظت کی ضمانت نہیں مل سکتی۔ انہوں نے کشمیر کی تاریخ سے مثالیں دیکر کہا کہ للتادتیہ مکتاپیڈ نے بھی اپنے عہدِ حکومت میں جہلم کی کھدائی کی تھی۔ اونتی ورمن کے عظیم انجینیر سویہ نے اس سلسلہ میں جو کارنامے انجام دئے ہیں وہ اُس کی بے مثال ماہرانہ ذہانت کا ثبوت ہیں۔ اُس نے بارہمولہ کے نزدیک جہلم کی کھدائی کی اور دریا کے دونوں کناروں کو پختہ بنا دیا تاکہ مٹی پھیل کر دریا میں جمع نہ رہ جائے جس سے پانی کے اخراج میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ زین العابدین بڈشاہ نے بھی سیلابات کو روکنے کے لئے جو اقدامات کئے وہ بھی کافی مُؤثر تھے۔ شری نہرو نے ماضی کے ان تجربات کی روشنی میں کام کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤

دوسری اگست کی صبح کو صوبہ جموں اور کشمیر کے شمالی ضلع کا دورہ ختم کرکے بھودان لیڈر آچاریہ دنوبا بھاوے سری نگر پہنچے۔ جہاں وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد کی سرکردگی میں ہزاروں شہریوں نے اُن کا پُرتپاک اور پُرخلوص استقبال کیا۔ آچاریہ جی کا ریاست بھر میں جس عقیدت سے خیر مقدم کیا گیا ہے وہ اُن کے اعلےٰ آدرشوں اور مقدس مشن سے کشمیریوں کے جذبات کی غمازی کرتا ہے۔ سری نگر میں اپنے چار روزہ قیام کے دوران انہوں نے بھاری اجتماعات اور پارتھنا سبھاؤں سے خطاب کیا جس میں ہزاروں شہریوں نے شرکت کی اور ان کے ہمہ گیر خیالات سے مستفید ہوتے رہے۔

فکر و فن

(تبصرے)

تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے

- کالے ہتھ ۔ (ڈوگری کہانیاں) . ویدراہی
- " دھاریں دے اتھروں (ڈوگری ناٹک) . ویدراہی

ویدراہی ہمارے جانے پہچانے ادیب ہیں۔ بحثیت اُردو افسانہ نگار اور شاعر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت دے چکے ہیں۔ اُن کی رچنائیں تعمیر و تشکیل کے اعتبار سے بڑی کامیاب ہوتی ہیں۔ ڈوگری ادب کے لئے یہ ایک نیک فال ہے کہ ویدراہی جیسے کم عمر اور کہنہ مشق ادیب نے اب مسلسل ڈوگری زبان میں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اُن کی برق رفتاریاں اور شعلہ خراسیاں اس بات کی غماز ہیں کہ وہ جلد ہی اپنی منزل کا نشان پالیں گے اور اُن تازہ دم اور باہمت ڈوگری ادیبوں کے لئے مشعلِ راہ بنیں گے جو اپنے گرد و پیش کے ہنگامہ خیز حالات سے وقتی طور پر مایوس ہو کر کسی کاروان یا میر کارواں کے سامنے دست بستہ کھڑے ہیں اور آگے کی جانب قدم بڑھانے کے لئے حکم و ہدایت کے منتظر ہیں۔

ویدراہی کا افسانوی مجموعہ " کالے ہتھ " ایک سلجھے ہوئے متوازن ذہن کے پیداوار ہے جس میں مصنف نے وسیع النظری اور پختہ مشاہدے کے گوناگوں نقوش فن کارانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ اُبھارے ہیں یہ کہانیاں ڈوگر دیس کے فطری خلوص اور ازلی چاہت کی کہانیاں ہیں۔ دُکھ درد اور خوشیوں کی ایسی ریکھائیں ہیں جن میں خاموش پہاڑوں کے مستقبل کی داستان پنہاں ہے۔ یہ کہانیاں اپنے لوگوں کے معصوم جذبات کے تانے بانے سے بنی گئی ہے۔ اور انہیں پڑھ کر ہم مصنف کی شخصیت یا کہانیوں کے کرداروں سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ متاثر ہوتے ہیں۔ سیدھے سادے رنگ ہیں اور جانے پہچانے خد و خال جو دل کو چھوتے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو لاتے ہیں اور ایک تڑپ سی جگاتے ہیں احساسات میں اُس جستجو کی جس میں خوش آیند مستقبل کی تلاش ہے۔ تلاش کی تکمیل ہے۔ مصنف نے ان کہانیوں میں مختلف موضوع لئے ہیں اور انہیں پوری نفسیاتی باریک بینی اور فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ سجا سنوار کر کچھ ایسا رنگ اُجاگر کیا ہے کہ ہر فرد ایک خاندان بن جاتا ہے اور ہر خاندان ایک چھوٹی سی سمکی دنیا جس کا محور زندہ رہنے کا احساس ہے اور اس احساس میں انسانوں کی مظلومیت اور انسانیت سے محبت دونوں کا عکس ملتا ہے۔

" منو آداکرتا " " تاتو ہوڑ " اور " کالے ہتھ " تعمیر و تشکیل کے اعتبار سے کامیاب کہانیاں ہیں۔ " منو آداکرتا " میں بُوآ کا کردار پیش کرتے میں مصنف نے جس فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے وہ اُسی کا حصہ ہے۔ کردار نگاری کے لحاظ سے " منو آداکرتا " اور " تاتو ہوڑ " اس مجموعہ کی بہترین کہانیاں ہیں جن میں جذبات نگاری سے بڑا کام لیا گیا ہے۔

" کالے ہتھ " ایک جاندار احساس اور مقدس غرض کی کہانی ہے ۔ ایک حساس دل اور خوبصورت روح کی دھڑکن ہے جو آنسو بن کر آنکھوں سے جھک پڑتی ہے اور " کالے ہتھ " اُس ٹوٹی ہوئی دھڑکن کو سہارا دینے کی سعی کرتے ہیں۔ یہ کہانی ایک گم شدہ لمحے کی تلاش کا بیان ہے جیسے روح کا جسم بن کر رہ گیا ہے ایک ایسا مفلوج جسم جس کے صرف ہاتھ ہی حرکت کرتے ہیں دوسروں کی غمناک محرومیوں کا درد بٹانے کے لئے۔

" چیہلتے مجوت " اور " لہروں " ناپختہ شعور کے معصوم پیار کی کہانیاں

جن میں بچپن اور لڑکپن کی وہ چاہت اُجاگر کی گئی ہے جیسے اگر جوانی اپنا لیتی ، تو جنسی شعلے لپکتے پھول بن جاتے۔ ان دو کہانیوں میں ایک خاص عمر کی فطرت کا لطیف نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ "چھٹ" اور "ہنٹودے مگر"۔ موضوع کے اعتبار سے نئی نہ سہی لیکن TREATMENT میں مصنّف نے ایک مخصوص رنگ اُجاگر کیا ہے۔

"کالے ہتھ" ڈوگری ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے اگر وید راہی زبان کی طرف اور زیادہ توجہ دیں اور مقامی محاورے سے کام لیں تو اس ماحول کی نوک پلک سنوارنے میں زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں جن کی مٹی میں اُن کی کہانیوں کے کردار پرورش پاتے ہیں۔ بہرحال وید راہی اپنی اس ستھری اور معیاری تخلیق کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(ٹھاکر پونچھی)

"دھاریں دے اتھروں" ۔ ڈوگری ناٹک

"دھاریں دے اتھروں" درحقیقت پہاڑوں کی پُر بہار مسکراہٹوں کا پیش خیمہ ہیں۔ ناٹک میں نئے دَور کی آواز ہے۔ حال کی ناکامیوں میں مستقبل کی کامرانیوں کی بھرپور جھلک ہے "دھاریں دے اتھروں" کا موضوع دیہاتی ماحول کے ایک عام سے گھرانے کی ایک عام سی کہانی ہے جو جتنی معمولی اور پرانی ہے۔ اتنی غیر معمولی اور نئی بھی۔ کہانی ہماری جانی پہچانی ہے۔ کئی بار سنا ہے اپنی آنکھوں سے ہنستے روتے دیکھا ہے۔ کردار بھی ہم میں سے ہیں۔ وید راہی نے ایک عام سے سماجی موضوع میں ڈرامائی تأثر پیدا کر کے ہمیں چونکایا نہیں۔ صرف ناٹک کے مرکزی خیال کا ساتھ دینے کی تحریک جگائی ہے ایک دھیمی سی نئی آواز میں اپنی آواز کو ہم آہنگ کرنے کا حوصلہ بخشا ہے مصنّف کا یہی مقصد تھا اور اپنے مقصد میں وہ کامیاب ہے۔ ناٹک کے کردار اپنی تلخیوں اور محرومیوں کو سنبھالے ہوئے زندہ رہنے کی عظیم جدوجہد میں جُٹے ہوئے۔ زندہ رہنے کے حربے مختلف سہی۔ لیکن زندگی کا پُر امید احساس سب میں ہے اور اُس کے لئے وہ ہر اچھا بُرا فعل کر گزرنے کے لئے تیار ہیں مصنّف نے کرداروں کے اس پُر امید احساس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہے۔ اور کہیں کہیں تیکھے جملوں سے اُن کے دلوں کی اتھاہ گہرائیوں کو بھی چھوا ہے۔ ناٹک میں ایک مخصوص پہاڑی ماحول کا عکس ہے زندہ قوتوں کی تصویر ہے جس میں متضاد اور متصادم احساسات کے ٹکراؤ سے ڈرامائی عنصر پیدا کیا گیا ہے۔

اس کے باوجود ناٹک کے کردار اپنی اس بلندی یا پستی کی وسعت اور گہرائی کو نہ پا سکے جس کے وہ حقدار تھے۔ شاموں کا کردار لاکھ بُرا سہی خود غرض اور ذہنی طور پر پست سہی لیکن موت میں انسان کا پرانا ثبوت نہیں اگر شاموں پاگل ہی رہتا اور اُس کے ہولناک ہنستے گھاٹیوں کے نشیب و فراز میں متواتر گونجتے رہتے تو زیادہ پُر اثر ہوتے۔ اس کی غیر قدرتی موت سے عبرت کا احساس نہیں جاگتا۔ رحم کا جذبہ اُبھرتا ہے جو کردار کی پست ذہنیت کو اُبھارنے میں سدِّ راہ بنا ہے ناٹک کے کچھ منظر مختصر ہونے کی وجہ سے تاثر پیدا نہ کر سکے۔ رتن اور شاموں کی شراب کے نشے میں بات چیت سماجی پس منظر کو واضح کر سکتی تھی اسی طرح پنچایت کا منظر بھی طویل ہو سکتا تھا اور مختلف کردار اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور گرد و پیش کے ماحول کی عکاسی و ترجمانی کرنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔

علاوہ ازیں ناٹک میں طنز و مزاح کا عنصر سرے سے غائب ہے جو کہ ہمارے ڈگر دیس کے ماحول کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ان خامیوں کو آسانی سے دُور کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال ناٹک اس اعتبار سے کامیاب ہے کہ مصنّف نے چھے تُلے جملوں اور نمایندہ کرداروں کے انتخاب سے ایک محدود چتر پٹ پر اپنا مدعا خوبصورت ڈھنگ سے بیان کر دیا۔

وید راہی کا یہ پہلا ڈوگری ناٹک ہے اور بہت حد تک اپنے اغراض و مقاصد کو پورا کرتا ہے۔ ڈگر دیس کو "دھاریں دے اتھروں" جیسے سماجی ناٹکوں کی ہی ضرورت ہے جو مخصوص مقاصد کے ساتھ اعلیٰ ادبی قدروں کو بھی اپنائے رکھیں۔

(ٹھاکر پونچھی)

تارک مال (غلام محمد دلشاد کی منظومات) دلشاد کشمیری زبان کے نوخیز اور اُبھرتے ہوئے شاعروں سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن کے اس مجموعے کو دیکھ کر اُن سے بجا طور پر بڑی اُمیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں اُن کی منظومات کا یہ پہلو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ وہ حسنِ بیان کے تقاضوں اور فنی احتیاط کا دامن نہیں چھوڑتے یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں جوش سے زیادہ ٹھہراؤ کے عناصر ملتے ہیں جہاں تک اُن کے تصورات کا تعلق ہے اِنمیں ابھی گہرائی اور گیرائی اگر نہیں آ سکی ہے تو اس کی وجہ شاعر کی نوعمری اور تجربات کی محدودیت ہے اور ہم کی تلافی زندگی کی نے گرانیوں میں ہی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔

حدیثِ دیگراں

بارُودفادہ لکھنؤ

تسلیم۔ خط مِل گیا تھا۔ "تعمیر" کی خدمت نہ کرسکا۔ اِس کے لئے شرمندہ ہوں۔ اب آؤں گا تو حکم کی تعمیل ہوگی۔

میری بعض تقریریں کشمیر ریڈیو سے نشر ہوئی ہیں۔ ایک کشمیر کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں سے متعلق ہے۔ وہ مِل جائے تو لے لیجئے گا!

آپ کا احتشام حسین

ڈیپارٹمنٹ آف پرشن
گورنمنٹ کالج سوپور (کشمیر)

ڈینگ صاحب۔ وعلیکم سلام

رُژ تو یہ گیہ نظم۔ "تعمیرس" منز آدہ یلہ غوش کرِ تیشلہِ چھاپِ تو۔ مگر فی الحال وُنی توم زِہ تہند کیاہ خیال چھُ اَتھ متعلق۔ اگر مناسب باسیو پنِنہ کینہہ دوست تہِ بوزناوِی توکھ۔ خاص کرِتھ شمیم صاحب۔ تہِند بوزی تو زِہ تم کیاہ چھِ وَنان۔ میہ چھُ بوزُن اکھ دوستاہ وَنان زِہ ژہ چھک دوہہِ تصوف وَنان۔ تہُ وُنی توم یتھ نظمِ ما چھُ کُنہ طرفہِ تصوفُک ژھاے پیوان۔ اَڈیو یارَو دوستَو کیاہ حض چھُ پَنِنہ "ترقی پسندی" کھارن وِزِتھ سارے وُرژ کتھہ تہِ سارِی بزر تصوفس مُشہر دِہ کرُو ہتو۔ تہندِس وَنِنس کُن بے گرُھو شَیلہِ چھُ ڈینہک سوڈِی رٹِتھ تہِ تعلیم ادب فقط تصوُفُک برکت تہ ترقی پسندی چھُ محض نعرہ بازی تہِ جذباتی آبیُر باسان۔

ناَدِم صابُن غزل پوُرم۔ کینہہ مصرِ چھس چُھو پاٹھو موزون بوزِ۔ یوتامت خیالک تعلق چھُ، میہ چھُنہ تتھ ریتو کینہہ اِختلاف۔ میون غزل اگر دوبارہ "تعمیرس" منز چھاپو، مہربانی کرِتھ گرُھ پوُرہ چھاپِن۔ بہ لیکھو وُشیل تیم زِہ شار بیٹھِ یِم نوِہ سرِ گژھن لیکھنو یِنہ:-

مطلع :- گمانہ ترٗاوِ نُن تشتُر دیاں چھُ مست بَنِن
مُہ کش نِہ توگ نَتہ ژھولو بو شراب وانہ اَنُن

ترمیم شار :- مُدا تہِ مانہ چھُ کیاہ زندگیہ مرگیہ لفظن
پیو ژِہ پیالہ ہمس کُن، بہ وا یہ ساز پَنُن

"تعمیرس" متعلق تجویزہ گیہ آیندہ۔ ینا حض یہ چھُو چھاپکھ تہِ ناحقس کڈہَم اَڈ اَڈ!

جوابس پرژاران : راہی

آسی رام نگری
مغل سرائے۔ یو۔ پی

پیارے بھائی! خلوصِ بیکراں۔ پچھلے دِنوں میں دہلی گیا تھا۔ وہاں "تعمیر" نظر نواز ہوا۔ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ آپ "تعمیر" کے ذریعہ زبان و ادب ہی کی نہیں، ملک اور قوم کی قابلِ قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔

میں بھی "تعمیر" کے لئے وقت نکالنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے لئے لکھنے میں مجھے مسرت ہوگی۔ پرچہ بھیجا کریں!

خلوص کیش : آسی رام نگری

"تعمیر" کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے
اپنی آراء اور مشوروں سے نوازیئے!

ادارہ

طرحی مشاعرہ

مصرع طرح:-

مت کرو متین زُلف کی زد لاؤ دِلبرو / نگارو

۲۳ر جولائی ۱۹۵۹ء کو محکمۂ اطلاعات کے شعبۂ ثقافت کے زیر اہتمام سیلاب زدگاں کی امداد کے سلسلے میں سری پرتاپ کالج ہال میں جو محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی اُس کی چیدہ غزلیں نذرِ قارئین کی جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ادارہ کلچرل آفیسر جناب شمیم احمد شمیم ... ... کا شکر گزار ہے جنہوں نے ان غزلوں کو "تعمیر" میں شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

(ادارہ)

- ساقی
- فراق
- تنہا
- دِلشاد
- بیکس
- فاضل

- کامل
- برق
- حازم
- مشتاق
- نازکی
- فارق

رحمان راہی

ہرہ ترسیش اچھن، دل برہ مس بانہ دلبرو
بیہ ونتہ ژہ کر یکہ مته امانہ دلبرو

چھنہ چانہ وسے میانہ رود چ محفلی جمال
چنہ دالی برژھاں خاکی چہ پیمانہ دلبرو

پیہ سونتہ پنبر زل ژیہ تقوی پیالہ پیش کش
پنیہ ہردہ کونگس موکھ ژیہ جرن پانہ دلبرو

میتہ داژ ومبر زونہ پچھن لانکہ پیٹھ ترال
کتہ مات ستیم سیتی پہم پانہ دلبرو

امہ گرایہ تہ پوت ژھایہ اگر سردہ گل وچھی
میچھہ یا تہ پچھن یا کدہ نودشانہ دلبرو

ژھنڈہ ناوہ نظر چانی اگر ون ژھنڈو مگر
متہ کرتہ متین زلفکو زولانہ دلبرو

ژھٹہ حسنچہ کس شانہ ارسطو تہ دام کور
تتہ ہارہ سکندر بیتہ رخسانہ دلبرو

یلہ میانہ امارچ یہ شہج وتہ وچھت پکھ
لژھہ پوشس پیون بکنو بنہ دردانہ دلبرو

یدہ ژی میہ دچھک ادہ یہ جنگی ہرنہ ٹوٹھ گوم
حدہ زوس یہ چوان چھک ژہ کیوہ دانہ دلبرو

میتہ بوز غزل، شورہ تمیس پھلے لگم
اتھ بانہ منسز آسم نہ دامانہ دلبرو

متہ چانی خیالن یہ دلیچ آنڈب چھم
ڈیہ پیٹھ ژہ پھکہ زونہ لگن طانہ دلبرو

تیوہ بانہ کتھن کن یہ نہی ناہیس مگر
تمیہ لیوس وچھت تس تہ ژیہ یاسانہ دلبرو

امین کامل

دیوانہٕ سنبھالنہٕ چھہ نو یادانہٕ نِگارو

متہٕ کرتہٕ متین زُلفہٕ کی زولانہٕ نِگارو

اُچھ یام تلکھ تام وَدن تازہٕ خمن شان

گُفتارہٕ چھم دانہٕ سنے درانہٕ نِگارو

یم شانہٕ بریکس لولہٕ سکینہٕ راجھروال

اُچھ میانہٕ رَچھت یم کرکھ شانہٕ نِگارو

اُمی ہونجہ ہندی چیاٚنہٕ ناگہٕ زاج نندرِ میانہٕ

اَمہٕ ناگہٕ بلہٕ ہو تہِ چھٹو بانہٕ نِگارو

چھنہٕ چیاٚنہٕ نظر ہوشہٕ تھوار کامہٕ دیوس پتھ

یمہٕ شانہٕ یہٕ گوب بور بہٕ تلہٕ ہا نِگارو

رونٛخ چیون وچھاو کاریگرِ زونہٕ ڈوس مکھ

قد چیون وچھت سرو پیو آسمانہٕ نِگارو

وَتہٕ چیانہٕ کینہہ اَشہِ وانہٕ ترکینہہ خوٗنہٕ زنگنہہ دراے

سو میراد تکھ ودن پوشن یا دُر دانہٕ نِگارو

پتہٕ میانہٕ ژہ گھرہ دراکھ، کرتہٕ وعدہ وفایی

قدمن مدد کرمی نے، وَتن نورانہٕ نِگارو

یا گونہٕ ژیہٕ چھوی دستِ خضر چھے عطایی

وتہٕ لاگ زِہکھ رادی مترِ دیوانہٕ نِگارو

تم میر، تمہٕ ہینز یانہٕ تہٕ نو تراوہٕ زمانس

ژھانجاپہٕ میہٕ پوگل تہٕ پرستانہٕ نِگارو

کامِل چھہ تھوی مست قلندر زہ ونے کیا

سُدرس اندر اُدریوس نہٕ دامانہٕ نِگارو

غلام نبی فراق

نتہٕ کوت ژٕلن کرٕ تھک ژٕ یم دیوانہٕ دِلبرو
متہٕ کرتہٕ متیٖن زُلفہٕ کی زولانہٕ دِلبرو

ستہ ساس رنگ ژٕ ہاوسن ہُندی شوخ گلزارن
وَتہٕ سینہٕ روشن، ہاو گُل خندانہٕ دِلبرو

کتھٕ چانہٕ بوزٕ ہول ژٕ ولُم آزہ ماوُن پوز
ہتہٕ میون ژٕ ھچوی پیشکش نذرانہٕ دِلبرو

ژٕھر گراے دِکھ تھتھرلے لگہٕ یتھ بولہٕ کِس سودرس
بے کار بے شند سازتے سامانہٕ دِلبرو

حیٖس ہوشہٕ ژٕلی یامت ژٕ یہ کُن الٰہ غائبہٕ نظر ژٕ ھ
مس کھاسی چھا یم چشمہٕ کنہٕ سے خانہٕ دِلبرو

یمہٕ ساتہٕ اچھن تل چھہ یِوان چون تصوّر
کم رنگ چھہ رٹان زِندگی، بوی زانہٕ دِلبرو

ڈوٗتھ پیالہ بَرٕ فوتہٕ شوقہٕ متیٖن چاوساقی ہَن
یمہٕ بزو ٹھہرہٕ وَکھ بَرہٕ وُمرہ ہُند پیمانہٕ دِلبرو

دِتھ کیا ژٕ پانس چھم نہٕ خبر کینہہ تہٕ فراقو
تیتھ کُنٕ بنے یم زِندگی افسانہٕ دِلبرو

عبدالحق برق

کہِ ناوہ کرَتھ یاد ژٕ کوہ زانہٕ نگارو
دِتھم ژٕ لایے ناد کہِ عنوانہٕ نگارو

ترٕ اُوم مِیہ چون دربار کرٕم کاسہٕ گدایی
رُودُم نہٕ ہیٖن اوسُم نہٕ رٹن بانہٕ نگارو

ژٕمہٕ ژٕمہٕ ژٕ ایم نظرٕ میہ چانیو ہیہٕ ژٕرسو ہیتو
سو صبہ آوہ سیٖیم وتیہ رہیم رانہٕ نگارو

اکِہ نُورہ ژٕھٹہٕ گے مُتہٕ مست تہٕ شیدا
عاقل تہٕ دانا سا سہٕ بُدی فرزانہٕ نگارو

یُژٕ کرٕ یُوتھ منزِل عاشقن کیُوتھ راہ طلب گو
مے خانہ ژٕلک گیہ، گیہ بُت خانہ نگارو

پروانہٕ لوگُم شمع رولیس پَہ مِیہ ژٕزِتھ پے
سر یِہ وندسے قدمن تہٕ ژٕرہ پروانہٕ نگارو

چھُوی مشورس آئینہٕ ہٹس شانہٕ خدارا
متہٕ کرتہٕ متیٖن زُلفہ کی زولانہٕ نگارو

دُچھ دُچھ یِوا [illegible] شرم ژٕیتہٕ ماہ گرژھان چھوی
کم ترٕ او تھک ستے کم ژٕ یہ چھی ہم خانہٕ نگارو

تلخی چھہ پزٕ ی، دِتھیہ تہٕ ژٕ وٕنی تہٕ ماروزسے
دَمہٕ دَمہٕ ہاوان چھک ہوکھی پیمانہ نگارو

برق بخشان ژٕرییں اوسو نی شہ مخمارس
ہم خانہ اوسو ہی از چھوڑ وی بے خانہٕ نگارو

تنہا انصاری

اکہِ جلوہ چانے میانہِ حالس شانہ نِگارو
فرزانہِ کم کم گے تیتھے دیوانہِ نِگارو

باہوش ڈیلی گے کر دیاں چانین اچھن مس کھاسو
مے ہوش متین اِم چھ زہ مے خانہ نِگارو

پھیورُس بہ چمن وذ مینہ وتھیم پوشنی ییون ییون
ژیوٹھم نہ پوشہ چانہِ امہِ انمانہِ نِگارو

کنہ وُزی میتیو متو آلوتھ زِ اتھ شمع رولیس
پروا نہ ہجران کینہہ تہِ چانی پروانہِ نِگارو

دراَمت ہوس از مشک ملتھ، عشق موشیومت
چھندریو متوی ذن پیو متوی اسمانہِ نِگارو

زولانہِ متین زندگی، کمیو دشمن دون نے
متہ کرتہ متین زلفہ کی زولانہ نِگارو

چانین متین از موت شیمہ نند وانندو چھ سنبراوان
پرہ سہ تہِ ونہہ چانی بولہ کی افسانہِ نِگارو

چھم یادشامن جلوہ چھ ژیی پوپہ ساماننے
وژنہِ شاپہ تارکھ زونہ دیوان طانہِ نِگارو

مستانہِ تنہا دِر چھ اکے نظرہ پکھاوان
عاشق عشرہ چھ ژی، ژی تشنہ قندانہِ نِگارو

مظلوم حازم

افسانہِ ہنز کعبہ تہِ بُت غمہِ نِگارو
متہ کرتہ متین زلفہ کی زولانہِ نِگارو

اکہ چانی نظر پامہِ دیوان جام و شرابس
اکہ چون اشن ماس پری خانہِ نِگارو

اَتہ بارہ زہ شہمارہ زلف تابہ مینہ گو دِل
اوہ! کارہ تھزہ بارہ چھ دیوانہِ نِگارو

اوہ! چانہِ دچھک زیر و زبر گرایہ دِوان ڈل
اوہ! چانہِ بتھیوک زونہ چھ نورانہِ نِگارو

موت چون یہ لو کپار مینہ باوس چھ کھیوان ہم
داوس چھ مزر سوختہ ہر میانہِ نِگارو

سُم چانی چھ اکہ جوے روان آبِ حیاتچ
ہُم ہُم چھ بنان ترشہ چھین بانہِ نِگارو

اکہ چانی ادا، شوخ ادا، گیہ نہ ادا ندانہہ
نتہ شعر دنے عاشقن کیا کیانہِ نِگارو

غلام محمد دِلشاد

متہ کرتہ متیٚن زلفہٕ کی زولانہٕ دِلبرو
نتہ اسہ کیاہ کم چھانٛی تیم مژگانہٕ دِلبرو

کیاہ زانہِ زاہد چشمہٕ خمارس چھُ اثر کیاہ
اکھ نیم نگاہ ساسہ بدی پیمانہٕ دِلبرو

دوہ چھا نی گُملاون چھ کران پیدہ دِلس منز
نو آتش، نوی طوفان نوی افسانہ دِلبرو

چھوی اکھ ژرِیہ دولت ادلہ بدل چھے ژریہ دِکِس ذرہ
مانن ژرِیہ رٚوس وَن کُس سنا جانانہ دِلبرو

یُمہ زندگی ہُند ژھو کھ تہ موٗدر زون برابر
تُسہ اہلِ نظر چھی ونان مستانہٕ دِلبرو

افسانہ کُنُوی کوہ کنن ہیٚکہِ نہ وٚنیتھ
چھس پھانٛپھلاوان آنتہ رٚوس افسانہٕ دِلبرو

یُد لولہِ بیابانٛ آسہِ ہا زانٛہہ حدِ نظر کانٛہہ
تیلہِ کُس کُس سیتی لاگہ ہے یارانہٕ دِلبرو

یم اہلِ سخن یارہ وُچھ از خستہ جگر ہیٚنتھ
چھی کرنہِ آمتی شیٚنے غزلی نذرانہٕ دِلبرو

چھوی دام چھ کرِتھ ونتہ موت دِتا دجونس
مُژراونا نتہ عالمس دیوانہٕ دِلبرو

غلام محمد مشتاق

طورس چھ چھانٛی براندہ کنُو آستانہٕ دِلبرو
نورس چھ تیٚج منٛز اچھن نو سانہٕ دِلبرو

دوہ تلن تہ بوذن میون چھوی پتہ چانہِ اتھچ کھیل
تِکہ تارہ کشو تارہ چھکھ تارانہٕ دِلبرو

انٛاری وُٹھن گژھ آسے وُژھ ژٹ نالہ سوداون
پُتھ شایہ گل نمہ بوی فلی غندانہٕ دِلبرو

مژہ رُدُوتھن پتہ عالماہ چھوی ڈانٛکہ مس لِسلاے
متہ کرتہ متیٚن زلفہٕ کی زولانہٕ دِلبرو

پریوہ چانہِ گیچ شبنمس پیٚیش، توے پوشن
پُتھ قطرہ سنگس ستی چاوانہٕ دِلبرو

کُنہِ ساعتہ یدوسے چون ظلون گو اندری خیالن
بے تاب دِکھس سجدہٕ آسے شولانہٕ دِلبرو

لسس رشک مشتاق مُبتلو کی غال ونچھت گوس
اکھ داغ چھس جگرس دوییم ارمانہٕ دِلبرو

مکھن لال بیکس

یِہ سادہ دِلن ولنہ ییی دامانہ دِلبرو
متہ کرتہ متین زُلفکی زولانہ دِلبرو

یم چاڑی طرح داسہ زُلف شانہ یدٔ کرکھ
ییہ وَلِنہ مزن دشکہ ہوت بیچانہ دِلبرو

خمار چشمو یلہِ ژٕہ اوش ترادان مینہ چھُہ باسان
کدواُلی زن تمت چھُہ کھوسمس ٹھانہ دِلبرو

دیوت بار ہا فریب دِلس آخرس یوت تام
بُت خانہ توہر آوتھ بناوی مے خانہ دِلبرو

وُنِہ تشنہ جگر رُود لیشیمان تہ کزیشان
وُنِہ دیوت نہ میہ کُن ساقین پیمانہ دِلبرو

بوزو بسہ وکھ یلہِ داتہ یلہِ ژھو کہ آش انسانس
وُنِہ چھس بوٗ رُٹتھ سمر کوی دامانہ دِلبرو

بس چاڑ اکی نیم نظر تیرہ شکارس
دیوانہ کرُن دِل پنُن نذرانہ دِلبرو

بیکس چھُہ دیان کفر دنان، جام گران نوش
مشرآومت تمۍ کعبہ تہ بُت خانہ دِلبرو

رشید نازکی

دنمم گناہ دیون چھم ژٕ یہ کُن پیمانہ دِلبرو
ژھوٹ یوت کرادس رحمتک دامانہ دِلبرو

بیداد کرُنس داد دِوان چھُوی ژٕ یہ جگر میون
ترکانہ حملن ہیُنڈ چھُہ دِل قسمانہ دِلبرو

زولانہ زُلفک نستہ خنجر تیر مژگانک
دیوانہ کرُنس دام کمہِ ساماںہ دِلبرو

چھی کالہِ زُلف نال وُلی وُلی رویہ تابانس
کمی کافرس اتھ کیازِہ دیوت قرانہ دِلبرو

شمعن چھُہ وُدی وُدی جان دیوتمت نار للومت
مٹہِ مار کھاران بِلی چھُہ لسن پروانہ دِلبرو

دُود شمع، پوشریان نول، تارکہ تہ رِوال ژٕلی
کرہٹی آسی ہجرو چہ داُژ ہندی افسانہ دِلبرو

ییہ ناہید مس پیالوی ہستی توبہ پھٹراز
ژی لول چشمو ماھجرتھ پیمانہ دِلبرو

اَتھ زورہ دیکھِس ییُنڈ چھُہ گیسو آب بہا یک
یا شیشہ مس ٹلتیک دامانہ دِلبرو

مس ہُر زن حستین منز ہوش پکھاوان
اتہاد چھو ژی لس چھُہ یی، مستانہ دِلبرو

نازک وتان ادن دت وُدی وُدی بلا یاد کُن
حکرتہ متین زُلف لی زولانہ دِلبرو

عدالۃ دورس هیں دیرے نارس صبح بہار

ماہنامہ
تعمیر
سرینگر
Mohan

گاندھی جی کی چند نشانیاں

مہاتما گاندھی

ساتھ سب کے لئے پھر دعا اٹھے مگر

دل میرا جرم کے احساس سے گھبراتا ہے

کہ دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھوں پہ مجھے

محسنِ دہر کا خون نظر آتا ہے

جگن ناتھ آزاد

فراق گورکھپوری

غزل

زاہد بتوں کی دیکھ کبھی جلوہ باریاں
رہ جائینگی دھری یہ عبادت گذاریاں

ہوں انتہا پسند بھی با اعتدال بھی
ہیں اختیار میں مری بے اختیاریاں

اس وقت تو سنی کو کیا تم نے ان سنی
آئیں گی تم کو یاد یہ باتیں ہماریاں

فطرت تمام حسن خود آرائی ہے مثال
کن انگلیوں نے رات کی زلفیں سنواریاں

دنیا کے انقلاب، زمانے کے اتفاق
سب حسن رنگ رنگ کی ہیں طرفہ کاریاں

میخانۂ سخن میں یہ راتیں نہ آئی تھیں
کچھ کام کر گئیں مری شب زندہ داریاں

دربار عشق میں تھے کروروں امیدوار
کچھ عرضیاں قضا نے بھی آ کر گذاریاں

ملے ہوئے ابھی سے ہیں تیور، جہاں کی خیر
لائیں گی رنگ یار تری طرحداریاں

گزرے ہیں سامنے سے ملائک بصد ادب
میں نے ترے لئے ہیں وہ راتیں گذاریاں

میرے علاوہ بھی ہیں کئی کشتگان عشق
اُن کی بھی ہیں حیاتیں محبت کی ماریاں

آہ اے سکوت ناز تیرا ساز سرمدی
بے لحن بے صدا ہیں تری نغمہ باریاں

ایسی کہاں تھیں دامنِ ہستی کی زینتیں
اے چشمِ خونچکاں یہ تری لالہ کاریاں

اک نیم بوسہ نیم اجازت سے ہائے ہائے
اے لعلِ لب یہ تیری کفایت شعاریاں

جو شب ہوئی وہ دیکھ در میکدہ کھلے
وہ جام اُٹھے کہ آئیں گناہوں کی باریاں

یا سب سنی ہوئی وہ صدائیں کہاں کی تھیں
غربت کی وادیوں میں سنے جو پکاریاں

تو ہی مرا نہیں تو کوئی بھی مرا نہیں
اتنا بتا مجھے یہ کہاں کی ہیں یاریاں

سرگوشیاں سی جیسے ہوں غیب و شہود میں
اے حسنِ شرمسار تری شرمساریاں

خلوت تمام عالم اسرار ہو گئی
جب اس نے چست و تنگ قبائیں اتاریاں

[illegible] کبھی حسن [illegible] بھی خدا
خوشیاں [illegible] نے ترے غم پہ واریاں

یہ سوزِ غم کی لو ہے کہ قطبِ زماں فراق
[illegible] سکوں نما ہیں مری بے قراریاں

ماہنامہ

تعمیر

سرینگر

ستمبر/اکتوبر سنہ ۱۹۵۹ء

جلد ۴ ———————— شمارہ ۲۰

جنرل ایڈیٹر
جے این زتشی

ایڈیٹر
محمد یوسف ٹینگ

قیمت فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے   سالانہ ۶ روپے

عبدالغنی مٹھیا پرنٹر پبلشر نے گورنمنٹ پریس میں چھپوا کر ڈائرکٹر پبلسٹی سرینگر کی طرف سے شائع کیا

ترتیب

سرورق

۲ر اکتوبر کو ہندوستان بھر میں مہاتما گاندھی کا نوّے واں جنم دن بڑی عقیدت کے ساتھ منایا گیا

زاویے

۲ر اکتوبر کو ساری دُنیا میں مہاتما گاندھی کی نوّے ویں سالگرہ پُورے خلوص اور عقیدت کے ساتھ منائی گئی۔ مہاتما جی تاریخ کے موجودہ مرحلے میں زیادہ محبوب اور مقبول بن گئے ہیں اور اُس کی وجہ جاننا بہت کٹھن کام نہیں ہے۔ دُنیا اس وقت جس صورت حال سے دوچار ہو گئی ہے وہاں اُس کی نگاہیں بڑی بے بسی سے کسی پناہ گاہ یا کسی پاسبان کی طرف اُٹھ رہی ہیں۔ طاقتی گروہوں کا تکیہ رکھنے والوں اور قوت یا ... کو نوعِ انسانی کے تمام مسائل کا ایک ہی حل ماننے والوں کا ایک بڑی دلچسپ اور عبرت ناک اُلجھن سے سامنا ہوا ہے۔ وہ ہلاکت آفریں ہتھیاروں کی پیداوار اور ترویج میں بڑی مستعدی اور سرگرمی سے جُت گئے۔ طرفین کا خیال تھا کہ بہت ہی جلد وہ اپنے تمام مخالفین کو چت کر کے صفحۂ زمین کو اپنی واحد اور بلا شرکتِ غیرے "جولانگاہ" بنا سکیں گے۔ مگر جب اُنہوں نے ہلاکت خیزیوں کی انتہائی تدبیریں مکمل کر کے سر اوپر اُٹھالیا تو اُنہیں یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ فتح تو بالکل دوسری چیز ہے۔ وہ اپنے ہی بُنے ہوئے جال میں اس طور قید اور مجبور ہو کے رہ گئے ہیں کہ اب بھی نہیں پھڑ پھڑا سکتے۔ موجودہ دُنیا کی عظیم طاقتیں جہنم کی تباہیوں کو اپنے جلو میں لئے ہوئی ہیں۔ مگر اُنہیں اس بات کا علم ہے کہ اس سے پہلے کہ اُن کا ہاتھ دوسرے کو دفن کرنے کے لئے اُٹھے، وہ خود خاکستر ہو چکے ہوں گے۔ اس احساس نے اُنہیں اب عالمی امن اور غیر اسلحہ بندی کی اصطلاحوں میں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس پس منظر میں مہاتما گاندھی کے ابدی پیغام کا تصوّر کر کے ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ نوعِ انسانی کے اس محسن نے عالمی بقا اور انسانی فلاح کے لئے جو صالح لائحۂ عمل پیش کیا تھا، ٹھوکریں کھا کے اور مجبور ہو کے اب دُکھوں کی ماری دُنیا اُسی سمت کو لوٹ رہی ہے جہاں اس مردِ پیر کے جسم کی ضیا باریاں تسکین اور آشتی کے نئے اُفق روشن کرتی ہیں۔ داخلی محاذ پر مہاتما گاندھی کے اصولوں کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا ہمارے لئے اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ اس مردِ قلندر نے سب سے پہلے اس بات کو بھانپ لیا تھا کہ کسی باغیرت قوم کی سیاسی آزادی اُس وقت تک بے معنی نعرہ ہے جب تک کہ اس کے عقب میں اقتصادی بہبودی اور سماجی اُستواری کا تانا بانا پس منظر نہ ہو۔ ہمیں اس دن عہد کرنا ہے کہ اُن آدرشوں کو عملی پیکر بخشنے کے لئے ہم اپنا دن اور رات ایک کریں گے جن کی سُرخ رُوئی کے لئے وہ جیے اور شہید ہوئے۔

موجودہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں دیر سے پہنچ رہا ہے۔ اس تاخیر کی وجوہات بڑی ناگزیر تھیں۔ ستمبر اور اکتوبر کے مشترکہ شمارے میں ضخامت میں اضافہ کر کے اس کمی کی تلافی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آج سے بارہ سال پہلے پاکستانی حملہ آوروں نے کشمیر پر حملہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں شری پریم ناتھ در کی کہانی "ویسے کا ویسا" پیش کی جا رہی ہے جو پاکستانی حملہ آوروں کے غاصبانہ حملے اور اُس کے عواقب کی فن کارانہ عکاسی کرتی ہے۔

شمیم احمد شمیم نے امین کامل کے تازہ ناول "گٹہ منز گاش" پر تنقید کر کے چند اہم اور غور طلب نکتے اُبھارے ہیں۔ اُن کی بعض آرا بڑی بحث طلب اور مابہ النزاع ہیں۔ مگر اس سے اُن کے مضمون کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ "گٹہ منز گاش" کے سلسلے میں اُنہوں نے جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے اُس کے بعض پہلوؤں سے اختلاف رکھنے کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس ناول کا متوازن جائزہ ہے۔

اس شمارے میں پروفیسر پنڈتا کا تعلیمِ نسواں سے متعلق ایک بحث طلب مقالہ بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہم تعلیمی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے خیالات و افکار کو بڑی مسرت سے شائع کریں گے۔

ستمبر/اکتوبر ۱۹۵۹ء

تعمیر

عرش صہبائی

مرے کشمیر میں

دیدنی ہے ہر گُلِ رعنا مرے کشمیر میں
موجزن ہے حُسن کا دریا مرے کشمیر میں

ہائے وہ منحوس دن جب بھوک اُگتی تھی یہاں
ہو رہا ہے آج زر پیدا مرے کشمیر میں

فصل کو خود کاٹتا ہے اور بوتا ہے کسان
اب نہیں وہ دَورِ عسرت کا مرے کشمیر میں

لہلہاتی کھیتیاں ہیں زینتِ دشت و جبل
سربسر جنت کا ہے نقشا مرے کشمیر میں

روشنی ہی روشنی پھیلی ہوئی ہے چار سُو
ہو گیا عالم چراغاں کا مرے کشمیر میں

موت پر بھی اب نہیں ہے موت کا وہم و گماں
زندگی کا راج ہے گویا مرے کشمیر میں

آبِ شیریں جو حقیقت میں ہے آبِ زندگی
کوثر و تسنیم میں ہے یا مرے کشمیر میں

عشق ہے محوِ ترنم، حُسن ہے مصروفِ رقص
خوشنما کتنا ہے یہ نقشا مرے کشمیر میں

دیکھئے جس کو بھی ہے سرشارِ صہبائے وطن
ہے رواں وحدت کا اِک دریا مرے کشمیر میں

چار سُو پھیلی ہوئی مدہوش کُن رنگینیاں
جا بہ جا ہے مستیٔ صہبا مرے کشمیر میں

ذرہ ذرہ عالمِ مستی میں ہے محوِ طرب
عقل نے یہ معجزہ دیکھا مرے کشمیر میں

چشمۂ شاہی ہو وہ یا باغِ شالیمار ہو
خاص ہے یہ فیضِ قدرت کا مرے کشمیر میں

دیدۂ پُرشوق میں ذوقِ نظارا چاہیئے
کم نہیں جنت سے ہر جلوا مرے کشمیر میں

زندگی بھی ہے محبت بھی ہے اہلِ دل بھی ہیں
کیا بتاؤں میں کہ ہے کیا کیا مرے کشمیر میں

آدمی کو جان و دل سے آدمیت کا پاس
زندگی مطلق نہیں رُسوا مرے کشمیر میں

جاذبِ قلب و نظر ہے سلسلہ کہسار کا
سر اُٹھا کر دیکھئے جلوا مرے کشمیر میں

جس طرف بھی دیکھئے اب مسکراتی ہے حیات
اب نہیں ہے موت کا کھٹکا مرے کشمیر میں

شمیم احمد شمیم

کشمیری ناول — ایک جائزہ

(گٹہٕ منز گاش)

ناول اور افسانے میں کیا فرق ہوتا ہے؟ ان دونوں کے درمیان کونسی حدِ فاصل ہے؟ ایک ناول کیونکر افسانہ کہلانے کا حق دار بنتا ہے اور ایک افسانہ کیسے ناول بننے کا سزاوار ہوسکتا ہے؟ — یہ ایک طویل ٹیکنیکل بحث ہے، لیکن ایک عام آدمی کے نقطۂ نظر سے میں ناول اور افسانے کے فرق کو یوں سمجھتا ہوں کہ ناول پوری زندگی پر حاوی ہوتا ہے اور افسانہ زندگی کے ایک شعبے، ایک واقعے یا سانحے سے متعلق ہوتا ہے۔ ناول لکھنے کے لئے ناول نگار کو زندگی پر مکمل گرفت ہونی چاہیئے اور زندگی سے میری مُراد خورشید الاسلام کے الفاظ میں "اُونچی نیچی سڑکیں، چھوٹی بڑی دُکانیں، جیٹھ کی دُھوپ، برسات کی اندھیری، بھیانک، مچل جانے والی راتیں، قہوہ خانے، گلابی جاڑوں میں نظریں بچا بچا کر مسکرانے والے پھول، مرجھائے ہوئے معصوم چہرے، پُرانی چیزوں کا نیا پن، سادگی میں بناوٹ، نیکیوں میں چھپی ہوئی کمزوریاں، پندار کی تہہ میں انکسار، علم الکلام اور سنگر مشین ہے۔" افسانے کے لئے زندگی کے وسیع مطالعے کی ضرورت تو ہے، لیکن زندگی پر مکمل گرفت کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔ افسانہ نگار اپنے اردگرد کی دُنیا میں سے ان ہی حادثات اور واقعات کو چُن لیتا ہے جو ایک مخصوص تاثر یا کیفیت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہوں۔ وہ اپنے کرداروں کی ان ہی خصوصیات کو نمایاں کرتا ہے جو اس کے مرکزی خیال کی تعمیر میں ممد و معاون ثابت ہوں۔ اس کی کامیابی کا راز کینوا‌س کی وُسعت سے زیادہ تاثر کی شدت میں مُضمر ہے۔ برعکس اس کے ایک ناول نگار زندگی کی جزئیات کے ساتھ ساتھ اس کی تفصیلات کو بھی پیش کرتا ہے۔ وہ ایک پُوری زندگی کو پھر سے تخلیق کرتا ہے، اس کے لئے ہر وہ چھوٹے سے چھوٹا کردار بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے جس کی بادی النظر میں کوئی حقیقت ہی نہ ہو۔ اُونچی نیچی سڑکوں سے سنگر مشین تک "ہر چیز اس کے لئے ایک ابدی حقیقت رکھتی ہے اور اسی لئے زندگی کی ان وُسعتوں میں ڈوب جانے کے ساتھ ساتھ ناول نگار میں ان وُسعتوں کو اپنی گرفت میں کرنے کا حوصلہ بھی موجود ہونا چاہیئے — ناول لکھنے کے لئے زندہ رہنا اور زندگی کا مطالعہ کرنا ہی ضروری نہیں بلکہ پوری زندگی پر حاوی ہونا بھی بہت اہم ہے۔ ہمارے ہاں اچھے ناولوں کی تعداد اسی لئے نہ ہونے کے برابر ہے کہ ہم زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو ان بڑی حقیقتوں کے پس منظر میں نہیں دیکھتے جن سے وہ وجود میں آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسی جزو کو "کُل" سمجھ کر ایک فریب مسلسل کا شکار رہتے آئے ہیں۔ اچھے ناولوں کی کمی دراصل صحت مند اور سائینٹفک نقطۂ نظر کا نہ ہونا ہے۔ "ناول" زندگی کے "کُل" کا احاطہ چاہتا ہے اور ہم زندگی کی جزئیات کو کُل سمجھ بیٹھے ہیں۔ اُردو کے بعض ناول نگاروں نے ناول کے ان تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، لیکن بحیثیتِ مجموعی اُردو ناول منشی پریم چند سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ میں اُردو ناول کے مستقبل سے مایُوس نہیں ہوں، لیکن آج کل اُردو ناول کے نام سے جو چیزیں چھپ رہی ہیں ان کی افراط و تفریط سے پریشان ضرور ہوں۔

کشمیری زبان میں ناول تو کیا، افسانے کی ابتدائی شکل کی تلاش کرنا بھی سعیِ لاحاصل ہے۔ یہ زبان اتنی عدم توجہی اور لاپروائی کا شکار رہی ہے کہ آزادی کے بارہ سال بعد بھی اس زبان میں کوئی ماہنامہ یا ہفتہ وار اخبار شائع نہیں ہوتا۔ ابھی تک اس کے رسم الخط کا مسئلہ بھی حتمی طور طے نہیں ہوا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس زبان میں مختلف اصنافِ سخن کا عدم وجود اس زبان کی تنگ دامنی اور کم مائگی سے زیادہ اہلِ نظر کی کم نظری اور اہلِ سخن کی عدم توجہی کا نتیجہ ہے۔ گذشتہ آٹھ دس سال سے کشمیری زبان میں لکھنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور اس زبان کے [illegible]

کی شعوری کوشش یہ رہی ہے کہ کشمیری زبان میں مختلف اصنافِ سخن اور اسالیبِ بیان کو رواج دیا جائے۔ کشمیری افسانے کا وجود اسی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔ اختر محی الدین، امین کامل، علی محمد لون، صوفی غلام محمد، امیش کول، بھارتی اور دیگر نوجوان فن کاروں کی کاوشوں نے کشمیری افسانے کے شاندار مستقبل کے لئے راہیں ہموار کر دی ہیں اور یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ کشمیری افسانے کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں اور کئی ایک اشاعت کے مرحلے طے کر رہے ہیں۔ اپنی زبان کی کم مائگی کا شدید احساس اور پھر اپنی زبان سے محبت کا بے پناہ جذبہ کشمیری زبان کے مستقبل کے لئے ایک نیک فال ہے۔ اور اگر کشمیری ادیبوں کی کوششیں اسی سرگرمی کے ساتھ جاری رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مستقبل قریب میں یہ زبان اپنے ادبی اثاثے پر فخر نہ کر سکے۔ کشمیری زبان میں چونکہ نثر کی تاریخ کا آغاز افسانے کی ترویج کے ساتھ ہی ہوا ہے، اس لئے ابھی تک کشمیری نثر کا کوئی واضح اسلوب یا اسٹائل نہیں اُبھرا ہے۔ ہر رنگ ایک انفرادیت لئے ہوئے ہے اور ہر نقش ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ رنگوں کی یہ قوسِ قزح دل کش اور دل فریب ضرور ہے لیکن اس میں توازن کی کمی ہے۔ نثر کے لئے جس پُر وقار سنجیدگی کا ہونا ضروری ہے وہ ابھی تک پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ یہ سب چیزیں رفتہ رفتہ آ ہی جائیں گی اور اس کے لئے بے صبر ہونے کی ضرورت نہیں ہے لیکن خود ادیبوں میں ایک بے چینی اور بے صبری کی کیفیت پائی جاتی ہے اور وہ صدیوں کی محرومی اور نامرادی کی تلافی چند سال میں کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک جست میں اس منزل کو پا لینا چاہتے ہیں جس کے لئے دیگر زبانوں کو صدیوں ریاض کرنا پڑا۔ افسانے کی ترویج کے فوراً بعد کشمیری زبان کے کچھ مہم پسند ادیبوں نے اس زبان میں ناول کا تجربہ کرنا چاہا ہے۔ ابھی تک دو ناول طبع ہو کر ہمارے سامنے آ چکے ہیں اور میری اطلاع کے مطابق کچھ اور حضرات نے بھی افسانے اور شاعری کی بجائے ناول نگاری پر اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ تجربے کی خواہش اور مہم پسندی بجائے خود کوئی خطرناک رجحان نہیں ہے لیکن اپنے پڑھنے والوں کے مزاج اور وقت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے صرف مہم پسندی کے لئے کوئی تجربہ کرنا ادب میں کوئی صحت مند رجحان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تجربے کی اہمیت اسی وقت بڑھ جاتی ہے جب یہ ایک تقاضے کو پیدا ہوا ہو اور اس میں مزاج اور ماحول کے باہمی تعلق کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہو۔ میں کشمیری زبان میں ناول لکھنے کا مخالف نہیں ہوں، بلکہ میرا عقیدہ ہے کہ جب تک کسی ادب میں اچھے ناول نہ ہوں، وہ عظیم ادب نہیں کہلا سکتا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے مزاج ابھی کشمیری ناول کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے مزاج کی بات رہنے دیجئے، خود ابھی کشمیری نثر نگاروں کے ذہن بھی ناول لکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناول میں خیالات کے اظہار اور واقعات کے بیان کرنے کے لئے زبان میں جو وسعت، گہرائی اور گیرائی ہونی چاہیئے وہ کشمیری زبان میں ابھی تک پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ رسم الخط کی دقت کی وجہ سے بہت کم لوگ ایسے ہیں جو آسانی سے کشمیری پڑھ سکتے ہوں۔ ان حالات میں ہمیں سب سے پہلے پڑھنے والوں کو ذہنی طور کشمیری پڑھنے کے لئے آمادہ کرنا چاہیئے۔ مختصر افسانے نے اس سلسلے میں کافی اہم کام کیا ہے، لیکن یہ کام ابھی ادھورا ہے۔ ابھی تک کشمیری افسانے سے محظوظ ہونے والوں کی تعداد صرف انگلیوں پر ہی گنی جا سکتی ہے، ہمارے پڑھنے والوں کی دنیا اتنی محدود ہے کہ کوئی مصنف اپنی کتاب کی چار سو (۴۰۰) کاپیاں بھی بیچ پائے تو اسے حیرت انگیز کامیابی تصور کیا جاتا ہے۔ ناول صرف ناول نگار سے ہی ریاض نہیں چاہتا، وہ پڑھنے والے سے بھی صبر اور سکون کا تقاضا کرتا ہے۔ کشمیری پڑھنے والا قاری ابھی اس صبر آزما مطالعے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ صرف اوّلیت کا اعزاز حاصل کرنے کے لئے ناول کا تجربہ ادب کے لئے بُرا نہیں، لیکن ادیب کے لئے نقصان دہ ضرور ہے۔ اس طرح فن کار، فن کو ثانوی درجہ دے کر تاریخی اہمیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اختر محی الدین اور امین کامل اسی کمزوری کا شکار ہو گئے ہیں۔ انہوں نے "ادبی عظمت" کا سودا کر کے "تاریخی اہمیت" حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اختر محی الدین کا "دود دگ" اور امین کامل کا "گٹہ منز گاش" تاریخی اعتبار سے ایک اہم کارنامہ ہیں، لیکن ان کی فنی اور ادبی قدر و قیمت بہت زیادہ نہیں ہے۔ اختر محی الدین کے ناول (اسے ناولٹ کہنا زیادہ موزوں ہوگا) میں ایک ادبی کارنامہ بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں، لیکن اختر کی جلد بازی اور اس کی سہل پسندی نے اسے ایک غیر معمولی ادبی تخلیق بنا دیا ہے۔ "دود دگ" کا موضوع اور اس کے کردار ہماری جیتی جاگتی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس میں ہماری زندگی کا عکس اور اس کی پاکیزگی

ہمارے سماج کا مکمل منظر نامہ اور اس کا خاکہ ، ہمارے کردار کی بلندی اور پستی ہمارے شعور کی پیچیدگیاں اور ہمارے لاشعور کی بھول بھلیاں سبھی کچھ ہے ، لیکن اس کے باوجود یہ ہماری معاشرت اور ہماری زندگی کی تصویر نہیں ہے ، آخر زندگی سے اتنے قریب ہونے کے باوجود زندگی کو نہیں پا سکے۔ یہ اس کے خلوص کا نہیں ، اس کے فن کا عجز ہے۔ ابن کاول کا ناول "گریٹر منز گاش" جو میرے اس مقالے کا موضوع ہے ، بقول ابن کاول "ایک نیم تاریخی حقیقت ہے"۔ ابن کاول کے الفاظ میں اس ناول کا موضوع ہندو مسلم اتحاد ہے اور انہوں نے ابتداء میں "گن ڈھ کتھ" (پہلی بات) کے عنوان سے تفصیل سے اُن مشکلات کا تذکرہ کیا ہے جو ایک نیم تاریخی حقیقت کو افسانے کے طور پر پیش کرنے میں درپیش آتی ہیں۔ کاول نے اپنے پڑھنے والوں کو خبردار کیا ہے کہ کسی تاریخی حقیقت یا واقعے کو ناول کا موضوع بنانے کے لئے اس میں کافی ترمیم ، تدوین اور اضافے کی ضرورت پڑتی ہے ، اس لئے میرے ناول میں تاریخی حقائق کی تلاش کرنا بے سود ہے ، بلکہ صرف اس تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھ کر اس کے پلاٹ ، کردار اور اس کی زبان پر بحث کی جانی چاہیئے۔ مجھے ذاتی طور پر کاول صاحب کے اس بیان سے اتفاق ہے اور میں اپنی بحث کو ان ہی حدود کے اندر رکھنے کی کوشش کروں گا۔

"گریٹر منز گاش" کا پس منظر سنہ ۱۹۴۷ء کا قبائلی حملہ ہے اور اس کا مرکزی خیال ہندو مسلم اتحاد ہے۔ بانڈی پورہ کے ایک شریف گھرانے کی لڑکی فاطمہ قبائلی حملے سے چند ماہ پہلے ملازمت کے سلسلے میں بارہ مولہ چلی جاتی ہے اس کے ساتھ بانڈی پورہ کا ایک بزرگ ولی بڈہ بھی روانہ کر دیا جاتا ہے۔ ولی بڈہ اور فاطمہ دونوں بارہ مولہ میں چند کمرے کرایے پر لے کر رہنے لگتے ہیں۔ فاطمہ دن بھر سکول جاتی ہے اور ولی بڈہ ٹوپیاں سیتا رہتا ہے۔ فاطمہ کے مکان کے نیچے رام کرشن نام کا ایک دکاندار دکانداری کرتا ہے جو ایک ہی مرتبہ فاطمہ کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ لیکن فاطمہ کو رام کرشن سے شدید نفرت ہوتی ہے اور ادھر رام کرشن اپنا سارا روزنہ دلی کے مشغلوں میں مشغول کر کے واپس ہو جاتا ہے۔ رام کرشن ایک مرتبہ بارہ مولہ کے ایک مشہور بزرگ سے متعلق وجاہت کا ذکر کرتا ہے۔ اتفاق سے جس مکان میں فاطمہ رہتی ہے وہ حسن لال کے باپ عزیز اللہ کا ہوتا ہے۔ حسن لال رام کرشن سے فاطمہ کے بے پناہ حسن کی تعریف سن کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ وہ مکان کی مرمت کے بہانے فاطمہ کے ہاں جاتا ہے اور فاطمہ کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ اس کے بعد فاطمہ سے خط و کتابت شروع کر کے اپنے عشق کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ فاطمہ کی شرافت اور بلندیٔ کردار کا یہ عالم ہے کہ وہ حسن لال کے خط کا جواب تو دیتی ہے لیکن اس پر یہ بات واضح کر دیتی ہے کہ وہ کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے جو کسی غیر مرد کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ شروع کرے۔ اگر حسن لال کو فاطمہ سے شادی کرنا مقصود ہے تو اُسے چاہیئے کہ اپنے باپ سے کہہ کر فاطمہ کے باپ سے سلسلۂ جنبانی کرے۔ اگر اس کے باپ کو یہ قبول ہو تو فاطمہ کو کوئی اعتراض نہیں۔ اس کے بعد سارا سلسلہ طے ہوتا ہے۔ فاطمہ کا باپ بانڈی پورہ سے آکر حسن لال کے باپ سے وعدہ کر لیتا ہے ---- اسی دوران میں قبائلی حملہ آور ریاست پر دھاوا بول دیتے ہیں اور وہ بارہ مولہ تک آ پہنچتے ہیں۔ فاطمہ اور ولی بڈہ اس اجنبی ماحول میں اور زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ ہفتے بھر تک سارے بارہ مولہ میں قیامت کا سماں بپا رہتا ہے اور اسی دوران میں رام کرشن اپنی جان کے خوف سے ایک رات کو فاطمہ کے ہاں پہنچ جاتا ہے۔ فاطمہ اپنی تمام نفرت اور حقارت کو بھول کر رام کرشن کو اپنے ہاں پناہ دیتی ہے۔ اس کے بعد ایک دن چند قبائلی فاطمہ کے مکان پر بھی حملہ کر دیتے ہیں۔ ولی بڈہ زخمی ہو جاتا ہے۔ رام کرشن فاطمہ کو بچاتے ہوئے گولی کا شکار ہو جاتا ہے اور فاطمہ قبائلیوں کی موجودگی میں رام کرشن کو اپنا خاوند جتاتی ہے۔ فاطمہ قبائلیوں کے چنگل سے بچ کر واپس آجاتی ہے اور رام کرشن اس کی گود میں جان دے دیتا ہے۔ فاطمہ حسن لال سے اس لئے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے کہ اس کا باپ عزیز اللہ قبائلی حملہ آوروں کی امداد و اعانت کرتا رہا تھا ---- وہ ہمیشہ کے لئے شادی کا ارادہ ترک کر کے بانڈی پورہ کے سکول میں استانی کے طور پر کام کرنے لگتی ہے ---- یہ ہے "گریٹر منز گاش" کی کہانی جسے مصنف نے بانڈی پورہ کے ایک ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر عبدالسلام کی زبانی کہلوایا ہے۔

ابن کاول نے اس ناول کے لئے جو فارم استعمال کیا ہے اس کے متعلق انہوں نے شروع میں کہا ہے "چونکہ ناول کشمیری ادب میں ایک نئی چیز ہے اس لئے مجھے ایک ایسے طرز یا فارم کی تلاش کرنی پڑی جو ہمارے لوگوں کو نامانوس معلوم نہ ہو۔ اس لئے میں نے ایک داستان گو کا اسلوب اختیار کیا۔ جسے ہمارے ہاں کے لوگ سال ہا سال سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔" کاول

صاحب کے ناول میں یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ داستان گو کون ہیں۔ وہ خود ہیں یا ماسٹر عبدالسلام، جن کی زبانی وہ کہانی سُن رہے ہیں۔ اگر مصنف خود داستان گو ہے تو پھر وہ مقصد پورا نہیں ہو پاتا جس کے لئے اس نے یہ طرز اختیار کیا۔ پرانی داستانوں میں داستان گو کہانی کا حصہ نہیں ہوتا تھا۔ اور "گنگا منز گاش" میں امین کا مل اس کہانی کے ایک اہم کردار ہیں۔ وہ اس کہانی کے کرداروں سے خود مل کر مواد فراہم کرتے ہیں۔ اور پھر عجیب اتفاق یہ ہے کہ وہ اس کہانی کے تقریباً سبھی اہم کرداروں سے ذاتی طور مل کر کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ماسٹر عبدالسلام سے ان کی ملاقات، ایک اتفاق سہی، لیکن اس کے بعد تو ناول صرف اتفاقات کے ہی سہارے آگے بڑھتا ہے۔ مجید، ولی بڈہ، جلہ صاحب، ڈاکٹر، نازکی، ان سب کے بغیر ناول مکمل نہیں ہو سکتا اور مصنف صرف چند گھنٹوں کے سفر میں ہی ان سے مل کر ناول کو اختتام تک پہنچا دیتا ہے۔ اس لئے مصنف اُس داستان گو سے مختلف ہے جو داستان سُناتے سُناتے ایک ایسی فضا پیدا کر دیتے تھے کہ سُننے والے یہ جانتے ہوئے بھی کہ داستان گو ایک سُنی سُنائی بات کہہ رہا ہے، اس کی ہر بات کا یقین کر لیتے تھے۔ "گنگا منز گاش" میں مصنف کی ہر بات کو صحیح ماننے میں قدرے تامل ہوتا ہے۔ اگر ماسٹر عبدالسلام کو، جس کی زبانی خود مصنف ابتدائی قصہ سُن رہے ہیں، داستان گو مان لیا جائے تو بہت سی مشکلیں حل ہو جائیں گی۔ ماسٹر عبدالسلام کے بات کہنے کا انداز واقعی ایک داستان گو کا انداز ہے اور پھر کہانی کے اختتام تک یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ اس سارے قصے سے خود بھی متعلق ہیں۔ لیکن ماسٹر عبدالسلام بھی کبھی کبھی "داستان گو" کی حدود سے باہر ہو کر خود کہانی کے کردار بن جاتے ہیں اور اس طرح پڑھنے والوں کے اعتقاد اور اعتبار کو دھچکا لگتا ہے۔ مثلاً وہ کہانی بیان کرتے کرتے فاطمہ کے اندرونی جذبات اور اس کی داخلی کشمکش کی تصویر یوں کھینچ دیتے ہیں کہ اس کا یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ کہانی کی جزئیات بیان کرتے ہوئے کبھی اس درجہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ ساری کہانی ماسٹر جی کی اختراع ہے۔ مثلاً وہ اُس خط کا مضمون حرف بہ حرف سُنا دیتے ہیں جو فاطمہ نے حسن لالہ کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ ایک جگہ وہ قرآن شریف کی وہ آیت بھی سُنا دیتے ہیں جو فاطمہ نے انتہائی پریشانی کے عالم میں اپنے دل میں پڑھی تھی۔ اور پھر انتہا یہ کہ وہ بڑی تفصیل سے فاطمہ کے بچپن کے اُن واقعات کو بیان کرتے ہیں جو فاطمہ اپنے تصور میں دیکھ لیتی ہے۔ اور اس قسم کی باتیں وہ ماحول پیدا کرنے میں مانع ہوتی ہیں جس میں بیان کرنے والے کو پڑھنے والے یا سُننے والے کا مکمل اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ دوسری بات جو اس اعتماد، اعتبار اور ایقان کی فضا قائم نہیں ہونے دیتی، اس ناول کا Time period ہے۔ یہ ساری کہانی صرف چند گھنٹوں میں مکمل ہوتی ہے اور اس کے مکمل کرنے میں واقعات کی رفتار سے زیادہ مصنف نے اپنے گفتار سے کام لیا ہے۔ مصنف کی گاڑی بانڈی پورہ جاتے ہوئے ایک جگہ پر فیل ہو جاتی ہے۔ ڈرائیور گاڑی کی مرمت کرنے لگتا ہے اور مصنف ساتھ کے گاؤں میں اپنا جسم گرم کرنے کے لئے چلا جاتا ہے۔ جتنی دیر میں ڈرائیور گاڑی ٹھیک کر لیتا ہے، مصنف ماسٹر عبدالسلام سے ساری داستان سُن کر واپس آ جاتا ہے اور لُطف کی بات یہ ہے کہ یہ ساری داستان عین اُس وقت ختم ہو جاتی ہے جب گاڑی کا ہارن بجنے لگتا ہے — اور یہی نہیں، کہانی کے باقی کردار اس کے بعد گاڑی میں مصنف کو مل جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ڈھائی تین گھنٹے میں یہ سب ممکن ہو سکتا ہو، لیکن پڑھنے والا یہ سب کچھ قبول نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ اتفاقات سے زیادہ واقعات اور حادثات پر یقین کر لیتا ہے اور پھر جب سارا ناول اتفاقات سے بھرپور ہو تو ناول کا ارتقا واقعات سے زیادہ مصنف کے زورِ قلم کا مرہونِ منت ہو جاتا ہے اور "گنگا منز گاش" میں یہ سقم کافی نمایاں ہے۔

اس ناول کا مرکزی خیال، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ہندو مسلم اتحاد ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب سارا ہندوستان فرقہ پرستی، تعصب اور مذہبی جنون کی آگ میں جل رہا تھا، کشمیر میں ہندو اور مسلمان بھائیوں کی طرح رہ رہے تھے۔ جب برِصغیر ہند و پاکستان میں انسانیت دم توڑ رہی تھی تو باپو نے کہا تھا کہ — "اس اندھیرے میں اگر مجھے کہیں سے روشنی کی کرن دکھائی دیتی ہے تو وہ کشمیر ہے —" روشنی کی یہ کرن ایک اتفاق یا حادثہ نہیں تھی۔ یہ وہ شمع تھی جو رشیوں، منیوں اور صوفیوں نے صدہا سال پہلے روشن کی تھی۔ مذہبی رواداری، بھائی چارے اور سماجی انصاف کی روایات چند سال میں قائم نہیں ہوتیں۔ ان کی بنیادیں اس تہذیب

اور کلچر میں نظر آئیں گی جیسے للہ دید، شندہ ریش، پرمانند، رسول میر اور مہجور نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اگر کشمیریوں کو اُس حیوانیت نے مغلوب نہیں کیا جس نے سارے ہندوپاکستان کو دبوچ لیا تھا تو اسے محض ایک اتفاق کہہ کر ٹالنا ایک تاریخی غلط بیانی ہوگا۔ قبائلی حملے نے ثابت کر دیا کہ یہ قوم آگ سے دُور رہ کر ہی اپنے آپ کو بچانے کی اہل نہیں، بلکہ آگ میں گھر کر بھی اپنے ماضی اور اپنی روایات کا تحفظ کرنا جانتی ہے۔ قبائلی درندوں نے اوڑی، بارہ مولہ، سوپور، پٹن اور بانڈی پورہ کے مسلمانوں کو ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ وہ مسلمانوں کو کافروں سے نجات دِلانے کے لئے آئے ہیں۔ یہ ایک سخت ترین امتحان تھا۔ لیکن کشمیری اس امتحان میں بھی پُورے اُترے کشمیری مسلمانوں نے اپنے ہندو اور سکھ بھائیوں کو اپنی زندگی کی قیمت پر بھی محفوظ رکھنے کی سعی کی۔ قبائلیوں نے [illegible] مسلمانوں کا یہ عدمِ تعاون دیکھ کر انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ مسلمانوں کے گھروں کو لُوٹا گیا۔ ان کی عورتوں کی بے عزتی ہوئی اور شہید شیروانی کا سینہ گولیوں کی بوچھاڑ سے چھلنی کر دیا گیا۔ شہید شیروانی کی موت ہندو مسلم اتحاد کی اُن عظیم روایات کی زندگی تھی جنہیں ہم صدیوں سے اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ شیروانی کی موت کشمیر کی تاریخ میں سب سے زیادہ قابلِ رشک موت ہے۔ امین کامل نے اسی پس منظر میں کشمیریوں کے جذبۂ رواداری اور بھائی چارے کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اُن کے خلوص اور ان کے نیک ارادوں پر شک نہیں، انہوں نے بڑی محنت اور لگاؤ سے اس جذبے کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس نے ساری دُنیا میں ہمارا سر اُونچا کر دیا ہے۔ لیکن کامل صاحب اپنے خلوص اور اپنی دیانت کے باوجود اس جذبے کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب نہیں رہے ہیں۔ پس منظر اتنا عظیم الشان ہے کہ کامل صاحب کی کاوشیں بڑی حقیر اور ناچیز نظر آرہی ہیں — یُوں سمجھ لیجئے کہ تاج محل کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے کوئی شخص تاج محل کا ماڈل بنا کر اس کی نمائش کرے۔ کامل صاحب نے فاطمہ اور رام کرشن کو ہندو مسلم اتحاد کے مظہر بنا کر پیش کیا ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ نہ فاطمہ اس رُوح کی نمائندہ ہے اور نہ رام کرشن اس جذبے کا مظہر — فاطمہ تو دیوی ہے۔ وہ تو زمین و زماں سے پرے کسی اور ہی دُنیا کی رہنے والی ہے۔ وہ اگر بانڈی پورہ یا بارہ مولہ کی بجائے نواکھلی یا مغربی پنجاب میں بھی ہوتی تو وہ اتنی ہی بلند اور پاکیزہ ہوتی۔ اس کی انسانیت اور شرافت، اس کی رُوح کی عظمت اور اس کے کردار کی بلندی کسی مخصوص زمین یا آب و ہوا کی پیداوار نہیں — وہ انسانوں کے دیش میں رہنے والی فرشتہ تھی۔ وہ انسانوں کی نمائندہ کیسے ہو سکتی ہے؟ رام کرشن کے ہاں اس جذبے کی عظمت کا کہیں گمان تک نہیں ہوتا ہے جس کا وہ نمائندہ قرار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ہندو کہہ کر قبائلیوں کے ہاتھ سے نہیں بچ سکتا تھا۔ وہ فاطمہ کا دفاع اس لئے کرتا ہے کہ فاطمہ نے اُسے اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ وہ فاطمہ کو اس لئے بھی بچانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ ایک مرد تھا۔ وہ اس لئے بھی قبائلی پوچھتے ہیں تو فاطمہ اسے اپنا شوہر کہتی ہے تو رام کرشن کا ذہن ایک نفسیاتی کش مکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھُولنا چاہیئے کہ رام کرشن فاطمہ سے محبت کرتا تھا اور یہ محبت خالص جنسی محبت تھی جس پر تصوّف یا افلاطونی عشق کا گمان نہیں کیا جا سکتا تھا! اس طرح رام کرشن کا کردار کسی ایسے جذبے کا مظہر قرار نہیں دیا جا سکتا جو ہمارے مزاج، کلچر اور ہماری روایات کا نمائندہ ہو۔ تمام ناول میں اس جذبے کا کوئی ذکر نہیں جو اس نازک دَور میں کشمیری من حیث القوم ہر محاذ پر کر رہے تھے۔ قبائلی حملے نے جہاں ہمارے سیاسی، معاشی اور اقتصادی نظام کو درہم برہم کر دیا وہاں ہمارے خوابیدہ احساس کو بھی جگا دیا۔ کشمیر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہاں کے ننھے بچے، جوان اور بوڑھے حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے لئے کفن بردوش نکلے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد اب ایک سیاسی نعرہ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ ایک سوالیہ علامت بن کر ہمارے سامنے آیا تھا۔ اور ہمیں فخر ہے کہ اس نازک امتحان کی گھڑی میں بھی ہمارے آدرش کا پرچم بڑی آن بان سے لہراتا رہا۔ "گلریز نگاش" میں اس ساری قومی جدوجہد کو ایک انفرادی واقعے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس ناول کی ساری کہانی بارہ مولہ میں شروع ہو کر یہیں اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اس ناول میں کسی شیروانی کا ذکر نہیں۔ شیروانی سے مُراد مقبول شیروانی سے نہیں۔ اور میں اس بات پر اصرار نہیں کرتا ہوں کہ اس کا ذکر کیا جانا ضروری ہے۔ لیکن شیروانی واقعی اس پاک اور ارفع جذبے کا نمائندہ ہے جسے امین کامل نے فاطمہ یا رام کرشن کی صورت دینے کی کوشش کی ہے۔

تعبیر

جو صرف اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے بھائی بندوں اور اپنے وطن کی آزادی کی حفاظت کے لئے بھی آگ میں کود گئے۔ "گرمنز گاش" میں ان لوگوں کا وجود ہی عنقا ہے، یہ ایک بہت بڑی فروگذاشت ہے، یہ صحیح ہے کہ ناول میں تاریخی حقیقتوں کی تفصیل تلاش کرنا ممکن نہیں۔ لیکن ناول میں تاریخی حقیقتوں کو جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا۔ اگر عزیز اللہ جیسے غداروں نے ملک اور قوم کی آبرو بیچنے کے لئے سب کچھ کیا، تو ایسے نوجوانوں کی بھی کمی نہیں ہے جنہوں نے ملک کی آزادی کو بچانے کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ "گرمنز گاش" کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سبھی کردار فرشتے ہیں یا شیطان، انسانوں کی اس پر پرچھائیں بھی نہیں پڑی ہیں۔ اسلئے اس کا ماحول بھی مابعد الطبعیاتی معلوم ہوتا ہے۔ "گرمنز گاش" کے یہی مافوق الفطرت کردار اس ناول کی سب سے بڑی کمزوری ہیں۔ فاطمہ کے کردار پر کامل صاحب نے غیر معمولی محنت کی ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہی کردار پیش کرنے کے لئے یہ سارا ناول لکھا گیا ہے۔ ناول کی ساری کہانی فاطمہ ہی کے گرد گھومتی ہے اور اس کی روح کی عظمت کو اجاگر کرنے کے لئے کامل صاحب نے اپنا سارا زورِ بیان اور زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔ انہوں نے فاطمہ کے ساتھ ہر وہ خصوصیت وابستہ کی ہے جس کے سزاوار صرف آسمان کے فرشتے ہی ہو سکتے ہیں۔ ابتدا میں وہ اپنے تخیل کی مدد سے فاطمہ کا جو سراپا پیش کرتے ہیں، وہ کامل صاحب کے حسنِ تخیل کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ فاطمہ کے "عظیم روح" کی جھلک فاطمہ کے نمودار ہونے سے پہلے ہی دکھائی دیتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف فاطمہ کی عظیم انسانی روح کو پیش کرنے سے پہلے اپنے سامعین کو ذہنی طور تیار کرنا چاہتا ہے، اُسے خود اس بات کا احساس ہے کہ "فاطمہ اتنی بلند، پاکیزہ اور فرشتہ سیرت ہے" کہ انسانی ذہن اسکے وجود کو آسانی سے تسلیم نہیں کر سکتا، اسی لئے وہ بار بار اس "عظیم انسانی روح" کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جو فاطمہ کے وجود میں پیش کی جاتی ہے

فاطمہ ہندی ورے کے ایک غریب گھرانے کی نوجوان لڑکی ہے جو قبائلی حملے سے چند ماہ پہلے ملازمت کے سلسلے میں بارہمولہ چلی جاتی ہے۔ فاطمہ کا تعارف مسٹر عبدالسلام یوں کراتے ہیں:-

"فاطمہ کم عمر تھی اور غیر شادی شدہ، اور پہلی مرتبہ اپنے گھر سے باہر جا رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فاطمہ بڑی شریف اور باسلیقہ لڑکی تھی، مذہب کی اتنی سخت پابند تھی کہ عمر کے تقاضے کے لحاظ سے حیرت ہوتی تھی، جوانی میں پابندی سے پانچ وقت نماز پڑھنا اور صبح شام قرآن شریف کی تلاوت کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔"

فاطمہ سے یوں مختصر تعارف کے بعد بارہمولہ میں ہمیں فاطمہ کے کردار کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ فاطمہ میں عام لڑکیوں سی کوئی بات نہیں پائی جاتی وہ ایک سنجیدہ، متین اور بڑی خاموش سی لڑکی ہے۔ نوجوانی میں جو شوخی، ترنگ اور شرارت آمیز حیا لڑکیوں میں ہوتی ہے، وہ اس سے بالکل عاری ہے، وہ سکول جاتی ہے، اور سکول سے واپس آکر کھانا پکاتی ہے۔ یہی اس کی کُل کائنات ہے اس کی کوئی سہیلیاں نہیں ہیں، اور وہ اپنے ماحول سے مطمئن نظر آتی ہے کبھی کبھی اُسے "رام کرشن" کے گانے اور گنگنانے سے بھی اُلجھن ہو جاتی ہے اور وہ صرف اسی لئے ترکِ مکان کا بھی ارادہ کر دیتی ہے۔ وہ ولی بڈہ کے ذریعہ رام کرشن کو پیغام بھی بھجوا دیتی ہے کہ یوں گاتے رہنا اچھا نہیں لگتا۔ آخر اس کے پڑوس میں عورتیں بھی رہتی ہیں، وہ ایک مرتبہ سنجیدگی سے ولی بڈہ کو دوسرا مکان تلاش کرنے کے لئے کہتی ہے۔ فاطمہ کی زندگی میں کوئی تلاطم، کوئی ہیجان کوئی کشمکش یا اونچ نیچ نہیں، وہ مشین کی طرح کھانا پکاتی ہے اور سکول جاتی ہے۔ پانچ وقت نماز پڑھتی ہے، اور صبح شام قرآن شریف کی تلاوت کرتی ہے ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیسی لڑکی ہے کہ جسے کوئی اُمنگ، کوئی جذبہ، کوئی خواہش اور کوئی لغزش چھو تک نہیں گئی ہے، اس عمر میں جنسی جذبے کی اُٹھان نوجوان لڑکیوں میں ایک نامعلوم اور عجیب تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن فاطمہ کے وجود میں اس تبدیلی کا کوئی اثر نمایاں نہیں ہوتا ہے۔ بارہمولہ کا رئیس زادہ حسن لال جو پہلی ہی ملاقات میں الف لیلے کے شہزادوں کی طرح اس پری چہرہ پر دل و جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے، جب فاطمہ سے پہلی مرتبہ اظہارِ محبت کرتا ہے، تو فاطمہ گھبرا جاتی ہے، پریشان ہو جاتی ہے اور رونے لگتی ہے، ایک لمحے کے لئے وہ اپنے کو بھول جاتی ہے۔ اس کے خوابیدہ احساس میں ایک ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے پہلی بار احساس ہوتا ہے کہ اس کی جوانی اور اس کا حسن کسی مرد کو متاثر بھی کر سکتا ہے، اپنی جوانی کا غرور اسے ایک لمحے کے لئے۔۔۔ صرف ایک لمحے کے لئے۔۔۔ اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ لیکن فوراً ہی فاطمہ

کے دل پر گہرا اثر واحد ہی غلبہ کرتا ہے، اور وہ حسن لال کو ایک ایسی چھٹی لکھتی ہے، جو صرف فاطمہ لکھ سکتی ہے، دنیا کی کوئی نوجوان لڑکی نہیں لکھ سکتی ہے، یہی فاطمہ کی بلندی ہے اور یہی اس کی پستی بھی۔ فاطمہ حسن لال کو لکھتی ہے کہ میں اور لڑکیوں کی طرح خط و کتابت کرنا پسند نہیں کرتی، میں کنواری ہوں، مجھے اپنے ماں باپ کی عزت کا بہت خیال ہے، اگر آپ واقعی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو میرے ماں باپ کو لکھئے، اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو، تو مجھے بھی کوئی عذر نہیں ہوگا۔ مجھے بھی بڑی خوشی ہوگی —" فاطمہ کی عمر کی نوجوان لڑکی ایسا خط نہیں لکھ سکتی، یہ میرا ایمان ہے، یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس خط کو پڑھ کر جلا دے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے، اور اس کا جواب تک دینا بھی گوارا نہ کرے۔ لیکن وہ "اتنا" "کتابی" جواب دینا کہاں سیکھے گی۔ جتنا فاطمہ نے حسن لال کے خط کے جواب میں لکھا ہے، یہ ناممکن ہے — لیکن میں نے کہا ہے کہ فاطمہ تو فرشتہ تھی، اُس سے ہر بات ممکن تھی! مجھے فاطمہ کی شرافت، اس کی مذہبیت اور اس کے بلند کردار پر شک نہیں، لیکن اس کے انسانی کردار ہونے پر شک ضرور ہے، جوانی کا اپنا ایک مذہب ہوتا ہے، اور اس کی شرافت کی اپنی قدریں ہوتی ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ فاطمہ کسی سے عشق کیوں نہیں کرتی، یا وہ حسن لال سے خط و کتابت کیوں نہیں کرتی، لیکن اس کے دل میں وہ جذبات کیوں مفقود ہیں، جو ایک اوسط درجے کی نارمل لڑکی میں ہوتے ہیں، جب بچہ اپنی کم عمری میں ہی بزرگی اور پختگی کے آثار ظاہر کرتا ہے، تو نفسیات کی اصطلاح میں اس بچے کو ABNORMAL قرار دیا جاتا ہے۔ فاطمہ ذہنی لحاظ سے ABNORMAL اور جنسی لحاظ سے SUB NORMAL ہے وہ ہمارے ماحول کی صحیح نمائندہ قرار نہیں دی جاسکتی — فاطمہ کی جنسی نفسیات کا آپ نے مطالعہ کیا، اب اس کی ذہنی پختگی اور اس کا سیاسی شعور ملاحظہ کیجئے۔

جب قبائلی حملہ آور بارہمولہ تک آ پہنچتے ہیں، اور فاطمہ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے منگیتر حسن لال کا باپ عزیز اللہ ان کی رہنمائی کرتا ہے تو وہ فلمی ہیروئنوں کی طرح حسن لال کو دھتکار دیتی ہے، گولیوں کی بوچھاڑ میں جب حسن لال فاطمہ کو اپنے گھر لیجانے کے لئے اس کے ہاں آتا ہے تو فاطمہ اسے کہتی ہے کہ میں قبائلیوں کے ہاتھوں مرنا پسند کروں گی، لیکن اس کے گھر میں قدم نہیں رکھوں گی۔

حسن لال اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں خود بھی اپنے باپ کی حرکتوں سے نالاں ہوں، مگر کیا کر سکتا ہوں، میں اس کا مقابلہ کروں، تو وہ جائداد سے بیدخل کر دیگا — حسن لال ایک بے عمل اور بزدل نوجوان ہے، اور فاطمہ اس کی غیرت اور عزت کو للکارتی ہے، لیکن بے سُود!

فاطمہ کے کردار میں یہ غیر معمولی تبدیلی کیوں اور کیسے پیدا ہوئی اس کا سُراغ لگانا آسان نہیں۔ اس شریف الطبع اور مذہب کی پابند لڑکی سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اپنی عزت اور آبرو کو خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اور اپنے منگیتر کے ساتھ جانے کے لئے تیار نہ ہو۔ فاطمہ کے کردار کی یہ رفعت قابل تعریف ہے۔ لیکن ذہن یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ اتنی بڑی تبدیلی آنِ واحد میں آسکتی ہے فاطمہ جب قبائلی حملہ آوروں کے دوبدو ہو جاتی ہے تو وہ ایک بار پھر اپنی جرأت، ہمت اور بلند نظری کا مظاہرہ کرتی ہے۔ قبائلی جب رام کرشن پر حملہ کرتے ہیں، تو وہ فوراً کہہ اُٹھتی ہے کہ:-

"یہ میرا خاوند ہے، میں اس کی بیوی ہوں، مجھے —" یہی ایک سانحہ اس ناول کا کلائمکس قرار دیا جاسکتا ہے، اور اسی کی بنیاد پر مصنف نے فاطمہ کے کردار کی بلندی، اس کے روح کی عظمت اور ہندو مسلم اتحاد کی روایات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کے بعد فاطمہ رام کرشن کی تعریف یوں کرتی ہے: "خان یہ تمہاری طرح حسین نہیں ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر انسانیت کا نُور ہے، اس کے پیچھے انسانی تہذیب کی ہزاروں سالہ تاریخ ہے"

یہ سارا واقعہ اپنے اندر بڑی ڈرامائی کیفیت رکھتا ہے۔ فاطمہ جو رام کرشن سے بے پناہ نفرت کرتی ہے، اس مرحلے پر اُسے اپنا خاوند بتاتی ہے، اس کی زبان سے ایسے مکالمے ادا ہوتے ہیں، جو صرف سٹیج پر ادا کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس سارے واقعے کی منطقی توجیہہ کیونکر کی جاسکتی ہے۔ فاطمہ رام کرشن کو اپنا بھائی بھی ظاہر کر سکتی تھی، اس سے رام کرشن کو اپنا خاوند ظاہر کرنے سے کہانی کا کلائمکس تو بن گیا۔ لیکن خود فاطمہ کے کردار میں کئی گرہیں پڑ گئیں۔ فاطمہ کو کشمیری عورتوں کی نمائندہ کردار بنانے کے لئے اس سے یہ مکالمے بھی ادا کروایا جاتا ہے۔ "ہم کشمیری ایک بار

اپنا خاوند کہتی ہیں، اُسی کی رہتی ہیں، ہم کشمیری عورت ہیں"؟

سٹیج پر یہ مکالمے سامعین کو متاثر کرسکتے ہیں، لیکن ایک مسلسل ناول جس کا ایک ارتقا ہو، اور جس کے کردار اپنی ایک انفرادیت رکھتے ہوں، میں اس قسم کے جملے نعرے بازی سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ مان لیجئے کہ فاطمہ نے ایک شدید جذباتی کیفیت میں رام کرشن کو قبائلیوں سے بچانے کے لئے اپنا خاوند کہا۔ اس کو تو کسی حد تک قبول بھی کیا جا سکتا ہے، اور اس کی کوئی توجیہہ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن فاطمہ تو قبائلیوں کے اخراج کے بعد ہندوستانی فوجی افسر سے بھی یہی کہتی ہے کہ "میرے خاوند کو جلانے کا انتظام کیا جائے" وہ اس کے بعد حسن لال سے شادی کرنے سے انکار کرتی ہے۔ یہی نہیں وہ ہمیشہ کے لئے شادی کا ارادہ ترک کرکے بانڈی پور کے گرلز سکول میں پھر سے پڑھانے لگتی ہے۔ اسے فاطمہ کے کردار کی بلندی کہئے یا اس کے روح کی عظمت، لیکن اسے کشمیری عورت کے کردار کی عکاسی کہنا ایک ناقابل قبول مبالغہ ہوگا۔ میں نے بار بار کہا ہے کہ فاطمہ کے کردار میں کوئی بھی انسانی خصوصیت شامل نہیں ہے، وہ ہر قسم کی انسانی کمزوریوں سے مبرا ہے۔ وہ بانڈی پور کی پیداوار نہیں مصنف کے ذہن کی پیداوار ہے، اس کا اپنا کوئی کردار یا نشوونما نہیں، وہ ناول نگار کے ہاتھوں کا ایک کھلونا ہے، وہ جہاں اور جس مرحلے پر چاہے شطرنج کے مہرے کی طرح اسے رکھ دیتا ہے، وہ کٹھ پتلی کی طرح اس کی ہر حرکت اور جنبش کا خالق ہے۔ اور اس لحاظ سے فاطمہ "گٹہ منز گاش" کا کمزور ترین کردار ہے۔ فاطمہ کے متعلق ایک اور کردار ولی بڈہ کا یہ فقرہ بڑا ہی معنی خیز اور بلیغ ہے۔ "فاطمہ حسن چھہ سِرّ خدا۔ یوت تام سیٹھاہ کم لوکھ چھہ داتان" — مصنف اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے — "میانی زکن دوتن نہ غلط کینہہ تہ" فرشتوں کی اس کائنات میں دوسرا فرشتہ خود ماسٹر عبدالسلام ہے، جو فاطمہ کی داستان بیان کرتا ہے۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں مصنف سے اس قدر گھل مل جاتا ہے کہ چند ہی گھنٹوں کے اندر اندر اُسے اپنی زندگی کی ساری حکایت بیان کرتا ہے، وہ خود ہی نہیں بلکہ اس کے بچے بھی کلام نادم، پنج گنج اور اسرارِ خودی کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے پاگل لڑکے مجید سے بھی بڑے ادب اور تعظیم سے بات کرتا ہے وہ قبائلیوں سے بھی آزردہ یا ناراض نہیں، حالانکہ وہ اپنی آنکھوں سے انکی بربریت دیکھ چکا ہے، وہ ان کی درندگی کی بھی توجیہہ کرتا ہے۔ اس کا لڑکا مجید مخبوط الحواس ہونے کے باوجود بڑا شائستہ ہے، وہ کوئی بدتمیزی یا بے ادبی نہیں کرتا، صرف اپنی محبوبہ کے بارے میں پوچھتا رہتا ہے، ماسٹر عبدالسلام کا گھرانہ ایک دیہاتی گھرانے سے زیادہ شہر کا ایک مہذب اور متمدن گھرانا معلوم ہوتا ہے، اور یہ مصنف کے تخیل کا اعجاز ہے۔ حسن لال اور ولی بڈہ صرف فاطمہ کے کردار کو نمایاں کرنے کیلئے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کو اپنی کوئی انفرادیت نہیں۔ رام کرشن ہماری زندگی سے قریب تر ہے، لیکن اس کا فاطمہ پر پہلی ہی نظر میں فریفتہ ہو کر ہنسنا، کھیلنا بھول جانا اور اپنی شخصیت میں اتنی بڑی تبدیلی پیدا کرنا الف لیلیٰ کا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ رام کرشن اس میں سنسان اور سنجیدہ ماحول میں ایک Relief کا کام دیتا ہے۔ اس کے ہاں انسانی کمزوریاں بھی ہیں، حسرتیں بھی اور لغزشیں بھی!

مجموعی حیثیت سے یہ ناول ایک طویل افسانہ ہے اگر ماسٹر عبدالسلام کی داستان سرائی اور مصنف کی حاشیہ آرائی کو نکال دیا جائے، تو اس کہانی کا تاثر زیادہ شدید اور دیرپا ہوگا، مصنف نے کہانی کو اختتام تک پہنچانے کے لئے حیرت انگیز مبالغے سے کام لیا ہے، ولی بڈہ کا ملنا، نازکی صاحب سے فاطمہ کے متعلق مزید معلومات فراہم کرنے اور پھر فاطمہ کو ماسٹر عبدالسلام کی اپنی بیٹی ثابت کرنا انتہائی غیر ضروری تھا، اور پھر ایسا کرنے سے کہانی میں وہ چیز باقی نہیں رہی ہے، جو پڑھنے والے کو بہت دیر تک متاثر رکھتی ہے۔ کہانی کو وہیں ختم ہو جانا چاہیئے تھا، جہاں ماسٹر جی نے اسے ختم کر دیا تھا۔ مصنف کی تحقیق نے کہانی کو صرف ایک تھیسس بنا کر رکھ دیا، جس میں شروع سے آخر تک فاطمہ کے "عظیم انسانی روح" کے مختلف پہلو پیش کئے گئے ہیں۔ فنی نکتہ نگاہ سے مصنف کا کہانی کی ابتداء میں فاطمہ کے کردار اور اس کے سراپا کا خاکہ پیش کرنا بھی مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا اس سے پڑھنے والے کو شروع میں ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ فاطمہ کا کردار کیسا رہا ہوگا؟

"گٹہ منز گاش" کشمیری زبان کا دوسرا ناول ہے، کشمیری ادب میں اسکا کیا مقام ہوگا، اس کا فیصلہ آنے والا مؤرخ ہی کر سکے گا، لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ ادبی اہمیت سے زیادہ اپنی تاریخی اہمیت کے اعتبار سے ہی یاد کیا جائے گا۔

سید سرتاج عالم عابدی

موہن داس گاندھی

(۱)

مہا گجرات کے خطہ میں جو ایک پور بندر ہے
وہاں کی سرزمیں بھی اپنی قسمت کی سکندر ہے
تولدگاہ گاندھی جی کی، اس قصبہ کے اندر ہے
کپاس اُگتی ہے جس پرؔ اور کنارہ پر سمندر ہے
مقدس ہے زمیں جس پر کہ ایسی آتما آئے
بلندی پر فلک کی ابرِ رحمت بن کے چھا جائے

(۲)

وہ موہن داس گاندھی جس کا بچپن بھی ہے آئینہ
کدورت اور عداوت سے رہا جو پاک وہ سینہ
زباں جس کی صداقت کا نمونہ، دل بھی بے کینہ
وہی اِک ناتواں جس سے محبت سب کو دیرینہ
نہیں ہم میں پہ اس کی یاد ہر اِک دل میں باقی ہے
شرابِ ہوش دیتا ہے جہاں کو ایسا ساقی ہے

(۳)

گذاری زندگی جس نے سدا قوموں کی خدمت میں
جو افریقہ میں بیماروں کی رحمت تھا مصیبت میں
نہ جس کو عیش سے رغبت، نہ دلچسپی تھی دولت میں
بھرا تھا جذبۂ قومی خدا نے جس کی فطرت میں
وہ رہبر آنجہانی ہند کا روشن ستارا تھا
چراغِ بے کساں تھا اور غریبوں کا سہارا تھا

(۴)

نحیف و نزار ہستی اور پھر جیلوں کی سختی میں
نہیں دِقت کوئی گو آدمی ہو تندرستی میں
وہ جنتا کے لئے تھا، جیل میں جنتا تھی مستی میں
نہ ویرانوں میں اس نے چین پایا اور نہ بستی میں
اس محسن کو ناتھو رام نے گولی سے مارا تھا!
جو پست اقوام اور دُکھیوں کی اُمیدوں کا تارا تھا

(۵)

اس کی یاد میں سرتاج ہم آنسو بہاتے ہیں
یہ گل ہائے عقیدت ہیں سمادھی پر چڑھاتے ہیں
کوئی گھر کو سجائے ہم تو مرقد کو سجاتے ہیں
گراں ہے بارِ فرقت کا جو ہم دل پر اُٹھاتے ہیں
اسی کے راستے پہ چل کے ہندستان ہو جنت
یہی ہے آرزو میری یہی ہے آخری منت

شفیقہ شہناز انجم

ہندوستانی لوک ناچ

(ایک اجمالی مطالعہ)

یہ ہندوستان کے دیہات ہی ہیں جہاں ہمارے پرکھوں اور بزرگوں نے کھیتی باڑی، تبنے کاتنے، دست کاری اور صنعت سے لے کر دیوی دیوتاؤں تک کی پوجا کی ہے۔ اپنے دکھ سکھ کا اظہار اپنے طریقے سے کرنا سیکھا اور اس کے اظہار کے لئے نت نئے وضع اختیار کئے۔ زندگی کے تمام رُخ اور حیاتِ کامران کے چہرے سے نقاب کشائی کا اُن کا اپنا انداز ہے جسے صدیوں کی گردشِ روزگار نے سنوارا اور نکھارا ہے اور جس پر اُن کے مقامی آب و ہوا اور جغرافیائی حالات کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ صدیوں کے قریبی اور سماجی تعلقات نے اُن میں یگانگت کا شعور پیدا کیا۔ جس کا اثر ہندوستان کے مختلف صوبوں کی اپنی مقامی تہذیب اور کلچر پہ نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے آرٹ، ادب اور تہذیبی کارناموں میں اُن کا اپنا مخصوص رنگ جھلکتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں کی تہذیب کی رنگارنگی اور بوقلمونی ہی اُسے دُنیا کے دیگر ممالک سے ممتاز بناتی ہے۔ اس معاملے میں ہندوستان خود ایک چھوٹی موٹی دُنیا ہے جہاں کی زبان، ادب اور کلچر کی رعنائی اپنی مثال آپ ہے۔ لوک ناچ بھی تہذیبی ترقی کے سلسلے کی ایک بنیادی کڑی ہے اور لوک ناچ کے سلسلے میں بھی ہندوستان اپنی دُنیا الگ بسائے ہوئے ہے۔

لوک آرٹ جیسے مرقع نگاری، لباس، دست کاری، گانے اور ناچ بھی تہذیب ہی کا حصہ ہیں جس کی ترقی میں زمانہ، حالات اور تاریخی عوامل کا ہاتھ ہوتا ہے اور جو مختلف ضروریات کے تحت پیدا ہوتی رہتی ہیں اور جس کی تخلیق میں مختلف قسم کے اذہان سرگرم کار رہتے ہیں۔ ان میں سے ناچ اور گانے ہندوستانی دیہاتوں کی تہذیبی زندگی کے بنیادی عناصر ہیں۔

لوک آرٹ اور روایات ہر جگہ [illegible] اور تہذیبی زندگی کے اہم عناصر سمجھے جاتے ہیں۔ امریکہ، روس اور چین میں تو دیہاتی زندگی کی احیا اور لوک روایات تعمیر میں نئی رُوح اور ایک نئی زندگی پھونکنے کی تحریک جاری ہے۔ رقاصوں، موسیقاروں اور تمثیل نگاروں نے بھی ہر جگہ اس سے گہری وابستگی اور دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ لوک آرٹ کی خوبیوں اور اس سے بڑھتی ہوئی دلچسپی کے عناصر کے تجزیے کے سلسلے میں شہری زندگی کی ہنگامہ آرائی اور تیز رفتاری کے ساتھ بڑھتی ہوئی مشغولیتوں کو نظر میں رکھنا ضروری ہے جس کے تحت انسانی زندگی مشین ہو کر رہ گئی ہے اور جو قدرت کی پیدا کردہ لطیف اور حسین چیزوں سے ہمیں دُور کرتی جا رہی ہے جس نے انسانی زندگی کو دُکھ سے بوجھل اور تکلفات سے بھرپور کر دیا ہے۔ لوک آرٹ ان تمام دُکھوں کا مداوا اور علاج ہے۔ لوک آرٹ کے ذریعہ ہی ہم زندگی کی سادگی، سچائی اور پیار سے ہم کنار ہوتے ہیں جسے شہری زندگی کی تکلفات نے دبا رکھا ہے اور جس پر ہر طرح کی ملمع کاری ہو چکی ہے اور جو پاؤڈر اور لپ اسٹک سے رنگی اور تھپی ہوئی کسی شاہد بازاری کی ہم نشین بن چکی ہے۔ فنِ تعمیر، زیورات، لباس، طریقِ گفتگو، طرزِ تحریر ہر شے میں سادگی اور صفائی ہی زندگی کو حسن سے معمور کرتی ہے۔ سادگی اور سچائی کی تمام خصوصیات لوک آرٹ میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی شہری زندگی بسر کرنے والے لوگوں کو دل سے بھاتا ہے۔ لوک آرٹ کا شجاعانہ طریقِ اظہار، تسلسل اور فنی بانکپن ہی اس کی زندگی کا ثبوت ہے۔ یہ تو پچھلے بیس پچیس برسوں کے عرصے کی بات ہے کہ کلاسیکی انداز رقص اور دیگر فنونِ لطیفہ کو عزت اور اشتیاق کی نظروں سے دیکھا جانے لگا ہے۔ لیکن لوک آرٹ جس توجہ اور دلچسپی کا محتاج ہے اس کی کمی ہنوز کھٹکتی ہے۔

لوک آرٹ خاص کر لوک ناچ کے سلسلے میں اودے شنکر کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جائے گا۔ اس لئے کہ اُن کی خدمات عظیم ہیں۔ اُنہوں نے

ہندوستان کے مختلف حصوں کا دورہ کیا۔ اور وہاں کے مخصوص لوک ناچوں کا گہرا مطالعہ کرکے اُن کی فنی اہمیت کی وضاحت کی۔ جس نے خود اُن کے فن کو تازگی اور نکھار بخشا۔ انہوں نے لوک ناچ کے ابتدائی فارم اور تاب دار حصوں سے زندہ اور جاندار ٹکڑوں کو لے کر اپنے کلاسیکی انداز کے رقصوں میں شامل کیا۔ فن سے یہ دلچسپی بچپن ہی سے اُن کے حصہ میں آئی، جب کہ وہ اپنے والد کی زمین داری پر غازی پور کے ایک گاؤں نصرت پور جایا کرتے تھے۔ جہاں رام لیلا اور نوٹنکی کی محفلیں جمتی تھیں، جہاں ایک بوڑھی جوگن ماتا دین جیسا استاد انہیں ملا۔ جو لوک ناچ کا رسیا اور ماہر تھا، جس کے انگ انگ میں شنکر دیو تا کا سا حسن اور فن کی تازگی تھی اور جس نے ناچ کے ہر انداز کو آئینے کی طرح اپنے جسم پر سجایا تھا۔ اور جس کا وجود ہی فن کا ایک مکمل نمونہ اور زندگی کے چشمے کا ایک سُریلا راگ تھا۔ ماتا دین اودے شنکر کا ذہنی گرو ثابت ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ بہت دنوں تک اس بات کا کھلا ہوا اقرار اُس بڑے فن کار نے نہیں کیا، لیکن جس کی فن کی عظمت کے سامنے آخر اُسے ماتھا ٹیکنا ہی پڑا۔ جب کہ اودے شنکر خود فن کار کی حیثیت سے عظیم اور بین الاقوامی شہرت کا مالک ہو چکا تھا۔ ایک بار نصرت پور کے دوران قیام میں انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ ماتا دین ہی اُن کا اُس گُرو ہے جس نے اُن کے اندر فن کی سچی لگن اور پیار کو جگایا اور زندہ رکھا۔ اس واقعہ کے ذکر سے میرا مقصد صرف یہ دکھلانا ہے کہ لوک آرٹ کس طرح ایک سچے اور تخلیقی فن کار کو جنم دیتا اور پروان چڑھاتا ہے۔

اور تب سے فن کاروں کی بہت سی جماعتوں اور انفرادی طور پر بہت سے فن کاروں نے لوک ناچ اور گانوں کی طرف اپنی وابستگی اور توجہ مبذول کی اور ہندوستانی فلم انڈسٹری نے اپنے شان دار انداز میں اس کی اشاعت اور پبلسٹی کا اہتمام کیا۔ وزیر اعظم نہرو کا ہندوستان کے مختلف حصوں میں دورہ بھی لوک آرٹ کی خدمات کے سلسلے کی ایک سنہری کڑی ہے۔ اس لئے کہ ہر جگہ اُن کی پذیرائی وہاں کے مقامی لوک ناچوں اور گانوں کی پیش کش کے ساتھ کی جاتی ہے اور جس کی خوبصورت فلمیں محکمۂ اطلاعات کے ذریعہ عام لوگوں کی دلچسپی کے لئے ہندوستان کے گوشے گوشے میں دکھلائی جاتی ہے۔ بھرت اپادیہ تحریک نے بنگال کے اندر لوک ناچ کے فن کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ مقامی جماعتوں، عوامی تھیٹر اور انڈین نیشنل تھیٹر نے بھی تعمیر

عوام کو اپنے زندہ اور بھرپور لوک ناچ کے فن، روایات اور اُن کے اقسام سے متعارف اور آشنا کرایا۔

کسی فن یا آرٹ میں اسٹائل کوئی جامد اور ساکت شے نہیں بلکہ ایک حرکی نوعیت ہے۔ فلم اور اسٹیج پر مختلف قسم کے ناچوں کے اثرات کے تحت لوک ناچ کے فارم میں تبدیلی کا آجانا اور اُس کا اثر پذیر ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ یورپ اور امریکہ کے برخلاف جہاں لوگ اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ شہری زندگی کی ہنگامہ آرائی سے دُور کسی دیہات میں قدرت کی رعنائیوں سے لُطف اندوز ہونے اور وہاں کے طور طریقے، لباس، رہن سہن، مکانات، زیورات اور ناچ گانے کے مطالعے کا پروگرام بناتے ہیں اور جنہیں خاص طور پر زائرین کے مطالعے کے لئے محفوظ بھی رکھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں متوسط طبقے کے خاندان کے افراد کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ دیہات یا شہروں کے دَورے پر نکلیں اور وہاں کی قابل دید اشیاء کا مطالعہ کریں۔ اگر اتفاق سے کسی میں اس چیز کی صلاحیت بھی ہو تو اُن کو اس بات کی اطلاع ہی نہیں کہ کہاں جانا چاہیئے اور کس قسم کی چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور نہ تو اس کے لئے کوئی انتظام ہی ہے۔ شاید اس پنج سالہ منصوبہ بندی کے دوران میں جب کہ اس چیز کی اہمیت کو بھی محسوس کیا جا رہا ہے کہ زائرین (ٹورسٹ) کی آمد ملک کے لئے غیر ملکی زرِ مبادلہ کے حصول کی ایک صورت ہے، زور اس بات پر ڈالا جا رہا ہے کہ عوام بھی دیہاتوں میں اپنے تھیٹر اور اسٹیج قائم کریں اور اپنے فنون لطیفہ کو زندہ رکھنے اور پروان چڑھانے کی طرف دھیان دیں جس کے لئے مناسب امداد کا بھی بندوبست کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اسٹیج اور تھیٹر پنچایت گھروں کے ساتھ ملحق ہوں گے، جس کے ساتھ کتب خانوں اور عجائب گھروں کا بھی انتظام ہوگا۔ جہاں عوام کی تیار کردہ آرٹ کی چیزیں بطور نمائش رکھی جائیں گی اور اسی لے ساتھ ساتھ ایک کُل ہند لوک ناچ اور گانے کے مقابلے کے اہتمام کی بات بھی چلی ہے جو اس تحریک کو قوت اور توانائی بخشے گی اور عوام کے اندر دلچسپی کی رَو کو تیز تر کرے گی۔ کمیونٹی پراجکٹ کا یہ پروگرام عوام کے لئے نئی اُمیدوں اور آرزوؤں کی بیداری اور برآری کا پیغام ہے جس کے لئے انہیں خود بھی محنت، شوق اور توجہ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

لوک آرٹ سے عوام کو بیدار کرنے اور اُن کے اندر شعور پیدا کرنے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ بمبئی کے اندر پچھلے دنوں "غلہ زیادہ اُگاؤ"

کی تحریک کے سلسلے میں عوامی تھیٹر اور انڈین نیشنل تھیٹر نے ایک لوک بیلے کا پروگرام پیش کرکے ثابت کر دیا کہ کس طرح وہ عوام کی دلچسپی کو کسی تحریک سے وابستہ کر سکتے ہیں۔ بیلے ٹروپ ایک سڑک کے ہوتے ٹورنگ اسٹیج کی شکل میں گاؤں گاؤں اپنے پروگرام پیش کرتا اور لوگوں کو تحریک کے سلسلے میں جان کاری دیتا رہا۔

اگر ایک شخص اپنے ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک کا دورہ کرے تو اسے سال کے تقریباً تمام حصے میں کہیں نہ کہیں لوک ناچ اور گانوں کے پروگرام سے سابقہ پڑے گا۔ ہر اپنے علاقے کے لحاظ سے اپنی خصوصیات کا حامل ہوگا۔ لوک ناچوں کی مذہبی، غیر مذہبی اور زراعتی قسمیں عوام کے لئے صدیوں سے متبرک، پاک اور عام ورثے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ ہولی، دیوالی، درگا پوجا، آنم، شوراتری، محرم، پونگل، رام نومی اور جنم اشٹمی وغیرہ تو عوام کی شدید اور تاریک زندگی میں روشنی اور مسرت کے پیغام بر ہیں اور ان مواقع پر جس انبساط اور خوش دلی کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ مدتوں تک دلوں کو گرمانے کے لئے کافی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وحشی قبائل جیسے ناگا، کول بھیل، سنتھال اور گونڈ وغیرہ بھی اپنے ناچ گانوں کا سرمایہ الگ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اہیر، دھوبی، چمار اور ملاحوں کے مخصوص ناچوں کی قسمیں علیحدہ ہیں۔

کاشت کاروں کے تقریباً تمام ناچ گانے وقت اور موسم سے وابستہ ہیں اور اسی کے ساتھ ان کی خصوصیات بھی منسلک ہیں۔ سال کے تمام حصوں میں مختلف قسم کے تہوار، شادی بیاہ، بچوں کی پیدائش، بوائی اور کٹائی سے متعلق ناچ اور گانوں کا پروگرام جاری رہتا ہے۔ اس کے علاوہ موسمی میلے ٹھیلے، محرم اور پوجا پاٹ کے موقع پر بھی ناچ گانوں کا مظاہرہ ضروری ہے۔ کچھ ناچ اور سوانگ ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ وہ خشک سالی اور قحط کے دیوتاؤں کو اکساتے اور انہیں نرمی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بھیلوں کے اندر دوشیزائیں ناچتی اور گاتی ہوئی صبح دھواں کی طرف جدھر بادل کی تلاش میں نکل جاتی ہیں جسے دیوی کے حضور میں بطور قربانی کے پیش کیا جاتا ہے تاکہ وہ انہیں بارش عطا کرے۔ بعض اوقات یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بارش آنے والے بھیل قبیلے کے لوگ بارش کی خوشی میں جھومتے ہیں اور خوب ناچتے اور گاتے ہیں۔ یہاں تک کہ

بارش شروع ہو جاتی ہے اور وہ لوگ بھیگ جاتے ہیں۔ پھر وہ اپنے کھیتوں کی طرف نکل جاتے ہیں اور اس طرح میگھ دیوتا کی توجہ وہ اپنے خشک کھیتوں کی طرف منعطف کراتے ہیں۔

جنوبی ہند میں بھی اس طرح کا خیال عام ہے کہ بارش کی کمی اور خشک سالی گاؤں والوں کے گناہوں کا خمیازہ ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جو دیوتاؤں کو بیدار کرنے کے سلسلے میں منعقد ہونے والی تقریب میں حصہ لیتے ہیں انہیں ایک دن پہلے برت رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد اگلی صبح وہ اشنان کرکے میگھ دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔ ایک اہم اور پرشوکت رقص کی ابتدا چپکے ایک حلقے ہوتی ہے۔ پجاری ڈھول پیٹتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ناچ شروع ہو جاتا ہے۔ جسم کی حرکت اور الفاظ کا شور شروع میں تو ہلکا اور نرم رہتا ہے۔ پھر ایک غوغا کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ آخر میں رقاصوں کا سردار تلوار بلند کرتا ہے اور کیلا اچھال کر اس کے دو ٹکڑے کر دیتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قربانی پیش کر دی گئی (جو شاید پہلے کے جانور کی قربانی کی یادگار کے طور پر ہے) اس کے بعد رقص کے انداز میں دھیما پن شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگ گھٹنوں کے بل جھک جاتے ہیں اور اس طرح میگھ دیوتا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور بارش کی التجا کرتے ہیں۔

مینڈک کو میگھ دیوتا کا محبوب تصور کرتے ہوئے آسام کے علاقوں میں بارش کی کمی کے موقع پر مینڈک کا بیاہ بڑی دھوم دھام سے رچایا جاتا ہے اور اس موقع پر ناچ گانے کی اچھی خاصی رنگ رلیاں مچتی ہیں تاکہ دیوتا خوش ہو جائیں اور بارش ہو۔ اور وہیں کچھ علاقوں میں مینڈک کو پکڑ کر کوٹ ڈالتے اور کسی عمر رسیدہ عورت کے جسم پر ڈال دیتے ہیں۔ اس وہم کے تحت رچایا اس طرح دیوتا سے اپنے محبوب کا دکھ دیکھا نہ جائے گا اور وہ بارش برسانے پر آمادہ ہو جائے۔

اندرون بنگال اور ہمالیہ کی ترائی کے کچھ علاقوں میں عورتیں ایک عجیب قسم کا گھریلو رقص پیش کرتی ہیں۔ عورتوں کی ایک جماعت میگھ دیوتا کی گھر بنی میں بنائی ہوئی ایک مورتی اپنے ساتھ لے کر کسی تنہا اور الگ تھلگ مقام کی طرف نکل کھڑی ہوتی ہے۔ چاند جب اوپر چڑھ آتا ہے تب وہ اپنے کپڑے اتار پھینکتی ہیں اور ناچنا گانا شروع کر دیتی ہیں۔ الفاظ ایک عجیب طرز کے ہوتے ہیں آپس میں گڈمڈ جس کا کوئی معنی اور مطلب نہیں۔ اتنا کچھ ہو جانے

کے بعد اگر بارش ہو جاتی ہے تب تو مورتی کو وہ اپنے ساتھ واپس لے آتی ہیں اور بڑے اہتمام سے اُس کی پُوجا کرتی ہیں۔ ورنہ بصورت دیگر کوستے ہوئے اُسے پٹک کر چکنا چُور کر دیتی ہیں۔

اس قسم کے تقریباتی ناچ اور گانے دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ یورپ کا کوئی حصہ ہو یا افریقہ، اُن کے مختلف قبائل کے اندر اس کا یکساں رواج ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سادہ دِل اور بھولے بھالے عوام اور کسان قدرت سے عقیدت اور خوف رکھنے کے معاملے میں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ سائبیریا میں مثال کے طور پر کچھ لڑکیاں درختوں کی پتیوں میں ملبوس گلی کوچوں میں ناچتی گاتی جاتی ہیں اور مکانوں کی چھتوں اور دریچوں سے اُن پر پانی کے چھینٹے پھینکے جاتے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ دیوتا خوش ہو جائیں گے اور بارش ہوگی۔ یہ اور ایسی کئی حرکتیں شہر میں بسنے والے لوگوں کے لئے حیران کن ہوں گی اور انہیں تعجب ہوتا ہوگا کہ ابھی بھی دُنیا کے لوگ ایسے توہمات میں گھرے ہوئے ہیں۔ لیکن تہذیبی ارتقا کے تسلسل کی کڑی ان ہی توہمات اور حرکات سے وابستہ ہے جو معاشرتی تغیر اور سماجی انقلاب میں مددگار ثابت ہوتی ہے اور سب سے بڑے تعجب کا مقام تو یہ ہے کہ بیشتر اوقات بارش بھی ان ہی سوانگ اور ناچوں کے دوران پیدا ہونے لگتی ہے۔ جس نے توہمات کی جڑیں بڑی گہرائی تک عوام کے دِلوں میں پیوست کر دی ہیں۔

اسی قسم کے اور بھی پرستش کے طریقے ہیں جو ناچ اور گانوں سے پُر ہیں اور جن کے لئے خاص خاص اوقات موزوں ہیں۔ اسی میں وہ ناچ بھی شامل ہے جسے عورتیں کسی درخت یا پنڈی کے سامنے اولاد حاصل کرنے کی تمنا میں پیش کرتی ہیں۔ بھیل، ناگا، گونڈ اور دوسرے قبائلی بھی اپنے اپنے مخصوص لوک ناچوں کے مالک ہیں، جو زندگی سے بھرپور اور حرکات و سکنات میں فنی جوہر لئے ہوئے ہیں۔ مشہور بھیل ناچ جس میں شیو دائے بدریا کی حیثیت سے شیطان پر فتح حاصل کرتا ہے۔ عام موضوع "باطل کے مقابلے میں حق کی فتح" کو پیش کرتا ہے۔ مختلف وضع اور لباسوں میں سیلون، جاوا ملایا اور بالی کے "پرستش ناچ" اور ہندوستان کے مختلف حصوں کے "کھیتیوں کا ناچ" ایک دوسرے سے کافی حد تک مشابہ ہیں اور یہ تمام رقص اپنے تیز حرکات و سکنات، جسمانی لچک اور اچھل کود کے لحاظ سے زندگی کی توانائی کے مظہر ہیں۔

سنتھالوں اور گونڈوں کا "قبیلہ ناچ" گجرات اور مالابار کے علاقوں میں ملاحظہ کی چیز ہے۔ سنتھال عورتیں ایک دوسرے کے بازوؤں میں بازو ڈالے خوبصورت قدموں کے ساتھ اس انداز سے آگے اور پیچھے کی طرف حرکت کرتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ کھیتوں کی ہری بھری فصل ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہی ہے اور اُن کا بدمست شباب فضا میں اٹھکیلیاں کر رہا ہے۔ اُن میں سے جوں ہی کوئی عورت ہٹتی ہے دوسری اس کی جگہ آموجود ہوتی ہے۔ اس طرح اُن کے رقص کا انداز بڑا نرالا اور پیچیدہ ہے۔ ساتھ ہی دِلچسپ اور زندگی سے بھرپور بھی۔ جو شباب اور زندگی کے حُسن جاوداں کو پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی قسم قسم کے رقص ملک کے طول و عرض میں پائے جاتے ہیں۔ جن میں پنجاب کا بھنگڑا ناچ فنی خوبی، حرکات و سکنات اور جسم کے لوچ کے لحاظ سے متحیر کن انداز کا مالک ہے۔ جس کے دیکھنے سے زندگی کی سرخوشی، انبساط، ڈھول دھپا اور سینکڑوں کیفیات کا اظہار ہوتا ہے اور جس کے پیش کرنے والے بھی یقینی طور پر زندگی کو زندگی کی ساری تلخی اور مٹھاس کے ساتھ انگیز کرنے کے قائل ہیں۔ جو اُن کے فن کے اندر بھی جاری و ساری ہے۔

اس کے بعد داستان سراؤں اور کتھا کاروں کا نمبر ہے جو اپنے رقص میں حُسن و عشق کی کسی داستان، کسی اساطیری کہانی یا کسی جنگی واقعے کو پیش کرتے ہیں اور وہ تعداد میں اتنے ہیں کہ اُن میں سے ہر ایک کا ذکر کرنا مشکل ہے اُن کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ انہوں نے مدتوں سے عوام کے دِلوں کو اُن کے تاریخی کارناموں، بہادری کے قصوں، رزمیہ کہانیوں اور اُن کے علم الاصنام کے ذکر سے برمائے رکھا۔ چنانچہ کیرتن، بھجن، کتھا، پربندھم، ہری کتھا وغیرہ کے بھی اپنے اپنے مقامات ہیں اور سماجی زندگی میں اُن کا بھی ایک رول ہے۔ جب کہ عوام فصل کی تیاریوں کے بعد مطمئن، خوشحال اور کچھ دِنوں کے لئے پیٹ کے دھندوں سے بے فکر ہو جاتے ہیں تو ایک جگہ جمع ہو کر ان ہی کتھاؤں کے ذریعہ دنیاوی عقل و شعور کی باتیں سیکھتے ہیں، جسے صدیوں کا ورثہ سمجھنا چاہیے جو انہیں اپنے بزرگوں سے حصے میں ملا ہے۔ یہ پیشہ ور فسانہ خوان اور کتھا کار بات بنانے میں ماہر اور اپنے فن کے اُستاد ہیں۔ وہ اپنی داستانوں میں گذری ہوئی باتوں کے ساتھ موجودہ حالات اور واقعات کے پیوند اس طرح جوڑتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اُن

طرح وہ سماجی ناانصافی، انقلاب، معاشرت کی بدلتی ہوئی قدروں اور تہذیبی روایات کی پامالی کے قصوں کو اپنی داستان کا موضوع بناتے اور عوام کو غور و فکر پر مجبور کرتے ہیں۔ اس طرح وہ گذشتہ حالات اور موجودہ واقعات کا تجزیہ کرکے دیہاتیوں کو اُن کی زندگی اور زندگی کے تجربات سے نتائج اخذ کرنے کا سبق دیتے ہیں۔

حلقے بناکر ناچنا، تالی لگانا اور چھوٹی چھوٹی چھڑیوں سے ایک دوسرے کو مارنا یا اسی قسم کے اور بھی طریقے ہیں جو عام ہیں۔ لوک ناچ کی سب سے ہردلعزیز اور عام قسموں کے جنم دینے اور پروان چڑھانے میں اُن افسانوں کا بھی تعلق ہے جو رادھا اور کرشن کے حسن و عشق سے وابستہ ہیں۔ اور جو دیہاتوں میں عام دوشیزاؤں کے دِل کی دھڑکنیں آج بھی تیز کر دیتے ہیں۔ شیو بھگوان کی شخصیت بھی، جسے ہندو مذہب کی پاک تثلیث کا ایک رکن کہنا چاہیئے اس قسم کے ناچوں کے سلسلے میں تحریک پیدا کرنے کا باعث رہی ہے۔

لوک ناچ کی دوسری عام قسموں میں وہ بھی ہیں جس میں جانوروں کی نقلیں اُتاری جاتی ہیں یا چہرے پر نقاب ڈال کر کوئی مزاحیہ کردار ادا کیا جاتا ہے۔ کچھ رقص ایسے بھی ہیں جس میں ناچنے والے ہاتھ میں تلوار یا چھڑ لے کر کچھ کرتب دِکھلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کٹھ پتلی، کٹھ گھوڑے اور رسیوں کے ناچ علیحدہ ہیں۔ ناچ کے ساتھ ڈھولک، تاشہ، منڈر، بانسری، سنگھا، گھنگرو، تالیاں اور بہت سی دوسری موسیقی اثرات پیدا کرنے والے آلات استعمال کئے جاتے ہیں۔ قیمتی اور جڑاؤ زیورات، رنگین اور شوخ کپڑے اور بھاری ملبوسات بھی ان ناچوں کی خصوصیات میں سے ہیں جن کے بغیر اُن میں کوئی لذت نہیں۔

دُنیا کے تمام لوک ناچوں کے جنم دینے کے سلسلے میں فطرت اور مافوق الفطرت ذرائع کا بھی ہاتھ ہے۔ تمام دُنیا میں جہاں لوگ رقص کرتے ہیں یا تو انبساط کے لئے ناچتے ہیں یا غم آلام کے اظہار کے لئے۔ محبت کے لئے یا نفرت کے لئے۔ جو یا تو اطمینان اور فارغ البالی کے لئے رقص کرتے ہیں یا پھر غربت اور فلاکت سے رستگاری کے لئے۔ اُن کا رقص یا تو تخلیق کے لئے ہوتا ہے یا [illegible] کے لئے۔ وہ یا تو عقیدت کے لئے ناچتے ہیں یا صرف وقت کاٹنے کے لئے۔ کسی وقت ناچ دُنیاوی حالات سے جنگ کرنے کے لئے ہوتا ہے یا کسی وقت رُوحانی سرور حاصل کرنے کے لئے۔ تمام دُنیا کے لوک ناچ ایک دوسرے کے ساتھ ایک عام وابستگی رکھتے ہیں اور اُن کا تعلق کائناتی ہے اور اُن کی یہ وابستگی عام انسانی قدروں کی ہم آہنگی کی مثال بھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جغرافیائی حالات اور مقامی اثرات ظاہری طور پر اُن کو ایک دوسرے سے الگ اور متمیز کرتے ہیں۔

ان ناچوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنا دِل ہر قسم کے تعصبات سے پاک رکھے۔ جب ہی فن کی زرخیزی، گانوں کی مختلف وضع اس کی ساخت، سادگی و پرکا[illegible]، متاثر کرنے والا میک اپ، زیورات اور آراستگی سے تکلف اندوز ہو سکتا ہے۔ یہیں پر آکر واضح ہو جاتا ہے کہ کس طرح آرٹ سچائی، پیار، عقیدت اور انسانی تعلقات کے تسلسل کی بقا کی ضامن ہے اور انسانوں کو دُکھ، تفکر اور رنج و آلام سے نجات دِلاتا ہے۔ ہندوستان کے لوک ناچ ہندوستان کے لئے ایک عظیم ورثہ ہیں، تہذیبی اور سماجی، جس کا زندہ رکھنا ہر قیمت پر ضروری ہے۔

مغل روڈ

وزیر ترقیات نے قانون ساز یہ کے گذشتہ اجلاس میں ایک سوال کے جواب میں کہا کہ قدیم مغل روڈ کی اہمیت کے پیش نظر حکومت نے اس کی از سر نو تعمیر کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں رواں مالی بجٹ میں اس غرض کے لئے ۳۰ ہزار روپے کی رقم مخصوص رکھی گئی ہے اور پہلے چار میل تعمیر کرنے کا کام شروع کیا جا چکا ہے۔
پہلے اجلاس میں قانون ساز یہ کے دونوں ایوان مغل روڈ تعمیر کرنے کی ضرورت پر سرکاری قرارداد بھی منظور کر چکے ہیں۔

جناب بخشی غلام محمد
وزیر اعظم جموں و کشمیر

قومی تعمیر کے بارہ سال

ہندوستان نے ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے پچھلے بارہ سال میں زندگی کے ہر شعبہ میں بے پناہ ترقی کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ چند ایک میدانوں میں ترقی کی رفتار اتنی تیز رفتار رہی ہے کہ بہت سے مشاہد بھی اس کا جائزہ لے کر ششدر رہ گئے ہیں۔ اپنے یہاں کام کرنے کا ڈھب اور اپنے یہاں کے وسائل کے پیش نظر ہم نے بے شک دنیا کے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر کام انجام دیا ہے مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم اپنا کام ختم سمجھیں اور اسی پر مطمئن ہو کر بیٹھے رہیں۔ کیونکہ بہت کچھ انجام پانے اور بہت کچھ حاصل کرنے کے باوجود ابھی بہت کچھ کرنا بھی باقی ہے۔ ہمارا ملک ایک وسیع اور عریض ملک ہے۔ چین کے بعد آبادی کے لحاظ سے ہمارا ملک دوسرے نمبر پر ہے اس لئے ہمیں یہاں زیادہ محنت اور جفاکشی سے کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم ایک خوشحال اور طاقتور ہندوستان کی تعمیر کے خواب کو ایک حقیقت کے روپ میں بدل دیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہم نے ملک کی ترقیات کے لئے ایک مستحکم اور پائیدار بنیاد تیار کی ہے اور ایک خاص راستہ متعین کیا ہے۔ اگر ہم کسی بھی مرحلہ پر اس راستے سے ادھر ادھر نہ ہٹے تو یقیناً اس سے ہمیں موجودہ سماجی اور اقتصادی حالات میں ایک انقلاب برپا کرنے میں مدد ملے گی۔ یہاں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جانی چاہئے کہ ہمارے بہت سے مسائل ابھی حل نہیں ہو پائے ہیں۔

یوم آزادی کی اس سالانہ تقریب پر [illegible] گیا ہے کہ ہم پچھلے سال کے کاموں کا جائزہ لینے کے لئے [illegible] کر بیٹھتے ہیں [illegible] ناکامیوں سے زیادہ خوبیوں کو پرکھنے لگتا ہے۔ [illegible] عجب محسوس ہوگا جو ہمیں اس کام [illegible] سامنے ہے بہ نسبت اس کام کے جو ہم نے تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ اس لئے [illegible]

ملک کی ہمہ گیر ترقی سے دلچسپی اور لگن رکھتے ہوئے میں ان کاموں کے تمام پہلوؤں کو تنقیدی جائزہ کے لئے پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

اس وقت سب سے پہلے بے روزگاری کے مسئلہ سے نپٹنا فوری ضرورت کا کام ہے۔ اس حقیقت سے چشم پوشی کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ مسئلہ ملک کے لگ بھگ تمام حصوں میں شدت سے ابھرا ہوا ہے اور بہت سی مشکلات جن کا ہمیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس ایک بنیادی سوال کی تہہ میں ہی ٹٹولی جا سکتی ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو حل کرنے کے لئے کوئی ایک بنا بنایا حل تجویز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ اس مسئلہ سے نپٹنا ہے اور اس کے لئے کوئی فوری حل تلاش کرنا ہے۔ کیونکہ ملک کی متوازن ترقی کے لئے یہ بہت ضروری ہو گیا ہے۔

اگرچہ ذات پات کے رجحان مٹانے کے لئے بہت کچھ عمل میں آ چکا ہے پھر بھی اس برائی کا خاتمہ کرنے کے لئے جو بڑے مؤثر پیمانے پر موجود ہے، زبردست کاوشوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس قابل ہونا چاہئے کہ ہم ذات پات اور فرقہ پرستی کی ان برائیوں کے خلاف پوری شدت سے سارے ملک کو اکٹھا کریں۔ کیونکہ یہ برائیاں قوم کی جڑوں کو بری طرح گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ اس عظیم کام میں ملک کی تمام سرکردہ جماعتیں یکجا ہو سکتی ہیں اور ملک [illegible] ایک کونے سے دوسرے کونے تک وسیع عوامی تحریک کی بسم اللہ کر سکتی ہیں۔ میرے خیال میں اپنے ملک کو منظم کرنے کے لئے ہم جو بھاری حصہ ادا کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم اس عظیم کام کی طرف جتنی جلدی ہو سکے مائل [illegible] کے لئے [illegible] مشکل نہیں لیکن اگر تجربے سے ہم محسوس کریں کہ ایسے اقدام ضروری ہیں [illegible]
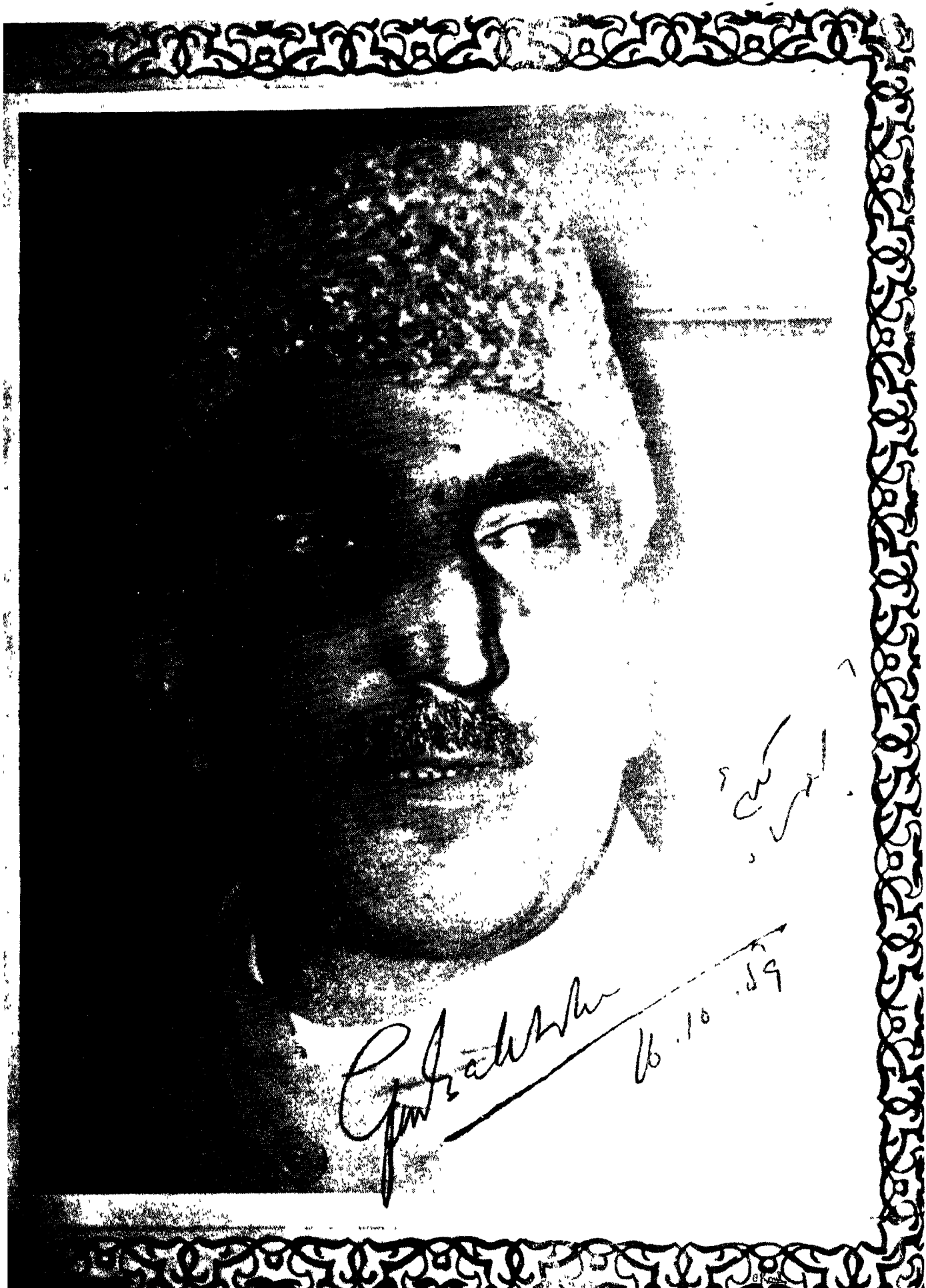
بلا روک ٹوک ہاتھ میں لئے جائیں اور کسی پس و پیش کے بغیر ان پر عمل درآمد
کیا جائے۔ یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ ملک کے اندر جذباتی ہم آہنگی ہماری
اجتماعی ترقی کے لئے بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ بڑے بڑے پراجیکٹ ہم نے تعمیر
کر لئے ہیں۔ کچھ بڑے بڑے پراجیکٹ ہم اس وقت تعمیر کر بھی رہے ہیں۔ عظیم
الشان صنعتی اور دوسری اسکیموں پر ہمارے یہاں عمل ہو رہا ہے۔ لیکن اس حالت
میں یہ سب کچھ کوئی معنی نہیں رکھتا اگر ہمارے ملک کے مختلف خطے تنگ نظری
کے دائرے میں جکڑے رہیں اور الگ الگ گروہوں میں کام کریں۔ اس کا
مطلب یہ بھی نہ لیا جائے کہ علاقائی مفادات کی کوئی فکر ہی نہ کی جائے۔ ہر ایک
ریاست اور علاقے کو اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ جائز دعاوی پیش
کرے اور اپنے مخصوص مسائل کے حق میں ساری قوم کی ہمدردیاں حاصل کرے۔
مگر یہاں ضرورت صرف درست رویے اور نقطۂ نگاہ کی ہے۔ آدمی کو پہلے اپنے
ملک کے لئے سوچنا چاہیئے نہ کہ اپنے فرقے، برادری یا علاقے کے لئے۔

یہ کہتے ہوئے مجھے مسرت ہوتی ہے کہ ہم نے اس سمت میں کشمیر کے اندر
نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ یہاں کے لوگوں اور ملک کے باقی حصوں میں رہنے
والے عوام کے جذبات اور میلانات کو نظر میں رکھ کر ہماری ریاست کی سب سے
بڑی سیاسی جماعت نیشنل کانفرنس نے حکومت سے سفارش کی ہے کہ
وہ ملک کے باقی حصوں کے ساتھ زیادہ گہرے رابطے اور قربت کے لئے مناسب
قدم اٹھائے۔ اس نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ ہندیونین کے آئین کی دفعہ ۱۳۶
کا پوری طرح سے اطلاق کر کے ریاست کو سپریم کورٹ کے دائرہ اختیار میں لیا
جائے۔ یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ مرکزی انتخابی کمیشن کے دائرہ کار کو ریاست تک
توسیع دی جائے۔ نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل ان اقدامات کی
توثیق کرے گی، ریاستی حکومت ان پر عمل درآمد کرے گی۔ اس طرح سے باقی ملک
کے ساتھ ریاست جموں و کشمیر کے ادغام کا عمل مکمل ہو جائے گا۔ ملک کے آئین
میں کشمیر کو جو ممتاز پوزیشن حاصل ہے اس کے پیش نظر اور پچھلے سالوں کے
واقعات کو دھیان میں رکھتے ہوئے کشمیر کے عوام نے جو یہ فیصلے لئے ہیں یہ
قومی تواریخ میں بھاری اہمیت کے کارنامے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ملک کے دوسرے حصوں کے قدموں سے قدم ملاتے ہوئے ریاست جموں
کشمیر نے سماجی اور اقتصادی میدان میں پچھلے سال نمایاں ترقی کی ہے۔ خاص طور
پر تعلیم، صحت عامہ، سڑکوں کے پھیلاؤ، رسل و رسائل، صنعت و تجارت کے
شعبوں میں ترقی کی اُٹھان ہمت افزا ہے۔ ریاست کے تمام حصوں میں سکولوں
کا ایک وسیع جال بچھایا گیا ہے۔ اس طرح سے سماجی پس ماندگی اور ناخواندگی کا خاتمہ
کرنے کے لئے بڑی پھرتی سے کام ہو رہا ہے۔ اور تو اور ریاست کے دور
افتادہ دیہات کو بھی صحت عامہ کی سرگرمیوں سے مستفید کیا جا رہا ہے۔ ملیریا اور
ٹائیفس جیسی بیماریوں کو، جو ہر سال بے شمار انسانی جانوں کو تلف کرنے کا موجب
ہو رہی تھیں، احتیاطی اور روک تھام کی تدبیروں سے بڑی حد تک ختم کر دیا گیا ہے۔
سڑکوں کو وسعت دینے کے نتیجہ میں بہت سے دشوار گذار علاقوں تک آنا
جانا آسان ہو گیا ہے۔ اس سے ان علاقوں کو ترقی دینے میں بھی بڑی مدد مل رہی ہے۔
ٹرانسپورٹ کے انتظامات کو بہتر بنایا گیا ہے۔ ریاست کی تواریخ میں پہلی مرتبہ
سونمرگ کو کرگل سے ملانے کے لئے ایک کمرشل سروس شروع کی گئی ہے۔ کرگل
سے لیہ تک ایک سڑک آج کل زیر تعمیر ہے۔ مستقبل قریب میں سرینگر سے لیہ
تک سڑک کے رستے آنا جانا بھی ممکن ہو جائے گا۔

صنعتی میدان میں بھی ریاست تسلی بخش طریقے پر پیش قدمی کر رہی ہے۔ چھوٹے
اور بڑے پیمانے کی کئی ایک صنعتیں قائم کی گئی ہیں۔ ابھی کئی اور کارخانے چالو کرنے
کی سکیمیں عمل درآمد کے لئے تیار ہیں۔ سرکاری طور پر جو فیکٹریاں چل رہی ہیں اُن
میں پیداوار برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ صنعتی مزدوروں کی اُجرتوں میں بھی مناسب
اضافہ ہوا ہے۔ اُن کے کام کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے طرح طرح کے
اقدامات کئے گئے ہیں۔

حکومت نے غذائی محاذ پر اناج کی اُپجاؤ میں اضافے کے لئے جو جامع
اقدام اُٹھائے ہیں اُن کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ پچھلے سال اجناس
کی پیداوار میں نمایاں اضافہ پایا گیا۔ اس سال کی پیداوار پچھلے سال کے مقابلہ میں اور
زیادہ ہونے کی توقع تھی لیکن جولائی میں ریاست کے اندر جو ناگہانی سیلاب آئے
انہوں نے پیداوار کو سخت دھکا پہنچا دیا۔

میں نے ابھی ابھی ایسی چند کامیابیوں کا تذکرہ کیا ہے جو ہم حاصل کر سکے ہیں۔
ہمارے سامنے جو کام ہیں وہ بہت زیادہ ہیں اور مشکل بھی۔ اس لئے ہماری طرف سے
کسی قسم کی تساہلی اور سہل انگاری کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ہم عظیم مقاصد کو پانے
کے لئے اٹل ارادے کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہم نے اپنی [illegible] کو اُن بندھنوں
زیادہ مضبوط اور درست کر لیا ہے جو ہمیں ملک کے باقی حصوں کے ساتھ باندھے ہوئے ہیں۔

میر غلام رسول نازکی

قطعات

مدینُک شام زُلفن شانہٕ طورس — مدینچ رات چشمن سُرمہٕ نورس
مدینُک صُبح پرتوٕ شش جہاتس — مدینُک دوہ جلاٗ دِلکس حضورس

۲

زمین دِل آسمان دِل لامکان دِل — خُدا دِل بندگی ہُند امتحان دِل
اَماہ عیباہ تہٕ وُچھمس بے نہایت — لوٗدی تیران پرٛدی ڈیوٗٹھم تمان دِل

۳

جوانا اوٗر تہٕ دوٗر پادر سہہاہ ہیوٗ — بہت بے کار شِکس منز گمت گیر
مینہٕ گو کیاہ تام تہٕ پرٛذھس ژٕ یہٕ کیاہ گوٗذ — دوہ شاہ ترٛوٗن دوپُن یی اوس تقدیر

۴

سِراہ وینہٕ ہاہٕکا نہٕ گوٗژھ معنہِ بوزُن — سِراہ یُس شوٗبہٕ تمر گُس ڈالہِ سوزُن
نَسُن کیاہ گو مرُن کیاہ گو مینٛہ نِش بوز — مرُن یُس توٗگ تمِس توٗگ زِندہٕ روزُن

۵

صُبح پھوٗل ترٛوٗ دو پرٕ توٗ آفتابن — زمانن ہیوٗت کرُن تعبیر خوابن
سینین دوٕ گنیارٕ دوٕ گنیارن سینٕ گو — نوٗسن پرٛ اٗلِس کنوٗی کوٗر انقلابن

۶

شبُک گنہٕ گار دِیُتھم زُدل کوٗرس — لُیم بے کار کترا چیالہ بھوٗرس
کریم چانِس جہانس مالہ پوشن — سِتن طرفن وٕ تن الماس جوٗرس

لہ تُو شب آفریدی... الخ (اقبال)

گاندھی جی نے کہا

زندگی اور سماج کے متعلق گاندھی جی کے نظریات بڑے سیدھے سادے اور پاکیزہ تھے۔ کسی بناوٹ اور مصلحت سے آزاد۔ ان میں ہندوستان کی صدیوں پرانی روح رچی بسی تھی۔ ان نظریات کی بنیاد اُس انسانی فلسفہ اور کلچر پر تھی جس نے دُنیا کی قوموں میں ہندوستان کو ایک الگ ممتاز مقام بخشا ہے اور جس کا جوہر انسانوں میں نفرت اور ریاکاری کو فنا کرتا ہے اور اس کی جگہ باہمی رواداری، تعاون اور انسانی ہمدردی کو جنم دیتا ہے۔ گاندھی جی کی عظمت یہ تھی کہ انہوں نے جو فلسفہ دُنیا کے سامنے رکھا، اُس پر زندگی بھر خود بھی عمل کیا اور اپنے عملی کارناموں سے دُنیا کے لوگوں کو اس فلسفہ کی اہمیت اور قوت کا احساس بھی دِلایا۔

سچائی۔ باہمی تعاون اور عدم تشدد

یہ تھی گاندھی جی کے فلسفۂ فکر و حیات کی اساس!

گاندھی جی کے تصوّرات اس مشینی دَور سے بہت پرے ہندوستانی عوام کو اسی دیہی سماج میں دیکھنا چاہتے تھے جس کی بلندی اور عظمت کا راز ایک دوسرے سے تعاون اور رفاقت میں تھا۔ جب ہر ایک گاؤں اپنی جگہ ایک مکمل اکائی تھا اور سب کی ضرورتیں آپس میں محنت کی موروثی تقسیم کے طریقہ پر پُوری کی جاتی تھیں۔

اُنہوں نے دیہات کی خود کفیل معیشت پر بار بار زور دیا۔ انہوں نے کہا "میں کہتا ہوں کہ اگر ہمارے دیہات ویران ہو گئے تو سمجھ لو کہ ہندوستان بھی ان کے ساتھ ہی فنا ہو جائے گا۔ تب ہندوستان یہ ہندوستان نہیں رہے گا۔ دُنیا میں اس نے جو مِشن چلانا ہے نہیں چلے گا، ختم ہو جائے گا۔ جب لُوٹ کھسوٹ کا انت ہو جائے گا، ہمارے دیہات کی تعمیرِ نو اور احیا شروع ہو جائے گا۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ بھاری پیمانہ پر صنعت بندی کوئی اچھی چیز نہیں۔ لازمی طور پر یہ ہمارے دیہات کی بے پناہ لُوٹ کا باعث ہوگی۔ کیونکہ اس سے باہمی مقابلہ اور منڈی کا سوال سختی سے پیدا ہو جائے گا۔ یہ دیسی صنعت و حرفت کی بالکل جڑ کاٹ دے گی۔ اس لئے ہمیں اپنی توجہ دیہات کو خود کفیل بنانے میں لگانی چاہیئے۔ جہاں مال نجی ضرورت اور استعمال کے لئے تیار ہو۔ اور اگر ہمارے دیہات کی دیسی صنعت و حرفت کا یہ کیریکٹر بنائے رکھا جاتا ہے تو دیہاتیوں کو جدید طرز کی مشینیں اور ہل استعمال کرنے پر کوئی عذر نہیں ہوگا تا وقتیکہ یہ مشینیں دوسروں کی لُوٹ کھسوٹ کے لئے ایک وسیلہ اور ذریعہ نہیں بنتیں۔"

اسی طرح قومی آزادی کے متعلق بھی گاندھی جی کا نظریہ خیالی اور سطحی نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے کہ "اقتصادی طور پر اور مادی لحاظ سے انسانوں کو فراغت اور اطمینان میسّر نہیں تو سچی آزادی کا تصوّر بھی ممکن نہیں۔" ایک بار انہوں نے کہا :-

سچی آزادی کا تصوّر

"ایک بھُوکا آدمی بھُوک سے نڈھال ہو کر کچھ اور سوچنے کی بجائے پہلے یہی سوچتا ہے کہ اس کی بھُوک دُور ہونے کا کوئی راستہ نکل آئے۔ اس لئے وہ ایک مُٹھی بھر چاول کی خاطر اپنی آزادی تک بیچنے کو تیار ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے لاکھوں لوگوں کی یہی حالت ہے۔ ان کی نظر میں آزادی بھگوان اور ایسے ہی دوسرے کئی الفاظ کے معنی و مطلب کچھ نہیں، محض لفاظی ہے۔ وہ ان پہ مُنہ سکوڑ لیتے ہیں۔ اگر ہم ان لوگوں میں آزادی کا حقیقی تصور پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان کے لئے روزگار کا بندوبست کرنا ہوگا۔ انہیں ایسا کام دینا ہوگا جو، گھر پہ کر سکیں اور جس سے

انہیں کم ازکم دو وقت کا کھانا مل سکے۔

گاندھی جی شہروں اور دیہات کے آپس کے تفاوت کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ بڑے گنجان شہروں کو پھیلانے کی بجائے دیہات میں زیادہ سے زیادہ حسن پیدا کیا جائے اور ایسے حالات پیدا کئے جائیں تاکہ دیہات کی زندگی سے اُکتا کر لوگوں میں شہروں کی اور دوڑ جانے کا رُجحان رُک جائے۔

شہر اور دیہات کا تفاوت

انہوں نے کہا:-

"دیہات میں جو کام ہوتا ہے وہ ہمیں ہراساں کر دیتا ہے۔ ہم جو شہری زندگی کے عادی ہو چکے ہیں، دیہات کی زندگی اختیار کرنے میں بڑی گھبراہٹ محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے جسم اکثر حالتوں میں سخت محنت کا کام برداشت نہیں کرتے۔ یہ ایک مشکل تو ہے مگر ہمیں اس سے جرأت کے ساتھ نپٹنا چاہیئے بلکہ مجاہدوں کی طرح ہمیں یہ کام کرنا چاہیئے۔ اگر ہم سچے معنوں میں عوام کے لئے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ اگر ہم یہ نہ کر سکے تو اس کا بدل یہی ہوگا کہ ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر حکومت کرے گا۔ اور یہ چیز بھی اور بھی مشکل اور خراب ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے دیہات کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں بے وقت کی موت مرتے رہے ہیں تاکہ ہم جی سکیں۔ البتہ اس مرنے اور اُس مرنے میں کافی فرق ہوگا۔ جن کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے وہ مرتے رہے مگر یہ نہ جانتے ہوئے کہ وہ کن کے لئے اور کیوں مر رہے ہیں۔ ان کی یہ موت رضاکارانہ نہ تھی۔ ان کی جبری موت نے ہماری عظمت کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ اب اگر ہم جانتے ہوئے، سمجھتے ہوئے اور اپنی مرضی سے ان کے لئے مریں تو ہماری قربانی سے قوت پیدا ہوگی۔ یہ ہم کو ہی نہیں ساری قوم کو عظیم اور بلند کردے گی۔ ہمیں ضروری قربانیوں سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے، اگر ہم نے خودمختار اور قابلِ احترام قوم کی طرح جینا ہے۔"

گاندھی جی قوموں کے درمیان میل ملاپ اور ہم وجودیت کے بڑے علم بردار تھے۔ وہ کہتے تھے کہ قوموں کی ترقی ایک دوسرے کے کلچر اور علم سے سیکھنے اور استفادہ کرنے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اس بارے میں ان کا خیال یہ تھا:-

"میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے چاروں اور اُونچی اُونچی دیواریں کھڑی کی جائیں اور مکان کی کھڑکیوں کے پٹ بھی بند رکھے جائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ دُنیا کے ہر ملک کا کلچر بلا روک ٹوک، جتنی آزادی سے ہو سکے، میرے گھر میں آئے اور پھلے پھولے۔ مگر میں یہ بھی نہ مانوں گا کہ ان میں سے کوئی میرے قدم میرے ہی گھر سے اُکھیڑ دینے کی کوشش کرے۔ میرا عقیدہ یہ نہیں کہ میرا گھر ایک قید خانہ کی طرح ہو۔ اس میں خدا تعالیٰ کی ہر مخلوق کے لئے جگہ تو ہے مگر ناروا داری اور رنگ و نسل کی برتری کے لئے کوئی جگہ نہیں۔"

گاندھی جی جسمانی نظام اور دل و دماغ کی نشوونما اور صفائی کے لئے تزکیہ نفس کے بڑے قائل تھے۔ وہ کہتے تھے:-

روزہ

"جسمانی تربیت اور رُوحانی ارتقا کو مدد دینے کی خارجی تدبیروں میں سے روزہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا غذا کی سادگی اور کمی۔ حسی لذت کی خواہشیں اتنی زبردست ہوتی ہیں کہ انہیں قابو میں رکھنے کے لئے جب تک ہر طرف سے گھیرا نہ ڈالا جائے، کام نہیں چلتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ غذا نہ ملنے سے ان کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے میرے نزدیک حسیات کو قابو میں لانے کی غرض سے روزہ رکھنا بہت مفید ہے۔"

نور محمد بٹ

کام دیو ـــ یونان سے کشمیر تک

دیومالا ایک ایسا تہذیبی ورثہ ہے جو انسان کو اُس کی لاکھوں سال کی اجتماعی محنت سے حاصل ہوا ہے۔ جب مادی اقدار کی نشو و نما عالمِ طفولیت میں تھی اور انسانی ذہن مظاہرِ قدرت کو سمجھنے اور آفاتِ سماوی سے مقابلہ کرنے میں بے بس تھے، دیومالا کا وجود اس کرۂ ارض پر ہوا۔ گویا قدرت کے رازہائے سربستہ فہم میں نہ لانے سے ہی اساطیر نے اپنے قدم جمالئے۔ اور کئی علما کی یہ رائے سو فیصدی دُرست معلوم ہوتی ہے کہ جوں ہی انسان مظاہرِ قدرت پر غلبہ پانے میں کامیاب ہوجائے اس کے قدم اُکھڑنے شروع ہو جائیں گے۔ تہذیبی ورثہ کی حیثیت سے یہ تا ابد قائم رہے گی اور نسلِ انسانی کے لئے ہر وقت روح کو گرمانے اور من کو تڑپانے والی شے بن کر رہے گی۔

"کام دیو" جس کا یونانی نام اِروس (EROS) ہے اور رومن نام کیوپڈ (CUPID) عشق و محبت کا دیوتا قرار دیا گیا ہے۔ اسے ہندوستانی اور یونانی اساطیر میں لگ بھگ ایک جیسی علامات سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کا تصور ایک شریر اندھے لڑکے سے کیا گیا ہے جو بان لئے ہوئے ہے۔ جب اس نے معصوم شیو جی کو اپنی محبت کے تیر سے زخمی کر دیا تو شیو جی نے اپنی تیسری آنکھ سے جو انگارے برساتی ہے، کام دیو کو جھلس کر رکھ دیا۔ ہندو اساطیر میں اسے وشنو اور لکشمی جی کی اولاد کہا گیا ہے۔

یورپی اساطیر میں سائیکی (Psyche) کو عشقیہ مناظر میں پیش کیا گیا ہے اور اسے دو پروں والی لڑکی کے روپ میں دکھایا گیا ہے جسے یونانی اساطیر میں انسانی رُوح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قصہ اس طرح مشہور ہے کہ سائیکی جو بادشاہ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی، نہایت حسین و جمیل تھی۔ اس کی دو بہنوں کی شادی شاہانہ ٹھاٹھ کے ساتھ اپنے وقت پر تو ہوئی لیکن سائیکی کے حسن کا ہم پلہ کوئی بھی شہزادہ ملک بھر میں نہ نکلا۔ اطراف و اکناف سے حسین ترین جوان اپنی قسمت آزمائی کے لئے اس کے پاس آئے لیکن سائیکی کے حسن کی تاب نہ لا کر بے نیل و مرام واپس لوٹے۔ یہاں تک کہ لوگوں میں اس کے آفاقی ہونے کا ذرا بھر بھی شُبہ نہ رہا۔ سائیکی کے حسن اور وسیع شہرت نے محبت کی دیوی وینس (VENUS) جس کا دوسرا نام ایفرو ڈائٹس (APHRODITES) ہے، میں حسد کی آگ بھڑکا دی۔ وینس کے نام کی جتنی بھی زیارت گاہیں تھیں، عقیدت مندوں نے وہاں پھول چڑھانا بند کر دئے اور برعکس اس کے سائیکی کے چرنوں میں پھول چڑھانے کی رسم شروع ہوئی۔ وینس نے اپنے بیٹے کام دیو کو حکم دیا کہ وہ سائیکی کے من میں کسی بد اخلاق اور مفلوک الحال شخص کے لئے محبت کا جذبہ اُتارے تاکہ وہ عمر بھر ذلیل و خوار رہے۔ اور اُس کی زندگی دُکھ اور مرض کی مرکب بنے۔ جوں ہی کام دیو نے سائیکی کو دیکھا اور اپنے تیر کا نشانہ باندھا، اُس کی عصبی قوت حُسنِ لاثانی کے رُعب سے اتنی نحیف پڑ گئی کہ یہی تیر خود اپنے پاؤں کو زخمی کر گیا۔ بس کیا تھا، ادھر وہ تیر اس کے پاؤں پر پڑا، اُدھر اُس کے دِل میں سائیکی کی محبت نے جگہ لی۔ اور جذبۂ شوق سے وہیں میٹھی نیند سو گیا۔ سائیکی کے من میں بھی عجیب بے چینی پیدا ہوئی اور اُس کی سہیلیاں اُسے کہنے لگیں کہ اس بے چینی کا سبب یہی پوشیدہ دیو ہے۔ بالآخر جب سائیکی نے دِیا جلایا تو کام دیو کی چمک دمک اور خوبصورتی دیکھ کر پھولے نہیں سمائی اور فرطِ مسرت سے جلتے ہوئے دیئے میں سے تیل کا ایک گرم قطرہ کام دیو کے مُنہ پر گرا۔ جس سے اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ اور پلک جھپکتے ہی غائب ہو گیا۔ سائیکی نے اس کے فراق میں سارہ کائنات چھان ماری۔ بدقسمتی سے وہ ایک بار وینس کے پنجے میں آ گئی۔ وینس نے اسے مشکل ترین کام سُپرد کر گئی۔ ان کاموں میں سے سب سے زیادہ کٹھن اور پُرخطر کام

پاتال سے ایک ایسے صندوقچہ کو حاصل کرنا تھا جس میں پریم کا مرہم بند تھا۔ سائیکی نے بعد مشکل اس صندوقچہ کو حاصل کیا۔ لیکن واپسی پر اسے کھولا اور کھولتے ہی جو بھاپ اس مرہم سے نکلی اُس سے سائیکی بے ہوش ہو گئی۔ اب کی بار کام دیو حاضر ہو گیا اور سائیکی کو ہوش و حواس میں لایا۔ کام دیو جیو پیٹر (JUPITOR) سے دست بدعا ہیں کہ وہ اُسے لافانی بنا دے جیو پیٹر نے کام دیو کی التجا پوری کی اور اُنہیں آپس میں شادی رچانے کی منظوری دی۔

کام دیو کی قوت کا اندازہ "مہابھارت" کے اس قصہ سے مل سکتا ہے:۔

"راجہ سمورنا حسنِ اتفاق سے اپنے ساتھیوں کو چھوڑ شکار کھیلنے کے دوران ایک خوبصورت ہرن کا تعاقب کرنے لگا۔ کافی دیر تک تعاقب کرنے کے بعد جب وہ تھک کر چور ہو گیا۔ اُس نے شکار کا پیچھا چھوڑ دیا۔ جب ہرن اُس کی نظروں سے غائب ہو گیا تو وہ ہراساں و پریشان ادھر اُدھر گھومنے لگا۔ اچانک اُس کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں جب کہ اُس نے ایک حسین دوشیزہ کو سامنے دیکھا۔ کچھ لمحے تک وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نازک اندام کو دیکھتا رہا۔ اور دل ہی دل میں خیال کیا کہ شاید یہ کوئی دیوی ہو یا سورج کی شعاعوں کا مجموعہ۔ اُس گلبدن کا ہر انگ لچک دار اور سڈول تھا۔ بدن آگ کی مانند شعلہ فروزاں اور ہلال کی طرح بے داغ تھا۔ وہ ایک سنہرے بت کی مانند ساکت و جامد کھڑی رہی۔ آس پاس کے بیل بوٹے اُس نازنین کے اثر سے سونے میں تبدیل ہوتے معلوم ہوئے۔ اس پری رُو چہرے کا نام تاپتی تھا جو سورج دیوتا کی سپتری تھی۔

راجہ کی آنکھیں للچائیں اور اس کے من کو محبت کے دیوتا "کام دیو" نے محبت کے تیر سے مجروح کر دیا۔ وہ سکونِ قلب کھو بیٹھا۔ بالآخر اُس کی زبان کھل گئی اور پوچھا۔ "اے من موہ لینے والے تم کون ہو؟ اے میٹھی ہنسی ہنسنے والی دوشیزہ اِن سنسان جنگلوں میں گھومنے سے کیا حاصل؟ میں نے اپنی عمر میں تجھ جیسی حسینہ کو نہ دیکھا ہے اور نہ سنا ہے۔ ... کام دیو مجھے چھلنی کر رہا ہے۔"

اس کنول نین ناری نے زبان تک بھی نہ کھولی اور وہ نظروں سے یوں اوجھل ہوئی جیسے بادلوں میں بجلی۔ راجہ اس کی تلاش میں تمام جنگل کو چھان مارا، لیکن بے سُود۔ غم و اندوہ سے وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا اور پیچھے زمین پر آ گرا۔ اور بے ہوش ہو گیا۔

کیا ہوا کہ یہی نازک اندام ہنستی ہوئی دوبارہ حاضر ہوئی اور شہد بھرے لفظوں میں بول اٹھی:۔

"اُٹھ اے شہنشاہوں کے شیر! اُٹھ! یہ کوئی طریقہ نہیں کہ تم اپنی عقل و دانش کو اس طرح کھو بیٹھو۔"

سمورنا نے جو آنکھیں کھولیں تو تاپتی کو مخاطب پایا۔ شدتِ جذبہ سے کیف اس نے پھر التجا کی:۔

"تیری خاطر میں پریم کی اگنی میں جل رہا ہوں اے کاجل نین والی حسینہ مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دے۔ میری جان نکلتی جاتی ہے۔ مجھے کام دیو نے جو ایک زہریلے ناگ کی مانند ہے، ڈس لیا ہے۔ مجھ غریب پر رحم کر۔ اے حسین اور بے خطا چہرے، اے کنول یا چاند جیسے چہرے۔ اے چہچہاتے کنار جیسی سُریلی آواز میری زندگی کی بقا تیرے ہاتھوں میں ہے۔ تیرے بنا اے شرم سار حسینہ میرا جینا محال ہے۔ اے کاجل نین والی دوشیزہ، تجھے یہ شوبھا نہیں دیتا کہ مجھے بے کس و بے بس چھوڑ دے۔ تجھے یہ لازم ہے کہ اپنے پریم سے میرے درد و کراہ کو رفع کر۔ تُو نے اپنی پہلی نظر سے میرے من کو میرے سینے سے چھین لیا۔ میرا دل پریشان پھرتا رہا، مجھ پر رحم کر۔ میں تیرا وفادار غلام ہوں۔ تیرا اَن تھک پجاری مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دے ... اے کنول نین تُو نے خواہش کا شعلہ مجھ میں جلایا۔ اس شعلے کو بجھانے کے لئے اپنی محبت کا پانی اس پر چھڑک!"

تاپتی نے جواب دیا۔ "میں اپنی ذات پر قابض نہیں ہوں۔ میں وہ دوشیزہ ہوں جس پر میرے پتا کا قبضہ ہے۔ اگر تجھے مجھ سے پریم ہے تو اُس سے التجا کر۔ تم نے بھی میرے من پر ڈاکہ ڈالا ہے۔"

اپنا حسب و نسب بتا کے تاپتی آکاش میں چلی گئی۔ سمورنا ایک بار پھر

زمین پر آگرا اور بے حس و حرکت پڑا رہا۔

راجہ کے وزرا اور نوکر جا کر اس کی تلاش کرتے کرتے وہاں آ پہنچے۔ انہوں نے راجہ کو زمین پر بے یار و مددگار پایا اُس قوسِ قزح کی طرح، جو اُفق سے چھن کر زمین پر گر پڑی ہو۔ انہوں نے اس کے چہرے پر کنول سے معطر سرد پانی چھڑکا۔ جب اُس نے ہوش و حواس سنبھالے تو سوائے ایک وزیر کے تمام وزیروں اور نوکروں کو واپس بھیجا اور پہاڑ کی چوٹی پر سورج دیوتا کی بارہ روز متواتر تپسیا کی۔

پس ایک رشی سورج دیوتا کے پاس حاضر ہوا۔ اور اپنے ساتھ تاپتی کو سورج دیوتا کی اس منظوری سے کہ سموَرنا تاپتی کی شان کا پتی ہے، لے آیا۔

بارہ سال تک راجہ پری رُو دُلہن کے ساتھ پہاڑوں کے جنگل میں عیش و عشرت کرتا رہا۔ لیکن اس کا ملک ان بارہ برسوں میں بارش کے ایک قطرے تک کا محتاج رہا اور ملک خشک سالی سے ہمہ گیر قحط کا شکار ہوا۔ ملک میں قحط نے اتنی خطرناک صورت اختیار کی کہ لوگوں نے اپنی بیویوں کو طلاق دی اور بچوں کو اپنے گھروں سے نکال دیا۔ پھر ایک مہارشی نے سموَرنا اور اُس کی آفاقی دُلہن کو واپس اپنے وطن میں لایا۔ اُن کے آتے ہی ملک میں باد و باراں ہوا۔ اور ملک میں خوش حالی کا دَور دورہ ہوا۔ لوگ فرطِ مسرت سے پھولے نہ سمائے۔ اور بچھڑے ہوئے پھر آپس میں مل گئے۔

شیکسپیئر نے بھی اس کا تذکرہ اپنی ایک کامیڈی "Mid-Summer Night's Dream" میں بخوبی کیا ہے۔ اوبرن پریوں کا راجہ، پری پک سے کہتا ہے ؂

اوبرن :۔ میری شریف پک، میرے نزدیک آ۔ تجھے یاد ہے جب ایک دفعہ میں اُفق کے کنارے بیٹھا تھا تو مرمیڈ (اس کا سر اور جسم عورت کا ہوتا ہے اور دُم مچھلی کی) جو رنگین مچھلی پر سوار تھی، کے مدھر گیت سُن رہا تھا۔ اس کے میٹھے بول سُن کر گستاخ سمندر بھی مہذب بن گیا۔ اور آکاش کے چند تارے بھری دوشیزہ کا گیت سُننے اپنے مداروں سے ہٹ کر دیوانہ وار چلے آئے۔

پک :۔ مجھے یاد ہے، عالی جاہ!

اوبرن :۔ تم تو نہیں دیکھ سکی ہو، پر میں نے دیکھا، کام دیو، کیل کانٹے سے لیس ٹھنڈے چندرما اور دھرتی کے بیچ پرواز کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے تیر کا نشانہ باندھا کسی ایسی پاک دوشیزہ کی طرف (شیکسپیئر چونکہ ملکہ الزبتھ کے عہد کا ڈرامہ نویس ہو گذرا ہے لہٰذا اس کا مقصد اسی ملکہ کی طرف ہے جس نے عمر بھر شادی نہ کی) جو مغرب میں تخت نشین ہے۔ اپنی کمان سے محبت کے تیر کو پھرتی سے چلایا۔ اس کی تیز رفتاری سے پتہ چلتا تھا کہ شاید یہ تیر سینکڑوں یا ہزاروں دلوں کو چھلنی کر دے۔ لیکن میں نے جوان کام دیو کے تیر کا حشر دیکھا۔ آبی چاند کے پوتر شہتیروں میں یہ تیر یخ بستہ ہو گیا اور یہ دیوی اپنا کام بغیر کسی خلل کے کرتی گئی۔ پھر بھی میری نظر خطا نہ ہوئی۔ کام دیو کا یہ تیر مغرب کے ایک نازک پھول پر آگرا جو پہلے دودھ کی مانند سفید تھا اور پریم کا زخم کھانے پر ارغوانی ہو گیا۔ دوشیزائیں اس پھول کو (Love-in-idleness) کے نام سے پکارتی ہیں۔ چلی جا اور اس پھول کو، اس بوٹی کو، جس کا پتہ میں نے تجھے دیا ہے لے آ۔ اس کا رس اگر سونے والے کے پپوٹوں پر ڈال دیا جائے تو وہ اُس شخص پر دیوانہ وار فریفتہ ہو جائے جس کو وہ آنکھ کھلتے ہی دیکھ لے۔ اس بوٹی کو جلد میرے پاس لا۔

شعر و شاعری کے لئے دیومالا سولہ سنگھار میں سے ایک ہے اور اگر اسے شاعری کے دائرہ عمل سے خارج کیا جائے تو شاعری بے ذوق اور بے جان بن کر رہے گی۔ کشمیری شاعری میں کام دیو کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اسے کم و بیش ہر شاعر نے اپنی غزلوں میں استعمال کیا ہے۔ انہوں نے اسے اکثر ملبوس تصور میں پیش کیا ہے اور اس طرح اس پر مقامی رنگ چھا گیا ہے۔ آزاد کا یہ شعر اس کا ایک واضح ثبوت ہے ؂

کاٗفری ہندی جامہ لاگتھ کامہ دیو لوٗب عاشقو
پردہ میانِس دردہ عشقس کعبہ تہٕ بُت خانہ میوٗن۔

سرخ لباس سے متعلق جو تصور دورِ گذشتہ سے ہم میں چلا آیا ہے وہ اب بھی کسی حد تک قائم ہے۔ ہماری سینہ بہ سینہ چلنے والی قصہ کہانیوں میں بھی اس رنگ سے وابستگی کا اظہار کیا گیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ چند حیوانوں میں بھی اس رنگ سے ایک خاص حس ابھرتی ہے۔ سرخ پیرہن میں کام دیو کا یہ تصور مہجور، آزاد اور دستگیر کے ہاں

یوں رہا ہے ؎

جامہ وو منزلی کامہ دیو لاگتھ دزراو
شامہ ژھایہ روگرِ روگرِ بانس ژاو
پرشہ چمنن مُشک گو جایرِ یے
ہاے سوزِ دِل میٖن تِرہ بوزہ وَن ہاگریے

(مہجور)

مارِ مندین شمن پلوی کا لرِگاہ نوی نوی
کامہ دیون کمی سوی جامہ وون زرلہ دونہ اییے

(آزاد)

رسول میر اور آزاد نے اسے گلابی رنگ کے لباس میں ملبوس نہایت حسین طریقہ سے پیش کیا ہے ؎

مسول پُہ ژٹے کامہ دیون جامہ گلابو
ہیتہ تن میہ دُزم ناہرہ گر اناہرہ متیو وے

(رسول میر)

رسول میر کے اسی خیال کا ایک اور شعر ؎

مسول پُہ دُزہ سوناہرہ کس ونہ گلابو
ہیہ میلتہ گلِ اناہرہ ہیتہ اکہ لٹے لو

(رسول میر)

اور آزاد کا یہ شعر ؎

کامہ دیوہ لاگتھ جامہ گلابی
وُچھتہ بے تابی سانہ نیے

(آزاد)

کہیں کہیں کام دیو کو کامکس یا کامکو کے نام سے پکارا گیا ہے مثلاً ؎

کامکس جامہ نافرمانی
چھُی بصورت یوسف ثانی
ننہ بون کیاہ گنہ تم خلہ
تنہ بدنے آسنے ولنیے

(رسول میر)

کامکو چھم چاکہ لوہ کامن
جامہ ژیتھ رٹے دامن

(رسول میر)

چند تصویر بتاں ——————— (صفحہ ۳۵ سے آگے)

پھر اس نے دوسرے پیالے کو دھیرے سے اُٹھایا اور ادائے خاص کے ساتھ کہنے لگا۔

"رِیتا۔ تمہارا بھی جواب نہیں۔ میں نے تمہیں سو بار کہا کہ ایک پیالہ چائے اور پی لو۔ مگر تم برابر انکار کرتی جا رہی ہو۔ یہ بات مجھے پسند نہیں۔ لو اب پی بھی لو۔ پھر ٹھنڈی ہو جائے گی۔ سارا مزہ جاتا رہے گا۔ لو اب پی لو۔ زیادہ نخرے نہ کیا کرو۔"

اس نے آنکھیں مٹکا کر گرم گرم چائے کے پیالے کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ "چائے کا جواب نہیں۔" پھر اس نے سیخ کے کباب کا ذائقہ چکھتے ہوئے کہا۔ "سُشما ذرا کباب تو ٹیسٹ کرو۔" اور خود کباب کھانے لگا۔

"کلپنا۔ تم ہمیشہ شرماتی رہو گی۔ پگلی۔ یہ سب مال تمہارا ہے۔ اُٹھا بھی لو اب۔ یہ پیسٹری ہے۔ اس سے اچھی پیسٹری سارے شہر میں نہیں ملے گی۔"

اور اس نے پیسٹری کا پیس اُٹھا کر مُنہ میں ڈال دیا۔

میرے پاؤں کے نیچے سے پھر زمین کھسکنے لگی۔ اس سے پہلے کہ زمین کھسک جاتی، میں وہاں سے کھسک آیا ——

دَورِ حاضر کا عظیم انسان

ٹیکساس کے شہر ابلینہ میں سماجی علوم کے میدان میں تحقیق کا کام انجام دینے والے ایک عالم مسٹر کالون سی کاڈون نے ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔

وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد کے نام اپنے ایک مکتوب میں مسٹر کالون لکھتے ہیں۔

"میں اپنی قوم کے ایک بہترین ہائی سکول میں سماجی تحقیق کا استاد ہوں۔ میرے خوشگوار اور صلہ بخش فرائض میں سے میرے ذمہ ایک کام یہ تفویض ہوا ہے کہ میں اپنے سکول کے طلباء کے سامنے آج کی دنیا کے رہنماؤں کی زندگی کے حالات اور ان کے کارناموں کی روئداد پیش کروں۔ جب میں اپنے لیکچروں میں اُن بے لوث، صادق اور خوش خلیق انسانوں کے کارہائے نمایاں اور ان کی فکر انگیز زندگی کے حالات بیان کرتا ہوں جن پر ہماری دنیا کی رنگ برنگ کی قوموں کے بھاری معاملات نپٹانے کی بڑی ذمہ داریاں آپڑی ہیں، تو ان موقعوں پر میں اپنے آپ میں بڑی اُمنگ اور گرمجوشی محسوس کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اپنے سکول کے ایک ایک لڑکے میں بھی یہی جوش و جذبہ اور یہی سرگرمی پاتا ہوں۔

سماجی علوم کے مطالعہ کے دوران اس موضوع پر کوئی بات چھڑتی ہے تو ہم خاص طور پر کشمیر کے قابل احترام، جفاکش اور سلیقہ شعار وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد کی شخصیت اور زندگی سے تحریک لیتے ہیں اور اس کا مطالعہ کرنے میں بڑی سنجیدگی برتتے ہیں۔

اس قوم کے رہبر ایک عمدہ نظام حکومت، عالمی امن اور سمندر پار کے ملکوں میں رہنے والے اپنے تمام دوستوں کی سلامتی اور ان کی بہبودی سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہی وہ قدریں ہیں جو بنائے رکھنے اور جنہیں تقویت پہنچانے کے لئے آپ نت نئی اور بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور اسی لئے میرے سب طالب علم آپ کی عزت کرتے ہیں اور آپ سے متاثر ہیں۔ آپ سچے معنوں میں اپنے ملک اور عوام کے لئے گراں قدر خادم اور ممتاز شہری کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عزت مآب وزیر اعظم — ایک عظیم قوم اور عظیم ملک کی امتیازی خصوصیت یہی ہوتی ہے کہ اس میں آپ جیسی ذہانت اور عظمت کے انسان خوشی خوشی اپنا سب کچھ اپنی قوم کے لئے وقف کر دینے کو تیار رہتے ہیں بین الاقوامی تعلقات میں مفاہمت کے لئے اور حکومت کے دائرہ میں آپ جو شاندار خدمات انجام دے رہے ہیں وہ ہمارے لئے فخر کا باعث ہیں آپ کی ریاست ہماری دنیا کا ہی ایک حصہ تو ہے۔ اس طرح سے ساری دنیا آپ کی صلاحیتوں اور ذہانت سے فیض پا رہی ہے۔ درس و تدریس کے پیشہ سے تعلق رکھنے والے ہم لوگ بھی آپ کے عمدہ کام سے بیحد لگاؤ رکھتے ہیں۔ ہم اس سے ضرور باخبر ہیں کہ عظیم الشان کشمیر کے وزیر اعظم کی حیثیت سے آپ کو کتنی اہم اور پیچیدہ ذمہ داریاں نبھانا پڑ رہی ہیں۔ ہم ان تمام ترقیاتی کاموں کا غائر نظر سے جائزہ لے رہے ہیں جو آپ کے عظیم ملک میں عمل میں آ رہی ہیں۔

اگرچہ ہم آپ کی خدمات کی زبردست افادیت کا اندازہ کر سکتے ہیں اور اس کو پرکھ لیتے ہیں۔ تاہم ہمیں نجی طور پر آپ تک شکریہ سے بھرپور اپنے جذبات پہنچانے کا شاذ و نادر ہی کوئی موقع ملتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے

کہ ہم پوری طرح سے یہ آنک نہ سکے ہوں کہ آپ کو اتنی خوبی کے ساتھ عوام کی خدمت انجام دینے کے لئے ذاتی طور پر کیا کیا قربانیاں دینی پڑی ہوں گی اس میں شک نہیں کہ ہم آپ سے متعلق ہر مضمون کا ذوق و شوق سے مطالعہ کرتے ہیں۔ پھر بھی ہم یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ آپ کشمیری عوام کی بہبود کے لئے اور اس طرح ہم سب کے لئے ایک بہتر دنیا کی تعمیر کی خاطر وقت وقت پر کتنے کوشاں رہتے ہیں۔ کیا کیا منصوبے سوچتے ہیں۔ کتنا فکرمند ہوتے ہیں، اور کتنی قوت صرف کرتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے آپ کو اب تک جو انتھک جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ ہم اس کی ایک معمولی سی جھلک تو پا سکتے ہیں مگر اس سے زیادہ کی جانکاری حاصل نہیں کر سکے ہیں بہرحال آپ کی خدمات میں کوئی کلام نہیں۔ ہم کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کریں۔

جناب وزیر اعظم — میں ایک سیدھا سادہ سکول ٹیچر ہوں۔ آپ اور میں آمنے سامنے شاید کبھی نہ مل سکیں گے۔ لیکن میں ذاتی طور پر آپ کو ان کارہائے نمایاں کے لئے جو آپ دُنیا کے بے شمار خوش خصال لوگوں کی خاطر انجام دے چکے ہیں، اور جو آپ مستقبل میں انجام دینے جا رہے ہیں، دلی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ ہم ہمیشہ آپ کی سرفروشی، آپ کی اولوالعزمی آپ کی بے غرضی اور مثالی کردار کے اس انداز کو ہمیشہ یاد رکھیں گے جس کے طفیل آپ نے اپنے کو اتنے ممتاز مرتبہ تک پہنچا دیا ہے۔

اپنی عظیم شخصیت سے آپ نے ہمیں جو فیض عطا کئے ہیں اُن کے لئے ہم شکر گزار اور احسان مند ہیں۔ جب تک مجھ میں دوسروں کو تعلیم دینے کی قوت رہے گی، میری کوشش رہے گی کہ میں عزت مآب وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد کی زندگی اور ان کے کاموں کی عظمت اپنے طلباء کے ذہن نشین کر دوں۔ آپ جس تعظیم و تکریم سے سرفراز ہیں، یقینی طور پر آپ اس سے کہیں زیادہ عزت افزائی اور قدر و منزلت کے روادار ہیں۔ آپ کا نام زمانے کے ہر دور میں زندہ اور تابندہ رہے گا۔ اگر میں اپنے طلباء کو کوئی سبق دینے کی خواہش رکھتا ہوں تو وہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ دنیا میں عظیم قوموں کی تعمیر تن آسان لوگوں نے نہیں کی۔ یہ قومیں عظیم انسانوں نے تعمیر کیں۔ ایسے انسانوں نے جو عزم صمیم اور مدبرانہ بصیرت کے مالک تھے۔ قوموں کی تعمیر کا کام آج بھی جاری ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ وزیر اعظم کی حیثیت میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور تدبر سے اپنے عوام کی آنے والی نسلوں کے لئے ایک آسودہ حال اور بہتر کشمیر کی تخلیق کر رہے ہیں۔

مجھے پورا یقین ہے کہ آنے والے برسوں میں آپ کی یہ خدمات زور و شور سے جاری رہیں گی۔ میں تہہ دل سے تمنا کرتا ہوں کہ آپ مستقبل میں جو عظیم کام انجام دینے جا رہے ہیں، ان کی تکمیل کے راستے میں کامیابیاں اور مسرتیں آپ کے قدم چومیں۔ ایک بار پھر مجھے شکریہ ادا کرنے دیجئے میری دعا ہے کہ پروردگار آپ کے شامل حال ہو، اور وہ ہمیشہ آپ کو سلامت رکھے!

دیہی زندگی کی شیرازہ بندی

ریاست جموں و کشمیر میں دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں اجتماعی ترقی اور اجتماعی توسیعی سروس اسکیموں کے تحت جو ٹھوس اقدامات کئے گئے ہیں ان کی مختصر سی تفصیل ذیل میں درج ہے:-

(۱) ۵۳ ترقیاتی بلاکوں کا قیام عمل میں لایا گیا
(۲) ۹۱۷ کمیونٹی سنٹر قائم کئے گئے
(۳) مختلف مقامات پر دیہی لیڈروں کے ۳۴ تربیتی کیمپوں کا اہتمام کیا گیا
(۴) بلاکوں کی مشاورتی کمیٹیوں کے ۱۲۲۴ اجلاس منعقد ہوئے
(۵) ۲۰۰۷ دیہاتیوں کو تربیت دی گئی
(۶) پینے کا پانی فراہم کرنے کی خاطر ۲۹۸ کنوئیں کھودے گئے
(۷) ۱۱۳۲ نئے اور جدید قسم کے اوزار کاشتکاروں میں تقسیم کئے گئے

دو غزلیں

جاوید وششٹ

بیانِ لالہ و گُل ہو کہ ذکرِ پیمانہ
حسیں سارے فسانوں میں تیرا افسانہ

خفا خفا سی اُدھر کچھ حرم کی محرابیں
کھِچے کھِچے سے اِدھر ابروئے صنم خانہ

کشاکشِ غمِ دُنیا سے ہوگیا آزاد
پہنچ گیا تری دُنیا میں تیرا دیوانہ

چراغِ لالہ و گُل سے، نہ جام و مینا سے
شرارِ غم سے فروزاں ہے شمعِ غم خانہ

ہجومِ رنگِ نشاطِ بہار ہے، تم ہو
کہ آخر آہی گیا کام خونِ دیوانہ

کرن بجھی سی ہے دُھندلا سا کچھ سویرا ہے
سبُو کو جام سے، ٹکرا دو خم سے پیمانہ

کسی کے عشق نے بخشی ہے آگہی ایسی
خرد کو درسِ وفا دے رہا ہے دیوانہ

بہارِ جشنِ چراغاں کبھی سرِ مژگاں
کبھی ہے شعلۂ جوالہ دِل کا کاشانہ

جنون جب بھی سرِ دار مسکرایا ہے
بنا دیا ہے خرد نے اُسے بھی افسانہ

جمود حد سے جو بڑھتا ہے بزمِ زنداں کا
تڑپ کے ہوتی ہے بیدار رُوحِ میخانہ

غمِ فراق سے جاوید دِل کا حال نہ پوچھ
بغیر شمع بھی جلتا رہا ہے پروانہ

راہی معصوم رضا

سفر میں ہمتیں اپنی نہ گر جواں ہوتیں
نہ منزلیں نہ علاماتِ کارواں ہوتیں

ضرورتوں کے اندھیرے میں ڈوب جاتی ہیں
نہ جانے کتنی زمینیں جو آسماں ہوتیں

دُعا دو چاکِ گریبانِ وحشتِ دِل کو
نہیں تو بخیہ گری کی کہانیاں ہوتیں

جنون نہ ہوتا تو گلشن میں کیا بہار آتی
بس اِک تھکی ہوئی شبنم کی سِسکیاں ہوتیں

بہار والو کہاں ہیں وُہ صاحبانِ جنوں
کہیں تو جیب و گریباں کی دھجیاں ہوتیں

اُن آرزوؤں کو لائیں کہاں سے فصلِ جنوں
وہ آرزوئیں جو اب کے برس جواں ہوتیں

شعورِ فن نے گریباں بڑھا دیا ورنہ
چمن میں دُور تلک صرف آندھیاں ہوتیں

[illegible]

چند تصویرِ بتاں

پُورَن کے گھر کی سیڑھیوں پر جب میں نے قدم رکھا تو جیل کے گھنٹہ پر چار بج رہے تھے۔ میرا ہاتھ بیل بجانے کو ابھی بڑھا ہی تھا کہ ایک دم رُک گیا۔

میں نے سوچا۔ آج چوروں کی طرح اس کے ڈرائنگ روم میں داخل ہونا چاہیئے۔

آہستہ سے میں نے دروازہ کھولا۔ اور مکان کے اندر داخل ہوکر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا اس کے کمرے تک بڑھنے لگا۔ جیسے کوئی چور چوری کرنے جارہا ہو۔

اس کے کمرہ کی کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھا تو میز خالی تھی اور مہمان جاچکے تھے۔ میز پر صرف چائے کا خوبصورت سیٹ۔ تین پیالے۔ انڈوں کے خالی خول، سیخ کباب کے بچے کھچے ٹکڑے، بٹر ٹوسٹ اور پیسٹری کے چند پیس باقی رہ گئے تھے اور میز پر ٹانگیں پھیلائے پورَن چائے کا آخری گھونٹ پی رہا تھا۔

آج یہ تیسرا موقعہ تھا کہ پورَن نے دعوت پر مدعو کیا تھا۔ اس سے پہلے جب میں آیا تو صرف میزبان باقی ہوتا اور مہمان چلے گئے ہوتے۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ابھی چلانا شروع کردے گا کہ

"اتنی دیر سے آئے۔ عجب آدمی ہو۔"

میں چُپ چاپ اس کے سامنے کی کُرسی پر بیٹھ گیا۔

اس نے پہلے تو گھور کر دیکھا۔ پھر ادھر اُدھر دیکھ کر چلانے لگا

"آگئے تم۔ یہ تمہارا وقت تھا آنے کا۔" پھر اُس نے کلائی پر بندھی خوبصورت گھڑی کو دیکھا اور کہا۔ "پُورے چالیس منٹ لیٹ۔ حد ہوگئی۔ آدمی ہو کر ... ... مدھو بھی کہہ رہی تھی کہ آپ کے دوست عجیب ہیں۔ جنہیں وقت کا پاس نہیں اور تم ہو کر ... ..."

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "مگر میں تو پُورے چار بجے یہاں پہنچ رہا ہوں۔"

وہ گرج کر کہنے لگا۔ "خاک۔ کس کم بخت نے تم سے چار بجے آنے کو کہا تھا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تین بج کر بیس منٹ تک پہنچ جانا۔ ورنہ وہ لوگ چلے جائیں گے۔ اور وہ چلے گئے۔ کب تک تمہارا انتظار کرتے! اچھا۔ اب جو ہونا تھا، ہو چکا۔ پھر سہی۔ جب تک پورَن سلامت ہے حسین چہروں کی کمی نہیں۔"

پھر اُس نے بڑی تمکنت کے ساتھ اپنے نوکر کو آواز دی۔

نوکر بھی عجیب تمکنت کے ساتھ کمرہ میں آیا۔ اور ٹی سیٹ اُٹھا کر لے گیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد دوسرا سیٹ سجا کر آگیا۔ یہ سیٹ بہت قیمتی اور جاذب نظر تھا۔

وہ کہنے لگا۔ "مدھا ہمیشہ قیمتی اور نازک پیالوں میں چائے پیتی ہے۔ اس لئے میں نے یہ آج ہی خرید کیا ہے۔ ودچاہ روز تمک میں اسے بھی ایک

پا رہا ہوں۔ فکر نہ کرو۔ تمہیں بھی دعوت دوں گا۔ ہاں مگر یاد رکھنا اگر اس روز بھی تم نے دیر کر دی تو پھر ہماری تمہاری دوستی ختم۔ "

سُندھا شہر کی وینس تھی یا کوئی آکاش کی اپسرا۔ جو دھرتی پر اُتر آئی تھی۔ اس قدر نرم و نازک جیسے بیدِ مجنوں۔ اس کا گدرایا ہوا جسم اس قدر ملائم تھا جیسے مکھن ——

گھور گھور کے کیا دیکھ رہے ہو۔ لو چائے پیو۔ کسی روز سندھا سے ملا دیں گے تمہیں۔ تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دیں گے۔ پیارے شہر کی کون سی لڑکی ہے جس نے تمہارے پورن کے ساتھ پیار کی پینگیں نہیں بڑھائیں اور قوس و قزح کے راستے چاند تک نہ پہنچیں۔ "

پھر وہ اُٹھ کر الماری کے پاس گیا اور وہاں سے ایک خوبصورت سا البم نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ جب میں نے دیکھنا چاہا تو وہ کہنے لگا ——

" پیارے صبر کرو۔ اتنے بے قرار نہ ہو۔ یہ تو میری زندگی کا خزینہ ہے۔ "

پھر اس نے خود ہی البم دکھانا شروع کر دیا۔

پہلا ورق اُلٹ گیا۔

میں دیکھتے ہی چونک اُٹھا —۔ " رتّا "

" ہاں پیارے۔ یہ رتّا ہے۔ ریڈیو آرٹسٹ۔ رینجر کی لاڈلی بیٹی۔ جس کی آواز سُن کر تمام لوگ پاگل ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ مجھے دیکھ کر پاگل ہو جاتی ہے۔ ہے نا کتنی خوبصورت بات —۔ "

دوسرا ورق اُلٹ گیا۔

یہ کملا ہے، صرف کملا۔ اس کے ماں باپ کون ہیں، یہ میں نہیں جانتا۔ یہ کہاں کی رہنے والی ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ صرف کشمیر کی سیاحت کے لئے آئی تھی کہ مجھ سے ٹکرا گئی —۔ یہ تصویر پہلگام کی ہے۔ اس کے پیچھے غور سے دیکھو۔ میرا چیسٹر پڑا ہے۔ دوست کیا بتاؤں۔ اس کی آنکھیں، بس جھیل ڈل کی مانند ہیں۔ دیکھو کتنی شانت اور کتنی گہری۔ بس میں اسی میں ڈوب کر رہ گیا۔ مگر دوسرے لمحہ میں تیر کر سطح پر آ گیا۔ ہم تو بھونرے ہیں بھونرے۔ اس کے بعد کملا، کیوں ؟ "

اس کے بعد وہ ورق اُلٹتا رہا۔ اور مختلف لڑکیوں کے عجیب عجیب پوز دکھاتا رہا۔ کوئی سکھنی تھی، کوئی دکھنی اور کوئی نرملا —۔

حیرانی سے میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ ایک پورن اور اتنی ساری لڑکیاں۔

پھر سب کی سب دِل کش۔ جاذبِ نظر اور حسین خط و خال والی۔ مگر وہ ہر ایک کے بارے میں یہی کہتا رہا۔

" یہ مُنہ اور مسور کی دال۔ کہتی تھی۔ مجھ سے شادی کر لو۔ ہی ہی ہی ! "

اور میں اس کے انتخاب کے بارے میں سوچنے لگا —۔ وہ کیسی لڑکی سے شادی کرے گا۔ وہ زمین پر رہنے والی ہو گی یا آسمان کی۔ بھگوان جانے۔ وہ کس قسم کی لڑکی کا انتخاب کرے گا —۔ "

پورن سے میری پہلی مُلاقات "کاسموپالٹین" میں ہوئی تھی۔

اس شام میں اپنے کسی دوست کا انتظار کر رہا تھا اور کافی انتظار کے باوجود جب وہ نہ آیا تو کوئی دوسرا نوجوان میری ٹیبل پر آ کر بیٹھ گیا۔ اور یہ پورن تھا۔

" آپ کس کا انتظار کر رہے ہیں ؟ "

" جی —— ! "

اور جب میں نے بغور اس کی طرف دیکھا تو مجھے خفت سی محسوس ہوئی۔ ایک اَن جانا۔ اَن دیکھا نوجوان۔ اور اس قدر صاف گوئی !

اس نے کہا۔ " انتظار چیز ہی ایسی ہے۔ مگر میں نے کبھی زندگی میں انتظار نہیں کیا۔ سبھوں نے میرا ہی انتظار کیا۔ اپنی اپنی ٹیکنیک ہے۔ "

" آدمی کافی دلچسپ ہو۔ "

" شکریہ —۔ " اور اس نے بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔ " آپ کا اس عورت کے بارے میں کیا خیال ہے ؟ "

میں نے حیرانی سے کہا —۔ " جی ! "

وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ " اجی صاحب۔ میں اس عورت کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ "

میں نے ہال میں بیٹھی ہوئی تمام عورتوں کی طرف چور نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ " کس عورت کے بارے میں ! "

" اجی صاحب۔ وہاں نہیں۔ یہ دیکھئے۔ "

اور جب میں نے اِدھر دیکھا تو بے ساختہ ہنسنا شروع کر دیا۔

" اسے لائف کہتے ہیں۔ یہ لائف کا سرورق ہے۔ عورت۔ لائف جیسے "بیسویں صدی"۔ "شاہراہ"۔ "شاعر"۔ مگر ان میں زندگی بکتی ہے۔ صرف زندگی اور "لائف" میں عورت بکتی ہے۔ دیکھا مشرق و مغرب کا فرق۔ یہ

عورت۔ یہ گدرایا ہوا جسم۔ یہ گہری آنکھیں۔ یہ لہراتے ہوئے بال ـــ یہ ہونٹ۔"

میں نے سوچا۔ "عجیب شخص ہے۔ مگر ساتھ ہی دلچسپ بھی۔ نہ جان نہ پہچان اور اتنی جلدی گھل مل گیا۔ جیسے برسوں کا دوست ہو۔"

"چائے پیجئے گا!"

"شکریہ۔ ابھی پی کے ہی آرہا ہوں۔ کل آپ میرے مہمان۔ پورے پانچ بجے یہاں پہنچ جائیے گا۔ بائے بائے۔"

اور وہ تمکنت کے ساتھ ہوٹل سے چلا گیا۔

دوسری شام جب میں "کاسمو" میں پہنچا تو ہر طرف زندگی ہی زندگی تھی۔ ریڈیو گرام پر کسی انگریزی دُھن کا ریکارڈ چل رہا تھا۔ اور وہ اکیلا ٹیبل پر چائے کا سیٹ سجائے ہوئے میرے انتظار میں بیٹھا تھا۔ جب میں اس کے پاس جاکر کرسی پر بیٹھ گیا تو کہنے لگا۔

"یار۔ پندرہ منٹ لیٹ۔ ابھی ابھی نرو تما بیٹھی تھی۔ چلی گئی۔ شاپنگ کر رہی تھی کہ اچانک مل گئی۔ پوچھنے لگی۔ "کیا حال چال ہے۔ کبھی چائے تو پلوا دو ہمیں۔ بہت دن ہوئے آپ کے ساتھ چائے پیئے ہوئے۔ بس' یار! تم ذرا پہلے آجاتے تو مزا آجاتا۔ خیر جانے دو۔ مگر میری ایک نصیحت یاد رکھو۔ وقت کے ہمیشہ پابند رہو۔"

میں نے ہال میں لگے کلاک کی طرف دیکھا تو واقعی میں کسی حد تک لیٹ تھا۔ میں نے کہا۔ "دو منٹ۔ اب کے غلطی ہو گئی۔ آئندہ کبھی نہ ہوگی۔"

"چلو معاف کیا!"

اور پھر ہم دونوں چائے پیتے رہے اور خوش گپیاں کرتے رہے۔

وہ اٹھائیس کے لگ بھگ تھا۔ دُہرا جسم۔ بیضوی چہرہ۔ گورا رنگ۔ گھنگھریالے بال۔ چھوٹی چھوٹی شرارتی آنکھیں۔ اور ان پر نظر کا چشمہ۔ مگر جدید طرز کا' جسے عموماً عورتیں پہنتی ہیں۔ پینٹ اور جیکٹ پہنے تھا۔ سردی ہو تو بشش شرٹ پہن لیتا تھا اور گرمی ہو تو کوٹ۔ بڑا عجیب اور دلچسپ نوجوان تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔

"دوست تم کرتے کیا ہو؟"

ہنس کر کہنے لگا۔ "وہی کام جس سے وارے کے نیارے ہوتے ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "تو پھر چوری کے سوا دوسرا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔"

اس نے جواب دیا۔ "خوب۔ ہوں تو چور' مگر نفیس قسم کا۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میرے نام پر لوہے کی برآمدگی کا پرمٹ ہے۔ بس کافی ہے۔"

"تب تو واقعی وارے کے نیارے ہو جاتے ہوں گے!"

"جی ہاں۔ بس بچا ہی لیتے ہیں۔ مگر تم ـــ"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "بس پیارے۔ جھک مارتے ہیں۔"

"خوب۔ تمہاری جھک کا جواب نہیں۔"

پھر ہم اسی ہوٹل میں ملنے لگے۔ وہ ہمیشہ نئے نئے لباس پہن کر آتا۔ جب ہی وہ بل چکاتا۔ جیب سے سَو کا نوٹ ہی نکالتا۔ میں حیران رہ جاتا۔ کم بخت سَو کے نوٹ کے بغیر بات ہی نہیں کرتا۔ اس کی باتوں کی زمین ایک ہی تھی۔ خوبصورت لڑکی۔ جیسے گلاب کا پھول۔ ہنستا ہوا' خوشبو پھیلاتا ہوا' اور ایسی ہی لڑکی کے گرد اس کی تمام باتیں گھومتی تھیں۔

جب بھی وہ ہوٹل میں آتا۔ تو دو چار ضرور اس کی آشنا لڑکیاں بیٹھی ہوتیں۔ میں اس سے کہتا۔ "ان میں سے کسی کو اپنی ٹیبل پر بلا لو۔"

مگر وہ جواب دیتا۔ "نہیں دوست۔ پوُرن زندگی میں ایک ہی بار کسی لڑکی کو اپنی ٹیبل پر آنے کی دعوت دیتا ہے۔ کیونکہ لڑکیاں ایک ہی بار سب باتیں اُگل جاتی ہیں۔ اس کے بعد ان کے پاس باقی کچھ نہیں رہتا۔ نہ وہ الفاظ اور نہ آنکھوں کے تیر۔ اور پھر میں بور ہونا نہیں چاہتا۔ بوریت سے مجھے سخت نفرت ہے۔"

اتوار کو اس نے پھر گھر پہ ایک دعوت کا انتظام کر رکھا تھا۔

شدھا آرہی تھی!

جیسے بہار آتی ہے۔ ہولے ہولے۔ خراماں خراماں!

مجھے پوُرن پر رشک آنے لگا۔

"کم بخت کے پاس کون سا سحر ہے' جسے وہ لڑکیوں پر پھونک دیتا ہے اور وہ اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔"

سدھا آرہی تھی۔

جس کی چال دیکھ کر مور بھی اپنی چال بھول جاتا ہے۔

ستھا !
جس کی آنکھوں میں آسمان کی تمام نیلاہٹیں گھلی ہوئی تھیں۔

سُدھا !
جس کے سر کے لمبے لمبے بال، سیاہ فام۔ جیسے سیاہ گھٹائیں!

اور جب میں سیاہ گھٹاؤں کے نیچے ٹھنڈی ہوا لینے پہنچا تو میز پھر خالی تھی۔ پلیٹیں، پیالے، سب صاف۔ انڈوں کے خالی خول۔ اور ــــ

میں دبے پاؤں اندر آ گیا۔

"آج میں پھر دیر سے ... "

"تو کیا وقت پر پہنچے ہو۔ تمہیں تین بجے آنے کو کہا تھا نہ کہ چار بجے ــــ"

"تین بجے ــــ"

"تو پھر اب تو چار بج رہے ہیں۔"

"ہاں۔ اب تو چار ہی بج رہے ہیں۔ اگر تم کہو گے کہ صبح ہو چکی ہے۔ تو بھی مان لوں گا۔"

"آدمی ہو کر جانور ــــ"

"جانور ــــ"

پھر ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اور کافی دیر تک ہنستے رہے۔ اور ہنسنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

"عجیب مذاق ہے۔ جب بھی اس نے مجھے مدعو کیا۔ دیر سے پہنچا۔ پھر وہ کب گھر پر کسی کو بار بار دعوت دیتا ہے۔ کم بخت ہوٹل لے جائے گا۔ ہوٹل میں مل جائے گا سینما ہال میں نظر آ جائے گا۔ مگر گھر پر صرف لڑکیوں کو ہی دعوت دے گا۔ پھر اس کی مجھ پر یہ کرم فرمائی کس لئے ؟"

گذشتہ کئی دنوں سے میں پریشان تھا۔ اور زیادہ پریشانی یہ تھی کہ میں نے ہمیشہ سنہری موقعے گنوا دیے تھے۔ اور پُورن کی ان باتوں سے محروم رہ گیا تھا جو وہ لڑکیوں سے کرتا ہے۔ میں نے سُنا تھا کہ وہ عجب انداز میں آنکھیں مٹکا مٹکا کر، ہونٹ دبا دبا کر اور ہر بات پر مختصر سا قہقہہ لگا کر بات کرتا ہے۔ میری ایک یہ بھی تمنا تھی کہ اس کی وہ باتیں سُنوں جس کے فن سے وہ لڑکیوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔

ایک شام میں ریزیڈنسی روڈ پر کسی دوست سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک مجھے وہ مل گیا۔ اس نے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ جب بھی اُسے کوئی رازدارانہ یا خاص بات کرنا ہوتی تھی تو وہ اشارے سے بلایا کرتا تھا۔

کہنے لگا۔ "کل شام کو میرے یہاں چلے آنا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا کوئی خاص فنکشن ہے ؟"

"ہاں پیارے۔ وہی فنکشن۔ مگر سوچتا ہوں۔ تمہیں دعوت دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ تم آؤ گے ہی دیر سے ــ۔"

"ضرور آؤں گا اور پورے چار بجے پہنچ جاؤں گا۔"

وہ ہنس کر کہنے لگا۔ "یہ ہوئی نا بات۔ مگر یاد رہے کہ یہ موقع بار بار ہاتھ نہیں آئے گا۔ تین لڑکیاں آ رہی ہیں۔ تینوں اے وَن ریڈیو آرٹسٹ ہیں۔"

"ریڈیو آرٹسٹ ؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں میرے بھائی۔ تینوں ریڈیو آرٹسٹ۔ ایک ڈرامہ آرٹسٹ، ایک مغنیہ اور تیسری ادیبہ ہے۔"

"کیا یہ تینوں سگی بہنیں ہیں ؟" میں نے پوچھا

"ابھی نہیں۔ دوست ہیں یعنی کہ سہیلیاں۔"

"ہائے ہائے ــــ"

دوسری شام تک ایک ایک لمحہ ایک ایک برس کا محسوس ہونے لگا۔ وقت گزرنے میں نہیں آ رہا تھا۔ اور جب وقت کروٹیں بدل بدل کر اِدھر اُدھر گھوم پھر کر گزار دیا تو دو بجے ہی میں نے اس کے گھر کا رُخ کیا۔

چور کی طرح دبے پاؤں میں اس کے ڈرائنگ روم تک پہنچ گیا۔ اور جب میں نے پردے کو قدرے سرکا کر اندر جھانکا تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ہوا میں لٹک رہا ہوں۔ اور پھر جب میرے پاؤں تلے زمین آ گئی تو میں بغور اس کی باتیں اور حرکتیں سُننے اور دیکھنے لگا۔

اس نے دائیں طرف کے پیالے کو بڑی نزاکت کے ساتھ اُٹھایا۔ اور پھر ڈرامائی انداز میں کہنے لگا ــــ

"شُما۔ پی لو نا۔ تکلف اچھا نہیں ہوتا۔ یہ ٹی سیٹ میں نے خاص انگلینڈ سے منگایا ہے۔ مجھے پتہ تھا کہ ایک روز تم چائے پینے آؤ گی۔ اس کے باریک کنارے دیکھ کر ہی کہنا پڑتا ہے جیسے تمہارے پتلے پتلے ہونٹ ہوں۔"

اور یہ کہہ کر اس نے خوبصورت اور باریک کنارے والے پیالے کو اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگا لیا۔

دُو سانیٹ

خوابِ غزالاں

جمیلہ، شعر کی دُنیا ہے، نازِ نغمہ سنجاں ہے
تیرا سیمیں بدن، سرشارِ صہبائے لطافت ہے
خمارِ بادۂ نابِ جوانی ہے، نزاکت ہے
بہارِ ناز و نغمہ ہے تُو ہی جانِ بہاراں ہے
تیری آنکھوں میں رعنائی ہے یا خوابِ غزالاں ہے
طرب زارِ مسرت ہے شبستانِ محبت ہے
شبِ مہتاب کا خواب آفریں حسنِ صباحت ہے
غزل کی جان ہے تُو شاہدِ نازک خیالاں ہے
سرورِ شعر و نغمہ، لذتِ رقصاں نگاہوں میں
تجھے حسنِ شبستانِ بہاراں کا فسوں کہہ دوں؟
وہی زُلفوں کا تابندہ خزانہ عطر و عنبر کا
جسے غارت گرِ ہوش و سکوں، جانِ جنوں کہہ دوں؟
مگر تُو زینتِ شہرِ طرب، شہرِ نگاراں ہے
غزل کی جان ہے تُو شاہدِ نازک خیالاں ہے

حسنِ خیال

بہارِ لالہ و گُل ہے کہ خوابِ رعنائی
چھلک رہی ہے تری آنکھوں سے شرابِ جمال
سرورِ بیز و لبالب ہے جس سے جامِ خیال
ہے کائناتِ محبت میں تیری دارائی
میرے خیال و تصور میں تجھ سے برنائی
کسی مصورِ نازک قلم کا جیسے حسنِ خیال
خطوطِ جسم، وہ آنکھوں کے زاویوں کا کمال
سمٹ گئی ہے بدن میں تیری جو رعنائی
دھڑک رہی ہے دلِ ساز میں وہ صوتِ نغمہ
دہک رہی ہے رُخِ گُل میں، موجِ صہبا میں
چمک رہی ہے ستاروں کے نرم آبگینوں میں
حنا کے رنگ میں پنہاں ہے، خوابِ رعنا میں
تمہاری یاد کی زُلفِ حسیں جو لہرا ئی!
بہارِ لالہ و سنبل نے لی ہے انگڑائی!

پروفیسر رام چند پنڈتا

تعلیمِ نسواں — چند رُجحانات اور سوالات

پروفیسر پنڈتا کشمیر کے اچھے تعلیمی ماہروں میں سے ہیں۔ وہ ایک منجھے ہوئے معلم اور مفکر بھی ہیں۔ عورتوں کی تعلیم کے متعلق انہوں نے اس مضمون میں ایک بحث طلب نظریہ پیش کیا ہے۔ خود اس مضمون میں بھی پروفیسر صاحب نے دوسروں کو دعوتِ فکر دی ہے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ تعلیم نسواں سے دلچسپی رکھنے والے تعلیمی ماہر اور جان کار مرد اور خواتین دونوں اس طرف متوجہ ہوں گے۔

"تعمیر" میں اس موضوع پر ہر فکر و خیال کے مضامین بڑے شوق سے شائع کئے جائیں گے۔ (ایڈیٹر)

کسی مُلک یا سماج کے ارتقا کے لئے تعلیم کو مقبولِ عام بنانا اور صحیح طریقے پر وُسعت دینا ایک بُنیادی ضرورت ہے۔ ہمارے چھوٹے سے ملک میں گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے دوران اور خصوصاً جدید ترین زمانے میں جو انقلابات ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رُونما ہوئے اُن کی اہم ترین وجہ منجملہ دیگر وجوہات کے یہی ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے اور فنِ تعلیم میں بھی روز بروز ترقی ہو رہی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں۔ مگر اب وقت آگیا ہے کہ ہم موجودہ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اُن خامیوں کی طرف بھی توجہ دیں جو ہماری لاپرواہی، کج فہمی یا کوتاہ اندیشی سے ہمارے بچوں کے طریقۂ تعلیم میں داخل ہو رہی ہیں۔ ان تمام نقائص پر بحث کرنا یا وضاحت سے ذکر کرنا ایک مختصر سی تحریر میں ممکن نہیں۔ تاہم ذاتی تجربہ کی بنا پر طبقۂ نسواں کی موجودہ تعلیم سے متعلق دو ایک غور طلب امور پر کچھ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا۔

وہ زمانہ بہت دُور نہیں جب ہماری بہو بیٹیوں کے مفاد کی خاطر سرکاری یا غیر سرکاری تعلیمی اداروں کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ عام طور پر لڑکیوں کے لئے گھر سے باہر قدم رکھنا یہاں تک کہ کھڑکی سے سر نکالنا بھی شرافت اور تہذیب کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ ان گھر کی چار دیواری کے اندر ہی کہیں کہیں قرآن شریف یا گیتا جیسی مقدس کتابوں میں لڑکیوں کی سرسری طور پر تعلیم و تدریس کا تھوڑا بہت انتظام تھا۔ مگر ننانوے فی صد لڑکیوں کو عام تعلیم سے محروم رکھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ سماج کا نقطۂ نگاہ وُسعت پکڑتا گیا۔ اور اب یہ حالت ہے کہ سکولوں اور کالجوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی ہے اور لڑکیوں کو لڑکوں کے دوش بدوش ان اداروں میں داخل کرنا تقاضائے وقت کے پیشِ نظر ضروری اور باعثِ فخر سمجھا جا رہا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ تعلیمی امور میں طبقۂ نسواں کو پُوری آزادی اور حقِ خود ارادیت حاصل ہے۔ عورتوں کے تئیں وہ پُرانی بے اعتنائی اور بے انصافی کا دَور ختم ہو رہا ہے یہ امر تسکین بخش تو ہے۔ مگر ساتھ ہی سچائی اور دُور اندیشی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہم موجودہ حالات اور ہوا کا رُخ دیکھ کر اپنی بہو بیٹیوں کے مستقبل پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور ایسی تدابیر عمل میں لائیں کہ ہمارا کلچر محفوظ رہے اور ہماری معاشرتی زندگی درہم برہم نہ ہونے پائے۔

میرے تمام مہربان دوست میرے ساتھ متفق الرائے ہوں یا نہ ہوں مگر آج سے بیسوں پہلے کینیڈا کے ایک مشہور و معروف پروفیسر سٹیفن لی کاک (Stephen Leacock) نے اسی نوعیت کے خطرے کی گھنٹی بجائی۔ جب اُس نے اوکسفورڈ یونیورسٹی میں زن و مرد کی مخلوط تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:-

"یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ ہم عورتوں کی مخصوص قدرتی زندگی

کو نظر انداز کر کے اُن کا بیش بہا وقت اور زرِ کثیر ایسی تعلیم و
تربیت پر صرف کرواتے ہیں جو انجینئرنگ اور وکالت جیسے
شعبہ جات اور پیشوں کے لئے کارآمد ہے جن کا تعلق مردوں
کی زندگی کے ساتھ ہے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لڑکوں
اور لڑکیوں کو ایسی تعلیم و تربیت دی جانی چاہیئے جو اُن کی
جُداگانہ طرزِ زندگی سے موافقت رکھتی ہو اور اُن کے مستقبل
کے لئے مفید ثابت ہو سکے۔ یہ ایک بُنیادی حقیقت ہے کہ بالآخر
عورت کا کام ازدواجی زندگی بسر کرنا، بچوں کی پرورش اور تربیت
نوکروں کی دیکھ بھال اور اسی قسم کی دیگر خانگی ذمہ داریاں سر
انجام دینا ہے۔ گھریلو زندگی کے یہ مقدس اور اہم ترین فرائض
مرد انجام نہیں دے سکتا۔ لڑکیوں کے لئے زبان دانی، تواریخ،
جغرافیہ، موسیقی، خانگی حساب، خانگی سائنس، صحت و صفائی
کے بُنیادی اصول اور تمام دست کاریوں کی تعلیم اور عملی کام سیکھنا
ضروری ہے۔ قطع نظر اُن معدودے چند لڑکیوں کے، جن کی
زندگی کا نصب العین ہی مختلف ہو یا جو کسی خاص مضمون میں
دلچسپی یا مذاق رکھتی ہوں، مندرجہ بالا مضامین کا مطالعہ کرنا
ہی کافی ہے۔ کالجوں میں ان مضامین کے علاوہ علم النفس
(Phychology) اور علومِ طبعی (Natural
Sciences) کا مطالعہ اُن چند ہونہار طالبات کے لئے
ضروری اور مفید ہے جو اساتذہ یا ڈاکٹروں کا پیشہ اختیار کرنے
کی خواہش مند ہوں۔ بشرطیکہ ایسے مشکل مضامین پر عبور پانے کی
اُن میں اہلیت بھی موجود ہو۔ ظاہر ہے کہ لڑکیوں کی بڑی بھاری
اکثریت کے لئے چند مضامین مثلاً اُونچے معیار کی ریاضی
(Higher Malkematics) فزیکس اور کیمسٹری پر
وقت صرف کرنا بے معنی ہے۔ شادی کے بعد ایک سال کے اندر
اندر اکثر لڑکیاں ریاضی اور علومِ طبعی کی ابتدائی باتیں بھی بھول
بیٹھتی ہیں۔ کیونکہ اُن کا تقریباً سارا وقت ضروری خانگی مشاغل
میں گذرتا ہے جن کی اہمیت محتاجِ تشریح نہیں۔

یہ ہیں خیالات ایک روشن دماغ، تجربہ کار اور دُور اندیش پروفیسر کے

جو اُسی مغربی تہذیب سے وابستہ ہے جس کے ہم دِل و جان سے اندھا دھند
پیروی کر رہے ہیں۔ حالاں کہ ہماری تہذیب اور ہمارا کلچر صدیوں پُرانے ہیں اور
دُنیا ان کا احترام کرتی ہے۔

حصولِ تعلیم کے لئے تمام ممکن سہولتیں بہم پہنچانا ہر ایک مہذب حکومت
کا فرضِ عظیم ہے۔ چناں چہ اس فرض کی انجام دہی نیا کشمیر کا نصب العین ہے
ہماری سرکار نہایت سُرعت اور گرم جوشی کے ساتھ ہر سال قابل اساتذہ اور
اعلٰے تعلیمی اداروں میں اضافہ کرتی ہے۔ ثانوی تعلیم بھی مُفت کر دی گئی ہے
اور مستحق طلبا کو وظیفے دئے جاتے ہیں۔ تاہم ہر سال ہزاروں اُمیدوار یونیورسٹی
کے امتحانات میں ناکام رہتے ہیں اور اس طرح سے ہمارا قومی سرمایہ ضائع ہو رہا
ہے۔ اس کی بڑی بھاری وجہ یہی ہے کہ لوگوں میں بچوں سے متعلق اپنی ذمہ
داری کا احساس نہیں۔ ہر ایک شہری کا فرض ہے کہ وہ اپنے لڑکے لڑکیوں کی
جسمانی اور دماغی قابلیت اور فطری رُجحانات دیکھ کر تعلیمی امور میں اُن کی صحیح
رہنمائی کرے اور اوائلِ عمر میں اُن کے چال چلن اور عادات پر کڑی نگرانی کرے
ہر ایک والد کا یہ اپنا کام ہے، گورنمنٹ کا نہیں۔

اگر تعلیم یافتہ شہریوں اور خصوصاً والدین کی سہل انگاری اور کوتاہ
اندیشی کا یہی حال رہا، جو اَب ہے اور ان تعلیمی مسائل کی طرف فوری توجہ نہ
دی گئی تو یقیناً لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں پہ اس کا زیادہ بُرا اثر پڑے گا۔
اس میں شک نہیں کہ تعلیمِ نسواں ابتدائی منازل سے گذر رہی ہے۔ لیکن ابھی
سے ایسے آثار رُونما ہونے لگے ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مستثنیات
درکنار، بحیثیتِ مجموعی ہماری لڑکیوں کا جسم کمزور اور صحت نازک ہوتی ہے۔
پڑھائی کے ساتھ ساتھ اُنہیں گھر کا بھی تھوڑا بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ اِس
حقیقت کے پیشِ نظر اُنہیں من مانی کرنے پر چھوڑنا یا اُن کے جسم اور دماغ
پر زیادہ بوجھ ڈالنا سراسر غلطی ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں اختیاری مضامین
لیتے وقت اُن کی رہنمائی کرنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ یہ سودا بہت مہنگا پڑے
گا۔ بالعموم ریاضی اور علومِ طبعی انہیں نہ لینے دیں یا لینے پر مجبور نہ کریں تاوقتیکہ
ان مشکل مضامین کا مطالعہ کرنے کی ان میں جسمانی اور دماغی اہلیت نہ ہو۔ اعلیٰ
تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا طبقۂ نسواں کو بھی ویسا ہی حق ہے جیسا کہ
مردوں کو۔ بشرطیکہ وہ اپنی ذاتی قابلیت اور اپنے مستقبل دونوں کا بھی خیال
رکھیں۔ عورت گھر کی [illegible] ہے۔ گھر کو آباد اور آراستہ کرنا اُس کی زندگی کا [illegible]

نعیم

ستمبر اکتوبر [illegible]

یتھ جہانس منز سنٛز، سوچنٛ، عمن آو کڈُن
سو دمہ چشمن ہنز کشش حسنس تہٕ نابا روز ؤنی
یتھ جہانس منز چھہ لوٚلیچ زندگی ناپائے دار

دوٚن تھ سکھر، ڈبہ تلُ تہ دوٚن تھ کٹھ واشن دوٚن تھ پرواز کر
دوٚن تھ ژہ! بوٗ تہٕ وڈوہ کرِتھ وُزٕ وات ژٕے نش آسمانٕ
از میہٕ لو آسی مگر ڈبہ ہور اوٚبرک گر گھسن؟
از میہٕ چھم وڑوہ کرُن واشہٕ کڈُن وا تِن ژٕیہ نش
شاعری ہندیٚن نوین نوٚزک پرن سیدِ تھ سوار
گوٚ خیالن کھر میہٕ چھم آمُت دِماغس انتشار
مات وِچھ کاژہ حسین تٔمس چھوٗر تٔے خوشگوار
زوٗن زن ملکانٕ تختس پیٹھ بہت دِلشاد از
تارکن ہنز لشکرہ چھس سیتی اندی اندی راچھ در
وِچھ مگر یتھ جایہِ کُن اکھ گاشہ لی تامت چھہ ما
او مگر تمہِ گاشہ ژوس تمہ نوٗرہ ژوس پہ اگاشہ ژوس
خوش ہوا آکاشہ پیٹھ یہ کُنٕ چھہ پڑ ز لاوان یتھ
کوتاہ لنجین سرسبز پنہٕ برگن ہنا حرکت کرِتھ

پاوش کم پھولیتہ کمو رن تل چھس نہ کینہہ ڈیشتھ ہیکان
چھم نہ کینہہ یوان تگان کینتھ کنہ گگرہ تہ وُٹھ
پرچھِ لنجین پیٹھ چھہ مشکن مختلف ترایہ اندر
چھم فقط اندازہ سپدان بس پہ ہوی اندازہ ہیو

تنہا

نوٚبہارُک یُس بہران دامن حیاتک پوٗرہ پانٕ
نوٚبہارُک یُس کران بُت راژ میانے مال دار
یُس کران ترتازگی گاسس عطا پوشن چھ رنگ
اسِ لو سیتی ژوٗٹ کجہِ ہند سخت بدلاوان یُس
کنڈ دوٚن چمن منز یُس چھہ کھاران مشکہ ہٹ چھتی چھ گاب
یاسمن بھرِ یابو سند ہیو یا وُنہہ بخشان یُس
لولہ چشمن سودمہ یُس لاگان چھوی یمبر زلن
داآن پوشن ڈوٗرہ ڈورے یُس بہران نارہ پھرِس
لالہ رویس پیالہ یُس تھاوان بھری بھری شبنمک
یُس چران دایان سازہ ماچھ تلرے لولہ ہتی
سونتہ کِس شامس نیستانن، گلستانن اندر

دِلبراہ دِل چھوی گواہی از دِوان کیاہ تام مے
چھوی میہٕ موتس سیتی کوٚرمُت بارہا یارانہ ہیو
میٹھ آو چھم تمِس دِتمِت سیٹھاہ پتّ ناو ہیتھ
بارہا وَدمس بہٕ مرہا مو کلہ ہا جنجالہ نش
جان مرنوٗی از تہِ چھس آسان سونچان بار بار
خوش بہٕ گژھہا از اگر یِیہ پے اجل نوت پانٕ مے
نصف راتن بے خبر یانٕ ژھین تہٕ نیہ پے توٗری مے
اوتمی وقتن ژہ ملہ گیوٗنس اندرمست آہنگ
شوی گیوٗن یتھ منز ژٕ نیہہ بوزمت آسہ یتھ خونِ جگر
یتھ ہوائی روِ مت کیاہ آسہ لیکن قبرِ منز

میٹھو آلَو چاٗنٛز آیہ ما آسہٕ بوزان بُلبُلا ہ

چھُکھ ژٕہ لافانی تہ لاثانی سیٹھاہ رُت جانور
مرنہٕ پت ما ژٕہ اوسکھ پیدہ گومُت بُلبُلا ہ
ہنٛول ژٕیہ ییم ازتام وُچھنۍ چھا چنگیزی نسل کانٛہہ
میٹھو آلَو چاٗنٛز ییم بوزان بُچھس یتھ راز منٛز
ییم چھہ ہم آلَو یمن بوزان آسے شاہ و گدا
ازلہٕ پیٹھہ ازتام ہر رنگس تہ ہر آنس اندر
ہُو بہو شاید ییمائے آلَو سینٛتیٚ رودٕہ آسی
یُل بُتس وطنک غمن دیراگ ٹھُمت اوسے
خوٗن جگرُک یُل سو ہاران آسہ پردیس اندر
دِل وُباٗلی کرٕہ اُمی آوازٕہ پٔرِیَن کاژہن
تل پتالن منٛز امی آوازٕہ کم دیوانہ کرٕہ
کاٗتھن نوٗژک دِلن لگ داغ تنہائی اندر

لفظِ تنہا بوٗزِتھی احساس گو میانِس دِلس
لفظِ تنہا بوٗزِتھی گو میوٚن دِل ہوشیار ہیوٚ
بار پھیرت آسن بیٚیہِ پننِس شعورس کن بہٕ دوہٕ ژ
دوہٕ ژ گریا راتھ کوتاہ کال ژسے سیتی تھاوٕ ہا
الوداع! گمراہ کرِتھ دوہٕ ژ ہیٚکہِ نہ کانٛہہ رنگین خیال
یتھہ کُنتھہ افسانہ وابستہ اَتھ کُن سپدِ ہت
اُم خیالن یتھہ کُنتھہ بِن تتے پُری نشہ راوٕمت
خیر گژھہ کرپھیرٕنہ، تو کُن ژیٚہہ یو کُن دِل دَنی
الوداع! بس الوداع

در دِہ ہَتِ ییم چاٗنٛز آلَو دوہٕ ژ ہیٚتِن لوٚت لوٚت ژلن
ہورکن میدانہ منٛز ہمہِ آرہ کِن ہمہِ بالہِ پیٹھو
بالہٕ پت آسن گمتِ تِم دفن کنہِ سنٛزِن اندر
کیاہ یہ ما اِلہام اوسُس یا خواب بیداری اندر
دوہٕ ژ یہ گیوٚ نوٗی غاٗب گو کمہِ طرفہ ژٕ دِل کوٚت ژھیٚپ وُژن
کیاہ چھُسا بیدار بہٕ یا ننٛدرِ منٛز؟

(بشکریہ ریڈیو کشمیر سرینگر)

نگارشات

ارسال کرتے وقت یہ امر خاص طور ملحوظ خاطر رکھیے کہ وہ
غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہوں!

رشید نازکی

زآر کی شاعری — ایک تعارف

مہجور اور آزاد کا دَور کشمیری شاعری میں قومی بیداری کی حیثیت سے بہت اہم دَور ہے۔ یہی وہ دَور ہے جس نے کشمیری قوم کو خاصی مدت تک دار و رسن کی آزمائش میں گرفتار کیا۔ نئی اور پُرانی قدروں کا تصادم ہوا اور اس تصادم نے ذہنی انقلاب کی صورت اختیار کر لی۔ چناں چہ اس دَور کے فن کاروں کے ذہنی ارتقاء کو بہت سے نشیب و فراز دیکھ لینے پڑے۔ ایک طرف روایاتی غزل گوئی اُن کا دامن تھام رہی تھی۔ اور دوسری طرف وقت کے سنگین تقاضے اُن کے گریبان گیر تھے۔ چنانچہ اس دَور کے شعراء کے کلام میں بغیر صوفی شاعروں کے یہ نشیب و فراز بہت صاف نظر آ رہے ہیں۔ اس دَور کے دو اہم شاعروں مہجور اور آزاد نے بھی سوایاتی غزل گوئی ہی سے اپنی نغمہ سرائی شروع کی۔

زآر اسی قافلے کا ایک اور مسافر ہے۔ لیکن اُس کی شاعری کی چند اہم خصوصیات ہیں۔ سب سے بڑی خصوصیت رجعت پسندی سے شدید بغاوت ہے۔ شاید اسی بغاوت کا نتیجہ ہے کہ زآر نے عام ڈگر سے ہٹ کر اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے نہیں کی۔ بلکہ زندگی کے ٹھوس حقائق کی پیروی سے شروع کی۔ غلام سماج کی ہر عادت اور ہر حرکت شاعر کے دل کا درد بن کر الفاظ کا جامہ پہننے لگی۔ لیکن یہاں بھی وہ انقلاب کا ڈھنڈورہ پیٹ کر پیش نہیں ہوا بلکہ رچے ہوئے خیال اور سلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ غلامی سے پیدا ہونے والے اثرات کا نہایت عمیق نظر سے مطالعہ کرتا رہا۔ وہ طوفانی نالوں کی طرح نہ اُبھرا اور نہ گرجا بلکہ شیریں چشموں کی طرح نہایت خاموشی کے ساتھ غلامی کی دلدل سے رِستا رہا۔ اُس نے فقط اپنی بات کہنے پر ہی اکتفا نہ کیا۔ بلکہ وہ پلٹ پلٹ کر اپنی بات کا اثر دیکھتا رہا۔ وہ ذہنی انقلاب کو ہی سب سے بڑا انقلاب سمجھتا رہا۔ اُس نے غلامی کے

تعمیر

شدید احساس کو اپنی قوم میں عام کرنا چاہا۔ تاکہ قوم اپنے چھوٹے ہوئے حوصلہ اور ٹوٹی ہوئی ہمت کو پھر سے حاصل کرنے کے لئے صحیح وقار اور صحیح عظمت کے ساتھ صحیح نشانے قائم کر سکے اور اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کے لئے کسی بھی عظمت سے لڑ پڑیں۔ وہ زندگی کی رعنائیوں کا قائل تھا۔ اُسے بہار کے حُسن کا شدید احساس تھا۔ لیکن غلام قوم کی بہاریں بھی اُسے غلام نظر آ رہی تھیں۔ یہاں آ کر شاعر میں طبقاتی کش مکش کا احساس سب سے پہلے جاگ اُٹھتا ہے۔ اُسے تنہا سامراج ہی اپنا دُشمن نظر نہیں آتا۔ بلکہ ملک کا سرمایہ دار طبقہ اور پھر تہذیب کی ہر وہ قدر جو اُس کی غلامی پر دامنی نظر آتا ہے اور شہنشاہی اور سرمایہ داری سے مفاہمت کرتی ہے، اپنی دُشمن نظر آتی ہے۔ خواہ وہ مذہب ہے یا سیاست، اخلاق ہے یا قانون، وہ ہر ایک سے نپٹ لینا چاہتا ہے اور ایک ایسے انقلاب کا قائل ہے۔ جو ان تمام قدروں پر کاری ضرب لگا کر غلامی کے ہتھکنڈوں سے گو خلاصی کا باعث ہو۔ وہ کسی بھی غلام عظمت کا قائل نہیں۔ بلکہ اُس کے سامنے آزادی بذاتِ خود ایک ایسی عظمت ہے جو ہزاروں عظمتوں کو جنم دے سکتی ہے۔ آزادی سامراج سے — آزادی طبقاتی کشمکش سے — آزادی غلام مذہب اور سیاست کے ہتھکنڈوں سے — آزادی سرمایہ داری کی ہر مکروہ چال سے — چناں چہ بہار میں اُس کا یہ خیال بڑی شدت کے ساتھ اُبھر جاتا ہے۔ حُسن کے شدید احساس کے ساتھ ساتھ اُسے اپنی غلامی کا تصور زہر کے گھونٹ پلا دینے پر مجبور کرتا ہے:

حسین چھنہ یہ چشنک دِژ — کرِ زِنگ سپرو تابس شوِد
شرائنگ چھُ دینگ زور — نلہ ذی مسولہ لول غذاد
بہار میش و عشی رنچنہ آو

ترجمہ :- حسینوں کی رعنائی کا یہ اُبھرتا ہوا نور۔ قدرت گرمِ صبر و سکون رہا ہے اُن کے سینوں کا اُبھار اور اُن کے کانوں کے حسین بندے زُلف کی کالی گھٹائیں کی اوٹ لئے اُبھر اُبھر کر نکل رہے ہیں۔ آخر کیوں نہ ہو۔ بہارِ عیش و کامرانی لے کر آیا ہے۔

وہ دولت مندوں کے حرص و آز کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے لیکن اُس کی نگاہوں میں فریاد نہیں، غم و غصہ کی اُٹھتی ہوئی لہریں ہیں۔

ــــ دُچھو دولت مندان ہنر شان   ضیافتراکہ اُکس کھیا دان
گراشیچ پھُلے چاوان   گراچی ئے چوان چا دان
وپان داماہ چہ داماہ چا د   بہارِ عیش و خوشی ہنیتہ آد

ترجمہ :- دولت مندوں کی شان دیدنی ہے۔ ضیافتیں اُڑ رہی ہیں۔ وہ حسن کی بہاروں کے مزے لے رہے ہیں۔ شراب کے دَور چل رہے ہیں۔ خوب پیا اور پلایا جا رہا ہے۔ کیوں نہ ہو آخر بہارِ عیش و کامرانی لے کر آیا ہے۔

آخری بند میں ایک گہرا طنز ہے۔ جو اُس وقت کی خسروی پر ضرب کاری سے کسی طرح کم نہیں۔ دوسرے ہی لمحہ اُس کا تاثر شدید جذبے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اُس کا شکوہ فغاں اور فغان للکار بن جاتی ہے۔ وہ پوچھتا ہے۔ دریافت کرتا ہے۔

ــــ بہاراہ بُلبلاہ نغاہ   نظارہ خوش ہوا پھلکیاہ
بلاشک پرتھ اُکس خوشیاہ
گمبے کس غریبس تیا   دنایس گرہ نہ کنہ کوس تاد
بہارِ عیش و خوشی ہنیتہ آد

ترجمہ :- بہار، بُلبل اور حسین نغمے۔ نت نئے نظارے، نسیم بہاری اور حسین شگوفے بے شک دعوتِ انبساط دے رہے ہیں۔ لیکن کیا بے کس غریب کو بھی؟ جس کے گھر میں نانِ شبینہ بھی نہ ہو۔ وہ کیسے کہے کہ بہارِ عیش و کامرانی لے کر آیا ہے۔

شاعر کے احساسِ جمال کو ٹھوکر لگ جاتی ہے تو ایک بے پناہ درد اُس کے دل میں کروٹیں لینے لگتا ہے۔ وہ تلملا اُٹھتا ہے اور سماج کی ہر اُس قدر سے یکسر بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے جو اُس کے بہاروں سے رعنائی چھین لیتی ہے۔ اُس کے پھولوں سے نکہت اُڑا لیتی ہے۔ اُس کے دل کی دھڑکنوں کو پابرجولاں کر دیتی ہے اور اُس کی ہیئت کو گدلا کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتی ہے۔

ــــ قہر جہنم تسندہ باچہ   عذابک جہنم تسندہ باچہ
بہشتک بنہم تسندہ باچہ   کرن مرغم تسندہ باچہ
تسندہ زیوہ مایہ آکو دزاد   بہارِ عیش و خوشی ہنیتہ آد
خدائی زارہ بوڈ حیرت   گنیز فرمان عمل شرکت
چوان بندے چہ بیدیئن رتھ   یوان چنہ رحمتس غیرت
شہ کیاہ ودیئیس نہ ارمان فرزاد   بہارِ عیش و خوشی ہنیتہ آد

ترجمہ :- قہر اور جہنم کا خوف فقط فریب کے لئے ہے۔ بہشت کی خیالی تصویر فقط اُس کے لئے ہے۔ تسلیم و رضا کی خو اُس کے لئے ہے۔ اُس کی زبان سے آخر یہ بات کیسے نکلے کہ بہارِ عیش و کامرانی لے کر آیا ہے۔

زار خدائی عجب حیرت ہے۔ حکم تو توحید کا ہے۔ لیکن عملاً شرک کا دَور دورہ ہے۔ ہمارے حال پر رحمت کو بھی غیرت نہیں ہوتی ہے۔ آخر وہ کیسے کہیگا جس کا کوئی ارمان پورا نہ ہو سکا کہ بہارِ عیش و کامرانی لے کر آیا ہے۔

"بدی ما کنہہ بینہ کرُ ہڑ چم ؟" "کون کسی بُرائی کی تہی میں سے" یہاں شاعر کا خیال کچھ ڈھیلا سا پڑ گیا ہے۔ وہ مظلوم نظروں، دھڑکتے دل، آہوں اور آنسوؤں کی دنیا میں رہ کر فریاد و فغان کرتا ہے۔ شاید وہ پر عدہ گارانِ عصر کو اپنے حالِ زار کی طرف کسی طرح متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اُس فغان و فریاد کی دُنیا میں عاشقانہ نیازمندی نہیں۔ بلکہ اپنی مظلومیت کا شدید احساس کار فرما ہے۔ اور اس شدت نے شاعر کی فریاد میں بلا کا اثر، درد اور گھلاوٹ پیدا کر دی ہے۔ وہ فریاد کی لَے میں پتے کی بات کہہ جاتا ہے۔ وہ رحم کا طالب نظر نہیں آتا بلکہ انصاف کی جستجو میں سرگرداں نظر آ رہا ہے۔ وہ سماج میں اپنے صحیح حق کا طالب ہے اور اپنے مقام کی تلاش کچھ اس طرح کر رہا ہے کہ دیکھنے والی آنکھ رونے کے ساتھ ساتھ ذہن کے پردوں پر بھی ایک ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔ دماغ کچھ سوچنے لگتا ہے اور دوسرے ہی لمحے شاعر کے دل کی بات ہر ایک کی بات بن جاتی ہے۔

ــــ پتی آرام تماداں چُس، جہانی ماوہ داداں چُس
دہ ہستی داتس کاداں چُس
پھترا پوذ پہ تقاداں چُس، زمین پھر پھر وگلان چم ئم
بدی ما کنہ بینہ کرُ ہڑ چم ؟

(میں اپنے آرام کو داؤ پر لگا لیتا ہوں۔ اپنی جوانی سے کھیلتا ہوں۔ دن رات محنت کی چکی میں پستا ہوں۔ کپڑے بھی ٹھیک نہیں لگاتا ہوں۔ زمین کے ساتھ پنجہ فگن ہو کر میری انگلیاں فِگار ہو گئی ہیں۔ کون سی بُرائی کی ہے میں نے!)

معاشرے میں بدی کے لئے سہی، صاحبِ ثروت کو احساس کی دنیا میں کھینچ کر لانا چاہتا ہے۔ اُس کے ذہن اور خیال کو اپنا ہم خیال بنانے کی خاطر تامرِ نو ر دلائل سے کام لیتا ہے اور اُسے غریبوں کی بات سُننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ فریادِ دہقان میں بھی زار کی جولانیٔ طبع اور حریتِ فکر کہیں چوٹ نہیں کھاتی ہے۔

مشقت میانی عظمت چانی ذلالت میانی شوکت چانی
جہالت میانی چہ عظمت چانی چہ غربت میانی فراغت چانی
کما وجہ ستکو ژھنیتہ نیو تم بدی ما کړېنہ مینہ کړہ ہر چم

ترجمہ:- میری مشقت تمہاری دولت کی راہ ہے۔ میری ذلالت میں تمہاری شوکت کا راز پوشیدہ ہے۔ میری جہالت تمہاری عظمت ہے۔ میرا افلاس تمہاری فراغت کا باعث ہے۔ تم زبردستی میری محنت کا پھل میرے ہاتھوں سے چھین لیتے ہو۔ کون سی بدی کی ہے میں نے؟

شاعر کی فریاد میں شکوۂ بیداد کا رنگ نکھرنے لگتا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے روایاتی ادب کا دامن چھوڑ کر اپنے دل کے جلے پھپھولے پھوڑ ڈالتا ہے، لیکن اس جوش میں بھی جو غصے کی حد تک چلا گیا ہے، حقیقت سے ہرگز آنکھیں بند نہیں کرتا۔ اس کی باتوں میں نہ تو شاعرانہ علو ہے نہ جذباتیت اور نہ مبالغہ آرائی۔ سیدھی سی باتیں ہیں، لیکن ہر بات ایسی کہ دل کا داغ بن کر رہ جاتی ہے۔

ژہ چہ تہ ہی کا نہ رحم ما ہرگز ژہ ما پاسِ وفا ہرگز
ژہ ما شرم و حیا ہرگز ژہ ما خوفِ خدا ہرگز
ژہ گوی جنت مینہ کړہ جہنم بدی ما کړېنہ مینہ کړہ ہر چم

ترجمہ:- تم رحم نہیں جانتے۔ تمہیں پاسِ وفا نہیں۔ تم میں شرم و حیا نہیں۔ تم میں خوفِ خدا نہیں۔ لیکن باوجود اس کے تم بہشتی ہو اور میں جہنمی۔ کون سی بدی کی تھی میں نے؟

زار مذہب کو تنگ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ محض اس لئے کہ اس سے سرمایہ داری سے مفاہمت کی بو آتی ہے اور زار سامراجیت اور سرمایہ داری سے مفاہمت کی ہر تحریک کو انسانی وجود کے لئے اٹل خطرہ سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ ایک ایسے مذہب کا قائل ہے جہاں انسانیت کا احترام مذہب کی بنیادی قدر ہو اور جہاں تسبیح و زنار کے جھگڑوں سے الگ رہ کر انسانیت اور اتحادِ فکر و نظرِ انسان کا فریضہ ادا ہو۔

سہ دنان ساری چہ دہری نار زار تسبیح نہ تن زنار
تہ س ہم سانگ کتہ درکار گنیزی آسہ کوومت یار
بیہے پزنہ کتہ مینہ سگر ہر ہم بدی ما کړېنہ مینہ کړہ ہر چم

ترجمہ:- سب لوگ زار کو دہریہ سمجھتے ہیں نہ وہ تسبیح کا قائل ہے نہ زنار کا۔ آخر اسے یہ سوانگ رچانے کی کیا ضرورت ہے جس نے وحدت کو دل سے مان لیا ہو۔ یہ سیدھا سادا راستہ میں نے اختیار کر لیا ہے۔ کون سی بدی کی ہے میں نے؟

زار کی دُنیا مزدوروں اور کاشتکاروں کی دُنیا ہے۔ اس حیثیت سے اُسے احسان بن دانش سے قریبی مماثلت ہے۔ وہ احسان ہی کی طرح اپنے داغ دار سماج کی تصویریں پیش کرتا ہے۔ اُس کے یہاں آہوں اور آنسوؤں کی دُنیا میں کچھ کمایا تو روزی ورنہ روزہ۔ ہزاروں آرزوئیں، لاکھوں تمنائیں اُبھرنے سے پہلے موت کی آغوش میں سو جاتی ہیں۔ زندگی کی ہر ہر ادا موت حیات کی کشمکش کی ایک خونچکاں داستان ہے۔ پست ماحول کی اس ٹھوس صورت میں بھی رجائیت کا تصور زار کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ ہر باطل قوت سے پنجہ فگن نظر آ رہا ہے۔ وہ جھنجھلا جھنجھلا کر اپنی مخالف قوتوں پر پوری شدت کے ساتھ حملے کرتا ہے۔ چوٹ کھا کر سنبھلنا اُس کا شعار بن گیا ہے۔ مایوسی پل بھر کے لئے اُس کے گریباں گیر ہوتی ہے۔ لیکن معاً وہ ایک تیز دھارے کی طرح ناموافق حالات اور مایوسی میں اپنا راستہ نکال کر ہی رہتا ہے۔ "نالۂ دہقان"۔ "کہ سوں کش چہ بو زلاں!" (چل ہماری کون سنتا ہے؟) میں ایک زمین دار اپنے بیل کے ساتھ مصروفِ گفتگو نظر آ رہا ہے۔ وہ اپنے دل کے داغ انسانوں سے مایوس ہو کر حیوانوں کو دکھلانے لگتا ہے۔ انسانی طبیعت بقولِ شیلے جب انسانوں سے جو دراصل خود اپنی قبروں کے نشانی پتھر ہوتے ہیں، مایوس ہونے لگتی ہے تو فطرت کے دوسرے مظاہر کو اپنا راز دار بنانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ زمیندار کا سب سے بڑا ہمدرد اُس کا بیل ہے اور ہمارا ہیرو بے یار و مددگار شاعر اپنے دل کے جلے پھپھولے بیل کے سامنے پھوڑ ڈالتا ہے۔ شاید وہ اس انسانیت سے تنگ آ گیا ہے جہاں مکر و فریب کے توسل سے پسماندہ عوام پر جہانبانی کی جاتی ہے۔

بستی جنگل بیابان   جل قمرو گل گلستان
[illegible] انسان   یلہ مست تندرہ آسان
اسی کلہ کھاہ چہ نیران   پکہ سون کس چہ بزاں

ترجمہ: بستی اور صحرا، جنگل اور بیابان، جل، قمری اور گلستان، جب مست نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں تو ہم اپنے کھیت پر اپنے آرام کو ٹھکرا کر چل دیتے ہیں۔ چل میرے بیل چل، ہماری کون سنتا ہے۔

[illegible] کھور وڈان پیشہ تن   تاپس اندر دوپہرن
بوچہ پیستی جگر چہ کترن   چشمن چہ گاش سوتن
بکھس نہ چارہ آسان   پکہ سون کس چہ بزان

ترجمہ:۔ دوپہر کے وقت گرم زمین پابوس ہو کر ہمارے تلوؤں کو جلا دیتی ہے۔ بھوک ہمارا جگر کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں۔ لیکن مشقت سے فرار کا کوئی راستہ نہیں۔ چل بیل ہماری کون سنتا ہے؟

اُسے ایک بار پھر مشیت پر شک ہونے لگتا ہے۔ کیا خدا کی رحمت حرکت میں نہیں آسکتی۔ کیا ہمیشہ باطل قدریں زندگی پر محیط ہو سکتی ہیں۔ کیا انصاف کبھی بار آور نہیں ہو سکتا ہے؟ آخر ظالم کب تک یوں حاکم بنتا پھرے گا۔ زار کی فریاد میں یہاں پھر وہی بالواسطہ للکار پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ گھور گھور کر اپنے ماحول کو دیکھ رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں جہاں آنسو ہیں وہاں اُس کی تیوری پر بل بھی ہیں۔ جہاں غم ہے وہاں غصہ بھی ہے۔

شاید چہ وہم قدرت   بے حس گڑ چہ فطرت
کوتان ما ئی محنت لیس   سوئی چہ با فراغت
ننگ فاقہ اسی چہ روان   پکہ سون کس چہ بزان

ترجمہ:۔ شاید قدرت ایک وہم ہے۔ شاید فطرت بے حس ہو گئی ہے۔ جو لوگ ہماری محنت لوٹ رہے ہیں وہی فراغت سے بیٹھے ہوئے ہیں اور ہم۔ ہم ننگے فاقوں پر فلک کے نیچے جا رہے ہیں۔ چل ہماری کون سنتا ہے؟

اس کے فوراً بعد شاعر کا زخمی احساس چوٹ کھا کر سنبھلتا ہے۔ وہ ایک اُتحاد عزم کے ساتھ پکار اٹھتا ہے ؎

[illegible] چہ [illegible]   گال بہ ظلم [illegible]
[illegible] آسمان   غاصب حریص انسان
[illegible] تنا چہ بامان   پکہ سون کس چہ بزان

ترجمہ:۔ اب ہم مصائب برداشت نہیں کر سکتے۔ میں کائنات سے ظلم کو [illegible]

بے نشان کر دوں گا۔ زمینوں اور آسمانوں میں ایک آگ سی لگا دوں گا۔ غاصب اور حریص انسان جنہیں جن آگ کی موت مارتے ہیں۔ چل ہماری کون سنتا ہے۔

وہ زندگی میں ایک ایسی رُوح پھونکنے کا قائل ہے جو سرمایہ داری کے زہر کے لئے تریاق کا کام کرنے اور ہر ظلم و جور کا فقط مقابلہ ہی نہ کرے بلکہ اسے جڑ سے اکھیڑنے کی بھی قدرت رکھتی ہو۔

؎ تیوتھ انقلاب کرہ ودان   حلکن تہ زار نقر ودان
مُردان سہ روح پھر ودان   امہ زہرہ گھنہ مرو ودان
نتہ زار کیاہ چہ درمان   پکہ سون کس چہ بزان

ترجمہ:۔ میں ایک ایسا انقلاب پیدا کر دوں گا کہ ملائک بھی لرزہ براندام ہو جائیں۔ مُردوں میں ایک ایسی روح پھونک دوں گا کہ وہ سرمایہ داری کے زہر سے نہ مر سکیں۔ زار اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ چل ہماری کون سنتا ہے؟

زار کی اس نظم میں فرار کی یک طرفہ رائے کے بجائے اگر بیل کی زبان سے بھی کچھ نکلتا تو شاید اُس کی ہر ہر بات انسانیت کے درجۂ عظمیٰ اور اُس کی اشرفیت پر ایک گہرا طنز ہوتی۔ مگر میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ زار شاعری یا صنعت گری کا اس قدر قائل نہیں جس قدر نصب العینیت کا سختی سے پابند ہے۔

"ویدا کہ" "نالۂ ماتم" میں شاعر کا ذہن یکسر قنوطیت کی نذر ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا حوصلہ یہاں بھی نہیں ٹوٹتا۔ وہ اپنے درد کی کہانی کو افسانہ نہیں بنانا چاہتا بلکہ اس سے وہ ایک ایسے ذہنی انقلاب کی تخلیق کرتا ہے جو ان تمام باتوں کو محسوس کرنے کے بعد باطل پرست قوتوں سے نبرد آزما ہو جائے۔ اس کے دل کی داستانِ داغدار نے اُس کے کلام میں اثر اور لوچ پیدا کیا ہے۔ ایک ایک حرف سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے اور غلامی کے مظالم کا آئینہ دار ہے۔ اگر شعر دل سے نکل کر دل میں اُترنے ہی کے لئے ہے تو پھر زار کے "نالۂ ماتم" کے یہ چند بند سُن لیجئے ؎

پھول یاسمن و ریکم تہ ہی اسمان
آستہ آستہ وناد سوتنہ ویادہی چھادان
جل چہ بولان، دہقان نالہ زاوان
دُدی ہر دُنہ وادوہ ندھہ وسیتی ادرمان

ترجمہ:۔ یاسمن اور چنبیلی "درویکم" (ایک پھول جو بہار کی ابتدا میں کھلتا ہے) ہر طرف سے کھِل اُٹھی ہیں۔ بہار کی ہوائیں آہستہ آہستہ مصروفِ خرام ہیں۔ جل (ایک پرندہ) مصر کانوں میں نغمہ سرا ہے۔ لیکن دہقان فریاد کناں ہیں۔ آہ [illegible]

ہمارے ارمانوں کو خزاں کے ظالم جھونکوں نے جلا کر رکھ دیا ہے۔

سوکھہ مونکھ نیوکھ سونکھ اسہ اتھہ مُوریتھ
کھین تہ چھین سون اسہ نیوکھ ہونٹ چیرتھ
فاقہ، باک، شرٲکہ یتہٕ اسہ کرٕ چھہ تھاوان

ترجمہ:۔ اچانک ہمارے آرام کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا گیا۔ ہمارے اکل و شرب کو یہ لوگ گلا دبا کر لے بھاگے۔ اُنہوں نے تو ہمارے لئے فقط فاقہ مستی، آہیں، ماتم اور چیخیاں رکھ دی ہیں۔ آہ! خزاں کے تیز جھونکوں نے ہمارے ارمانوں کو جلا کر رکھ دیا ہے۔

خونہٕ جگرک کھُرِ کلہٕ سگناوِتھ
شرٛوٗ تہ باٹرِی ہینتھ پھلہٕ پھلہٕ سنبراوِتھ
ژھلی بلی نیتھ اسہ چھی باکہ دِوان
دُودی ہرونہٕ داوہ ژھنہٕ سانی ارمان!

ترجمہ:۔ ہم اپنے خونِ جگر سے ایک ایک پودے کو سینچتے رہے۔ ہم نے اپنے بال بچوں کو لے کر ایک ایک دانہ جمع کرلیا۔ اور وہ مکر و ریا کے توسل سے ہر چیز لے کر ہمیں ماتم کناں چھوڑ گئے۔ آہ! خزاں کے تیز جھونکوں نے ہمارے ارمانوں کو جلا کر رکھ دیا ہے۔

جُرم سنگین حالِ دِل کٲنسہ ماونٕ
جگرہ داد چھہ دگہ منز شاہ تراونٕ
زِندہ روزُن آسان، نہ موت آسان "

ترجمہ:۔ دل کی روئداد سنانا یہاں ایک سنگین جرم ہے۔ دردِ جگر آہ! آہ بھی نہیں بھر سکتا کوئی۔ غرض یہاں نہ زندہ رہنا آسان ہے اور نہ موت آسان ہے۔

شاعر نے حقیقت کی جس طرح غمازی کی ہے، شاید یہی وہ تاریخ کی خونچکاں داستان ہے۔ جب نہ فریاد کی اجازت تھی اور نہ تڑپنے کی۔ بلکہ گھٹ کر مرجانا۔ صیاد کی آخری مرضی تھی۔

فضل و رحمت آسہ تے تہ اسہ کرٕ ما
پھیروتے نافہ اسہ کئی تہ حاصل کیاہ
مرگہ پتہ زہر شہد آسہ تہ زہر یکسان "

ترجمہ:۔ فضل و رحمت ہو بھی، تو ہمارے لئے کہاں؟ وہ ہماری طرف دیکھ بھی کرے تو کیا حاصل؟ موت کے بعد زہر اور شہد دو یکسان

سماجات ہے۔ آہ! خزاں کے تیز جھونکوں نے ہمارے ارمانوں کو جلا کر رکھ دیا ہے۔

جاپہٕ جاپہٕ لُدی مندر تہ آستان ہے
قہرنہٕ کیتہ عاصی چھہ زانان ہے
پانہ نوانہٕ دٲسے اتھ پننہٕ عدلک شان "

ترجمہ:۔ جگہ جگہ ہم نے مندر اور آستانے بنالئے۔ لیکن اس کے باوجود قہر کے لئے عاصی ہمیں ٹھہرایا جاتا ہے۔ شعلۂ خود اپنے اس عدل کا خان جاتا ہے۔ آہ! خزاں کے تیز جھونکوں نے ہمارے ارمانوں کو جلا کر رکھ دیا ہے۔

کاشت کار اور مزدور کی یہ درد بھری داستان ہزاروں بولتے ہوئے افسانوں کی جان ہے۔ اور پھر شاعر کا کمالِ فن یہ ہے کہ معاملہ بندی میں کوئی چیز حقیقت سے دور نہیں۔

ہر خیال بجائے خود ایک محشرِ خیال ہے۔ اور ایک ایک لَے درد کی دُنیا میں دِل کے گوشوں کو ٹٹولتی ہوئی نظر آتی ہے۔ زندگی کی ہر ایک رگ دُکھتی ہوتی ہے اور خون کا ایک ایک قطرہ ایک رِستا ہوا ناسور ہے۔ نظم میں سوز و گداز اور جاذبیت پیدا ہوگئی ہے۔ جس نے ایک طرف دماغ کو سوچنے پر مجبور کیا ہے اور دوسری طرف دِل کو جولاں گاہِ قیامت بنا دیا ہے اس نظم میں نغمہ ہے لیکن پُر درد۔ ہر لَے میں ایک ایسی صدا ہے جو ماتم خانہ زندگی میں دِل دردمند کی آوازِ بازگشت ہے۔

" ساقی " زارؔ کی مشہور ترین نظم ہے۔ یہاں شاعر اپنے دِل کی دھڑکنوں کو اپنے کلام میں سمو کر رہ گیا ہے۔ نظم بہت لمبی نہیں۔ لیکن پھر بھی اس اختصار میں شاعر کی چابکدستی نے ہزاروں افسانوں کو جنم دیا ہے۔ یہ غزل نُما نظم غزل کی تنگنائے میں ڈوب کر نہیں رہا ہے۔ نہ ہی قافیہ پیمائی کا شکار ہوگئی ہے بلکہ شاعر کی رُوح یہاں بھی بولتی نظر آرہی ہے۔ زندگی کے رواں دواں عمل کی طرح ایک ایک شعر میں حرکت ہے، اضطراب ہے۔ حقیقت کی غمازی ہے۔ یہاں شاعرانہ خوش آئیند اور فرسودہ تشبیہات نہیں بلکہ حقائق کی ایسی ناقابلِ تردید ترجمانی ہے کہ بے اختیار انسان کو شاعر کے خیال سے ہمدردی پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہاں زارؔ کے فن کا خلوص اور دیانت اپنا بھرپور حقائق کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ ہر بات بے باک انداز میں کہہ گزرتا ہے۔ مذہب کی وہ غلط قدریں جو مذہب کے نام پر دریاں بہتے ہوئے ناسور بن گئے ہیں۔ پھر ایک بار ...

ہے۔ شاعر کے ذہن میں عجیب رچاؤ پیدا ہونے لگتا ہے۔ اُسے اپنے اُوپر مکمل اعتماد ہے
وہ ایک خاص عظمت کے ساتھ، جس میں فرشتوں کا سا تقدس ہے اور انسانوں
کا سا اضطراب اپنے پیغام کو پیش کرتا ہے۔ یہ نظم پختگیٔ خیال، حقیقت پسندی
اور معصوم اندازِ بیان کے لئے ایک خاص درجہ رکھتی ہے۔

شاعر ساغر و ساقی کا سہارا لے کر ہر وہ بات کہہ دیتا ہے جس کا تعلق اُس
کے دل کا گھاؤ بنا ہوا ہے۔ جس دُنیا میں فقط تسبیح و زنار مذہب کا سب سے
بڑا مظاہرہ ہو، وہاں زارؔ جیسا انسانیت پرست شاعر واقعی رحمت کا حق دار
نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ وہ چیخ اُٹھتا ہے ؎

نہ چھم تسبیح نہ چھم زنار ساقی
پُکر بنہ رحمتس حق دار ساقی

ترجمہ:۔ ساقی نہ میں تسبیح کا مالک ہوں، نہ زُنّار بردار۔ بھلا میں کیسے رحمت
کا حق دار ہو سکتا ہوں؟ لیکن دوسرے ہی لمحہ اسے اپنی حقیقت پسندی
کا شدید احساس ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی بے گناہی اور اپنی عظمت کا یوں اظہار
کرتا ہے ؎

دُوہی ہُند طوقِ لعنت یُی نہ ژھۄن نالی
مے گو مُلحد تہٕ بدکردار ساقی!

ترجمہ:۔ شرک کا طوقِ لعنت جس نے اپنی گردن میں نہ ڈال دیا، دُنیا
والوں کی نظر میں وہی مُلحد اور بدکردار ہے۔

یہاں زارؔ کا اندازِ بیان مجرمانہ نہیں، نہ ہی نیاز مندانہ ہے بلکہ وہ ایک
پختہ اعتماد کے ساتھ زندگی کی صحیح قدروں کو اُجاگر کرنے میں مصروف نظر آرہا
ہے۔ اُس کا نظریہ یہاں بھی حسبِ معمول حقیقت پسندانہ ہے۔ وہ فلسفہ کی
گتھیوں کو سلجھاتا نہیں بلکہ روزمرہ کے مشاہدے نے اُس کی زندگی میں تجربات
کی ایک طویل داستان سے نئے افسانوں کو جنم دیا ہے۔ وہ زندگی کو اپنی
تمام رعنائیوں سمیت جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ہر نفی سے ایک اثبات کا
قائل ہے کیونکہ ؎ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
وہ خدا کی خدائی میں حیات کو شریک سمجھتا ہے۔ مذہب سرمایے کا غلام نظر
آتا ہے اور سماج کا ہر فرد سرمایہ داری اور شہنشاہیت کو اپنا خون دیتے
ہوئے نظر آرہا ہے ؎

خُدائی [illegible]
بنیہ [illegible] مذہب دار ساقی

ترجمہ:۔ خدائی سرمایہ داروں نے زاہد اور مذہب دار بن کر اپنے
ہاتھوں میں لے لی ہے ساقی!

شاعر دیکھ رہا ہے کہ وہ بے غم قہر رحمت کو بانٹ رہے ہیں۔ انہوں
نے رحمت کا ہبہ کر لیا ہے اور قہر ہمارے حصے میں رکھ دیا ہے۔ زندگی میں
یہ دُکھ درد تو برداشت کرتے تھے لیکن آخرت میں بھی شاید ان سے گلو
خلاصی مشکل ہے۔

؎ بچھ بے غم باگران تم قہر و رحمت
بچو کتھ پُٹھو اُسو نادار ساقی

ترجمہ:۔ وہ بے غم ہو کر قہر اور رحمت کو بانٹ رہے ہیں۔ ہم نادار
کیسے بچ کر نکلیں ساقی؟

اُسے اپنے خیال، اپنے نصب العین اور اپنے عقیدے پر ایک بار
پھر مکمل یقین ہو جاتا ہے۔ وہ فریاد کی لے میں ایک بار پھر زندگی کی غلط
قدروں کے تار تار ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے ؎

تمنا، شوق و ارمان دُوی غریبن
چھُ دِیُتمُت غاصبو تیوتھ نار ساقی

ترجمہ:۔ غریبوں کی تمنائیں، شوق اور ارمان کی حسین دُنیا جل کر
راکھ ہو گئی۔ غاصبوں نے ساقی کچھ عجیب قسم کی آگ لگا دی ہے۔

؎ جوان کرلین نہ کرِ وتھ وَسے تہٕ شامن
غوزانن پیٹھ بہتھ بے کار ساقی

ترجمہ:۔ کماؤ جوانوں کو کما کر روزی نہیں ملتی اور سرمایہ دار نوالوں
پر بےکار بیٹھے ہوئے ہیں۔

اس سماجی اُونچ نیچ اور طبقاتی کشمکش نے شاعر کو زبردست
بغاوت پر آمادہ کیا ہے۔ اُس کی بغاوت میں قنوطیت ہے۔ لیکن انتہا
میں بھی اُس کا استدلال ناقابلِ تردید ہے۔

؎ خُدا فریاد بوزیا بے کسن ہُند
تمیٔ یلہٕ تھوٗ روا دو گنیار ساقی

ترجمہ:۔ خدا بھی بے کسوں کی فریاد نہیں سُنے گا۔ اسی نے تو
یہ دوئی روا رکھی ہے۔

یہاں شاعر کی چوٹ بالواسطہ مذہب کے ایسے غلط نظریوں پر ہے
جو انسان کو تقدیر کا پابند جانتے ہیں اور تقدیر کی غلط تعریف کرتے
[illegible]

ہمت کی جوانی اور عزائم کی استواری پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔

مے روشیتہ قسمتچ دیوی غریبن

ملک دشمن، فلک بیزار ساقی

ترجمہ:۔ قسمت کی دیوی شاید غریب سے روٹھ گئی ہے۔ ملک اس کے دشمن اور فلک اس سے بیزار ہیں ساقی!

لیکن انتہائی یاس و قنوطیت میں شاعر کا رجائی تصور جاگ اُٹھتا ہے اور وہ یوں نعرہ زن ہوتا ہے ؎

پیا پے دِن خودی ہندے مینہ جام

وز دِہ عملن یمِنک خمار ساقی!

ترجمہ:۔ مسلسل مجھے خودی کی شراب کے جام پلا دے ساقی۔ ایک ایسی شراب جس کا خمار عمل کے لئے ارشادِ عمل ہو۔

کیوں؟

کرُن مے ختم جنگ زرگری چھُم

تھز و پستی کرِ ز ہموار ساقی!

ترجمہ:۔ کیونکہ مجھے جنگ زرگری ختم کرلینی ہے اور نشیب و فراز کو ہموار بنا دینا ہے۔

زادر کی شاعری پر یہ ایک نظر آزادی سے پہلے کی شاعری پر ہے۔ آزادی کے بعد زادر کے کلام میں ایک خاص رچاؤ، سنجیدگی اور پختگی آ گئی ہے۔ ایک خاص گھن گرج ہے۔ ایک خاص وقار ہے۔ تجربات کی وسیع دنیا میں اُس کا نقطۂ نظر سمٹ کر نہیں رہا ہے بلکہ اُس کے مشاہدے میں سلجھاؤ اور بلند نظری پیدا ہو گئی ہے۔ وہ حقائق کی دنیا میں رہ کر زندگی کو عمل کی عینک سے دیکھنے کا عادی ہے۔ وہ زندگی کے بحرِ بیکراں میں اُٹھتی ہوئی موجوں کا تماشہ ساحل سے نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ خود لہروں کی آغوش میں پل کر جوان ہونے کا مدعی ہے۔ اُس کی آواز میں ایک خاص پیغام ہے ایک خاص فلسفۂ حیات کی بالواسطہ غمازی۔ وہ فقط سیاسی آزادی کا قائل نہیں۔ وہ قوم کی ہر ہر عادت اور ہر ہر ادا میں ایسے وقار، عظمت، احساسِ خودی اور صحیح شہریت کا خواہاں ہے۔ جو اُسے واقعی آزاد قوم کی صف میں لاکھڑا کرے۔ اُس کے مستقبل کو درخشندہ بنا دے اور اُس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو جھنجھوڑ دے۔ اُس کی عظمتوں کو نکھار بخش ... کو بہار کی رعنائی کے ساتھ ساتھ خزاں کی پختگی بھی بخش

ہے۔ وہ جمال و جلال کے امتزاج سے ایک ایسے پیکرِ خاکی کی تخلیق چاہتا ہے جس کا عزم پہاڑوں کی طرح استوار ہو۔ زادر کا انداز اب باغیانہ نہیں نہ مجرمانہ اور نہ معاندانہ بلکہ سراسر ناقدانہ ہے۔ کہیں کہیں ہمدردانہ بھی۔ لیکن یہ ہمدردی پند و موعظت نہیں بن گئی ہے۔ زادر کی غزلوں میں یہ انداز بہت زیادہ نکھرا ہوا ہے۔ اُس کی غزل گوئی کا انداز تمام شاعروں سے ہٹ کر ہے۔ اُس کی غزلوں میں ایک خاص اندازِ بیان ہے اور ایک خاص تخیل کارفرما ہے۔ ان چیزوں نے مل کر زادر کو کشمیری شاعری کے ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ جہاں وہ اکیلا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ "حیرت" "دِتم کیتزاہ مینہ صدقہ جان" "کھُر اپنے سر کا صدقہ دے دو" "عمل" "مبالغہ" "فرق" "غم" میں اس کا اندازِ بیان اور زیادہ نکھر گیا ہے۔ شاعر کا اپنا مخصوص پیغامِ عمل اور ارشادِ عمل ہے۔ غرض نہایت ہمت کے ساتھ زندگی کی ہر قدر کی صحیح تحلیل اور صحیح تصویر پیش کرنے میں شاعر نے اپنے تمام وسائل اور تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لائی ہیں۔

زادر کی تمام تر شاعری میں نغمہ اور موسیقیت کی کمی ہے۔ اس کے شعروں میں ترنم اور روانی کا وہ طوفان نہیں جو کسی شاعر کے کلام کو شہرت کے پر بخش دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زادر عوامی شاعر ہو کر بھی عوام میں اپنا مقام حاصل نہ کر سکا۔ شاید یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ شاعر کا مطالعہ بہت زیادہ پختہ نہیں۔ گو اُس کا مشاہدہ بہت زیادہ تیز ہے۔ لیکن اساتذۂ فن کے کلام کو پڑھنے کی شاعر نے زحمت گوارا نہیں کی ہے۔ اس کے علاوہ نصب العینیت اور حقائق سے بے پناہ عقیدت شاعر کو اُن نزاکتوں سے بہت دور رکھتی ہے جو کلام کو موسیقی اور ترنم کی روح بخش دیتے ہیں۔ شاعر کا مطالعہ اگر اب بھی صحیح راہوں پر لگ جائے تو یقیناً کشمیر کی ادبی تاریخ میں ایک ایسے شاعر کا اضافہ ہوگا جو اپنی بلند آہنگی کے ساتھ ساتھ ہر ہر قدم پر نغمے کی دیوی کے پائل کی جھنکار سے ہزاروں فسانے بھی پیدا کر سکتا ہے۔

"تعمیر" کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے
اپنی قیمتی آراء اور مشوروں سے نوازیئے!

دیہاتی زندگی — دوپہلو

په فصل اسهدو کی هندم

حسن فطرت کے لب معصوم کا ہمسخن

کشمیری شادی کا ایک منظر

شمس کنول

مانگے کا اُجالا

(اس مضمون کی ایک قسط جولائی کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے)

انگریزی زبان میں ہندوستانی الفاظ کی تعداد کافی ہے۔ اگر تحقیق کی جائے تو ہندوستان کی ہر علاقائی زبان کے بہت سے الفاظ اپنی اصل شکل میں یا قدرے تلفظ میں رد و بدل کے بعد انگریزی ادب میں اور روزمرہ کی انگریزی بول چال میں ملیں گے۔ مثال کے طور پر انگریزی کھانوں میں لفظ "Curry" عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ دراصل یہ لفظ تامل زبان کے لفظ "کاری" (Karry) کی ایک دوسری شکل ہے۔ یہ دونوں الفاظ رقیق شوربے یا سالن کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ شمالی ہند میں انگریزی بولنے والے عموماً آسان یا خوش گوار کام کے معنی میں A cushy job جملہ استعمال کرتے ہیں۔ دراصل لفظ Cushy "خوش" (Khush) سے نکلا ہے جو اُردو زبان کا ایک عام فہم لفظ ہے۔ وہ تعلیم یافتہ اشخاص جو مختلف زبانوں کی "ذات اور نسل" کی چھان بین میں لگے رہتے ہیں۔ وہ یہ خوب جانتے ہیں کہ اُردو زبان کا لفظ "ٹھگ" (thug) انگریزی زبان کی لغت آکسفورڈ انگلش ڈکشنری (O.E.D) میں کیسے پہنچا۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں ٹھگوں کی لوٹ مار کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے لئے تشویش پیدا ہوئی تو ۱۸۳۹ء میں کارلائل نے انگریزی زبان میں لفظ "ٹھگ" یا "ٹھگی" کو ہو بہو اپنا لیا اور یہ لفظ آج بھی اپنے اصلی معنی میں امریکہ میں بھی مستعمل ہے۔ ہندی زبان کا لفظ "پنڈت" (Pandit) بھی انگریزی میں پہنچ چکا ہے۔ انگریزی زبان کا لفظ "شمپو" (Shampoo) جو ایک رقیق یا پاؤڈر کی قسم کے صابن سے سر کے بالوں کو دھونے یا ملنے کے لئے فعل کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ہندی لفظ "چمپنا" (Champona) یا اُردو لفظ "چمپی" (Champi) سے نکلا ہے۔ "چارپائی" (Charpoy) اور "تپائی" (Tea poy) اُردو زبان کے وہ الفاظ ہیں جو ہندوستان کے ہر علاقے میں بولے جاتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں اور تعجب تو یہ ہے کہ یہ دونوں الفاظ اپنی اصلی شکل اور اپنے اصلی معنی کے ساتھ سات سمندر پار کر کے لندن تک پہنچ چکے ہیں۔

سنہ ۱۸۵۷ء کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہمیت حاصل ہے۔ اس پہلی جنگ آزادی کے دور میں انگریز حکمرانوں کو اپنی آسانی کے لئے بہت سے ہندوستانی الفاظ اپنی زبان میں شامل کرنا پڑے ہیں۔ جیسے اُردو لفظ "چپاتی" (chapati) اُس وقت انگریزی زبان میں پہنچا جب کہ ۱۸۵۷ء میں کان پور میں فوج کے درمیان چپاتیوں کی تقسیم پر جھگڑا ہوا۔ اور جھگڑے نے انگریزوں کے خلاف ایک بغاوت کی صورت اختیار کر لی۔ چناں چہ آج بھی ہندوستان کی پتلی روٹی کو انگریزی زبان میں "چپاتی" ہی کہا جاتا ہے۔ لفظ "سپاہی" بھی اُسی زمانے کی دین ہے جس کو انگریزی زبان میں (Sepoy) کہا جاتا ہے اور جس کو ہندی زبان میں "سینک" کہتے ہیں۔ انگریزی زبان کا ایک اصطلاحی لفظ ہے "جگرناٹ" (Juggernaut) جس کو تباہی اور خونریزی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ لفظ سنسکرت کے لفظ "جگن ناتھ" کی ایک دوسری شکل ہے۔ تقریباً چار سو سال قبل ایک انگریز نے شہر پوری (اوڑیسہ) میں دیکھا کہ شہر کے لوگ کرشن کا بت ہر سال رتھ میں رکھ کر جلوس کے ساتھ نکالتے ہیں اور جس کے آگے لوگ اپنے آپ کو گرا کر ہلاک کر لیتے ہیں۔ گو کرشن پر قربان ہونے والوں کا یوں ہلاک کر لینا اُن کے خیال میں نجات کا ایک ذریعہ تھا مگر اس انگریز

نے اُس کے معنی تباہی اور بربادی سمجھے اور لفظ "جگن ناتھ" کو ذہن میں رکھ کر "جگرناٹ" (Juggernaut) لفظ ایجاد کر دیا۔ انگریزی زبان میں ایک لفظ "ٹینک" (Tank) اکثر استعمال ہوتا ہے۔ دراصل یہ لفظ پرتگال سے ہندوستان میں آیا۔ اُردو زبان میں "ٹنکی" (Tanque) یا "ٹاکی" اُس بڑے برتن کو کہا جاتا ہے جو پانی یا اناج یا گیس کا ذخیرہ کرنے میں کام آتا ہے۔ یہ لفظ "ٹنکی" ہی انگریزی زبان میں پہنچ کر "ٹینک" بن گیا۔ اس کے علاوہ بنگالی زبان کا لفظ "بنگلہ" انگریزی میں پہنچ کر "بنگلو" (Bungalow) ہندی لفظ "بنگڑی" (چوڑی) انگریزی میں "بینگل" (Bangle) ہندی لفظ "چھینٹ" انگریزی میں "چنٹ" (Chint) اُردو لفظ "ولایت" انگریزی میں "ولایٹ" (Vilayat) اُردو لفظ "موسم" انگریزی میں "مانسون" (Monsoon) اُردو لفظ "طوفان" انگریزی میں "ٹائیفون" (typhoon) اور ہندی لفظ "لُوٹ" انگریزی میں "لوٹ" (Loot) بن چکا ہے۔ لیکن یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ لفظ "اُردو" خود انگریزی لفظ "ہورڈ" (Horde) سے بنا ہے اور انگریزی زبان کا یہ لفظ تُرکی سے آیا۔ اور تُرکی میں اس لفظ کے معنی فوج یا کیمپ کے ہوتے ہیں۔ روزانہ استعمال کا ایک ہندوستانی لفظ "گھی" ہے۔ انگریزی زبان میں اس لفظ کا کوئی نعم البدل نہیں۔ "بٹر" کہہ نہیں سکتے۔ بٹر مکھن کو کہتے ہیں۔ اس لئے انگریزی داں "گھی" کو "گھی" (ghee) ہی کہتے ہیں!

تعلیمِ نسواں

(بقیہ از صفحہ ۴۸)

کا مقدس فرض ہے۔ اُسے کوئی ایسا قدم نہ اُٹھانا چاہیئے جس سے اُس کی ازدواجی زندگی درہم برہم ہونے کا احتمال ہو۔ میرے سامنے بہت سی ایسی مثالیں ہیں جہاں بیوی ایم۔ اے یا ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کر کے ملازمت میں اپنے میاں سے الگ کسی دُور شہر یا قصبے میں بود و باش کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور دونوں کی ازدواجی اور معاشرتی زندگی تلخ اور ناممکن ہو جاتی ہے یا برسوں کی مفارقت کے بعد بیوی کو بادلِ نخواستہ ملازمت سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔

معروضہ بالا موجودہ حالات کے پیشِ نظر میری ذاتی رائے اور تجویز یہ ہے کہ کنڈرگارٹن سے آگے مخلوط طریقہ تعلیم مناسب نہیں۔ ابتدائی یا پرائمری تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہماری لڑکیوں کی اکثریت کو علومِ مشرقی یعنی اُردو ہندی، پنجابی کی طرف رجوع کر کے ہندوستانی زبانوں کا ہی مطالعہ کروانا چاہیئے۔ ایسا کرنے سے نہ صرف اُن کا بوجھ ہی ہلکا ہوگا بلکہ ہمارے کلچر اور روایات کا خاطر خواہ تحفظ بھی ہوگا۔ لڑکیوں کے مڈل اور ہائی سکولوں میں علومِ مشرقی کی جماعتیں الگ رکھنے کا انتظام ہونا چاہیئے۔ بعد میں ایسی لڑکیاں بتدریج انگریزی زبان میں بی۔ اے کا امتحان پاس کر سکتی ہیں۔ یا جو چاہیں وہ اعلیٰ تعلیم و تربیت بھی حاصل کر سکتی ہیں یہ مسئلہ غور طلب ہے! اُمید ہے کہ میری آواز صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی!

تخلیق اور تعمیر

ریاست جموں و کشمیر میں دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے اختتام پر اور باتوں کے علاوہ حسب ذیل نشانے پورے ہونگے:

- چاول، مکئی اور گیہوں کی ۲۳ لاکھ ۷۹ ہزار من پیداوار
- ۷۸۰۰ کلوواٹ برقی رَو
- ۸۲۰ میل لمبی نئی سڑکوں کی تعمیر
- ۱۹ بڑے پُلوں کی تعمیر
- ۲۴ لاکھ پونڈ تارِ ریشم کی پیداوار
- ہسپتالوں میں مزید ۶۰۰ بستروں کا انتظام
- ملک اور بیرون ہند میں ۲۱ ایمپوریم خانوں کا قیام
- ۱۰۰۵ بنیادی اور دیگر سکولوں کا قیام

عمر انصاری

جنّتِ کشمیر

دامنِ کہسار میں اِک پھولتا پھلتا چمن پالکی میں سر بہ زانو جیسے چوتھی کی دُلہن
گل بدست و گل بدوش و گلبدن گل پیرہن سیم رُخ سیما جبیں سیمیں نگاہ و سیم تن
حُسنِ فطرت کے لبِ معصوم کا پہلا سخن

دُور تک دو رویہ اِستادہ شجر ہائے چنار سربلندی سرفرازی سرخوشی کے شاہکار
جس طرح اندر سبھا میں سبز پریوں کی قطار خوش نوا و خوش جمال و زرفشاں و زرنگار
حسن ہو جن پر تصدق عشق ہو جن پر نثار

سبزہ جیسے اطلس و کمخواب و دیبا و حریر راستے جیسے جواں ہاتھوں میں قسمت کی لکیر
بھینی بھینی سی ہوائیں باغِ جنت کی سفیر لہلہاتے کھیت جیسے بے گناہوں کے ضمیر
مانی و بہزاد کے البم ہیں جن کی نظیر

سلسلہ در سلسلہ ہر چار جانب کوہسار پُر خروش و گرم جوش برف پوش و برفبار
باہمہ خلق و مروت باہمہ عز و وقار امنِ عالم کے نگہباں صلح کے آئینہ دار
صف بہ صف آراستہ پیراستہ سے شہسوار

دیدنی ہے باغِ شالیمار کا جاہ جلال داستاں گوئے شراب و شاہد و ہجر و وصال
یاد کر کے حسن و اُلفت کا وہ عہدِ بے مثال روزِ ماضی سے گلے ملنے چلا جاتا ہے حال
حافظ و خیام کا اِک مُشترک حسنِ خیال

ذرّہ ذرّہ جلوۂ صد رنگ کا آئینہ دار نغمہ زن ہر موجِ دریا زخمہ زن ہر آبشار
غنچہ و گُل صد ادائے ناز و عشوہ در کنار یہ نگاہ جلوہ ارزاں وہ عروسِ نوبہار
موسموں کے ٹھاٹھ جیسے بھیرویں دیپک ملار

سطحِ دریا پر شکاروں کے حریفانہ خرام سانس لینے کے تقاضے زندگانی کا پیام
منتشر سا فرشِ آبی پر ستاروں کا نظام جیسے صحنِ میکدہ میں لڑھکے ہوں بھرے جام
مرکزِ چشمِ تماشا دعوتِ ہر خاص و عام

فتنہ فتنہ ماہ وشاں ماہ پیکر، مہ جبیں چپہ چپہ نازشِ کوک مثال ناز آفریں
حامدِ ہوش و حواس و حامدِ علم و یقیں مسکراتی کھیلتی ہنستی ہوئی خلدِ بریں
زندہ باد اے جنتِ کشمیر تیری سرزمیں

بنسی نردوش

تعلیمی ترقی —— ایک جائزہ

وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد نے ایک بار تعلیم کو عام اور مفت کر دینے کے اصول کی تعریف اور حمایت میں کہا تھا کہ "ہم چاہتے ہیں کہ ہزاروں غریب بچے اپنی اُمنگوں کا اس لئے گلا گھونٹ دینے پر مجبور نہ ہوں کہ وہ مدرسہ جاتے مگر مدرسہ کی فیس دینے کے لئے ان کے والدین کے پاس روپیہ نہ تھا"

بلاشبہ تعلیم عامہ کا ایک عمدہ اور چست نظام ہی آزادی کے ساتھ تخلیقی کام کرنے، انسان کے فطری رجحانات کو فروغ دینے اور ذہنی صلاحیتوں کو پوری نشوونما کے ساتھ اُجاگر کرنے کے لئے سازگار حالات پیدا کرنے کی ضمانت دیتا ہے، یہ قدرتی بات ہے کہ اگر ہر فرد کو سماجی اور مدنی حقوق سے مستفید ہونے کا موقع دینا ہے تو سب سے پہلے اس امکان اور اندیشہ کو ختم کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک آدمی کو چاہ اور لگاؤ کے بغیر بھی علم حاصل کرنے کی تمام سہولتیں نصیب ہوں اور دوسرے کو اس کا شوق و ذوق ہوتے ہوئے بھی اس سے محروم ہونا پڑے۔

کشمیر سٹیٹ میں اب کسی کو ایسا کوئی اندیشہ لاحق نہیں، کیونکہ چھ سال پہلے ریاستی سرکار نے ایک ایسا انقلابی فیصلہ لیا ہے، جس کے نتیجہ میں تعلیم مفت اور عام کر دی گئی، سٹیٹ کے ہر ایک شہری کے لئے بلا روک ٹوک اعلیٰ سے اعلیٰ درسگاہ میں تعلیم و تربیت کے انتظامات کئے گئے اور اس طرح سے پہلی بار کشمیر کی تاریخ میں ہر ایک کے لئے اپنی لیاقت و استعداد کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے اور ذہنی قوتوں کو فروغ دینے کے راستے کھل گئے۔ لازمی طور پر اس سے تعلیم چاہنے والے طلبہ کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی۔

چنانچہ سال ۵۳۔۱۹۵۲ء میں سکولوں میں تعلیم پانے والے طلبہ کی تعداد ایک لاکھ ۳۲ ہزار تھی جو اب دو لاکھ ۶ ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ پانچسالہ پلان پر عملدرآمد سے پہلے سکول جانے والی لڑکیوں کی تعداد اُنیس ہزار پانچ سو تھی، جو اب چھبیس ہزار سے تجاوز کر گئی ہے۔ سال ۵۳۔۱۹۵۲ء میں بھی صرف تین سو بہتر لڑکیاں کالجوں میں زیر تعلیم تھیں، اب ان کی تعداد بھی ایک ہزار سے زیادہ ہو گئی ہے۔

آج سے پانچ دس سال پہلے جن بچوں کے لڑکپن کی شوخیاں اور شرارتیں بند کلی کی طرح کھلنے سے پہلے ہی ماحول کے کھردرے ہاتھوں مسلی جا رہی تھیں، جن کے پھول سے قدموں کی آہٹ کسی مدرسہ کی دہلیز سے آنے کی بجائے کسی جنگل یا کسی چراگاہ میں ڈھور ڈنگروں کے ساتھ آوارہ گھومتے پھرتے کھو جاتی تھی۔ انہی میں سے بہت سے بچوں کے غول کے غول اب بغل میں بستہ دبائے ہر صبح سکولوں کی طرف دوڑتے پھلانگتے نظر آتے ہیں۔

شہروں کی تو بات ہی نہیں اب دیہات میں بھی بہت کم لڑکے اور لڑکیاں ڈھور ڈنگر چرانے کی طرف راغب ہونے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔ جو ان کے بچپن کی گرمجوشی اور چمک دمک ختم کر کے ان میں پژمردگی پیدا کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شہر میں آزادی سے پہلے لڑکوں اور لڑکیوں کو کچھ کچھ تعلیمی سہولتیں ضرور میسر تھیں، مگر اتنی زیادہ نہیں جتنی آج ہیں، دیہات میں دور دور تک کسی مدرسہ کا نشان تک مشکل سے ملتا تھا، اور اس میں بھی بعض کسان اور کھاتے پیتے لوگوں کے ذہنوں میں اپنا تعلیمی شوق پیدا کر پاتے تھے، نہیں تو دیہات میں غالب اکثریت ایسے بچوں کی تھی، جن کے مقدر میں اپنے والدین کے ساتھ کھیتوں میں سخت محنت کا کام کرنے، مویشیوں کا چارہ لانے، ڈھور ڈنگر

چنانچہ وہ کانوں پر ہاتھ بٹانے، اور دوسرے ایسے ہی کتنے کاموں میں جُٹے رہنے کے سوا کوئی دوسری مسرت نہ تھی۔ ایسی بے رونق پھیکی زندگی میں کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یہ بچے جسمانی، ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے کبھی ترقی بھی کر سکیں گے۔ ایسے حالات میں نہ ان بچوں کی شخصیت کی تعمیر ہو پاتی تھی نہ ان کو جائز احترام حاصل ہوتا تھا۔ آزادی کے حصول کے بعد بچوں کی زبوں حالی کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ جابجا سکول کھولے گئے۔ پرانے سکولوں کے درجے بڑھائے گئے، اور اس وقت تک سکولوں میں برابر اضافہ چلا آ رہا ہے۔

پانچ سالہ پلان شروع کرنے سے پہلے پرائمری سکولوں کی تعداد ایک ہزار سے کچھ اوپر تھی، اب یہ دو ہزار چھ سو دس تک پہنچ گئی ہے، سیکنڈری سکولوں کی تعداد دو سو سولہ تھی، یہ تین سو چھیاسٹھ تک تجاوز کر گئی ہے۔ کالج بھی بارہ تک بڑھائے گئے ہیں۔

تعلیم تو مفت تھی ہی، اس کے ساتھ غریب والدین کے بچوں کو اس طرف مائل کرنے کے لئے لاکھوں روپے کے وظائف مقرر کئے گئے، جس کے نتیجہ میں بہت سے طلبہ کو سکولوں میں کتابیں خریدنے اور دیگر ضرورت کے دوسرے خرچ پیدا کرنے کی زحمت سے بھی نجات مل گئی۔ پہلے پانچ سالہ پلان کی بدولت تعلیمی پھیلاؤ کی سکیموں کے تحت پانچ نئے کالج کھولے گئے۔ ۲۰ سنٹرل سکول، ۱۳۰ لوئر ہائی سکول، پانچ سو نوے پرائمری سکول اور نوے مکتب و پاٹھشالا چالو کئے گئے۔

دوسرے پانچ سالہ پلان میں بھی تعلیم و تربیت کے بنیادی اداروں کو وسعت دینے کا کام اور بڑھایا گیا۔ اب تک تین سالوں کے نشانے لگ بھگ پورے ہو گئے ہیں۔ اس پلان کے دوران نئی بات یہ ہوئی کہ کئی بیسک ایجوکیشن سکول قائم کئے گئے۔ خانہ بدوشوں اور گوجروں کے لئے دور افتادہ مقامات پر گشتی سکول بنائے گئے، جو خانہ بدوش کنبوں کے ساتھ ہر پڑاؤ پر آتے جاتے ہیں۔ دوسرے پلان میں تعلیمی اداروں کے اجراء کا جو پروگرام زیر عمل ہے اس کا خاکہ یہ ہے:

چند [illegible] سکول [illegible] ہائر سیکنڈری سکول [illegible] سکول [illegible] مستقل [illegible] ایک ٹریننگ کالج کا قیام [illegible] کے [illegible]

اُمیدواروں کے لئے ایک تربیت گاہ۔ اس کے ساتھ ہی تعلیمی شعبوں کے لئے خرچے بھی بڑھائے جا رہے ہیں۔ سال ۴۸-۱۹۴۷ء میں تعلیمی بجٹ کے لئے ۳۳ لاکھ ۴۹ ہزار روپے مخصوص کئے گئے تھے۔ سال ۵۶-۱۹۵۵ء میں پلان کے خرچ کے سمیت یہ بجٹ ایک کروڑ ۳۶ لاکھ ۳۵ ہزار تک بڑھایا گیا۔ سال ۵۹-۱۹۵۸ء میں تعلیمی بجٹ ایک کروڑ ترپن لاکھ روپے کے برابر کر دیا گیا ہے۔

تعلیم کے اس زبردست پھیلاؤ نے شہروں اور دیہات میں نہ صرف فکری اور عقلی اعتبار سے ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی، بلکہ اس سے بچوں کی صحت اور ذہنی ارتقاء کی راہیں بھی استوار ہونے لگی ہیں۔ خاص طور پر لڑکیوں کو تعلیم دلانے کے لئے جو جامع اقدام کئے جا رہے ہیں، وہ مفید نتائج برآمد کر رہے ہیں۔ لڑکیوں کے لئے غیر مخلوط تعلیمی ادارے، کالج اور تربیت گاہیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں کھولی جا رہی ہیں۔ دوسرے پلان کے دوران عورتوں کے لئے ایک پوسٹ گریجویٹ کالج قائم کرنے کی تجویز بھی ہے۔ تعلیم نسواں کے لئے ریاستی سرکار نے اس سال مرکز کی ایک سکیم پر عملدرآمد کی منظوری بھی دی ہے۔

تعلیم نسواں کا کام کوئی آسان کام نہیں۔ خاص طور پر ایسے سماجی حالات میں یہ کام اور بھی مشکل ہوتا ہے، جہاں حقائق سے زیادہ جذبات سے کام لیا جاتا ہو۔ اور جذبات بھی وہ جو بدلتے ہوئے خیالات اور بدلتے ہوئے زمانہ کے اثرات سے زیادہ پختہ اور سخت ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم نسواں کے معاملہ میں تبدیلی اور ترقی کی رفتار نسبتاً سست ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو لڑکیوں کو تعلیم دلانے کے سوال پر ناک سکوڑ لیتے ہیں۔ بسا اوقات یہ لوگ تعلیم نسواں کی سختی سے مخالفت بھی کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایک عورت کی تعلیم اور تربیت اس کے گھر کی آغوش میں ہوتی ہے۔ یہ والدین کا دامن ہی عورت یا لڑکی کی سب سے بڑی درسگاہ تصور کرتے ہیں، کیونکہ ذہنی طور پر ایسے لوگوں کو روایات کی دلدل سے نکلنے میں ڈر محسوس ہوتا ہے۔ ان کے [illegible] میں طرح طرح کے غیر فطری وسوسے جاگ اٹھتے ہیں، جو انسانیت کا جوہر ختم کر دیتے ہیں اور خود انہیں بھی [illegible] سے اوپر اٹھنے کی مہلت نہیں دیتے ہیں۔ [illegible] ہو رہی ہے، لیکن ان میں [illegible] باقی نہیں [illegible]

کے روپ میں ایک استانی، ایک نرس، ایک ہیلتھ وزیٹر، ایک لیڈی ڈاکٹر یا ایک انسپکٹریس ان دیہات میں آتی ہے تو ایسے بزرگوں کے پرانے تصورات کی دیواریں لڑکھڑانے لگتی ہیں۔

کشمیر سٹیٹ میں اب زنانہ مدرسوں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی ہے، نہ صرف شہروں اور قصبوں کے کالجوں میں لڑکیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد زیر تعلیم ہے، بلکہ کشمیر سے باہر ملک کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی کئی لڑکیاں ریاستی سرکار کے خرچہ پر تربیت اور تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ اس سے پہلے یہ عالم تھا کہ ریاست میں شاید ہی کوئی پڑھی لکھی لڑکی ملتی تھی۔ جہاں خود پڑھے لکھے مردوں کی تعداد آزادی سے پہلے مشکل سے چھ فیصد تھی وہاں کسی تعلیم یافتہ لڑکی کی تلاش بے معنی تھی۔

پچھلے سال مڈل سٹینڈرڈ کے امتحان میں کشمیر سٹیٹ کی لگ بھگ دو ہزار لڑکیاں شامل ہوئیں۔ اس سال امتحان میں دو ہزار ایک سو ستتا...س لڑکیوں نے حصہ لیا۔ سال ۱۹۶۰ء کے میٹرکولیشن کے درجہ میں ایک ہزار چھتالیس لڑکیاں تھیں۔ سال ۱۹۵۷ء کے اسی درجہ میں لڑکیوں کی تعداد ایک ہزار چار سو سے بھی زیادہ تھی۔ یہ اعداد و شمار خود اپنی زبان سے اس بات کی تصدیق کے لئے کافی ہیں کہ ریاست میں تعلیم و تربیت کا معیار اور اس کی رفتار کیا ہے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ ہم جوں جوں ریاست کو سچے معنوں میں عوامی سود و بہبود کی ریاست بنائیں گے ہمارے لئے زندگی کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی مسرتیں عام ہو جائیں گی۔ کیونکہ اگر انسان کو زندگی میں مسرت اور اطمینان کی تلاش نہ ہوتی تو شاید اسے علم حاصل کرنے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ بدقسمتی سے علم چاہنے والے انسانوں کو ہر زمانہ میں تعلیم پانے کی ایک سی سہولتیں نصیب نہیں رہی ہیں۔ پرمیت کال میں علم کو دیوتاؤں کی چیز خیال کیا جاتا تھا۔ پڑھنے لکھنے اور پڑھانے کا کام صرف ایک طبقہ کے لئے وقف تھا۔ اس طبقہ سے ہٹ کر جب بھی کسی نے علم کی پیاس بجھانا چاہی اسے طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار ہونا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مادی اور روحانی طور سے جکڑے ہوئے عوام اپنی تمناؤں اپنے خوابوں اپنی محبت نفرت اپنی داخلی واردات کا اظہار مروجہ طریقہ پر نہ کر سکے۔ انہیں اپنی تمناؤں کا مدفن اپنے سینوں میں ہی بنانا پڑا۔ پھر وہ زمانہ آیا، جب تحصیل علم پر کوئی قید نہ رہی، تاہم پھر بھی عام لوگ اپنی آرزوئیں پوری نہ کر سکے۔ وہ تعلیم گراں اور سختی سہن نہ کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سال ہا سال تک علم کے دروازے دولت مند گھرانوں کے بچوں کے لئے کھلتے رہے اور غریب بچوں کے کان مدرسہ میں بجنے والے گھنٹے کی آواز تک کو ترستے رہے۔ لیکن اب وہ زمانہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اب لوک راج کی برکت سے علم حاصل کرنے میں دولت اور عسرت کی کوئی تفریق نہ رہ سکے گی۔

تحصیل علوم کا ادارہ

وزیر مملکت برائے تعلیم سردار ہربنس سنگھ آزاد نے قانون ساز کونسل میں شیخ غلام رسول کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ "تیسرے پانچ سالہ منصوبہ کے پہلے سال کے دوران میں کشمیر یونیورسٹی کے تحت فزکس، کیمسٹری، باٹنی اور زوولوجی کی پوسٹ گریجویٹ کو جاری کیا جائے گا۔

آپ نے کہا کہ "کشمیر یونیورسٹی نے براہ راست پوسٹ گریجویٹ کلاسوں کو بڑھانا شروع کیا ہے۔ اور فی الحال انگریزی، اقتصادیات، ریاضی، ارضیات، ہندی اور اردو مضامین میں پوسٹ گریجویٹ کلاسوں کی تعلیم دی جا رہی ہے اور جوں ہی عمارتیں تعمیر ہوں گی تو فزکس، کیمسٹری، باٹنی اور زوولوجی کے مضامین میں پوسٹ گریجویٹ کلاسوں کو قائم کیا جائے گا۔ توقع ہے کہ یہ کلاسز تیسرے پانچ سالہ پلان کے پہلے ہی سال شروع کئے جا سکیں گے۔ انہوں نے کہا کہ یونیورسٹی کو ادارۂ تحصیل علوم بنانے کے لئے دوسرے پانچ سالہ پلان میں بارہ لاکھ روپے مخصوص رکھے گئے ہیں۔

انہوں نے آگے چل کر کہا کہ یونیورسٹی لائبریری کے لئے تیسرے منصوبہ کے دوران خاص عمارت تعمیر کی جائے گی۔ اس سلسلہ میں ضروری ساز و سامان خریدنے کے لئے دو لاکھ روپے کی رقم مخصوص رکھی گئی ہے اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ... ہزار روپے کی گرانٹ بھی منظور کی ہے۔

پریم پال اشک

دوہے

سچ سچ کہدوں، اشکوں کا اب کچھ بھی نہیں ہے مول
نین ترازو ہاتھ میں لے کر تول سکے تو تول

پھول سا سُندر کومل مکھڑا، برہ میں یوں مُرجھائے
جیسے پت جھڑ میں ہریالی بن پوچھے اُڑ جائے

رُوپ خریدا جائے جہاں میں بکتی پیار کی راہ
ڈھول کی قیمت ڈھول چکائے واہ رے مالک واہ

دِل کی مٹی کو آشا کا اِک جھونکا آئے راس
رنگ نہ اس میں، رُوپ نہ اس میں، باہر بھیتر باس

پھول کے نیچے کانٹا دیکھا، دِل میں اُٹھی پیر
بھونرا اپنے بھاگ پہ آخر آپ بہائے نیر

آنکھوں سے کچھ اشک گرا کر لوگ بنائیں بات
لیکن وہ اب لیلے بیٹھی ہنس کر گزاریں رات

عبدالحفیظ
بی ایس سی

پھل محفوظ کرنے کی چند ترکیبیں

کشمیر پھلوں کے لئے کتنا مشہور ہے، یہ کون نہیں جانتا۔ سازگار آب و ہوا کی بدولت کشمیر میں بکثرت پھل پیدا ہوتے ہیں یا پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے پھل ایسے ہیں، جو ہندوستان کے باقی حصوں میں نایاب ہیں، اور اگر کچھ ہیں بھی تو وہ معیار (QUALITY) کے اعتبار سے اچھے نہیں ہوتے۔ اگر کوشش کی جائے تو پیداوار اور بڑھائی جا سکتی ہے۔ جموں و کشمیر میں غیر ممالک سے اور ہندوستان کے باقی حصوں سے پھلوں سے بنائی ہوئی مختلف چیزیں مثلاً جام، رس اور مربع جات وغیرہ آتی ہیں۔ اس کے برعکس ریاست جموں و کشمیر میں پھلوں کی کاشت کرنے والوں کی لاپرواہی کی بدولت بہت سا پھل ضایع ہوتا ہے، اور معمولی کوشش سے ان پھلوں کو ضایع ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ اگر کشمیر میں پھلوں کی کاشت کرنے پھلوں کو محفوظ کرنے کے طریقے (فروٹ پریزرویشن) گھریلو دستکاری کے طور پر سیکھ لیں تو اس سے نہ صرف پھلوں کی کاشت کرنے والوں کے لئے زائد آمدنی کا ذریعہ پیدا ہو سکتا ہے، بلکہ اس طرح سے ریاست جموں و کشمیر کے لوگوں کو مقابلتاً سستی اور زیادہ مفید اور غذائیت رکھنے والی خوراک مل سکے گی۔ اور اقتصادی طور پر ساری ریاست کو کافی فائدہ بھی ہوگا۔ اگر ہم خود ان چیزوں کا استعمال نہ کریں تو ہم ان کو ان چیزوں کے علاوہ ستر ہزار سیاحوں (جو کہ ہر سال ہندوستان اور دیگر ممالک سے یہاں آتے ہیں) کی خدمت میں پیش کر سکتے ہیں۔ احسان کی مزید اپنی پیدا کرتے ہوئے اپنی اقتصادیات کی مفید خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اس کی مصیبت میں سیب سے کچھ چیزیں بنانے کے چند نسخے درج ہیں۔ امید ہے کہ اس سے خاص طور پر طبقۂ نسواں کو فروٹ پریزرویشن سے متعلق معلومات حاصل کرنے میں مدد ملے گی، جو نہ صرف ان کے لئے مالی طور پر مددگار ثابت ہوگی بلکہ اس سے زیادہ غذائیت والی خوراک بھی حاصل کی جا سکے گی۔

سیب کی جیلی بنانا

صاف ستھرے سخت پھل جو نہ زیادہ پکے ہوں اور نہ ہی زیادہ کچے پھل چُن لئے جائیں۔ اچھی طرح دھونے کے بعد صاف چاقو سے بغیر چھیلے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لئے جائیں، اب اتنے پانی میں جس میں پھل اچھی طرح ڈوب جائیں سیب کے علاوہ سائٹرک ایسڈ (فی پونڈ پھل میں تقریباً ۳/۴ گرام کے حساب سے) ڈال دیا جائے، اور تیز آگ پر نصف گھنٹہ جوش دیا جائے۔ جوش دیتے وقت ذرا ذرا دیر بعد لکڑی کی ڈوئی سے سیب کے ٹکڑوں کو کچلتے رہیں۔ اب موٹی سی ململ میں سے رس نچوڑ لیا جائے۔ اس مرکب کو چند گھنٹے ساکن رکھ لیا جائے تاکہ تہ جم جائے۔ پھر صاف رس نتھار لیا جائے۔ فی پیالہ مرکب میں ایک پیالہ چینی ڈال دی جائے۔ چینی ڈالنے کے بعد مرکب کو ۲۲۰ درجہ فارن ہیٹ تک گرم کیا جائے یا جب تک قوام سخت نہ ہو یعنی چمچہ سے گرانے پر تار بندھ جائے۔ قدرے ٹھنڈا ہونے پر صاف خشک کھلے منہ والی بوتلوں میں ڈال دیجئے۔ جم جانے پر اس طرح بند کر دیجئے کہ ہوا اندر نہ جا سکے۔ سائٹرک ایسڈ آخر پر بھی ڈالا جا سکتا ہے۔

سیب کا مربہ بنانا

یوں تو ہر ایک قسم کے سیب سے مربہ بنتا ہے لیکن سیب

بہترین مربہ لال امری ہی سے بنتا ہے۔ بنانے کی ترکیب یوں ہے
سالم قدرے سخت چھوٹے چھوٹے صاف سیب لیجئے۔ دھونے کے بعد ایک صاف چاقو سے چھیل لیجئے۔ اب ان سالم لیکن چھیلے ہوئے سیبوں کو ململ میں لپیٹ کر کھولتے ہوئے پانی میں تقریباً دس منٹ رکھئے اس کے بعد ان کو کانٹے یا لکڑی کی تیلی سے بالکل اچھی طرح گود دیجئے اب سیبوں کے ہم وزن چینی لے کر ⅓ حصہ پانی اور تھوڑا سا سٹرک ایسڈ (ایک گرام فی پونڈ چینی کے حساب سے) ملا کر جوش دیجئے اور شربت تیار کر لیجئے۔ اب سیبوں کو شربت میں ڈال کر پکا لیجئے جبتک درجہ حرارت ۲۲۳ فارن ہیٹ تک پہنچ جائے یا جب انگلیوں میں رکھنے سے شربت کی تین یا چار تار نکلیں۔ ٹھنڈا ہونے پر اچھی طرح گرم پانی سے دھوئے ہوئے مرتبانوں میں رکھ دیجئے۔

سیب کا جام بنانا

بڑے تقریباً پختہ مہک دار سیبوں کو چن لیجئے۔ دھونے کے بعد ان کو چھیل لیجئے، اب ان کے بالکل چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیجئے اور اچھی طرح کوٹ لیں۔ اس کے بعد نرمی کے واسطے ان کوٹے ہوئے سیبوں کو تقریباً دس یا پندرہ منٹ گرم کر لیجئے۔ پھر ہم وزن چینی کے ساتھ ملا کر تھوڑی سی کا دیر رکھ لیجئے۔ اس کے بعد ۲۲۰ درجہ فارن ہیٹ تک پکائیے یا تب تک جب اس کا وزن ڈالی ہوئی چینی سے ڈیڑھ گنا ہو جائے۔ اندرے ٹھنڈا ہونے پر جام کو گرم پانی سے اچھی طرح دھوئی ہوئی کھلی منہ والی بوتلوں میں انڈیل دیجئے، اور پھر ان بوتلوں کو اس طرح سے بند کر دیجئے کہ ہوا اندر نہ جائے۔

سیب کا رس (جوئیس) بنانا

بڑے رس دار پختہ مہک دار سیب چن لیجئے، بالکل اچھی طرح دھونے کے بعد بغیر چھیلنے کے پھل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیجئے۔ اب ان ٹکڑوں کو اچھی طرح کوٹ لیجئے۔ کوٹے ہوئے پھل کو ایک صاف کپڑے میں لیجئے، اور پھر زور سے دبا کر رس نچوڑ لیجئے۔ رس نچوڑنے کے لئے ایک چھوٹا سا باسکیٹ پریس (BASKET PRESS) اچھا رہیگا۔ اب اس رس کو صاف کرنے کی خاطر تھوڑے سے کپاس میں سے گذار دیجئے۔ پھر رس کو چند منٹوں کے لئے ۱۸۰ درجہ فارن ہیٹ پر گرم کریئے۔ اب بغیر ٹھنڈا ہونے کے رس کو گرم پانی سے دھوئی ہوئی گرم بوتلوں میں بالکل اوپر تک ڈالیئے۔ اور پھر جلدی سے بوتلوں کو اس طرح بند کیجیئے کہ ہوا اندر نہ جا سکے۔ اس کے بعد بوتلوں کو ایک موٹے سے دو یا تین دفعہ تہ کئے ہوئے کپڑے میں رکھکر گرم پانی میں تقریباً آدھ گھنٹہ رکھیں۔ پانی کا درجہ حرارت تقریباً ۱۷۰ درجے فارن ہیٹ ہونا چاہیئے۔ آدھ گھنٹہ بعد بوتلوں کو نکال کر ایک ٹھنڈی جگہ رکھیئے۔

لاکھوں انسانوں کی ضروریات کا خاکہ

دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کے تحت مندرجہ ذیل مقاصد کے حصول کی خاطر کوششیں جاری رکھی جائیں گی :۔

- آبپاشی کی سہولیات میں مزید توسیع
- سڑکوں اور رسل و رسائل کے دوسرے ذرائع کو وسعت دینا
- معدنی دولت کے علاقوں کی کھوج اور دریافت کا کام
- عوام کو کام کاج اور روزگار کے مزید ذرائع مہیا کرنا
- بجلی کی مزید پیداوار اور فراہمی
- نئے صحت افزا مقامات اور سیاحوں کو زیادہ سے زیادہ سہولیات کی فراہمی
- ہسپتالوں میں بستروں کی تعداد میں اضافہ اور صحت عامہ کی زیادہ بہتر سہولیات

پریم ناتھ در

ویسے کا ویسا

قبائلی حملے سے پہلے کی بات ہے جب بارہ مولا ایک معروف شہر تھا. گھر گھر گھر والے تھے۔ ان کی بیویاں تھیں، بیٹیاں تھیں، گھروں میں رانڈیں تھیں، دادے اور چاچے تھے اور بھرے پُرے شہر میں ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہی اکیلا ہے، بن بیاہا، ٹنڈ منڈ پیڑ کی طرح، ایک ہرے بھرے باغ میں منحوس سا سایہ ڈالتا ہوا ـــــ لیکن یوں دیکھنے میں ہرا بھرا اور تازہ تازہ سا وہ بھی تھا اور اپنی مضبوط بوٹیوں کی نمائش کرتا ہوا ہر گھر میں آ دھمکتا تھا۔ نہیں اُسے بلایا جاتا تھا کیونکہ وہ کمپونڈر تھا اور لوگ بیمار ہو جاتے تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ ہسپتال کے ڈاکٹر سے بھی زیادہ جانتا تھا اور لال لال پیلی پیلی دوائیوں کی بڑی بڑی خوراکیں معمولی داموں میں دیتا تھا۔ پیسے وہ مانگتا بھی نہیں تھا۔ یوں ہی بڑا بنتا پھرتا تھا۔ اور جس کسی کو اس کی یہ بات بُری لگتی تھی، چار آنے کے پیسے اس کے مُنہ پر مار آتا۔ لیکن شہر کے اکثر لوگ ایسے کو پیسے دینے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ جو دوائیاں بانٹتا پھرتا ہے، اس کے گھر کی نہیں، سرکاری ہسپتال کی ہیں۔ یوں ہی ڈاکٹر بننے کا شوق ہے اُسے۔ اور ان کی فراخ دلی تھی کہ یہ جانتے ہوئے بھی اُسی کو بلاتے تھے کہ اس کے قدم بھاری ہیں اور اس کے آنے سے گھر میں نئی بیماریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ جنتر منتر ٹونوں میں یقین رکھنے والے تو یہ کہتے تھے کہ دوائیوں سے پہلے وہ بیماریاں بھیجتا ہے، اور سب کا تو یہ خیال تھا کہ وہ گھر گھر میں گھسنا چاہتا ہے اور کم بخت بیماریاں بھی اسی کا ساتھ دیتی ہیں۔ مردوں کا خیال تھا کہ وہ عورتوں کو دیکھنے آتا ہے اور عورتوں کا خیال تھا کہ وہ انہیں نظر لگانے آتا ہے کیونکہ آنکھیں اس نے ایسے [illegible] اندر اندر گہرا اتارتا تھا۔

وہ سمجھاتے تھے کہ اس کی خلعت ہوتی ہے نہ ہوگی۔ پہلے تو اس کے

چہرے پر ہمایہ بات تھی۔ عورتیں اس کی ایک ایک بوٹی سے سمجھ جاتی تھیں۔ مُنہ پر وہ بے ترتیبی نہ ہوتی اگر عورت کا ساتھ ہوتا تب اُس کی بوٹیاں اُٹھی ہوئی اور سخت سی نہ ہوتیں اور اس کی سُرخی کیسری مائل نہ ہوتی۔ ان کے مردوں کی سفیدی میں ایک بھلی بھلی، ہلکی ہلکی پیلاہٹ ہوتی تھی۔ گرہستی چہرے ہوتے تھے اُن کے۔ وہ انسان سے دکھائی دیتے تھے اور یہ تھا کہ کورا کورا سا، جس کا دھونے والا کوئی نہ تھا۔

مردوں کے لئے وہ ترنگاروں، کھانسیوں کے علاوہ جیسے وباء بن کر آتا تھا۔ بات ان سے کرتا تھا اور دیکھتا تھا ان کی بیویوں کی طرف۔ نبض دیکھتے ہوئے تو خیر بیمار کی طرف کون دیکھتا ہے۔ وہ تو زبان دیکھ کر بھی جھپاکے میں گردن موڑ لیتا تھا۔ عورتیں کہتی تھیں کہ اس کی آنکھیں کیوں نہیں پھوٹتیں۔ اور مرد کہتے تھے کہ لڑکی دے کر کوئی اس کا روگ کیوں نہیں کاٹتا۔ لڑکی اسے دیتا کون؟ کمپونڈر تو تھا، لیکن تھا کرشن درزی کا بیٹا سادھو ـــــ کشمیری پنڈتوں کی "ساتوں دیواریں سونے کی ہوتی ہیں۔" یعنی رشتہ داری میں کوئی نانوائی، حلوائی یا درزی ایسا ذلیل آدمی نہیں ہوتا۔ ان پیشوں کے لوگ شادیاں نہیں، بہنوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ اور جس کے پاس بہن نہیں یا غریب کی چھوکری خریدنے کو دھن نہیں، اس کے لئے بیوی نہیں، رام کا نام کافی ہوتا ہے ـــــ کم بخت سادھو پُجاری ہوتا، درزی کا بیٹا نہ ہوتا۔ تب تو اس کے چہرے پر اُٹھی ہوئی بوٹیاں نہ ہوتیں۔ مُنہ کورا لٹھا نہ ہوتا، کیونکہ عورت کا ساتھ ہوتا۔

لیکن سادھو اپنے آپ کو ایک معقول ڈاکٹر ہی نہیں سمجھتا تھا بلکہ ایک فلسفی بھی۔ ڈاکٹر کی حیثیت میں جب وہ کسی 'بیوی' کی نبض پر انگلیاں رکھ سکتا تھا، اس کے اندر ایک چھوٹا سا سادھو، ڈاکٹر کو دبا کر، بیماری کی دھڑکن [illegible]

سُننے لگتا۔ سانسوں کی گرمی سینکنے لگتا۔ اور جب وہ بیمار مُنہ کی گرم گرم بدبُو کو بھی کھینچ کھینچ کر سونگھنے لگتا، اس کا فلسفی اُچک پڑتا — لالچی مادھو کو پچھاڑ دیتا۔ بیمار کی ٹیٹول، پیشابوں کی پوچھ گچھ کرنے لگتا — اور مادھو کمپونڈر —— نہیں مادھو ڈاکٹر — وہ نسخہ لکھتا جس کو بدلنے کی ضرورت کبھی نہ پڑتی۔

ظالم فلسفی نے مادھو کو مار مار کر اور دل میں عجیب بنایا تھا۔ اور تھے کہ انسان تھے، جذبات والے انسان، کہ بچہ رویا ماں باپ کے کلیجے پھٹنے لگے۔ بیمار نے آہ بھری، تیمار دار اس پر صدقے ہونے لگا۔ ایک نے ترچھا دیکھا تو دوسرے کے دل میں نقوش رینگنے لگے۔ انسانی رشتے تھے یہ کہ ایک دوسرے کو محسوس کرتے تھے اور یہ تھا کہ بس بوٹیوں کا بنا ہوا اور کڑوی کڑوی دوائیاں دیتا تھا۔ لمبے لمبے چہرے اور چیخوں کو جیسے سُنتا بھی نہ تھا۔ مارے خوف کے بیمار کانپنے لگتا۔ زخم میں کیڑے بھی پڑ گئے ہوں — کیڑوں سے بڑے مادھو کے انگوٹھے ہوتے جو پیپ کیا اُن کی جان نکالتے۔ بیمار کبھی نازک سی لڑکی ہوتی۔ بیچاری آنسو بہاتی۔ اس سے التجائیں کرتی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی۔ لیکن یہ تھا کہ اپنی آنکھیں ذرا ڈھیلی ہونے لگیں اور پُتلیاں ذرا گھٹنے لگیں کہ اچانک نہ جانے اسے کیا ہو جاتا۔ اس کے چہرے پر بھوتوں کے سایے آتے۔ اس کا نچلا ہونٹ پھڑ پھڑانے لگتا اور ایک لمحہ میں گردن اُونچی کرکے، اپنی نظروں کو جیسے کس کے انگوٹھے بڑھاتا۔ وہی پیپ پیشاب والا، نری بوٹیوں کا مادھو۔ کمپونڈر کا کمپونڈر اپنا کام کرتا۔ خون نکالتا یا پیپ نکالتا۔

حد یہ کہ اس دن بھی جب اُس تباہی کی آمد آمد تھی، جب لوگ بارہ مولہ سے بھاگنا چاہتے تھے، پر بھاگنے کا انہیں راستہ نہ دکھائی دے رہا تھا، جب کہیں دھان کے بڑے بڑے ادکھلے دروازوں کے پیچھے بٹھائے جا رہے تھے اور کہیں پھوس کے پیچھے چھپنے کی جگہ بنائی جا رہی تھی۔ جب بے بسی میں دلوں سے دُعائیں اُٹھ رہی تھیں کہ جہلم واپس مڑ جائے اور انہیں جلدی جلدی سرینگر کی طرف بہا لے، جب گھر والے، جہاں دیدہ اور غیرت والے اونچی آواز میں رونے بھی لگے تھے کہ بچوں کو کہاں ڈھک دیں اور عورتوں کو کہاں گاڑ دیں۔ جب بیار بیماریوں کو بھول کر بھاگ دوڑ کرنے لگے تھے اور بچے بڑوں کو مرگی کے دورے پڑ رہے تھے، اس دن

وہی ایک مادھو کمپونڈر اپنے برآمدے میں حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ تین چھوٹے چھوٹے اور ایک لمبا کش، جیسے یہاں بھی اپنے دونوں مادھو حقہ پی رہے تھے۔ ایک وہ کہ تین چھوٹے چھوٹے، بھوکے بھوکے اور بے چین کش لگا رہا تھا اور دوسرا وہ کہ ان پر ایک لمبا اور گہرا کش لگا کر دھوئیں کی گھٹائیں نکال رہا تھا۔ پھر وہی بوٹیاں، وہی رنگ، جیسے قبائلیوں کی گولیاں ان بوٹیوں کو لوہا سمجھتیں۔ وہ ایسے بیٹھا ہوا تھا کہ دیکھ کر تن بدن میں آگ لگتی تھی۔ لوگ برداشت کیا کرتے؟ اُسے اُونچی آوازوں میں کوس رہے تھے، کہہ رہے تھے کہ بیٹھا ہوا ہے۔ کیونکہ ماں بہن نہیں ہے۔ بیوی نہیں ہے۔ بچے نہیں ہیں۔ لیکن مادھو اپنے کش لگاتا رہا۔ پھر جب کسی دل جلے نے یہ بھی کہا کہ بیٹھا ہے دیکھنے کہ کتنا خون بہے گا۔ اور جو نہ بہے گا، اس میں کتنی پیپ پڑے گی" مادھو اپنے انوکھے پن میں سوچنے لگا کہ ان کے دلوں میں بچنے کی اُمیدیں ضرور ہیں جو پریشانیوں کے نیچے پیپ ہی کی طرح چھپی ہوئی ہیں۔

اور پھر وہ گھڑی بھی آ گئی جب جہلم وہی پرانی چال چل رہا تھا اور مادھو اپنے کش لگا رہا تھا کہ یکایک اس پار اور اُس پار، دائیں بائیں دونوں پہاڑوں سے گولیاں چلنے لگیں۔ ٹھائیں۔ ٹھائیں۔ ٹھائیں۔ اور گولیوں کے ساتھ دروازے اور کھڑکیاں بند ہوتی گئیں اور چند لمحوں میں ہی دن دہاڑے شہر بھر کی دھڑکن رُک گئی۔ مادھو نے بھی اپنی کھڑکی بند کی اور حقہ اٹھاتے ہوئے محسوس کرنے لگا کہ اس دُنیا کی آوازیں بھی نقلی تھیں جو ایک نئی آواز سے بیٹھ گئیں، ایسی کہ جیسے تھیں ہی نہیں۔ لیکن اسی وقت دریا میں چپو چلنے اور کشتیاں چلیں۔ اور کنارے پر آ کر بھاری بھاری پیر چلنے لگے — ہش ہش — چوڑی موٹی آوازوں کی گھٹا چھوٹی سی اُٹھتی گئی اور پھیلتی گئی۔ اسی پار کھڑا رخ سے ایک اور گولی چھٹی اور مادھو کی بوٹیوں کے بیچ جھرجھری لی — ایک اور — ایک اور — خاندان بھر کی چیزوں نے بارہ مولہ کے پہاڑ پھاڑنے شروع کر دئے۔ خود مادھو کی چھت تک [illegible] دکھائی دی۔ پھر ایک گھر کی چیخیں دوسرے کو چھو گئیں۔ اور مادھو نے ایسا محسوس کیا کہ چیخیں آگ کی طرح پھیل رہی ہیں اور دیکھتے دیکھتے سارا شہر لپیٹ میں آ جائے گا۔ کس گھر سے اب اٹھیں اور کہاں یہ چیخیں دب گئیں، مادھو یہ اندازہ نہیں لگا سکتا۔ مادھو چیخوں کا

[illegible] بھر شہر بھر کی چیخیں سُن رہا تھا۔ لیکن اندازہ لگاتا تو کیسے [illegible] تھا۔ اس کے ساتھ پیپ نہیں، پُوری جان نکل رہی تھی۔ چیخوں میں بل نہیں تھے۔ موڑ نہیں تھے، فوارے تھے جو ایک دم چھوٹ نکلتے، نکل ہوتے اور دم بھر میں دب جاتے، کھو جاتے۔

مادھو کے اندر ایک انجانی کپکپاہٹ اُٹھنے لگی۔ اور اگر کوئی سامنے ہوتا، دیکھتا کہ مادھو کی بوٹیاں بھی نرم پڑ گئی ہیں۔ اُس کے انگوٹھے بھی جھکے ہوئے ہیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے کھڑکی کو کھولنا چاہا تھا۔ لیکن اُسی لمحے گولیوں کا ایک دوڑتا ہوا سلسلہ شروع ہو گیا — "تڑا تڑ تڑ تڑ" — جیسے مٹر بھُنتی جا رہی تھی۔ پچھلے پہاڑ سے اگلی سڑک پر، پُل پر، اور ایسا سُنائی دینے لگا جیسے جہلم بھی گولیاں اُگل رہا تھا اور مادھو فلسفی عادت سے مجبور کانپتے ہوئے مادھو سے پُوچھنے لگا کہ بارہ مولے کو ختم کرنے کے لئے اتنی گولیوں کی کیا ضرورت تھی، بیمار بارہ مولے کو، جہاں اتنی پیپ تھی۔

لیکن گولیاں دوڑتی گئیں اور بارہ مولے کی ایک ایک اینٹ چیخنے لگی۔ بالغ آوازوں نے کہرام مچایا۔ انسان کُتوں کی طرح بھونکنے لگے۔ کُتے وہ گلے کہاں سے لاتے؟ ایک ایک گلی میں کئی کئی وحشی گھُسے ہوئے تھے اور مادھو کمپونڈر کو بھی ڈر ہونے لگا کہ نہ جانے گولیوں سے کیسے جان نکلتی ہو گی۔ اُس نے کھڑکی تو نہیں کھولی، لیکن جالی پر چپکے ہوئے کاغذ میں ایک اُنگلی گھُسا دی۔ تنا ہوا کاغذ پھٹ گیا اور مادھو کا دِل اُسی ننھی سی آواز سے ہی لمحہ بھر رُک گیا، جیسے کاغذ نہیں، اُس کے سامنے ایک بم پھٹ گیا ہو۔ کھُلے ہوئے چھید میں سے دیکھنے ہی لگا تھا کہ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ ٹھنڈی اور بھیگی بھیگی ہوا کی جگہ بارُود کی بھبک چلی آئی اور باہر دیکھنے سے پہلے ہی اُس کی آنکھیں بھر گئیں۔ کھڑکی سے ہٹ کر وہ اپنے اندر ہی کی طرف محتاط قدم اُٹھاتا ہوا گھڑونچی کے پاس آ کر رُکا۔ گھڑونچی پر وہی اپنا مٹکا تھا، گیلا گیلا، صاف صاف پانی کیا ایک [illegible] سمیٹے بیٹھا تھا۔ اُس نے ایک گلاس کو مٹکے میں ڈبو کر محسوس کیا کہ پانی ہاتھ کو چوم رہا ہے۔ اُس کو یہ مٹکا رُلانے ہی لگا تھا کہ [illegible] — اور مٹکے سے بھلے کیا محبت؟ روز [illegible] — پھر اُسے وہ ہنسیاں [illegible]

یک سُنائی دینے لگیں جو عورتیں ہنسا کرتی تھیں۔ جب مادھو اُن ہی کی طرح اپنا مٹکا کاندھے پر اُٹھاتا۔ وہ ہنسیاں گولیوں سے بھی اُونچی اُٹھیں اور اُس نے پانی بھی نہ پیا۔ اور آ کر کھُلے چھید پر پھر جم گیا۔ اُس نے پہلے اپنے نتھنے کھولے اور بارود کی بھبک کو ہی سونگھنے لگا۔ پھر اُس نے اپنی آنکھ بھی چھید کے ساتھ لگا دی۔

پہلی نظر میں تو اُسے کچھ بھی نہ دکھائی دیا۔ جیسے کچھ ایسا ہو گیا جیسے خود وہ بھی نظر کے ساتھ باہر کی فضا میں گم ہو گیا ہو۔ لیکن سنبھل کر اُس نے اپنی سڑک پر نظر کو روکا۔ سڑک وہی تھی۔ اُس کے اُکھڑے ہوئے روڑے بھی۔ وہ اپنے گڑھے بھی، جن میں پانی رُکا ہوا تھا۔ اور ٹٹوؤں کی لید بھی جو اُسی صبح چاول لئے گذر رہے تھے۔ سڑک پر کچھ اور نہ تھا۔ سُنہری دھوپ تھی اور اُس کے اُوپر دھوئیں کے ہلکے ہلکے جال رہے تھے۔ اُس نے اطمینان کے ساتھ اُوپر کا ایک اور چھید کھولا اور جہلم کے پار بید کے درختوں میں کھوجنے لگا۔ بید سبھی کھڑے تھے اور دھوپ وہاں بھی اتنی تیز تھی کہ درختوں کے نیچے ہر موڑ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن یہ گولیاں قریب آ رہی تھیں اور وہ شور جو مچا ہوا تھا؟ اُسی وقت بیدوں کے پیچھے اَن گنت سایے ہلنے لگے۔ اُس نے دائیں طرف کا ایک اور چھید کھولا اور دیکھا کہ بلوائیوں کی فوجیں ایک اندھی بے ترتیبی میں دوڑی آ رہی ہیں — آدمی ہی آدمی، جو خونخوار درندوں کی طرح پیر مار رہے تھے۔ کچھ کشتیوں میں اُترنے کے لئے بے تاب تھے۔ کچھ اُوپر اُوپر پُل کی طرف بڑھے آ رہے تھے — قبائلی! یہ تھے وہ!! پٹے، لُنگیاں، داڑھیاں اور رائفل۔ — مادھو اپنے آپ سے بولنے لگا۔ رونے کو دَبانے لگا۔ دھوپ میں رائفلیں چمک رہی تھیں۔ نہ معلوم کتنے اُس پار آ چکے تھے، کتنوں کو اور آنا تھا۔ بس چند لمحے تھے کہ مادھو بھی ... ...

بارہ مولہ اب ایک ایسا کہرام بن گیا تھا جہاں گولیاں، چیخیں، آگ، دھواں اور بھگدڑ ایک ہو گئے تھے۔ لیکن ایسے میں بھی مادھو کے ذہن میں ایک بات صاف تھی۔ اُسے یقین تھا کہ ساتھ والا مکان خاموش ہے۔ خاموش ایسا کہ جیسے بھونرے کے گھونسلوں میں چڑیاں [illegible] جانپ گئی ہوں۔ اُس نے [illegible] کی دیوار کا سہارا لیا۔ دونوں ہاتھوں سے اینٹوں کو پکڑے رکھا۔ جیسے اُس خاموشی کو تھام رہا تھا — لیکن یکایک پھر

وہیں پہاڑ پھٹنے لگے۔ دو پارہ جیسے وہیں گھس گیا۔ اینٹ اینٹ بجنے لگی۔ اور ایک ظالم ہنسی بولتی ہوئی اینٹوں کو جیسے گھونٹتے ہوئے ادھر تک آگئی۔ اور جیسے مادھو کو اپنا دیواروں سے ٹپکنے لگی۔ وہ ہنسی تھی کہ شعلوں کو لپیٹ رہی تھی۔ مادھو چلنے سا لگ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اٹھا کے اپنے پہلو میں گاڑ دیا۔ کیونکہ اس کے پہلو سے چیخیں اٹھنے لگی تھیں۔ دھڑام سے ایک برج گرا اور اس کے دروازے کے ساتھ ٹکرایا۔ دراڑوں میں سے لال لال خون چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگا۔ گرتے برج، ٹوٹتی دیواریں، پھٹتے گلے، دھواں، بارود ہنسی، خون اور بھونچال پھیلنے لگا۔ اور یہی پھیلاؤ گولی چھوٹنے سے پہلے ہی مادھو کو نگل لیتا۔ اگر دروازے کے پیچھے پڑوسی کی منّی کی چیں چیں کرتی آواز پھیلاؤ میں سوئیاں نہ چبھوتی۔ منّی چیں چیں کرتی گئی اور دروازے پر دو ہتڑ مارتی گئی اور .... کاکا ... ... اے مادھو کاکا ... ... اے مادھو کاکا۔ بھائی لال کا سِل دیکھو۔ ٹوٹ گیا ہے۔ تمہارے دروازے پہ ہے۔ دروازے سے ٹوٹ گیا ہے۔ کاکا خون نکل رہا ہے۔ سِل کے دو ہو گئے ہیں۔ پٹی باندھو۔ دوائی پلاؤ۔ بھائی لال کا سِل ... ... "

اور اتنے میں اس کی چھت پر بھی بھاری پیر اترے۔ اُدھر اُدھر موت کے بادل گرجنے لگے اور ایک گولی وہاں بھی ... ...

"زن لاؤ۔ زر لاؤ۔ کافر کیدر اے زن؟"

زن ——؟ اس لفظِ "زن" میں نہ معلوم کیا تھا کہ مادھو سنبھل کر سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"زن کیدر اے ——؟"

زن ——؟ مادھو، پورا مادھو، اب سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کے اندر ایک ایسا طنز اٹھا۔ ایک مسکراہٹ اٹھی، جو اتنی زہریلی تھی کہ اس کے اندر ڈر مر گیا۔ اس کی ٹانگوں میں طاقت آگئی اور وہ آگے بڑھا۔

"میں ہوں [illegible] مادھو رام، جس کے گھر میں زن نہیں ہے ——!"

مادھو کے جواب میں ایک گولی آئی جو اس کے کانوں کے پاس سے گذری اور ایک دیو قد پٹھان اس کے سامنے سراپا موت کی طرح کھڑا ہو گیا۔

"کافر کیدر اے تمارا زن ——؟"

"خان میری ماں کے بعد اس گھر میں کوئی عورت نہیں آئی۔"

اتنے میں چار اور داڑھیاں اور چار اور لنگیاں ابھریں اور مادھو کے

ملک الموت نے ان کو پشتو میں کچھ کہا۔ مادھو نے سمجھا کہ وہ لوگ اس کے گھر کی تلاشی لے چکے ہیں۔ قبائلی نے اپنی رائفل نیچے رکھ دی اور آستین الٹ کر اس نے اپنے چھلے ہوئے بازو کو آگے کر دیا۔

"تو تم ڈاگدر اے؟ ڈاگدر اے۔ مرہم لگاؤ۔ مگر ڈاگدری کیدر رکھا اے؟"

تانی ہوئی رائفل کے سامنے اور "زن" کے لفظ سے مادھو کے دل میں ایک شان آگئی تھی۔ ایک غرور آگیا تھا۔ جو اس فلسفی شہید کی بھوؤں میں موت سے پہلے آجائے۔ جس کو کم ظرف دنیا نے ایک چیز سے عمر بھر محروم رکھا ہو۔ اور اب وہی دنیا اس سے وہی چیز طلب کر رہی ہو۔ اسے اپنا آپ زن سے بالاتر، دنیا سے اونچا اور موت سے پرے دکھائی دینے لگا تھا —— لیکن گری ہوئی رائفل اور چھلے ہوئے بازو نے، زندگی کی اس ضعیف امید نے اس کو اور اس کے غرور کو توڑ دیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی جگہ التجائیں تھرکنے لگیں اور جھکے جھکے شانے لے کر، گرے ہوئے ہاتھوں کو گھما کر، بھیگی بھیگی آنکھوں سے دیکھ کر اس نے قبائلی کے بازو پر دوائی لگائی اور پٹی باندھی۔ اور اس کا سارا منہ ایسا ہو گیا جیسا اس بچے کا، جس نے ابھی ابھی اپنے باپ سے مار کھائی ہو اور اب اس کا دل بہلانے کے لئے کچھ نیم خوف زدہ، نیم روٹھا ہوا اسی کا کام کر رہا ہو ——

"لیکن تمارا زن کیدر اے ——؟"

"خان۔ میں نے شادی نہیں کی۔ مجھے ملی نہیں۔ کسی نے دی نہیں ——"

"تو ڈاگدر کو شادی نہیں ملا ——؟ اور تم یہ والا، یہ والا ..." اس نے اس کی لال لال بوٹیوں پر چٹکیاں لیتے ہوئے کہا —— "اور ایسا والا ڈاگدر ——؟"

"خان۔ یہ ہماری برادری ایسی ہی ہے۔ اسکول کے لڑکوں کو دیتے ہیں۔ چھوٹے نا تجربہ کار لڑکوں کو۔ لیکن ... ..." مادھو برادری کی یاد پر موت کو بھی بھول سکتا تھا اور نہ معلوم اب کتنا واویلا کرتا۔ برادری کی کتنی اور باتیں انہیں سنانے بیٹھتا۔ لیکن پشتو کا ایک تیز تند جملہ اور وہ سب باہر چلنے کا حکم ہوا۔

باہر آتے ہوئے مادھو کے دل میں برادری کی وہ اور باتیں تھیں جو وہ اس پٹھان کو سنا سکتا تھا۔ ابھی چند قدموں پر ہی تھے سیڑھی پہ تعلق کو کچھ

کم ہی دھیان تھا۔ لیکن جوں ہی اُس نے ٹھنڈا سا ہاتھ سڑک پر اچانک پیر رکھ دیا، بھنک کی ایک لمبی شعاع سی اُس کے سر تک گھس آئی۔ ایک جھرجھری کے ساتھ وحشی بھیانک دُنیا میں جھانک پڑا جس کو اُس نے اُن چند لمحوں میں بھلا سا دیا تھا ... اب وہ باہر اُسی سڑک پر تھا، اپنی سڑک پر جس کے دھڑوں اور گڑھوں پر سے اُس کے پاؤں اُچھلتے جانے تھے۔ اب وہی اپنی سڑک اُسے کھانے آئی۔ سڑک تو وہی تھی، اُس میں اپنے گڑھے بھی تھے، لیکن گڑھوں میں پانی نہیں، خون تھا۔ ٹٹوؤں کی لید کے ساتھ ساتھ برادری کی لاشیں بھی تھیں۔ ہوا میں بارود ہی نہیں، مٹی کی گھٹائیں تھیں — مسالوں کی دھمک تھی۔ نالیوں میں تیل بہہ رہا تھا۔ سڑک کے کنارے ٹوٹی ہوئی کھڑکیاں، دروازے اور دُکانوں کے پھٹے تھے۔ چاول، سیب، ٹوکریاں اور ٹین تھے۔ انسانوں کے سر تھے۔ الگ الگ ٹانگیں تھیں اور تیل، خون اور ہلدی کی کیچڑ تھی۔ کنارے کنارے مکان تو کھڑے تھے، لیکن اُن کی شکلیں بگڑی ہوئی تھیں۔ دروازوں دریچوں کی جگہ منہ کھلے سوراخ تھے جیسے یہ بھی چیخ چیخ کے پھٹ گئے تھے اور اب جیسے ان کی بھی چیخیں چھینی گئی تھیں۔

مادھو نے سوچا تھا کہ اس بلا نے انتخاب کیا ہے کہ بلوائیوں کا ایک الگ مذہب ہے، فرقہ ہے۔ اور اسی لئے یہ بلا اُسی کے فرقے پر، اُسی کی برادری پر ناگہاں اُتر آئی ہے۔ لیکن اُس نے دیکھا کہ اینٹ گارے اور لکڑی کی دیواروں کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ اس لئے جہاں تہاں وہ کھڑی تھیں، ضرب کھائی ہوئی کھڑی تھیں اور دیکھا کہ آٹے چاول کی بوریاں محض بوریاں تھیں۔ اسی لئے وہ ہر دُکان سے چھینی گئی تھیں۔ اور دیکھا کہ لامذہب سونا یا لامذہب چاندی، چاہے ہندو کے کان میں تھی، چاہے مسلمان کے بازو پر، نوچی گئی تھی، "توڑی گئی تھی۔ بندوق کی برچھی سے، یا برچھی سے سخت اُنگلیوں سے۔ نہیں! اتنا ہی نہیں، سڑک کے اُس چوڑے کونے پر جہاں سیب کی پیٹیاں دھری رہتی تھیں۔ وہاں چنار پر لمبی سیدھی میخیں لگی ہوئی تھیں اور شیر جیسی اُردو میں ایک اعلان لٹک رہا تھا کہ یہ میخیں اُن مسلمانوں کے لئے ہیں جو مسلمان ہو کر بھی حب الوطنی کی حماقت کریں اور ہندوؤں کے ساتھ مسجد ... تعمیر کریں۔"

مادھو نے دیکھا کہ تھی تو مسلمان ہی۔ لیکن اس کی پیٹھ پر ایک

دُو تلی گری اور پیٹھ سے ایک دُھواں سا اُٹھ کر اُس کے دماغ میں آ گھسا۔ وہ شاید آگے چلنے لگا۔ لیکن دُھوئیں میں اُسے ایسا دِکھائی دیا کہ دُنیا بھیڑیوں کی ہے اور ایک ریوڑ چل رہا ہے۔ ریوڑ میں چاروں طرف "میں میں" کا شور ہے۔ اُسے ایسا سُنائی دیا کہ ریوڑ ذبح خانے کی طرف جا رہا ہے اور اُس کی ٹانگوں میں بھی اینٹھن آگئی ہے۔ لیکن ٹانگوں کو چلانا تھا۔ وہ بھی چلتا رہا۔ اور جب اُسے قبائلی کے پھیلے ہوئے بازو اور پٹی کا خیال آتا تھا وہ خون کے گڑھوں سے بچ کر اور لاشوں سے ہٹ کر قدم اُٹھاتا۔ نہ جانے اُس وقت اُس کی آنکھیں بھی کیوں دیکھنے لگتی تھیں۔

لیکن چلتے چلتے مادھو کا دُھواں چھٹنے لگا۔ اور مستقبل کی دُھند میں بھی اُسے حال کے ساتھی صاف دِکھائی دئیے۔ ساتھیوں میں ... ... مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ لیکن مرد ایسے کہ جیسے مردوں کا خام مسالہ اکٹھا ہو گیا ہو۔ عورتیں ایسی کہ جیسے پھوڑے سُکڑ گئے ہوں۔ جیسے ابھی ابھی اُن میں سے پیپ نکالی گئی ہو۔ جیسے تنے ہوئے چھالے اب پھٹ گئے ہوں۔ اُن میں سے کئی ناخنوں سے اپنے چہروں کو بگاڑ رہی تھیں۔ کئیوں نے بال نوچ نوچ کر مٹھیاں بھر دی تھیں۔ مرد رو رہے تھے اور عورتیں وحشی ہو گئی تھیں۔ وہ منہ کھول کھول کر، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہچکیاں مار رہی تھیں اور اُن سب کو چند ایک قبائلی رائفلوں سے ہانک رہے تھے۔

پُل پر سے گزرتے ہوئے ایک عورت نے چھلانگ ماری اور مادھو نے پانی میں چکر کھلتے دیکھے۔ پھر اُس گرداب کے عین بیچ میں ایک موٹا ٹھوک گرتا دیکھا۔ ہوا میں گالیاں پھیلتی سُنیں۔ ایک اور اُچھلی، پانی اُچھلا لیکن اِس بار ٹھوک نہیں گرا۔ پُل ہلا، گولی چلی۔ ایک، دو، تین مرد گرے۔ عام مسالہ دھیوں کی طرح بیٹھ گیا اور ریوڑ پُل کے پار اُترا۔

مادھو کے سر میں دُھواں پھر گھنا ہونے لگا۔ تھانے کے صحن میں وہ بیٹھ تو گیا لیکن اُس کے ساتھ دُنیا کی عمارتیں جیسے بیٹھ گئیں۔ اُس کے کانوں میں دیواریں گرنے لگیں اور اُس دھوئیں نے اُسکو لپیٹ لیا — لیکن اس پار کو ٹھیوں کی فضا تھی۔ لوٹ مار سے نہ وہاں گرد اُٹھی تھی، نہ مٹی پھیلی تھی۔ یہاں تو پہلے جنگل سے ہوا آ رہی تھی اور بارود کی بُو بھی یہاں سے اُس پار چلی گئی تھی۔ یہاں کی فضا کچھ رُکی رُکی سی معلوم دی؛ اور قبائلی بھی تھک سے گئے تھے۔ دھیرے دھیرے مادھو کا دُھواں

بھی چھپنے لگا۔ اور اُسے مردوں کے واویلا میں صاف لفظ بھی سنائی دینے لگے اور سامنے جیتی ہوئی عورتوں کی لاشیں بھی دکھائی دیں۔ رانیں ۔۔۔ بڑی بڑی جیسے زمین پر رکھی گئی تھیں۔ ہر کہیں کہیں سے اُن چیتھڑوں سے ڈھکی ڈھکی تھیں۔ جیسے نہ جانے کیسے اور کون بچا لایا تھا!

مادھو نے محسوس کیا کہ ستر پوشی کی رسم بھی اُٹھ گئی ہے۔ کیونکہ مردوں عورتوں کی نظروں میں اُس نے ایک اتفاق دیکھا۔ اُس آفت کے ساتھ سمجھوتہ دیکھا۔ جس نے مردوں عورتوں کو ننگا کر دیا تھا۔ صحن میں کسی کا بھائی، کسی کی بہن، کسی کا شوہر اور کسی کی بیوی ننگی تھی۔ رشتوں ناطوں میں کوئی نہ کوئی ننگا تھا۔ ایک بلائے عام تھی اور مادھو نے سوچا کہ ہر عام شے کی طرح یہ بلا بھی قابلِ توجہ نہ تھی۔ اُس نے بھی تجسس کو اندر اندر دبوچا، ویسے ہی جیسے اُس نے چیزوں کو پہلوؤں میں دبایا تھا اور وہ ننگی رانوں کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے وہ گری ہوئی دیوار کی اینٹیں تھیں لیکن اس لئے شاید کہ اُسے ویسے دیکھنے کا تجربہ نہ تھا یا اس لئے کہ اُس اکیلے کا بدن سالم ڈھکا ہوا تھا یا شاید اس لئے کہ وہ رشتوں ناطوں والا انسان نہ تھا۔ روتے ہوئے مرد بھی اُس کی اُن نظروں پر خفا ہوتے ہوئے دکھائی دئے۔ رکھی پڑی بے حس رانیں بھی ہلنے لگیں۔ اور اُسے چوٹ کے درد سے زیادہ یہ افسوس ہونے لگا کہ ایسے وقت میں بھی برادری اُسی کو انوکھا سمجھتی ہے۔ لیکن افسوس کے آتے ہی وہ قبائلی بھی آ گیا اور اُسے پکڑ کے باہر لے گیا۔

مادھو کو یقین تھا کہ اُسے ذبح نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے وہ سڑک پار کرتے ہوئے بھی اُنہی رانوں، چیتھڑوں اور نظروں کے چکر کاٹتا ہوا قبائلی کے پیچھے چلا آیا۔ لیکن چند گز چل کر ہی وہ ایسے چونک پڑا جیسے بھڑوں کے چھتے میں اُس نے پیر رکھ دیا ہو۔ اُسے خیال بھی نہ تھا کہ خود بلوائیوں کا مرکز اتنا قریب ہو سکتا تھا۔ تھا تو وہ پادریوں کا سکول، لیکن اُس کی دیواروں کا بس ایک ستھرا سا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ سامنے کے سبزہ زار، اترائیاں اور چڑھائیاں سب میلی ہو چکی تھیں۔ سبزہ تو تھا ہی کہاں؟ چاروں طرف میلے میلے ڈھیر تھے۔ کشتیاں، بوریاں، کپڑوں کے گٹھے تھے۔ کالی میلی دیگیں تھیں۔ بکھرا ہوا آٹا تھا۔ پچکے ہوئے صندوق تھے۔ ٹین، کنستر، الماریاں، کھونٹیاں، شہر بھر کی ریل پیل تھی۔

بیچ بیچ میں دھواں اُٹھ رہا تھا۔ ان دھوؤں کے نیچے دیگوں کی قطاریں لگی کرسیاں، میز اور بینچ جوڑ جوڑ کے مدرسے کے صحن ہی میں جلائی جا رہی تھیں۔ دھوؤں کے گرد مادھو نے وہی ایک عجیب بیتابی ہلتے جلتے دیکھی۔ اُسے دھوؤں سے بھرے چھلکتے دکھائی دئے۔ ہر دائرے کے پاس راکھوں کے ڈھیر تھے اور لوہے کی انگیٹھیاں تھیں۔ کہیں کباب بھنا جا رہا تھا۔ کوئی دودھ کے لوٹے پی رہا تھا۔ کوئی گوشت کی سالم ران کو دھوئیں پر رکھ رکھ کر دانتوں سے بھنبھوڑ رہا تھا۔ ایک دائرے میں مٹھائیوں کی دکان بٹ رہی تھی اور دوسرے میں نہ جانے کس چیز کی مٹھائیاں بھر بھر کر منہ میں ٹھونسی جا رہی تھیں۔ چاروں طرف موٹے موٹے تھوک اچھلتے تھے۔ قبائلی ہی قبائلی، لنگیاں ہی لنگیاں، داڑھیاں ہی داڑھیاں، دھواں ہی دھواں۔ کیونکہ ہوسٹل کے کمروں سے بھی دھوئیں کی ان گنت لکیریں نکل رہی تھیں۔

مادھو کو سڑک پر کھڑے رہنے کا حکم ملا اور قبائلی خود اندر چلا گیا۔ کھڑے کھڑے اُس کے دل میں ایک ڈر اُبھرنے لگا کہ ان لوگوں کو ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہاں اتنی بے ترتیبی تھی کہ ہسپتال کا عالم نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں بچھڑا اور دھات کا عالم تھا جہاں خود ڈاکٹر کی ران کو بھی دھوئیں پر رکھا جا سکتا تھا۔ اور یہ ڈر تو تھا ہی کہ اس سے پہلے کہ اُسے اندر بلایا جائے اور اُس کے فن کا امتحان لیا جائے، پل پار سے آتے ہوئے گروہوں میں سے کوئی وہیں سڑک ہی پر اُسے ڈھیر نہ کر دے۔ لیکن جوں جوں وہ ٹولیاں آتی گئیں اور اندر جاتی گئیں، اُس کا ڈر کم ہوتا گیا۔ اور وہ اُن آتے ہوؤں کو بھی اچھی طرح دیکھنے لگا۔

مادھو کو معلوم تھا کہ بارہ مولے میں شراب نہیں تھی۔ اور اگر تھی بھی تو اتنی کہ اُن میں سے دو چار پی لیں۔ لیکن پل پار سے جو بھی آ رہا تھا، کچھ یوں آ رہا تھا جیسے معدے میں بوتلوں کی بوتلیں گشت کر رہی ہوں۔۔۔

وہ سب ایک عجیب نشے میں چور تھے۔ ایک وحشی سا گانا گا رہے تھے جیسے زندگی کی مراد پا گئے تھے انہوں نے۔ جیسے اُن کا مقصد ایک شہر بھر کی موت کا ہی تھا۔ اُن میں سے ایک سفید ریش قبائلی کندھوں سے اوپر اُوپر تک کشمیری دُلہن کا پھرن لپیٹے آ رہا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے پھرن کی بھی اُس کے شانوں نے کس دبا رکھا تھا۔ وہ پھرن [illegible] کی ایک

گھٹی ہوئی چیخ سی رہ گئی تھی۔ اور دوسرا قبائلی جو مادھو کے قریب تھا اُس نے اپنا بُغچہ کھولا اور ویسے ہی کپڑے نکال کر اُنہیں اُلٹے سیدھے پہننے لگا۔ پہن کر ناچنے لگا۔ عجیب منظر تھا وہ جب خوفناک داڑھیاں پارچے کے پھرن پر گھے کے حاشیوں پر، اُس کی ننھی ننھی دھاریوں پر بہنے لگیں۔ زیب گوش، روپیلے "اٹہرو" بندوق کی نوک سے لٹکنے لگے اور کشمیری سرپوش کی تہیں جوڑے اور بھدے شانوں کے ساتھ اُلجھ گئیں۔ مادھو کو اپنی جان سے اپنے جذبات زیادہ پیارے لگنے لگے۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ خشک داڑھیاں اُس کے اندر خانوں میں سوئیاں چبھا رہی ہیں۔ اُسے اب معلوم ہونے لگا کہ یہ پارچے کے "پھرن" اور روپیلے "اٹہرو" خود اُسی کے چھپے ہوئے خزانے تھے۔ اُس کو مرنا بہتر معلوم ہونے لگا کیوں کہ اُس کی تمناؤں کا مذاق بھی اُڑایا گیا تھا۔ لیکن اُسی وقت "ڈاگڈر" "ڈاگڈر" کی گرج نے اُس کو دوسری طرف کھینچ لیا۔ یکایک اُس کا دِل پھر موت کے خوف سے بھر گیا اور اپنے من من بھر کے پیر گرج کی طرح اُٹھاتا گیا۔

مادھو اندر جاکے مراہمیں، معروف ہوگیا۔ پادریوں کے سکول کے ساتھ یہ اُن کا پُرانا ہسپتال تھا۔ یہ بھی لُٹ چکا تھا۔ سفید سفید سسٹریں جو مادھو کو گھسنے بھی نہ دیتیں، اُن کا وہاں نام و نشان بھی نہ تھا۔ سفید سفید لال لال بوتلیں بکھری پڑی تھیں۔ اُن کے لیبل اُتر کے کٹ گئے تھے۔ بوتلیں کیا، شیشے کے ڈھیر تھے وہاں۔ سسٹریں! بوتلیں!! — مادھو کے معدے میں شیشہ چبھنے لگا۔ لیکن اُسے کام پر بُلایا گیا تھا۔ اُس نے الماریاں کھولیں۔ بچی ہوئی شیشوں کو الگ کرنے لگا۔ لیبل بغیر دوائیوں کو سونگھنے لگا، چکھنے لگا۔ اُس نے فرش پر سے گولیاں اُٹھائیں، شیشہ اُٹھایا اور فوراً ہی مکسچر بنانے اور پلانے میں معروف ہوگیا۔ اکثر شکایت ہاضمے کی تھی۔ کھانسی کی تھی یا پُرانے میلے زخموں کی۔ لیکن قبائلی تھک بھی گئے تھے۔ کئیوں نے ٹانگوں میں مالش کرائی۔ شانوں پر تیل ملوایا۔ اور گھٹنے دبوائے۔

دوائی خانے میں مادھو کے جیسے پَر لگ گئے۔ اُس میں ایک نئی طاقت آ گئی۔ الماریوں میں دوائیں کم تر تھیں، لیکن خوشبوئیں بہت تھیں۔ اور باہر سب قبائلی بیمار معلوم دیتے تھے اور اُسے خیال تھا کہ سبھی کو دوائیوں کی ضرورت ہوگی۔ اُس قیامت کی اندھیر گرد۔ میں بھی وہ اپنے آپ کو بیماروں میں پاکر ایسے محسوس کرنے لگا جیسے دُنیا کو کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ ٹنکچر پاؤڈر کے ماحول میں اُس کے ہاتھ پھر حسبِ معمول چلنے لگے۔ دِن بھر کے جمود کے بعد اُس کی بوٹیوں میں جان سی آگئی اور وہ مری ہوئی دُنیا کو زندہ سمجھنے لگا۔

اُسی رات کو جب دواخانے کی گھڑی گیارہ بجا رہی تھی۔ جب اُس قبائلی نے مادھو کے کنوارپن کا مذاق اُڑا اُڑا کر اور دوں کو ہنسانا شروع کیا اور مادھو نے اُن کے قہقہوں کا احترام کرتے ہوئے مُسکرانے کی کوششیں کیں، قبائلی نے مادھو کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا —

"خو تم شادی کرے گا۔ آبی (ابھی) کرے گا۔ تم ہمارا ساتھ کیمپ چلو۔ تمہارا شادی آبی کرے گا۔ آبی رات کو —"

مادھو کے دِل میں تھانے کی یاد کیا، ایک طوفان اُمڈ آیا۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکا۔

شادی — ؟ قہقہوں کی گونج میں مادھو کا فلسفی اندر اندر اس کے کان میں کہنے لگا —

"سُنا تم نے ؟ شادی! لیکن شادی سے پہلے "تمبک ناری" بجتی ہے دعوتیں اُڑتی ہیں۔ گھر سجتے ہیں۔ دولہا سجتا ہے۔ ایک برات نکلتی ہے دُلہن — ! فلسفی کی آواز رُک گئی۔ سامنے سفید ریش قبائلی کے شانے پر پارچے کا "پھرن" کھنچ گیا۔ بیچ کے تار الگ الگ ہوگئے اور دوسرا قبائلی حاشیوں کو خاک میں ملا رہا تھا۔ مادھو ایک آہ کو روک نہ سکا۔ اس کے آنسو بھی نکل آئے اور اس نے قبائلی سے التجا کی کہ شادی کے بدلے اسے وہ اجازت دے کہ وہ تھوڑی سی دوائی، تھوڑی سی رُوئی اور بنڈیج کیمپ میں لے جائے۔

پھر آدھی رات کے قریب جب وہ ایک وردی پوش کی حفاظت میں سکول سے باہر آیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ کالی رات ایک منحوس قسم کا رونا رو رہی ہے۔ رونا یہ کسی کا ضرور تھا۔ کیونکہ دریا پار شہر کے کتوں کا بھونکنا الگ سُنائی دے رہا تھا اور اِدھر جنگل کے گیدڑوں کا الگ، اس رونے کے سُر لمبے تھے۔ گہرے تھے۔ لیکن اس میں کھُلے ہوئے منہ کی دھاڑیں نہیں تھیں۔ اس میں الگ الگ چیخیں نہیں تھیں۔ ایک دبی دبی، لیکن لگاتار دُکھ بھری پُکار تھی۔ اور جب وہ تھانے کے قریب آ گیا

اُسے معلوم ہوا کہ پیڑ رہا بھی اسی تھانے سے اُٹھ رہا ہے۔ یہ سوچ کر کہ وہ تمام تھانے پہنچ گئے ہوں گے، اس نے تیز تیز قدم اٹھائے اور دیکھا کہ تھانے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ تھانے کے باہر بھی ایک بھیڑ تھی۔ ان ہی قبائلیوں کی بھیڑ، جن کو اندھیرے اور کھلی ہوا میں بھی مادھو نے سونگھ کے پہچانا۔ اور جو سے آگے آگے تو جوان پشتو تھی بھا بھیڑ میں دھکا پیل تھی۔ ہر شخص پہلے اندر جانا چاہتا تھا۔ یہ اتنے قبائلی ——! اندر جاکے کیا کرتے تھے؟ مادھو کے دل میں ایک خوف ناک خیال تو آ گیا۔ لیکن وہ خود اندر جاکے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے محافظ وردی پوش سے التجا کی اور وردی پوش نے جل تول راستہ بنالیا۔

گھُپ اندھیرے میں اسے دکھائی تو کچھ بھی نہ دیا، لیکن صحن اور کوٹھڑیاں آوازوں سے لدی ہوئی تھیں۔ آوازیں تو مختلف تھیں، لیکن مل کر وہی رات کا رونا بن گئی تھیں۔ کوٹھڑیوں میں بھچتے گوشت کی صاف صاف آوازیں تھیں۔ سانس اُٹھتے تھے اور گھُٹتے تھے۔ گھُٹتے تھے اور اُٹھتے تھے۔ اور جب بھی سانس تھوڑی دیر رُک کر، اکٹھے ہو کر احتجاج کی چیخوں میں نکلنے لگتے اور دولتیاں چلنے لگتیں۔ ایک بپھرے ہوئے ریچھ کی ہبکی نکلتی۔ لوہا سا گرتا اور گوشت کی چیخ لمبی ہو کر سُست پڑتے پڑتے پھر سانس بن جاتی —— صحن میں دھکا پیل تھی اور دھکا پیل کی سب آوازیں۔ سب کے سب کوٹھڑیوں میں گھُسنا چاہتے تھے۔ سب کے سب ایک کیفیت میں تھے بلکہ ایک کیفیت کی اُمید میں دیوانے ہو رہے تھے۔ مادھو کو ان کی آواز میں ان کے دانت دکھائی دئے۔ ان کی لمبی لمبی تیز تیز انگلیاں دکھائی دیں۔ ان کے قہقہے اتنے ہی میلے دکھائی دئے جتنے اس نے ان کے کپڑے اور ان کے بال دیکھے۔ اس کو ایسا دکھائی دینے لگا جیسے بالوں کی نکیلی اور خشک جھاڑیاں اس کے اپنے مُنہ میں چبھ گئیں اور اس تمام کے پس منظر میں مادھو نے برادری کے نیچے کچھے مردوں کو دیوار کے ساتھ سایوں کی طرح پھیلے ہوئے دیکھا۔ جیسے مولی کے پچھن سوکھنے کے لئے رکھ دئے گئے ہوں۔ لیکن ان سایوں میں سے بھی کہیں کہیں ایک ایسی آواز اُٹھ رہی تھی جیسے کوئی مُنہ میں کپڑے ٹھونس ٹھونس کر رونے کو دبا رہا ہو۔

خود مادھو کے اندر بھی ایک ایسا ہی رونا جمع ہونے لگا۔ لیکن فلسفی کہہ اُٹھا ——

"رو کر تو بھی دیوار کے ساتھ پھیل کر رہ جائے گا۔ کالی رات کے رونے میں گھُل جائے گا۔" اور چونکہ اس کا رونا اندر اندر بھر گیا تھا۔ اُمڈ کر یہی رونا ایک نئی آواز میں نکل آیا۔ رونا نہیں ایک پھپکار تھی وہ، اور جب اس کی وہ ایک آواز نکلی، نہ معلوم کیسے پے در پے ویسی ہی اور آوازیں نکلتی آئیں۔ اور ان آوازوں میں بے موقع کے کئی الفاظ تھے۔ "بند کرو۔ بے شرمو۔ بھاگ جاؤ۔ نکلو ... ..." رات کا رونا کٹ گیا۔ وہ کالا منحوس سا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اندر دولتیاں چلنے لگیں۔ چلنے لگیں۔ احتجاج کی چیخیں نکلتے نکلتے رُک گئیں۔ باہر بھی دھکا پیل تھم سی گئی اور کالے پونچھن اُبھرنے لگے۔ اور "بند کرو، بے شرمو۔ بھاگ جاؤ" کے شور سے رات بھر گئی۔

لیکن فوراً ہی دھکا پیل کی بیمار اور جھکتی حرکتوں کی جگہ صحن کی بھیڑ میں جان آ گئی۔ ایک آن میں لمبے لمبے بازو، ہلے لُنگی دار سر اُٹھے۔ اندھیرا گالیوں سے بھر گیا۔ ایک آدھ گولی بھی چھُٹی اور مادھو اور اس کے پیچھے پیچھے کئی اور اسی کے سلسلے سے صحن سے باہر ایسے ہی گھسیٹے گئے جیسے وہ بے کار لاشیں تھیں۔ پھر شور کہاں؟ باہر اندھ وہی رات کا ایک سُرا رونا بولنے لگا۔ اندر کی چیخیں لمبی پڑتی پڑتی سانسوں میں تبدیل ہوتی گئیں۔ دولتیوں کو لوہا بٹھاتا گیا اور صحن میں پھر ایک سُست سی دھکا پیل شروع ہو گئی۔ لنگڑاتا اور کراہتا ہوا مادھو پچھلی پہاڑی پر چڑھتا گیا۔ اور جنگل کی گھنی رات اور ایک جھاڑی کی اوٹ میں اس نے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا دئے ——

"دُنیا ختم ہو گئی ہے!" اس نے پیڑ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہا۔ پیڑ کا درخت سسک رہا تھا۔ اس نے پھر کہا —— "دُنیا بالکل ختم ہو گئی ہے۔" اور یہ کہہ کر اس نے اپنے گلے کے بٹن کھول دئے اور اطمینان کے ساتھ ایسے رونے لگا جیسے اندر کی گہرائیوں کو کھود کھود کر زندگی کو ڈھونڈ نکال رہا ہو۔ اور ایک ایک ہچکی کے ساتھ زندگی کا ایک ایک قسط کا قیمہ پیڑ کو ہی دے رہا ہو۔

مادھو نے اپنا سب کچھ پیڑ کے حوالے کیا تھا اور رونے کے تمام اسباب مٹ چکے تھے۔ پیڑ کی سائیں سائیں میں ایک ایسی سرگوشی تھی

کر مادھو ہست و بود سے دُور ایک کیفیتِ نیست میں لپٹ گیا۔ لیکن ایک توپ چھُوٹی اور جنگل ہلا۔ مادھو نے زندگی کی تمام قسطیں واپس لیں۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور سُننے لگا۔ پھر ایک اور توپ چھُٹی۔ پھر ایک اور۔ مادھو بے چین ہوگیا اور چیڑ کو سراسر بھُول گیا۔ اب وہ توپ توپ کو گِننے لگا۔ توپ توپ میں فرق جانچنے لگا۔ اور سانس کو روک کر سُننے لگا کہ ایک توپ کے بعد دوسری کچھ آگے آکر چھُٹتی ہے کہ نہیں۔ کچھ سمجھ کر اس نے ہاتھ چیڑ سے اُٹھا لئے اور سر ہلا کر کہا۔ "دُنیا ہرگز ختم نہیں ہوئی ہے۔ نہیں ہوئی ہے۔" اور اُٹھ کر اس نے تاروں کو دیکھا۔ اندھیرے کو ناپا اور مشرقی پہاڑوں کے پیچھے سحر کی تلاش شروع کی۔

اُجالے کی پہلی دُھند میں ہی اس نے بڑے پتھر کی اوٹ لے کر بارہ مولہ کو دیکھا۔ دیکھا کہ بارہ مولہ کے وہی لوگ جن کے لئے میتوں کا اعلان ہو چکا تھا، ایک ایک کر کے نظر بچاتے۔ ہمتیں باندھے، سیب کی پیٹیاں اُٹھائے تھانے کی طرف بڑھے آرہے ہیں۔ پیٹیاں اُٹھانے والوں میں میلی ٹوپیوں والے بھی تھے اور سفید پگڑیوں والے بھی۔ میلے میلے دہقان بھی تھے۔ سفید پوش شہری بھی تھے اور نہ جانے اس وقت وہ بلوائی کہاں تھے کہ آتی ہوئی سحر نے ان کو بھی سُلا یا تھا۔ جب پہلی پیٹی تھانے کے صحن میں گرائی گئی۔ صحن کے اندر مُردے سے کھڑے ہو گئے۔ مکھیاں سی بھنبھنائیں۔ سیب غائب ہو گئے۔ پیٹیوں پر پیٹیاں انڈیلی گئیں اور مادھو نے محسوس کیا کہ دن کا اُجالا بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ اور تھانے کا میلا صحن اُبھرتا جا رہا ہے۔ وہ خود ایسے کھڑا ہو گیا جیسے نمودار ہونے میں اب اسے کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ اس نے سمجھا تھا کہ مستقبل مٹ گیا ہے۔ اب دیکھ رہا تھا کہ زندگی سیب لئے چلی آرہی ہے۔ اندھیر گردی اور قیامت کے پہروں میں سے بھی۔ اور عزت، جو اُسے خاک ہوتی معلوم دی تھی اُن میلی میلی ٹوپیوں میں اور ان سفید پگڑیوں میں محفوظ دکھائی دی۔ جن پر پیٹیاں چلی آرہی تھیں۔ اور ان حوصلوں میں، جن کو لے کر مشل ان کشمیری پُل پار چلا آرہا تھا۔

مادھو نے اپنا قدم پتھر سے آگے بڑھایا اور اسے ایسا دِکھائی دینے لگا جیسے اسی کی رہنمائی میں وہ سب امدادی توپیں بارہ مولے میں گھُس آئی تھیں اور خود وہ اپنی فوج کے آگے ایک کرنیل کے دوش بدوش قدم اُٹھا رہا تھا۔ اس کے تخیل میں بارہ مولے کی وہ سڑکیں بھی کھُلنے لگیں جن پر ملبے کے ڈھیر تھے۔ ان سڑکوں پر برادری کے چند بزرگوں کو تخیل کی آنکھ سے بھی دیکھ کر وہ اُداس ہو گیا۔ لیکن یہی لوگ اس کو دیکھ کر اس کی بلائیں لینے لگے۔ انہوں نے اسے بھگوان رام کہہ کر پُکارا۔ اس کو ہیرا کہا۔ جواہر کہا اور جب انہوں نے اس کی شکل و صورت کی بھی داد دینا شروع کی، اسے سپوت کہہ کر پُکارا۔ مادھو کے دِل میں خیال آیا کہ یہ لوگ اُسے لڑکی دینا پسند کریں گے۔ لیکن تخیل میں بھی فلسفی مادھو موجود تھا۔ مادھو، جس نے ابھی ابھی زندگی کی تہیں اُلٹ کر دیکھی تھیں۔ اس نے زندگی کے گوشت پوست کو دیکھا تھا۔ اب وہ شادی کیا کرتا؟ کس سے کرتا؟ ہُونہہ! جیسے مادھو اندھا ہو گیا تھا —— پر اس وقت تو مادھو کی گردن میں اکڑ آگئی۔ اس کی بھویں تن گئیں۔ وقت آگیا تھا جب وہ ٹھکرا دے۔ انکار کر دے۔ نامنظور کر دے۔

لیکن کھڑے کھڑے اس کے تخیل میں یہ بھی آگیا کہ اپنی فوجوں نے بارہ مولے کو سنبھالنا شروع کیا ہے۔ شہر پھر سے بسنے لگا ہے کہ گلیوں میں سے ڈھیرے ڈھیر ملبہ اُٹھایا گیا۔ ادھ جلی گلیاں بننے لگیں۔ ٹوٹی ہوئی دیواریں چڑھنے لگیں۔ سودا سلف بکنے لگا۔ شادی بیاہ ہونے لگے۔ کئی رانڈوں نے بھی شادیاں کر لیں۔ کئیوں نے مجبوریوں پر پردہ رکھا اور جُوں تُوں برادری نے اپنا مُنہ پونچھ لیا —— اور پھر مادھو کمپونڈر۔ کمپونڈر نہیں ڈاکٹر، نیلی پیلی دوائیاں بنانے لگا۔ کڑوی کڑوی پلانے لگا۔ اور انگو بُڈھا بڑھاتا ہوا، پیپ پیشاب والا نِری بوٹیوں کا مادھو۔ کمپونڈر کا کمپونڈر۔ "ویسے کا ویسا" چہرے کا وہی رنگ، اُٹھی ہوئی بوٹیاں اور مُنہ پر بے ترتیبی۔ جس سے صاف پتہ لگتا تھا کہ اس کی شادی نہ ہوئی ہے نہ کبھی ہوگی —— تخیل سے باہر مادھو کا پیر پتھر کے پاس کانپنے لگا۔ اس نے چاہا کہ پتھر کی اوٹ میں پھر چلا جائے۔ لیکن توپیں نزدیک سے سُنائی دینے لگیں۔ نیچے سفیدوں کے سائیں سائیں میں اُسے بُلاوے سُنائی پڑے اور وہ کچھ سوچ کر جلدی جلدی پہاڑی پر سے اُتر گیا۔

"تعمیر" کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے اپنی آراء اور مشوروں سے نوازیئے!

ورق ورق

تہذیبی جلسے • کھیل کود کے مظاہرے • میڈیکل کالج کا قیام • ایک تواریخی فیصلہ

اگست اور ستمبر کے دو مہینے کئی لحاظ سے بڑے ہی سرگرم اور پُر جوش مہینے تھے۔ زندگی کے ہر میدان اور ہر محاذ پر ان دو مہینوں میں پیش قدمی کی رفتار بڑی نمایاں اور تیز رہی۔ ہر طرف بڑی گہما گہمی نظر آئی۔ سرینگر تہذیبی زندگی کا ایک وسیع مرکز بنا۔ جگہ جگہ کلچرل جلسے ہوئے۔ فن اور موسیقی کے مظاہرے ہوئے۔ ناٹک کھیلے گئے۔ مشاعروں کا انتظام کیا گیا۔ اور سماجی و سیاسی اعتبار سے بھی کئی ایسے اقدام کئے گئے جس سے نہ صرف ہمارے اندر آزادی کو پوری قوت سے برقرار رکھنے کی توانائی ملتی ہے بلکہ جو جموں و کشمیر کے عوام اور ریاست سے باہر کے کروڑوں عوام کے درمیان جذباتی یگانگت اور برادرانہ میل جول کی نئی راہیں کھول دیتے ہیں۔ اور آپس کے سیاسی، سماجی اور آئینی رشتہ کو اور بھی مضبوط بناتے ہیں۔ اسی مدت میں عوام کی ایک دیرینہ مانگ کو عملی صورت دی گئی اور ریاست میں پہلا میڈیکل کالج چالو کر دیا گیا۔

اگست کی پندرہویں تاریخ کو ساری ریاست میں یوم آزادی کا جشن ... سرینگر اور جموں میں اس دن روایتی پریڈ ہوئی۔ سرینگر کے پولو گراؤنڈ ... کرن سنگھ نے لڑکوں اور کیڈٹوں کے مارچ پاسٹ پر ... اہنے کے دوسرے ... اعرے ... کلچرل اکادمی کی

والے سکولوں میں انعامات تقسیم کئے گئے۔ صدر ریاست شری کرن سنگھ نے اپنی تقریر میں کہا کہ قومی آزادی کو بنائے رکھنے کے لئے ہمیں معاشی آزادی کی خاطر مل جل کر اور زور و شور سے کام کرنا چاہیئے اور آزادی کو ایک تخلیقی قوت مان کر خطرات کا مقابلہ کرنا سیکھنا چاہیئے۔ آپ نے معاشی بہبودی کے لئے اور عوام کی مسرتوں اور خوشیوں کے لئے ہونے والے عظیم تعمیری کاموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ عوام کی کایا پلٹ دینے کے لئے ہیں اور عوام کے ضمیر اور ان کے رہن سہن کے حالات کو بہتر کرنے کے لئے ہیں۔ "جشن آزادی کے سلسلہ میں محکمہ اطلاعات کے کلچرل و ریگزی بشن یونٹ کی طرف سے نیڈوز ہوٹل کے تھیٹر ہال میں ایک ورائٹی شو پیش کیا گیا۔ یہ اپنی طرز کا اچھوتا تہذیبی پروگرام تھا۔ اس میں دو سال کی عمر سے دس سال کی عمر تک کی لڑکیوں نے کلاسیکی ناچ پیش کئے اور لوک گیت گائے۔ ان میں کتھک ناچ، شوتانڈو اور بھرت ناٹیم دیکھنے کی چیز تھے۔ تین تین سال کی لڑکیوں نے سٹیج پر بڑی مہارت اور سلیقہ کے ساتھ یہ ناچ ناچ کر شائقین کے دل موہ لئے۔ کم سن لڑکیوں نے ان کلاسیکی ناچوں کے جمالیاتی احساسات پیدا کرنے کے لئے جس متانت اور لوچ و لچک کا ثبوت دیا اس نے ساری محفل میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیا۔ یہ محفل بڑی کامیاب رہی۔

طرح اس مشاعرہ میں بہت سے شاعروں کے درمیان محاسن شاعری اور حسنِ بیان کا ایک مقابلہ رہا۔ اس مشاعرے نے کشمیری زبان کو کئی شیریں اور پُر تاثیر شعر عطا کئے ہیں۔

محکمہ تعلیم کی طرف سے بھی اسی نوعیت کا ایک مشاعرہ سیاحوں کے استقبالیہ مرکز میں منعقد ہوا۔ اس کی تین مجلسیں منعقد ہوئیں۔ ایک کی صدارت جناب بخشی غلام محمد نے کی، دوسری کی صدارت کے فرائض وزیر مملکت تعلیمات سردار ہربنس سنگھ آزاد نے انجام دئے اور تیسری محفل مشاعرہ ماسٹر زندہ کول المعروف ماسٹر جی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میں صرف سکولوں کے اُن اساتذہ کو مدعو کیا گیا تھا جو اُردو یا کشمیری میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ محکمہ تعلیم سے متعلق دفاتر اور دوسرے اداروں میں کام کرنے والے شعرا بھی بُلائے گئے تھے۔ اس میں تین انعاموں کا اعلان بھی کیا گیا تھا۔ شاعروں کے لئے موضوع مقرر تھا اور وہ تھا — "جھیل ڈل میں چاندنی رات کا نظارہ" — اُردو اور کشمیری میں لگ بھگ چالیس شاعروں نے اس طویل محفل میں حصہ لیا۔ یہ شام کے ساڑھے چھ بجے شروع ہوئی اور رات کے گیارہ بجے اختتام پذیر ہوئی۔ ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔

بانڈی پورہ میں محکمہ اطلاعات کے شعبۂ نمائش و ثقافت کی طرف سے مقامی شاعروں کا مشاعرہ منعقد ہوا۔ کلچرل یونٹ کی ایک پارٹی اس علاقے میں ایک ورائٹی پروگرام کا اہتمام کرنے گئی تھی جہاں اس پروگرام میں مشاعرہ بھی شامل کیا گیا۔ اس مشاعرہ میں بانڈی پور کے دس شاعروں نے حصہ لیا جو سب کے سب کشمیری میں لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ یہاں "لڑی شاہی" طرز پر شعر کہنے میں کئی ممتاز اُستاد بستے ہیں۔

ڈرامے

کلچرل اکاڈمی کی طرف سے ایک کشمیری کھیل "شیشہ تہ سنگستان" نیڈوز ہوٹل کے تھیٹر ہال میں کھیلا گیا۔ یہ سیلاب زدہ لوگوں کی امداد کے لئے تھا۔ مقصد یہ تھا کہ سیلاب زدہ لوگوں کی بپتا کو اس ڈھنگ سے پیش کیا جائے تاکہ سیلاب زدہ لوگوں سے عام لوگوں کی زیادہ سے زیادہ ہمدردی حاصل کی جائے۔ اس پیشکش میں چند فنی خامیوں کے باوجود کلاکاروں نے اس کھیل کو اپنی اداکاری سے سنبھالا۔ مجموعی اعتبار سے اس کھیل کا تاثر نامکمل اور معنوی — امر کلچرل اکاڈمی کی ایک پہلی کوشش کے طور پر اسے قبول کیا گیا۔

اس عرصہ میں محکمہ اطلاعات کے شعبۂ نمائش و ثقافت کی جانب سے دو تمثیلچے پیش کئے گئے۔ ایک بارہ مولہ میں کھیلا گیا اور دوسرا بانڈی پورہ میں لوگوں کے سامنے دکھا گیا۔ بارہ مولہ میں دو ہزار سے زیادہ لوگوں نے شہید شیروانی میموریل ہال میں "گرِہنز گاہ" نام کا ایک ایکٹ کا کھیل دیکھا۔ بانڈی پورہ میں پہلی بار اس یونٹ کی طرف سے اوپن ایئر تھیٹر کا تجربہ کیا گیا۔ چھ ہزار لوگوں نے اوپن ایئر تھیٹر میں "پنچایت" نام کا ایک تمثیلچہ بڑے شوق اور خاموشی سے دیکھا۔ یہ تمثیلچہ دیکھنے والوں میں دو ہزار سے اُوپر عورتیں شامل تھیں۔ سرکاری اور غیر سرکاری با اختیار اداروں کی طرف سے تہذیبی مناظروں کا اہتمام کرنے کے علاوہ پرائیویٹ شوقیہ تھیٹروں کی طرف سے بھی ان دو مہینوں میں کئی کھیل کھیلے گئے۔

زنانہ فلڈ ریلیف کمیٹی کی جانب سے ایک اُردو کھیل "آج کا سچ" سٹیج کیا گیا۔ یہ طنزیہ اور مزاحیہ کھیل تھا۔ جس میں ہماری زندگی کی کچھ تلخ حقیقتوں کو اپنی ساری پیچیدگیوں کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ یہ ایک دلچسپ تفریحی اور علمی مذاق کا ڈرامہ تھا۔

چوٹہ بازار سرینگر میں سماج سُدھار سمتی کے تھیٹر ہال میں مہاکوی ٹیگور کا ایک ڈرامہ "ڈاک گھر" کھیلا گیا۔ جو ایک درد انگیز طویل ڈرامہ ہے اور کشمیر میں پہلی بار سٹیج کیا گیا۔ بھیر و کلامندر کی طرف سے رعناواری سرینگر میں "حبہ خاتون" پیش کیا گیا۔ اس کا افتتاح وزیر صنعت و تجارت شری شام لال صراف نے کیا۔ انہوں نے نجی طور پر تھیٹر کی کلا کو تقویت پہنچانے والے شوقیہ اداکاروں اور نغمہ نگاروں کی کوششوں کی بے حد سراہنا کی۔

اس طرح سے ان دو مہینوں میں عوام کی تفریحی تشنگی کی تسکین کے لئے کئی ورائٹی پروگرام اور معیاری کھیل پیش کئے گئے۔ ان تہذیبی اور تمدنی جلسوں میں مردوں اور عورتوں نے بڑی دلچسپی اور انہماک کا ثبوت دیا۔

میڈیکل کالج چانو

ریاست کشمیر میں صحت عامہ کا ایک معیاری اور مفید نظام موجود ہے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جدید طرز کے علاج معالجہ کی سہولتوں سے مستفید ہونے کا موقعہ بہم پہنچایا جائے تاکہ بے وقت کی اموات کی روک تھام ہوسکے۔ اس میں شک نہیں کہ نت نئے علاقوں میں

شفاخانے کھولے جا رہے ہیں اور پرانے شفاخانوں کو توسیع دی جا رہی ہے مگر پھر بھی یہ کام رفتار اور وسعت کے اعتبار سے ابھی اور تیز ہونا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری ریاست میں ڈاکٹروں کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اگرچہ حکومت ہر سال قرضہ دے کر، خرچہ دے کر اور دوسری ضروری سہولتیں فراہم کر کے اُمیدواروں کا ایک ایک کھیپ باہر کی ریاستوں میں تربیت کے لئے بھیجتی آئی ہے مگر پھر بھی یہ ضرورت پوری ہونے میں کچھ مدت لگے گی۔ چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے کشمیر میں اپنا میڈیکل کالج چالو کر دیا گیا ہے جس میں ملک کے چوٹی کے ڈاکٹروں اور ماہروں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ اس کالج میں ان ہی دو مہینوں سے جماعتیں چالو ہو گئی ہیں۔ رسمی طور پر اس کا افتتاح صدر ریاست شری کرن سنگھ جی نے کیا۔ انہوں نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "میڈیکل کالج کے قیام کا مقصد طبّی جانکاروں کی ضرورت پورا کرنا ہے۔ اس کالج کے قیام سے اکثر و بیشتر جان لیوا بیماریوں پر انسان کی نئی فتح کے قوی امکانات پیدا ہو گئے ہیں اور یہ امکانات روز بروز روشن ہوتے جائیں گے۔" اس موقع پر وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد نے کالج کے اُمیدوار طلباء سے بھی خطاب کیا اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ تن دہی اور دلچسپی سے تحقیق اور تربیت کے کاموں میں حصہ لیں تاکہ اس ادارہ کو علم طب کا ایک معیاری اور قابل فخر ادارہ بنایا جا سکے اور انسانوں کی جان بچانے کی جدوجہد میں اس کالج کو ایک مؤثر وسیلہ قرار دیا جا سکے۔

کھیلوں سے دلچسپی

سرینگر میں کھیلوں سے عوام کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا جو عالم انٹر یونیورسٹی فٹ بال ٹورنامنٹ کے دنوں دیکھنے میں آیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ فٹ بال کے زونل ٹورنامنٹ کے فائنل میچ سرینگر میں ہی کھیلے گئے۔ ان میں جبلپور یونیورسٹی، وکرم یونیورسٹی، علی گڈھ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، حیدرآباد یونیورسٹی، کلکتہ یونیورسٹی اور کشمیر یونیورسٹی کی ٹیموں نے حصہ لیا۔ سیمی فائینل تک کشمیر یونیورسٹی کے کھلاڑیوں نے جم کر شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا۔ آخرکار اس ٹورنامنٹ کی بازی عثمانیہ یونیورسٹی ٹیم کے ہاتھ رہی جس نے فائنل میں کلکتہ یونیورسٹی ٹیم کو ایک گول سے ہرا دیا۔

رائے عامہ کے احساسات

ان ہی دنوں کشمیر اسمبلی نے اتفاق رائے سے ایک سرکاری بل منظور کیا۔ جس کی رو سے ریاست جموں و کشمیر کے آئین میں پہلی بار ترمیم کی گئی ہے۔ اس ترمیم کے مطابق مرکزی یونین کے آئین کی دفعہ ۱۳۹ کا اطلاق ریاست پر کیا گیا ہے۔ عدالت عالیہ کا دائرہ اختیار کشمیر سٹیٹ تک بڑھایا گیا ہے اور انتخابی کمیشن کو ریاست جموں و کشمیر میں بھی چناؤ کے لئے وہی انتظامات کرنے کا اختیار حاصل ہوگا جو اسے ملک کی دوسری ریاستوں میں حاصل ہے۔ ریاست کے ہائی کورٹ کے ججوں کا منصب بھی دوسری ریاستوں کے ہائی کورٹ کے ججوں کے منصب کے برابر کر دیا گیا ہے۔ اس بل کو اب باقاعدہ قانون کی صورت مل گئی ہے۔ یہ ایکٹ بجائے خود کشمیر کے عوام کے جذبات اور احساسات کا غماز ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی سفارش جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے کی تھی۔ اس نے یہ سوال جنرل کونسل کے سامنے رکھا۔ جنرل کونسل نے اس خیال کی توثیق کر دی۔ اس طرح غیر سرکاری سطح پر عوام کی ایک بڑی اکثریت کی رائے معلوم کر لی گئی اور وہ اس حق میں تھی کہ ریاست کشمیر کو سپریم کورٹ اور مرکزی الیکشن کمیشن کی عملداری میں لے آیا جائے۔ چنانچہ عوام کے احساسات کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اس بارے میں ایک سرکاری بل ستمبر کے آخری ہفتہ میں کشمیر اسمبلی کے بجٹ اجلاس میں پیش کیا گیا۔ بل پر کافی بحث مباحثہ ہوئی۔ سبھی نے اس کے حق میں رائے دی کیونکہ یہ رائے عامہ کی مرضی اور منشا کے مطابق تھا۔

ہمہ گیر شخصیت

گاندھی جی ہماری قومی زندگی پر پورے طور حاوی تھے اور یہ بات خود ہماری بہبودی کی ضامن ہے کہ ہم اُن کے اصولوں سے واقف ہوں۔ آزادی کی تحریک میں گاندھی جی کے فعالی رول سے عام طور پر بہت لوگ واقف ہیں۔ مگر میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ میری عمر کے جیسے لوگوں کے لئے گاندھی جی ماضی کی ایک ایسی ہستی بن گئے ہیں جو ایک سایہ کی مانند ہے۔ چھوٹے سن کے لوگوں کے لئے یہ معاملہ اور بھی زیادہ دھندلا بن جاتا ہے۔ اس لئے یہ بات اور اہم ہے کہ ہمارے طلبا اس لاثانی ہستی سے تعلق رکھنے والے معاملات سے واقف ہوں۔ (صدر ریاست شری کرن سنگھ)

شبکب ملت ایم اے۔ بی ٹی

عزمِ تعمیر

آج بھارت کی فضائیں میکدہ بردوش ہیں دشت ہیں جنت بداماں وادیاں گلپوش ہیں
آج گردش میں خوشی کے ساغرِ سرجوش ہیں مدتوں کے بعد توپوں کے دہن خاموش ہیں

شادمانی کے دن آئے دورِ ناشادی گیا!
آئے دن کا وہ ملالِ خانہ بربادی گیا!

اک نئی تشکیل کا، تعمیر کا آغاز ہے نغمہ زن پھر مسکراتی زندگی کا ساز ہے
شاہدِ جمہوریت محوِ خرامِ ناز ہے جس کی ہر آہٹ پہ دنیا گوش بر آواز ہے

ہے فروزاں اک ادائے نو سے فانوسِ وطن
پنجۂ دشمن سے ہے محفوظ ناموسِ وطن

کل جو دشمن سے لڑے سر سے کفن باندھے ہوئے آج اٹھے ہیں شرطِ تعمیرِ وطن باندھے ہوئے
دامنِ دل میں بزرگوں کے سخن باندھے ہوئے ہیں وہ قصدِ انقلابِ انجمن باندھے ہوئے

سرفروشی جن کی خو ہے وہ جفاکش نوجواں
جانبِ منزل رواں ہیں کارواں در کارواں

مچ رہی ہے گلشن و صحرا میں آزادی کی دھوم گامزن ہے جانبِ تعمیر جنتا کا ہجوم
دو گھڑی اس زندگی پرور فضا میں تو بھی جھوم اٹھ کے رہمتِ عالی کے رخساروں کو چوم

ہم نشیں آ پرچمِ تعمیر لہرائیں ذرا

گیت جو گُم سے تھے پہلے پھر وہی گائیں ذرا

آؤ سلجھائیں ذرا زُلفِ پریشانِ وطن　　گردِ ناکامی سے کردیں پاک دامانِ وطن

اور بھی مضبوط ہو بُنیادِ ایوانِ وطن　　ہو یُوں ہی پُوری تمنّائے شہیدانِ وطن

متحد ہوکر بدل ڈالیں مقدر ہند کا

اور بھی ہو جائے اُونچا فخر سے سر ہند کا

دست و پا رکھتے ہیں مُنہ قسمت کا تکتے کیوں رہیں　　مفلسی کے رنج سے روتے بلکتے کیوں رہیں

رہروِ گمراہ کی صورت بھٹکتے کیوں رہیں　　اپنے ہاتھوں کام کرنے سے جھجکتے کیوں رہیں

کیوں نہ تہذیبِ عمل سے خُود سنواریں زندگی

غازۂ حُسنِ تدبّر سے نکھاریں زندگی

بن گئے ہیں ہم حکومت کے لئے اِک بار کیوں　　اپنا اپنا کام خود کرنے میں سمجھیں عار کیوں

اپنی غفلت سے بنالیں زندگی دشوار کیوں　　روک لیں بے کار ہم تعمیر کی رفتار کیوں

اپنی خدمت خود کریں، اپنی مدد ہم خود کریں

ہو سکے تو امتیازِ نیک و بد ہم خود کریں

داستانِ ہند کا رنگین باب آنے کو ہے　　سامنے آنکھوں کے اب تعبیرِ خواب آنے کو ہے

منتظر تھے جس کے ہم وہ انقلاب آنے کو ہے　　قوم کا بچپن گیا عہدِ شباب آنے کو ہے

رہ گئی ہے دو قدم منزل بس اب مِل کر چلیں

کامیابی کا تقاضا ہے کہ سب مِل کر چلیں

فکر و فن

(تبصرے)

تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے

تلوک چند محروم مرتبہ جگن ناتھ آزاد۔ ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ

محروم کی بلند قامت ادبی شخصیت کے سایے میں اُردو شاعری کی کئی نسلیں پروان چڑھی ہیں۔ بہت کم شاعروں کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ ۲۰ برس پہلے اُن کے کلام کی محبوبیت اور مرغوبیت کا جو عالم رہا ہو وہ آج بھی اُسی آب و تاب کے ساتھ قائم و دائم نظر آئے۔ کلامِ محروم کی اسی دلنوازی کا راز دراصل اُن کی عظیم فن کاری میں مضمر ہے۔ اُن کی شاعری سارے اُردو ادب میں اپنے منفرد خد و خال رکھتی ہے اور یہ خد و خال اتنے ستھرے اور تیکھے ہیں کہ اُن کی داد دئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ آزاد کے متذکرہ مجموعے میں محروم ایک شاعر اور ایک انسان کی حیثیت سے پیش کئے گئے ہیں۔ اس مجموعے کے لگ بھگ تمام مضامین مطبوعہ ہیں مگر انہیں ایک سنگم پر جمع کرکے آزاد نے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ کتاب کا حسنِ ظاہری بھی بڑے پاکیزہ مذاق کا اظہار کرتا ہے۔

شفق زار (مجموعہ قطعات)

پرکاش ناتھ پرویز

ملنے کا پتہ:۔ ۲۸ نابھہ ہاؤس شملہ

پرکاش ناتھ پرویز کے ان قطعات میں بڑے حسین شعر پارے بھی مل جاتے ہیں اور تیسرے درجے کی قافیہ پیمائی کے نمونے بھی۔ یہ بات جہاں پرویز کی شاعرانہ صلاحیتوں کی گواہی دیتی ہے وہاں اُن کی لاپروائی اور لاأبالی کا ثبوت بھی ہے۔ کاش ہمارے شاعر اپنے کلام کی مقدار بڑھانے کی سعی میں اس کے معیار کا بھی خیال رکھا کریں! انتخابِ شعر کی جو روایت اسد اللہ خان غالب نے شروع کی تھی، ہمارے آج کے شاعر اُسے فراموش کرکے خود اپنا نقصان کر رہے ہیں۔ پرویز کے بہترین قطعات، جن کی تعداد اس مجموعے میں بیشتر ہے، پڑھ کر ہر کوئی سخن فہم جھومے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شریمد بھاگوت گیتا

(بھگوت گیتا کے چند اشلوکوں کا کشمیری ترجمہ)

سروانند کول پریمی

بھاگوت گیتا کا ترجمہ تقریباً دُنیا کی ہر مہذب زبان میں ہو چکا ہے۔ اور صدیوں سے تمام عالم کے تشنگانِ معرفت عرفان کے اس ساگر سے پیاس مٹاتے رہے ہیں۔ یہ بات کشمیری زبان کے پھیلتے ہوئے دامن اور کشمیری ذہنوں کی بڑھتی ہوئی طلب کی غماز ہے کہ اب عرفان کا یہ چشمہ کشمیر کی وادیوں میں بھی ہریالی لا رہا ہے۔ پریمی صاحب نے ترجمہ بڑی کاوش سے کیا ہے۔ مگر کہیں کہیں انہوں نے ٹھیٹ سنسکرت الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے کشمیریوں کے گوش آشنا نہیں۔ اُمید ہے کہ باقی حصوں کا ترجمہ کرتے وقت وہ سادگی اور سلاست کے تقاضوں کی طرف زیادہ توجہ کریں گے تاکہ یہ زمزمۂ افلاکی زیادہ سے زیادہ عام فہم بن جائے۔

وہ؟ (پسِ پردہ) (انگریزی)

مُصنف:۔ بی، کے کرشنا

بی، کے کرشنا کی ان تحریرات کو نظم یا نثر کا نام دینے سے قبل آپ کو ادب کی تمام اصناف کو کھنگالنا پڑے گا اور اس کے بعد بھی ع

خامۂ انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہیئے؟

کتاب میں ہمارے موجودہ سماج اور موجودہ دَور کی لڑکی کا تصادم پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس تصادم کو پیش کرنے میں نوجوان مُصنف اپنے جذبات میں توازن نہیں رکھ سکے ہیں اور وہ ذہنی [illegible]

اُن کی آواز پر جھنجلاہٹ غالب آجاتی ہے اور قاری اور اُن کے درمیان بڑی مشکل سے ہی تفہیم کا کوئی رشتہ قائم رہتا ہے۔ کتاب موہن رینہ کی چند حسین تصویروں سے مزین کی گئی ہے اور یہی شاید کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ کاش مسٹر کرشنا اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے اور اپنی نظموں کو ابہام کے پردوں سے باہر نکالنے کے لئے ریاضت سے کام لیں!

ماہنامہ "آج کل" دہلی

رقص نمبر

ایڈیٹر:۔ بال مکند عرش ملسیانی

"آج کل" اُردو کے اُن صاف ستھرے اور پاکیزہ رسالوں میں سے ہے جو ایک مدت سے بڑے امتیاز اور نفاست کے ساتھ اُردو کی جھولی کو گل بداماں بنا رہا ہے۔ "آج کل" کے موسیقی نمبر اور ابوالکلام نمبر ملک بھر کے مقتدر ادبی اور علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اب ادارہ "آج کل" کی اس شاندار روایت میں رقص نمبر کا حسین اضافہ ہوا ہے۔ رقص نمبر کتابت، طباعت اور مواد ہر لحاظ سے پسندِ خاطر ہے۔ سرورق کی سہ رنگی تصویر کافی جاذب نظر ہے۔ شمس کنول کا رقص پر مضمون کافی بسیط ہے۔ فنِ رقص سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس نمبر کا مطالعہ ہر لحاظ سے ناگزیر ہے۔

ماہنامہ "کھلونا" (سالنامہ)

ضخامت:۔ ۱۵۸ صفحات

ناشرین:۔ ادارہ "شمع" آصف علی روڈ۔ اجمیری دروازہ نئی دہلی

ادارہ "شمع" کی طرف سے نونہالوں کے لئے شائع ہونے والا یہ رسالہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ادارے کی طرف سے شائع ہونے والی دوسری مطبوعات کی طرح یہ رسالہ بھی کتابت اور طباعت کے لحاظ سے انتہائی جاذب نظر ہوتا ہے۔ اس نمبر کے معیار کا اندازہ کرنے کے لئے صرف یہ لکھ دینا کافی ہوگا کہ اس میں آثر لکھنوی، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، کنہیا لال کپور، خادم اللہ افسر، ہمدم نامعہ، سلام مچھلی شہری، ساغر نظامی اور اقبال فرحت اعجازی جیسے قلمکاروں نے حصہ لیا ہے۔ بچوں کے لئے ادب میں یہ نمبر ایک بیش بہا اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

حدیث دیگراں

(بقیہ از صفحہ ۷۶)

پورے ایک سال کے بعد "تعمیر" کا شمارہ بابت ماہ جولائی ۱۹۵۹ء نظر نواز ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کو مجھ غریب کی یاد آئی۔ سرورق جاذب نظر ہے۔ جناب فضا ابن فیضی کی نظم "تلاش سحر" کا کیا کہنا! کشمیری زبان کی غزلوں کے ہمراہ اُن کا ترجمہ بھی دیا جاتا تو اُردو داں طبقہ اُن سے ضرور لطف اندوز ہوتا!

مجھ ناچیز کی ایک ضروری گذارش آپ کی خاص توجہ کی محتاج ہے۔ وہ یہ کہ ملک کے مشہور و معروف اہلِ قلم کی ادبی تخلیقات کے پہلو بہ پہلو "تعمیر" کے اوراق میں نوعمر لیکن ہونہار ادبا اور شعرا کی معیاری نگارشات بھی طبع ہونی چاہئیں۔ اس طرح نئے لکھنے والے نوجوان طبقہ کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ اشاعت و فروغ علم و ادب کے لئے یہ اقدام نہایت ضروری ہے۔ افسوس کہ ملک کے چند مشہور و مقتدر رسائل و جرائد کے ایڈیٹر صاحبان اس امر کو کلیتاً نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔ اُمید کہ آپ اُن کی اس روش سے انحراف کریں گے اور اپنی ذاتی جرأت سے کام لیتے ہوئے اُن "گم نام" لیکن مستحق اہلِ قلم کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر منظرِ عام پر لانے کی ہر ممکن کوشش فرمائیں گے۔ خدا آپ کے نیک اِرادوں میں برکت دے اور "تعمیر" آپ کی ادارت میں نہایت کامیاب ہو! دُعائیں

آپ کا:۔ باوا کرشن گوپال مغموم

"گلۂ منز گاش"

(صفحہ ۱۳ سے آگے)

اخلاقیات، حب الوطنی، شرافت اور ہندو مسلم اتحاد کے پرچار کے نقطۂ نظر سے یہ ناول ایک اچھی کوشش ہے اور سکولوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں اس کی اشاعت ضرور ہونی چاہیئے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ بچوں کے لئے ایک عمدہ اور سبق آموز کہانی ہے۔ میرا خیال ہے کہ "گلۂ منز گاش" اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود ایک صحت مند اور دلچسپ ناول ہے اور اس کا اثر بچوں پر کافی مفید اور دیرپا ہوگا۔ ادبی اور فنی محاسن کے اعتبار سے یہ ناول کمزور سہی لیکن اپنی افادیت کے لحاظ سے اس کی اہمیت مسلّم ہے!

غلام نبی عارف

زٕ غزلہ

ساقھاہ اگر اُچھن تل تمُسند جمال روزاں
ضبطس چھ ہوش راوان شوقس زوال روزاں

جلوَن ہندیَن دریچن سمأرِ تأرِی دِتی نا؟
عشقس مگر تیتھے کُنٕ وصلُک خیال روزاں

ہا بُلبلو دِلکِ رنگ ساقھاہ بہک تہ وُچھ ہک
وُچھ ہک چھُ کتھ سنبالان، کتھ کُنٕ بیچال روزاں

یمی ہردہ دادہ رنگ روٗد یمی ڈوڈھ پیٹھ مُشک ژھوٹ
سوٗی گُل چھُ گُلستانس منٛز لازوال روزاں

ژٕ یہٕ تہٕ سروِ قدِ نگار وامیٕ گمژ رٕہتھ جوانی
لگنے ژٕ یہٕ آسے اُفس سرِ خم چھُ وال روزاں

یُتھٕ خوش کلام یارن شیرین دہانٕ مُژرود
تتہٕ چھا زبان دانن کتھ ہُند مجال روزاں

یارہ مشلس قرارہ، دیماں یٕ ورک بہارہ
چھُ تسُ وچھت خیالس بیٚیہ کانہہ خیال روزاں

روہ پہ تنہٕ اُطلاسس ولیو لالو
سینٛدِ دانہٕ تن من چھلیو لالو

پھیرہ متہٕ اَنتم، بیرہ متہٕ اَنتم
بُرتہٕ نو قولس ڈلیو لالو

گھرہ بار ترٲوِتھ جنگلن پھیرے
سنگرو یُتھٕ ما ژٕلیو لالو

شولہ وُن یاوُن بولہ وُن کستور
شراوُن سورِتھ کلیو لالو

چانہٕ ییٚنہ مسولہِ سوتس چھُ آدآو
مانگس منٛز نو پھولیو لالو

سمار میٚانین نازن خریدار
غیرن سیتی نو رَلیو یارو

مجنون خانن لیلی چھس بیمار
چانہٕ درشنہٕ سیتی بلیو لالو

عارفن لیٚشہ بوز عارفن پیغام
عُمرِ لسس اوٚر کوٚر پلیو لالو

حدیثِ دیگراں

پی' آئی' بی۔ اُردو سیکشن

پارلیمنٹ اسٹریٹ۔ نئی دہلی۔ یکم ستمبر ۱۹۵۹ء

برادرم تسلیم! اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ "تعمیر" چونکہ صالح مضامین اور بہتر ادب برابر پیش کر رہا ہے اور پھر نئے ادیبوں اور شاعروں کو بھی برابر موقع دے رہا ہے اس لئے آج میں ایک نئے شاعر سے آپ کو روشناس کرا رہا ہوں۔ انہوں نے اپنی عقیدت سے سرشار ہو کر گاندھی جی کی سمادھی کے لئے گلہائے عقیدت پیش کئے ہیں اور بہت محنت کی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اسے اپنے مؤقر جریدہ کے لئے قبول فرما کر مشکور کریں گے۔
کبھی دِلی آنا ہو تو پریس انفارمیشن بیورو آئیے۔ ہم بھی آپ سے مُلاقات کے متمنی ہیں۔ اُمید کہ کبھی اس کا موقع آپ کی جانب سے حاصل ہو گا۔

مخلص :۔ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

ماہنامہ "شاہکار" (اُردو لٹریری ڈائجسٹ)

۱۳۶۔ کٹرہ۔ الہ آباد

مکرمی تسلیم! "تعمیر" کے تازہ شمارے ملے۔ "شاہکار" کا نواں شمارہ پریس پہنچ چکا ہے۔ دسویں شمارہ میں تبصرہ ضرور بالضرور شائع ہو جائے گا اور تبادلہ بھی ہوتا رہے گا۔
شمیم صاحب کا بدل "تعمیر" کو خوب ملا۔ آپ کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا اندازہ زیرِ نظر شمارہ کی ترتیب و تدوین سے ہوتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آپ کی ادارت میں "تعمیر" روز افزوں ترقی کرے گا۔ پہلے تو فراقؔ صاحب کے یہاں "تعمیر" مل جاتا تھا لیکن ادھر بہت دنوں کے بعد یہ شمارہ دکھائی دیا۔
ادارہ "شاہکار" ہر ممکن تعاون کے لئے ہمہ وقت تیار ہے۔ الہ آباد کے ادبا و شعراء سے "تعمیر" کے لئے جو کچھ ضرورت ہو ہمیں لکھیں۔ ہم ان کا بھی تعاون دِلانے کی کوشش کریں گے۔
اور کوئی خدمت؟ والسلام نیازکیش اخترؔ سندیلوی

سلطان شاہی۔ حیدرآباد دکن

۸ ستمبر ۱۹۵۹ء۔ مکرمی! تسلیمات
"تعمیر" کا جولائی نمبر ملا۔ شکریہ۔ پرچے نے خاصی ترقی کی ہے۔ مضامین اور نظمیں سب اچھی ہیں۔ ترتیب بھی بڑی ہی عمدہ ہے۔ لکھائی چھپائی بھی بے انتہا نفیس ہے۔ خداوندِ عالم آپ کو استقامت دے اور "تعمیر" کی عمر دراز کرے!
براہِ کرم پرچہ بھجواتے رہیئے۔ اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے! پنڈتا صاحب نے معرکۂ داغؔ و غالبؔ خوب لکھا ہے۔ فقط والسلام

(تمکین کاظمی)

ہاؤس نمبر ۷۰/۱۰F ۔ اسیکٹر نمبر ۲۲۔ اے

چنڈی گڑھ (پنجاب) ۱۲ ستمبر ۱۹۵۹ء

مکرمی و محبی ٹینگ صاحب، تسلیم و نیاز

اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہو گا۔ شمیم بھائی کلچرل آفیسر ہو گئے اور آپ کو ماہنامہ "تعمیر" کی ادارت سونپ دی گئی۔ اُمید ہی نہیں بلکہ یقینِ کامل ہے کہ آپ نہ صرف شمیم صاحب کی ادبی روایات کو قائم رکھیں گے بلکہ "تعمیر" کو نت نئی ادبی، فنی، جمالیاتی اور ثقافتی بلندیوں سے روشناس کرا کر اربابِ علم و ہنر سے اپنی جدتِ طبع، حُسنِ ترتیب و تدوین اور فن کارانہ چابک دستی کی داد حاصل کریں گے۔

(بقیہ بر صفحہ ۸۲)

مجھے
آپ کی
بچت
کی ضرورت ہے
اور قوم کو بھی
قومی بچتوں کے ذریعے اس کے مستقبل
کا تحفظ کیجئے۔ باقاعدہ بچت کیجئے اور بھارت
سرکار کی چھوٹی بچت اسکیموں میں روپیہ لگائیے۔ اس سے
آپ اور آپ کے بچوں کے لیے خوب تر بھارت کی تیز ترقی میں مدد ملے گی
۱۲ سالہ قومی پلان بچت سرٹیفکیٹ
۱۰ سالہ ٹریژری بچت ڈپازٹ سرٹیفکیٹ
۱۵ سالہ اینوئٹی سرٹیفکیٹ
پوسٹ آفس سیونگز بنک اکاؤنٹ
اجتماعی میعادی ڈپازٹ اسکیم
قومی بچت آرگنائزیشن
DA 59/170

نشیب و فراز